رسائل کے دفینوں سے

اُردو ادب کی بازیافت

پانچویں جلد

ماہنامہ **زبان** منگرول

۱۹۲۶ ——— ۱۹۲۸ء

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت : حصہ پنجم

ماہنامہ زبان (منگرول، کاٹھیاواڑ، گجرات)
۱۹۲۶ — ۱۹۲۸ء

بار اوّل ۱۹۸۷ء

تقسیم کار:

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 11025

شاخیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دلّی۔ 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی۔ 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202001

قیمت : پچاس روپے

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

گجرات

کا

ماہنامہ زبان منگرول

۱۹۲۶ — ۱۹۲۸ء

مکمل فائل کی عکسی اشاعت

خدابخش لائبریری، پٹنہ

۱۹۸۶ء

پیشگفتار

پیشگفتار

کاٹھیاواڑ گجرات کے ایک تہذیبی مرکز' سابقاً ایک دیسی ریاست' منگرول کے ساٹھ سال پرانے ایک تاریخ ساز ماہنامہ 'زبان' کے تمام شماروں کی یکجا مکمل عکسی اشاعت پیش خدمت ہے۔

زبان کے پہلے شمارہ میں ایڈیٹر جناب عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی نے اپنے 'افتتاحیہ' میں پرچہ کی نوعیت کے بارے میں مندرجہ ذیل پیراگراف لکھا تھا' جس سے اس کے کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

"زبان" جن خدمات کی ذمہ داری کا بار لیکر آیا ہے وہ اس کے آیندہ اوراق خود بتادیں گے زبان کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ کوشش کریگا کہ ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں اس کا شمار ہو۔ ہیں اگر زبان کو عامیانہ خیالات کی جولانگاہ بنانا ہنیں چاہتا تو اپنے بعض کرمفرما احباب کے مشورہ کے مطابق خالص علمی (جس میں ادبیات کی چاشنی نام کو نہ ہو) بنا کر بالکل خشک اور ٹھوس بھی بنانا نہیں چاہتا' البتہ ایسے ادبی مضامین سے جن میں صرف پرشکوہ اور شاندار الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں اور جو معانی و مطالب سے معرا ہوتے ہیں اور جن میں غلط اور غیر مانوس ترکیبیں' لایعنی جملے' اور عریاں خیالات ہوتے ہیں زبان کو آلودہ نہ ہونے دوں گا۔ اگر اس کو "قبول عام" کا شرف دینے کے لیے ان تمام دلچسپیوں کا خیال رکھا جائے گا جس کا جواز اہل کتاب و اہل علم نے دے رکھا ہے اس میں (۱) مقالات (۲) مترجمات (۳) ادبیات (۴) اخبار علمیہ اور (۵) تنقید و تبصرہ کے مستقل عنوانات ہوا کریں گے۔ جنکے ضمن میں (۱) علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کے مضامین ہوں گے۔ (۲) عربی' انگریزی اور گجراتی کے اعلیٰ خیالات اردو میں منتقل کئے جائیں گے (۳) بہترین شاعرانہ خیالات "شعر منثور" اور مختصر اخلاقی و سبق آموز افسانے اور اخلاقی و نیچرل نظمیں اور تازہ غزلیات ہوا کریں گی۔ (۴) جدید علمی خبریں ہوں گی اور حیرت انگیز سائنس کے اختراعات سے آگاہ کیا جائے گا (۵) مطبوعات جدیدہ پر ناقدانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا جائے گا۔"

○

زبان کے ایڈیٹر (اور مالک)' جناب عبدالرحمٰن بن محمد محسن سلیمانی متخلص بہ خوشتر کی ولادت ایک غریب لیکن غیور عرب خاندان میں یکم مارچ ۱۸۹۲ء کو ہوئی ان کے والد رہا سہا سے۔ جوناگڑھ' وڈھوان وغیرہ میں نوابوں اور راجاؤں کے محل کے عرب افراد کے روایتی پاسبانی دستوں کے رکن تھے' ان کی عمر مشکل نو سال کی تھی جب ان کے والد نے بعارضۂ دق انتقال کیا' یہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم جوناگڑھ کے بہابت مدرسہ اور وڈھوان کے ایک غیر سرکاری اسکول میں ہوئی' والد کے انتقال کے بعد یا

منگرول کے صدر مقام منگرول کے مدرسۂ اسلامیہ اور گجراتی ہنڈ اسکول اور جوناگڑھ کے مہابت مدرسہ میں ہوئی۔

تعلیم تکمیل کرنے نہ پائے تھے کہ منگرول کے ایک متمول میمن گھرانے کی ایک معمر خاتون حج بیت اللہ کو جاتے ہوئے خوشتر صاحب کی والدہ کدر بانو کو اپنے ساتھ لے گئیں، چنانچہ ان کی والدہ نے انہیں بمبئی شہر میں کھڑک محلہ میں واقع اس زمانے کے مشہور و معروف زکریا احمد پٹیل کے یتیم خانے میں داخل کردیا، اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔

۱۹۱۳ء تک بمبئی میں قیام رہا، حج سے واپسی پر ان کی والدہ نے ان کی نسبت بمبئی میں مقیم منگرول کے ہی ایک باعزت خاندان کی بیوہ لڑکی مسماۃ زینب سے کردی اور وہ بمبئی سے اپنی والدہ کے ساتھ منگرول چلے آئے، کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ علیل ہوئیں اس لئے بمبئی کو واپسی کا ارادہ ترک کرکے منگرول کے مدرسۂ اسلامیہ میں پندرہ ۱۵ روپے کے مشاہرہ پر مدرسی کی ملازمت اختیار کی، اس کے ایک ہی ماہ کے اندر ان کی والدہ کا انتقال ہونے کے بعد وہ پھر بمبئی گئے جہاں ۱۹۱۴ء میں ان کا عقد زینب خاتون سے ہوا، دو ۲ بچوں کے بعد ۱۹۱۷ء ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

بمبئی میں مختلف مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں اپنے وطن منگرول واپس ہوئے اور ولیعہد ریاست شیخ محمد عبدالخالق صاحب کے دربار سے وابستہ ہوگئے، ولی عہد کے صاحبزادے ناصر میاں صاحب کے مصاحب کی حیثیت سے ۳۰ روپے ماہوار پر ان کا تقرر ہوا، تین سال کے بعد ۱۹۲۱ء میں ان کی دوسری شادی ولی عہد صاحب کے توسط سے ایک مقامی عرب خاندان کے شیخ حسن بن علی چاؤش کی صاحبزادی مسماۃ مریم بانو سے ہوئی۔ ان دوسری بیوی سے دو ۲ بیٹے اور دو ۲ بیٹیاں ہوئیں۔

ان کی اولاد میں ماشاءاللہ تین بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ان کا تقرر ریاست منگرول کے ریونیو سررشتہ دار کے اوّل کارکن (کارکن اوّل) کی حیثیت سے ہوا، اس سے دو ۲ سال قبل ۱۹۲۶ء میں انہوں نے منگرول سے ماہنامہ رسالہ "زبان" کا اجراء کیا جو آگرہ پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً دو سال جاری رہا لیکن مالی دشواریوں اور قدردانوں کی کمی کے باعث اسے جاری نہ رکھ سکے اور اس کو بند کرنا پڑا۔

ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے پہلے ریونیو اسسٹنٹ اور پھر شیخ محمد ناصرالدین میاں صاحب کے عہد میں ۱۹۴۳ء میں ریاست کے ریونیو کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست منگرول کے انڈین یونین میں ضم کئے جانے پر دیگر مسلم عہدیداروں کے ساتھ خوشتر صاحب کو بھی پنشن پر سبکدوش کیا گیا۔

ملازمت کے دوران خوشحالی سے زندگی بسر ہوتی رہی۔ شعر و شاعری کے ذوق شوق کے لئے جو بمبئی کی سکونت کے دوران پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہوگا منگرول کی فضا اور ماحول نہایت سازگار تھا۔

ملک کے بٹوارے کے بعد ان کے بڑے بیٹے ابا مختار تو کراچی منتقل ہوگئے، لیکن ابا محسن اور ابا خالد ہندوستان میں ہی رہے

لیکن وہ دونوں بھی کچھ سال بعد وہاں سے مشرقی پاکستان چلے گئے، بنگلہ دیش کی تشکیل کے بعد انہوں نے وہاں کی قومیت اختیار کرلی، آجکل ڈھاکہ میں اینٹوں کے کارخانے کے مالک اور صاحب استطاعت ہیں، خوشتر صاحب کو مہنگائی بھتہ علاج معالجہ کے الاؤنس وغیرہ کو ملاکر ۲۳۰ روپے وظیفہ ملتا ہے، نہایت کشادہ دست اور فراخدل اور مہمان نواز ہونے کی وجہ سے نیز کتب و رسایل کی خریداری کے پیش نظر اس قلیل رقم میں ان کی بسر اوقات ہونا مشکل ہے لیکن ان کا سعادتمند لڑکا ابا خالدان کی تمام ضروریات کو پوری کرتا ہے اور خوشتر صاحب کی زندگی اسی طرح خوشحالی اور آسودگی میں بسر ہورہی ہے۔ ان کے بنگلہ دیشی دونوں بیٹوں کا اصرار ہے کہ وہ ان کے ساتھ ڈھاکہ میں بود و باش اختیار کریں لیکن ع کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر کے بمصداق وہ اپنے وطن مالوف منگرول کو جہاں پوری زندگی نہایت نیک نامی اور ادبی فضا کے علاوہ مقامی اور بیرونی مشاہیر کی صحبت میں گزاری ہے، چھوڑنا نہیں چاہتے، ویسے وہ ڈھاکہ آتے جاتے رہے ہیں گو اب ضعف بصر اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے سفر کرنا ترک کردیا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں کئی ماہ ڈھاکہ میں رہے اور قیام ڈھاکہ کے دوران میں ہی وہیں سے حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں۔ سعادتمند فرزند ابا خالد صاحب نے اپنی بیٹی رضیہ ماں کی شادی کی تقریب کے بہانے اگست ۱۹۸۵ء میں ایک بار پھر انھیں اپنے پاس بلالیا۔

یتیم خانے کے قیام اور تعلیم کے زمانے میں وہاں کے پرنسپل منشی محمد حسین صاحب تھے جو اپنی ادارت میں اردو مفید الاخبار نکالتے تھے۔ یہ یتیم خانے میں طبع اور وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت اردو فارسی کے استاد اپنے زمانے کے مشہور عالم ادیب اور شاعر حضرت تجمل حسین جلالپوری تھے، یتیم خانے کے اسکول کے بعد بمبئی میں ہی گولی محلے کے میونسپل اسکول میں بغرض مزید اردو تعلیم داخل ہوئے جہاں خوشتر صاحب کو ۱۹۰۸ء میں جناب محمد حسین مقبہ صاحب کے ہاتھوں "مجموعۂ سخن" کتاب بطور انعام ملی، اس اسکول میں ان دنوں صوبۂ بمبئی (حال صوبۂ کرناٹک) کے شہر بلگاؤں کے باشندے عبدالحق المتخلص بہ شائق بھی مدرس تھے۔ وہ اپنے طلبا کو اکثر اردو شعرا خصوصاً مصحفی اور انشا اور غالب و ذوق کے حالات بڑے دلچسپ انداز میں اور مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ چھٹی ہوجانے کے بعد کے اوقات میں بھی اسکول میں مزید کچھ وقت ایسے شاعرانہ ماحول میں گذرتا تھا۔ "مجموعۂ سخن" میں شعرائے متقدمین کا کلام اور مختصر حالات درج تھے۔ ان میں بڈیڈ کے رہنے والے خوشتر تخلص والے شاعر بھی شامل تھے جن کی رام اور سیتا پر کہی ہوئی نظم اس میں شامل تھی، خوشتر صاحب کو یہ تخلص پسند آگیا اور فن شاعری کی شد بد نہ ہونے کے باوجود اس تخلص کا اپنے لئے انتخاب کرلیا اور اپنے نام کے ساتھ خوشتر منگرولی لکھنے لگے۔

بمبئی کے ہی ناخدا محلے میں رام پور کے ایک ظہور الدین نامی حکیم صاحب مطب کیا کرتے تھے۔ خوشتر صاحب نے ان سے بھی کچھ فارسی سیکھی۔ بقول خود خوشتر صاحب کے "تعلیمی عہد کے خوشتر تخلص کا دم چھلہ لگا لینے کی وجہ سے مجھے مجھے خواہ مخواہ شاعر بننا پڑا" اسی لئے خوشتر صاحب اپنے آپ کو دیسی شاعر نہیں متشاعر کہتے ہیں، چنانچہ تخلص کو نباہنے کے لئے انہوں شعرگوئی کی طرف توجہ

دی اور اس طرح "اوٹ پٹانگ" شعر سے شعر کی مشق کا آغاز ہوا، ان دنوں بمبئی کے بھنڈی بازار کے فٹ پاتھ پر اقبالؔ کا شکوہ اور جواب شکوہ، آغا حشر کشمیری کا سکر پر یورپ وغیرہ نفیس طباعت والے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بکا کرتے تھے۔ خوشتر صاحب ان کو خرید کر مطالعہ کرتے۔ زکریا مسجد بمبئی کے مقابل واقع سبحانی لائبریری میں جا کر گھنٹوں اردو اخبارات اور رسالے پڑھا کرتے اس کے علاوہ بمبئی کی مشہور کریمی لائبریری واقع انجمن اسلام بوری بندر میں بھی کافی وقت کتب بینی میں صرف کرتے رہے، اس دوران فٹ پاتھ کے کتب فروش کے پاس سے "اصلاح سخن" نامی ایک مختصر رسالہ دستیاب ہوا جو لاہور سے حضرت وجاہت جھنجھانوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اس کے مستقل خریدار بن گئے اور ان سے اپنی پہلی غزل پر اصلاح لی جس کا مطلع یہ تھا:

خدا نے ان حسینوں کی عجب صورت بنائی ہے کہ جن کی بھولی بھالی شکل پر قرباں خدائی ہے

اسی کے ساتھ ایک اور غزل بھی بغرض اصلاح بھیجی تھی جسے یہ لکھ کر واپس کر دیا گیا کہ طبیعت پر اور زور لگاؤ اس تجربے سے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کسی مقامی استاد سے بالمشافہ مشورہ کرنا چاہئے تاکہ شعر کے محاسن و معایب کا حقہ سمجھ میں آسکیں، چنانچہ خوشتر صاحب نے اپنے ہم وطن سلطان میاں المخلص سلطان کے مشورے پر ان کے استاد حضرت تجمل حسین تجمل جلالپوری کے دامن تلمذ سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر کے سنہ ۱۹۱۱ء میں حضرت الاستاذ تجمل جلالپوری کے سامنے زانوے شاگردی طے کیا اور انہوں نے پہلی اصلاح کردہ غزل کی "تاج خوشتر" (سنہ ۱۹۱۱ء) تاریخ کہی، خوشتر صاحب کی شاعری کا اس طرح باقاعدہ آغاز ہوا۔

منگرول میں ولی عہد ریاست شیخ محمد عبدالخالق صاحب کے دامن دولت سے ۱۹۱۸ء میں وابستہ ہو کر ان کے سایۂ عاطفت میں اپنے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ ان کی خدمت کے علاوہ وقت کا زیادہ حصہ کتب بینی میں صرف کرتے رہے جس سے ان کے علمی ذوق کو بڑی تقویت پہنچی، نتیجۃً سنہ ۱۹۲۶ء میں اردو زبان کا ایک ماہوار رسالہ "زبان" شائع کیا۔ یہ آگرہ میں جناب دلگیر کی وساطت سے آگرہ پریس میں چھپتا اور منگرول سے شائع ہوتا تھا، اس رسالے کے اجراء میں برصغیر کے مشہور اہل علم و دانشور جناب قاضی احمد اختر جوناگڑھی مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ان کی اعانت سے رسالہ اعلیٰ معیار پر نکلتا تھا، بدقسمتی سے رسالہ دو سال کے عرصے میں بند کرنا پڑا۔

ایک طرف طبیعت میں "تفنن" اور دوسری طرف اہل و عیال کے چکر کی وجہ سے باوجود اچھی خاصی ملازمت کے تنگدست رہے، ان دنوں منگرول کے ایک اور صاحب علم بڑے افسر جناب فصیح الحق عباسی بھی ان کی دستگیری کرتے رہتے تھے، رئیسوں کی سالگرہ کے موقعوں پر قصیدہ تہنیت پیش کرنے پر بھی چھوٹا موٹا انعام مل جاتا تھا۔ اس طرح گزر بسر ہوتی رہی، البتہ خوشتر صاحب کی زندگی کا یہ آخری دور ان کے نہایت نیک بخت اور سعادتمند بیٹے ایاز خالد کی نگرانی سے فارغ البالی میں گذر رہا ہے۔ اپنی ۹۲ سالہ زندگی میں کسی جسمانی تکلیف یا بیماری سے دوچار نہیں ہوئے سوائے یہ کہ پچھلے دو سال سے بتقاضائے عمر ضعف بصر اور قوائے جسمانی کی کمزوری کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہیں، ماشاء اللہ حافظہ اب بھی قوی ہے اور منگرول اور بمبئی تک کی علمی اور ادبی فضا

کے بارے میں معلومات کا بیش بہا خزانہ ان کے اس حافظے میں محفوظ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے ان معلومات کے خزانے کو قلمبند کیا جائے۔

متذکرہ منظوم کلام کے علاوہ خوشتر صاحب کا نثری سرمایہ بشمول ترجمہ کردہ مضامین اور افسانوں کے مالک ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی طباعت کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں کی، نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "حسن خیال" کے نام سے ان کے بیٹوں عرب محمد محسن اور عرب ابا خالد نے ۱۹۷۶ء میں ڈھاکہ سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں گجراتی زبان کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس دھوم کیتو کے چیدہ چیدہ خوشتر صاحب کے کئے ہوئے گجراتی سے اردو ترجموں کا مجموعہ بنام "خیالی تصویریں" ریاست منگرول کے آخری رئیس اور مترجم کے ممدوح نے رقم کثیر خرچ کرکے کراچی سے شائع کرایا تھا جوان کو شکایت ہے کہ بڑا غلط سلط چھپا تھا، اس لئے وہ اسے دوبارہ اضافوں کے ساتھ تصحیح شدہ صورت میں چھپوانا چاہتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا ایک اور دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ لیکن طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ نثری ادبی مضامین 'طیور آوارہ' کے نام سے چھپ رہے ہیں 'حسن خیال' کا دوسرا ایڈیشن بھی اضافوں کے ساتھ ڈھاکے سے دسمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ خوشتر صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں گجرات اردو بورڈ (احمدآباد) نے آپکو ۲۹ نومبر ۸۶ء کی ایک تقریب میں ولی گجراتی ایوارڈ دیا ہے۔

خوشتر صاحب نے ہماری گزارش پر ہمیں ازراہِ کرم اپنا جو 'احوال واقعی' عنایت کیا وہ اوپر درج ہوا۔ اب کچھ رسالہ 'زبان' کے بارے میں:

○

'زبان' کے پہلے شمارے میں سرورق پر عربی شعر مندرج تھا:۔

لَقَدْ وَجَدْتُ مَكَانَ الْقَوْلِ ذَا سَعَةٍ ۔۔۔ فَإِنْ وَجَدْتَ لِسَانًا قَائِلًا فَقُلِ

جو اگلے شماروں میں بھی جاری رہا۔ اس شعر کے نیچے رسالہ کا نام ہوتا اور پھر یہ عبارت ہوتی تھی "کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ"۔ مقالات کے اوپر سرنامے کے طور سے کبھی کبھی یہ رباعی درج رہتی تھی (۲۵۰)

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی ۔۔۔ کل جسم میں اک نطق مجسّم ہے یہی

ہے عرش خدائے پاک، گر پاک ہے دل ۔۔۔ صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی

۱۹۲۷ء کے فروری میں یہ اعلان بھی کیا گیا (۲۹۳) کہ اب تک اگرچہ اخبار آگرہ سے چھپتا تھا تاخیر ہوتی تھی، اب دہلی سے چھپے گا۔

'زبان' کا مکمل فائل ہمیں خوشتر صاحب سے ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی کے توسل سے ملا اس کے لیے دونوں کا شکریہ ہم واجب ہے

اس عکسی اشاعت میں پہلے پرچے کا سرورق دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس کے بعد کا کوئی ٹائٹل نہیں دیا گیا سوائے دوسری جلد کے پہلے شمارے کے جس میں مبین صاحب کے خط کی روشنی میں اس عربی شعر کو تصحیح کے ساتھ چھاپا گیا جو اب تک غلط چھپتا تھا۔ ساتھ ہی شاعر کا نام بھی اڑا دیا گیا۔ اس کے بعد تیسری جلد کے چوتھے شمارہ میں ٹائٹل کا ڈیزائن اور مضمون تبدیل ہو گیا، اس لیے اس کا عکس دینا بھی ضروری خیال کیا گیا۔

یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ: شمارہ ۳(۱)، دراصل ۳(۱-۲) ہے یعنی جولائی اگست کا مشترک نمبر ہے، ادارہ کی جانب سے ایسا مذکور ہونے سے رہ گیا۔ اسی طرح ۳(۵) کو غلطی سے ۳(۴) لکھ دیا گیا تھا۔ ۳(۶) میں اداریہ میں مشمولات کے ذکر میں عشرت رحمانی کے مضمون متعلقہ مومن دہلوی کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ مضمون واقعتاً نیت یا ارادہ ہی تک محدود رہا، چھپا نہیں۔

○

ہر رسالہ کی الگ الگ فہرست مضامین صفحات ۳، ۵۱، ۹۹، ۱۴۷، ۱۹۵، ۲۴۳، ۲۹۵، ۳۴۵، ۳۹۵ (دو ماہ کا مشترک نمبر)، ۴۹۱ (دو ماہ کا مشترک نمبر)، ۵۸۵ (دو ماہ کا مشترک)، ۷۱۵، ۷۶۳، ۸۱۱، ۸۵۹ پر موجود ہے۔ لیکن مضمون کے مقابل جو ماہانہ اشاعت کے صفحات نمبر دیے ہوئے ہیں وہ اب اندر تبدیل ہو گئے ہیں اور نئے نمبر مضمون کے مقابل دینے کے بجائے ایک جامع فہرست بنا دی گئی ہے۔ تاہم اصل فہرستوں کی ہیئت کو ہر رسالے کے ساتھ جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے تاکہ اور کچھ نہیں تو اندر بھی سامنے رہے (سوائے فہرست ۲(۶) کے جو اصلاً ہمارے نسخے میں محفوظ نہیں)۔

○

ذیل میں 'زبان' کی تمام تحریروں کو دس بارہ موٹی موٹی قسموں میں تقسیم کر کے مرتّب کر دیا گیا ہے تاکہ ایک نظر میں اس مخصوص فن میں دلچسپی لینے والے کے سامنے ساری متعلقہ تحریریں یکجا آ جائیں۔ اس بیانظم کے حصے میں چونکہ ہزار دو رسالے کی مانند یہاں بھی شعرائے کرام تعداد میں اچھے خاصے ہیں اس لیے انھیں ابجدی ترتیب میں کر دیا گیا ہے، اور اسی طرح ایڈیٹر کے نام خطوط لکھنے والوں کو بھی۔

اسلام و متعلقات

وجود باری عزاسمہ (محمد افتخار علی)، ۲۸ ● سیرت رسول اللہ کی تمہید (پروفیسر سید نواب علی)، ۶۰۵ ● زوجیت در قرآن مجید (قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)، ۱۰۸ ● تحصیل علوم و فنون کے لیے احکامات اسلامیہ (سید آل حسن اختر کنلیری)، ۵۲۰ ● علم اور اسلام مصنفہ ربیان ترجمہ محمد اسماعیل اصلاحی اعظم گڑھی بتوسط قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۱۴، ۵۴، ۸۰، ۱۰ ● [illegible] کے علوم (منظر احمد اعظمی)

تاریخ ہند اسلامی

تاریخ و تنقید زبان و ادبیات اردو

میں شخصی واحد تیار کر رہا ہے (اداریہ نوٹ) ۲۴،● رسم الخط (تمکین الکاظمی) ۲۲۲ ● انداز (اسٹائل): (عابد علی عابد) ۲۲۵ ● میر انیس اور عون و محمد کا کردار (عبدالقادر سروری) ۵۱۶ ●

● اردو کو پیغام گوشاں (محی الدین قادری زور) ۶۴۲۔ خاصکر اقبال کے بارے میں اہم حصہ: زندگی میں مضمون ۶۰ تا ۶۹ ● دارالاستفادہ کے انعقاد کی ضرورت (اداریہ) ۲۲۹ ● جواب استفسار عرضی از آزاد کاکوری در نیرنگ' رام پور (شاداں بلگرامی) ۲۱۲ ● نواب آصف الدولہ کا شکار اور میر سودا (ابو المحاسنات سید غلام محی الدین قادری زور بی اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ) ۳۱۰ ● نفسیات اکبر (عابد علی عابد) ۳۶۵ ● خیابان خلیل (لسان الملک صاحبزادہ متین اللہ خاں واثق ٹونکی) ۔ والی ٹونک اچھے شاعر ہیں لیکن مجموعے میں جو پوچ شعر ہیں یقیناً وہ ان کے نہیں کسی کے کہے ہیں اس لئے ہم اس حصہ پر تنقید کر رہے ہیں ۲۴۲، ۵۲، ۳۰، ۸۹، ۹۰۰ آخری قسط میں 'باقی' کا اشارہ ہے لیکن اس کے بعد 'زبان' نکلا ہی نہیں ● دور قدیم و جدید کی شاعری پر ایک نظر (ولایت حسین خاں اثر رامپوری) ۵۴۰ ● دور حاضر کے شاعر (عشرت رحمانی المجیب رامپوری ۵۲۹ ۔ عندلیب شادانی والے انداز میں: دور حاضرہ کے کچھ مامور شعرا کا کلام، ایڈیٹ دو سال کے اندر کے 'خورشید' اور 'جلوۂ یار' میرٹھ سے غریب سہارنپوری، افسر امروہوی، جان محمد انور تلمیذ مضطر خیرآبادی، 'شیاما چرن بزم بریلوی' زخمی میوتی، سالک رام سالک گرداری، قادر بخش شباب، نوح ناروی پر اعتراضات ۵۲۹ ● اٹھارویں صدی کے افسانہ نگار (یعنی انگریزی افسانہ نگار - ترجمہ (قیسی) ۸۹، ۷ ● سید مقبول حسین بہزاد کا ایک مراسلہ کہ اردو کی ایک کتاب فارسی جدید کے طرز پر شائع ہو رہی ہے - ۱۰، ۷ ● دنیلے افسانہ پر ایک نظر (محمد محسن خاں متین حیدرآبادی) ۶۷۹

ناولٹ / طویل افسانہ

شہید تغافل (بانم) ۲۷۲، ۳۲۴، ۴۶۵، ۷۰۳ ● فلسفی دل (مصنفہ اسٹیونسن مترجمہ احمد عبداللہ المسدوسی متعلم عثمانیہ): ۲۴ ورق کا طویل افسانہ یا ناولٹ ۵۵۱

مختصر افسانہ

● احساس گناہ کی قیمت (محمد صدیق مسلم بالی گاؤں) ۷۹۵، ۸۴۳ ● پہاڑی لڑکی (محمد شفیع کاشف اکبرآبادی) ۔ کیوپڈ اور سائکی کے بارے میں افسانہ ۶۸۳، ۵۵۷ ● شوالہ (محمد شفیع کاشف اکبرآبادی) ۸۱،۲۰ ● مہر موہوم (اقبال احمد اقبال) ۸۳۲ ● لازوال شاعر (شوکت تھانوی) ۶۹۵ ● انصاف اندھا ہو سکتا ہے لیکن روپیہ گونگا نہیں (قاضی نصیح الدین صدیقی متعلم بی اے عثمانیہ) ۔ انگریزی سے ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۸۵۰ ● گنگا کی وادی میں (قیسی رامپوری) ۸۰۷ ● رقابت

ایسٹے

انشائیے

نکات ملا رموزی

نظم (نظم، غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ)

مکتوبات مشاہیر

تذکرۂ مشاہیر

تصاویر مشاہیر

● ابوالکلام آزاد ۵۸۶ ● نور ۵۹۶ ● شیخ عبدالخالق ولیعہد منگرول ۵۹۵ ● میر علی نواز خاں ناز والی خیرپور (پرائیویٹ سکریٹری رضا الحق عباسی کے ذریعہ) ۳۹۴ ● شیخ محمد جہانگیر میاں والی منگرول ۳۰۴ ● غلام معین الدین خان والی ریاست مانادور (کاٹھیاواڑ) ۔ یہ سب تصاویر طباعت کی سہولت کے پیش نظر یکجا پیش کر دی گئی ہیں۔

تذکرۂ رسائل

جن پر تبصرہ ہوا یا 'زبان' پر جن کے تبصرے نقل ہوئے

● آفتاب (کلکتہ) ۲۹۰ ● آئینہ (کانپور) ۴۴۹ ● ادبستان (بمبئی) ۲۴۰ ● اقتباس (بمبئی) ۲۲۹ ● الناظر (لکھنؤ) ۲۳۳ ● انقلاب ایڈیٹر فتح چند شمیم و کنہیا لال ثاقب لاہور ۴۹۰ ● پیمانہ (آگرہ) ۲۲۶، ۲۹۷ ● ثریا (آگرہ) اشتہار ۲۹۷ ● حرم (سپلی بھیت) ۲۴۱ ● خیابان (لکھنؤ) ۲۸۹ ● دل (آگرہ) ۲۲۸ ● ریاست (دہلی) ۳۴۶ ● زمیندار (سنڈے ایڈیشن) (لاہور) ۳۴۶ ● سہیل (علی گڑھ) ۲۸۶ ● شمع (آگرہ) ۲۷۷، ۴۸۳ ● ظل السلطان ۲۲۸، ۷۱۶ ● علی گڑھ میگزین ۴۸۶، ۷۰۶ ● قوس قزح (لاہور) ۲۴۴، ۲۸۹ ● کیف (اجمیر) ۲۴۰، ۷۶ ● مرقع (لکھنؤ) ۲۴۲، ۴۸۹ ● معارف ۳۴۶ ● مفید عالم (دہلی) ۳۴۳ ● نظر (لکھنؤ) ۲۳۵ ● نگار (بھوپال) ۲۳۴ ● نیرنگ (رام پور) ۲۳۷، ۳۶۷ اشتہار نمبر ۸۰۳ ● نیرنگ خیال (لاہور) ۴۸۹ ● ہمدرد (دہلی) ۳۴۶

تذکرۂ کتب

(تبصرہ یا اشتہار)

● پس پردہ (مضامین) از آغا حیدر دہلوی ۸۰۹/۸۰۸ ● حیاتِ انیس اور امجد علی اشہری کی دوسری کتابوں کا اشتہار ۵۳۳ ● خطوطِ شبلی بنام عطیہ و زہرہ فیضی ۳۴۳ ● دنیائے افسانہ از سروری ۸۰۸/۸۰۷ ● روحِ تنقید از زور ۸۰۷ ● عبرت کدہ (اکبر حیدری) افسانے ۱۱ ● فانی کے 'دیوانِ فانی' کا اشتہار۔ محمد شوکت علی خاں بی اے علیگ، شعر سے آغاز 'کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل :: لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے' آگرہ اخبار آگرہ ۷۵۹ ● کتاب الحج والزیارۃ مولفہ مولوی منور الدین دہلوی، تبصرہ از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳۸۶ ● کیفستان (ادبِ لطیف) ۸۱۰ ● گلزارِ خلیل از خلیل ۲۸۶ ● مرآۃ محمدی: گجرات کی لکھی اسلامی تاریخ (از منشی غلام محمد) جنھوں نے جوناگڑھ کی تاریخ مرآۃ مصطفیٰ آباد نام سے لکھی ہے ۲۸۵ ● مرقع عبرت یا ایک عیاش کی ڈائری۔ افسانہ ۸۰۹، ۸۱۰ ● ندرِ رمضان، ۱۶ ص کا رسالہ (از مظہر احمد ادھمی)، لیلۃ القدر کے فضائل ۳۸۹

متفرقات

● حکمتِ عملی [اخلاقیات میں] (یسین محمد الجعبرا جینی) ۷۸۵ ● قابلیت دماغی اور صحت جسمانی (م. راشکور بیگ متعلم عثمانیہ

اخبار علمیہ / مترجمات

● شرق اردن کے آثار قدیمہ ۲۹۱ ● لاش کی حفاظت (معرکہ طرح اٹلی میں) ۲۹۱ ● ایک مصر والے حق کی ۴۵ ہزار میں خرید ۲۹۱ ● سب سے چھوٹا برقی لیمپ ۲۹۲ ● علمی اصطلاحات ۴۸ ● باغ حیوانات عہد عباسی میں ۴۸-۴۹ ● عرب میں سونے کے دانتوں کا رواج ۱۸۰۰ء سے قبل ۴۹ ● شمالی یورپ میں اسلامی سکہ جات کی دریافت ۴۹ ● مستقبل کا اخبار: صرف واقعات کی چھوٹی چھوٹی تصاویر پر مشتمل ہوگا ۵۰ ● اسلامی جذبۂ خودداری ۵۰ ● فوٹوگرافی کا ارتقا: ایک سیکنڈ میں تین سو؛ تشخیص امراض بذریعہ تصاویر؛ مکھی محترمہ کے جراثیم ۳۴۰ ● ایک عجیب گھڑی جو ہلا کر چلے گی ۳۴۱ ● نباتاتی انسائیکلوپیڈیا ۲۶۹ ● یورپ کے شاہی درباروں کی اخلاقی حالت ۲۷۰ ● ارتقائے ارض کا قرآنی نظریہ اور موجودہ تحقیقات طبقات الارض ۳۳۷ ● لذتِ الم ۳۳۸ ● ترجمہ قرآن مجید چینی زبان میں — محمد علی کے ترجمہ سے ترجمہ محی الدین کر رہے ہیں ۳۸۲ ● غیر صحیح اور مخرب اخلاق کتابیں نذرِ آتش ۳۸۳ ● لندن میں مذہب عیسوی پر مادیت و خودغرضی کا غلبہ؛ قدیم جغرافیہ کے محافظ: مسلمان (جاگرفیکل میگزین) ۳۸۴ ● ذاتوں کا امتیاز اور مساوات اسلامی ۳۸۵ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا جدید ایڈیشن ۳۸۵ ● مطبوعات قدیمہ کی قدر و قیمت ۵۴۶ ● مغلوں کا محکمہ احتساب ۵۴۷ ● فلسطین کی جدید اثری تحقیقات ۵۴۹

اصل مضامین پڑھنے سے بھی پہلے محض ایک نظر میں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ **اسلام و متعلقات تاریخ ہند اسلامی** کے علمی حصے کے تحت جو کچھ بھی ہے اچھے لکھنے والوں کے قلم سے ہے اور آج بھی ان کی وہی اہمیت ہے۔ **ادبیات** اردو میں زیادہ تر کی تاریخی اہمیت ہی رہ گئی ہے لیکن **عشرت رحمانی** اور **واقف ٹونکی** کے تنقیدی مضامین آج بھی لطف دیتے ہیں **افسانے** اور **ناولٹ**، کہانی کے ارتقا کی خاموش کہانی سناتے ہیں، ان کی یہ اہمیت آج بھی باقی ہے کل بھی باقی رہے گی۔ یہی **صورت** انشائیے کی ہے۔ **نکات رموزی** میں اردو تحریک کے بارے میں عصری صورت حال سامنے آتی ہے۔ **نظموں غزلوں** میں اس وقت کے عام شاعرانہ ماحول کا ایک مجموعی نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ **مکتوبات** شخص متعلقہ کے تذکرہ و سوانح میں کچھ مددگار ہو سکتے ہیں۔ **تذکرۂ مشاہیر** کی عصری اہمیت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں آزاد، اقبال اور مومن کے معمولی حوالوں کے سوا کوئی اہم چیز اتفاق ہی سے ملے تو ملے۔ **تذکرہ رسائل** سے ادبی رسائل کی تاریخ مرتب کرنے میں سہولت رہے گی۔ اسی طرح **تذکرۂ کتب** بھی کبھی کبھی کارآمد ہو سکتا ہے خاص کر ان کتابوں کے سلسلے میں جن کی محض علاقائی اشاعت تھی۔ **متفرقات** میں جامعہ ملیہ کے لیے اپیل خصوصی طور سے توجہ طلب ہے جس میں ایک ہی پلیٹ فارم پر متعدد مشاہیر جمع ہو گئے ہیں! جامعہ کچھ چیز ہی ایسی تھی، جبھی تو ۱۹۴۶ء میں بھی جب اس کی جبلی ہوئی تب بھی جناح اور جواہر لال اور لیاقت علی خاں سب کے سب جامعہ کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔

اخبار علمیہ اور **مترجمات** کے ذیل میں جو ماخوذ اطلاعات یا دوسرے پرچوں سے مفید مختصرات ترجمہ کر کے دیے جاتے تھے، ان کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ان میں آج بھی تازگی ہے، اور افادیت باقی ہے۔

○

اڑھتالیس صفحات کا یہ ماہانہ رسالہ عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی کی ادارت میں جولائی ۱۹۲۶ء میں نکلا اور جون ۱۹۲۸ء کے آخری پرچے کے بعد بند ہو گیا۔ کاٹھیاواڑ کا یہ اکلوتا پرچہ ادبی رسائل کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل تو ہے ہی، لیکن محض تاریخ سے آگے کی بھی چیز ہے۔ اس کے مشتملات میں ایک اچھا خاصا حصہ ایسا بھی ہے جو آج بھی علم و نظر دونوں میں اضافہ کر سکتا ہے۔ 'زبان' نے 'معارف' کو اپنا ماڈل بنایا۔ اس کے بالواسطہ طور سے کئی اشارے ملتے ہیں۔ خود فہرست مضامین میں مشتملات کو جس طرح سے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاتا تھا اس سے، اور پھر 'ترجمات' یا 'اخبار علمیہ' سے اور رسائل و کتب پر تبصرں سے بھی اس ماڈل کی طرف دھیان جاتا تھا۔ ایڈیٹر کے بنیادی طور سے ایک ادیب اور شاعر ہونے کے باعث نظمیں، غزلیں اور افسانے جس تناسب سے اس میں شامل رہتے تھے وہ البتہ 'معارف' کی روش سے ہٹی ہوئی چیز تھی۔ اس طرح یہ اپنی طرز کا ایک الگ پرچہ تھا جس میں، جیسا کہ اس کے سرورق پر لکھا رہتا تھا، علمی اور ادبی دونوں اقسام کی تحریریں شامل رہتی تھیں۔

نظموں / غزلوں کے بارے میں تو ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن افسانوں کے بارے میں گجرات کے حوالے سے بھی، اور اس صنف کے عمومی ارتقا کے ذیل میں بھی 'زبان' میں چھپے ہوئے افسانوں (ناولٹوں) کی تاریخ ساز نوعیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس ذیل میں ایک قلمی نام والے مصنف 'بالم' کا طویل افسانہ یا ناولٹ "شہید تغافل" خصوصاً قابل ذکر ہے جو کئی قسطوں میں مکمل ہوا۔ ہمارے استفسار پر خوشتر صاحب نے بتایا کہ افسانہ نویسی کے لیے یہ انھیں کا قلمی نام تھا۔

یہ ناولٹ یا اسی طرح کا ایک آدھ افسانہ، ایسے یا انشائیہ شامل اشاعت رہنے کے باوجود ایڈیٹر 'زبان' کو 'معارف' کا ہمرنگ قرار دیتے ہوئے یہ شکایت کرتے رہے کہ عوام 'معارف کے ہمرنگ' کسی رسالے کو نہیں چاہتے (اداریہ ۶۴/۷) ادبی رسائل کی کساد بازاری کا رونا دوسرے ہمعصر مثلاً حکیم یوسف حسن بھی روتے رہے (۸/۱۴)۔ 'زبان' نے ایک سال پورا کر کے ۱۳۴ خریدار پیدا کر لیے تھے (۷/۲۲)۔ ادبی علمی پرچوں کے لیے خرید کر پڑھنے والوں کی خوش اعتقادی کا یہ تناسب ۱۹۸۶ء میں بھی قائم ہے الّا ماشاء اللہ!

'زبان' کی ایک دلچسپ تجویز جو ساٹھ سال قبل شائع ہونے کے باوجود آج بھی آج کی سی چیز لگتی ہے وہ ایک مضمون " فضول اور بیہودہ لٹریچر کی اشاعت " ہے جس میں کہا گیا ہے ایک "دارالانتقاد" قائم کر کے ایسے لٹریچر کی اشاعت روک جائے یا انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین اور انجمن اردوئے معلّٰی علیگڑھ مل کر یہ کام کریں، اور ان کی سند کے بعد ہی کتاب شائع ہو سکے (۳/۶۹)

○

'زبان' کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے گجرات / کاٹھیاواڑ کے لکھنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ علم و ادب کے میدان میں

روشناس کرایا، ان میں کچھ جو پہلے سے روشناس تھے ان سے خصوصی تحریریں حاصل کیں (بڑودہ کے سید نواب علی، جوناگڑھ کے احمد میاں اختر، راج کوٹ کے میمن عبدالعزیز)۔ کاٹھیاواڑ / گجرات کے ایک درجن کے قریب شعرا و ادبا آج زبان ہی کے ذریعہ تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔ (غلام علی کامل، محمد عمر عباس، اکبر علی، صدیق مسلم، سلطان میاں سید عبداللہ، محمد صدیقی، حکیم سید فضل علی شفا، محمد حسن ترمذی، محمد علی ترمذی، محمد اسماعیل ابراہانی وغیرہ اور خود خوشتر منگرولی)۔

اہم بات یہ ہے کہ ایڈیٹر نے توازن برقرار رکھا اور بیرون کاٹھیاواڑ کے لکھنے والے بھی اس میں معقول تناسب کے ساتھ شریک رہے۔ اُس وقت کے کئی نئے نام عشرت رحمانی المحبوبی رامپوری (جو بعد میں عشرت رحمانی کے نام سے جانے گئے)، عرشی نعمانی رامپوری (جو بعد میں امتیاز علی عرشی کے نام سے غالبیات میں سند کا درجہ مانے گئے)، بھوپال کے ملّا رموزی، احمد آباد میں مقیم ابوظفر ندوی، حیدرآباد کے رباعی گو احمد حسین امجدؔ، شاعر شوکت تھانوی، افسانہ نگار قیسی رامپوری، یہ سب بعد میں بڑے نام بنے۔ دوسری جگہوں کی ترجمانی بھی خاصی تھی مگر شاید منگرول کے خود ریاست ہونے کے سبب دوسری دیسی ریاستوں کے لکھنے والے بھی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں: خیرپور، حیدرآباد، بھوپال، رامپور، ٹونک، یہ پورا درخود منگرول پرچے پر چھائے رہے۔ تاہم معیار سے کہیں سمجھوتا نہیں کیا گیا ہے۔

••

فہرست مضامین

فہرست مضامین

نفیس

خوشتر منگرولی

۱۹۲۶ء میں

ایڈیٹر "زمان" کی حیثیت سے

رجسٹرڈ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد وجدت مجال القول اسعۃ
فان وجدت لسانا قائلا فقل
(اعشی)

زبان

کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

مرتبہ

عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی)

سالانہ (چار روپیہ) للعہ

ششماہی (دو روپیہ ۸ آنہ)

(نمونہ ۶/)

زبان

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

جلد ۱ — نمبر ۱

صفحۂ ادارت

خلاق عالم نے جس ماہ میں (روز عاشورہ) عالم کون وفساد کو آفرینش کیا ہے، ہمارا رسالہ بھی اسی ماہ سے عالم وجود میں آتا ہے، اس لئے امید ہے کہ آغاز ۱۳۴۵ھ کے ساتھ ساتھ اگر تا قیامت نہیں تو کم از کم میری زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے بھی بھلے بُرے دن ضرور گذاردیگا بلکہ جب تک زبان دہن میں اور دل پہلو میں ہے یہ "زبان" جسم میں جان کی طرح میری حیات کا ایک جزو لاینفک ہو کر رہیگا۔

پندرہ بیس سال سے زاید عرصہ ہوا کہ ریاست جوناگڈھ نے ایک محکمہ تاریخ قایم کیا تھا جس میں چند لایق اہل قلم جوناگڈھ کی تاریخ کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے۔ ان اصحاب میں سے جناب منشی غلام محمد صاحب مرحوم (ساکن اولپاڈ گجرات) اعلیٰ تاریخی مذاق رکھنے والے اور مستثنیٰ قابلیت کے بزرگ وار تھے، جنھوں نے آج سے بارہ سال قبل داعی اجل کو لبیک کہا اپنی عین حیات میں ریاست جوناگڈھ کی ایک ضخیم تاریخ بنام "مرآۃ مصطفیٰ آباد"[۱] مرتب کر چکے تھے جو ان کی وفات کے زمانہ سے لیکر اب تک غیر مطبوع حالت میں پڑی ہوئی تھی کتاب مذکور ملک سورٹھ کی مستند تاریخ ہے جس کے ضمن میں کاٹھیاواڑ کی تاریخ وجغرافیہ سے متعلق نادر تحقیقات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ مرحوم کے خلف الرشید شیخ غلام احمد صاحب (پرنسپل وکٹوریہ جوبلی مدرسہ پوربندر) کی تحریک سے ریاست جوناگڈھ نے اپنے خرچ سے اس کتاب کی اشاعت منظور فرمائی ہے جو بمبئی میں اعلیٰ پیمانہ پر باتصویر چھپ رہی ہے اور عنقریب حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر نکلے گی۔

آجکل بعض دیسی ریاستیں ملک وقوم کی جو قابل تقلید خدمات انجام دے رہی ہیں اس بنا پر ہمیں ریاست جوناگڈھ سے جو ایک زبردست اسلامی ریاست ہے بہت کچھ توقعات رکھنی چاہیئے، اگر وہ سردست اپنے دفاتر کی زبان اردو

---

[۱] اس کے علاوہ مرآۃ محمدی (اردو) (۲) تاریخ گجرات (انگریزی) اور مرآۃ عالمگیری (گجراتی) چھپ چکی ہیں جو مولوی غلام رسول اینا سورتی۔ بھنڈی بازار بمبئی یا ہلالی پریس ڈونگرے بمبئی سے مل سکتی ہے۔

ہیں کر سکتی تو کم از ایک دار التراجم یا دار التصانیف ہی کی بنیاد ڈال دے جس میں غیر زبانوں کی بہترین اور نادر تصانیف اردو میں ترجمہ کی جائیں اور ایسی کار آمد کتابیں چھپوائی جائیں جس سے ملک وقوم کو فائدہ ہو۔

یقین ہے کہ شہریار سورتھ عالی جناب نواب مہابت خانجی صاحب بہادر جہاں اور صدہا کاموں میں اپنی فیاضی و دریا دلی کا ثبوت دے رہے ہیں وہاں ہماری اس درخواست پر بھی توجہ فرمائیں گے۔ ساتھ ہی عالیجناب شیخ محمد بہائی صاحب وزیر ریاست سے بھی جو ایک پابند صوم و صلوٰۃ پکے مسلمان ہیں توقع ہے کہ وہ بھی ایسے کارہائے نمایاں سے اپنی علم پروری اور ملکی و قومی ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔

ہماری غفلت اور خود فراموشی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنے ہاں کے کسی جوہر قابل کی قدر و قیمت سے اس وقت تک بیخبر رہتے ہیں جب تک "باہر والے" اس کے نتائج دل و دماغ سے ہمیں آگاہ نہ کریں۔

کاٹھیاواڑ کے صدر مقام راجکوٹ کی خاک نے ایک ایسا باکمال عربی علم و ادب کا عالم پیدا کیا ہے جو اپنی ادبی تحقیقات کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ کے معدودے چند افراد میں شمار ہو سکتا ہے۔ ہماری مراد اپنے محترم جناب مولانا مولوی میمن عبد العزیز صاحب سے ہے جو آجکل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں عربی کے پروفیسر ہیں۔

ہمارے اس لائق "عزیز کاٹھیاواڑ" کا چرچا مصر کے بازار علم میں ہو رہا ہے چنانچہ وقتاً فوقتاً مصر کا مشہور علمی رسالہ الزہرا ان کے مقالات شائع کرتا اور ان کے نتائج افکار سے ہمیں مطلع کرتا رہتا ہے۔

رمضان کے مجلہ الزاہرا میں ایڈیٹر صاحب محب الدین خطیب اطلاع دیتے ہیں کہ مولانائے موصوف کی مندرجہ ذیل کتابیں ان کے مطبع سلفیہ میں زیر طبع ہیں۔

(۱) ابوالعلاء و ما الیہ (ابوالعلاء المعری کے تنقیدی سوانح)

(۲) الغایت (معری کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو اس کے دواوین میں نہیں پایا جاتا)

(۳) زیادات شعر المتنبی (متنبی کا غیر مطبوعہ کلام)

کتب ذیل ان کی تصحیح کے ساتھ چھپ رہی ہیں:۔

(۱) رسالہ "کلا" لابن فارس

(۲) ما تلحن فیہ العوام للکسائی

(۳) رسالہ ابن العربی الی الامام فخر الدین رازی

ہم علامہ موصوف کو ان کی ان ادبی فتوحات پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے بحیثیت ہموطن ہونے کے ان سے یہ استدعا کرنے کا پورا استحقاق رکھتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنی علمی معلومات سے اپنے ہموطنوں کو بھی مستفید فرماتے رہیں تاکہ "تردیکان بے بصر دور" کی طرح ان کے نتائج طبع سے محروم نہ رہیں۔

دوسری قابل فخر ہستی جس کو کوہ گرنار کی پرانقلاب تلہٹی نے پیدا کرکے عظمت کوہ سے بھی بلند آسمان علم و کمال پر مثل کوکب چمکا یا وہ ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر (جوناگڑہی) ہیں جو دنیائے ادب میں خاصی شہرت رکھتے ہیں اور جن کے نتائج افکار سے ہندوستان کے نامی اور چوٹی کے رسائل مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

آپ صاعد اندلسی کی کتاب "طبقات الامم" کا اردو میں ترجمہ کررہے تھے جو اب تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور عنقریب مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ کے سلسلہ تصانیف میں شائع ہوگا آپ کو اس ترجمہ میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کتاب میں جا بجا نہایت مفید اور پراز معلومات ذیلی حواشی بھی دئیے ہیں جن کے لئے ان کو متعدد مستند عربی کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے، اس ترجمہ کو اردو کے خزانہ میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھنا چاہئے۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم قاضی صاحب موصوف کی ان مساعی جمیلہ کا اعتراف نہ کریں جو انہوں نے ترتیب زبان کے متعلق معقول مشورہ اور مضامین کی فراہمی وغیرہ میں کی ہیں ترجمات اور اخبار علمیہ کے عنوانات آپ نے اپنے لئے مخصوص کرلئے ہیں اور بلا ناغہ ہر ماہ مستقل طور پر اس پر لکھنے کا بھی وعدہ فرمایا ہے یا یوں سمجھئے کہ جو کام ہمارا تھا اس کا ذمہ لیکر ہمیں ایک زبردست ذمہ داری سے سبکدوش کردیا ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں منگرول کی دو زبردست خاموش ہستیوں کا ذکر بھی کردیا جائے ان میں سے ایک ہمارے استاذی مولانا مولوی حکیم سید محمد حسن صاحب ترمذی ہیں جن کے علمی و ادبی مضامین آج سے دس بارہ سال پیشتر طبی رسائل میں نکلتے رہتے تھے، نیز عربی کا ایک قلمی نسخہ اسباغ ازایا (حصہ اول) جو کیمیاوی مجربات و معالجات پر مشتمل ہے عرصہ ہوا پبلک کے فائدہ کے لئے اردو میں ترجمہ کرکے چھپوادیا ہے۔

آپ عربی و فارسی علم و ادب کے جید عالم ہیں عرصہ سے مضامین لکھنا چھوڑ دیا ہے تاہم "زبان" کے لئے مضمون عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے جس کے لئے ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں۔

دوسری ہستی جناب سید محمد علی صاحب ترمذی پروفیسر بہار الدین کالج جوناگڈھ کی ہے جن میں مبدء فیاض نے استدلال و تحقیق کی اعلیٰ قابلیت ودیعت فرمائی ہے عربی فارسی میں بھی کامل دستگاہ ہے باوصف اس کے اب تک خاموش اور علمی دنیا سے الگ ہیں لیکن یقین ہے کہ وہ "زبان" کے لئے "قفل خموشی" توڑ دیں گے اور علمی دنیا کو اپنی وسیع معلومات سے مستفیض فرمائیں گے۔

رسالہ مرتب ہو کر مطبع میں جا رہا تھا کہ ہمنے یہ نوید روح پرور سُنی کہ ہمارے اور "زبان" کے سب سے بڑے محسن و معاون جوان بخت و فیض رساں عالیجناب نواب محمد سرور علیخاں صاحب بہادر والیٔ ریاست کوروائی (سنٹرل انڈیا) کی شادی کتخدائی دار الاقبال بھوپال کے موجودہ نوجوان فرمانروا ابد اقبال نواب محمد حمید اللہ خانصاحب دام اقبالہ کی بڑی صاحبزادی صاحبہ سے بغیر کسی دھوم دھام کے حسب شرع شریف ہو گئی۔

ہمارے مسلمان رؤسا عموماً ایسی تقاریب کے موقعوں پر ناچ گانے اور فضول رسومات کی ادائیگی میں کروڑوں روپئے برباد کر کے مقروض ہو جاتے ہیں انہیں اس کی تقلید کرنی چاہئے۔

اب ہم اپنے کرم گستر و کرمفرما نواب صاحب بہادر کی خدمت میں (دوہری) دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ خدائے "حسن و عشق" اس "پیکر محبت و مجسمہ اخلاص" کو حیات جاوید عطا فرمائے اور ان میں باہمی محبت و اخلاص رہے۔ آمین!

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

یہ بھی ہمارے رسالہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا پہلا ہی نمبر اس تقریب سعید کی یادگار میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر دنیائے صحافت میں رونما ہوتا ہے۔

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

زبان

ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

افتتاحیہ

زلافِ حمد و نعت اولیٰ ست بر خاکِ ادب خفتن

سجودِ میتواں کردن درودِ میتواں کردن

الحمد للہ کہ برسوں سے جو "خیالی معشوق" صرف دل و دماغ کے لئے، وجہ نشاط بنا ہوا تھا آج "کاغذی پیکر" میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر نہ صرف باصرہ نوازہی ہو رہا ہے بلکہ اپنی "حیات عملی" کا ثبوت بھی دے رہا ہے اگرچہ اس کی "جلوہ گاہ" ایک پُر شور مقام پر واقع ہوئی ہے لیکن اس کی یہ شوریت "نمک پاش" نہیں، بلکہ "حسن" کو "حسن ملیح" بنانے والی ہے۔

آج رسالہ "زبان" کا اجرا، جہاں سے عمل میں آرہا ہے یہ وہ مقام ہے جس کو حضرت داغ دہلوی، حضرت جلال لکھنوی حضرت تسلیم لکھنوی اور حضرت شمشاد لکھنوی فرنگی محلی وغیرہما ایسی مستند، اہل زبان، اور فخر روزگار ہستیوں نے اور دیگر نامی نامی فضلاء و کملاء نے گاہ گاہ اپنے قدوم فیض لزوم سے رشک گلزار بنایا

اور جن سے ایک عرصہ تک اہل منگرول مستفیض ہوتے رہے ہیں، اس لحاظ سے یہاں سے اُردو کے ایک ماہوار رسالہ کا اجرا کسی طرح بھی غیر موزوں نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ع

"آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"

لیکن اب بھی یہاں ایک ایسی ہستی ہے جو کاٹھیاواڑ میں مغتنمات میں سے ہے اور جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور وہ ہمارے تاجدار منگرول عالی جناب نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب دام اقبالہ ہیں جن کو نہ صرف اُردو اور اس کے ادب سے گہری دلچسپی ہے بلکہ اُردو کے سچے حامی و معاون ہیں اسی طرح آپ کے خلف اکبر عالی جناب شیخ عبدالخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست منگرول کو بھی اُردو سے ایک گونہ عشق ہے بدیں سبب یہاں نسبتاً اُردو کا زیادہ چرچا ہے تاہم ایک "زبان" کے اُردو رسالہ کو کسی ایسے مقام سے شائع ہونا چاہئے تھا جو حقیقتاً "زبان اردو کا" مرکز و مسکن ہے۔ یا اس کا اجرا وہیں سے مناسب ہو سکتا تھا جہاں سے اس (زبان اُردو) نے "اردوے معلیٰ" اور "اُردوئے مطلا" کے واجبی و حقیقی خطابات حاصل کئے اسی طرح عنان ادارت بھی انہیں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی جو "اہل زبان و زباندان" ہونے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

برخلاف اس کے میں کاٹھیاواڑی نژاد ہوں اور زبان ایک ایسے گوشے سے اپنی آواز بلند کر رہی ہے جہاں "یقینی یاس" ہے کہ اس کا "ہمنوا" اور "ہمزبان" اور اس کی صدا پر "لبیک" کہنے والا ایک بھی نہ نکلے گا۔ مقام (کاٹھیاواڑ) کی غیر موزونیت اور زمین کی شوریت کے علاوہ "اُردو سے بیگانہ وشی" اور "فقدان مذاق" یہ دو ایسی چیزیں ہیں کہ زبان تو کیا کسی ہونہار رسالہ کو کبھی پھولنے پھلنے اور پروان چڑھنے نہ دیں۔

جہاں اس قسم کے سیکڑوں ہلاکت آفریں اسباب اس کی زندگی خطرے میں ڈالنے والے ہیں وہاں ایک زبردست سبب یہ بھی ہے کہ یہاں عوام کی زبان گجراتی اور بعض مسلمانوں کی "گجراتی آمیز اُردو" ہے، غالباً یہ کہنا غیر صحیح نہ ہوگا کہ یہاں اُردو اور اس کے لٹریچر سے کسی کو (باستثنائے چند) مس تک نہیں ہے۔

"ہر قوم کے حالات و خیالات طرز تمدن و معاشرت کا آئینہ یا مکمل تاریخ اس کی زبان کا لٹریچر سمجھا جاتا ہے" دُنیا کے کسی خطہ میں کوئی ایسی متمدن قوم نہیں ہے جس کو اپنی مذہبی، علمی، اور تاریخی روایات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے کلیتہً "زبان غیر" کا محتاج ہونا پڑتا ہو، لیکن ہم اہل کاٹھیاواڑ اس کی "زندہ مثال" موجود ہیں جو نہ صرف اپنے مذہب و تاریخ ہی سے کما حقہٗ واقف نہیں بلکہ اپنی مادری زبان (اُردو) سے بھی ناآشنائے محض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں کی ملکی دفتری اور تجارتی زبان گجراتی ہے اور اس کی تعلیم بچوں کے لئے ، ازبس ضروری ہے لیکن اُردو اسقدر بھی غیرضروری نہیں ہے جسقدر سمجھی جاتی ہے بلکہ اب تو اس فقدان علم (فارسی عربی) کے زمانہ میں ہر مسلمان کو اُردو کا جاننا نہایت ضروری اور فرض ہے کیونکہ ہمارے اسلاف کے بیشتر علمی کارنامہ اُردو میں منتقل ہوگئے ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں کسقدر افسوس ہے کہ ہم اُردو اور دینی تعلیم کو صرف اُنہیں لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں جن کا خاندان مولوی قاضی ، اور ملا ہوتا ہے اور جو وعظ و قضارت یا امامت کرکے یا مکتب قایم کرکے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔

اوّل تو یہاں کے مدارس کی اُردو تعلیم ہی ایسی ضعیف و ناکارہ ہوتی ہے کہ طلبا مدرسہ چھوڑتے وقت اس کو بھی وہیں چھوڑ جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے کسی بچہ کا اُردو کی طرف فطری میلان ہوتا ہے اور وہ اُس کو شوق سے پڑھتا ہے تو اکثر والدین یہ کہہ کرکہ "کیا اُردو پڑھ کر ملا[1] بنتا ہے" بلکہ ملاجی (اُستاد) سے بھی یہ کہہ کرکہ ہمارے بچہ کو اُردو پڑھا پڑھا کر کیا اپنی طرح ملا بناؤ گے اور کھانے کمانے کے قابل نہ رہو گے" بچہ کو اُردو پڑھنے پڑھانے کی جانب سے بددل کردیتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر کسی کی زبان سے دانستہ یا اتفاقیہ کوئی صحیح لفظ ادا ہو جاتا ہے تو "بڑا ہندوستانی ہوگیا ہے" یا "ہندوستان اسی (آداب گفتگو) ہیں کہو یا" وغیرہ وغیرہ طعن آمیز فقروں سے اس کو شرمندہ بلکہ آیندہ اُردو بولنے سے مانع آتے ہیں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں کا یہ ماحول اور یہ "بدمذاقی" ہے وہاں کب اور کس طرح اُردو اور تہذیب کو فروغ حاصل ہوگا؟

اُردو سے اسقدر بیگانہ وشی دیکھتے ہوئے اور ان تمام مایوس کن اسباب کے باوجود میں اسی پُرسوز اور "پتھریلی" سرزمین سے ایک اُردو رسالہ کو معرض وجود میں لارہا ہوں کن اسباب کی بنا پر؟ محض اپنے بعض کرمفرما احباب کی حوصلہ افزا امراعات کی امید پر اور ابنائے ملک کی قدردانی کے بھروسے پر! اگر ابنائے ملک نے میری اس "ادنیٰ سعی" کی حوصلہ افزا داد دی تو انشاءاللہ بہت جلد میں اپنے ان عزایم میں جن کا ذکر آگے آئیگا کامیاب ہوجاؤنگا اور "ہجوم ناامیدی" میری اس "سعی لاحاصل" کی لذت کو خاک میں نہ ملا سکیگی!

---

[1] ملا کے معنی نہایت حقیر سلئے جاتے ہیں حالانکہ ملا بننا کارے دارد ہے۔ ۱۲ (اڈیٹر)

باشندگانِ جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ اقتصادی و مالی حیثیت سے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر گئے ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تہذیب و تمدن میں علی الخصوص علم و فضل میں تو سب سے پیچھے ہیں۔

نمبر۱ کاٹھیاواڑ کا کل رقبہ زمین ۲۰۷۷۹ مربع میل ہے

نمبر۲ کاٹھیاواڑ کی کل آبادی (ہندو مسلمان اور جین وغیرہ) / ۲۵،۳۸،۴۹۷

نمبر۳ کاٹھیاواڑ میں مسلمانوں (ذکور) کی آبادی / ۱،۲۱،۱۰۲

نمبر۴ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان (ذکور) / ۱۴۰۱۰، ۴۵ اور (اناث) / ۳۶۸۲

نمبر۵ انگریزی داں (ذکور) / ۱۹۳۱ اور (اناث) صرف ۵۹

نمبر۶ غیر تعلیمیافتہ ذکور / ۷۷۰، ۱۹،۱ - اور اناث / ۱۶۷۸۰

نمبر۷ اور گجراتی بولنے والے / ۲۳۹۲۷۹۴ ہیں

یہی وجہ ہے کہ یہاں سے گجراتی زبان میں اخبارات و رسائل بکثرت شائع ہوتے ہیں اور اردو کا ایک بھی رسالہ یا اخبار نہیں نکلتا۔

ان حالات کے ماتحت میں برسوں سے اس ضرورت کو محسوس کرتا تھا کہ کاٹھیاواڑ سے کسی ایسے اردو اخبار یا رسالہ کا اجرا کیا جائے جو ہمارے خیالات و جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے والا ہو اور جس کا واحد مقصد ملک میں محض اردو کا مذاق عام کرنا اور صحیح اردو کو رواج دینا ہو اور جو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں ملک کو خواب غفلت سے بیدار کرے قومی ضروریات سے آگاہ اور مذہبی احکامات سے خبردار کرے اور جو تاریخی روایات سے واقف اور تمدنی و اقتصادی نقائص کی طرف توجہ دلائے لیکن یا تو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا ابھی تک وقت نہیں آیا تھا یا کوئی صورت نہیں نکلتی تھی بہرکیف اب جبکہ اسکا وقت آ گیا بجائے اس کے کہ مجھے خوش ہونا چاہئے میں اپنے تئیں "ملول و غمگین" پاتا ہوں! کیونکہ جو مطمح نظر میرا ہے وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے چنانچہ

نمبر ۱ Kathiawar Directory part IV vol. I P. 96.

نمبر ۲ Census of India 1921 vol. VIII part II P. 4.

نمبر ۳ " " " " " P. 16 " "

نمبر ۴ و ۵ و ۶ " " " " " P. 113 " "

نمبر ۷ " " " " " P. 126 " "

"اشاعت اُردو" کی غرض سے طلبہ اور ایسے متوسط الحال طبقہ کے افراد میں جن کو اردو سے دلچسپی ہے رسالہ کی مفت کاپیاں تقسیم کی جائیں، چھوٹے چھوٹے اخلاقی اور سبق آموز فسانے اور مذہبی رسالہ پمفلٹ کی صورت میں عام طور پر مفت تقسیم کر کے ملک میں اُردو کا مذاق عام کرنے کی کوشش کی جائے اس میں سے ایک خدمت بھی میں تنہا نہیں ادا کر سکتا۔

اس کے لئے ایک مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے اور اگر ملک کے چند سربرآوردہ افراد اس طرف توجہ مبذول فرمائیں تو کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے صرف پانچ چھ ہزار روپے سالانہ کافی ہو سکتے ہیں۔

اس لئے ملک کے ان سربرآوردہ حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ ابنائے ملک کی بہبودی کی خاطر اس طرف ضرور توجہ فرمائیں اور اردو تعلیم کے لئے بھی نہایت شد و مد سے سعی اور ایک مشترکہ سرمایہ سے غربا کو مفت اُردو تعلیم دلانے کا شعبہ قائم کریں اور اسی سرمایہ سے اُردو کی اشاعت بھی کی جائے۔

بحالت موجودہ جبکہ میں اپنے قلیل ذاتی سرمایہ سے بلا کسی خیال منفعت کے اسکا محرک ہوا ہوں اگر "زبان" میں اغراض بالا کی تخصیص و رعایت کو مدنظر رکھوں تو رسالہ کی زندگی معلوم۔ اول تو ملک میں اتنے اُردو پڑھنے والے ہی نہیں ہیں کہ رسالہ ان کی خریداری سے اپنے بار کا آپ متحمل ہو سکے اور اگر کچھ ہیں بھی تو ان میں بیشتر مفلوک الحال اور ایسے غریب ہیں کہ اپنی قلیل آمدنی سے رسالہ کو نہیں خرید سکتے ان حالات کی بنا پر مجھے اپنے رسالہ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔

زبان اہل کاٹھیاواڑ ہی کے لئے محدود نہیں اس سے وہ تمام اُردو داں حضرات خواہ مشرقی ہند کے ہوں یا جنوبی ہند کے بے دریغ متمتع ہو سکتے ہیں ہاں کاٹھیاواڑی نژاد ہونے کے لحاظ سے گاہے گاہے وطن کی خدمات سے اغماض نہ کرونگا۔

دستور عام کے مطابق ہر اڈیٹر اپنے رسالہ کے پہلے نمبر میں افتتاحیہ مضمون کے ذیل میں رسالہ کے اغراض و مقاصد کی تشریح کر دینا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے لہٰذا میں بھی اس "بدعت حسنہ" کا ادا کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

اکثر رسائل اپنے افتتاحیہ میں لمبے چوڑے دعاوی لیکر عالم وجود میں آتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طفلانہ اداؤں سے لبھانے کی سعی کرتے ہیں مگر زبان اس قسم کی خوشامدوں سے بے نیاز ہے اور ہمیشہ

بے نیاز رہے گا۔

" زبان کی خدمات کی ذمہ داری کا بار لیکر آیا ہے وہ اس کے آیندہ اوراق خود بتا دیں گے زبان کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ کوشش کریگا کہ ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں اسکا شمار ہو۔ہیں اگر زبان کو عامیانہ خیالات کی جولانگاہ بنانا نہیں چاہتا تو اپنے بعض کرمفرما احباب کے مشورہ کے مطابق خالص علمی (جس میں ادبیات کی چاشنی نام کو نہو) بنا کر بالکل خشک اور ٹھوس بھی بنانا نہیں چاہتا البتہ ایسے ادبی مضامین سے جن میں صرف پرشکوہ اور شاندار الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں اور جو معانی و مطالب سے معرا ہوتے ہیں اور جن میں غلط اور غیر مانوس ترکیبیں، لایعنی جملے، اور عریاں خیالات ہوتے ہیں زبان کو آلودہ نہ ہونے دونگا مگر اس کو" قبول عام" کا شرف دینے کے لئے ان تمام دلچسپیوں کا خیال رکھا جائیگا جس کا جواز اہل نقاب اہل علم نے دے رکھا ہے اس میں (۱) مقالات (۲) مترجمات (۳) ادبیات (۴) اخبار علمیہ اور (۵) تنقید و تبصر کے مستقل عنوانات ہوا کریں گے جن کی ضمن میں (۱) علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کے مضامین ہوں گے۔ (۲) عربی انگریزی اور گجراتی کے اعلیٰ خیالات اردو میں منتقل کئے جائیں گے (۳) بہترین شاعرانہ خیالات "شعر منثور" اور مختصر اخلاقی و سبق آموز فسانے۔ اور اخلاقی و نیچرل نظمیں اور تازہ غزلیات ہوا کریں گی (۴) جدید علمی خبریں ہونگی اور حیرت انگیز سائنس کے اختراعات سے آگاہ کیا جائیگا (۵) مطبوعات جدیدہ پر ناقدانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا جائیگا۔

ایڈیٹران

عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی)

ایڈیٹر رسالہ "زبان"

اعلان

جن حضرات کی خدمت میں رسالہ زبان نمونتاً حاضر ہوا ہے وہ اپنی آیندہ خریداری و عدم خریداری کی اطلاع دفتر زبان میں اگست کی ۱۰ تاریخ تک روانہ فرمادیں ورنہ دوسرا نمبر قیمتاً وی۔پی سے حاضر ہوگا جسکا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہے۔

(مینیجر)

مقالات

علم اور اسلام

از

پروفیسر موسیو رینان

(مترجمہ مولانا مولوی محمد اسمعیل صاحب اصلاحی اعظمگڈھی)

ذیل کا گرانبہا مضمون مع ایک مختصر نوٹ کے ہم کو اپنے کرمفرما دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی کی وساطت سے ملا ہے جس کو شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ قاضی صاحب موصوف حسب وعدہ بہت جلد اس کی دوسری شق بھی روانہ فرما کر مشکور فرمائنگے

(اڈیٹر

" فرانس کے مشہور فلسفی اور ماہر السنہ سامیہ موسیو رینان نے "اسلام اور علم" کے نام سے ایک لکچر پیرس کی سربون یونیورسٹی کے سامنے دیا تھا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ "اسلام اور علم دو متضاد چیزیں ہیں"۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسکا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا اور نہ اس کا جواب سوائے علامہ جمال الدین افغانی کے کسی نے دیا ہے۔ مصر کے ایک عالم یوسف علی ہندس نے رینان کے اس لکچر کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کے شروع میں رینان کی مختصر سوانح عمری اور آخر میں بعنوانے " الحدید یفلم بالحدید " اس کے ہم مذہب، ہمقوم، اور ہموطن موسیو مسمر کے جواب کا بھی ترجمہ کرکے شامل کر دیا ہے جو اس نے اصل فرانسیسی میں لکھا ہے۔ میری استدعا پر میرے دوست مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کا ترجمہ کرنا شروع

گیا تھا لیکن ابھی وہ رینان کے سوانح اور لکچرز کا ترجمہ کرنے پائے تھے کہ بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اپنے وطن تشریف لے گئے۔ اب میں موسیو مسمر کے جواب کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاءاللہ آیندہ کسی اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہوگا۔

اختر (جوناگڈہی)

پیدایش ۲۷ فروری ۱۸۲۳ء کو شہر ٹریجویر (Treguier) خاندان رینان میں ایک متوسط الحال والدین کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچہ کی عمر ابھی پانچ برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھہ گیا اور باپ نے ہنرییٹ نامی ایک شانزدہ سالہ بہن کے سوا کوئی چیز بطور میراث کے نہ چھوڑی۔

اسی بچہ کا نام ارنسٹ ہے جو آگے چلکر فرانس بلکہ یورپ کے معدودے چند مشاہیر علما میں شمار کیا گیا۔

تعلیم ارنسٹ کے لئے اکلیروس کے گرجا کے مدارس یتمی کے علاوہ جو اس کے شہر میں جاری تھے تعلیم کی کوئی صورت نہ تھی چنانچہ پندرہ سال کی عمر میں اس نے ٹریجویر (Treguier) کے تمام خیراتی مدارس کی تعلیم ختم کرلی جس کے بعد وہ کلیۃ القدیس نقولہ میں داخل ہو گیا یہاں رینان کو اشیا (کائنات) ان کی ماہیت اور ان کے علل و اسباب پر غور و فکر کرنیکا خیال پیدا ہوا اور اس نے کلمات سحر سے اسکی ابتدا کی جس کے ساتھہ ہمارے علما اور فلاسفہ کو قدیم عشق ہے۔

فلسفہ کی تحصیل ۱۸۴۴ء میں مدرسہ ایسی (Issy) میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے ریڈ اور مالبرانچ کا فلسفہ پڑہنا شروع کیا پھر حکمار جرمنی مثلاً ہیگل اکانٹ اور ہرڈر کے فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس زمانہ میں وہ اپنی بہن کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ:۔

"فلسفہ حقایق اشیا پر بحث و تجسس کے لئے انسانی قوتوں کو ابھارتا ہے لیکن ہیہ ابھی صرف نصف صدی سے مروج ہے اور میری تمام توجہ علوم ریاضیات پر مرکوز ہے"

لیکن ہمارے اس نوجوان فلسفی نے اپنے شکوک کا حل ریاضیات میں نہیں بلکہ علم اللغات میں پایا۔ اسلئے وہ سان سولبیس کالج میں داخل ہو گیا۔ جو علم الالسنہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مشہور ہے وہاں وہ ملل قدیمہ کی زبان یعنی عبرانی کی تحصیل میں مصروف ہو گیا اب رینان پوری ذہانت کے ساتھہ مذہبی کتب کی حقیقت اور ان کے اصول

پر غور و فکر کرنے لگا اور اس میں اسے علومِ الیقینات یعنی منطق اور ریاضیات سے بڑی مدد ملی اس نے دیکھا کہ سفر نامہ اشیار (Ecclesiastes) کا دوسرا حصہ نہ صرف اسلوب بیان اور زبان کے لحاظ سے بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی مختلف ہے اور سفرِ دانیال تو محض ایک قصہ گو کی حیثیت رکھتا ہے جو قدیم اور موضوع ہے۔

رینان کے نزدیک آسمانی کتب کا معیار صداقت یہ ہے کہ کسی آسمانی اور الہامی کتاب میں اگر ایک غلطی بھی تسلیم کرلی جائے تو اس کے پورے حصہ پر فاسد کا حکم لگایا جائیگا"

مذہب اور فلسفہ کا موازنہ

فلسفہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد سان سولبیس کالج میں رینان ہمیشہ مذہب اور فلسفہ پر بحث کیا کرتا اور دونوں کا آپس میں موازنہ بھی کرتا تھا اور اسی زمانہ میں اس نے ابو العلا معری فلسفی کے اس خیال کی تردید کی کہ:۔

کَمْ اُمَّۃٍ لَعِبَتْ بِھَا جُھَّالُھَا — فَتَنَطَّسَتْ مِنْ قَبْلُ فِی تَعْذِیْبِھَا

کتنی امتیں (مذاہب) ایسی ہیں کہ انکے جاہل (امتوں) نے ان کو بازیچہ بنایا! — اور پہلے ہی سے ان کے عذاب کی جستجو میں پڑ گئے

اَلْخَوْفُ یُلْجِئُھَا اِلٰی تَصْدِیْقِھَا — وَالْعَقْلُ یَحْمِلُھَا عَلٰی تَکْذِیْبِھَا

خوف ان (مذاہب) کی تصدیق پر مجبور کرتا ہے — اور عقل ان کی تکذیب پر آمادہ کرتی ہے

وجبلۃ الناسِ الفسادُ فظلّ من — یسمو بحکمتہ الی تھذیبھا

انسانوں کی سرشت ہی میں فساد ہے پس وہ شخص محفوظ ہے جو — اپنی عقلمندی سے (فطرت انسانی) کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوا

جب اس کے خیالات کی اشاعت ہونے لگی تو اسے اکلیروس (گرجا) والوں کے ہاتھوں مطمئن ہو کر مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا اس لئے وہ سان سولبیس کالج کو خیرباد کہہ کر اسانستس کالج میں آگیا۔ جہاں اسے آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے خیالات اشاعت کی امید تھی اس لئے کہ یہ مدرسہ اکلیرکیہ یعنی گرجا کا نہ تھا لیکن چونکہ یہ کالج سلسلۂ مدارس اکلیروس کی آخری کڑی تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اظہارِ خیالات میں اکلیروس کا بڑی حد تک پابند ہے لہذا یہاں بھی اسے پوری مسرت نصیب نہ ہوئی اس لئے وہ مذہبی زندگی

سے بالکل کنارہ کش ہوکر موسیو کروزیہ مدرسہ شبینہ (Night School) میں صدر مدرس
کے عہدہ پر معمور ہوگیا اور دن کا پورا وقت السنۂ سامیہ وغیرہ کی تحصیل میں صرف کیا کرتا۔

اجراجیہ فی الفلسفہ کی ڈگری حاصل کرنا

۱۸۴۷ء میں اس نے پیرس اکاڈمی سے سند فضیلت حاصل کی اور اسے
اپنی تالیف "تاریخ مقارنۃ اللغات السامیہ" کے صلہ میں اجراجیہ فی الفلسفہ
کی ڈگری ملی اور ۱۸۴۹ء میں فرانسیسی گورنمنٹ نے اسے اٹلی کی ایک
علمی مہم پر بھیجا۔ خدمت مفوضہ کی تکمیل کے بعد رینان واپس آکر پیرس کی
پبلک لائبریری میں ملازم ہوگیا اور اپنی بہن ہنریٹ کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔ پروفیسر رینان اکثر مسائل پر غور و فکر کیا
کرتا اور "رسالۃ العالمین" (Revue des deux mondes) اور اخبار الدنیا
([illegible]) میں اپنے مسلسل مضامین مذہبی تاریخی اور اخلاقی شائع کرتا رہا۔ ۱۸۵۲ء میں اس
نے اپنی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ شائع کی جس کے صلہ میں اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملی اور یورپ میں اسکی
شہرت کو چار چاند لگ گئے اسی وقت سے رینان کا شمار فرانس کے اکابر فلاسفہ میں ہونے لگا۔ ۱۸۵۷ء میں ماہر علوم
السنہ قواطرمیر (Quatremere) کا انتقال ہوا تو السنہ سامیہ کی پروفیسری کا عہدہ خالی
ہوا اس زمانہ میں فرانس بھر میں رینان کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا مگر فرانس کا کیتھولک
فرقہ رینان جیسے ملحد شخص کا ایک ایسے مذہبی عہدہ پر تقرر کسی طرح منظور نہیں کرسکتا تھا اور نہ کیا لیکن امپراطور فرانس
رینان کے رسالے اور مضامین پڑھ کر اس کی بے نظیر قابلیت سے واقف ہوگئے اور اسے فلسطین کی مہم آثار
قدیمہ پر بھیجنا چاہا۔ رینان نے بھی اس کو قبول کرلیا اور اپنی بہن ہنریٹ کو ساتھ لیکر روانہ ہوگیا یہ واقعہ ۱۸۶۰ء
کے موسم گرما کا ہے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء کو مقام ایشطا میں اس کی بہن کا انتقال ہوگیا۔ مس ہنریٹ کی موت نے
رینان سے ایک قوی الارادہ۔ نرم دل اور شفیق بہن چھین لی جو اس کے تمام اعمال زندگی میں بہترین معاون
اور اس کی مربی تھی۔ بہن کی مفارقت نے اسے اسقدر نڈھال اور حواس باختہ کردیا کہ رینان اس کا مرثیہ
بھی نہ لکھ سکا اور جہاز پر سوار ہوکر وطن روانہ ہوگیا۔ جہاز میں اس کی حالت نہایت خراب تھی اکثر شدت
تکلیف سے غشی اور بدحواسی طاری رہتی تھی۔ اگر سمندر کی فرحت زا ہوا اس کے قویٰ کو بحال اور تازہ کرکے
کسیقدر اس کا غم غلط نہ کردیتی تو قریب تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ فرانس پہنچنے پر وزیر تعلیمات نے
فرینچ کالج میں السنہ سامیہ کی پروفیسری کے عہدہ پر اسے فائز کردیا۔

السنہ سامیہ کی پروفیسری

رینان نے جو اپنا پہلا لکچر دیا اس میں اس نے تصریح کی کہ (حضرت) مسیح علیہ السلام خدا نہیں (ہیں) بلکہ وہ صرف ایک بے مثل السان تھے اس زلزلہ خیز آواز نے کیتھولک گرجاؤں میں تہلکہ ڈال دیا اور انہوں نے رائے عامہ (پبلک) کو اس کے خلاف ابھارا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ رینان کے لکچروں سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے چنانچہ اس کی زبان بندی کا حکم نافذ ہو گیا اور اس کے لکچر موقوف ہو گئے۔

۲ رجون ۱۸۶۴ء کو پروفیسر رینان نے پیرس کے اخبارات میں پڑھا کہ اسی السنہ سامیہ کے عہدۂ پروفیسری سے پیرس پبلک لائبریری کی سکرٹیری شپ کے عہدہ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے اس جدید عہدہ کو قبول نہ کیا اور اس کے بعد سے بطور ایک مصنف کے صرف اپنے قلم کو ذریعۂ معاش بنا کر آزادانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ فرانس کی علمی مجالس (سوسائیٹیوں) نے رینان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور ۱۸۷۹ء میں "المجمع العلمی الفرانساوی" نے اسے اپنا رکن منتخب کیا اور ساتھ ہی فرانس کالج کا نگراں بھی مقرر کیا اور اس کے علم و فضل کے اعتراف میں اسے ایک تمغہ دیا اور اس نے اپنی بقیہ عمر ایک ممتاز اور بلند پایہ محسن علم کی حیثیت سے بسر کی جو غربا اور مساکین اور حاجتمندوں کے ساتھ نہایت ہمدردی اور رحمدلی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو رہا تھا تو اس نے نہایت اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ کہا کہ:-

اس وقت میں اپنا فرض پورے طور پر ادا کر چکا ہوں اس لئے میری یہ موت مبارک اور مسعود موت ہے جبکہ یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو موت سے مفر نہیں ہے۔

(باقی دارد)

تبادلہ

جن معاصرین کرام کی خدمت میں زبان بطور تبادلہ حاضر ہوا ہے وہ براہ کرم اپنا اپنا رسالہ تبادلہ میں روانہ فرما کر مشکور فرمائیں۔

(مینیجر)

فن تعلیم

(از جناب محمد اسمعیل صاحب ایرانانی۔ بی اے جوناگڑھی)

"ذیل کا فلسفیانہ مضمون اگرچہ کاٹھیاواڑ کی ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک اُردو تقریر کا ملخص ہے لیکن ہم اس کے ذریعہ مقرر کو کاٹھیاواڑ کے ایک جدید انشا پرداز کی حیثیت سے علمی دنیا میں روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ صاحب مضمون ہمارے اس فخریہ دعوے کا ثبوت گاہ گاہ اپنی جنبش قلم سے دیتے رہیں گے"

ایڈیٹر

جاننا چاہئے کہ نفس انسان تین حالتوں میں عمل کرتا ہے۔ انسان کو یا تو کسی چیز کا مطلق علم حاصل ہو سکتا ہے یا خوشگوار یا ناگوار اثر سے رنج وراحت کا احساس ہوتا ہے یا وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے پس نفس انسان میں وہ جوہر یا قوت ہے جو معلوم کرتی، محسوس کرتی یا ارادہ کرتی ہے ان تین قوتوں کو تعلّم، احساس اور ارادت کہتے ہیں۔ **تعلّم** سے نفس کو کسی چیز کا ادراک حاصل ہوتا ہے **قوتِ احساس** وہ قوت ہے جس کے ذریعہ سے رنج وراحت اور کسی قسم کی اور کیفیات نفس پر طاری ہوتی ہیں۔ **قوت ارادہ**۔ اس قوت سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے ارادہ میں تحریک ہوتی ہے۔

یہ تینوں حالتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی رہتی ہیں۔ چھوٹے بچوں میں قوت ارادت کم اور قوت احساس زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر بچوں کے احساس کو تحریک دیکر تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہئے اس کے مختلف طریقے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں قوتوں کو تربیتِ نفس کہتے ہیں۔ اُن میں سے قوتِ تعلّم کا تعلق عقلی تعلیم کے ساتھ اور احساس وارادت کا تعلق اخلاقی تعلیم کے ساتھ ہے۔

قوت تعلّم چار بڑی قوتوں پر مشتمل ہے۔

(۱) **قوتِ مدرکہ**۔

(۲) **قوتِ حافظہ**
(۳) **قوتِ متخیلہ**
(۴) **قوت عقل یا فیصلہ**

(۱) **قوت مدرکہ** وہ قوت ہے جس میں حواس کے ذریعہ سے باہر کی چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ حواس پانچ ہیں۔ (۱) **باصرہ** (۲) **شامہ** (۳) **ذائقہ** (۴) **سامعہ** (۵) **لامسہ**۔ یہ پانچ علم کے دروازے ہیں اور ان کو تربیت دینے کے مختلف طریقے ہیں۔

قوت باصرہ اور لامسہ نہایت ہی ضروری قوتیں ہیں۔ ان کی ترقی کے لئے بچوں کو الگ الگ قسم کے رنگ دکھا کر ان میں تمیز کرانی چاہئے اور مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرا کے ان کی خاصیتوں کو معلوم کرانا چاہئے۔ مثلاً کسی چیز کا قد اس کی شکل، رنگ حرکت وغیرہ۔ جانتا چاہئے کہ **کنڈر گارٹن** اور **اسباق الاشیاء** جو بچوں کی تعلیم میں داخل ہیں ان سے دوسری قوتوں کے علاوہ بچوں کی **قوتِ مشاہدہ** اور **قوت لامسہ** کی ترقی مقصود ہے۔

(۲) **قوتِ حافظہ** وہ قوت ہے جو حاصل کئے ہوئے علم کو ذہن میں محفوظ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اسکو پیش کرتی ہے۔ یہ قوت نہایت ہی ضروری ہے۔ حافظہ کے بغیر ہم کسی علم میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں کے مدرس بہت سی باتیں طوطے کی طرح بچہ کو رٹا دیتے ہیں جس سے اکثر مرتبہ بچہ کا دماغ بہت کمزور ہو جاتا ہے البتہ بچہ کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سی باتیں لفظ بہ لفظ بھی یاد کرانی چاہئیں مثلاً حساب کے پہاڑے قواعد کی تعریفیں اخلاقی نصیحتیں وغیرہ۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں جہاں ممکن ہو بچہ کو یہ باتیں سمجھا دینی چاہئیں اور جہاں ممکن نہ ہو وہاں ان کو یہ کہدینا کافی ہے کہ "تم بڑے ہو گے تب اس بات کو سمجھ لوگے"۔ تاکہ بچہ کے دل پر یہ نقش جارہے کہ یہ بات میں نے فضول نہیں سیکھی یہ کام کی چیز ہے جس کی حقیقت مجھے آیندہ معلوم ہوگی۔

حافظہ کی ترقی کے لئے مضمون باترتیب اور سلسلہ وار بیان کرنا چاہئے۔ بار بار سوالات کے ذریعہ سے تمام باتیں دوہرا دوہرا کر بچوں کے ذہن نشین کرانی چاہئیں اور ان میں **توجہ** قایم رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور اس کے لئے مدرس کا طریقہ تعلیم دلچسپ اور برتاؤ ہمدردی والا ہونا چاہئے۔

(۳) **قوت متخیلہ** اس قوت کے ذریعہ سے نفس گذشتہ خیالات میں کمی بیشی کرکے اسی قسم کی یا بالکل

صورتیں اپنے ذہن میں پیدا کر لیتا ہے۔ تخیل کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) تخیل ترکیبی۔

(۲) تخیل اختراعی۔

تخیل ترکیبی وہ ہے جس کے ذریعہ سے جو چیزیں ہمنے دیکھی ہیں ان کا حافظہ کے ذریعہ سے تصور کرنا متعدد دیکھی ہوئی چیزوں پر سے ایسی صورتیں بنانا جن کا واقعی طور پر وجود بھی ہو۔ مثال کے طور پر ہمنے پہاڑ بھی دیکھا ہے اور آگ بھی دیکھی ہے لیکن ایسا پہاڑ نہیں دیکھا جس میں سے آگ نکلتی ہو جسکو کوہ آتش فشاں جوالامکھی کہتے ہیں۔ اب ہم پہاڑ اور آگ کو ساتھ ملا کر ایک جلتے ہوئے پہاڑ کا تصور تخیل ترکیبی کی مدد سے کر سکتے ہیں۔

تخیل اختراعی سے ہم کو سروکار نہیں ہے کیونکہ یہ شاعروں یا افسانہ نگاروں کے کام کی چیز ہے۔

بچوں کی قوت تخیل کا روز ان کے کھلونوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ گڑیا کو جاندار سمجھکر وہ اس کو کھلاتے ہیں پلاتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور تخیل کے رو سے طرح طرح کے لطف حاصل کرتے ہیں۔ لکڑی کا گھوڑا بناتے ہیں اور بڑے شہسوار بن کر اس کو دوڑاتے ہیں گھانس کھلاتے ہیں پانی پلاتے ہیں ان کو ان باتوں سے بڑی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اکثر والدین خود بھی کبھی بچے تھے اور ایسے کھیل کیا کرتے تھے ان کو فراموش کر کے وہ بچوں کی ان حرکتوں کو فضول اور لغو سمجھتے اور ان پر خفا ہوتے ہیں۔ اس سے بچوں کو بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ اور ان کا تخیل خراب ہوتا ہے اس لئے اُن کو کھیلنے دینا چاہئے اور طرح طرح کے کھلونے دلوانے چاہئیں یہ فضول خرچی نہ ہو گی۔ البتہ بچوں کے اکثر کھلونوں کی نگرانی کرنا ضروری ہے۔

(۴) قوت عقل یا فیصلہ اسی قوت کی بدولت ہم کو دوسرے حیوانات پر شرف حاصل ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے ہم کسی دو خیالوں کا مقابلہ کر کے ان کی نسبت اپنی رائے قایم کر سکتے ہیں اور نتیجے نکال سکتے ہیں اس میں دو قوتیں شامل ہیں۔

(۱) قوت اوّل خیالات کا مقابلہ کر کے حکم لگانا جس کو قوت فیصلہ کہتے ہیں۔

(۲) قوت دوم۔ استدلال۔ اس کے ذریعہ سے دو حکموں پر سے ہم ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ یہ عقل کی اعلیٰ قسم ہے اور اس کی تربیت بہت دیر سے ہوتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں اُن تمام باتوں کو مثالوں کے ساتھ بوضاحت بیان

نہیں کرسکتا کیونکہ طوالت کا خوف مانع آتا ہے اور اس کے لئے میرے پاس کافی وقت بھی نہیں ہے۔ لہذا ان باتوں کی نسبت جو مدرسین زیادہ جاننا چاہتے ہیں ان کو اس فن کی کتابیں پڑھنا چاہیئے۔

المختصر **قوتِ تعلّم** کے ماتحت چار قوتیں جو ہمنے بیان کی ہیں ان کا تعلق **عقلی تربیت** کے ساتھ ساتھ ہے اور **تاثر** اور **ارادت** کا تعلق **اخلاقی تعلیم** کے ساتھ ہے۔ مدرسین کے لئے ان **قویٰ** کی تربیت کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

نوائے دلگیر

(مولانا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

مرگئے ہم گل چراغِ داغ ہجراں ہوگیا
صبح سے پہلے ہی جل بجھنے کا ساماں ہوگیا

اے بہ حسرت دیکھنے والی دلِ برباد کی!
کچھ خبر ہے کب یہ اُجڑا کب یہ ویراں ہوگیا

اُف رے بیدردی، مرے زخمونکی حسرت دیکھکر
مسکرا کر بولی "اب خالی نمک داں ہوگیا"

تیرے پیکاں کی بدل دیں جذبِ دل نے خواہشیں
میرا دشمن بن کے آیا میرا مہماں ہوگیا

بن گیا وجہ ندامت تیرا خونِ بے کسی!
مرنے والے! خنجر قاتل پشیماں ہوگیا

بڑھ گئی غربت میں ناکامی سے ہمت اور بھی
بے سروسامانیوں میں خوب ساماں ہوگیا

اب نہ وہ نالہ نہ وہ شیون نہ وہ فریاد ہے
کیا اسیر غم ترا مانوسِ زنداں ہوگیا

دیکھ لی نازک کلائی کر چکیں بس آپ قتل
آپنے احساں کیا اور مجھ پہ احساں ہوگیا

آنیوالی! تو خالبتہ ہی آتی شام وصل
تیری بے رنگی سے پھیکا رنگِ احساں ہوگیا

آپکی زلفوں کو دیکھا میں نے سجادہ بدوش
آج سمجھا یہ مرا خواب پریشاں ہوگیا

میری چشم شوق میں سکتہ کا عالم دیکھ کر
اُن کی محفل کا ہر اک آئینہ حیراں ہوگیا

خامۂ قدرت نے لکھی جب کتاب زندگی
دردِ میرے صفحۂ ہستی کا عنواں ہوگیا

مدتوں دلگیر اس دل پہ مجھے آیا ہے رشک
جو کسی کی یاد میں دم بھر پریشاں ہوگیا

مترجمات

سلطان محمود (۸۶۳ھ ۱۴۵۹ء - ۹۱۷ھ ۱۵۱۱ء)

کی

وجہ تسمیہ بیگڑھ

مراۃ سکندری کے مصنف نے سلطان محمود کے لقب بیگڑھ سے ملقب ہونے کی دو وجہیں بیان کی ہیں :-

(۱) سلطان نے جوناگڈھ اور چانپانیر کے دونوں قلعے فتح کئے تھے اس لئے اس کو "بے گڑھ" ، (دو قلعوں والا) کہا گیا۔

(۲) گجرات میں بیگڑھ اس بیل کو کہتے ہیں جس کے سینگ کسی ہم آغوش ہونے والے آدمی کے کھلے ہوئے ہاتھوں سے مشابہ ہوتے ہیں، اور چونکہ محمود کی مونچھیں بھی اسی طرح کی تھیں اس لئے اسکو بیگڑھ کہا گیا۔

مصنف مذکور نے ان وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کن رائے نہیں ظاہر کی، اس نے صرف "واللہ اعلم بالصواب" پر اپنے قول کو ختم کر دیا ہے۔ یہاں ہم بعض دلائل اس بات کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آخری وجہ دراصل صحیح ہے، اور کہ وہ لفظ گجراتی (   ) ہے جس کے معنی اوپر کو اٹھے ہوئے سینگوں والے بیل کے ہیں۔ پہلی وجہ تسمیہ باوجود عام طور پر تسلیم کئے جانے کے ناقابل توجہ ہے۔

۱ - بولوگنا ([illegible]) کا یورمن سیاح وارتھما (Varthema) جو سنہ ۱۵۰۶ء میں سلطان محمود کے عہد حکومت میں گجرات میں آیا تھا، لکھتا ہے :-

سلطان کی مونچھیں اس قدر لمبی ہیں کہ وہ ان کو لے کر اپنے سر پر اس طرح

باندھ لیتا ہے جس طرح ایک عورت اپنا جوڑا باندھتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کی لمبی اور گھنی مونچھوں نے اس کی رعایا کو متعجب کر دیا، اور انھوں نے اپنے ہاں کے بیلوں کے سینگوں کی تشبیہ میں اس کو ویگڑو (वेगडो) یا بیگڑہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ جیسے اہل جرمنی نے "قیصری مونچھوں" کو۔

۲۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۶۱۷ء میں۔ یعنی مرآۃ سکندری کی تصنیف سے صرف ۱۰ سال قبل۔ احمد آباد میں تھا وہ اپنی تزک میں سرکھیج شریف اور سلطان محمود بیگڑہ کے مزار پر جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"بیگڑہ اہل گجرات کی زبان میں چڑھی ہوئی مونچھوں والے کو کہتے ہیں اور چونکہ سلطان محمود کی بھی اسی طرح کی مونچھیں تھیں لہٰذا لوگ اس کو بھی بیگڑہ کہتے ہیں۔"[۵۱]

یہاں اگرچہ جہانگیر نے اصل لفظ گجراتی (वेगडो) کا ذکر نہیں کیا جس سے لفظ "بیگرہ" بنا ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۶۱۷ء ایسے قریب العہد زمانہ میں لکھتے ہوئے جہانگیر اس دو قلعوں والے نظریہ سے قطعاً ناآشنا تھا کیونکہ اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

۳۔ جو لوگ گجراتی زبان سے واقف ہیں وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ پہلی وجہ تسمیہ میں دو قلعوں کی فتح کا جو نظریہ قائم کر لیا گیا ہے وہ کسقدر کمزور اور ضعیف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لقب اصل گجراتی زبان کے لحاظ سے (वेगडो) (بے گڈھو) ہوتا نہ بیگڑہ۔

گجراتی لٹریچر میں کہیں بھی پہلے معنوں میں بیگڑہ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔

لفظ (वेगडो) گجراتی زبان میں چڑھے ہوئے سینگوں والے بیل کے لئے اب بھی کاٹھیاواڑ کے کاشتکاروں میں مستعمل ہے۔ مسٹر اے۔ کے فاربس راس مالا[۵۲] کے ایک منظوم قصہ میں ایک بھیل کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام "ویگڑو" تھا۔ وہ شعر جس میں اس بھیل کے ذو معنی نام پر مذاق کیا گیا ہے صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ لفظ "ویگڑو" عام زبان میں انہی معنوں میں مستعمل تھا۔ اسی لفظ (वेगडो) کے مقابلہ میں بھیلو (भीलो) بولا جاتا ہے جس کے معنی بغیر سینگ کا بیل" ہیں۔ یہ لفظ بھی

---

۵۱ تزک جہانگیری

۵۲ دیکھو فصل دوم باب پنجم

۵۳ دیکھو راس مالا (گجراتی اڈیشن)، صفحہ ۶۱۳

گجراتی میں ان معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔[۱]
یہاں یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ لفظ "ویگڑو" فارسی میں آکر "بیکرہ" ہو گیا ہے۔
(رسالۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شعبہ بمبئی)

لفظ "مسیح" کی اصلیت

اصل میں یہ لفظ عبرانی میں "مشیح" سُریانی میں "مشیحو" اور کلدانی میں "مشیحا" ہے جو لفظ "مشح" سے مشتق ہوا اور جس کے معنی "مسح" کے ہیں۔ علامہ احمد فارس الشدیاق اپنی کتاب الجاسوس علی القاموس (صفحہ ۴۹) میں لکھتے ہیں کہ یہودیوں میں یہ دستور تھا کہ جب اُن میں کوئی بادشاہ بنایا جاتا تو احبار یہود اس کے جسم کو تیل ملا کرتے تھے۔ اس لئے جب کوئی "مسح" کیا جاتا تو وہ اس کو "مسیح الرب" کہتے تھے، جو اُن کے ہاں بادشاہ کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب اپنے انقراض مملکت کے بعد یہود مسیح (یعنی بادشاہ) کی آمد کے منتظر ہوتے جو اُن کو اس ذلت اور تباہی سے نجات دے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث برسالت ہوئے اور ان سے معجزات ظاہر ہوئے تو وہ ان پر ایمان لائے اور ان کو "مسیح ناجی" ماننے لگے۔ مگر انہوں نے جب آپ کو تارک الدنیا اور اُن کے فرشتوں کا ارضی نہیں بلکہ سماوی ہونا معلوم کیا تو کہنے لگے کہ آپ کا "مسح" الٰہی اور روحانی ہے مگر اس قول سے اُن لوگوں کی تشفی نہ ہوئی جو مجازی نہیں بلکہ حقیقی "دنیوی مسیح" کے منتظر تھے۔ چنانچہ اب تک یہود کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام دراصل مسیح نہ تھے۔ بادشاہ یا حاکم کو تیل ملنے کا رواج آج بھی حبش میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے سلاطین سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اب تک توراۃ کی بعض سنتوں مثلاً ختنہ، اباحت تسری وغیرہ پر ان کا عملدرآمد ہے۔

(الزہراء)

---

[۱] راس مالا صفحہ ۲۲۶۔

جرمنی کی تعلیمی حالت

ولایت آدرنہ کے سابق محقق تعلیمات (مفتش المعارف) اور ترکی مدرستہ المعلمین کے پروفیسر کمال بک جو گذشتہ ماہ میں جرمنی کی تعلیمی حالت کے معائنہ کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں کی تعلیمی ترقیوں کی نسبت اطلاع دیتے ہیں:-

"آجکل باشندگان جرمن کی تعداد چھ کروڑ تیس لاکھ ہے جن میں فیصدی ۹۸½ لکھے پڑھے لوگ پائے جاتے ہیں گویا فی ہزار مرد اور عورتوں میں صرف پندرہ اشخاص ایسے ہیں جو نوشت و خواند کی نعمت سے محروم ہیں۔

جرمن بچہ چھ برس کی عمر میں مدرسہ اولیہ (پرائمری اسکول) میں داخل کردیا جاتا ہے اگر اس کے والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ اس کو کالج کی اعلیٰ تعلیم دلاسکیں تو صرف مدرسہ اولیہ میں چار سال تک اس کو رہنا پڑتا ہے جہاں سے وہ سند حاصل کرکے مدرسہ ثانویہ میں داخل ہوسکتا ہے اور اگر بچوں کے والدین صرف ابتدائی تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو اس کو مدرسہ اولیہ میں آٹھ سال تک تعلیم دی جاتی ہے جس کے بعد وہ منتہی ہوکر نکلتا ہے اس وقت اس کی عمر ۱۴ برس کی ہوتی ہے اب اس کو اختیار ہے کہ وہ اُن مدارس میں داخل ہو جو مدارس [illegible] یا (بیروت) کہلاتے ہیں یہاں چار سال کے بعد وہ سند پاکر نکلتا ہے اُس وقت اس کی عمر ۱۸ سال کی ہوجاتی ہے اس حالت میں وہ فینانس [illegible] کے کسی شعبہ میں ملازم ہوجاتا ہے یا کسی تاجر کے دفتر میں کلرک ہوتا ہے یا اپنی حالت کے مطابق کوئی مستقل کام شروع کردیتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک جرمنی میں سرکاری مدارس کی تعداد ۵۲۷۷۹ تھی جن میں ۱۴۷۰۵۲ مدرسین ۹۴ ہزار استانیاں اور طلبہ ۸۸۹۸۳۲۰ (ذکور و اناث) ہیں معلمین کے لئے جو ہال (غیر سرکاری) مدارس قایم ہیں ان کی تعداد ۲۸۰ ہے جن میں ۸۵۸۰۰ طلبہ (ذکور و اناث) ان کے علاوہ اور قسم کے مدارس بھی ہاں ہیں جو اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد ۱۷۹ ہے اور انہیں ۱۴۵۰۰ طلبہ

(ذکور واناث) تعلیم پاتے ہیں۔

جرمنی میں مدارس ثانویہ تین قسم کے ہیں:۔

قسم اول۔ ریئال جمنیاز۔

قسم دوم۔ جمنیاز۔

قسم سوم۔ اپر ریئال شولہ

یہ مدارس اُن اعلیٰ مدارس سے مختلف اور جداگانہ ہیں جن میں طلبہ بعد کو داخل ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی طالب علم ہندسہ کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کو اپر ریئال شولہ میں داخل ہونا پڑتا ہے کہ وہاں بہ نسبت اور علوم کے ریاضیات اور طبیعات کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا جاتا ہے یہاں اجنبی زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی سکھائی جاتی ہے لاطینی زبان کے لئے اس میں کوئی انتظام نہیں ہے اگر کوئی طالب العلم تکمیل تعلیم کے بعد ادبیات عقلیات اور الہٰیات میں مشغول ہونا چاہے تو اُسے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ جمنیاز میں داخل ہونا پڑتا ہے جہاں ریاضیات اور طبیعات کی طرف بہت کم توجہ کیجاتی ہے غیر زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان سکھائی جاتی ہے اور خاص طور پر لاطینی اور قدیم یونانی زبانوں کے سیکھنے کا انتظام بھی ہے مدارس ثانویہ کی مدت تعلیم ۹ سال ہے۔

جرمنی کی تعلیمی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ۱۵ قسم جمنیاز کے مدارس ہیں جنہیں ۲۰۶۰۰ مدارس اور ۲۱۳۷۵ طلبہ (ذکور واناث) ہیں ۳۲۱ مدارس ریئال جمنیاز کے ہیں جن میں ۷۰۱۰ مدارس ہیں اور ۱۴۹۴۹ طلبہ (ذکور واناث) ہیں اپر ریئال شولہ نامی مدارس کی تعداد ۵۰۷ ہیں جن میں ۹۸۳۰ مدرسین اور ایک لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو ستائیس طلبہ (ذکور واناث) ہیں۔

یہ نظام تعلیم ۱۹۱۷ء سے مدارس اولیہ وثانیہ میں بھی قائم ہے جس پر شخصی حکومت کے زمانے سے لیکر موجودہ عہد جمہوری تک انقلابات کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔

کمال بک موصوف کی جرمنی کے ایک نامور فاضل جون دوتی سے ملاقات ہوئی تو اس نے ترکی کو نصیحت کرتے ہوئے دوران گفتگو میں کہا:۔

> "جرمنی لوگ جب اپنے نظامات میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں (خواہ وہ کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو) تو اسپر عرصہ دراز تک غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور اپنے

صیغۂ تعلیمات میں پورے تدبّر اور مطالعہ طویل کے بعد کوئی ترمیم کرتے ہیں۔"

تعلیم قانونی سے ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک ایسی نیک اخلاق جماعت پیدا ہو جو تمدنی، شخصی اور علمی حیثیت سے صاحب عقل و تدبیر ہو اس کو اپنے قوم و وطن کے ساتھ انس و محبت ہو اور دیگر اقوام کے ساتھ مصالحت کی روح اسمیں پیدا ہو۔

یہ آخری شق موجودہ عہد جمہوری کی پیدا وار ہے۔

مذہبی تعلیم جرمنی میں جبری اور لازی ہے الّا یہ کہ یہ کہ طلبہ کے والدین اس سے اتفاق نہ کریں جرمنی میں ایک تعلیمی بورڈ قائم ہے جو جرمن کے تمام مدارس کا انتظام کرتا ہے اس کے ممبروں میں سربرآوردہ اساتذہ اور طلبہ کے نگراں اشخاص شامل ہیں اس مجلس انتظامیہ کی قرارداد کے مطابق تمام مدارس میں عمل درآمد ہوتا ہے۔

مدارس ابتدائیہ و ثانویہ میں سے امتحانات کا نظام بالکل موقوف کردیا گیا ہے البتہ یہ اعلیٰ مدارس میں قائم ہے وہ بھی صرف اس حدتک کہ ان میں اساتذہ جو لکچر تیار کرتے ہیں انہیں میں امتحان لیا جاتا ہے جو عشرہ میں ایک مرتبہ تحریری صورت میں ہوا کرتا ہے سال کے آخر میں ان نتائج کا اوسط نکال کر اس پر طلبہ کے کلاسوں کی ترتیب رکھی جاتی ہے۔

فی الحال جرمنی میں ۲۳ یونیورسٹیاں ہیں جن کے اساتذہ کی تعداد ۴۵۶۴ ہے ان میں ۸۵۰۱۷ طلبہ اور ۴۴۱۰ طالبات ہیں ان کے علاوہ ۲۱۶۵ ایسے طلبہ اور ۳۳۸۰ طالبات ہیں جو صرف ان یونیورسٹی کے لکچروں میں شریک ہوتے ہیں علاوہ بریں جرمنی میں حسب ذیل مدارس قائم ہیں۔

۶ مدارس تجارت کے۔ ۱۱ مدارس صنعت و حرفت کے ۱۱ مدارس موسیقی کے ۱۶ مدارس فنون لطیفہ کے ۴ مدارس زراعتی ۳ مدارس جنگلات کے اور ۳ مدارس معدنیات کے ہیں۔

(الزہرار)

نظام تعلیم کی تجدید

مسٹر ایس۔ وی۔ رامامورتی ایم۔ اے، آئی۔ سی۔ ایس نے اپریل کے رسالۂ ینگ مین آف انڈیا

میں عنوانان مندرجہ بالا پر ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں وہ ہمکو بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں قلیل التعداد آدمیوں کی تعلیم کے اخراجات کا بار کثیر التعداد غیر تعلیمیافتہ اشخاص کے سر پڑ رہا ہے۔ مؤخرالذکر دیہات کے رہنے والے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو زیادہ تر ٹیکس ادا کرنے والے ہیں۔ وہ ہماری تعلیم کا بار اٹھاتے ہیں تو اس کے عوض میں انہیں کچھ بھی نفع نہیں پہونچتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"آپ اپنی یونیورسٹیوں کو بند کر دیجئے پھر بھی آپ دیہاتی زندگی کو اُن سے غیر متاثر پائیں گے وہ کتابیں جو یہ دیہاتی پڑھتے یا سنتے ہیں وہ ہماری یونیورسٹیوں اور ان کے پیدا کردہ افراد کے دماغوں کی ممنون نہیں ہے، وہ اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی جو یہ دیہات والے بسر کرتے ہیں ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم و تعلم سے کچھ بھی اثر پذیر نہیں ہوتی۔ پس اگر کسی ملک کی اعلیٰ تعلیم ایک قومی معاملہ ہے جس کا معاوضہ غریب دیہات والے ادا کر رہے ہیں تو یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ان سے ایک ایسے کام کا معاوضہ لیا جا رہا ہے جن سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

مضمون نگار موصوف ہماری یونیورسٹیوں کی "پیداوار" سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہماری یونیورسٹیاں صحیح معنوں میں علم و فن کی تعلیم گاہوں کی بجائے صرف ذہنی "نقلی پن" کی درسگاہیں ہیں۔ ہمارے معلمین، ہمارے ڈاکٹر، ہمارے انجنیر اور وکلا میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں "ماہر فن" کہے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نقل تو کر سکتے ہیں مگر خود اپنی طبیعت سے کچھ نہیں پیدا کر سکتے۔ ہمارے گریجویٹوں کی ایک تعداد کثیر گورنمنٹ کی ماتحتی کی ملازمتوں پر مٹی ہوئی ہے۔ ان کی تعداد روز افزوں ہے حالانکہ سرکاری ملازمتوں کے لئے ان کی ضرورت نہیں رہی، یہی وجہ ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد بے روزگار پھر رہی ہے۔ پس یہ جو ہم آئے دن گریجویٹوں کی تعداد کو بڑھا رہے ہیں تو تضیع مال و اوقات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

"اصل میں ہونا یہ چاہئے کہ جو شخص ماہر فن بننا چاہے اس کو یونیورسٹی کی تعلیم سے روک دیا جائے اور گریجویٹ کو ایک کلرک یا اس کے برابر قابل ہونے سے باز رکھا جائے۔"

....

اَدَبّیات

شواله

(۱)

یوں تو ارضِ آنتف کا ایک ذرہ بھی ایسا نہ تھا، جس میں الوہیت والہیت کی آئینہ بندی نہو، اور جس سے اس مشہور تاریخی سرزمین کے قدیمی تقدس کا پتہ نہ چلتا ہو، مگر آذر کا قبیلہ اپنی سامریت اور دیویت کے لئے دور دور مشہور تھا - اس قبیلہ میں دو بت تھے - ذی روح اور متحرک -

ایک کا نام زارہ تھا دوسرے کا نام ثمرہ یا ثمرو - ان کا مندر آذر کا وہ عظیم الشان محل تھا جو آنتف کے مندر کے دریا کے کنارے سبزہ زاروں سے گھرا ہوا تھا - مندر ایک پہاڑ پر واقع تھا جو کثیر سبزہ سے ڈھکا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبز گھاس کا ایک انبار لگا ہوا ہے یا پہاڑ خود مخمل بن کر رہگیا ہے - پجاری نہایت عقیدت کے ساتھ اس مندر میں صبح و شام جاتے، جہاں روحانی تزئین کے علاوہ جسمانی تفریح کے سامان بھی نہایت وافر تھے - آذر، زارہ اور ثمرہ کا باپ مندر کی دیویوں اور دیوتاؤں کے مقدس استھان پر جب دُعا کرتا، اُس کی دعاؤں کا مقصد صرف حصولِ حسن ہوتا تھا ——— اُس کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں یعنی مندر کی دیویوں نے اُسے دو کنواریاں ایسی حسین دیدی تھیں کہ آنتف کی پوری سرزمین ان کے جوابِ مثال سے قطعًا خالی تھی - مگر آذر ہنوز اپنی دعاؤں کو ناکام سمجھتا تھا - وہ حسن چاہتا تھا - مگر ایسا جو اُس کی آغوشِ تمنا میں پریشان ہو سکے - وہ عورت ڈھونڈتا تھا، مگر ایسی جو دنیا کے تمام نظارہ سے اُسے بے نیاز کر دے ———

ہاں زارہ اور ثمرہ کی ماں انتقال کر چکی تھی -

آذر جب سورج طلوع ہونے کے بعد اپنے محل سے نکل کر شوالۂ آنتف میں چلا آتا تو اس کے بعد شوالہ

سے اور تمام ماحول سے نگاہوں کی گرم کرنیں اس کے محل میں طلوع ہوتیں۔ اُس کی لڑکیاں گھبرا جاتیں، اور گھر سے نکلنے کے لئے مجبور ہو جاتیں۔ اُنہیں محل کی بلند دیواروں میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نگاہیں چھن چھن کر اُن کے نازک رخساروں پر جمی جاتی ہیں، وہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں آنکھوں کو چشم براہ محسوس کرتی تھیں۔ ہاں تو وہ گھبرا جاتیں اور خدا جانے وہ کیا جذبہ تھا جو اُنہیں کھینچکر کبھی لب بام اور کبھی بیرون در لے آتا تھا۔

جس وقت آذر کی جبین نیاز، حُسن کی بڑی دیوی عَنصرہ کے قدموں میں جھکی ہوئی اپنی عبودیت عقیدت کا صندل عَنصرہ کی پیشانی پر چڑھا رہی تھی، عین اسوقت زارہ اور ثمرہ اپنے بام پر کھڑی ہوئی سواد انتف کی جنت بکنار فضاؤں کا رس اپنی سانسوں میں بھر رہی تھیں۔ اور اپنے ٹھنڈی عنبر بار سانسوں کو ہواؤں میں ملا کر فضاؤں کو پیام مسرت پھونکا رہی تھیں۔ حسن پرست نوجوان شوالہ کے بہانے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے، ان دوشیزہ دیویوں کی پرستش کر رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اون کی گداز نوجوانیوں میں، اُن کے اچھوتے شباب میں، اور ان کے شہابی چہروں میں جذب ہو جائیں۔ مگر ہمسایہ نگاہوں کا خوف اُنہیں بار بار چوکنا کر دیتا تھا۔ اور وہ اپنے مسلسل نظارہ کو کبھی کبھی شوالہ کی عظیم المناظر عمارت دیکھنے میں صرف کر دیتے تھے۔

اُنہیں تماشائیوں میں ایک نوجوان تھا۔ ہرناق۔ جو سب سے زیادہ بے قرار، سب سے زیادہ بےچین۔ اور سب سے مچلنے والی تمناؤں کو اپنے دل میں سنبھالے پھر رہا تھا۔ اُسے شوالہ کی حرمت کا مطلق خیال نہ تھا۔ وہ سراپا نظر اور یکسر نظارہ ہو کر صرف، زارہ اور ثمرہ کی شوالہ شکن دیویت میں کھویا ہوا تھا۔ آخر وہ پہاڑ سے جلد جلد اُترا اور نشیب کی جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

(۲)

آذر کی نیازمندی، دیویوں اور دیوتاؤں کی بارگاہ میں کہاں تک مقبول نہ ہوتی، اس کا، اعتکاف اور اسکا ہر سجدہ، محویت کا ایک بہترین مظاہرہ تھا۔ اُسے عَنصرہ کے غیر متحرک قدموں میں جھکے جھکے نیند آگئی۔ وہ عالم خیال میں ایک مجسّم دیوی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس سے کہہ رہی تھی۔

آذر۔ سر اُٹھا۔ گھر جا۔ اور اس شوالہ کے لئے ایک ایسا بُت بنا لا جس کا سر عنبر سارا کا ہو، جبین اور چہرہ صندل کا ہو، گردن شیشہ کی ہو، سینہ بلور کا ہو، رانیں یاقوت سُرخ کی ہوں اور پاؤں زبرجد کے ہوں، اس کی زلفیں مشک سے بنا اور آنکھیں شراب سے، دل موسیقی سے اور زبان گلاب کی پتیوں سے۔ اسی طرح ترکیب دینے کے بعد اسے دیویت کی ریشمی ردا میں چھپا کر لا، اور شوالہ میں ایک طرف کھڑا کر دے۔ میں اس میں جان ڈالونگی

اور پھر وہ تیری اور صرف تیری ہوگی۔ اگر اپنی دعا کا نتیجہ دیکھنا چاہتا ہے تو اٹھ اور میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جا۔"

آذر کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بڑی دیوی کے قدموں پر بدستور جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک لطیف کرب کے ساتھ اٹھا۔ مؤدب بیٹھا۔ اور دیوی کے چہرہ کو پُرمعنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اسے اپنا خواب بالکل یاد تھا۔ وہ وحشی کی طرح اٹھا ادھر ادھر دیکھا اور شوالہ سے رخصت ہو کر اترا۔ اور اپنے محل میں پہونچکر خواب پر غور کرنے لگا۔

اس کا احساس تازہ تھا۔ اس کی آنکھیں بیدار تھیں! وہ سوچ رہا تھا کہ دیوی نے جس دیوی کی تصویر کھینچکر بتائی ہے اگر میں اسے تیار کر سکا تو واقعی دنیا میں اس کا جواب نہ ہوگا۔ لیکن عنبر، صندل، شیشہ، بلور، یاقوت سرخ زبرجد، مشک، شراب۔ اتنی مقدار اتنی جلد کس طرح مہیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ چیزیں مہیا ہو جائیں تو کیا ان کی ترتیب میرے ہاتھوں سے ممکن ہے۔ کیا میں ایسا بت واقعی تیار کر سکتا ہوں اور کیا پھر وہ ذی روح ہو کر میری تمناؤں کی آغوش کو مقدس بنا سکتا ہے؟

آذر ابھی اس خیال میں تھا کہ زارہ اس کے سامنے سے مچلتی ہوئی نکل گئی، اور ثمرہ بھی زارہ کے پیچھے بھاگتی نظر آئی۔ آذر اٹھا۔ پوچھا کیا ہے کیوں بھاگ رہی ہو۔ زارہ نے اپنی برق پاش ہنسی کو روکتے ہوئے کہا "کچھ نہیں ثمرہ مجھے چھیڑ رہی تھی دیکھئے اب بھی چھیڑ رہی ہے۔"

آذر: "کیا ہے ثمرہ، اپنی چھوٹی بہن کو تم کیوں پریشان کر رہی ہو۔

ثمرہ: "ابا جان۔ ہرناق مشک مانگنے آیا تھا۔ میں نے کہا تھوڑے بال کاٹ کر دیدو۔ تو یہ ایسی بھاگیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ پریشان کر دیا۔

آذر۔ ہرناق۔ مشک۔ بال۔ اور زارہ! ــــ ثمرہ میں نہیں سمجھا۔ مشک سے اور زارہ سے کیا تعلق ہے؟"

ثمرہ: "ابا جان آج مجھے نیا تجربہ ہوا ہے، جبکہ شوالے کا گھنٹہ زور زور سے بج رہا تھا۔ اور ہم دونوں سر جھکائے بڑی دیوی کی یاد میں کھڑے تھے۔ یکایک زارہ کے گیسو اڑے، مجھے ان میں سے ایک خاص خوشبو آڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو بالکل مشک کی سی تھی۔ پھر جو میں نے غور کیا تو زارہ کے بال واقعی مشک سے بنے ہوئے تھے۔"

زارہ: "دیکھئے یہ مجھے بنا رہی ہیں۔ میں ہرناق کو اپنے بال کیوں دیتی۔ وہ تو مشک مانگنے آیا تھا۔ ثمرہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں۔"

آذر نے زارہ کو بغور دیکھا۔ اور اوس کی جسمانی ترکیب پر ایک گہری نظر ڈالی، اس نے معلوم کیا کہ ایک دیوی کا بت بنانے میں جن اجزا کی ضرورت ہے، وہ سب زارہ میں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وہ متحیر ہو گیا۔ اس سے پہلے آذر نے زارہ کو اس نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اُسے اکثر اپنے گھر میں شراب، مشک، اور عنبر کی خوشبو آیا کرتی تھی تاریکی میں اکثر روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ اور موسیقی کی نازک صداؤں سے اکثر اوسکی سماعت وجد کرتی تھی۔ مگر وہ ان سب باتوں کو شوالہ کی بڑی دیوی کا تصرف سمجھا کرتا تھا۔ اور اسی لئے شوالہ کی ہمسائگی پر اُسے ناز تھا۔ آج جب اُس نے یہ کیفیت اور عنبریت اپنی حقیقی بیٹی زارہ میں دیکھی تو وہ حیران رہگیا۔ اور کہنے لگا یہ مجسمہ تو بنا بنایا میرے گھر میں موجود ہے۔ مگر میرے کس کام کا۔ وہ کوئی اور آذر ہے جو اس بت سے بغیر محنت اور تراشنے کے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اب میں کیا کروں، مجھے تو بت بنانا چاہئے۔ میرے خواب کی تعبیر میرے سامنے موجود ہے ...... مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری تمناؤں میں کچھ کمزوری سی پیدا ہو چلی ہے .... ہرناف کیوں آیا تھا .... اُسے مشک کی ضرورت کیوں ہے، کیا وہ بھی کوئی بت بنانا چاہتا ہے جس کی بشارت دیوی نے دی ہو .... آذر بہت پریشان تھا، اس کا دماغ الجھ رہا تھا۔ لڑکیاں اُس کے سامنے سے چلی گئی تھیں، مگر اُس نے زارہ کو پھر آواز دی۔ وہ آئی۔ کہا بیٹھ جاؤ۔ زارہ نے اپنی لچکدار گردن کو خم دیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے باریک ریشمی لباس میں اوس کا تمام جسم جھلک رہا تھا۔ اور آذر یقین کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ دیوی کی بشارت کا مجسمہ اُس کی بیٹی زارہ ہے۔

(۴)

کئی دن سے آذر شوالہ میں نہیں آیا۔ بڑی دیوی اُس سے ناراض ہے دیوتاؤں کو حکم دیدیا گیا ہے کہ مقدس استھان کے لئے کوئی اور بنانے والا تلاش کریں۔ جو آذر سے بہتر پیشانی اور آذر سے بہتر کنواریاں رکھتا ہو۔ حکم کی تعمیل ہو جاتی مگر تمام انتف میں آذر کی کنواریوں سے زیادہ حسین لڑکیاں نہ مل سکیں۔ سارا اور سمدان میں ایسی دو لڑکیاں ضرور تھیں مگر وہاں کے سب سے بڑے دیوتا نے ان کو انتف کے اہل شوالہ کی نذر کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سارا اور سمدان سے اگر یہ دونوں لڑکیاں انتف بھیجدی جائیں تو یہاں "صبح نہ ہو گی، اور اگر کرۂ شمس کے روٹھے ہوئے دیوؤں کو منا بھی لیا تو سارا اور سمدان کی رات اپنی رنگینیاں کھو دے گی۔ سارا میں دوپہر کی طرح شام گرم ہو گی اور سمدان میں رات کو کیں

ذرا بھی روشنی نظر نہ آسکے گی۔ نہ کوئی تارا آسمان پر طلوع ہو سکے گا۔

دیوی نے اپنے وقار خاموشی کو قایم رکھتے ہوئے زبان حال سے کہا میں آذر سے اس لاپرواہی اور غیر حاضری کا بدلا ضرور لونگی۔ اور اب وہ دیوی اُسے دی جائیگی جو اُس سے زیادہ میرے قدموں پر سجدے کر سکے گا۔

خادمان شوالہ نے دیوی کے غصّے کی چنگاریاں محسوس کیں۔ اور ایک رات جبکہ شوالہ گھنٹے کی زبان خاموش اور پجاری کا سبزہ خواب میں تھا۔ ہرناق کو ارض انتقت سے اٹھا کر دیوی کے قدموں میں جھکا دیا۔ ہرناق کی آنکھیں خواب آلودہ نہ تھیں اشک آلودہ تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر وہ تبخالے تازہ تھے جو دعاؤں کی گرمی سے ابھی پھپھولے بن رہے تھے۔ وہ دیوی کے قدموں پر اپنا سر نیاز دیکھ کر اس یقین میں تھا کہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اور دیوی اس کے اثرات قلب کو اپنی جاذب مگر سنگین نگاہوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکایک ناقوس کی پُرشور صدا نے ہرناق کو چونکا دیا۔ اور اب وہ سمجھا کہ جسے خواب سمجھ رہا تھا وہ خواب نہ تھا بلکہ ایک بیدار کشش تھی جو اُسے اس کی خلوت سے کھینچ کر شوالے میں لے آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنا سر اُٹھائے اور اس ناگہانی انقلاب پر غور کرے مگر کسی نے اُسے مجبور کر دیا اور وہ کسمسا کر بدستور سجدہ میں پڑا رہ گیا۔

شوالہ کا گھنٹہ گونجا۔ اور صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ آذر اپنی گھبراہٹ اپنے چہرہ پر لئے ہوئے کسی طرف سے دوڑا ہوا آیا وہ چاہتا تھا کہ دیوی کے قدموں میں سر جھکا دے مگر اُس نے اپنی جگہ ہرناق کو سجدہ میں پایا۔ اُسے غصّہ آگیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور ہرناق کا پیراہن پیچھے سے کھینچکر اُسے وہاں سے دُور کرنا چاہا۔ مگر ہرناق نے دیوی کے آہنی پاؤں پکڑ لئے۔ پیراہن پھٹ گیا۔ اور آذر پیراہن کا ایک ٹکڑا لئے ہوئے دور جا پڑا۔ اس کا سر شوالہ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اُسے چکر آگیا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہرناق ابھی تک سجدہ کر رہا تھا۔ اُجالا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اور شوالہ کے پجاری صندل اور لوبان لئے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ زبانوں پر دیویوں کا نام تھا۔ اور تیوروں سے عقیدت برس رہی تھی۔ ایک پجاری نے آذر کو فرش پر کرب میں پایا اُس نے اُٹھایا۔ اور کہا "کیا تم رات بھر شوالہ میں رہے ہو؟"

آذر "نہیں میں اس گنوار کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں جو سجدوں کے بہانے دیوی کے پاؤں کا صندل چاٹ رہا ہے۔ وہ قیمتی صندل جو میں نے چین سے منگوایا تھا اور جس کی یقین دیوی کے قدموں پر چڑھائی تھیں"

پجاری نے ہرناق کی طرف دیکھا۔ جو اب تک سجدہ میں تھا۔ اور جس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو

ایک گز زمین کی آبیاری کر چکے تھے۔ وہ ہرناق کے پاس گیا۔ اُسے آواز دی۔ اور کہا "صبح ہو چکی ہے۔ اُٹھو۔ تم کون ہو اور دیوی کے استھان سے کیا چرا رہے ہو" ہرناق چونکا۔ اس نے سر اُٹھایا۔ دیوی کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اور پجاری سے کہا: "شوالہ میں کوئی شخص چوری کرنے نہیں آتا۔ اور اے پاکباز برہمن، میں تو چرا کر منگوایا گیا ہوں"

پجاری:- "یعنی"

ہرناق:- "یعنی مجھے دیوی کی آلہانہ قوتیں سوتے سے یہاں اُٹھا لائی ہیں۔ میں خود نہیں آیا ہوں"

پجاری:- "اچھا تمہارا معاملہ بڑے دیو کے سامنے پیش کیا جائے گا، تم اُٹھو اور ہمیں صبح کے مراسم پورے کرنے دو"

ہرناق مجبوراً اُٹھا اور ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا۔ آذر غصہ کی تیز نگاہیں ہرناق پر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ پجاری صبح کے مراسم ادا کرنے لگے۔ دیوی کے معتقد آتے تھے اور سلام کر کے چلے جاتے تھے۔ مگر ہرناق ہاتھ باندھے اور آنکھیں بند کئے شوالے کے ایک کونے میں مجرمانہ حیثیت سے ابتک کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کی محویت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ شوالے میں یکایک آنے کا مسئلہ بھی اب اُسکے دماغ سے باہر تھا۔

(باقی آئندہ)

محمد شفیع شفیع اکبر آبادی

ہستی معصوم

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

عنوان کو پڑھکر غالباً آپ کا خیال قدرتاً فرشتوں کی جانب منتقل ہو گیا۔ لیکن نہیں۔ میں یہاں کچھ اور ہی کہنا چاہتا ہوں۔ آجکل کارنامہ مادیات سے غرض رکھتا ہے اور مادی تحقیقات سے بالقصد آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے روحانیاتِ محض کا ذکر بیجا ہے۔ جبکہ میرے سے عالم خیر کا وجود ہی معرضِ انکار میں ہے۔

ہاں تو یہاں "ہستی معصوم" سے وہ لطیف ہستی مراد ہے۔ جسے صحیح معنی میں چہرۂ کائنات کا آب و

رنگ کہہ سکتے ہیں۔ شاعرانہ زبان میں ادب کی ساری لطافتیں ایک سانس میں آپ جمع کرلیں جب بھی جملہ ناتمام ہی رہے گا۔ اور کہنے والے کے لئے جو تھوڑا سا مذاق تنقید بھی رکھتا ہو نہیں معلوم کیا کچھ کہنا باقی رہ جائے گا۔ اسلئے بیان کی سادگی سفارشی ہے۔ کھلے لفظوں میں کہدوں میری غرض "مخلوق نازک ترین" یعنی عورت سے ہے!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ممکن ہے کسی کو عورت کے معصوم ہونے میں کلام ہو۔ لیکن اسے کیا کیجئے۔ میں ہزاروں گناہوں کے ساتھ بھی اس چیز کو معصوم ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے خوش مذاقی سے (بدمذاقی کہنا خلاف تہذیب ہوگا) آپ میرا شیوہ نیازمندی نہ سمجھئے۔ محض تقاضائے فطرت اور عین منشا رحسن ہے جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔

معصومیت کے جو معنی آپ کے نزدیک ہیں وہ میں جانتا ہوں۔ اور گو افراط سنجیدگی میرے لئے بیجوڑ سی شے ہے۔ تاہم خیام کی طرح وعدۂ فردا سے اسقدر بدگمان بھی نہیں ہوں، کہ آپ کو شکایت کا موقع مل سکے بات صرف اتنی ہے۔ آپ کا ہم خیال ہونے کے باوجود بھی جنس لطیف یعنی عورت میرے نزدیک نہایت نازک تخیلات کی صرف تصویر مرئی ہے۔ جس کے پرشباب سینے میں وجدان روحانی۔ ایک وصف اضافی سے زاید حیثیت نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ تناسب اعضا یہاں یک لخت بے تعلق پایا انداز نہیں کیا جا سکتا جسپر بوالہوسوں کے دندانِ آز ہمیشہ تیز ہی رہے۔ لیکن میں اپنے خیالات کی نشو و نما اس دنیا میں چاہتا ہوں جہاں شرعی دُرّے بے ضرورت۔ اور سنبل کے تازیانے نرم و نازک ہاتھوں میں حفظ اخلاق کے ضامن ہیں۔

عورت کی غایتِ زندگی ایک چاہنے والے کے دلمیں تھوڑی سی جگہ۔ یعنی محبت ہے۔ جس دنیا میں آپ اور ہم ہزار دل جا دیجا خواہشوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں "وہ" صرف اسی کی طالب رہتی ہے۔ سلطنت کو ٹھکرا دیگی۔ اگر ایک سچے چاہنے والے پر اپنے آپ کو حکمراں نہ پائے۔ ایک نور کی ہیکل کو قدموں کے نیچے رکھ کر غیورانہ مسل دے گی۔ اگر شائبہ خلوص سے متراد دیکھ لے۔ دل سے دل ملا ہو تو پس پردہ خوش ہو لیجئے۔ ورنہ لا کھ آنکھوں پر بٹھائیے۔ وہ خاک جونک کے چلدے تو سہی!

ایوانِ ناز میں برقی فانوس کی ضیاباری۔ اس کے لئے خاص مذاق کی چیز ہے۔ لیکن اظہار دلچسپی اسیوقت جائز سمجھتی ہے جب تیز و شفاف روشنی کسی کی نگاہ اشتیاق کو حد فاصل پر روکے ہوئے تڑپا رہی

ہو۔ یہ نہیں تو دُنیا بھر کی تاریکی وہ اپنی خلوت انس میں سمیٹ لینے کے لئے تیار ہے!

عورت چاہے جس حالت میں ہو۔ خلوص اُس کی فطرت کا عنصر لازمی ہے۔ جس کے بے ساختہ گرمجوش اظہار سے کسی وقت وہ عاری نہیں!

اس حقیقت سے آپ کا مغایرانہ انکار کس حد تک لائق تحسین ہے۔ اس کا فیصلہ میں اُن طبائع پر چھوڑتا ہوں جو عورت کو اس کی تمام حسیاتِ لطیف کے ساتھ حدود نسائیت کے اندر ہی دیکھنے کی عادی ہیں۔ میں صرف اسقدر گذارش کرونگا کہ مالوفانہ اعتراف کے مقابلہ میں جو ذوق صحیح اور احساس کامل کا نتیجہ ہے۔ کسی بھونڈے مذاق کے چھچھورپن کو کوئی نسبت ہی نہیں دیجا سکتی۔

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

چہ جائیکہ دونوں کو ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بے محل کوشش تک کیجائے۔

دیکھئے۔ یہ ایک شانِ معصومیت ہے۔ جس کی ہوا بھی آپ کو چھو نہیں گئی۔ یعنی عورت اپنے نشا ط زندگی پر دوسرے کو قابو پاتے ہوئے دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے اور کسی رقیبانہ جذبہ سے متاثر ہونا بالکل عار سمجھتی ہے۔

نقصانات کے تصادم سے (چاہے وہ کسی نوع کے ہوں) اپنے ضمیر میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتی ہاں ایسے میں ایک "متقبل تصویر" ہمیشہ پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے جو خلوت و جلوت میں اس کی تمام تر دلچسپیوں کو پورے توزع کے ساتھ اپنے میں جذب کر سکے۔!

جبین نازنین ایک بار یکسی تمام شکن اسئی وقت نظر آسکتی ہے۔ جب چاہنے والے میں احساس کی کمی دیکھے۔ ورنہ زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کا تبسم زیر لب ہزار سامانِ حیات کے برابر ہے "وہ" اپنے چاہنے والے کی ہر آزمائش کے متعلق حوصلہ افزا خیالات رکھتی ہے اور اسس امر کی صلاحیت کہ نازک سے نازک محل پر بھی اپنی طرف سے آپ کو بدگمان نہ ہونے دے۔ شرط صرف اتنی ہے۔ اسے آپ آہستہ سے اپنے دل میں پیوست ہو جانے دیکھئے۔ اور اس سے اطمینان رکھئے۔ وہ پھول کی طرح نازک شے ہے اسلئے کانٹا بن کر آپ کو خلش نہ پہونچائے گی!

جو انانہ خوشس فعلیوں میں کبھی وہ آپ اپنی تماشائی بن جاتی ہے۔ اور جو کیف مسرور اپنے حریف

نزاکت سے مل کر حاصل ہو سکتا ہے۔ تنہا رہ کر اپنے باطن میں پیدا کر لیتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنا غیر سمجھ کر خطاب و عتاب کرتی ہے۔ کبھی خود روٹھ جاتی ہے تو کوئی اُسے منانے لگتا ہے کبھی روٹھے ہوئے کے آگے مجرم نادم کی حیثیت سے ہاتھ جوڑتی ہے کبھی اپنے محسوس و مجسم ہاتھوں سے کسی پیکر موہوم کا احاطہ کرنا چاہتی ہے۔ اور کبھی تھک کر اپنے کو اسکے آغوش محبت میں سونپ دیتی ہے۔ !

غرض بیخود ہو کے بھی آپ سے باہر نہیں جانا چاہتی۔ اور اُسکے ارادے محض ارادے نہایت خوبصورتی سے افعال کا جامہ پہن لیتے ہیں۔

فطرتِ نسائیت کی یہ وہ مخصوص ادائیں ہیں جن سے دوسرے محروم رکھے گئے ہیں۔

آباد ہے یہ کوچہ دل ناتوان تک

عصمت پر طفلانہ نکتہ سنجی ایک ایسے دماغ کے لئے جو علمی بحثوں سے لگاؤ رکھتا ہو خوش آئندہ شغلہ ہے التجا تو بیموقع ہوگی۔ ہاں اتنی آرزو ضرور ہے۔ کاش کبھی وہ اسطرف متوجہ ہو اور میرے اس ادعا کو کہ نسائیت و عصمت مرادف الفاظ ہیں قریحہ صالحہ سے جانچے اور اپنے ذوق علمی کا ثبوت دے۔

گو میرے قبل از وقت اظہار رائے کو آپ بے تکی شہنائی سے تشبیہ دیں گے۔ تاہم اس خیال سے کہ پندار عجب ناقابل تحمل ہو جائے اسکا اظہار معیوب نہیں۔ میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نامزد موضوع پر نقد و نظر کے بعد دفعتاً جو تصویر چشم تصور کے آگے آکر کھڑی ہو جائے گی وہ ایک عورت ہوگی۔

ہماری زندگی کے اس دایرہ میں "عورت" قدم تک رکھنا نہیں چاہتی۔ جسے قدرت کی فیاضی نے صرف ہمارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن نگاہ اسقدر گہری رکھتی ہے کہ دیرہ کا کوئی سا شعبہ مس ناکردہ نہیں رہ جاتا اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی قوتیں کبھی کبھی حرکت میں آجاتی ہیں ورنہ معاف رکھا جاؤں ہم وہ ہماری فطرت کا عنصر لازمی ہے جس سے کم از کم اس دنیا میں ہم دست بردار نہیں ہو سکتے۔

حیاتِ نسوانی کا یہ پہلو اسکے اچھوتے پن کا آئینہ ہے ذرا طرز تصرف کی بلاغت کو دیکھئے گا کتنی مانوس بیگانہ وشی ہے۔ اس سے تو اچھا کہ فعل رہیں مگر افتراق ذوق کیا تھ۔

اب بھی آپ اسے غیر معصوم ثابت کرنا چاہیں تو۔ ؎

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

درسِ شہادت

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

نا امیدی اب نہیں جینے کی مطلق آرزو — آج پھر زخموں سے دل کے بہ گیا سیروں لہو
تیرہ و تاریک ہے نظروں میں دنیا چار سو — آرہا ہے یاد مجھ کو زیر خنجر اک گلو

آہ - ہفتم تک رہی لاش اس کی وقفِ التہاب
تشنگی پر جس کی ہے تسنیم و کوثر آب آب

مہر انور پردۂ ظلمات میں روپوش ہے — غرۂ ماہ محرم شعلہ در آغوش ہے
چشم عالم صورتِ سیارگاں خاموش ہے — کربلا کی خاک سے یوں آسماں ہمدوش ہے

کارواں اسلام ہے اک مہمان دشتِ بیکسی
جس کے قدموں نے بڑھائی شان دشتِ بیکسی

داغ عصیاں ثبت لوحِ خاوراں ہونیکو ہے — خضر کو رنج حیاتِ جاوداں ہونیکو ہے
حرمتِ دین آہ نذرِ ناکساں ہونیکو ہے — شور ماتم تا حریم لامکاں ہونیکو ہے

جاگ اٹھے فتنے - الٰہی سو نجائے کائنات
خوف ہے مجھ کو کہیں کم ہو نجائے کائنات

آہ کیونکر اس غم جانکاہ کا اظہار ہو — نیلگوں چوٹوں سے جسکی گنبدِ دوار ہو
نیم کش ہو تیر تو کچھ طاقتِ گفتار ہو — کیا محل گفتگو سینہ سے جبدم پار ہو

طعنے دیتے ہیں مگر شہ کے تولائی مجھے
چھوڑ جا اسلام نہ تو اے تاب گویائی مجھے

تھا یہی منظور کیا تجھ کو قلم کارِ ازل — تھا اسی کے واسطے فطرت کا یہ طرزِ عمل
گر پڑا ہے ٹوٹ کر بزم امامت کا کنول — اے زمیں ہشیار ہو اے آسماں دیکھ اب سنبھل

شامتِ اعمال پھرتی ہے بگولے کی طرح

مرکزِ عالم کو جنبش ہے ہنڈولے کی طرح

چشمِ عبرت سے ذرا اے آسمانِ پیر دیکھ	کون سفاکانِ شامی کا ہے یہ نخچیر دیکھ
دشتِ غم میں بیکسیِ عترتِ شبیر دیکھ	اُف! گلوئے اصغرؑ ناداں میں زخمِ تیر دیکھ

خونِ سبطِ مصطفیٰؐ کو کرچکی دُنیا ہدر
"الحذر از دفترِ عصیانِ اُمت الحذر"

خاک و خوں میں ہیں لبِ دریا جوانانِ حسینؑ	دستِ عابدؑ میں ہے خون آلودہ دامانِ حسینؑ
کچھ نہیں جز رنج و درد و کرب سامانِ حسینؑ	سینکڑوں تیرِ جفا ہیں بہر یک جانِ حسینؑ

اہلبیتِ مصطفیٰؐ میں کفر کی غارت گری
اے مسلمانان فغاں از دورِ چرخِ چنبری

آہ جب پیاسے گلے پر شمر نے پھیری چھری	آسماں تھرا گیا غم سے زمیں ہلنے لگی
نعشِ اکبرؑ دیکھ کر جب آخری انگڑائی لی	شدتِ غم سے نجف میں روحِ حیدرؑ کانپ اُٹھی

کچھ خبر اس کی بھی ہے او گردشِ ایام ہے
گنبدِ خضرا اے یثرب رعشہ براندام ہے

فطرتِ معصوم اس غم سے گریباں چاک ہے	اُف زمانے کی روش بھی کسقدر بیباک ہے
مضطرب صدمہ سے روحِ سیدِ لولاک ہے	فاطمی خوں سے زمینِ کربلا نمناک ہے

قدسیوں کا حال ماتم میں نہ کیونکر غیر ہو
خاک اُڑتی ہے مدینہ میں الٰہی خیر ہو

زیرِ تربت آہ اب راحت نہ پائیں گی بتولؑ	سیدِ عالم کو رو رو کر جگائیں گی بتولؑ
جب کھلے سر عرصۂ محشر میں جائیں گی بتولؑ	اک قیامت پیشِ داور اور ڈھائیں گی بتولؑ

آہ جس دم بخششِ اُمت کی ساعت آئیگی،
خونِ فرزندانِ بیکس فاطمہؑ دکھلائیگی،

الفقر فخری

کیا کریں فریاد جب رکھتے نہیں فریاد رس
دم بخود ہیں اپنے عالم میں اسیرانِ قفس
سازو برگ کارواں ہے اور نہ آوازِ جرس
اپنا مسلک ہے فقط اللہ بس باقی ہوس

رات دن کرتے رہے ہیں نفس کی قربانیاں
فخر الفقر فخری ہیں ہیں ہم بے سامانیاں

جامۂ استبرق و قاقم سے ہم کو کام کیا؟
ساغرِ جمشید کیا؟ اور بادۂ گلفام کیا؟
داستانِ شکوہائے گردشِ ایام کیا؟
رات دن یکساں ہیں ہم کو صبح کیا اور شام کیا

چشم عبرت میں ہمیشہ سے یہ دونوں رنگ ہیں
دل کے پردے اس نوا سے ساز ہم آہنگ ہیں

بے بقا ہے جب تو یہ انشا غلط دفتر غلط،
نظمِ سیار و ثوابت صورتِ محور غلط،
جلوۂ مہر مبین و تابشِ اختر غلط،
نقطہ نقطہ فردِ ہستی کا ہی سر تا سر غلط،

اس نمودِ بے بقا سے کسبِ عبرت کیجئے
عالمِ کثرت میں رہکر درسِ وحدت لیجئے

وہمِ باطل کارِ عقلِ تفرقہ پرداز ہے
دل پہ قبضہ ہو جسے وہ مایۂ صد ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی دیکھئے کیا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

نور پیدا ہو رہے ہیں ایک ہی تنویر سے
اتنی تصویریں کھچی ہیں ایک ہی تصویر سے

عیش فانی کا تصور لغو ہے بے ہودہ ہے
حبِ دنیا سے دلِ غم آشنا آسودہ ہے
ایک حصہ فقر ہے وہ بھی غبار آلود ہے
صبر ایوبی ہمارا شیوۂ فرسودہ ہے

دردِ دل را می کنم با ضبطِ پیوندے دگر
بر طبیب خود تغافل می‌زنم چندے دگر
(نظیری)

ہم کو اُس سے کیا غرض ہو قصرِ گردوں کا جواب — نقش جب ہے لِدوا للموت وابنوا للخراب
ہم جہاں ہیں وہ زمیں ہے رشکِ صد آفتاب — ذرہ ذرہ ہے ہماری خاک کا حکمت مآب

بارگاہِ حق میں حاضر ہیں ہمیشہ دل بکف
خاک کے پتلے ہیں ہم اور نوریوں پر ہے شرف

عزیز (لکھنوی)

مسلکِ تسلیم

مطربۂ خوش گلو کمسن و رنگین ادا — عربدہ جو، خوبرو، عشوہ گر و فتنہ زا
دستِ حنائی میں اک جامِ نگاری لئے — محفلِ رنداں میں کل یوں ہوئی نغمہ سرا

شورِ فغاں تابہ کے رنج و الم تا کجا

واقفِ رازِ جہاں کون ہوا آج تک — ساحلِ بحرِ بقا کس کو ملا آج تک
عارضِ مقصود کا بوسہ میسّر کسے — محملِ اندیشہ تک اُٹھ نہ سکا آج تک

عقدۂ ہستی کو حل کس نے کیا آج تک

عالمِ افلاک کی دید ہوئی یاس خیز — پاسِ نظر سے کہیں ان کی تھی رفتار تیز
فرش سے ہی عرش تک گلکدۂ کائنات — اپنا کرہ اس میں ہے صورتِ گل مشک بیز

جیسے ہو اک قطرہ میں عکسِ چمن جلوہ ریز

ذرۂ ناچیز کی ہوتی تو ہے کچھ نمود — اس سے کہیں کم ہے آہ، دہر میں اپنا وجود

بندۂ تسلیم بن اور ہو وقفِ سجود

محمود (اسرائیلی)

مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اردو

ہے گرچہ پھنسی ورطہ آفات میں اردو
مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اردو

یہ میر کی ہے آہ یہ غالب کا ہے نغمہ
زندہ ہے ولی تیری مناجات میں اردو

زنار میں تسبیح کے دانے ہیں پروئے
ہے برزخ الفت صفت و ذات میں اردو

گو مر مٹے گجرات میں توحید کے شیدا
باقی رہی پیروں کی کرامات میں اردو

پاتے ہیں اسے مہد سے بے شبہ لحد تک
محدود ہے کب شعر و حکایات میں اردو

آنکھوں پہ پڑے "جہل و تعصب" کے ہیں پردے
مٹتی ہے "الکشن" کی خرافات میں اردو

کہدو یہ حریفوں سے یہ ہے نشۂ عرفاں
لائی ہے عجب رنگ خرابات میں اردو

ملت کا اگر درد ہے نواب دلوں میں
آئے گی سدا یاد ہر اک بات میں اردو

نواب علی
(از بڑودہ)

سیّد القوم خادمھم

شاہ ہاروں الرشید باصفا کے عہد میں
تھا بنی عباس میں جو سرورِ عالی مقام

قاضی یحییٰ بن اکثم عالم مشہور نے
ایک دن ایوانِ شاہی میں کیا آکر قیام

رات کو سوئے تو اُٹھے خواب سے پچھلے پہر
کیونکہ مارے پیاس کے وہ ہو رہے تھے تشنہ کام

چاہتے تھے اُٹھیں بستر سے وہ پانی کے لئے
اور بجھائیں تشنگی اپنی وہ جاکر بالمرام

پاؤں کی آہٹ جو اُٹھنے میں خلیفہ نے سنی
سو رہا تھا جو قریب اُن کے وہیں آسودہ کام

جھٹ اُٹھا بستر سے اور ہوکر کھڑا کہنے لگا
"اس گھڑی کیا آپ پانی پیجئے گا اے امام"؟

روک کر اُن کو وہیں خود جاکے پانی لادیا
جس سے اپنے دل میں شرمندہ ہوئے وہ نیکنام

معذرت کی اور بولے "یا امیر المومنین!
کیا نہ تھا حاضر یہاں پر آپکا کوئی غلام"؟

تب خلیفہ نے کہا "کیا میں سناؤں آپ کو
ہے جو ارشادِ جنابِ خاتم الرسل الکرام"؟

جو مسلمانوں میں اپنی قوم کا سردار ہے
ہے وہ بیشک ان کا اک ادنیٰ سا خادم اور غلام

اختر (جوناگڈھی)

رباعی محمود

(در صنعت مقلوب)

الفاظ میں اک لطف نمایاں دیکھا
نالاں کو ہر اک طور سے نالاں دیکھا

اقبال سے لابقا ہی نکلا محمود،
نادان کو اُلٹا ہی تو نادان دیکھا

محمود اسرائیلی

عقد پروین

(حضرت حاتم اصم رح کے حکیمانہ اقوال و نصائح)

اگر تو یار کوئی چاہتا ہے — تو ہے وہ ایک رب العالمیں بس
اگر ہمراہیوں کی ہے ضرورت — تو ساتھی ہیں کراماً کاتبیں بس
جو ہے عبرت کے نظارہ کی خواہش — تو اس دُنیا کو دیکھ اے ہمنشیں بس
کوئی مونس اگر تو چاہتا ہے — تو ہے واللہ قرآنِ مُبیں بس
اگر کچھ کام تجھ کو چاہئے تو — جھکا حق کی عبادت میں جبیں بس
اگر ہے وعظ کی تجھ کو ضرورت — تو کوئی مرگ سے بڑھکر نہیں بس
سُنا تو نے کہا جو کچھ کہ میں نے — نصیحت یہ اگر تجھ کو نہیں بس

تو پھر یہ آخری بھی بات سُن لے
کہ ہے تو دوزخی کر لے یقیں بس

کامل (جوناگڑھی)

سلام

(از جناب حکیم سید فضل علی صاحب مرحوم شفا بڑودوی)

ہی طبع زوروں پہ پیری میں عنفواں کیطرح — زمین شعر دکھاتی ہے آسماں کیطرح
بتا محمد کا نہیں خاکِ جسم جاں کیطرح — مکیں کا نام و نشاں مٹ گیا مکاں کیطرح
جگہ نہ اُلفتِ دُنیا کی تھی دلِ حُرمیں — دلائے شاہ نے گھر کر لیا تھا جاں کیطرح
انہیں بھی کردیا اُمت پہ شاہِ دیں نے نثار — کہ جنکو گود میں پالا تھا اپنی جاں کیطرح
بچایا کشتیٔ اُمت کو غرق ہونے سے — ردائے فاطمہ زہرا نے بادباں کیطرح

نہ بہکا جادۂ حق سے جو حریہ باعث تھا
کہ ساتھ ساتھ تھی رحمت نگاہباں کیطرح

یہ داغ ماتم شبیرؑ دیکھنا اک دن
لحد میں دیگا ضیا مہر آسماں کی طرح،

بُرائی اور بھلائی سے متقصف ہے یہی
محال کہنے ہے ممکن کیا زباں کیطرح

بہم تھی دولت اولاد و مال و زر لیکن
کسی نے نام نہ روشن کیا زباں کیطرح

ہمیں ہو مدت بھر نسیا م کا کیا ڈر
سروں پہ رحمت حق ہوگی سائباں کیطرح

بلائیں روضہ پہ حضرت جو انکی سال شفا
پڑھوں سلام یہ ممبر پہ روضہ خواں کیطرح

تاریخ اجرائے رسالہ زبان

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈہی)

تعال اللہ کہ شد دورِ فلک آخر بکام ما
بر آمد از پس مدت تمنائے دلِ اختر

چہ خوش وقتے وخرم روزگاری او نمود اکنوں
کمر بستہ باجرار رسالہ حضرتِ خوشتر

دعا دارم و را ایزد بقای جاوداں بخشد
شود از جملۂ اردو رسائل افضل و برتر

پیئے تاریخ اجراے رسالہ فکر می کردم،
سروشم داد ایں مژدہ "زبانِ دلکش و خوشتر"

۱۹ ۴ ۲۶

غزلیات

(خاکسار عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی ایڈیٹر)

ایک دونوں کی جب نظر ہو گی — دونوں جانب وہ کارگر ہو گی
کیا خبر تھی کہ اشک باری سے — آتش عشق تیز تر ہو گی
قہر ٹوٹے گا جان دشمن پر — لطف کی مجھ پہ جب نظر ہو گی
کیا یہ سمجھے ہو تم دعا کی طرح — آہ بھی میری بے اثر ہو گی؟
آپ سے اور غیر کو الفت! — ہو گی لیکن نہ اس قدر ہو گی
کیا ہمارے ہی باغ عالم میں — شاخ امید بے ثمر ہو گی؟
دست الفت جو آپ کہہ دیں گے — کم ذرا سوزش جگر ہو گی
غیر سے کام! غیر سے مطلب! — جب نظر ہو گی یار پر ہو گی
جس سے تر ہو گی آستیں تیری — وہ ہماری ہی چشم تر ہو گی
مجھ پہ اس شوخ کی نگاہ کرم — نہیں ہوتی کبھی مگر ہو گی

رنج و آفت میں یوں ہی اے خوشتر
عمر کب تک تری بسر ہو گی

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

داغ جو آپ کا دیا ہو گا — مشعل عشق کا دیا ہو گا
دل میں کیا درد کے سوا ہو گا — درد بھی وہ کہ لا دوا ہو گا
ہے یہ کافی کہ وہ کہے اپنا — حق خدمت تو کیا ادا ہو گا
ہم تمہارے نیاز مند سہی — ناز بردار دوسرا ہو گا
وہ الست بربکم تو کہے — ہر زباں پر بلا ہو گا
ماعرفناک حق معرفتک — وہ کہے گا جو آشنا ہو گا
بلبلیں کیوں خموش ہیں شاید — آج ناظم غزل سرا ہو گا

اخبار علمیہ

علمی اصطلاحات

(۱) دمشق کے مجمع علمی العربی نے آلۃ الکاتبہ (Typewriter) کے لئے لفظ "النّاخَۃ" وضع کیا ہے۔

(۲) ابتک ہمارے ہاں (Botanical) کے لئے لفظ "نباتی" مستعمل ہے مگر پانچویں صدی ہجری میں ابن بیطار نامی اندلسی عالم نباتات نے اس کے لئے لفظ "شجّار" وضع کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے معزدات میں لفظ قرصغہ کے تحت میں لکھتے ہیں:۔

"وکلّھا مشھورۃ عند الاطباء والشجّارین"

(۳) مصر کے ایک عالم عارف بک الکدی نے تحقیق کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے لفظ ھیئۃ الاجتماعیہ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جن معنوں میں آجکل مستعمل ہے۔

(۴) ہمارے ہاں تھیوری کے لئے لفظ "نظریہ" مستعمل ہے۔ علامہ ابن خلدون نے نظریات کے لئے "انظار" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(۵) مصریوں نے موٹر کار کے لئے "سیارۃ الکہربائیۃ" وضع کیا ہے۔ (الزہرار)

باغ حیوانات

عام خیال یہ ہے کہ باغ حیوانات (ژولاجیکل گارڈن) اہل یورپ کی ایجاد ہے، مگر تاریخی شہادت اس کو خلاف واقعہ قرار دیتی ہے۔ عربی تواریخ میں اس کے لئے لفظ "حیر الوحش" آیا ہے، اور سب سے پہلے عباسی خلیفہ المامون نے اس کو قایم کیا اس نے یہ باغ حیوانات اپنی زوجہ بوران کے لئے بغداد میں نہر عیسٰی کے کنارے قصر ثریا سے

متصل تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد خلیفۃ المعتضد باللہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا۔
(ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیب (مقدمہ) ص۹۲ طبع پیرس)

(الزہراء)

عرب میں سونے کے دانتوں کا رواج

امام سیوطی بغیۃ الوعاۃ (ص۳۹۲) میں معاذ بن مسلم الہراء کے حالات میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دانتوں پر سونا چڑھایا تھا۔ یہ پہلے نحوی ہیں جنہوں نے علم التصریف وضع کیا۔ یہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

شمال یورپ میں اسلامی سکہ جات

پروفیسر محمود بک سالم نے جمعیۃ الجغرافیہ الخدیویہ کے سامنے ایک لکچر دیا جس میں انہوں نے بیان کیا:۔
"ڈاکٹر جارج یاکوب کہتے ہیں کہ ۱۸۳۶ء میں انہوں نے جزیرہ آئیسلینڈ میں صوبہ بیرار کے ایک قصبہ میوڈال میں، اور گرین لینڈ میں قطب شمال کے قریب اسلامی سکہ جات دریافت کئے۔ مگر اب تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس منطقہ میں یہ اسلامی نقود کیسے منتقل ہو گئے"۔

"علاوہ ازیں شمال یورپ کے اکثر حصوں خصوصاً روس، جرمنی، سویڈن وغیرہ میں کئی سکے برآمد ہوئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ٹورنبرگ نے ۱۸۵۷ء میں سویڈن کے اُن ۱۶۹ مقامات کے نام بتائے ہیں جہاں سے یہ نقود برآمد ہوئے ہیں۔
ڈاکٹر ہانس ہلڈبراندٹ نے ۱۸۷۳ء میں عربی نقرئی سکے جزیرہ گوٹلینڈ۔ (غوتلانذہ) میں معلوم کئے جن کی تعداد ۱۳ ہزار سے زاید تھی۔
بلغاریہ، جرمن، نارمنڈی، انگلستان، اسکونیا وغیرہ میں ایسے نقود پائے گئے ہیں جن پر خوشخط کوفی حروف منقوش ہیں"۔

(الزہراء)

مستقبل کا اخبار

سر رابرٹ ڈونالڈ نے لندن کے سسیل ہوٹل میں روٹری کلب کے لنچ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مستقبل کا اخبار صرف واقعات کی چھوٹی چھوٹی تصاویر پر مشتمل ہوگا۔
یہ تصاویر انہی مقامات سے جہاں سے کہ وہ لیجائے گی، براہ راست خریداروں کو بھیجدی جایا کرینگی۔

اسلامی جذبۂ خودداری

استاذ جبرتی اپنی تاریخ اسلام میں ۲۰ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ کے حوادث میں رقمطراز ہیں:-
"بوناپارٹ کے امیر الافواج نے مشائخ مصر کو طلب کیا۔ جب وہ آکر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تو بوناپارٹ مجلس سے اُٹھ گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین قسم کی رنگین چادریں تھیں۔ ہر چادر تین گز کی تھی۔ سفید، سرخ اور سرمئی، ان میں سے ایک چادر اس نے شیخ شرقاوی کے کندھے پر رکھدی شیخ نے خفا ہو کر وہ چادر زمین پر گرادی انکا مزاج برہم اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ تو ترجمان نے عرض کی کہ یا حضرت مشائخ آپ ہمارے سپہ سالار صاحب کے دوست بنائے گئے ہیں اس لئے وہ اس طرح آپ کی تعظیم وتکریم کرنا چاہتا ہے۔ اس علامت سے آپ وہ امتیاز حاصل کرلیں گے کہ عوام اور فوجی لوگ آپکی تعظیم کریں گے اور اُن کے دل میں آپ کی وقعت بڑھجائیگی۔ ان بزرگوں نے جواب دیا:-
"مگر ہماری قدر ومنزلت خدا کے ہاں اور ہمارے برادران اسلام کے نزدیک یقیناً خاک میں مل جائے گی۔!"
کیا موجودہ زمانہ کے حضرات مشائخ بھی ایسے ہی جذبۂ اسلامی وجوش مذہبی سے متاثر پائے جاتے ہیں؟

(الزہراء)

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۲

صفحۂ ادارت

رسالہ "زبان" صرف علمی خدمت کے خیال سے جاری کیا گیا ہے اسمیں کسی طرح کی، منفعت کا شائبہ تک نہیں ہے مگر اعلیٰ علمی مضامین کی بہم رسانی ایک ایسا دشوار گذار مرحلہ ہے جس سے ہر مدیر رسالہ کو دوچار ہونا پڑتا ہے ہمنے قلمی اعانت کے لئے بعض اہل قلم سے متعدد درخواستیں کی ہیں مگر انھوں نے ابتک "جنبش قلم" سے ہمکو ممنون نہیں فرمایا ہم ملک کے لائق اہل قلم اور انشاپردازوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ خالص علمی تاریخی وادبی مضامین ارسال فرمائیں جو حضرات معاوضہ پر مضامین دینا چاہیں گے ہم انکی خدمت میں معقول معاوضہ بھی پیش کرنے کو حاضر ہیں جو ذریعہ خط وکتابت طے ہوسکتا ہے۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشتر لا ونعم را

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ موقر ہمعصر معارف اعظم گڈھ نے مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کا نوٹس لیا تھا اور ان غلط الزامات اور گستاخانہ تحریرات کی طرف اس کے مدون کو توجہ دلائی تھی جو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کتاب مذکور میں (عمداً یا سہواً) درج کردی گئی ہیں۔ حال میں ہمارے مکرم جناب سید نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج نے انگریزی روزنامہ بمبئی کرانیکل میں ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے جسمیں انہوں نے ان غلط الزامات اور گستاخانہ الفاظ کی تردید کرتے ہوئے مدون انسائیکلوپیڈیا کے اس "عذر لنگ" کا کافی جواب دیا ہے جو اس نے امور متنازعہ فیہ کی نسبت پیش کیا تھا یعنی کہ ان معلومات کا ماخذ مشہور دشمن اسلام مارگولیتھ کی تصنیف ہے۔

کسقدر شرم وافسوس کی بات ہے کہ خالص علمی تحریرات میں بھی ہمارے ہندو بھائی اس قسم کی ناشائستہ حرکتوں سے باز نہیں آتے کیا یہی باتیں شیرازۂ قومیت واتحاد کو محکم کرنے والی ہیں؟

ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی ہے کہ اعلیٰحضرت حضور نظام دکن (خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ) نے قلمروئے آصفیہ میں اس انسائیکلوپیڈیا کے داخلہ کی ممانعت کردی ہے ہمیں امید ہے کہ اور مسلمان والیان ریاست حضور نظام کی تقلید میں اس قسم کی منافرت انگیز کتابوں کو اپنی حدود میں آنے سے باز رکھیں گے جو باشندگان ہند کے جذبات واحساسات کو بھڑکا کر نفرت و

عداوت کی خلیج کو وسیع تر کردینے والی ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اکثر حملے ہوس ملک گیری۔ بت شکنی اور لوٹ مار کی غرض سے معرض وجود میں آئے ہیں لیکن اس بات کی کبھی تحقیق نہیں کیجاتی کہ اصل اسباب کیا تھے اور کن وجوہ کی بنا پر مسلمان سلاطین کو ہندو راجاؤں پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کے ظلم و تشدد سے تنگ آئی ہوئی مسلمان رعایا کی فریاد پر ان مسلمان سلاطین کو انکی گوشمالی کرنی پڑی ہے۔

چنانچہ ہم اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک مستند و معتبر تاریخی دستاویز پیش کرتی ہے جو فتح جونا گڈھ کے اصل سبب پر کافی روشنی ڈالتی ہے یہ ایک خط ہے جو منگرول کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید رکن الدین المعروف بہ سید راجو صاحب نبیرہ حضرت سید سکندر بن مسعود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیطرف سے انکے پیر و مرشد قطب الاقطاب حضرت شاہ عالم (ولادت ۸۱۷ھ وفات ۸۸۰ھ) قدس اللہ سرہ العزیز کے نام فارسی میں بخط عربی احمد آباد لکھا گیا ہے اسمیں انہوں نے راجہ را امانڈلیک حاکم سورٹھ (در کاٹھیاواڑ) کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے حالات تحریر فرمائے ہیں اور عرض کی ہے کہ اس طرف سلطان محمود (بیگڑہ) کی توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ وہ حملہ آور ہو کر اسکے شر و فساد کا قلع و قمع کردیں اسی خط کی پشت پر حضرت شاہ عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب درج ہے جسمیں آپ نے کاتب کو اطمینان دلایا ہے۔ یہ مکتوب گرامی اس وقت یہاں (منگرول) کے سجادہ نشین سید محمد صاحب مدظلہ کے پاس موجود ہے جو حضرت سید سکندر بن مسعود (جہانیاں جہانگشت) کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خط کے دونوں طرف کے فوٹو لئے گئے ہیں جو ہم انشاءاللہ کسی آیندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔

زبان کے رفقائے کار میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق حضرت شاہ دستگیر صاحب ہیں جنھوں نے نہ صرف ہمیں طباعت کے ناقابل بیان مخمصات ہی سے سبکدوش کردیا ہے بلکہ "زبان" میں جو حسن ترتیب اور حسن اہتمام نظر آرہا ہے وہ سب آپ ہی کی بے لوث جگر کاوی و مخلصانہ سعی بلیغ کا نتیجہ ہے۔ جس کے لئے ہم شاہ صاحب کے نہایت ممنون و مشکور ہیں۔

اڈیٹر

زبان

ماہ اگست ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(مولینا مولوی محمد اسمعیل صاحب اصلاحی اعظم گڈہی)

یہاں تک تو موسیو رینان کے حالات زندگی تھے۔ اب ہم اس کے فلسفہ اور خیالات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر رینان فرانسیسی مصنفین میں اپنی مخصوص فصاحت و بلاغت اور طلاقت کلام اور اہم مباحث ومضامین کے لحاظ سے جسے قوم نے ہاتھوں ہاتھ لیا ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اسی لئے اس کی تصنیفات تالیفات اور رسائل کا شمار فرانس کے کثیر الاشاعت اور ہر دلعزیز لٹریچر میں ہوا۔ اور پبلک میں انہیں یہانتک اعتبار حاصل ہوا کہ اس کی بعض کتابوں (مثلاً السیرۃ المسیحیہ) کے چودہ ایڈیشن تک کی نوبت آئی جس کا شمار فرانس کی اعلیٰ بلیغ کتابوں میں ہے۔ اسکی کتاب "تذکار الصبا والصفولیہ" اور کتاب "تشقیق" (ہنرٹ) بھی اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ جو چودہ چودہ مرتبہ چھپیں۔

پروفیسر رینان اپنے زمانے میں "مذہبیات" کا سب سے بڑا عالم تھا اور سامی السنہ، علوم، تاریخ، معتقدات اور اخلاق کی زبردست واقفیت کے ساتھ مذہبی مسائل پر نہایت آزادی کے ساتھ بحث کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ آیندہ اوراق میں نظر آئے گا۔

جب وہ کسی مسئلہ کی مدافعت کرتا جسے وہ اپنے ضمیر اور اذعان کے فیصلہ سے (تقلید یا آبائی عقیدے سے نہیں) ضروری سمجھتا تو اس کو اس خوبی سے انجام دیتا کہ علمائے یورپ میں معدودے چند ہی لوگ ایسے ہیں جو اس درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔

رینان کی حالات زندگی میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی تمام

زندگی گرجا کی چار دیواریوں اور حجروں میں بسر کی اور وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی مذہبی کتب اور اصول کا بہ نظر تعمق مطالعہ کیا اور وہ پہلا شخص ہے جس نے انجیل کی اصل زبانوں کو پڑھا اور اس میں دست گاہِ کامل پیدا کی باوجود ان تمام باتوں کے وہ پہلا شخص ہے جس نے دین مسیحی کو خیرباد کہا۔

میرے خیال میں رینان کے ارتداد کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسیحی پادری فلسفہ کے مخالف تھے بلکہ بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے غیر مذاہب کی تعلیمات اور اصول سے واقفیت پیدا کی۔ اور پھر ان کا آپس میں موازنہ کیا ع

"وبضدھا تتمیز الاشیاء"

اور یہی اصول موازنہ ہے جسے حکمائے اسلام (فلاسفۂ اسلام) نے میزان قرار دی ہے اس لئے کہ انہوں نے مذہب اسلام کو تقلیداً یا وراثتاً قبول نہیں کیا تھا جیسا کہ بعض اُن لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے فلاسفہ اسلام کی کتابیں نہیں دیکھی ہیں بلکہ انہوں نے اسلام کو اس صداقت کی وجہ سے قبول کیا تھا جو ان میں اسلام اور دیگر مذاہب میں موازنہ کرنے کے بعد نظر آئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ پروفیسر رینان نے ایک مذہبی مصلح (رفارمر) کی طرح تجدید مسیحیت کے سلسلہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیں اور قوم کو حقیقی مسیحیت کی دعوت دی جو اس کے خیال کے مطابق عقاید کے لحاظ سے توحید باریتعالےٰ بلاشرکت غیرے اور اعمال کے لحاظ سے صفائی باطن اور پیروی حق والصاف پر مشتمل ہے۔

موسیو رینان نے قدیم مسیحی کتابوں کے بحث و تمحیص کرکے پرخچے اُڑا دیے اور عقل و رایتی کو حکم قرار دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے زبردست اور خالص اصولِ توحید کو تسلیم کرنا پڑا۔

اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سب کو سرنگون ہوجانا پڑا ہے چاہے وہ اسلام کے فلاسفہ و متکلمین ہوں یا یورپ کے روشن خیال مسیحی مصنفین اور دہریئے۔ لیکن اس بات کی دلیل کہ کائناتِ عالم کا کوئی رب اور خالق ہے یہ ہے کہ خود عقل انسانی کسی طرح یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کائنات کی علت صرف مادہ ہو جو محض ایک جسم بیجان ہے یا متکلمین کے الفاظ میں یوں کہئے کہ بغیر مؤثر کے کسی اثر کا پایا جانا ناممکن ہے اور یہی تقاضائے عقل بھی ہے۔ رینان کی یہ ایک فلسفیانہ رائے ہے کہ کائنات اور انسان کی ترقی جس پر تمام مباحثِ فلسفہ کا مدار ہے۔ صرف عقلی اور دماغی فلسفہ سے ناممکن ہے بلکہ یہ بات علوم حسیہ مثلاً ریاضیات۔ طبیعات۔ کیمیا۔ تاریخ اور علم الالسنہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔

اسلام کے متعلق رینان کی خاص رائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ کہتا ہے

کہ :-

"اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے اندر اسلام کی طرف ایک خاص کشش محسوس کی بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا"

رینان اپنی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ کے صفحہ ۱۶۲ پر لکھتا ہے کہ :-

"ہمارے پاس ابن رشد کو ایک مخلص مسلمان نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام کے متعلق جو کچھ تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہیں ان کو اسلام کے خالص عقائد اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور خود اسلام ہی ان باتوں کو غیر معقول اور لغو قرار دیتا ہے ۔ اسلام کے عقائد تو نہایت صاف ستھرے اور صحیح خیالات کا مجموعہ ہیں"

جو شخص رینان اور امام غزالی رح کے حالات کا باہم مقابلہ کرے گا اسے نظر آئیگا کہ رینان یورپ کا غزالی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر نے مذہب کو چھوڑ کر تسکین قلب پائی اور موخر الذکر کو یونان کی پیچ در پیچ گتھیوں سے الگ ہوکر مذہب میں راہ حق ہاتھ آئی۔

موسیو رینان کا لکچر

موسیو رینان نے پیرس کے سربون کالج میں علمائے فرانس کے سامنے "اسلام اور علم" کے عنوان پر ایک بسیط لکچر دیا جس کا ملخص حسب ذیل ہے :-

آج میں آپ لوگوں کے سامنے ایک اہم اور دقیق علمی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں جسکی تحقیق نہایت ضروری ہے اس لئے کہ مورخین کی سہل انگاری نے اس میں بہت کچھ غلط فہمی پیدا کر دی ہے پروفیسر مذکور اپنی تقریر کی ابتدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

مورخین نے بلا سوچے سمجھے محض سہل انگاری سے کام لیکر بعض خاص خاص چیزوں کو خاص خاص اقوام سے منسوب کر دیا ہے جس سے اصل حقیقت پر بہت کچھ پردہ پڑ گیا ہے مثلاً انھوں نے یونانی رومی اور عرب سے ان اقوام کو تعبیر کیا ہے گویا وہ اپنے اصل حالات اور خصائص پر قایم ہیں۔ انھوں نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ امتداد

زمانہ نے ان کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے قدیم اور گذشتہ حالات سے یکسر متباین ومتغائر ہوگئی ہیں اور ملکی فتوحات مذہبی انقلابات اور دوسرے اہم واقعات وتصرفات جو نوع انسان کی تاریخ میں آئے دن پیش آیا کرتے ہیں اس عظیم الشان اور زبردست انقلاب کا باعث ہوتے ہیں۔

حالات کا اقتضا ہے کہ ہم اس مسئلہ میں نہایت امعان نظر اور عمیق غور وفکر سے کام لیں مثال کے طور پر ہم اہل فرانس زبان کے اعتبار سے رومی، تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے یونانی، اور مذہب کے اعتبار سے یہودی ہیں یہ اور قوموں کا خاندانی اور نسلی امتیاز باوجود اپنی زبردست اہمیت اور اپنی اصل کی واقفیت کے مرور حوادث، امتداد زمانہ، اور انقلاب اقوام سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے، مثلاً یونانیوں کا تمدن، رومیوں اور جرمنوں کی فتوحات، عیسائیت اور اسلام کا ظہور زمانہ انتعاش علوم عہد فلسفۂ جدیدہ اور انقلاب فرانس اس قسم کے حوادث اور واقعات جب دنیا میں رونما ہوتے ہیں تو قوموں کے امتیازی خصوصیات اور ان کے ممتاز عادات واطوار میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان کی خصوصیتیں بڑی حد تک مٹ جاتی ہیں اور وہ آپس کی کثرتِ اختلاط اور میل جول سے تقریباً ایک ہی قوم بن جاتی ہیں اب ہم اسی قسم کی ایک تاریخی سہل انگاری پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

آجکل عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ عربوں کے علوم، عربوں کے فنون، عربوں کا تمدن، عربوں کا فلسفہ، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کا تمدن وغیرہ وغیرہ اس سے ایک عالمگیر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور بکثرت غلط خیالات کی اشاعت ہوگئی ہے جو شخص ہم اہل یورپ کے حالات سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے اسے معلوم ہوگا کہ آجکل اسلامی ممالک اسلامی سلطنتیں کسقدر انحطاط اور تنزل کی حالت میں ہیں اور مختلف قومیں جنھوں نے اس دین کو قبول کیا کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہیں۔

جس نے مشرقی افریقہ کا سفر کیا ہے اسے معلوم ہے کہ وہاں کے (مسلمان) لوگ کسقدر احمق اور بیوقوف ہوتے ہیں، مذہب ان کے دل ودماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے اس لئے وہ جدید علوم وفنون سے بے بہرہ رہتے ہیں اول تو ان کے بچے ذہین اور سمجھدار ہوتے ہی بہت کم ہیں لیکن جب وہ دس بارہ برس کی عمر کو پہونچتے ہیں اور مذہبی عقائد سیکھ لیتے ہیں تو پھر سخت متعصب ہو جاتے ہیں اور ان کو اس میں اسقدر غلو ہو جاتا ہے کہ اپنے علاوہ سب کو وہ احمق سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے بس صرف وہی حق پر ہوتے ہیں اور اسلئے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت اور مبارک سمجھتے ہیں دراصل یہی ان کے انحطاط اور تنزل کا باعث ہے

یہی تفاخر اور خودستائی مسلمانوں کی بدترین عادت ہے اور اسی لئے اُن کو اپنی عبادتوں میں بھی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جس سے وہ غیر مذاہب کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ "توکل علی اللہ" اُن کا عقیدہ ہے کہ خداوند تعالے جس کو چاہے بغیر کوشش وسعی کے فضل وکمال عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر محنت ومشقت کے ملک و سلطنت بخشتا ہے اس لئے وہ تعلیم اور صنعت وحرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ علوم وفنون اور یورپ کی موجودہ ترقیات سے کوسوں دور ہیں اور مسلمانوں کے انہیں خصائل وعقاید نے جو مذہب نے ان میں پیدا کردی ہیں، باوجود اُن کے مختلف الاقوام ہونے کے انہیں بالکل اندھا اور گمراہ کررکھا ہے اس لئے کہ جب ایک بربری یا سوڈانی یا مراکشی یا افغانی مسلمان ہوجاتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے ملک یا قوم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے بلکہ اس کا انتساب اب صرف اُس کے مذہب کی طرف ہوگا۔

لیکن ایرانی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنی قبل از اسلام کی قومی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے اسی لئے ان کو مسلمان نہیں بلکہ شیعہ کہتے ہیں۔

اسلام کی موجودہ نازک حالت نے بعض لوگوں کو آمادہ کردیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس انحطاط کا سبب مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شئے کو قرار دیں (اسلام کی موجودہ نازک حالت کو دیکھ کر بعض لوگوں نے مسلمانوں کے اس انحطاط کا سبب ان کے مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شئے کو قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں وہ مسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش کرتے ہیں) اس لئے کہ اسلامی تمدن جو اس وقت رو بہ تنزل ہے زمانہ قدیم میں ترقی کے اعلیٰ اور بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اس میں علماء تھے فلاسفہ تھے اور ایک زمانے تک اُنہیں مسیحی یورپ پر حاکمانہ استادانہ اور معلمانہ شرف حاصل رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر پہلے تھا تو اب کیوں نہیں ہے یہی وہ سوال ہے جسے میں اپنا موضوع بحث بنانا چاہتا ہوں۔

کیا حقیقتاً علوم اسلامیہ کا کوئی وجود ہے یا کم سے کم یہ کہ اسلام نے انہیں قبول کیا اور اُن کی اشاعت کی اجازت دی؟ بیشک بعض وجوہ سے اس کا جواب اثبات میں صحیح ہے اسلئے کہ ۷۷۵ سے لیکر تیرہویں صدی کے وسط تک پانسو برس کے زمانے میں اسلامی ممالک میں بڑے بڑے علماء فضلاء اور ارباب فکر موجود تھے جو اہم علمی مسائل میں دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے اور اسلامی ممالک کو مسیحی ممالک پر بہت کچھ بلندی وبرتری حاصل تھی اس موقع پر غلط فہمی سے بچنے کے لئے ہمیں ذرا تشریح اور تفصیل سے کام لینا چاہئے اس کے لئے ہم کو مشرق کی عہد بہ عہد کی تاریخ کی نہایت احتیاط سے ورق گردانی کرنی ہوگی تاکہ ہم اس ترقی (و انقطاع) کے صحیح اسباب کا پتہ لگا سکیں

جو اسقدر مبدل بہ تنزل ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا قرونِ اول علوم اور فلسفہ سے بہت دور رہا (تھا) اس لئے کہ اسلام ان مذہب کے تنازعات دینی کا نتیجہ ہے جو قرونِ سابق میں پائے جاتے تھے اور لازمی طور پر عربوں نے اسلام قبول کرتے ہی ان تمام مختلف (اعلیٰ اور بلند عقائد و خیالات (کو خیر باد کہدینے) سے الگ ہوئے جن میں سے بعض توحید الٰہی کے بھی قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمام علوم عقلیہ سے بہ مراحل دور ہو گئے بیشک بہادران عرب جو اسلام کی رہنمائی میں ملک پر ملک فتح کرتے جاتے تھے اس وقت شجاعت اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ فلسفہ سے بہت ہی کم واقف تھے بعض مشرقی مصنفین مثلاً ابو الفرج[۵] نے عربوں کی طباعی اور ذہانت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن علوم پر عربوں کو فخر تھا وہ لغت ۔ عروض ۔ قیافہ اور انشا کے علوم تھے اور فلسفہ کی تو خدا نے ان میں اہلیت ہی نہیں پیدا کی۔

اور درحقیقت بھی یہی ہے کہ عرب کے بدو جہاں زباندانی اور فصاحت میں تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے وہاں اشیار کی حقایق و ماہیت پر غور و فکر کرنے میں سب سے پیچھے تھے، ایک متدین عرب حوادث عالم کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتا تھا کہ:۔

"اللہ تعالےٰ عالم کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ ہماری ہدایت کے لئے انبیار کو بھیجتا ہے جو ہمیں سیدھا رستہ بتاتے ہیں"

یہی وجہ ہے کہ جب تک اسلام صرف عربوں کے اندر رہا یعنی خلفار راشدین، اور بنی اُمیّہ کے زمانے میں مذہب کے باہر (خارج از مذہب) ایک بات بھی نہیں کہی جاتی تھی، اگرچہ (حضرت) عمرؓ نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا حکم نہیں دیا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ دنیا میں اسلام کے غالب ہوتے ہی انھوں نے ان تمام ممکن علمی وسائل و ذرائع کو تلف کر دیا جن سے مباحث علمیہ کا امکان تھا۔

۷۵۰ء میں جبکہ ایران نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بنی امیہ کے خلاف بنی عباس کی امداد کی اور اس طرح حکومت عباسیوں کے ہاتھ آئی تو تمام حالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا،

اور مرکز اسلام منتقل ہو کر دجلہ اور فرات کے مرغزاروں میں آیا جہاں مشرق کے قدیم ایرانی ۔ ساسانی تمدن

---

[۵] ابو الفرج الملیطی ایک مسیحی مورخ ہے جو ۱۲۲۶ء میں ملاطیہ میں پیدا ہوا اس نے یونانی فارسی اور عربی کتابوں سے مدد لیکر سریانی زبان میں ایک تاریخ لکھی ہے عربی میں مختصر الدول کے نام سے اس کی تلخیص موجود ہے (مترجم)

کے باقیات الصالحات بہت کچھ محفوظ تھے، جو کسری انوشیرواں کے زمانہ میں ترقی اور ارتفاع کے اعلیٰ مدارج پر پہونچے ہوئے تھے صنعت و حرفت سالہا سال سے ترقی کر رہی تھی، اور انوشیرواں نے تو سنسکرت کی علمی کتابوں کا ترجمہ اور یونانی فلسفہ کی تعلیم عام کر کے اس بڑہتی ہوئی ترقی کو چار چاند لگا دیئے، اس زمانہ میں قسطنطنیہ کے بعد ایران، فلسفۂ یونان کا مرکز ہو رہا تھا،

(یہ ایران) اور اس کے گرد و نواح کے اکثر باشندے نسطورین عیسائی تھے، جن کو علم طب اور فلسفۂ یونان میں ملکۂ علمی حاصل تھا، اور ان کے پادری اور پیشوا علم ہندسہ اور منطق کے ماہر تھے، فارسی کے اُن قصائد میں جنہیں رستم کے واقعات کو شہرت دی گئی ہے، تم دیکھو گے کہ جب انہیں کوئی پل بنانے کی ضرورت ہوتی تھی وہ "جاثلیک" سے دعا مانگتے تھے، اور لفظ "جاثلیک" (Catholicos) نسطورین عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں کے لئے بولا جاتا تھا، لیکن جب پہلا اسلام آیا تو اس نے ایران کی ان روز افزوں ترقیوں کو ایک صدی تک بالکل روک دیا، مگر جب عباسیوں کا غلبہ اور ظہور ہوا تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب تمدن اکابرہ پھر بحال ہو جائیگا، اسلئے کہ ارباب حل و عقد جنہوں نے عباسیوں کو تخت و فوج کا مالک بنایا تھا یہی ایرانی تھے، یہی وجہ ہے کہ ابو العباس اور خصوصاً منصور کی مجلسیں ان سے کبھی خالی نہیں ہوئی تھیں، سلطنت کے وزرا اور مشیر اور خلفا کے بچوں کے معلم و اتالیق خاندان برامکہ کے لوگ ہوتے تھے، یہ خاندان ایران کا قدیم خاندان ہے جس کی بنیاد صاحب کمال اور اہل علم آبا و اجداد کے ہاتھوں پڑی تھی، یہ لوگ اپنے آبائی دین پر قائم رہے اور بہت سے اسلام لے آئے، وہ بھی بغیر کسی گہرے اعتقاد کے،

ان میں نسطورین عیسائی کو ضعیف المذہب خلفاء عباسیہ کے درباروں میں تقرب خاص حاصل تھا اور وہ ان کے اول درجہ کے شاہی اطبا میں داخل تھے، شہر حران سے جہاں قدیم یونانی علوم و فنون کے بہت کچھ آثار باقی تھے، علما و فضلا خصوصاً ماہرین فلکیات کی ایک کثیر جماعت نکلی جو کسی مذہبی عقائد کے پابند نہ تھے اور انہیں لوگوں نے شہر بغداد کی بنا ڈالی جو دولت عباسیہ کا دار الخلافہ تھا، اور جو درحقیقت ایک ایرانی سلطنت تھی، لیکن جس طرح مذہب اسلام سے کلیتہً الگ رہنا ان کے لئے ناممکن تھا، اسی طرح فاتحین کی عربی زبان کو فارسی کر دینا بھی آسان نہ تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ تمدن مخلوط ہو گیا اور نصاریٰ و مجوس سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے، اور عیسائیوں کو خصوصیت کے ساتھ نظم و نسق کے ذمہ دارانہ عہدے سپرد کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ مشہور خلفاء منصور، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے اسلام میں لوگ

شک کرنے لگے، یہ لوگ حقیقتہً نہیں صرف ظاہر میں اپنے مذہب کے پابند تھے، اور ہر شے خصوصاً اجنبی اشیاء کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بڑے شایق تھے، چاہے وہ بت پرستوں اور ہندیوں کی ہوں یا ایرانیوں اور یونانیوں کی،

کبھی کبھی ان کے مذہبی علما اس معاملہ میں تعرض کرتے تو خلیفہ کو مجبوراً اپنے کافر اور ملحد احباب سے الگ ہٹنا پڑتا، لیکن جونہی اس مذہبی تعرض کا اثر زائل ہوا اور علما غافل ہو گئے، بس پھر فوراً ہی وہ ان لوگوں سے اختلاط اور میل جول شروع کر دیتے،

یہ بغداد کے عجیب و غریب زمانہ شباب کے تمدن کا ذکر ہے جس کا تصور عام لوگ قصہ الف لیلہ سے کر سکتے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ ظاہر میں تو بیشک مذہبی معاملات پر تشدد تھا لیکن باطن میں کچھ نہیں تھا، اور بڑی آسانیاں حاصل تھیں اسی لئے اس وقت مختلف صنعتیں اور متعدد علوم لطیفہ عالم وجود میں آئے ارباب حکومت کی عام مذہبی سہل انگاریاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ فاسق اور فاجر تک کو عزت و رتبہ دیتے اور اپنا مقرب بناتے، حالانکہ ان کے مذہبی احکام کا اقتضا تھا کہ ایسے لوگوں کی تنبیہہ اور سزا کی جائے،

انہیں خلفاء کے زمانے میں مذہبی معاملات میں عام طور پر تسامح اور چشم پوشی سے کام لیتے تھے، اور کبھی اپنی اس پالیسی پر افسوس بھی کرتے تھے، غرض کہ الحاد پھیلا اور متکلمین مذاہب، اور ادیان پر عقلاً بحث و مناظرہ کے لئے جلسے منعقد کرنے لگے،

یہاں میں اس قسم کے ایک جلسہ کے متعلق اندلس کے ایک متقی عالم کے بیان کا ملخص دیتا ہوں جس کا ترجمہ موسیو روزی نے کیا ہے:-

"حکیم قیروانی نے ایک اندلسی عالم سے جو بغداد سے واپس آئے تھے، پوچھا کہ کیا تم متکلمین کے جلسوں میں شریک ہوئے تھے؟ اندلسی عالم نے جواب دیا کہ ہاں میں صرف دو مرتبہ شریک ہوا تھا، لیکن پھر نہیں گیا، حکیم قیروانی نے کہا یہ کیوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "پہلے پہل میں جس جلسہ میں شریک ہوا اس میں میں نے دیکھا کہ سنی اور معتزل مسلمانوں کے علاوہ ملاحدہ، مجوس، دہرئیے، یہود، اور نصاریٰ سبھی بیٹھے ہوئے ہیں خلاصہ یہ کہ ہر قسم کے کفار کا وہاں ایک جم غفیر موجود تھا، اور جلسہ میں ہر فرقہ کا ایک پیشوا یا رئیس تھا جو اپنے مذہب کی نمایندگی کرتا تھا، اور جب کوئی رئیس جلسہ میں آتا تو تمام حاضرین اس کے احترام کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک اپنی جگہ پر وہ بیٹھ نہ جاتا سب کے سب کھڑے رہتے تھے جب حاضرین کی تعداد پوری ہو گئی تو ان میں سے ایک کافر اٹھا اور اس نے

یوں تقریر شروع کی:-

"حضرات! ہم لوگ یہاں پر صرف عقلی مناظرہ کے لئے، جمع ہوئے ہیں اور آپ تمام حضرات کو اس کے شرائط بخوبی معلوم ہیں، پس میں مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی دلیل نہ پیش کریں جو ان کی مذہبی کتاب یا اقوال نبی سے ماخوذ ہو، اس لئے کہ ہم ان کی مذہبی کتاب اور ان کے نبی کو نہیں مانتے پس ہمارا فرض ہے کہ ہم صرف عقلی دلائل پر اکتفا کریں۔"

"تمام حاضرین نے اس کی تائید کی اور اس کے ثبوت میں سب نے تالیاں بجائیں، یہ دیکھ کر دوبارہ شرکت کا میں نے ارادہ نہیں کیا، لیکن مجھ سے ایک مرتبہ اور شریک ہونے کے لئے، کہا گیا، میں گیا تو اس کو گذشتہ جلسہ سے بھی بدتر پایا"

مذہبی احکام کے بموجب اس موقت تعویق کے بعد شام کے مسیحی اطبا کے ذریعہ سے علوم و فلسفہ کی اشاعت ہونے لگی، اور یونانی فلسفہ کے وہ لوگ وارث ہوئے جو فلسفۂ ارسطو، ریاضیات، طب اور ہیئت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، اور انھیں لوگوں کو عباسی خلفا نے ارسطو، جالینوس، بطلیموس، اور اقلیدس وغیرہ کی تصنیفات و تالیفات کے ترجمہ پر لگایا، خلاصہ یہ کہ تمام یونانی علوم و فلسفہ کے ترجمہ کی خدمت انہیں لوگوں کے سپرد کی گئی۔

بعض باذاق اور پرجوش اشخاص مثلاً کندی نے اہم اور دقیق مسائل (جہاں انسانی ذہن و عقل کی رسائی بڑی مشکل سے ہوئی) پر بحث و مناظرہ شروع کر دیا، انہیں لوگوں کو فلاسفہ کہا گیا، اور اس زمانے سے یہ یونانی الاصل لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو مذہب اور دین کی مخالفت کرتا ہو اور ہر وہ شخص جس پر اس لقب "فیلسوف" کا اطلاق ہوتا تھا ہدف مطاعن اور قابل گردن زدنی سمجھا جانے لگا، جیسے قدیم زمانہ میں لفظ زندیق تھا اور موجودہ زمانے میں لفظ "فری میسن" ہے۔

درحقیقت انہیں فلاسفہ کے ذریعہ سے مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اسقدر ترویج اور اشاعت ہوئی "اخوان الصفا" کے نام سے فلاسفہ اسلام کی ایک باقاعدہ جمعیۃ قائم ہوگئی ان لوگوں نے فلسفہ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی متعدد کتابیں لکھیں جو فلسفیانہ خیالات اور بحث مسائل کے لحاظ سے بہترین کتابیں تھیں، ان میں سے دو اشخاص فارابی اور ابن سینا کا فضل و کمال نہایت بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اور ان کو علوم فلسفہ میں ید طولیٰ حاصل تھا چنانچہ

ان کا شمار چوٹی کے فلاسفہ میں ہے،

علم الفلک، اور علم النجر کو خصوصیت کے ساتھ ایران میں ترقی ہوئی، علم الکیمیا، سے اگرچہ عام طور پر علانیہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کے نتائج بھی عمل تقطیر اور بارود کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے۔
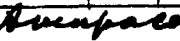
مسلمانانِ اندلس نے اشاعت علوم اور ترقی تعلیم میں مشرقی مسلمانوں کی تمام تر تقلید کی تھی اُن کی اس علمی جدوجہد میں یہود بھی شریک تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارھویں صدی عیسوی میں ابن باجہ[1]، ابن طفیل اور ابن رشد، جیسے اوالعزم اور بلند مرتبہ فلاسفہ پیدا ہوئے جیکہ علم وفضل کی مثال (نظیر) قرونِ ماضیہ میں نہیں ملتی۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کو صرف اس لئے "فلسفہ عربیہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ عربی زبان میں لکھا اور مدون کیا گیا، حالانکہ درحقیقت یہ فلسفہ تمام تر یونانی، ساسانی یا صرف یونانی فلسفہ کیوں کہ اس کے عناصر کلیتہً یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔

اس زمانہ میں جو شخص یونانی علوم سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا تھا وہ بڑا فاضل مانا جاتا تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں یونانی علوم وفلسفہ کا واحد مرکز تھا شام وعراق کی فضیلت یورپ پر صرف اس لئے مانی جا سکتی ہے کہ انہوں نے یونانی علوم وفنون کے تراجم میں پیش قدمی کی، اور اس کی یہی وجہ یہ تھی کہ اقلیدس، بطلیموس اور ارسطو کی کتابیں حران اور بغداد میں بآسانی مل سکتی تھیں اور پیرس میں وہ میسر نہ آتی تھیں۔

افسوس! صد افسوس!! کہ اہل قسطنطنیہ نے سخت بخل سے کام لیا۔ کاش وہ اُن علمی خزانوں کے معاملہ میں ہم سے بخل نہ کرتے جو ان کے پاس محفوظ چلے آتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ آٹھویں یا نویں صدی کے ابتدا ہی میں ہمارے ہاں لسکاریس اور بیساریوں جیسے لوگ پیدا ہو جاتے، تو ہمیں بارہویں صدی میں یونانی علوم وفلسفہ کے لئے بغداد، قرطبہ اور طلیطلہ کا دست نگر اور مرہون منت نہ ہونا پڑتا۔

لیکن فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک راز ہے کہ جب کسی قوم کے علوم ومعارف برباد اور انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں، تو

---

[1] ابن باجہ، یورپین مصنفین، انہیں ([illegible]) کہتے ہیں اندلس کا نامور فلسفی جنے سب سے پہلے علوم نظریات میں تمیز پیدا کی گیارھویں صدی عیسویں کے اختتام پر سارا قوسہ میں پیدا ہوا اور ۱۱۳۸ء میں عین عالم شباب میں چالیس برس سی بھی کم عمر میں بمقام فاس وفات پائی دیگر فلاسفۂ اسلام کی طرح اُسے بھی علم طب میں کمال حاصل تھا فلکیات کا بھی بلند مرتبہ عالم تھا ایک کثیر جماعت نے اس سے شرف تلمذ حاصل کیا جلیل القدر اسلام فلسفی ابوبکر ابن طفیل صاحب کتاب حی ابن یقظان اس کے تلامذہ میں سے ہے یہ حی ابن یقظان ابن سینا کی حی بن یقظان نہیں ہے اسلئے کہ دونوں کا موضوع بحث جداگانہ ہے اگرچہ نام میں اشتراک ہوگیا ہے (مترجم)

دوسری قوم ان میں ترقی اور جلا دیتی ہے، اور یہی ان بدقسمت اور مقہور و معتوب فلاسفہ (اسلام) کی شہرت اور مقبولیت کا واحد سبب ہے اور ضعیف الایمان وضعیف العقائد حرانیوں کے فضل و کمال کا بھی یہی سبب تھا۔

ان میں عربی کتابوں کے تراجم نے جو یونانی سے لئے گئے تھے اہل یورپ کو یونانی علوم و فلسفہ سے روشناس کرایا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے درحقیقت جس وقت عربوں کا آخری فلسفی ابن رشد مراکش میں بستر مرگ پر ہذیان ونسیان میں آخری سانس لے رہا تھا، یورپ اس وقت اکتساب علوم کی جد و جہد میں مصروف تھا اور املا رد علوم عقلیہ پر بحث و مناظرہ کر رہا تھا، اور اس طرح یورپ نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو اس کی ذہانت کے موافق تھا، اور اس نے بتدریج اس ترقی اور انقلاب کی ابتدا کی جس کا نتیجہ تھا کہ انسانی عقلوں سے تمام پردے ہٹ جائیں۔

پیرس میں جبل جنیفیف پر ایک دارالتعلیم کی بنیاد رکھی گئی، اور ہمیں صرف ان اصلی کتابوں کی ضرورت تھی جو علوم قدیمہ کے حقیقی ماخذ و مرکز میں لکھی گئی تھیں اور یہ بات بادنیٰ ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگر یہ کتابیں بجائے عربی تراجم کے براہ راست کتب خانہ قسطنطنیہ سے حاصل کی گئی ہوتیں، تو بدرجہا بہتر تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ عربی زبان یونانی تخیلات اور افکار کی ادائگی سے بالکل عاجز ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کنیسۂ روما اور کنیسۂ قسطنطنیہ کے باہمی مذہبی اختلافات اور تنازعات نے اس کا موقع نہ دیا اس سلسلہ میں اس منافرت اور جذبات بغض و عناد کو بھی شامل کر لینا چاہئے جو ۱۲۰۴ء کی جنگ کے بعد آپس میں پیدا ہو گئے تھے بایں ہمہ اگر ہم فرض کر لیں کہ ان اصل کتابوں کا ملنا ممکن تھا پھر بھی تو ہمیں تین سو برس تک انتظار کرنا پڑتا تاکہ لیففر دی تابل اور یودیہ جیسے یونانی زبان کے ماہر پیدا ہو جائیں جو اصل یونانی کتابوں کا ترجمہ کر سکیں۔

انہیں اسباب کی بنا پر ہمیں اسپین سے یونانی علوم لینے پڑے جو در اصل فلسفہ یونان کے محرف اور بالکل غلط ملط تراجم تھے جیسا کہ کتبخانہ قسطنطنیہ کی اصل کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

اعلان

سیرت

(جناب نجم الحسن صاحب محمود اسرائیلی)

سیرت دنیا کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ پاکیزہ سیرت کا مجموعہ بلند ترین نوعیت انسانی کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی اعلیٰ صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ صنعت پیشہ، دیانت دار، نیک ارادہ، باوضع اور بااصول لوگ غرض ہر شعبۂ حیات میں جو عدیم النظیر اور ذکی الحس ہستیاں ہوتی ہیں انہی کی وجہ سے دُنیا کو بالطبع عظمت انسانی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ایسی ہستیوں پر اعتماد اور ان کی تقلید کرنا ایک قدرتی امر ہے کیونکہ محاسن دنیوی کے یہی ہستیاں علمبردار ہوتی ہیں اور اگر دستِ عالم پر انکا مایۂ ناز وجود نہ ہو تو یہ خاکدان عالم قابل رہایش ہی نہ رہے ذہانت ہمیشہ خراج تحسین حاصل کرتی ہے مگر سیرت دلوں پر تعظیم و تکریم کا سکہ بٹھاتی ہے اول الذکر دماغی قوت کی آوردہ ہے مگر آخر الذکر کا سرچشمہ دل ہے اور اگر ہم بنظر تعمق دیکھیں تو دل ہی حیات انسانی پر حکمراں نظر آئیگا، ذی علم ہستیوں کے مراتب قابلیت کے تناسب سے حلقہ احباب میں ہوا کرتے ہیں مگر بااصول اشخاص کی عزت ان کی ضمیر کے لحاظ سے ہوتی ہے اول الذکر کی لوگ تعریف و توصیف کرتے ہیں مگر آخر الذکر کی رہنمائی کو فخر سمجھا جاتا ہے بڑی ہستیاں ہمیشہ عدیم المثل ہستیاں ہوا کرتی ہیں کیونکہ بزرگی کا بھی فی نفسہٖ ایک معیار ہے فی الحقیقت دُنیا میں اکثر لوگوں کی حیات مستعار اسقدر محدود ہوتی ہے کہ ان کی عظمت حاصل کرنے کے مواقع بہت کم دستیاب ہوتے ہیں مگر ہر شخص اپنے فرایض ایمانداری عزت شرافت اور حسب لیاقت انجام دے سکتا ہے وہ عطیات ربانی کا جائز استعمال کر سکتا ہے اور اُن کے برے مصرف سے گریز کرنے پر قادر ہے وہ اپنی زندگی کو بہترین بنانے کی سعی کر سکتا ہے وہ ادنےٰ سے ادنےٰ معاملات کو بھی صداقت انصاف، ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے الغرض انسان اس دائرہ میں رہکر جو قدرت نے اسے ودیعت فرمایا ہے اپنے فرایض منصبی کو بوجہ احسن پورا کر سکتا ہے۔

گو بادی النظر میں ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر فی الواقع فرایض کی انجام دہی تمام اُن صفات حسنہ کا مجموعہ ہے جن سے اعلیٰ ترین حیات انسانی اور سیرت مرکب ہے ممکن ہے کہ اسی میں دور از کار شجاعت کا فقدان ہو مگر انسان عموماً شجاع نہیں ہوا کرتے اور اگرچہ ادائگی فرایض کا احساس انسان

کو اعلیٰ صفات سے ہمکنار کر دیتا ہے مگر با ایں ہمہ اس کو معمولی اور خانگی امور سے بھی روزانہ نہایت صبر و استقلال کے ساتھ سامنا کرنا پڑتا ہے حیات انسانی عام فرائض کے مجموعہ کا نام ہے اہم ترین نیکیاں وہ ہیں جن کا ہم کو روزانہ ساتھ پڑتا ہے کیونکہ انسان کے ذریعہ ہی سے ہماری پوری آزمایش ہوتی ہے اور وہی سب سے زیادہ دیرپا بھی ثابت ہوتی ہے وہ "ظنی" "فضائل جن کی تکمیل سے معمولی دل و دماغ کا انسان عاجز ہے محض تحریص و خطرات کا موجب ہوا کرتے ہیں برک کا مقولہ ہے کہ "جب تک انسانی ذہنیت کا مدار رستمانہ فضائل پر رہیگا یا تو اس میں خلاف فطرت اختلاط رونما ہونے لگے گا یا وہ فسق و فجور کا آماجگاہ بنجائے گی"۔

ڈاکٹر آباٹ اسقف کنٹربری نے جب اپنے متوفی دوست مہتمم خزانہ ملکہ الزبیتھ کی سیرت کی تعریف کی تھی تو اس کو بہ حیثیت ایک اعلیٰ مدبر یا نازک خیال شاعر کے دنیا کے روبرو پیش نہیں کیا تھا بلکہ معمولی فرائض حیات کو مدنظر رکھتے ہوئے عام انسانوں کی طرح ان الفاظ میں محاسن بیان فرمائے تھے "میرے مرحوم دوست میں کسقدر عدیم المثل نیکیاں تھیں! ان سے زیادہ کون اپنی بیوی سے محبت، اپنی اولاد سے شفقت، اپنے دوستوں سے وفاداری، اور موانست، اپنے دشمن سے رواداری اور اعتدال پسندی اور اپنے اقوال کا پاس کرسکتا ہے"۔ دراصل انسان کی اصلی سیرت اور اس کے محاسن اس طرز عمل کو دیکھکر کافی ذہن نشین ہو سکتے ہیں جو وہ اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے کرتا ہے کیونکہ بہ حیثیت مصنف مقرر یا مدبر کے اس کی سیرت کے خد و خال اچھی طرح نمایاں نہیں ہو سکتے، اگرچہ عموماً فرائض سے وہ معاملات مراد ہوتے ہیں جن سے معمولی درجہ کے لوگوں کو اپنی حیات عمومی میں اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے تاہم اعلیٰ سے اعلیٰ سیرت کے نفوس کے لئے بھی خوے ضبط و تحمل ان فرائض ہی کیوجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے نفوس علم و دولت یا اقتدار کے مالک ہوں انکے بھی بغیر انسان کے دل میں استواری اور پاکیزہ جذبات کی افراط ہوسکتی ہے اور یہی نہیں بلکہ انہیں ایمانداری، صداقت اور فرمانبرداری کے جوہر بھی ہو سکتے ہیں جو شخص اپنے فرائض کو کما حقہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ اپنی خلقت کے اصلی منشا کی تکمیل میں سرگرم ہوتا ہے اور اپنی ذات میں ان اصول کو مرتب کرتا ہے جو اعلیٰ سیرت کے حامل ہوتے ہیں دنیا میں سینکڑوں ایسے انسان ہیں جن میں بجز اعلیٰ سیرت کے کوئی اور خوبی نہیں پھر بھی وہ صرف اسی کی بدولت ایک خود مختار کی طرح اپنے ارادوں میں مستحکم و استوار نظر آتے ہیں۔

ذہانت سے پاک طینتی یا اعلیٰ سیرت کا کوئی تعلق ضروری نہیں ہے جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ تھوڑی سی نیک زندگانی علمیت کے طومار سے کہیں افضل ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ علم کی اہمیت کم کردی جائے

مگر مقصود یہ ہے کہ علم کو نیکی کی راہ پر لگایا جائے بعض اوقات علمیت کمینہ اطوار میں آلودہ نظر آتی ہے اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس کے غلام بن جاتے ہیں اور ادنیٰ طبقوں میں اس سے شیخت آجاتی ہے انسان صنعت و حرفت، علم ادب اور طبیعات وغیرہ میں کامل دسترس حاصل کرنے کے بعد بھی غریب اور جاہل کاشتکاروں کی طرح ایماندار نیک طبیعت حق گو اور فرض شناس بن سکتا ہے۔ برتھیس نے اپنے دوست کو لکھا تھا کہ آپ مصر ہیں کہ میں ذی علم لوگوں کی عظمت کروں اس سے مجھے انکار نہیں مگر یاد رہے کہ خواہ آدمی کتنا ہی ذیعلم کیوں نہ ہو وسیع خیالی، کشادہ دلی، انصاف پسندی، تجربات عالم، اطوار کی سنجیدگی جرات آزمائی۔ خوش اسلوبی سے کام کرنے کا طریقہ، صداقت، انس، ایمانداری اور فنافی المقصد ہوجانا ایسی صفات ہیں جن کا ان میں فقدان ہوتا ہے اور ان کی تکمیل کے لئے ان کو اور ذی علم ہونا چاہئے۔

سر والٹر اسکاٹ جب تقریر کر رہے تھے تو سامعین میں سے ایک شخص نے اُن سے علمی تجر کو دیگر صفات سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں فاضل مقرر نے جواب دیا کہ اگر نفضیلت کی دلیل تمہارا یہی اصول ہوتا تو دنیا کیسی حقیر شے بن جاتی!! میں نے اپنی عمر میں اعلیٰ ترین تصانیف کی ورق گردانی کی ہے اور مجھے ہمثیل علما و فضلا سے شرف محبت بھی حاصل ہوچکا ہے مگر یقین جانئے کہ مشکلات و مصائب کے موقعوں پر جن بہادرانہ جذبات کا اظہار اور اپنے احباب اور ہمسایوں کے معاملات میں جن سادہ مگر صداقت آمیز خیالات کو میں نے غریب بے علم لوگوں کے لبوں سے سُنا ہے وہ اہل علم لوگوں میں دیکھے نہ سُنے!! تعلیم قلب کے لئے جب تک ہم ایسا علم نہ حاصل کریں گے جس سے ہر شے چاندنی کی طرح درخشاں نظر آئے ہم کو ہرگز اپنی ضروریات اور ان کی قدر و قیمت کا احساس اور عظمت آشکارا نہ ہوسکے گی سیرت کو اعلیٰ کرنے کے لئے دولت کی بہت ہی کم ضرورت ہے اس کے برعکس حقیقت یوں ہے کہ دولت سے اکثر سیرت میں پستی اور خرابی واقع ہوجاتی ہے دولت اور ابتری عیش پسندی و بدکاری میں ایک خاص رشتہ ہے ضعیف الارادہ افراد جن کو اپنی ذات یا اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوتا دولت کے سبب حرص کے پھندے میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور فی الحقیقت یہ دولت ہی ان کی اور ان کی وجہ سے دوسروں کی ذات میں بُرائی پیدا کرنے کا سرچشمہ بنجاتی ہے اس کے برعکس کسی قدر مفلسی سے انسان کی سیرت پر مفید اثرات مرتب ہوجاتے ہیں اگر انسان محض اپنی دستکاری کفایت شعاری اور دیانت داری پر پورے طور پر کاربند ہو تو اس حالت میں بھی وہ حقیقی انسانیت کے اعلیٰ مدارج بہ آسانی طے کرسکتا ہے۔ مسٹر برن

اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ "اولوالعزمی دکھانا" اگرچہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہ تھا۔ سچ ہے نیک اور جرات آزما دل کے بغیر انسان کی قدر و قیمت ایک حبہ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

سیرت در اصل جائداد ہے مقبوضہ اشیا میں وہ سب سے پاکیزہ چیز ہے۔ عوام کی منفعت اور انسانی عزت کے لحاظ سے وہ ایک ریاست سے کم فائدہ بخش نہیں جو لوگ اس پر قابض ہوتے ہیں گو وہ بظاہر دنیوی مال و متاع سے کافی مستفید نہ ہو سکیں مگر دنیا کی نگاہ میں ان کی کافی شہرت اور عزت ہوتی ہے اس میں کلام نہیں کہ زندگانی کے خصائل حسنہ زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ دستکاری نیکی اور سعادت کا رتبہ دنیا میں سب سے اعلیٰ اور صرف وہی افراد یہاں صفت اولین میں شامل ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت ہر لحاظ سے نیک ہیں۔ (ترجمہ)

نوائے دلگیر

(مولینا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

دل کو اپنے پہلے ہم اتنا شکیبا دیکھتے — شوق سے پھر اُن کا حسن بے محابا دیکھتے

گر کے قدموں پر تمہارے جس نے آخر جان دی — تم ذرا اُس مرنے والے کا کلیجا دیکھتے

وصل کی شب تیرے ارمانوں سے کہتا تھا کوئی — سُرمگیں آنکھوں کا اُن کی آج نشا دیکھتے

اک جھلک نے جس کی کرڈالا دو عالم کو خراب — چاہتا ہے جی کہ اک دن پھر وہ جلوا دیکھتے

دوش پر وہ عنبریں زلفوں کا سایہ ڈال کر — اپنے عاشق کا ذرا دنیا سے اُٹھنا دیکھتے

اب کہاں ہے وہ دلِ مرحوم اے اہلِ نظر! — میری آنکھیں دیکھتے اور اُس کا مرنا دیکھتے

ہائے کیا دنیا کی محفل میں کوئی پرساں نہیں — عمر گذری ہے ہمیں اس دل کو تنہا دیکھتے

نشے سے آنکھ میں، کچھ نیند، کچھ انگڑائیاں — پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھتے

حسن کی تھی وہ فراوانی جہانِ حسن میں،
صرف دو آنکھوں سے اے دلگیر کیا کیا دیکھتے

مترجمات

بعض مشہور تاریخی مغالطات کی اصلاح

فلسفۂ تاریخ کے اس اصول کے مطابق کہ "جو واقعات جسقدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہو جاتی ہے"، مندرجۂ ذیل واقعات شہرت کے منظر عام پر لائے گئے اور مسلمات میں داخل سمجھے گئے ہیں حالانکہ ان کی اصلیت کچھ اور ہے۔

(۱) یہ غلط ہے کہ جس وقت شہر روما جلایا جا رہا تھا اسوقت روما کا بادشاہ نیرو ([illegible]) قذل (ایک باجا) بجا رہا تھا، کیونکہ وہ تو اس وقت انطیوم میں اپنے محل کے اندر تھا جو روما سے پچاس میل دور ہے۔ پھر قذل سولہویں صدی سے پہلے ایجاد نہیں ہوا تھا۔

(۲) یہ بھی غلط طور پر مشہور ہے کہ سراج الدولہ نے ۱۴۰ انگریزوں کو کلکتہ کی ایک تنگ تاریک کوٹھری میں بند کرکے مار ڈالا۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان میں اس کا کچھ ہی اثر ہوا ہو مگر یہ محض "مقدس اختراع" ہے!

(۳) یہ بھی غلط مشہور ہے کہ سر والٹر ریلے آلو اور تمباکو امریکہ سے انگلستان لایا تھا۔ اس لئے کہ سر جان ہاکنس تمباکو، اور سر فرانسس ڈریک آلو لانے والے ہیں۔

(۴) اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جیمس واٹ نے اسٹیم انجن ایجاد کیا تھا۔ البتہ اس نے اسمیں کچھ اضافہ کیا مگر اصل میں ایڈورڈ سومرسیٹ (مارکوئس آف ورسسٹر) نے ۱۶۵۵ء میں اس کو ایجاد کیا تھا۔

(۵) اسی طرح مارکونی کا "تلغراف بے سیم" ([illegible]) ایجاد کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ مارکونی نے اس کو ترقی دی اور اس مطلب کے لئے اسکا استعمال بتایا لیکن اسکے اصل واضعین اور موجد ہرٹز (Hertz) اور کلرک میکسویل تھے۔

اسلام اور ڈینٹی

مجریط (اندلس) کے ایک زبردست مستشرق اور عربی کے جید عالم پروفیسر آسین نے اٹلی کے نامور شاعر ڈینٹی کی مشہور کتاب ڈِوائن کامیڈی (Divine Comedy) کا مقابلہ اسلامی تصانیف سے کرکے بتایا ہے کہ ڈینٹی نے اپنی کتاب میں اسلامی خیالات سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اسی پر اکتفا نہ کرکے پروفیسر موصوف نے امام ابن العربی رح کی تصانیف سے مثالیں پیش کی ہیں اور انکا مقابلہ ڈینٹی کی عبارت سے کرکے ثابت کردیا ہے کہ یہ مشابہت و مماثلت کوئی اتفاقی حیثیت نہیں رکھتی۔ حال میں پروفیسر سرٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے رسالہ "منارۃ" میں اس پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"انگریزی کی اُن تمام عظیم الشان اور معرکۃ الآرا کتابوں میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں، ایک کتاب "اسلام اور ڈوائن کامیڈی" ہے جس کو اندلس کے ایک مشہور عربی داں عالم پروفیسر آسین نے (جو مجریط کی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں) اسپینی زبان میں تصنیف کیا ہے جب پہلے پہل یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تو یورپ اور امریکہ کے علمی حلقوں خصوصاً کلام ڈینٹی (Dante) کے شیدائیوں میں ایک ہل چل مچ گئی۔ مؤخر الذکر گروہ کے لئے تو یہ معلوم کرنا یقیناً ایک سخت اور ناقابل برداشت صدمہ تھا کہ کتاب "ڈوائن کامیڈی" جو قرون وسطیٰ کے کلیسائے کاتھولیکہ کے دینیات، فلسفہ اور علم الکائنات کی دائرۃ المعارف ہے، اپنی نمایاں خصوصیتوں میں اسلامی ماخذ کی رہین منت ہے! پروفیسر آسین نے اپنے اس جرات آمیز نظریہ کی تقویت و اثبات کے لئے زبردست شواہد پیش کئے ہیں اور عربی لٹریچر پر اپنے کامل عبور، خصوصاً صوفیائے اسلام میں سے ابن العربیؒ کی تصانیف سے . . . .

اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ان مشہور اندلسی عالم و فلسفی کی تصانیف کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، جنھوں نے ڈینٹی کی ولادت سے صرف ۲۵ برس پہلے وفات پائی۔ پروفیسر آسین نے ہر دو مصنفین کے کلام میں مشابہت کی کئی مثالیں پیش کرکے دونوں کے طرز بیان اور صوفیانہ استعارات و تشابیہ

کو تبلایا ہے جو اِن دو نوں فلسفیوں کی تحریر میں پائے جاتے ہیں"
اس کے بعد دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سر آرنلڈ لکھتے ہیں :-

"ڈینٹی کی مشہور نظم کا موضوع، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے ؛ دوزخ، اعراف اور بہشت میں نشاۃ ثانیہ کا بیان ہے - پروفیسر آسین ڈینٹی کے بیان کا مقابلہ پیر اسلام کے واقعہ معراج کے بیان سے کرتے ہیں جو عربی لٹریچر میں بہت اہم رہا ہے کہتا ہے، بعض مسلمان مصنفین نے واقعات معراج کو بطور تاریخی واقعات کے لکھا ہے اور بعض مصنفین نے صوفیانہ رنگ میں اُن کا ذکر کرکے اعمال نیک کے ثواب اور گناہوں کے عذاب کے متعلق اُن کو اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے - ہم اس وقت اُن جزئیات کو پیش نہیں کرنا چاہتے جن کو پروفیسر آسین نے فاضلانہ طور پر پیش کیا ہے کیونکہ یہ کتاب اب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے اور انگریزی داں اصحاب کے لئے سہل الحصول ہے - پروفیسر موصوف کی پیش کردہ متعدد مثالیں ایسی واضح اور مشابہ ہیں کہ ان کو اتفاقات میں نہیں شمار کیا جا سکتا ضمناً یہ کتاب مذہب اسلام کے مطالعہ اور قرون وسطی کے یورپ پر اسلامی اثرات پر بہت روشنی ڈالتی ہے"

کتاب سعد السعود

ایران کے ایک نامور عالم شیخ ابوعبداللہ زنجانی نے مصر کے نامور ادیب احمد تیمور پاشا کو ایک خط لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"مجھے کتاب "سعد السعود" دستیاب ہوئی ہے جس کو ۶۵۱ھ میں علی بن موسیٰ بن محمد الطاؤس نامی امامیہ کے ایک عالم نے تالیف کیا تھا اس کا موضوع یہ ہے کہ مؤلف نے صحف سماوی مثل قرآن، توراۃ، انجیل، صحف ادریس، اور دقدمار کی چند تفاسیر فی سبیل اللہ وقف کر دیں جو اگرچہ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں تاہم ابن الندیم نے الفہرست میں انکا ذکر کیا ہے مؤلف نے انہی کتابوں سے عمدہ اور مفید انتخابات اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں - ان منقولات میں سب سے زیادہ اہم ایک نسخہ انجیل کی آیات ہیں جن کے شروع میں لکھا ہے

"مشرح انجیل جس کو مارلما مطران ...... نے امیرالمومنین المامون کے لئے اس سنہ میں تصنیف کیا جبکہ نسطوریہ نے یعاقبہ پر خروج کیا تھا اور خلیفہ نے اس کی اعانت کی تھی۔ سُریانی سے عربی میں دونوں زبانوں کے علمار کی موجودگی میں منتقل کیا گیا انجیل کا وہ نسخہ (سریانی) اصل نسخہ سے نقل کیا گیا تھا اور یہ نسخہ اس (سریانی) نسخہ سے نقل کیا گیا ہے"

اس انجیل کی آیات اور موجودہ انجیل کی آیات میں بھی فرق پایا جاتا ہے صحف ادریس کو مولف نے کوفہ کے مشہد الطاہر" کے وقف کی ایک کتاب سے نقل کیا ہے جس پر "سنین ادریس" لکھا ہوا تھا اس میں لکھا ہے کہ :-

"بخط علیسی محرر، سریانی سے عربی میں ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن ہرون الصابی الکاتب نے نقل کیا"

ہرون غالباً زھرون کا محرف ہے اور یہ صابی وہی مشہور و معروف مترجم اور انشا پرداز ہے بہر حال اس کتاب سے بہت سے علمی ادبی اور تاریخی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

(الزہرار)

ایک فرانسیسی کی تعریف اسلام

موسیو سرویر (Servier) ایک فرنچ مشنری مصنف ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہر وقت زہر اگلنے پر مستعد رہتا ہے۔ حال میں اس نے ایک کتاب "سائیکالوجی آف دی مسلمان" کے نام سے لکھی ہے مسٹر اے۔ کِن روس (Kinross) انگریزی کے رسالہ "انگلش ریویو" میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"انگریز لوگ اسلامی ترقی کو ممکن خیال کرتے ہیں جبکہ موسیو سرویر اس کو نہیں تسلیم کرتے۔ ان کے نزدیک "مذہب اسلام۔ ایک وقتی مذہب ہے جو منجمد مُردہ اور ناقابل تغیر و ترمیم ہے"

اس کے خیال میں نصف تعلیمیافتہ مصریوں ہی نے اپنی قومیت کا زہر تمام عالم اسلامی میں افریقہ کے فرنچ مقبوضات تک پھیلا رکھا ہے"

مسٹر کِن روس موسیو مذکور کے ان نتائج پر چیلنج دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"کیا ایک مسلمان مصنف موسیو سرویر کے تتبع میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عیسائی مذہب ایک خاص وقت کے لئے

تہا اور کہ وہ منجمد مردہ اور ناقابل ترمیم ہے اور کیا وہ اسی کی دلیل جہین کر اہل پروشیا کو مثال میں نہیں پیش کر سکتا جنہوں نے نائرۂ جنگ و جدال مشتعل کیا اور صلح کو اپنی فریب بازیوں سے اڑا دیا؟ کیا وہ روم اور کلیسائے روم کو پیرو ([illegible]) میں اہل اسپین کی کارروائیوں، سنیٹ بارتھولمیو کی خونریزیوں، اور ملین کے "اولیائے مقتول" ([illegible]) اور اسی قسم کے چھوٹے بڑے مظالم سے تعبیر نہیں کر سکتا؟ کیا وہ فی زمانہ فرانس اور اطلی کو نہیں پیش کر سکتا جنہوں نے یونانیوں اور آرمینیوں کو ترکوں کے رحم پر چھوڑ رکہا ہے۔ یا اناطولیہ کے کاشتکاروں کو یونانیوں یا آرمینیوں کے رحم پر۔

"موسیو مذکور کے حق میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ وہ ان مسلمانوں سے خائف معلوم ہوتے ہیں جبکہ ہمیں ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔"

(انڈین ریویو)

ہنری فورڈ کی کامیابی کا راز

کوئی دس سال پیشتر، ہنری فورڈ نے اپنا یہ اصول قائم کیا تہا کہ اس نے اعلیٰ قسم کی مزدوری کی اجرت بازار کے نرخ سے زیادہ دینا شروع کیا۔ اور اپنی مصنوعات کو مقابلہ کی قیمتوں کی محدود سطح سے بھی زیادہ سستا بیچنا شروع کیا۔ تجارتی دنیا پہلے تو اس کے اس فعل پر مضحکہ اڑانے لگی، بعد میں اس نے کچھ توجہ کی اور آخر کار انہی اصولوں پر مقابلہ پر آمادہ ہو گئی مگر اس عرصہ میں فورڈ نے اچھی طرح ترقی کر لی تھی اور اس وقت سے وہ غالباً دنیا کا متمول ترین آدمی شمار کیا جانے لگا۔ اس کے یہی اصول آج بہی قائم ہیں، چنانچہ وہ کام کرنے والے مزدوروں کو سب سے زیادہ اجرت یعنی ۶ ڈالر روزانہ دیتا ہے اور اپنی موٹر کے کارخانہ میں کام کرنے والے اشخاص کو بازاری شرح اجرت سے ڈیڑھ ڈالر زیادہ ادا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف سالانہ ۳ فیصدی کام کرنے والے اس کے ہاں بدلتے ہیں جس سے روپیہ، اسباب اور وقت جو نئے کاریگروں کے تیار کرنے میں صرف ہوتا ہے بہت کچھ بچ جاتا ہے۔

(انڈین ریویو)

تفتیش جرائم

یہ بتانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت امداد جو سائنس پیش کرسکتا ہے، اسرار جرائم کے انکشاف میں استعمال کی گئی ہے علم الانسان، طب، کیمیا، طبیعیات، نفسیات، اور علم الانسان وغیرہ نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا ہے سگار پینے کی پائپ پر دانتوں کے نشانات اور سگار کا وہ سرا جو منہ میں رکھا جاتا ہے انکا امتحان خون کے دھبوں کا کیمیاوی تجزیہ اور بالوں کا بڑے غور وخوض کے ساتھ معائنہ کیا جاتا ہے۔ لندن میں کسی مکان کی کھڑکی کے شیشہ پر انگلیوں کے نشانات کافی خیال کئے گئے تھے جنہوں نے مجرم سے اقبال جرم کرالیا اس کی وجہ یہ تھی کہ "ماہر نشانات انگشت" نے یہ بتایا تھا کہ انگلیوں کی لکیروں اور ان کی خصوصیات میں ولادت سے لیکر وفات تک کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ اور لاکھوں قسم کے نشانات میں دو نشانات کبھی یکساں اور مشابہ نہیں پائے گئے۔ ایک سراغ رساں کسی مقدمہ کی تفتیش کر رہا تھا جو ایک گم شدہ بنک نوٹ سے متعلق تھا۔ جس کمرہ سے یہ نوٹ گم ہوگیا تھا وہاں اس کو ایک نیم کشیدہ چرٹ ہاتھ لگا۔ چونکہ اس کا سرا کٹا ہوا نہ تھا اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ کسی آدمی کا پیا ہوا نہیں ہے۔ اکثر اوقات جیب میں پڑی ہوئی گرد کے کیمیاوی اور دوربینی امتحانات عجیب غریب انکشافات کا سبب ہوا کرتے ہیں۔

کیسی چھوٹی اور معمولی چیز نے پروفیسر ویبسٹر کو پھانسی کی لکڑی پر لٹکوادیا۔ پروفیسر مذکور موجودہ زمانہ کا ایک نامور سائنس داں تھا جو بہت بڑی قابلیت اور بلند رتبہ خصائل کا آدمی خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اس میں عیب یہ تھا کہ وہ بہت جلد باز اور عصبیت و الانسان تھا۔ ایک روز اتفاقیہ طور پر روپئے کے معاملہ میں اسکے پرانے رفیق ڈاکٹر پارکمین سے اس کی لڑائی ہوگئی۔ اس لڑائی میں ڈاکٹر پارکمین کی موت واقع ہوگئی۔ اگر پروفیسر ویبسٹر اقبال جرم کرلیتا تو غالباً وہ معمولی سزا پاکر چھوٹ جاتا مگر وہ بالکل خاموش رہا اور اس نے اپنے دوست کے اعضا کو نابود کرنے کے لئے سائنس کے تمام بہترین ذرائع استعمال کرڈالے۔ اس نے اپنے معمل (لیبارٹری) میں مقتول کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے تمام اعضا، حتیٰ کہ ہڈیوں تک کو نیست و نابود کرڈالا۔ اب وہ مطمئن ہوگیا کہ مقتول کا ایک بال بھی نہیں بچا ہے جو اس کے جرم کا راز فاش کرسکے۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی چیز کو بالکل نظرانداز کرگیا۔ اس کی بھٹی (آتشدان) کی راکھ اور کوئلوں میں مصنوعی دانتوں کی ایک قطار کا کچھ حصہ پایا گیا جس کو دندان ساز نے پہچان کر بتادیا کہ یہ فلاں آدمی کا ہے۔ یہ دانت ایک ایسی سخت دھات کے بنائے گئے تھے جس پر

آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک سائنس داں کے لئے ایسی معمولی چیز کا بھول جانا ایک معمولی بات تھی مگر انہی دانتوں نے اس پروفیسر کو دار پر کھنچوا دیا۔ اور قبل ازیں اس نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا۔

چند سال پہلے مسز لیگلنٹ نامی ایک عورت شکاگو (امریکہ) سے یکایک غائب ہوگئی۔ اس کے اعزہ واقارب کو اس کے شوہر نے یہ کہہ کر اطمینان دلادیا کہ وہ اپنے بعض احباب کی ملاقات کو کہیں گئی ہے۔ مگر شادی کی انگشتری نے، جو اس کے شوہر نے اپنی دلہن کو کئی برسوں کے پہلے دی تھی، اس راز کو طشت از بام کردیا۔ یہ خاموش گواہ اس شخص کے مکان کے احاطہ میں ایک ایسڈ (تیزاب) کے پیپے میں سے برآمد ہوئی۔ تفتیش ہونے لگی اور قلیل عرصہ میں یہ معلوم ہوگیا کہ اس شخص نے اپنی بیوی کو مار کر اس کے جسم کو ایسڈ میں تحلیل کر ڈالا تھا، مگر اس خاموش اور بے زبان مگر ناقابل استحالہ گواہ کو وہ بالکل بھول گیا۔ اور اسی دھات کے ایک ناچیز حلقہ نے اس سے اقبال جرم کرایا۔

کچھ عرصہ پہلے نیویارک میں ایک یکہ وتنہا معمر آدمی مرگیا جس کا کوئی عزیز و قریب اس کے پاس دم واپسین حاضر نہ تھا۔ وہ بہت دولتمند آدمی تھا۔ اس کی حوائج زندگی کا دارومدار تمام تر اس کے گماشتہ پر تھا، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص اپنی طبعی موت نہیں مرا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر نے بھی جو اس کو دیکھنے آیا تھا کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا۔ ایک روز متوفی کے صراف کے ہاں ایک چک آیا، جس کو اب تک اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ یہ چک پہلی نظر میں بالکل صحیح اور درست معلوم ہوتا تھا۔ مگر بنک کے کلرک نے یہ معلوم کیا کہ دستخط کنندہ اپنے نام کے جزو اول کا ایک حرف لکھنا بھول گیا ہے جو کسی حالت میں غلط نہیں لکھا جاسکتا۔ وہ قلم جو اپنا نام لکھنے کا عادی ہے کبھی "البرٹ" کی بجائے "ابرٹ" نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک معمولی غلطی تھی جو حالت بے پروائی میں سرزد ہوگئی تھی۔ مگر اس پر تفتیش شروع ہوئی۔ اور آخر کار متوفی کے وکیل (سولی سیٹر) کو اپنے مؤکل کے قتل کا اقرار کرنا پڑا کہ اسی نے متوفی کو روپیئے کے لالچ سے مار ڈالا تھا۔

۱۹۱۷ء کے آخر میں ووائزین نامی ایک شخص نے ایک عورت کو قتل کرکے مقتول کے سر اور ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تاکہ شناخت نہ ہوسکے۔ اس کام کے لئے اس نے طوفان ہوا کی ایک رات کو پسند کیا تاکہ اس طوفان کے خوف سے مقتولہ کا لندن سے بھاگ جانا غیر ضروری امر معلوم نہ ہو۔ مگر اس کو مقتولہ کے اس کپڑے کا خیال نہ رہا (جو اس کے پاس رہ گیا تھا) اور جس پر دھوبی کی دکان کا نشان بنا ہوا تھا۔ آخر وہ گرفتار کرلیا گیا اور کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا۔

مشکوک ملزمین کے جرم اور بیگناہی کا اکثر ماہرین طب ہی کی شہادت پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مقدمات میں انگلستان کے ایک بیرسٹر کا مقدمہ بہت عظیم الشان ہے اس جرم کی طرف غالباً کسی نے توجہ بھی نہ کی ہوتی اور واقع شدہ موت کو ناگہانی یا خودکشی خیال کر لیا جاتا۔ اگر ماہرین طب اس کا ثبوت بہم نہ پہونچاتے۔ اس مقدمہ میں سوال یہ درپیش تھا کہ آیا "متوفی قتل کیا گیا ہے یا اس نے خودکشی کر لی ہے؟" آرام کرسی پر پڑی ہوئی لاش کی ہیئت سے قتل کا انکار کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہدیا کہ یہ لاش اس جگہ مرنے کے کوئی ۶۰ یا ۷۰ گھنٹوں کے بعد رکھی گئی ہے۔ لاش اپنی موجودہ حالت میں سرد نہیں ہو جانی چاہیے کیونکہ موت واقع ہونے کے ۲۴ گھنٹوں بعد وہ لاش سخت ہو گئی اور اس سختی کو دور کئے بغیر لاش کو حرکت نہیں دی جا سکتی۔ حالانکہ عضلات کو توڑے بغیر یہ ناممکن ہے۔ مگر عضلات نہیں ٹوٹے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کو سخت ہو جانے کے بعد حرکت دی گئی ہے جو موت واقع ہونے کے بعد ۶۰ یا ۷۰ گھنٹے تک وقوع میں نہیں آتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے لاش کو آرام کرسی میں رکھکر خودکشی کا خیال پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی تائید اس نقش قدم سے بھی ہوئی جو وہاں خون آلودہ زمین پر اٹھا ہوا تھا۔ اس قدم کا نقش قدم مقتول کا نہیں ہو سکتا تھا اور کہ یہ نقش قدم خون بہنے سے دو گھنٹے بعد یا غالباً اس سے بھی زیادہ مدت کے بغیر نہیں اٹھ سکتا تھا پھر وہ اس تاریخ سے بہت پہلے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ پولیس نے پہلی اطلاع ملنے پر اس مکان کا جائزہ لیا تھا۔ یہاں قاتلوں نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے تجاویز سوچی تھیں جو بالکل بیکار گئیں اور آخر کار قاتلوں کا پتہ چلایا گیا وہ گرفتار ہوئے اور اپنی سزا کو پہونچ گئے۔

یہ مقولہ کہ "قتل ہمیشہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا" ہمیشہ صحیح نہیں ہوا کرتا۔ ابھی ایسے تاریک اور پرخطر اسرار باقی ہیں جن کا انکشاف نہیں ہوا، اور وہ غالباً کبھی ظاہر نہ ہوں گے مگر "اعمال مخفی" عموماً چالاک اور تعلیمیافتہ آدمیوں کے نہیں ہوا کرتے عموماً غیظ و غضب سے مغلوب آدمی غیر ارادی قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا دیوانے اور مجنون آدمی ان افعال بلا مقصد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بیوقوف آدمی اپنے جرائم بلا مقصد کو چھپانے میں غلطی کر سکتا ہے مگر ایک چالاک خونی اپنی ترکیبوں کو نہیں چھپا سکتا اور وہ ایک معمولی بات کو نظر انداز کر جاتا ہے جو آخر کار اس کو اپنے کرتوتوں کی سزا دلاتی ہے۔ وہ بھولی ہوئی معمولی چیز اس کے کرتوتوں کی شاہد اور اس کے جرم کا "اشتہار" بن جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی حفاظت کے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اکثر یہ حالت رونما ہوتی ہے۔

ادبیات

سونیٹ

(جناب محمد عمر صاحب (کھتری) عباسی بی۔ اے (جوناگڈھی) مقیم حال لندن)

"دس مع الدھر کیف دار" کے زرین اصول پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی کر رہی ہے فیشن نہ صرف لباس وطرز معاشرت میں سرایت کر گیا ہے بلکہ علم وادب میں بھی داخل ہوتا جاتا ہے۔ اکثر شعرا اور مضمون نگار حضرات نے آجکل ایسی روش اختیار کر لی ہے جو بعینہ انگریزی طرز وروش کا خاکہ یا کسی مغربی زبان کا عمدہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ آجکل یہ طرز سخن اور پیرایہ بیان مقبول خاص وعام ہو رہا ہے اس سے ایک زبردست فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہماری پرانی شاعری جو گل وبلبل اور شمع وپروانہ اور وصل وہجر کے لغو اور مبالغہ آمیز خیالات سے بھری ہوئی تھی رفتہ رفتہ پاک ہوتی جاتی ہے اور بمصداق "کل جدید لذیذ" نیچرل شاعری جو مطبوع طبع ہر خاص وعام ہو گئی ہے ہماری پرانی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دینے کی باعث ہوئی ہے۔

اگر ہم خود کوئی اختراع وایجاد نہیں کر سکتے تو کم از کم غیروں کے عمدہ اختراعات کی نقل تو کر سکتے ہیں لیکن نقل کی جائے تو ایسی کی جائے کہ اصل کا دھوکا ہو ترجمہ وہی بہترین سمجھا جاتا ہے خواہ وہ نظم میں ہو خواہ نثر میں اپنی زبان کے قالب میں اس طرح ڈھال لیا جائے کہ طبعزاد معلوم ہو اور ترجمہ کا شبہ تک نہ گذرے۔

آج ہم ارباب سخن کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "سونیٹ" جو ایک مغربی صنف نظم ہے اور جو کسی حد تک ایک خاص قسم کے خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے مخصوص قرار دیگئی ہے اگر اس کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے تو یہ ہمارا اردو شاعری میں ایک اضافہ ہوگا، ہم یہ درخواست کرتے ہوئے خصوصًا اُن اصحاب سے جو انگریزی لٹریچر سے ناواقف ہیں سونیٹ کا تعارف کراتے ہیں۔

سونیٹ کی تعریف | سونیٹ ایک چودہ مصرعی نظم ہے جو ایک خاص وزن میں لکھی جاتی ہے چودہ مصرعے قوافی کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں دو۔ چار چار مصرعوں اور دو

تین تین کے۔ اول ۔ چہارم ۔ پنجم ۔ اور ہشتم مصراع ہم قافیہ۔ دوم ۔ سوم ۔ ششم ۔ ہفتم ۔ ہم قافیہ نہم و دوازدہم ہم قافیہ ۔ دہم و سیزدہم ہم قافیہ اور یازدہم و چہاردہم ہم قافیہ ۔ مزید وضاحت کے لئے نقشۂ ذیل ملاحظہ ہو۔

(مصراع) اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ چہارم ۔ پنجم ۔ ششم ۔ ہفتم ۔ ہشتم ۔ نہم
(قافیہ) ا ۔ ب ۔ ب ۔ ا ۔ ا ۔ ب ۔ ب ۔ ا ۔ ج
(مثال) آب ۔ بر ۔ تر ۔ تاب ۔ باب ۔ پر ۔ ثمر ۔ خواب ۔ راز

(مصراع) دہم ۔ یازدہم ۔ دوازدہم ۔ سیزدہم ۔ چہاردہم
(قافیہ) د ۔ ہ ۔ ج د ہ
(مثال) فصاحت ۔ مثال ۔ نیاز ۔ بلاغت مقال

کبھی کبھی اس میں فرق کیا جاتا ہے جو ہم آگے چل کر بتائیں گے ۔ مگر ہمیں علاوہ وزن اور قوافی کے خیالات وجذبات کی بھی قید ہے یعنی ایک ہی موضوع کو اول سے آخر تک نباہتے ہیں اور اس میں روانی اور مناسبت ایسی ہوتی ہے کہ اول سے آخر تک چودہ مصرعے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اگر اس کو ایک چودہ مصرعی جملہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا آخری مصرع میں سارے مضمون کا لب لباب کوئی جامع مقولہ یا ضرب المثل یا حاصل مطلب اس خوبی سے لایا جاتا ہے کہ اگر اس آخری مصرع کو یاد رکھ لیں تو ساری سونیٹ کا مطلب یاد ہوجاتا ہے عموماً سونیٹ کو عاشقانہ جذبات کا جامہ پہنایا جاتا ہے ۔ اگر اس موضوع خاص کے علاوہ اور موضوعات بھی اختیار کئے جائیں تو اس میں بخوبی ادا ہوسکتے ہیں اس طرح کی نظم کو ہم اپنی زبان میں "مسبع" کہہ سکتے ہیں اور میرے خیال میں یہی موزوں بھی ہے۔

سونیٹ کی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی میں اطالوی زبان میں اس کا رواج ہوا اور اس زبان کی روانی اور لطافت نے اس میں روح پھونک دی ۔ سولھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے شعراء نے اس میں کچھ تبدیلی کرکے جو انگریزی زبان کے لحاظ سے لازمی تھی اس طرح کی نظمیں لکھنا شروع کیں اور قوافی کی ترکیب میں بھی کچھ تبدیلی کی ۔ اس کا خیر مقدم کرنے والوں میں سپینسر اور سر فلپ سڈنی تھے اس کے بعد شیکسپیر نے اس کو نشو و نما دی اس کی خامیاں دور کرکے نئی زینت بخشی اور قوافی کو بدل کر

اس طرح پر رکھا:-

اول - دوم - سوم - چارم - پنجم - ششم - ہفتم - ہشتم - نہم - دہم - یازدہم -
ا - ب - ا - ب - ج - د - ج - د - ہ - و - ہ - و

دوازدہم - سیزدہم - چاردہم -
و - ز - ز

اس نئے لباس نے اس کی زینت حسن کو دوبالا کر دیا - اور اس دن سے شاعران انگلستان،
اسی طرح پر لکھتے رہے - مگر ملٹن کے زمانے میں پھر اس کو اپنی حالت پر رکھا گیا مگر اس نے ایک نئی بات
یہ پیدا کی کہ اس سے پہلے جو چار حصص میں سے ہر حصّہ کے آخر میں وقف لایا جاتا تھا یعنی چار شعر کے بعد
جملہ ختم ہوا - پھر چار کے بعد پھر تین کے بعد اور پھر تین کے بعد ملٹن نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا - گویا اول سے آخر تک
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہاڑ میں سے ایک ندی نکلی اور سیلاب کی طرح بہتی چلی گئی اور آخری سرے پر آ کر سمندر سے
ہم آغوش ہو گئی - اسوجہ سے ملٹن کے سونیٹ پر شکوہ اور شاندار معلوم ہوتے ہیں جیسے اس کے دیگر اصناف سخن ہوا
کرتے ہیں -

ملٹن کے بعد سونیٹ مدتوں جسم بیجان کی طرح پڑی رہی آخر ورڈز ورتھ نے اس کو اصلی قالب میں ڈھال کر
اس میں از سر نو جان ڈالی - پھر روسیٹی اور مسز براؤننگ نے اسکو اور امتیاز بخشا فی الحال مسز براؤننگ کے سونیٹ
سب سے زیادہ مروج اور پسندیدہ ہیں -

قوانی کے لحاظ سے اس میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا نقشہ حسب ذیل ہے -

(اطالوی) اب ب ا - اب ب ا - ج د ھ - ج د ھ

(شیکسپیر) اب اب - ج د ج د - ہ و ہ و - ز ز

(ملٹن) اب ب ا - اب ب ا - ج د ج - د ج د

سونیٹ کو اردو کا جامہ پہنانے سے پہلے کوئی وزن مقرر ہونا چاہئے انگریزی وزن جو اس کے لئے
مخصوص ہے اگر اسکا تتبع انگریزی داں شعرائے اردو کر سکیں تو ایک ادبی مسئلہ طے ہو سکتا ہے اور ہم
"خذ ما صفا ودع ماکدر" پر عمل پیرا ہو کر انگریزی شاعری سے بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں اور ہماری اردو
شاعری اس سے بوجہ احسن استفادہ کر سکتی ہے بطور نمونہ ہم اپنے دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر

(جوناگڑھی) کا ایک سونیٹ جو اُنھوں نے میرے اصرار سے لکھا ہے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں امید کہ ناظرین زبان میں سے شعرا اس طرف توجہ فرمائیں گے اور سونیٹ لکھ کر ادب اُردو کو ممنون فرمائیں گے۔ وَھُوَ ھٰذَا:-

شہرِ خموشاں

کیا ہی یہ شہرِ خموشاں دل شکن نظارہ ہے ا
کیسی عبرت خیز ہے یہ اس کی پُرغم خامشی ب
حسرت و بیچارگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی ب
دیکھ کر جس کو دلِ مضطر بھی پارہ پارہ ہے ا
خاک کے تودے پڑے ہیں جا بجا کس شان سے ا
قبر ہے کوئی شکستہ اور کوئی اُجڑی ہوئی ب
سبزۂ خودرو کہیں ہے اور کہیں کائی جمی ب
ہیں پڑے سنگِ لحد بھی قالبِ بیجان سے ا

چھوٹ کر قیدِ مصیبت سے ہر اک آ کر یہاں ج
سو رہا ہے فکرِ عیش و جاودانی چھوڑ کر د
ان کی تربت پر فقط سبزہ ہے تنہا سوگوار ھ

صرف اک شبنم ہے ان کے حال پر گریہ کناں ج
بیکسی چھائی ہوئی ہے خفتگانِ خاک پر د
آہ یہ شہرِ خموشاں بھی ہے کیا اُجڑا دیار۔ ھ

(اختر)

شوالہ

(محمد شفیع صاحب شفیع اکبر آبادی)

(بسلسلہ ماہ جولائی ۱۹۲۶ء)

(۴)

زارہ اور ثمرہ عالم خیال میں شوالہ کی دیویوں کی کیسی ہی معتقد کیوں نہ ہوں۔ مگر بظاہر وہ ان سے زیادہ مانوس نہ تھیں۔ ہلیون کی آخری تاریخوں میں جبکہ بڑی دیوی کا اشنان ہوتا تھا یہ دونوں بہنیں کچھ صندل لیکر شوالہ میں حاضر ہوتی تھیں۔ اور ان کی وجہ سے اس دن اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا کہ مجبوراً انہیں بڑی دیوی کی پناہ لینی پڑتی تھی۔ اور پھر یہ اسوقت شوالہ سے باہر آتی تھیں جبکہ پجاریوں کے سوا کوئی شوالہ میں باقی نہ رہتا تھا۔ وہ عقیدت کی کمزور نہ تھیں مگر اُن کا جسم ضرور نازک تھا۔ وہ اگر گھر سے باہر آتیں تو انہیں لوگوں کی نگاہوں سے تصادم کا خوف رہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت محفوظ محجوب اور بچکر نکلتی تھیں۔

آذر شوالہ سے لوٹا تو اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ اُس نے ثمرہ کو بلایا اور کہا "دیکھو آئندہ ہرناق میرے محل کے دروازے پر نہ آنے پائے۔" ثمرہ نے نہایت متبسم لہجہ میں کہا "اگر یہ حکم آپ دربان کو دیتے تو زیادہ مناسب تھا" یہ کہہ کر وہ اُچھلتی کودتی ہنستی ہوئی ایک طرف روانہ ہو گئی۔

آذر نے زارہ کو آواز دی۔ زارہ آئی تو آذر نے کہا "زارہ میں نہیں چاہتا کہ تم ہرناق کی نگاہوں کے سامنے پھول برساؤ۔ اور بے حجاب چلی آؤ۔" زارہ نے نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ جبینی سے کہا "اگر آپ ہرناق کو یہاں آنے جانے سے روک دیتے تو یہ زیادہ مناسب تھا" اور وہ بھی سیٹی بجاتی، اور نگاہوں سے بجلیاں گراتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

آذر ایک عجیب کش مکش میں تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہرناق نے بڑی دیوی کو منا لیا ہے اور بڑی دیوی اُسکی تمناؤں کو پورا کرنے میں ساعی ہے۔ اُسے قطعی شبہ تھا کہ ہرناق زارہ سے یا ثمرہ سے محبت کرتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک کے حاصل کرنے میں اس کا کامیاب ہو جانا یقینی ہے۔ اسکی فطرت، اسکی حسن پرستی، اور اس کا جذبۂ عشق

ایک ایسے جذبہ سے بدلا ہوا نظر آتا تھا جو اُس کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔ جیسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔ گرمقدور تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ اس کے آنسو جھلار گالوں پہ بہنے لگے اور وہ عالم خیال میں بڑی دیوی کے قدموں پر جاپڑا اُسے محسوس ہوا کہ بڑی دیوی ناراض ہے۔ اُس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ آذر کی پیشانی اور اور ہونٹوں کو اپنے پاؤں کا ذرا سا صندل بھی عنایت کرے۔ اُس نے جوش عقیدت میں اپنا سر اور آگے بڑھایا۔ دیوی اور سمٹی۔ اور جب آذر نے تیسری مرتبہ پابوسی کی جرأت پوری قوت کے ساتھ کی تو دیوی کے ہاتھ سے وہ تیر اُس کے سر پر گر پڑا جو جبروت و جلال کے مظاہرہ کے لئے اُس کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا اُسے اپنے سر میں ایک درد محسوس ہوا۔ وہ کراہا اور عالم خیال سے واپس آ گیا اُس نے آنکھیں کھولدیں۔ اپنے صنم کدہ میں گیا جہاں اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کئی بُت رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نسائی بُت کی طرف بڑھا۔ بُرش سے اُسے صاف کیا۔ مسالوں سے دھویا اور گردن پر رکھکر سیدھا شوالہ کی طرف پہونچا۔ پہاڑ کی چڑھائی نے اُسے کمزور کردیا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ شوالہ سے کچھ دور ایک درخت کے سایہ میں ٹھہر گیا اور دم لیکر پھر چڑھا۔ شوالہ کے دروازہ کو زور سے کھولا اور بڑی دیوی سے آنکھیں چُراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہاں جاکر آذر نے اپنا بُت نصب کیا۔ اُس پر صندل لگایا۔ لوبان کی دھونی دی۔ اور اُس کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ اپنے نئے بُت کا پرستار تھا۔ اب اُسے کوئی منع نہ کرسکتا تھا۔ اُسنے بُت کے پاؤں پوری قوت سے پکڑ لئے اور اس قوت کے ساتھ سجدہ کیا کہ اُس کی پیشانی سے خون بہنے لگا مگر اُس نے اس کی کچھ پروانہ کی۔

(۵)

ہرناق بدستور کھڑا ہوا تھا۔ شام ہوئی پُجاریوں نے شام کے مراسم ادا کئے۔ دیوی کے پہلو میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ ناقوس کی آوازوں نے انھیں لوریاں دیں۔ گھنٹے کی سُریلی صداؤں نے پیام خواب دیا۔ جب پُجاری اپنے فرائض ادا کرچکے تو ہرناق، ایک دُور اُفتادہ پروانے کی طرح بڑی دیوی کے چرنوں پر جاپڑا۔ اُس نے سب چراغ بُجھا دیئے اور دیوی کے سجدہ میں جھک گیا۔ یہ اُس کی آخری منزل تھی۔ اور عقیدت مندی اُسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے دیوی کے سامنے کھڑی تھی۔

زارہ نے ثمرہ سے کہا "بہن اباجان بہت خفا ہیں۔ شاید ہرناق کا کوئی بُت شوالہ میں مقبول ہوگیا ہے۔ چلو ذرا ہم بھی ہو آئیں۔ آج تو وہ بھی اپنا ایک بُت لے گئے ہیں"

دونوں ریشمی رداؤں میں ملفوف ہوئیں، اور پہاڑ پر چڑھ گئیں۔ بڑی دیر میں پہونچیں۔ بالائے کو۔

کی تازہ ہواؤں نے اُنہیں تازہ دم کر دیا۔ وہ چہلیں کرتی ہوئی شوالہ میں داخل ہوگئیں۔ بڑی دیوی کو سلام کرنے جھکتی تھیں کہ ہزناق کو سجدہ میں دیکھا۔ زارہ نے ثمرہ سے کہا "دیکھو ہزناق دیوی کو منا رہا ہے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے"
ثمرہ نے اِس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عقید تمندانہ خم کے ساتھ پھرا پھریں اور ثمرہ نے زارہ سے کہا "چلو ذرا اپنے باپ کے بُت کو دیکھیں" وہ تمام شوالہ میں پھریں۔ دیوتاؤں نے اُنہیں محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دیویوں نے خاموش نگاہوں سے اونکی پذیرائی کی۔ دوسری طرف اونہیں آذر نظر آیا۔ جو اپنے بُت کے قدموں پر مجروح و مجبور پڑا تھا۔ ثمرہ نے آواز دی۔ زارہ نے منع کیا اور بھاگ کر کسی طرف غائب ہوگئی۔

آذر نے آواز پہچانی غصہ اور نفرت سے منہ پھیر کر دیکھا۔ ثمرہ نے کہا "زارہ بھی یہیں ہے" آذر ایک ہیبت ناک انگڑائی لیکر اٹھا۔ اپنے بت پر غائر نگاہ ڈالی اور پوچھا "ثمرہ۔ زارہ کہاں ہے؟" "وہ ابھی تو یہیں تھی ابھی بھاگ گئی ہے" ثمرہ نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ آذر بڑھا سب سے پہلے بڑی دیوی کے بُت کے پاس آیا۔ دیکھا ہزناق دیوی کے سجدوں میں بالکل ڈوبا ہوا ہے۔ اُس نے زارہ کو ہر طرف تلاش کیا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا ثمرہ نے کہا "شاید وہ آپ کے ڈر سے نیچے اُتر گئی ہوگی۔"

آذر غصہ کی تیز آنکھیں چمکاتا ہوا شوالہ سے باہر نکلا۔ پہاڑ سے اُترا۔ گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ زارہ یہاں بھی نہیں ہے۔

آذر سخت پریشان تھا۔ دریا کے ساحل اور پہاڑ کی وادیاں آدھی رات تک چھانیں پھر شوالہ میں ڈھونڈا مگر زارہ کہیں نہ تھی۔

(۹)

شوالہ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ نصف شب گذر چکی تھی۔ چاند پوری روشنی کے ساتھ پہاڑی سبزہ میں تارے بنا رہا تھا جھینگر خواب آور نغموں سے شوالہ کی بیداریوں کو آسودہ خواب کر رہے تھے چشموں میں پانی بہنے کی آوازیں سریع ہوگئی تھیں۔ دریا کی موجوں کا شور سماعت میں تموج پیدا کر رہا تھا۔ آذر اپنے محل میں کش مکش کے لمحے جلد جلد کاٹ رہا تھا۔ ثمرہ اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی تمام گھر والے بار بار اُٹھتے تھے اور ہر آہٹ پر زارہ کے آنے کا اُنہیں یقین ہو جاتا تھا۔ آذر کا گمان ہزناق کی طرف ضرور تھا۔ مگر اُسنے دو تین بار شوالے کا چکر لگایا اور ہزناق کو ہر مرتبہ سجدہ ریز پایا۔ اس لئے آذر کا یہ گمان اس یقین سے بدلتا جاتا تھا کہ زارہ کو یا تو کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا یا وہ ڈر کر پہاڑ کی دوسری جانب گر پڑی۔ جہاں عمیق غار دل

میں ہمیشہ کے لئے اس کی قبر بن گئی ہوگی۔ بہرحال وہ بہت پریشان تھا۔ او خصوصیت کے ساتھ اس کی پریشانی یوں اور بھی زیادہ تھی کہ اس کی بیٹی دیوی کی بشارت اور اس کے خواب کی ایک زندہ تعبیر تھی۔

(۷)

آدھی رات کے بعد شوالہ کے اندھیرے میں ہرناق کی نماز گی بڑھی۔ وہ رویا۔ بہت زیادہ رویا، اور اس نے دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی! اب تو رحم کر۔ میں صرف زارہ کو چاہتا ہوں۔ دنیا درکار نہیں، اس کے بدلہ میں اپنے تمام بُت شوالہ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ دیوی تو نے مجھے گھر سے بُلایا ہے، میں دو روز سے بھوکا پیاسا تیرے چرنوں میں پڑا ہوا تجھے سجدہ کر رہا ہوں، تیری قوت سے پہاڑ کمر بستہ ہے، اور تیری ہیبت سے دریا سر پیٹ رہا ہے۔ تو اپنے تیرے آذر کا کام تمام کر، اور زارہ ——— آہ ——— زارہ کو مجھے دیدے۔ جلد دیدے۔ کہ میں تیری پرستش کے بعد اس کی پرستش کر کے اپنی جبین و آغوش کو صندل سے بسالوں۔ دیوی۔ اگر اب بھی تجھے اس میں عذر ہوگا، تو میں اپنا سر پھوڑ کر یہیں مر جاؤں گا۔ اور دُنیا بھر کے شوالوں میں تو ہرناق کُش مشہور ہو جائے گی۔" ہرناق یہ کہہ کر رو دیا اور پھر سجدہ میں جُھکا۔ وہ چاہتا تھا کہ دیوی کے پاؤں پکڑ لے مگر اس کے ہاتھ میں ایک گداز اور نرم کلائی آگئی۔ اُس نے شمع جلادی اور سر اُٹھایا۔ دیکھا تو زارہ اپنی تمام خوبصورتیوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی ہے۔ دیوی کی مسرت اس کے ہونٹوں میں مسکرا رہی ہے۔ اور زارہ کی نگاہوں سے رضامندی اور دلدہی کے پھول برس رہے ہیں۔

ہرناق تڑپ کر اُٹھا۔ اس نے زارہ کو ہمکنار کر لیا۔ اور گھبرا کر پوچھا "زارہ۔ زارہ۔ تم کیسے آئیں؟"

زارہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "جیسے تم آئے تھے!"

ہرناق پھر دیوی کے قدموں جھک گیا۔ زارہ نے بھی سجدہ کیا اور عقیدت کے آنسو نذر کرنے کے بعد دونوں شوالہ، سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

شمع کے ناکمل اُجالے میں، نہ معلوم ان کا ہاتھ کس چیز پر جا پڑا۔ ایک زور کا دھماکا ہوا۔ اور یہ دونوں آذر کے محل میں ایسی جگہ جا کر گرے جہاں آذر کروٹیں لے کر اپنی پریشانیوں کے مجسمے پامال کر رہا تھا۔ وہ اس شور کی آواز سے چونکا۔ آنکھیں کھولیں

"توہرناق" زارہ کے قدموں میں سجدہ ریز تھا اور زارہ حسن کی ایک عدیم النظیر باوقار دیوی کی طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔

زبان کے جولائی نمبر میں کتابت کی بعض افسوس ناک غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین درست فرمالیں۔

صفحہ ۲ آخری سطر میں توقعات رکھنی چاہئیں بنا لیجئے۔ صفحہ ۳ سطر ۵ بجائے "کلہ کوہ" کے "قلہ کوہ" ہونا چاہئے۔ اور سطر ۹ "ساعد اندلسی" کی جگہ "صاعد اندلسی" درست کر لیجئے۔ افتتاحیہ کے شعر میں درود سے اور سجود سے، ہونا چاہئے۔ اضافت کسرہ غلط ہے۔

صفحہ ۷ سطر ۱۲ "زبان ایک ایسے گوشے سے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۸ سطر ۱۰ "قابل نہ ہوگے" کی بجائے، قابل نہ رکھوگے۔ اسی صفحہ کی سترہویں سطر میں بجائے "پرنور" کے "پرشور" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۱ سطر دوسری "زبان کی خدمات کی بجائے "زبان" جن خدمات کی ہونا چاہئے۔ اسی صفحہ کی آٹھویں سطر میں بجائے "اہل نقاب" کے صرف "نقات واہل علم" ہونا چاہئے۔

ادبیات کے سلسلہ میں صفحہ ۳۳ کی بیسویں سطر میں "کارنامہ" کی جگہ "کارزانہ" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۴ کی سطر ۱۳ و ۱۴ میں "پایا انداز نہیں کہا جا سکتا" کی بجائے "یا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۵ کی سطر ۱۴ میں "مستقبل تصویر" کی جگہ "مستقل تصویر" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۶ کی سطر ۹ میں "خوش آئندہ" کی بجائے "خوش آیند" سطر ۱۱ میں "الفاظ میں" کی جگہ "الفاظ ہیں" اور سطر ۲۰ میں "نغل رہیں" کی بجائے "مخل رہیں" بنا لیجئے۔ صفحہ ۳۷ کی سطر ۱۶ میں "کم ہو نہ جائے" کی جگہ "گم ہو نہ جائے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۸ کی سطر ۴ میں "دینا ہور" کی بجائے "دینا ہر" ہونا چاہئے۔

نظم "مسلک تسلیم" کے آخری بند کا یہ شعر درج ہونے سے رہ گیا ہے ؎

تیری حقیقت ہی کیا اور ہے کیا اختیار
بندۂ الم سی کو کل اس سے نہیں کی ہو د

ایڈیٹر

لہو کی بُوند

جلوۂ رخ کو میں رنگینیٔ بستاں نہ کہوں
پرتوِ حُسن کو آئینہ حیراں نہ کہوں
گردشِ چشم کو پیمانۂ رقصاں نہ کہوں
وسعتِ وحشتِ خاطر کو بیاباں نہ کہوں

لیلیٰ عشق بنوں آہوئے صحرائی ہوں
بزمِ قدرت کے کرشموں کا نہ شیدائی ہوں

بھر رہا ہے گلِ مقصود کو داماں میں کوئی
ایک گلگوں لئے بیٹھا ہو گریباں میں کوئی
لذت اندوزِ طربِ محفلِ خوباں میں کوئی
محوِ اندوہ و الم فرقتِ جاناں میں کوئی

کوئی سرگرمِ فغاں ہے تو کوئی ہو دلشاد
لب پہ نغمہ ہے کسی کے تو کسی کے فریاد

تھا اسی فکر میں غلطاں کہ سرِ راہ گذر
مجھکو اک شاخ پہ آیا گلِ صد چاک نظر
جابجا داغ تھے سرخی کے نمایاں جس پر
اور شبنم کے چمکتے تھے درخشاں گوہر

موجِ نکہت میں تھے گیسو کی طرح پیچ و تاب
اس کا ہر داغ تھا رعنائی میں گلشن کا جواب

منظر اک عالمِ عبرت کا دکھایا اس نے
دیدۂ شوق کو مبہوت بنایا اس نے
اپنا افسانۂ غم گو نہ سنایا اس نے
جنبشِ لب سے مگر اتنا تو بتایا اس نے

"ساغرِ عیش نہ تصویرِ سبو کی ہوں میں"
"صفحۂ دہر میں اک بوند لہو کی ہوں میں"

زیر اب تک نہ ہوئی ہمتِ مردانہ مری
غیرتِ دل سے سبق لیتا ہے پروانہ مری
خاک کے ذروں سے لپٹا تھا کبھی دانہ مری
اس کے ہر پھول میں ہے نکہتِ مستانہ مری

"رہا خوظ یہ گلچیں کی جفا سے اب تک"
اس کی شاخیں نہ جھکیں دستِ صبا سے اب تک

کشتۂ تیغ جفا سے مری توقیر کو پوچھ
رہروِ ملکِ عدم سے مری تنویر کو پوچھ
گردشِ چرخ سے جا کر مری تاثیر کو پوچھ
بسملِ خستہ جگر سے مری تفسیر کو پوچھ
شمع ملت کی مرے داغ میں تابانی دیکھ
میرے ذرات میں آئینِ جہانبانی دیکھ

محمود (اسرائیلی)

مناظرۂ نظم و نثر

ذیل کا دلچسپ مناظرہ پروفیسر نواب علی صاحب کا غیر مطبوعہ ہے جو ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا ہم کو جناب نظام الحق صاحب عباسی حیرت (احمد آبادی) کی معرفت موصول ہوا ہے جس کو ہم شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف کا نام دنیائے صحافت میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں اور عرصے سے بڑودہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں۔

(ایڈیٹر)

لطفِ شام اور وہ اک روز اٹھا نے نکلا
لبِ جو ایک عجب میں نے تماشا دیکھا
دو جواں نور کے سانچے میں ڈھلے آئے نظر
آسماں سے اُتر آئے تھے فرشتے گویا
قدِ موزوں میں عجب ایک کے تھی رعنائی
دوسرا نام خدا لو لوئے منثور اتھا
حضرتِ نظم تھے اک دوسرے مولانا نثر
نام ہر ایک کا تھا ٹوپیوں میں اُنکے کڑھا
بحث کرتے تھے کہ کسکو ہے فضیلت ہم میں
کون ہے گرمیٔ ہنگامۂ بزمِ اعلیٰ
حضرتِ نظم لگے کہنے کہ ہم "موزوں" ہیں
اسی باعث سے تو بھاری ہے ہمارا پلّا،
میری موزونی پہ آتی ہے طبیعت سب کی
اور یہ مضموں ہے تمہارا کہ "میں آیا تھا"
بحث لفظی سے نہیں بحث ہے صاحب ہم کو
ہم معانی و مطالب کے ہیں سچے شیدا

مثنوی دو جہاں معنوی صورت اپنی، اللہ اللہ یہ ظرف اور دماغ اعلیٰ
میرے دریا سے ہوا کوئی جو سیراب اگر تا ابد زندۂ جاوید بلا شبہ ہوا
جتنے ہیں ذاکر و مذکور مری محفل میں ان کا رہتا ہے صدا بزم جہاں میں چرچا
سعدی و حافظ و جامی و نظامی ہیں کہاں چار سو نام کا پر ان کے ہے بجتا ڈنکا
میں نے رستم کا کیا نام جہاں میں روشن پہلواں تھا کوئی ورنہ کسی گوشہ میں پڑا
گردشِ چرخ سے ملتا نہ پتہ بھی لیکن کوکبِ بختِ زلیخا مرے دم سے چمکا
بزم میں میری غزل مطربِ عیش و عشرت رزم میں میرا رجز جنگ و جدل کا قرنا
میں نے جب ہومر و ملٹن کے لگایا سر سے دُور کی سوجھی انھیں میرے ہی ہوئی ایسی جلا
ڈینٹی میرا ہی شاگرد تھا جس نے بے مثل جنت و دوزخ و اعراف کا نقشہ کھینچا
جلوۂ حسنِ معانی نظر آیا کیا خوب میں نے اسٹیج پہ جب شیکسپیر کو بھیجا
اور تو کیا کہوں تھا اپنا زمانہ بھی کبھی، ہند و یوناں میں سمجھتے تھے مجھے جب دیوتا
جمگھٹے رہتے تھے ہر وقت پری رویوں کے اور میں ان میں کنہیا کی طرح پھرتا تھا
لوٹ میں نے ہی لیا صبر و قرارِ عاشق، میں نے عالم میں محبت کی ہے دی آگ لگا
آن واحد میں مجازی کو حقیقی کر دوں بندۂ بت کو بنا دوں ہیں خدا کا بندا
آپ فرمائیے کس بات پہ ہے ناز جناب کچھ فضائل تو بیاں کیجے سنیں ہم بھی ذرا
جوش میں آ کے لگے کہنے یہ مولانا نثر چڑھ گئی آج زیادہ ہے جناب والا
گر سناؤں تمہیں تھوڑے سے فضائل اپنے آپ کی ساری تعلی کو دکھا دوں نیچا
آپ کو ناز بہت اپنی ہے موزونی پر، میرے مضموں کو بتاتے ہو کہ ہر وہ اُکھڑا
رول دوں موتیوں کو میں ہوں وہ بحرِ ذخار آپ ڈنڈی کی ترازو کی خبر لیجئے جا
میں تصنع سے معرا ہوں بہ رنگِ خورشید آپ پہنے ہوئے ہیں قوسِ قزح کا جوڑا
میرے جملے سے مسیحا نے جلائے مردے آپ زندوں کو کریں زندۂ جاوید تو کیا
میں ہوں منطقی ارسطو قلم افلاطون، فارابی کا بیاں نسخۂ ابنِ سینا۔
برک کی یاد میں وہ برق صفت تقریریں یاد سسرو کی وہ سحر بیانی کرنا

علم دیں میں نے جلایا وہ غزالی ہوں میں — نام قرآں میں ہے نکلا مرا قاضی بیضا
روم و ایراں مرے خطبوں سے لگے تھرانے — تخت قیصر ہے نہ اب باقی ہے تاجِ کسرےٰ
دی اذاں مصر کے اہرام پہ چڑھ کر میں نے — گونج اٹھا سارا جہاں صل علےٰ صل علےٰ
طفل ہوں، یا ہوں جواں، پیر ہوں حقیقت میں غرض — کلمہ پڑھتا ہے ہر ایک بزم جہاں میں میرا
اور میں کچھ نہیں کہتا ہوں بس اک بات مری — اور سُن لیجئے پھر آپ ہی سمجھیں جیسا،
للہ الحمد شرف مجھ کو ہوا یہ حاصل — مری آغوش میں قرآں ہے خدا نے رکھا

حضرت نظم یہ سُن کر ہوئے کچھ سرخ مگر
میں نے جب رنگ یہ دیکھا تو وہیں بیچ میں جا

یوں کہا میں نے کہ تیوری پہ نہ بل آئے ذرا — ورنہ پھر بحث کا بیچ پوچھیے کیا لطف رہا
خلط مبحث ہی تناقص کا سبب ہوتا ہے — افضلیت ہے الگ ذکر فضائل ہے جُدا
سچ اگر پوچھیے دونوں کے دلائل ہیں قوی — ہے ہر اک تم میں سے آنکھوں کا ہماری تارا

نظم "دل"، آپ ہیں نثر آپ ہیں بے شبہ "دماغ"
دل - دماغ آدمی کے ہیں یہ قوائے اعلیٰ

سید نواب علی (از بڑودہ)

گوہر اشک

سرد چلتی تھی ہوائیں اور اندھیری رات تھی — سو گئی تھیں برف کے بستر پہ کرنیں چاند کی
ہُو کا عالم، چاند ارا آتا نہ تھا کوئی نظر — ایک سناٹا سا تھا چھایا ہوا سب دہر پہ،
ایسی خاموشی میں ایک نا طورہ ناز آفریں — گھر سے اپنے باہر آئی با دلِ اندوہ گیں
شہر سے باہر چلی شہر خموشاں کی طرف — مدفن عاشق کو یعنی کوئے جاناں کی طرف
نازنینِ گلبدن آرام جاں کی قبر پر، — بیٹھ کر آنسو بہانے لگ گئی با چشم تر
برف کے مانند قطرہ اشک کا اک جم گیا — صبح کو سورج کی کرنوں نے اُسے چمکا دیا
اتفاقاً اک فرشتے کا ہوا اس پر گذر — دیکھ پایا اُس نے وہ اشک درخشاں قبر پر
جھٹ اٹھا کر لے لیا اُس نے وہ دُرِ بے بہا — اور وہ اس کے تاج سر کے واسطے زینت بنا

اے گلزمین ڈھاکہ

(مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

انوارِ رفتگاں ہیں زیبِ جبینِ ڈھاکہ ــــ انجم نشاں نہ کیوں ہو مہ نشینِ ڈھاکہ
آنکھوں میں کھب گیا ہے نقشِ حسینِ ڈھاکہ ــــ اُف دلنواز طرزِ ناز آفرینِ ڈھاکہ
پورب کی جان ہے تو اے گلزمینِ ڈھاکہ

ہر شان دل نشیں ہے ہر آن دلربا ہے ــــ مغلیہ دور کا تو وہ نقش جانفزا ہے
ظاہر پہن بہن سے انداز اک جدا ہے ــــ پنہاں ادا ادا میں تہذیب ایشیا ہے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

دشمن فلک سے اب بھی گرمِ ستیز ہے تو ــــ اس دور میں بھی کان اہلِ تمیز ہے تو
مشرق کے دائرے میں وہ ایک چیز ہی تو ــــ بنگالہ جسم ہے اور جان عزیز ہے تو
پورب کی جان تو ہے اے گلزمین ڈھاکہ

قسمت کے ہیں فروزاں تجھ میں چراغ کتنے ــــ گہوارہ گیر تیرے روشن دماغ کتنے
سرگشتگانِ ساقی ہیں باغ باغ کتنے ــــ معمور کتنے شیشے لبریز ایاغ کتنے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

خاکِ وطن کا شیدا تجھ کو نعیم جانے ــــ لطف و دوام سمجھے فیضِ عمیم جانے
نکہت کو جیسے گل کی بادِ نسیم جانے ــــ روحانیت کو تیری طبعِ سلیم جانے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

کس کس کو کھینچ لائی جا کر ہوا چمن کی ــــ شمعوں کی روشنی سے زینت بڑھی لگن کی
گو فتنے میں چھڑے ہیں تو رونق ہو انجمن کی ــــ وہ طرفہ داستانیں ہیں تیرے بانکپن کی
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

جو تیری غیر فانی توقیر جانتے ہیں ــــ اک مشت خاک کو بھی اکسیر جانتے ہیں

رنگین مزاج دلکش تصویر جانتے ہیں　　　یا خواب عنبریں کی تعبیر جانتے ہیں۔

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

کرتے ہیں ذکر جنکا اب ہم بڑی ہلی ہیں　　　ذرے ہیں جن کے روشن اس خاک عنبری میں
خوشبو بسی ہے جن کی ہر پھول ہر کلی میں　　　پھرتی ہیں انکی بو میں تیری گلی گلی میں

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

دوش صبا کی چادر یارب سرک نہ جائے　　　پھولوں میں سونیوالی ساحل پہ تھک نہ جائے
رندوں کی سرخوشی سے واعظ بہک نہ جائے　　　لہرا رہی ہے گنگا ساغر چھلک نہ جائے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

سیلاب باغ دھرا پاک جگر کو سیلے　　　آکر کنارہ گنگا ہر ایک جام پی لے
آنکھیں ہیں کہ رسیلی منظر ہیں کچھ رنگیلے　　　عنابی انگلیوں میں دامن میں کتنے نیلے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہیں لال لال سڑکیں یا کھیل رہی ہیں ہولی　　　ڈوبی ہوئی شفق میں یا ہے ہتنک کی چولی
یہ گھر ہیں کہ جگمگاتی شکلیں یہ بھولی بھولی　　　ڈھاکہ تو شہر ہے یا مالن کی کوئی جھولی

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہیں شام میں یہاں کی شام اودھ کے جلوے　　　فطرت کے موقلم سے اترے ہیں خوب چہرے
کھنچتے ہیں دور سے دل سنتے ہیں جب فسانے　　　تیری لطافتوں کے تیری نزاکتوں کے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

رعنائی دلکشائی شیشے پہ آب صیقل　　　"یا نخلہ کہن سے پھوٹی ہے دُہری کونپل
ناقابل تحمل کیوں ہو نہ تازہ جدول　　　نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

محفل میں دوستوں کی کیا میں کبھی نہ ہونگا　　　ڈھاکہ کی شہرت کا انکار کب سہوں گا
سچی جو بات ہوگی کیوں بے کہے رہونگا　　　سو میں کہونگا خالدؔ میں لاکھ میں کہونگا

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

غزلیات

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

تجھے کس نے جانا کہ مانا نہیں ہے
تجھے کس نے مانا کہ جانا نہیں ہے

یہ دید اور وا دید کی داستاں میں
بجز ذکر دیروز و فردا نہیں ہے

سُنی ہم نے "دیدار" تعبیر جس کی
یہ وہ خواب ہے، جو کہ دیکھا نہیں ہے

محیط و محاط ایک کیوں کر بھلا ہو
کہ قطرہ حقیقت میں دریا نہیں ہے

سمجھتا ہے جو نحن اقرب کا مطلب
اسے ڈھونڈھنے دور جانا نہیں ہے

مری سادہ لوحی تجسس ہے اس کا
جسے ڈھونڈھنا ہی ہے پانا نہیں ہے

نہ کہہ کر انا الحق تماشا ہو ناظم
تجھے دیکھنا ہے دکھانا نہیں ہے

(خاکسار عبد الرحمٰن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا)

حسینوں کے مرقع میں تری تصویر اچھی ہے
میں عاشق ہوں ترا کتنی مری تقدیر اچھی ہے

ادھر مضطر ہوا میں اور اُدھر وہ گھر سے چل نکلے
مری آہِ رسا میں آجکل تاثیر اچھی ہے

نزاکت سے نہ جب شمشیر اُٹھی دستِ نازک سے
تو جھنجھلا کر کہا کم بخت کی تقدیر اچھی ہے

مزے لیتا ہوں دید و گفتگو کے وقتِ تنہائی
مری ہمدم فراقِ یار میں تصویر اچھی ہے

بُرا میں ہوں مگر تم سے حسیں پر جان دیتا ہوں
تم اچھے ہو مگر تم سے مری تقدیر اچھی ہے

ہمیشہ خوش جمالوں میں بسر ہوتی ہے اے خوشتر
مقدر کا دھنی تو ہے تری تقدیر اچھی ہے

منتخبات

مکتوب مہدی

تحصیل بارہ - ضلع الہ آباد
۸ مارچ ۱۹۱۶ء

پیارے دلگیر

خط ملا، تھوڑی دیر کے لئے آپ کی پیدا کردہ حرارت میری رگوں میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے لیکن اس قدر بے کیف ہو رہا ہوں کہ آپ با دصف خلوص وہاں بیٹھ کر، اندازہ نہیں کر سکتے۔

آستانۂ سخن کو سابقہ بھی پڑا تو کس سے؟ ڈیڑھ سو برس کی بڑھیا یعنی قانون سے، جس کے چہرے کی جھریاں میرے دماغ میں گرہیں ڈالتی ہیں۔

بھئی، ۷ اپریل تک ضبط کیجئے، آخری موقع (چانس) ہے۔ یا تخت یا تختہ! تحصیلداری کی ہوس نہیں، لیکن غیرت نفس گوارا نہیں کرتی کہ کسی سے گھٹ کر رہوں، لاج آپڑی ہے، خدا بات رکھ لے، پھر میں آپ کا ہوں اور جہاں تک باتیں بنانے کا تعلق ہے، نقاد میرا۔

بعض سرخیاں جو میں آپ کے لطف طبع کے لئے لکھ دیتا ہوں، یہ صرف اس لایق ہیں کہ شوخی تحریر کے لحاظ سے "مطائبات نثر" کے تحت میں کبھی کبھی ان کو جگہ دیجئے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں جو کسی ادبی رسالہ کے لئے نفسیات ادب کے لحاظ سے مقصود بالذات ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ تصنیفی عہد کا شبلی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا!

موجودہ نسل قدیم لٹریچر بالکل نہیں جانتی اور کتنی ہی روشن خیالی ہو بے گھر کی پونجی (اریجنیلٹی) کے کام نہیں چلتا، جس نوجوان گروہ کے ہاتھ میں قلم ہے، اسے زیادہ سے زیادہ "عیب پوش" سمجھئے، یعنی معلومات اور قابلیت کے لحاظ سے ایک انچ بھی نہیں لیکن چاہتا ہے کہ ایک فٹ نہیں ایک گز سمجھا جائے۔ ایک آدھ مستثنیات لایق غیرت کہیں ہوں تو اُن سے کام نہیں چلتا۔

ماجد بی۔ اے کی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع آپ نے دیکھی؟ یہ البتہ ہونہار ہے .. .. اور ایک دن حکمائے ادب میں پیش پیش ہوگا اس لئے کہ اس میں گہرائی موجود ہے، نری باتیں بنانا نہیں جانتا۔

نیازؔ سے کیا فرمائش کروں، وہ صحیح مذاق تصنیف کی طرف نہیں آتے۔" عہد زرین یعنی عباسی دور کے ارتقاء دماغی" پر لکھوائیے۔ بہتیرے سنجیدہ عنوان ہیں۔ لیکن لکھنے والے کہاں سے آئیں گے؟

میں یورپ کی مدد سے کام چلا سکتا ہوں لیکن پہلے بارہ چھوڑ آئیے اور اکبر آباد کے کٹڑے میں میوے کی دُکان کھلوا دیجئے۔

لطیف صاحب سے (جن کا پتہ سمجھ میں نہ آیا، ڈھولی کھار۔ کیا چیز ہے؟ بار کا دروازہ اور پائے مگس کی تیلیاں!) کہہ دیجئے گا جس قسم کا ٹھوس لٹریچر وہ چاہتے ہیں، مواد کی کمی نہیں، لیکن پہلے پائنیر کا سا خوش سواد اور نشاط افزا دفتر اور پائین باغ پیدا کر دیجئے اور اسی کے قدر دان نہیں صرف پڑھنے والے دیجئے جو سربکف نہیں زربکف ہوں، پھر جو آپ چاہتے ہیں، نہ ہو تو میرا ذمّہ!!

رہی چھم چھم (یا اُن کی کھٹ کھٹ) یہ جاتے ہوئے نشۂ جوانی کا اُترا ہوا خمار ہے جو کبھی کبھی "صحافی" کی اوٹ میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔

میرے سب سے پہلے مضمون کا عنوان ان شاء اللہ "ادبُ الاساتذہ" ہوگا۔ نیازؔ اگر عہد زرین کو نہ سنبھال سکیں تو یہ عنوان دیجئے:۔

"کل جو گذر گئی۔ بے کار۔ جو آنے والی ہے غیر اختیاری ہے زندگی تو آج صرف آج کا نام ہے!"

میں تم سبھوں کی بے غایت شاعری سے اسی لئے تو جلتا ہوں کہ کام کی بات آتی نہیں یا کرنی نہیں چاہتے، اچھا خاصا انسان، ہیولیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہاں یہ آج کل آئے دن آپ کی "آنکھیں کیوں دُکھتی ہیں" کیا کسی نے "نمک کی چاٹ پر لگا یا ہے" لطیف صاحب کو یہ چند سطریں دکھا دیجئے گا، ان کے خط کے ایک ضروری حصے کا جواب رہ گیا تھا۔ گورکھپور۔ نقاد کے لئے لکھتا ہوں، جواب باصواب پر آپ کو اطلاع دونگا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

ہمیشہ آپ کا

مہدی

(علیگڈھ میگزین)

اخبار علمیہ

دُنیا کا سب سے بڑا مطبع

واشنگٹن (امریکہ) میں دُنیا کا سب سے بڑا مطبع قائم ہے جس کی رفیع الشان ہفت منزلہ عمارت میں کام کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے۔ ایک سو چوالیس ٹائپ جمانے کی مشینیں اور ۳۲۵ مصحح ہیں۔ ایک خاص شعبہ ۱۵ ہزار محکمہ جات مال کے لئے آفیشل کاغذات کی چھپائی کے واسطے مقرر ہے جو علاوہ ازیں تمام ریاست ہائے متحدہ کے آفیشل کاغذات چھاپتا ہے۔ اس مطبع میں کارڈ چھاپنے کے لئے ایک علیحدہ شعبہ مقرر ہے جو ایک دن میں چالیس لاکھ کارڈ چھاپتا ہے ایک شعبہ صرف ٹکٹیں چھاپنے اور ان کو رنگنے اور گوند چپکانے کے لئے مخصوص ہے مطبع کا ایک شفاخانہ بھی ہے جو وہاں کے کام کرنے والوں کے علاج معالجہ کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

(الزہرا)

کرہ زمین کی عمر

ڈاکٹر ایف۔ آر۔ مولٹن نے جو شکاگو یونیورسٹی کے فلکیات کے پروفیسر ہیں حال میں اپنی ایک تقریر میں بیان کیا کہ زمین آج سے تقریباً دس لاکھ ارب برس تک قائم رہے گی اُن کی رائے ہے کہ زمین ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی عمر طبیعی کا ابھی صرف بیس لاکھواں حصہ ختم ہوا ہے زمین سے جو معدنیات نکلتے ہیں خصوصاً ریڈیم ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت زمین کی عمر صرف دو ارب سال کی ہوتی ہے۔ ستاروں کی تعداد، ان کا بُعد اور وہ جس تیزی سے ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ دس لاکھ ارب سال کے بعد ایک وقت آئے گا جبکہ ستارے آپس میں اسقدر نزدیک ہو جائیں گے کہ ان میں باہم تصادم ہو جائے گا اور وہ ایک ۔۔۔۔ دوسرے کو فنا کر دیں گے۔ اُسوقت کرہ زمین بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکیگا۔ چنانچہ دس لاکھ ارب سال کے بعد زمین کا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔

(موڈرن ریویو)

زبان خلق

ہم اس عنوان کے تحت قدردانان علم وادب، اور نقادان فن کی ان بیش بہا آراء کو مستقل طور پر درج کیا کریں گے جو زبان کے محاسن و معائب پر اپنے آزادانہ خیالات کا اظہار فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

ذیل میں ہم اپنے کرمفرما جناب خورشید صاحب لکھنوی کا مضمون "زبان کاٹھیاواڑ" شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے ہم ان کے لفظ لفظ سے اتفاق کرتے ہیں لیکن یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ابنائے ملک (اہل کاٹھیاواڑ) بھی اس ضرورت کو محسوس کریں۔ جیسا کہ ہم نے اپنے پہلے نمبر کے افتتاحیہ میں گذارش کردی ہے۔ بہرکیف اگر اہل کاٹھیاواڑ نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہماری اس محنت کی داد دی تو ہم اپنی تمام خدمات اہل کاٹھیاواڑ کیلئے وقف کردیں گے۔

ایڈیٹر

زبان کاٹھیاواڑ

(چند مشورے اگر مانے جائیں)

خورشید صاحب کو یہ یقین دلانا جب میری طاقت سے باہر ہو گیا کہ آج کل میں ایسی حالت میں ہوں، کہ دماغی محنت کر ہی نہیں سکتا تو ناچار، چند سطریں ان کے لئے لکھنا ہی پڑیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ، اب تک سمجھ میں نہیں آتا، کہ لکھوں کیا۔ ایک ایسے خطے میں جہاں کی زبان گجراتی ہے، ایک اردو رسالے کے اجرا پہ مبارکباد دوں، یہ نہایت ہی معمولی بات ہے۔ چلئے وہ بھی دی جا چکی۔ رسالے کی کامیابی کی دعا کروں، وہ تو ایک رسمی بات ہے۔ وہ بھی ہو چکی۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی بات لکھی جائے، جو چاہے نئی نہ ہو، مگر مفید ضرور ہو۔

یہ رسالہ ایسے مقام سے جاری ہوا ہے، جہاں کے رہنے والے اگرچہ اردو نہیں جانتے مگر یہ بات تو ثابت نہیں ہوئی ہے، کہ انہیں اردو سیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ منگرول کی اسلامی ریاست نے مانا کہ، اردو کی ایسی خدمت نہیں کی، جو ذکر کے قابل ہو، لیکن اردو کے خادموں کی قدر تو ضرور ہی کی ہے۔ وہ اس طرح کہ فردوس مکان سابق نواب صاحب کے زمانے میں لکھنؤ کے دو نامی شاعر **جلال** اور **شمشاد** اس ریاست کے ملازم تھے۔ میں نے

سنا ہے، نواب صاحب مرحوم خود بھی شعر کہتے تھے اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ مرثیہ بھی خوب پڑھتے تھے۔ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جانتا بھی ہوں، سنا بھی ہے، اور کہیں پڑھا بھی ہے کہ لکھنؤ کے یہ دونوں باکمال شاعر جن کا ذکر ابھی ابھی ہوا ہے، منگرول میں اپنی زندہ یادگاریں بھی چھوڑ گئے ہیں۔ دو صاحبوں کا ذکر تو میرے ایک دوست نے کیا تھا۔ اگر میری یادداشت میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی، تو یاد پڑتا ہے کہ ایک صاحب کا تخلص جنون ہے اور دوسرے کوئی سید صاحب ہیں۔ میں ان صاحبوں سے واقف نہیں، مگر جلال مرحوم کا ہم وطن ہونے کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں صاحبوں کو اس پرچے کو پوری مدد دینا چاہیئے۔

میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس پرچے کو خوشتر صاحب کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کے لئے اور خاص ...... منگرول والوں کے لئے وقف کر دیں جہاں تک ہو سکے انہیں سے مضمون لیں، وہ چاہے نظم ہو، یا نثر، اور انہیں کے مضمون چھاپیں۔ کوئی ضرورت نہیں باہر والوں کے ایسے مضامین کی جن کا مقصد لکھنے والوں کے لئے قابلیت کی نمائش ہو اور بچارے کاٹھیاواڑ والوں کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو اپنے پھٹے پرانے لباس کو دوسروں کے مانگے تانگے کے خلعت سے بہتر سمجھتا ہوں" اور یہی شیراز کے ایک بڑے تجربہ کار کا کہنا ہے کہ ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن بہ از جامۂ عاریت خواستن

یعنی مانگے تانگے کے لباس سے اپنا پرانا دھرانا لباس زیادہ اچھا ہے۔

خوشتر صاحب کو میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ اس رسالے کا بڑا حصہ نثر کے مضمونوں سے بھرنا چاہیئے اور لکھنے والے صرف منگرولی یا کاٹھیاواڑی ہونا چاہیئے۔ وہ پھر چاہے جیسی زبان میں لکھے جائیں ایڈیٹر صاحب کا فرض ہے کہ ان کی زبان سدھار کر انہیں چھاپیں۔ آپ پوچھیں گے آخر وہ لکھیں کیا؟ میں جواب دوں گا لکھنے کو مضمون بہت، اور کچھ نہیں تو منگرول کا جغرافیہ ہی سہی۔ آپ پوچھیں گے اس میں کیا دھرا ہے؟ میں کہوں گا سب کچھ ہے۔ اب سمجھ لیجئے آپ سید صاحب کے دفتر سے نکلتے ہیں اور سارے شہر کی سیر کرتے ہیں بس جو آپ دیکھیں وہی لکھ دیں۔ یہاں کی چھوٹی گلیاں یہاں کے بڑے رستے۔ یہاں کی عالی شان عمارتیں، یہاں کے پرانے کھنڈر۔ یہاں کے امیروں کے محل، یہاں کے غریبوں کے جھونپڑے، یہاں کے آباد مقام، یہاں کے ویران ٹھکانے یہاں کے ہرے بھرے باغ یہاں کے اُجاڑ جنگل، اس کے سوا آپ جو دیکھیں وہ لکھیں، میں نے تو منگرول دیکھا بھی نہیں میں کیا جانوں یہ ایک ایسی کام کی چیز ہو جائے گی، جو منگرول کی ایک اچھی یادگار رہے گی۔

اس رسالے کی زبان اول سے آخر تک کم سے کم ایسی ہو، جیسی اس مضمون میں میں نے لکھی ہے۔ یعنی بالکل آسان

جیسے بچے بوڑھے جوان سب سمجھیں، تھوڑی بہت اُردو پڑھے ہوئے پڑھ لیں، اور اُردو نہ جاننے والے بھی پڑھوا کے سُن لیں۔ یاد رہے کہ اس کی زبان ہرگز ہرگز ایسی نہ ہو جسے کاٹھیاواڑی مسلمان نہ سمجھ سکیں۔ کیا اچھا ہو، اگر اس پرچے میں یہ خصوصیت (خاص بات) پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضمون چاہے وہ نظم میں ہوں، یا نثر میں فارسی عطف اور اضافت سے پاک ہوں۔ ایسا کرنا بے شک آسان تو نہیں ہے، مگر مہربانی کر کے میرے اس مضمون کو آپ پھر ایک مرتبہ پڑھ جائیے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑی سی کوشش میں ایسے مضموں لکھے جا سکتے ہیں۔

ہر کاٹھیاواڑی مسلمان کو چاہیئے کہ اگر وہ اردو کی کچھ بھی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس رسلے کو ضرور خریدے اور اڈیٹر کا ہاتھ بٹائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ناگرول میں اس کو ۵-۶ سو خریدار مل جائیں تو یہ رسالہ بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ ناگرول اور کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کو چاہیئے کہ اس میں برابر مضمون لکھا کریں۔ وہ دن بے شک بڑی خوشی کا ہوگا، کہ میں اسے اول سے آخر تک منگرولیوں ہی کے مضامین سے بھرا ہوا دیکھوں گا۔

مجھ جیسے اور لکھنے والے، جن سے اڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں ان سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ وہ جہاں تک ہو سکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے حقیقت میں بالکل فرصت نہیں ہے ورنہ میں کوئی خاص مضمون لکھ بھیجتا، مگر پریشانیاں دور ہونے پر، وعدہ کرتا ہوں، کہ میں زبان کو بھولنے والا نہیں۔

سروش (لکھنوی)

مخدومی اڈیٹر صاحب زبان! السلیم

زبان کا پہلا نمبر میری نظر سے گذرا، میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ کاٹھیاواڑ سے اُردو کا ایک ایسا دلفریب دیدہ زیب پرچہ آپ نے نکال کر ہماری زبان پر احسان کیا ہے۔ رسالہ کے حسن ترتیب سے آپ کے ذوق سلیم اور شوق ادب کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مختلف مستقل عنوانات قایم کر کے آپنے رسالہ میں جو تنوع پیدا کر دیا ہے وہ بہت دلکش ہے۔ مقالات میں "علم اور اسلام" والا مضمون پُر مغز اور کار آمد ہے، ادبیات میں "شوالہ" نہایت دلپذیر فسانہ ہے اور حضرت خالد کی "ہستی معصوم" تو اپنے غیر فانی لٹریچر کے لحاظ سے قطعی اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی!

اُن کی کس کس نازک خیالی کی داد دوں؟ حیران ہوں۔

میں آخر میں آپ کو اس پاکیزہ رسالہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خادم ادب

سید انتظام الدین شاہ اکبر آبادی (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۳

زبان خلق

اکثر حضرات ملا صاحب کو صرف "ملاموزی" اور گلابی اردو کے موجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن ہم جس حیثیت سے پہچانتے ہیں اس بنا پر اس بات کے کبھی قائل نہیں ہو سکتے کہ ملا صاحب سوائے اپنے مخصوص رنگ کے سنجیدہ اور متین عبارت نہیں لکھ سکتے ہم اگر چاہیں تو آج ہی اُن سے اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون لکھوا سکتے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ کسی اشاعت میں اُن کا علمی مضمون قارئین "زبان" کی خدمت میں پیش بھی کرینگے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا ان کو اُسی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے جس رنگ میں کہ وہ دنیائے صحافت میں مشہور ہوئے ہیں۔ اس لئے "زبان" میں بھی اُن کا اصلی ہیئت میں آنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا اگرچہ زبان ایسے علمی رسالہ میں ملا صاحب کے مطائبات کچھ ناموزوں سے معلوم ہونگے لیکن بفحوائے المزح فی الکلام کالملح فی الطعام ناظرین کی ضیافت طبع کی خاطر ہر ماہ "نکات" کے زیر عنوان پیش کیا کرینگے۔

آپ کے نکات میں صرف دلبستگی تفنن طبع اور غم غلط کرنے ہی کا سامان نہ ہوگا بلکہ اس میں بعض ایسے نکتوں کا حل بھی ہوگا جسکو ارباب بست و کشاد بھی حل نہیں کر سکتے۔

ملا صاحب "زبان" میں مستقل طور پر مضمون بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے کرم نامہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

> آئندہ سے زبان میں "نکات" کے عنوان سے مستقل مضمون لکھا کروں گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کے تحت ہر مہینے علم و ادب اور تمدن و معاشرت کے ایسے اچھوتے اور بصیرت فروز نکتے بتلائے جائیں گے جو شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں البتہ فرق یہ ہوگا کہ اس کی عبارت میں اس امر کی خاص پابندی کی جائیگی کہ دن بھر کی تھکن، یا قدرتی خشکی اور بلغم کی کمی سے آپ کے چہرہ پر قحط اور فاقہ کشی کے جو تین آثار پیدا ہو جاتے ہیں اُن میں "نکات" کے ظرافت انگیز فقروں سے ایک تازگی اور شگفتگی پیدا ہو جائے گی .... فن انشا کا یہ اصول رہا ہے کہ ہر تحریر و تقریر میں اتنی ظرافت ضرور ہو جس سے باوقار یا خشک سے خشک مولوی صاحب

تک کے دانت باہر نکل آئیں کیونکہ جن لوگوں کو دن رات کے چار اوپر بیس گھنٹوں
میں ایک مرتبہ بھی ہنسی یا تبسم تک پسند نہیں اور جو ہر دم غصے اور خموشی کے تام بوٹ بنے
رہتے ہیں سنا ہے کہ ان کے جنازے میں فرشتے بھی خوشی سے شریک نہیں ہوتے۔
یقین ہے کہ ناظرین زبان بھی ہمیں ایسی متین ظرافت" کے اندراج کی اجازت دینگے۔

ایڈیٹر

اگر بدظنی اور بدگمانی میاں مجنوں اور مسماۃ لیلیٰ بی تک ہی محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کہ اس کے پیدا ہو جانے سے طالب و مطلوب میں ایک "غیر خونریز جنگ" یا ایک "لطیف جھجک" پیدا ہو جاتی ہے بلکہ شعرائے اردو نے تو محبوب کی اس بدگمانی کو طالب کے لئے معراج کا درجہ عطا فرمایا ہے جو اسے اپنے طالب سے اس طرح ہو جائے کہ وہ سمجھے کہ "اب میرا طالب کسی دوسرے کا طالب ہے"، لیکن خدا بچائے اور بصیغہ فوری بچائے اس بدگمانی سے جو ایک ایڈیٹر اور ایک مضمون نگار کے درمیان پیدا ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ اکثر یہی دیکھا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مارے غصہ کے ڈنلپ ٹائر کی طرح پھول جاتے ہیں اور خط و کتابت تک بند؟

ٹھیک ایسی ہی بدگمانی میرے اور ایڈیٹر صاحب رسالہ "زبان" کے درمیان واقع ہو گئی اور ممدوح گرامی کی دعوت پر جو میں نے مضمون نہ بھیجا اس کی وجہ کچھ تو میری ذاتی مصروفیت تھی اور کچھ میرا مرض "لکھاس"۔ یہ "لکھاس" بروزن بکواس صحیح ہے اور جن لوگوں میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے اُن کے لئے شاید یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ۔ کھاتے پیتے۔ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے بلکہ اونگھتے ہوئے بھی۔ فی الفور ایک عدد مضمون لکھ سکتے ہیں گویا وہ مضمون نگار کیا اچھے خاصے "نولکشور پریس لکھنؤ" ہوتے ہیں کہ ڈھیر اڈھر مضامین کے انبار تیار کر سکتے ہیں۔

جون ۱۹۲۶ء کی پندرہویں کو حضرت محترم مولینا خوشتر کا گرامی نامہ ملا کہ مضمون بھیجو رسالہ "زبان" جاری ہوتا ہے میں نے ارادہ کیا کہ جب رسالہ کا پہلا نمبر دیکھ لونگا تو اُس کی قائم حالت اور پالیسی کے اندازہ پر اُس میں مستقل سلسلہ مضمون شروع کر دونگا اگر اُسیوقت یہ کہدیتا کہ "پہلا نمبر دیکھکر" تو شاید خوشتر صاحب اسکو میری ٹال مٹول سمجھتے اور ایک ایڈیٹر کے لئے مضمون نگار کی ٹال کسی "جہاں آرزو" کے "وعدہ فردا" سے کسی طرح کم تکلیف

وہ نہیں ہوتی اگرچہ مجھ میں یہ دونوں نزاکتیں نہیں۔

البتہ میں نے یہ کیا اور اب سمجھا کر بہت بُرا کیا کہ بس ع "خوشی معنی وارد" کا ڈپازٹ پارسل پیکٹ بن گیا خوشتر بجے اور کس قدر معقول بچے کر کلا رموزی "باغی" ہو گیا اور دنیائے صحافت میں مضمون نگار باغیوں کی سزا یہی ہے کہ انہیں نظر بند نہیں تو "رسالہ بند" ضرور کر دیا جائے کیا معنی کہ ان کے نام رسالہ بند کر دیا جائے لہذا میں اُسوقت جبکہ "رسالہ زبان" کا پہلا نمبر اپنے ناظرین کو بھیجا جا رہا تھا میں منہ کھولے اُس کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ نہ آیا اور آہ کہ نہ آیا۔

۱۶ اگست ریاست کوروائی کے علم دوست اور معارف گستر تاجدار اعلیٰ حضرت ہز ہائنیس نواب محمد سرور علیخاں بہادر ربالقابہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو "رسالہ زبان" کا پہلا نمبر باصرہ نواز ہوا پس ہم نے یہ پرچہ موصوف کے پرائیوٹ سیکرٹری صاحب کے کمرے سے اس شرافت کے ساتھ چرایا کہ انہیں آج تک خبر نہیں۔ اور پھر پوری گھبراہٹ کے ساتھ اس کو از الف تا ی پڑھ لیا۔ پڑھ کیا لیا اچھا خاصہ چاٹ لیا ! ! !

رسالہ "زبان" کا پہلا نمبر دیکھکر جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز تھی وہ حضرت خوشتر کا عزم راسخ۔ استقلال اور حوصلۂ عمل کہ انہوں نے ایک ایسی سرزمین سے جو انہیں کے الفاظ میں "زمین شور" ہے زبان اردو کی خدمت کے لئے رسالہ "زبان" کو قوت سے فعل میں لانے کی کامیاب کوشش کی اور یہ خوشتر صاحب اور محض خوشتر صاحب کے ذوق کی پختگی تھی کہ وہ رسالہ "زبان" کے اجرا میں اسی "زمین شور" زمین سے کامیاب ہوئے جس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دوسری چیز رسالہ زبان کا رفیع تر معیار یا اُس کے مضامین کی بلند پائیگی ہے خوشتر صاحب نے رسالہ زبان کی ترتیب میں علو خیال اور متانت و سنجیدگی کو ملحوظ رکھا ہے وہ اُن کے اعلیٰ علمی ذوق کا ثبوت ہے۔
تیسری قابل احترام چیز اس کے وہ اُردو دان اہل قلم اور سرپرست اصحاب ہیں خصوصاً ہمایوں جاہ نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر والی ریاست منگرول اور نواب زادہ شیخ عبدالخالق صاحب بہادر ولیعہد

مگر دل کی رسالہ زبان کے ساتھ خسروانہ توجہات ہیں یہ تو صحیح نہیں کہ ہمارے موجودہ دیسی والیان ملک میں علم نوازی اور علم پروری کا قطعی فقدان ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے علم نواز والیان ملک خاص ہیں جنکی دولت اور فرصت علم و زبان کی دلچسپیوں اور ترقی کے لئے وقف ہے۔

فاضل مدیر رسالہ "زبان" نے اپنے مقالہ افتتاحی میں علاقہ کاٹھیاواڑ میں تعلیم کی عموماً اور اُردو زبان کی خصوصاً جس کمی اور پستی کے اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان کے دیکھنے سے اس امر کا تو افسوس نہیں ہوتا کہ اس علاقہ میں اردو زبان پست ہے، البتہ افسوس تو کاٹھیاواڑ کے اُن ذمہ دار افراد پر ہے۔ جن کی ذہنی حالت اب اس درجہ پست ہو چکی ہے کہ باوصف ذمہ داری کے اُن میں احساس نہیں اور اگر احساس ہے تو قوت عمل ماؤف ہو چکی ہے مسلمانان کاٹھیاواڑ کے علمی جمود و بے خبری اور ان کی غفلت و بے فکری کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کے علاقہ کا ایک ایسا شخص ایک رسالہ جاری کرتا ہے جو باعتبار اُس کی عظیم الشان مالی ذمہ داریوں کے اس کا ہرگز مستحق نہ تھا۔

لیکن جن کاٹھیاواڑی بھائیوں کو آج دولت، فراغت اور احساس کے خزانے حاصل ہیں کیا انہیں اپنے فرائض یاد ہیں؟ اگر یاد نہیں تو وہ اُٹھیں اور اپنے صوبہ کے ہر حصہ میں رسالہ "زبان" کی اشاعت کے لئے بورڈ اور ایجنسیاں قائم کریں قصبوں اور قریوں اور شہروں میں "اردو کلب" اور انجمن قائم کریں کیا کاٹھیاواڑی مسلمانوں کو معلوم ہے کہ آج سے صرف ایک سال ہی پہلے صوبہ بہار[1] میں اردو زبان کی یہی حالت تھی لیکن اسی ایک سال کے قلیل وقفہ میں پٹنہ سے ایک اردو اخبار جاری ہوا بلکہ وہاں ایک عظیم الشان "اُردو کانفرنس" بھی منعقد ہو چکی وہاں اُردو کی متعدد انجمنیں قائم ہو چکیں اور محض پٹنہ و بہار کے چند ذی حوصلہ افراد کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج انگریزی حکومت کی انتظامی کونسل تک یہ سوال پہونچ گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ صوبہ بہار کی تمام دفتری کارروائی اُردو زبان میں ہو۔

---

[1] زبان:۔ صوبہ بہار کی عام حالت بہ لحاظ زبان چاہے جو کچھ ہو لیکن معبرین سے مخفی نہیں کہ پٹنہ میں عرصہ دراز سے اردو کا چرچا ہو رہا ہے بلکہ اس نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں خدابخش کا مشہور و معروف کتبخانہ جس سے ہزاروں اہل علم سیراب ہو رہے ہیں ایسا [illegible]

کیا اچھا ہو اگر صوبہ کاٹھیا واڑ میں زبان اُردو کی ترقی کے لئے رسالے، اخبار، کلب۔ انجمن کانفرنس اور مذاکرات علمیہ کا انعقاد عمل میں آئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ ترقی تعلیم اور ترقی اُردو پر زور دیا جائے کیا آپ حضرت خوشتر کے ہاتھوں کو مضبوط بنائیں گے کہ وہ ان امور میں آپ کی رہنمائی کریں بس اگر آپ کے چند ذی علم افراد آج کمر بستہ ہو جائیں تو سنگر دل ہی میں صوبہ کاٹھیا واڑ کی ایک مرکزی انجمن اور مرکزی اردو کانفرنس کا انعقاد عمل ہو سکتا ہے جو بے انتہا مفید اور ضروری ہے۔

ملا رموزی

"ظل السلطان"
شاہجہان آباد بھوپال

۱۰ر اگست سنہ ۲۶ء

جناب کرم۔ السلام علیکم

والا نامہ موصول ہوا۔ آپ کا رسالہ بھی دیکھا مضامین کی حیثیت سے نہایت بہتر رسالہ ہے اور میں خوش ہوں کہ آپ ایک ایسی جگہ رہکر زبان اردو کی خدمت کر رہے ہیں جہاں قدم قدم پر آپ کے لئے مشکلات ہیں۔ خدائے کریم آپ کو کامیاب کرے۔

اس رسالے کے ذریعہ سے سب سے نمایاں کام جو آپ نے کیا وہ وہاں کے قابل انشا پردازوں اور فاضل لوگوں کو ادب و انشا کے میدان میں لے آنے کا کیا اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ مولٰنا اختر جونا گڈھی کے افادات سے اب بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا آپ نے ان کو حجرہ سے باہر نکال ہی لیا۔ خوب کیا۔ یہ کاٹھیا واڑ کے شبلی ہیں اور ادب و انشا کی روح رواں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ ان سے کام لیں گے اور ملک کو ان کے ترشحات خامہ سے مستفیض فرمائیں گے۔

.........میں کوشش کرونگا کہ آپ کے رسالہ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گو اب فرصت بھی نہیں ملتی اور لکھنے سے جی بھی اکتا گیا ہے۔ کہیں لکھتا بھی نہیں۔ مگر آپ نے رسالہ ایک ایسے مقام سے شائع کیا ہے جہاں ضرورت ہے کہ اس کی امداد دیکھا ئے اور جو امکان میں ہو کیا جائے، میرے امکان میں بس یہی ہے کہ آپ کو لکھ کر کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں اور انشا اللہ بھی کرتا رہونگا۔

خادم
سید محمد یوسف قیصر

صفحۂ ادارت

یقیناً یہ خبر خواص وعوام میں مسرت سے سنی جائیگی کہ ہمارے سردین پناہ معدلت گستر رعایا پرور نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ والی ریاست منگرول جو نہایت متشرع اور سچے فدائی دین متین ہیں کچھ عرصہ سے اپنے ذاتی اخراجات میں سے پس انداز کر کے ساڑھے چار لاکھ روپیہ کی ایسی گراں قدر رقم غربا کے تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دی ہے۔ جس میں سے ایک لاکھ روپیہ تو محض تعلیم نسواں میں صرف کیا جائیگا باقی رقم اُن غربا کی دینی و دنیوی تعلیم میں صرف کی جائیگی جو تعلیمی مصارف برداشت کرنے کے اہل نہیں ہوتے چنانچہ منگرول میں دارالاقامت کی عمارت بھی طیار کرائی گئی ہے جسمیں فی الحال کم وبیش پچاس طلبہ تعلیم پاتے ہیں ان کی رہائش اور خورد ونوش کا انتظام بھی وہیں ہوتا ہے۔

کاٹھیاوار بلکہ عالم اسلام میں نواب صاحب موصوف کی ذات ستودہ صفات مغتنمات میں سے ہے جس پر ہمیں فخر ہے اور بجا فخر ہے آپ دیگر کار ہائے خیر (مذہبی وقومی) میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

کیا یہ ایثار وقربانی ان روسا کے لئے قابلِ تقلید وسبق آموز نہیں جو محض اپنے ذاتی مشاغل کی بنا پر اور رعایت شوق کی خاطر لاکھوں روپیہ برباد کر دیتے ہیں؟ کیا ان سے احکم الحاکمین روز حشر ان کی ان فضول خرچیوں بے اعتنائیوں اور حق تلفیوں کی باز پرس نہ کریگا؟ کریگا اور ضرور کریگا۔

اس رقم اوقاف کے لئے ہم اتنی عرض ضرور کرینگے کہ اس میں سے نصف رقم لگا کر ایک عربی درسگاہ کی بنیاد ڈالی جائے اور جس میں عام مسلمانوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا جائے۔

اس درسگاہ کا تعلیمی معیار ایسے جدید اصول پر رکھا جائے کہ جب اس مدرسہ کا تعلیم یافتہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو وہ ایک روشن خیال جید عالم وفاضل بھی ہو اور علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کا ماہر انگریزی داں وسائنس داں بھی ہو۔

اگر اس عرضداشت پر توجہ مبذول فرمائی جائے تو یہ اہم کام نہایت آسانی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے۔

اس ماہ میں "علم اور اسلام" والا طویل مضمون ختم ہوتا ہے ہم خود اس قسم کے طول طویل مضامین بالاقساط درج کرنے سے پریشان ہوتے ہیں اور ناظرین بھی انتظار کی شدت سے تنگ آجاتے ہیں لیکن ایک ہی وقت میں اس ضروری اور گراں قدر مضمون کا شائع ہونا محال تھا اس لئے اسکو تین نمبروں میں شائع کرنا پڑا آئندہ کوشش کی جائے گی کہ ہر مضمون ایک ہی اشاعت میں ختم ہو جائے، اگرچہ اس نمبر میں بھی "ہندوستان اور اسکی زبانیں" والا مضمون بسبب طویل ہونیکے ادہورا درج کیا جاتا ہے لیکن دقت یہ تھی کہ اگر ہم اسکو اسی نمبر میں پورا شائع کر دیتے تو قارئین کرام کو علم اور اسلام والے مضمون کی تکمیل کے لئے ایک ماہ اور انتظار کرنا پڑتا۔

باوجود تصحیح اور پروف دیکھنے کے انتظام کے پچھلے نمبر میں بھی کتابت کی بعض اہم غلطیاں رہ گئی ہیں جن کے لئے ہم بیحد شرمندہ ہیں۔ اگر ہم آگرہ سے پروف منگائیں اور خود تصحیح کر کے بھیجیں تو دس بارہ روز کا عرصہ لگ جاتا ہے اول تو رسالہ وقت پر شائع نہیں ہوتا اس پر اگر ہم یہاں پروف منگائیں تو مزید تاخیر کا خوف ہے اس لئے آئندہ سے جدید انتظام کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اب رسالہ بھی وقت پر قدر دانوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔

ہمارے پاس بہت سے ایسے مضمون (نظم و نثر) بغرض اندراج رسالہ آئے ہیں جو زبان کے معیار سے گرے ہوئے ہیں اگر ہم خوشنودی یا حوصلہ افزائی کو مد نظر رکھکر درج کرتے ہیں تو ہمارا رسالہ بھی بعض دیگر رسائل کی طرح عامیانہ اور مبتذل مضامین کا تختہ مشق بن جاتا ہے اور تعلقات داہل علم کی نظروں سے گر جاتا ہے لہذا ایسے مضمون نگار حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ اپنے خیالات کو وسیع اور اپنے مضامین کو اعلیٰ معیار علم و ادب پر لانے کی سعی فرمائیں۔ ساتھ ہی رسالہ کے معیار کو نظر انداز نہ فرمائیں۔

آہ مرحوم نظام الحق (عباسی)

کیا خبر تھی کہ ہم اگست نمبر میں جن کی وساطت سے پروفیسر سید نواب علی صاحب کی غیر مطبوعہ نظم (مناظرہ نظم و نثر) شائع کرینگے وہ اپنے عطیہ کو مطبوعہ کی صورت میں نہ دیکھ سکینگے اور ہمیں دائمی مفارقت کا داغ دے جائیں گے مرحوم نے ۲۵ سال کی عمر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۶ء کو

منگرول میں انتقال فرمایا۔

مرحوم کا وطن احمد آباد تھا لیکن سترہ اٹھارہ سال سے منگرول ہی میں ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور اس عرصہ میں برابر ملک وقوم کی خدمات انجام دیتے رہتے تھے۔

منگرول اور اہل منگرول سے ایسی اُنسیت ہوگئی تھی جیسی وطن اور یاران وطن سے ہوتی ہے منگرول والوں کی بہبودی وبہتری کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔

مرحوم علاوہ منکسر المزاج اور نیک طبع ہونے کے سچے بہی خواہ دہمدرد ملک وقوم بھی تھے۔ انجمن خدام کعبہ خلافت۔ اور ارتداد کے سکریٹری بھی تھے اور ایسے قومی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے اور ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اہل منگرول میں قومی اسپرٹ آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لئے ہم ان کے ہمیشہ ممنون ہونگے

مرحوم کو علم وادب سے گہری دلچسپی تھی اردو اور گجراتی کے اچھے مضمون نگار تھے سیکڑوں کی تعداد میں آپ کے مضامین اخبارات میں چھپ چکے ہیں طبیعت کا شعرگوئی کی طرف بھی میلان تھا عبرت تخلص کرتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے ہم انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں مرحوم کے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین کریں گے

انجمن اسلام منگرول، مرحوم کی زندہ یادگار موجود ہے جس کی بنیاد مرحوم نے عرصہ ہوا غربا اور طلبہ کی خدمات انجام دینے کی غرض سے ڈالی تھی امید کہ کارپردازان انجمن اس یادگار کو قائم اور حوادث سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں گے۔

لیکن افسوس کہ مرحوم کے بعد اب ہمیں منگرول میں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو مرحوم کا نعم البدل ہو سکے اگرچہ ایسے حضرات بہت ہیں جنکے دلوں میں مذہبی جوش اور قومی اسپرٹ موجود ہے، لیکن جب تک میدان عمل میں آکر لوگوں کو اپنا ہم خیال وہمنوا نہ بنا سکیں اور ان کے دلوں میں قومی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا کر سکیں یہ اسپرٹ کس کام کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(بسلسلۂ ماسبق)

(از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اصلاحی)

گیارھویں صدی عیسوی میں قسطنطین افریقی پیدا ہوا جس نے مسلمانوں میں رہ کر تعلیم حاصل کی، اور اپنے زمانہ کا زبردست فاضل ہوا جربرٹ (Gerbert) کے متعلق تو بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس کی سیاحت بلاد اسلامیہ کے بارہ میں بہت کچھ شک وشبہہ کا اظہار کیا جاتا ہے ۱۱۳۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیان قابل اور ماہر فن مترجمین کی ایک جماعت مطران ریمنڈ (Raymond Lull) کی سرکردگی میں طلیطلہ بھیجی گئی تاکہ وہ علوم عربیہ کا لاطینی میں ترجمہ کرائیں اور تیرھویں صدی کے اوائل میں ارسطو کی تصنیفات عربی سے ترجمہ کرکے پیرس یونیورسٹی (L' Universite - de - Paris) میں داخل کردی گئیں اور اس طرح یورپ اس قعر جہالت سے نکلا جس میں وہ چار پانچ صدیوں پھنسا ہوا تھا چنانچہ اس تاریخ تک تو ہم مسلمانوں کے شاگرد تھے، پھر تیرھویں صدی کے وسط میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم ان کے ہم پلہ ہوگئے حتیٰ کہ ۱۲۷۵ء میں قریب قریب مسلمانوں کا یہ افسوسناک انحطاط وتنزل شروع ہوگیا جبکہ یورپ اپنی پوری جد وجہد اور مستعدی کے ساتھ علوم وفنون کے اکتساب اور ان کی ترویج اور اکتساب میں مصروف تھا۔ اور علمی مباحث میں ناقابل قیاس عظیم الشان اور حیرت انگیز

ترقیاں کرنے لگا۔

افسوس! اور صد افسوس! ان علوم و فنون پر جن میں ترقی اور پیش قدمی کی قابلیت اور استعداد نہ ہو، اور زمانۂ حال میں اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہی وہ علوم عربیہ ہیں۔ جو لاطینی یورپ میں تھوڑی سی زندگی بسر کرنے کے بعد معدوم ہو گئے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ ابن رشد جو ہمارے ہاں (یورپ میں) ارسطو کی طرح مشہور ہے اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاں وہ بالکل غیر معروف اور نسیاً منسیاً ہے

۱۲۰۰ء سے لے کر آج تک کوئی عرب فلسفی پیدا نہیں ہوا اس لئے کہ فلسفہ، اگرچہ بالکل متروک و مطرود نہیں ہوا لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ہاں محض مذہب اسلام کی وجہ سے معتوب اور مقہور رہا یہی وجہ ہے کہ اوائل ۱۲۰۰ء سے جبکہ علمائے اسلام کا پورا پورا غلبہ اور تسلط تھا ہم دیکھتے ہیں کہ بلاد اسلامیہ میں فلسفہ کا بالکل فقدان ہے یہاں تک کہ مورخین اور مصنفین اپنی کتابوں میں صرف بسبیل تذکرہ اس پر بحث کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ کی کتابیں نادر الوجود اور معدوم ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے ہاں علم الفلک کی تعریف صرف اس قدر جائز ہے جو نماز کے وقت سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے ضروری اور لابدی ہو۔

پھر اس کے بعد تُرک آئے جن کو مسلمانوں پر غلبہ اور تسلط حاصل ہوا۔ انہوں نے بھی علوم اور فلسفہ کو مٹانے میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ اور اسی زمانہ سے مسلمانوں میں علوم اور فلسفہ کا پورا پورا انحطاط اور فقدان ہوا۔ چنانچہ اس وقت سے ممالک اسلامیہ میں مشکل سے کوئی صاحب فکر و رائے اور سمجھدار عالم ملے گا الا ماشاء اللہ مثلاً ابن خلدون خلاصہ یہ کہ اسلام نے علم اور فلسفہ کا پورا قلع قمع اور استیصال کر دیا۔

جو کچھ اب تک میں نے کہا حاشا و کلا اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں علوم عربیہ کی شان رفعت اور علو مرتبت کی توہین اور تحقیر کروں۔ یوں تو علوم عربیہ کو انسانی علوم و معارف کی تاریخ میں ایک خاص اور اہم درجہ حاصل ہے۔ میرا منشاء صرف اس قدر ہے کہ بعض علوم مثلاً علم الفلک کو عربوں کی طرف منسوب کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے یہ تو ایک کھلی ہوئی بے انصافی ہو گی اگر میں عربوں کی بالکل قدر نہ کروں اس لئے کہ چھٹی صدی بارہویں اور تیرھویں صدی کے مابین کے حالات و واقعات پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ "عربی زمانہ" تھا اور اس زمانہ میں اسلام جہاں کہیں گیا اس نے عقل انسانی کی ہمیشہ تربیت کی لیکن یہ علوم جن کو عام طور پر لوگ علوم عربیہ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں، کیا در حقیقت یہ عربی علوم ہیں یا نہیں، ہرگز نہیں! صرف زبان کے علاوہ عربوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے بات یہ ہے کہ اسلامی فتوحات نے عربی زبان کو حجاز سے لے کر دور و دراز ممالک تک پھیلا دیا ہے۔ اس سے لوگوں کو

یہ دعویٰ ہو گیا کہ عربی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تمام تر عربوں کے ذوق علمی اور رفعتِ تخیل کا نتیجہ ہے۔ جیسا اس سے قبل لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو چکی ہے کہ لاطینی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب لاطینیوں کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے۔
جس طرح البرٹس اعظم (albert le grand) ، راجر بیکن[51]، اور فرانسس بیکن[52]، لاطینی نہیں ہیں باوجودیکہ انہوں نے لاطینی زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ابن رشد ابن سینا اور البتانی بھی عرب نہیں ہیں۔
پس عربی علوم اور فلسفہ کو جزیرۃ العرب کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ مسیحی ادبیات کو زمانۂ انتعاش علوم (Renaissance) اور مسیحی علم الکلام (Scholastique) کو سولھویں صدی کے تمام اور سترھویں صدی کے بعض علوم و فنون کو شہر رومہ کی طرف اس وجہ سے منسوب کرنا کہ وہ لاطینی زبان میں ہیں۔
اگر ہم تحقیق سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن تمام علما اور فلاسفہ میں سے جن کے متعلق عرب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، کوئی بھی سوائے الکندی[53] کے کوئی بھی عربی النسل نہیں ہے نہ وہ نسب اور خاندان کے لحاظ سے عرب ہیں اور نہ خیالات و افکار کے اعتبار سے بلکہ یا تو وہ عجمی ہیں یا ماوراء النہری، اندلسی ہیں۔ یا بخاری، سمرقندی ہیں یا اشبیلی اور قرطبی! ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں عربی زبان کو استعمال کیا حالانکہ عربی زبان ان کے خیالات اور مافی الضمیر کو ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے علما نے قرون متوسطہ میں لاطینی زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ اور اس کی تنگی و کم مائگی کی وجہ سے اس میں ردوبدل کیا۔ عربی زبان شعر اور فصاحت کی صلاحیت تو رکھتی ہے لیکن اس میں فلسفانہ (مابعد الطبیعیات) خیالات ادا کرنے کی استعداد اور قابلیت نہیں[54] ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عرب علما اور فلاسفر کی فلسفیانہ تصانیف میں انشا پردازی کا رنگ کچھ اعلیٰ نظر نہیں آتا۔

---

[51] راجر بیکن (۱۲۱۴ء۔ ۱۲۹۴ء) یورپ کے مشاہیر علما میں سے تھا۔ اس نے تمام تر عربوں سے تحصیل علوم کی تھی۔ فلسفہ، نجوم اور کیمیا میں اس کی تصانیف ہیں جو علمائے اسلام کی خوشہ چینی کی رہینِ منت ہیں۔ (مترجم)

[52] مشہور انگریزی عالم لارڈ بیکن ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۶ء میں مر گیا۔ اس کی تصانیف انگریزی درسیات میں داخل اور عام طور پر متداول ہیں۔

[53] ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی مشہور عرب "فیلسوف" خلیفہ مامون کے زمانہ میں تھا۔ علوم طبیعہ اور فلسفہ میں اس کی چند تصنیفات ہیں۔

[54] یہ رینان اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی کوتاہ بینی اور عربی زبان سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے مستشرقین کا (بقیہ صفحہ آئندہ)

گذشتہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن علوم کو عربی کہا جاتا ہے وہ اصل میں عربی علوم ہی نہیں ہیں تو پھر اسلامی کیا ہونگے ؟ اور کہ اسلام نے حقائق اشیاء سے بحث کی اجازت بھی دی ہے یا نہیں ؟ کیونکہ جن لوگوں نے علوم و معارف کی اشاعت کی اور ان کو ترقی دی وہ مجوس، نصاریٰ، یہود، حرانی، اسمٰعیلی اور منافق مسلمان تھے لیکن خالص مسلمان اور مؤمن تو ان کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے رہے یہاں تک کہ علما نے مامون کی تکفیر کا صرف اسلئے فتویٰ دیا کہ اس نے فلسفۂ یونان کی تعلیم کی اجازت دی تھی۔ اور خود اس کے عہدِ حکومت میں جو مصیبتیں آئیں ان کو علما سے مامون کی غیر مذاہب کے ساتھ رواداری اور سہل انگاری سے منسوب کر دیا۔

کئی خلفا نے اپنی رعایا کے خوف سے مجبور ہوکر، جن کے محرک بھی علما تھے فلسفہ اور فلکیات کی بکثرت کتابیں مجمع عام میں جلادیں۔ جو شخص اس زمانہ میں ان علوم کو حاصل کرتا تھا اسے زندیق اور کافر کہا جاتا تھا۔ اسکی سزا دی جاتی اسکا مکان جلادیا جاتا اور بسا اوقات حکومت عوام کے اشتعال جذبات کو فرو کرنے کے لئے اُسے قتل کر دینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب اسلام نے علوم و فنون کو ہمیشہ بُرا سمجھا ہے اور ان کے شائقین کو سزائیں دی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے دُو دوروں میں امتیاز کیا جائے :۔

(۱) بدورِ اسلام سے لے کر بارھویں صدی عیسوی کے آخر تک،

(۲) تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک،

اسلام کے دورِ اول میں معتزلہ وغیرہ مختلف المذاہب جماعتوں کے باعث مذہبی تعصب اور اس کے احکام کی پیروی کا جوش بہ نسبت دوسرے دور کے بہت کم تھا۔ اس لئے کہ اس دورِ ثانی میں اسلام پر تاتاری، بربری اور وحشی قومیں حکمراں تھیں، جن میں ذرا بھی عقل کا مادہ نہ تھا۔

یہ بات مشاہدہ کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا مسلمانوں کا ایمان اور ان کا تعصب مذہبی سخت اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) ایک گروہ اسکے بالکل خلاف رائے رکھتا ہے جس میں عربی زبان کے ماہرین اور علم اللسان کے جید عالم شریک ہیں۔

علم و فلسفہ کے لئے عربی زبان کی صلاحیت کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ یورپ علمی اور فلسفی اصطلاحات کے لئے عربی زبان کا ممنون احسان ہے۔ عربی زبان میں چالاکھ سے زائد ایسے مادّے ہیں جو قابل تحویل اشتقاق ہیں برخلاف اس کے انگریزی زبان کے پاس ۴۰ ہزار الفاظ اور فرانسیسی کے پاس پچاس ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہیں جیسا کہ محققین لغات کا خیال ہے۔

ضبط ہوتا گیا اس لئے کہ بالکل ابتدا میں جو عرب مسلمان ہوئے تھے ان کی تصدیق رسالت و نبوت بہت ہی کمزور تھی جیسا کہ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں اور تیسری صدی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد خالص مذہبی عقائد کی پابندی تمام دینی اور دنیوی امور میں عام ہوگئی۔ اور لوگوں کو اس پر عمل کرنیکے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ اور عدم پابندی کی صورت میں دردناک اور قابل نفرت سزائیں دی جانے لگیں کہ اس کی نظیر سوائے مجلس المفتش (معتقدمانند ضمنعہ ؟) کے اور کہیں نہیں مل سکتی جس کا کام یہ تھا کہ جو شخص عیسائیت کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتا اسے قتل کر دیا جاتا یا جلا دیا جاتا تھا اس قسم کے واقعات اسپین، اٹلی اور فرانس وغیرہ میں بکثرت رونما ہوئے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ مذہبی عقائد کی پابندی کے لئے جبر کرنا تمدنی آزادی کے لئے پیغام موت ہے۔ اور ہمارے زمانے میں یہ سوائے ممالک اسلامیہ اور یورپ کے ماتحت ملکوں کے ہمیں کہیں نظر نہیں آتا جس کو دینی اور دنیوی امور میں ایک ساتھ اقتدار حاصل ہے۔ لیکن یورپ کے ماتحت ملکوں کا حصہ بہت کم ہے۔ بخلاف مذہب اسلام کہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکمران ہے جو ہر قسم کی ترقی سے محروم ہے کیونکہ وہ آسمانی وحی اور عقائد پر مبنی ہے جیسا کہ تمام مسلمان بزعم خود سمجھے ہوئے ہیں۔

فلاسفۂ یورپ اور شیدایان حریت جو مذہب اسلام کی مدافعت کرتے ہیں، فی الحقیقت وہ اسلام سے واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں مذہب اسلام عبارت ہے ایک ایسے مذہب سے جو دینی اور دنیوی امور کا بدرجۂ اتم جامع ہے حالانکہ وہ صرف ایسے اصول و عقائد پر مبنی ہے جن پر بحث کرنے کی وہ اپنے پیروں کو مطلق اجازت نہیں دیتا۔ مذہب اسلام عقائد کی ایک ایسی بوجھل زنجیر ہے جو نوعِ انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہے ہمیں تسلیم ہے کہ اوائل قرونِ متوسطہ میں (یعنی ابتدائے اسلام میں) مذہب اسلام نے فلسفہ کی مساعدت اور موافقت کی لیکن یہ جو کچھ تھا مجبوراً تھا۔ کیونکہ اہلِ اسلام کی آپس کی نااتفاقی اور فلسفہ کے مزاحم اسباب کی عدم موجودگی کے سبب فلسفہ کی رد کو بالکل روک دینا اسلام کی طاقت سے باہر تھا۔ اس لئے کہ تمام محکمہ جاتِ نظم و نسق عیسائیوں کے قبضہ میں تھے .... لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور انکا مذہبی تعصب سخت ہو گیا تو علم و فلسفہ کو زوال اور مذہبی خوف و نفاق کا دور دورہ ہوا۔ پس اسلام جب تک ضعیف تھا حریت و عدل کا حامل تھا۔ لیکن جونہی وہ قوی اور مضبوط ہوا تو سراسر ظلم ہی ظلم تھا۔ ایسی حالت میں اس کو کوئی فضیلت نہیں دی جا سکتی کہ اس نے عدم استطاعت کی حالت میں علم و فلسفہ کی اجازت دی اسکی یہ فضیلت بعینہ ایسی ہے جیسے کہ ہمارے مذہبی پادریوں کو موجودہ علوم و فنون کی فضیلت دیدی جائے حالانکہ یہ ترقی بالکل ان کے علی الرغم ہوئی ہے۔ کیونکہ مسیحی عقائد اسلام سے بھی زیادہ علوم و

وفنون کے دشمن ہیں۔ لیکن اُن سے علم وفلسفہ کو اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا اسلام سے ممالک اسلامیہ میں۔ یورپ میں اور کہیں بھی ان مسیحی عقائد کو علم کے خلاف غلبہ حاصل نہیں ہوا سوائے اسپین کے کہ وہاں ایک ظالمانہ اور جاہلانہ طریقہ رائج تھا جس کی وجہ سے علوم تباہ وبرباد ہوئے۔ لیکن یہ شریف ممالک مسیحیت سے ضرور انتقام لیں گے اور ان میں علم کو کامیابی نصیب ہوگی اگر تمام مجلسِ تفتیش" لوگوں کے عقائد مذہبی کے لئے ہوتیں اور فلیپ ثانی اور پاپائے پی خامس کی کوششیں علم کے خلاف بارآور ہوتیں تو اسلام میں بھی وہ تمام باتیں پیدا ہو جاتیں جن کے پیدا ہونے کا امکان یورپ میں تھا۔

اگر کوئی شخص کسی امر میں نقصان پہونچانیکا قصد کرے اور اس میں ناکام رہے تو اس کی فضیلت یا تعریف نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ دنیا میں جتنے مذاہب گذرے ہیں ان میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے کچھ مفید باتیں ضرور ہوتی ہیں جو اُس زمانہ میں حالتِ دنیا کی اصلاح کرتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو باتیں مذہب کی مساعدت کے بغیر بلکہ اس کے اعلی الرغم پیدا ہوگئیں اس کے لئے بھی مذہب ہی کو مستحقِ فضیلت تسلیم کیا جائے۔ جبکہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اور نہ یہ مناسب ہے کہ ظالم کو مظلوم سے نفع اُٹھانے دیا جائے۔ بااینہمہ ہر وہ شخص جس کو اسلام سے تعلق ہوگیا ہو ان تمام ترقیوں کے لئے جو اسلام کے علی الرغم معرضِ وجود میں آئیں اسلام ہی کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔

ابن سینا، ابن زہر، اور ابن رشد کو اسلام سے وہی نسبت ہے جو گلیلیو[1] (Galileo) کو رومن کیتھولک سے بیان کی جاتی ہے حالانکہ مسیحیت نے اس کے اکتشافاتِ علمیہ میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ الٹا اس کو نقصان پہونچایا ہے۔ اور میرے دل میں ایسے مذاہب کے خلاف کوئی معمولی اعتراض بھی پیدا نہیں ہوتا جنہوں نے بنی آدم کو ان مشکل مسائل پر بحث کرنے سے نجات دلادی اور جن پر خود آدم (علیہ السلام) نے اپنے مشاہدہ عالم اور اس کے مآل کار پر نظر کرتے وقت غور وفکر کیا تھا۔ مذہبِ اسلام کے احکام فی نفسہ بہت بلند رتبہ اور قابلِ احترام ہیں اور اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے قلب کے اندر ایک کشش اور تاثیر محسوس کی ہے، بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا ہے۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ اس (اسلام) نے عقل انسانی کو بہت پیچھے کر دیا ہے اور اپنے حیرت انگیز اثر ونفوذ سے کام لے کر، جو دیگر مذاہب کو نصیب نہیں ہے، اس نے عقل انسانی کو حقایق اشیاء میں غور وفکر کرنے سے بالکل روک دیا، یہاں تک کہ بعض ممالک کو جہاں اسلام

[1] فلکیات کا مشہور مسیحی عالم جو ۱۵۶۴ء میں اٹلی میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۲ء میں انتقال کر گیا۔ زمین کے گھومنے کا نظریہ اسی نے ایجاد کیا تھا۔

پھیلا علمی نقطۂ نظر سے بالکل صفا چٹ میدان بنا کر رکھدیا جہاں حقائق اشیا سے بحث کرنا[1] جس سے عقل انسان وسیع ہوتی ہے، خواب وخیال سے بہت دور ہے۔ اس پہ اتنا اور اضافہ کرلو کہ ان ممالک کے لوگوں کی عقلیں خود ہی قاصر ہوتی ہیں اس پر طرّہ یہ کہ وہ ہوتے ہیں مسلمان جن کی امتیازی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ علوم وفنون سے بُغض رکھیں، اس کو بُرا سمجھیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ بحث کرنا کفر ہے، اس سے عقل کم ہوجاتی ہے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ کائنات عالم کا علم سیکھنا گویا خدا سے معارضہ کرنا ہے، اور علم تاریخ سے اگلے وقتوں کی گمراہیاں عود کرآتی ہیں کیونکہ وہ تمام تر ازمنۂ قبل از اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر شیخ رفاعہ کا نام لیا جاسکتا ہے جو پیرس میں مدرسۂ مصریہ کے مدتوں امام رہ چکے ہیں۔ پیرس سے واپسی پر شیخ صاحب موصوف نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں فرانسیسی قوم کے عجیب وغریب خیالات بیان کئے ہیں اس میں وہ بڑے شد ومد سے لکھتے ہیں کہ یورپ کے تمام علوم کفر ہیں خصوصاً ان کا عقیدۂ "قدمِ عالم" کے بارہ میں ہمیں شیخ صاحب کا یہ قول دیکھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے، اور اسلام جو نام ہے ایسے عقائد دینیۂ الہامی کے مجموعہ کا جو حریتِ خیال اور حقائق اشیا پر آزادی سے بحث کرنے کے کلیتہً منافی اور بسا اوقات مخالف ہیں۔

علوم کی غرض دین ومذہب کی نفی نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حوادثِ کائنات کو قدرتِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ تجربات مافوق العقل اعتقاد رکھنے کے منافی ہیں۔ اور عقائدِ اسلام کی تو بنیاد ہی ایسے اعتقاد پر ہے۔ پس ایسی حالت میں اسلام کا علوم کے ساتھ بغض رکھنا اس کے اصول کے عین مطابق ہے، لیکن اس مطابقت نے خود اسلام کو بھی بہت سے نقصانات پھونچائے ہیں اور علوم کو تباہ کرکے تو اسلام نے اپنے آپ کو تباہ کرلیا ہے اور وہ اس انتہائی قعرِ تنزل میں جا پڑا ہے،

جب انسان یہ اعتقاد رکھے گا کہ حقائق اشیا پر بحث کرنا احکام خداوندی کے خلاف ہے تو اس کی عقل کُند ہوجائیگی اور اس پر اوہام وشکوک کا غلبہ ہوگا چنانچہ ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آخر بحث ومباحثہ میں کہہ دیتے ہیں "واللہ اعلم[2]"

---

[1] منطقی اصول پر حقائق اشیاء سے بحث کرنا اسلام کا اصل اصول ہے۔ قرآن مجید میں ہے قل هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين اور اہل عرب نے قرآن مجید کی بدولت فلسفی بن گئے کہ اسلام کا ایک خاص اپنا فلسفہ ہے جس کے مبادیات سے اہلِ عرب یونانی فلسفہ اور اس کے متراجم سے روشناس ہونے کے پہلے ہی واقف ہوچکے تھے حتیٰ کہ علم منطق کے بعض اصول بھی انہوں نے وضع کئے تھے۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب "الاسلام اُزاء العلم والفلسفہ" باب مهد الفلسفة فى الاسلام۔ (مترجم)

[2] "واللہ اعلم" کہنے سے فلاسفہ کے طریقہ پر نفی بحث بطور شک وشبہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا کلمۂ تواضع ہے جو بقولہٖ تعالیٰ (بقیہ نوٹ بر صفحہ ۱۱۷)

اس کی شہادت میں موسیو لیارڈ کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب موسیو موصوف موصل پہونچے تو انہوں نے موصل کی آبادی، اس کی تجارت اور اس کے تاریخی حالات کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ ان امور کے متعلق قاضی شہر سے استفسار کیا تو اُن قاضی صاحب نے بذریعۂ ترجمان حسب ذیل جواب دیا:-

"میرے معزز اور پیارے دوست! آپ نے جن امور کے متعلق مجھ سے سوال کیا ہے وہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہیں، باوجودیکہ میری پوری زندگی اسی شہر میں گذری ہے لیکن مجھے کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کے مکانات اور رہنے والوں کا شمار کروں، اور مال تجارت جس کو بعض لوگ اپنے خچروں پر لاد کر لاتے ہیں اور بعض اپنی گردنوں پر تو ان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، اب رہے یہاں کے تاریخی حالات سو اس کا علم تو سوائے خدائے علیم و قدیر کے کسی کو بھی نہیں ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے پہلے یہاں کے گمراہ باشندوں کی تعداد کیا تھی اور اس کا جاننا ہمارے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر ہے

"محب من! آپ کو ان چیزوں سے بحث نہیں کرنی چاہیئے جو آپ کے لئے کچھ بھی مفید نہیں ہیں۔ آپ میرے پاس آئے ہیں اور اس سے ہم خوش ہوئے ہیں تو مناسب ہے کہ آپ اسی طرح خوش و خرم واپس بھی جائیں۔ کیونکہ جو کچھ باتیں آپ نے کہیں ان میں میرا کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ کہنے والا اور ہے اور سننے والا اور۔ آپ نے جیسا کہ آپ کے ہموطنوں کی عادت ہے، مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی ہے یہاں تک کہ یہی سفر آپ کے لئے زادِ راہ بن گیا ہے، یعنے سفر کرنا آپ کے لئے بہت آسان ہو گیا ہے، لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم بحمد اللہ اسی جگہ پیدا ہوئے اور یہاں سے دوسری جگہ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عزیز من! سنو کہ ایمان باللہ سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے جو ساری دنیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ تو کیا ہمارے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ اسکی مخلوقات اور کائنات سے بحث کریں اور اس طرح اس کی برابری کرنے لگیں۔ دیکھو یہ ستارہ ہے جو اُس کے اور اس دُمدار ستارہ کے گرد گھومتا ہے جس سے برسوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ پس اس کو پیدا کرنے والے ہی کے لئے چھوڑ دو کہ وہی اس کا متکفل ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے کہیں کہ اے شخص میرے پاس سے ہٹ جا کیونکہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، اور آپ اس چیز کو دیکھیں جس کو حقیقت میں آپ نہیں دیکھتے اور اس کی وجہ سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ مجھ سے افضل ہیں تو اے دوست یہ آپ ہی کو مبارک ہو، میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ کو ان چیزوں کی بحث سے جن سے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۶) "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا"، استعمال کیا جاتا ہے علاوہ ازیں بہت کم تعداد ایسے متاخرین کی ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں اس کو استعمال کیا ہے، ورنہ عربی کی علمی اور فلسفی تصانیف اس سے بالکل خالی ہیں۔ (مترجم)

میرا کچھ فائدہ نہیں ہے، نجات دیدی ہے۔ تم نے اُن چیزوں کو سیکھا ہے جو میرے نزدیک کچھ بھی اہم نہیں ہیں، اور اُن چیزوں کو دیکھا ہے، جو میرے نزدیک حقیر ہیں پس کیا کثرتِ علم سے تمھارے لئے زادِ راہ (سامانِ آخرت) مُہیا ہو سکتا ہے؟ یا وسیع النظر ہونے سے تمھیں جنت کا راستہ مل سکتا ہے؟ پس اے دوست! اگر تم سعادت چاہتے ہو تو کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ، کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ اور اس طرح لوگوں کو خوف دل سے نکال دو، اور موت سے ڈرتے رہو جو تمھارے لئے مقرر ہو چکی ہے ،،

یہ قاضی صاحب اپنے طریق پر ایک بہت بڑے فلسفی ہیں لیکن ہم میں اور اُن میں فرق یہ ہے کہ ہم ان کے تمام جوابات کو محض ظرافت ہی سمجھتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہم ان کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں تو وہ بہت چراغ پا ہوں! ایسی ہی عقل کے لوگ اس قوم کو تباہ کر دیتے ہیں جس کی عقلیں بہت کچھ ترقی کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے خیالات سے جو علم اور عقلیت سے بالکل عاری ہی ہوتے ہیں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں ایک تو نہایت ذلیل خرافات و توہمات اور دوسرے اپنے عقیدہ کا تعصب۔ اور یہی دوسری چیز ہے جو لبسا اوقات نہایت خراب نتائج پیدا کرتی ہے۔

مسلمانوں میں جو مشرقی مسلمان ہیں وہ خرافات کی طرف مائل نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ہاں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کی عقلوں پر ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا بڑا تسلط ہے جو نوعِ انسانی کے ادائے فرائض کے لئے سدِ راہ ہے۔ اس لئے کہ اس زمین پر ہم جہل میں مبتلا اور اسی پر مطمئن رہنے کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ اس لئے کہ باطل اور مضرت رساں عناصر کا مقابلہ کریں۔ علم ہر ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کی روح درواں ہے، اسی سے قوموں کی عقلیں علیٰ قدرِ مراتب فنونِ حرب اور صنعت و حرفت میں ترقی کرتی ہیں۔ اور سی سے انسان قومی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ سکتا ہے، یعنی اس سے وہ اعتدال پیدا ہوتا ہے جو بقاءِ عالم کے لازمی ہے۔ علم ہی سے قوائے عقلی کی آبیاری ہوتی ہے۔ اگرچہ آج بھی ایشیا میں ایسے جاہل و وحشی پائے جاتے ہیں جیسے کہ ابتدائے لشکر اسلام میں اور اس کے بعد بھی ہلاکو اور چنگیز خاں کے لشکر میں تھے، لیکن یورپی علوم نے اب اقوام یورپ کی ایسی کایا پلٹ کر دی ہے یہ اگر حضرت عمرؓ یا چنگیز خاں بھی ہوں تو افواج یورپ کے مقابلہ پر نہیں ٹھہر سکتے۔ بلکہ ان کو اپنے "صحرا" سے نکلنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ ان نو ایجاد، آتشین آلات حرب کے سامنے ٹھہرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے تمھیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں ان آلات کی بہت مذمت کی جاتی تھی حالانکہ وہ اس وقت ہمیں بہت مدد دیتے اور ترقی کی اشاعت میں ہماری مساعدت کرتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں تو علم ہی سچی نعمت ہے اور اسی کی بدولت آلات و اسلاح فتنہ و شر سے ہمیں بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے ایجاد ہوئے جو لبسا اوقات اسی (علم) سے مُنتج ہوتے ہیں اور میری رائے یہ بھی ہے کہ علم صرف اُسی ترقی کی مساعدت

کرتا ہے جو انسان کی حفاظت اور آزادی پر مبنی ہو۔

ہندوستان اور اُس کی زبانیں

از

سر جارج گریرسن۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای

(مترجمہ مولوی عبد الستار صاحب فاروقی)

اُن مختلف طریقہ ہائے زبان کے مشاہدہ کے لئے، جن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان نے مسئلہ زبان کو حل کیا ہے، بحیثیت مجموعی دنیا کا کوئی خطہ ہندوستان سے زیادہ مواقع پیش نہیں کرسکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خاص ہندوستان کی زبانیں ۱۷۹ ہیں اور اگر اس میں برما کو شامل سمجھا جاوے تو ان کی تعداد ۱۹۰ تک پہونچتی ہے۔ ان زبانوں کا تعلق اُن چھوٹے شعبوں کے علاوہ جو ابھی تحقیق طلب ہیں زبان کے اُن چار مُسلّمہ خاندان سے ہے جن کو علم اللسان میں تبتی چینی (Tibeto-Chinese)، دراویدی (Dravidian) آسٹروی (Austric) اور آرین (Aryan) کہتے ہیں۔ ہندوستان کو ان لسانی تعلقات کی بنا پر ایک ایسے لسانی جنکشن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، جہاں سے مسافر بلا تبدیلی پلیٹ فارم کے ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں منتقل ہوکر ہر سمت میں دنیا کے بعید ترین گوشہ تک پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ آسٹروی لائن کے ذریعہ ہم جنوب مشرق میں پنجاب سے ہندوستان کو طے کرتے ہوئے برما، انڈوچین، انڈونیشیا (Indo-nesia)، ملانیشیا (Melanesia) اور پولی نیشیا (Poly-nesia) سے گزر کر جنوبی امریکہ کے ساحل سے دور جزیرۂ ایسٹر (Easter) تک جاسکتے ہیں، اور تبتی چینی کے ذریعہ ہم مشرق میں بالتستان (کشمیر) اور وہاں سے ہمالہ کی تلہٹیوں سے گزرتے ہوئے آسام، برما اور سیام کے راستہ سے چین کو پہونچ سکتے ہیں؛ جبکہ آرین زبانیں ہمیں انڈو یورپین کی بڑی شاخ سے ملاتی ہوئی تمام مغربی ایشیا کی وسعت میں گھماکر یورپ میں اور وہاں سے اٹلانٹک پار امریکہ پہونچا سکتی ہیں۔ غرضکہ بلحاظ زبان ہندوستان کے تعلقات کی وسعت تمام دنیا کو محیط ہے۔

زمانۂ دراز سے ہندوستان میں جو زبانیں بولی جاتی رہی ہیں اُن کا تعلق آسٹروی خاندان سے تھا اور ہے؛

بلکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے ہندوستان کی قدیم ترین اور اصلی بھاکا آسٹروی خاندان ہی کی ایک قسم تھی جو آگے چل کر دو بڑے شعبوں آسٹرونیسین اور آسٹروایشیاٹک میں منقسم ہو گئی۔ ان میں سے اول الذکر ملک کے صرف ایک گوشہ میں برما کی انتہائی جنوبی سرحد پر ایک ساحلی خانہ بدوش قبیلہ کی زبان رہی ہے جو سالونز ([illegible]) کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں سے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ (آسٹرونیسین) بحرالکاہل ([illegible]) کے اس پار جزیرۂ ایسٹر تک، اور جنوب میں آسٹریلیا کو بیچ میں چھوڑتی ہوئی، نیوزیلینڈ تک پہونچتی ہے۔ انڈوچینی زبانیں آسٹروایشیاٹک شعبہ کی خاص نمائندہ ہیں جن سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ علاوہ انڈوچینی کے اسکی دوسری شاخیں برما، آسام، اور خلیج بنگال کے پار جزائر نکوبار میں ہوتی ہوئی وسط ہند میں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں اس کو سنتالی اور دیگر مخلوط زبانوں کی شکل میں وہ پہاڑی جرگے مثل سنتال، منڈے، اور کرکو استعمال کرتے ہیں جن کے ناموں سے مشنری سوسائیٹیوں کے رسائل پڑھنے والے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہندوستان کے لسانی معائنہ سے جو حال ہی میں اختتام کو پہونچا ہے، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کی زبانیں وادی گنگا کے ایک بڑے حصہ اور کوہ ہمالہ کے جنوبی رُخ میں براہِ راست پنجاب تک مروّج رہی ہیں۔ اس تمام وسیع رقبہ پر اگرچہ دوسری زبانیں بھی اب تک قابض ہیں جن کو وہاں بعد کو آباد ہونے والے لوگ بولا کرتے تھے، تاہم اصلی زبان کی بہت سی یادگاریں آسٹروایشیاٹک الفاظ اور محاورات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ علاوہ بریں بہت قدیم زمانہ میں ان کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ جب آرین لوگ شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کو اپنے اس نئے مسکن میں ایسی چیزوں سے سابقہ پڑا جن کے ناموں سے وہ پہلے قطعاً ناآشنا تھے۔ اس لئے وہ مجبور ہوئے کہ ان کو ان کے دیسی ناموں ہی سے یاد کریں۔ اسی طرح کئی دیسی نام انکی زبان پر چڑھ گئے اور یہی نام اب بطور اصلی زبان کی یادگار کے سنسکرت میں، جو آج سے دو ہزار سال بیشتر مُردہ ہو چکی ہے، باقی ہیں یہاں ہم مثالاً چند اشیا کے نام لکھتے ہیں جو آسٹروایشیاٹک نژاد ہیں، اور سنسکرت میں عام طور پر مستعمل ہیں:-

”پان - روئی - روئی کا کپڑا - بانس کا تیر،“ وغیرہ

یہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے محققین السنۂ ہند کے لئے باعثِ پریشانی تھے۔ ان الفاظ کی طرح بعض شہروں کے نام بھی باوجود آسٹروایشیاٹک نسل سے ہونے کے سنسکرت لٹریچر میں داخل ہو گئے ہیں۔ آرین قوم نے ان کو استعمال ہوتے دیکھا اور اختیار کر لیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اس قبیلہ کا نام ہے۔ جس کو ملایا والے، جن کی زبان آسٹرونیسین ہے، ”کلنگ“ کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل ہندوستان کے مشرقی ساحل

کے سنسکرت نام "کلنگا" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ لفظ "کلنگا" اصل میں آسٹرو ایشیاٹک ہے۔
جس کو سنسکرت نے عاریتاً لے کر اپنا بنا لیا تھا۔ اب یہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ یورپین بھی اس کو استعمال کرنے لگے
ہیں چنانچہ پلینی (Pliny) کی کتاب نیچرل ہسٹری (تاریخ طبیعی) میں یہ لفظ موجود ہے۔ یہ آسٹرو ایشیاٹک
لفظ کی ایک عمدہ مثال ہے جس کو انڈو آرین نے اختیار کیا، اور جو بگڑی ہوئی صورت میں مجمع الجزائر ملایا کی آسٹرونیشین
بھاکا میں دوبارہ نمودار ہوا۔ ویانا (Vienna) کے پادری اسکمڈت (Schmidt) جو اس
موضوع پر ہمارے لئے ایک بہت بڑی سند ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُن تمام آسٹروی زبانوں کی قدیم ترین شکل،
جس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، خود ہندوستان میں ضرور مستعمل رہی ہوگی، اور یہاں سے یہ زبانیں آگے بڑھتی ہوئی
بحر الکاہل کے پاس جزیرۂ ایسٹر اور نیوزیلینڈ تک پہونچ گئی ہونگی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس طویل سفر کے باعث ان میں
اہم تبدیلیاں واقع ہو گئیں، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اب بھی صاف طور پر ان کی قرابت قریبہ کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان
کی آسٹرو ایشیاٹک زبانوں میں قابلِ ذکر ایک تلنگ زبان ہے جو پہلے برما میں بولی جاتی تھی اور اب جنوبی حصہ پیگو
(Pegu) کی بولی ہے، اور دوسری آسام کی خاصی اس ضلع کی زبان ہے جس میں صوبہ کا صدر مقام شیلانگ
واقع ہے۔

اگر ہم سنتالی زبان کو ان ہندوستانی آسٹرو ایشیاٹک زبانوں کی ایک اہم شاخ کے طور پر لیتے ہیں
تو فوراً ہماری نظر اس کے نحوی قواعد کی ظاہری پیچیدگی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے، حالانکہ وہ تمامتر باقاعدگی کا ایک
عمدہ نمونہ ہے، اور اس لحاظ سے وہ اسی قدر آسان ہے جتنی کہ اسپرانٹو (Esperanto) اس زبان میں
آسان ترین خیال کو ادا کرنے کا طریقہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر فعل پورے جملہ کی جزئیات پر مشتمل ہو مثلاً "ڈال"
ایک فعل ہے جس کے معنی ہیں مارنا، پیٹنا۔ اب اگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:-

"میرے غلام کا لڑکا خود کو پٹنے کی اجازت دیتا ہے"۔ تو فعل ڈال کی یہ صورت ہوگی:-

"ڈالوچو اکنتا اتینائی" (Dalachoakantahintá aetinae) اس جملہ میں
ہر کلمہ پر زور دیا جاتا ہے، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ:-

"وہ شخص جس کا تعلق اُس سے ہے جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے اپنے تئیں لوگوں کے ہاتھ سے مار کھلاتا رہے گا!"
ایک سنتالی فعل کی پوری گردان کے لئے اگر ایک معمولی گرامر کے چھ سو صفحات وقف ہو جائیں تو اس میں کوئی
تعجب کی بات نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس کے تمام اصول اور قواعد اس قدر آسان اور منطقی ترتیب پر ہیں کہ صرف چند

گھنٹوں کی کوشش سے ہم اون پر حاوی ہوسکتے ہیں۔

آسٹروی زبان کے برعکس دراویدی زبانوں کے باہمی تعلقات اگر منقطع نہیں ہوگئے ہیں تو مُشتبہ ضرور ہیں۔ یہ زیادہ تر جنوبی ہند میں مروّج ہیں۔ ان میں قابل ذکر اسنہ تامل، کانڑی، اور تلگو ہیں اور ان کے بولنے والے علی الترتیب ایک کروڑ اسی لاکھ۔ ایک کروڑ۔ اور دو کروڑ چالیس لاکھ ہیں۔ یہ زبانیں باقاعدہ اور اصول نحو کے ساتھ منضبط ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم تمدن سے متعلق قیمتی لٹریچر پایا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ بہت چھوٹے چھوٹے قبائل کی خانگی بولیاں جو شمالی ہند بلکہ بلوچستان اور دریائے سندھ کے اوپر جانب مغرب پھیلے ہوئے ہیں، دراویدی ہیں، اور اسی دیسی زبان کو برتنے والے مجموعی طور پر اب بھی جرمنی کی آبادی سے زیادہ یعنی چھ کروڑ چالیس لاکھ ہیں۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اگلے وقتوں میں دراویدی بولنے والے قبائل مغربی ہند اور پنجاب پر قابض تھے مگر وہ کہاں سے آئے تھے اور مغربی ہند پر کس طرح قابض ہوئے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر اب تک محققین متفق الرائے نہیں ہوئے۔ ایک گروہ کا جس کے مؤیدین میں مسٹر (Slater[۱]) کا حال میں اضافہ ہوا ہے، یہ خیال ہے کہ آریوں کی طرح مگر ان سے بہت پہلے دراویدی بھی شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ جب آرین لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان دراویدوں کو بہت متمدن میں پایا تھا، جو بڑے شہروں میں سکونت پذیر اور پنجاب پر قابض تھے، جہاں قابض ہونے سے پہلے ان کو سخت معرکہ آرائیاں کرنی پڑی تھیں۔ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ زمانۂ قبل التاریخ میں آسٹریلیا دراویدی اُس وقت ہندوستان آئے جبکہ ان ہر دو ممالک کے درمیان خشکی کے راستہ سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ نظریہ ابھی زیر تحقیق ہے اور اس کے متعلق کوئی ناطق فیصلہ دینا یقیناً قبل از وقت ہوگا اور اگرچہ ہم اس کے ثبوت میں کوئی بات اس قسم کے تعلقات کی نسبت پیش نہیں کرسکتے، تاہم بعض وجوہ مشترکہ کی بنا پر ہم اس نظریہ کو ناممکن بھی نہیں کہہ سکتے۔

(باقی)

---

[۱] گلبرٹ سلیٹر ایم، اے، باڈسی۔ ایس سی سابق پروفیسر معاشیات، مدراس یونیورسٹی اور مصنف "ہندوستانی تہذیب میں دراویدی عنصر" (مترجم)

کتاب الاغانی

اور

اَبُو الفرَج اَصْفہانی

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر کا یہ مضمون عرصہ ہوا رسالہ النصر (لکھنؤ) میں شائع ہو چکا ہے لیکن حال ہی میں ایک مضمون مصر کے عربی رسالہ الزہرا میں آغانی اور اُس کے مصنف پر شائع ہوا ہے اس میں سے بعض معلومات مفیدہ کو اخذ کرکے بادنیٰ تغیر قاضی صاحب موصوف نے ہمیں بغرض اشاعت ارسال فرمایا ہے جس کو ہم ذیل میں شائع کرتے ہیں۔ "اڈیٹر"

عربِ قدیم کے متعلق اسلامی مؤرخین کے لئے اشعار و امثال عرب ایک بہت بڑا ذریعہ معلومات کا ہوئے، چنانچہ اسلامی مورخین یعقوبی، طبری، مسعودی، ابن اثیر، ابوالفداء، ابن خلدون وغیرہ نے علاوہ دیگر ذرائع معلومات کے زیادہ تر اسی ذریعہ سے عربِ قدیم کا حال لکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ اشعار عرب سے ایام عرب، ان کی لڑائیاں، اور اخلاق و عادات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اشعار ایک مدت تک زبانی روایت ہوتے چلے آئے اس بنا پر انکا اکثر حصہ برباد ہو گیا، اگرچہ اسلام میں ابو عبیدہ اور اصمعی اشعار عرب کے سب سے بڑے راوی خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں نے بھی جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کا اکثر و بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ تاہم عربِ قدیم کے لوگوں کی تاریخ ان کے عادات و اطوار اور ان کی طرز معاشرت کے متعلق لٹریری حیثیت سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ اب تک "کتاب الاغانی" میں محفوظ ہے۔

کتاب مذکور اصل میں سو قسم کی اُن مختلف راگنیوں کے بیان پر مبنی ہے جن کو مغنیوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے لئے اختیار کیا تھا[1] اِن راگنیوں میں مصنف نے بھی کئی ایک راگنیوں کا اضافہ کیا ہے گویا یہ اُن تمام موسیقانہ عربی اشعار کی تاریخ ہے جو مصنف کے زمانہ تک گائے گئے ہیں۔ ان اشعار کے بول اور ان کی دُھن بتانے کے بعد ان کے موجدین شعراء اور مغنیوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے، جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، کہ مصنف نے صرف اسی موضوع پر اکتفا کیا ہے، بلکہ اخبار و اشعار، اور انساب و ایام عرب کے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۵۵۔

علاوہ اُن تمام مغنیوں اور شعراء کے حالات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے جن کا کلام اس کتاب میں درج ہے، اور بعض جگہ تاریخ و دیگر علوم سے بھی بحث کی ہے۔ علاوہ بریں مغنیہ اور شاعرہ عورتوں، کنیزوں شراب ملانے والوں، اور گانیوالے حسین لڑکوں کے حالات بھی اس کتاب میں مذکور ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف قسم کے لوگوں کے نوادر اور لطائف و ظرائف بیان کئے ہیں۔ مشاہیر شعراء مثل ابو تمام، ابو نواس، بحتری وغیرہ کے کلام کا اکثر حصہ جمع کر دیا ہے۔ بعض مستند احادیث و روایات، نحو و لغت، سیر و مغازی، طلب و بیطاری، اور ہیئت و نجوم سے متعلق کئی باتیں اس میں درج کی ہیں۔ غرضکہ مصنف نے کوئی چیز رطب و یابس اُٹھا نہیں رکھی اور اس نے ہمارے لئے ایک ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اصفہانی نے کوئی واقعہ اغانی میں ایسا نہیں لکھا جسکی اسانید اور مختلف روایات کو نہ بیان کیا ہو۔ ان اسانید اور روایات مختلفہ سے متناقض اور مبالغہ آمیز روایات میں ہم تمیز کرکے صحیح اور غلط کو پہچان سکتے ہیں۔ کتاب الاغانی کا طرز تحریر بلیغ حشو و زوائد اور تعقید و تکلیف سے پاک ہے۔ بغداد کے بویہی حکمراں معز الدولہ کے وزیر ابو محمد المھلبی اس کتاب کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

ھو للزاھد فکاھۃ، وللعالم مادۃ وزیادۃ وللکاتب والمتادب بضاعۃ وتجارۃ، وللبطل رحلۃ وشجاعۃ، للمضطرب ریاضۃ وصناعۃ وللملاک طیبۃ ولذادۃ"[1]	یہ کتاب ایک زاہد خشک کے لئے تفریح کا سامان، ایک عالم کے لئے معلومات کی کان، ایک انشاپرداز اور طالب ادب کے لئے سرمایۂ تجارت، ایک بہادر کے لئے سفر اور شجاعت، ایک مضطرب آدمی کے لئے ورزش و ریاضت اور ایک فرماں روا کے لئے تفریح و لذت ہے۔

بلاشبہ عربی لٹریچر میں یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مشہور مورّخ ابن خلدون اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

ولعمری انہ دیوان العرب وجامع اشتات المحاسن التی سلفت لھم فی کل فن من فنون الشعر والتاریخ والغناء وسائر الاحوال ولا یعدل بہ کتاب فی ذالك فیما نعلمہ، وھو الغایۃ التی یسمو الیھا الادیب ویقف عندھا وانیٰ لہ بھا[2]	بجان عزیزم! یہ کتاب عربوں کا پورا دفتر یا رجسٹر ہے اور اُن تمام مختلف محاسن مثل شعر تاریخ اور موسیقی وغیرہ پر حاوی ہے جو انہوں نے زمانۂ قدیم میں حاصل کئے تھے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کوئی کتاب اس فن میں اس کی برابری نہیں کرسکتی۔ ایک ادیب کے لئے یہ غایت الغایات ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے اور جس کے بعد اس کو کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی

---

[1] دیکھو مقدمۂ اغانی۔ [2] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۵۱۔

ابن خلکان کی روایت مندرجہ ذیل سے اس کتاب کی اہمیت بخوبی ثابت ہوتی ہے :-

"کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عباد[1] تیس اونٹ کتابوں کا بوجھ سفر میں ہر وقت مطالعہ کرنے کے لئے ساتھ رکھا کرتا تھا لیکن جب کتاب الاغانی اسے مل گئی تو اس نے صرف اسی ایک کتاب کو ساتھ رکھنے پر اکتفا کیا"[2]

الغرض یہ نہ صرف موسیقی عرب کی ایک ڈکشنری ہے بلکہ اہل عرب کی شاعری، ان کی تاریخ، اور ادب کی ایک جامع و مانع انسائیکلو پیڈیا ہے۔

اس مشہور کتاب کا مصنف قاضی علی بن حسین بن محمد بن احمد بن ہیثم اُموی مشہور بہ ابوالفرج اصفہانی ہے۔ وہ ۲۸۴ھ مطابق ۸۹۷ء بمقام اصفہان پیدا ہوا۔ وہ عرب عرباء قریش کی خاص نسل سے اور سلاطین اُمویہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کے خاندان سے تھا۔ اس کا خاندان اگرچہ اصفہان میں مقیم تھا۔ لیکن اس کا عنفوان شباب زیادہ تر بغداد ہی میں گذرا تھا جہاں وہ بطور ایک ادیب اور مصنف کے مشہور ہوا۔ وہاں اس نے تعلیم و تربیت پائی اور وہیں سکونت اختیار کی۔ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہونے کے باوجود مذہباً شیعہ تھا[3]۔ سکونت عراق اور قرب فارس کی وجہ سے بیتر عجمی اہل تشیع کے میل جول سے (جو بغداد آتے جاتے رہتے تھے) غالباً وہ مائل تشیع ہوا ہوگا۔

امیر سیف الدولہ حاکم شام کے دربار میں اس کی رسائی تھی اور امیر اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا کرتا تھا۔

اسی طرح بنی اُمیۂ اندلس سے بھی پوشیدہ طور پر اس کی چند تصانیف کا صلہ ملا کرتا تھا جن کو وہ اندلس وقتاً فوقتاً بھیجا کرتا تھا۔

یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ابوالفرج بہت کثیف اور میلا کچیلا رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اپنے کپڑے نہیں دُھلواتا تھا حتی کہ جب تک وہ بوسیدہ ہو کر نہ پھٹ جاتے وہ ان کو اپنے جسم سے نہیں اُتارتا تھا[4]

اصفہانی ہجو گوئی میں بہت مشہور تھا۔ چنانچہ لوگ اسکی مذمت اور زبان تلخ سے بہت ڈرتے تھے۔ ابوعبداللہ البریدی کو جب عہدۂ وزارت تفویض ہوا تو اس نے ہجو لکھی جس کا مطلع یہ ہے :-

یا سماء اسقطی و یا ارض میدی	اے آسمان ٹوٹ پڑ اور اے زمین متزلزل ہوجا
قد تولی الوزارۃ ابن البریدی	ابن البریدی کو وزارت مل گئی ہے!

[1] یہ بڑا فاضل اور ادیب شخص مؤید ولہ اور فخر الدولہ (بویہی) کا وزیر تھا۔ اس کا نام ابوالقاسم اسمٰعیل بن ابی الحسن عباد بن عباس ہے۔ ۳۸۵ھ میں بمقام رے وفات پائی (ابن خلکان ج ۱ ص ۷۵ و ص ۷۶)

[2] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۴ [3] ایضاً

[4] ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب ج ۵ ص ۱۵۲ ۔ ص ۱۵۳

تغزل میں اس کے عمدہ اشعار ہیں جو یاقوت اور الغزی نے نقل کئے ہیں [۱]

کہتے ہیں کہ کتاب الاغانی کی تصنیف میں اس نے اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ یعنے پچاس برس کر دئے، اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ امیر سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے ایک ہزار دینار عطا کئے اور ساتھ ہی ایک ایسی معرکۃ الآرا کتاب کی تصنیف پر اس قدر قلیل رقم دینے پر معذرت خواہی کی [۲] حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ عضد الدولہ نے اس کتاب کا ایک نسخہ چار ہزار درم کو خریدا تھا جسے وہ سفر و حضر میں کسی وقت اپنے پاس سے جدا نہیں کرتا تھا [۳]

اُسی زمانہ میں اندلس میں امیر الحکم بن عبد الرحمٰن الناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) بڑا علم دوست اور کتابیں جمع کرنے کا شائق تھا۔ اس کی یہ خاص کوشش تھی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائے بغداد سے پہلے اسپین آ جائے، اس کوشش میں وہ بہت سا مال و زر صرف کیا کرتا تھا جب اس کو یہ خبر پہونچی کہ ابو الفرج کتاب الاغانی تصنیف کر چکا ہے تو اس سے درخواست کی کہ یہ کتاب عراق (بغداد) پہونچنے سے پہلے اس کے پاس بھیجدی جائے اور اس کے عوض میں الحکم نے ایک ہزار اشرفیاں بھیجیں [۴]

ابو الفرج نے چہارشنبہ ذی الحجہ ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء میں بمقام بغداد وفات پائی۔ مرنے سے چند روز قبل اس کے حواس معطل ہو گئے تھے [۵]

ابو الفرج کی تصانیف حسب ذیل ہیں جن کا ذکر ابن الندیم حاجی خلیفہ اور یاقوت نے کیا ہے:۔ [۶]

۱ کتاب الاغانی الکبیر
۲ کتاب مجرد الاغانی
۳ التعدیل والانتصاف فی اخبار القبائل وانسابہا
۴ مقاتل الطالبیین (چھپ گئی ہے)
۵ الماء والشواعر
۶ الدیارات
۷ دعوۃ التجار
۸ اخبار القیان
۹ المالیک الشعراء
۱۰ ادباء الغرباء
۱۱ اخبار جحظۃ البرمکی
۱۲ کتاب اخبار الطفیلیین
۱۳ کتاب مناجیب الخصیان
۱۴ الاخبار والنوادر

[۱] ملاحظہ ہو اسکا کلام ارشاد الاریب ج ۵ ص ۱۵۲ ۔ ص ۱۵۳ میں، نیز الغزی کی کتاب الآداب السلطانیہ ص ۳۸۷ ۔ ص ۳۸۸ میں۔
[۲] ابن خلکان ص ۳۳۴ ۔ [۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۲۶ ۔ [۴] نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۱۸۰ ۔
[۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۵ ۔ [۶] کتاب الفہرست ص ۱۱۵ ، ارشاد الاریب ج ۵ ص ۱۵۱ ۔ ص ۱۵۲

۱۵ کتاب الخمارین والخمارات	۲۱ جمہرۃ النسب
۱۶ کتاب فی النغم	۲۲ نسب المہالبہ
۱۷ اعیان الفرس	۲۳ نسب بنی شیبان
۱۸ الفرق والمعیار فی الاوغاد والاحرار (ہارون بن النجم کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا تھا)	۲۴ نسب بنی عبد شمس
۱۹ کتاب الدیانات	۲۵ نسب بنی تغلب
۲۰ تحف الوسائد فی اخبار الولائد	۲۶ تفصیل ذی الحجۃ

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اصفہانی کی کوئی کتاب سوائے کتاب الاغانی اور مقاتل الطالبین کے اب تک معرض طبع میں نہیں آئی۔ اور اس طویل فہرست میں سے شاذ ہی چند رسائل یا ان کے متفرق اجزا ممالک اسلامیہ کے کتب خانوں یا یورپ کی لائبریریوں میں مل سکیں۔ اگرچہ قرین قیاس تو یہی ہے کہ تاتاری سیلاب نے جہاں لاکھوں بیش بہا جواہر دجلہ فرات میں غرق کر دئے۔ وہاں ان کو بھی دریابرد کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اس طویل عرصہ میں اس کی کسی تصنیف کی موجودگی کا پتہ نہیں چل سکا۔

یورپ میں سب سے اول جب فرانسیسیوں نے مصر پر چڑھائی کی اس وقت کتاب الاغانی کا قلمی نسخہ موسیو ریج (M. Reig) کو دستیاب ہوا جو اب تک پیرس کی رائل لائبریری میں رکھا ہوا ہے[۱]

کتاب الاغانی سب سے پہلے قاہرہ کے مطبع بولاق میں ۱۲۸۵ھ میں ۲۰ جلدوں میں ناقص طبع ہوئی بعد ازاں مستشرق رُودولف برونو (R. E. Brunnow) نے ۱۳۰۶ھ میں اس کی اکیسویں جلد لیڈن سے شائع کی۔ اور پروفیسر جویدی (Guidi) اطالوی مستشرق نے بعض مستشرقین یورپ کی مدد سے اس کی چار حسب ذیل فہرستیں (انڈکسین) مرتب کیں:

(۱) اسماء شعراء (۲) قوافی اشعار مندرجہ کتاب (۳) رجال ونساء قبائل (۴) امکنہ وجبال ومیاہ۔

۱۳۱۸ھ میں یہ انڈکس لیڈن سے شائع ہوئی۔ پھر الحاج محمد الساسی نے اس کو مکرر چھاپ کر اغانی کے اکیسویں جلد کے ساتھ ملحق کر دیا۔ یہ انڈکس طبع مصریہ کے حوالہ صفحات کے ساتھ استاد مفضال بک مسعود نے تیار کی تھی۔ بیروت کے ایک عیسائی پروفیسر انطون صالحانی نے رنات المثالث والمثانی کے نام سے دو لطیف

---

[۱] روز گارڈن آف پرشیا از مس کاسٹیلو ص۹

جلدوں میں اغانی کی تلخیص تیار کی جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔[1]

استاد شیخ محمد خضری مفتش المعارف مصر نے اغانی کی تہذیب مرتب کی ہے، یعنے تمام مکررات اور اسانید حذف کرکے، شعرا کے حالات ان کے قبائل کے لحاظ سے ترتیب دئے ہیں، اس تہذیب کو دارالکتب المصریہ نے شائع کیا ہے۔ اور طباعت کے تمام اخراجات کے لئے سید علی بک راتب نے دو ہزار پونڈ (مصری) عطا کئے ہیں۔

ابن منظور صاحب لسان العرب نے بھی اغانی کا اختصار کیا تھا جو مختصر الاغانی کے نام سے مشہور ہے۔ حال میں یہ کتاب محب الدین الخطیب (اڈیٹر الزہراء) کے مطبع سلفیہ میں سید محمد عمر الخشاب کتب فروش کے خرچ سے چھپ رہی ہے۔ یہ نسخہ بھی مکرر روایات، اسانید و اصطلاحات موسیقی سے خالی ہے اور اس میں شعرا کے حالات حروف معجم کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں۔

غزل

(ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین (بٹالوی)

پھر کہہ رہی ہیں کلیاں ہنس ہنس کے بیکلی میں
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

جھڑتے ہیں پھول اُن کے منہ سے ہنسی ہنسی میں
کھلتے ہیں جس طرح سے غنچے شگفتگی میں

تابندہ ہوگیا ہے بندہ بھی بندگی میں
حسن ایاز جھکا ہے عشق غزنوی میں

ہمدم نہ کوئی مونس غمخوار ہے نہ محرم
بس مجھ سے بیکسی ہی لپٹی ہے دوستی میں

ہے حسن و عشق باہم اک دوسرے میں پنہاں
شکل ایاز روشن ہے شکل غزنوی میں

میری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت
اظہار مدعا کا جذبہ ہے خامشی میں

دُنیا تو عیش میں ہے آباد ساری خلقت
میں ایک بس رہا ہوں دنیائے بیکسی میں

لینے دے لطفِ اُلفت اے ہوش وصل کی شب
ڈوبی ہوئی خودی ہے خود شوق بیخودی میں

اک سانس آنے والی اک سانس جانے والی
ہے راز زندگی کا بس یہ ہی آدمی میں

[1] الشفاء العنوس مع باہو مطبوع ص ۱۲

مترجمات

ہندوستان اور جاپان

رسالہ ماڈرن ریویو بابت جولائی ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر جے۔ٹی سنڈرلین ہندوستان اور جاپان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جاپان جو کچھ عرصے کے پہلے بالکل گمنامی کی حالت میں تھا آجکل اس کا شمار ایشیا کی سربرآوردہ اقوام میں ہوتا ہے اور وہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ حکومت بن گیا ہے۔ستر برس پہلے جبکہ کموڈر پیری نے جاپان کا جمودِ غفلت دور کیا اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات قائم کرنے کے لئے اس کے دروازے کھول دئے اس وقت وہ ایشیا میں غیر معروف سا تھا۔جاپان تمامتر زراعتی ملک تھا،جس کے مصنوعات بہت تھوڑے اور اس کی خارجی تجارت بالکل محدود تھی۔اس کے پاس لوہا یا کوئی دوسری فلزات نہ تھیں۔کوئلہ بھی اس کے ہاں کچھ زیادہ نہ تھا۔برخلاف اس کے لوہا،کوئلہ اور دیگر ضروری اشیاء ہندوستان میں بکثرت اور غیر مختتم تھیں۔جاپان کی دولت ہندوستان کے مقابلہ میں (جو اسے برطانوی اقتدار سے قبل حاصل تھی) بہت معمولی تھی"

تو پھر جاپان کی ترقی اور کامیابی کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟ ڈاکٹر سنڈرلینڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ جاپان گورنمنٹ نے جاپانیوں کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے بالکل برعکس حکومت ہند نے ہندوستانیوں کے سلئے کیا ہے۔اس کو وہ بدفعات ذیل بیان کرتے ہیں :-

"(۱) سب سے پہلے جاپان گورنمنٹ نے اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس میں یہاں تک کوشش کی کہ تمام ملک میں کسی گھر میں کوئی شخص جاہل نہ رہنے پائے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے تعلیمی مطالبہ کا اس قدر انکار کیا کہ ایکسو ساٹھ [۱۶۰] برس کے بعد بھی ہندوستان کے لوگوں میں فی صدی نو آدمی جاہل اور بے پڑھے پائے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت جاپان نے ابتدا ہی سے ہر قسم کی صنعت و حرفت کو اپنے ملک میں رائج کر دیا اور ہر قسم کی اشیاء

اپنے ہاں بنانی شروع کر دیں حتیٰ کہ اس لحاظ سے اب وہ ایشیا کی ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی غیر ملکی حکومت نے اپنے تجارتی محصولات اور دوسرے طریقوں سے رفتہ ہندوستان کی مقامی پیداواروں اور ملکی مصنوعات کو انگلستانی مصنوعات کی بہبودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور اس طرح ہندوستان کو ایک زبردست صنعتی قوم سے برطانیہ عظمیٰ کی مصنوعات کے لئے خام پیداواریں مہیا کرنے والے ملک میں تبدیل کر دیا۔

(۳) جاپان کی حکومت خود اختیاری نے شروع ہی سے ہر ممکن طریقہ سے خارجی تجارت اور جہاز سازی کو اپنے ہاں داخل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فی الحال جاپان نہ صرف ایشیا میں بلکہ تمام دنیا میں بلحاظ تجارت اول درجہ رکھتا ہے۔

اس کے برخلاف ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ نے اپنے برطانی تاجروں اور جہاز ران کمپنیوں کی سرپرستی کر کے عملی طور پر ہندوستان کی تجارت اور اس کی صنعت جہاز سازی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی خارجی تجارت اب زیادہ تر برطانی ہی ہے۔ جو برطانیہ کے زیر اقتدار ہندوستان کی بجائے برطانیہ کے تمول میں اضافہ کر رہی ہے۔"

آخر میں ڈاکٹر سنڈرلینڈ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اپنی قومی حکومت کی باگ ہوتی جیسی کہ جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے تو ہندوستان اپنی ملکی پیداواروں سے (جو ہر حال میں جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں) اور اپنی غیر محدود فردکاری کی بہم رسانی کے ذریعہ جاپان سے کہیں سے زیادہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوتا۔

ہندوستان کی تعلیم کا دردناک انجام

مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون مسٹر آلڈس ہکسلے کے قلم سے اخبار نیشن میں شائع ہوا ہے اگرچہ اس میں کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت نے انکی حالت کو ایک ناگفتہ بہ "ٹریجڈی" بنا دیا ہے جس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:-

"کاشمیر میں تم ایک کلرک کو اپنے باورچی کی نصف تنخواہ پر ملازم رکھ سکتے ہو۔ کچھ کاشمیر ہی پر منحصر نہیں ہے

یہ ہندوستان بھر کی یہی حالت ہے۔ حال ہی میں ایک سرکس کا تماشا کرنے والی کمپنی لاہور میں آئی اور اس نے ایک دربان کے لئے پندرہ روپیہ کی تنخواہ کا اشتہار دیا۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ اس نوکری کے امیدواروں میں کوئی چالیس کے قریب گریجوٹیوں کی عرضیاں بھی تھیں۔"

یونیورسٹیاں ایسے گریجوٹیوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر رہی ہے جن کو کوئی کام نہیں ملتا۔ حکومت ان کی صرف ایک محدود تعداد کو ملازمتیں دے سکتی ہے، اور مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے لئے گورنمنٹ کی ملازمت کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایسے صنعتی تجارتی کاروبار کا ہندوستان میں خیر سے وجود ہی نہیں ہے جن کے لئے ہمارے کئی مغربی نوجوان اپنے تئیں وقف کر دیتے ہیں اور کوئی ایسا سرمایہ ناممکن الحصول ہے جس کے ذریعہ اس قسم کا صنعتی کاروبار بڑے پیمانہ پر جاری کیا جا سکے۔ پھر عام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں بطور خود اس قسم کا کام مختصر پیمانہ پر کرنے کی جرأت اور مادہ نہیں ہے۔ ان کا نصب العین کوئی ایسا محفوظ عہدہ کلرکی ہے۔ جو ذمہ داریوں سے بالکل پاک ہو اور آخر میں تھوڑی سی پنشن! طوطے کی طرح رٹ کر حاصل کی ہوئی تعلیم ان کو کسی مصرف کا نہیں رکھتی۔ اور بدقسمتی سے ایسی پنشن والی محفوظ کلرکیوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے غرضکہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی جماعت ہندوستان میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے جو ایک مستحکم گورنمنٹ کے لئے بڑی حد تک خطرناک ہے۔

موجودہ انگریزی مصنفین کی تصانیف کا معاوضہ

لندن کے مشہور روزنامہ گرافک میں انگریزی زبان کے موجودہ مصنفین کی بعض تصانیف کا معاوضہ بتایا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ انشاپردازوں اور مصنفوں کی یورپ میں کیسی کچھ قدر کی جاتی ہے۔ روزنامہ مذکور لکھتا ہے کہ :۔

"مس ایتھل ایم ڈیل کا خیال کرو کہ اس کو اپنی تصانیف کے معاوضہ میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی! کیا مسز اسکوتھ نے اپنی تزک (آپ بیتی) کے لئے تیرہ ہزار پونڈ، اور سٹر اے۔ ایم ہچنسن کو اس کے ایک ناول "[illegible]" کے عوض تیس ہزار پونڈ نہیں حاصل ہوئے؟ کچھ عرصہ ہوا ایک نشر کتب کمپنی نے مسٹر لائڈ جارج کو تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب کے لئے نو ہزار پونڈ پیش کئے۔ سر آرتھر کینن ڈائل نے بارہ افسانے

لکھ گئی ہیں اس نے شرلاک ہوم کو پھر زندہ کیا ہے، نو ہزار پونڈ وصول کئے۔ مسٹر چرچل کی علمی تصانیف کی آمدنی ایک بہت معقول رقم ہے اور یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ ان کو بعض خاص مضامین کے لئے ہر مضمون پر ۲۵۰ پونڈ کا صلہ دیا گیا۔"

کیا اس قسم کی فیاضانہ قدردانیوں کی امید ہندوستان میں بھی کبھی کی جاسکتی ہے؟ غریب مصنف کو مشکل سے اتنا موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی تصانیف کو چھپوا سکے تا بمعاوضہ چہ رسد! اس کے لئے اس غریب کو رؤسا اور امرا کی خوشامد اور والیان ریاست کے درباروں میں جبہ سائی کرنی پڑتی ہے تب کہیں جاکر بشرط "انتساب" صرف چھپوائی کے اخراجات ملجاتے ہیں۔

عربوں کا انکشاف امریکہ

کلمبس سے پہلے

یورپ کے بعض فضلا، عرصے سے اس بات کے مدعی ہیں کہ کلمبس سے پہلے مسلمان عربوں نے امریکہ کو دریافت کرلیا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب "معرکہ مذہب وسائنس" میں اس بات کا اعتراف کیا کہ کلمبس کو ابن رشد کی کتاب پڑھکر اس کی تصانیف کے لاطینی متراجم عرصہ تک یورپ کی درس گاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ انکشاف امریکہ کا خیال پیدا ہوا پھر بیروت کے ایک عیسائی نوفل آفندی نے اپنی کتاب "صناجۃ الطرب" میں بطلیموس کے جغرافیہ کے حوالے سے لکھا کہ اندلس کے ایک عرب قبیلہ نے اطلانتاک پار کا سفر کرکے چھٹی صدی میں دریافت کرلیا۔

حال میں اس کے متعلق ایک تازہ شہادت یورپ کے ایک محقق نے بہم پہونچائی ہے جو نہایت مستند اور ناقابل تردید ہے۔ چار سال کا عرصہ ہوا ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو تیز (Leo Wiener) نے "افریقہ و انکشاف امریکہ" کے نام سے ایک کتاب ۳ ضخیم جلدوں میں شایع کی ہے، اس کتاب میں مصنف نے امریکہ کے ہندیوں (Red Indians) کی زبان میں عربی الفاظ کے وجود کا پتہ چلایا ہے۔

مصنف مذکور ۲۶ زبانوں کا ماہر ہے اور چند سال ہوئے اس نے امریکہ کے ہندیوں کی زبان سیکھنا شروع کیا ہے تاکہ وہ اُن الفاظ کو دریافت کرسکے جن سے ان ہندیوں تک پہونچنے والی قوموں کا سراغ لگایا جاسکے چنانچہ اس زبان میں اُسے انگریزی، اسپینی، اور پرتگال الفاظ ملے اور ان سب سے قدیم تر عربی الفاظ تھے مصنف نے اپنی

کتاب کو شائع کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان عربی الفاظ کی تاریخ سنہ ۱۲۹۰ء تک پہونچتی ہے یعنے کولمبس کے امریکہ پہونچنے سے دو برس قبل۔

بعض محققین یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ازد اور مایا کی آبادیاں خالص عربی تھیں یہ دونوں عربی نو آبادیاں ہیں جو امریکہ میں سنہ ۱۱۵۰ء کے درمیان قائم ہوئی تھیں۔ عربوں کی آبادی افریقہ میں نویں صدی عیسوی میں اپنے اوج کمال پر پہونچی ہوئی تھیں جہاں سے وہ جنوب کی طرف بڑھتی ہوئی منڈنجو تک مغربی افریقہ اور وہاں سے مشوا کان تک پہونچ گئی جو خلیج میکسیکو ( ) کے کنارے پر واقع ہے یہی دونوں مقام ہیں جہاں امریکہ کی زبان میں عربی الفاظ کے آثار پائے جاتے ہیں یہ وہ ہی الفاظ ہیں جو قدرتی طور پر فاتح کی زبان سے نکل کر مفتوح کی زبان میں (مثل طبی اور سیاسی الفاظ کے) باقی رہ جاتے ہیں جب عربوں کا تعلق امریکہ سے یک لخت منقطع ہوگیا تو ازد اور مایا کی آبادیاں بھی برباد ہوگئیں کہ وہ عربوں کے تجارتی تعلقات پر مبنی تھیں۔

سائنس کی حدود

یورپ کا مشہور سائنس داں ڈاکٹر ورنن کیلوگ رسالہ "ورلہ آف ٹوڈے" میں لکھتا ہے کہ:۔

" سائنس نے میرے ضمیر کی شناخت سے متعلق مجھے کچھ بھی واقف نہیں کیا، اور مجھے نہیں بتایا کہ میں کس لئے گیت بناتا اور گاتا ہوں یا موسیقی کے خوشگوار ترانوں سے متاثر ہوتا ہوں ہوائے اس دلیل کے کہ میرے آباواجداد ایسا ہی کیا کرتے تھے چنانچہ میں نے بھی یہی باتیں ورثہ میں پائی ہیں۔ مگر میرے پیش رؤں کی نسبت بھی یہ معما ایسا ہی لاینحل رہ جاتا ہے۔

سائنس نے مجھے نہیں بتایا کہ میں اپنی چھوٹی بچی سے اس قدر شدت کے ساتھ کیوں محبت کرتا ہوں اور نہ یہ بتایا کہ میں شعر کس لئے کہتا ہوں (اگر میں کہہ سکوں) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے میرے اس سوال کا جس کو میں بار بار پیش کرکے جواب کے لئے اصرار کرتا رہا ہوں کوئی جواب نہیں دیا۔ کہ مجھ میں ایک فانی روح ہے یا نہیں؟"

کیا خدا نے اپنے برگزیدہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے نہیں کہہ دیا کہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (قرآن مجید)

تیرہ سو برس کے بعد سائنس کی زبان سے اس عاجزی و بیچارگی کا اظہار مغربی سائنس کے فدا کاروں کے لئے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں ہے!

ادبیات

ایک دوست کی شادی پر

مبارکباد کا پہلا خط

یہ ادبی مضمون ہمیں جناب محمد یوسف صاحب قیصر مدیر ظل السلطان بھوپال کی جانب سے موصول ہوا ہے جس کی پہلی شق مسئلہ ازدواج پر تحقیر آمیز مغربی خیالات ایک ہندوستانی خاتون کی ترجمہ ہے دوسری شق خود جناب قیصر صاحب کی رہین منت ہے۔

قیصر صاحب نے جس خوبی وعمدگی سے اصل خط کے ساتھ دوسرا خط چسپاں کیا ہے وہ نہایت کامیاب اور اس قابل ہے کہ اس کی ضرور داد دی جائے لہذا ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے قارئین "زبان" کے ذوق ادب سے بھی داد چاہتے ہیں۔

(اڈیٹر)

دوست!

اب تمھاری شادی ہو گئی ہے، جس وقت میں نے یہ الفاظ سنے میں ٹوکیو (جاپان) کے ایک خوبصورت ہوٹل میں بیٹھی ہوئی چاپانی رہی تھی اس طرح جیسے جی گھبرا جانے کے بعد روح جسم سے علحدہ کر لی جاتی ہے میں نے بھی چائے کی پیالی تشتری میں رکھدی۔

تمھیں یاد ہوگا، موسم بہار کی ایک لطیف شام کو دریائے نیل کے کنارے پر تم بحری کہانیاں پڑھ رہی تھیں اور میں تمھیں کسی ایک بات پر ستا رہی تھی اور تم سے کھیل رہی تھی اور ہم دونوں شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، ہاں خیال کرو، اگر تمھیں وہ شام ذرا بھی یاد ہو؟ -!!

جب مجھے اس کا خیال ہوا، اور یقین بھی ہو گیا، کہ اب تم نے اپنے جذبہ خودداری، مستقل مزاجی، اور ریونہ"

انکاری اشاروں، کو فنا کر کے خاک میں ملا کیے ازدواجی زندگی میں قدم رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ایک قسم کی نوکری قبول کر لی ہے، تو میرا لوہے کی مانند گرم دل، برف کی مانند سرد ہو کر پگھلنے لگا۔ تحلیل ہونے لگا

خیر جو کچھ تم نے کیا، اپنے ہی لئے کیا ہے وہ اچھا کیا ہو یا برا کیا ہو گو میں ...... جس کے متعلق تمہارا یہی یقین ہے کہ ایک سچی دوست ہوں صرف یہی کہوں گی کہ خدا تمھیں نوازے اور امن دے اور جیسا میں نے موسم بہار کی اس خوبصورت شام کو دریائے نیل کے کنارے کنارے، شادی کو (اپنے خاص نقطۂ نظر سے) ایک قسم کا جرم قرار دیا، خدا تمھیں صبر دے کہ جرم کی مرتکب بن کر تم "راہِ نجات" تلاش کرنے کی بیہودہ کوشش نہ کرو، اور نجات حاصل کرنے کی آرزو کو اس طرح بھول جاؤ، جیسے جانور عمر کی زیادتی سے اپنی حقیقی اولاد کو بھول جاتے ہیں۔

تم نے غلطی کی اور مبتلا ہو گئیں، جرم کیا اور مجرم بن گئیں، کوئی مضائقہ نہیں مگر اس کی کیا ضرورت تھی کہ تم مجھے بھی اپنے اس جرم سے آگاہ کرتیں؟ مجرم فطرتاً اپنے جرم کی پوشیدگی چاہتا ہے، مگر شاید یہ سچ ہو کہ شادی کے بعد انسان احمق بن جاتا ہے اور تم لوگوں سے پوشیدگی کا مادّہ اس طرح مفقود ہو جاتا ہے جیسے کسی پودے کے سوکھ جانے کے بعد زمین پر اس کا کوئی نشان موجود نہیں ہوتا!!

آخر تم نے اپنے جرم سے مجھے آگاہ کر ہی دیا! ہاں مجھے ...... جو پچھلے چند دنوں سے ٹوکیو میں مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی بے امن اور قدرے سراسیمہ کر دیا۔ میرا وہ تنفس، جو گذشتہ چند مہینوں سے مطمئن تھا ایک طویل آہِ سرد کی شکل میں مبدّل ہو گیا۔

اگر حقیقتاً شادی، امن، مسرت، محبت، قدردانی کا نام ہے تو میں پوچھتی ہوں۔ اس میں نجات اور امن کی کوئی شکل کیوں نظر نہیں آتی، دوست! تم برا نہ مانو تو میں ضرور کہوں گی، ایک بات ضرور پوچھوں گی کہ جب مریض کے دو طبیب ہوتے ہیں تو علاج کا نتیجہ موت ہوتا ہے پھر ازدواجی زندگی کے متعلق کیا رائے دیتی ہو جب دونوں کی زندگیاں ایک بنا دی جاتی ہیں تو نتیجہ کیا ہوتا ہے، وہی نا جو دو طبیب والے مریض کا ہوتا ہے، یہی، ناکامی، مایوسی، بے امنی، بے قدری، اور بے لطفی؟ آہ۔

زندگی میں سب سے زیادہ قابلِ غور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کیوں کر بسر کریں نہ یہ کہ محبت کیوں کریں۔ اس کا خیال نہ کرو کہ محبت کس سے کی جائے میرا خیال ہے کہ وہ شخص، جس نے نہ صرف اپنی غریب زندگی پر بلکہ تمہاری بیچاری حیات پر بھی ظلم توڑا اسے ذرا سوچے تو اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس نے حقیقتاً تم سے محبت کر کے شادی نہیں کی ہے، بلکہ اس نے تم سے محبت کر کے تمہاری تحقیر کی ہے اور تمھیں دنیا میں رسوا کر دیا جس کا نہ اب تمھیں احساس ہے

ورنہ تمھارے شخص کو، آئندہ تم نے ایک ایسے راستہ کو اپنے لئے پسند کیا ہے جس کی کوئی منزل مقصود نہیں اور تم
سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاؤگی!!— تم غریب —!!

جب میں اپنے شادی شدہ دوستوں کی زندگی کا خیال کرتی ہوں تو نہ صرف میرا جسم بلکہ میرا دل، میرے
واس، میری روح سب لرز جاتے ہیں اور میں ایک صوفے پر گر پڑتی ہوں، پھر مجھے اُس وقت تک کسی قسم کی خبر نہیں
وتی جب تک کہ میری خادمہ مجھے میری کی صبح ڈاک نہ لائے یا شام کے ملاقاتیوں کے متواتر کارڈ نہ دکھائے کہ وہ ملاقاتی
رسے میں میرا انتظار کر رہے ہیں!

دوست! دل چاہتا ہے کہ تم پر خوب خفا ہوں مگر خیال صرف اتنا ہے کہ تم زیادہ قابل رحم ہو اور میں اس ہستی کو
زیادہ چھیڑنا نہیں چاہتی جسے کشمکش حیات سے آئندہ فرصت ملنے کی کوئی شکل نظر نہ آئے۔

سچ کہنا اب تم کیسی ہو، زندگی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے، تم نے تو کبھی مجھ سے اس شخص کا ذکر ہی
نہیں کیا اور نہ تعارف کرایا جس نے تمھاری، ایک نامعلوم طور پر، ایک غیر احساس انداز میں تحقیر کی ہے

شادی ایک احمقانہ شجاعت ہے مردکی، اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے کہ جب وہ مرد کا مضحکہ اڑانا چاہتی
ہے تو اس سے شادی کر لیتی ہے مگر وہ ذرا غور کرے۔ اپنی آپ وہ کتنی تحقیر کرا لیتی ہے! کیوں کہ میرا پختہ یقین ہے کہ عورت
ل بدترین تحقیر اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی بی بی بن جاتی ہے۔

لو دوست خدا تمھارا نگہبان رہے، تمھارے امن کے لئے میں دعا کروں گی اور مجھے اس کا بھولے سے بھی
نتظار نہ ہوگا کہ تم نجات کا خوبصورت راستہ آئندہ ٹٹولتی نظر آؤگی، شرم —!

مس حجاب اسمٰعیل،
(دی یا مس (لین تھم)

دوسرا خط

مکرم دوست! آپ کا خط مجھے اسوقت موصول ہوا جبکہ میں پیرا کے ایک رنگارنگ ہوٹل میں اپنے احباب کی دلچسپ
گفتگو میں شریک تھا، میں نے خط پڑھا اور پھر پڑھا اور بار بار پڑھا جس میں آپ نے مجھے اپنی شادی کا مژدہ سنایا
ہے مجھے ایک تعجب انگیز مسرت ہوئی کہ میرے دوست نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا گو یہ احساس کسی قدر تاخیر سے
ہوا، اب آپ ایک مکمل انسان بن گئے، یعنی تکمیل انسانیت کے لئے عورت و مرد کی تخصیصوں کی باہمی امتزاج اور رفاقت
کی ضرورت ہے اور آپ نے اس ضرورت کو پورا کر لیا، اور اب آپ ناکامی مایوسی، بے امنی کے خارزار سے نکل کر امن

مسرت محبت قدردانی کے اس سرسبز گلزار میں پہونچ گئے جہاں آپ اپنی زندگی کے حقیقی لطف سے لذت اندوز ہوں گے، بلکہ لذت اندوز ہو رہے ہیں کیونکہ آپ کے خط کے ایک لفظ میں شادمانی کی روح ہے، اوس کی شاداب عبارت آپ کی شگفتگی طبیعت کی جاسوسی کر رہی ہے اب آپ بہیمیت اور بربریت کی اس تنگنائے سے جہاں مہیب اور خطرناک اسباب تھے نکل کر ایسے فردوس میں پہونچ گئے جو روحانی مسرتوں اور حقیقی شادمانیوں کا مرکز ہے۔ اب آپ نے اپنی زندگی کو حاصل کر لیا مجھے یہ پڑھکر مسرت ہوئی کہ آپ کی رفیق زندگی نے ،،انکار شادی،، کا جو معاہدہ اپنی ایک زندہ دل سہیلی سے دریائے نیل کے کنارے پر کیا تھا اور شرقیت کی بہترین روح کو اوس دریا میں غرق کر دیا تھا۔ آج وہ معاہدہ ایک "پرزہ کاغذ" سے زیادہ حقیر ہو گیا۔ مغربی تہذیب نے جو ضاعیاں اون کے صاف و شفاف قلب پر کی تھیں وہ مشرقی روحانیت نے نقشِ باطل ثابت کر دیں اور حقیقت میں آپ سے زیادہ مبارکباد اور اگر سچ پوچھیے ہو تو قابل صد ہزار تحسین و تبریک آپ کی محترم خاتون ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ثبوت اور اپنے وطن اور اپنے مذہب کی عزت کو قائم رکھا اور گو اُن کی توبہ شکنی سے اُن کی ایک فاضل سہیلی کو سخت افسوس ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی توبہ شکنی میں ابدی راحت کا راز پنہاں ہے ؎

ٹوٹی ہے توبہ آج کسی مے پرست کی بجتی ہے گردِ فتح کے نوبت شکست کی

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب کے دست کرم نے آج مشرقی خواتین کو بھی اوس بزم ناز میں لا بٹھایا جہاں مادیت کی شمعیں ہر طرف روشن ہیں اور جہاں زندگی کا ہر لمحہ مصنوعی طمع کاریوں میں گذرتا ہے مغربی عورت اپنے حدودِ نسائیت سے گذر کر اوس ہیبت ناک غار میں گرنے کے لئے تیار ہو گئی ہے جو اسی غیر مآل اندیشیوں کی ظلمات میں پوشیدہ ہے، اوس نے اپنے جنس کی سخت توہین اور تذلیل کی ہے اوس نے اپنے نوع کو تبدیل کرنے کی ناکامیاب کوشش کی، اور دیکھا جاتا ہے کہ اُن اثرات نے مشرق کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی جدوجہد شروع کی ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کی اہلیہ مکرمہ جو مغربی لٹریچر سے بخوبی واقف ہیں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اس عزت کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ اور اگر یہی خیال بکثرت اشاعت پذیر ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ یورپ کی مجالس تہذیب میں ایک دن صفِ ماتم بچھی نظر آئے گی۔

عورت و مرد اپنے باہمی تعلقات کے لئے فطرتاً مجبور ہیں، اور یہی مجبوری ہے جس نے قبل اس کے کہ تمدن اور تہذیب کی بنیاد دنیا میں قایم ہو، اُن تعلقات کو قائم کر دیا۔ ایسے حصۂ زمین کو فی الحال چھوڑ دیجیے جہاں تمدن اور تہذیب کے سورج کی کمزور سی کمزور شعاع بھی پرتوفگن ہے۔ اُن طبقات حارہ اور باردہ پر نظر دوڑائیے۔ جواب تک

ری آپ کی تہذیب سے محروم ہیں اور جہاں ہماری آپ کی خود غرضی، دغابازی، جعل سازی، کذب، بطلان کا
پتہ تک نہیں ہے جن کی زندگی ابھی معصومانہ فضا میں ہے جن کی آبادی سادگی کی اصلی حالت پر ہے، وہاں بھی
بت و مرد ایک دوسرے کے شریک اور باہمی رفیق زندگی ہیں۔ شادی یا ایک عورت کے لئے ایک مرد اور ایک
کے لئے ایک عورت کا ہونا وہاں بھی پایا جاتا ہے اکثر جانوروں تک میں یہ احساس موجود ہے کہ وہ اپنے لئے ایک
ے رفیق زندگی تلاش کریں اور اوس کے ساتھ اپنی عمر گزار دیں، بہر حال عورت کے باہمی تعلقات ضرور ہوں گے
رجب تک اس کرۂ ارض پر انسان کا آخری قدم بھی ہے اُن تعلقات کا رہنا یقینی ہے لیکن اکثر نوجوان دل و دماغ
ں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ شادی مرد کی احمقانہ شجاعت اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے، اوس کی بنیاد حماقت
ر خود غرضی پر ہے لیکن اگر آج اس حماقت کو بے نقاب کر دیا جائے اور عورت کی اس پوشیدہ چال کو پہچان جائے تو
پ دیکھیں گے کہ تمدن انسانی میں ایک ایسا زلزلہ پیدا ہو جائے گا جو ایک دن اس کی عمارت کو ڈھا دے گا۔
۔ وہ زمانہ کس قدر مضحکہ انگیز نہ ہوگا جب کہ عورتوں کی تمام جنس مردوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک دنیا الگ[۱] قائم
رلے گی، جہاں اون کی "پوشیدہ چال" کا نام و نشان نہ ہوگا۔ اور مردوں کی کُل نوع عورتوں کی شرکت سے الگ ہو کر
اپنی زندگی بسر کریں گے جہاں اون کی "احمقانہ شجاعت" بالکل بے اثر رہے گی، اوس وقت نظام کائنات اور انسانی
آبادی اور اون کی تعداد پر موت کی نیند مسلط ہو جائے گی اور یہ دُنیا کے فنا ہونے کا ایک آخری نظارہ ہوگا۔

لیکن آپ ہنسیں گے کہ یہ خیالات میرے ہی دماغ کے افکار خصوص ہیں جو عورتیں کہ شادی کی مخالف ہیں
اور جو مرد کہ اس سے انکار کرتے ہیں اُن کو ان حالات سے کوئی تعلق نہیں نہ اُن کا مدعا یہ ہے کہ عورت و مرد حالت تجرد میں
زندگی گزاریں بلکہ اون کا مقصد یہ ہے کہ قدرت کی اُن حسین اور نازک بدن تیلیوں کو صرف ایک ہی پھول پر قناعت
نہ کرنا چاہیے بلکہ دنیا کی فردوس میں ہر پھول اون کے واسطے اپنی آغوش تمنا کو کھلا رکھے اور یہی حالت مردوں
کی ہو۔

---

[۱] امریکہ میں عورتوں نے اپنی ایک نوآبادی الگ قائم کی ہے جہاں مرد کا وجود تو در کنار اوس کا نام تک نہیں لیا جاتا تھا۔
کوئی نر جانور نہیں رکھا جاتا تھا تمام انتظام حکومت اور متعلقات حکومت عورتوں ہی کے ہاتھ میں تھے مگر دو ایک برس کے بعد یہ
احساس پیدا ہوا کہ مرد کی ضرورت فطرتاً ہے اور بجز اوس کے عدم نیست لزوم کے انسانی فردوس دوزخ سے بدتر ہے، مجبور ہو کر
چند مردوں کو وہاں آنے کی تکلیف دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ سوائے عورت کے اور انتظام حکومت اور کاروبار ریاست
میں ہاتھ نہ لگائیں اور نہ دخل دیں ۱۲۔

خط بہت طویل ہو گیا اور آپ میری فضول تحریر کا غالباً مضحکہ اڑائیں گے لیکن اس سے میری غرض ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی اہلیہ معززمہ کی خدمت میں میرے خط کا یہ حصہ یا اوس کا اقتباس پیش کر دیں میں اون کی عزت کرتا ہوں آپ کے ساتھ شادی کرنی نہیں بلکہ اس معاہدہ کے شکست کی اون کو خلوص قلب سے مبارک باد دیتا ہوں میں اون پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ ابدی راحت ہے اپنے معاہدہ کی شکست سے نظام کائنات کی شکست کو بچا لیا۔ اون کو معلوم ہو گا کہ اون کی زندگی اب شروع ہوئی ہے، مسرت کے اثرات اب اون کے دل و دماغ کو شاداب اور شگفتہ رکھیں گے۔ وہ دیکھیں گی کہ محبت اپنے حقیقی معنون میں اون کا کیسا شاندار خیر مقدم کر رہی ہے عشق کی جلوہ آرائیاں اون کے لئے اب کس قدر پر کیف خمار آگین ہوں گی۔ اور آپ بھی معلوم کرینگے کہ دنیا میں امداد باہمی کا پہلا اصول اور اتحاد باہمی کا پہلا رکن یہی ہے، آپ نے اپنی اور اپنی بی بی کی دنیا کو روشن کر دیا اور اپنے دل و دماغ پر قابو پا لیا جو اب آپ کے لئے محبت اور خلوص کے خزانے پیش کرے گا اور آپ کی زندگی کو ہمیشہ تازہ اور سرسبز رکھے گا۔

اس خط کے ساتھ چہ ہدایات اپیش کئے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ کی نظروں میں کوئی وقیع جگہ حاصل کر سکیں لیکن جب میرا خلوص قلب اور میری نیازمندی اس میں شامل کر دی جائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آپ ان کو قبول فرما کر مجھے ممنون اور سرفراز فرمائیں گے۔

قیصر ازبھوپال

رباعیات امجد

(جناب سید احمد حسین صاحب امجد)

(بیکسی)

غم دیدہ پہ کون رحم فرماتا ہے،
اس تن کے سیہ خانے میں کون آتا ہے
لے، دے کے بس اک دم ہے ہمدم اپنا
وہ بھی کبھی آتا ہے، کبھی جاتا ہے

(اعتبار حال)

آثار سے ظاہر ہے کہ میں بندہ ہوں
سر تا بقدم حدوث کا پتلا ہوں،
کیا تھا کیا ہونگا، اس سے کیا حاصل
مجھکو تو یہ دیکھنا ہے میں اب کیا ہوں

امجد

تسلیم و رضا

(سر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ)

طالب: شکوہ نہ کیا میں نے اے یار کبھی تجھ سے — لے لیتا ہوں ملتا ہے جو کچھ بخوشی تجھ سے
میں حرص سے مستغنی بندہ ہوں قناعت کا — دست سے نہیں واقف دامن مری حاجت کا

مطلوب: اے سائل نرگس تو اخلاق کا پتلا ہے — معلوم ہے سب مجھ کو جو کچھ ترا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: مل جائے اگر تجھ سے اک مجھ کو گل خنداں — آراستہ ہو جائے ایوانِ دل ویراں

مطلوب: بخشش کا اگر میری تو اتنا ہے دلدادہ — کیا خارِ مغیلاں بھی لینے کو ہے آمادہ؟

طالب: ہاں ان کو بھی میں اپنے سینہ میں جگہ دونگا — پُر لطف خلش اُن کی میں شوق سے سہ لونگا

مطلوب: اے سائل نرگس تو۔ اخلاق کا پتلا ہے — معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ تیرا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: صہبائے مسرت سے پیمانۂ دل بھر دے — صرف اک نظر میرے چہرے کی طرف کر دے
صدقہ میں اِن آنکھوں کے میں داد وفا پاؤں — وہ موت مروں جس میں جینے کا مزا پاؤں

مطلوب: پُر لطف نگاہوں سے دنیا ہو اگر خالی — ہوں قہر بھری آنکھیں گر مائل پامالی

اُن کو بھی بصد ارماں لبیک کہوں گا میں
تیروں کی طرح دل میں چبھنے انہیں دو نگاہیں۔

معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ تیرا منشا ہے
خود منھ سے نہیں کہتا کس شے کی تمنا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو
دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

جناب منشی للتیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی

انقلاب

عبرت آموز ہے گل کاری ایواں جہاں
جس کا ہر نقش تغیر کا پتہ دیتا ہے
حیرت افزا ہے عجب شاہدِ فطرت کا طلسم
کہ جو انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے
خاک صحرا سے نکلتا ہے ہوا کا جھوں کا
چرخ پہ ابر کا اک فرش بچھا دیتا ہے
جلوۂ برق وہ رکھتا ہے نہاں سینہ میں
موتی پیشانی عالم پہ گرا دیتا ہے
صحن بستاں میں نسیم سحری کا انداز
غنچہ کو خواب پریشاں سے جگا دیتا ہے
دیدۂ مہر جہاں تاب ۔ مژہ سے اپنی
پردۂ شب رُخ گیتی سے اُٹھا دیتا ہے
دورِ باطل میں جو اُٹھتا ہے کوئی شیر خدا
نعرۂ حق سے وہ دُنیا کو ہلا دیتا ہے
آہ جانسوز سے ظلمت کدۂ عالم میں
جلوۂ برق جہانتاب دکھا دیتا ہے
زلف دوراں میں وہ مشاطۂ فطرت بن کر
اک لڑی گوہر مقصد کی بڑھا دیتا ہے
اس کا ہر تار نفس بادِ تمنا بنکر
دل شگوفہ کی طرح سب کے کھلا دیتا ہے
صفحۂ دل پہ جو ہوں جور پرستی کے نقوش
صورت حرف غلط ان کو مٹا دیتا ہے

درد ملت کا جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
رُخ گیتی پہ عجب غازہ چڑھا دیتا ہے

محمود اسرائیلی

جذباتِ سلیم

(از جناب وحید الدین صاحب سلیمؔ پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

تجھ کو نہ دیکھ سکنے پہ قربان ہوں بنشین
تجھ کو نہ جان سکنے پہ صدقے ہوں دانشین

تیری نگاہِ شوخ کی تاثیر کیا کہوں
جسموں میں زلزلے ہیں تو روحوں میں لرزشین

چھوٹے زرد دیدۂ و دل عشق میں ہیں خون
یاد آئیں گی یہ حسن کی رنگیں نوازشین

پامال کرکے دی مجھے رحمت سے مخلصی
ہر نقشِ پا پہ تیرے ہوں رحمت کی بارشین

تیرے جمال کا ہے نگاہوں پہ یہ اثر
تاروں پہ ناچتی ہیں ستاروں کی تابشین

کیا دُور ہے کہ زیر و زبر کرکے دہر کو
محشر بپا کریں تری پلکوں کی جنبشین

عُذرِ خطا کروں بھی تو کیوں کر خطا شعار
سانسوں میں لرزشین ہیں زبانوں میں لغزشین

پھولوں کو رنگ و بو دیا گوہر کو آب و تاب .
قدرت کی ہر محل پہ نرالی ہیں بخششین

دو چار گام پر کہیں تھک کے رہ نہ جائیں
تیری طلب میں دوڑتی پھرتی ہیں کوششیں

ہر حرف ایک شعلہ ہے ہر لفظ اک شرر
دل کے ورق پہ غم نے یہ کی ہیں نگارشیں

میدانِ حشر کیا کوئی دنگل ہے اے خدا
کرنی پڑیں جو مجھکو عبادت کی ورزشیں!

آنکھ سے ہٹ تو لے خس و خاشاکِ عقل و ہوش
پنہاں ہیں میرے دل میں محبت کی سوزشیں

کشتیِ صبر اُلٹ گئی اے موجِ اضطراب
کب تک رہیں گی یہ تیرے طوفاں کی شورشیں!

محور نہ عِلم کا ہو اگر ذاتِ ذوالجلال
بے کار ہیں عقل کے پہیوں کی گردشیں،

لپٹے ہوئے یہ سب تھے غلافِ سحاب میں
کھولی ہیں ارتقا نے ستاروں کی بندشین

کافی ہے ان کو برقِ تجلی کی اک لپک
پرواز پر ہیں اپنی ملائک کو نازشین،

لالہ کا کھیت ہے میرے دیوان کا ہر ورق
اللہ رے میرے خونِ جگر کی تراوشین

دل کے صنم کدہ میں دکھایا جو تو نے رُخ
پندار کے بتوں مٹا دیں پرستشین

پھونکا ہے تیرے شوق نے کیا نغمۂ فریب
دل کی فضا میں ناچتی پھرتی ہیں خواہشین

مت کھا فریب باغِ جہاں کی بہار کا | ہیں یہ سرابِ رنگ کی ساری نمائشیں
آہوئے دل کو میرے نہ تو کر سکا شکار | اے شیرِ نفس دیکھ لیں اب تیری غرشیں
آنکھیں حصارِ دل کے ہیں دو در کھلے ہوئے | کیوں کر ہوں بند فوج تمنا کی یورشیں

میری نظر میں ہیچ ہے عالم کا التفات
بل بے تری نگاہِ تغافل کی پرسشیں

کویل سے

طائر زیبا ہے تو بے شک اے میری دلربا | خیر مقدم دل سے اے کویل ترا کرتا ہوں میں
آم کی ڈالی پہ عجب ہوتی ہے تو نغمہ سرا | کان ہر دم خوشنوائی پر تری دھرتا ہوں میں

نیلگوں نہرِ رواں کے اُس کنارے جس گھڑی | میں فقط ہوتا ہوں تنہا محوِ سیرِ بوستاں
چھائی ہوتی ہے فضا میں ایک پُر غم خامشی | فرش سبزہ پر میں جا کر لیٹ جاتا ہوں وہاں

توڑتی ہیں قفلِ خاموشی کو آوازیں تری | قالبِ بیجاں میں گویا میرے پڑ جاتی ہے جاں
آہ اے فرقت زدہ تو درد و غم سے ہے بھری | ایسی تنہائی میں ہے تو ہمنوا اے عاشقاں

تری کو کو نالہ ہائے عاشقِ دلگیر ہیں | تیرے نغموں سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے کھنچا
آہ یہ نالے ترے ہر بار پُر تاثیر ہیں | کیوں ہے اس آواز میں سوز و گداز اتنا بھلا
گونجتے ہیں تیری آوازوں سے دشت و کوہسار | چھوڑ جاتی ہے ہوا میں تُو اشاراتِ غنا
جھنڈ میں آموں کے جب آ بیٹھتی ہے بار بار | کیا ہی وہ دلچسپ ہوتا ہے سماں اے دلربا
ہاں یوں ہی کو کو کئے جا طائرِ شیوا بیاں | مرحبا اے مرغِ خوش الحانِ ایامِ بہار
کیوں نہ اختر مدح پیرا ہو ترا جانِ جہاں | لے کے آئی ہے تو اپنے ساتھ پیغامِ بہار

(اختر جوناگڑھی)

اخبارِ علمیہ

عربی شعر کی قدامت

بلادِ یمن کے پُرانے کھنڈروں میں سے کسی ایک کھنڈر میں ایک عربی قصیدہ دستیاب ہوا ہے جو عادی خط میں منقوش ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کندہ ہوا ہے۔

وحدتِ لسانی وطن سامی میں

سنہ ۱۸۸۹ء میں تل العمارنہ میں مابین منیا و اسیوط جو اثوری کتبات پائے گئے ہیں ان کو پڑھ کر پروفیسر سالیس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مصر سے بنی اسرائیل کے خروج سے پہلے مصر، شام اور عراق کے علماء اور اہلِ سیاست کی زبان اثوری تھی۔ گویا ازمنۂ قدیمہ میں تمام سامیوں کی ایک ہی زبان تھی۔

ایک عظیم الشان فلکی دوربین

اجرامِ سماوی کے معاینہ کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ عظیم الشان اور قوی دوربین وہ ہے جو بمقام وکٹوریہ (برٹش کولمبیا) قائم کیا گیا ہے۔ اس کا وزن ۵۵ ٹن ہے۔ آج تک انسانی آنکھوں سے تقریباً ۵۰۰۰ ستارے دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر اس جدید دوربین کے ذریعہ تیس کروڑ ستارے معلوم ہو چکے ہیں۔ اس دوربین کی نلکی اتنی بڑی ہے کہ اس میں سے ایک موٹر با سانی گزر سکتا ہے۔ اس قدر عظیم الشان ہونے کے باوجود اس کے بالائی حصہ پر صرف ۵ پونڈ کا وزن اس کو متحرک کر دیتا ہے۔

اس کا شیشہ دُنیا کے تمام دوربینوں سے بڑا ہے جس کا قُطر چھ فٹ ہے۔ اور اس کے کنارے بارہ انچ موٹے ہیں۔ اس شیشہ کو صاف و شفاف بنانے اور اس کے مرکز میں ساڑھے دس انچ کا سوراخ کرنے میں کئی ماہ صرف ہوئے ہیں۔ اس شیشہ کا وزن ۲ ٹن ہے۔

امریکہ میں موٹروں کی لاگت

ریاست ہائے متحدہ کے محکمۂ صنعت وحرفت کے موٹروں کی صنعت سے متعلق جو اعداد فراہم کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں دوکرور موٹروں کی تیاری پر ڈو ارب اسی کرور پونڈ سالانہ لاگت آتی ہے۔
امریکہ والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ روپیہ بیجا نہیں صرف ہوتا کیونکہ ملک کا بڑھا ہوا تجارتی کاروبار، دولت وثروت ۔۔اور اسباب کی خریداری انہیں موٹروں کی بدولت ہے کہ انہی کے ذریعہ اسباب کے فوری حمل ونقل میں بڑی سہولت ہے۔

دنیا کا قدیم ترین درختِ گلاب

ہلڈیشیم (جرمنی) میں ایک درخت ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین گلاب کا پیڑ ہے کلیسائے پرلیش کے تمام مشرقی رخ پر چھایا ہوا ہے۔ کلیسائے مذکور کے دفتر میں ایک ہزار برس پہلے سے اسکی ۔و نمائی اور حفاظت کے طریقوں سے متعلق حوالے پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کی جڑیں کلیسائے مذکور ۔نیچے کے مقبرہ تک نظر آتی ہیں۔

طاعون میں حفظ ماتقدم

ازمنۂ قدیمہ میں لہسن کو جو غالباً مشرق سے ممالک مغربیہ میں پہونچا ہے، کئی امراض میں بطور علاج استعمال ۔جاتا تھا۔ جالینوس اس کو دیہات والوں کا علاج کہتا ہے۔ حکیم براکلوس (مصنف اسباغزایا) طاعون سے ۔ظ رہنے کے لئے اس کو بہترین علاج بتایا ہے۔ ایک اور نامور طبیب لہسن کو ناشتہ میں استعمال کرنے کی ہدایت ۔ت والوں کو کرتا ہے کہ اگر وہ لہسن کی چند ڈلیاں روٹی اور مسکہ کے ساتھ استعمال کریں تو وہ تمام کام کرنیکے قابل ۔یں گے جن کے لئے قدرت نے ان کو وضع کیا ہے۔
کاٹھیاواڑ کے اکثر شہروں اور دیہات میں ہر سال موسم سرما میں لہسن کو مختلف غذاؤں کے ساتھ کھانے کا ۔رواج ہے۔

دریائی گھونگھوں سے ریشم

برلن (جرمنی) کے دو مشہور ماہران سائنس ڈاکٹر پی او - ہرزوگ اور ڈاکٹر جی ، کے نائنک کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے سبز و سُرخ بِڈّوں، زنبوروں اور دریائی گھونگھوں کے سروں اور بچوں سے مصنوعی ریشم تیار کیا ہے۔
ان حشرات الارض میں ایک طرح کا لیسدار مادہ ہوتا ہے جس کو "جترن" ( ) کہتے ہیں اس کو باریک سوراخوں والے آلات میں سے نکال کر اس کی ڈوریاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ ڈوری نہایت باریک اور اس کی بناوٹ اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے کپڑا بخوبی بنا جا سکتا ہے۔

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	طلب منفعت	جَلبِ منفعت	۱۱	۱۹	معزول	معتزلی
۳	۸	سنہ ۱۷ھ	سنہ ۸۱۷ھ	۱۳	۲	علم الجمر	علم الجبر
۳	۹	سنہ ۷۸۷ھ	سنہ ۸۸۷ھ	۱۳	نوٹ	حربن یقظان	حی بن یقظان
۸	۱۱و۱۲	زائد ہیں تو ہیں نہ ہونی چاہئیں		۲۴	۲	ہر وقت	ہردہ
۹	۳	قرون اول	قرن اول	۲۶	۱۰	اس قدم کا نقش قدم	اس قسم کا نقش قدم
۱۰	۱	کری	کسریٰ	۲۸	۸	مگر ہیں	مگر اس میں
۱۰	۱۰	اکابرہ	اکاسرہ	۳	۱۴	قومیں ہیں جہانیاں جہاں گشت کی بجائے خلیفہ جہانیاں جہاں گشت	
۱۰	۱۶	عیسیٰ	عیسائیوں				
۱۱	۱۶	موسیو روزی	موسیو دوزی	۳۸	۱۰	بجائے سٹیج پر کے اسٹیج پہ	

یا قادر

غزلیات

(جناب محمد شفیع صاحب شفیع اکبر آبادی)

آج برہم قلب کی آواز ہے — کیا یہ آوازِ شکستِ ساز ہے

بے سکون وہ محوِ خوابِ ناز ہے — میرا نالہ دور کی آواز ہے

مطربِ نالحق تری آواز ہے — تو سراپا اک نوائے ساز ہے

مائلِ پرواز پہلے تھا خیال — اب قفس خود مائلِ پرواز ہے

قابلِ عزت سہی دیر و حرم — تیری بزمِ ناز بزمِ ناز ہے

یوں سمجھئے وحدت و کثرت کا راز — ہیں صدائیں مختلف اِک ساز ہے

کر نہ ظاہر میرا رازِ عاشقی — تو بھی تو آخر کسی کا راز ہے

دل کی دھڑکن سے جب آتی ہے صدا — میں سمجھتا ہوں تری آواز ہے

اک ادا ہے یہ تغافل بھی ترا — بے نیازی بھی تری اک ناز ہے

سحر ہیں پیکر میں دو آنکھیں تری — اور باقی ہے جو کچھ، اعجاز ہے

تو نہیں، اک راز ہے تخلیق کا — دل نہیں، پردہ سرائے راز ہے

میرے سجدوں کا نہیں ملتا مزاج — عرش ہے یا آستانِ ناز ہے

آہ سناٹا ہے پچھلی رات کا — یا کسی مایوس کی آواز ہے

کیا حقیقت منکشف ہو راز کی، — اب حقیقت خود اسیرِ راز ہے

میرے دل پہ داغ ہے حوالے شفیع
تازہ تصنیفِ نگاہِ ناز ہے

(عبدالرحمٰن خوشتر منگلوری ایڈیٹر رسالہ ندا)

کہا میں نے تو پھر اس کا مزا کیا — تمھیں کہدو ہے مدعا کیا
کہیں کیا جب وہ ہم پر مہربان تھا — اُٹھائے زندگی کے لطف کیا کیا
ستاؤ مجھ کو جی بھر کر ستاؤ — نہ نکلے حوصلہ وہ حوصلہ کیا
تمھارا اک نظر بس دیکھ لینا — تمنا دل کی ہے اس کے سوا کیا
کہانی خواب کی تھی زندگانی — کہیں کیا آہ دیکھا کیا سنا کیا
ہے کیا کہنا نظر جس پر ہو تیری — تو پوچھے جس کو اُس کو پوچھنا کیا
سناتے ہی رہے ہم قصۂ غم — وہ سنتے ہی رہے ہر بار کیا کیا؟
تمھیں ہم پیار سے گر دیکھتے ہیں — برائی اس میں ہے آخر بھلا کیا
میری غرض تمنا سن کے اُس نے — کہا جھنجلا کے پھر کہئے کہا کیا؟
کیا گر ہم نے وصف زلف پیچاں — بگاڑا بندہ پرور آپ کا کیا؟
کہیں کیا عہد برنائی کی باتیں — نہیں معلوم وہ تھا خواب یا کیا
مجھے اُلفت ہے اُن سے اُن کو نفرت — نہیں کھلتا ہے آخر ماجرا کیا
کوئی اُس بت پہ دے کر جان دیکھے — فنا کیا چیز ہے اور ہے بقا کیا
شب تنہائی تو کھیل کھیلئے کچھ — ہٹاؤ پردہ ہے شرم و حیا کیا
ہے عالم سوز کیوں ہر سمت منظر — فغاں کرتا ہے کوئی دل جلا کیا
تمنا ہے۔ نہ پوری ہو تمنا، — ہو پورا مدعا وہ مدعا کیا

جگر میں ٹیس کیوں اُٹھتی ہے خوشتر
کوئی بھولا ہوا یاد آ گیا کیا

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۴

زبان خلق

مشفقم جناب عبدالرحمن صاحب۔ السلام علیکم
آپ کا رسالہ زبان اور لفافہ ملے میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا مجھے افسوس ہے کہ میں
آپ کے رسالہ زبان کی علمی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ میں یکم ستمبر کو ولایت جا رہا ہوں، بہرحال آپ کے رسالہ کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کی تیاری میں کافی محنت سے کام لیا ہے اور امید ہے کہ ذرا سی
کوشش سے رسالہ ہندوستان کے اچھے ادبی رسالوں میں شمار ہونے لگے گا۔
موجودہ نمونہ یہ توقع دلاتا ہے کہ بہت جلد آپ نہایت اعلیٰ درجہ کا رسالہ پبلک کے سامنے پیش کرینگے

راقم خاکسار
محمد ناظم (پروفیسر ہسٹری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از بمبئی

مکرم بندہ زاد لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
ماشاء اللہ بارک اللہ، بہت خوب رسالہ نکالا مگر افسوس کاٹھیاواڑ بہت نااہل ہے اگر حضرت شیخ صاحب
(نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بالقابہ) یا ولیعہد صاحب (بہادر) کی امداد شامل حال رہی تو انشاء اللہ
رسالہ چلے گا محض خریداروں کے بھروسے پر یہ ضروری کام نہیں چل سکتا۔
عنوان کا بیت یوں چاہیئے

لقد وجدت مکان القول ذا سعۃ　　فان وجدت لسانا قائلا فقل

اور یہ کہ یہ بیت متنبی کا ہے نہ کہ اعشیٰ کا۔
صفحہ ادارت پڑھکر بہت خجل ہوا میں ہرگز اتنا کام کا نہ تھا جتنا کہ آپنے جذبہ ہموطنی سے متاثر ہوکر ظاہر کیا ہے،
بہرکیف آپکے حسن ظن کا مرہون احسان ہوں اور آپ کو اپنے بلند اور نیک ارادوں میں کامیابی بخشنے میں بہت خیر مطمئن
ہوں انشاء اللہ اکتوبر کے آخر تک شاید کوئی قلمی خدمت کرسکوں امید کہ آپ میرے ہجوم اشغال پر نظر کرکے معذور
تصور فرمائیں گے۔　　(مولینا) میمن **عبدالعزیز** (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از راجکوٹ

نکات

(از ضیاء الملک ملا رموزی جرنلسٹ ذفاضل الہیات)

کہتے ہیں کہ آجکل جو شخص۔ پائنیر۔ انگلش مین، اور بمبئی ٹائمز۔ پڑھ سکے، دوستوں کو بجائے اُردو زبان کے انگریزی میں "مائی ڈیر" لکھ سکے، اور اُردو زبان میں آدھی سے زیادہ انگریزی ملاکر گفتگو کر سکے۔ وہ "تعلیم یافتہ" باقی تمام علوم اور زبانیں جاننے والے۔ ابو جہل

اب سوال یہ ہے کہ اچھا اگر "تعلیم یافتہ" سے مراد صرف انگریزی دانی ہے تو ذرا ان انگریزی خوانوں اور دانوں کی عقل و فراست کا اندازہ کر لیجئے پتہ چل جائیگا کہ یہ ان کی "تعلیم یافتگی" کہاں تک "تعلیم یافتہ" بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے؟

مان لیجئے کہ عقل و فراست آج کل کے۔ اسکولوں۔ کالجوں۔ اور یونیورسٹیوں سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ تاثیر تو کچھ، دیوبندی وضع کے حجروں۔ مکتبوں۔ مدرسوں اور مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اور ہل ہل کر پڑھنے۔ فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس فقرے سے پیشانی پر بل ڈال کر نتھنے تو پھلائیے نہیں بلکہ سیدھی طرح سن لیجئے کہ اگر عقل و تعلیم۔ کا مقصد یہی ہے کہ آپ اپنی تمام قومی و مادری خصوصیات کو ترک کرکے دوسری قوموں کی خصوصیات کو اختیار کرلیں، اور اپنی آبائی تہذیب و طرز معاشرت کی ہنسی اُڑائیں تو یہ آپ کے "تعلیم یافتہ" ہونے کا کوئی قابل تعریف ڈپلوما نہیں۔ بلکہ آپ کے "نرے کندۂ نا........ ہونے کی عدالتی سند ہے،

ہم نے تو آپ کو اسکولوں۔ کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں اس لئے بھیجا تھا کہ آپ کے دماغ علوم جدیدہ کی عالم آرا روشنی سے منور ہوں گے، اور اس روشنی کے صدقہ میں آپ "اصلاح و تخریب" کے فرق کو محسوس فرما کر ہم "دقیانوسی کسانوں" کی اصلاح فرمائیں گے، ہماری زبان کو ترقی دیں گے۔ ہمارے لباس سے محبت کرینگے، ہماری رسم و رواج کو عروج دیں گے۔ ہمارے مذہب کی خدمت و حفاظت کریں گے، کیونکہ یہی اور صرف یہی وہ چار خصوصیتیں اور علامتیں ہیں قوموں کی جن کے بقا و عروج سے قوم۔ قوم کہلاتی ہے، لیکن ہمنے تو یہ دیکھا

کہ جب آپ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے "تعلیم یافتہ" ہو کر نکلے تو ہمارے وہ "ننھے میاں" اور ننھے میاں" ہی نہ رہے جو کالج جاتے وقت تھے، بلکہ جب آئے تو خاص "جنٹلمین" کے لاٹ پادری کا ہو خول پہنے آئے جس کے اندر نہ آپ کی۔ قومی زبان نظر آئی نہ آپ کا لباس، نہ آپ کا رسم و رواج دیکھا نہ مذہب کی توقیر و پابندی۔ پھر تعلیم یافتہ ہو کر اپنی قومی و مادری زبان۔ لباس۔ رسم و رواج کو ترک کر دینے والا بھی۔ تعلیم یافتہ۔ کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ یا "انگریزی یافتہ"؟

اسکولوں۔ کالجوں۔ اور۔ یونیورسٹیوں۔ سے ہر سال نونہالانِ قوم کی جو کثیر تعداد "فارغ التحصیل" یا "تعلیم یافتہ" ہو کر نکلتی ہے اُس میں کتنے ہوتے ہیں جو "بین الاقوامی مسائل" کے سلجھاؤ اور عقدہ کشا ہوتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو ملازمانی جہنم میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور انسانیت کے جملہ فرائض کو بھول جاتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو غریب اور بے کس مسلمانوں کی اخلاقی۔ اجتماعی، دینی۔ اور ذہنی۔ اصلاح و ترقی پر اپنے۔ دماغ۔ وقت۔ اور۔ دولت کو صرف کرتے ہیں؟ کتنے ہوتے ہیں جو ناموس امت یعنی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی اعانت و سرپرستی فرماتے ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو کالجوں کے ہر برخود غلط "تعلیم یافتہ" سے کئے جانے کے قابل ہیں لیکن اگر آج یہ سوالات ہمارے انگریزی یافتہ طبقہ سے کر دیجئے تو جو جوابات ملیں گے وہ یہ ہوں گے؟

کالج سے نکل کر۔ ملازمت کرتے ہیں، بے کس اور مجبور مسلمانوں پر اکڑ کر حکومت کرتے ہیں شکار کھیلتے ہیں، موٹر خریدتے ہیں ٹینس، کرکٹ۔ اور ہاکی کھیلتے ہیں سی۔ آئی۔ ڈی بنکر اپنے قومی بھائیوں کو بڑے گھر۔ پہنچاتے ہیں، کوتوال اور سب انسپکٹر بنکر شریفوں کی عزت لیتے ہیں قومی لباس و زبان کو نفرت و ذلت سے دیکھتے ہیں کہئے کیا بُرا کرتے ہیں؟؟؟

خیال تھا کہ صحبت کا اثر لازمی ہوا کرتا ہے جو بچہ درجہ الف سے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل بی تک خالص علمی ماحول اور درس گاہ میں بہاڑ جھونکتا رہے اُس کے اندر علمی مذاق پیدا ہی نہیں بلکہ طبع ثانی ہو کر رہے گا، لیکن ہمارے موجودہ "انگریزی یافتہ" حضرات میں جس قسم کا "علمی مذاق" پیدا ہوتا ہے اُس کا نمونہ یہ ہے کہ فیشن ایبل

مکان کے ایک نظر فریب کمرے میں قیمتی الماریوں کے اندر انگریزی کی بے شمار کتابیں رکھی جاتی ہیں کیونکہ آجکل کتابوں سے آراستہ الماریاں۔ اور کوئی رنگین جاپانی گلدان کمرہ میں رکھنا داخل فرنیچر ہے۔ لیکن کوئی پوچھے کہ کیوں حضور ان ملٹن اور شکسپیئر کی مطالعہ و مذہب کتابوں میں غریب مادری زبان اردو کی کتنی قدیم و جدید کتابیں ہیں؟ تو بجائے معقول جواب کے انسلٹ کہہ کر بگڑ جائیں گے! پھر مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ ایسے ہی ڈپٹی کلکٹرانہ زندگی والے آخر عمر میں قوم کے لیڈر ہی نہیں بلکہ "مولانا" بھی ہو جاتے ہیں۔ اب یہ تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہے یا "گھوڑ دوڑ" کا؟

کالجوں اور سکولوں میں۔ اردو املا لکھنے کی جگہ ملا اور دینیات کے گھنٹہ میں۔ پانی پینے کے بجائے سے جنگ جانے کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ہماری روزمرہ گفتگو میں آدھی سے زیادہ انگریزی داخل ہو رہی ہے۔ ہم اردو خطوط میں بجائے مشفقی و مکرمی۔ لکھنے کے۔ مائی ڈیر۔ اور ڈیر سر۔ لکھنے کے عادی ہو رہے ہیں اور آج نول کشور پریس کی وہ "انشائے مادھو رام" کوئی چھدام میں نہیں خریدتا جس میں مشرقی آداب و القاب لکھے گئے تھے، ہمیں اردو اخبارات اور رسالوں سے محبت کی جگہ نفرت ہے، ان حالات کا اثر یہ ہے کہ ہماری ملکی و مادری زبان اردو کا خاصہ مشغلہ ہو رہا ہے اور ہم اس "انگریزیت" پر خوش ہی نہیں بلکہ مغرور بھی ہیں، یہ ہے غلام دماغی کی اس آب و ہوا کا نتیجہ جس میں ہم روزانہ بلا ٹمپ کے سانس لیتے ہیں۔

جمعیتہ الاقوام واقع جنیوا سوئزرلینڈ میں دوسری حکومتوں کی طرح مملکت ہند زیر سایہ برطانیہ کی طرف سے ہر سال ایک عدد نمایندہ جایا کرتا ہے، پچھلے سال لالہ لاجپت رائے جو ہندوستان میں ہندی زبان کو ملک کی مشترکہ زبان بنانے کے حامی اور اردو زبان کے نیم ادیب ہیں اس مجلس میں مزدوران ہند کے نمایندہ بن کر گئے تو مجلس کے تمام شرقی و غربی نمایندوں نے دیکھا کہ لالہ جی اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا کھدر ڈانٹے ہوئے ہیں، لیکن جب آپ نے تقریر شروع کی تو وہ ان کی ملکی و مادری زبان میں نہیں تھی بلکہ۔ انگریزوں کی زبان تھی، اب پچھلے ستمبر میں پنجاب کے مایہ ناز فرزند اور اردو زبان کے دیرینہ سرپرست خان بہادر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق ایڈیٹر مخزن و وزیر تعلیمات جو اس مجلس میں گئے تو امید پیدا ہوئی کہ آپ کسی طرح بھی لالہ جی کی ہمسری۔ اختیار نہ کریں گے اور اپنی پیاری مادری زبان ہی کو استعمال کریں گے؟ لیکن اغلب یہ ہے کہ جمعیتہ الاقوام

کے۔ لال منہ نمایندوں سے شیخ مرعوب ہو کر انگریزی ہی بول اٹھیں گے، یہی حال ہمارے رہنمائے اعظم حاجی محمد علی و شوکت علی صاحب کا۔ موتمر مکہ۔ میں تھا کہ آپ نے موتمر میں بجائے اردو کے انگریزی زبان میں تقریریں فرما ڈالیں، اور ایک حجازی نے ان انگریزی تقریروں کا ترجمہ عربی میں کرکے موتمر میں پیش کیا، کیا اگر مولانا محمد علی اردو میں تقریر کرتے تو مولانا سید سلیمان علامہ کفایت اللہ علامہ عبدالحلیم بھوپالی اور مولانا عرفان اس کا عربی ترجمہ موتمر میں پیش نہیں کرسکتے تھے؟ حالانکہ دنیا کی ہر بین الاقوامی مجلس میں اس کے نمایندوں کو سرکاری زبان نہ جاننے کی صورت میں ان کی مادری زبان میں اظہار خیال کی اسی طرح اجازت ہوتی ہے جس طرح ہندوستان کے انگریزی ہائی کورٹس میں مجرمین کو اردو، ہندی، بنگالی، اور، گجراتی۔ بولنے کی حاصل ہے، پھر ایسی صورت میں کہ ہندوستانیوں کے پاس ان کی کوئی ملکی و مادری زبان تک نہ ہو کیا ہم انھیں حیوان مطلق۔ کہہ سکتے ہیں؟

---

۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو زیر صدارت ڈاکٹر عبداللطیف۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد "آندھیرا ایجوکیشنل کانفرنس" کا اجلاس منعقد ہوا اس خالص علمی مجلس میں ڈاکٹر صاحب نے جو عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا وہ اپنی علمی خوشنمائیوں کے لحاظ سے ممتاز و مختص ہے اس خطبہ میں ڈاکٹر صاحب نے "آندھیرا یونیورسٹی" کے قانون پر جو بحث فرمائی اس سے یہ معلوم ہوا کہ آندھیرا یونیورسٹی نے اپنے تمام انتہائی درجوں میں۔ اردو زبان۔ کی تعلیم کو اس صوبہ کی دوسری زبانوں کے مقابل درجہ اور امتیاز عطا کیا ہے اور یہ قانون۔ مدراس لیجسلیٹو کونسل سے باقاعدہ پاس ہوچکا ہے اسی طرح میسور یونیورسٹی نے بھی اردو زبان کو بطور ایک مستقل مضمون کے درجہ ایم۔ اے۔ کے امتحان کے لئے منظور کر لیا ہے اور میسور میں ایک مستقل اردو کالج۔ کی تجویز زیر غور ہے لیکن ایک سات کروڑ مسلمانوں کی "مسلم یونیورسٹی" ہے جہاں سے اردو کے گھنٹہ میں نہ فقط طلبہ ہی بھاگ جاتے ہیں بلکہ اس کے ہاں اردو پروفیسر اور اردو ریڈر زیر غور تک کے پتہ نہیں راوہ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم لکھنؤ، یعنی روایت کیا اسکو سید جالب دہلوی نے پنج اخبار ہمدم اپنے کے۔ اب اردو زبان کے ساتھ ہمارے بچوں سے لیکر لیڈروں نمایندوں اساتذہ تک کا جب یہ سلوک ہو تو کہنا چاہیئے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

صفحۂ ادارت

باوجود انتہائی سعی و کوشش کے رسالہ اپنے وقت پر نہیں نکل سکتا اس کا ہمیں سخت ملال ہے اگر چہ ہم فراہمی مضامین سے عہدہ برآ ہو کر ٹھیک وقت پر رسالہ مرتب کر کے مطبع کو بھیج دیتے ہیں پھر بھی اہل مطبع اپنی شان بے نیازی دکھائے بغیر نہیں رہتے۔

ہر چند یہ تعویق کہ ستمبر کا نمبر آخر نومبر میں شائع ہوا خریداروں کو بددل اور پریشان کرنے والا ہے لیکن ان سے زیادہ ہمیں اس امر کا احساس ہے اگرچہ مطبع کی دوری اور اہل مطبع کی بے پروائی کا علاج ہماری دسترس سے باہر ہے۔

انہی دشواریوں کو مدنظر رکھ کر اکتوبر و نومبر کا یہ مشترکہ نمبر دو چند ضخامت پر نکال کر تلافی مافات کرتے ہیں اگرچہ اردو جرائد کا یہ عیب خصوصی عیب ہے مگر مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی کوشش کریں گے (اگر پھر اہل مطبع نے شان بے نیازی سے کام نہ لیا) کہ دسمبر نمبر بھی اگر آخر دسمبر تک نہیں تو شروع جنوری تک قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے، اس طرح ممکن ہے ہم وقت کی پابندی کرسکیں ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس۔

اگرچہ دنیائے صحافت میں ہمارا یہ پہلا قدم ہے مگر اس قلیل عرصہ میں ہمیں جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جو جو تجربات حاصل ہوئے ہیں ان کو ملحوظ رکھ کر ہم یہ کہنے پر آمادہ ہوئے ہیں کہ دنیا سے سچی ہمدردی اگر کلیۃً مفقود نہیں ہوئی تو نایاب ضرور ہو گئی ہے نمائشی ہمدردی اور ظاہری خیر خواہی روز بروز وسعت پذیر ہوتی جاتی ہے۔

ثبوت میں اگر ہم اپنے قیام بمبئی (دسمبر ۲۶ء) کے بعض اہم واقعات قلمبند کریں تو انسانی افعال و خصائل کا ایک عجیب و غریب دفتر اور علم النفس میں جدید مگر دلچسپ معلومات کا اضافہ ہو جائے مگر ہم ان واقعات کے اظہار سے قارئین "زبان" کی تضیع اوقات کرنا نہیں چاہتے اس لئے ان کو نظر انداز کر کے صرف اسی پر اکتفا کرتے

ں کہ ہ

ہم نہ سمجھے تھے یہ ظاہر داریاں
تیری باتوں نے بڑا دہوکہ دیا

بمبئی سے لگ بھگ ایک سوایسے خریداروں کے وی۔پی واپس آئے ہیں جنھوں نے ہمیں ردبرد وپلو روانہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی، ان کی اس "ستم ظریفی" سے دفتر کو ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑا ہے لہذا ان سے اگر وہ ان سطور کے دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں) التماس ہے کہ اس وقت اگر کسی سبب سے آپ رسالہ کی اعانت نہیں فرماسکے تو اب ازرہ کرم مبلغ چار روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر دفتر کے اس عظیم نقصان کی تلافی کردیں۔

ہمیں گذشتہ نمبر ہی میں ان معاونین کرام کا جنھوں نے اپنے بیش بہا عطایا سے "زبان" کو نوازا ہے اور جنھوں نے رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہمیں کافی مدد دی ہے شکریہ ادا کردینا چاہئے تھا لیکن بعض ابتدائی مراحل کی انجام دہی کے سبب اب تک قاصر رہے امید کہ معاونین کرام معاف فرمائیں گے۔

معاونین کی فہرست میں تمام تر ایسے حضرات کے نام ہیں جنہیں اردو سے بہت کم تعلق رہا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اردو جانتے ہی نہیں ہیں تو حقیقت سے بعید نہ ہوگا اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کے دلوں میں قومی درد اور اپنے وطنی بھائیوں (اہل کاٹھیاواڑ) کی پستی کا احساس اور ملک میں اردو کو عام رواج دینے کا خیال بدرجہ اتم موجود ہے۔

سب سے بڑی بات جس کا ہمیں فخریہ اظہار کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاونین سب کے سب منگرول والے ہی ہیں اور ہر چند انکی مالی حالت بھی متقابلتاً منگرول اور کاٹھیاواڑ کے دیگر اپنے ہمقوم بھائیوں سے کچھ زیادہ تسکین بخش نہیں ہے۔ لیکن محض قومی ہمدردی کی بنا پر اور اس خیال سے کہ اپنے وطن سے ایک اردو رسالہ کا اجراء عمل میں آیا ہے رسالہ کی سرپرستی ومعاونت فرماتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہمارے مخلص دوست جناب محمد خاں گلاب خاں صاحب (منگرولی) ٹمبر مرچنٹ سنبل پور ہیں جنھوں نے ہمارے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں سبقت فرمائی ہے صرف ہمارے عزم اجرائے رسالہ کا سن کر فوراً ازخود ڈیڑھ سو روپیہ روانہ فرما کر اپنی ہمدردی و علم دوستی کا ثبوت دیا اور آیندہ بھی بہت کچھ توقع دلائی ہے۔ اسی طرح مکرمی جناب سیٹھ اسحاق محمد (منگرولی) اینڈ کمپنی ٹمبر مرچنٹ بمبئی نے ایک سو روپیہ مرحمت فرما کر ہماری حوصلہ افزائی اور آیندہ بھی اعانت کا وعدہ فرمایا اور ہمدرد ملک و قوم جناب سید واصل میاں صاحب (منگرولی) نے بھی کھمبات سے پچاس روپے روانہ فرما کر اپنی ملکی و قومی کا ثبوت دیا ہے جن کے ہم بیحد ممنون ہیں۔

جناب اے۔ ایس۔ ولی بارایٹ لا (بمبئی) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے پچیس مرحمت فرمائے اگرچہ ہم کو آپ کے مشاغل علمی کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ قدردانی کی امید تھی۔

اس سلسلہ میں دس دس روپے کی رقم دینے والے چند قدردانوں کے اسماء کا اظہار کر دینا بھی غالباً بیجا نہ ہوگا۔ جناب محمد میاں صاحب، نجم الدین میاں صاحب (منگرولی) جناب سید مصطفےٰ میاں عزمیاں اور جناب سید عبداللہ میاں جعفر میاں

جن کاٹھیاواڑی حضرات نے باوجود تمول و مقدرت کے اب تک اپنے اس ملکی رسالہ کی اعانت نہیں فرمائی وہ توجہ فرمائیں کہ یہ رسالہ بغیر کسی سرمایہ کے محض آپ کی فیاضی کی امید پر جاری کیا گیا ہے اگر آپ نے اس کی اعانت میں کوتاہی اور عدم توجہی سے کام لیا تو رسالہ مالی مشکلات سے تنگ آ کر بند ہو جائے گا تو اس کی تمام ذمہ داری آپ کے سر ہو گی۔ ہم نے ملک کے ایک گوشہ سے صدا بلند کی لیکن افسوس کہ چند اہل وطن کے سوا کسی نے سماعت نہ فرمائی۔

ہم نے اپنا فرض ادا کیا آپ اپنا فرض ادا کریں

رسالہ کا سالانہ خرچ بارہ سو روپیہ ہے اور ہمیں اب تک صرف سوا سو خریدار بہم پہنچے ہیں اسلئے ملک کے

متمول ذمہ دار افراد سے ہم اسکی اعانت کے طالب ہوئے ہیں اگر صرف تین سو خریدار ہم پہنچ جائیں تو ہمیں کسی کی اعانت کی ضرورت نہ رہے ہاں بارہ سو سے زاید رقم جمع ہو جانے پر ہم رسالہ کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں اضافہ کرسکینگے۔

ہمنے گذشتہ اگست نمبر میں ملک کے نامور اہل قلم حضرات سے مضامین کی درخواست کرتے ہوئے معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ مالی حالت کے درست نہ ہونے پر ہم انکی خدمات سے ابتک محروم ہیں اس لئے معذرت کرتے ہوئے نہایت ندامت سے ملتجی ہیں کہ رسالہ کے سنبھلنے تک قلمی اعانت سے ہمارا ہاتھ بٹائیں رسالہ کی مالی حالت درست ہونے پر ہم اپنی بساط بھر آپ کی خدمات سے دریغ نہ کرینگے۔

یہ بات کسی سے بھی مخفی نہیں ہے کہ مخدومی خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ جہاں اسلام کی بہت کچھ ناقابل فراموش و لائق مدحتین خدمات انجام دے رہے ہیں وہاں اشاعت اُردو کے بھی سچے بہی خواہ وہمدرد ہیں اور دل سے اس کی ترویج و تبلیغ کے خواہاں ہیں حال میں ہماری خوش نصیبی سے خواجہ صاحب موصوف بسلسلہ تبلیغ اور ہندی ترجمہ قرآن مجید کے چندہ کی فراہمی کی غرض سے کاٹھیاواڑ کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے ۱۰ اکتوبر ۲۶ء کو منگرول میں بھی تشریف لائے تھے اس موقع پر مدیر رسالہ زبان کو آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا رسالہ دیکھکر بہت پسند فرمایا اتنا ہی نہیں بلکہ اشاعت اُردو کے خیال سے "زبان" کو خریداری کا بھی شرف بخشا اور اپنے دیگر ہمراہیوں کو بھی اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائی اور کاٹھیاواڑ میں جہاں گئے اسی کا ذکر خیر فرمایا۔

کیا اب بھی اہل کاٹھیاواڑ کو اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا کہ ایک غیر کاٹھیاواڑی اور وہ بھی ایسا شخص جس کی خدمت میں زبان سے بہتر ہندوستان کے کئی رسالہ بہ تحفہ پیش ہوتے ہیں وہ "زبان" کی اس لئے نہیں کہ وہ زبان اردو کا ایک رسالہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک ایسے مقام سے نکلتا ہے جہاں اُردو کو رواج دینے کی سخت ضرورت ہے مدد کرنا اپنا اور ہر اُردو داں کا فرض سمجھتا ہے۔ یہ خواجہ صاحب ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کو اشاعت اُردو کی اہمیت کا احساس ہے زبان کی امکانی امداد

سے دریغ نہ کرے گا۔

کس قدر افسوس ہے کہ چند دیسی ریاستوں میں جہاں سالہا سال سے تمام دفتری کارروائی اُردو میں ہوتی تھی وہاں اب اس کی حریف ہندی زبان میں ہوتی ہے اور آئے دن جس سُرعت کے ساتھ اسکو ترقی ہو رہی اور جس سرگرمی سے ہمارے ہندو بھائی اس کو اوج کمال پر پہنچانے میں جدوجہد کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

کیا ہمنے بھی اپنی وطنی اور مادری زبان "اردو" کو وسعت دینے کی کوئی نمایاں اور عملی کارروائی کی ہے؟!

ہمارے مخلص دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی اور مکرمی مولانا عبدالستار صاحب فاروقی زبردست قلمی اعانت کے علاوہ زبان کی توسیع اشاعت میں بھی بڑی سرگرمی سے حصّہ لے رہے ہیں جس کے لئے ہم ان کے بیحد ممنون ہیں۔

اڈیٹر

التجا

طبع الم نواز دے ذوقِ فغاں طراز دے
یعنی دلِ فسردہ کو تابِ نفس گداز دے

سرد ہیں سارے ولولے آتشِ شوق پھونکدے
سوزِ دروں کو پھر مرے قوتِ شعلہ ساز دے

نقشِ عبودیت جو تھے اب ہیں وہ کچھ مٹے مٹے
شانِ فتادگی بڑھا، بیخودیِ نیاز دے

رنگِ بہارِ دہر کا نذرِ سموم ہو چکا،
موجِ نسیم کر رواں ذوقِ چمن طراز دے

درخورِ لطف گر نہیں زؔرمی خستہ و حزیں
تیری نگاہِ قہر ہی غرت و امتیاز دے

رزمی بھوپالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء

مقالات

زوجیتِ عامّہ

اور

قرآن مجید

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

از منۂ قدیمہ میں جبکہ تمدّنِ بشری کی ابتدا تھی نباتات کے روابط و اسرار بہت کم دریافت ہوئے تھے۔ مثلاً یہ معلوم تھا کہ درختِ خرما میں جنسِ نر و مادہ ہوتی ہے، مگر اس بات کا علم نہیں تھا کہ تمام اقسام نباتات میں ذکور و اناث پائے جاتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو برس پیشتر قرآن کریم نے اس نظریہ کو دنیا سے روشناس کرایا کہ "زوجیت عامّہ" یعنی جنسیتِ نر و مادہ تمام نباتات میں موجود ہے:-

وَ اَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ (سورۂ حج) اور ہر جنس نباتات کو تر و تازہ اُگاتا ہے،

مِن کُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِیھَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ (سورۂ ۱۳)

تمام میووں میں سے اس نے جوڑے بنائے ہیں۔

نباتات کے علاوہ بھی قرآن مجید ہمیں ایسی چیزوں میں جنسیت اور زوجیت کی خبر دیتا ہے جنکو ہم نہیں جانتے۔

سُبْحَانَ الَّذِی خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (سورۂ یٰسین)

پاک ہے وہ (خدا) جس نے ہر اس چیز سے جوڑے پیدا کئے جنکو زمین اگاتی ہے اور انسانوں میں سے، اور ان (مخلوقات) میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

بلکہ اس کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ:۔

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (الذاریات)

اور ہر چیز سے ہم نے جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو

باوجود ان روشن اور واضح تر بیانات کے لوگ اس نظریہ سے نا آشنا رہے۔ مگر جب علم الحیات اور علم نباتات نے ترقی کی زینہ پر قدم رکھا اور حکمائے اسلام تحقیقات علمیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نباتات میں جنسیت نر و مادہ کی حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی چنانچہ آج اس بات کو زمانہ حال کے تمام نباتیین اور شجارین تسلیم کرتے ہیں اور علم اشکال الاعضار (Morphology) کا ہر ایک ماہر جانتا ہے کہ پیش رستہ (Prothalium) پودوں میں اعضائے جنسیہ ہوتے ہیں جنکو اصطلاح میں تخم خانہ (Archegonia) اور زر خانہ (Antheridia) کہتے ہیں اور یہ دونوں بصورت (Homosphorous) فرن[۵۱] کی قسم کے پودوں میں یکجا، اور مختلف قسم کے تخم دان والے (Heteresphorous) پودوں میں ذکور و اناث پیش رستہ میں پائے جاتے ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ بے پھول جماعت کے چوبی درختوں کی قسمیں جن کے ورق ملائم ہوتے ہیں۔

۵۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لفظ ”بوٹنی“

لیکن جمادات اب تک اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ حال ہی میں رُوس کے ایک نامور سائنس داں مینوایلوف (Manuilofe) نے جو انسانوں حیوانوں اور نباتات میں جنسیت کی تحقیق کر رہے تھے اس اہم نظریہ کا انکشاف کیا ہے کہ "جمادات میں بھی جنسیت پائی جاتی ہے!

ڈاکٹر مینوایلوف لینن گراڈ (روس) کی "انجمن معالجۂ نفسی" کے ایک سربرآوردہ رُکن ہیں، اور حال میں انہوں نے اپنے تازہ انکشافات پر انجمن مذکور میں ایک تقریر کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ تازہ اختبارات نے اُن پر یہ ثابت کر دیا کہ بلور (Crystal) کی دو خاص شکلوں ہشت پہلو اور مکعب میں جنسیت پائی جاتی ہے، چنانچہ اس نظریہ کی مزید توثیق و تصدیق کے لئے انہوں نے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مختلف قسم کی گیارہ معدنیات کا تجربہ کیا، اور ہر تجربہ کا یہی نتیجہ برآمد ہوا[۱]۔ اس طور پر جمادات میں جنسیت کے وجود کا یقینی ثبوت مل گیا۔

نباتات کی جنسیت کے نظریہ کو حکمائے اسلام نے تحقیق کیا اور جمادات کا مسئلہ محققین یورپ نے حل کیا۔ اس طرح مشرق و مغرب نے مِل کر قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق کر دی! وَلِلّٰہ درّ من قال:

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نظریۂ علم و حکمت کو ایک اُمّی (فداہ ابی و اُمّی) نے کس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا؟ لیکن کیا یہ بین ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ قرآن مجید مُنزّل من اللہ ہے جس کو پروردگارِ عالم نے اپنے برگزیدہ بندہ کے ذریعہ نازل فرمایا؟ اور کیا اس سے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اور وَاِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ کی کامل تصدیق نہیں ہوتی؟

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرّس شد!

---

[۱] رسالہ (Tit-bits) بابت ۱۶ جنوری سنہ ۲۶ء

ایران

زیر حکومت رضا خاں

از میجر ای۔ ڈبلیو پولسن نیومن

(مترجمہ جناب اکبر علی صاحب۔ بی۔ اے۔ ناظم تعلیمات ریاست منگرول)

ہماری استدعا پر جناب اکبر علی صاحب بی۔ اے (پنیالوجی) ناظم تعلیمات ریاست منگرول نے زبان کے لئے انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرکے عطا فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے بیحد مشکور ہیں۔

موصوف کا نام اگرچہ دنیائے ادب میں نیا ہے لیکن اگر وہ اس علمی شغل کو جاری رکھیں تو یقین ہے کہ بہت جلد ایک اچھے انشا پرداز مشہور ہو جائیں۔ حال میں موصوف نے ہمارے سرپرست و آقا نواب صاحب منگرول بالقابہ (جنھیں مسلمانوں کی تعلیم کا بڑا خیال ہے خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کو آسان بنانے کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے) کی فرمائش سے اردو کا ابتدائی قاعدہ جدید اصول پر مرتب فرمایا ہے (جو عنقریب شائع ہو جائیگا) جس کو دیکھکر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آجتک اردو کے جتنے قاعدے لکھے گئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی قبولیت کا شرف نہیں حاصل ہوا لیکن امید ہے کہ یہ قاعدہ سب سے بہتر ہونے کے لحاظ سے بہت جلد قبولیت کا شرف حاصل کرلے گا۔

اس قاعدہ میں سب سے بڑی خوبی علاوہ آسان اور سریع الفہم ہونے کی یہ ہے کہ بچہ بیک وقت اردو اور گجراتی دونوں زبانیں سمجھنے اور لکھنے لگ جاتا ہے اس لئے بچہ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ رہتا ہے۔ غرضکہ بمبئی پریسیڈنسی کیلئے یہ قاعدہ ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

اڈیٹر

منجملہ اخباری بیانات کے جو اطلاعیں مختلف ذرائع سے موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران

کی عام حالت کے بارہ میں بہت غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ ایران کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے مجھ سے کہا گیا تھا کہ ملک میں بالشویزم کا بہت زور ہے، سوویٹ گورنمنٹ ہی درحقیقت گورنمنٹ ایران ہے اور روس بتدریج (سیاسی نہ سہی) اپنا اخلاقی اثر سرحد عراق اور خلیج فارس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

خوش قسمتی سے میں بوثوق یہ بات بیان کرنے کے قابل ہوں کہ وہاں کی یہ حالت نہیں ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میں اُن اصول کا کچھ خیال آپکو دلاسکونگا جن پر ایران آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔

ملک ایران دراصل ایک سرسبز و شاداب زراعتی ملک ہے جس کے تمام اطراف میں میلوں تک فراخ وادیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تمام ملک اگرچہ کوہستانی ہے لیکن اس کا ایک وسیع رقبہ قابل زراعت ہے۔

جملہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہاں ریل گاڑیاں نہیں ہیں اور تمام تجارتی مال و اسباب کو سست رفتار قافلے ناہموار راستوں پر آرام و آہستگی سے لیجاتے ہیں۔ ملک کے مختلف حصّوں کے درمیان آمدورفت بہت کم ہے۔ اگرچہ موٹر کے اجراء نے سفر میں بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں جس سے آمدورفت بڑھ گئی ہے، تاہم بعض اضلاع ایک دوسرے سے اس قدر الگ تھلگ ہیں کہ ایک حصّہ میں قحط پڑ جاتا ہے تو دوسرے حصّہ میں گیہوں پڑے سڑا کرتے ہیں۔

ایران میں ہر چیز کی رفتار نہایت سُست ہے۔ مذہبًا اکثر اہل ایران شیعہ فرقہ کے مسلمان ہیں۔ علما و مجتہدین کی مذہبی جماعت کو اب بھی بڑا اقتدار حاصل ہے، اور بحیثیت مجموعی ملک میں اسلامی احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ تعلیم کی طرف سے اب تک بہت غفلت برتی گئی ہے۔ حال ہی میں مُلّاؤں اور غیر ملکی مشنریوں (مبلغین) نے اسے کُلیتہً اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فوج پہلے کم و بیش ناکارہ لوگوں کی ایک بے قاعدہ جماعت سے زیادہ نہ تھی جو وردی پوش رہا کرتی تھی۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں "قرون وسطیٰ" کی سی فضا سرایت کئے ہوئے تھی، اور آمدورفت کے ذرائع کی عدم موجودگی نے ترقی کے بڑھتے ہوئے قدم کو بہت روک رکھا تھا۔

اب ایران آہستہ آہستہ کروٹ بدلنے لگا ہے، اور بتدریج ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ترقی ضرور ہو رہی ہے، اور گورنمنٹ کی عملی کارروائی اور آئین حکومت کے ماتحت قائم شدہ عام درسگاہوں کی بدولت تعلیمی حالت روبہ ترقی ہے، لوگ زیادہ روشن خیال ہوتے جارہے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس (جن میں جبریہ تعلیم دی جاتی ہے) کا تعلیمی نصاب وزیر تعلیمات کے ماتحت ہے۔ اور دور دراز صوبجات

تک میں مدارس قائم کردیئے ہیں۔ طہران میں فرانسیسی علوم کا ایک شعبۂ تعلیم قائم ہے جہاں طب، قانون اور سیاسیات کی سندیں عطا کی جاتی ہیں۔ بایںہمہ تعلیم کو جسقدر امداد ملنی چاہیے اتنی نہیں ملتی، اور اگر ایرانی حکومت اشاعت تعلیم کے لئے مزید سرمایہ بہم پہنچائے تو بہت بہتر ہوگا۔

زبان فارسی کی تعلیم تمام مدارس میں لازمی ہے، قومی زبان اور قومی تاریخ کی تعلیم ہر جگہ دی جاتی ہے۔ فوج میں اصلاح کی گئی ہے اور امن عامہ کا انتظام اچھا ہے۔ بجٹ میں کچھ زائد رقم پس انداز کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد سے ایرانیوں کا قومی جذبہ بہت تیز ہو گیا ہے، اور معاشرتی اتحاد کے علاوہ، (جو ایرانی نسل کا امتیاز خصوصی ہے) قومی و سیاسی اتحاد کا خیال، فوج کے قیام، تعلیم اور موٹر کے اجراء سے مضبوط کیا جارہا ہے حق بات یہ ہے کہ اہل ایران کے پاس اس وقت ایک ایسی بنیاد موجود ہے جس پر وہ ترقی کی ایک ٹھوس عمارت بتدریج قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرلینا چاہیے کہ یہ بنیاد غیر متزلزل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میں بہت احتیاط سے کام لیا جائے۔ کیونکہ وہ ابھی اتنی مضبوط نہیں ہے جو سخت صدمات کو (خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی) برداشت کرسکے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ اصطلاحات میں سب سے بڑی قوت متحرکہ رضا خاں پہلوی موجودہ شاہ ایران کی شخصیت ہے۔ جو پہلے وزیر اعظم، وزیر جنگ اور کمانڈران چیف تھے۔ اگرچہ ان کے اصلی اختیارات ایک خود مختار حاکم کے برابر تھے تاہم انکو "مطلق العنان" کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ انکو اقتدار پہلے ہی سے حاصل ہوچکا تھا اور وہ مناسب آئینی حکومت کے ماتحت صاحب اختیار تھے۔ وہ اس بنائے عمارت کے "سنگ بنیاد" پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اور انکی یہ طاقت تخت ایران پر جلوہ فرما ہونے سے بہت مستحکم ہوگئی ہے۔

فوجی جمعیت رضا خاں کی بہت بڑی مؤید تھی، اور فوجی طاقت بڑھانے کے لئے مجلس شوریٰ نے حال ہی میں ایک سخت فوجی قانون نافذ کیا ہے۔

طہران میں جن ایرانیوں سے میری ملاقات ہوئی ان کو یورپ میں تعلیم پانے، اور موجودہ سیاسی تدبر میں گہری دلچسپی لینے کی وجہ سے میں نے بہت روشن خیال پایا۔ امریکن کالج، اور ینگ پرشین سوسائٹی عام سطح خیال کو بلند کرنے میں بہت کوشاں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آئینی تدبر کے عناصر اس وقت ملک میں سرایت کر رہے ہیں۔

اس وقت ایرانیوں کی اولوالعزمیوں کی نمایاں خصوصیت حصول "آزادی" ہے جو تمام ایرانی

حکمت عملی کا اصل الاصول ہے۔

قبل از جنگ ایران میں دو زبردست غیر ملکی اثرات تھے، یعنی برطانیہ عظمیٰ اور روس۔ روسی اثر بہت زبردست تھا۔ ایرانی کاسک فوج کا دستہ (Cossack Brigade) جس کا کمانڈر روسی کرنیل تھا، اپنے منتخب روسی افسروں کے ساتھ طہران میں، دنیا کی سب سے بڑی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ ایک زبردست سفارتخانہ کے علاوہ ایک روسی بنک بھی تھا جس کا مالی اثر بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان ہر سہ ذرائع سے روسی رفتہ رفتہ اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر صیغہ سہولت کی غرض سے سینٹ پیٹرسبرگ (پٹروگراڈ) میں ایک علیحدہ وزارت کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ جو مداخلت کے الزامات کی تردید کے لئے ایک ذریعہ تھا۔

برطانوی اثر جو زیادہ تر جنوب مغربی ایران تک محدود تھا، شمال میں روسی اثر کی کمی بیشی کی بدولت منظم اور باقاعدہ ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ تک ان دو بڑی حکومتوں کا عملدر آمد پیش قدمی اور پسپائی کی دو رُخی پالیسی پر تھا، اس کے بعد عدم مداخلت کا قانون بروئے کار آیا جس کی رو سے برطانیہ نے تسلیم کیا کہ وہ شمال میں اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور روس اس بات پر رضامند ہوا کہ وہ جنوب میں عدم مداخلت کی حکمت عملی پر کاربند رہیگا۔ اس اثنا میں اہل ایران، طہران اور شمال ایران پر روسیوں کے مسلسل تسلّط سے بہت تنگ آ گئے تھے اور عدم مداخلت کا جو اقرار تھا وہ بالکل بے سود ثابت ہوا۔ روس اور انگلستان کے مابین ۱۹۰۷ء کے معاہدہ کا منشا بھی (جو اسی طریقہ کار پر مشتمل تھا) روس اور انگلستان کی طرح ایرانی معاملات کے بارہ میں بھی اتحاد کی پالیسی کو رواج دینا تھا۔ اس پر بھی کامیابی کے ساتھ عملدر آمد نہ ہو سکا، اور ایرانیوں نے مشترکہ انگریزی اور روسی حکمت عملی کو ناپسندیدگی سے دیکھا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ عظمیٰ اور روس آپس میں اتحادی بنگئے۔ اس لئے ایران نے درخواست کی کہ غیر جانب دار علاقہ سے روسی افواج ہٹادی جائیں۔ لیکن یہ درخواست منظور نہ ہوئی یہانتک کہ روسی انقلاب رونما ہوا۔ اس وقت صرف برطانیہ ہی کا اقتدار ملک میں باقی رہگیا تھا۔ لیکن اسیوقت انگریزی اور روسی اتحاد کو اپنے ملک میں دیکھ کر ایرانیوں کو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ برطانوی اثر روسی

اثر سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔

دوسرا اقدام وہ انگریزی ایرانی معاہدہ تھا جس نے محض ناکامیوں کی فہرست میں اضافہ کیا اور بالآخر جون ۱۹۲۱ء میں منسوخ ہوگیا۔ ایران غیر ملکی مداخلت سے تنگ آگیا ہے۔ وہ کامل آزادی اور قطعی عدم مداخلت چاہتا ہے اور بالآخر اس کو ترقی دینے اس میں حب الوطنی کا جوش پیدا کرنے اور قومی قوی کو حرکت میں لانے کے لئے اس کو ایک زبردست عالی دماغ مل گیا ہے۔ یہ عالی دماغ شخص فتنۂ بالشویزم کے مقابلہ میں ایران کا سب سے بڑا محافظ ہے۔

ایران جانے سے مجھے یقین ہوگیا کہ ملک میں بالشویزم کی تحریک دبتی جا رہی ہے اگرچہ روسی حکومت کے گماشتے اس بارہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے۔ تاہم میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایرانی حکومت پر سوویٹ گورنمنٹ کا کچھ بھی اقتدار نہیں ہے اور بالشویزم کی بابت چیخ پکار کا مطلب محض سوویٹ روس کی اس خونخوار پالیسی کو (جو کامل عدم مداخلت "سے زیادہ کسی چیز کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی) مشتہر کرکے اس کی ہمت افزائی کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ایران "سرخ پالیسی" سے متنفر ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ "سرخ" ہے بلکہ اس سبب سے بھی کہ وہ روسی ہے۔ اس پالیسی سے اس کی آزادی معرض خطر میں ہے ——— وہ آزادی، جو خود کو منوانے اور اپنے قیام و ثبات کے نصب العین سے برطانیہ کی ہمدردی کے ساتھ کسی بیرونی دباؤ کی زبردست محافظ ہے۔

اسلام کا شیعہ مذہب دراصل ایک ایرانی سیاسی تحریک تھی جس نے مذہبی فرقہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اور اس لئے ملک ایران روسی ہوسناکیوں کی نشوونما کے لئے مناسب سرزمین نہیں ہوسکتی۔ اہل تشیع کو مذہبی پابندی کا پورا احساس ہے جس کی نگہداشت ان کے ملا کرتے ہیں۔ اس بارہ میں گورنمنٹ کی طرف سے ان ملاؤں کی ہمیشہ تائید ہوتی ہے۔ ایسے مذہب کے خلاف جس کی جمعیت کا دارومدار تمامتر قومیت پر ہو روسی حکمت عملی کامیاب نہیں ہوسکتی اور موجودہ حالات کے اعتبار سے بہت کم امید ہے کہ سوویٹ پروپگنڈا ایران میں بارآور ہوسکے۔ کیا عجب ہے کہ یہی پروپگنڈا آگے چل کر قومی آزادی کی ترقی میں ایک مفید محرک ثابت ہو۔

روسی نقطۂ خیال سے ایران ہر طرح ایک اہم چیز ہے اور اگر وہ سوویٹ پروپگنڈا کے سامنے

بر تسلیم خم کر دے تو خلیج فارس اور عراق (بشرطیکہ برطانیہ میسوپوٹامیہ کو خالی کر دے) سے لیکر شام اور بحیرہ روم تک راستہ صاف ہو جائے، ایران اس وقت روس اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان ایک بین بین کی حالت میں ہے۔ البتہ برطانیہ جنوب اور جنوب مغربی ایران کے جائز و مقررہ حقوق کی نگہداشت کا خواہشمند، اور تمام ایران کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات کو وسعت دینے کا اُمیدوار ہے۔ لیکن ایرانی معاملات میں وہ دست اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنے معاملات کو سُلجھانے میں ایران جس قدر ذمہ داری قبول کرے اتنا ہی برطانیہ کے مفید مطلب ہے۔ پس ایرانی سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی طرف سے کبھی کوئی ناجائز دباؤ نہ ڈالا جائیگا۔ اسی طرح انہیں یقین ہے کہ ضرورت کے موقع پر برطانیہ بے غرضانہ مشورہ دینے کو تیار ہوگا۔

آزادانہ طریقوں سے ایران کی آیندہ ترقی اس کی مستقل مالی حالت اور اُس اقتصادی ترقی پر منحصر ہے جو انگلستان اور امریکہ کے مشترکہ اقتصادی اتحاد سے حاصل کی گئی ہو۔ زراعت کو ترقی دینا، آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع بہم پہنچانا ملک کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ افیون کی کاشت کے مسئلہ کو حل کرنا چاہئے اور بالآخر اس کی قائم مقام کاشت کو رواج دینا چاہئے۔ کیونکہ افیون کی پیداوار نہ صرف قوم کے لئے جسمانی حیثیت سے مضرت رساں ہے بلکہ اس کا استعمال تمام ترقیوں کا مانع ہے۔ اس کی مقدار اس کی قیمت کے مقابلہ میں کم ہے، اور افیون کی ایک قیمتی مقدار کا وزن اُٹھانے کے لئے ایک قلیل الجثہ گدھے کی پیٹھ کافی ہوتی ہے۔

افیون کی جگہ اور اجناس کی کاشت کو رواج دینے کے لئے آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع مہیا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جن سے کسی طرح سے ملک کو فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ اگرچہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ پیداوار معقول نہ ہو، اگر افیون استعمال کرنے والے ممالک جو اس کے استعمال کا انسداد کرنا چاہتے ہیں، اس کی جگہ اور فصلوں کی ابتدائی کاشت کے لئے کچھ مالی امداد دیں تو اس سے نہ صرف ان کو فائدہ ہوگا بلکہ وہ ایک وسیع پیمانہ پر ایران کی اقتصادی ترقی کا راستہ بھی صاف کر دیں گے۔

ایران میں افیون کے انسداد کا مسئلہ چونکہ بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا گہرا اثر اس ملک کی اقتصادی حالت پر پڑتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے، اس لئے

مسئلہ افیون سے واقفیت حاصل کئے بغیر ایران کے اصلی اور صحیح خال وخط کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔
منجملہ بائیس ۲۲ صوبجات کے ایران کے اٹھارہ ۱۸ صوبوں میں افیون پیدا ہوتی ہے، اور تقریباً چار لاکھ مربع میل رقبہ میں (جو ملک مصر کے رقبہ سے زیادہ ہے) اس کی کاشت ہوتی ہے، علاقہ کاشت سے خارج صرف وہ صوبجات ہیں جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہیں، اور صوبجاتِ شمال مثلاً آذربائجان، گیلان، استرباد، خمسہ، اور کردستان ہیں۔ افیون کی تجارت پر کوئی ضابطہ قائم کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہے، کیونکہ افیون کی اقتصادی اہمیت اور اس کی تجارت میں کثیر منافع کا خیال اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ نیز تجارتی منفعت کے کثیر ذرائع کو کم کردینے، یا کسی خاص فرد کی آزادی میں مداخلت کرنے میں عام اور سیاسی مخالفت کا اندیشہ ہے۔
افیون کی تجارت ایران کے لئے اقتصادی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فی الواقع ایران کے متعدد صوبوں میں صرف یہی ایک فصل ہے جو کسی نہ کسی صورت میں کاشتکار کی محنت کا نقد معاوضہ دیتی ہے۔ اور کلاً یا جزءً لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی گذر اوقات اسی کی کاشت اور تجارت پر منحصر ہے۔
اصفہان کی اسّی ہزار کی آبادی میں کم ازکم پانچ ہزار آدمی ایسے پائے گئے ہیں جو اپنی آمدنی کا تمام یا ایک بڑا حصہ تجارتِ افیون کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر انہیں سے ہر ایک فرد کے متعلقین کا اوسط تین آدمی فرض کرلیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ تمام آبادی میں کم ازکم پچیس فی صدی لوگ زیادہ تر اسی افیون کی پیداوار پر اوقات بسر کرتے ہیں[۵۱]۔
بدقسمتی سے ملک میں صنعت وحرفت کا وجود نہیں ہے، جو تجارتِ افیون کے انسداد یا اسمیں کمی واقع ہوجانے کی حالت میں اس مزدور پیشہ جماعت کو کسی کام پر لگا سکے۔ نہ ہی زمیندار یا کاشتکار موجودہ حالت میں سخت نقصان اُٹھائے بغیر افیون کی جگہ کسی اور چیز کی کاشت کرسکتے ہیں۔ اگر ان کے لئے فن زراعت کا کوئی ماہر اور افیون کی قائم مقام فصلیں بونے کے لئے کما حقہ سرمایہ بہم پہنچایا جائے ایسے لوگوں کی طرف سے جنھیں افیون کی پیداوار کو کم کرنے یا روکنے کا حق حاصل ہے، تب بھی لوگوں کو ان فصلوں سے کافی آمدنی مہیا کرنے کے لئے سالہا سال درکار ہوں گے، تاکہ ان نقصانات

۵۱ ان اعداد وشمار میں اصفہان وذراع اصفہان کے کاشتکاران افیون شامل نہیں ہیں۔ ۱۲

کی تلافی ہو سکے جو انسداد افیون کی وجہ سے پہنچیں گے۔

پھر بھی گورنمنٹ ایران نے بعض قوانین جاری کر کے صحیح طریقہ پر بہت کچھ اصلاح کر دی ہے مثلاً گورنمنٹ نے "شیرہ سوختہ" کے ٹھیکے کو رواج دیا ہے۔ حقوں میں افیون پینے کے بعد جو مواد بچ رہتا ہے اسی سے یہ شیرہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک عرق ہے جو آجکل ایران میں استعمال ہو رہا ہے۔ چنگی کا محصول بڑھا دیا گیا ہے، اور ۱۹۱۱ء میں چند دفعات بھی مرتب کی گئی تھیں جو سات سال کے اندر "شیرہ" کے استعمال کی ممانعت پر مشتمل تھیں۔ پھر ساتویں سال کے بعد ایسے قوانین کا نفاذ بھی ہوا تھا جن کی رو سے ادویہ کے سوا افیون کے استعمال کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔ اس ممانعت کو عمل میں لانے کے لئے چند قواعد بھی مرتب کئے گئے تھے جن سے شیرہ کے ٹھیکہ کو مزید تقویت ہو گئی نیز عرق افیون کو ایک جگہ جمع کرنے، اور گورنمنٹ کے گودام خانوں میں اس کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ ملک میں افیون کے مقامی استعمال پر ضابطہ قائم ہو سکے۔

شیرہ کے تمام گودام خانے براہ راست گورنمنٹ کی نگرانی میں ہیں، اور ادویہ کے سوا ماسوا افیون (Morphine) کے استعمال کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت پر عملدرآمد کے لئے سرحدوں پر سخت نگہداشت کی جاتی ہے۔ مارفین کی بڑی مقدار اور مارفین پینے کی نلکیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے سبب سے جبکہ برطانوی، روسی، اور ترکی افواج کے لئے ایران میدان جنگ بنا ہوا تھا، مرکزی حکومت کا اقتدار گھٹ گیا تھا، اس وجہ سے افیون سے متعلق قوانین کے اجراء میں ایک طرح کی خامی واقع ہو گئی۔

لیکن جب رضا خاں (موجودہ شاہ ایران) نے ۱۹۲۲ء میں محصولات کی تحصیل بلاواسطہ اپنے ہاتھ میں لے لی تو افیون کے گودام خانوں میں ایک وافر ذخیرہ افیون نظر آیا۔ پھر جب امریکن مالی کمیشن نے بھی تحصیل دسمبر ۱۹۲۳ء میں اپنے اختیار میں لی تو اس نے ذخیرہ افیون یکجا جمع کرنے کی تجویز پایہ تکمیل کو پہونچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ان صوبوں میں جہاں یہ اصول قائم ہو چکا تھا سخت نگرانی ہونے لگی۔

افیون کی کاشت کو وسیع پیمانہ پر تقسیم کر دینے سے، چھوٹے چھوٹے قطعات زمین میں (جیسے کہ وہ حرم، کے باغات میں) نگرانی ناممکن ہے، منفعت بخش زراعت کے امکان سے، اور اس وجہ سے

کہ بہترین پیداوار کے بہت رقبے اب گورنمنٹ کے قبضہ میں آنے لگے ہیں، افیون کی پیداوار پر باضابطہ نگرانی قائم کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ کھلیان کے زمانہ میں افیون کے کھیتوں میں کثیر التعداد لوگوں کے داخل ہو جانے سے افیون کے عرق کی نگہداشت بھی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ فصل کے پکنے تک تو کاشتکار لوگ کھیتوں میں رہتے ہیں لیکن پوست کو پکنے کے ساتھ ہی کرنج لینا ضروری ہے ورنہ عرق دستیاب نہیں ہو سکتا اس مطلب کے لئے کئی مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں عموماً افیون یا عرقِ افیون یا کچھ عرق اور کچھ نقد معاوضہ دیا جاتا ہے۔

فصل تیار ہونے پر دوکاندار اور چھوٹے بیوپاری دیہات میں جاتے ہیں جنھوں نے سال بھر میں کاشتکاروں کو مال ادھار دیا ہوتا ہے اور معاوضہ میں افیون کا عرق وصول کرتے ہیں اسی طرح تاجروں کو بھی یہی صلہ ملتا ہے۔ جونہی عرق کا ذخیرہ شروع ہوتا ہے، ہزارہا چھوٹی چھوٹی اشیاء فروخت کرنے والے اپنا سامان افیون کے کھیتوں میں عرق کے عوض بیچتے پھرتے ہیں۔ درویش۔ نقدہ گو، فقیر، گویے، کھیل کرنے والے مداری، ان کھیتوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں، جن کی ہتھیلیوں پر افیون کھرچنے کے چاقو پر چپکا ہوا حصہ بطور انعام لگا دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے حاصل کردہ افیون، باہر سے آنے والے خریداروں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے ایسی حالت میں جبکہ فصل کے موقع پر ایک رقبہ میں تین سے پانچ ہزار باہر کے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں جن سب کے پاس افیون کا عرق ہوتا ہے کل فصل کی افیون یکجا جمع کرنے میں جو مشکلات پیش آ سکتی ہیں ان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ ان میں سے اکثر لوگوں کا گذران ہی سالانہ آمدنی کے بڑے حصہ پر ہوتا ہے، جیسے وہ فصل کے موقع پر حاصل کرتے ہیں، تو کامل طور پر ذخیرہ یکجا کرنے سے ان لوگوں کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اگر زمینداروں اور کاشتکاروں سے ان کا تمام عرق جمع ہونے کے ساتھ ہی گودام خانوں میں رکھوا لیا جائے تو ان میں سے کم و بیش ہزارہا اوسط درجہ کے حقدار لوگوں کو اپنے پیشوں سے دست بردار ہونا پڑیگا مذکورہ بالا کاشتکاروں کے علاوہ افیون کے دلال کمیشن ایجنٹ اور تجار بھی ہیں جو ملک میں افیون کی خرید و فروخت کے لئے تیار رہتے ہیں ان لوگوں اور ان کے عملوں کا گذران بہت کچھ اسی افیون کی تجارت پر منحصر ہے۔ اور ان کی تعداد سیاسی لحاظ سے آبادی کا غالب حصہ بنی ہوئی ہے

سرحد کی وسعت کے سبب سے افیون کی بڑی مقدار ملک میں سے خفیہ طور پر باہر چلی جاتی ہے لیکن اگر برآمد قطعاً بند کر دی جائے تو اس خفیہ کام میں اور اضافہ ہو جائے اور سا تھ منافع بھی بڑھ جائے

اس لئے جنگی کے محصول کی شرح احتیاط سے مقرر کرنی چاہیئے۔ پھر بھی عرق افیون اس کی سلائیوں اور ٹکیوں کی پیداوار کے مقام سے منزلِ مقصود تک لیجانے میں "طریقِ اجازت" (Permit System) کے اصول پر سخت نگرانی کیجاتی ہے۔

تجارت افیون پر ضابطہ قائم کرنے میں گورنمنٹ ایران کو کئی سیاسی اور خانگی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاجران افیون اور کاشتکاروں کی جماعتیں غالباً ایران میں سب سے زیادہ مالدار جماعتیں ہیں۔ اور آخرالذکر طبقہ میں کئی بارسوخ مقتدایان مذہب بھی شامل ہیں جن کے زیر اثر یا ملکیت میں اُن مقامات کا ایک معقول حصہ ہوتا ہے جو مذہبی غرض سے وقف کئے گئے ہیں۔ اس لئے افیون کی پیداوار، تیاری یا برآمد میں دخل دینے کی کوشش ان جماعتوں کی متحدہ مخالفت کا موجب بنجاتی ہے۔ تاوقتیکہ افیون کی تجارت سرمایہ اور مزدوری کے مقابلہ میں اسی قدر منفعت بخش ذرائع مہیا نہ کئے جائیں، گورنمنٹ کو انسداد کی ہر ایک تجویز میں سوداگروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی (جن کا ملک کی منڈیوں میں بڑا رسوخ ہے) افیون کی کاشت والے صوبوں کے مذہبی ملاؤں کی جنہیں سیاسی و مذہبی اقتدار حاصل ہے) اور زمینداروں کی (جو ایسے معاملات میں دہقانوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور جنہیں زمینداروں کی اکثریت والی پارلیمنٹ میں بسا اوقات قانون سازی میں دخل دینے کا حق حاصل ہوتا ہے) مخالفت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں دہقانوں کے معاملہ میں ان کے مقررہ رسم و رواج اور طریق عمل میں کوئی تبدیلی کرتے ہوئے گورنمنٹ کو اندیشہ رہے گا۔ اسی طرح افیون کی تجارت کے انسداد کے بعد امداد کے وعدوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ گذشتہ ایام میں ایرانیوں کو بڑی بے رحمی سے لوٹا گیا ہے اس لیے وہ اس قسم کے وعدوں کو خواہ وہ کسی کی جانب سے ہوں، مشتبہ نظروں سے دیکھنے میں حق بجانب ہیں۔

گورنمنٹ کے ضابطہ کو وسیع کرنے والے چند فوری تدابیر اختیار کیجاسکتی ہیں پھر بعد میں دیگر قوانین کا اجراء بھی عمل میں آسکتا ہے، بشرطیکہ پہلے تجارت افیون کی محنت اور سرمایہ کی جگہ، نیز گورنمنٹ کی آمدنی میں جو نقصانات ہونگے انکی تلافی کے لئے نئے ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ فوری تدابیر مثلاً افیون کی کاشت حمل ونقل، تیاری مقامی کھپت اور برآمد پر سخت نگرانی اور ضابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے بلا اس کے کہ گورنمنٹ یا تجارت کے خانگی مفاد پر نامناسب مشکلات عائد کی جائیں۔

افیون کی جگہ اور چیزوں کی کاشت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افیون کا چھوٹا سا رقبہ بھی

بڑا منفعت بخش ہوتا ہے، حمل ونقل کے لئے اچھے راستوں اور ریلوں کی اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ خرید فروخت کا طریقہ بھی سیدھا سادہ ہوتا ہے، اور افیون وعرق دونوں کی بڑی قیمت پر باہر سے ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ ایران کی دوسری فصل کی بہ نسبت فی ایکڑ کثیر معاوضہ دینے کے علاوہ افیون کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر افیون کی فصل اکٹھی کر لینے کے بعد دوسری فصل اسی زمین میں لگائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا قائم مقام فصلوں سے وہی مقررہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے کسانوں کو زیادہ رقبہ کی کاشت کرنے کے علاوہ پانی کا استعمال بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ نیز ان قائم مقام فصلوں کے لئے خرید وفروخت کا بازار بھی قائم کرنا ضروری ہوگا۔

افیون پیدا کرنے والے رقبے زیادہ تر انہی صوبوں میں واقع ہوئے ہیں جہاں اچھی سڑکیں نہیں ہیں، اور جہاں باربرداری گدھوں کے کاروانوں تک محدود ہے۔ اس طریقہ سے باربرداری کی لاگت وزنی اشیاء کی برآمد کو، بمقابلہ اس کی قیمت کے، روک دیتی ہے۔ اسلئے قائم مقام فصلوں کی کاشت کے لئے کم قیمت پر زاید پانی مہیا کرنا، حمل ونقل کے اقتصادی (کم خرچ) ذرائع معلوم کرنا، اور زراعت سے متعلق ایسی فنی امداد حاصل کرنا ضروری ہے جن سے بحالت موجودہ جو کاشت ممکن ہو اس سے نسبتاً زیادہ ہونے لگے۔

ایران میں کاشت کے لئے افیون کی قائم مقام مناسب اجناس ریشم، تمباکو، روئی، چقندر، چار، سن، جوٹ، اور خشک میوہ جات ہیں۔ یہ قائم مقام فصلیں قدرتی طور پر صرف افیون پیدا کرنے والے قطعات تک محدود نہیں ہیں، اسلئے ان قطعات کا خیال مقدم ہونا چاہئے، تاکہ افیون کی تجارت کے خانگی مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ لیکن ایسے قطعات میں صرف قائم مقام فصلیں، اور کاشت کی وسعت گورنمنٹ کو اتنی کافی آمدنی نہیں دے سکیں جس سے کاشت افیون کی تخفیف کے باعث پیدا ہونے والے خسارہ کی تلافی ہو جائے۔ لہٰذا غیر افیونی رقبہ میں جدید یا مزید ذرائع آمدنی مہیا کرنے کے لئے زراعتی اسباب ووسائل کی اصلاح ضروری ہے۔

موجودہ حالات کے ماتحت ایران میں افیون سازی کے اس نازک وسیاسی تار وپود کو ایسے اقتصادی فتنہ، یعنی صنعت افیون کے انسداد سے، بکھیر دینا ابتداءً ہلاکت آفریں ثابت ہوگا، تاوقتیکہ ابتدائی تدابیر اختیار نہ کی جائیں، اور احتیاط سے تجویز کردہ طریقہ عمل میں نہ لایا جائے، بدگمان کسان اس سے کم

ٹ پر راضی نہ ہوں گے۔ نیز فنی امداد اور مطلوبہ سرمایہ کا بھی اس موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔
یکل (فنی) امداد یورپ بڑے بڑے ممالک، خصوصاً امریکہ سے، حاصل کی جا سکتی ہے، اور سڑکوں
ار یلوں کی تیاری، آب پاشی، بیج خریدنے کے لئے قرض، اور زراعتی مشینوں کے لئے سرمایہ
ٹ سے آنا ضروری ہے جو افیون کے انسداد میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کم مقدار میں افیون پیدا
الے غریب ممالک سے اس تمام نقصان کو برداشت کرنے کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے جب کہ
ستعمال کرنے والے مالدار ممالک (جو خاص نفع حاصل کرتے ہیں) امداد نہ کریں۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ ہر
دی انسداد کا شاعرانہ خیال ترک کر دے کہ یہ کلیتہً ناقابل عمل ہے۔ مہمات امور میں طریقہ کار بتدریج
ہئے اور موقت مشکلات کو نہایت احتیاط سے حل کرنا چاہئے۔

سلہ افیون کا مرض کی طرح علاج کرنا مناسب ہوگا، جس پر پوشیدہ جرات کے ساتھ حملہ کرنا بہتر ہوگا۔
ایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۵ لاکھ پونڈ افیون کو قطعی نیست و نابود کرنے کے لئے درکار ہوں گے۔ چونکہ قائم مقام
ں کو رواج دیکر ملک کو وسیع بنانے پر ایران کی اقتصادی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اس لئے
یقہ سے لگایا ہوا سرمایہ ملک کی بڑھی ہوئی مرفہ الحالی کے موقع پر وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کا غیر
ں سے کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ کسی خارجی حکومت کی مداخلت کو اہل ایران نہایت ناپسند کریں گے
ے ساتھ ہی کوئی وجہ نہیں ہے کہ غیر ملکی حکومتیں ایک منظم اور باقاعدہ خانگی مہم کے لئے مالی امداد نہ دیں۔
اگر میں نے افیون کے مسئلہ کا طوالت کے ساتھ ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایران کی موجودہ
،کا اس سے بہت گہرا تعلق ہے۔

یہ میرا پختہ خیال ہے کہ ایران کا مستقبل اس کی آزادی کی سیاسی ترقی پر منحصر ہے، جس میں کسی کی مداخلت
یہ تک نہ ہو۔ تاکہ ملک میں قومی اتحاد کی روح پھیل جائے۔ لیکن اس جذبہ اتحاد کو پیدا کرنے کے لئے ضرورت
،آمدورفت اور حمل و نقل کے لئے سریع السیر ذرائع مہیا کئے جائیں، صحیح اقتصادی مہم کے لئے جو ضرورت
بلی آزمودہ کار ماہرین فن کی ہدایت حاصل کی جائے، زراعت کو ملک کی بنیادی صنعت سمجھ کر اسکو ترقی
ے، اور افیون کی بجائے اسی کے برابر نفع والی فصل لگانے کے لئے بتدریج اور متواتر کوشش کی جائے
ست افیون کے پوشیدہ خطرات سے مبرا ہو۔

ہندوستان اور اُس کی زبانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبتی چینی زبانوں کے بولنے والوں کا اصلی مسکن یانگ تسی کیانگ اور ہوانگ ہو کے بالائی میدانوں میں تھا جہاں سے ہجرت کرکے وہ ہر چہار طرف پھیل گئے تھے۔ اس ہجرت کا جہاں تک ہندوستان سے تعلق ہے یہاں تین گروہ یکے بعد دیگرے دریائی میدانوں میں سے ہوتے ہوئے دریائے ایراوڈی اور سالوین کے نشیب میں برما اور برہم پترا سے آسام میں سالوین کے فراز سے تبت میں اُتر آئے ان میں سے ہر گروہ نے اپنے پیشروؤں کو نیچے کی طرف ڈھکیل کر یا تو ساحل مقامات تک پہونچا دیا یا کوہستانی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برما اور آسام کے قدیم ترین آسٹرو۔ ایشیائی زبانوں کے بولنے والے یا تو پیگو کی آخری جنوبی سرحد کے ساحلی مقام میں پائے جاتے یا کوہستانی علاقوں میں منتشر تھے جہاں وہ حملہ آوروں کی زد سے محفوظ ہو گئے تھے۔

تبتی چینی شعبہ کی دو بڑی شاخیں سیامی چینی اور تبتی برمی زبانیں ہیں۔ ان میں سے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اول الذکر صرف برما میں رائج ہے جہاں کے دس لاکھ باشندے اسکو استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ شن قوم جسکی زبان سیامی اور اس کے ذریعہ چینی زبان سے بہت کچھ مخلوط ہو گئی ہے، یونان سے آکر یہاں آباد ہو گئی تھی، اور اب وہ ایک اہم قوم بن گئی ہے۔ ہمارے نزدیک موخر الذکر یعنی تبتی برمی کی دو بولیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں جو تبت، برما اور آسام کے بڑے حصوں اور مشرقی بنگال میں مروج ہیں۔ تمام ملک تبت اور اسکی مغربی سمت میں کشمیر تک اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس کے جنوب میں کوہستان ہمالیہ واقع ہے اور اس سلسلۂ کوہ پر متعدد نو آبادکاروں نے تاخت و تاراج کرکے بستیاں اور اس کے تمام جنوبی رُخ پر پنجاب تک قبضہ کر لیا ہے اگرچہ ہمیں اس قدیم ترین زمانہ کا علم نہیں ہے جبکہ ہندوستان پر پہلی مرتبہ حملہ آوری ہوئی تھی تاہم کئی صدیوں تک لوگ ہجرت کر کرکے یہاں آنے لگے تھے، اور ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آسام میں ایک زبردست تبتی برمی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور تیرہویں صدی عیسوی میں سیامی چینی قبیلۂ آہوم نے آسام کو فتح کر لیا تھا۔ اس وقت سے

کئی ایک حملہ آور یکے بعد دیگرے یہاں ہمیشہ آتے رہے۔ آخری حملہ قوم کچن نے کیا تھا جس کو انگریزوں کی فتح بالائی برما نے ۱۸۸۶ء میں روک دیا تھا۔

تبتی چینی زبانیں مذکورہ بالا تسنتانی سے بالکل برعکس واقع ہوئی ہیں۔ ان کی لغت میں تمامتر الفاظ واحد الہجا ہیں، یا وہ ایسے قواعد اور حروف صوتی پر مبنی ہیں کہ بعض زبانوں میں تو ایسے واحد الہجا کلمات کی تعداد ۵۰۰ یا ۶۰۰ سے زیادہ ممکن ہی نہیں ہے۔ باایںہمہ ان مفرد کلمات سے مرکب الفاظ بنانے کا ایسا عجیب طریقہ ہے جس کے ذریعہ اسمائے ذات بآسانی ادا ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم برمی اور تبتی ان دو بڑی لٹریری زبانوں کو مستثنیٰ کردیں تو تبتی برمی شعبہ کی تمام بولیاں کوہتانی اضلاع تک محدود ہوجاتی ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایسے دشوار گذار ملک میں ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ قبائل سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ اور اگر ایک دوسرے قبائل آپس میں ملتے جلتے بھی ہیں تو جنگ جویانہ طور پر کسی قطعۂ زمین پر بزور دقوت سکونت پذیر ہونے کے خیال سے، یا اُجاڑ راستوں پر اپنے وحشیانہ جذبۂ خونریزی کو فرو کرنے کے لئے، یا پھر دوسرے قبائل کے آدمیوں کو انسانی قربانی کے لئے پکڑے جانے کی غرض سے۔ غرضکہ ان مختلف قبائل میں اختلاط اور میل جول کا وجود شاذونادر اور بہت مشکل سے ہوتا ہے علاوہ بریں ایک ایسی واحد الہجا کلمات والی غیر مرتب زبان، جس کے الفاظ مختلف حالات و اسباب مثلاً مذہبی اور سختی وغیرہ کے ماتحت بدل جایا کرتے ہیں، ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ چند افراد اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک دور دراز پہاڑی پر آباد ہوگئے اور ایک یا دو نسلیں گذرنے کے بعد ہی ان دونوں کی زبانوں میں اسقدر تفاوت ہوگیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبائل کی زبانیں مختلف بولیوں، اور بولیوں سے مختلف زبانوں میں منقسم ہوجایا کرتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال تبتی برمی زبانوں کا رہا ہے جو تعداد میں تو ۱۲۰ ہیں مگر ان میں سے تبتی اور برمی زبانوں کو چھوڑ کر ہر ایک زبان کے بولنے والوں کی تعداد کا اوسط صرف ۱۷،۰۰۰ ہے جو بہت مختصر ہے۔

ان زبانوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسم اور فعل کا غیر سے وجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم انگریزی میں یہ کہیں کہ "My hand is strong" (میرا ہاتھ مضبوط ہے) تو یہاں لفظ "Hand" اسم ہوگا۔ اور اگر ہم یوں کہیں کہ "Hand me this"

(مجھے یہ دیدو) تو یہاں وہی لفظ فعل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں انگریزی میں بہت شاذ ہیں۔ لیکن تبتی برمی زبانوں کا یہ حال ہے کہ ان کا ہر لفظ اسم اور فعل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کو یہ کہنا ہے کہ "میں گیا" تو اسکو اس طرح کہیں گے کہ "میرا جانا ختم ہوا" جس میں جانا اور ختم دونوں مستقل لفظ ہیں جو نہ اسم ہیں نہ فعل مگر موقع و محل کے لحاظ سے دونوں ہو سکتے ہیں۔

تبتی برمی شعبہ کی بعض زبانوں میں اسم اور فعل کا امتیاز نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسمائے عام کی ادائگی سے قاصر ہو گئی ہیں۔ تبتی اور برمی زبانیں جن میں ادبی ذخیرہ موجود ہے بعض طریقوں (اشارات واصوات) سے ایک حد تک اس نقص سے پاک ہو گئی ہیں، مگر ابھی چین اور بنگال کے درمیان پہاڑی ملک میں قبائل کی غیر ترقی یافتہ بولیوں میں یہ نقص ابتک موجود ہے۔ بلکہ ہمیں یہاں ایسے قبائل بھی ملتے ہیں جن کی زبانیں عام اصطلاحات کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، اور اُن کا ذخیرۂ الفاظ صرف اسمائے ذات تک محدود ہے۔ ان میں اکثر زبانیں ایسی بھی ہیں، جن میں آدمی ایسے معمولی اسم عام کا مترادف لفظ بھی نہیں ہے۔ انگریز، سنگ فو، میکر، گمار وغیرہ کے لئے ان میں الفاظ مل جائیں گے، لیکن آدمی کے لئے کوئی لفظ نہ ملیگا۔ اسی طرح ان میں ایک لوشئی (Lushai) زبان ہے جس میں نو قسم کی چیونٹیوں کے نام تو پائے جاتے ہیں لیکن عام "چیونٹی" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

ایسے الفاظ جن سے رشتہ داری یا اعضائے جسمانی کا اظہار ہوتا ہے ان کا شمار اسمائے عام میں ہے۔ عام طور پر لفظ "باپ" (جو کسی خاص شخص کا باپ نہیں ہے) ایک خیال ہے جو کسی قدر غور و خوض چاہتا ہے۔ ایسے مفرد کلمات کا استعمال تبتی برمی زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ مگر باستثنائے چند ہمیشہ کسی نہ کسی شخص کے ساتھ منسوب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ ان زبانوں میں "میرا باپ"، "تیری ماں"، "اُس کا ہاتھ" وغیرہ فقرے آپ ملیں گے، مگر صرف ماں، باپ، یا ہاتھ کہیں استعمال ہوتا نظر نہ آئیگا۔ اکثر تبتی برمی زبانوں میں ہم ان فقروں کا لفظی ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً:-

"باپ فطرتاً مہربان ہوتا ہے"۔ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔

(باقی دارد)

مترجمات

لاسلکی کا اصلی موجد

مشہور پندرہ روزہ رسالہ (Woman Engineer) میں "تلغراف النتاخر" (Type Printing Telegraphy) کے موجد ڈیوڈ ایڈورڈ ہیوجز پر ایک دلچسپ مضمون پروفیسر اسپونر (Spooner) کے قلم سے نکلا ہے، ہیوجز دراصل خاندانِ ویلش کا ایک نوجوان تھا جو ۱۸۳۱ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا۔ حالت نوعمری میں اس کے والدین اُسے ممالک متحدہ (امریکہ) میں لے گئے۔ وہاں اس نے سائنس اور موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور ایک روز جبکہ وہ پیانو بجا رہا تھا اس کے دل میں تلغرات النتاخر کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے مائکروفون[۱] (Microphone) ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ سے وہ ٹیلیفون کی تکمیل میں کامیاب ہوگیا۔ پروفیسر اسپونر رقمطراز ہیں کہ:-

"مائکروفون کی ایجاد نے اس کو بعض قیمتی اور اہم تحقیقات کی طرف متوجہ کردیا اور ۱۸۷۹ء میں اس نے اپنی دو بیش بہا ایجادوں "میزان امالۂ برقی" (Induction Balance) اور آلۂ آوازپیما (Sonometer) کا اعلان کیا۔ اور اسی سال کے آخر میں اس نے امواج برقی منسوب بہ ہرٹز (Hertz) کو ہرٹز سے پہلے، آلۂ کوہیرر[۲] (Coherer) کو برانلی (Branly) سے پہلے (جیسا کہ ہیوجز نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے، جو اس نے بتاریخ ۸ رمئی ۱۸۷۸ء میں رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا تھا) اور لاسلکی کو لاج (Lodge) اور مارکونی (Marconi) وغیرہ سے قبل دریافت کرلیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے کیمبرج کے مشہور ریاضی داں اور اعزازی ناظم رائل سوسائٹی سر جارج اسٹوک سے "دماغ پر برقی رَو پیدا کرنے" کے نظریہ میں اختلاف رائے ہوجانے کے باعث یہ عظیم الشان انکشافات غیر معروف رہے۔ ہیوجز اس بات کو اپنی شکست خیال کرکے اسقدر پست ہمت ہوگیا کہ اس نے مسائل مذکورہ پر جو مضمون رائل سوسائٹی

---

[۱] وہ آلہ جس کے ذریعہ سے باریک سے باریک آواز سن لی جائے۔ [۲] یہ آلہ ایک ٹیوب کی شکل کا ہوتا ہے اور دھات کی پتیوں سے بنایا جاتا ہے جس میں امواج کہربائی گذرتے ہیں تو اس ٹیوب کی برقی مقاومت کو بہت کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ ۱۲۰

کے لئے تیار کیا تھا اس کے پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اس ہوائی تلغراف لاسلکی (Aerial Wireless Telegraphy) کا مہتم بالشان انکشاف تقریباً ۲۰ سال تک معرض خفا میں رہا۔ گر ہیوجز نے ان مسائل سے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ ۱۸۸۶ء تک برابر جاری رکھا۔"

"یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ الکٹریشین (Electrician) کے اڈیٹر کی استدعا پر ہیوجز نے تحقیقاتِ لاسلکی کے متعلق اپنی کامیابیوں کی رُوداد قلمبند کر دی جو خوش قسمتی سے تاریخی اغراض کے لئے رسالۂ مذکور مورخہ ۵ رمئی ۱۸۹۹ء میں شائع ہو گئی ہے۔ اسی طرح رسالۂ الیکٹریکل ریویو مورخہ ۱۲ رجون ۱۸۹۹ء میں ایک مضمون ہیوجز کی تحقیقات و اختبارات لاسلکی کی تعریف میں شائع ہوا تھا۔

۱۸۷۹ء سے ہیوجز کا سلسلۂ تحقیقات ایک طویل داستان ہے۔ جن کی بدولت اس کو "ہوائی امواج کہربائی" (Aerial Electric Waves) یا "لاسلکی" کے ذریعہ پیغام رسانی میں کامیابی ہوئی۔ المختصر ہیوجز ۵۰۰ گز کے فاصلہ تک پیغام رسانی میں کامیاب ہو گیا۔ گر ایک میل کے بعید فاصلہ تک اس کے اشارات صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ کثرت غاز (گیس) اور متعدد پانی کے نل بیچ میں مزاحم ہو کر اس کی لہروں کو جذب کر لیتے یا کمزور بنا دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ناقابل تردید شہادت اس بات کے ثابت کرنے کے لئے موجود ہے کہ ہیوجز، اور صرف وہی اس "ہوائی برقی تلغراف" کا موجد اور بانی تھا۔"

"اگرچہ یہ عالی دماغ شخص اپنی تحقیقات کی اوّلیت جتانے میں ہمیشہ کسر نفسی کیا کرتا تھا تاہم وہ دوسروں کے کارناموں کی بڑی فیاضی سے داد دیتا تھا۔ چنانچہ مارکونی کی دماغی قابلیت کا وہ بڑا مداح اور معترف تھا۔

(ریویو آف ریویوز)

حروفِ تہجی کی اصلیت

جدید عہدِ حجری کے کتبات

لیون یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اے۔ موریل نے وہاں کی "انجمن کتبات" کو مندرجۂ ذیل سوالات لکھ کر بھیجے ہیں:-

(۱) کیا زمانۂ قبل التاریخ کا انسان پڑھ لکھ سکتا تھا؟

(۲) کیا اسی نے موجودہ حروف تہجی ایجاد کئے ہیں؟

(۳) ہمیں معلوم ہے کہ عہد حجری کے لوگ صناع اور کاریگر تھے، انکی بنائی ہوئی فیل شعرانی (mammoth) اور برفانی بارہ سنگھے (Reindeer) کی رنگین اور منقش تصاویر آج بھی غاروں اور تہ خانوں میں محفوظ ہیں۔ مگر کیا وہ علمی و ادبی مذاق بھی رکھتے تھے؟"

حال ہی میں مقام گلوزل (Glozel) کے آثار قدیمہ کھودے گئے ہیں جن میں سے آلات، اسلحہ اور ظروف برآمد ہوئے ہیں، نیز پتھر کے بعض کتبات سے (جن کی نسبت ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ ہے) یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد حجری کے انسانوں نے حروف تہجی کا استعمال کیا تھا۔

اُن دنوں، جبکہ برفانی بارہ سنگھے ملک فرانس میں پھرا کرتے تھے، عہد قبل التاریخ کے انسان اپنے خیالات کا اظہار "حروف نقطی" سے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر موریل نے تقریباً نوّے حروف اس قسم کے دریافت کر لئے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ فینیقیا والوں نے درحقیقت اپنے حروف جدید عہد حجری (Neolithic) کے قبائل سے مستعار لئے تھے جیسا کہ ان دونوں کی قریبی مماثلت سے معلوم ہوتا ہے موسیو شالومان لیناش ڈاکٹر موریل کے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے خاص طور پر مقام گلوزل کا سفر کیا اور مٹی کے ایک طبقہ سے برآمد شدہ ایک لوح کا بچشم خود معائنہ کیا۔ انکا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ میں کسی رومی یا گالی ظروف فلزی کا نشان تک نہیں پایا گیا۔ تقریباً پچاس تختیوں پر تحریر کی باقاعدہ سطریں منقوش ہیں جن میں سے بعض فینیقی اور قدیم ترین یونانی حروف سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں اگرچہ ان کے متن کو پڑھنا ناممکن ہے۔ آجکل اس نظریہ پر گرمجوشی سے علمی بحث چھڑی ہوئی ہے۔

گاؤکشی

شدھی اور سنگھٹن کے علمبردار سوامی شردھانند نے اپنے رسالہ (Liberator) (الناجی) میں گاؤکشی پر ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"گاؤکشی کے متعلق ہندوں کا طرز عمل مجھے ہرگز پسند نہیں آیا میرا خیال ہے کہ ہندوستان

میں سال بھر میں تیس ہزار سے زیادہ گایوں کی قربانی نہیں کیجاتی۔ ایک مسلمان مذہبًا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات مسلمانوں کو بہشت میں لیجائے گی۔ مگر تقریبًا دس لاکھ گائیں اور بیل ہر سال فوجی چھاؤنیوں میں برطانی افواج کے لئے ذبح کیجاتی ہیں۔ تقریبًا ۵ الاکھ ہندوستان کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے اور چالیس لاکھ کے قریب بیف (گائے کا گوشت) اور چمڑے کی تجارت کے لئے ذبح ہوتی ہیں۔ پھر ان سب گؤکشیوں پر ایک ہندو کو کیوں اذیت نہیں پہونچتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمان قربانی کے جانوروں کی ایسی نمایش کرتے ہیں جو طیش انگیز ہوتی ہے اور اس لئے ہندو چراغ پا ہوتے ہیں لیکن پچیس لاکھ گائیں اور بیل کھلے راستوں پر سے مذبح میں ہنکا لیجاتے ہیں۔ پھر ان ہزارہا گایوں کی نمایش سے وہ کیوں برانگیختہ نہیں ہوتے؟ مسلمان (ہندوؤں کے خیال میں) اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی ثواب کا کام کر رہے۔ لیکن ہمارے ایک نادان بھائی کے کسی فعلِ نادانی پر ہمیں برانگیختہ ہونے کا کونسا موقع ہے؟ ہندوؤں کو اپنے بھائیوں کے لئے خدا سے دعا کرنی چاہئے اور اون کو سمجھانا چاہئے کہ انسانی جذبات اور نفسانی خواہشات کی قربانی۔ نہ کہ خون اور گوشت کی قربانی۔ صرف خدا کے نزدیک مقبول ہو سکتی ہے۔ اور نفرت کی بجائے ہمیں ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ روش اختیار کی گئی تو نہ صرف ہندوؤں کو چڑھانے کا یہ طرز عمل ہمارے مسلمان بھائیوں کے دلوں سے نکل جائیگا بلکہ وہ سنجیدگی سے اس امر پر غور کریں گے کہ آیا گائے کی قربانی مذہبی حیثیت سے ضروری بھی ہے یا نہیں۔ تین چار سال سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بکرا دس روپیہ سے کم پر نہیں خریدا جا سکتا۔ مگر ایک گائے جو بیس روپیہ کو خریدی جائے سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ تمام ہندو قطعاً گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ تب بکرے وغیرہ ارزاں ہو جائیں گے۔ اور مسلمان اپنے بوڑھوں اور بچوں کو گائے کے دودھ سے (جو ماں کے دودھ سے بڑھ کر ہے) محروم نہ رکھ سکیں گے"۔

سوامی جی کی اس تجویز سے ان کے ہم مذہبوں کو اتفاق ہو یا نہو مگر ہمیں ان سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن کیا سوامی جی نے اس کے امکان و عدم امکان پر بھی غور فرمایا ہے؟ ہمیں امید ہے کہ برادرانِ وطن ہمارے لئے ضرور خدا سے دعا کریں گے لیکن دعا کی استجابت کے لئے بھی سوامی جی نے کوئی عمل بتلا دیا ہوتا تو بہتر ہوتا!

حضرت مسیح ہندوستان میں

بمبئی کی بدھ سوسائٹی کے ناظم اعزازی کو مندرجہ ذیل اطلاع امریکہ سے بذریعہ تار موصول ہوئی ہے :-
امریکہ کے ایک نامور ماہر اثریات پروفیسر راورنچ (Roerich) جو امریکہ کی ایک جماعت کے ساتھ وسط ہند میں علمی و اثری تحقیقات میں مصروف ہیں، اطلاع دیتے ہیں کہ ان کو تبت کی کسی خانقاہ میں ایک قلمی کتاب دستیاب ہوئی ہے جس میں حضرت یسوع مسیح کا بودھ مذہب سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان میں تشریف لانا بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ہندوستان کی سیاحت کی اور تبلیغ کرتے رہے پھر یروشلم (بیت المقدس) واپس تشریف لے گئے۔
یہ تھیوری صحیح ہو یا نہ ہو مگر ہے ضرور دلچسپ۔ دیکھیں پروفیسر موصوف اس کے ثبوت میں کونسی واضح اور مفصل دلائل پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان ہر دو مذاہب میں بعض وجوہ اشتراک کی بنا پر بودھ مذہب عیسائیت کا ماخذ اور اصل ہے۔ اگر صرف یہی وجہ اشتراک ایک مذہب کے دوسرے مذہب سے ماخوذ ہونے کے لئے کافی خیال کرلی جائے تو بنیادی اصول مذہبی کے لحاظ سے دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے ایکدوسرے سے ماخوذ ہونیکا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

اکبر کا مذہب

(عہد مغلیہ کی تصاویر پر سے)

ریورنڈ ایچ ہراس نے جو سینٹ زیویرکالج (بمبئی) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں مغلیہ تصاویر اکبر کے مذہبی مباحثات پر، کے عنوان سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جلسہ میں بزیر صدارت سر للو بھائی شاہ نے ایک دلچسپ لکچر دیا تھا۔ جسکا ملخص حسب ذیل ہے :-
ابتدا میں مقرر نے کہا کہ وہ صناعی نقطۂ خیال سے اس موضوع پر کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ صرف ان تصاویر پر سے اکبر کے مذہبی مباحثات پر ایک تاریخی تبصرہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ مقرر نے کہا کہ یوں تو تمام تاریخ دستاویزی سندات پر مبنی ہوا کرتی ہے مگر نقوش و تصاویر بھی مستند دستاویزیں ہونیکے

لحاظ سے استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے بیان کیا کہ:۔
اکبر ایک صوفی مزاج بادشاہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان کا اتحاد تمام تر مذہبی اتفاق پر منحصر ہے لہذا اس نے مذہبی مباحثوں کو ترقی دی متعدد تواریخ سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا مزید ثبوت اس ,,عبادتخانہ،، سے ملتا ہے جسکو اکبر نے ان مباحثات کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ وہاں تمام مذہب کے نمایندے ہندو، پارسی، عیسائی۔ مسلمان، جینی اکبر کی سرپرستی میں جمع ہوتے تھے۔ ۱۵۷۳ء سے ۱۵۷۹ء تک اکبر ہندو مذہب کے زیر اثر تھا جس کی وجہ راجپوت کماریوں کے ساتھ اس کا عقد اور بیربل کی مصاحبت تھی اور دستور مہرجی رانا کے دربار اکبری میں شامل ہونیکی وجہ سے زردشتی مذہب کا اثر اکبر پر پڑا چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اکبر اپنے دل سے ایک صوفی ہے مگر وہ رسوم مذہبی کے لحاظ سے پارسی ہو گیا ہے یہ اثر ۱۵۷۸ء سے ۱۵۸۲ء تک قائم رہا۔ پھر اکبر نے اپنے دربار میں تین یسوعی پادریوں کو بلایا۔ چنانچہ ۱۵۸۲ء سے ۱۵۸۵ء تک اس کا میلان عیسائیت کیجانب رہا۔ فادر مونسٹراٹ اور فادر اکوادیوا مشہور عیسائی تھے جنہوں نے اکبر پر یہ اثر ڈالا تھا،،

اس کے بعد مقرر نے ان تین تصویروں کو جو عبادتخانہ کی تھیں پیش کیا۔ یہ تصاویر پُونا سے ہاتھ لگی تھیں جہاں غالباً عہد پیشوا میں آگرہ سے لائی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں ایک درختوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں اکبر مختلف مذاہب کے علماء کے بیچ میں بیٹھا ہوا ان کے مباحثہ میں سرگرم نظر آتا ہے۔ مقرر کا قیاس ہے کہ یہ پہاڑی کہیں فتحپور کے قریب ہوگی۔

قطعہ

سر کے ہمراہ ہے ساماں کی گرانباری بھی
نام کے ساتھ دیا مجھکو نشاں بھی تو نے
جان ہی آفت جاں تھی کہ ملی غت بھی
پیٹ کیا کم تھا، کہ دی اس پہ زباں بھی تو نے

ادبیات

حقیقت مجاز

(از جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

(۱)

ریل گاڑی آہستہ سے چلدی۔ کسی کی حسرت بھری نگاہیں پلیٹ فارم کے ایک کونہ سے اُچٹ اُچٹ کر پہلے ایک گاڑی۔ پھر دوسری، تیسری۔ چوتھی اور پھر گارڈ صاحب کی گاڑی سے ٹکراتی ہوئیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں سے رُک گئیں۔ ہاتھ اک لمحہ کے لئے آنکھوں سے پھر جُدا ہوئے۔ نگاہیں ایک دفعہ پھر اُٹھیں۔ گاڑی بہت دُور نکل چکی تھی۔ انجن کے سیاہ دھوئیں کے خفیف سے نشان آسمان پر کہیں کہیں نظر آ رہے تھے اور بس۔ محویت کا یہ عالم کہ ایک منٹ، دس منٹ۔ بیس منٹ گذر گئے پلیٹ فارم کا کونہ نہیں چھوڑا۔ کانپتا ہوا ہاتھ کوٹ کے اندر کیطرف گیا۔ جیب سے ایک چھوٹی سی تصویر نکلی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں نے اُسے غور سے دیکھا گویا تصویر کا چہرہ دُھندلا تھا دوسرے ہاتھ کے رومال سے تصویر کو صاف کیا مگر تصویر ویسی کی ویسی بلکہ کچھ اور زیادہ دھندلی تھی۔ اتنے میں خاکروب نے جو اپنے جھاڑو کے پلیٹ فارم سے مسافروں کے پھینکے ہوئے پتے۔ کاغذ۔ سگریٹ کی خالی ڈبیاں صاف کر رہا تھا۔ محمود کو ایک طرف ہٹ جانیکو کہا، اُس کے لبوں سے کچھ بڑبڑاہٹ کی آواز آئی۔ خاکروب مسکرایا۔ اور میاں محمود اپنا پلیٹ فارم ٹکٹ۔ گیٹ بابو کو دیکر لاہور اسٹیشن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

(۲)

دہلی ابھی دور تھی۔ ہر ٹھہرنے والے سٹیشن پر جہاں ریل گاڑی ٹھہرتی۔ عذرا کی نگاہیں اپنے برقعہ کی جالیوں سے چھن چھن کر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہر چلنے والے نوجوان پر پڑتیں اُسے خیال تھا کہ شاید محمود چلتی گاڑی میں سوار ہو کر اُس کے ساتھ ساتھ آ رہا ہوگا۔ کیونکہ عذرا کو ایک شریف جنٹلمین بلا تنخواہ کے نوکر کی ضرورت تھی جو اُسکے لئے ہر موقعہ ہر جگہ پر اشتہار کا کام دیتا اور وہ فقط محمود ہی اُس کی اس خاص ضرورت کو پورا کر سکتا تھا اور ساتھ

ہی اس کے وہ ہر اسٹیشن پر اترتا۔ اچھی اچھی مٹھائی۔ عمدہ عمدہ پھل سگرٹ وغیرہ عذرا کے کمپارٹمنٹ تک پہنچاتا۔ عذرا خوش ہوتی..... مگر افسوس محمود گاڑی میں موجود نہ تھا۔ شاید وہ اس کے ہمراہ دہلی چلتا اگر عذرا اُسے ایک مرتبہ بھی اپنے ساتھ لے جانے کو کہتی۔

عذرا علم موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ چہرہ پردہ نکھار موجود تھا جو دیگر بازاری حسن سے بدرجہا بہتر سیرت صورت دونوں دلفریب تھیں۔ لاہور ہی میں نہیں دور دور تک شہرت پھیلی ہوئی تھی نواب اکرم بیگ کی شادی کی تقریب پرخاص طور سے بلائی گئی تھی۔ قدرت نے اچھا کیا کہ محمود اس وقت عذرا کے ہمراہ نہ تھا ورنہ کوئی اُسے اوباش، کوئی نانک کا دل فریفتہ ایکٹر اور کوئی رنڈی کی اداؤں کا کشتہ کہتا۔

(۳)

محمود سر ڈالے رواں دواں سیدھا گھر پہنچا۔ وہ گھر جہاں اُس نے گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں قدم تک نہ رکھا تھا بہنوں نے سلام کیا۔ ماں دیکھتے ہی بسم اللہ کہہ کر اٹھی۔ دوڑی گلے چمٹ گئی۔ بلائیں لیں۔ منہ۔ سر چوما۔ پیار کیا ماں کے لئے ہزار لاکھ خوشی کی یہ ایک گھڑی تھی کہ بیٹا خود بخود گھر آیا مگر...... اُس کو ان باتوں سے کیا سروکار تھا۔ ماں کے متبرک ہاتھ گلے سے جھٹکے۔ نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے وہیں دالان میں چھوڑ اپنے اُس اوپر والے کمرہ میں آیا جو کبھی اُس کی آرامگاہ تھی۔ دم پھولا ہوا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ اوسان خطا تھے۔ دھم سے ایک خاک آلودہ پلنگ پر اوندھا گر پڑا۔ ماں کو اتنی طاقت کہاں تھی کہ دوبارہ بیٹے کے پاس آتی۔ جھڑکیاں سنتی حال پوچھتی۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا کرتی۔ بیچاری اتنی ہی خوشی میں کہ بیٹا خیر و عافیت سے گھر آ گیا ایک خط اپنے بھائی کے نام جو سیالکوٹ میں آنریری مجسٹریٹ تھا لکھ بھیجا کہ محمود اب تندرست اور روبہ صحت ہے۔ بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر نے گھر آنے کی اجازت دیدی ہے۔ کالج کی تعلیم بھی بدستور جاری کر دیگا۔ ماں تھی شاید اتنا جھوٹ لکھنا سوار کھتی آخر کیوں نہ لکھتی ان تمام موہوم کے ساتھ ایک اُمید منسلک تھی کہ بھائی کی رضامندی کی تطراس کے رشتۂ حیات کو اور زیادہ کچھ مدت زندہ رہنے دے گی۔

ادھر محمود حالتِ اضطراب میں پڑا کروٹ پر کروٹ لے رہا تھا۔ سینہ میں ایک ہوک اُٹھتی تھی اور ساتھ ہی جسم کو ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے گذشتہ خیالات اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہے تھے۔ عذرا کے ساتھ دنیا کی سیر کو نکلنا سینما کی تصویریں دیکھنا۔ تھیٹر میں ریزرو صوفہ پر بیٹھنا گویا یہ سب مناظر ایک ایک کر کے دل پر چوٹ لگا رہے تھے۔ ابھی خیالات میں منہمک وہ کبھی گم کبھی عالمِ سکوت میں پڑا رہا۔ آخر ایک سرد آہ بھری اور پلنگ سے اٹھکر

اِدہر اُدہر کچھ تلاش کرنے کے بعد ایک بکس کو کھولا۔ چند خطوط نکالے جو اُسے عذرا نے عالم ابتدا میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اور اُسے بیوفا کے نام سے موسوم کرتے ہوئے قلمبند کئے تھے۔ یہ سب عذرا کا داؤ پیچ تھا جس کو محمود بالکل نہ سمجھا خط آنکھوں کے سامنے آتے ہی ایک غبار سا اُٹھا۔ دونو انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا۔ دو موٹے موٹے پانی کے قطرے آنکھوں سے نکل کر اخساروں سے ہوتے ہوئے قمیص پر جذب ہو گئے۔ اور خط کا پرچہ اُٹھا سینہ پر چسپاں کر دیا۔ گویا وہ مجسم عذرا ہے جسے وہ سمٹ سمٹ کر تنہائی میں پیار کر رہا ہے یہ موہوم تھا اور سراسر اتہام۔ نوجوانی کی غلط کاریاں تھیں اور بداعمالیوں کی روش۔

چاہئے تھا کہ عذرا کے ان مختلف پرچوں سے محمود کچھ سبق حاصل کرتا مگر اُسے اور بھی صداقت ہو گئی کہ اُس کی محبت کے جواب میں عذرا بہت حد تک صداقت رکھتی ہے۔ محمود۔ عذرا کا فریفتہ جمال اور شکار محبت ہو چکا تھا اور حق تو یہ ہے کہ بغیر اس کے اب صبر و سکون دشوار اور محال تھا۔

(۴)

عذرا کو دہلی کے اسٹیشن پر آؤ بھگت سے اُتار لیا گیا۔ علیحدہ ایک وسیع کوٹھی میں رہنے کو جگہ تھی۔ عذرا اکیلی نہ تھی۔ ساتھ بوڑھی اماں۔ ایک چھوکرا دو دولا لہ۔ استاد طبلچی بیسیوں کی تعداد میں ہمراہ تھے۔

شام کے وقت خود نواب صاحب عذرا کی مزاج پرسی کو حاضر ہوئے ادہ باتوں باتوں میں اس امر کا اظہار کر دیا کہ دہلی اہل زبان ہونے کے باعث مشہور ہے گانے میں کہیں ایسی بات نہ رہجائے جو ہر موقعہ یا بعد از وقت پشیمانی نصیب ہو۔

مگر عذرا کوئی نادان گانے والی رنڈی نہ تھی باسمجھ تھی۔ ذہین تھی۔ خوبصورت تھی حسن کو سنوارنا خوب آتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ پڑھی لکھی تھی۔ ایک شریف مالدار نوجوان کو اپنی دامن محبت میں گرفتار کرنیکو اس میں سب سامان موجود تھے۔ دہلی کے گلی کوچہ میں عذرا کے گانے کی شہرت اور دہوم تھی۔ نواب صاحب اور بھی خوش تھے کہ اُن کے بعد اُن کے احباب کے حسب منشا گانا ہوا تھا۔ عذرا نے علاوہ مزدوری اور انعام و اکرام کے اور بہت کچھ اس قلیل عرصہ میں کما لیا تھا۔ یعنی نواب اکرم بیگ کے چھوٹے بھائی نواب اکمل بیگ کو اپنی جال اور دلفریب اداؤں میں اسقدر پھنسا لیا تھا کہ ان دو چار دنوں میں زیادہ ہر سانس کے ساتھ عذرا کا نام لیتا۔ اُٹھتا بیٹھتا۔ عذرا کی تعریف کرتا۔ گانے کی محفل ختم ہو جانے کے بعد جب عذرا رہائشی کوٹھی میں جاتی

تو نواب اکمل بیگ لوگوں کی نظریں بچا کر وہاں پہنچتا مگر کسی غیر معمولی حس و حرکت کی وجہ سے کوٹھی کے اندر داخل نہ ہو سکتا۔ اِدھر اُدھر ٹہلتا اور واپس ہو جاتا۔ مگر عذرا ان تمام باتوں سے بےخبر نہ تھی وہ اپنے کمرے کے جھروکوں سے یہ سب کچھ دیکھتی اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔

عذرا کو واپس جانے کو کہا گیا۔ شام کے وقت جب عذرا معہ اپنے آدمیوں کے دہلی اسٹیشن پر پہنچی اور گاڑی میں سوار ہوئی تو اپنی مجسّم کامیابی کو دیکھ کر فرطِ انبساط سے باچھیں کھل گئیں اور "آئیے نواب صاحب" کہہ کر کمپارٹمنٹ سے نیچے اتر آئی نواب صاحب نے ادھر اُدھر دیکھ کر عذرا کو الگ ہونے کے لئے کہا۔ ان دو چار منٹ کی ملاقات کی گفتگو کا یہ خلاصہ تھا کہ وہ اب عذرا سے کمال عشق اور محبت رکھتا ہے اور بغیر اس کے اب اس کی زندگی یقینی طور پر بیکار اور بدمزہ رہے گی۔ عذرا نے بھی حسب ضرورت محبت کا معاہدہ کر لیا۔ مکار عذرا نے اس بھولے ناتجربہ کار اکمل کی ہستی کو اپنے ڈوپٹے کے جوتے ہوئے آنچل سے آخری الوداع کہی اور گاڑی ایک آن کی آن میں دہلی سے کئی منزل دور تھی۔

(۵)

"تب مجھے حجاب اور ادب دونوں مانع ہیں کہ راز سربستہ اسطرح افشا کر دوں۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی تمہاری والدہ کے اس خط کی نقل جو چند یوم ہوئے میرے والد مکرم کے نام موصول ہوا اس پرچہ کے ہمراہ تمہاری اطلاع کے لئے بھیج رہی ہوں۔ یہ خط گو اون کی بہن کا تھا مگر آجتک مضحکہ انگیز بنا رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کو تمہارے متعلق ایک ایک بات کی خبر ہے اور جب سے تمہارا رشتہ اتحاد کسی بازاری رقاصہ کے ساتھ ہوا ہے میرے والد نے میری شادی کا بندوبست کہیں اور جگہ کر رکھا ہے۔

مجھے سخت رنج ہے کہ میری وہ خواہشات جن کے پورا ہونے کی امیدیں محض تمہارے ہی ساتھ منسلک تھیں یوں برباد ہو رہی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی عقل سے کام لیتے اور جیسا کہ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوا کرتا تھا میرے حاصل کرنے کے لئے ہر چند سعی کرتے۔ کالج کی تعلیم کو یوں نامکمل اور ادھورا چھوڑ دیا کہ فی زمانہ چار پیسہ بھی تمہاری قیمت نہیں ہو سکتی۔ میں حیران ہوں کہ اس رقاصہ کو ایک شریف نوجوان جس کے ساتھ کسی غریب بے بس لڑکی کی امیدیں وابستہ تھیں تباہ کرنے سے کیا ملا۔ کیا وہ تمہارا ساتھ دیگی؟ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے ایک چھوڑ سینکڑوں تم جیسے موجود ہیں۔

کسقدر تعجب انگیز ہے یہ منظر کہ تمہارے پاس اتنا اثاثہ بھی نہیں رہا کہ دو چار دن کے کھانے پینے کا

سامان بھی ہو سکے۔ اپنی بوڑھی اماں کو دیکھو اور اُس کے وہ دن بھی آنکھوں کے سامنے لاؤ جب اُس کا خاوند زندہ تھا۔ دیکھو اب کیا حال ہے۔ نصیبا سے پچھلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ بیچاری اس غم میں مردہ ہو رہی ہے۔

غور کرو۔ تمہارے والد کو مرے ہوئے آج ایک سال مشکل سے ہوا ہوگا۔ وہ گھر جہاں دن رات ریل پیل ہاتھی گھوڑے ہنہناتے تھے آج وہاں خاک اُڑ رہی ہے۔ چالیس ہزار کی مالیت کا مکان ان دنوں میں جب بنکر تیار ہوا تھا اور آج جس کی قیمت کچھ نہیں تو استی ہزار ہو سکتی ہے صرف پندرہ ہزار پر نیلام کر کے اُس کمبخت رقاصہ کے گھر ڈال دیا، افسوس۔ تم نے اپنی والدہ کا کوئی زیور ایسا باقی نہیں چھوڑا جو اسوقت اُس بیچاری کے کام آسکے۔ جاؤ، اب بھی وقت ہے اپنی والدہ کے قدموں کو پکڑ لو اور اپنے قصوروں کی معافی مانگو۔ کالج کی تعلیم کو از سر نو پھر جاری کر دو۔

تمہاری تعلیم کے لئے میرے والد تمکو کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے مگر جب سے اُنہیں تمہارے کارناموں کی خبر ہوئی ہے انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ میری بہن کے گھر ایک کوڑی تک نہ جائے گذشتہ دو چار ماہ جو روپیہ تمہیں پہنچتا رہا وہ سراسر میری کوششوں کا نتیجہ تھا۔

اغلب ہے اور تمہیں معلوم بھی ہو گیا ہوگا کہ میری شادی اسی ماہ کی آخری تاریخوں میں ہے اور جس سے میرا رشتہ زندگی منسلک ہونے والا ہے وہ بھی کوئی غیر نہیں۔

اس خط کے جواب لکھنے کی فضول کوشش نہ کرنا ورنہ میری بے حرمتی ہوگی اگر ہو سکا تو میں کبھی کبھی بڑی اماں کو کچھ نذر بھیج دیا کروں گی۔

اب آئندہ سے تمہاری ماموں زاد ہمشیر صغرا"

(باقی دارد)

(تصحیح کی تصحیح)

ماہ اگست کے زمان میں حضرت شاہ عالم صاحب قدس اللہ کی سنہ ولادت و وفات غلط چھپ گئی تھی۔ جس کی ستمبر نمبر کی "غلط آمیز تصحیح" کاتب صاحب کے خامۂ اعجاز رقم کی مرہون منت ہے لہذا ناظرین اس طرح درست فرمالیں سنہ ولادت ۱۴۱۸ھ سنہ وفات ۸۸۰ھ اور اس غلط نامہ میں جہاں "قوسین میں" لکھا ہے وہاں قوسین میں (خلیفہ جانیان جہاں گشت) بنا لیجئے۔

لطفِ نظّارہ

بہارِ باغ سے گو دل کو ہو جاتی ہے کچھ تسکیں
مگر جو بات دل میں ہے وہ گلشن میں نہیں ملتی
نگاہِ لطف فرما لاکھ ہو ممنونِ شادابی
نشاطِ روح کی لیکن کلی اس سے نہیں کھلتی

کسی معشوق صورت کو اگر میں دیکھ لیتا ہوں
تو آجاتی ہے دلمیں خو دبخود اک شانِ استغنا
اثر انداز اسکا حسن ہوگا کس طرح دل پر
کہ جس انداز کو دل چاہتا ہے وہ نہیں ملتا

نظر کے سامنے ہو ایک ایسا خوشنما منظر
کہ جسکی نزہت آگیں دلکشی پر جان ہو شیدا
کہ جس کی روح پرور تازگی پر دل تڑپ جائے
بھرا ہو سبزہ خودرو سے ایسا دامنِ صحرا

وہ صحرا جسکی وسعت۔ وسعتِ دل سے بھی بڑھکر ہو
نہ پہنچے جس کی مضبوطی کو استقلالِ انسانی
چلی جائیں ہزاروں پیچ وخم سے گھاٹیاں جسکی
زیادہ زلف سے ہو راستہ میں جس کے حیرانی

وہ صحرا جس کے ہوں آغوش میں بہتے ہوئے چشمے
وہ چشمے، جن سے ہو جنگل کی آبادی کو سیرابی
پڑی ہو اسطرح پھولوں کی چادر جس سے ظاہر ہو
کہ ان کے بارِ احساں سے بھی جاتی ہے شادابی

نمایاں ہو سحر سے جب شفق گوں نور کا عالم
تو ہر اک چیز میں صحرا کے ہو انداز معصومی
بہارِ خورمی کیفیتِ قلبی پہ چھا جائے
شادی خاطرِ آشفتہ سے اسباب محرومی

نشاطِ روح کے ہیں مرکزِ اصلی یہی جلوے
نہیں ہے دل کے بہلانے کا کچھ ان کے سوا چارہ
یہی جلوے ہیں، جو کرتے ہیں پیدا ذوقِ روحانی
حقیقی طور پر حاصل ہے ان سے لطفِ نظارہ

قیصر (بھوپال)

تضمین

نا اُمیدی کی ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا   اُن کے کوچے سے چلا میں دل کو سمجھاتا ہوا
شعلِ دانش سے دکھلاتا طریقِ نیک و بد

اس گلی سے جا چکا ہے بارہا ناکام تو،   پھر بھی ہے محوِ فریبِ گردشِ ایام تو
ہو چکی رسوائیوں، ناکامیوں کی اب تو حد

ہو چکیں کتنی جفائیں تجھ پہ اے ناکامِ عشق   مصلحت سے کام لے اور اب لے تو نامِ عشق
دامِ اُلفت سے رہائی کے لئے کر "جِد جِد"

دل نے برافروختہ ہو کر دیا ایسا جواب   بن نہ آیا مجھ سے کوئی اُسکی باتوں کا جواب
مصرعِ اوّل پہ چمپت ہو گیا پیرِ خرد

مجھ کو مقتل ہی ہی، دامن بھی ناداں کو ہی دو رست   میگریزم از جفائے دوست لیکن سوئے دوست
چوں شررِ خونم نہاں در تیغِ قاتل می شود

تلوک چند محروم

رباعیات

(زبان)

بک بک کی ہر اک شخص کی بیماری ہے   کیا کیجئے مجبوری ہے لاچاری ہے
جاری رہتا تھا پہلے، دلِ عارف کا،   اب دل کی جگہ، زبان ہی جاری ہے

ایضاً

چھوٹا سا یہ خنجر دل آزاری ہے   زخم اس کا ہزار تیغ سے بھاری ہے
وہ نارِ سقر، کہ جس سے سب ڈرتے ہیں   یہ سرخ زباں اُسی کی چنگاری ہے

ایضاً

صورت کی طرح طرزِ بیان اچھی ہے   تاثیر نہیں، نہو، فغاں اچھی ہے
الفاظ بڑے چڑھے مگر بے معنی   دل چاہے خراب ہو زباں اچھی ہے

ایضاً

میرے لئے ہے خدا، جہاں تیرے لئے   میرے لئے ہو مکیں، مکاں تیرے لئے
اے اپنی زباں پہ ناز کرنے والے   دل میرے لئے ہے اور زباں تیرے لئے

امجد (حیدرآبادی)

عاشقِ مجاز سے

عشق میں کس کے عاشق جانباز رنگ چہرہ کا ہو گیا ہے زرد؟
کیوں ہے مغموم، کیوں ہو پژمردہ ہر گھڑی کیوں ہو لب پر آہِ سرد؟

سوکھ ہو گیا ہے کیوں کانٹا کون سے گُل سے تجھکو الفت ہو؟
کونسا ہے وہ لالہ رخ جس نے کر دیا داغدار دل کو ترے؟

کون ایسی وہ چشم فتّان ہے اتنا جس کے لئے تو حیراں ہے؟
کس کی کاکل میں تو ہوا ہے اسیر کس کی زلفوں میں پا بجولاں ہے؟

کس کے رخسار پر تو ہے شیدا کس زنخداں کی چاہ میں ڈوبا؟
کون ایسا ہے وہ پری تمثال تیرے دل کو ہے جس نے موہ لیا؟

کیوں حسینوں پر مر رہا ہے تو کیوں پرستش تو اُن کی کرتا ہو؟
کس لئے سر کو اُن کے آگے جھکا تیرگی اپنے دل میں بھرتا ہے؟

چھوڑ دے عشق یہ مجازی ہو اسمیں ہے جان و مال کا خطرہ
نہیں حاصل بجز فضیحت کے اسمیں ہوتا ہے آدمی رسوا

عشق صادق کی ہے اگر خواہش اُس صنم سے تو لَو لگا اپنی
جس نے پیدا کیا تجھے انسان اور مخلوق پر فضیلت دی

اختر جوناگڑھی

از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی۔ اے۔ ایل ایل بی
پلیڈر۔ لاہور

دل غیور شہید نیاز ہو نہ سکا — یہ آبگینۂ رنگیں گداز ہو نہ سکا
بہت بلند رہا رتبۂ وقار حرم — مگر صنمکدۂ گل طراز ہو نہ سکا
بھڑک رہا تھا مرے دل میں ایک شعلۂ عشق — جو نذرِ ضبط ہوا۔ سرفراز ہو نہ سکا
دل نیاز کی تکمیل آرزو نہ ہوئی — شرار عشق بنا برق ناز ہو نہ سکا
سما گیا مری آنکھوں میں اشکِ خوں بنکر — جنونِ غم کا فسانہ دراز ہو نہ سکا
وقار حسن میں قایم رہی ادائے غرور — نظر فروز بنا دلنواز ہو نہ سکا
مری طرح سے غزل نغمہ ریز ہو نہ سکی — مری طرح سے کوئی گل طراز ہو نہ سکا
حرم کے گوشہ نشینوں میں جا رہا زاہد، — حریفِ شوخیِ حسنِ مجاز ہو نہ سکا

کچھ اس طرح سے پلائی کسی نے عابد کو
نہیں کہی نہ گئی۔ احتراز ہو نہ سکا

(از جناب ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

ضبطِ غم نے مضطرب کو اور مضطر کر دیا
لا دوا تھا جو مرض قلب و جگر میں بھر دیا

حسن بخشا ناز بخشا حق نے مال و زر دیا
دل حسینوں کو دیا تو ظلم کا خوگر دیا

جان و دل میں رازِ غم کا آبلہ سا بھر دیا
ضبط کی تاثیر میں اک رنگ پیدا کر دیا

آؤ راہِ چشم سے آکر تو، دل میں رہو
پردہ داروں کے لئے اللہ نے یہ گھر دیا

خاک ہوتا اُن پہ میری آہِ سوزاں کا اثر
جب خدا نے ہی او نہیں دل کی جگہ پتھر دیا

ہجر کی آتش میں جلنا دل کو بخشا عشق نے
جس سے جل جائے فلک وہ آہ میں اخگر دیا

حشر تک ساجد رہیگا آستانِ یار پر
اللہ، اللہ، با وفا، اللہ نے کیا سر دیا!!!

جانتے تھے راہِ الفت میں بھٹکنا ہے ہمیں
پھر بھلا کیوں اس کٹھن منزل میں ہمنے سر دیا

لے اُڑے عرشِ معلیٰ پر نہ کیوں شوقِ سخن
حق نے پروازِ تخیل کے لئے بے پر دیا

از ناظم الاخلاق حضرت ذہین (حیدر آباد)

عشق تو نے مشکلوں کو مجھ پہ آساں کر دیا
میری ہر اک آرزو کو وقفِ حرماں کر دیا

آتشِ الفت کی حدت میں گیا یہ دودِ آہ
رازِ پنہاں تو نے سوزِ دل نمایاں کر دیا

خود کو بیگانہ سمجھ کر کہہ دیا یکتا اُسے
جلوۂ حسنِ ازل نے مجھ کو حیراں کر دیا

زیست کی امید کب تھی کشتۂ انداز کو
اور کچھ دن عشق نے جینے کا ساماں کر دیا

دیکھتا تھا آنکھ اُٹھا کر حور کی جانب نہ میں
زالِ دنیا تو نے کیوں مجھ کو پریشاں کر دیا

رحمتِ باری کو دیکھا جوش پر میں نے ذہین
کثرتِ عصیاں نے جب مجھ کو پشیماں کر دیا

جناب منشی لشیشر پرشاد صاحب منور خلف حضرت آفق مرحوم لکھنوی

دل سے ایک آہ کی درد کا مزا لیا
صبر یوں ہزار بار ہمنے آزما لیا

صدقے اس حبیب کے جو ہو درد آشنا
گر پڑا اگر کوئی دوڑ کر اٹھا لیا

سوز و ساز عاشقی کچھ ازل سے تھا پسند
ہمنے خود ہی مانگ کر دل غم آشنا لیا

اسقدر ہے دہر میں بے وفائیوں کا زور
جل اسی نے دی ہمیں جسکا آسرا لیا

ذرہ ذرہ خاک کا مظہر جمال ہے
جس کی جستجو میں تھے اسکو ہمنے پالیا

آنکھ بند جب ہوئی عالم خیال میں
آستانِ یار کا دل نے راستہ لیا

خواہ رہکے آڑ میں خواہ آکے سامنے
کام اپنا آپنے ہر طرح بنا لیا

خون ہے خموش کیوں کشتگانِ ناز کا
کس نے اپنے ہاتھ میں خنجر جالیا

پاؤں ہے رکاب میں یہ بھی تو بتائے جا
تمنے رخت آخرت اپنے ساتھ کیا لیا

حسن بے نیاز نے دہمکیاں قضا کی دیں
جس نے انکے سامنے نام عشق کا لیا

بچ گیا منور آج ورنہ خیریت نہ تھی
درد اٹھا تھا مگر ضبط نے دبا لیا

از خاکسار عبد الرحمن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہٰذا

فلک ہے دیر سے تجویز میں بجلی گرانے کی
الٰہی خیر ہو آفت زدوں کے آشیانے کی

یہ مانا ہمنے حوران جناں بھی خوبصورت ہیں
مگر ان میں کہاں ایسی ادائیں دل لبھانے کی

چھڑا دو لاکھ لیکن چھٹ نہیں سکتی ہے اے زاہد
بری ہوتی ہے عادت دخت رز کو منہ لگانے کی

ہمیں بھی مہرباں ہو کر کبھی جلوہ دکھا دینا
نکل آئے اگر صورت کوئی صورت دکھانے کی

مری عرض تمنا پر بگڑ کر وہ یہ کہتے ہیں
کہاں ہو ہوش میں آؤ کرو باتیں ٹھکانے کی

صبا نے چال، بو و نے چرایا رنگ گلشن میں
اڑائی طرز غنچوں نے تمہارے مسکرانے کی

وہ مجھسے میرا حالِ درد دل سنکر یہ کہتے ہیں
مناسب ہے یہ عادت چھوڑ دو باتیں بنانے کی

دہان زخم دل پر بھی تبسم آہی جاتا ہے
ادا جب یاد آتی ہے تمہارے مسکرانے کی

نہیں اپنے بھی جب اپنے تو پھر کیا ذکر غیروں کا
بہت نازک ہے خوشتر آجکل حالت زمانے کی

اخبار علمیہ

جنین کی جنسیت حسب خواہش والدین

ایک حاملہ عورت کی تشخیص کا مسئلہ کہ وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی، عرصۂ دراز سے سائنسدانوں کا مرکز توجہ ہے
مگر اب تک بقول مسٹر ونسحزر (Vincent Vinci) اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں ہو سکا جسکو
سائنٹفک اصول پر تسلیم کیا جا سکے۔

آجکل اس سے بھی زیادہ اہم اور پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے میں سائنسدانوں کی ایک جماعت منہمک ہے۔
یعنی کہ جنین کی جنسیت والدین کی خواہش کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اگرچہ نباتات اور حیوانات پر اس کے
تجربات عمل میں آرہے ہیں اور ان سے بعض اہم نتائج کا انکشاف ہوا ہے تاہم ماہرین علم الانسان اور
اطبار کے مابین اس امر میں بہت کچھ اختلاف رائے ہے کہ ان تجربات کا علم انسانوں پر بھی چسپاں کیا
جا سکتا ہے یا نہیں؟

زلزلوں کی پیشین گوئی کرنیوالہ آلہ

سائنس کی عجیب وغریب اختراعات میں سب سے اہم وہ ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے زلزلۂ زمین
کی خبر فوراً معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ آلہ معمولی تھرمامیٹر کا سا ہوتا ہے۔ اس کا موجد ڈاکٹر طامس۔ اے
جیگر ہے جو علم زلزلۂ ارضی کا ماہر ہے۔ بقول اس کے یہ آلہ زلزلۂ زمین کی خبر منٹ اور سکنڈ کے
حساب سے ایسی ہی صحیح طور پر دے سکتا ہے جیسی کہ جزائر فلپائن میں طوفان کی آمد کے وقت وہاں
کا ایجاد شدہ آلہ صحیح طور پر بتا دیتا ہے۔ اس آلہ کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک حصہ زمین پر ایک پیندے
میں جما دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ عمارت کے کسی مناسب حصہ میں لگا دیا جاتا ہے۔

تصحیح رسالہ زبان بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
سرورق	۳	وَجَدْتُ	وَجَدْتَ	۲۲	۱۲	دار ویدوں کو	دار ویدیوں کو
〃	〃	ثَقَانٌ	ثَقَانٍ	۲۴	۲	شراب ملانے والوں	شراب پلانے والوں
〃	〃	نَقْلٌ	نَقْلُ	〃	۵	طلب وبیطاری	طب وبیطاری
۱	فہرست مضامین	ستوجات ۱۰	ستوجات. از قاضی محمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	〃	۹	تعقید وتکلیف	تعقید وتکلیف
۱	〃	اخبار علمیہ..."ف"	اخبار علمیہ.. از قاضی محمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	۲۵	۱۴	یاقوت ہموی	یاقوت حموی
۱	〃	کوئل سے...	کوئل سے.. از قاضی محمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	۲۶	۲	پچاس برس کردئے	پچاس برس صرف کردئے
۲	۸	مطالیات	مطالبات	۲۸	۱۹	تیسری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت	تیسری زبان کو کیا گویائی کی ضرورت
〃	〃	المنحج فی الکلام الملیح فی الطعام	المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام	۲۹	۳۰	ٹی سنڈرین	ٹی سنڈرلینڈ
〃	۱۰	دلبتگی	دلبستگی	〃	۱۸	تعلیمی مطالبہ کا اس ودر	تعلیمی مطالبہ کا اس قدر
۵	۴	مقابلۂ اختتامی	مقالۂ افتتاحی	۳۰	۲	رفتہ	رفتہ رفتہ
۶	۱	سرودیں پناہ	سرپرست دیں پناہ	۳۰	۱۵	فردکاری	مزدکاری
〃	۲	والی ریاست منگرول	والی ریاست منگرول نے	〃	۱۵	کہیں سے زیادہ	کہیں زیادہ
〃	۵	اہل نہیں ہوئے	اہل نہیں ہوتے	۳۲	۱۴	دریافت کریا	دریافت کرلیا تھا
۸	۶	پوراہ	پُر رہ	۳۳	۳	ازدوار مایا	ازدوار مایہ
۱۱	۱۰	ظلم لفلک	ظلم الفلک	۳۴	۱۲	چاپی رہی تھی	چائے پی رہی تھی
۱۲	۹	کو ابی بھی	(زائد ہے)	۳۵	۵	جرم اقرار دیا	جرم قرار دیا
〃	۱۵	فلاسفر	فلاسفہ	〃	۸	مبتلا ہولیگیں	مبتلا ہوئیں
۱۳	۵	علما سے	علما نے	〃	۲۱	بحث کیوں کریں	بحث کیونکر کریں
۱۴	۱۴	بدور اسلام سے	بدوِ اسلام سے	۳۹	۲	اہلیہ مغرمہ	اہلیہ محترمہ
۱۵	۹	اعلی الرغم	علی الرغم	〃	۱۹	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل؟
〃	۱۲	رطب اللسان ہیں	رطب اللسان ہے	۴۰	۱۲	صرف اک نظر	صرف ایک نظر
۱۶	۱۰	اسلام جو نام ہے	اسلام نام ہے	۴۱	۱	پجھنے	پچھنے
〃	۱۲	مقصد صرف ہے	مقصد صرف یہ ہے	〃	۹	پتہ دیتا ہے	پتہ دیتا ہے۔
۱۷	۲	ان اموز	ان اُمور	〃	۸	ہوا کا جھوں کا	ہوا کا جھونکا
〃	۲۱	مبارہو	مبارک ہو	۴۲	۳	بنشین	بینشیں
۱۸	۸	جس کی عقلیں	جن کی عقلیں	〃	۹	رحمت	زحمت
۱۸	۱۸	کردی ہے یہ	کردی ہے کر	۴۵	۷	محکمہ صنعت وحرفت کے	محکمہ صنعت وحرفت سے
۱۹	۸	چار سلسلہ خاندان سے	چار سلسلہ خاندانوں سے	۴۵	۹	کلیسائے پریش	کلیسائے پیرش
۱۹	۱	آزری	نزدی	۴۵	۱۰	نشوونمائی اور حفاظت	نشوونما اور حفاظت
۲۱	۸	بحرالکاہل کے پاس	بحرالکاہل کے پار			کھیل کھیلے	کھُل کھیلے
〃	۱۹	ڈاوچو اکنتا اینتائی	ڈاوچو اکنتا غنتا اینتائی				

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۵

زبانِ خلق

از جناب منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی:-

رسالہ زبان کا پہلا نمبر پہنچا آپ نے اس کو کامیاب بنانے میں جس قابلیت و عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ ہر طرح سے قابل تحسین ہے کاٹھیا واڑ جیسے مقام کو اردو علم و ادب کے جیسے قابل قدر پرچہ کی ضرورت تھی اسکو آپنے باحسن الوجوہ اپنی اولوالعزمی سے پورا کر دکھایا دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپکے ارادہ میں برکت دے اور اسکو ترقی روز افزوں نصیب کرے بالفعل دو تعلیں رسال خدمت ہیں اور آیندہ بھی انشاء اللہ قلمی معاونت میں تہِ دل سے آپکا [illegible]

از جناب مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی، پروفیسر

آپ کی ہمت مردانہ اور ذوقِ علمی کی مدح کرتا ہوں کہ باوجود رسالوں کے ناکامیاب ہونے کے آپ نے کاٹھیاواڑ ایسے ملک سے ایک ادبی اردو کا رسالہ جاری فرمایا۔ خدا اُسے مقبول کرے اور آپ کی تمنا برآئے۔

از جناب محمد ایوب صاحب شمیم بی۔ اے۔ بی ٹی۔ ایم۔ آر۔ ایس۔ اے

آپ کا رسالہ نمبر ۲ نظر سے گذرا ماشاء اللہ خوب پرچہ ہے۔ میں آپ کی اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں..... میری رائے ہے کہ حتی الوسع اعلیٰ مضامین کی فراہمی کا زیادہ خیال رکھا جائے تاکہ ناظرین کو رسالہ سے کافی دلچسپی رہے۔ اس کا خیال انشاء اللہ میں بھی رکھوں گا۔

از جناب سعید رزمی صاحب (بھوپال)

رسالہ زبان معہ گرامی نامہ کے پہنچا۔ آپ کی کامیابی مستحق مبارکباد ہے خدا آپ کی کوششوں کو بارآور کرے...... آپ نے ایک ایسے مقام سے رسالہ جاری کیا ہے جہاں اردو پر کس مپرسی کا عالم ہے اُس کی امداد ضروری ہے۔

از مولینا رشید احمد صاحب صدیقی (مرتب سہیل علیگڈھ)

زبان کی قلمی اعانت ہمارا فرض ہے آپ کے مساعی نہایت مبارک اور قابل ستایش ہیں خدا کرے آپ دقتوں سے جلد نہ گھبرائیں مجھ سے آپ نے قلمی اعانت کے لئے اصرار کیا ہے

مولینا راجکوٹی (پروفیسر عبدالعزیز صاحب) مدظلہ کے ارشادات اس پر مستزاد ہیں میں سوچتا ہوں کہ آخر کیا لکھوں
بہرحال دیکھئے اگر خدا کو منظور ہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔

مولوی عبدالستار صاحب فاروقی :-

کرمی خوشتر صاحب سلام مسنون

زبان پہنچا شکریہ اس کی تدریجی ترقی دیکھکر طبیعت کو ایک گونہ اطمینان و خوشی حاصل ہوئی ہے مجھے اس کے مضامین ان لاہوری پرچوں کے مقابلہ میں بہت پسند ہیں جن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ تو بہت ہوتی ہے لیکن مضامین تمامتر بیکار و غیر مفید۔ ان کا ہر جزو ادب لطیف جن کو کثیف کہنا زیادہ موزوں ہوگا پر مشتمل ہوتا ہے
"زبان سبھا" میں "ملارموزی" کی شرکت بہت ضروری تھی خدا کا شکر ہے کہ آپ ان کو ہمیشہ کے لئے کھینچ لائے۔ خدا نے چاہا تو اب اردو جرنلیزم کے ایوان میں زبان کو ایک مستقل سیٹ (جگہ) مل جائیگی جیسا کہ لیگ اقوام میں جرمنی کو مل گئی ہے۔ حالانکہ بہت سی حکومتیں اس کے لئے کوشاں تھیں اور ہیں اسی طرح ایوان اردو جرنلیزم میں جگہ پانے کے لئے بہت سے رسائل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن وہ منزل ابھی ان کے لئے بہت دور ہے۔

جناب سعید زرمی صاحب :-

خوشتر صاحب

رسالہ پہنچ گیا۔ کارڈ بھی ملا زبان کی ترتیب میں آپ محنت و قابلیت صرف فرما رہے ہیں۔ مضامین بھی مفید اور بلند معیار کے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ نے ایک ایسے ناموزوں مقام سے رسالہ جاری کرکے "اردو" سے اپنی محبت اور فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے خدا کرے کہ آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ اہل قلم حضرات کو آپ کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ ہرچند میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن آپ کا محبت آمیز ارشاد و اصرار مجبور کن ہے انشاءاللہ جلد کوئی مضمون پیش کرونگا۔

صفحۂ ادارت

ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے یہ ضرور کہیں گے کہ "زبان" جس نکتہ نظر سے جاری کیا گیا ہے اس نے اب تک اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیا یعنی "زبان" اہل کاٹھیاواڑ کی خدمت میں ایسے سادہ اور سریع الفہم لٹریچر پیش کرنے سے جس کو بوجہ سادگی و روانی ایک بچہ بھی سمجھ سکے عاجز رہا ہے - اس کا ہمیں بہت صدمہ ہے لیکن کیا اہل ملک نے بھی (ہمیں بار بار اس کے اعادہ سے ندامت معلوم ہوتی ہے) کبھی اپنی ذمہ داری کا احساس کیا؟

دفتر میں اس قسم کے بہت سے خط موصول ہوئے ہیں کہ "زبان کی زبان بہت مشکل اور ادق ہوتی ہے" اگر یہ شکایت درست مانی جائے تو اس حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ایک علمی رسالہ کے لئے بلحاظ نوعیت مضامین اپنی زبان اور استعمال علمی اصطلاحات سے گریز ایک ناگزیر امر ہے۔"

تاہم اگر مضامین نگار حضرات تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں تو یہ مشکل آسانی سے حل ہو سکتی ہے چنانچہ بقول سرکشن[1] لکھنوی "کیا اچھا ہو اگر اس پرچہ میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضمون چاہے وہ نظم میں ہوں یا نثر میں فارسی عطف و اضافت سے پاک ہوں ...... مجھ جیسے اور لکھنے والے، جن سے ایڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں آن سبھی سے یہی درخواست کرونگا کہ وہ جہانتک ہو سکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔"

اسی طرح عربی و فارسی کے ایسے ادق اور دشوار الفاظ جن کے ہم معنی و مترادف الفاظ ہندی اردو میں موجود ہوں استعمال نہ کریں اور سادہ اور متعارف الفاظ تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی ادائے مطالب کا پورا پورا لحاظ رکھیں تو ناظرین زبان کے لئے بہت کچھ سہولت اور آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ امید کہ ہمارے مقالہ نگار آیندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

اڈیٹر

---

[1] دیکھو زبان بابت اگست زبان خلق کے آخر پارے - ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہ نومبر ۱۹۲۶ء

مقالات

ناصر الدنیا والدین ملک نائب خسرو خاں گجراتی

(از مولینا ابو ظفر صاحب۔ ندوی پروفیسر گجرات مہاودیالہ احمد آباد)

ذیل کا گراں بہا تاریخی مضمون مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے ہماری استدعا پر توجہ فرماکر زبان کے لئے مرحمت فرمایا جس کے لئے ہم ان کی خدمت نہایت خلوص کے ساتھ ہدیۂ شکریہ پیش کرتے ہوئے امیدوار ہیں کہ آیندہ بھی زبان کے صفحات کو تاریخی معلومات سے مالامال فرمائیں گے۔

موصوف کا نام دنیائے ادب میں ہماری تعریف و توصیف سے مستغنی ہے آپ دار العلوم ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اور اردو کے ایک زبردست انشاپرداز ہیں کچھ عرصے سے آپ احمد آباد کی گجرات مہاودیالہ کے پروفیسر ہیں۔ "گجرات کی ایک مکمل و مبسوط تاریخ اردو میں تالیف فرما رہے ہیں جس سے امید ہے کہ اردو کے سرمایہ میں ایک نمایاں اضافہ ہوجائے گا۔

ایڈیٹر

خسرو خاں گجراتی کو تاریخ میں لوگوں نے بہت کم وقعت دی ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب ناجائز طریقہ سے حصول حکومت ہے۔ یا یہ کہ بہت ہی پیچ قوم کا آدمی تھا۔ لیکن یہ دونوں جرم کچھ ایسے مہا پاپ نہیں

ہیں۔ جن کا ارتکاب صرف خسرو خاں گجراتی ہی نے کیا ہو۔ بلکہ نظر غور سے دیکھو تو دنیا کا کوئی حصہ ایسے اولوالعزم فاتح کی تاریخی مثالوں سے خالی نہ ہوگا۔ قیصر، نپولین، سبکتگین، قطب الدین ایبک، چنگیز، نادرشاہ ان میں سے کون اعلیٰ خاندان رکھتا تھا۔ مول راج سولنکی اور علاء الدین خلجی نے تخت و تاج ٹھیک اسی طرح حاصل کیا۔ جیسا خسرو خاں نے۔ خسرو خاں گجراتی نے قطب الدین کی غفلت سے جو فائدہ اٹھایا وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ ذاتی حیثیت سے اپنی قوم اور ملک کے لئے جس طرح عقل و فراست سے کام لیا۔ اس کے باعث اس کے فخر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ بعض موانع کے باعث وہ مقدم الذکر اشخاص کی طرح دنیا کا کامیاب بادشاہ نہ ہو سکا۔

نام و نسب و قوم کی تحقیق

یہ شخص گجرات کا رہنے والا تھا۔ اور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا وطن اصلی نہروالا پٹن کے پاس تھا۔ اس کے عروج کے زمانہ میں جبکہ بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا جارہا تھا۔ اس کے آس پاس تمام رشتہ دار نظر آتے ہیں۔ لیکن قریب ترین رشتہ دار یعنی باپ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدا عمر میں وہ فوت ہو چکا تھا۔ مذہباً یہ ہندو تھا۔ اس کی ذات کے متعلق مورخوں کی رائے مختلف ہے۔ مورخ برنی اور فرشتہ نے "پرواَر" بہ بار فارسی لکھا ہے۔ اور پرواری قوم گجرات میں ڈھیر (بھنگی) لوگوں کو کہتے ہیں۔ بدایونی نے "برواَر" بہ باء عربی تحریر کیا ہے۔ اور گجرات گزیٹیر نے اسی کی تشریح کی ہے۔ کہ بروار، گجرات میں ایک شاخ کاٹھی اور اہیر وغیرہ کی ہے۔ جس کو بابریا بھی کہتے ہیں، یہ لوگ عموماً ملازم پیشہ ہوتے ہیں۔ گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ نے بھی بروار ہی لکھا ہے۔ بعض لوگوں نے "پرمار" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ راجپوتوں کی شاخ سے جو گجرات اور مالوہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عام مورخین اس پر متفق ہیں کہ خسرو خاں ادنیٰ قوم (ذات) کا آدمی تھا۔ اور راجپوتوں کی ذات ادنیٰ میں شمار نہیں کیجاتی۔ میرے خیال میں لفظ پروار، اور، بروار دونوں کی اصل "بھرواڑ" ہے۔ جو فارسی اور عربی قالب میں ڈھل کر پروار اور بروار ہو گیا ہے۔ گجرات میں "بھرواڑ" قوم بکثرت ہے۔ جن کا پیشہ بھیڑ، بکریاں چرانا ہے۔ اردو میں اس کے لئے لفظ "گڈریا" کا ہے۔ ہندو قوم ان کو نیچ ذات سمجھتی ہے۔ یہ لوگ مالوہ اور مارواڑ سے لے کر بمبئی تک بکریاں چراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ایسا ہے کہ خسرو خاں اسی قوم بھرواڑ

میں سے تھا یہ قوم جنگلوں میں زندگی بسر کرنے کے سبب دلیر، بہادر، اور باہمت ہوتی ہے۔

پرورش و تعلیم

خسرو خاں کے باپ کی طرح خود اُس کا بھی اصلی نام پروۂ خفا میں ہے۔ اس کا مذہب کسی طرح تبدیل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی تربیت اور صحبت سے متاثر ہو کر اس طرف مائل ہوا۔ غالباً بکریاں چرانے کے سلسلہ میں اس کا خاندان مالوہ نکل گیا تھا۔ کہ جنگ مالوہ شروع ہوئی اور اسیر ہو کر دہلی لایا گیا۔ اور ملک شادی حاجب سلطان علاء الدین نے اس کی پرورش کا بار اپنے سر اُٹھالیا تبدیل مذہب کے بعد اس کا نام "حسن" رکھا گیا۔ مورخوں نے عہد علائی میں متذکرہ بالا بیان کے سوا اور کسی قسم کا تذکرہ نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عہد علائی میں یہ غیر معروف رہا۔ جس کا سبب یا تو یہ ہو کہ صغیر السن ہونے کے باعث کسی کام میں دخل نہ دے سکا۔ اور یا یہ کہ بڑے بڑے جنرل اور تجربہ کار اشخاص اُس عہد میں موجود تھے۔ جن کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض ۷۱۶ھ میں جب سلطان قطب الدین تخت دہلی پر قابض ہوا۔ تو حسن قطب الدین کے دربار میں باریاب ہوا۔ ملک شادی کے زیر نگرانی اس نے جو ترتیب حاصل کی۔ اب اُس کے اظہار کا وقت آگیا تھا۔ چنانچہ یہ تفصیل اُس کے کارنامے لکھے جاتے ہیں۔ رسمی علوم و فنون کے متعلق تاریخ کی زبان گنگ ہے۔ لیکن جنگ تعلق اور مدراس کے حملوں میں جو کارنامے تاریخ کے صفحوں پر ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن جنگ میں وہ کافی ماہر تھا۔ اور زمانہ کے عام مذاق کے مطابق اس میں خوب مہارت بہم پہونچائی تھی۔

عام حالات و واقعات

۷۱۸ھ میں قطب الدین خلجی جب دیوگڈھ کی بغاوت فرو کرنے گیا۔ تو خسرو خاں حسن ساتھ تھا۔ اس کے حسن لیاقت اور کارہائے نمایاں کو دیکھ کر سلطان قطب الدین نے "خسرو خاں" کا خطاب عنایت فرمایا۔ اور اس کی بڑی عزت افزائی فرمائی۔

اگرچہ مورخ ضیا برنی نے خسرو خاں گجراتی کے متعلق اکثر مقامات پر متعصبانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ادنیٰ فکر و غور سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ کے اقتضار سے جو کچھ خسرو خاں گجراتی نے کیا وہ صحیح کیا۔ سلطان قطب الدین اپنے باپ سلطان علاء الدین کی طرح جو ملک کافور کا بیحد گرویدہ ہو گیا تھا۔ خسرو خاں پر بہت زیادہ مہربان نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب دیوگڈھ سے واپس ہوا۔ تو دوسرے تجربہ کار اشخاص کی موجودگی میں خسرو خاں کو چتر اور دورباش دیکر تلنگانہ اور معبر (مدراس)

روانہ کیا۔ علاءالدین نے جس طرح ملک کافور کو با اختیار کرکے ملک دکن پر حاوی کردیا تھا۔ قطب الدین
نے بھی خسرو خاں گجراتی کو معبر کا مختار کل بنادیا۔ خسرو خاں گجراتی بڑے ساز و سامان کے ساتھ مع امراء
دولت دیوگڈھ سے پہلے تلنگانہ میں آیا۔ اور وہاں کے راجہ سے بعد محاصرہ ایک سو سے زیادہ ہاتھی اور
بے شمار مال و دولت وصول کرکے "متھلی" کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں سے بھی نو سو بیس [۹۲۰] ہاتھی اور
ایک ٹکڑا الماس کا جو وزن میں چھ درم تھا لے کر معبر پہونچا۔ موسم[۵۱] برسات آگیا تھا اسلئے اس نے اسی جگہ
چند روز قیام کیا۔ اسی مقام پر ایک مسلمان تقی نامی سوداگر بڑا مالدار تھا اس نے صرف یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں
کا لشکر یہاں آیا ہے۔ جو مسلمانوں کو نہیں ستانے کا۔ اسی جگہ مقیم رہا۔ خسرو خاں گجراتی نے اس کو گرفتار
کرلیا۔ اور اس کا تمام مال ضبط کرکے داخل خزانہ شاہی کیا۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہ مظلوم مسلمان باوجود
ان تمام مصائب کے بھی اپنی زندگی کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ خسرو[۵۲] خاں گجراتی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ قطب الدین
کی بدمستی اور عیش پرستی کو دیکھ کر ملک کافور کی طرح اس میں خود مختاری کی ہوس پیدا
ہوئی۔ اور ایسا ہونا اس عہد کے لحاظ سے ایک قدرتی بات تھی۔ ایک ادنیٰ شخص کو اس قدر جلد بڑے
بڑے عہدے اور خطابات دیئے گئے ہوں اور پھر ایک جرار لشکر اس کے ماتحت ہو۔ مال و دولت کا
انبار بھی سامنے لگا ہو۔ اور پایہ تخت سے دور ایک خود مختار حاکم کے مثل رہتا ہو۔ تو اسکے دل میں ایسی
خواہش کا پیدا ہونا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ بعض ہندوں اور ملک کافور کے بقیہ لوگوں کو
ملاکر اس امر کے لئے مشورہ کرنے لگا۔ خسرو خاں گجراتی جب تک معبر میں رہا دن رات اسی دھن میں
لگا رہا۔ کہ کس طرح تمام امراء سلطنت کو ملالیا جائے۔ یا خاتمہ کرکے خود مختاری کا اعلان کرے۔ جب یہ
مشورہ عام طور پر مشہور ہوگیا۔ اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ تو فوجی سرداروں میں سے ملک تمر،
ملک تلبغہ یغدہ نے خسرو خاں گجراتی کو پیغام بھیجا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم بغاوت کا ارادہ رکھتے ہو۔ اور
یہاں سے واپسی کی نیت نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے اور قبل اس کے کہ ہم تم کیجا
ہوں۔ بہتر ہے کہ تم واپسی کا ارادہ کرلو۔ اسی طرح ڈرا دھمکا کر خسرو خاں گجراتی کو واپسی پر مجبور کیا۔
بموجب حکم سلطانی خسرو خاں کو دیوگڈھ سے پالکی پر سوار کراکر سات دن میں دہلی پہونچا دیا گیا۔ قطب الدین شاہ

---

۵۱ بدایونی صفحہ ۲۱۲ جلد ۱-۱۲

۵۲ یہ تمام کام ایسے ہوئے جیسے نصرت خاں نے کھمات فتح کرتے وقت تاجر بغدادی کے ساتھ کیا-۱۲

اس کو دیکھتے ہی نرم ہو گیا۔ اس کے حسن خداداد اور چرب زبانی سے مسحور ہو گیا۔ اس نے بھی میٹھی میٹھی باتوں
سے اُمرائِ کبار کی سخت شکایت کی۔ اور اپنی سرکشی کے الزام کو اس طرح دور کیا۔ کہ یہ امرائِ کبار مجھ پر بغاوت
کا جھوٹا الزام صرف اس لئے عائد کرتے ہیں کہ وہ فضیلت جو ان پر آپ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔
انہیں پسند نہیں۔ اور اس لئے مجھے آپ کی نظروں سے گرانا چاہتے ہیں اور یہ سب گواہ جھوٹے
ہیں۔ بادشاہ نے یہ سب سچ سمجھ کر گواہوں کو مروا ڈالا۔ اور امرائِ دولت کی سخت توہین کی۔ اور اُن میں سے
اکثر کی جاگیریں واپس لے کر خسرو خاں گجراتی کو دیں۔ ان باتوں سے تمام امرائِ دولت خوف زدہ
ہو گئے۔ اور بضرورت زمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ جب خسرو خاں نے دیکھا کہ اب زمانہ ہمارے موافق
ہو گیا ہے۔ تو اس نے ۱۸ ۷ھ میں بادشاہ سے شکایت بیجا کر کے ملک دینار ظفر خاں کو گجرات سے
طلب کرا کر قتل کروا دیا۔ اور اس کے بجائے اپنے بھائی (ملک حسام الدین) کو گجرات کا گورنر بنا کر
بھجوا دیا۔ یہ کارروائی ایک خاص غرض سے کی گئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ خسرو خاں گجراتی نے
جب دیکھا کہ جو خود مختاری کا خواب معبر میں دیکھا تھا بدقسمتی سے اس کی تعبیر غلط نکلی۔ لیکن زمانہ کے
موافق ہوتے ہی پھر جنون شروع ہوا۔ اور اس دفعہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ دور کی سوچی۔
یعنی گجرات جو وطن ہے۔ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ وہاں دولت حاصل کر کے اور فوجی
بھرتی کے ذریعہ خاص وطن میں ہموطنوں کی امداد سے خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اور گمان یہ تھا
کہ یہ کام بآسانی حاصل ہو جائیگا۔ اور اسی لئے بے چارہ ملک دینار کو قتل کروا دیا۔ اور اپنے بھائی حسام الدین
کو دولت اور فوجی طاقت حاصل کرنے کے لئے گجرات کی گورنری دلوائی۔ لیکن نالائق ہونے کے
سبب اس کام کو انجام نہ دے سکا۔ بلکہ سچ پوچھو تو نقصان پہونچایا۔ قطب الدین کی آنکھیں ہوتیں
تو خسرو خاں گجراتی کے دونوں فریب ظاہر ہو جانے پر کافی بندوبست کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بادۂ غفلت
میں اس طرح مست تھا۔ کہ اس وقت بھی مدہوش رہا۔ اور خسرو خاں گجراتی اور حسام الدین گجراتی پر
ایسا ہی بھروسہ کرتا رہا جیسا باپ کو لڑکے پر یا عاشق کو محبوب پر ہوتا ہے۔
خسرو خاں گجراتی نے دیکھا کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ اور حسام الدین گجرات میں کوئی خود مختار
سلطنت قائم نہ کر سکا۔ جس کی خسرو خاں گجراتی کو دلی خواہش تھی۔ دونوں مرتبہ تجربہ سے ثابت
ہو گیا۔ کہ پایہ تخت سے باہر ابھی علائی سردار موجود ہیں جو کام بننے نہیں دیتے ہیں۔ اسلئے اِس بار

ذرا زیادہ بلند پروازی سے کام لیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کا مل صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ امراء دربار کو ذلیل کرکے دہلی سے باہر نکال دیا جائے۔ یا اپنے ساتھ مل جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور پھر قطب الدین کو مار کر تخت پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ کر ہمت چست کرکے بلند حوصلگی کے ساتھ دلیرانہ اس کام کو انجام دینا شروع کر دیا۔

پس علاء الدین کے عہد کے بڑے بڑے امراء روزانہ سر دربار ذلیل کئے جانے لگے۔ تو بہ نامی گجراتی بھاٹ امراء دولت سے ذلیل طور پر مسخری کرتا جس کا انجام آخر کار یہی ہوا۔ کہ کچھ لوگ خسرو خاں سے مل گئے۔ اور کچھ لوگ خانہ نشین ہو گئے اور انھوں نے دربار کی حاضری موقوف کر دی۔ اور بعض جاگیرانی اپنی جاگیروں پر چلے گئے جب میدان خالی ہو گیا تو دربار میں ادنیٰ درجہ کے لوگ اپنی قوم میں سے بھرنا شروع کر دیا۔ ایک دن موقعہ پاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور کی مہربانی سے بڑے درجہ تک پہنچ گیا ہوں۔ دور دراز ملکوں میں اپنے فتوحات کا ڈنکا بھی بجا چکا ہوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ امراء دولت مع اپنے خویش و اقرباء کے جاہ و حشم کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ اجازت ہو تو میں بھی گجرات سے اپنے رشتہ داروں کو بلا کر حضور کی مرحمت کا سزاوار بناؤں۔ اور اس بہانہ سے اس نے اپنے تمام رشتہ داروں کو طلب کرکے سارا دربار ان سے بھر دیا۔ اسی درمیان بادشاہ شکار کے لئے "سرساوہ" گیا لوگوں کی رائے ہوئی کہ اسی شکار گاہ میں سلطان کا شکار کیا جائے۔ لیکن بہاء الدین دبیر، یوسف صوفی، تیسر قرہ قیمار وغیرہ نے اس سے منع کیا۔ اور کہا کہ اگر بادشاہ یہاں مارا گیا تو اسلامی لشکر ہم سب لوگوں کا شکار کرے گا۔ اور ایک بھی زندہ نہ بچیگا۔ اور ہم لوگوں کو پناہ کی جگہ نہ ملے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ بادشاہ کو کوشک ہی میں قتل کیا جائے۔ اور بوقت ضرورت کوشک ہزار ستون کو پناہ کا مقام بنایا جائے۔ چنانچہ جب بادشاہ دہلی آیا۔ تو اس کی تیاری شروع کر دی ۷۲۰ھ میں گجرات کی صوبہ داری اپنے نام کرالی۔ اور پھر گجرات اور بھیل واڑے سے فوجی بھرتی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں فوجی طاقت جمع کرکے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ باہر نکلنے لگا۔

(باقی دارد)

ہندوستان اور اس کی زبانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

البتہ بعض زبانیں ایسی ہیں جن کو اس نقص کا احساس ہو گیا ہے، اور وہ اس کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان سے ہمیں اس امر کے مطالعہ کا بخوبی موقع ملتا ہے کہ کس طرح ایک وحشی قبیلہ اپنی زبان کو ترقی دیتا، اور وسیع بنا کر اعلیٰ اور عام خیالات کے اظہار کے قابل بنا دیتا ہے۔ عام بول چال میں "میرا" اور "تیرا" کی بجائے صیغۂ واحد غائب کی ضمیر زیادہ مستعمل ہے، اسی طرح ان میں کی بعض زبانوں میں "اس کا" کا استعمال بالکل غیر معین طور پر ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہ ایک بے معنی لاحقہ ہے جس کا استعمال ہر اسم عام کے ساتھ غیر معین طور پر جائز ہو گیا ہے۔

اسی طرح ان زبانوں میں کوئی نحوی قاعدہ نہیں ہے جو ضمیر موصول کا قائم مقام کہا جا سکے مثلاً ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "وہ آدمی جو کل آیا تھا" تو ہم کو اس طرح کہنا پڑیگا کہ "وہ کل آنے والا آدمی" البتہ بعض وہ زبانیں جن کو آرین زبانوں سے اختلاط کا موقع ملا ہے ضمیر موصول کا ٹھیک انگریزی کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ بعض قبائل اس ضمیر کی سہولت کا احساس کرتے ہوئے اپنی زبانوں میں اوسکو اختیار کرنے لگے ہیں۔ وہ طریقہ جس کے ذریعہ انھوں نے اس مشکل کو حل کیا ہے ہمارے لئے اس بات کی ایک قابل غور مثال ہے کہ کس طرح دور و دراز ملکوں میں بھی ایک انسانی دماغ اسی مسئلہ زبان بالکل یکساں طریقہ سے حل کر لیتا ہے جیسا کہ ہم نے انگلستان میں ضمیر استفہام ([illegible]) کو ضمیر موصول کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح آسام کے قبیلہ لھوتا ناگا ([illegible]) نے ہمسایہ قبائل کی زبان کی امداد کے بغیر اس مطلب کو ادا کر لیا ہے۔ اگر انکو یہ کہنا ہو کہ "آپ جو چاہتے ہیں لے لیں" تو وہ جو کچھ کہیں گے اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا:-

"آپ کیا لینا چاہتے ہیں لے لیں"

تبتی برمی کے بالکل برعکس آرین زبانیں ہیں جن کو بائیس کروڑ تیس لاکھ شمالی اور مغربی ہندوستان کے

لوگ (جو تقریباً یورپ کی نصف آبادی کے برابر ہیں) استعمال کرتے ہیں۔ یہ آرین زبانیں جو ہماری یورپین زبانوں سے ایک طرح کی قرابت بعیدہ رکھتی ہیں ہمارے (یورپین) خیال کے مطابق ایک کثیر ذخیرۂ الفاظ اور نحوی قواعد پر مشتمل ہیں۔ اور ہر اس خیال کو جس کا ادراک نفس انسانی کر سکتا ہے، نہایت صفائی اور شستگی کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان زبانوں کے پھیلنے بلکہ ہندوستان میں داخل ہونے کی صحیح تاریخ بھی ہمیں معلوم ہے۔ آرین زبانیں اس زبردست انڈو یورپین خاندان کی ایک شاخ ہیں جس کی دوسری شاخیں یورپ کی مختلف زبانیں لاطینی، یونانی، انگریزی وغیرہ ہیں۔ انڈو یوروپین زبانوں کے اصل مسکن کا مسئلہ جہاں سے کہ وہ یورپ اور مغربی و جنوبی ایشیا میں پھیل گئیں، برسوں تک زیر بحث رہا ہے۔ ہم لوگ عام طور پر پروفیسر میکس مولر کی اس محفوظ رائے سے واقف ہیں کہ "انکا مسکن ایشیا میں کہیں ہے" لیکن اس رائے کے بعد اور مقامات کے نام بھی پیش کئے جاتے ہیں، اِن میں سے ایک مقام جنوبی روس کا میدانی ملک ہے جس کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے اور جس کی بعض علماء اب بھی تائید کر رہے ہیں۔ اس سے متعلق جدید ترین نظریہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ جائلز نے "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اُن کا یہ نظریہ نباتات اور حیوانات کی تقسیم پر (جن کے نام قدیم الایام سے چلے آتے ہیں) تاریخ طبقات الارض، اور اُن تحقیقاتِ جدیدہ پر مبنی ہے جو حال ہی میں ایشیائے کوچک میں کی گئی ہیں۔ اس بنا پر وہ ان قبائل کے انتشار و افتراق کا مرکز اقصائے شمال مغرب میں ایک ایسے مقام کو قرار دیتے ہیں جسے موجودہ آسٹریا ہنگری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہیں سے وہ قبائل شمال، جنوب، اور مغرب، کی جانب پھیل گئے، جن کی زبان کی نمایندگی اس وقت مذکورۂ بالا السنۂ یورپ کر رہی ہیں۔ دوسرے وہ قبائل جو پے در پے حملے کرتے ہوئے درۂ دانیال کو عبور کرکے ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہوئے اسی طرح ان یورشوں کا حال جو ان سے پہلے بار بار وقوع پذیر ہوئیں، تاریخ قدیم میں درج ہو چکا ہے۔ ان خانہ بدوش قبائل میں سے بعض کے وجود کا شمالی الجزیرہ (میسوپوٹامیہ) تک پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ دو ہزار سال قبل مسیح میں قوم منداد ( ) یا میڈیا والوں کے نام سے ایران کے شمالی مغربی میں قدیم شہر بلخ (میڈیا) اور اس کی نواحی میں نظر آتے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی بحث طلب ہے کہ آیا یہ لوگ یہاں پر براہ راست ایشیائے کوچک سے آئے تھے یا کسی اور راستہ سے۔ لیکن اس بات سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاریخ مذکورہ میں یہ قوم یہاں موجود تھی۔ اُن ناموں اور الفاظ سے جو کتبات اور فرمانروایانِ مصر کے مراسلات

میں پائے جاتے ہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایشیائے کوچک کی حِتّی ( ) قوم سے بھی ان کا تعلق تھا۔ جدید خیال کے مطابق وہ منڈا یا نیڈیا والے ہی تھے جنھوں نے آریاؤں کے نام سے ایران پر تاخت و تاراج کی اور انھی میں سے ایک گروہ آگے بڑھتا ہوا افغانستان کے راستہ سے ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا۔ ہندوستان کی سکونت سے اس گروہ کے لوگ اپنے ایرانی بھائیوں سے بالکل دور افتادہ اور بے تعلق ہو گئے۔ اور ہر چہار طرف اپنے مخالف قبائل سے گھرے ہوئے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی زبان کو اسی طرح پاک و صاف رکھا جس طرح میکسیکو اور پیرو کی اسپینی زبان موجودہ اسپینی زبان کی بہ نسبت سولھویں صدی کی زبان سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور آئرلینڈ کے ادنیٰ طبقہ کی زبان عہد الزابتھ کی انگریزی زبان کو یاد دلاتی ہے۔

منڈا قوم کے ہندوستان میں آنے والے لوگوں کو یہاں کے درآیدیوں اور منڈا قوم کے اُن قبائل سے سخت مقابلہ کرنا پڑا جو ہندوستان میں ان سے بہت پہلے سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ اور جنھوں نے ان کی بہت کچھ روک تھام کی لیکن یہ رفتہ رفتہ پنجاب میں پھیل گئے، گنگا کے وسیع میدانوں کو طے کرتے ہوئے بنگال کے قریب تک جا پہونچے، اور مغربی ساحل کی طرف گوا تک پہنچ گئے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ملک کے اصلی باشندوں سے ان کے ازدواجی تعلقات قائم ہوتے رہے یہاں تک کہ بنگال کے ہر باشندہ کے جسم میں آرین خون کی کچھ نہ کچھ مقدار باقی ہے۔ لیکن ان کی زبان یہاں بھی ویسی ہی خالص جس کو انہوں نے مفتوح اقوام میں رائج کر دیا۔ تبتی برمیوں کی طرح آریہ بیک وقت ہندوستان نہیں آ گئے تھے بلکہ وہ گروہ در گروہ کئی صدیوں تک ہندوستان میں داخل ہوتے رہے۔ اور اس لئے لازمی طور پر بعد میں آنے والوں کی زبان ان کے پیش رُوں کی زبان سے مختلف تھی۔ چنانچہ یہ فرق آج تک بھی برابر قائم ہے جو ان کی اولادوں یعنی ہندوستان کی موجودہ بولیوں میں پایا جاتا ہے۔ بعض زبانیں جیسے ہندوستانی (اردو) وغیرہ انگریزی کی طرح آسان سلیس اور رواں ہیں، اور بعض جیسے مرہٹی وغیرہ قواعد کی زنجیروں میں اسی طرح جکڑی ہوئی ہیں جیسے کہ ہم یورپین زبانوں میں جرمنی کو دیکھتے ہیں۔

ہندوستان کی آرین زبانیں عام طور پر انڈو آرین کہلاتی ہیں اور ان کی قدیم ترین شکل جو ہمیں معلوم ہے وہ سنسکرت زبان ہے۔ قدیم ترین بولیوں میں جو صدیوں تک زبانی منقول ہوتے رہنے کے بعد وید کے گیتوں میں نمودار ہوتی ہے وہ غالباً وہی آرین زبان ہے جو آریاؤں کی اولین ہجرت ہند

ے پہلے ایران میں بولی جاتی تھی۔ بعد میں اس زبان نے جو صورتیں اختیار کیں وہ اس آرین زبان کو
ں کرتی ہیں جو اس وقت اس مقام کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی جسے اب دہلی کہتے ہیں۔ اس زبان
ں ایک کثیر ذخیرۂ ادب موجود ہے جس کا تذکرہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ اسی زبان
راس کی متعلقہ زبانوں سے موجودہ انڈو آرین زبانیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں بڑی زبانیں یہ ہیں:۔

۱) **ہندی**۔ اس میں مختلف بولیاں لکھی جاتی ہیں، مشہور ہندوستانی اردو زبان بھی اسی میں شامل ہے۔ پنجاب اور بنگال کے مابین وادی گنگا کے تمام باشندوں کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۹ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ جو ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔

۲) **بنگالی**۔ ملک بنگال میں بولی جاتی ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کے بولنے والے پانچ کروڑ ہیں۔

۳) **مرہٹی**۔ بمبئی اور اس کے مشرق اور جنوب کے ملک میں مروّج ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ نوّے لاکھ ہے۔

۴) **گجراتی**۔ ملک گجرات میں بولی جاتی ہے جو بمبئی کے جنوب میں واقع ہے۔ ایک کروڑ آدمی اس کو بولتے ہیں۔

۵) **پنجابی**۔ ملک پنجاب میں مستعمل ہے۔ بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔

ان تمام زبانوں کا اپنا مستقل لٹریچر ہے جس کی ابتدا ہمارے ازمنۂ متوسطہ سے ہوتی ہے۔
نکا ادب اس زبردست شاعری کو اپنے دامن میں لئے ہوئے، جو خاص ایشیا کی پیداوار ہے
ہایت خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔

اس آخری ہجرت ہند کے بعد ان آریاؤں کی زبان جو ایران میں پیچھے رہ گئے تھے، خود
نو دار تقائی مدارج طے کرنے لگی، اور جس طرح اطالوی زبان لاطینی سے ترقی کرکے بنی ہے
سی طرح وہ آخر کار موجودہ خوبصورت فارسی میں تبدیل ہوگئی۔ فارسی چونکہ ہندوستان کی
بان نہیں ہے اس لئے سردست ہمیں یہاں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان
ی طرف آریاؤں کی نقل وحرکت مابعد کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو مذکورۂ بالا ابتدائی ہجرت ہند

کے بعد معرضِ وجود میں آئی۔ انڈو آرین قوم کے براہ افغانستان ہندوستان پہونچنے سے کچھ ہی قبل ایران میں ان کی زبان (جبکہ وہ اسوقت بالکل ابتدائی حالت میں تھی) ہنوز موجودہ صورت کی طرف ترقی کر رہی تھی کہ ان کے دوسرے جتھوں نے شمال مشرقی رخ کی جانب بڑھنا شروع کیا اور آخر کار وہ پامرس ([illegible]) تک پہونچگئے۔ دنیا کے اس ناموافق اور غیر متواضع مقام سے انہوں نے جنوب کی طرف پنجاب کے میدانوں کا رُخ کیا۔ اُن میں سے بعض دریائے سندھ کی وادی تک پہنچ گئے۔ وہاں وہ اپنے اُن متقدم بھائیوں سے مل گئے جو ان سے پہلے افغانستان ہوتے ہوئے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ بقیہ آرین ہندوستان کی جانب پامرس کے نشیب میں ہندوستان کے پہاڑی ملک میں رہ پڑے جن کی نسل سے آگے چل کر غیر متمدن "کافر" اور چترال اور گلگٹ کے باشندے پیدا ہوئے۔ ان میں سے بعض نے تو کشمیر کی پُر فضا گھاٹیوں کو اپنا مسکن بنایا جن کی نسل کی زبان موجودہ کشمیری ہے۔

اس کے بعد بھی جبکہ موجودہ ایران کی حدود قائم ہو چکی تھیں، ان کی نسلیں ایران سے آکر افغانستان میں اقامت گزین ہوئیں، اور اپنے ساتھ اپنی زبان کو بھی لیتی آئیں جو آگے چل کر پشتو کہلائی۔ اس زبان کو اب وہاں کے پٹھان قبائل استعمال کرتے ہیں۔ پشتو زبان ایک مکمل اور لچکدار زبان ہے مگر اہلِ مغرب کے کانوں کو بے سُری معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں ہم ہندوستان کے اس معائنۂ لسانی کو، جو غالباً سب سے پہلا معائنہ ہے، اس تاریخی حکایت کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ افغانستان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ وہ دُنیا کی تمام زبانوں کے نمونے پیش کرے۔ وزیر موصوف جب اس مہم کو انجام دیکر لوٹا تو اس نے حضرت سلیمان کے دربار میں ہر زبان کا نمونہ پیش کیا۔ جب پشتو کی باری آئی تو اس نے تھوڑی دیر توقف کیا، پھر ایک مٹی کے برتن میں ایک چھوٹا پتھر ڈال کر اس کو زور زور سے ہلا کر کہنے لگا کہ "یہ ہے قریب قریب اس زبان کا نمونہ جسے افغانستان والے بولتے ہیں!" با ایں ہمہ پشتو زبان سعدی و خیام کی دلکش زبان کی خالہ زاد بہن ہے۔

میرے خیال میں مندرجۂ بالا سطور میرے اس دعوی کی شاہد ہیں کہ اُن طریقوں کے مطالعہ کے لئے جن سے انسانوں نے زبان کے مسئلہ کو حل کیا ہے، ہندوستان ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں

ایسی زبانیں پائی جاتی ہیں جن کے قواعد صوفی صرف تین الفاظ سے زیادہ لفظ بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور وہ بڑی مشکل سے اُن عام خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں جو ہمارے نزدیک بالکل معمولی اور عام ہیں۔ بعض ایسی زبانیں بھی ہیں جو انگریزی زبان کے ذخیرۂ لغت سے صفائی اور شستگی میں برابری کرتی ہیں۔ ہم نے ایسی زبانیں دیکھی ہیں جن میں ہر کلمہ ایک لفظ ہوتا ہے، اور ایسی بھی جن میں کلمہ بہ کلمہ لگا کر اس کی صورت ایک عظیم الشان جملہ کی بنا دی جاتی ہے۔ ایسی زبانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں جن میں نہ اسم ہے نہ فعل اور ہمارے خیال کے مطابق ان کی صرف و نحو ہی کا پتہ نہیں ہے، اور بعض ایسی بھی جو اپنے نحوی قواعد کے لحاظ سے یونانی اور لاطینی کو ٹکر مارتی ہیں۔ ہندوستان میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کے ہر پہاڑی قبیلہ کی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے ــــــ وہ زبان جو ایک یا دو پشتوں کے بعد خود اس کے بولنے والوں کی اولادیں نہیں سمجھ سکتیں ــــــ اور دس دس ہزار میل کے رقبہ والے میدان ہیں جہاں صرف ایک زبان صدیوں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ شروع سے آخر تک یکساں بولی جاتی ہے۔ با اینہمہ اس ملک پر مشرقی اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان زبانوں میں، یکے بعد دیگرے، ہمیں ازمنۂ گذشتہ کی غیر مسموع گنگناہٹ سنائی دیتی ہے، اُن ایام قدیمہ کی جبکہ آرین قوم ارض فلسطین کے دریاؤں کے اس پار اپنے گلوں کو چراتی پھرتی تھی، جبکہ انڈو چینی ابھی اپنے مقام یانگ ٹسی کیانگ سے باہر نہیں نکلے تھے، اور جبکہ کوئی قبل التاریخی ہندوستانی ٹیوسر[۵۵] (Teucer) خلیج بنگال کے اس پار سے لیکر انڈونیشیا تک اپنے ساتھیوں کو لیجانے اور وہاں سے مشرق میں پھرتے ہوئے بحر الکاہل میں آباد ہونے کی جرأت کر رہا تھا۔ اور غالباً اسی زمانہ میں لیموریا کا براعظم بھی موجود تھا جس کو بحر الہند کے متلاطم امواج نے دھو کر اس کا نام و نشان مٹا دیا۔ آرین، تبتی برمی، آسٹرک یا دراویڈی زبانیں اپنے اصل ساکن، اپنے مخصوص تمدن اور اپنی ترقی کے مختلف مدارج کو پیش کرتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک نے آخر کار زبانوں کے اختلاط اور میل جول کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔

زبان خیالات کا آئینہ ہے، بلکہ ایک جملہ میں لفظوں کی ترتیب بولنے والوں کی ترتیب خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اور ہندوستان کے مرقع میں ہمیں نفس انسانی کی تصاویر کا ایک سلسلہ تہذیب و

---

[۵۵] یونانی بادشاہ کا شاہزادہ اور اجکس اعظم کا بھائی جو محاصرۂ ٹرائے میں تمام متحدہ یونانی افواج کیساتھ شریک جنگ تھا۔ ہومر کی الیڈ میں

تمدن کے اکثر مدارج میں دکھائی دیتا ہے ـــــــ ایسی تصاویر جو نہایت ناموافق حالات کے موقع پر ان کی طاقت اور نئی ضروریات کے اظہار کے وسائل پر بخوبی روشنی ڈالتی ہیں۔ دریائے ایراوڈی کے کناروں پر بسنے والے خونخوار وحشیوں کا نفس سوائے "خیالات" کے کسی چیز کا تصور کرنے سے عاجز ہونا چاہیئے۔ تاہم اسمیں ترقی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ضرورت کے مواقع پر وہ قوت ادراک بڑھانے کے لئے وسائل ایجاد کرسکتا ہے اور "خیالات مجردہ" کو ظاہر کرنا سیکھتا ہے۔ وہ پہلا قدم اٹھاتا ہے جو اُسے وحشت و جاہلیت سے تہذیب و تمدن کی طرف لیجاتا ہے۔ اور بہیمیت سے نکال اُسے دنیائے قدیم و جدید کے فلسفوں کی شاہراہ پر گامزن کردیتا ہے غرضکہ ہندوستان ہمارے سامنے لسانی مسائل، دماغی نشو و نما اور ان کے ارتقائی مدارج کی مثالیں بہ کثرت پیش کرتا ہے۔

قاصدِ امید

(از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

آ۔ اے قاصدِ امید آ۔ تو کیا ہے اور کون ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ تجھکو کس چیز سے تشبیہ دوں؟ یہ بھی نہیں جانتا۔ میں اہل دنیا سے سوال کرتا ہوں لیکن کوئی ایسا نہیں جو مجھے معقول جواب دے مجھے تمام دنیا بے رحم نظر آتی ہے پس تو آ اور ہلال عید، بن کر آ۔

میری مصیبتوں میں میرا کوئی شریک نہیں۔ میری تکلیف لاعلاج ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا جو مرغانِ خوش الحان کے چہچوں کی دل کش آواز کان میں پہنچاتی ہے۔ سورج کا وہ نظارۂ دلکش جب وہ گوشۂ مشرق سے سر نکال کر اس پُر فضا زمین پر نگاہیں دوڑاتا ہے اور اس کی سنہری اور رنگین کرنیں جو قطرات شبنم کو موتیوں کی طرح چمکا دیتی ہیں۔ رات کی خاموشی اور بلبل کا ترانہ جان نواز سے سوا میرے پژمردہ دل کو شگفتہ نہیں کرسکتے۔

پس آ۔ اے قاصد امید، آ۔

اور

مرکز آرزو بنکر آ۔

جواب استفسار جناب آزاد

(از مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں ۔ بلگرامی)

ذیل کا عروضی جواب مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی نے مدیر نیرنگ (رامپور) کے استفسار پر لکھا ہے جس کو اگرچہ رسالہ "نیرنگ" ہی میں شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن از رہ کرم ہمیں "زبان" کے لئے مرحمت فرمایا ہے جس کو ہم بڑی خوشی سے درج کرتے ہوئے مولینائے موصوف سے امید کرتے ہیں کہ اسی طرح آیندہ بھی مستقل طور پر اپنی وسیع معلومات سے قارئین کرام کو مستفید فرمایا کریں گے۔

مولینائے موصوف ہندوستان میں مستثنےٰ قابلیت کے بزرگوار ہیں، فن عروض میں آپ کو جو مہارت تامہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں رسالہ نیرنگ (رامپور) کے صفحات آپکے علمی کارناموں کے شاہد ہیں جن کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن عروض میں آپ اپنی مثال ہیں۔

ایڈیٹر

جناب منشی عزیز اللہ خالصاحب ایڈیٹر اور پروپرائٹر رسالہ نیرنگ رامپور تحریر فرماتے ہیں کہ جناب آزاد کاکوروی اپنی ایک غزل کے اس مصرع کی بابت

"عالم عالم سوختی و عالم عالم ساختی"

حیرت سے دریافت فرماتے ہیں کہ لفظ عالم ثانی سے عین دونوں جگہ اس مصرع میں کیا تقطیع سے گرتا ہے؟۔ اگر مصرع کی ساخت پر نظر کرکے جو مصنف کو پسند ہے بجنسہ برقرار رکھا جائے تو کوئی ہرج تو نہیں ہے یا مصرع ہی تبدیل کر دیا جائے۔

جواب

ایک مصرع کے لکھنے سے اکثر متحقق نہیں ہوتا کہ غزل کس بحر میں ہے ۔ اگر جناب آزاد نے بحر رمل مثمن محذوف میں یہ غزل کہی ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دو بار ہوتا

ہے تو ضرور لفظ عالم ثانی کا عین دونوں جگہ اس مصرع میں تقطیع سے خارج ہے لہٰذا عروضیوں کے مسلمات
کے موافق بحر مذکور میں یہ مصرع ناموزوں ہوگا کیونکہ عین کا تقطیع سے گرنا ان کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس لئے
ضرور مصرع تبدیلی کے لایق ہے۔ اگر جناب آزاد کو پسند آئے تو مصرع مذکور کو اس طرح بنالیں۔

"عالمے راسوختی وعالمے راساختی"

جو عروضی بحور مسمطات چہار گوشہ میں زحافات اذالہ وتسبیغ۔ حذف وقصر۔ وقف وکشف وغیرہ حشو میں لانا
جائز سمجھتے ہیں وہ اس مصرع کو جبکہ واو عطف درمیان "سوختی وعالم" ہو بحر مدید مثمن سالم میں بروزن
فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن کہہ سکتے ہیں۔ اور بہ لحاظ حذف درمیانی رمل محذوف بھی کہا جاسکتا
ہے گو یہ فرع رمل کی کتب عروض میں مرقوم نہیں۔

جناب قدر بلگرامی مرحوم کو زحافات مخصوصہ عروض وضرب کو حشو میں نہ لانے کے بارہ میں اسقدر
غلو ہے کہ جس کلام میں کسی استاد کے زحافات مذکور درمیان مصرع پائے جاتے ہیں تو جناب
قدر ضرور کوئی تاویل فرماتے ہیں جس سے ان زحافات کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔ لیکن پھر بھی
مفتعلن فاعلن چار بار کو بحر منسرح مثمن مطوی مکشوف بتایا ہے اور جناب محقق طوسی علیہ الرحمتہ
کے اس قول سے کشف درمیانی کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ کشف ووقف بھی عروض وضرب سے
مخصوص ہیں۔ قول محقق یہ ہے۔

چوں ایں وزن چہار خانہ شود مسمط یا غیر مسمط رکن دوم ہر مصراع ہم
مطوی مکشوف یا موقوف بکار روارند بر قیاس عروض وضرب،

تفسیر اس قول محقق کی خود جناب قدر اس طرح فرماتے ہیں کہ جب وزن چہار خانہ ہو جائے تو
ہر ایک خانہ قائم مقام ایک مصرع کا ہے۔ یعنی پورا وزن گویا مسطور ہو کر مضاعف ہوگیا ہے۔ بدیں
صورت نصف مصرع ایسے وزن کا دراصل ایک مصرع ہو جائیگا۔ جب یہ ہوا تو کشف ووقف
برقیاس عروض وضرب ٹھیک واقع ہو کر درمیان میں جائز ہوگا۔ یہاں زحافات مخصوصہ عروض و
ضرب کے اس تاویل سے حشو میں لانے کے قائل ہو گئے مگر دوسرے مواقع پر بڑے شد ومد
سے اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں اور ایسی تاویل فرماتے ہیں جس سے ایسے زحافات
کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔

کلام اساتذہ میں ایسے زحافات کا وقوع درمیان مصرع میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

بدر چاچی
در بحر عمت غواص۔ لالائے دو چشم ماست
صد لولوئے ترا نیک بر طشت زرش غلطاں

باوجودیکہ تین قافئے غیر قوافی قصیدہ نہیں لائے پھر بھی مصرعہ اولی میں تسبیغ درمیانی کو صرف کیا ہے۔

بدر چاچی
آں شاہد تپ لرزہ او سر طانش چوں سازونزار
صفرا بود بر خاک وخارہ از تف حمیٰ ریختہ

اس شعر میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ ہیں۔تب اذالہ حشو میں صرف کیا ہے۔ حالانکہ اذالہ بھی عروض وضرب سے مخصوص ہے۔

اذالہ وتسبیغ وغیرہ کے حشو میں لانے پر جواز کی دلیل میرے نزدیک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تعریف قافیہ میں اہل فن یوں رقمطراز ہیں کہ:۔

"وہ حرف یا حروف چند جن کو ابیات یا مصاریع کے آخر یا بمنزلہ آخر میں بالفاظ مختلفہ کرر لائیں۔"

جب تعریف قافیہ میں قید آخر مصرع یا بیت کی تجویز کی جاتی ہے۔ پھر بھی مجور مستطات چہار گوشہ میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ سے آتے ہیں اور قید آخر مصرعہ یا بیت کی پروا نہیں کرتے۔ اس قاعدہ پر قیاس کرکے اگر زحافات مخصوصہ عروض وضرب کو رکن دوم وششم میں لائیں تو ہوسکتا ہے خصوصاً جب عمل اساتذہ اس قاعدہ کا موید ہے تو پھر ناجائز کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

گو اس بحث کو استفسار سے زیادہ تعلق نہ تھا مگر ضمن بیان میں جب یہ مسئلہ آپڑا تو میں سمجھتا ہوں کہ ناواقف کیلئے افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ اب میں پھر اصل سوال کیطرف رجوع کرتا ہوں۔

بہت سے اساتذہ اردو وفارسی گو کو الف وصل کے دھوکے میں عین کو تقطیع سے گرانے میں سہو ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عین کا تلفظ اہل زبان اردو وفارسی مثل الف کرتے ہیں۔ اہل عرب ہی عین کو اس کے مخرج کے ساتھ ادا کرنے کے عادی ہیں اس لئے غیر عرب عین میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ لیکن ایسا سہو عروضیوں کے نزدیک قابل معافی نہیں۔ چنانچہ میر شمس الدین فقیر علیہ الرحمۃ حدائق البلاغۃ میں

لکھتے ہیں۔

مولانا ظہوری بیتے ازیں باب آوردہ و مورد طعن شدہ و آں بیت ایں ست ؎

بدستم دہ آں رشک یاقوت را

کہ سازم علاج عقل فرتوت را

عقل کا عین تقطیع سے خارج ہے۔ لیکن جناب میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں مصرع ثانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ؎ کہ سازم جواں عقل فرتوت را۔

ظاہر ہے کہ فرتوت کے مقابل " جواں " مناسب ہے نہ عقل

عاقل شاہجہان آبادی

ناتوانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش   خاک بر سر میکند در خانۂ آئینہ آب

لفظ عاقل کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔ جناب قدر فرماتے ہیں اگر مقام کی جگہ "مکان" ہو تو یہ عیب برطرف ہو جاتا

ولہ   اے بنقاب عارضت شعلۂ بال نگاہ   عکس تو در آئینہ یوسف مصری بچاہ

یہاں بھی عارض کا عین تقطیع سے خارج ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں ہوتی۔

ناصر علی سرہندی   اے رگ جاں بہار ایں ہمہ بیرحمی چیست

خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

عادت کا عین تقطیع میں حذف ہو جاتا ہے۔

اہل ایران سے بھی یہ تسامح واقع ہوا ہے۔ خواجہ باقر عزت شیرازی

مرا پند خردمنداں بحال خود نمی آرد   بایں افسانہا مجنون عشق عاقل نمیگردد

عاقل کا عین خارج از تقطیع ہے۔

خاقانی   خاقانی عید آمد و خاقان بہ یمن جود   ہر کار کز خدائے بخواہد روا شود

عین لفظ عید کا تقطیع سے خارج ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عین باقی ہے مگر یائے تحتانی لفظ خاقانی کی تقطیع سے گر گئی۔ خواہ عین ساقط ہو یا یائے تحتانی دونوں کا سقوط ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میر حسن دہلوی ؎

"اُس عہدے سے کوئی بھی نکلا نہیں"۔ لفظ عہدے کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔

باوجود ان اشکال کے ان شواہد سے تمسک کر کے سقوط عین جائز نہیں ہو سکتا ہے یہی مسئلہ اہل فن ہے و اللہ اعلم بالصواب

مترجمات

مسیح علیہ السلام کے وجود سے انکار

مندرجہ بالا عنوان سے ولایت کے مشہور اخبار نیشن نے اپنی تازہ اشاعت میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا ملخص حسب ذیل ہے:-

امریکہ کے ایک شخص جارج برانڈس نے (Jesus a myth) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت مسیح کی، شخصیت بالکل موضوع اور من گھڑت ہے، جیسے کہ ہرقلیس اور پرامیتھس کی شخصیتیں لوگوں نے وضع کرلی ہیں۔ یہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، تنقید بائبل کے آغاز سے ہی اس کی ابتدا ہوچکی ہے جسکو تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوچکے ہیں اور اس نظریہ کی ترقی یافتہ صورت کو پچاس سال سے زاید عرصہ نہیں گزرا۔ یقیناً یہ مسئلہ ارتقاء مسیحیت کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کے لئے بہت جلد حل طلب ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عہد نامہ جدید تاریخی حیثیت سے بالکل پایۂ استناد سے گرا ہوا ہے، اور کئی صدیوں تک اس کی صحت کے متعلق کوئی سوال پیدا نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تاریخی تنقید کے اصول مدوّن ہونے سے پہلے کلیسائے عیسوی کا اقتدار و اثر پورے عروج پر تھا، اور صدیوں تک جو لوگ اس بات کو ماننے کے عادی ہوچکے تھے کہ ہومر کی الیڈ کی تلخیص جنگ تروجن (Trojan) کو برائے العین مشاہدہ کرنے والے ایک شخص نے تیار کی ہے (اور جو قسطنطین کے موضوع "عطیہ" کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے رہے) وہ کبھی اس اساسی دستاویز پر اعتراض نہیں کرسکتے تھے جو ان کے مذہب کا مؤید تھا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر نے بھی اناجیل اربعہ کے اتحاد مضامین پر اپنے عدم اطمینان کو صاف طور پر ظاہر کردیا۔

۱۷۸۲ء میں جرمنی عالم کارل فرانڈرخ بہروت نے اس نظریہ کو ترقی دی کہ مسیح فرقہ

آئینیز (Essenes) کی ایک پوشیدہ جماعت کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح تھا، جس کے ذریعہ سے وہ یہودیوں کو اپنی مادی رسم "مسح" کے خیال سے ہٹانا چاہتی تھی۔

پونی صدی کے بعد برونو بادر حیاتِ مسیح سے متعلق پختہ معاصرانہ شہادت کی عدم موجودگی میں کوئی معقول عذر تلاش کر رہا تھا۔ اس نے "مخفی انجمن" کے اس نظریہ کو ایک نئی تحریک دی، اور بڑی جرات سے اناجیل کی تاریخ تصنیف دوسری صدی عیسوی میں مقرر کرتے ہوئے اس بات کو ظاہر کیا کہ مسیح کا قصہ یزد بادشاہ روم کے عہد میں ایجاد ہوا ہے۔ اور اس پر آج تک حاشیہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔ اس نے یہ استدلال کیا کہ عہد جاہلیت (قبل مسیح) کے فلاسفر، خصوصاً سینیکا (Seneca) عیسائیت کے ان اخلاقیات کی تدوین بہت پہلے کر چکے تھے۔ البتہ وہ اپنے خیالات کی عام اشاعت نہیں کر سکتے تھے اس لئے لوگوں نے ان کو ایک ایسی شخصیت سے منسوب کرنا چاہا جس میں "مافوق الفطرۃ" ہونے کی دلکشی پائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسیح کا اسطورہ (myth) وضع کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نظریات تاریخی مشکلات کو حل کر دیتے ہیں، لیکن وہ اس "مافوق الفطرۃ مصنوعی شخصیت" سے تو بہرحال کچھ کم ہی قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ معجزات کی ان عقلی تاویلات کی طرح جو مسیح کو ایک طرح کا ہوڈینی بنا دیتے ہیں (جو دھوکہ بازی اور فریب دہی کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز بن گیا تھا) یہ لوگ ان معجزات کی بہ نسبت اپنے نظریوں کے لئے زیادہ اعتماد کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کو یاد دلاتے ہیں جو کسی عقیدت مند نے ایک مشہور معقولی سے طعناً کہی تھی کہ "وہ ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ بائبل میں نہ ہو!" وساطیر در اصل اسقدر موضوع اور مخدوش نہیں ہوا کرتے جسقدر کہ ان کی روایت کا طریقہ ہوتا ہے یعنی کہ وہ ایک کے منہ سے نکل کر دوسرے کے منہ تک پہونچتے پہونچتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اگر مسیح کی شخصیت ایک قصہ کہانی ہے تو وہ کسی مخفی انجمن کی وضع و اختراع نہیں ہے بلکہ رفتہ رفتہ انسانی ضرورت اس کو وضع کرنے کی داعی ہوئی ہے۔

یقیناً عیسائی یا ملحد علماء کی ایک کثیر جماعت اس بات پر اتفاق کرے گی کہ "روایات کا مسیح" "تاریخی مسیح" سے بالکل جداگانہ ہے اور اکثر لوگ اس کو تسلیم کریں گے کہ یہ اس طور وہ خواہ کتنا ہی غلط اور قابل اعتراض

لہ یہودیوں کا وہ فرقہ جو مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ ۱۲

ہوتاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ضرور کوئی تاریخی شخصیت ہونی چاہئے جس کے متعلق لوگوں نے بعد میں مبالغہ کر دیا ہے۔ ع

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیز ہا

مسیح کے وجود سے متعلق کوئی اطمینان بخش شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اور اگر یوسیفوس کا دستیاب شدہ ترجمہ، جس میں مسیح کا ذکر موجود ہے، (اور جسے عام طور پر زمانۂ مابعد کی تفسیر سمجھا گیا ہے) فی الحقیقت اتنا ہی قدیم ہو جتنا کہ کہا جاتا ہے تو مسیح کے تاریخی وجود کا یہ ایک بیّن ثبوت ہو سکتا ہے۔

برنرڈشا کی تھیوری

انگریزی کا مشہور ڈراما نویس اور ادیب برنرڈشا انگلستان کا ایک سربر آوردہ شخص ہے جس نے حال ہی میں اپنے علمی کارناموں کے صلہ میں "عطیۂ نوبل" حاصل کیا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی اشاعتِ جدیدہ میں برنرڈشا پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں سوانح حیات کے علاوہ اس کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اسی مضمون میں شا کی تھیوری مندرجۂ ذیل الفاظ میں اجمالاً بیان کی گئی ہے:

"امراض، مفلسی، اور جنگ۔ یہ سب افعال خدا کے خلاف کئے جاتے ہیں اگر دنیا نے اس سیلاب کو نہ روکا اور خدا کے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو وہ بہت جلد نسل انسانی کو دنیا سے ناپید کر دیگا جیسا کہ ان سے پہلے اس نے شعرانی حیوانات (Mammoth) کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے۔

"تمہیں ایسی زندگی بسر کرنی چاہئے کہ جب مرنے لگو تو خدا پر تم اپنا قرض چھوڑ جاؤ"۔ کیا یورپ کے مادہ پرست اس صدائے حق نیوش پر گوش بر آواز ہوں گے؟

لفظ میمن انگریزی زبان میں

کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں ایک متمول تاجر قوم میمن کہلاتی ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ یہ

کس زبان کا لفظ ہے اور کسطرح اختیار کیا گیا۔ مگر انگریزی ادبیات میں اس کو استعمال ہوتے دیکھ کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسی کا ہمنوا لفظ (mammon) ہے جس کے معنی سریانی زبان میں دولت و ثروت کے ہیں! (ملاحظہ ہو ملٹن کی فردوس گم شدہ باب پہلا)

اسپنسر کی نظم فری کوئین (پریوں کی ملکہ) میں میمن ایک کیرکٹر ہے جس کی زبانی یہ الفاظ منقول ہیں :-

"اگر سرگایون میری اطاعت کریگا تو وہ دنیا میں سب سے بڑا دولتمند آدمی ہوگا"

(دیکھو کتاب مذکور باب ۲ فصل ۷)

گویا یہاں پر میمن کو "دولت کا دیوتا" بتایا گیا ہے!

بین جانسن اپنی کتاب "دی آلکیمسٹ" (کیمیاگر) میں "سر اپکیور میمن" اس آدمی کے لئے استعمال کرتا ہے جو "لذات دنیوی کا حریص" ہو۔

اسی طرح لوقا کی انجیل (۱۶ : ۹) میں مال و دولت کو "ناراستی کا میمن" بتایا گیا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اسم کا اثر مسمیٰ پر ہوتا ہے تو تسلیم کرنا چاہئے کہ (خواہ اس کی اصلیت اور وجہ تسمیہ کچھ ہی ہو) ہمارے میمن بھائیوں کی قابل فخر دولتمندی اور خوشحالی پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اور انکے ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ بات ذرا بھی حقیقت سے بعید نہیں معلوم ہوتی۔

مصوّرِ فطرت

اقبال جسطرح ذوقِ شعری میں بے مثل تھا، اسیطرح وہ مصوری میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ ایکطرف جذبات ومحاکات سے کسی شعر کا ایک مجسمہ قائم کر دیا کرتا تھا۔ تو دوسری طرف کاغذی پیرہن پر وہ مناظرِ فطرت میں اس حسن وخوبی کیساتھ رنگ آمیزی کرتا تھا کہ اصل ونقل میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کبھی وہ کسی پھول یا کسی کلی کا نقش کھینچتا تھا تو اظہارِ رنگ کے ساتھ ہی، بو کا نمودار کر دینا بھی اسی کا کام ہوتا تھا۔

ایک بار اس نے موسم برشگال کا منظر کھینچا، جس میں کالی گھٹاؤں کا اُٹھنا، بجلی کا چمک کر چھپنا، اور پانی کا برس کر بند ہونا تو ایک معمولی بات تھی۔ لیکن اُس وقت حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہتی تھی جبکہ اس منظر کو بغور دیکھنے سے ایسا یقین ہونے لگتا تھا کہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے کان متاثر ہو رہے ہیں اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس یقین میں اُس وقت اور بھی اضافہ ہو جایا کرتا تھا جبکہ شدید موسم گرما میں اس منظر کو پیشِ نظر رکھنے سے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ صدمۂ برق وبرودتِ ہوا، سامعہ ولامعہ سے مس ہو کر روح کو ایک گونہ فرحت بخش رہی ہے۔ غرضکہ وہ فطرۃً شاعر بھی تھا اور مصور بھی۔ ایسا مصور جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھا۔ لیکن اس شغل سے اس کی کبھی تسکین نہیں ہوئی بلکہ ایک نامعلوم کاوش وجستجو میں مبتلا ہو گیا۔

شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں تھا۔ جہاں چند کچے مکانوں کے علاوہ، ایک نیم پختہ مکان بھی تھا جس کے دروازہ کے سامنے قریب تر ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا ہوا تھا

نمودِ صبح کی فضائے لطیف میں ٹھنڈی ہوا کی عطر بیزی میں صحرائی غنچے حسب معمول زر بکف رہا کرتے تھے، اور ہر صبح منتظر ہوتے تھے کہ وہ اپنے گلِ بیگانہ کو دیکھیں اور اس زر کو اُس پر سے نچھاور کریں اور خود بھی گلے کا ہار بن کر نثار ہو جائیں۔

اقبال ایک صبح اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اور چاہتا تھا کہ اس بہترین منظر کا نقش صفحۂ قرطاس پر قائم کر لے، کہ دفعتہً اس کی غیر متحرک و ساکن نگاہ میں ایک چشمک پیدا ہوئی، اسنے یہ محسوس کر کے کہ شاید سورج کی یہ شعاعِ اولین میری نگاہ میں پیوست ہو رہی ہے، آنکھیں بند کر کے گردن موڑ رہی تھی کہ دفعتہً سامنے باغیچہ میں ایک کیفیت نورانی، مافوقِ حسنِ انسانی، اور اعجازِ حقیقت نسوانی یعنی کہ ایک زندہ جادو، یا ایک صحرائی حسن تھا جس کی بوئے دوشیزگی بوئے گل کے ساتھ مل کر گاؤں کی ساری فضا کو معطر کرنے لگی۔ لیکن! وہ اس سے گاؤں کے رہنے والے بالکل بیخبر تھے۔

یہ غزالِ رعنا و آہوئے دشت ایک سفید ساری میں (جو کچھ میلی تھی) ملبوس تھی، اور ہرن کی طرح اس باغیچہ میں کلیلیں مار رہی تھی۔ اس کا قدِ بلند قیامت زا تھا۔ اس کی شہلائے چشم بادہ ریز تھی۔ اس کے سیاہ و دراز گیسوں کے بیچ میں اس کا حسین و ضوفشاں چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں کے درمیان آفتاب چمکنے لگتا ہے، تناسب اعضاء کے ساتھ کہربائی حصہ جسم کے نشیب و فراز میں کشش سحر زا تھی۔ اور معصوم حسن کا چشمہ، پھٹ پڑنے والے شباب کے دریا میں گر رہا تھا۔ یا یہ کہیئے کہ بادۂ تند مینائے خام میں بھری جا رہی تھی۔ ایک طرف یہ دوشیزہ پھول توڑ کر ہار بنانے میں مشغول تھی۔ اور دوسری طرف مصور فطرت اقبال اسکی تصویر کھینچنے میں منہمک۔ اقبال کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے قلم میں لرزش تھی۔ اور اس کی ساری روح اس کے جسم سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دفعتہً یہ سنبھلا اور ہوش قائم کئے۔ سب سے پہلے اسنے قلم کی باریک نوک سے اس کے تمام جسم کا ایک نقش قائم کیا، اس خیال سے کہ کہیں یہ لڑکی اپنا ہار گوندھکر چل نہ دے۔ اس کے بعد جب اس کا قلم گھنے و سیاہ گیسو بنانے میں مصروف ہوا تو اسے خود محسوس ہونے لگا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ پھر جب اس نے آنکھیں بنانی شروع کیں اور غشاوۂ بصر پر جب باریک و نازک رگوں میں ارغوانی رنگ بھرنا شروع کیا تو اسپر سکر طاری ہونے لگا۔ لیکن جب اس نے دوشیزہ کے اس پر شباب حصۂ جسم پر قلم کو جنبش دی، جسمیں فطرت نے کوٹ کوٹ کر بجلیاں بھر رکھی تھیں جس میں قوت کہربائی پوشیدہ تھی۔ اور جس کا برقی انجذاب قوتِ بصر کو جذب کر رہا تھا، یعنی کہ جسم کا وہ فراز حصہ جو مخزنِ برقیات و معدنِ کہربائیات تھا، اور جس کا تصور اقبال کی روح کو تحلیل کر رہا تھا تو اس وقت نشہ کی فراوانی سے یہ جھومنے لگا۔ اور شدت سرور سے اسپر ہذیان طاری ہونے لگا۔

بالآخر جب یہ پاؤں کی نازک و رنگین انگلیاں بنانے میں مشغول تھا تو اس وقت اس کا قلم اور یہ خود سجدہ میں گر گیا، اور اس کے منہ سے مسرت انگیز صدا نکلی، جس کا مفہوم یہ تھا۔

”میں نے مقصدِ زندگی پالیا۔ اب اس دنیا میں مجھے کسی شئے کی ضرورت نہیں پھر کیا دیر ہے“؟

یہ کہا اور اس پر حیرت و سکوت طاری ہوگیا۔ اسکی نگاہیں تصویر پر جم کر رہ گئیں اب اسے محسوس ہونے لگا کہ تصویر نے ابھر کر ایک جسم اختیار کرلیا ہے۔ اس سے اس کی روح میں ایک نوع کا ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس کو گلے سے لگا کر ایک مدید بوسہ لیا۔ جس سے اسے محسوس ہونے لگا کہ اسکی پیشانی عرق ریز ہے اور صورت سے اظہار انفعال۔

کچھ وقفے کے بعد یہ اس دوشیزہ کے پاس گیا، اس خیال سے کہ یہ تصویر اس کو دیدے۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر تصویر لڑکی کو دی۔ لڑکی نے تصویر دیکھ کر ایک تبسم نگاہ اقبال پر ڈالی دفعتہً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور یہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور خون منہ سے جاری ہونے لگا۔

لڑکی سہم کر اس کے پاس آئی۔ اور ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی ہی تھی کہ گرم آہ کے ساتھ خود بھی پھول کیطرح کملا کر رہ گئی۔

امام اکبر آبادی

مناظرِ قدرت

از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ)

آج صبح سویرے۔ اتنے سویرے کہ چڑیوں نے اپنا صبح کا گیت بھی شروع نہیں کیا تھا میں باہر نکلا، اندھیرا اور اُجالا اسطرح دست گریبان ہو رہے تھے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ اسوقت تک پالا کس کے ہاتھ رہا۔ لیکن پانچ منٹ کے اندر روشنی اچھی طرح نمودار ہوئی اور اندھیرا زائل ہوگیا یہ وقت بھی عجیب وقت ہے صبح کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے سپیدہ صبح کا نمودار ہونا بھی دلفریب ہے۔ مرغان خوش الحان کے چہچہے بھی دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر بھی اسکی خوبیوں اور لطافتوں سے واقف ہے اسکا دل اس ذوق و اس کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ باتیں ہمکو بتلاتا ہے جو کبھی ہمارے وہم گمان میں بھی نہیں آئی ہونگی یہ وقت سونے کیلئے نہیں یہ وقت نیچر کے بننے سنورنے کا ہے وہ رات بھر کی اوس سے اپنا منہ صاف کرتی ہے اور اپنے محبوب (سورج) کے نکلنے سے قبل ہی آراستہ و پیراستہ ہو جاتی ہے —— میرے کانمیں ہزاروں آوازیں پرندوں کیڑے مکوڑوں اور پتوں کی آرہی تھیں میں اس عالم میں تھا جب خوشی کے خیالات انتہا پر پہنچ کر رنج و غم کے خیالات دلمیں پیدا کر دیتے ہیں —— میری روح نیچر کے مناظر سے دلچسپی رکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی بلکہ مجھے خیال تھا کہ میں بھی پرندوں اور نیچر کی تمام خوشنما چیزوں کیطرح خوش ہوں —— یکایک مجھے خیال آیا کہ انسان ایک دوسرے کا دشمن ہے اور اسی باعث نیچر کی اور اشیا کیطرح اسمیں زندہ دلی

حقیقتِ مجاز

(جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

خط لاپرسری نگاہ سے دیکھا اور پھینک دیا۔ محمود کے لئے ان لفظوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی جو انہیں بار بار پڑھتا۔ سوچتا۔ سمجھتا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اور صغرا کہاں تک درست کہتی ہے۔

"وہ بھی اس صغرا کی کیا پرواہ۔ اس سے بدرجہا بہتر۔ حسینہ۔ باسلیقہ۔ پڑھی لکھی اور علم موسیقی سے واقف عذرا موجود ہے اور وہ سب خوبیاں جو ایک شریف نوجوان مرد کی بیوی بننے کے لئے ایک عورت میں ہونی چاہئیں وہ سب عذرا میں ہیں۔ اگر مکان بک گیا۔ جائداد تباہ کر دی تو بلا سے۔ آخر میں نے برا کیا کیا۔ روپیہ تھا اسی طرح نہیں اسیطرح صرف کر دیا۔ لوگ شادیوں میں گھر بار بیچ کر لگا دیتے ہیں اور پھر اون کی مرضی کے موافق بیوی نہیں ملتی اور اگر میں نے عذرا کے لئے اس تمام جائداد کو ان معنوں میں استعمال کر لیا تو کیا ہرج ....؟"

چٹھی رساں کی آواز نے محمود کو ان خیالات سے جلد رہائی دلا دی۔ وہ فوراً نیچے گیا اور ایک بیرنگ خط وصول کر لیا۔

"—————— قدرت کا فیصلہ ہمیشہ اٹل رہا ہے۔ اور یہ وہ فیصلہ ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ میرا یہ خط تمہارے دل پر میری طرف سے بہت شکوک پیدا کریگا۔ مگر دیکھنا یہ ہے میں کہاں تک درست ہوں۔ میں جب دہلی پہنچی تو نواب اکرم بیگ کا چھوٹا بھائی نواب اکمل بیگ مجھے دیکھتے ہی ہزار جان سے مجھ پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کے لفظوں کی صداقت نے میرے دل پر وہ گہرا اثر کیا جو تمہاری محبت گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں نہ کر سکی۔ میرے دل نے اس امر کی گواہی دیدی کہ نواب صاحب کسقدر پاک خصلت اور صاف دل ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میرے پسند خاطر ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے

کہ میں بازاری رقاصہ کہلوانے کے نام سے کسقدر نفرت کرتی تھی۔ اور میری شروع ہی سے یہ خواہش تھی کہ کسی شریف نوجوان آدمی کے گھر بیٹھ جاؤں الحمدللہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئی۔ میرے دل وجان کے مالک ومختار بس وہی نواب صاحب ہیں جنہوں نے آگرہ پہنچکر میرے ساتھ شادی کرلی۔ دہلی سے مجھے لکھنؤ آنا تھا اور وہاں سے اسی غرض کے لئے آگرہ جانا پڑا۔ میری یہی تمنا ہے کہ اپنے خاوند کے آغوش محبت میں جان دیدوں۔ میرے لئے اُن کی ہستی قابل پرستش اور بہترین نعمت ہے اور میں ہی جانتی ہوں کہ وہ مجھے کہاں تک عزیز ہیں۔ اُن میں وہ صفات اور وہ خوبیاں موجود ہیں جو مجھے تم میں دکھائی نہیں دیتیں۔ میرے دل میں اگر صاف کہوں اور تم بُرا نہ مانو تو تمہاری محبت بالکل نہ تھی۔ وہ بھی فقط امی جان کے کہنے پر تمہاری محبت کا جواب دیدیا کرتی تھی۔ میرے دل نے تمہیں مطلقاً قبول نہیں کیا اور نہ ہی تم میں اسقدر دلفریب خوبیاں تھیں جو مجھے گرویدہ کرسکتیں۔ بس اب یہی اچھا ہوگا کہ تم مجھے بھول جاؤ اور ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ اب میں وہ نہیں ہوں جو کبھی رقاصہ تھی۔ میرا نام بھی اب بازاری لفظوں میں نہیں آسکتا میں یہ سب کچھ جانتی ہوں کہ یہ خط پڑھکر تم پر کیا کچھ نہ گذرے گی مگر حق گواہ ہے کہ میں مجبور ہوں جس چیز کو میری آنکھیں پسند نہیں کرتیں جس کو میرا دل قبول نہیں کرتا اوس کو لیکر میں کیا کروں گی۔ جس کے پاس ایک لمحہ کے لئے بیٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی اُس کے پہلو میں تمام عمر کس طرح بسر کردوں۔ مگر خدارا میرے ملنے کی ہرگز سعی نہ کرنا ورنہ نواب صاحب تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔ لکھنے والی بس وہی جو کبھی عذرا تھی"

(۷)

ناامیدی کی گھٹا بند تاریکیوں میں چھپنے والا۔ مرکزِ یاس کے تقاضا تک ختم ہوجانے والا۔ میری زیست اور مابعد کی زیست کو بدنام کرنے والا تو ہی فقط تو ہی ایک جنس ہے جس کی ایک ایک رگ میں عذرا کی محبت ہے۔ تو برباد ہو کہیں غارت ہو۔ ڈوب مرتا کہ تیرے ساتھ عذرا کا خیال بھی غارت ہوجائے تونے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ دُنیا اور آخرت دونو میری آنکھوں میں اندھیر ہیں اسے عذرا .... اسے خوبصورت عذرا .... میں مستقبل کی توقع میں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ آنے والے متبرک دور میں اپنی زندگی تمہاری معیت میں گذاردوں گا۔ اور یہی خواہش تھی کہ میرا جام زرین حیات تیرے سامنے موت کے ہاتھوں چھلک کر تمام ہوجائے مگر .... مگر افسوس .... یہ

سب امیدیں خاک میں مل گئیں جس طرح صبح کے وقت شبنم کے باریک قطرے طلوع آفتاب سے فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح میں اپنی آرزوؤں امیدوں کے حصول کی ناکام کوشش کی وجہ سے اپنے آپ کو اس صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا ہوں۔ اب مجھے کامل یقین ہو گیا کہ باہمی محبت سے متحد ہونے میں اس دنیا کی کوئی طاقت اتفاق نہیں کر سکتی اور جو کچھ عشق و محبت کے افسانے سنے جا رہے ہیں وہ یقیناً واقعات سے خالی ہیں۔ جب اسے عذرا .... اے خوبصورت عذرا .... ایک پاک روح کی محبت تیرے دل پر اتنے عرصہ میں اثر نہ کر سکی تو کب امید ہو سکتی ہے کہ محبت کا پاک اور استوار رشتہ اس دنیا میں کسی کے ساتھ منسلک ہو سکے گا؟

آہ! عذرا !! .... یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں کبھی آکر پہروں بیٹھا کرتے تھے .... یہ وہی پتھر ہے .... جس تک دریا کے پانی کی لہریں مست ہو ہو کر تیرے پاؤں کو مس کیا کرتی تھیں .... جب تک .... بیشک یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی محبت کے پرانے واقعات کو دہرایا کرتے تھے .... آج میں ہوں اور یہ اکیلا پتھر .... عذرا، آ، دیکھ .... دیکھ عذرا یہ کہ دریا کا پانی کس بیتابی سے مجھے اپنے آغوش میں لینے کے لئے میری طرف بڑھ رہا ہے آہ .... یہ درست ہے کہ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے یہ دریا کا پانی وہاں پہنچا دیگا جہاں میری پلید روح بھی دُر کار دیجائیگی مگر کسی متبرک دہلیز سے ڈھاسنا لگائے تیری آمد کا آخری منتظر .... منتظر رہونگا جہاں تجھے معلوم ہو جائیگا کہ میں ....

....

....

—— —— دریا کا پانی اس وقت زوروں پر تھا ایک خفیف جھٹکا محمود کے لئے کافی ہوا۔ پانی کی لہروں میں اضطراب نمودار ہوا۔ بہتے ہوئے پانی کی سطح پر پہلے چھوٹا پھر لمبا سا دائرہ پیدا ہوا۔ پھر اور بڑھا۔ وسیع ہوا۔ یہاں تک کہ پانی کی لہروں میں بہت جلد پنہاں ہو گیا۔

حسنِ بیان

مقصدِ سعیِ حیاتِ ناتواں بر آئے کاش
حاصلِ صد خرمنِ دل ہی نگاہ برق پاش

اوس کا ذوقِ جستجو بھی ہی جنونِ جستجو
جس کو منزل پر پہنچکر پھر ہو منزل کی تلاش

دشت میں بھی لے رہا ہوں میں گلستاں کے مزے
دستۂ گل بنگئی ہی تن پہ کانٹوں کی خراش

گو رہا میں خشک لب، پھر بھی یہ دامن بچ سکا
دستِ ساقی کا کوئی دیکھے تو حسنِ ارتعاش

دل ہے جسے کہتے تھے نزہت گاہِ حسن و عشق سب
آج وہ دل ہی شباب آلودہ امیدوں کی تلاش

اب تو گھر بھی اک بیاباں کا نمونہ بن گیا
اے جنونِ کار فرما تا قیامت زندہ باش

درد بھی تا حدِ امکان تحمل دل میں ہے
تا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں رازِ حسن فاش

دل سی نازک چیز کا ہر وقت کھٹکا ہی مجھے
انکی نظروں سے کہیں گر کر نہ ہو یہ پاش پاش

سرد مہری سے زمانہ کی طبیعت بجھ گئی
دل ہی پہلو میں کہ گویا برف کی ہی کوئی قاش

قیصر (بھوپال)

چشمِ جانان

کیا لکھوں اس کی کیسی آنکھیں ہیں / جھیل کی سطح جیسی آنکھیں ہیں
یہ وہ جادو بھری ہیں آنکھیں ہاں / جن میں شوخی ہے اور شرم نہاں
شرم کے ساتھ جذبۂ الفت / ہے سرور اس کا مایۂ راحت
ہے ان آنکھوں میں اک کشش ایسی / کیسی ہی رات کی ہو تاریکی

اپنی جانب یہ کھینچ لیتی ہے
مانع اسکی نہیں ہے کوئی شے

خوشنما آنکھیں یہ سمندر ہیں / ولولے ایسے اس کے اندر ہیں
کوشش و سعی لاکھ کیجے، مگر / دیکھ سکتی نہیں ہے اُن کو نظر
جس طرح موسم بہاری میں / آسماں ہو۔ ہیں ویسی ہی آنکھیں
ان رسیلی نشیلی آنکھوں سے / کیوں نہ ہو حد سے بڑھکے عشق مجھے
ہیں یہ آنکھیں بصد شکوہ و شان / مثل توام ستاروں کے تاباں
روشنی کا منارا انھیں کہئے / منتظر ان کے دید کے رہیے
رکھتا ہوں ان کو اپنی نظروں میں / تاکہ نکلیں مری تمنائیں

ایسے روشن منار ہیں ہادی
پھر تو گھبرا نہ جاؤں گا میں کبھی

ہچکچاتا ہوں آنکھیں کہنے سے / اِن کو۔ یہ تو ہیں صاف آئینے
عکس اِن آئینوں میں الفت کا / دیکھ لو صاف ہے نظر آتا
ہاں، بخوبی ہے یاد وہ دن / بھول جاؤں اُسے نہیں ممکن
نظریں دونوں کی جب ملیں باہم / ساتھ ہی روحیں ہوگئیں ہمدم
آنکھ سے اُسکی میری آنکھ ملی / نکلی دل سوز اک چنگاری

اُف نظر ہائے وہ ترے غمزے — وہ کچوکے تری کٹاری سے
ابرؤوں اور پلکوں میں سے تری — مدہ بھری آنکھیں یہ غضب ڈھاتی

رقص کرنے پہ جب وہ آتی ہیں
ہر گھڑی بجلیاں گرا تی ہیں

آنکھ سے اُس کی آنکھ میری ملی، — ہوئی بوچھاڑ پھر تو تیروں کی
غلط انداز کی جو اُس نے نگاہ — دفعتہً دل سے میرے نکلی آہ

نگہ لطف سے جو پھر دیکھا
ہوگیا پھر میں جیسے تھا ویسا،

کیا زیارت مجھے ان آنکھوں کی — اے خدا پھر نصیب بھی ہوگی
وہ کن انکھیوں سے دیکھنا اُس کا — اُسکا دیکھکر آنکھیں پھر چرا لینا
کیا کہوں کیسی اُس کی ہے یہ ادا — دل یہ کہتا ہے کیجیے جان فدا

اے خدا! کاش پھر وہ وقت آئے
دل کی حسرت مری نکل جائے

(ماخوذ از انگریزی) — **شاکر (میرٹھی)**

بیاض حضرت کوثر اکبرآبادی (علیگ)

ہر جنبش نظر میں ندامت کی اک جھلک (لا اعلم) اس اعتراف جور کے قربان جائیے
ہزار بار یہ دیکھا کہ ان کے چہرے سے (لا اعلم) نظر جو ہٹ گئی آنکھوں میں روشنی نہ رہی
نشے میں آنکھ میں کچھ نیند کچھ بیداریاں (دلگیر) پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھئے
میرے رونے کا جس میں قصہ ہے (جوش) عمر کا بہترین حصہ ہے
نیچی نظروں سے گذر جائیں گذرنے والے (فانی) دل کی ٹھہری ہوئی دنیا تہ و بالا نہ کریں
منہ چھپانا تھا انہیں پہلے ہی روز (لا اعلم) اب کیا پردہ تو کیا پردہ کیا

نیرنگ زمانہ

لاتی ہے رنگ کیا کیا نیرنگئی زمانہ — پیش نظر کرشمے رہتے ہیں اس کے کیا کیا
اک نقش بوالعجب ہے یہ عالم طلسمی — جادو بھرا ہوا ہے اسکا ہر اک تماشا
حیرت فزائے دیدہ اس کا ہر ایک منظر — رنگ فریب ہر دم اس کا ہر ایک جلوا
تارا بنا ہوا ہے آنکھوں کا ہر بشر کی — پنہاں نظر نظر میں ہے نور حسن اس کا
وہ دلفریبیاں ہیں اس کی ادا ادا میں — ہر دل فدائے صورت ہر چشم دید شیدا
دل سینکڑوں اڑائے آنکھیں ملا ملا کر — ہے چشم سحر فن میں جادو کسی پری کا
چالوں سے اسکی فتنے اٹھتے ہیں ہر قدم پر — رفتار ہے مقرر محشر کا اک نمونا
حیرت میں ڈالتا ہے رنگت بدل بدل کر — بازی گری ہے اسکی ادنی سا اک کرشما
ممکن نہیں نکلنا دام بلا سے اس کے — ہر رشتۂ محبت ڈالے ہوئے ہے پھندا
رکھتا ہے گردشوں میں دزات ہر کسی کو — گردوں سے کم نہیں ہے کچھ اسکا دور دورا
لاڈالتا ہے سب کو گرداب نیستی میں، — یہ موج بحر ہستی ہے اسی کا اک کنارا
بربادیاں لگی ہیں ہر سو قدم قدم پر — دشوار ہے بشر کو اسمیں سنبھل کے چلنا
جو سر ابھارتا ہے ہوتا ہے سرنگوں وہ — یکساں نگاہ میں ہے پست و بلند اسکا
حاصل غم توام ہے اسمیں ہر اک بشر کو — پاتے نہیں خوشی کا نام و نشان اصلا
نقشہ ہے راحتوں کا تصویر رنج و غم کی — آلام نے اڑایا عیش و طرب کا خاکا
آغاز شادمانی انجام صد الم ہے، — ہنسنا کوئی گھڑی کا ہے عمر بھر کا رونا
محلوں کے جو یہاں پر کل خواب دیکھتے تھے — ظالم نے آج انکو زیر زمیں سلایا
سب کو مٹا مٹا کر اک دن مٹے گا خود بھی — ہستی میں اس کی پنہاں ہے رنگ نیستی کا
تصویر اس جہاں کی اک نقش ہے خیالی — دھوکے میں ڈالتا ہے انساں کو اسکا نقشا
بہتر یہی ہے اس سے دل کو بچائے رکھئے — اچھا نہیں ہے رونق چالوں میں اسکی آنا

رونق (دہلوی)

یا للعجب

سمجھتا ہوں دم بھر میں یہ دم نہیں ہے
مگر پھر بھی خوش ہوں کوئی غم نہیں ہے
تعجب تعجب تعجب تعجب

لحد کا بھی ڈر ہے مگر ہنس رہا ہوں
سفر کا خطر ہے، مگر ہنس رہا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

ہے پیش نظر انقلاب زمانہ
ہر اک آج کی بات کل ہے فسانہ
ہر اک قافلہ ہو رہا ہے روانہ
نہیں اس ٹھکانے کا کوئی ٹھکانہ
سمجھتا ہوں، دنیا میں، میں چند دن ہوں
مگر پھر بھی بے فکر ہوں مطمئن ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

میں کوشش میں خاک جہاں چھانتا ہوں
پھر اس پر مقدر کو بھی مانتا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

اُسی لغویت میں، میں خود پھنس رہا ہوں
مگر غیر کے فعل پر ہنس رہا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

کوئی کام نیکی کا کرتا نہیں ہوں
خدا کو سمجھتا ہوں ڈرتا نہیں ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

امجد (حیدر آباد)

غزلیات

از جناب منشی سید مہدی حسن صاحب احسن ڈرامٹسٹ لکھنوی

خودکشی کا مسئلہ گو موردِ الزام تھا
اتفاقاً میں وہ کر گذرا جو تیرا کام تھا

ہستیٔ فانی کا اک جلوہ برائے نام تھا
میں چراغ صبح تھا یا آفتاب شام تھا

فطرتاً احکامِ اغلاط سے مجھے نفرت نہ تھی
عشق سے فرصت اگر ملتی تو اچھا کام تھا

تھی خلل انداز خلوت میں کشاکش نزع کی
روح کو گہوارۂ دل میں بہت آرام تھا

ہم سے ناحق ہے ہماری سخت جانی کا گلہ
آپ خنجر دیکھ لیتے یہ تمہارا کام تھا

لفظ کے معنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی
موت یعنی عشق کا اک دوسرا ہی نام تھا

اک بیہوشی سے وابستہ رہی امید و بیم
چارہ گر خطرہ سمجھتے تھے مجھے آرام تھا

ہجر کی شب دیدۂ خوں بار کے کام آ گیا
وہ جو اک قطرہ لہو میں برائے نام تھا

احسن ارباب حسد کی ہم نے کچھ پروا نہ کی
دوست وہ کرتے رہے جو دشمنوں کا کام تھا

از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

نہیں ہے نام کو مہر و مروت مہ جبینوں میں
ادائے جانستاں کے اور کیا ہے ان حسینوں میں

وہ ظاہر ہوں کہ مخفی ہوں وہ ہر حالت میں ہیں دلکش
انوکھے ہیں، نرالے ہیں جہاں کے نازنینوں میں

ستم کوشی دل آزاری، جفا جوئی، دغا بازی
بھری ہیں خوبیاں اس قسم کی لاکھوں حسینوں میں

خدا کی دین ہے یہ ہر کسی کو مل نہیں سکتی،
محبت گھر بناتی ہے ہمیشہ پاک سینوں میں

ہے باہر سرحد ادراک سے تیرا تصور بھی،
نظر آتی نہیں تصویر تیری دوربینوں میں

کیا کرتا ہے جو کسب ضیائے مہ تمام سے
کہ اختر بھی ازل سے ہی تمہارے خوشہ چینوں میں

از خاکسار عبد الرحمٰن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا

شغل ہے عشق آدمی کے لئے
دل ہے سینہ میں درد ہی کے لئے

رنج و فرقت ہے وصل ہی کے لئے
غم زمانے میں ہے خوشی کے لئے

گذر اپنا وہیں نہیں ہوتا
خاک اڑاتے ہیں جس گلی کے لئے

بے قراری پہ میری کہتے ہیں
جان کیوں دے کوئی کسی کے لئے

کیا خبر تھی کہ جان جائے گی
دل لگایا تھا دل لگی کے لئے

لاگ ہو یا لگاؤ کچھ ہو ضرور
دہر میں لطف زندگی کے لئے

تم کو زیبا ادائے محبوبی،
ہم ہیں اے جان عاشقی کے لئے

ہم ہوں یا خضر یا ہوں عزرائیل
موت ہے ایک دن سبھی کے لئے

ہے شراب اک دوائے روح فزا
اس بڑھاپے میں شیخ جی کے لئے

کہتے ہیں وہ کہ لے ہم آئے ہیں
آج خوشتر تری خوشی کے لئے

تنقید و تبصرہ

اردو رسالے

الناظر (لکھنؤ) یہ رسالہ کم و بیش پندرہ سولہ سال سے برابر پابندی کیساتھ بہ زیر ادارت جناب ظفر الملک صاحب علوی لکھنؤ سے نکلتا ہے شروع شروع میں یہ رسالہ نہایت شاندار نکلتا تھا ملک کے لائق اہل قلم اس کے خصوصی مقالہ نگار تھے ہر وقت اسکو اعلیٰ ترین بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔ "نظر سے خوش گزرے" کے پُر از معلومات اور چُبھتے ہوئے فقرے دلوں کو تڑپا دیتے تھے ایک عرصہ تک اس کا یہی رنگ رہا لیکن افسوس کہ حوادث روزگار نے اسکو بھی ایک حالت پر نہ رہنے دیا تاہم اب بھی اس میں ایک نہ ایک علمی مضمون ضرور ہوتا ہے چنانچہ اگست ۲۶ سنہ کے نمبر میں پروفیسر منتخب ولی الرحمٰن صاحب۔ ایم۔ اے کا طویل مضمون "منطق شہادت" نہایت پر مغز و کار آمد ہے اور خود ایڈیٹر صاحب کا مسلسل مضمون "سفر حجاز کی مختصر روداد" روزنامچہ کی صورت میں خوب ہے۔

ستمبر نمبر میں جناب محمد خلیل الرحمٰن صاحب (صاحب اخبار الاندلس) کا تاریخی مضمون "تاریخ عرب" نہایت محققانہ ہے "شمع بے نور کا مدر ڈیوں کا نزع" دلچسپ ہے سید محی الدین صاحب قادری زور (صاحب روح تنقید) نے بڑی تحقیق و تلاش سے "میر انیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر" ظاہر کیا ہے۔

غرضکہ الناظر اب بھی اردو اور ملک کی خدمات انجام دیتا رہتا ہے ہر سال ایک انعامی مضمون بھی ہوتا ہے جس میں اہل قلم کو اپنی محنت کا کافی معاوضہ مل جاتا ہے۔

الناظر میں سب سے زیادہ جو بات ہمیں نئی اور قابل تقلید نظر آئی وہ یہ ہے کہ اس میں "پچھلے مہینے کے رسالے" کے مستقل عنوان کے تحت موقت الشیوع رسائل کے اعلیٰ علمی مضامین کا اخذ و اقتباس یا اُن کی روح کھینچکر قارئین الناظر کو بھی مستفید کیا جاتا ہے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی ضخامت ۰۰ صفحے قیمت للعہ، پتہ الناظر پریس لکھنؤ۔

نگار (بھوپال) اس رسالہ کے بہترین ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جبکہ اسکی عنان ادارت ملک کے ایک ایسے ادیب دانشا پرداز کے ہاتھ میں ہے جس کی جادو بیانی کا ایک عالم معترف اور جس کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق نے ملک سے خراج تحسین وصول کرکے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا ہے۔

حضرت نیاز فتحوری ملک کے ان مستثنے انشا پردازوں میں سے ہیں جن کا ادبی اردو پر زبردست احسان ہے آپ کے ادبی شہ پارے اس قابل ہیں کہ تاریخ ارتقائے ادب میں زریں حروف سے لکھے جائیں ہم یہ دیکھ کر بیحد خوش ہیں کہ ملک نے ان کی علمی وادبی خدمات کی قدر بھی ویسی ہی کی جیسکے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

چار پانچ سال کا عرصہ ہوا جب "نگار" اپنے آتشیں رخسار کی ضیا پاشیاں کرتا ہوا دنیائے ادب میں جلوہ افگن ہوا تھا عناصر نگار میں چند ایسے نفوس بھی تھے جن کے ادبی مضامین نے دنیائے ادب میں ایک تازہ ہل چل اور نئی روح پھونک دی تھی خصوصاً صاحب لالرخ (لطیف الدین احمد) کے لازوال ادبیات نگار کی حیات وشہرت کے اصلی باعث ہیں۔ لیکن اب مدت سے حضرت نیاز ان سے بے نیاز ہو گئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اب نیاز صاحب نگار کو ادبی رنگ (ادب لطیف

سے پاک رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ اکثر انکے گذشتہ ملاحظات سے ظاہر ہے وہ چاہتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب لطیف کا اردو کے خزانہ میں اسقدر سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ اب ملک کو اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب ٹھوس مضامین کی طرف عوام کو رغبت دلائی جائے اور ایسے علمی مضامین صفحات نگار میں پیش کئے جائیں جس سے ناظرین کو جائز طور پر فائدہ پہنچے اگرچہ ایک حد تک نگار کو اس میں کامیابی ہو رہی ہے مگر اس میں صرف ٹھوس اور علمی مضامین ہی کا انبار نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس امر کا التزام بھی کیا جاتا ہے کہ ٹھوس مضامین کے پڑھنے کے بعد دماغ کی تکان دور کرنے کے لئے ایک دو دلچسپ فسانے عمدہ نظمیں شیریں ظرافت، اور کبھی کبھی طنزیات پر بھی کوئی مضمون بہم پہنچایا جاتا ہے۔

زیر نظر نمبر (اکتوبر و نومبر) بھی اپنی گوناگوں خوبیوں سے مالامال ہے "مطالعہ شاعری"... "محمد بن ابی عامر" اور "لارڈ ریڈنگ کا عہد حکومت"، خوب مضمون ہیں "روح تنقید کی ضرورت" اور "مخالفین کے اعتراضات کا جواب" بھی محنت سے لکھا گیا ہے نسانوں میں "شکست عہد" "اعانت مجرمانہ" اور "مرتضیٰ جاسوس"، اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھے ہیں نومبر نمبر میں "میر تقی میر کے خانگی حالات کی ترجمانی"، خوب کی گئی ہے "اثر دہلوی" اور "بدیہہ گوئی" بھی ادبی مضمون اچھے ہیں تاج محل (آگرہ) کے متعلق مسٹر اولڈوس ہکسلے کے اعتراض کا جواب اگرچہ

شنہ ہی لیکن ایک متعصب انگریز کے جواب کی طرف دو میں سب سے پہلے نگار نے اقفنا کی اُمید کا ایکے متعلق واقفیت رکھنے اور فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب ایڈیٹر صاحب کی درخواست پر توجہ فرما کر اس مشرق کی بہترین عمارت کی نسبت معترض کے اعتراض کا مدلل و رشافی جواب دینگے

اس نمبر کے فسانوں میں ایڈیٹر صاحب کا فسانہ "نقاب اُٹھ جانیکے بعد" ہمارے ہندوستانی پیران طریقت کی توجہ کے قابل ہے۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے امید کر ایڈیٹر صاحب اس سلسلہ کو جاری رکھکر پیری مریدی کی بے تکلف گھنونی رسومات کو اور بھی بے نقاب کرینگے

نگار کی قبولیت عام کی سب سے بڑی وجہ "استفسارات" ہے جسمیں ایڈیٹر صاحب کیطرف سے نہایت قابلانہ اور محققانہ جوابات ہوتے ہیں یہ سلسلہ اب ادنیٰ و اعلیٰ طبقہ میں اسقدر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ جس نمبر میں ایڈیٹر صاحب کی مصروفیتوں کے باعث یہ مستقل عنوان نہیں ہوتا تو ناظرین کو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ ہم ایڈیٹر صاحب کو صلاح دینگے کہ نگار نے باوجود چند سالہ عمر کے اپنے دامن میں جن جواہر پاروں (اشعار و جوابات) کو جمع کیا ہے وہ اسقدر اہم اور ضروری ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ فنون کی حیثیت سے ترتیب دیکر بہت جلد کتابی صورتمیں شائع کرا دیئے جائیں تاکہ خواص و عوام کی معلومات کیلئے ادب اردو میں ایک بیش بہا سرمایہ فراہم ہو جائے۔

سائز ۲۰×۲۶/۸ لکھائی چھپائی خاصی حجم ۹۶ صفحات سالانہ صرف جو اتنے بڑے رسالہ کیلئے بہت کم ہے۔ پتہ نور محل بھوپال۔

نظر - یہ چھوٹا سا گرخوشنما رسالہ پہلے پہل ترچھی نظر بنکر نکلا تھا اور اب صرف "نظر" ہو کر دارالادب لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر اعزازی جناب سید فدا حسین صاحب بی۔ اے ہیں اور اراکین ادارت خصوصی میں چار نام اور ہیں یہ پانچوں نظر کے حواس خمسہ ہیں اور انہیں کی مساعی جمیلہ سے نظر اپنی نظر فریبیوں سے شائقین ادب کے دلوں کو لبھاتا رہتا ہے۔

اس رسالہ میں اگرچہ ادبی مضامین کا عنصر غالب ہوتا ہے تاہم بعض دفعہ اچھے مضامین بھی نظر آجاتے ہیں چنانچہ اگست نمبر میں جناب ایم۔ ایس عبدالرحمٰن صاحب وارثی کا مضمون "تعلقات ازدواجی" اور ستمبر نمبر میں الف لیلیٰ کے متعلق جناب مسعود الرحمٰن صاحب ندوی کا محققانہ مضمون اچھا ہے۔

لیکن ہم مدیران خصوصی میں سے جناب آئین سلونوی کو یہ ہدایت ضرور کرینگے کہ وہ ادبی زادب لطیف، مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں اور ایسے مضامین اول تو قابل اندراج ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر اس سے رسالہ پورا کرنا ہی مقصود ہو تو اور بات ہے۔

ایسے ادبی مضامین غائر نظر سے دیکھے جانے کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بیشتر حصہ مہملات اور بھاری بھاری الفاظ کے استعمال پر مشتمل ہوتا ہے چنانچہ "وفائے عہد" میں لفظ چکاں کا کوئی دس بارہ جگہ استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ عجیب وغریب ترکیبوں

کے ساتھ مثلاً ترنم چکاں - فردوس چکاں - گریہ چکانی -
سیم چکانیوں - بہار چکاں - قمر چکاں - علم چکاں تیز یہ
چکانیاں وغیرہ اسی طرح لرزش اور لرزاں کا بھی جا
بجا استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ جدت کیا تہہ لہذا حضرت
آئین صاحب سلونوی کا فرض ہے کہ حتی الوسع ایسے
مسموم لیٹریچر سے نظر کو بچائے رکھیں - لکھائی چھپائی اور
کاغذ اوسط ضخامت ۶۰ صفحے سالانہ تین روپے (ت۔ نظر)

پیمانہ (آگرہ) یہ رسالہ شروع میں جناب ساغر
صاحب کی زیر ادارت چھوٹی تختی پر نکلتا تہا اب کچھ
عرصے سے بڑے سائز پر باتصویر نکلنا شروع ہوا ہے جسکے
مدیر اعلیٰ حضرت سیماب اکبرآبادی اور مدیر ثانی ساغر صاحب
ہیں ابتداءً ایڈیٹر صاحب کی جدت آفرین طبیعت سے "دو
منگوریات"، کے رنگ میں نہایت عریاں اور حیا سوز جذبات
نکلتے تہے جس میں علاوہ مہملات کے غیر مانوس الفاظ اور
نئی نئی لایعنی ترکیبوں کی بھرمار ہوتی تہی - جسپر معاصرین
نے بہت کچھ تنقید کی خصوصاً ادو تاریخ کی سال گذشتہ
کے فائل میں "ساغر و پیمانہ"، پر کئی مسلسل مضامین شائع
ہوئے ہیں مضمون نگار نے پیمانہ کی بعض ایسی فاحش
غلطیاں تبلائی ہیں جنکو تسلیم نہ کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر
اسکے اس حصہ کو جس میں ساغر و سیماب پر بعض بیجا حملے
اور فحش الزامات عائد کئے گئے ہیں نظر انداز کر دیا جائے
تو ماننا پڑے گا کہ مضمون نگار نے بعض ایسے وقیع لیٹریری
اعتراضات کئے ہیں جو پیمانہ کی پیشانی پر ہمیشہ کلنک کے
ٹیکے کی طرح روشن رہیں گے -

چند ماہ ہوئے پیمانہ کو آگرہ سے لاہور منتقل کیا گیا
تہا لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آنے پر پھر آگرہ
آگیا ہے جہاں سے زیر نظر مشترکہ نمبر (ستمبر اکتوبر)
نکلا ہے -

مستقل عنوانات میں سے "مدرجات"، "ساغر و
پیمانہ کی رعایت سے، بجائے ایڈیٹوریل یا شذرات کے
ہے ہر مستقل عنوان کے مضامین کی علیحدہ علیحدہ فہرست
ہوا کرتی ہیں جس میں فضول ایک ایک صفحہ رکا جاتا
ہے شاید ایڈیٹر صاحب پیمانہ کے نزدیک زبان کے تمام کتابی
سواد ادبیات میں شامل ہیں اسی لئے "دل اتحاد
کے ترشے اور دنیا کا مستقل "قانون تمدن اور
سیاسات مدن"، اور شاہجہاں کا یومیہ پروگرام "ادبیات
کے مستقل عنوان کے تحت میں آگئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ
پر اچھے ہیں - ثنائیات میں بھی تمام مضامین اچھے ہیں -
نظموں میں ساغر صاحب کی نظم "چاند کا تبصرہ امنیات
عالم پر" جدید طرز پر لکھی گئی ہے جو طویل ہونے کے باعث
دو نمبروں میں ختم ہوئی ہے اور آٹھ نو صفحوں پر حاوی
ہے "شاعری" پر جناب محمود صاحب اسرائیلی کی نظم
خوب ہے اسی طرح ملکہ شعریت، عورت کا دل، محبت
کے ساز پر طرب کا گیت وغیرہ اچھی نظمیں ہیں الہامات
کے تحت میں بھی تمام غزلیں اساتذہ حال کی فراہم
کی گئی ہیں -

ادیب مرحوم کی طرح تصویر کے متعلق ایک نظم بھی تی
ہے چنانچہ شروع میں ایک یورپین لیڈی کی مغربی مذاق
کی تصویر ہے جو "بہار شباب" سے موسوم کی گئی ہے
اور جس پر جناب منظر صاحب صدیقی نے نظم میں اظہار
خیال فرمایا ہے۔ دوسری تصویر کابل کی عیدگاہ کا
"معانقہ" ہے جو افغانستان کے جدید دور تمدن کا ثبوت
ہے۔ رسالہ میں ایک کارٹون بھی دیا گیا ہے جو ایک ادبی
رسالہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتا۔ بہرحال رسالہ
اچھا ہے۔
لکھائی چھپائی اور کاغذ خاصہ ہے ضخامت ۸۰ صفحات
سالانہ قیمت ؏ (پیمانہ دارالادب آگرہ سے ملسکتا ہے)

نیرنگ (رامپور) یہ رسالہ بھی پہلے چھوٹی تختی پر
جناب محمد عزیزاللہ صاحب عزیز۔ ایچ۔ پی کی ایڈیٹری
میں نکلتا تھا اب بڑی تختی ۴۸ صفحات پر برابر پابندی
کے ساتھ رامپور سے شائع ہوتا ہے اس میں زیادہ تر
شعراء کا چیدہ چیدہ کلام اور تنقیدی مضامین ہوا کرتے ہیں
چنانچہ زیر تبصرہ نمبر اگست ستمبر و اکتوبر میں بالترتیب استحکام
ملکوک، اشعر حقیقت، عروض واقف، دور حاضرہ کی
شاعری، اور ایک عروضی تحقیق، وغیرہ مضامین شائقین
شعر و سخن کے لئے بکار آمد ہیں بعض مضامین کا لہجہ ذرا
سخت ہے کیا اچھا ہو اگر اعتراضات نیک نیتی پر مبنی
ہوا کریں اور کسی ذاتی مخاصمت کی بنا پر خواہ مخواہ کسی
کو نشانہ ملامت نہ بنایا جائے کہ اس سے بجائے
فائدہ پہنچنے کے ناظرین خصوصاً مبتدی شعراء کے اخلاق پر
برا اثر پڑتا ہے۔

حضرت شوق قدوائی کی مثنوی "حسن" پر ہمارے
زبردست اور پرانے انشا پرداز خان بہادر مرزا سلطان
احمد صاحب کا مسلسل تنقیدی مضمون بھی خوب ہے۔

اکثر نظمیں بہت اچھی ہیں خصوصاً جناب سید کلب احمد
صاحب مانی جائسی کی نظم "مناظرہ حسن و عشق" لیکن سخت
تعجب ہے کہ ہم اسی نظم کو یہ تیسری مرتبہ چھپی ہوئی دیکھ رہے
ہیں اول اول النصر (لکھنو) میں پھر اس کے دو تین سال
بعد نقاد (آگرہ) میں اور اب کئی سال کے بعد نیرنگ میں
دیکھ رہے ہیں۔ نیرنگستان (شذرات نیرنگ) کو دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایڈیٹر صاحب نیرنگ نے
مانی صاحب کے صاحبزادہ سے مانی صاحب کے کلام
کی درخواست کی ہوگی اور انہوں نے مانی صاحب کی
بیاض سے نقل کرکے یہ نظم روانہ کردی ہوگی اس میں
بظاہر ایڈیٹر صاحب نیرنگ کا کوئی قصور نہیں ہے مضامین
بھیجنے والے حضرات اس کے ذمہ دار ہیں انہیں ایسے
مطبوعہ مضامین کے دوبارہ چھپوانے سے احتیاط کرنا چاہئے

رسالہ میں اکثر شعراء کے خطوں کے عکس بھی
دیئے جاتے ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے رسالہ برا
نہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی قیمت سالانہ ؏ ہے۔

پتہ: منیجر رسالہ نیرنگ ریاست رامپور۔

دل (آگرہ) یہ چھوٹا سا دلکش و دیدہ زیب رسالہ جناب حکیم سید وصی حسن صاحب شباب اکبر آبادی نے اپنی ادارت میں محض ادبی خدمات کو سر انجام دینے کی غرض سے جاری کیا ہے اور ایک حد تک اسکو اسمیں کامیابی ہو رہی ہے۔ آگرہ کے مشہور ادیب جناب لطیف الدین احمد صاحب، حافظ امام الدین صاحب، شفیع احمد صاحب شفیع اکبر آبادی اور محمود صاحب الہی مقتدر و مستند ہستیاں اس کو بہترین ادبی رسالہ بنانے میں کوشاں ہیں نقاد مرحوم کے بھی بعض خصوصی مقالہ نگار گاہے ماہے اسمیں نظر آجاتے ہیں یعنی مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی اور مولوی نذیر علی صاحب درد کاکوروی وغیرہ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر حجم ۳۲ صفحے سالانہ عہ

پتہ۔ گڈھیا حکیمان آگرہ سے طلب فرمائیے۔

ظل السلطان (بھوپال) دار الاقبال بھوپال کا یہ زنانہ لٹریچر کا ماہانہ رسالہ برابر دس سال سے اپنی مسلسل خدمات انجام دے رہا ہے زنانہ لٹریچر کے اور بھی بہت سے رسالے نکلے اور ناقدردانی زمانے کے ہاتھوں فنا ہوگئے اب بھی کئی رسالے نکلتے ہیں اور آئے دن نکل رہے ہیں لیکن اس نے خواتین ہندوستان کے کارآمد مضامین کا حصہ ذخیرہ بہم پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا۔ نیز یہ فخر بھی اسی رسالہ کو حاصل ہے کہ اس کی ناظرات اور مسلسل پڑھنے والیاں آج ملک کی اچھی انشا پردازوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

آجکل بعض زنانہ رسائل میں اکثر انشا پرداز خواتین کے قلم سے نکلے ہوئے نہایت مخرب اخلاق اور پایہ ارتقا سے گرے ہوئے مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن ظل السلطان کی یہ خوبی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے ہمیشہ پاک و صاف رکھا اور اپنے سنجیدہ معیار سے ذرا بھی ہٹنے نہیں پایا اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں ابتداً جن چند متبرک و مقتدر ہستیوں کے مضامین نکلتے تھے اب ان سے محروم ہے لیکن اس سے رسالہ کی شان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا خصوصاً جب سے جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر نے اس کی ادارت کا بار اپنے ذمہ لیا ہے رسالہ کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

زیر تنقید ستمبر نمبر میں مدقعیہ کی سرگذشت،، ناظم زادہ نے خوب لکھی ہے اور افادات رسکن ،، دہ حورت ،، کے متعلق محمد عبد الجمیل صاحب نے بڑی محنت سے اقتباس کیا ہے اور عباسی بیگم صاحبہ کا مد صحرا کا پھول،، بھی سبق آموز فسانہ) خوب ہے جو مسلسل ہے اکتوبر کے رسالہ میں دو حفظ الاطفال حکیم محمد ابراہیم صاحب کا کیا نہ مضمون بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے پہلا نو میں تعلیم نسواں کی ترقی کی تدبیریں بادیہ محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا دو انعامی مضمون ہے جو ایڈیٹر اخبار دو دربار،، کے مضمون نگار خواتین کی ہمت افزائی کے خیال سے اسی

موضوع پر انعامی مقابلہ کے اعلان پر لکھا گیا تھا اور جس پر جناب موصوفہ اور خیر النسا صاحبہ نے انعامات حاصل کئے تھے اس مضمون میں نہایت مفید اور قابل عمل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ "اولاد کی شادی کرتے وقت کن باتوں کا لحاظ کرنا چاہیے" اور "اسلام میں عورت کا درجہ" اہلیہ مولوی سعد الدین حیدر صاحب اور اہلیہ نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اچھے مضمون لکھے ہیں اس کے علاوہ حضرت قیصر صاحب ہر ماہ کشکول میں نایاب جواہر پارے جمع کرتے ہیں۔ اور کبھی عالم نسواں کی خبروں سے بھی ناظرات ظل السلطان کو واقفیت بہم پہنچایا کرتے ہیں

غرض کہ رسالہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہندوستان کے ہر خواندہ اور ناخواندہ مرد و زن کو اسکا پڑھنا اور سننا نہایت ضروری ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ برا نہیں حجم ۴۸ صفحے سالانہ تین روپئے۔

پتہ:- منیجر رسالہ ظل السلطان بھوپال

اقتباس (بمبئی) یہ دیکھ کر کہ اب بلدۂ بمبئی جہاں دُنیا بھر کے اسباب تعیش کی فراوانی۔ دولت کی ارزانی اور ہر قسم کے لہو ولعب کی افزائش ہے وہاں اب علمی مذاق کی بھی روز افزونی ہے، بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے اگرچہ آج سے بہت پہلے یہاں سے بہت سے ادبی رسالے نکلتے تھے لیکن وہ یا تو تمام تر شاعرانہ مطارحات پر مبنی ہوتے تھے یا شعراء بمبئی کے باہمی مجادلہ کا میدان ہوتے تھے جنہیں اس مبحث سے ہٹ کر ایک دوسرے پر نہایت شرمناک حملے کئے جاتے تھے۔

اگر ہماری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بمبئی کے ابتدائی گلدستوں میں برق، منشور شفاعت، ارمغان فرخ، غنچۂ جاوید، آفتاب، معلومات الوارث، شکسپیر، اور لبرل اپنے مقاصد و اغراض باحسن الوجوہ ادا کرتے تھے، موخر الذکر دو تین رسالے مخزن کے تتبع میں بہت کچھ علمی خدمات انجام دیتے تھے خصوصاً حضرت ناظم لکھنوی کا لبرل اور ان کے استاذ حضرت ناطق سرسوی کا معلومات الوارث صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت کرتے تھے اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اہل بمبئی پر ایک جمود کا عالم طاری رہا اور اگر اس درمیان میں کوئی گلدستہ نکلا بھی تو اس کا عدم و وجود یکساں رہا۔

لیکن مسرت کا مقام ہے کہ اب اسی مقام سے طویل خاموشی کے بعد چند بہترین رسالے نکل رہے ہیں چنانچہ انوار القدس (صوفیانہ) انجمن اشاعت اردو کی طرف سے اقتباس، انجمن معین الادب کی جانب سے ادبستان علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان میں **اقتباس** سب سے چھوٹی اور چار جزو کا رسالہ ہے جس کی عنان ادارت جناب شبر صاحب بدایونی کے ہاتھ میں ہے اقتباس کا ساتواں نمبر بابت ستمبر ۲۶ء ہمارے پاس بغرض تنقید موصول ہوا ہے۔ اس میں پہلا مضمون "ہماری چند انشاپرداز خواتین" جناب حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے میرٹھی کا لکھا ہوا ہے

فاضل مضمون نگار نے چند مضمون نگار خواتین کے ان جذبات عریاں پر جو انشائے لطیف کے نام سے ملک کے بعض ادبی رسائل میں رہتے ہیں تنقید کی ہے اور جا بجا ان کے ان حیا سوز مضامین کے نمونے بھی درج فرمائے ہیں جس سے نہ صرف خواتین کو احتراز کرنا چاہئے بلکہ ہمارے شعرا اور ادب لطیف کے شیدا ادیبوں کو بھی پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ مضمون "نگار" سے اقتباس کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا اسیطرح حضرت نیاز کا فسانہ "فریب خیال" بھی نگار سے بلا حوالہ نقل کیا گیا ہے "بیحجابی اور تعلیم نسواں کا چوتھا نظارہ" میں جناب فصیح الزماں صاحب نے مرد کے مقابلہ میں عورت کی عدم افضلیت کا نہایت عالمانہ اور محققانہ ثبوت پیش کیا اس مضمون کے تین نظارہ اگلے نمبروں میں نکل چکے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب اقتباس کی خدمت میں کیا ہم یہ مشورہ پیش کرسکتے ہیں کہ انتخاب و اقتباس مضامین میں بلند حوصلگی سے کام لیں کہ مضامین اقتباس کے لئے بہت وسعت ہے

بہرکیف رسالہ کی ابتدائی حالت اچھی ہے سالانہ عہ

پتہ:۔ قادر بلڈنگ بمبئی نمبر ۸

ادبستان۔ یہ بھی بمبئی کا ایک باتصویر ادبی رسالہ ہے جناب رشید صاحب صدیقی کی ادارت میں ستمبر ۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا ہے پہلے نمبر میں جناب قمر احمد صاحب بی۔ اے ال ال۔ بی۔ مدیر روزنامہ خلافت بمبئی نے "مذاق شاعری" خوب لکھا ہے "اسلام ملوکیت" پر راجہ غلام حیدر خانصاحب نے نیتجہ خیز مضمون لکھا نامور انشا پرداز جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے اپنے مخصوص رنگ میں "دعائے نیم شبی" میں ایک فرضی آنریبل ایم سی (ممبر آف دی کانسل) کا مضحکہ خیز خاکہ اڑایا ہے باقی تمام مضامین مبتذل اور غیر مفید ہیں نظموں میں جناب محمود اسرائیلی کی نظم کنول اور مولینا وحیدالدین صاحب سلیم کی غزل خوب ہے۔

اکتوبر نمبر میں "اردو رسائل کا کیا نصب العین ہونا چاہئے" راجہ غلام حیدر خانصاحب نے خوب لکھا ہے بلکہ سارے رسالے میں یہی ایک کام کا مضمون ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ایڈیٹر صاحب مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں وسیع النظری سے کام لیں کہ نوآموز مضمون نگاروں کی رعایت اور حوصلہ افزائی سے رسالہ اپنے معیار سے گرجاتا ہے۔

تیسرا نمبر اگلے دو نمبروں سے اچھا نکلا ہے اسمیں مضامین بھی اچھے ہیں چنانچہ "انگلستان کے سیاح" "سلطان صلاح الدین" اور "تنظیم کے چار پہلو" قابل مطالعہ ہیں امید ہے کہ اسیطرح آیندہ نمبر میں بھی کام کے مضامین فراہم کئے جائیں گے۔

تصاویر کی نسبت بھی اتنی عرض ضرور کریں گے کہ تقرا انتخاب سے کام نہیں لیا جاتا اکتوبر نمبر میں "نور محل" کے نام سے جو رنگین تصویر زیب ادبستان کیگئی ہے وہ بمبئی کے ایک ہفتہ وار گجراتی رسالہ "بیسویں صدی" کے دیوالی نمبر سے لیگئی ہے جسمیں شہنشاہ جہانگیر کا کیرکٹر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ لب جو ہے رقص و سرود کی بزم گرم ہے اور جہانگیر "رام رنگی" کے مزے اڑا رہا ہے اسی طرح نومبر نمبر میں "نغمہ" غالباً کسی رنڈی کی تصویر ہے جو ادبستان کے لئے کسی طرح بھی زیبا نہیں ہوسکتی۔

اگر ایڈیٹر صاحب ان فروگذاشتوں کے دور کرنے کی

کوشش فرمائیں گے تو ادبستان وقعی "ادبستان" کہلائے جانیکا مستحق ہو جائیگا۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ سائز ۲۰×۲۲ ضخامت ۴ جزو سالانہ للعہ، پتہ:۔ منیجر صاحب ادبستان ۱۰ درمین روڈ بمبئی نمبر ۱۔

حرم (پیلی بھیت) ضرورت تھی کہ ملک سے ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو نسوانی علاج معالجات پر مشتمل ہو۔ شکر ہے کہ اس غرض کو لیڈی ڈاکٹر بیگم عبد الغفور صاحب ایل۔ ایم۔ پی نے بخوبی پورا کر دیا ہے اس میں تمام تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا جاننا عورتوں اور مردوں کے لئے نہایت ضروری ہے چنانچہ نمبر ۲ بابت ماہ جون میں "طویل العمری" اور "تشنج اور حمل" ایڈیٹرس صاحبہ کے "قلم سے نکلے ہوئے مضامین نہایت مفید و کارآمد ہیں علاوہ ازیں ادبی، اخلاقی، اقتصادی اور امور خانہ داری پر بھی بعض اچھے مضمون ہیں خصوصاً "ہندوستانی شاعری اور ہندو عورتیں" "مصر کی ترقی و اقتصادی حالت پر ایک اجمالی نظر" خوب ہیں اخیر میں بطور ضمیمہ ڈاکٹر عبد الغفور صاحب کا مستقل تاریخ طب اسلامیہ پر مسلسل لکچر نہایت محققانہ اور پر از معلومات ہے۔

جولائی و اگست کے مشترکہ نمبر میں بھی "پیدائشی آشوب چشم" "عسرات الطمث" اور "ایام حمل" طبی مضمون قابل قدر ہیں جناب مدیرہ صاحبہ کی جانب سے طبی معلومات بھی خوب بہم پہنچائی گئی ہیں ملک کی قابل فخر اور مشہور ادیبہ جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کا اخلاقی فسانہ "شادی خانہ بربادی" قابل قدر ہے۔ ب۔ ج صاحبہ کا "ایک عجیب خط" ادبی رنگ آمیزیوں سے بھرا ہوا ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض ادب لطیف کے شایق "جنس کرخت" کی طرح "جنس لطیف" میں بھی ایسی رنگین عبارت آرائی کرنے والی موجود ہیں۔ مدیرہ فاضلہ نے اس خط کو محض اس غرض سے شائع کیا ہے کہ "یہ طرز تحریر عورتوں کیلئے کہاں تک قابل تقلید ہو سکتا ہے؟" جہانتک ہمارا خیال ہے عورتوں اور مردوں کو ایسی ناکارہ عبارت آرائی سے جس میں مطلب کم اور غیر ضروری الفاظ کی بھرمار ہو پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہمیشہ مفید مطلب اور کام کی باتیں لکھنا چاہئیں۔

ستمبر نمبر میں بھی بعض مضامین بہت اچھے ہیں۔ بچوں کی صحت و ذہنیت، "دودھ، گندہ دہنی، اور عورتوں کے لئے کام کی باتیں"، اس نمبر کے طبی مضامین ہیں "ہمارے رہنماؤں کی پست خیالی" پر جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کی بلند خیالی قابل داد ہے اور "کلکتہ میں ایک لاکھ زنان بازاری" اور "ملک کی ترقی عورت کے ہاتھ میں ہے"، قابل عمل و مطالعہ مضمون ہیں۔

یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اس رسالہ کا مقصد اجرا یہ ہے کہ:۔

"اس رسالہ سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ غریب اور بیمار عورتوں کے علاج پر صرف کیجائیگی"، ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ ملک کے تمام خواندہ اور ناخواندہ افراد اس کے خریدار بن جائیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھی بھلا ہوگا۔

تختی چھوٹی ضخامت ۳ جزو لکھائی چھپائی بھی بری نہیں سالانہ تین روپیہ۔

پتہ :۔ دفتر حرم محلہ کھان پیلی بھیت (یو۔ پی)

اخبار علمیہ

درختوں کو رنگنے کی صنعت

جرمن کے مشہور سائنسدان فرٹز وان بہر (Fritz - von - Behr) نے درختوں کو مختلف رنگوں سے رنگنے کی عجیب غریب صنعت ایجاد کی ہے۔ وہ پوشیدہ طریقے سے عمل کر کے ایک معمولی (Beech) کے درخت کو گلاب کے پیڑ میں اور بیچ پیڑ کے درخت کو مہاگنی (Mahogany) میں تبدیل کر لیتا ہے۔ تجربہ کار رنگ سازوں اور فرنیچر بنانے والوں کو باوجود تحقیق و تفتیش کے اسکا راز معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ رنگ سطحی نہیں بلکہ درخت یا لکڑی کے اندر پیوست ہو کر پھر کبھی زائل نہیں ہوتا۔ اس قسم کی رنگین لکڑیوں سے کئی اشیا تیار کی گئی ہیں۔

عصبی امراض کا سبب

امریکہ کے نامی اطبا رنے، جو عرصۂ دراز سے اپنی تحقیقات میں مصروف تھے، معلوم کر لیا ہے کہ تمام امراض عصبی مثلاً التہاب اعصاب، ضعف اعصاب، ذیابیطس، عرق النسا، وجع القلب، وجع نعصب وغیرہ وغیرہ تا اعصاب کی میکانکی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس حرکت و تہیج کا مرکز وہ ہڈی ہے جو کمر کے نیچے اس جگہ واقع ہے جہاں کولہے کی ہڈیاں (ایک حلقہ میں) جڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے اس کا تجربہ کر کے دکھایا کہ اس ہڈی کے اپنی جگہ سے ذرہ بھر ہٹنے پر ان جوڑوں کے ذریعہ تمام اعصاب پر دباؤ پڑتا ہے جس سے یہ امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس ہڈی کو اپنی اصلی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو ان کا دعویٰ ہے کہ مریض کو جلد آرام ہو جائیگا۔

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء — نمبر ۶

زبانِ خلق

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) اپنے رسالۂ اُردو بابت اکتوبر سنہ ۲۶ء میں) زبان پر حسب ذیل ریویو فرماتے ہیں:۔

"زبان"

ایڈیٹر۔ عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی) سالانہ قیمت چار روپے۔ منگرول (کاٹھیاواڑ) یہ رسالہ ایسے مقام سے شائع ہوا ہے جہاں کی زبان گجراتی ہے۔ ہم خوشتر صاحب کو ان کی سعی پر مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ یہ نیا رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا۔ علمی و ادبی مضامین کے لحاظ سے رسالہ قابل قدر ہے مضامین کے ساتھ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ گجرات بھی ایک زمانہ میں اُردو زبان کا مرکز رہا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ جناب خوشتر صاحب اور پروفیسر نواب علی صاحب جیسے صاحب ذوق حضرات کی بدولت اس کا چرچا پھر اس خطے میں ہونے لگے ہم بھی فاضل پروفیسر کے ہمنوا ہیں کہ:۔

"مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اُردو"

رسالہ "قوس قزح" لاہور بابت دسمبر سنہ ۲۶ء۔

زبان۔ بہ ادارت جناب عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی۔ مقام اشاعت منگرول کاٹھیاواڑ سائز ۲۰×۳۰ حجم ۴۰ صفحہ سالانہ چندہ چار روپیہ

کاٹھیاواڑ سے ایک اُردو رسالہ کا اجرا، واقعی نہایت ہمت کا کام ہے اور میں کارکنان کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے اس حصہ میں اردو نشر و اشاعت کی واقعی بہت ضرورت ہے "زبان" کے دو نمبر میرے سامنے ہیں دونوں ایک سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ زبان شُستہ مضامین بلندپایہ غرض اس کی اٹھان بہت شاندار ہے۔

صفحۂ ادارت

ہمارے انحطاط و زوال کی اصل وجہ علم و ہنر سے بیگانہ وشی بتلائی جاتی ہے اگرچہ اس کی اصلیت و صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب ہم اس "بیگانہ وشی" کے علل و اسباب پر غور کرتے ہیں تو اصل حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کیونکہ ادنیٰ اور اوسط طبقے کے افراد بوجہ قلت معاش اور مخزونی افلاس تعلیم و تدریس کے اُن منازل کو بتدریج طے کرنے سے عاری ہوتے ہیں جہاں کامیابی کا امید افزا چہرہ نظر آتا ہے۔

ایسے افراد میں وہ شخص بڑا خوش قسمت مانا جاتا ہے جو سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے پہلے کچھ سد بد پڑھ لیتا ہے، ورنہ عام طور پر ان طبقات کے افراد ناخواندہ اور جاہل رہ جاتے ہیں اس کی وجہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اپنی اور اپنے متعلقین کی کم مائگی و افلاس اور گذر اوقات کے افکار لاحق ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنی تعلیم کو آگے بڑھانے کی بجائے ہوشیار ہوتے ہی کہیں نہ کہیں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اس طرح ان کی تعلیمی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں کتنی ایسی درسگاہیں اور کتنی ایسی ریاستیں ہیں جو ایسے افراد کے بچوں کو معقول وظائف دے کر انہیں فکر معاش نیز ان کے متعلقین کی گذر اوقات کی اہم ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتی ہیں؟ جہاں تک ہمارا خیال ہے ایک بھی ایسی درس گاہ یا ریاست نہیں ہے جو ان کی تعلیمی ترقی کی ممد ہوں! ہاں بعض ریاستوں میں جبریہ تعلیم کا قانون نافذ ہو گیا ہے وہ بھی محض پرائمری تعلیم تک بغیر کسی اعانت و وظیفہ کے۔

جہاں اس مصیبت میں اور صوبہ جات مبتلا ہیں وہاں ہمارا جزیرہ نما کاٹھیاوار بھی اس آفت میں گھرا ہوا ہے جسے دیکھ کر سخت ملال ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس تو ان متمول ذمہ دار حضرات اور ارباب حل و عقد پر ہوتا ہے جو اس مصیبت کا تدارک اور اس آفت کے دفعیہ کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے۔

ہمارے خیال میں کاٹھیاواڑ کے ارباب بست وکشاد کے قابل توجہ امر تعلیم نسواں ہے اگر وہ اس طرف کامل جد وجہد اور پوری سرگرمی کے ساتھ توجہ مبذول فرمائیں تو ان وساندوں کی بہت کچھ درمانی ہو سکتی ہے کیونکہ لڑکیوں پر لڑکوں کی طرح کمانے وغیرہ کا بار نہیں ہوتا صرف امورِ خانہ داری کی واقفیت ضروری ہوتی ہے جو بہت قلیل عرصہ میں حاصل ہو سکتی ہے اس لئے اگر ان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے تو وہ شادی تک خاص علمی استعداد حاصل کر سکتی ہیں، اس طرح وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے زبردست ممد ومعاون ثابت ہونگی، اور ایک اہم مسئلہ نہایت آسانی کے ساتھ حل ہو جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کچھ عرصے سے قوم کے نبض شناس افراد تعلیم نسواں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تعلیم نسواں کے متعلق، ان تھک اور قابل قدر جد وجہد کر رہے ہیں اور ان کی یہ سعی بلیغ روز بروز کامیاب بھی ہوتی جاتی ہے۔

لیکن ان سطور کے لکھنے کی اصل غایت تو یہ ہے کہ کیا کاٹھیاواڑ کے ذی حوصلہ اور ذمہ دار حضرات نے بھی اس مسئلہ میں کوئی عملی کارروائی کی؟ اور اگر کی ہے تو کس حد تک کامیابی ہوئی؟

جہاں تک ہمارا خیال ہے مسلمانان کاٹھیاواڑ، لڑکیوں کی تعلیم صرف اسقدر ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور تعلیم نامہ کو ختم کرادے، بس یہی ان کا منتہائے تعلیم ہے، عورت کے لئے لکھنا پڑھنا بدترین گناہ سمجھ کر تعلیم نامہ سے آگے نہیں بڑھنے دیتے، اتنی تعلیم بھی محض اس لئے دلائی جاتی ہے کہ لڑکی کا ناطہ جوڑتے وقت لڑکے والوں کو یہ کہہ سکیں کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔

اگرچہ کاٹھیاواڑ کے دو تین شہروں میں جہاں متمول میمنوں کی آبادی بکثرت ہے لڑکیوں کے مدرسے کھول دیئے ہیں لیکن ان کا تعلیمی معیار نہایت پست ہے تاہم شکر ہے کہ اب اہل کاٹھیاواڑ بھی اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں اگرچہ پردہ خواتین ہند کی تعلیمی ترقی میں سد سکندری کی طرح حائل ہے۔

انہیں امور کو د نظر رکھ کر حال میں ہمارے بیدار مغز اور علم دوست رئیس عالیجناب نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر بالقابہ نے ریاست منگرول میں جابجا مدارس صبیات قائم کر دیے ہیں اور اُن کے تعلیمی نصاب کو بھی اعلیٰ پیمانہ پر لانے کی سعی فرما رہے ہیں۔ کیا کاتھیاواڑ کی دیگر اسلامی ریاستیں بھی کبھی اپنی اس زبردست ذمہ داری کو محسوس کریں گی؟

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت سے پڑھی جائے گی کہ حال میں کاٹھیاواڑ کی ایک ہندو خاتون مس جمنا بائی بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے ریاست گونڈل کے روشن خیال ٹھاکر صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری کے ممتاز عہدہ پر سرفراز ہوئی ہے جن کو ہم ان کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔
کاٹھیاواڑ میں یہ پہلی ہندو عورت ہے جو اپنی اعلیٰ تعلیم کے باعث امور مملکت کی سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے رہی ہے۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں عالی جاہ حضور نواب صاحب منگرول بالقابہ کی رقم اوقاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک عربی درسگاہ کے قیام و انعقاد کی طرف بھی موصوف الذکر کی توجہ منعطف کرائی تھی شکر ہے کہ ہماری عرضداشت ہمارے کرم گستر و علم پرور حضور ولیعہد صاحب بہادر نے توجہ مبذول فرمائی ہے بہ شرطیکہ ملک کے اہل استطاعت بھی اس کار اہم میں شرکت فرمائیں۔
امید ہے کہ بمبئی کے (اہل دل) ذی حوصلہ حضرات جنھیں مسلمانان کاٹھیاواڑ کی دینی و دنیوی تعلیم کا خیال شدت کے ساتھ ہے اس علمی تحریک میں نمایاں حصہ لے کر اپنی علم دوستی و فیاضی کا ثبوت دیں گے۔

ہم علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے کی خدمت میں ان کی انتخاب کونسل کی میمبری کی کامیابی پر دلی مسرت و بہجت کے ساتھ تحیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں

ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیمی مصارف کا حال ناگفتہ بہ رہا ہے جس کا اصل سبب ملک کی بے التفاتی

اور اہل ثروت کی بے نیازی ہے چنانچہ ہماری قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ جس کی بنیاد تحریک خلافت کے زمانہ میں پڑی تھی آج ملک کی شاکی اور مالی مشکلات کی وجہ سے جان بلب نظر آتی ہے، اگرچہ تقریباً اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی کی ودیاپیٹھ (احمد آباد) کی بنیاد بھی پڑی تھی لیکن چونکہ وہ ہندوؤں کی ہے جنہیں اپنے اس قومی تعلیمی مرکز کا پورا احساس ہے اس کے کارپردازان کو اب تک دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی، اور جامعہ ملیہ جو مسلمانوں کی ہے جنہیں اس کی اہمیت کا کما حقہ احساس نہیں ہے؟ اس کے کارپردازوں کو آج قوم کی خدمت میں اپیل کرنے کا وقت آگیا ہے۔

ہمارے پاس کارپردازان جامع ملیہ (دہلی) کی جانب سے ایک مطبوعہ اپیل برائے اندراج رسالہ موصول ہوئی ہے جس کو ہم بجنسہ درج کرتے ہوئے ملک کے ذمہ دار افراد سے اس کی اعانت و امداد کی پرجوش الفاظ میں سفارش کرتے ہیں۔

اپیل

"جامعہ ملیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) کی بنیاد اگرچہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں پڑی لیکن وہ اول دن سے ایک مستقل تعلیمی نصب العین رکھتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۴ء میں اس کے ارکان نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اسے خلافت کمیٹی سے الگ کر کے ایک مستقل اور خالص تعلیمی مرکز کی شکل دیدی جائے اس کے لئے جس قدر مالی اعانت کی ضرورت ہو اس کا بطور خود انتظام کیا جائے اور چونکہ علی گڑھ کے قیام میں اس کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اس کی رقیبانہ چشمک باقی ہے اس لئے گزشتہ سال اس کا محل قیام بھی علی گڑھ سے دہلی میں بدل دیا گیا جو ہر حیثیت سے ایک مرکزی انسٹی ٹیوشن کے لئے موزوں تر ہے ہمارا یقین ہے کہ نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ ہندوستان کے لئے ایک ایسے قومی تعلیمی مرکز کی ضرورت وقت کی اصولی اور بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اور اگر ملک کی بے اتفاقی سے یہ مرکز تکمیل تک نہ پہنچ سکا تو ایک نہایت قیمتی تعلیمی حرکت سے ملک کا مستقبل محروم ہو جائیگا، اگرچہ جامعہ کی مطلوبہ تکمیل کے لئے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن اگر بالفعل پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی کا انتظام ہو جائے تو اس کی حد تک مضبوط ہو جائیگی کہ بہتر تعلیمی نتائج فوراً حاصل کئے جا سکیں گے۔ یہ پانچ ہزار روپیہ ماہوار نہایت آسانی سے فراہم ہو سکتا ہے اگر ملک کے لاکھوں مستطیع اشخاص میں سے سو اہل خیر ایسے نکل آئیں جو پچاس روپیہ ماہوار اس عظیم الشان کام کے لئے وقف کر سکیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستان کے کروڑ مسلمانوں میں ایسے سو اہل خیر و استطاعت حضرات کا

نحل آنا کچھ دشوار نہ ہوگا بشرطیکہ اس کار عظیم کی اہمیت اور اس کے نتائج محسوس کریں۔ ہم تمام ایسے حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے لئے کم از کم اتنا ضرور کریں۔ ہم نے یہ اپیل کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرلی ہے، ہم ملک کو یقین دلائیں گے کہ اگر جامعہ ملیہ کی موجودہ حالت اور اس کے مستقبل کی طرف سے ہمیں پورا اطمینان نہ ہوتا تو ہم اس نئی اپیل کی ذمہ داری ہرگز قبول نہ کرتے۔ ہم یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اب اس انسٹی ٹیوشن کو ملک کی کسی پولیٹکل تحریک سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، اور یہ کامل معنوں میں ایک خالص تعلیمی درسگاہ ہے۔"

(ڈاکٹر سر) محمد اقبال (نواب سر) ذوالفقار علیخاں (صاحبزادہ) آفتاب احمد خاں (مولینا) ابوالکلام آزاد۔ اجمل (امیر جامعہ) مختار احمد انصاری (معتمد جامعہ)

غزل

(جناب محمد عبد الباسط صاحب باسط بھوپالی)

اشک سے روتا تھا میں اور تو غم دشمن میں تھا
ہائے اس آنسو کی قیمت جو ترے دامن میں تھا

ڈوب کر دریائے ناکامی میں کامل ہو گیا
وہ تصور جو کنار آب جو گلشن میں تھا

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
میں کہ اک روشن ستارہ صبح کے دامن میں تھا

کیا بتاؤں حسرت دیدار گل اے ہم صفیر
ہائے وہ پرواز جس سے میں کبھی گلشن میں تھا

کیوں کہوں تاریک تھی دنیا مرے گھر کی طرح
نور تھا لیکن چراغ خانۂ دشمن میں تھا

حاصل صد آرزو ہے جذبۂ شوق نظر
آج وہ چلمن سے باہر ہے جو کل چلمن میں تھا

میری آنکھوں میں رہا تو یا دل مشتاق میں
حسن کس کا جلوہ گاہ وادی ایمن میں تھا

کیوں ہنسی کو اپنے رونے پر مرجح جانئے
طعنہ زن بے حاصلی ہر خندۂ گلشن میں تھا

اب جوانی میں اسے کس چیز سے تشبیہ دوں
جزو اعظم فتنۂ محشر کا جو بچپن میں تھا

بجلیاں ہیں اور باسط کا دل مشتاق ہے
کم جوانی کا تبسم وادی ایمن میں تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

مقالات

ناصر الدنیا والدین ملک نائب خسرو خاں گجراتی

(از مولانا ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر گجرات مہا ودیالہ احمد آباد)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک دن بادشاہ سے عرض کیا کہ میں شب و روز حضور کی خدمت میں رہتا ہوں اور میرے قرابت کے لوگ جو دور دراز ملک سے صرف مجھ سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔ وہ نہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ نہ میں ان سے کیونکہ حضور کے یہاں سے رات کو فراغت پاتا ہوں تو محل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضور اگر مناسب سمجھیں تو محل کی چابی میرے کسی معتمد کو سپرد فرما دیں۔ تاکہ رات کو ان لوگوں کو بلا کر مل سکوں بادشاہ نے بخوشی اس عرضداشت کو قبول فرما کر حکم دیا کہ محل کے چھوٹے دروازے کی کنجی خسرو خاں کے حوالہ کیجائے۔ خسرو خاں نے اس کو فال

نیک سمجھا۔ اب روزانہ بلا خطر گجراتی بھرواڑ محل میں آنے لگے۔ ہر رات یہ لوگ مسلح محل میں داخل ہو کر صبح تک اسی قسم کے مشورے کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ محل کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا۔ لیکن قطب الدین کی درشت مزاجی اور خسرو خاں پر اعتماد رکھنے کے باعث کسی کی مجال نہ تھی کہ قطب الدین کے کانوں تک اس کی خبر پہنچائے۔ قاضی ضیاء الدین[1] نے جو قاضی خاں کہلاتے تھے اور بادشاہ کے استاد بھی تھے۔ مگر ہمت باندھ کر ایک دن بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے۔ اور خسرو خاں گجراتی دن رات آپ کے برخلاف مشورہ کرتا رہتا ہے حضور تحقیقات فرمائیں۔ اگر واقعہ غلط نکلے۔ تو خسرو خاں کا اعتماد اور زیادہ بڑھ جائیگا اور جو صحیح نکلے تو حضور کی جان سلامت رہ جائے گی۔ قطب الدین نے اس کا جواب بہت درشتی سے دیا۔ اور اس وفادار استاد کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ جب تھوڑی دیر کے بعد خسرو خاں گجراتی آیا۔ تو قاضی خاں کی عرضداشت حرف بحرف سنا دی۔ خسرو خاں نے دیکھا کہ معاملہ پھر بگڑا جاتا ہے۔ اس لئے فوراً منہ بنا کر رونا شروع کر دیا۔ اور عرض کیا کہ تمام سرداروں سے میرا درجہ چونکہ حضور نے بلند فرمایا ہے۔ اس لئے لوگ میرے خون کے خواہاں ہیں۔ بادشاہ نے تسلی دہ الفاظ سے اُس کی خاطر داری کی۔

یہ واقعہ دن کے وقت کا ہے۔ جب رات ہوئی تو تمام گجراتی بھرواڑ محل میں مسلح جمع ہو گئے۔ اور حسب دستور رات زیادہ آجانے پر قاضی ضیاء الدین، پہرہ والوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ خسرو خاں کا رشتہ دار "رندھول" نامی مع چند گجراتی بھرواڑوں کے مسلح ایک جگہ چھپ رہے۔ اور محل ہزار ستوں میں قاضی خاں گیا تو سامنے آکر ایک بیڑا پان کا قاضی خاں کو دیا۔ اور اس درمیان "جاہریا" نامی ایک بھرواڑ نے پیچھے سے قاضی خاں کو ایک تبر اس زور سے مارا کہ وہ فوراً مر گیا۔ قاضی خاں کے مرنے سے محل میں ایک شور پیدا ہو گیا۔ اور محل تمام گجراتی بھرواڑوں سے بھر گیا۔ اس شور و غوغا کو سن کر قطب الدین نے خسرو خاں سے دریافت کیا کہ یہ کیسا شور ہے خسرو خاں تو واقف ہی تھا۔ نیچے دیکھ بھال کر اوپر واپس آیا۔ اور کہا کہ حضور گھوڑے اصطبل سے چھوٹ کر صحن میں آگئے ہیں[2]۔ لوگ پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی یہ گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ جاہریا بھرواڑ

---

[1] ان کا پورا نام یہ ہے۔ قاضی خاں صدر جہاں مولانا ضیاء الدین بن مولانا شہاب الدین خطاط (ابن بطوطہ جلد دوم)

[2] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ خسرو خاں نے بادشاہ سے کہا کہ کچھ لوگ میرے رشتہ دار مسلمان ہونا چاہتے ہیں مگر خاندان کے ڈر سے دن کے بجائے رات کو آنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے اجازت دیدی جبکہ قاضی خاں کے قتل سے شور ہوا تو قطب الدین نے پوچھا کہ کیسا شور ہے۔ تو خسرو خاں نے کہا کہ حضور وہی لوگ مسلمان ہونے کے لئے آنا چاہتے ہیں مگر لوگ آنے نہیں دیتے ہیں۔ بادشاہ باتوں میں مشغول تھا کہ دوسرے لوگ اوپر

قوم سب اوپر پہنچ گئی۔ اب قطب الدین کی آنکھ کھلی اور سمجھا کہ بلوہ ہو گیا۔ فوراً زنان خانہ کی طرف بھاگا۔ لیکن خسرو خاں گجراتی نے یہ سمجھ کر کہ اگر زنان خانہ میں بادشاہ چلا گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ اس لئے فوراً پیچھے سے بادشاہ کے گیسو پکڑ کر ہاتھوں میں مضبوطی سے لپیٹ لیا۔ بادشاہ نے اس کو گرا دیا۔ اور خسرو خاں کے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ پھر بھی مضبوطی سے خسرو خاں بال پکڑے رہا تاکہ بادشاہ بھاگ نہ سکے۔ اس اثنا میں "جاہریا" نامی بھرواڑ محمد اسحاق اور ابراہیم دونوں دربان خاص کو قتل کر کے بادشاہ تک پہنچ گیا خسرو خاں گجراتی نے چلا کر کہا کہ میں نیچے ہوں میرا خیال رکھنا "جاہریا" نے فوراً ایک تیر سلطان قطب الدین کی گردن پر مارا جس سے سلطان قطب الدین گر پڑا پھر سر اسکا کاٹ لیا۔ اور ہر شخص جوان کا مزاحم ہوا مار ڈالا گیا۔

محل ہزار ستون کے نیچے اوپر غرض ہر طرف گجرات کی بھرواڑ قوم بھری پڑی تھی۔

رندھول گجراتی خسرو خاں کا ماموں۔ حسام الدین گجراتی خسرو خاں سوتیلا بھائی، جاہریا اور دوسرے بھرواڑ مل کر حرم خانہ میں گھس گئے۔ اور علاء الدین کی بیگم یعنی فرید خاں اور عمر خاں کی ماں کو فوراً مار ڈالا۔ اور تمام حرم میں ایک غدر برپا کر دیا۔ پھر واپس آکر دربار سجایا گیا۔ اور بڑے بڑے امراء مثل عین الملک ملتانی، محمد تغلق جونا، ملک وحید الدین قریشی، ملک بہاء الدین دبیر، اور قرابیگ کے دونوں لڑکے۔ طلب کئے گئے، اور یہ سرداران ملک رات بھر نظر بند رہے۔ اور خسرو خاں گجراتی معہ اپنی قوم کے تمام رات انتظام مملکت، اور خانہ بربادی سلطان علاء الدین اور سلطان قطب الدین میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ ذکور میں سے شیر خوار بچے تک جوان کے ہاتھ لگے موت کے گھاٹ اتار دئیے گئے۔ اور اس طرح ملک نائب کافور اور ملک نائب خسرو خاں نے یکے بعد دیگرے ہمیشہ کے لئے سلاطین خلجی کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔[۵]

جب آفتاب طلوع ہوا۔ اور خسرو خاں گجراتی کے حسب خواہش تمام معاملات طے ہو گئے، تو اس نے تخت شاہی پر قدم رکھا۔ اور تاج شاہی سر پر رکھ کر ناصر الدنیا والدین خسرو شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اور اسی نام سے سکے ڈھلوائے اور اسی نام سے مسجدوں میں ممبروں پر اماموں نے خطبے پڑھے اپنے بھائی حسام الدین خان خاناں، اور اپنے ماموں رندھول کو رائے رایان، اور قرہ قیمار کے لڑکے کو شائستہ خاں، اور یوسف صوفی کو صوفی خاں، اور بہاء الدین دبیر کو اعظم الملک کا خطاب دیا۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جن کے قوت بازو نے اس کو تخت دہلی دلوایا تھا۔ لیکن بعض دوسرے

---

[۵] ضیاء برنی صفحہ ۴۰۹۔

امرا، دولت کو فقط خوش اور اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بھی خطابات اور عہدے دیئے۔ منجملہ اُن کے عین الملک ملتانی کو عالم خاں کا خطاب دیا۔ اور تاج الملک وحید الدین قریشی کو وزارت، اور ملک فخر الدین جونا (محمد تغلق) کو آخر بیگ (یعنی لمنز اصطبل جو اُس زمانہ میں ایک بڑا عہدہ تھا اور صرف بھروں کے لوگ اس عہدے پر مقرر کئے جاتے تھے) کا عہدہ دیا گیا۔ خسرو خاں گجراتی تمام احتیاطی تدابیر سے فارغ ہو کر گجراتی بھرواڑوں کو انعامات دینے شروع کئے اور علاء الدین کی طرح زرپاشی کر کے لوگوں کو ہم خیال بنانا چاہتا تھا۔ لیکن لوگ اس وقت تین گروہ میں منقسم تھے۔

(۱) خسرو خاں کے دلی ہواخواہ۔

(۲) وہ جو بظاہر ہواخواہ گر دل سے بدخواہ تھے۔

(۳) جو بالکل مخالف تھے۔

ملک فخر الدین جونا، اور اس کا باپ ملک غازی تغلق اسی آخری گروہ میں شامل تھے۔ لیکن ایسے لوگ یا تو دہلی سے دور تھے۔ یا مثل عین الملک کے مصلحت وقت سے خاموش تھے۔

خسرو خاں کے لوگوں نے قصر شاہی کو بڑی بے باکی سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شاہی لوگوں کی تذلیل اور مورتی پوجا شاہی محل کے ہر گوشہ میں شروع کر دینے سے عام مسلمانوں میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اگرچہ خسرو خاں اب ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تھا اور ڈھائی ماہ گذر جانے پر کسی صوبہ دار نے سرکشی نہیں کی۔ تاہم وہ ملک غازی تغلق سے ہر وقت مخدوش رہا۔ اور اسی لئے اس کے لڑکے کی بڑی خاطر داری کرتا تھا۔ لیکن فخر الدین جونا دہلی میں اور اس کا باپ ملک غازی تغلق دیبال پور میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چنانچہ ملک غازی تغلق نے موقعہ دیکھکر اُچھ، اور ملتان کے حاکم کو لکھا کہ ہمارا ساتھ دو۔ اور دہلی پہنچکر خلجی خاندان کو جو ہمارا اور تمہارا سرپرست ہے۔ خسرو خاں کے پنجہ سے نجات دلاؤ۔ حاکم ملتان مغلطی کشلو خاں نے جواب لکھا کہ میں ملتان کا اور تو دیبال پور کا حاکم ہے۔ ہم دونوں کو شاہ دہلی سے مقابلہ کرنا خوب نہیں۔ ملک غازی نے "بہرام ایبہ" کو جو ملتان کے امرا میں سے اُچھ کا حاکم تھا[1] لکھا کہ حاکم ملتان کو درمیان سے دفع کرو۔ اور لشکر لیکر مجھ سے مل جاؤ چنانچہ وہ حاکم ملتان کو قتل کر کے ملک غازی سے

---

[1] فرشتہ ج اول۔ میں امرا، ملتان لکھا ہے۔ باقی بدایونی، ضیا، برنی، اور گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ میں حاکم اُچھ لکھا ہے۔

بل گیا۔ ملک بیگ لکھی حاکم سمانہ کو بھی اسی قسم کا خط لکھا تھا۔ مگر اس نے اس خط کو خسرو خاں کے پاس بھیجدیا۔ اور لشکر لے کر ملک غازی پر حملہ آور ہوا۔ ملک غازی نے اس کو شکست دی۔ ادہر یہ کارروائی ہو رہی تھی۔ اور دہلی میں اس کا بیٹا ملک فخر الدین جونا دن رات اسی فکر میں رہتا کہ کس طرح دہلی سے بھاگ جاؤں۔ غرض پوشیدہ باپ کو ایک خط لکھا۔ جس میں اپنے مطلب کا اظہار کیا۔ باپ نے بھی اسی مطابق گھوڑوں کی ڈاک چوکی مقرر کر دی۔ اور دو سو سوار بھیجکر قلعہ سرستی پر قابض ہو گیا۔ ملک فخر الدین جونا ایک رات موقعہ دیکھ کر گھوڑے کو اس نے سرپٹ دوڑایا۔ اور سرستی پہنچ گیا[۵۱]۔ اور پھر وہاں سے دیبال پور آیا صبح کو جب خسرو خاں بستر راحت سے اٹھا تو اسکو ملک جونا کے فرار ہونے کی خبر ہوئی۔ اس سے وہ بہت خوف زدہ ہوا۔ اس لئے فوراً شائستہ خاں کو تعاقب میں روانہ کیا۔ مگر جب سرستی پہنچا تو معلوم ہوا۔ کہ وقت نکل گیا۔ اس لئے وہاں سے واپس آکر اپنی نامرادی کا اظہار کیا ادہر ملک غازی بھی ایک جرار فوج لے کر دہلی روانہ ہوا۔

ادہر خسرو خاں نے بھی بیس ہزار بھرواڑوں کی فوج خان خاناں حسام الدین کو دی اور صوفی خاں وغیرہ بھی شامل ہوئے۔ جب یہ گجراتی فوج ملک غازی کی فوج سے ٹکرائی تو پاش پاش ہو کر منتشر ہو گئی۔ خسرو خاں یہ سنکر بہت گھبرایا۔ لیکن ہمت کر کے اس نے فوج کی کمان خود لی۔ اور ایک جدید فوج کے ساتھ دہلی سے باہر نکلا[۵۳]۔ مگر کچھ زیادہ دور نہیں گیا۔ بلکہ حوض خاص کے پاس ٹھر گیا۔ کیونکہ ملک غازی دہا وا مارتا ہوا بے درنگ آرہا تھا۔ اس لئے خسرو خاں نے دہلی کو خالی چھوڑنا پسند نہ کیا۔ اس وقت خزانہ کا دروازہ کھول دیا اور ہر سپاہی کو دو دو تین تین سال کی تنخواہ حوالہ کی۔ فقرا اور درویشوں کو عطیے دیے گئے۔ گجراتی بھرواڑوں کو خزانہ کے جواہرات سے مالا مال کر دیا گیا۔ اور ملک غازی کے لئے خزانہ میں ایک پائی نہ چھوڑی۔ اس نے سوچا کہ علاء الدین

---

[۵۱] بدایونی ج اول صفحہ ۲۱۰۔

[۵۲] ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ خسرو خاں نے ملک فخر الدین جونا کو داروغہ اصطبل بنایا۔ مگر وہ دن رات بھاگ کر باپ کے پاس چلے جانے کے فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن خسرو خاں نے کہا کہ اصطبل کے گھوڑے بہت فربہ ہو کر بدن گراتے جاتے ہیں اس لئے ملک جونا کو حکم دیا کہ روزانہ ان کو دوڑایا کرو۔ چنانچہ ایک گھنٹہ دو گھنٹہ روزانہ دہلی سے باہر جایا کرتا ایک دن موقعہ پا کر چلدیا اور دوپہر تک واپس نہ آیا تو خسرو خاں کو بھاگ جانے کی خبر کی گئی۔

[۵۳] کل فوج چالیس ہزار تھی (فرشتہ جلد اول۔

کی طرح زر پاشی سے کام نکالوں۔ تو جلد کامیاب ہو جاؤنگا۔

غرض دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ عین الملک ملتانی تو جنگ سے پہلے ہی مالوہ روانہ ہوگیا جس سے خسرو خاں کو پریشانی تو ضرور ہوئی لیکن اس کی ہمت و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو دونوں نے داد مردانگی دی۔ اول تغلق کی فوج نے شکست کھائی۔ لیکن تغلق کے تین سو سواروں کا دستہ اچانک فوج خسروی پر آپڑا جس سے فوج کو ایسا مرعوب کر دیا کہ خسرو خاں کی فوج تاب مقاومت نہ لاکر بھاگ نکلی۔ ملک تلبغہ ناگوری جو خسرو خاں کا بڑا طرفدار تھا۔ مارا گیا۔ اور یوسف قرہ قیمار شائستہ خاں نے راہ فرار اختیار کی۔ خسرو خاں گجراتی نے اپنی ذات سے بڑی بہادری دکھلائی۔ اور بے انتہا جد و جہد کی۔ لیکن کارگر نہ ہوئی۔ غرض جمعہ کا دن تھا۔ عصر کے وقت تک جنگ برابر جاری رہی اور آخر شکست خسرو خاں گجراتی کی ہوئی۔ اور گجراتی بھرواڑ بے شمار مارے گئے۔

دوسرے دن جس نے جہاں بھرواڑوں کو پایا مارڈالا۔ اور ہزاروں بھرواڑ گجرات بھاگتے ہوئے راستہ میں مارے گئے۔ خود خسرو خاں نے اپنا چتر اور لباس چھوڑ کر سادھوؤں جیسی صورت بنالی۔ اور اپنے قدیم آقا ملک شادی کے باغ میں روپوش ہوگیا۔ دوسرے دن جب گرفتار کرکے لایا گیا۔ تو ملک غازی تغلق سے کھانے اور پانی کی فرمایش کی۔ غازی تغلق نے دستر خوان بچھا کر اچھی طرح کھلایا اور پلایا اور پھر پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو خسرو خاں نے کہا۔ کہ بادشاہ جو بادشاہ کے ساتھ سلوک کرتا ہے چنانچہ ملک غازی تغلق کے حکم سے اسی جگہ جہاں قطب الدین قتل کیا گیا خسرو خاں کو بھی قتل کیا[51] اور چونکہ خاندان خلجی میں سے کوئی مرد بالغ باقی نہ تھا اس لئے امراء دولت کے مشورہ سے ملک غازی، غیاث الدین کے لقب سے تخت دہلی پر رونق افروز ہوا۔

یہ واقعہ ۷۲۰ھ کا ہے۔ اور خسرو خاں کی چار ماہ چند دن سلطنت رہی۔[52]

خسرو خاں گجراتی کی وفات

خسرو خاں کی وفات کے متعلق عام مورخوں نے جو سن لکھا ہے وہ ۷۲۱ھ ہے۔ سوائے سیر المتاخرین کے کہ ۷۲۵ھ لکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں دونوں نے غلط تاریخ لکھی ہے۔ کیونکہ عام مورخین علاء الدین کی

---

[51] بدایونی (ج اول)

[52] خلاصہ از ضیاء برنی و ظفر الوالہ

وفات ۸ شوال ۷۱۶ھ پر متفق ہیں (مطابق ۱۹ دسمبر ۱۳۱۶ء) اور اس کے بعد ۳۶ روز (تقریباً) ملک کافور حکمران رہا۔ اور بعدہٗ قطب الدین اس کی جگہ آیا۔ اور یہ ۱۰ ذیقعدہ ۷۱۶ھ کا تھا۔ جب قطب الدین نے شہاب الدین کو معزول کرکے خود تخت حاصل کیا اور باقاعدہ تخت نشین ہوا تو بجز ظفر الوالہ کے عام مورخین [۱] دیک ۸ محرم ۷۱۷ھ کی تاریخ تھی (مطابق ۲۲ مارچ ۱۳۱۷ء) پھر سلطان قطب الدین کی موت ۵ ربیع الاول ۷۲۱ھ ہجری (مطابق ۲۴ مارچ ۱۳۲۱ء) لکھتے ہیں۔ سلطان کی موت اور خسرو خاں کی تخت نشینی گویا ایک ہی روز ہوئی اور اسی طرح خسرو خاں کی موت اور ملک تغلق کی تخت نشینی بھی گویا ایک ہی تاریخ واقع ہوئی۔ غازی تغلق بقول عام مورخین یکم شعبان ۷۲۱ھ کو تخت خلجی پر رونق افروز ہوا۔ اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ سلطنت کی۔ پس اگر قطب الدین کی موت ۵ ربیع الاول صحیح ہے۔ تو خسرو خاں کی موت اس حساب سے ۵ رجب ۷۲۱ھ ہونی چاہئے حالانکہ بقول عام مورخین یکم شعبان ۷۲۱ھ ملک تغلق کی تخت نشینی ہوئی ہے۔ اور اس سے دو ایک روز بعد اسکی موت ہکو یقینی مسلم ہے۔ اور اگر یکم شعبان ۷۲۱ھ خسرو خاں کی وفات تسلیم کریں تو اس صورت میں کئی باتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو واقعہ کے خلاف ہیں۔

(۱) یہ کہ اس صورت میں قطب الدین کی وفات بجائے ماہ ربیع الاول کے ماہ ربیع الثانی ہو جاتی ہے۔ اور یہ عام مورخوں کے بیان کے خلاف ہے اور کوئی معتبر تاریخ اس کی موید نہیں۔

(۲) یہ کہ بدایونی اور ضیاء برنی دونوں معتبر تاریخوں نے ۷۲۰ھ لکھا ہے۔ خصوصاً ضیاء برنی کے قریب العہد ہونے سے اس کا بیان زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ بالخصوص جبکہ دوسری شہادتیں بھی اس کی موید ہوں۔

(۳) خسرو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی حکم دیا کہ "ناصر الدنیا والدین خسرو خاں"، کے نام سے سکے اور خطبے جاری کئے جائیں۔ پس اس وقت تک جو سکے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سے ایک بھی ۷۲۱ھ کا نہیں ہے۔ بلکہ سب ۷۲۰ھ کے ہیں۔ اور ایسا خیال نہ کرنا چاہئے کہ خسرو خاں ۷۲۰ھ اور ۷۲۱ھ دونوں میں رہا ہو کیونکہ خسرو خاں کے چار مہینے ۷۲۱ھ کے کسی صورت سے بھی ۷۲۰ھ میں نہیں آتے۔ اسلئے قطعاً یہ ماننا پڑے گا کہ خسرو خاں کا سنہ وفات ۷۲۰ھ ہی ہے۔

---

[۱] فرشتہ جلد اول بیان خسرو خاں مطبوعہ نول کشور ۱۲

میرے خیال میں عام مورخوں نے فرشتہ سے تاریخ نقل کی ہے اور غالباً اسی جگہ سے بعد کی کتابوں میں ۷۲۱ھ کی غلطی شروع ہوئی۔

خسرو خاں گجراتی کے سکّے

(۱) چاندی کا سکہ ۷۲۰ھ

السلطان الاعظم
ناصر الدنیا والدین
ابو المظفر

خسرو شاہ السلطان
الواثق بخیر الرحمٰن
ولی امیر المومنین

حاشیہ
ضرب ھذہ الفضة فی عشرین وسبع مایة

(۲)

السلطان الا
عظم ناصر الدنیا
والدین

خسرو شاہ
السلطان ولی امیر المومنین

(۳) ۷۲۰ھ

السلطان الاعظم
ناصر الدنیا والدین
ابو المظفر

ضرب ھذا سکہ
خسرو شاہ السلطان
الواثق بتایید الرحمٰن
ولی امیر المومنین

السلطان الاعظم
ناصر الدنیا والدین
ابو المظفر

خسرو شاہ السلطان
الواثق بتایید الرحمٰن
ولی امیر المومنین

برحاشیہ
ضرب ھذہ السکة بحضرة دہلی فی سنة عشرین سبع مایة

پہلے سکہ میں نام کے ساتھ یہ بھی مرقوم ہے کہ یہ سکہ چاندی کا ہے۔ اور ۷۲۰ھ کا ہے۔ دوسرے میں صرف نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور تیسرے میں مقام ضرب یعنی دہلی مذکور ہے۔ یہ کل سکے لنڈن انڈیا آفس میں موجود ہیں۔

خسرو خاں کے شکست کے اسباب

قابل سوال یہ امر ہے کہ باوجود تمام احتیاطی تدابیر کے بھی خسرو خاں کو فتح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اسکے اسباب کیا ہیں۔ میرے خیال میں مندرجہ ذیل اسباب اُس کی شکست کے ہیں۔

(۱) خسرو خاں گجراتی اگرچہ اپنی ذاتی لیاقت اور ہوشیاری سے تخت سلطنت تک پہنچا تھا۔ لیکن ذاتی طور پر اس میں اعلیٰ اخلاق موجود نہ تھے۔ جس کے ذریعہ بڑے بڑے امرا سلطنت اور خاص و عام کو اپنی طرف مائل کرتا۔ سلطان قطب الدین کے عہد ہی میں لوگ اس کے بد اخلاقی کے بکثرت شاکی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی فوجی طاقت پر بڑا غرور تھا۔ غالباً اسی لئے عہد قطب الدین میں اس نے کسی بڑے جنرل اور ارکین دولت کو ملانے کی کوشش نہ کی۔ اسی باعث امرا سلطنت خسرو خاں سے اسُی وقت تک ملے رہے۔ جب تک خسرو خاں فوجی طاقت سے اُن کو ملائے رہا۔ اور جیسے ہی کہ خسرو خاں کا دباؤ کم ہوا۔ فوراً لوگ الگ ہو گئے

(۲) جو فوجی بھرتی خسرو خاں گجراتی نے کی تھی، وہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے چالیس ہزار تھی مگر عموماً اُس میں رنگروٹ بھرے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی باقاعدہ فوجوں سے لڑنے کی عمر بھر نوبت نہ آئی تھی۔ برخلاف اس کے مقابل کی فوج ایک آزمودہ جنرل ماتحت جنگی تعلیم یافتہ فوج تھی۔ اور اسی لئے گجراتی بھر دا اڑ زیادہ تر موت کے شکار ہوئے[۵۸]

(۳) خسرو خاں گجراتی کے فوجی لوگ جو زیادہ تر جاہل اور جنگلی تھے۔ اُن کی خاطر داری اور تالیف قلوب کے خیال سے خسرو خاں نے جو مذہبی آزادی اور قومی رواداری برتی۔ اسمیں افراط تفریط سے بہت کام لیا گیا۔ مسجد

---

[۵۸] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں نے ملتان میں تغلق کی بنائی ہوئی مسجد میں یہ کتبہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ اس نے اڑتیس[۳۸] دفعہ تاتاریوں سے لڑکر اُن کو شکست دی اور اس لئے اس کو لوگ ملک غازی کہتے ہیں۔ پھر ایسی تجربہ کار فوج کے مقابل گجراتی رنگروٹ کیا تاب مقاومت لاسکتے تھے۔ (جلد دوم باب ۴ فصل ۱۲)

میں مورتی پوجا ہونا اور قرآن کی توہین کرنا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن کو مسلمان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے دین دار مسلمان خسرو خاں سے نفرت کرنے لگے۔ اور عام پبلک کی نفرت یہ بھی اس کے ضعف کا سبب ہوا۔[۵]

(۴) دکن کی کل دولت جو علاء الدین خلجی کے زمانہ سے خزانہ میں جمع تھی۔ خسرو خاں گجراتی نے اس کو ایسے بیہودہ طریقے سے صرف کر ڈالا۔ جو کسی طرح بہ کار آمد ثابت نہ ہوا۔ بلکہ اس سے سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ خزانہ خالی ہونے کے سبب خسرو خاں پھر دوسری فوج بھرتی نہ کر سکا۔ اور یہ ایسی غلطی ہوئی کہ جس نے خسرو خاں کا کام بنا بنایا بگاڑ دیا۔

(۵) اس کے علاوہ خسرو خاں نے اپنی فوجی طاقت پر اسقدر بھروسہ کیا کہ انجام کار کے سوچنے کا خیال ہی دل میں نہ لایا۔ تھوڑی ہی عقل و فراست سے کام لیتا تو ممکن ہے کہ کامیاب ہو جاتا۔ اس نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ ممکن ہے کہ شکست ہو اور ایسے وقت کے لئے کوئی محفوظ جگہ تیار رکھنا چاہئے۔ وہ اگر چاہتا تو گجرات اور دکن کے علاقہ میں کوئی ایسی جگہ محفوظ کر سکتا تھا۔ جہاں بیٹھ کر عرصہ تک تغلق کی مدافعت میں مشغول رہتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہر جگہ بد عملی کا دور تھا۔ پنجاب اور سندھ چھوڑ کر باقی ہر صوبہ میں وہ خود مختارانہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

(۶) جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ امراء و دولت اس سے ناراض تھے۔ صرف چند مسلمان امیر شریک رہتے۔ اور یہ وہ لوگ تھے۔ جنکو قطب الدین کے ہاتھوں تکلیف پہنچی تھی۔ وہ صرف اسلئے خسرو خاں کے شریک ہو گئے تھے کہ یہ قطب الدین کا دشمن تھا۔ اور دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اور اسکے ساتھ شرکت سے فوری منافع کی بھی امید تھی اور اسی لئے میدان جنگ میں نظر آتا ہے کہ باوجود خسرو خاں کے ساتھی اور دوست ہونے کے شکست کے وقت کترا کر نکل گئے۔

(۷) یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ خسرو خاں کی کامیابی کے باوجود کسی ہندو راجپوت نے اس کو مدد نہ دی۔ حالانکہ اطراف میں ابھی کئی ہندو ریاستیں موجود تھیں۔ اور یہ غالباً صرف اس سبب سے ہوا کہ خسرو خاں بہت نیچ اور ادنیٰ قوم کا آدمی تھا۔ جس کی سرداری راجپوت کسی طرح قبول نہیں کر سکتے تھے۔

---

[۵] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ خسرو خاں نے حکم دیا کہ کوئی گائے تمام ملک میں ذبح نہ کرے۔ ہندو گائے کا مارنا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا ہے تو اس کو یہ سزا دیتے ہیں کہ اس کو اسکی کھال میں سلوا کر جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ گائے کی نہایت تعظیم کرتے ہیں۔ اور ثواب کے لئے بھی اور بطور دوا کے بھی اس کے پیشاب کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے گوبر سے گھر لیپتے ہیں۔ خسرو خاں چاہتا تھا کہ مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ اس لئے لوگ اس سے متنفر ہو گئے۔

(۸) خسرو خاں نے بعد قتل قطب الدین بادشاہی خاندان سے ایسا سلوک کیا جیسا کوئی فاتح میدان جنگ کے قیدیوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اس بُرے برتاؤ سے کسی کو خسرو خاں سے ہمدردی نہ رہی۔ لوگ فقط لوہے اور سونے کے دباؤ سے خاموش تھے۔ ورنہ اس وحشیانہ برتاؤ سے جو وہ دودھ پیتے بچے اور گود میں بچہ والی ماؤں کے ساتھ کیا۔ لوگ سخت متنفر ہو گئے تھے۔ وباللہ التوفیق۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

نوائے تازہ

اللہ یہ کیا ہے نگہ یاس اثر میں
پیوست ہوئی جاتی ہے میرے ہی جگر میں

اب خون کے آنسو بھی نہیں دیدۂ تر میں
ایسی بھی کوئی آگ لگائے نہ جگر میں

ہے حاصل صد عمر خضر میری نظر میں
پایا ہے غم عشق جو دنیا کے سفر میں

اے اہل چمن جس نے کیا ہے مجھے مدہوش
وہ ہوش ربا جلوہ کہاں ہر گل تر میں

آسایش دارین بھی قیمت نہیں جس کی
وہ چیز ہو تم اہل تمنا کی نظر میں

اللہ رے دزدیدہ نظر، اف رے تبسم!
اک حشر بپا ہے دل ہر اہل نظر میں

اور اتنی گذارش ہے نوازا ہے جو تو نے
کھٹکوں نہ نگاہ فلک شعبدہ گر میں

ہے حوصلہ افزائی مشق ستم ناز
کیا رکھا ہے ورنہ مرے دل اور جگر میں

ناکامی پیہم سے بڑھا حوصلۂ شوق
جو دل کی تمنا تھی وہ سودا ہوئی سر میں

ہے نعمت دارین جو ساقی مجھے مل جائے
وہ مے جو ہے تیری نگہ کیف اثر میں

اب اس سے سوا اور ہو ارتبۂ الفت
دیوانہ ہوں میں اس ستم آرا کی نظر میں

ہے چارہ گرو! عشرت فردا کی نشانی
رہنے بھی دو باقی ہے جو ناسور جگر میں

دو خاطر بیمار شب غم کی تمنا!
آ جلد نہ چھپ گوشۂ دامان سحر میں

ہیں غالب و محوی کی طرح اور بھی برباد
پر سچ ہے کہ نہیں فائدہ کچھ عرض ہنر میں

محوی (لکھنوی)

علم ظاہری کی حقیقت

(از جناب مولوی منشی منصب علی صاحب بی۔ اے سابق ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر حلقہ جنوبی احاطہ بمبئی)

ذیل کا مضمون تصوفانہ رنگ میں ہونے کی وجہ سے ممکن ہے وہ حضرات جنہیں اس کا مذاق نہیں ہے اس کی تہ تک نہ پہنچ سکیں کیونکہ واضح ہونے پر بھی کئی مقامات اب بھی محتاج وضاحت ہیں لیکن اس سے زیادہ واضح ہونے سے ایسے مضامین کا اصل لطف فنا ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ مضمون غائر نظر سے پڑھے جانے کا مستحق ہے۔

اڈیٹر

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

آج ہم اس صحبت میں اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ہمارے علوم قابل اعتبار بھی ہیں؟ اور اگر اعتبار کے لایق ہیں تو کہاں تک؟

علوم کی بڑی تقسیمیں دو ہیں یعنی علوم ظاہر اور علوم باطن۔ علوم باطن تو اس لئے قابل اعتماد ہیں کہ ہمارے ایمان ان کے لئے گارنٹی ہیں۔ علوم ظاہر میں علوم مشرقی اور مغربی شامل ہیں۔ اہالیانِ مغرب کو اپنے علوم پر علی الخصوص بڑا ناز ہے۔ اور اہل ظاہر کے نزدیک حق ان کی تائید میں ہے کیونکہ ان کی ایجادات اور اختراعات ان کے حق بجانب ہونے پر دال ہیں مگر عقل معاش، عقلِ معاد کے سامنے بے حقیقتِ محض ہے نیز علوم ظاہر کے اہم مسائل ابھی تک لاینحل ہیں۔ کہاں ایروپلین پر چڑھ کر خطرے میں پڑنا اور کہاں ؎

ان العاشقین بھا عیونٌ	ترا ما لا یراہ الناظرین
عاشقوں کی ایسی آنکھیں ہوتی ہیں	جنکو وہ دیکھتے ہیں سو دیکھنے والے نہیں دیکھتے
وجنحۃ تطیر بغیر ریش	الی الملکوت رب العالمین

اور بازو ہوتے ہیں جن سے بغیر پر کے اڑتے ہیں رب العالمین کے ملکوت کی طرف

ع۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ؎

بت کریں آرزو خدائی کی   شان ہے تیری کبریائی کی

آؤ اب اپنی تحقیقات کے میدان میں قدم رکھیں۔

"خواب خرگوش"

قبل اس کے کہ ہم اس میدان میں باقاعدہ گام زن ہوں اس بات کا پتہ لگانا ضروری ہے کہ ہمارے خواب کیا چیز ہیں۔ آنکھ ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ کان بھی ظاہری و باطنی ہیں علیٰ ہذا القیاس دیگر حواس، لیکن ع پنبہ این گوش سر گوش سر است، کے مطابق ہم حواس ظاہری ہی سے کام لیتے رہے لہذا بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے حواس باطنی درست نہ رہے حالانکہ حواس باطن بڑے کام کی چیز تھے۔ انسان کا کام لیتا مگر اس نے ان سے کچھ کام نہ لیا اور ان کو بگڑنے دیا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خداوند تعالےٰ باوجود چشم و گوش ظاہری سے منزہ ہونے کے دیکھتا اور سنتا ہے لیکن کن آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کن کانوں سے سنتا ہے اس کا معلوم کرنا مشکل ہے نہ چنداں سودمند صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جن آنکھوں اور کانوں سے انسان خواب میں دیکھتا ہے سنتا ہے جب وہ تصور میں نہیں آسکتے تو چشم و گوش خداوندی کا وہم و گمان سے بالاتر ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ اس سے زیادہ کرید کاوش کرنا عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرنا ہے۔ اسی طرح خواجہ خضرؑ کی آنکھ کی جہاں رسائی ہے موسیٰؑ کی آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر ہے خواجہ خضر سکندر کو ظلمات سے عبور کراتے ہیں، خضر دیکھتے ہیں لیکن سکندر اندھا ہے ؎

سیاہی گر بدانی نور ذات است
بہ تاریکی درون آب حیات است

انسان جب سوتا ہے تو اس کے حواس ظاہری اپنی اپنی ڈیوٹی بجا لانے سے قاصر ہو جاتے ہیں مگر حواس باطنی دن رات سوتے جاگتے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ روح جو حواس ظاہری اور باطنی سے کام لینے والی ہے ہمیشہ جاگتی اور ان سے حسب لیاقت کام لیتی رہتی ہے لیکن خواب کے وقت محض حواس باطنہ کارآمد ہوتے ہیں اسی لئے توپ کی آواز سوتے وقت سونے والے کو بمشکل سنائی دیتی ہے کیونکہ وہ سوتے وقت عالم ارواح کی سیر میں مشغول ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سیر اکثر بے معنی ہوتی ہے اسلئے کہ حواس باطنہ بیکار چھوڑے گئے ہیں تاہم کبھی کبھی خواب سچے نکل آتے ہیں کیونکہ روح اپنی اس قوت سے جو خداوند تعالےٰ نے اس میں ودیعت فرمائی ہے بعض اوقات سب بندھن توڑ پھوڑ کر ان سے کام لیتی ہے۔ ارواح لطیفہ کے نہ دیا اسی لئے اکثر

صادقہ اور ارواح خبیثہ کے خواب جھوٹے نکلتے ہیں۔ حالت خواب میں روح خبیثہ دن بھر کے بکھیڑوں کا اعادہ کرتی ہے۔ اور روح لطیفہ وہی دیکھتی ہے جو عالم ارواح میں وقوع میں آرہا ہے۔ بہرحال حواس ظاہری کبھی سوتے ہیں کبھی جاگتے ہیں مگر روح ہر گھڑی ہر پل بیدار ہے۔ یہ صرف خواب و بیداری میں بلکہ حیات و ممات میں اس کی بیداری میں فرق نہیں آتا، روح حواس ظاہری سے جب کام لینا بند کردیتی ہے اس حالت کا نام خواب ہے اور جب حواس ظاہری اور باطنی دونوں سے کام لیتی ہے اس کا نام بیداری ہے حالانکہ بیداری نہ حالت خواب میں ہے اور نہ اس بیداری میں جس کو عوام بیداری کہتے ہیں کیونکہ جیسا کہ عبارت ذیل سے واضح ہوگا یہ بھی خواب ہے۔ بلکہ یہ خواب خرگوش جیسے ہم کوتاہ فہمی سے بیداری سمجھے بیٹھے ہیں خواب در خواب یعنی ڈبل خواب ہے۔

یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں اس میں یقین کی تینوں قسمیں موجود ہوتی ہیں، شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہوتی مگر جس ڈبل خواب کو ہم بیداری سمجھے بیٹھے ہیں وہ اس دوسرے خواب کی تکذیب کرتا ہے اور تینوں اقسام یقین کو ملیامیٹ کرکے رکھ دیتا ہے یہ حقیقت ہمارے یقینوں کی ہے، اور علم کی بنا یقین پر ہے لہذا اصطلاح عوام میں جس کو بیداری کہتے ہیں وہ دراصل یقین کی جڑ کاٹتا ہے ممکن ہے جیسا کہ یہ بیداری خواب کو جھوٹا ثابت کرتی ہے کوئی اور بیداری نکل آئے جو ہماری اس بیداری کو بھی خواب بنا دے مگر متکلمین کے نزدیک اس دلیل سے دور تسلسل لازم آتا ہے مگر ہمارے نزدیک دور تسلسل اس لئے نہیں لازم آتا کہ مخبر صادق نے اصل بیداری کے علاوہ کسی اور بیداری کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ آیۂ فکشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد (اب کھولدی ہم نے تیری اندھیری اب تیری نگاہ آج تیز ہے) سے ظاہر ہے نیز ہمیں النوم اخت الموت (نیند موت کی بہن ہے) کا سبق دیا گیا ہے یعنی موت کے بعد جو کچھ ظہور میں آنے والا ہے وہ بطور تنبیہ خواب میں دکھلایا جاتا ہے تاکہ انسان اپنی موت کی حقیقت پر غور کرے اور والاخرة خيرٌ وّ ابقى کے معنی سمجھ کر محض طلب معاش کے تفکرات ہی میں غلطاں و پیچاں نہ رہے اور طلب معاد کو پس پشت نہ ڈالے، ہر متنفس پر وہ وقت آنے والا ہے کہ جب اخیر میں الهكم التكاثر حتى زرتم المقابر (غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھیں) کا خیال خدانخواستہ اسلئے موجب ندامت ہو اور کچھ بن نہ پڑے کیونکہ اس وقت کی ندامت کچھ کام نہ آئیگی ع — پھر پچھتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، اور

بمصداق ؎

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

النوم اخت الموت سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک دوسری دنیا ہے جو اہل دل کے نزدیک وہ مقام ہے جس کا یہ دُنیا عکس ہے اسی لئے اس کو عالم مثال کہتے ہیں۔ یہی مقام وہ مقام ہے جہاں انسان کو دوبارہ بیداری نصیب ہوگی اور موجودہ بیداری کو خواب سمجھے گا۔

ایک اعتراض البتہ ممکن ہے وہ یہ کہ حالتِ خواب کو حالت خواب میں ہم بیداری جانتے ہیں اور اس حالت میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کو ہم یقیناً بلا شک وشبہ صحیح و برحق تصور کرتے ہیں، بیدار ہوتے ہی وہ بیداری خواب بن جاتا ہے، خواب کی بیداری میں کسی اور بیداری کا خیال و احساس بالکلیہ نہیں ہوتا مگر اسی بیداری میں خواب و بیداری دونوں کا علم ہو جاتا ہے جس کا خواب میں پتہ اور نشان نہ تھا اس لئے ممکن ہے یہی بیداری اصل بیداری ہو اور کسی تیسری بیداری کا وجود نہ ہو پس واضح ہو کہ تعرف اشیاء باضدادھا (ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے) پہلی بیداری جسے ہم خواب کہتے ہیں یہی بیداری یا نرا خواب تھا مگر موجودہ بیداری نے اس یا خواب میں بین فرق پیدا کر دیا یا یوں کہو بیداریوں اور خوابوں میں اگر امتیاز نہ ہوتا تو انسان کو اصل بیداری کی تلاش نہ ہوتی اور نہ کوئی اور چیز اصل بیداری کی طرف رہنما ہوتی لہٰذا یہ اختیاری امر نہ ہوتا اور انسان ترقی و تنزل کا دروازہ مسدود ہو جاتا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ حالت خواب میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے افسوس کہ اس سے کوئی علم ان نے پیدا نہیں کیا۔ اہل مغرب خواب کی تحقیقات میں سرگرداں ہیں مگر اب تک محض قیاسات سے کام لیا جارہا ہے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا، باقی جتنے علوم و فنون ہیں وہ اس حالت بیداری کے نتائج ہیں، اب اگر خدا نہ کرے ہماری بیداری خواب ثابت ہوگئی تو ہمارے علوم بھی دریا برد ہوئے۔ بہر حال یہ علوم و فنون جن پر انسان کو غرہ ہے اگر بالکل از کار رفتہ نہیں تو مشکوک ضرور ہیں ؎

خفتہ آں باشد کہ او از ہر خیال
دارد امید و کند با او مقال

علوم از کار رفتہ اسلئے ہیں کہ فتنہ اور فساد کم ہونے کی بجائے زیادہ بڑھتا نظر آتا ہے اور بارگاہ

رب العزت میں انسان خلقت کے بارے میں ملائکہ کا فتویٰ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء الخ۔ (انھوں نے کہا کیا تو اس کو (دنیا میں) پیدا کرتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے) لفظاً لفظاً پورا اتر رہا ہے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے لڑائی جھگڑے شاہد ہیں فرق اتنا ہے کہ پہلے جہالت سے کام لیا جاتا تھا اب علوم سے ع

این جہاں را بر خیالے داں رواں

نیز علوم ظاہری مبنی ہیں حواس ظاہری پر اور حواس ظاہری بکمے اور بہتے ہیں بلا اس قوت فیصلہ کے جواب العزة نے انسان کی ذات میں رکھی ہے مثلاً ریل گاڑی کے سفر میں ہم درختوں کو بھاگتے دیکھتے ہیں مگر قوت فیصلہ بتلاتی ہے یہ سب غلط ہے درخت نہیں مگر گاڑی میں ہم بھاگے جاتے ہیں۔ سورج مشرق سے مغرب کو جاتا نظر آتا ہے اس قاعدہ سے سورج نہیں بلکہ زمین مغرب سے مشرق کو جا رہی ہے علیٰ ہذا القیاس دوسرے حواس بھی کبھی صواب پر ہیں اور کبھی خطا پر، مگر ہماری قوت فیصلہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہے اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری قوت فیصلہ خود غلطی کرے۔ المجتھد یخطی و یصیب (مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی) اب مشکل یہ ہے کہ حواس ظاہری قوت فیصلہ کے محتاج ہیں اور قوت فیصلہ حواس ظاہری کی۔ مثلاً پاگل دیکھتا ہے مگر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اندھا اور بہرا دیکھتے سنتے نہیں لہذا ایک گڑھے میں گر جاتا ہے، دوسرا دم بخود رہتا ہے اور بہرہ کی حالت بقول شخصے یہ ہے کہ ع

ناصح کی بات سننے کو یاں کان ہی نہیں،

لہذا اعتماد کے قابل نہ حواس ہیں اور نہ قوت فیصلہ۔ علوم المشارق والمغارب حواس و فیصلہ کے قویٰ کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوئے ہیں لہذا ان علوم کی وقعت کتنی ہے اس کا فیصلہ ہر متنفس خود کر سکتا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود،
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود،

رباعی امجد

کوشش ہے تمام اپنی ستائش کے لئے
کیا کیا کرتے ہیں، ایک خواہش کے لئے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے
پتلے مٹی کے ہیں، نمائش کے لئے

امجد

پانی، برف، اولے

(جناب محمد اسمٰعیل صاحب ناقت بھوپالی)

ہوا میں ہمیشہ ایک مقدار پانی کے ذرات کی موجود رہتی ہے اور ہوا جوں جوں گرم ہوتی جاتی ہے ووں ووں پانی کے ذرات بھاپ کی شکل میں ہوا میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ سورج کی گرمی زمین کی تری کو فضا میں جذب کرتی ہے اگر ایک خشک، صاف اور خالی بوتل کے مُنہ کو دوسرے بوتل کے مُنہ سے لگائیں جس میں کھولتا ہوا پانی بھرا ہوا ہو اور آدھ منٹ کے منٹ الگ کرکے خالی بوتل میں مضبوط کاگ لگا دیں تو یہ پانی کے ذرات (بھاپ) سے بھر جائے گی اور جب تک بوتل گرم رہے گی یہ بھاپ پانی کی شکل میں تبدیل نہ ہوگی۔ لیکن نقطۂ منطقہ اطراف شیشہ، اور بھاپ کی مقدار تمام جہات میں یکساں نہیں ہوتی۔ پس معلوم ہوگیا کہ دُنیا میں جتنا پانی ندیوں، دریاؤں اور سمندروں کی صورت میں نظر آتا ہے وہ سب ہوا میں سے آیا ہے اور بے شک ایک بہت بڑی مقدار پانی بھاپ کی ہوا میں ملی ہوئی ہے۔

اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیونکر اور کس طرح یہ بھاپ ہوا میں پراگندہ اور منتشر ہوتی ہے اگر تھوڑا سا عطر یا اور کوئی جوہر ہتیلی پر لیں تو وہ جلد گیس بن کر اُڑ جاتا ہے اور ذرا میں ہاتھ خالی ہو جاتا ہے یہی کیفیت بخار آب کی بھی ہے لیکن یہ پھیلی ہوئی اور ساکن حالت میں بھاپ بن کر ہوا میں صعود کرتا ہے اور سورج کی گرمی کی تاثیر سے بخار بالاستمرار جَو میں منتشر ہوتا ہے کیونکہ تمام پانی جو نہروں، ندیوں، نالوں، دریاؤں، اور بڑے بڑے سمندروں میں ہے اور جو تین چار حصّہ زمین کو گھیرے ہے حرارت آفتاب سے گرم ہو کر بھاپ بنتا اور فضا میں منتشر ہوتا ہے اور جب ہوا بخار سے بھر جاتی ہے تو اسباب جَوّیہ کے سبب سے سرد ہونے پر حسب درجہ برودت کبھی کُہر کی شکل میں نظر آتی ہے جو ہلکا ہونے کی بنا پر ہوا میں معلق رہتا ہے اور سرد تر ہونے کی حالت میں پانی کے دانوں (نقطۂ آب) کی صورت میں زمین پر برستی ہے جسے باراں کہتے ہیں اور جن جنھوں میں پانی بہت ہی برستا ہے وہاں ہوا میں ملی ہوئی بھاپ بہت ہی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ مصادف ہوتی ہے ان حوادث کے تین سبب ہیں کیا تو بہت ہی ٹھنڈے اور مرتفع طبقات جو

میں بخارات اور رطوبت آمیز گرم ہوا کا ارتقا ہے یا گرم ہوا ٹھنڈی ہواؤں میں باہم داخل ہونا یا گرم ہواؤں کا اونچے اونچے پہاڑوں کی سطح پر چلنا اور خط استوا اور دریاؤں کے قریب پانی برسنا ہے، کیونکہ گرم ہوائیں بہت ہی سرد اور بلند طبقات سے اٹھتی ہیں اور اس کی یہ وجہ ہے کہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے مقابلہ میں بہت ہی ہلکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی یورپ میں پانی زیادہ برستا ہے۔ جو طیارے خلیج میوز کے اوپر سے بخار آمیز ہوا کے اندر سے گذرتی ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ سرد و بلند پہاڑوں اور علی العموم ان جہات میں بکثرت پانی برستا ہے۔ جو بشدت سرد ہیں۔ اور انھیں جہات میں گرم ہوائیں مرور کرتی ہیں اور بخار ہوا کو متبدل بہ آب کرتی ہیں بخلاف ازیں بہت کم بارش ان جہات میں ہوتی ہے جو اونچے اونچے پہاڑوں سے محاط ہیں جیسے ایشیا میں اور ان صحراؤں میں جو دریاؤں سے دور ہیں اور علی العموم جہات گرم میں جہاں ٹھنڈی ہوائیں مرور کرتی ہیں۔ اور اگر کبھی درجۂ حرارت اسقدر اتر آتا ہے کہ درجۂ تجمد سے کیفقدر کمتر رہے تو بخار ہوا نقطہ ہار بلورین کی شکل میں متشکل ہوتی ہے جو خود بھی بہت ہی چھوٹے چھوٹے نقاط سے باہم متحد ہوتے ہیں اور روئی کے ٹکڑوں کی طرح زمین پر گرتے ہیں جسے برف برسنا کہا جاتا ہے۔ کبھی زیادہ تر یہی برف کے ٹکڑے باہم متحد ہوکر بہت برف کی چٹان بنا دیتے ہیں جسے یخ کہا جاتا ہے اور اس میں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چنے کے کنکر یا کنکری کے برابر نظر آتے ہوئے زمین پر گرتے ہیں۔ جس سے کھیتوں اور جانوروں کا بڑا اتلاف ہوتا ہے اور انھیں اولے برسنا کہتے ہیں۔

غزل

(از جناب نبے خاں صاحب سرخوش شادانی رامپوری ہیڈ مولوی گورنمنٹ اسکول مظفرنگر)

یہ ہے حسن کارفرما کہ ادائے دل نوازی
دل غزوی پہ غالب ہوئی شوکت ایازی

مجھے سر بسجدہ دیکھا، کہا ہنس کے اس صنم نے
ترا سجدہ ہے ریائی تو ہے خود غرض نمازی

میں ہوں منزلوں کا مارا مرا دل تھکا ہوا ہے
تو سنا دے اے مغنی مجھے نغمۂ حجازی

وہ ہی خیر و شر کا مالک وہی نیک و بد کا خالق
جسے چاہے دے وہ ذلت جسے چاہے سرفرازی

نئے فلسفہ کی دھن ہے نئے لوگ اور نئی مت
نہ وہ مذہب غزالی نہ وہ قول فخر رازی

تجھے بوالہوس پتہ کیا تو اسیر رنگ و بو ہے
ل مبتلائے سرخوش میں ہے درد پاکبازی

ترجمات

المستنصر عباسی کے زمانہ کی ایک گھڑی

مصر کے نامور رئیس اور اہل قلم امیر احمد تیمور پاشا کے کتبخانہ میں، فن تاریخ کے شعبہ میں نمبر ۱۳۸۳ پر ایک قلمی کتاب ہے۔ یہ تاریخی کتاب جس کے نام اور مصنف کا پتہ نہیں چلتا سنہ ۶۲۶ھ سے سنہ ۶۳۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے سنہ ۶۳۳ھ کے واقعات میں اس گھڑی کا تذکرہ کیا ہے جس کو امیر المومنین المستنصر نے مدرسۃ الطب والمستشفیٰ میں (جو مدرسہ مستنصریہ کے ماتحت قائم ہوا تھا) رکھوایا تھا۔ پاشائے موصوف نے اپنی غیر مطبوع تالیف "التصویر عند العرب" میں کتاب مذکورسے اس گھڑی کا احوال نقل کیا ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"اسی سال (یعنی سنہ ۶۳۳ھ) میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی جو مدرسہ مستنصریہ کے سامنے واقع ہے، اور اس کے پیچھے ایک صُفہ (چبوترہ) بنایا گیا جس پر طبیب اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر آنے والے مریضوں کا علاج کرے۔ اس چبوترہ کی دیوار پر ایک دائرہ کی شکل بنا کر اس میں کرۂ فلکی کا نقشہ اُتارا گیا ہے۔ اس میں نازک دروازوں والے دو چھوٹے طاقچے بنائے گئے ہیں، اور اس دائرہ کے اندر دو طلائی کٹوروں میں دو نیچے کے باز رکھے ہوئے ہیں جنکو اندر دو گولیاں اس ترکیب سے رکھی گئی ہیں جو نظر نہیں آسکتیں۔ گھنٹہ گزرنے پر ان دونوں کا منہ کھل جاتا اور دو گولیاں نکل کر کٹوروں میں جا گرتی ہیں۔ ہر گولی کے گرنے پر اُن طاقچوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں، اور ہر دروازہ جو سونے کا ہوتا ہے نقرئی بن جاتا ہے۔ وہ دونوں گولیاں کٹوروں میں گرتے ہی اپنے مقام پر واپس چلی جاتی ہیں۔ پھر اس فلک لاجوردی میں بعینہ آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور چاند نکلتے ہیں جو آفتاب کی گردش کے ساتھ حرکت کرتے، اور اس کے ساتھ ہی غروب ہو جاتے ہیں۔ جب رات ہو جاتی ہے تو یہ چاند اپنے پیچھے رکھی ہوئی روشنی کے ذریعہ طلوع ہوتے ہیں۔ اور جیسے ہی گھنٹہ ختم ہوتا ہے وہ روشنی بھی چاند کے حلقہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے حلقۂ قمر میں شروع ہوتی ہے۔ یہانتک کہ رات ختم ہو جاتی اور سورج نکل آتا ہے۔

اسی کے ذریعہ نماز کے اوقات معلوم کئے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد مصنف نے اس گھڑی کی تعریف میں اس زمانہ کے شعراء کے مندرجۂ ذیل اشعار نقل کئے ہیں:-

يا أيها المنصور يا مالكا
برأيه صعب الليالي يهون
شيدت لله ورضوانه
أشرف بنيان يروق العيون

اے فتحمند! اے حاکم! جسکی رائے و تدبیر سے راتوں کی مشکل آسان ہوگئی ہے، تونے خالصًا لوجہ اللہ، اور اسکی خوشنودی کے واسطے بلند ترین عمارت بنوائی جس کا منظر آنکھوں کو بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

ايوان حسن وضعه مدهش
يحار في منظره الناظرون

ایسی ایوان نفیس جس کی صنعت عجیب و غریب ہے جو ناظرین کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

صور فيه فلك دائر
والشمس تجري ما لها من سكون

اس میں فلک دوّار کی تصویر اتاری گئی ہے جسمیں آفتاب بلاسکون گھومتا رہتا ہے۔

دائرة من لازورد حوت
نقطة تبر فيه سر مصون

لاجورد سے بنا ہوا ایک دائرہ ہے جو طلائی نقطہ پر محیط ہے، اسی میں سب راز پوشیدہ ہے۔

فتلك في الشكل وهذا معًا
كمثل هاء ركبت وسط نون

اس کی شکل بعینہ ایسی ہے جیسے ھا کو نون کے وسط میں ملا دیا گیا ہو۔

(الزہرا ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ)

نباتات کی انسائیکلوپیڈیا

ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے، جو طب اور لغت میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ایک "معجم نباتات" مرتب کی ہے۔ یہ کتاب اُن تمام نباتات پر حاوی ہے جن سے اندلس، مغرب، مصر و سوڈان، فلسطین، شام و عراق، حجاز و یمن، اور تمام جزیرۃ العرب میں اہل عرب واقف تھے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں چار ہزار لاتینی اسماء نباتات درج کئے گئے ہیں جو انواع نباتات پر مشتمل ہیں۔ ان کے بالمقابل انکی مختلف اقسام اور لاطینی مترادفات ہیں، پھر ان کے بائیں طرف فرانسیسی اور انگریزی نام دیئے گئے ہیں، اور بائیں جانب ان کے عربی یا معرب نام

چھپے گئے ہیں۔ مصر کی وزارت المعارف (محکمہ تعلیم) نے مؤلف کے زیر اہتمام اس کتاب کو اپنی طرف سے شائع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

جرمنی کے مشہور عالم نباتات پروفیسر شوا این فورث (Schweinfurth) نے جو مصر کے مجمع العلمی کے صدر تھے، اسی موضوع پر دو سو صفحات کی ایک کتاب لکھی تھی۔ لیکن ڈاکٹر عیسیٰ بک نے اس کا استقصا کر کے اس کو اس قدر جامع بنا دیا ہے کہ وہ پروفیسر موصوف کی کتاب سے چوگنی ہو گئی ہے۔

اس کے ضمن میں ڈاکٹر موصوف نے ایک اور علمی کام یہ انجام دیا ہے کہ انہوں نے ان تمام اسمائے نباتات کو عربی لغت کی کتابوں مثل لسان العرب، المخصص، قاموس المحیط، اشجار و نباتات کے متعلق اصمعی اور ابن خالویہ کے رسائل، اور کتاب غریب المصنف وغیرہ سے اخذ کر کے لغات کے طریقہ پر مرتب کر لیا ہے اور اس کا نام "معجم النبات" رکھا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر نام کے بالمقابل اس کی تشریح بلا کم و کاست علمائے لغت سے نقل کر دی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر مراجعت کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ جو متعدد کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ (الزہراء)

یورپ کے شاہی درباروں کی اخلاقی حالت

رسالہ "جرنل آف انڈین ہسٹری" بابت اگست ۱۹۲۶ء میں ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر برنیر شاہجہاں کے دربار میں" سر تھیوڈور ماریسن کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں مضمون نگار سلاطین یورپ کے درباروں کی اخلاقی حالت کا موازنہ دربار مغلیہ سے کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"میں امید کرتا ہوں کہ میں عام رائے کے خلاف کسی غلط بات کی مدافعت کرنے کا مجرم نہ خیال کیا جاؤں گا، اگر میں یہ کہوں کہ سترھویں صدی میں "مغل اعظم" کا دربار بہ لحاظ عیش پرستی و شاہد بازی کے نہ صرف ظاہراً مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا، بلکہ باطناً بھی وہ فرانس اور انگلینڈ کے درباروں کی بہ نسبت زیادہ با اخلاق تھا۔

"عہدِ مغلیہ کی تاریخ میں اس مسرت انگیز اشتیاق کا وجود میں نہیں پاتا جو انگلینڈ اور فرانس کے امراء میں، اپنی بیٹیوں کی عصمت کو بادشاہ کی ہوسناکیوں پر قربان کر دینے کے لئے پیدا ہوا کرتا تھا۔ عین اس عمر میں جبکہ ہمارے خیال کے مطابق ابھی ان کو اسکول میں زیرِ تعلیم ہونا چاہئے، نوجوان لڑکیاں ورسیلز یا وائٹ ہال بھیجدی جاتی تھیں تاکہ وہ شاہی نوازشات سے سرفراز ہو کر متمول بن جائیں۔ بقول، سینٹ سائمن ہر والدین کی دلی تمنا یہی ہوتی تھی کہ ان کی لڑکی سب سے بڑا انعام حاصل کرے اور بادشاہ کی معشوقہ بن جائے۔ اس معاملہ میں انگلینڈ کا اخلاقی معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا،

جب آرابیلا چرچل، جیمس (ڈیوک آف یارک) کی منظورِ نظر بن گئی تو، بقول لارڈ میکالے، اس کے والدین اس تعجب خیز احساسِ مسرت میں پڑ گئے کہ ایسی سیدھی سادھی لڑکی کس طرح اس شاہی معیارِ انتخاب پر پوری اتری! اہلِ یورپ کی نظروں میں ایک شادی شدہ عورت سے بادشاہ کا تعشق کچھ بھی قابلِ اعتراض و ملامت نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مارکوئس دی مونٹیسپاں کو لوئی چاردہم (شاہِ فرانس) کے ساتھ اپنی بہو کے تعشق کی خبر پہونچی تو اس نے کہا کہ "الحمد للہ اب تمول ہمارے گھر میں داخل ہونے لگا ہے!"

(از "بالم")

(۱)

سلیمہ حسین تھی لیکن اپنے حسن و جمال، رعنائیوں اور اس کی پوشیدہ فتنہ سامانیوں سے بے خبر تھی ہر چند دولت حسن سے مالامال تھی لیکن قسمت کی ہیٹی غریب باپ کی بیٹی اور غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ جوانی و مفلسی کا ساتھ تھا۔ دل میں ہزاروں ولولے اور اُمنگیں پیدا ہوتیں اور پھر فنا ہو جاتی تھیں۔ اُس کا باپ حامد کانپور کے ایک تاجر چرم کے کارخانہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کا ملازم تھا۔ لیکن دو ماہ سے علالت کی وجہ سے صاحب فراش تھا۔ گھر میں ایک بیوی، دو چھوٹے چھوٹے بچے اور جوان سلیمہ کل چار پانچ نفر کھانے والے اور کمانے والا صرف ایک حامد۔ ایک تو یونہی عسرت میں بسر ہوتی تھی اس پر حامد کی علالت مستزاد، غریبوں کے گھر میں اثاثہ ہوتا ہی کیا ہے تاہم زیور کی صورت میں جو کچھ سچا جھوٹا تھا اونے پونے داموں تمام بیچ ڈالا۔ سلیمہ کی ماں اصغری بڑی کفایت شعاری سے اس کو صرف کرتی۔ اپنی اور سلیمہ کی ضروریات پر شوہر اور بچوں کی ضروریات کو مقدم سمجھتی تھی۔ کسی کسی دن ماں بیٹی فاقہ سے بھی گذار دیتی تھیں لیکن حامد کے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی تھی،

سلیمہ اپنی اور والدین کی اس ہلاکت آفرین و برباد کن عسرت و فلاکت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی، تنہائی میں پہروں رویا کرتی تھی لیکن اس کا تدارک اس کے امکان سے باہر تھا۔ عورت ذات اور کیا کر سکتی تھی تمام تمام دن چکی چلاتی لیکن پھر بھی گردش فلک پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ ماں باپ اپنی جاکش بیٹی کی پرمحنت و مشقت دیکھ دیکھ کر الگ پریشان ہوتے تھے۔

سلیمہ کی تعلیم اگرچہ اعلیٰ معیار کی نہ تھی تاہم خداداد ذہانت اور شوق مطالعہ نے اس میں خاصی قابلیت پیدا کر دی تھی گھر کے کام دھندوں سے ذرا بھی فرصت ملتی کتب بینی یا سینا پرونا اس کا مشغلہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی جس سے وہ محلہ کی دیگر نوجوان لڑکیوں میں ممتاز تھی۔

(۲)

جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے کانپور میں الٰہی بخش سوداگر چرم کے تمول کی بڑی دھوم تھی، بڑا رحم دل اور کریم النفس تھا ہزارہا غربا ومساکین اس کی دولت وثروت سے مستفیض ہوتے تھے دولت واقبال، آل اولاد اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ بڑا لڑکا رحیم بخش علی گڑھ یونیورسٹی میں بی اے کی تعلیم پاتا تھا، غرض ہر حیثیت سے خوش نصیب تھا۔ حامد اسی کے کارخانہ کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔ چونکہ حامد بہت ملنسار اور محنتی آدمی تھا کارخانے کے تمام ملازمین کے دلوں میں اس کی وقعت تھی اور ہر چھوٹا بڑا اس کو یکساں طور پر چاہتا تھا۔

کارخانے کا ہر دلعزیز منیجر منظور احمد جو نوعمر ہونے کے باوجود نہایت ہوشیار اور تجارتی معاملات میں خاصہ تجربہ رکھتا تھا۔ اپنی دیانت داری اور معاملہ فہمی کا الٰہی بخش کو بارہا ثبوت دے چکا تھا۔ اس لئے کارخانہ کا کل کاروبار اسی پر منحصر اور اسی کے دم سے الٰہی بخش کی تجارت واارت قائم تھی، خرید وفروخت آمد وخرچ غرض کہ کل سیاہ وسفید کا یہی مالک تھا ہر دلعزیزی اور نیک چلنی کے باعث الٰہی بخش کے زنانخانہ میں بھی بلا کسی عذر اور روک ٹوک کے آتا جاتا تھا۔ الٰہی بخش اور اس کی بیوی بھی اس کو اپنے حقیقی فرزند کی طرح چاہتے تھے۔

چونکہ منظور کام کے آدمیوں کا بڑا قدر دان اور ان کا ہر قسم کا خیال رکھنے والا تھا۔ حامد ایسے محنتی وجفاکش شخص کی دو ماہ کی غیر حاضری نے اسکو اس کی عیادت واعانت پر مجبور کر دیا اور وہ سیدھا اس کے مکان پر پہنچا۔

حامد کا مکان جو اس کا اپنا آبائی تھا قدیم طرز کا بنا ہوا تھا جسمیں دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک برآمدہ اور سامنے مختصر صحن تھا جس کو بلند دیواریں احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ حامد کی علالت کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی مرد عیادت کو چلا آتا تھا ورنہ اکثر محلہ کی عورتیں یا سلیمہ کی سہیلیاں بیٹھنے اور خوش گپیاں کرنے آیا کرتی تھیں، صحن کے دروازہ کو ہمیشہ اندر سے زنجیر لگی رہتی تھی جس کو کسی کے دستک دینے پر کبھی بچے اور کبھی سلیمہ کھول دیا کرتی تھیں، آج بھی حسب دستور جبکہ منظور نے دستک دی تو سلیمہ نے زنجیر کھولی لیکن جونہی دروازہ کھلا سلیمہ ٹھٹھک کر رہ گئی کیونکہ اس کے روبرو بجائے کسی عورت یا اپنی سہیلی گلنار کے ایک جوان رعنا کو دیکھا

پا ہے تو یہ تھا ایک غیر مرد کو دیکھ کر بھاگ جاتی مگر منظور کے مردانہ حسن نے لمحہ بھر کے لئے اس کو مبہوت بنا دیا آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں پر ایک قسم کی سراسیمگی طاری ہو گئی جسم میں برقی رو دوڑ گئی۔ خون میں حدت، جذبات میں ہیجان اور دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ تبادلہ نگاہ کے ساتھ دلوں میں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ یہ تو وہی خوب جان سکتے ہیں جن کو ایسی لذت اندوز و لطف آفرین اولین موت نصیب ہوئی ہو، اور اس لطیف ترین آن واحد میں طویل ترین محبت کی داستانِ اضطراب کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوا ہو۔ منظور اب جو سنبھلا تو وہ ناظورہ حسن چھلاوہ کی طرح نظروں سے غائب تھی۔

حامد نے اپنے غریب خانہ میں ایسی زبردست شخصیت کو دیکھ کر تعظیماً اٹھنے کی کوشش کی لیکن منظور نے اس کو ایسا کرنے سے باز رکھتے ہوئے دریافت حال کیا۔ بڑی کوشش کے بعد ایک دوسرے آپس میں سوال و جواب کر سکتے تھے، منظور بے طرح دل کی دھڑکن کے سبب اور حامد نقاہت کے باعث، منظور کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اگر یہاں مریض کے سوا کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اس کے جذبات دلی کی کیفیت چہرے کے اوتار چڑھاؤ سے تاڑ جاتا اسی لئے وہ علاج معالجہ کے متعلق کچھ یونہی سے استفسارات کے علاوہ زیادہ اظہار ہمدردی نہ کر سکا، پچاس روپے کے نوٹ بطور اعانت مریض کے حوالے کر کے اور آئندہ آنے کا وعدہ کر کے یہ دل گرفتہ و خستہ جگر ایک داغ جانسوز دل پر لیکر چلا گیا۔

(۳)

سلیمہ اور منظور کے چوٹ کھائے ہوئے دل مضطر و بیقرار ہیں ادھر سلیمہ، منظور کو دوبارہ دیکھنے کی آرزومند ہے تو ادھر منظور بھی اس کے جلوہ جاں سوز کے نظارہ کا طالب ہے، اگر ایک کو کسی کے دل پر قابض ہونے پر ناز ہے تو دوسرا بھی اس معبود حسن و شباب کے پرستار ہونے پر مغرور ہے اگر یہاں دل کی سیمابی کیفیت ہے تو وہاں اضطرابی حالت، اگر یہ دلولہ انگیز شباب کی امنگوں سے پریشان ہے تو وہ بھی جوانی کی طوفان خیز تمناؤں سے بیتاب ہے غرض کہ دونوں ایک ہی تیر کے زخمی، ایک ہی آرزو کے متمنی اور ایک ہی جذبہ سے متاثر ہیں۔ جو دل آج سے پہلے محبت کے نام سے واقف نہ تھے آج پر لطف و پرکیف درد سے آشنا اور پرلذت خلش سے بہرہ اندوز ہیں۔

(باقی دارد)

لالۂ صحرا

دشت

فضائے دشت میں چھائی ہے ویرانی سی ویرانی پھر اس پر سوزش گرما ہے وقف شعلہ سامانی
ہر اک جانب غبار ناتواں اٹھتا ہے ذروں سے کہ پیچ و تاب میں اسکے ہے درد آسا پریشانی
رواں ہے موج اندر موج، لو جھلسی ہوئی ایسی کہ گویا بحر ذاخر میں بپا ہو جوشش طغیانی
فضا میں ایک ہیبت زا ادا سی رقص کرتی ہے بگولے دوڑتے ہیں صورت غول بیابانی

وہ منظر ہے کہ آنکھوں میں پھریں حسرت کی تصویریں
وہ منظر ہے کہ خواب عیش کی نکلی ہیں تعبیریں

نخلستان

مگر شاداب خطہ بھی ہے اک اس دشت ویراں میں کہ نزہت کام آئی جسکی تخلیق گلستاں میں
سمائی ہے سکون غم کی عشرت ذرے ذرے میں تلاطم ہے نہاں لیکن ہوا کی موج لرزاں میں
یہاں دو پاک روحیں عشق کا دربار کرتی تھیں کہ نغمے ہیں انہیں کے نالہائے عندلیباں میں
انہیں سے روشنی یہ مل گئی ہے ماہ تاباں کو انہیں سے آئی ہیں یہ سرخیاں لعل بدخشاں میں
محبت ان کی تھی آئینہ دار نور یزدانی وہ نکلے عرش پر جا کر جو ڈوبے بحر عصیاں میں

وہیں تربت بنی تھی اک شہید بیقراری کی
کہ پیہم دوسرے نے اس پہ برسوں اشک باری کی

لالۂ صحرا

ہوا آخر کسی کا مرہم زخم جگر پیدا ہوا اس دشت میں اک غنچۂ رنگیں اثر پیدا
مرادوں کے شگوفے کھل گئے غربت کی وادی میں نہال عاشقی میں ہو گئے یعنی ثمر پیدا
محبت پھوٹ نکلی کاروان رنگ و بو ہو کر اچانک ہو گیا ذروں میں عشق فتنہ گر پیدا
ہوئے اس شمع کے جلنے سے دل کے تیکدے روشن فریب آرزو کرنے لگا حسن نظر پیدا
وہی اک "لالۂ صحرا"، فروزاں ہے وہاں ابتک بہار عاشقی کی روح خنداں ہے وہاں اب تک

ماہِ تاباں

اے مہِ تاباں! سرور افزا ہے تیری روشنی
اُجلی اُجلی یہ شعاعیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی
ساکنانِ دہر پر برسا رہا ہے نور تو
ہے سرِ کوہِ فلک گویا چراغِ طور تو
تیری ضو سے دامنِ لیلائے شب زرتار ہے
خلعتِ زر سے مزین ہر در و دیوار ہے
انجمِ تابندہ تابش سے تیری گل خوردہ ہیں
دامنِ چرخِ بریں میں غنچۂ پژمردہ ہیں
چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادیِ گلپوش میں
کاروانِ نور اُترا منظرِ خاموش میں
پیرہن سیماب کا پہنے ہوئے ہے موجِ آب
نور در آغوش ہے چشمِ نظر بازِ حباب
جوش سا دل میں ہے حُسنِ روئے عالمتاب سے
تیرا جلوہ دیکھتا ہوں دیدۂ سرخاب سے
محوِ نظارہ ہوں۔ وارفتہ ہوں۔ دیوانہ ہوں میں
شمعِ حُسنِ ماہ پر بچپن سے پروانہ ہوں میں
درس آموزِ حقیقت ہے ترا اوج و زوال
تیری ظلمت سے ہے روشن میری دنیائے خیال

گو بہ رخشندہ شب افروز تیری ذات ہے
"چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے"

رہروِ صحرائے گردوں! کس کی ہے تجھکو تلاش
شاہدِ خاموش! کر مجھ پر تو اپنا راز فاش
تیرے دل میں کس کا روشن ہے چراغِ آرزو
لگ رہی ہے کس کی لو کس کا ہے داغِ آرزو
رات بھر مشعل لئے پھرتا ہے تو کس کے لئے
ماہِ انور۔ ہے سراپا جستجو کس کے لئے
مہر سے کرتا ہے کس کے دیکھنے کو کسبِ نور
کون وہ ناز آفریں ہے مخزنِ حُسن و سرور
آہ سرگرداں عبث تو سعیِ لاحاصل میں ہے
برقِ جاں افروز پنہاں میری آب و گل میں ہے

وہ ضیا افگن میرے دل کے سیہ خانے میں ہے
بادۂ نورِ ازل مٹی کے پیمانے میں ہے

برق (دہلوی)

فائدہ

چاہے جب ہر شخص اپنا فائدہ — کس طرح پھر ہو کسی کا فائدہ
ہے جزا احسان کی احسان ہی — کیجئے احسان ہو گا فائدہ
تم کو کچھ نقصان پہنچے گا نہیں — تم جو چاہو گے کسی کا فائدہ
ہو گی یہ نیت تو پہنچے گا ضرر — غیر کا نقصان اپنا فائدہ
مبتلائے مصیبت ہو جاؤ گے — بدظنی سے کچھ نہ ہو گا فائدہ

خود غرض جو مشورہ دے گا ذہین
سوچ لے گا پہلے اپنا فائدہ

ذہین (از حیدرآباد)

زبان

رہے گا شاد وہی جس کی ہو زبان شیریں — کہ بدزبان سے خوش کوئی بھی جہاں میں نہیں
یہی زبان ہے آپس میں جو لڑاتی ہے — یہی زباں کہ ہر اک کو بھاتی ہے
جہاں میں زخموں سے اسکے ہیں سینکڑوں نالاں — یہی تو کرتی ہے کرتی ہے ہر ایک کو یہاں شاداں
یہی زبان تو عزت کو بھی ڈبوتی ہے — وہی ہے بات جو قند نبات ہوتی ہے
نہ بدزباں سے الفت بڑھائے گا کوئی — جو بدزباں ہو کوئی اس کو چاہے گا نہ کبھی
جو اپنے بس میں اسے رکھئے ہے وہی انساں — نہیں وہ آدمی قابو میں ہو نہ جس کے زبان
اسی زباں سے ہوتی ہے ہر جگہ ذلت — اسی سے آدمی پاتا ہے عزت و حرمت

جو دوسرے کو کہے گا برا سنے گا وہی
عزیز آپ نے کیا خوب ہے یہ بات کہی

عزیز نظامی (حیدرآباد)

غزلیات

(منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی)

تیغ قاتل کا اشارہ ہے گرانجانوں سے
تم بگلہ وحشی نہ ہو گے میرے احسانوں سے

بل کی ہے خنجر قاتل نہ گرانجانوں سے
سر سمجھتے ہیں یہ پہلے ہی جدا شانوں سے

شعلہ رو! آگ نہ ہو سوختہ سامانوں سے
شمع کی گرمی بازار ہے پروانوں سے

چار دن بھی نہ نبھی پھر گئے پیمانوں سے
تم کو شیشے میں اتارا تھا کن ارمانوں سے

مست ہوں دیکھ کے ساقی کی نشیلی آنکھیں
اب نہ مے سے مجھے مطلب ہے نہ پیمانوں سے

شور فریاد کا کب اس پہ اثر ہوتا ہے
اونچا سنتا ہے بہت پیر فلک کانوں سے

ہجر میں یاد شب وصل سے لیتا ہوں مزے
دل کو بہلاتا ہوں گذرے ہوئے افسانوں سے

تشنۂ دید سے کیا آنکھ ملاؤ گے جبھی
جب مے حسن چھلک جائیگی پیمانوں سے

دیکھتے ہیں غضب آلودہ نگاہوں سے مجھے
پرسش دل بھی وہ کرتے ہیں تو پیمانوں سے

عین کثرت میں نظر آتا ہے وحدت کا ظہور
راز قدرت کا نمایاں ہے صنم خانوں سے

بس گیا جس کی نگاہوں میں جمال جاناں
اس کو کعبہ سے غرض ہے نہ صنم خانوں سے

شامل حلقۂ رنداں ہے کہیں برق ضرور
آج ہو حق کی صدا آتی ہے میخانوں سے

(جناب سید عابد علی صاحب عابد - بی - اے - ایل ایل - بی)

غنچۂ پژمردہ ہوں ناشاد ہوں برباد ہوں
اور کہنے کو گلستاں میں گلستاں زاد ہوں

یا فلک پر تھا ابھی یا گر پڑا منزل پہ میں
برق وحشت ہوں قیود راہ سے آزاد ہوں

حسن کہتا تھا کہ ہے مجھ سے امیدوں کی بہار
عشق بول اٹھا رگ امید کا فصاد ہوں

گلفشاں ہے عشق سے میرے عروس کائنات
کار فرمائے بہار عالم ایجاد ہوں

ماورائے عشق ہر شے بے حقیقت ہو گئی
ان دنوں عابد دیار عشق میں آباد ہوں

اخبار علمیہ

ہوا پر دوڑنے والا موٹر

ہیٹبرگ کے ایک شخص نے ایک موٹر ایجاد کیا ہے جس کی نسبت اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہوا پر دوڑتا ہے۔ شروع میں یہ موٹر پٹرول کے تیل سے چلتا ہے اور جب دس میل فی گھنٹہ کی رفتار پر پہونچتا ہے تو پٹرول بند کر دیا جاتا ہے اور موٹر صرف ہوا کے ذریعہ سے چلتا رہتا ہے۔ اس کا پہلا تجربہ حال ہی میں بمقام ہیٹبرگ کیا گیا جس میں یہ موٹر فی گھنٹہ ۶۲ میل کی رفتار تک پہنچ گیا تھا۔

سب سے بڑا ہوائی جہاز

دُنیا میں سب سے بڑا ہوائی جہاز اس وقت جاپانی حکومت کی فرمایش سے بمقام فرائی ڈرشیفن، کانسٹن تالاب کے کنارے تیار ہو رہا ہے، اس میں سو آدمی بیک وقت بیٹھ سکیں گے۔

کالر اور نکٹائی کی مخالفت

فرانس کے ایک شاعر گستا د شار ینتیر اور وہاں کے ایک ڈراما نویس رومین کولس نے کالر پہننے کے خلاف ایک جمعیۃ "اینٹی کالر لیگ" کے نام سے قائم کی ہے۔ اس جمعیۃ کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا ہے کہ سخت کالر پہننا عقلاً اور طبًا مضر ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کی فضول جکڑ بندی ہے۔ اس نئی جمعیۃ کے لیڈر کالروں اور نکٹائیوں کو مردوں کے لئے ایسا ہی خطرناک بتاتے ہیں جیسے کہ عورتوں کے لئے قورسیتیہ (زنانہ سینہ بندی Corset) وہ اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ اس ضعیف خلقت نے تو جرأت کرکے اس "تنگ ملبوس" کو اُتار پھینکا، اور مردوں نے ابتک کالروں اور نکٹائیوں کی جکڑ بندیوں سے اپنے تئیں آزاد نہیں کیا!

زبان:۔ کیا ہمارے ملک کے انگریزی داں اور فیشن ایبل بننے کے شوقین نوجوان اس سے کچھ عبرت حاصل کریں گے؟

(اڈیٹر)

امریکہ کے لکھ پتی

بقول مسٹر میک کوئے، رجسٹرار خزانہ ریاستہائے متحدہ، امریکہ کے لکھ پتی آدمیوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، اور آئندہ چل کر اس میں بڑی کمی وا قع ہو جائے گی۔ یہ اندازہ انکم ٹیکس کی موصولات پر سے کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت امریکہ میں گیارہ ہزار آدمی لکھ پتی ہیں جن میں ایک کروڑ پتی بھی ہے۔ گویا ہر ۰۴۵۰ کی آبادی میں سے ایک شخص لکھ پتی ہے۔

ایک مخدر دوا

ٹوران یونیورسٹی کے ڈاکٹر سینڈورز نے ٹرکین نامی ایک مخدر دوائی ایجاد کی ہے جو اپنے منوم اثرات کے لحاظ سے عجیب غریب ہے۔

خاک سے علاج

نیپلز (اٹلی) کے ایک پادری مسمی ڈان لوئیگی گیروفیلو، تمام امراض جسمانی کا علاج خاک سے کرنے کے مدعی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظریۂ علاج کی بنیاد انجیل کے اس مقولہ پر رکھی ہے کہ "خاک کا پتلا ہے تو اور خاک میں مل جائیگا"!

پادری صاحب موصوف کی دلیل یہ ہے کہ ہومیوپیتھک (علاج بالمثل) نقطۂ نظر سے، چونکہ انسان کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے، اس لئے اس کے واسطے یہی عنصر شفا بخش ہو سکتا ہے چنانچہ مقام نیپلز ولی کے قریب ایک سرخ رنگ کی مٹی سے (جس میں گندھک اور تانبے کے اجزا ملے ہوئے نظر آتے ہیں) وہ گولیاں بنا کر اپنے مریضوں کو دیتے ہیں، اور ان کو شفا ہو جاتی ہے۔ اس مٹی کی کیمیادی ترکیب کی بہ نسبت اس عقیدت مندی کو زیادہ دخل ہے جو پادری صاحب اپنے مریضوں میں یہ کہہ کر پیدا کر دیتے ہیں کہ: "ہر جگہ کی خاک کی یہی تاثیر ہے"!

نیپلز کے ایک گنجان آبادی والے قصبہ میں پادری صاحب علاج کے لئے بلائے گئے۔ مریضہ جسکی عمر ۱۱ سال کی تھی مرض دماغی میں مبتلا تھی اور تمام نامی گرامی ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہو چکے تھے۔ پادری صاحب نے اس لڑکی کے سر پر ایک سفید کپڑا باندھا اور تین مرتبہ پڑھ کر دم کیا تو وہ لڑکی تندرست ہو گئی اسی طرح آپ نے دق، امراض قلب، امراض دنداں، گلسوے، وغیرہ کے علاج میں خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔

گورنمنٹ کے تعلیمی اخراجات

"ہندوستان میں تعلیمی ترقی" کا رپورٹ گورنمنٹ کے تعلیمی کمشنر مسٹر ریچی نے شائع کیا ہے۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تعلیم پر گورنمنٹ ۴۹۹۸۰۱۵۹ روپئے صرف کرتی ہے۔ جس کا اوسط رعایا میں سے

فی کس ۴ ہر پڑتا ہے۔ گویا اس حساب سے گورنمنٹ کے تعلیمی اخراجات ۹۰،۱ سے لیکر ۷،۴ تک گھٹ گئے ہیں اور ان میں تعلیمی فیسیں وغیرہ ملانے سے گورنمنٹ کا تعلیمی فنڈ ۸،۲۱ سے ۴،۲۲ تک ترقی کر گیا ہے۔ چنانچہ مختلف صوبجات میں ہر متعلم پر ۳ روپے (بہار اور اڑیسہ میں) سے لیکر ۴۴ روپیہ (دہلی میں) تک خرچ پڑتا ہے۔

عورتوں کی نو آبادی لندن کے جنوب میں بمقام لنگفیلڈ عورتوں نے بطور خود معاش حاصل کرنے کے لئے اپنی ایک نو آبادی قائم کی ہے چند نوجوان عورتوں نے اس کو قائم کیا ہے جہاں اُنہوں نے کاشتکاری اور باغبانی کا پیشہ کرنے کے لئے ایک سو ایکڑ زمین اپنے لئے مخصوص کی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ زراعت صرف مردوں ہی کا پیشہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی تن تنہا اس کام کو انجام دے سکتی ہیں، ان عورتوں نے اشتراکی زندگی اختیار کی ہے اور ہر معاملہ میں ان کو آزادی ہے سوائے اس کے کہ وہ اپنے شوہروں کو وہاں نہ آنے دیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس تین سے چار ایکڑ تک زمین ہے۔ علاوہ ازیں ان میں ایک نے انگورہ کے خرگوش پال رکھے ہیں، دوسری کے پاس گایوں کا گلہ ہے، تیسری نے سبزی ترکاری کا باغ لگایا ہے۔ تیسری اس نو آبادی کے لئے روٹیاں اور کیک پکایا کرتی ہو۔ پیداوار سے جو کچھ بچ رہتا ہے وہ اس کو قریب کی ایک شاہراہ پر لگی ہوئی دوکان پر فروخت کر دیتی ہیں تھوڑے عرصہ میں اس نو آبادی نے خاصی ترقی کر لی ہے اور کئی سو درخت میوہ جات کے وہاں لگ گئے ہیں۔ باایں ہمہ یہاں کی رہنے والیوں میں قناعت اور اطمینان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب اُنہوں نے شوہروں کو وہاں لانے کی ممانعت کا قانون منسوخ کر دیا ہے۔ شاید سخت کام اور محنت کے لئے مرد کی قوت کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے قانون میں یہ ترمیم کی ہے کہ اب سے شادی شدہ عورتیں اپنی اپنی زمین کی کاشتکاری وغیرہ کاموں میں اپنے شوہروں سے امداد طلب کریں گی مجاز ہوں گی۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس نو آبادی کے انتظامی معاملات میں یہ غریب دخل نہ دے سکیں گے، کہتے ہیں کہ اس شرط پر تین شوہر وہاں پہنچ گئے ہیں۔

تفریس الفاظ صفحہ مندرجہ آیندہ فہرست الفاظ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اہل فارس بھی انگریزی ناموں کو ان کے اصلی تلفظ میں رکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے عربوں کی طرح تعریب کرنے اور فارسیت کا جامہ پہنانے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

معرب الفاظ	اصلی الفاظ	
رویتر	ریوٹر	Reuter
فوریه	فبروری (جو اردو میں فروری لکھا جاتا ہے)	February
دیکتاتوری	ڈیماکریسی	Democracy
مارس	مارچ	March
نیویورک	نیویارک	New york
ماشین	مشین	Machine
استرالیا	اسٹریلیا	Australia
پاریس	پیرس	Paris
قنسول	قونصل	Counsel
پرفسور	پروفیسر	Professor
دکتور	ڈاکٹر	Doctor
اروپائی	یوروپین	European
رادیوم	ریڈیم	Redium
آتوموبل	آٹوموبل	Antomobile
استاسیون	اسٹیشن	Station
پاکت (لفافہ)	پاکٹ	Pocket
پستخانہ	پوسٹ آفس	Post-Office

اس قسم کے صدہا معربات روزانہ فارسی اخبارات میں نظر آتے ہیں انکو جمع کرنے کے لئے ایک ضخیم دفتر کی ضرورت ہے۔

عربی کے بجائے خالص فارسی مصطلحات

صدیوں سے فارسی اور عربی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور آج بھی جسقدر عربیت کو اس میں

دخل ہے کسی دوسری زبان کو نہیں مگر ایرانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جو محض فارسی الفاظ کو رواج دینا چاہتی ہے ان میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جو مملکت ایران کے اُن شہروں کے ناموں کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں جن کو عربوں نے معرب کر لیا تھا یا جن پر معرب ہونے کا گمان ہوتا ہے چنانچہ آقائے نو بخت اپنے ایک علمی مضمون "پیش نہاد ہائے نجگانہ" میں لکھتے ہیں کہ بطام - سوادکوہ - جرق - اور دامغان اصل میں بستان - فرشوادگر - چرزہ اور دام کون تھے جو عربوں کے کثرت استعمال سے معرب اور متغیر ہوگئے ہیں ذیل میں اُن فارسی مصطلحات کی فہرست دی جاتی ہے جو مروجہ عربی الفاظ کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

اسم اصلی	اسم پیش نہادی
فوج	درفش
سلطان	سرکردہان
رئیس ارکان حرب	ہمکان سرجنگ
مدارس نظام	دبستان سپاہ
وزارت	دستوری
مشار	گماشگر
وزیر حرب	جنگ دستور
وزیر معارف	دانش دستور
دار الصفارۃ	فرستادہ گاہ
وزارت مالیہ	باجستان
وزیر داخلہ	ایران دستور
رئیس الوزرا	مہین دستور وغیرہ

دولابہ راستی کش

ایکسرے (X-ray) کا استعمال ابتک متعدد امراض کے علاج معالجہ کے لئے مخصوص تھا لیکن اب جرمنی میں اس کا استعمال جرایم پیشہ افراد پر بھی کیا جاتا ہے۔ ایک برقی لیمپ کے ذریعہ مجرم کے چہرہ پر شعاعیں ڈالی جاتی ہیں جس سے وہ اپنے صحیح حالات بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ" دولابہ راستی کش" جرمنی کے ہر پولس اسٹیشن پر رکھا گیا ہے آبکینوں کی جانچ بھی اب اسی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

سزائے شراب نوشی

امتناع شراب نوشی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے نبراسکا (امریکہ) کی عدالت کے ایک جج مسٹر برائمینٹ نے یہ سزا تجویز کی ہے کہ ایسے مجرموں کو بطور غذا صرف روٹی اور پانی دیا جائے۔ مقامی اخبارات نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی لیکن جج موصوف نے اپنے زیر ماتحت تمام ملازمین کو پانچ روز تک اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم صادر کرکے اخبارات میں ایک اعلان شائع کرایا ہے کہ اس سزا سے جسمانی یا روحانی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

تنقید و تبصرہ

مراتِ محمدی منشی شیخ غلام محمد صاحب مرحوم متوطن ادلپاڑ (ضلع سورت) کو فن تاریخ سے گہری دلچسپی تھی خصوصاً گجرات کاٹھیاواڑ کی تاریخ سے خاصہ شغف رکھتے تھے چنانچہ ریاست جوناگڈھ کے محکمہ تاریخ میں ایک عرصہ تک تاریخ نویسی کی خدمت انجام دیتے رہے، جوناگڈھ کی ایک ضخیم تاریخ موسوم بہ مرات مصطفےٰ آباد (زیر طبع) بھی مرحوم ہی کی تصنیف بتائی جاتی ہے اس کے علاوہ بھی متعدد تاریخی کتب مرحوم کی یادگار ہیں۔

زیر تنقید کتاب گجرات کی مکمل اسلامی تاریخ ہے جس کو مصنف مرحوم کے لایق فرزند جناب منشی غلام احمد صاحب پرنسپل وکٹوریہ جبلی مدرسہ پوربندر (کاٹھیاواڑ) نے حال میں اپنے اہتمام سے بار اول طبع کرائی ہے۔

شروع میں جناب شیخ محمد بہائی صاحب دیوان ریاست جوناگڑھ کی تصویر اور اُن کے نام پر انتساب ہے۔ اسکے بعد صوبہ گجرات کا جغرافیہ ماضی و حال، دیسی ریاستوں سے برٹش گورنمنٹ کے پولیٹکل تعلقات، ریاستوں کے اختیارات و درجات اور اقوام گجرات و قدیم راجگان گجرات کے خاندانی حالات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، باب سوم سے اہل اسلام کا سلسلہ وار بیان ہے، چنانچہ بزمانہ خلافت راشدہ گجرات میں مسلمانوں کا ورود، سلطان محمود غزنوی کا حملہ سومنات تحقیق سے لکھا ہے اس کے بعد پانچویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری کے آخر تک سلاطین گجرات کے حالات پوری وضاحت سے لکھے ہیں۔ سلاطین گجرات کے تاریخی کارناموں کے ساتھ ساتھ مصنف نے ان کے طرز حکومت، عدل و انصاف، طرز معاشرت اور عادات و خصائل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے جو نہایت پر از معلومات اور مفید ہے غرضیکہ تاریخ کے شایقین کے لئے نہایت کارآمد اور گجرات کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔

فہرست مضامین کے نہ ہونے سے حالات دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے اسی طرح بعض زبان کی بھی فاحش غلطیاں رہگئی ہیں یقین ہے کہ شیخ صاحب موصوف طبع دوم میں ان نقایص کی اصلاح فرمادینگے

[illegible]

ملنے کا پتہ۔ سند رجہ بالا پور بندر کے پتہ سے یا محمدی بک ڈپو اولپاڑہ ضلع سورت سے مل سکتی ہے۔

گلزار خلیل | یہ چھوٹا سا رسالہ جناب سید محمد کاظم صاحب عرف آقا خلیل متخلص بہ خلیل کھمباتی نے تصنیف فرمایا ہے اسمیں اندوی حروف تہجی ، ۲ سلام اور ایک مرثیہ ہے۔

سلام اوّل کا یہ مطلع ثانی ؎

روح القدس بھی شیدا ہے میرے صفیر کا
بلبل ہوں بوستانِ جناب امیر کا

ناسخ مغفور کے اس مشہور و معروف مطلع سے "غالباً" توارد ہو گیا ہے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

تیسرے سلام میں اثر۔ نظر کے قوافی میں سوگور باندھ گئے ہیں لفظ سوگ ہندی الاصل ہے فارسی میں صرف ایک جگہ ترکیب اضافی کے ساتھ مستعمل ہے یعنی سوگوار لیکن اب تک صاحب لوگ۔ اہل سوگ یا سوگوار کہیں نظر سے نہیں گذرا اس لئے اس سے احتراز لازم ہے۔

ان معمولی فروگذاشتوں کے علاوہ بعض سلام سلامت و روانی کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں، لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۴۰ صفحے قیمت صرف ۴ر

مصنف کے نام کھمبایت قریب جامع مسجد کے پتہ سے مل سکتی ہے

اردو رسالے

سہیل (علیگڈھ) | مسرت کا مقام ہے کہ اردو فن صحافت روز بروز پایہ تکمیل کو پہنچتا جاتا ہے اور صحافت و ادارت کے اصول و فرائض کی کما حقہ ادائیگی ہو رہی ہے۔ بعض رسالے تو اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے سبب یورپ کے اچھے رسالوں کے ہم پلہ نظر آتے ہیں اگرچہ یہ صحیح ہے

کہ یورپ بہ لحاظ خوشنا ٹائپ اور موقع بموقع رنگین وسادہ تصاویر کے ظاہری خوبیوں میں ہم سے گوئے سبقت لے گیا ہے اور ہم اردو ٹائپ کی نامقبولیت کے باعث اور لیتھو کی ناقابل برداشت دشواریوں اور کثیر اخراجات طباعت کی وجہ سے بہت پیچھے ہیں تاہم معنوی خوبیوں میں ہم ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں بلکہ بعض رسالہ تو اس صنف یورپ سے بھی کہیں بالاتر ہیں چند رسالہ ایسے بھی ہیں جو ظاہری و معنوی دونوں اوصاف سے متصف ہیں اور ان میں سب سے پہلا نمبر سہیل کا ہے۔

انگریزی میں متعدد سہ ماہی رسالے نکلتے ہیں اور آئے دن نکلتے جا رہے ہیں۔ اردو میں اس کی سخت کمی تھی لیکن شکر ہے کہ اس کمی کو مولینا عبدالحق صاحب بی اے نے ذریعہ اردو (اورنگ آباد) بوجہ احسن اور مولینا رشید احمد صاحب صدیقی نے ذریعہ سہیل بدرجہ اتم پورا کر دیا ہے۔

مولینا رشید احمد صاحب (صدیقی) ملک کے مشہور انشا پرداز ہیں جو اپنی مخصوص طرز نگارش کے باعث بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں اور جن کو اردو سے نہ صرف گہری دلچسپی ہے بلکہ اس کی نشر و اشاعت کے پیچھے بھی خواہ وہمدرد ہیں اسلئے ملک کے اردو داں طبقہ کو جو توقعات ہونی چاہئے تھیں وہ با حسن الوجوہ ذریعہ سہیل انجام دے رہے ہیں

سہیل کا زیر تبصرہ نمبر ۳ بابت ستمبر ۲۶ء جس شان سے جلوہ گر ہوا ہے اور اپنے دامن میں جن جواہر پاروں کو لیکر قدردانان اردو کی خدمت میں حاضر ہوا ہے وہ میرے نزدیک لائق تحسین ہی نہیں بلکہ قابل صد رشک و حسد ہے (چشم بد دور) رسالہ خود اپنے مرتب کے ذوق صحیح، شغف علمی اور نگاہ انتخاب کا نمایاں طور پر ثبوت دے رہا ہے اسر ورق کی سادگی ہزاروں بناؤ پر قربان ہے شروع میں "ارجن اور کرشنا" کی رنگین تصویر جناب عبدالرحمن صاحب چغتائی کے موئے قلم کی اعلیٰ صناعی کا ثبوت ہے، پھر صفحہ الف تا ہ افاضل مرتب کے کارآمد شذرات ہیں اس کے بعد رسالہ کے اصل مضامین صفحہ ۲ سے شروع ہوتے ہیں پہلا مضمون "اردو بطور ایک مذہبی زبان کے" سید طفیل احمد صاحب (علیگ) کا ہے جسمیں فاضل مقالہ نگار نے اردو میں دینیات اور مذہبی کتب کے منتقل ہونے پر اظہار امتنان وتشکر، ہندی و اردو کی رفتار ترقی میں تیزی و سستی اور اردو کو ایک مشترکہ زبان بنانے کے مشکلات نہایت فصاحت سے بیان فرمائے ہیں صفحہ ۱۰ سے خواجہ منظور حسن صاحب ایم۔ اے نے روس کے مشہور فسانہ نگار ترگنف کے فسانہ "ایری ایڈی" کا اصل مصنف

سے کے مخصوص رنگ میں نہایت کامیاب ترجمہ فرمایا ہے یہ فسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے ۔ صفحہ ۳۰ پر "یک نظر راجع بہ تعلیم اسلامیات در علیگڑھ یونیورسٹیہ" کے عنوان سے جناب سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری نے علیگڑھ یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے متعلق نہایت جامع اور سلیس فارسی مضمون پسرد قلم فرمایا ہے جس کو دیکھ کر زبان سے بے اختیار داد نکل جاتی ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسی فارسی نظم و نثر لکھنے والی ہستیاں موجود ہیں جو کسی طرح اہل زبان سے کم نہیں ہیں، لیکن کیا اچھا ہوتا اگر یہ گرانقدر خیالات اُردو میں منتقل فرمائے جاتے کہ ناظرین سہیل میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہوں گے جو فارسی سے بے بہرہ ہوں گے ۔ صفحہ ۴۴ پر "پنڈت زتشی اور بعض مضامین سہیل" والے مضمون میں شرر و سرشار کی طرز جدید میں ناول نویسی کی اولیت کا جھگڑا اور اُردو میں عربی و فارسی یا سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کو بیجا طور پر دخل دینے کی کشاکش سے شیخ و برہمن بلکہ "سید و پنڈت" کا اختلاف ہے ، اس کے بعد "قاصد سحاب" کا طویل مضمون جو پچاس صفحات پر حاوی ہے مہا کوی کالیداس کی میگھ دوت کی عاشقانہ نظموں کے اردو ترجمہ کا دیباچہ ہے جس پر فاضل مرتب کا ایک طویل نوٹ ہے جس سے ہر منصف مزاج کو اتفاق ہونا چاہیے ، ترجمہ نظم میں بہت سی زبان اور شاعری کی غلطیاں موجود ہیں جن کے متعلق مرتب کے صلح جو قلم نے بہت دبی زبان سے آیندہ نمبر میں مشورہ دینے کا کہا ہے اس لئے ہم بھی اس کو انہی کے الفاظ میں صرف "اخلاقاً" نظر انداز کرتے ہیں اس کے بعد صفحہ ۱۰۱ سے ملک کے بہترین تنقیدی مضمون نگار جناب سید محی الدین صاحب زور کا بلند پایہ مضمون "اُردو کے اسالیب بیان" شروع ہوتا ہے جس کا پہلا حصہ سہیل کے نمبر ۲ میں نکل چکا ہے ۔ اس مضمون میں زور صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے اُردو کے اسالیب پر تاریخی نکتہ نظر سے اور محققانہ پیرایہ میں بحث کی ہے یہ مضمون جامع اور مبسوط ہونے کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ عوام کے فائدہ کے لئے علیحدہ کتابی صورت میں چھپوا دیا جائے ۔ آخری مضمون "اردو شاعری پر ایک نظر" جناب رشید احمد صاحب مرتب سہیل کے قلم سے نکلا ہوا ہے جو ہمارے شعراء کے لئے نہایت کارآمد قابل مطالعہ ہے ۔

اتنے بڑے رسالہ میں نظم کا حصہ بالکل نہیں ہے صرف حضرت گرامی کی ایک فارسی غزل ہے جو شعر و سخن سے دلچسپی اور ذوق رکھنے والوں کے لئے بالکل ناکافی ہے لہذا ہم فاضل مرتب کو اتنا مشورہ ضرور دیں گے کہ جہاں وہ اُردو نثر کا ایسا قابل قدر سرمایہ ہم فراہم کرتے ہیں وہاں ایسی ہی ملک کے بہترین

شعرا کی دو تین نظمیں ہم پہنچا کر اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

غرض کہ یہ ۱۶۶ صفحات اور ۲۰×۳۰/۸ سائز کا زبردست رسالہ عمدہ کاغذ اور اعلیٰ لکھائی چھپائی کے ساتھ سات روپیہ سالانہ میں بالکل مفت ہے فی پرچہ ۱۲

ملنے کا پتہ۔ علیگڑھ یونیورسٹی۔ علیگڑھ

خیابان (لکھنو) یہ نیا رسالہ نہایت آب و تاب کے ساتھ جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی کی ایڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر بابت ماہ نومبر ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ کسی رسالہ کا صرف ایک ہی نمبر دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے لیکن اسکو جیسے قابل مضمون نگار ملے ہیں وہ اس کے شاندار مستقبل کے لئے ضامن ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ خیابان کا وجود دنیائے صحافت میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔

پہلے نمبر کے تمام تر عمدہ مضامین ناتمام ہیں اسلئے اسپر کوئی رائے زنی کرنا قبل از وقت ہے یہ رسالہ چار جزو کا ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ اور سائز ۲۰ × ۲۶ ہے سالانہ پانچ روپیہ نمونہ ۸ آنہ۔

پتہ :- وکٹوریہ پریس لکھنو

قوس قزح (لاہور) اس باتصویر رسالہ کے مدیر مسئول۔ جناب محمد وحید کیلانی۔ بی۔ اے اور مدیر اعزازی جناب محمد علیم الدین صاحب سالک بی۔ اے ہیں۔ قوس قزح اپنے سالانہ نمبر کے باعث بہت کچھ شہرت حاصل کر چکا ہے ہر نمبر میں دو تین رنگین و سادہ تصاویر ہوتی ہیں اور مضامین کے لحاظ سے بھی دیگر لاہوری رسالوں میں ممتاز ہے۔

زیر تبصرہ دسمبر نمبر میں "فارسی ڈرامے کا ارتقا" "تاریخ اشتراکیت، فلسفہ غیب، اور مغلوں اور عادل شاہیوں کے تعلقات" بہت اچھے مضمون ہیں۔ افسانوں میں حضرت قضائی (ٹونکی) کا افسانہ "دل کی تاریخ" بہت دلچسپ ہے لیکن اس میں جا بجا عربی کے الفاظ کی ایسی بھرمار کی گئی جس سے قصہ کی دلچسپی میں تو کوئی

ں نہیں آتا مگر پڑھنے والے کو ناواقفیت کی وجہ سے الجھن ضرور ہوتی ہے، حضرت تمکین الکاظمی صاحب
کا ڈراما "مسافر کرمان شاہ" بہت دلچسپ ہے۔
رسالہ کی لکھائی چھپائی اعلیٰ اور کاغذ عمدہ ہے سائز ۲۰×۳۰ اور پانچ جزو کا ہے۔ اس پرسالانہ
صرف ۳ہے، جو اتنے بڑے رسالہ کے لئے بالکل مفت ہے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر قوس قزح لاہور

آفتاب یہ مشرقی ہندوستان کا مصور رسالہ بہ زیر ادارت جناب چراغ حسن صاحب حسرت کلکتہ سے جنوری ۲۶ء سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے۔ زیر نظر ستمبر نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے بہترین لکھنے والے بہم پہنچائے ہیں اور مضامین کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے چنانچہ نواب سید نصیر حسین صاحب خیال مدظلہ نے "ہند و اہل ہند" میں ہماری غذا کا متعلق واقعی اور نتیجہ خیز خیال ظاہر فرمایا ہے۔ "منی بیگم اور مغربی سیاح" "ایک سچا تاریخی واقعہ نواب زادہ اے۔ ایف۔ ایم عبد العلی صاحب نے خوب لکھا ہے۔ نظمیں بھی بہت اچھی ہیں خصوصاً جناب اختر شیرانی کے لمعات اور حضرت شاد عظیم آبادی کی رباعیاں جذبات قلبیہ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بہرکیف رسالہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ عمدہ حجم ۴۸ صفحے اور سرورق رنگین آرٹ پیپر پر اتنی خوبیوں پر سالانہ چندہ صرف ؏ہ۔

پتہ: منیجر آفتاب نمبر ا گنگا دھر بابو لین کلکتہ

اڈیٹر

قواعد وضوابط رسالہ زبان

(۱) "زبان" ہر انگریزی مہینے کی ۵ تاریخ کو منگرول سے شائع ہوگا۔

(۲) "زبان" کی سالانہ قیمت عوام سے چار روپے والیان ملک و معاونین کرام جو کچھ عنایت فرمائیں۔

(۳) نمونہ کا پرچہ ۶ آنہ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔

(۴) ششماہی چندہ ؏ـ (ڈھائی روپیہ)

(۵) رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تک آجانا چاہئے۔

(۶) جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

(۷) ترسیل زر و درخواست خریداری اور جملہ انتظامی امور کے متعلق منیجر رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاواڑ) سے خط و کتابت کیجیے۔

(۸) مضامین بغرض اندراج رسالہ ریویو کے لئے کتابیں تبادلہ کے اخبارات و رسائل کے متعلق ایڈیٹر صاحب رسالہ زبان سے مراسلت کیجئے۔

(۹) "زبان" میں سیاسی مضامین درج نہ ہوں گے۔

(۱۰) اعلیٰ علمی وادبی مضامین کا معاوضہ (بشرط پسندیدگی) دیا جائیگا گراس میں اونچیل مضامین کی تخصیص ہے۔

منیجر رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاواڑ)

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	چوتھائی صفحہ
	نرخ نامہ اشتہار		
ایک سال کے لئے	سعہ/	صعہ/	لعہ/
چھ ماہ کے لئے	وعہ/	لعہ/	؏عہ/
تین ماہ کے لئے	لعہ/	وعہ/	بے/
ایک ماہ کے لئے	بے/	صہ/	سے/

ضروری نوٹ

فحش اور غیر مہذب اشتہار نہ لئے جائیں گے اُجرت کا پیشگی آنا ضروری ہے۔ ٹائٹل پیج کے صفحہ ۲ و ۳ و ۴ کے لئے ذیل کے پتہ پر خط لکھئے۔

منیجر زبان منگرول
(کاٹھیاواڑ)

(باہتمام خواجہ صدیق حسین آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا)

۲۹۳
رجسٹرڈ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لقد وجدت مکان القول ذا سعۃ   فان وجدت لسانا قائلا فقل

کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ

مرتبہ

عبدالرحمن خوشتر (منگرولی)

سالانہ (چار روپیہ)   ششماہی دو روپیہ ۸ آنہ

(نمونہ ۶ آنہ)

زبان

جلد ۲ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

زبانِ خلق

مولانا وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد)

جو مضامین رسالہ میں شائع ہوتے ہیں میرے نزدیک وہ کاٹھیاواڑ کے پڑھنے والوں کے واسطے مشکل زبان میں ہوتے ہیں۔ آپ مضمون نگاروں سے اجازت لیکر ہر مضمون کی زبان کو سہل کر دیا کریں تاکہ وہ آپ کے اہل وطن کے پڑھنے کے لائق ہو جائیں۔ ورنہ خود زیادہ تر لکھیں۔ باہر کے مضامین کم لیں مضامین ایسے لینے چاہئیں جن سے وہاں کے لوگوں کو دلچسپی ہو اور اُن کو پڑھ کر نئی معلومات حاصل کر سکیں۔ مولوبانہ زبان میں مضامین شائع کرنے سے ان کو فائدہ نہ ہوگا غالباً آپ اس کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت تمکین الکاظمی

.........خارزار کاٹھیاواڑ سے ایک علمی اور ادبی رسالہ کا اجرا آپ جیسے ذی ہمت بزرگوں ہی کا کام ہے اردو کی حقیقی خدمت یہی ہے کہ ان مقامات سے رسائل کا اجرا ہو جہاں اردو کی حالت گری ہوئی ہے اور انہیں مقامات کے رسائل کی امداد اردو کی حقیقی سرپرستی ہے جو ایسے مقامات سے شائع ہوتے ہیں، یقین فرمائیے کہ میں آپ کے خیال سے بالکل متفق ہوں اور امکانی امداد کے لئے حاضر، انشاء اللہ آپ مجھے "زبان" کا "ہم زبان" پائیں گے

یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ قاضی احمد میاں صاحب جوناگڈھی بھی زبان کی امداد فرما رہے ہیں مولوی صاحب موصوف مدت سے خاموش تھے، ادب اردو کو آپ کا شکور ہونا چاہئے کہ آپ نے "زبان" نکالکر قاضی صاحب کو بھی "ہم زبان" بنا لیا۔

رسالہ کی ترتیب عمدہ ہے مضامین بھی بہتر ہیں، معلومات جدیدہ میں کسی قدر وسعت چاہئے۔

ھ زبان اگر مضمون نگار حضرات خود ہی اس بات کا خیال رکھیں تو زیادہ مناسب ہے۔ ۱۲۰

جناب سید محی الدین صاحب قادری زور قادری بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد)

.... چونکہ آپ ایک ایسے مقام سے رسالہ نکال رہے ہیں جو اس قسم کی کوششوں سے ابتک تقریباً محروم تھا اور اس کے علاوہ آپ نے جس حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی خوش آیند نوعیت نے مجبور کر دیا کہ "زبان" کے لئے کچھ لکھوں چنانچہ اس دو تین روز کے عرصہ میں ایک مضمون تیار ہوا ہے جو مرسل خدمت ہے............

نکات

از ملا رموزی

حضرت مکرم مولوی عبدالرحمٰن خوشتر ایڈیٹر "زبان" بھی کچھ عجیب کینڈے کے بزرگ واقع ہوئے ہیں، ان کی مثال سے اگر ساری صحافی دُنیا کو خالی سمجھا جائے تو غلط نہیں، یہ حضرت اپنے وقت کے کچھ اس درجہ "مستقل مزاج" اس درجہ "ثابت قدم" اور اس درجہ "صدی انسان" ہیں کہ اگر انھیں "پنولین کاٹھیاواڑ" کہا جائے تو بیجا نہیں، کیونکہ ان کے لغت میں بھی لفظ "ناممکن" اور ناامیدی کا وجود ہی نہیں،

ہم نے رسالہ "زبان" کے پہلے نمبر میں کہیں یونہی لکھدیا تھا کہ "ہم ہر نمبر میں نکات لکھتے رہیں گے" مگر ہمارے اس وعدہ میں سچائی اتنی ہی تھی جتنا آٹے میں نمک، یا وکیلوں کی بحث میں صداقت اور پولیس والوں میں "دیانت" وجہ یہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ رسالہ "زبان" سے صوبہ کاٹھیاواڑ میں نہ کسی کو محبت ہوگی، نہ کوئی اس کی اشاعت میں کوشش کرے گا، اور نہ کوئی اسے مالی امداد دیگا جیسا کہ ہو بھی رہا ہے اس لئے چند دن میں بھائی خوشتر تو ہو جائیں گے "دیوالیہ" اور "زبان" بے زبان، لہٰذا ہم نے بھی مضمون کی طرف سے سادہ لی چپ،

گراَف رے خوشتر کا استقلال دو حوصلہ کہ اونہوں نے بھی قسم ہی کھالی کہ رسالہ "زبان" جواب جاری ہوا ہے تو بند ہونے کا نام ہی نہ لیگا، اور یہ شاید اس لئے کہ صوبہ کاٹھیاواڑ کے باشندوں پر کہیں یہ الزام نہ آجائے کہ وہ اپنے صوبہ کا ایک عدد رسالہ بھی نہ چلا سکے، لہٰذا خوشتر ممدوح کا "تقاضائے مضمون" برابر جاری رہا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے ہمارے ساتھ جن تدابیر کو اختیار فرمایا وہ ملاحظہ ہوں،

لہ زبان خاکت بدہن۔

پہلے لکھا کہ معاوضہ دیں گے،

پھر۔ استدعار۔ التماس، عرض، گزارش۔ درخواست۔ یاددہانی۔ یادداشت۔ عرضداشت۔ مراسلہ۔ آفس نوٹ آفس کاپی، آفس سلپ ڈی۔ او۔ اطلاع۔ اور عریضوں سے کام لیا،

پھر= لالچ۔ امید۔ توقع۔ دلاسا۔ ترغیب۔ تحریص۔ دلجوئی۔ دلدہی۔ دلداری۔ اور کسی قدر ورغلانے سے بھی کام لیا۔

پھر= خوشامد۔ تملق۔ چاپلوسی۔ منت۔ سماجت۔ التجا۔ الحاح۔ عقیدت، ارادت۔ بندگی۔ نیازمندی۔ نیازکیشی۔ دوستی، مودت۔ تعلقات، اور یارانے سے کام لیا اور ایک مرتبہ تو "ارے یار" بھی لکھدیا،

پھر= ڈانٹ۔ ڈپٹ۔ دہمکی۔ سختی۔ شدت۔ ترش روئی۔ تلخ گفتاری۔ غصے۔ قہر۔ طیش۔ جھونج۔ جھڑکی۔ دھونس تخویف۔ تشدد۔ جھنجلاہٹ تنبیہہ۔ تقاید۔ تعذیب۔ تعزیر۔ زجر اور توبیخ سے کام لیا۔

پھر= کج خلقی۔ کجروی۔ کج ادائی۔ بے مروتی۔ بے وفائی، بے رحمی، بے دردی، اور بد اخلاقی سے کام لیا۔

پھر= وعظ۔ نصیحت۔ پند۔ موعظت۔ اور سمجھانے سے کام لیا۔

پھر= فصاحت۔ بلاغت۔ انشار انشاد۔ تحریر۔ املا۔ خوش خطی۔ خوش نویسی۔ کتابت۔ خطاطی اور نقاشی سے کام لیا۔

لیکن ان سب کے مقابلہ میں ہمنے بھی۔ نان کاپریشن۔ نان وائیلنس۔ بائیکاٹ۔ واک آوٹ۔ ترک موالات۔ مقاومت مجہول، عدم تعاون، عدم تشدد۔ خلاف ورزی۔ ستیہ گرہ۔ مقاطعہ۔ قطع تعلق۔ ان بن۔ کڑنوں۔ اور غرفش سے کام لیا تو بھائی صاحب نے اب۔ عمل۔ منتر۔ جادو۔ تعویذ۔ گنڈے۔ دعا۔ منت۔ مراد وظیفے۔ نیاز۔ فاتحہ۔ اور ایصال ثواب، کا حربہ سنبھال لیا اور آخر انہی میں سے کسی ایک چیز نے ہمارے اوپر اثر لیا اور ہم پھر رسالہ۔ زبان۔ میں حاضر ہوگئے۔ اب دعا دیجئے خوشتر کے حوصلہ کو اور اگر مناسب ہو تو زبان سے اپنی۔ بے اعتنائی۔ بے رخی۔ بے مہری۔ بے توجہی۔ بے پروائی۔ اور بے فکری۔ پر شرما جائیے۔!

---

۵ زبان آپ کو کون ورغلا سکتا ہے معلم الملکوت بھی آپ سے تو پناہ مانگتا ہے۔ ۱۲

ہم نے پچھلے "نکات" میں قومی خصوصیات کے تذکرہ میں بتلایا تھا کہ قوم، اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کی زبان لباس۔ مذہب۔ اور رسوم ملحوظ و یکساں ہوں۔ لہٰذا جس جماعت کی مذکورہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بھی کم ہو جائے یا بدل جائے، تو اُس کے افراد پر لفظ۔ قوم۔ یا قومی۔ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ انگریز بھائیوں کو دیکھئے۔ ہندوستان پر مرتے ہیں۔ دم دیتے ہیں۔ فدا ہوتے ہیں۔ صدقے جاتے ہیں۔ نثار ہوتے ہیں۔ یہاں آتے ہیں۔ رہتے ہیں۔ حکومت کرتے ہیں۔ تجارت کرتے ہیں۔ ہل چلاتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں پڑھتے ہیں۔ ملازم ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو کر "خدا گنج" بھی چلے جاتے ہیں، مگر عمر میں ایک مرتبہ بھی ہندوستان کا بنا ہوا انگرکھا۔ اچکن۔ شیروانی۔ کرتا۔ پاجامہ، لبادا۔ مرزائی صدری، شلوکا۔ تہ بند اور۔ دہوتی، نہیں پہننے پر نہیں پہنتے۔

خصوصیات قومی کی یہ ہے وہ حفاظت جو انگریزوں کے لباس میں پائی جاتی ہے، اسی طرح آپ کا کوئی کتنا ہی بے تکلف انگریز دوست ہو اگر آپ اُسے اپنی دعوت ولیمہ میں بلائیں گے تو آئیگا ضرور، مگر بیٹھے گا کرسی پر۔ منگنی کی تقریب میں آئیگا تو بیٹھے گا کرسی پر۔ نکاح میں تو کرسی پر۔ بارات میں کرسی پر۔ رخصت میں تو کرسی پر۔ چھٹی میں تو کرسی پر عقیقہ میں تو کرسی پر اور تقریب ختنہ میں تو یہ لوگ شریک ہی نہیں ہوتے، اسے کہتے ہیں قومی آداب کی حفاظت جو انگریزوں میں پائی جاتی ہے،

لیکن ایک ہندوستانی ہیں جن کے پاس آج نہ اُن کا قومی پاجامہ ہے نہ عمامہ، نہ لنگوٹ ہے نہ دہوتی۔ مشرقی فروش ہیں نہ قالین ہیں نہ گدا، نہ چاندنی ہے نہ تکیہ۔ اور تخت ہیں نہ چارپائیاں۔ جہاں ایم۔ اے ہوئے اور گلیڈسٹونی امت میں جاملے۔ جہاں۔ ایل۔ ایل۔ بی، کیا اور لائیڈ جارج بن گئے۔ اب اگر سوال کیجئے کہ کیوں حضور یہ اپنا ملک ہندوستان انگریز بھائیوں سے واپس لینے کے لئے تو آپ چرخہ۔ ترک موالات۔ تو تڑاق۔ ایجی ٹیشن۔ لٹھ بازی اور بس چلے تو۔ قتل عام۔ تک تیار ہیں اور "ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے" کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں، مگر یہ تو فرمائیے کہ مذکورہ حالات میں آپ کے اندر ہندوستانی۔ ہونے کی بھی کوئی علامت موجود ہے، پھر اسپر کہتے ہیں کہ ہمیں "سوراج" کے بندر کے ساتھ بکرا بھی دلادو، !!!

معاشرت اور زبان کے بعد اخلاق کا نقشہ بھی ملاحظہ ہو،
آپ ایک انگریز لارڈ کو بحر ظلمات میں ایک عدد کارڈ لکھ دیجئے وہ اس کا جواب ضرور دیگا، لیکن اگر ایک غریب ہندوستانی اپنے سے، ذرا مالدار ہندوستانی، ذرا عہدہ دار ہندوستانی، ذرا افسر ہندوستانی، ذرا جاگیردار ہندوستانی، ذرا ڈپٹی کلکٹر ہندوستانی، ذرا چیف جسٹس ہندوستانی، ذرا ہندوستانی لیڈر۔ اور ذرا ہندوستانی ایڈیٹر کو اگر دن میں پانچ مرتبہ بھی خط لکھے اور پھر مکتوب الیہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ راقم غریب اور میری پوزیشن سے کم پوزیشن کا آدمی ہے تو بس پھر اکڑ جائیں گے اور عمر بھر جواب نہ دیں گے۔ اور تو اور خیر سے یہ اردو اخباروں کے طفل دبستاں ایڈیٹروں کی اکڑ فوں کا تو جواب ہی نہیں، جب آپ خطوط کا تار باندھ دیجئے تو کارڈ پر ایک آدھ سطر میں بس اتنا لکھدیں گے کہ

"مصروفیت زیادہ ہے"

گویا آپ پتنگ کے کاغذ پر شائع ہونے والے دو پیسہ کے اخبار کے ایڈیٹر کیا ہیں دہلی کے گھنٹہ گھر میں جسکی گھڑی ایک سکینڈ کو بند ہی نہیں ہوتی!!!!

ہندو بھائیوں کو شکایت ہے کہ مسلمان اردو زبان میں عربی اور فارسی کو اسدرجہ داخل کر چکے ہیں اور کرتے جاتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہی نہ رہی، اور اسی لئے ہندو اخباروں نے اس کا توڑ یوں کیا ہے کہ اپنے مضامین کے اندر آئے دن سنسکرت اور بھاشا کے نہایت غیر ضروری اور بھونڈے الفاظ ٹھونس کر اردو کے حسن سلاست کو تباہ کر رہے ہیں، حالانکہ اردو زبان کی جدید ترقی یا نشاۃ الثانیہ میں مسلمانوں نے اپنی بے تعصبی، اور فراخ دلی کا جسقدر ثبوت دیا ہے وہ ذیل کے حقایق سے ظاہر ہے،

جنگ یورپ کے خاتمہ سے مشرق کی تمام قوموں میں زندگی کے جو امید افزا آثار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے مشرق کی تمام زبانوں کو بھی متاثر کیا ہے اسی لئے اردو زبان بھی ایک ترقی کن دائرہ سے گزر رہی ہے۔ اسکی وسعت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے، اسی سلسلہ میں اردو صحافت میں نت نئی اصطلاحات، محاورے، استعارے، اور الفاظ داخل ہو رہے ہیں جو زبان اردو کا جز بنتے جا رہے ہیں، پچھلے آٹھ دس برس میں اردو صحافت میں مسلمانوں کی طرف سے جو نئے الفاظ داخل ہوئے ان میں سے ترک موالات، موتمر، اور مدبر،

نہایت کثیر الاستعمال ہیں اور انہیں اب اردو کے الفاظ کہنا جائز ہے، لیکن اگر ان الفاظ کو آپ ہندوؤں کی تحریر۔ تقریر۔ یا اخبارات میں دیکھنا چاہیں تو نہ لیں گے، بخلاف اس کے اسی عرصہ میں ہندوؤں کی طرف سے چند الفاظ وضع ہوئے اور اور بعض مسلمان آج بڑی خوشی سے اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کر رہے ہیں اور اب یہ الفاظ مسلمانوں کی اس بے تعصبی سے اردو کے الفاظ بن چکے جن میں سوراج ستیہ گرہ سبھا۔ مہاتما۔ سوامی۔ آشرم۔ گورکھشا۔ شدھی۔ اور سنگھٹن کے الفاظ خاص ہیں،

ہمیں یاد ہے کہ لاہور سے "سوراج" نام کا ایک اخبار ایک مسلمان ہی نے جاری کیا تھا۔ لفظ سبھا۔ کو آج بھی لاہور کا ایک مسلمان رسالہ۔ بہارستان، اپنا مستقل عنوان بنائے ہوئے ہے، بقیہ تمام الفاظ آج مسلمانوں کی تقریریں سُنئے اور سمجھے جاتے ہیں اور ہر مضمون میں ان کا استعمال ہو رہا ہے۔ یہ ہے مسلمانوں کی رواداری جس سے وہ اپنے اس دعوی میں سچے ہیں کہ وہ اردو زبان کو اپنی زبان نہیں بلکہ ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔

بہر حال آج کل اردو زبان میں وضع الفاظ و اصطلاحات کا خاص دور ہے خدا کرے اسلامیہ کالجوں کے "انگریزی یافتہ مسلمان" اس مقابلہ میں پیچھے نہ رہجائیں اور وہ بھی انگریزی زبان کے چند موٹے موٹے الفاظ اردو میں ٹھونس دیں کیونکہ اُن کی قومی غیرت سے یہی امید ہے، !!! آئندہ نمبر سے ایسے تمام نئے الفاظ کی فہرست دی جائیگی جو اس ماہ میں داخل ہوا کریں گے، انشا اللہ

(از جناب محمد رضی الحسن صاحب رضی ایڈیٹر حسن خیال)

اُٹھتا نہیں ہے اب تو قدم کوئے یار سے
مجبوریوں نے کام لیا اختیار سے

پچھتاؤ گے سکون ہے سرمایۂ حیات
اچھی نہیں ہے چھیڑ دل بے قرار سے

لاکھوں میں داغ اب تو بجائے گل مراد
باغ نشاط و لیں خزاں ہے بہار سے،

تم نے جفا سے ہاتھ اٹھا کر غضب کیا
محروم ہو گئے ستم روزگار سے،

تیری نگاہ مہر کے ہوتے ہی باغباں
با دخزاں بدل گئی بادِ بہار سے،

بڑھتی ہی جارہی ہیں تری مہربانیاں
جی کانپتا ہے گردش لیل و نہار سے

گویا رضی تلافی مافات، ہو گئی،
دل بے قرار ہے نگہ شرمسار سے

صفحۂ ادارت

الحمدللہ کہ اس نمبر سے "زبان" کی دوسری جلد کا آغاز ہوتا ہے جس پر ہمیں بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ہم سے زیادہ ہمارے ملکی بھائیوں اور اہل ذوق کو خوش ہونا چاہیے کہ "زبان" نے باوجود اپنی نادارئ و بے مائیگی کے مردانہ وار اقتصادی مشکلات کا مقابلہ کر کے ایک ششماہی ختم کردی اور اب دوسری ششماہی میں قدم رکھ رہا ہے۔ اگرچہ ع

کٹھن ہے راہ اور منزل کڑی ہے

"زبان" کی خوش قسمتی کہیے یا اس کی جاذبیت کہ اب اس کی جانب ملک کے نامور اہل قلم حضرات نے بھی اپنی توجہات منعطف فرمائی ہیں۔ چنانچہ ہمارے فخر کاٹھیاواڑ علامہ میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، مشہور تنقیدی مقالہ نگار جناب سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولینا مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر ودیا پیٹ احمدآباد اور جناب تمکین الکاظمی وغیرہ ہمانے "زبان" کے اس نمبر کو اپنے اپنے افادات سے مستفید و مفتخر فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے مرہون منت ہیں۔

کئی اور مشہور و موقر اہل حضرات نے آیندہ سے "زبان" کی قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے جن کے رشحات خامہ سے قارئین زبان عنقریب بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس وقت حصہ "ادبیات" اگرچہ بہت کچھ غیر مکمل ہے تاہم اس میں محمود اسرائیلی، رزؔاق دہلوی، امجد حیدرآبادی، ذہین حیدرآبادی اور تجمل جلالپوری وغیرہ ایسے مستند و مشہور حضرات نظر آئیں گے، ہمنے اس حصہ کو بھی بہترین بنانے کے لئے ملک کے نامور ادیب و شعراء کی خاص طور پر اعانت حاصل کی ہے جو انشاءاللہ آیندہ نمبر میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔

مترجمات و اخبار علمیہ کی خوبیوں کی نسبت کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ یہ مستقل عنوانات ہمارے شفیق دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب نے اپنے لئے مخصوص کر لئے ہیں جن کو غیر زبان سے بے لاگ اُردو ترجمہ کرنے میں ایسی مہارت تامہ حاصل ہے کہ اس کو اپنا بنا لیتے ہیں اور اصل کا گمان ہونے لگتا ہے، قاضی صاحب موصوف جس عرق ریزی و جانفشانی سے مصر و شام اور امریکہ و یورپ کے عربی و انگریزی رسائل کے پراز معلومات اور سائنس کے جدید مگر حیرت انگیز انکشافات کا ترجمہ کر کے نذر ناظرین کرتے ہیں وہ یقیناً مستحق ستائش قابل داد ہے۔

ان عنوانات کے بہترین ہونے کا اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ انتخاب مضامین مترجمات کا اکثر "معارف" کے تلخیص و تبصرہ اور "زبان" کے مترجمات سے توارد ہو جاتا ہے اور جن کو ملک کے اکثر اہل اخبار و رسالہ اپنے اپنے اخبارات و رسائل میں نقل کرتے ہیں۔

ہر چند کہ اپنی توصیف آپ کرنا سخت معیوب اور اشتہار سے کم وقعت نہیں رکھتا لیکن اگر کسی امر واقعہ کا اظہار خود ستائی کی مد میں داخل ہے تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فروبری نہیں ہو۔

اس نمبر کے ساتھ جو شبیہ "زیب زبان" کی جاتی ہے وہ ہمارے نواب فلک رفعت سکندر صولت گردوں جناب معلی القاب **شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ و حشمتہٗ فرمانفرمائے ریاست منگرول** کی ہے اگرچہ اس سے "زبان" کا پہلا ہی نمبر مزین ہونا چاہئے تھا تاہم چونکہ "زبان" میں تصاویر کا آغاز اسی تصویر سے کیا جاتا ہے اسلئے اولیت کا سہرا اسی تمثیل کے سر ہے۔

"زبان" میں اس سلسلہ کو قائم رکھنے کا ہم وعدہ نہیں کرتے لیکن کوشش کریں گے کہ ہم اسکے ذریعہ ناظرین کرام کو مشاہیر و اہل قلم اصحاب سے کبھی کبھی روشناس کرانے کی عزت حاصل کرینگے۔

یوں تو کاٹھیاواڑ میں بہت سی مجلسیں اور انجمنیں قائم ہیں جو ایک حد تک اپنے اپنے مذہبی و قومی مفاد کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کرتی رہتی ہیں لیکن غالباً انجمن اخوان الصفا (مانا ودر) اپنے اغراض و مقاصد کی خصوصیات کی بنا پر کاٹھیاواڑ میں پہلی انجمن ہے جو باوجود قلیل مدنی و محدود سرمایہ کے مسلمانان کاٹھیاواڑ کی تعلیم اور انہیں اردو کو ترویج دینے کی شدت کیسا حامی ہو۔

اب کچھ عرصہ سے انجمن کے محدود سرمایہ سے ایک دوکان بھی کھولی گئی ہے جسمیں علاوہ روزانہ ضروریات اور اسٹیشنری وغیرہ کے کم و بیش ہر قسم کی اشیاء مہیا کی گئی ہیں، اور شکر ہے کہ اہل مانا ودر بھی اپنی اس قومی دوکان

ہی سے خرید و فروخت کرتے ہیں، اس دوکان کی آمدنی سے انجمن حتی الامکان اپنے اغراض و مقاصد انجام دیتی ہے۔

اس انجمن کے جہاں اور بہت سے قوم کے مفید مطلب مقاصد ہیں وہاں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کاٹھیاواڑ میں اُردو کو ترویج دینے کی ہر امکانی کوشش کی جائے "، چنانچہ اس مقصد عظیم کی تکمیل کے لئے علاوہ مقامی جد و جہد کے اس کے مہتمم اعلیٰ پیرزادہ عبدالقادر صاحب نے ہمیں چوبیس روپے روانہ فرمائے ہیں کہ اس سے کاٹھیاواڑ کے چھ ایسے طلباء کے نام رسالہ زبان جاری کر دیں جو رسالہ کے خریدار ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ درخواست دینے والے طلبہ اپنی اپنی درخواستوں کے ساتھ اپنے شہر کے ایک معزز شخص کی شہادت اور اپنے مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر کی تحریری سفارش بھی روانہ فرمائیں بعد تحقیق ان کے نام سال بھر کے لئے رسالہ زبان جاری کر دیا جائیگا تمام درخواستیں بنام سکرٹری انجمن اخوان الصفا ۔مانا ودر (کاٹھیاواڑ) یا اڈیٹر رسالہ ہذا کے نام مذکورہ بالا شرائط پر آنی چاہئیں۔

امید کہ کاٹھیاواڑ کی دیگر انجمنیں بھی اپنے مقاصد میں اس مبارک مقصد کا اضافہ کرکے انجمن اخوان الصفا کی عملی تقلید کریں گی۔

ناظرین اور معاصرین کرام کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ابتک **زبان** کو جو خالص علمی و ادبی رسالہ ہے باوجود پورے سات ماہ کی مسلسل کوشش کے ڈاکخانہ کا رجسٹر نمبر نہیں ملا۔ جس کا سبب اصلی ایک "دلچسپ تعصب" ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق ہمارے آخری تار کے جواب میں ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل (ویسٹرن انڈیا) کی جانب سے بجز اس کے کہ "یہ مسئلہ ابھی زیر غور ہے"، کوئی قطعی اور باضابطہ اطلاع موصول نہیں ہوئی ہے لہٰذا ہم بھی سردست اس "اہم مسئلہ" پر روشنی ڈالنا قبل از وقت سمجھتے ہیں یا پھر ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

نتیجہ کے انتظار میں دفتر کو معقول نقصان برداشت کرنا پڑا ہے اگر اس پر بھی نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوا تو پھر ع

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

کہہ کر لب کشائی کرینگے اور دنیائے صحافت میں صدائے احتجاج بلند کریں گے۔ **ایڈیٹر**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوری   زبان   سنہ ۱۹۲۷ء

زبان

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی   کل جسم میں اک نطقِ مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہے دل   صادق ہے زباں تو اسم اعظم ہے یہی
(امجد)

مقالات

تغلق

(از مولٰنا سید ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر مادو دیالہ احمد آباد)

تغلق ایک ترکی لفظ ہے، جس کے معنی "پہاڑی" کے ہیں۔ یہ پشتو لفظ "رہیلہ" کے مرادف ہے۔ نوادر المعلا میں ہے کہ تغلق اور تغلغ ہم معنی ہیں۔ بلکہ تغلغ مبدل ہوکر تغلق ہوگیا ہے، جس کے معنی "اوسط" کے ہیں۔ مگر اس کی کوئی دلیل نہیں دی تغلق کے متعلق قدیم ترین بیان ابن بطوطہ کا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ رکن الدین قریشی ملتانی سے میں نے سنا ہے کہ تغلق ترک قوم سے "قرونہ" تھا۔ اور یہ ترکستان اور سندھ کے بیچ کے پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

لفظ "قرونہ" کی نسبت آٹھویں صدی کا مشہور سیاح مارکوپولو اس طرح تشریح کرتا ہے کہ "قرونہ" ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ جن کی ماں ہندی اور باپ تاتاری ہو" ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے۔ جہاں ان کا لشکر چلا جاتا ہے۔ وہ اس ملک کو بے چراغ کر ڈالتے ہیں" الخ۔ لفظ قرونہ کا ترجمہ عربی میں مولدین ہے، اور آجکل کی اصطلاح میں "یوریشین" کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ اصل میں یہ لوگ چین کے شمال میں "قردن جیدن" (یا خیدن) ایک پہاڑ ہے وہاں رہتے تھے پھر وہاں سے نکل کر مذکورہ علاقہ میں آ بسے۔

"مارکوپولو" پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ ان کا سردار "نکودار" ہے۔ جو چغتائی کا بھتیجہ ہے "یہ شخص اپنے چچا کے پاس سے بھاگ کر اور قرونہ کے لشکر کو لیکر بدخشاں کے راستہ کشمیر میں گیا۔ اور لاہور کو فتح کرکے وہاں بیٹھ گیا[1]۔ اور مغلوں سے لڑتا رہا"۔

دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لشکر کے ساتھ "قرونہ" کا طومان (دس ہزار آدمی) ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر ان لوگوں نے لشکر سے علیحدگی اختیار کرکے لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنا لیا اور غالباً اسی لوٹ مار کے سلسلہ میں انہیں ترکستان سے سندھ اور پنجاب تک کا سفر کرنا پڑا۔

خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان کا باپ تغلق نامی سلطان غیاث الدین بلبن کے ترکی غلاموں میں سے تھا۔ اور اس کی ماں پنجاب کی قوم جاٹ سے تھی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "قرونہ" کے لفظ سے ابن بطوطہ کے راوی شیخ قریشی نے یہی مراد لیا ہے۔ اور مارکوپولو کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تغلق قوم کا نام نہ تھا۔ بلکہ شخص خاص کا نام تھا۔

مندرجہ بالا بیان کی تصدیق فرشتہ بھی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میں جب لاہور گیا تو اہل علم سے اس معاملہ کی تحقیقات کی۔ لیکن کسی نے "تغلق" کے متعلق صحیح اور قابل وثوق بات نہیں بتاتی۔ البتہ یہ بات سنی جو عام طور پر مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق کا باپ ملک تغلق۔ غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا۔ اور اس نے پنجابی جاٹ کی لڑکی سے شادی کر لی جس سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا"۔

سکوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک سکہ پر ہے :۔

---

[1] جہاں تک تاریخ کا تتبع کیا گیا ہے۔ ایسا کوئی مغل سردار نظر نہیں آتا کہ ہندوستان کا کوئی علاقہ خصوصاً لاہور جیسا مقام فتح کرکے مستقل قبضہ اس پر جما یا ہو۔ بابر سے پہلے جس قدر تاتاری ہندوستان آئے۔ بجز "تیمور" کے سب کے سب بلا استثناء مار کر نکال دیئے گئے۔ ایسی صورت میں مارکوپولو کے تحریر کی یہ تاویل کیجا سکتی ہے۔ کہ "نکودار" یا کوئی دوسرا مغل سردار ہندوستان آیا ہو اور مسلمان ہو گیا ہو۔ اور غوری غلاموں کے عہد میں کسی بادشاہ نے اُسے لاہور کا گورنر بنا دیا ہو۔ جیسا کہ خلجی اور تغلق کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انہیں کے ساتھ تغلق کے باپ دادا آئے ہوں جیسا کہ آگے ثابت ہوگا۔

اَلسُّلطان الغازی غیاث الدنیا والدین ابوالمظفر تغلق شاہ ناصر امیرالمومنین۔
پھر اس کے بیٹے کے سکّہ پر درج ہے:۔
"المجاھد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ" یا "محی سنن خاتم النبیین محمد بن تغلق شاہ"
ان سکوں سے شخصی نام کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تغلق خود ملک غازی غیاث الدین کا نام ہے نہ اس کے باپ کا۔

لیکن یہ بات مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے برخلاف ہوگی۔ اور فیصلہ یک طرفہ بہت مشکل ہے۔ سکوں کے متعلق جواب دیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اطمینان دہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات مشکوک رہی کہ تغلق یا تو خود ملک غازی غیاث الدین کا نام ہے یا اس کے باپ کا۔ میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ دونوں مذکورہ بالا کتب کی سماعی روایتوں کے مقابل سکہ کی عینی شہادت زیادہ معتبر ہے۔ اس لئے تغلق خود غیاث الدین کا نام تھا۔

افسوس ہے کہ تاریخ میں ضیاء برنی نے اور فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف نے اس لفظ کی کوئی تشریح نہیں کی۔ سراج عفیف یا امیر خسرو کا تغلق نامہ اگر مل جاتا تو بڑی آسانی سے اس کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی۔ مصنف طبقات اکبری کا بیان ہے کہ تغلق نامہ اس کے نظر سے گذرا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نے ایک لفظ بھی اس کے متعلق نہیں لکھا۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ واقعات بیان کرتا ہوا نکل گیا ہے۔

اب رہی یہ بحث کہ تغلق ہندوستان کب آیا؟ اس کے متعلق مذکورہ بالا کتابوں سے تو آپ کو معلوم ہوگیا کہ عہد خلجیین میں آیا۔ لیکن ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ کہ تغلق بہت مفلس تھا سندھ میں آیا تو کسی سوداگر کا گلہ بان ہوگیا۔ یہ عہد علاء الدین کا ذکر ہے۔ انہیں دنوں سلطان کا بھائی الغ خاں بطور حاکم ملتان آیا ہوا تھا۔ تغلق اس کے لشکر میں داخل ہو کر پہلے پیادوں پھر سواروں میں بھرتی ہوا۔ اس کی کارگزاری دیکھ کر اس کو افسر بنایا گیا۔ پھر میر آخور یعنی داروغۂ اصطبل، اور آخر کار امراء کبار میں سے ہوگیا۔

شمس سراج عفیف نے فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ تغلق، رجب، ابوبکر تینوں بھائی خراسان سے دہلی میں آئے۔ یہ زمانہ علاء الدین خلجی کا تھا۔ سلطان نے دہلی ہی میں مختلف عہدوں پر ممتاز کر کے ان سے کام لیا۔ آخر کار رجب انکی بہادری کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا تو سلطان علاء الدین خلجی نے دیبال پور (دیوبال پور) کا ان کو حاکم (گورنر) بنا کر بھیجا۔

ان پچھلے دو بیانوں سے جو قریب قریب متحد ہیں، یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین تغلق خلجی

عہد میں ہندوستان آیا۔ نہ بلبن کے عہد میں۔ جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے۔

اور اگر مصنف فیروز شاہی کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے اپنے آقا کو غلامی سے بچانے کے لئے چشم پوشی کی ہے تو ابن بطوطہ کو تحریر کرنے سے کون مانع تھا؟ پس اب اگر فرشتہ کی روایت صحیح تسلیم کر لی جائے تو تاویل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملک تغلق عہد بلبن میں آیا تھا لیکن بعد وفات بلبن ملک میں جب ابتری پھیلی دیکھی تو خراسان چلا گیا۔ اور پھر ان کے بیٹوں یا خود خلجی کے عہد میں واپس آیا۔

نسب نامہ
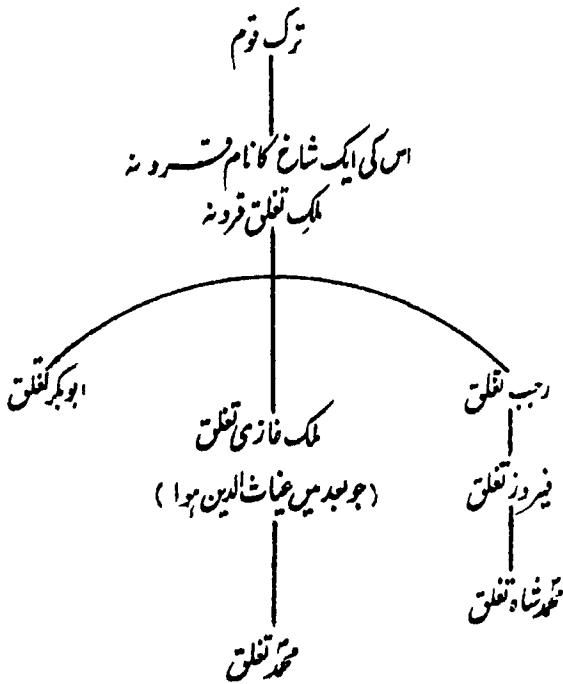
نواب آصف الدولہ کا شکار

اور

میر و سودا

(ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

اگر یوں کہا جائے کہ عالم اردو میں فن تنقید سرے سے مفقود تھا تو غالباً بیجا نہ ہوگا اور اگر تھا تو نہایت تشنہ اور غیر مکمل حالت میں جس کو ہم کسی طرح بھی تنقید نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ملک کو مولینا سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ آپنے "روح تنقید" ایسی گرانقدر کتاب تصنیف سے اردو فن تنقید کو جدید یورپی اصول پر مکمل فرماکر اردو علم و ادب کی ایک زبردست کمی کو پورا کیا۔

ذیل کا قابل قدر تنقیدی مضمون بھی موصوف ہی کی نگارش خامہ کا مرہون منت ہے جس میں موصوف نے ناقدانہ نظر سے وہ وہ نکات پیدا کئے ہیں جو آجتک پردہ خفا میں تھے۔ ہم اس مضمون کو نہایت فخر کے ساتھ درج کرتے ہوئے موصوف سے استدعا کرتے ہیں کہ آیندہ بھی اسی طرح زبان کو نوازیں گے۔

ایڈیٹر

تنظیم کائنات کے وقت ایسی ہستیوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے تعین کر دینا خلاق عالم کے لئے ضروری تھا، جو اپنے ملک و محل کی ان معجز نما حقیقتوں کی ایک روداد منضبط کرتی رہیں جنہیں وہ اپنے اطراف کی کارروائیوں میں جلوہ گر پاتی ہوں۔

ان معمولی غیر مہذب کا کام یہ ہوتا ہے کہ واقعات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھ لیں اور پھر ان میں سے جن جن کو ان کا قلب و دماغ قابل یادگار سمجھتا ہو انہیں اپنے مخصوص ذریعہ اظہار ——— خواہ وہ

شاعری ہو یا تاریخ نگاری، اور خواہ وہ نقاشی ہو یا مجسمہ سازی — کی مدد سے آنے والی نسلوں پر منکشف کرتی ہیں۔
یہ تو وہ کلیہ تھا جس کے تحت شاعروں، انشا پردازوں، نقاشوں، معماروں اور مجسمہ سازوں کی آئے
دن کی محیر العقول تخلیقیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہستیاں اپنے مشاغل کو ایک مذہبی فرض یا
ایک معاشرتی ضرورت کی حیثیت سے جاری رکھنے پر مجبور ہو جایا کرتی ہیں۔

کائنات کی فطرت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اسے قلمبند کر لیا جائے۔ بقول امرسن تمام چیزیں خود اپنی تاریخ
لکھنے میں مشغول ہیں ایک سیارہ ہو یا ایک کنکر، اپنا سایہ ڈالے بغیر نہیں رہتا، پتھر پہاڑ پر سے خراش چھوڑتا ہوا
لڑھکتا ہے، دریا زمین پر بہتا ہے تو اپنا راستہ ضرور کھودتا چلا جاتا ہے، جانور فنا ہوتے ہیں لیکن میدانوں میں اپنی
ہڈیاں چھوڑ جاتے ہیں، گھاس پھوس بھی جلتے وقت کوئلے پر اپنے دھبے نشان چھوڑے بغیر نہیں جلتے، پانی کی
بوند ٹپکنے کے بعد ریت یا پتھر پر اپنا نقش بنا دیتا ہے، برف یا ریت پر قدموں کے نشان چلنے والے کی غیر فانی یادگار
ہے۔ انسان کا ہر کام اس کے ہم جنسوں کی ذہنیتوں اور خود اس کے چہرے اور اطوار میں اپنے نقوش ضرور ثبت
کر دیتا ہے۔

میر تقی اور میرزا رفیع نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اس کا اثر ان کی تخلیقی قوتوں پر پڑنا ضروری تھا۔ انسان
ہی قوت حافظہ ایک ایسے آئینہ کے مانند ہے جو اپنے اطراف کی اشیا کی شکلیں حاصل کر کے ان میں جان ڈالتا ہے
اور پھر نئی ترتیب سے ان کا انعکاس کرتا ہے، جس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ اپنا اثر چھوڑنے پر مجبور ہے، انسان
کی فطرت بھی اپنے انفعالیت تخیلات کو قلمبند کرتے رہنے کی مقتضی ہے ہماری زبان کے ایک موجودہ انشا پرداز
کے قول کے مطابق انسان پیٹ کا ہلکا واقع ہوا ہے، جب تک وہ اظہار نہیں کرے گا اس کے پیٹ میں درد
ہوتا رہے گا یہی ہے وہ بنیادی عنصر جس پر کسی زبان کے ادب وانشا کا انحصار ہوتا ہے اور جس کے تحت اس
مضمون کے عنوان پر ہم کچھ روشنی ڈالنی چاہتے ہیں:۔

نواب آصف الدولہ بہادر، رستم جنگ، وزیر الممالک، لکھنؤ کا وہ عالی نژاد تاجدار، جو خود مختار حکومت و
ثروت حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے قدیم لیکن کمزور دہلوی آقاؤں کی اسی طرح عزت واحترام کرتا رہا جس طرح اسکے
آباد اجداد دہلی کے تاجداروں کے عروج عظمت کا زمانہ میں عام درباریوں کی طرح کیا کرتے تھے، ایک حقیقی علم پرور
اور مردم شناس حکمراں کی طرح علما و فضلا اور شاعروں کی قدر دانی اور تربیت پر کمر باندھتا ہے۔ اس کی فیاضیاں
کہربا بنکر بڑے بڑے عالی ہمتوں کو خس و خاشاک کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھر ان کی دنیاوی تشکیلوں کو

اسقدر سیراب کرتی ہیں کہ اس کے بعد وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔
ایسی صورت میں میرزا رفیع اور میر تقی جیسی ہستیاں ـــ وہ ہستیاں جو بہکنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں وہ ہستیاں جو ہر اس چیز کو جو اُن کی نظروں کے سامنے آتی ہے، یا جس کا انہیں کوئی تجربہ ہوتا ہے، ایک معیاری نمونہ سمجھ کر اس کا مرقعہ کھینچنے کو تیار ہو جاتی ہیں، وہ ہستیاں جو لوگوں کے اس خیال کو باطل سمجھتی ہیں کہ دُنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ناقابل اظہار ہیں، وہ ہستیاں جن کو یقین رہتا ہے کہ وہ تمام اشیا بھی جن کا صرف خیال کیا جا سکتا ہے صرف تحریر کے ذریعہ سے ظاہر کی جا سکتی ہیں ـــــــــ اس امر پر مجبور تھیں کہ ان تمام چیزوں کو اپنے قلمی مرقعوں کے ذریعہ سے زندہ جاوید بنا دیں جو اُن کے اطراف انہیں دکھائی دیتی تھیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مرقعوں کی کثرت کے باعث میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے کلیات نگارستان بنے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کا صحیح تنقیدی نزاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے اور اس نوع کے رنگ برنگ کے مرقعے نکال نکال کر نہ صرف اردو والوں کو محظوظ کرایا جائے بلکہ دُنیائے ادب اردو کو دلکش اور پر لطف بنا دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس مضمون میں اپنے بساط کے موافق میر اور سودا دونوں کے ایک ہی چیز سے متعلقہ مرقعوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

نواب آصف الدولہ کو شکار کا خاص شوق تھا۔ اور جس طرح ان کو شادی کی تمام دھوم دھام اور ان کی دوسری دلچسپ تقریبوں اور شغلوں کے نقشے ان کے زمانہ کے شاعروں کے کلام میں نمایاں نظر آتے ہیں اُن کے شکار کے متعلق بھی بعض بہتر سے بہتر تصویریں دستیاب ہوتی ہیں جن میں میر اور سودا کے عہد نامے زیادہ قابل ذکر ہیں۔

میر اور سودا کی طرزِ شاعری اور اسلوب بیان میں جسقدر فرق ہے وہ ادب اُردو کا صحیح مذاق رکھنے والوں پر ظاہر ہے۔ ان دونوں کی شاعری میں ایک دوسرے سے بالکل مخالف رنگ کیوں اور کس طرح جھلکنے لگا اس کی تحقیق پیش کرنا ہمارے اس مضمون کے حدود سے باہر ہے یہاں ہم صرف اس امر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی زمانہ کے دو عظیم الشان اور ہم پلہ شاعر کس طرح نظر ڈالتے ہیں؟

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سودا خارجی حالات کی ترجمانی کرنے میں میر تو کیا اُردو کے اکثر شاعروں سے بہت بلند مرتبہ ہیں۔ انہوں نے بقدر خارجی مرقعے پیش کئے ہیں وہ اسقدر حقیقی اور نفیس معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد ہمیں ایک افتخار سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُردو زبان بھی دنیا کی ترقی یافتہ اور

شائستہ زبانوں کی طرح کنایات اور اس کی گوناگونیوں کے خوبصورت اور مکمل مرقعوں سے محروم نہیں۔ کیا سودا کا پیش کردہ بدقسمت "گھوڑا"، ادبی دنیا کا ایک اعلیٰ پایہ کا "کارٹون" نہیں؟ اور کیا اپنے زمانہ کی لڑائیوں اور کشمکشوں کے متعلق سودا کے بیانات نہایت نفیس حقیقت آمیز اور موافق فطرت مرقعے نہیں ہیں؟

سودا کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کے لئے یقیناً ایک بہت بڑے "ظرف" کی ضرورت ہے۔ موجودہ "تنگنائے مضمون" غالب کے الفاظ کے مطابق "بقدر ذوق" نہیں ہو سکتا اور افسوس ہے کہ ہم ایسی کوششوں کی ابتدا کرنے کی جگہ یہاں ان کے اس قسم کے کمال کا ایک ایسا نمونہ دکھانا چاہتے ہیں جس میں وہ اپنے حریف میر تقی میر سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں!

نواب آصف الدولہ کے شکار سے متعلق میر نے مثنویوں کی شکل میں کئی صید نامے لکھے ہیں اور اس کے برخلاف سودا کی مثنویوں میں ایک ہی صید نامہ پایا جاتا ہے جو اظہار موضوع کے لحاظ سے بھی میر کے صید ناموں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ سودا — وہ سودا جو اس میدان میں ہمیشہ میر سے گوئے سبقت لیجایا کرتے تھے —— اس ایک موقع پر کیونکر ان سے بہت پیچھے رہ گئے؟

اس کی ایک وجہ بہت ممکن ہے یہ ہو کہ میر نے صید نامہ کی مثنویوں کو خاص اہتمام کے ساتھ لکھا۔ چنانچہ وہ ان تین مثنویوں کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زمانہ میں ہے رسم کہنہ کی کچھ[1] — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہنامہ کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شاہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دل شاعراں رشک سے ہے دو نیم
کسو نے کہی عشق کی داستان — ہوا کوئی کہانے سے ہمداستان
پے آصف الدولہ میں نے بھی میر — کہے صید نامے بہت بے نظیر
گر نام نامی یہ مشہور ہو — گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

اس کے برخلاف سودا نے —— معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق ادب کے مذکورہ اصول کے مطابق —— خاص اہتمام سے اس کی طرف توجہ نہیں کی ان کی صید نامہ کی مثنوی میں صرف (۳۵) ابیات ہیں۔ اور میر کی صیدیہ

[1] (دیکھو "کلیات میر" ص ۹۶۲ - مطبوعہ نول کشور کانپور)

مثنویوں میں تقریباً سات سوابیات موجود ہیں۔ اور اگرچہ ان مثنویوں کے درمیان میر نے کئی بڑی بڑی غزلیں بھی درج کردی ہیں لیکن ان کو علیحدہ کردینے کے بعد بھی میر کے جو خارجی بیانات باقی رہجاتے ہیں وہ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

سودا نے اپنی صیدیہ مثنوی کو اس طرح شروع کیا ہے :-

سر صفحہ پر آج یوں صبحدم — لگا دست سودا میں کہنے قلم
جو اس عہد میں ہند کا ہے وزیر — بہمت جوان و بتدبیر پیر
بدہر آصف الدولہ جسکا ہے نام — سلیمان شکوہ و ذوی الاحتشام
جہاں تولے وہ اپنی شمشیر کو — تو روباہ سمجھے ہے وہ شیر کو
کیا ان نے ناگاہ بعزم شکار — قدم رنجہ اپنا بہ سوئے شکار

(دیکھو "کلیات سودا" مطبوعہ نول کشور کانپور صفحہ ۱۷۵)

میر نے اپنی صیدیہ مثنویوں کو حسب ذیل اشعار سے شروع کیا ہے :-

(۱) چلا آصف الدولہ بہر شکار — ہنا د بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

(دیکھو کلیات میر صفحہ ۹۴۱)

(۲) چلا پھر بھی نواب گردوں شکار — اسد باد کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال — نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال

(دیکھو "کلیات میر" صفحہ ۹۴۴)

(۳) مکرر ہے نواب کو قصد صید — بیاباں پہ اوراب ہونگے قید
رواں بحر لشکر ہوا موج موج — گئی چشم خورشید تک گرد فوج

(دیکھو کلیات میر، صفحہ ۹۵۳)

ان مثنویوں میں میر نے نواب آصف الدولہ کی تعریف میں اور دعا کے طور پر حسب ذیل شعر لکھے ہیں جو ہر مثنوی کے آخر میں پائے جاتے ہیں :-

(۱) بہت ہمنے دیکھے وزیر شہاں — شکار ایسے دستور سے تھے کہاں
نکلو ار جیسے تو ہیں گے ہزار — نہ میر ابھی ہوناہے یاں یادگار

غرض میر تا دورِ چرخ بلند — رہے آصف الدولہ اقبال مند
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام — شکار اس کے دشمن رہے صبح و شام

(دیکھو صفحہ ۵۴۳)

(۲) غرض ہے وزیرِ جہاں ارجمند — رئیس کلاں کار عالم پسند
در اسکا ہے بابِ سجودِ سراں — رہیں حکم کش اس کے زور آوراں
صدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

(دیکھو صفحہ ۵۵۲)

(۳) نہ ہے آصف الدولہؑ دادگر — سخنور نواز اور عاشق ہنر
وہش سے جہاں اسکی رزق پذیر — وزیرانِ دستور دین وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں — کف جود خورشید سا زر فشاں
سراپائے احساں بتامی ہمہ — ہمہ تن مروت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف دوات ہی رہے یادگار

(دیکھو صفحہ ۵۶۲)

اس کے برخلاف سودا نے اپنی صیدیہ مثنوی کے آغاز ہی میں نواب کی تعریف کردی ہے (جس کے متعلق اشعار پیش کردیے جاچکے ہیں) اور مثنوی کو ایسے بیان پر ختم کردیا ہے جو مزید تفصیل کا خواہشمند ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میر کے صید نامے دیکھنے کے بعد خود بھی کوئی صید نامہ لکھنے کا خیال کیا ہو لیکن کسی وجہ سے اس کو اختتام تک پہنچانے کے قابل نہ ہو سکے ہوں۔

میر کے صید ناموں کی غیر معمولی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید انہیں ان کے باعث نواب سے کسی بڑے انعام کی امید ہو کیونکہ انھوں نے اپنی انہی مثنویوں کے آخر میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:— اس وقت تک مجھے باوجود ایک اچھا شعر گو ہونے کے لکھنؤ میں کوئی قدرداں نہیں ملا، لہٰذا پھر اپنے ان شاہکاروں کو لیکر دہلی لوٹ جانا چاہئے — میر کے اس مضمون کے شعر ملاحظہ ہوں:—

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر لیکر چلو، بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

(دیکھو صفحہ ۵۶۳)

ان مثنویوں کی کامیابی کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ نواب آصف الدولہ کی توصیف کے لئے سودا جس زبردست حربہ پر قادر تھے میر اسی سے محروم تھے۔ وہ غزل گو شاعر تھے، باطنی کیفیتوں کو ظاہر کرنا اور خوبی سے ظاہر کرنا ان کی صنفِ شاعری کی معراجِ کمال تھی۔ انہیں قصیدہ گوئی میں سودا کی برابری ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ سودا کے قصیدے اگرچہ متعدد ہیں لیکن خاص نواب آصف الدولہ کی تعریف میں انہوں نے بڑے بڑے چھ قصیدے لکھے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ پہلا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۳ پر شروع ہوتا ہے اس کا مطلع یہ ہے :-

گر فلک اب یہ مہرباں ہوئے جوں تگرگ ابر درافشاں ہوئے

اس میں کل (۶۰) شعر ہیں۔

۲۔ دوسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۵ پر سے شروع ہوتا ہے اس کا مطلع یہ ہے :-

کیا فلم کو رستم سے ہے منظور کہ صریر اس کے سے ہے دل کو سرور

اس میں کل (۳۸) شعر ہیں۔

۳۔ تیسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۷ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے :-

سوا اپنے جیب جنوں نے کیا خواب حرام لائی گھر اس طبیب کے بے عقل جن کا نام

اس میں کل (۴۴) شعر ہیں۔

۴۔ تیرا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۸ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے :-

تیرے سایہ تلے ہے تو وہ ہمت پشہ کر جائے دیو دارسے لڑنت

اس میں کل (۲۶) شعر ہیں۔

۵۔ پانچواں قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۹ سے شروع ہوتا ہے۔ اسکا مطلع یہ ہے:-

کیا تجھ کو سجی مسندِ ایوانِ وزارت میں شوکتِ شاہی کہوں یا شانِ وزارت

اس میں کل (۱۰) شعر ہیں۔

۶۔ چھٹا قصیدہ عید رمضان کی مبارک باد ہے۔ اور پانچویں قصیدہ کے بعد ہی سے شروع ہوتا ہے

اس کا مطلع یہ ہے ؎

صیام عید ہے دل ہے خوشی سے الا مال ۔۔۔ مے طرب سے ہیں سب مست اپنے اپنے حال

اس میں کل (۱۱) شعر ہیں۔

سودا کے ان قصیدوں کے مقابلہ میں ہمیں میر کی کلیات میں آصف الدولہ کی مدح کے متعلق صرف دو قصیدے دستیاب ہوتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱- پہلا قصیدہ کلیات کے صفحہ (۱۲) سے شروع ہوتا ہے ۔ اس میں کل (۴۰) شعر ہیں ۔ جو دو مطلعوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں اس کا پہلا مطلع ہے ؎

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب ۔۔۔ آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

اور دوسرا مطلع ہے ؎ اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب ۔۔۔ دشمنوں کو دو ہے سا نہ اضطراب

۲- دوسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ (۵۲۱) سے شروع ہوتا ہے اور قصائد کے سلسلہ میں شامل رہنے کی بجائے ترکیب بند کے بعد سے شروع کیا گیا ہے ۔ اس میں کل (۵۸) شعر ہیں جو تین مطلعوں پر منقسم ہیں اسکا پہلا مطلع یہ ہے ؎ ہوا کئے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر ۔۔۔ سیہ ہی کاغذ مشقی کے رنگ لوح منیر

ان دو قصیدوں کے علاوہ ایک اور قصیدہ بھی کسی بادشاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے ۔ لیکن صاف طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس کی مدح میں ہے مدحیہ اشعار میں نہ آصف الدولہ کا نام ہے اور نہ کہیں ان کیطرف واضح اشارہ کیا گیا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ آصف الدولہ ہی کی مدح میں لکھا گیا ہو اس میں (۷۷) شعر ہیں اور کلیات کے صفحہ (۹) سے شروع ہوتا ہے ۔ چار مطلعوں پر منقسم ہے ۔ پہلے کے دو مطلعوں میں تشبیب ہے اور تیسرے مطلع سے ممدوح کی تعریف کی طرف گریز کیا ہے ۔ اسکا پہلا مطلع یہ ہے ؎

جو پہونچی قیامت تو آہ و فغاں ہے ۔۔۔ مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

بہت کم قصیدے لکھنے کے باعث میر کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس نوع کی کمزوری کی تلافی کرائیں ۔ چنانچہ انہوں نے مثنویوں کے ذریعہ سے اس کام کو سرانجام کرنا چاہا اور بڑی بڑی چھ مثنویاں لکھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

۱- صید نامہ نمبر (۱) اس میں تقریباً (۸۰) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۴۱) سے شروع ہوتی ہے۔

۲- " " (۲) " " (۳۰۰) " " " " (۵۴۴) " "

۲- صید نامہ (۳) اس میں تقریباً (۵۲۲) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۵۳) سے شروع ہوتی ہے۔
مثنویوں نمبر (۲) اور (۳) میں کئی غزلیں بھی شامل ہیں۔
(۴) کدخدائی نواب۔ اسمیں تقریباً (۶۲) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۶۴) سے شروع ہوتی ہے
(۵) آصف الدولہ کا ہولی کھیلنا۔ اسمیں تقریباً (۴۶) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۷۰) شعر ہیں
(۶) ساقی نامہ۔ اسمیں تقریباً (۱۱۰) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۷۹) سے شعر ہیں۔

ان کے علاوہ میر کے کلیات میں دس شعر کا ایک قطعہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو نواب آصف الدولہ بہادر کے گھوڑے کی تعریف میں لکھا گیا ہے اور جو صفحہ (۵۲۳) سے شروع ہوتا ہے۔

اگرچہ میرزا رفیع سودا نے کئی بڑی بڑی مثنویاں لکھیں لیکن اس خاص موضوع سے متعلقہ مثنویوں میں وہ میر کے مقابلہ میں کامیابی نہیں حاصل کر سکے۔ ان مثنویوں میں میر کا خارجی حالات کو نہایت خوبی سے اور خاص طور پر پیش کرنے کی کوشش کرنا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ درحقیقت اپنی اس کمزوری کو دور کرنا چاہتے تھے جس کے باعث وہ بہترین قصیدے نہیں لکھ سکتے تھے اور جس کی وجہ سے سودا نے اردو زبان کے شاعروں میں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔

میر اور سودا کی صید نامہ کی مثنویوں پر ایک عام تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد ہم ان کا بالمقابلہ مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ میر کے صید ناموں کی اہمیت اور سودا کے صید نامہ پر ان کی فوقیت ظاہر ہو جائے۔

۱:- اس قسم کی کوشش کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سودا کی مثنوی میں پہلے ہی سے نواب کی مدح شروع کر دی گئی ہے جو سودا کی قصیدہ گو فطرت کا ایک ٹھیک ٹھیک منظر ہے۔ اس کے برخلاف میر کے تینوں صید نامے نہایت آزادانہ اور بے لوثانہ انداز میں شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ہر ایک مثنوی کے آخر میں نواب کی تعریف ضرور کی ہے لیکن سودا کی آغازی تعریف کی طرح ان تینوں تعریفوں کے پڑھنے سے ذوق سلیم کو گرانی نہیں محسوس ہوتی۔

۲:- جس وقت نواب آصف الدولہ کی فوج جنگل میں داخل ہوتی ہے اسوقت کا نہایت نفیس اور موافق فطرت مرقع میر کی ہر مثنوی کے آغاز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی مثنوی کے آغاز میں وہ کہتے ہیں ؎

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانے سے جانے لگے — وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے
سن آواز شیران نر ڈر گئے — پلنگ و نمر خوف سے مر گئے (صفحہ ۵۴۱)

دوسری مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

روانہ ہوئی فوج دریا مثال — نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال
گیا شور تا آسمانِ بریں، — ہوئی گرد افواج گردوں نشیں
زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر — فلک کو لگے دینے شیر نر
چڑھا ابسکہ دریائے فوج گراں — اتر ہاتھیوں کی گئی مستیاں
دبے چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال — پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار کی راہ لی، — نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بگھیرے جو تھے دام سے چھا گئے — کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے چھپے — گزندوں کے منہ گرد نیچے ڈھپے (صفحہ ۵۴۴)

تیسری مثنوی کے آغاز ہی شعر ملاحظہ ہوں ؎

رواں بحر لشکر ہوا موج موج — گئی چشم خورشید تک گرد فوج
بحار و صحاری پہ ہے عرصہ تنگ — نگریاں، سراسیمہ ہیں، واں پلنگ
ہرن بیٹھے ہیں شیر سبری لباس — کریں لوگ شاید فقیری کا پاس
چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند — دلوں میں ہراس کمان و کمند،
کہیں گرگِ وادی کو فکر گریز — نظر آیہ ہر ادھر کرے شیر تیز
بنوں میں ہے آشوب، کوہوں میں ڈر — بیاباں وطن سارے گرم سفر
کہیں امن ہو تو کہوں واں گئے — نکل آ گھروں سے پریشاں گئے
اسد کے نہ شیرانہ ہنکار رہے — نہ گفتار کو تاب زنتار ہے
جہاں کے تہاں فکر ہی میں کھڑے — کہ دنگل ہے جنگل میں کیا بن پڑے
ہوا دود باروت سے تیرہ رنگ — صدائے تفنگ و صدائے تفنگ
وحوش بیاباں کو دہشت غضب — ہوا میں کھڑکتے ہیں پتہ کے سب (صفحہ ۵۵۲)

ان سے مقابلہ کرنے کے لئے سودا کے صید نامہ میں کوئی سماں نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے شکار کرنے کا ذکر فوراً ہی چھیڑ دیا ہے اس حقیقت حال کی طرف توجہ نہیں کی کہ جب ایک دم جنگل میں فوج گھس پڑے گی تو وہاں کے

انسانوں سے نا آشنا رہنے والے جانوروں کی کیا حالت ہوگی۔

۴- سودا کا صید نامہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کہنے والا ایک قصیدہ گو شاعر ہے۔ اس میں میر کے صید ناموں کی طرح موافق فطرت اشیا کے بہت کم مرقعے کھینچے گئے ہیں۔ ہر جگہ شان و شوکت اور علمیت جلوہ گر رہتی ہے جو قصیدہ گوئی کی معراج کمال ہے۔ کیا حسب ذیل اشعار کائنات کی حقیقتوں اور اصلی فطرت کی صحیح طور پر ترجمانی کرسکتے ہیں ؎

نہ دیکھا جو گاؤ زمیں نے پناہ	قدم نیچے دے اس کے اپنی پناہ
گیا دشت و بیشہ جو شیروں سے پاک	پڑی شیر کے ارنے کی یہ دہاک
رکھا نام پھر اس نے از خوف جاں	کہ جس شخص کا نام تھا شیر خاں
رہے دیکھ حیران صغیر و کبیر	جب آ گے سو اٹھ بھاگے قالین کے شیر
زمیں سے فلک تک جو ہو یہ ذکر	پڑی اپنی برج اسد کو بھی فکر
اگر دیو و دد واں جو آیا نظر	نہ چھوڑا غرض یہ اسے بوجھ کر (صفحات ۱۶۵، اور ۱۶۶)

اگرچہ میر کے صید ناموں میں بھی مبالغوں، صنعتوں، اور مخالف فطرت عنصر سے آلودہ اشعار ڈھونڈھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن سودا کے یہاں ان کی جو کثرت ہے اور جو بیڈھب پن پایا جاتا ہے اس سے میر کا کلام قطعاً پاک ہے۔

۴- سودا کے صید نامہ کا زیادہ حصہ ہاتھیوں ــــ اور بالخصوص ایک خاص ہاتھی ــــ کے شکار کی تعریف پر مبنی ہے۔ ان شعروں میں وہ کہتے ہیں کہ " واپسی کے وقت کئی ہاتھیوں کو زندہ پکڑ کر حلقہ بگوش لائے اور اگر تمام ہاتھی اچھے اور سواری کے موزوں ہے لیکن ان میں سے ایک ہاتھی ایسا خوبصورت ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ نو آسمانوں کے نیچے ایسا ہاتھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس کا قد و قامت اسقدر بلند ہے کہ اسکے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پہاڑ کو زنجیروں میں کھینچ لا رہے ہیں " اس کے بعد آخری دو شعروں میں س طرح فرماتے ہیں کہ ؎

نہیں اس کی خوبی میں ذرہ قصور	خدا چشم بد سے رکھے اس کو دور
ترے سائے میں یہ بجے تا ابد	تجھے پرورش کی رہے اسکے کد

سودا کے اس بیان کے مقابلہ کے لئے میر کے تینوں صید ناموں میں سے ہاتھی کے متعلق کافی شعر حاصل کئے جا سکتے ہیں مثلاً صرف پہلے صید نامہ میں (۱۹) شعروں میں ہاتھی کے شکار کا سماں دکھایا گیا ہے۔

میر اور سودا کے اس قسم کے بیانوں کا زبردست فرق یہ ہے کہ سودا نے ہر چیز کے شکار کی صرف،

تعریف کردی ہے، ان کا کامل مرقع نہیں پیش کیا۔ میر نے ہر قسم کے جانور کو شکار کرنے کے متفرق طریقے بتلانے کے علاوہ شکار کے وقت کا سماں بھی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر کر دیا ہے۔

ہاتھی کے شکار کے بعد میر کے تفصیلی مرقعوں میں مچھلی کے شکار سے متعلق بھی کئی شعر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ (دیکھو صفحات ۴۲۲ ۵ اور ۴۲۵ ۵) مچھلی کے شکار کے جسقدر طریقے اس زمانہ میں رائج تھے ان سب کے متعلق میر نے نہایت قابل وقعت مواد پیش کیا ہے۔

۵۔ آخر میں ہم میر کے اس زبردست کارنامہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہتے ہیں جس نے ان کو سودائے مخصوص جولانگہ میں بھی دوش بدوش رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ زبردست کارنامہ وہ متفرق تصویریں ہیں جو میر نے اثنائے شکار کے واقعات اور تجربات کے متعلق پیش کئے ہیں۔ پہاڑوں کی دلکشیاں، ان کی سر بفلک چوٹیوں کے نظر فریب مناظر گھنے جنگلوں کے خوفناک رستے، چٹیل میدانوں کی تکلیف دہ منزلیں اور دلکش و سبز مرغزاروں کے قیام کی رنگ رلیاں، بارش کی کیفیتیں اور سردی کی شدتیں فطرت کے وہ حقیقی جلوے ہیں جن کا اظہار کرنا واقعی اصلی شاعری ہے اور وہی شاعر کامگار شاعر کہلایا جا سکتا ہے جو انکی سچائی کے ساتھ ترجمانی کرتا جاتا ہے۔

ہمارے اس مضمون میں اسقدر وسعت نہیں ہے کہ ہم میر کی بعض طویل فطری تصویروں پر ایک تفصیلی نظر ڈال سکیں اس لئے ہم اس سلسلہ میں صرف ایک دو بیانات کے متعلق کچھ کہدینا چاہتے ہیں :۔

میر نے ایک دفعہ ایک مہیب دریا کا سماں پیش کیا ہے جو نواب آصف الدولہ اور ان کی فوج کے رستہ میں حائل ہوتا ہے۔ اس کے تلاطم کو دیکھ کر نواب کے تمام ساتھی اس کے عبور کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر عوام کی جو ذہنیت ہوتی ہے اس کا حال اور پھر نواب کا اس کے عبور کرنے میں پہل کرنا اور اس کے بعد دریا کا بہت پایاب ہو جانا ان واقعات کو میر نے جس طریقہ پر بیان کیا ہے وہ نہایت فطری ہے۔ اس کے بعد شعر ملاحظہ ہوں :۔

ہوا حائل راہ بحر عمیق	کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
قریب آ کے اتری پہ خائف تھی فوج	کہ بیٹھ دل اٹھتی تھی ہر ایک موج
مہیب اور آلودۂ خاک آب	بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب
غضب لجہ خیزی بلا جوش پر	تلاطم قیامت لئے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارا کرے — مگر دیکھ ہی کر کنارا کرے
تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار — کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ — کہ جوں تشنگی ہو جوانی کے ساتھ
لگے پاؤ چلنے جہاں شور تھا — کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا
تأمل سے اقبال نواب دیکھ — توقف کیا پہلے تو آب دیکھ
پھر اس پار جا کر اشارہ کیا، — کہ لشکر نے وہیں گزارا کیا
لگا سب اترنے لگے لشکری — نہ خوش آب کا وہ نہ دیسی تری
کچھ اک ناؤ میں لے کچھ شجر کاٹ کر — شتابی سے دریا کہیں پاٹ کر
اترنے لگا لشکر بے کراں — کراں تا کراں تھا یہ محشر عیاں (صفحہ ۵۴۴)

شکار کے زمانہ میں ایک دفعہ شدت کی بارش بھی ہوئی۔ اس کی وجہ سے لشکریوں کی جو حالت ہوئی اسکا بھی میر نے ایک نہایت نفیس اور حقیقی مرقع پیش کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پھر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب، — سب اسباب لوگوں کا تھا زیرِ آب
نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قناعت اور تنبو لپے سب گئے — کھڑے تھے جو کنڈلے اتر سب گئے
پھر ا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار
پھرے باولے لوگ منہ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کید ہر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
مہِ تیغ خورشید پنہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا
بہت اسپ اشتر موئے پاؤں پیٹ — نکالا وہیں خیمے سے گھسیٹ

(صفحات ۵۴۶ - ۵۴۷)

اُردو شاعری کی بدقسمتی سمجھئے یا اُردو والوں کی تنگ نظری کو انہوں نے کائنات کی نیرنگیوں اور فطرت کی بوقلمونیوں کے ان مرقعوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کی جو ان کے شاعروں کے کلیات میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہمارے شاعروں کے دیوانوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان میں سے اس زبردست نوع شاعری کے اعلیٰ نمونوں کا انتخاب ہو تو ہمیں یقین ہے کہ ایک ایسا کافی ذخیرہ فراہم ہو جائے گا جو کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے مایۂ صد افتخار ہو سکتا ہے۔

سودا، میر حسن۔ انشا، نظیر اکبرآبادی، میر انیس اور مرزا دبیر کی خارجی تصویریں تو خیر اس صنعت شاعری کے بہترین نمونے ہیں لیکن ہمارے وہ یورپ زدہ اہل زبان جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری صرف مشق عاشقی ہی کی داستان اور گفتگو پر مشتمل ہے غالباً یہ معلوم کرکے متحیر ہو جائیں گے کہ میر جیسا داخلی حالات کی ترجمانی کرنے والا شاعر بھی کن پایہ کے خاص مرقعے پیش کر سکتا ہے۔

غزل

(جناب میاں احمد ابراہیم پٹیل احمد چشتی نظامی از بمبئی)

اللہ رے حسن یار ہے کیا حسن یار بھی	پنہاں بھی اہل دید سے ہے آشکار بھی
نکلے گا آپ ہی کی طلب میں ہمارا دم	کوچہ میں آپ ہی کے بنے گا مزار بھی
پیدا ہو چشم دل تو یہ پوری امید ہو	آساں نہیں ان آنکھوں سے دیدار یار بھی
رہتا ہوں شاد کام جدائی میں صبح و شام	کتنی لطیف شے ہے غم وصل یار بھی
تیری نگاہ شوخ کے مانند آج کل	ملتا نہیں مزاج دل بے قرار بھی
پچھتائے آج شکوۂ بیداد کرکے ہم	دیکھا گیا نہ آہ انہیں شرمسار بھی
بدنام بھی ہمیں ہیں ہمیں نیک نام عشق	ناکام بھی ہمیں ہیں ہمیں کامگار بھی

تکلیف ہجر یار ہے احمدؔ تو ایک دن
ہوگی نصیب راحت دیدار یار بھی

ادبیات

شہید تغافل

"بالم"

(بہ سلسلہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء)

دل گرفتہ منظور کل جہاں دل کھو کر آیا تھا آج پھر وہاں گیا لیکن آج کل کی طرح بیچین نہ تھا اور حامد نے بھی آج کل سے زیادہ تپاک سے خیر مقدم کیا۔ دیر تک علاج معالجہ اور کارخانہ کی نسبت آپس میں گفتگو ہوتی رہی کچھ ادھر ادھر کی بھی باتیں ہوئیں مگر اسی دوران میں منظور کمرے میں بار بار کچھ متجسسانہ نظر سے بھی دیکھتا جاتا تھا جس سے آخر حامد متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور کہنے لگا "حضور کو کسی چیز کی خواہش تو نہیں؟ منظور نے پھر کمرے میں ایک متفحصانہ نظر دوڑا کر کہا "ہاں کچھ یوں ہی سی پانی کی خواہش تھی مگر اب کچھ نہیں" حامد نے نہایت خلوص سے "نہیں حضور ابھی حاضر ہوتا ہے" کہہ کر اپنی نحیف آواز سے سلیمہ کو پکارا جو برآمدے میں آکر کسی قدر آڑ میں چپ چاپ کھڑی ہو گئی حامد نے پانی لانے کی فرمایش کرتے ہوئے کہا "آپ ہمارے مربی و محسن ہیں کسی صاف گلاس میں ان کے لئے پانی لے آؤ" سلیمہ لپک کر دوسرے کمرے میں گئی اور جلدی سے ایک بلوری گلاس کو صاف کرکے اپنی اماں جان سے مردانہ کمرے میں پانی دے آنے کو کہا مگر ماں نے اسی کو لیجانے کو کہا۔ اگرچہ سلیمہ بھی چاہتی تھی لیکن پھر نسوانی شرم نے مجبور کیا اور قدم آگے نہ بڑھ سکا تھا اپنے مریض والد کی دوسری آواز پر اپنا ڈوپٹہ سیدھا کیا اور منہ پر زیادہ تان کر اپنے تشنۂ دید عاشق کے سامنے نہایت لجاجت سے پیش کیا۔ منظور نے اپنے ساقی مہوش کے ہاتھ سے جام آب حیات لیکر نوش کیا بلکہ کن انکھیوں سے ڈوپٹے میں چھپا ہوا شربت دید بھی نوش کیا لیکن اب اس کی حالت متغیر ہو گئی شدت درد سے بیتاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ درد نے اٹھ کر بٹھانا چاہا مگر دل بیقرار نے بیٹھنے نہ دیا، مریض کو تسلی بخش الفاظ سے ہمت دلا کر رخصت ہو گیا، اور سلیمہ کی حسرت بھری نگاہوں نے

صحن کے دروازہ تک مشایعت کی۔

نگاہوں کی مقناطیسی کشش کہئے یا دل کی بہتی قوت، جسنے منظور کو کئی بار مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ قصد آگے چلنے کا کرتا تھا لیکن قدم تھے کہ پیچھے ہی پڑتے جاتے تھے۔ بدقت تمام گرتے پڑتے مکان تک پہنچا، جوں جوں وقت گذرنے اور تنہائی ہونے لگی منظور کی حالت دگرگوں ہونے لگی لب سے آہ فلک سوز اور آنکھوں سے اشک خونیں جاری ہو گئے نہ کسی کروٹ چین نہ کسی پہلو قرار غرض اسی خلفشار میں رات بسر کی۔

صبح کو پیر دہ تھا اور خیال جاناں نہ کسی کی بات ہی پسند آتی ہے نہ دوستوں میں جی بہلتا ہے اور نہ کاروبار میں جی لگتا ہے البتہ خیال یار سے دل کو یک گونہ تسکین سی ہو جاتی ہے۔ طواف کوئے جاناں کا کئی بار ارادہ کرتا ہے لیکن پھر کسی خیال کے آنے سے فسخ کر دیتا ہے۔

ایک ہفتہ سے زائد عرصہ ہو گیا منظور آستان یار پر نہیں گیا، اگرچہ یہ مدت بہت قلیل ہے لیکن حسرت نصیب اور فرقت زدہ عشاق کے لئے تو قیامت سے کم نہیں۔ منظور نے بڑے صبر و استقلال سے کام لیا لیکن محروم دید سلیمہ کی حالت قابل رحم تھی، پہلو میں ایک پُر لطف درد اور درد میں ایک مسرت بخش لذت محسوس کر رہی ہے، جب آتش عشق کے شعلے دل میں بھڑک اٹھتے ہیں تو لب سے آہیں بشکل دود نکلتی ہیں، اور آنکھوں سے ساون بھادوں برسنے لگتا ہے ہر وقت چشم براہ اور گوش بر آواز رہتی ہے لیکن "جنت نظر" اور "فردوس گوش" سے محروم رہتی ہے۔

اپنی ہمراز نسیلی گلنار سے پہروں ذکر حبیب رہتا ہے جس سے کچھ تسکین سی ہو جاتی ہے ہر چند گلنار یقین دلاتی ہے کہ لاگ کی آگ ایک ہی طرف نہیں ہوتی، منظور بھی لازمی طور پر آتش عشق و محبت میں جل رہا ہوگا مگر پاس ننگ و ناموس کی وجہ سے یا افشائے راز کے خیال سے دانستہ احتراز کرتا ہوگا لیکن سلیمہ ہے کہ اس کو کسی طرح یہ یقین نہیں آتا کہ وہ میری شمع حسن کا پروانہ اور میری زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا ہوگا اس طرف منظور ناتجربہ کار منظور ابھی اسی ادھیڑ بن میں پڑا ہوا ہے کہ یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ ایک مرتبہ اور صرف ایک مرتبہ کے دیکھ لینے سے وہ بھی میری طرح بیتاب ہوگی اور اس پر بھی عشق کا جادو چل گیا ہوگا!

منظور کبھی کبھی اپنی خیالی تدابیر کی ناکامیوں پر غور کرتا تو اس طرح دل ہی دل میں کہتا:۔

"میں کیوں عیادت کے لئے گیا اور بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو مبتلائے مصیبت کیا لیکن آہ! کیا خبر تھی کہ متاع صبر و ہوش کو لوٹ لینے والا کوئی اس کمین گاہ میں پوشیدہ ہوگا اور یوں اچانک

حملہ آور ہوگا! ـــــ لیکن شکر ہے کہ میں جس فاتح کا مفتوح ہوں وہ ایسا فاتح ہے کہ اگر اس کے سامنے
دنیا کے بڑے بڑے سورما اور شجاع آئیں تو اُن کو بھی اپنے اپنے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی
چارہ کار نظر نہ آئے ــ ہائے! ظالم نے کس بلا کا حسن پایا ہے، واللہ یہ حسن اگر کلیو پطرہ کی
طرح اپنے کسی زبردست عزم کو لیکر منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہو تو عالم کون وفساد کو تہ وبالا کر ڈالے اور
تمام دنیا اسی کا لوہا مانے، ہائے! اس شخص کی زندگی بھی کیسی قابل رشک ہوگی جو رات کو اس کے
خواب آور گیسوئے عنبرین کے زیر سایہ موخواب اور صبح کو اس کی انگڑائی کے ساتھ بیدار ہوگا!! کیا
ممکن نہیں کہ وہ خوش قسمت شخص منظور ہی ہو! ــ ہرچند وہ غریب خاندان کی لڑکی ہے مگر خذف
پاروں میں گوہر یکتا اور سنگ ریزوں میں لعل بے بہا ہے، یہ حسن! جو شاہوں کے محلوں کی زینت
ہوسکتا ہے کیا ہر ایک کو میسر ہوسکتا ہے؟ ہر گز نہیں! لیکن منظور! ایک دن ضرور اس پیکر حسن و
مجسمہ شباب پر متصرف ہوگا!"

جہاں اس کے یہ خیالات تھے وہاں ایک یہ بھی ل بھی اس کی آرزوؤں کا خون کئے بغیر نہ رہتا تھا:۔ کہ ایک
مجہول الاحوال اور ادنےٰ درجہ کے ملازم پیشہ شخص کی لڑکی سے۔ رشتۂ مناکحت جوڑنے سے وہ معززین
شہر کی نظروں سے گر جائیگا، برادری میں حقیر اور احباب میں انگشت نما ہو جائیگا" یہی ایک ایسا خیال تھا جو
اس کے عزائم کو متزلزل کردیتا تھا اور اس دوراہہ پر پہنچکر اس کا پائے ثبات ڈگمگا جاتا تھا۔
منظور سات آٹھ روز کی غیر حاضری کے باوجود خادم کی طرف سے غافل نہیں رہا برابر اس کے
علاج معالجہ کے لئے ڈاکٹروں کو بھیجتا رہتا ہے اور ان کی فیس ادا کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کیا از روئے
ہمدردی ہے؟ اس کا جواب اگرچہ مشکل نہیں ہے تاہم ماننا پڑے گا کہ اس نے بیحد ہمدرد اور بے قرار
دل پایا تھا۔

چونکہ نسبتاً مرد سے عورت کا جذبہ عشق زیادہ قوی اور صادق ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج منظور
کے دل میں آستانِ دلربا پر جانے کا بار بار خیال پیدا ہوتا ہے وہ جانے کے لئے آمادہ ہی تھا کہ اسکو
ڈاکٹر کی طرف سے اس مطلب کی چھٹی ملتی ہے کہ "مریض کی حالت ناگفتہ بہ ہے وہ اکثر آپ کو یاد بھی کرتا
ہے اگر آنا مناسب سمجھیں تو شام کے پانچ بجے میرے ہمراہ چلیں"
اب کیا تھا منظور کو معقول وجہ ہاتھ آگئی۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا کہ کب وقت آئے اور

وہ مریض کے گھر یا درِ جاناں پر جائے خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ جلدی سے ڈاکٹر کے گھر پہنچا اور اُس کے ہمراہ روانہ ہوا مگر پہلو میں تڑپنے والا دل اور دل میں ایک رنگین آرزو لئے ہوئے آج حامد کا حال زیادہ تکلیف وزبون ہے اور اب اس کی زندگی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ منظور خاموش مریض کے قریب ایک صوفہ پر بیٹھا ہے اور ڈاکٹر مریض کے معائنہ میں مصروف ہے۔ حامد ایک کھٹیا پر بےحس وحرکت آنکھیں بند کئے ہوئے پڑا ہے، کمرے میں یاس وحرماں کا عالم چھایا ہوا ہے درودیوار سے اداسی ٹپک رہی ہے اور زنانہ کمرے میں قیامت کا سماں ہے سلیمہ اور اس کی ماں نے رو رو کر آنکھیں سُرخ کرلی ہیں کیونکہ انکو بھی آج حامد کی زندگی سے کچھ یاس سی ہوگئی ہے ۔۔۔ اگر منظور انکی ایسے وقت میں دست گیری نہ کرتا تو خدا جانے ان غریبوں کا کیا حشر ہوتا! اس میں شک نہیں کہ حامد کب سے اپنی بیوی بچوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر چل بسا ہوتا لیکن خدائے مسبب الاسباب ایسے بے کسوں اور لاچاروں کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دیتا ہے جس سے ان کی مایوسیاں امیدوں سے بدل جاتی ہیں۔

مریض نے طویل سکوت کے بعد ایک لمبی مگر نہایت نحیف سانس کے ساتھ آنکھیں کھولیں جس نے پہلے ڈاکٹر اور پھر منظور احمد کی طرف دیکھا اور منہ پر ایک قسم کی بشاشی سی چھاگئی اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن لب ہل کر رہ گئے۔ منظور یہ سمجھ کر کہ مریض کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے قریب آکر جھک گیا بالآخر بیمار حامد نے ایک آخری کوشش کر کے نہایت آہستگی سے کہا "آپکو دیکھ کر میری روح کو اطمینان ہوگیا ۔۔۔ میری زندگی اب چند لمحات کی مہمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری ایک آخری گذارش ...... سلیمہ کو آپ کے سپرد ...." خدا ترس منظور نے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مقصد سمجھ کر فوراً کہا "اطمینان رکھو میں اس کی کفالت کا ذمہ دار ہوں"

حامد گویا انہی الفاظ کے سُننے کا منتظر تھا ایک زور کی ہچکی لی اور عالم جاودانی کی طرف چل بسا ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا اور منظور کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی جو مردانہ کمرے کی دیواروں کو چیرتی ہوئی زنانخانہ تک بھی پہنچ گئی موقع شناس اصغری اگرچہ بچوں کے سنبھالنے میں مصروف تھی لیکن وہ اس نازک حالت سے بے خبر نہ تھی جونہی اس کے کان پر منظور کی چیخ کی آواز پڑی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر دیوانہ وار مضطر وپریشان مردانہ کمرے میں چلی آئی جس بات پر کھٹکی تھی وہی سماں دیکھ کر نہایت کرب وملال کے ساتھ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی سلیمہ بھی اپنی ماں کی آہ وزاری سن کر مردانہ کمرے میں گھس آئی اور شریک ماتم ہوگئی۔

خستہ ومغموم منظور بھی باچشم نم مکان سے باہر نکل آیا۔

جب اس سانحہ جانکاہ کا حال منظور کی زبانی خدا بخش کو معلوم ہوا تو ایک معقول رقم اس کی تجہیز و تکفین کے لئے مدد انہ کی اور آیندہ کے لئے بھی بہت کچھ اطمینان دلایا۔

(۴)

سلیمہ کی کفالت کا ضامن منظور نہایت پریشان اور عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ حامد کا چلم بھی ہو گیا مگر ابھی تک دیدار یاب سے محروم ہے اگرچہ اپنے وعدہ پر قایم ہے اور برابر حامد کے پس ماندوں کی خدمت کرتا رہتا ہے لیکن اس کے مکان پر کبھی نہیں جاتا اگر جانے کا قصد بھی کرتا ہے تو ہمت یاری نہیں دیتی اور یہ خیال کہ اب میرا وہاں جانا اس حیثیت سے کہ میں انکا معاون ہوں ان بیکسوں کو شرمندہ کرنا ہے علاوہ ازیں جس گھر میں جوان حسین لڑکی ہو میرے باربار جانے سے لوگوں اور ہمسایوں کو کیا گمان پیدا ہوگا خواہ مخواہ میں انگشت نما اور وہ بدنام ہوں گے اس کو وہاں جانے سے اور دیدار جاناں سے باز رکھتا تھا۔

دفتر میں جاتا تو با دل ناخواستہ۔ احباب سے ملتا تو شکستہ خاطر اور جب تک گھر میں رہتا نہایت مضمحل و پژمردہ کارکنان دفتر و کارخانہ ملنے جلنے والے اور گھر کے لوگ اس کی طبیعت کا یہ فوری تغیر دیکھ دیکھ کر محو حیرت تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ بعض بے تکلف دوست تو صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ تم لاکھ چھپاؤ مگر عشق کبھی نہیں چھپ سکتا۔ یہ ہر وقت کی خاموشی اور کھویا ہوا سا رہنا صاف بتلا رہا ہے کہ کہیں دل کھو کر آئے ہو، مگر منظور ان کو ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی اختلاج قلب کا بہانہ پیش کر دیتا تھا اور کسی کو تو اپنی عدم صحت کا ذکر کر کے پہاڑ پر جانے کا خیال بھی ظاہر کر دیتا تھا مگر اصل راز سے کسی کو آگاہ نہ کرتا تھا۔ اسی بےچینی کی وجہ سے اپنے آقا خدا بخش کے ہاں بھی اکثر کم جاتا تھا۔

آج بھی حسب دستور دفتر میں ملول و غمگین بیٹھا ہوا بےچینی سے کرسی پر پہلو بدل رہا ہے کہ ایک نو عمر لڑکا دفتر میں آ کر منظور کو ایک چٹھی پیش کرتا ہے وہ جوں جوں اس کو پڑھتا جاتا ہے چہرے سے بشاشت اور مسرت مترشح ہوتی جاتی ہے۔ یک بیک خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور تمام غم غلط ہو گیا چٹھی دو تین مرتبہ پڑھی اور پڑھ کر حامل رقعہ سے مخاطب ہوا۔

"صاحبزادے ہماری چٹھی بھی لے جاؤ گے"

لڑکے نے کہا "لے تو جاتا مگر وہ تو آج کہیں اور رہنے کو چلی گئی ہیں"

منظور نے گھبرا کر پوچھا کہیں اور! کیا اس نے آج ہی یہ رقعہ نہیں دیا؟

لڑکا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو آپا نے ابھی دیا ہے۔
منظور۔ اور تمہاری آپا نے بھی کچھ زبانی نہیں کہا۔
لڑکا۔ نہیں تو!

منظور نے لڑکے سے زیادہ استفسار مناسب نہ سمجھا اور اس کے ہاتھ میں پانچ روپیہ دیکر رخصت کر دیا۔ منظور کو ابھی ابھی جو چند لمحوں کی خوشی حاصل ہوئی تھی حزن و ملال سے یکسر مبدل ہو گئی۔ دل میں خیالات کا ایک حشر برپا ہو گیا بہت دیر تک سوچتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خط کس کا ہے آخر سلیمہ کے مکان پر بھی ہو آیا اور لڑکے کے بیان کی تصدیق کر لی۔ مکان پر آکر اس خط کے معمہ کو حل کرنے میں معروف ہوا اور اس طرح خیال آرائیاں کرنے لگا۔

یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ محبت نامہ سلیمہ ہی کے دست نازک کا لکھا ہوا ہے؟ یہ قطعی اس کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے جس قابلیت سے اسمیں اظہار خیال کیا گیا ہے وہ ہرگز صنف لطیف کی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا! مگر مشکل یہ ہے کہ اس سے قبل میں نے اس کی کوئی تحریر بھی نہیں دیکھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے دوستوں میں سے کسی نے میری پریشانی کا اصل راز کسی صورت سے دریافت کر لیا ہو اور مجھے دام محبت سے آزاد کرنے کے لئے یہ سعی ناشکور کی ہو! بے شک یہی بات ہے! ورنہ وہ چٹھی میں ضرور اپنی روانگی کی اطلاع بھی تحریر کر دیتی۔ یہ ناممکن ہے کہ کہیں اپنی برادری میں کچھ دنوں کے لئے رہنے کو جانے کا خیال ہوا اور اس کی خبر خود اس کو نہ ہو اور اس طرح اچانک روانگی کے لئے تیار ہو کر چلی گئی ہو۔ بالفرض اگر ایسا ہی ہوتا تو بھی وہ اپنی سہیلی گلنار کو جس کی وساطت سے یہ چٹھی بھیجی گئی ہے ضرور اپنی روانگی سے مطلع کر جاتی اور یہ بھی غیر ممکن ہے کہ اگر کسی رشتہ دار نے آج ہی اپنی ہمراہ انہیں لے چلنے پر مجبور کیا ہو اور قریب ہی رہنے والی اور ہمراز داں سہیلی گلنار کو اس کی اطلاع نہ ہو ــــ کہیں گلنار نے تو میرا مضحکہ نہیں اڑایا؟! لیکن اس کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت اور پھر اس کو میرے ہی ساتھ ایسا کرنے کی کیسے جرات ہو سکتی ہے ضرور دال میں کالا ہے وہ پھر اس نامہ دلربا کو جیب سے نکال کر اس طرح پڑھنے لگتا ہے:۔

میرے ...... محسن!

"میں جس جذبہ سے متاثر ہو کر ان سطور کے لکھنے پر مجبور ہوئی ہوں وہ اس قابل ہے کہ میں "بیگناہ"

تصور کی جاؤں۔ اگرچہ ہماری اسلامی اور ہندوستانی تہذیب اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم نامحرموں سے نامہ و پیام کریں۔ ہمارے نزدیک یہ فعل ایک بدترین جرم ہے لیکن اپنے محسن کے احسانات کا شکر گذار نہ ہونا اس سے بھی بدترین گناہ ہے۔ اس لئے پہلے مجھے اپنے بے پایاں الطاف و احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت دیجئے اور پھر اپنے دل .... ہائے میرا قلم کچھ اور لکھنا چاہتا ہے لیکن آگے نہیں چل سکتا۔ کیا میں اس امر کے دریافت کرنے کی جرات کر سکتی ہوں کہ میری نیاز مندیوں کی آپ کے دل ...... لیکن میری سہیلی گلنار (جس کے چھوٹے بھائی کی معرفت آپ کی خدمت میں یہ چٹھی پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہی ہوں) ہر چند تسلی دلاتی ہے کہ لاگ کی آگ ایک ہی طرف نہیں ہوتی لیکن آہ! میں اسکو کیا کروں کہ دل نہیں مانتا اور چاہتا ہے کہ خود آپ سے .... ہائے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ...... بس جی یہی چاہتا ہے کہ کاغذ پر بجائے سیاہ حروف کے سینے سے دل نکال کر رکھدوں کہ اظہار حال کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں —— لیکن پھر شرم معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ سب کچھ لکھ رہی ہوں جو کچھ نہ لکھنا چاہئے تھا۔

ندامت اور خوف تو اس امر سے ہے کہ کہیں آپ میری امیدوں کو .... آہ اس دن کے لئے خدا مجھے زندہ نہ رکھے اس کے تصور ہی سے مری تو جان گھلی جاتی ہے —— توبہ! توبہ!! ابھی سے یہ بدشگونی —— معاف فرمائیں اگر یہ خیال سوءظنی کے مترادف ہو! اب مجھ میں اس سے زیادہ لکھنے کی سکت نہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں نے کن مصیبتوں سے ان سطور کو پورا کیا ہے؟ آہ!"

آپ کے ......؟ کی

"س"

جذبۂ عشق سے متاثر ہو کر اظہار محبت کرنا نہایت بھدا اور بھونڈا طریقہ تھا اس لئے اظہار تشکر و امتنان کے بہانے کس عمدگی کے ساتھ جذبات دلی کا اظہار کیا ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ میں تم کو چاہتی ہوں مگر اشاروں ہی اشاروں میں سب کچھ لکھدیا اور پھر کچھ لکھا بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ع

کاش سمجھے خدا کرے "کوئی"

وہ بھی مجھ سے سننا چاہتی ہے کہ ان کی نیاز مندیوں (ناز آفرینیوں) کی میرے دل میں کہاں تک قدر ہے۔ پھر یہ بھی خواہش ہے کہ میں اس کے ساتھ اپنی محبت کا اس طرح اقرار کروں کہ اُسے یقین آجائے۔ مگر ساتھ یہ خوف بھی دامنگیر ہے کہ کہیں میں اس کی امیدوں کو پامال نہ کر دونگا۔ اس کو بدشگونی سمجھنا پھر بدگمان ہو کر فوراً معافی چاہنا۔ ایک انفعال متالم سے عبارت کو ادھوری چھوڑ کر بھی مطلب کو ہاتھ سے نہ جانے دینا واللہ نسائیت کی مکمل تصویر ہے

لیکن کیا ایک عورت کی جس کی تعلیم نہایت معمولی ہے یہ تحریر ہو سکتی ہے؟ بفرض محال اگر ہے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ سلیمہ ہی کے دست نازک کی تحریر ہے!! یہ سب تو ایک طرف لیکن سوال یہ ہے کہ اصغری اور سلیمہ کہاں غائب ہو گئیں!

یہی ایک ایسا سوال تھا جو اس کو بےچین کئے دیتا تھا اور کسی نتیجہ پر پہنچنے نہیں دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ہاتھ پیچھے کئے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا پھر کسی خیال کے آتے ہی گھر سے نکل کر کہیں چلا گیا۔

(باقی)

غزل

(جناب محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف بھوپالی)

وہ اب ہیں اپنے بسمل کا تڑپنا دیکھنے والے
کہاں ہیں حسنِ خود آرا کا جلوا دیکھنے والے

دلِ مردہ کی ہر رگ اک جہانِ بےقراری ہے
یہ کس گہری نظر سے تو نے دیکھا دیکھنے والے

ہزاروں سال بیت اللہ میں رہ کے نکلے ہیں
بتوں کو دیکھ اور برقِ کلیسا دیکھنے والے

لرز جاتے ہیں اڈرتے ہیں، دعا جو کرتے ہیں
مرے رونے پہ اس ظالم کا ہنسنا دیکھنے والے

یہاں سے گوہرِ مقصود حاصل ہو نہیں سکتا
ذرا گہرے میں جائیں موجِ دریا دیکھنے والے

نہ آ! اہلِ نظر کے سامنے بے پردہ! اے ظالم!
ابھی بیہوش ہو جائیں گے جلوا دیکھنے والے

میں اپنی ابتدا کا آپ ہی انجام ہوں ہاتف
نہیں! میری محبت کا نتیجہ دیکھنے والے

مژدۂ حیات

(یہ نظم "جامعہ ملیہ دہلی" کے یوم تاسیس کے جشن میں پڑھی گئی تھی)

اے چرخ کے جور سہنے والے — دنیائے ستم کے رہنے والے
سیلاب فنا میں بہنے والے — گو کہہ گئے تجھ سے کہنے والے

رفتار گر تری وہی ہے
طینت میں اثر تری وہی ہے

ساقیٔ فلک صراحی بردوش — ہاتھوں میں لئے ہیں جام پُرجوش
اس بزم سے آہ تو ہے روپوش — دنیائے وجود میں ہے خاموش

اس دورِ نشاط پر نظر کر
لے جام حیات تو بھی بھر کر

تو کیوں ہدفِ سنانِ غم ہے — کیوں کشتۂ خنجرِ ستم ہے؟
کیا دہر میں تو کسی سے کم ہے — دل تیرا صفا میں جام جم ہے،

ہر دم سے ترے فروغ ہستی
کیوں ہو گیا آشنائے پستی؟

ویرانے میں تیرے اب بھی ناداں — موجود ہیں دلکشی کے ساماں
مستور ہے خاک میں گلستاں — ہر ذرہ میں ہے ابھی نمایاں،

بھڑکا تھا جو طور پر شرارہ
چمکا تھا حرا سے جو ستارہ

اس نور سے پھر دیا جلا دے — پھر بزم جہاں کو جگمگا دے
پھر ظلمتِ جہل کو مٹا دے — پردہ رخِ علم سے اٹھا دے

نکہت سے جہاں کو پاک کر دے
غفلت کی قبا کو چاک کر دے

اے جامعۂ ملیہ کے ایواں — سایہ میں ترے پلے جو انساں
بھر اُن کے دلوں میں نورِ ایماں — کر علم میں اُن کو فخرِ دوراں

گیتی پہ قمر وہ لے کے نکلیں
گردوں پہ قمر وہ بن کے نکلیں

ان کے دلِ مردہ کو جِلا دے — اک جامِ حیات کا پلا دے
آئینۂ حق نما دکھا دے — تو خاک کو کیمیا بنا دے

غرناطہ و قرطبہ کے ثانی
تا حشر ہو تیری زندگانی

محمود (اسرائیلی)

غزل

(از جناب حضرت اختر صاحب)

نشۂ الفت میں جو سرشار ہے — مست و بیخود ہے وہی ہشیار ہے
بحرِ الفت میں ہوا جو غوطہ زن — دو جہاں میں اس کا بیڑا پار ہے
وعدۂ فردا پہ ہو کیونکر یقیں — روز و شب اُن کا یہی اقرار ہے
قدر کر ان آنسوؤں کی اے فلک! — دیدۂ تر ابرِ گوہر بار ہے
خندۂ گل دیکھ کر یاد آ گیا — یوں شگفتہ زخمِ دامندار ہے
کرتے ہیں وہ آج گل گشتِ چمن — مقتلِ عشاق گلزار ہے
یا الٰہی آج دل کی خیر ہو! — شوخیوں پر ابروئے خونخوار ہے

نام اختر ان کا ہے "آرامِ جاں"
ہم تو یہ کہتے ہیں — "دل آزار" ہے!

تیتری

تیتری کب سے دیکھتا ہوں میں تجھے
دیکھ الفت ہے کتنی تجھ سے مجھے
مثلِ پریوں کے پر نکالے ہوئے
جھونک نٹ کی طرح سنبھالے ہوئے
پاؤں اپنے جما کے پھول پہ تو
سونگھے جاتی ہے پھول کی خوشبو
فکر اس وقت کچھ تجھے ہے نہ غم
جیسے ہوتا ہے سکتہ کا عالم
نہیں ہم کو خبر یہ ہوتی ہے
چوستی ہے تو رس کہ سوتی ہے
کس قدر تو ہے بے حس و حرکت
پھول کے حسن پہ یہ محویت!
خوب لے لے مزے تو راحت کے
عیش و آزادی و فراغت کے
آئے گا جب نسیم کا جھونکا
پھر مسرت کا تیتری پوچھنا کیا
لے اڑیگا تجھے ہوا میں وہ
تجھ کو پہنچائے گا فضا میں وہ

باغ میرا ہے یہ شجر میرے
اور یہ پھول میری خواہش کے
ہیں پرستان کے جو تیرے پر
ان کو آرام دے تھکیں وہ اگر
لے تو آرام اس طرح سے یہاں
ہے یہ گویا حرم۔ یہاں ہے اماں
جی ترا جتنی دفعہ چاہے آ
نہیں ہے اس میں ڈر کی بات ذرا
بیٹھ جا تو یہاں کی ڈالی پر
بار تیرا نہ ہوگا مالی پر
ہم سنائیں گے دھوپ چھاؤں کے گیت
تیتری دیکھ ہم سے کر لے پیت
تجھ سے باتیں کریں گے گرمی کی
میٹھی سب باتیں اور نرمی کی
باتیں اس وقت کی کہ ہم بھی تھے
تیتری مانند ننھے منے سے
ہائے اک وہ بھی کیا زمانہ تھا
نہ رہا یاد اک فسانہ تھا

وہ مزے کے تھے دن بھی کتنے بڑے
تھے برابر وہ اب کے دس دن کے

ذہین (حیدرآباد)

غزلیات

حضرت تحمل جلالپوری مدظلہ

ہم بھی یہ چاہتے ہیں دلِ بے قرار بھی / دے رنج آسماں بھی تڑپائے یار بھی

کتنی ہے کیف زا نگہ مست یار بھی / سرشار بادہ کش بھی پرہیزگار بھی

اک تم کہ غیر پر نگہ التفات ہے / اک ہم کہ ہیں تمھیں پہ فدا بھی نثار بھی

کس طرح مفلسی میں کریں حلق خشک تر / نادار رند ہیں نہیں ملتی ادھار بھی

کی تجھ سے دوستی تو جہاں بھی ہوا خلاف / رکھتا ہے دشمنی فلک کج مدار بھی

ہیں بعد مرگ بھی وہ ہوں افتادگی پسند / ہوتا نہیں بلند لحد کا غبار بھی

افسانہ ہے وہی دلِ خانہ خراب کا / جو تم کو ناپسند بھی ہے ناگوار بھی

ٹھکرا کے میری قبر کو کہتے ہیں ناز سے / جب وہ نہیں تو کیوں ہو نشانِ مزار بھی

مٹتی نہیں ہے ہستی موہوم کی خلش / کٹتی نہیں ہے زندگی مستعار بھی

رحمت نے بڑھ کے مژدۂ بخشش سنا دیا / ہونے نہ پائے اہل گنہ شرمسار بھی

ہیں حال مفلسی میں تحمل غنی مزاج
بے مایہ بھی ہمیں ہیں ہمیں مالدار بھی

ممتاز الشعرا منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی

بھڑکا ہوا ہے شعلۂ برقِ جمال بھی
پیدا ہے رنگِ حسن میں شانِ جلال بھی

ماہ دو ہفتہ ہوتا ہے گھٹ کر ہلال بھی
اک روز ہے کمال کو آخر زوال بھی

ملنے کی آرزو بھی ہے اُسکا خیال بھی
تڑپا رہی ہے یاد بھی۔ شوقِ وصال بھی

ہے مبتلائے غم دلِ آشفتہ حال بھی
بکھرا ہوا ہے صورتِ گیسو خیال بھی

دل ہی نہیں ہے وقفِ تمنائے دیدِ حُسن
صرفِ وفورِ شوق ہے چشمِ خیال بھی

آتش فروز دل میں تجلیٔ یار ہے
پردے میں ہے جمال کے شانِ جلال بھی

صورت کسی کی رہنے لگی دل میں جلوہ گر
تصویرِ حُسن بنگیا رنگِ خیال بھی

رنگت ہے انقلاب کی پست و بلند دہر
وابستہ عروج یہاں ہے زوال بھی

دل بنگیا ہے آئینہ تصویرِ حُسن کا
نظروں میں ہے جمال بھی اُسکا جلال بھی

تاکید ضبط بنگئی مہرِ لبِ سکوت
کھلتی نہیں زباں دمِ اظہارِ حال بھی

پہلے ہی روئے یار سویدائے چشم تھا
پتلی نظر کا بنگیا عارض کا خال بھی

چشمِ غضب بھی اُنکی پئے دل ستم نہیں
چمکا ہوا ہے غازۂ روئے ہلال بھی

شیدائے حُسن جبکہ ہے اے دل ازل سے تو
اُس بیمثال کی کہیں دیکھی مثال بھی

ٹکڑے فقط نہیں ہے گریبانِ آرزو
ہاتھوں سے تیرے چاک ہے جیبِ خیال بھی

کھنچتی ہیں عشق میں مری دقت پسندیاں
اک امرِ سہل ہے مجھے کارِ محال بھی

تصویرِ حسن پھرتی ہے جس کی نگاہ میں
رہتا ہے میرے دل میں وہ بنکر خیال بھی

محشر میں جوشِ رحمتِ باری کو دیکھ کر
ہے موجزن مرا عرقِ انفعال بھی

کاغذ پہ اڑ چلی ہیں جو مضموں کی شوخیاں
حسنِ رقم نے بھر دیا رنگ خیال بھی

زینت فزائے بزمِ عزیزِ جہاں ہوں میں
رونق بھی مجھ کو کہتے ہیں سب پیارےلال بھی

مترجمات

ارتقاء ارض کا قرآنی نظریہ

اور

موجودہ تحقیقات طبقات الارض

مندرجۂ بالا عنوان سے ایک مختصر مگر پُر از معلومات مضمون نواب کرامت جنگ بہادر کے قلم سے دوکنگ کے رسالۂ اسلامک ریویو میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ارتقاء ارض سے متعلق زمانہ حال کے یورپین ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات کو بیان کیا ہے۔ اس کا مجمل خاکہ علی الترتیب حسب ذیل ہے:-

(۱) عہد قدیم کے قشر ارض کا پھیل کر ضخیم ہونا، اور آخرکار تمام سطح زمین پر چھا جانا

(۲) بخارات کا زمین سے اٹھ کر مجتمع ہونا اور بارش کی جھڑیاں بن کر برسنا۔

(۳) نباتات اور سبزہ کی کثرت روئیدگی۔

(۴) حیوانی زندگی۔

اس کے بعد مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پیشتر قرآن مجید نے اس نظریہ کو اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اب ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ آخری کتاب سماوی زمین کے اس نظریۂ ارتقاء کو کس طرح بیان کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا	اور اس کے علاوہ زمین کو بچھایا
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا	اسی میں اسکا پانی اور اسکا چارا نکالا
وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا	اور پہاڑوں کو (اسمیں) گاڑ کر (ہلا دیا)
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (سورۃ)	یہ سب تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدہ کے لئے

"قرآن مجید سے اس نظریہ کی مطابقت کسقدر تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے؟" قرآن میں پہلے زمین اور قشر ارض کی وسعت کا ذکر ہے، پھر پانی کے اجتماع، پھر سبزہ و روئیدگی اور آخر میں حیوانی زندگی کی پیدائش کا بیان ہے جن میں کا اشرف المخلوق "انسان" ہے۔

"ماہرین طبقات الارض کی تحقیق میں بھی یہی ترتیب نظر آتی ہے۔ یعنی ایک قدیم قشر ارض کی موجودگی اس کی تدریجی وسعت اور حجم، اس کا تمام سطح زمین پر چھا جانا، پھر بخارات کا مجتمع ہو کر پانی بننا۔ سبزہ و نباتات کی روئیدگی اور اس کے بعد حیوانی زندگی"

"مذکورہ بالا مطابقت میں میں نے پہاڑوں کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ اگرچہ اسکا بیان (تحقیقات جدیدہ اور قرآن) دونوں میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ سلسلۂ ارتقاء اب تک ختم نہیں ہوا جیسا کہ آتش فشاں پہاڑوں کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ میرا مقصد صرف تخلیق کی سلسلہ وار ترتیب دکھانا ہے۔"

کیا اب بھی لوگوں کو اس بات میں شک ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام (علیہ الوف التحیۃ والسلام) کا ذریعہ وحی و الہام خدا کے سوا کوئی اور تھا؟

لذّتِ الم

مسٹر جیمس ڈگلس اخبار سنڈے اکسپریس میں رقمطراز ہیں:۔

"میں ہمیشہ مصائب و آلام کے خلاف بہت جد و جہد کیا کرتا تھا۔ مجھے وہ ایک قسم کا بیہودہ پن اور ظلم معلوم ہوتا تھا۔ مگر میری زندگی کے تجربہ نے مجھے سکھا دیا کہ اگر تکالیف اور رنج و غم کا وجود نہ ہوتا تو ہمیں لازمی طور پر انہیں پیدا کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ کیونکہ بغیر دُکھ درد کے ہم وہ نہیں ہو سکتے جو ہم ہیں اور آیندہ ہو سکتے ہیں۔"

"میں نے ایسے مرد اور عورتوں کو دیکھا ہے جنھوں نے درد و الم کی آگ میں سے نکل کر ایک نئی روح پیدا کرلی ہے۔ اگرچہ وہ استحالہ اور تنویہ کا عمل نہیں جانتے تھے۔ کیونکہ تکالیف میں مبتلا ہوتے ہی وہ سراسیمہ اور پریشان ہو گئے، اور رنج و غم کے شعلوں میں حیرت و استعجاب کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارنے لگے، مگر جب وہ اس سے باہر نکلے تو زیادہ نرم دل، نہایت سادہ، مستقل مزاج

اور ہردلعزیز بن کر نکلے۔

"بہر حال زندگی ایک بڑی معلم ہے اور تا بقید حیات اس مدرسہ میں ہمیں درس ملتا رہتا ہے، جہاں ہم ہر روز ایک تازہ سبق سیکھتے رہتے ہیں۔ اور جوں جوں ہماری عمر ترقی کرتی جاتی ہے، ہم اپنے آلام کی بدولت اپنی مسرتوں کو پہچانتے ہیں۔ ہمارے مصائب ہمارے لذائذ کی بہ نسبت زیادہ رازوں کا انکشاف کرتے ہیں۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آیتِ شریفہ اِنَّ مَعَ العُسْرِ یُسْرًا کی بہترین تفسیر نہیں ہے؟

غزل

(از جناب شریف قسکری بھوپالی)

قیامت ہی گذرنا ہی تو یوں مجھپر گذر جائے
تری زلفیں بکھر جائیں ترا گیسو سنور جائے

ستم ہی اے محبت وہ نگاہیں پھیر کر جائے
جسے حدِ نظر تک دیکھنے میری نظر جائے

کسی کی سمت کیوں آخر ترا تیرِ نظر جائے
مرے سینہ میں در آئے مرے دل میں اُتر جائے

حیاتِ مضطرب اک چیز ہے دنیائے الفت میں
خداوندا قیامت تک نہ یہ دردِ جگر جائے

نگاہِ ناز و چشمِ شوق دونوں یوں ملیں یا رب
وہ اپنا کام کر جائے یہ اپنا کام کر جائے

پڑینگی اُسپہ رشک آمیز نظریں اہل جنت کی
تری دیوار کے سایہ میں جو دم بھر ٹھہر جائے

یہ حسرت ہی ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو جاؤں
نگاہِ مست میرا ساغرِ امید بھر جائے

محبت میں کسی کی پیروی کیوں کر گوارا ہو
چلے وہ راہ کیوں فکری جدھر کو راہبر جائے

اخبار علمیہ

فوٹوگرافی کا ارتقاء

ایک فرانسیسی موجد موسیو نوگس نے ایک سکنڈ میں تین سو فوٹو لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ توپ کے منہ سے نکلنے والے گولے کی تصویر لے سکتا ہے۔ موسیو نوگس کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ ایجاد سریع السیر سینو موٹوگرافی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردے گی۔ ابھی وہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ فی سکنڈ چھ سو تصاویر تک اس کو پہنچا دے۔

تشخیص امراض بذریعہ تصاویر

برلن (جرمنی) کے ایک طبیب ڈاکٹر الیسنر نے اندرون معدہ کے امراض کی تشخیص کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ وہ ایک نلکی کو — جس کے سرے پر تیز روشنی اور ایک چھوٹا سا آئینہ لگا ہوتا ہے — ایک مریض کے پیٹ میں اتار کر اس کا فوٹو لیتا ہے۔ اس آئینہ کے ذریعہ سے احشار کا عکس ایک سات فلم والے چھوٹے سے کیمرے میں پڑتا ہے، جو صرف ایک سیکنڈ میں سات تصویریں بیک وقت اتار لیتا ہے، ان تصاویر سے مریض کے اندرونی امراض کی پوری تشخیص ہو جاتی ہے۔

حمیٰ محرقہ کے جراثیم

ٹوکیو (جاپان) کی امپیریل یونیورسٹی کے پروفیسر ساتا نے ثابت کیا ہے کہ حمیٰ محرقہ کے جراثیم بہت آسانی سے جلد اور بیرونی مسامات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس جدید تحقیق سے اس مرض کے انسداد کے لئے اب تک جو تدابیر مہیا کی گئی ہیں ان کو بالکل بدل دینا پڑے گا۔

ایک عجیب گھڑی

ٹیرٹیڈا (کٹیالونیا) کے ایک نوجوان گھڑی ساز مسمی کیلکسٹو آربیرو نے ایک عجیب گھڑی بنائی ہے، جس کی نسبت اس کا دعویٰ ہے کہ یہ گھڑی بلا کو کنے کے ہمیشہ چلتی رہے گی۔ اس گھڑی میں یہ صنعت رکھی گئی ہے کہ وہ سکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتہ، مہینہ اور سال بتاتی ہے۔ اس سے دن اور رات کے گھنٹے، ہفتہ اور مہینہ کے دن، لوندکے برس، بروج فلک، سال کے باقی ماندہ ہفتے، طلوع و غروب کے اوقات اور چاند کے تشکلات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس گھڑی کو جس کے پرزے آٹھ سو سے زائد ہیں، اس گھڑی ساز نے اپنی بالائی فرصت کے وقت گیارہ سو گھنٹوں میں یہ گھڑی تیار کی ہے۔

تصحیح رسالۂ زبان بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۷	قومی کا ثبوت	قومی ہمدردی کا ثبوت
"	۸	پچیس مرحمت فرمائیے	پچیس روپئے مرحمت فرمائے
"	۱۱	نفس گزار	نفس گداز
۱۳	۱۴	ترقی کی زینہ پر	ترقی کے زینہ پر
۱۵	۵-۶	ریاست منگرول نے زبان کیلئے	ریاست منگرول نے ذیل کا معقول عطیہ زبان کیلئے
۱۷	۱۱	اصطلاحات	اصلاحات
۲۱	۲	منجملہ بائیس	منجملہ چھبیس
۲۶	۲	یورپ بڑے بڑے ممالک	یورپ کے بڑے بڑے ممالک
۲۸	۱۴	مذہبی اور سختی	مذہبی سختی
۳۲	۱۶	متن کو برھنا	متن کو پڑھنا
۳۴	۱۷	قلو بھائی شاہ نے	(نے زائد ہے)
۴۱	۷	ہرا ہو سبند و خود رد	ہرا ہو سبزہ خود رو
"	۱۰	جس سے	جن سے
"	۱۳	شادی	شادے
۴۲	۸	جد جد	جد و جد
"	۱۵	ہر اک شخص کی	ہر اک شخص کو
۴۳	۴	کونسے گل سے تجھکو الفت ہے	تجھکو الفت ہے کونسے گل سے

تصحیح رسالۂ زبان بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۲	نکتۂ نظر سے	نقطۂ نظر سے
۴	۸	حیثیت	حقیقت
۵	۸	خدمت نہایت	خدمت میں نہایت
۷	۸	صغیراسن	صغیر السن
"	۱۲	یہ تفصیل	بہ تفصیل
۸	۳	معاصرہ	محاصرہ
۱۲	۱۹	بعض کے وجوہ کا	بعض کے وجود کا
۱۶	۱	قواعد صوفی	قواعد حرفی
۱۷	۳	"خیالات"	"خیالات مجردہ"
۲۳	۵	سفر کرتے ہوئے	مقرر کرتے ہوئے
"	۱۸	دساطیر	اساطیر
"	۲۴	اس طورہ	اس طرہ
۲۷	۱۸	غشادۂ بصر	غشاوۂ بصر
۳۲	۶	امیدوں کی تلاش	امیدوں کی لاش
۳۳	۱۹	ہاں مجھی خوب ہی یاد وہ دن	ہاں مجھے خوب یاد ہے وہ دن
۳۴	۱۰	اسکا دیکھکر	(اسکا زائد)
۳۵	۱	پیش نظر کرشمع	پیش نظر کرشمے
۳۷	۹	اک بیہوشی	ایک بیہوشی
۳۸	۲	ادائے جانستاں کے اور کیا ہی	بجز ناز و ادا کے اور کیا ہی
۴۱	کالم اول ۱۴	(اشعار و جوابات)	(استعارات و جوابات)
۴۲	" ۹	تحتی	تقطیع
۴۳	" ۱۲	تمتی	تقطیع
۴۴	۱۸	ناقدردانی فرمانے کے	ناقدردانی زمانہ کے
۴۵	کالم اول ۱۳	اس مبحث	اصل مبحث
"	کالم دوم ۱۸	چھوٹی اور	چھوٹی تقطیع اور
۴۶	کالم اول ۱	رسائل میں رہتے ہیں	رسائل میں نکلتے رہتے ہیں
"	" ۲۱	"اسلام ملوکیت"	"اسلام اور ملوکیت"
"	" ۲۲	نتیجہ خیز مضمون ملک نامور	نتیجہ خیز مضمون لکھا ہے ملک کے نامور

زبان

جلد ۲ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء | نمبر ۲

زبانِ خلق

"معارف" اعظم گڑھ بابت جنوری ۱۹۲۷ء

زبان "کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے"۔ اس کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن صاحب خوشتر ہیں، اُردو دانانِ کاٹھیاواڑ کا یہ پہلا علمی قدم ہے مضامین سے اعلیٰ علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے، اُمید ہے کہ کاٹھیاواڑ اپنے شایانِ شان ترقی اس رسالہ کو بخشنے میں کامیاب ہوگا۔ ضخامت ۴۰ صفحے سالانہ چندہ للعہ ر۔

روزنامہ زمیندار لاہور (جلد ۱۴ نمبر ۲۹ (سنڈے ایڈیشن)

"زبان" کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ جو مولینا عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی کے زیرادارت نکل رہا ہے مضامین عمدہ ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے قیمت سالانہ چار روپے ششماہی ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مینجر رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاواڑ)،

روزنامہ ہمدرد دہلی (جلد ۴ نمبر ۳۴)

زبان یہ رسالہ، منگرول (کاٹھیاواڑ) سے نکلنا شروع ہوا ہے، اب تک اُردو رسائل کا اجرا زیادہ تر پنجاب تک محدود تھا اس ایک سال کے دوران میں لاہور سے نہ معلوم کتنے رسالے نکلے ہیں جو تقریباً سب ایک ہی طرز کے ہیں اور بقول "معارف" کے اگر ان میں سے ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیا جائے تو کوئی فرق نہ ہوگا بہرحال پنجاب سے اُردو رسالوں کا اس کثرت سے نکلنا تعجب خیز ہو یا نہ ہو لیکن کاٹھیاواڑ جیسی جگہ سے اُردو زبان میں ادبی رسالہ شائع کرنا یقیناً قابلِ قدر ہے، ایسی صورت میں جبکہ کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کو اپنی اردو دانی کا کوئی دعویٰ نہیں وہاں سے ایک علمی و ادبی رسالے کے اجرا سے اردو دانانِ کاٹھیاواڑ کے ذوقِ علمی کا پتہ چلتا ہے، رسالے کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن صاحب خوشتر ہیں، انتخاب مضامین سے ان کے علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے، ترتیب مضامین اور کتابت و طباعت کی طرف ذرا اور اگر توجہ کر دی جائے تو یقیناً "زبان"، بہت سے تجارتی رسالوں سے اچھا ہو جائے گا ہم دعا کرتے ہیں کہ خوشتر صاحب "زبان" کے ذریعہ سے اپنے صوبہ میں اردو زبان کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں۔ سالانہ چندہ للعہ۔

اخبار ریاست دہلی (جلد سوم نمبر ۲۰)

"زبان"

کاٹھیاواڑ میں زبان اُردو کا مذاق بہت کم ہے ہمیں یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب خوشتر مانگرولی نے ماہوار رسالہ "زبان" کا اجرا کرکے اس علاقے میں پہلا ادبی قدم اٹھایا ہے۔ منگرول میں پریس کی دشواریوں کی وجہ سے کارکنان رسالہ ہزاروں میل کے فاصلہ پر آگرہ میں انتظام طباعت کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن ان تمام موانعات کے باوجود "زبان" ایک کامیاب پرچہ کہا جاسکتا ہے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی محنت کی جاتی ہے اور اسوقت بھی اسکا ادبی معیار کسی اچھے اُردو رسالے سے ہرگز کم نہیں۔ ہم اپنے جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ مولانا خوشتر نے جو کاٹھیاواڑ میں اردو علم ادب کی شمع روشن کی ہے وہ باد حوادث کے جھونکوں سے محفوظ رہے۔

کاغذ لکھائی چھپائی صاف چندہ سالانہ للعہ؟ منیجر صاحب رسالہ "زبان" منگرول (کاٹھیاواڑ) سے طلب کیجئے۔

"آئینہ" (کانپور) (جلد اول نمبر سوم)

"زبان" منگرول (کاٹھیاواڑ) کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے کاٹھیاواڑ جیسے حصہ ہند سے اردو "زبان" کا رسالہ شائع ہونا بظاہر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہندوستان کی ملکی و قومی مشترکہ زبان اُردو کی ہمہ گیری کا ایک بین ثبوت ہے "زبان" خصوصیت کے ساتھ علمی مضامین شائع کرتا ہے اور اس لئے اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے رسائل کی طرح "زبان" بھی اہل علم کی بے اعتنائی کا گلہ گزار ہے اسکا شکوہ ہی کیا کہ یہ عام شکایت ہے یقیناً مولانا خوشتر ہمیں معاف فرمائینگے اگر ہم انکی خدمت میں اپنے ایک مکرم دوست کی رائے (جو انہوں نے آئینہ کا پہلا نمبر دیکھکر ظاہر فرمائی تھی) پیش کرنے کی جرات کریں یعنی "فی زمانہ ایسے خوش مذاق لوگ بہت کم ہیں جو صرف علمی مضامین کی بنا پر کسی رسالہ کی حوصلہ افزائی فرمانا اپنا فرض سمجھیں ضرورت ہے کہ علمی مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ عوام کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا جائے" ہمارے نزدیک "زبان" کی خدمت کرنا ہر اہل علم اور علم دوست کا فرض ہے۔ کراؤن سائز حجم ۳ جزو قیمت سالانہ چار روپیہ للعہ ششماہی ۱۲ر

صفحۂ ادارت

اس نمبر کے ساتھ جو تصویر زیب "زبان" کی جاتی ہے وہ ہمارے کرمفرا حضور فیض گنجور نواب غلام معین الدین خانصاحب بہادر (بابی)، والی ریاست مانادور (کاٹھیاواڑ) کی ہے اسوقت آپ کی عمر ۱۰ سال کی ہے اور راجکمار کالج (راجکوٹ) میں تعلیم پاتے ہیں آپ اس صغر سنی میں نہایت ہوشیار، ذکی الحس اور بیدار مغز واقع ہوئے ہیں بلکہ اپنے والد بزرگوار کی طرح فیاض اور ہمدرد ملک و قوم ہیں اور آپ کے دل میں بھی اپنی غریب رعایا کی فلاح و بہبودی کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ صغر سنی کے باعث ریاست مانادور کی عنان حکومت آپ کی والدہ ماجدہ مخدومہ و معظمہ عالیہ جناب فاطمہ بیگم صاحبہ صدیقہ دام اقبالہا ایجنٹ آف مانادور کے ہاتھ میں ہے جو نہایت قابلیت کے ساتھ امور ریاست اور اپنی ذمہ داریوں کو ایک بیدار مغز رئیس کی طرح انجام فرماتی ہیں۔

بیگم صاحبہ موصوفہ ہمارے نواب صاحب بہادر باغابہ (والی منگرول) کی بڑی صاحبزادی صاحبہ ہیں جنہوں نے اپنے عالی دماغ اور روشن خیال والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں علوم وسیاست حاضرہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی ہے، موصوفہ کو جہاں انگریزی تحریر و تقریر میں مہارت تامہ حاصل ہے وہاں اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ہم عنقریب آپ کے افکار عالیہ سے قارئین زبان کو بہرہ اندوز کریں گے۔

شرر و شاد کی وفات پر موقت الشیوع رسائل نے خوب خوب نوٹ لکھے ہیں بلکہ بعض رسائل نے تو اس پر انعامی مضامین بھی لکھوائے ہیں لیکن ہم ان مرحومین کی ماتم گساری میں بوجہ تاخیر اشاعت رسالہ سب سے پیچھے رہ گئے تھے لہذا اب ہم بھی سخت حزن و ملال کے ساتھ ماتم گسار ہیں۔

اگرچہ یہ ہر دو مستند و متقدر ادیب اپنی عمر طبعی کو پہنچکر فوت ہوئے ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی وفات سے دنیائے ادب میں ایک ناقابل تلافی حادثہ وقوع میں آیا ہے اور اس سے اردو علم و ادب کو جو نقصان ہوا ہے برسوں تک اس کی تلافی نہیں ہوسکتی، ایک اگر نثر نگاری میں بادشاہ تھا تو دوسرا نظم نگاری میں اپنے رنگ کا استاد تھا۔

اخیر میں ہم دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومین کو اپنی جوار رحمت میں جگہ اور پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ابھی ہم شرر و شاد کے ماتم ہی میں مصروف ہیں اور ابھی ہمارے آنسو بھی خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ یہ خبر وحشت اثر سنی گئی ہے کہ ملک کے مشہور نغمہ گو اور نازک خیال شاعر حضرت مضطر خیر آبادی نے بھی ہمیں اپنی دائمی مفارقت کا ایک داغ دیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آج جہاں ہم ان ہیم ادبی حادثوں سے مغموم و رنجیدہ ہیں وہاں ایک روحانی صدمہ سے بھی غمگین و حزین ہیں یعنی ۱۷ار فروری ۱۹۲۷ء کو ہمارے کاٹھیاواڑ کے برگزیدہ و مقدس بزرگ سجادہ نشین حضرت سید محمد صاحب (منگرول) نے ۸۴ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم نہایت خلیق و با مروت اور برگزیدہ بزرگوار تھے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی تھی اور آپ سے سینکڑوں عقیدت مندوں کو روحانی فیض پہنچتا تھا۔

مرحوم کے خلف اکبر و جانشین جناب سید عبدالصمد صاحب (عرف بڑا صاحب) سے ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلیں گے اور نہایت صلح و آشتی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کا خیال رکھیں گے۔

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فروری   **زبان**   سنہ ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی   کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہے دل   صادق ہے زباں تو اسم اعظم ہے یہی

مقالات

گجرات کا ایک غیر معروف عربی سفرنامہ

سنہ ۱۱۳۳ھ

(از علامہ عبدالعزیز راجکوٹی پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

ہمارے محترم علامہ راجکوٹی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے نامعلوم مقامات سے علمی، ادبی اور تاریخی جواہر پارے نکال لاتے ہیں جو حاشیۂ وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اُن کی وسیع کتب بینی، محققانہ تلاش وجستجو اور علمی تحقیقات کی بدولت کئی نایاب اور نادر جواہر علم وادب کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔

ذیل کا مضمون جو آج سے دو سو برس پیشتر کے ایک عرب سیاح کا سفرنامۂ گجرات ہے، اور جو تاریخی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، علامہ موصوف نے اپنی توجہ خاص اور لطف عمیم سے ہمیں بغرض اندراج

رسالۂ زبان عنایت فرمایا ہے اس کے لئے ہم اپنے محترم کے خاص طور پر ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی اپنے وطن مالوف کے ایک علمی پرچہ کی سرپرستی اور اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

ایڈیٹر

"مکرم مدیر صاحب زبان منگرول کا پیہم اصرار تھا کہ ان کے رسالہ کے لئے کوئی مضمون دوں۔ بہت غور کیا تو کوئی ایسا موضوع جو میرے وطن کی آب و ہوا کے لئے موافق ہوتا نہ سوجھا میں راجکوٹ ہی میں تھا کہ کتاب[1] نزھۃ الجلیس ومنیۃ الأدیب الانیس مصر سے پہنچی یہ ایک بارہویں صدی ہجری کے ادیب عباس بن علی بن نورالدین المکی الحسینی الموسوی کی ادبی تالیف ہے جس کی طویل فصول میں مؤلف نے اپنا سفرنامۂ عراق ایران گجرات اور یمن اس بری طرح مدغم کر دیا تھا کہ پڑھنے والے کو سفرنامہ کے وجود کا خیال بھی نہ ہو۔

ہر چند کہ سفرنامہ بہت متأخر زمانہ کا لکھا ہوا ہے مگر صرف اس خیال پر کہ اس میں چند جزوی واقعات مرہٹوں کی جنگوں اور اس عہد کے ملکی اور غیر ملکی اعیان کے حالات کسی قدر تفصیل سے آگئے ہیں میں نے راجکوٹ ہی میں اگست ۱۹۲۶ء میں اس کا ترجمہ شروع کر دیا جو بدقت تمام باعث قلت فرصت آج ۲۳ جنوری ۲۷ء کو علیگڈھ میں تمام ہوتا ہے۔

تاریخی حواشی نہایت اہم تھے مگر نہ یہاں ضروری مواد مہیا تھا نہ فرصت اس لئے خوشتر صاحب کے مطالبہ کو اور کشائی میں نہیں ڈالتا۔

مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ مؤلف کے حالات سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر لمحمد خلیل المرادی میں ڈھونڈھتا کہ وہ بدقسمتی سے ہمارے کتبخانہ میں موجود نہیں۔

میمن عبدالعزیز راجکوٹی
ریڈر ان عربک مسلم یونیورسٹی
علیگڈھ (یو۔پی)

جب ۶ صفر ۱۱۳۱ھ کی شام ہوئی تو ہم بصرہ سے کشتی میں سوار ہو کر روانۂ ہندوستان ہوئے۔ ہمارے ہمراہ ناصر ابن یحییٰ بن ذکریا تھے۔ اور کشتی مرحوم امیر فارس خاں کی تھی جو در اصل سید علی شاطری کی ملکیت تھی اور اس وقت امیر فارس خاں نے ان سے کرایہ پر لیلی تھی۔ راستہ میں ایک جزیرہ آیا جس کے سامنے ہم چھ دن لنگرانداز رہے تا آنکہ ناخدائے مذکور نے اپنا تمام سامان وہاں سے لیکر کشتی میں بار کر دیا پھر ہم چل پڑے اور راستہ میں طرح طرح کی اذیتیں اٹھا ئیں

[1] مطبوعہ مطبع وہبیہ مصر ۱۲۹۳ھ در دو جلد۔

گر پھر ۷ ربیع الاول کو بندرگاہ کنج میں داخل ہوئے جو نہایت دلکشا اور سرور افزا بندر ہے یہاں اطراف سے بکثرت میوے آتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بھلے لوگ ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات جناب سید محمد بن احمد بحرینی سے ہوئی جو اچھی طرح پیش آئے۔ پھر کوئی چار روز کنج میں ٹھہر کر روانہ بندرگاہ سورت ہوئے۔ شب و روز مسلسل بحر ہند میں کشتی چلاتے رہے تا آنکہ ۲۵ ربیع الاول کو بوقت ظہر بارہ میں لنگر انداز ہوئے جو سورت کا بندر ہے۔ اس بندر میں انگریزوں کا ایک بڑا جہاز تھا جس نے ہمیں بندر میں نہ گھسنے دیا۔ وہ کسی کشتی کو اترنے نہ دیتا تھا کہ اس کے حاکم نابینا شیخ الاسلام خاں اور انگریزوں کے مابین عبدالرحمن اسحق کی کشتی چھین لینے کے بارہ میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اس قصہ کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسرے روز ہمیں اجازت مل گئی۔ ۲۷ ربیع الاول کی صبح کو ہم بندرگاہ سورت میں داخل ہوئے جو نہر (نربدا) کے کنارے ہندوستان کا بڑے سے بڑا بندر ہے۔ جب میں داخل ہوا تو یہاں ہر اچھی چیز دکھائی دی جو انسان کو اہل و وطن کی یاد تک بھلا دے۔ یہاں بہت سے عالی شان محلات سرسبز باغات آباد بازار منور مسجدیں اور مشہور حمام ہیں۔ یہاں ایک سر بفلک قلعہ ہے جو بجائے خود اچھا خاصہ شہر ہے اور جو ترکوں کا بنایا ہوا ہے۔ بندر کے گرد دو شہر پناہیں ہیں قدیم اور جدید۔ قدیم ترکوں کی پرانے وقتوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اور نئی کے برج امیر مبارز خاں نے بنوائے تھے اور دس پر سلطانی خزانہ سے روپیہ صرف کیا تھا پھر اس کی تکمیل حیدر خاں نے کی تھی۔ یہاں میری ملاقات امیر فارس خاں سے ہوئی جس نے بہت کچھ فضل و کرم کیا۔ اور قلعدار میرزا کے بھانجے سے بھی ملا اس نے بھی عنایت کی۔ اور علامہ سید علی شاطری سے بھی ملا۔ اور قطب مولانا سید عبداللہ بن ولی سید علی عیدروس اور سید زین عیدروس اور سید عبدالقادر عیدروس اور سید مصطفےٰ عیدروس اور سید محمد عیدروس اور سید صادق عیدروس اور سید احمد عیدروس الغرض ان سب کی خدمت سے سعادت اندوز ہوا۔ اور یہاں کے مشہور تاجر شیخ ابراہیم بن خلیل قدسی سے ملا جو بہت خوبی سے پیش آئے۔ انکے علاوہ ان شاہیر تجار سے بھی ملا اور ان کے حسن سلوک سے مسرور ہوا جناب ابراہیم چلپی ودرلی، احمد چلپی ولد حاجی صالح درویش، حاجی عبدالرحمن جبوس، حاجی حسن بدوی چلپی۔ حسین حمیدان اور ان کے بھتیجے جناب مصطفےٰ حمیدان اور حاجی علی درویش اسی طرح یہاں کے عالم جلیل سید سعد اسعد اور سید علی مومن اور امیر جلیل صارم علی خاں اور شاہ ایران کے ایلچی مولانا سید مرتضیٰ بن سید علی خفاف سے ملاقی ہوا۔ نیز حاکم سورت شیخ الاسلام خاں سے بھی ملا جو بدترین اندھا ہے جو آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے اور مزید برآں اعلیٰ درجہ کا بخیل اور بزدل بھی۔ اور آیۂ کریمہ ومن کان فی ھٰذہٖ اعمی فھو فی الآخرۃ اعمی واضل سبیلا کا مصداق ہے اللہ اس کا برا کرے۔

پھر جب یکم شعبان ۱۲۳۱ھ کا روز آیا تو ہم خدائے تعالے پر بھروسہ کرکے مالی جہان دھلی موہن، نامی شہر کی طرف ہوئے
ہمارے ہمراہ ہمارے محترم استاذِ شریعت و شیخ طریقت مولانا سید یوسف بن سید احمد رفاعی تھے۔ راستے میں ایک قصبہ انجلیسر
(انکلیشور) نامی آیا۔ جہاں نہایت عمدہ ہندوستانی کاغذ طیار ہوتا ہے۔ پھر ہم بَرُوج (بھروچ) پہنچے۔ جو ایک عظیم الشان نہر
(نربدا) کے کنارے ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ایک سر بفلک قلعہ ہے یہاں سے مشہور بھروچی لٹھے کی برآمد ہوتی ہے۔ یہاں
کا تربوز وصال یار سے شیریں ہوتا ہے۔ یہاں تین روز ٹھہر کر ہم شہر بڑودہ پہنچے جو نہایت آباد اور با رونق شہر ہے۔ یہاں سے
بڑودی لٹھے کی برآمد ہوتی ہے۔ یہاں بھی ہم تین روز مقیم رہے یہاں میں مشہور رئیس جناب حاجی جعفر سے ملا جو رستم علیخاں
کے خسر ہیں انہوں نے اچھی طرح خاطر و مدارات کی۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر دیوحی پہنچے۔ جو قدیم زمانہ سے بتوں کا تیرتھ
چلا آتا ہے۔ اس قصبہ کی فصیل تمام تر کالے پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ جسکا چھوٹے سے چھوٹا پتھر دو ذرع کے برابر ہوگا یا کچھ زیادہ اس
بستی کے تین دروازے ہیں۔ اور تینوں رنگا رنگ مورتیوں اور عجیب و غریب ہیکلوں سے منقش ہے۔ یہاں سے
دہی کی قماش برآمد ہوتا ہے۔ یہاں ایک بڑا تالاب ہے جسکا دور تقریبًا ایک میل یا کچھ زیادہ ہوگا وہ تمام تر گھڑے ہوئے پتھروں
کا ہے۔ اوس کے گرد درختوں کی گول قطار ہے۔ یہاں ایک نہایت خدا پرست زاہدہ عورت کا مزار ہے جسکا نام مادو کری
ہے ایک محیر العقول بات یہ ہے کہ اس کی قبر پر پتھر کا ایک چھوٹا سا ستون ہے جس میں انسانی سر کی گنجائش کے برابر ایک
سوراخ ہے۔ سو جب کوئی جھوٹی قسم کھا کر آتا ہے اور اس سوراخ میں اپنا سر ڈالتا ہے تو اوسکا گلا گھٹنے لگتا ہے اور وہ
کسی طرح اپنا سر نکال نہیں سکتا جب تک توبہ نہ کرے یا اپنی قسم پوری نہ کرے۔ اور سچی قسم کھانے والا بے محابا اپنا سر ڈالکر
نکال بھی لیتا ہے میرے سامنے جبکہ میں مرحوم مہر علی خاں کے عہد میں یہاں کا محتسب تھا اس امر کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے
جو بالکل ٹھیک اترا ہے۔ اس مزار کی اور بھی کرامتیں ہیں۔ اللہ ہمیں اپنے نیک بندوں کی برکتوں سے ہر دو جہاں میں سرخرو
فرماوے۔ پھر ہم دیوحی میں ایک دن ٹھہر کر روانہ ہوگئے راستہ میں تمام کفار کے علاقے ہی آتے رہے پھر کہیں جا کر ۱۵ شعبان
کو مالی مہان پہنچے یہ شہر سر بفلک پہاڑوں اور بلند درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کے دروازوں اور گلیوں میں بے حساب
مور پھرتے رہتے ہیں۔ یہاں عظیم الجثہ بندر بھی بکثرت ہیں جو بڑے نڈر اور مہیب ہیں یہاں ایک اونچا اور سر بفلک پہاڑ بھی ہے
یہاں کے راجہ کا نام ودی سنگھ ہے۔ جو ظاہر میں کافر اور باطن میں مسلمان ہے۔ اس لئے کہ اس کے اہل و عیال اور اقارب
نسب کے سب کافر اور بت پرست ہیں۔ بنا بریں اوس نے ان کے اندیشہ سے اپنے اسلام لانے کے قصہ کو چھپا رکھا ہے۔ میں
اس سے خلوت میں ملا اور اسکو سورہ یسین اور سورہ رحمن پڑھائی اور اوسکو دعا حرز یمنی اور اسمائے حسنے کا اجازہ دیا۔ اس نے
مجھ سے وہاں اقامت کرنے کی استدعا کی جسکو میں نے منظور نہ کیا اسکا سبب بہت عجیب ہے۔ وہ یہ کہ میں نے سنا ہے کہ وہ

ایک فقیر مسمےٰ شاہ غریب کے متعلق بے حد خوش عقیدہ اور ارادتمند تھا۔ فقیر بھی بہت نیک دل اور باخدا تھا چندے وہ راجہ کے ہاں رہا اور اُسکو قرآن پڑھایا۔ پھر اس سے وطن جانے کی اجازت مانگی جو بصد دقت دیگئی۔ پھر جونہی کہ وہ نکلا راجہ نے اُسکے پیچھے چند آدمی کر دیئے۔ جو اوس کو قتل کر کے راجہ کے پاس لے آئے۔ راجہ نے اُس کو اپنے ہاں دفن کیا اور اوس پر ایک عالی شان مزار بنوایا جس کی بڑی زیارت ہوتی ہے اور راجہ اپنی خوش اعتقادی سے قندیل لنگر اور خندقوں میں بہت روپیہ خرچ کرتا ہے۔ میں بھی جان جانے کے ڈر سے یہاں مقیم نہ ہو سکا۔

القصہ ہم وہاں پانچ روز نہایت عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ راجہ نے بہت کچھ عنایتیں کیں۔ پھر ہم وہاں سے کوچ کر کے حدود لنقر بار کے پہلے شہر کرکون میں پہنچے۔ یہ شہر خوش وضع اور دلکش ہے۔ یہاں پان کے درخت بے حساب ہوتے ہیں۔ کبھی جانور بھی اس کو چرتے ہیں۔ ایک پیسہ میں ایک ہزار سفید اعلیٰ اور بڑے پان ملتے ہیں۔ اور کبھی اس مقدار سے بھی زیادہ ملجاتے ہیں۔

وہاں ہم ایک روز ٹھر کر ایک بڑے شہر پہنچے جس کو جیور کہتے ہیں اور جو ایک بڑی ندی کے کنارہ پر ہے۔ یہاں ایک عالیشان قبہ ہے جس میں ایک شخص مسمےٰ مینی چود[^1] مدفون ہے جس کا مزار بہت بڑا ہے۔ اس شہر کا حاکم عوض خاں ہے جو وزیر نظام الملک کا خسر ہے۔ یہ بخل و طمع کے لئے سخت بدنام اور رسوا ہے۔

[۲۹۶]
[۲۹۵]
پھر جب رمضان المبارک کا چاند دکھائی دیا تو ہم عنایت ایزدی سے شہر برہان پور میں داخل ہوئے اور یہاں کے رئیس کبیر مولانا سید احمد دمشقی کے مہمان ہوئے۔ جو ان علاقوں کے کوتوال ہیں اور انکا خطاب زین الدین خاں ہے۔ انھوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اور ہمیں دس روز انعام و اکرام سے مہمان رکھا۔ ہم ان کے بھتیجوں سید نور الدین، سید حسین، سید جعفر اور سید علی سے ملے جو بہت اچھی طرح پیش آئے۔ برہان پور بہت خوب محکم و خوش قطع شہر ہے۔ یہاں عالی شان، محلات، آباد بازار، دلکشا باغات، ستھرے حمام، اور عمدہ مسجدیں ہیں۔ اس کی شہر پناہ بلند ہے۔ یہاں غریب الوطن کا دل بہلجاتا ہے ایک بڑی نہر اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہاں فخری انگور بکثرت ہوتا ہے اور اس درجہ ارزاں کہ بار ہا گدھوں کو بطور چارہ دیا جاتا ہے۔

---

[^1]: کہتے ہیں اس کی دختر بہت ملیح تھی یہ قاضی کی عدالت میں جاکر بولا کہ میں نے اپنے گھر میں سیب کا ایک درخت بویا ہے جو اب پھل دینے لگا ہے ایک سیب ہے جو پک گیا ہے مگر میری بیوی مجھے کھانے نہیں دیتی سو کیا میں اوس کو کھا سکتا ہوں۔ نادان قاضی نے کہا جی ہاں کیوں نہیں؟ موئے نے گھر جاکر بیٹی کے ساتھ زنا کر لیا۔ اہل شہر اس کے متعلق بڑا اعتقاد رکھتے ہیں جو اُن کی جہالت کی دلیل ہے۔ (از اصل)

پھر ہم خدائے جہان پر بھروسہ کرکے سرزمین گوندوانہ کی طرف ہو لئے۔ راستہ میں ہمیں ایک قریہ مسمیٰ آسیر گڈھ ملا۔ یہاں ایک سر بفلک پہاڑ ہے جس پر ایک بے نظیر قلعہ ہے۔ اس پر تین فصیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پتھروں کی ہیں اور ایک ٹھوس پتھر سے تراشیدہ۔ جو ایک ہی قطعہ ہے۔ اس کا دور ایک میل اور طول میں قدِ آدم ہے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنات نے سلیمانؑ کے لئے بنائی ہے۔ یہاں بے حساب انگور ہوتا ہے جو لطافت شیرینی اور ارزانی میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ یہاں ہم ایک روز ٹھیرے۔

پھر کوچ کرکے شہر گرآبی میں آئے۔ یہاں ایک نہایت بلند قلعہ ہے اور یہاں کا پادشاہ مہان سنگھ ہے جو بُت پرست ہے۔ اس نے ہماری خاطر و مدارات کی اس لئے ہم وہاں ایک روز ٹھہر کر چل پڑے۔

پھر جب ذی العقدہ کی پہلی تاریخ ہوئی تو ہم نے سرزمین گوندوانہ میں قدم دھرا۔ اس شہر کا نام دیوگڈھ چاندہ ہے جس کے معنی دیوؤں کا قلعہ کے ہیں۔ ہم یہاں کے نجیب وکریم پادشاہ راجہ بخت بلند کے ہاں مہمان ہوئے اس نے ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہاں میں سید کریم صاحب خلق عظیم سیدی وملجائی ومرشدی سید بدر بن سید غالب موسوی رفاعی سے ملا۔ جو میرے قادریہ اور رفاعیہ طریقے کے پیر و مرشد ہیں۔ انہوں نے مجھے سلطان سے کہہ کر اپنے گھر میں لا رکھا۔ سلطان نے ان کی خواہش کو اس لئے منظور کیا کہ انہوں نے ہی اوس کو کفر و شرک سے چھڑا کر بندۂ توحید بنایا ہے۔ سلطان ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ یہاں ان کے بہت سے گاؤں اور قصبے ہیں جن کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ سو میں نہایت فراغت کے ساتھ ان کے ہاں عزت و توقیر کے ساتھ رہا۔

۱۱۳۴ھ

پھر جب ۱۲ محرم الحرام ۱۱۳۴ھ کی بابرکت صبح نمودار ہوئی۔ تو ہم اپنے شیخ طریقت استاذی سید بدر الدین سید غالب رفاعی مرحوم کے معیت میں اللہ پر بھروسہ کرکے دیوگڈھ چاندہ سے باگڑھ کی طرف رہ نورد ہوئے۔ باگڑھ بگاف فارسی شیروں کے راستہ کو کہتے ہیں۔ کہ ہم اس راہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلے جاتے تھے بحالیکہ ہمارے ارد گرد شیر دہاڑیں مارتے۔ دونوں شہروں میں ۱۲ مرحلہ کی مسافت ہے۔ مگر اللہ کے فضل سے ہم ہر طرح محفوظ رہے۔ اسی پر توکل کرکے ہم شیروں کی دست درازی سے بےخوف ہو گئے۔ سو ہم اسی طرح شیروں کی دہاڑوں میں بدحواس ہوئے چلتے رہے تا آنکہ جب باگڑھ اور ہمارے مابین نصف مرحلہ کا فاصلہ رہ گیا تو ہماری پیشوائی کرنے کے لئے وہاں کا پادشاہ راجہ علی شاہ نکلا۔ کہ وہ سید مذکور کے ہاتھ پر بیعت ہوا تھا۔ یہ پادشاہ راجہ بخت بلند مذکور کا فرزند ہے بڑی جمعیت کے ساتھ ہمارے استقبال کو نکلا یعنی کہ اپنے سواروں پیادوں اور جھنڈوں سمیت۔ اور اسی روز اس نے عام دعوت کی۔

پھر جب محرم کی ۱۰ تاریخ ہوئی تو ہم راجہ کے ہمراہ باگڑہ میں داخل ہوئے۔ راجہ پادشاہ کو کہتے ہیں۔ ہم امیر شیر خاں کے دولت خانہ پر اترے جو وہاں کا دیوان تھا اس نے ہمارے لئے معقول روزینہ مقرر کر دیا۔ ایک رات ہمیں ایک عجیب التعول بات سے سابقہ ہوا۔ وہ یہ کہ ہمارے شیخ مذکور گانے کے بڑے شائق تھے سنتے ہی اُنپر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اُنکے ہاں صوفیۂ کرام کے معمول کے مطابق چند گویّے ملازم تھے۔ کہ صوفی لوگ بالاجماع یہی کہتے ہیں کہ سماع ظاہر میں فتنہ اور باطن میں باعث عبرت ہے۔ سو جو عبرت سے باخبر ہو اُس کے لئے گانا سُننا جائز ہے۔ القصہ ایک رات راجہ مذکور نے اثنائے گفتگو میں سید صاحب سے کہا کہ میرے ہاں تین گویّے ہیں جو صفائے گلو حسن لہجہ اور راگوں سے باخبر ہونے میں اپنے نظیر نہیں رکھتے پہلے یہ امیر عالم علی خاں کے خاص گویّے تھے جو سید عبداللہ خاں وزیر فرخ سیر شاہ ہند کا بھانجہ تھا۔ مگر جب امیر عالم علی خاں اور وزیر نظام الملک میں لڑائی ہو گئی اور مقدم الذکر مارا گیا تو اوس کے تمام حاشیہ نشین بکھر گئے اور یہ تینوں گویّے جو باہم بھائی بھائی ہیں راجہ علی شاہ کے ہاں پہنچے اس نے اونپر بہت انعام و اکرام کیا اور اُن کو سالانہ پانچ سو روپیہ پر ملازم رکھ لیا۔ یہ سب کچھ علاوہ گھوڑوں، خلعتوں، طعام اور دیگر انعام و اکرام کے ہے۔ سیّد نے راجہ سے کہا کہ اول ان کو میرے پاس بھیجو تاکہ میں اون کو جانچ لوں راجہ نے اونکو اپنے بڑے فرزند بادل شاہ یعنی شاہ ابر کے ہمراہ سید کے ہاں بھیجا۔ سید نے اُن سے موسیقی کے متعلق جس سے وہ باخبر تھے بات چیت کی تا آنکہ وہ ایک ہندی راگ کا ذکر کرنے لگے جس کو دیپک کہتے ہیں۔ یہ راگ عالم کے عجائبات میں سے ہے۔ اس کی ایک راگنی ہے جس کو ٹھمنجری کہتے ہیں اور وہ بھی عجائبات میں سے ہے اس کے جاننے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ گویّوں نے کہا کہ ہم اس کو اچھی طرح جانتے ہیں اور گا بھی سکتے ہیں۔ اسپر سیّد نے اون کو حکم کیا۔ شہزادہ سید کے ایک پہلو پر کھڑا تھا اور اُس کے آدمی ہاتھوں میں ڈھالیں اور تلواریں لئے اُس کے سر پر کھڑے تھے۔ مجلس میں کوئی ۲۰ اُمرا وغیرہ بھی موجود تھے۔ جونہی ان گویّوں نے گانا شروع کیا ہم ازخود رفتہ ہو کر مدہوش ہونے لگے گو ہمنے شراب پی نہیں تھی پھر بھی متوالے ہو گئے۔ حتی کہ اگر کوئی چور آ جاتا اور ہمارے کپڑے بھی اُتار لیجاتا تو ہمیں خبر تک نہ ہوتی۔ اسی حالت میں ایک گھڑی سے زیادہ وقت گذر گیا۔ ایک فقیر شاہ عنایت اللہ جو ہمارے ہمراہیوں میں سے تھا ہمارے درمیان اسی حالت میں آیا۔ وجد و حال اُس کے دماغ پر پورے طور پر مسلط ہو گیا اور اس کے اندر قوت تمیز باقی نہ رہی۔ کچھ آگے بڑھ کر اوس نے شاہزادہ کی تلوار جو وہیں پڑی تھی اٹھالی۔ ادھر ہم سب یہ ماجرے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر کسی میں اتنی قدرت نہ تھی کہ اُٹھ کر اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین لے۔ ادھر فقیر نے تلوار کو نیام سے نکالا اور اُسکی نوک اپنی ناف پر رکھ کر پورے زور سے دبائی۔ ہمنے جو دیکھا تو تلوار اس کی پیٹھ سے چمکتی ہوئی نکل رہی تھی۔ فقیر کا

تو خاتمہ ہو گیا۔ ہم سب یہ ساری کیفیت دیکھتے رہے مگر کسی میں اتنا یارا نہ تھا کہ اس کو منع کرے یا نہیں از مرگ اوس کو زمین پر سے اٹھالے۔ یہ سب کچھ اس راگنی کا اور علی الخصوص اس کو صبح کے وقت گانے کا نتیجہ تھا۔

پھر جب ١٠ صفر ١٢٣٣ھ کو صبح ہوئی تو ہم باگرہ سے برہانپور کی طرف پلٹے۔ اثنائے راہ میں ہمیں ایک شہر اسلام نگر نامی ملا۔ جہاں ایک مستحکم قلعہ ہے۔ یہاں کا حاکم امیر دوست محمد خاں افغانی ہے جو نہایت دلیر مظفر اور کریم الانسان ہے۔ یہ سلیمانی[٥] ہے خالد بن الولید رض کی اولاد میں سے ہے۔ ہم اس کے قلعہ میں مقیم ہوئے تین روز نہایت عزت و توقیر کے ساتھ اُسکے مہمان رہے۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر تیسرے دن دریائے نربدہ کے کنارے پہنچے۔ اُس دن دریا کو عبور نہ کر سکے۔ سو رات وہیں گذاری اور دوسرے دن کشتیوں میں بیٹھ کر عبور کیا۔ پھر ہمیں راستہ میں ایک شہر مسمّٰے ہنڈیا ملا۔ یہاں ایک پختہ قلعہ ہے اور مُلا دو پیازہ کا مزار بھی یہیں ہے۔

پھر ٤ ربیع الاول کو ہم راجہ فتح سنگھ کی معیت میں کرائی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں ہم تین روز بہت اطمینان سے رہے۔ پھر وہاں سے کوچ کرکے بیابانوں میں چلتے رہے پھر جب ٨ ربیع الاول ہوئی تو دارالسرور برہان پور میں پہنچے اور سید کریم جناب احمد دمشقی المخاطب نواب زین الدین خاں مذکور کے دولتکدہ پر فروکش ہوئے۔ انکی سید بدر سے کچھ قرابت ہے۔ کہ سید کے والد نے دمشقی کی بھتیجی سے عقد کیا تھا۔ ان کے بھائی سید عمر دمشقی تھے۔ ان کا خطاب بھی زین الدین خاں تھا ان کے مرنے کے بعد ان کے بھائی کو انہیں کا منصب اور خطاب دیا گیا۔ القصہ ہم انکے ہاں بہت عزت و اکرام کے ساتھ رہے۔

پھر ٢ شوال ١٢٣٣ھ کو ہم برہان پور سے نکل کر راہ گرائے سورت ہوئے۔ راستہ پرخطر تھا اس لئے قریباً ایک مرحلہ چل کر ہمنے دشمن کے ایک ہوشیار آدمی کو مبلغ ستر روپیہ بطور بدرقہ روز نوکر رکھا۔ یہاں بدرقہ کو نایک کہتے ہیں۔ القصہ ہم دشمن کی زمین میں نایک کی موجودگی کے باعث بے خوف و خطر سفر کرتے رہے تا آنکہ شہر نیاپور میں پہنچے جو دشمن کا شہر ہے پہلے یہ سلطان کا تھا اور اب اوس پر غنیم قابض ہو گیا ہے۔ شہر کا سردار بیلوجی ہماری پیشوائی کو بڑی دھوم دھام سے نکلا ہماری خوب آؤبھگت کی اور ہمارے ہمراہ تین سوار اور تین پیادے کر دئے تاکہ ہمیں بلا معاوضہ بندرگاہ سورت تک پہنچا دیں۔

---

٥ عرب لوگ اسی بنا پر افغانی کو سلیمانی کہتے ہیں۔ مگر افاغنہ کا سیف اللہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہونا گو افاغنہ کو بڑا دعویٰ ہے ہنوز محقق نہیں ہوا

پھر ہم ۱۹ شوال کی صبح کو بخوشی بندرگاہ سورت پر پہنچے اور مرجان شامی کے محلے کے ایک مکان میں اُترے ساری کوفت جاتی رہی اور دوست احباب سے ملے۔

پھر جب ۱۴ ربیع الثانی ۱۱۳۶ھ کی صبح نمودار ہوئی تو ہم بندرگاہ سورت سے احمد آباد کو روانہ ہوئے۔ ہمارے ہمراہ یہ یہ اصحاب تھے حاجی عبد النبی بن حاجی کاظم درویش، اُن کے خسر علی کربلائی اور حاجی حسن الدورقی۔ راستہ میں ہمارا گذر انکلیشور بھروچ اور بڑودہ کیطرف سے ہوا۔ ہم ان شہروں کا حال پہلے لکھ آئے ہیں۔ پھر ہم بڑودہ سے نکل کر بانکانیر کے راستہ پر ہو لئے۔ یہ بڑا منحوس پُرخطر اور مورد آفات راستہ ہے۔ یہاں کے کولی کفار کا پیشہ بجز جنگ و جدل کے اور کچھ نہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں معلوم ہوتا۔ ہم بہ توفیق الٰہی ان کے ملک میں دو مرحلے چلے۔ پھر تیسرے دن نہر نربدا کے کنارے پہنچے۔ یہاں کولیوں نے ہمیں آن لیا اور قافلہ کے لوگوں سے ایک معتدبہ رقم وصول کی۔ تب جاکر ہمیں نہر نربدا عبور کرنے دی۔ ہمنے عصر کے قریب بعد ہزار دقت نہر عبور کی۔ اتنے میں دوسری طرف سے کچھ اور لوگ آکر بولے کہ راستہ میں لٹیروں کی ایک ٹولی قافلہ کے انتظار میں پڑی ہے۔ الغرض اس بہانہ سے انہوں نے بھی ایک رقم وصول کی تاکہ قافلہ کو کسی اور راہ سے لیچلیں آخر ہمیں رات کو انہیں کے ایک گاؤں میں بسیرا کرنا پڑا جہاں ہمنے نہایت رنج و تعب اور حسرت و الم سے رات گذاری۔ رات بھر نہ سوئے اور علی الصباح روانہ ہوگئے ہمیں مال و جان کی سلامتی کی امید نہ تھی۔ آخر ان کے ملک سے قریب زوال نکل گئے پھر انہیں شیاطین کے ایک گاؤں میں پہنچے جس کے حاکم کا نام بانوجی تھا یہ اپنے ہمراہ کولیوں کا ایک جم غفیر لئے ہوئے قافلہ لوٹنے کے ارادہ سے نکلا مگر ہمنے کچھ مال پیش کش کر کے پیچھا چھڑا لیا۔ پھر ہم مغرب کے قریب شہر نڑیاد میں پہنچے یہ شاہی ممالک محروسہ میں سے ہے۔ یہاں نہایت لطیف جلیبیاں بنتی ہیں ایک اور چیز دودھ کی ہوتی ہے جس کو لڈوا (لڈو) کہتے ہیں جو نہایت پُرلطف ہوتی ہے۔ یہیں ہمنے رات گذاری اور دن کو قیلولہ کیا پھر اگلی رات سوئے۔ اور تڑکا ہوتے ہی نکل کھڑے ہوئے اور پُرامن شاہی راستہ میں چلتے رہے تا آنکہ قریہ محمود آباد میں پہنچے۔

یہاں سے چل کر ۲۳ ربیع الثانی کو بوقت عصر شہر گجرات (احمد آباد) پہنچ گئے یہ نہایت عمدہ اور شاندار شہر ہے۔ اللہ نے زمین کو برکت دی ہے اس کا منظر چشم بینا کو خیرہ کر دیتا ہے۔ ایک مصر (قاہرہ) دیکھنے والے نے مجھ سے کہا کہ بلا مبالغہ یہ اُس سے بڑا ہے۔ یہ سلطان احمد کا بنایا ہوا ہے جو تیموری خاندان کے علاوہ ایک اور شاہی خاندان سے تھا اسی نام سے یہ شہر نامزد ہے اس کی قبر بھی یہیں ہے جو نہایت عمدہ سنگ رخام کی بنی ہوئی ہے اسپر رنگارنگ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اسکا گنبد نہایت عجیب و غریب دست کاری سے بنا ہے جو بنانے والے کی حکمت و دانش کا پتہ دیتا ہے اسکا مزار بہت بڑا ہے

اور اوسکی خیراتیں بھی کچھ کم نہیں جو آج تک برابر فقرا و مساکین پر تقسیم ہوتی ہیں۔ شہر کی فصیل نہایت بلند اور مستحکم ہے قلعہ بھی مضبوط ہے اور شہر ایک بڑی نہر دسابرمتی) کے کنارے بسا ہوا ہے۔ یہاں عالیشان حویلیاں ہیں منور چاندہیں پانی ہیں پرندے ہیں۔ یہیں بیش قیمت آم ہوتے ہیں جن کی خوشبو مشک وعنبر کیطرح مہکتی ہے اور جو نہایت ارزاں بکتے ہیں۔ یہاں سے دوسرے ممالک کو زنگارنگ اور قسم قسم کے کپڑے مثلاً سوتی کمخواب وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ اسی شہر سے ولی کامل شیخ ہارون گجراتی منسوب ہیں جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی صحبت سے مستفیض ہوئے تھے شیخ ہارون مذکور کا وصال مکہ مکرمہ میں ہوا تھا آپکا مزار سوق اللیل میں شریف احمد بن حازم کے گھر کے نیچے ہے اسپر ایک قبہ ہے جسکی زیارت ہوتی ہے اسی سے ولی عارف اور امام علامہ شیخ علی متقی گجراتی منسوب ہیں جن کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی اور جو جنۃ المعلیٰ (گورستان مکہ) میں مدفون ہوئے۔ آج تک مکہ میں آپ کی نسل موجود ہے۔ الغرض یہاں میں کوتہ پارچہ دشاید بیننے) چوراہہ) میں سید کریم مولانا السید یوسف بن رئیس جلیل سید محمد بخشی کے دولت خانہ پر فروکش ہوا۔ سید محمد بڑے فیاض اور محسن بزرگ تھے زندگی میں بڑی عزت سے رہے تا آنکہ بندر[۵] دیول میں سنہ ۱۱۳۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہی۔

میں گجرات کے گورنر امیر حامد خاں سے ملا جو وزیر نظام الملک کے چچا تھے نیز امیر شجاعت خاں اور اون کے برادران امیر رستم علیخاں وامیر قلی خاں اور امیر رئیس مہر علیخاں اور اونکے صاحبزادے اشرف الدین خاں اور امیر خانہ زاد علیخاں اور تاجر کریم شیخ عبدالستار بن میاں عثمان، اور سوداگر حاجی کاظم ذرویش اور تاجر حاجی صالح اصفہانی سے بھی ملا۔ مؤخر الذکر نے میری خاطر و مدارات کی اور میں نے احمد آباد کے مشاغل دلپسند طریق سے انجام دیدیئے۔

پس جب ۲۶ جمادی الاولی سنہ ۱۱۳۷ھ کی شام ہوئی تو ہم توفیق ایزدی احمد آباد سے سید یوسف بن سید محمد بخشی کی معیت میں اور امیر کبیر مہر علیخاں کی رفاقت میں دیوجی کی طرف روانہ ہوئے جسکا ذکر پہلے آچکا ہے اس شہر کی گورنری بادشاہ نے مہر علیخاں کو بخشی تھی سید یوسف کا اس امیر کے بھانجے پر کچھ قرض تھا جسکی مقدار ہندوستانی سکہ میں تیرہ ہزار روپیہ تھی۔ سید نے اسی لئے امیر کی ہمراہی اختیار کی تھی کہ اون کا قرضہ ملکی پیداوار سے جمع کرکے ادا کردیا جائے سو ہم باامن وامان چلتے رہے تا آنکہ سلامتی سے دیوجی پہنچے۔ امیر مذکور نے مجھے منصب احتساب پر فائز کرنیکا وعدہ کیا تھا جسکو ایفا کیا یعنی کہ مجھے بلدۂ مذکورہ کا ناظر و محتسب کردیا مگر افسوس دینا نے ہمسے وفا نہ کی اور ہماری کاربرآری کے بعد ہمسے مونہہ موڑنے لگی سچ ہے کہ "اہل علم کے نصیب میں علم ہے اور جہال کی قسمت میں مال" دینا پر دل باختہ ہونا خواب وخیال کا ہو بیٹھنا ہے۔

---

۵ دیکھو مرآت احمدی ۲ × ۵۵۔

اسکا باعث یہ ہے کہ نواب رستم علیخاں نے بادشاہ سے شہر مذکور اجارہ پر حاصل کیا اور مہر علیخاں کو چار ماہ کی گورنری کے بعد معزول کردیا اور ہم بھی بعد حسرت دیاس وہاں سے نکلے ازاں بعد رستم علی خاں نے سید یوسف علی خاں کے اوس قرضہ کی کفالت کی جو اوسکا اوس کے خسر مہر علیخاں کے ذمہ واجب الادا تھا۔ سو ہم بھی پلٹے اور اُنکے ہاں تقریبًا دو ماہ ٹھہرے مگر سید مذکور کو دو ہزار سے زیادہ رقم نہ ملی۔ جب دیکھا کہ ٹالم ٹول ہورہی ہے اور ملتا ملاتا کچھ نہیں تو سید کو وہیں چھوڑ کر ہم احمد آباد کو روانہ ہوگئے۔ ادہر سید نے اپنے خسر مہر علیخاں سے باقی قرضہ کا تقاضہ کیا تو بعد مدت مدید کہیں تین ہزار اور اگلوائے۔

پھر ۱۲ محرم ۱۱۳۹ھ کو ہم احمد آباد سے مشہور بندرگاہ کھمبایت کی طرف روانہ ہوئے جو کبھی ہندوستان کے بڑے بندروں میں شمار ہوتا تھا مگر اب ویران پڑا ہے اور اوسکا دسواں حصہ بھی باقی نہیں۔ یہاں ہم رئیس مرزا زمان کھمبایتی کے دولت خانہ پر فروکش ہوئے۔ پھر ۲۰ محرم الحرام ۱۱۳۰ھ کو ہم جہاز میں سوار ہوکر کھمبایت سے سورت گئے اور ۲۵ محرم کو بندر مذکور میں بخیر و عافیت داخل ہوئے اور یہیں ٹھہر گئے۔

یہاں ہم ادیب فاضل شیخ عبدالمحسن بن شیخ تاج الدین القلعی مفتی مکہ سے ملے نیز ان اصحاب سے ادیب کریم شیخ احمد بن علان شریف مکہ ادیب کامل سید عبداللہ بن سید محمد السلیفینی القدسی اپنے استاذ علامہ حضرت سید عبداللہ بن سید جعفر باعلوی ملقب بہ مدھر علامہ سید جعفر صادق عیدروس، سید اسمٰعیل عطاء اللہ، اونکے فرزند سید اسعد سید عبدالرحمٰن قسطنطینی سید عبدالرحمٰن امین، شیخ عباس حافی شیخ محمود دمنتی، قاضی مصطفےٰ بن قاضی جدہ قاضی احمد۔ یہ تمام بزرگ بیت اللہ کے باشندے ہیں اور غریب الوطنی نے انہیں یہاں ڈالدیا ہے اللہ ہم سب کو واپس وطن پہنچائے۔ آمین۔

پھر یکم ربیع الاول ۱۱۳۰ھ کو ہم بمعیت شیخ احمد بن علان شریف مکہ سورت سے شاہجہاں آباد کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں احمد آباد کیطرف سے گذر ہوا جہاں ہم تین ماہ ٹھہرے شریف نے یہاں سے متعدد رقمیں وصول کیں پھر احمد آباد سے شاہجہاں آباد کو ہولئے اس سال دکن میں بہت بڑی ٹڈیاں آئی تھیں ایک ایک ٹڈی بالشت بھر کی تھی۔

اس سال کے وقائع میں سے یہ ہے کہ امیر حامد خاں جو وزیر نظام الملک کے چچا تھے احمد آباد کے گورنر تھے۔ امیر شجاعت خاں بھی جو اوس وقت کے اکابر میں سے تھے وہیں مقیم تھے بادشاہ نے حامد خاں کو معزول کر کے سربلند خاں کو اوسکی جگہ تعین کیا جو اوسوقت بادشاہ کی ڈیوڑھی پر حاضر تھا۔ شجاعت خاں کو شاہی حکم ملا کہ سربلند خاں کے پہنچنے تک تم شہر کا انتظام کرو اور تمام اختیارات تمہیں دیئے جاتے ہیں۔ شجاعت خاں نے گجرات سے تمام اُمراء کو طلب کیا اور شاہی فرمان پڑھ سنایا۔ تمام چھوٹے بڑے امراء نے فرمان کی تعمیل کی اور پھر شجاعت خاں نے حامد خاں کو پیام بھیجا کہ وہ قلعہ اور ملک اوس کے حوالہ کر کے احمد آباد سے نکل جائے۔ وہ نہ مانا اور آمادہ عصیاں ہوا۔ دونوں کے مابین شہر کے وسط میں تین

شب و روز مسلسل خونریز جنگ رہی اور توپیں چلیں پھر جبراً حامد خاں کو نکلنا پڑا اور شجاعت خاں نے اوس کی جگہ سنبھالی ادہر حامد خاں مسلسل پانچ دن کنکریہ طلاؤ[۱] (تالاب) پر مقیم رہا۔ یہ تالاب پتھروں سے پختہ کیا ہوا ہے اس کے گرد انواع واقسام کے پھل پھول ہیں جن کے اوپر پرندے چہچہاتے رہتے ہیں۔ پہر حامد خاں وہاں سے کوچ کر کے دکن پہنچا تاکہ اپنے برادر زادہ نظام الملک مخاطب بہ قلیچ خاں بن غازی الدین خاں سے کمک لیکر شجاعت خاں سے احمد آباد چھین لے۔ سو نظام نے ستر ہزار سواروں سے اُسکی امداد کی جو تمام تر غنیم (مرہٹے، کے جنگجو تھے اور جن کا قائد اعظم دکنتاجی، نامی ایک دیو عفریت تہا۔ الغرض۔ حامد خاں اس لشکر جرار کو ہمراہ لیکر احمد آباد کی طرف بڑہا۔ اب اس قصہ کو یہیں چھوڑ دو۔

ادہر شیخ احمد بن علان ہم لوگوں کی معیت میں احمد آباد سے شاہجہاں آباد کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ چار دن چلکر ہم کپڑ گنج نامی بستی پر پہنچے یہاں ایک دن ٹھرے جب اس سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اطلاع ملی کہ حامد خاں بمراہی لشکر آج شام کو یہاں پہنچ جائیگا۔ سو سچ مچ عصر کے بعد حامد خاں غنیم کا ایک جرار لشکر لیکر آن پہنچا دوسرے دن ہمارے پاس ایک علَم بھیجا کہ اگر اسکو اپنے قریب گاڑے رہو گے تو غنیم (مرہٹوں) کے شر سے محفوظ رہو گے۔ پہر اوس نے امن و امان کا پیام پہنچایا اور شیخ احمد بن علان کو طلب کیا سو شیخ اپنے ہمراہ کچھ تحائف لیکر چلے جن میں ایک بڑی شمشیر قاقم کی پوستین اور طنپچہ کی ایک جوڑی تھی اوس نے شیخ کی خوب آؤ بھگت کی اور اونکو غنیم کی چیرہ سے سلامت و امان کی خوشخبری دی۔ پہر شیخ نے حامد خاں سے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت چاہی مگر اوس نے بدیں علت منع کیا کہ اثنائے راہ میں کولی ڈاکو بکثرت ہیں۔ جنہوں نے رہزنی کو اپنا پیشہ بنالیا ہے اور قافلوں کے قتل و غارت کو اپنا شیوہ اور کہا کہ ہمارے ساتھ احمد آباد چلئے تا آنکہ حالت پُر سکون ہو جائے۔ سو ہم بتعمیل حکم بادل ناخواستہ احمد آباد واپس ہوئے۔

سو ہم اس لشکر جرار کی معیت میں چلے تا آنکہ شاہی باغ تک پہونچے جو ایک نہایت شاندار بادشاہی باغ ہے اس کو اعظم شاہ بن اورنگ زیب نے نہر کے کنارے بنوایا تہا۔ ہم یہاں ذرا دن چڑھے پہنچے۔ اسی دم شجاعت خاں اپنا عظیم لشکر لیکر ہماری طرف بڑہا دونوں لشکروں میں مُٹھ بھیڑ ہو گئی کشتش وکوشش شروع ہوئی تیرے باندہے گئے تلواریں سونتی گئیں اور ایک دوسرے کو موت کے گہاٹ اُتارنے لگے۔ یہ دن ہمارے حق میں بلاخیز تہا کہ ہر سمت سے توپوں اور بندوقوں کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تہیں۔ الغرض حامد خاں فتح مند ہوا یعنی کہ وہ شجاعت خاں سے دوچار ہوا دونوں نے تلواریں چلائیں اور تیر پھینکے حامد خاں نے اوسکی پیشانی پر تیر مار کر اوسکو ہاتھی پر سے گرا دیا اور آگے بڑھکر اوسکا سر کاٹ لیا۔ پہر اوسکا سارا خزانہ اور سال و منال لوٹ لیا فلاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ بات دُنیا کے راز ہائے سربستہ

[۱] دیکھو مرآت احمدی ۲ ۱۲۷۔

یں سے ہے۔ ورنہ اگر ان دونوں کا مقابلہ کرو تو حامد خاں[1] گرجتا ہے برستا نہیں اور شجاعت خاں بڑا فیاض اور کریم ہے جبکہ حامد خاں جہاں بھر کا کنجوس مکھی چوس ہے۔ ولیکن یہ تقسیم ایزدی ہے اور مشیت الٰہی جس میں کسی کو دم مارنے کا یارا نہیں۔

القصہ حامد خاں مظفر و منصور ہو کر احمد آباد میں داخل ہوا۔ پانچ دن گذر جانے کے بعد اوس نے شجاعت خاں کے حقیقی بھائی امیر ابراہیم قلی خاں کو اپنے سامنے طلب کیا اور اُس کو امان دی ابراہیم کے دل میں اپنے بھائی کا قصاص لینے کا خیال مستحکم تھا۔ قلعہ میں گھستے ہی جونہی اُس کی نگاہ حامد خاں پر پڑی تلوار سونت کر اوس کے پیچھے لپکا حامد خاں بھاگا اور ابراہیم بھی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑا تا آنکہ وہ زنان خانہ میں پہنچا ابراہیم اون کو دیکھ کر زیر جھپٹنے کا خیال کر کے کچھ ہچکچا گیا گو دل میں ہنوز آتش انتقام برافروختہ تھی۔ مگر جونہی کہ وہ قلعہ کی طرف بڑھا تو دیکھتا ہے کہ وہ پانچ ہزار جنگجویوں کے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے جو شمشیر بکف ہیں مگر وہ بے محابا شیر ژیاں کی طرح اون پر لپکا اور پہلے حملہ ہی میں ساٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا مگر ادھر وہ کثیر انبوہ اور ہاتھیوں سے ہر طرف سے گھر گیا تھا جنہوں نے اس کی تکے بوٹیاں کر ڈالیں سو اوس پر اس کا رحم ہو۔ یہ امیر بڑا مہمان نواز غریب پرور اور دلیر تھا حامد خاں کے ہاتھوں ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ ہوا دنیا اسیطرح سفلہ پروری کیا کرتی ہے۔

ادہر حامد خاں نے احمد آباد میں چند ہی روز گذارے تھے کہ اُسے یہ خبر ملی کہ رستم علیخاں جو ان دونوں مرحوموں کا تیسرا بھائی تھا تیس ہزار جنگجویوں کو لیکر آرہا ہے۔ رستم سورت کا گورنر تھا جب اوسے اپنے دونو بھائیوں کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو بہت گھبرایا اور یہ لشکر لیکر نکلا۔ حامد خاں سامنے آیا اور دونوں کا مٹھ بھیڑ قریہ آراس (داسو) میں ہوا جو احمد آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دونوں میں ہولناک لڑائی ہوئی۔ رستم نے اُس کو بہت بڑی شکست دی اور اُس کے لشکر کو سخت ہزیمت اوس کے خزانے لوٹ لئے اور اُس کے تمام راستے بند کر دیئے۔ حامد خاں دُم دبا کر بھاگا اور پیچھے پیچھے رستم اوس کا تعاقب کرتا رہا مگر افسوس کہ رستم کے اپنے لشکر نے اوسکے ساتھ غداری کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ سال بھر غنیم سے لڑ رہا تھا جن کا سردار بیلوجی (بیلاجی) تھا جب اوس کو اپنے بھائیوں کے قتل ہونے کی خبر ملی تو یہ خبر اوس پر شاق گذری اس لئے اُس نے بیلوجی سے مبلغ ایک لاکھ روپیہ نقد دو مانگی اور۔ ایک خلعت فاخرہ پر مصالحت کر لی کہ وہ دونوں حامد خاں کے خلاف یکدل ہو جائیں۔ مگر اندرونی طور پر بیلوجی حامد خاں کے خلاف اس سازش سے پہلے ہی آگاہ کر دیا۔ سو جب دونو لشکروں میں مٹھ بھیڑ ہوئی تو رستم تین ہزار عرب جنگجویوں کے ساتھ لیکر حامد خاں پر حملہ آور ہوا

لہ عربوں نے چونکہ وہ ہندوستان میں خیرات اگہوانے آتے ہیں ہندوستانیوں کے حسن و قبح کا معیار اس بات کو بنالیا ہے کہ جو دے وہ ولی اللہ اور جو نہ دے وہ حرامی بطال۔ تا دم تحریر یہ حالت باقی ہے۔ ہر چند کہ مصنف کے بیان پر اور مورخ بھی متفق ہیں۔

اور غالب رہا اور ہنوز وہ اوس کے تعاقب ہی میں تھا کہ ملعون بلوجی سو قع سے فائدہ اٹھا کر پچیس ہزار کی جمعیت سے اوس کے لشکر پر عقب سے حملہ آور ہوا صدہا آدمیوں کو قتل کیا اور رستم کے لشکر کو حوالی و اطراف کے گاؤں میں بھگا دیا اور سارا سامان ہتیار اور توپیں لوٹ لیں اور پھر اپنا توپ خانہ اور لشکر لیکر رستم اور اس کے ہمراہی عربوں کو گھیر لیا۔ تو حامد خاں کی جان میں جان آئی اس لئے وہ بھی پلٹ کر اپنے سواروں کے ساتھ خم ٹھوک کر جم گیا۔ رستم علی خاں برابر اسی حالت میں سترہ دن لڑا کیا اوس کے بہادر ساتھی ایک ایک کرکے قتل ہوگئے اور اس کے ساتھ صرف پچیس عرب بہادر رہے۔ اس مدت میں طرفین کے بے شمار آدمی کھیت رہے اور ہر روز حامد خاں کو اپنے بھتیجے کی طرف سے کمک پہنچتی رہی حتیٰ کہ اس کی جمعیت ایک لاکھ ساٹھ ہزار جنگجو مرہٹوں پر مشتمل ہوگئی جو اٹھارویں روز تمام و کمال رستم پر حملہ آور ہوئی اور اوسکو قتل کر دیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رستم بڑا مجمع کمالات عالی ہمت اور غیور امیر تھا مگر دنیا نے کس کے ساتھ وفا کی ہے جو اس کے ساتھ کرتی پھر حامد خاں میدان جیت کر خوش خوش احمد آباد واپس ہوا۔ ان تینوں بے نظیر بھائیوں کو قتل کرکے بادشاہ (محمد شاہ) سے سرکشی اختیار کی اور رعایا پر بے طرح ظلم شروع کر دیا۔ اس نے شیخ احمد بن علان سے وعدہ کیا تھا کہ اوس کو بہت کچھ دے دلا کر بادشاہ کی طرف روانہ کر دے گا۔ مگر پھر وعدہ وفا نہ کیا بلکہ الٹا شیخ کے وہ تمام گھوڑے جو مبارک بن احمد شریف مکہ نے شاہ دہلی کے لئے بھیجے تھے لوٹ لئے۔ انہی دنوں قمر الدین خاں وزیر شاہی کی پھوپھی بارادۂ حج بیت اللہ دہلی سے احمد آباد پہنچی تھیں۔

میں نے جو دیکھا کہ حالت بگڑ رہی ہے اور غنیم اور حامد خاں کے ہاتھوں ہر طرف ابتری اور بربادی پھا رہی ہے اور جی ان پریشان کن حالات سے اکتا گیا ہے تو اللہ کے بھروسے وزیر کی پھوپھی کی معیت میں بندرگاہ سورت کی طرف روانہ ہوگیا۔ ۱۵ رمضان ۱۱۳۸ھ کو وزیر کی پھوپھی کے ہمراہ چل کر بانکانیر پہنچے۔ حامد خاں نے غنیم کے پچاس سوار ساتھ کر دیئے تھے تاکہ بدذات کولیوں کی دراز دستیوں سے بچاؤ ہو سکے۔ راستہ میں کولیوں کے ہاتھوں ہمیں کافی اذیتیں پہنچیں تا آنکہ ۲۸ رمضان المبارک کو بعون ایزدی سورت پہنچ گئے

پیر یکم جمادی الاخری ۱۱۳۹ھ کو ملا محمد علی بن عبدالحی بن ملا عبدالغفور کے فخر اسلام نامی جہاز میں سوار ہوئے جس کی تاریخ میں نے اس طرح کہی ہے

فخذ تاریخ فخر الاسلام هنیا — تماماً فی المعانی فیہ لطف

فخر اسلام کی تاریخ لکھئے خوشی کے ساتھ — جس کے معنی میں پوری لطافت ہے

فبسم اللہ مجریہا دواما   وبسم اللہ مرساها یحف

اللہ ہی کے نام پر یہ ہمیشہ چلے   اور اوسی کے نام سے اسکا بندرگاہ کو ٹہرنا

میرا سفر بندرگاہ سورت سے رئیس عبدالرحمٰن بن عبدالقادر ناخدا اور سید حسین بن سید محمد رفیع کی معیت میں ہوا۔ انھوں نے دوستی کا حق ادا کیا اور ان کی ہمراہی بندرگاہ مخا تک رہی۔ سو ہم ہندوستان کے وسیع سمندر میں چلتے رہے تا آنکہ اسی مہینہ کی ۱۸ تاریخ کی صبح کو خیریت سے عدن پہنچے۔

(مترجم۔ سفرنامۂ گجرات یہاں ختم کیا جاتا ہے باقی سفرنامۂ یمن وغیرہ ہمیں مطلوب نہیں)

اگست سنہ ۱۹۲۶ء د ـــــــ ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

راجکوٹ و علیگڑھ۔

عبدالعزیز المیمنی

* پہلی ہوا۔ دستے تاریخ ۸، ۹، ۱۰ غلطی ہے۔ معلوم نہیں مصنف نے کس طرح حساب کیا ہے۔

نفسیات اور اکبر

(از جناب عابد علی صاحب عابد بی۔ اے۔ ال ال۔ بی)

اکبر دورِ زوال کا شاعر ہے۔ لیکن اور انحطاط آفریں دور کی وہ تمام خصوصیات جو ہر ایک فرد میں پائی جاتی ہیں اکبر میں نہیں۔ اس روشن مگر حیرت انگیز حقیقت نفس الامری کو ذہن نشین کرنے کے لئے چند ایک باتوں کو تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہوگا۔ یہ نفسیات کا ایک لطیف نکتہ ہے۔ کہ ہر ایک قوم کے مدارج ارتقا میں تہذیب و تمدن شاعری کے دوش بدوش راہ ترقی پر گامزن ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا عروج شاعری میں سطوت اور بلند آہنگی پیدا کر دیتا ہے شاعری عمل کی شاعری ہو جاتی ہے اسی طرح انحطاط و زوال کے اثرات شاعری کے زاویہ نگاہ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہی شاعری دل کے تمام جذبات کو مردہ کر دیتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ دورِ زوال کی افسردگی جذبات بہترین انفرادی شاعری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت شاعر واردات قلب کو بیان کرتا ہے۔ اور دور نشاط کی شاعری نیز پر سطوت اور باشوکت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں وہ انفرادی عنصر نہیں ہوتا جسے سوز و گداز کا خطاب دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ نکتہ قابل لحاظ ہے۔ کہ قانون ارتقا کے ہمہ گیر اثر کے تحت میں زوال پذیری ایک حد تک متعین ہے اس کے بعد دورِ زوال کے تمام جذبات پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن حیات جدید کی یہ سرعت اور شدت بعض دفعہ قوم کو شاہراہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ اس وقت جو شاعر اعتدال سے تجاوز نہ کرے اور حیات جدید کے تمام پہلوؤں کو نمایاں طور سے ظاہر کر کے ایک خاص کشمکش ایک عظیم جد و جہد کا پیغام دیتا رہے۔ حقیقت میں وہی اصلی شاعر ہے۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن اجتماع کی متحدہ رائے کے اثرات ہر ایک فرد کو جس کی رائے اجتماع سے اختلاف کے باوجود دور اندیشی اور دانشوری پر مبنی ہو جھک جانے پر مجبور کرتے ہیں اس وقت شاعر قائد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک موقع پر ایک قائد اور شاعر کے امتیازی خصائل خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ وہی سطوت و نفوذ ذاتی جس کے بغیر کوئی قائد حقیقی معنی میں قائد نہیں کہلا سکتا شاعر میں بھی موجود ہوتا ہے وہ کبھی کسی متفقہ رائے سے جو مضر ہو اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی ذاتی وجاہت اور خود اعتمادی سے کام لیکر مستقل مزاجی سے اپنے فرض کو ادا کئے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی یہ مسلسل رواداری اجتماع کے قلوب پر اپنا نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور آخر کار ان کی تمام قوت ایک زبردست قوت ارادی کے مطیع ہو جاتی ہے۔ بس انہیں تمام نقوش تاثر کو قبول کرنا اور انہیں فانی شعر

سے ادا کرنا اکبر کا کمال ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ اس ملک کا ادب اس کی معاشرتی۔ تمدنی اور اصلاحی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کلیے کی تصدیق کے لئے آپ کو اکبر سے بہتر کوئی شاعر نہ ملے گا جس انداز سے اس نے قوم کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ دورِ ماضی کے تمام شاعروں میں نایاب ہے۔

یہاں ہمارا مقصد ان شعروں کو نقل کرنا نہیں۔ جن میں قوم کو اُبھارا گیا ہے جہاں اکبر کے دوراندیش دل و دماغ نے اجتماع کی پیروی نہ کرتے ہوئے ایک دوامی جدوجہد جاری رکھی ہے۔ ان کا تفصیلی بیان آپ آئندہ صفحات میں پائینگے یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس دورِ زوال کے تمام انحطاط آفرین خیالات سے اکبر کہاں تک متاثر ہوا؟

بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکبر نے کسی انحطاط آفرین جذبے کی ترجمانی نہیں کی۔ مگر اس کے کلیات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان اثرات سے آزاد نہیں رہا۔ لیکن اکبر کا حقیقی کمال یہ ہے۔ کہ جذبات کے اس تاریک پہلو کو اس نے اپنی جدت سے روشن کر دکھایا ہے۔ نفس کی جتنی کیفیتیں ہیں ان کا لازمی اصول یہ ہے کہ ارتقائے جذبات کی ہر ایک ترتیب کے معکوس عمل سے متاثر ہوتی ہیں یعنی جو جذبات نفس انسانی میں سب سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں وہ سب سے اخیر میں انحطاط قبول کرتے ہیں۔ اور جو جذبات سب سے بعد میں ظاہر ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے سوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے زیرِ اثر حیات کے ہر ایک پہلو پر افسردگی چھائی رہتی ہے۔ اور صرف کشاکش عمل ہی ایک ایسی شے ہے جو انسانی دل و دماغ کو ان روح فرسا خیالات سے چھٹکارا دلا سکے۔ اکبر عمل کی کشاکش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مغربی تہذیب سے بچ کر۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کسی حد تک ناکام کوشش افسردہ ہو جاتی ہیں۔ یہ افسردگی انحطاط جذبات کا پہلا زینہ ہے۔ مگر خیال رکھنا چاہئے۔ کہ اکبر کی افسردگی وہ درماندگی کی کیفیت میں جو بار دار منجمد ہوتی ہے۔ اور جسے کوئی ٹھوکر بیدار نہیں کر سکتی۔ اس کی افسردگی لطیف رقیق اور رنگین ہے اور چونکہ اکبر کی افتادِ طبیعت صوفیانہ تھی۔ اس افسردگی میں ایک تسلیم و رضا کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ جو روح رواں کی طرح مصرعوں کے ہر لفظ میں جاری و ساری ہے۔ کس پر درد انداز سے کہتا ہے ؎

بلبلِ دل کے لئے ہر داغ گلشن ہے یہاں ہر نفس راہ جنوں میں گل بدامن ہے یہاں
ہے تجلی نورِ حسرت کی ہر آہِ شعلہ بار ہر تپش سینے کی برق طور ایمن ہے یہاں
شعلۂ غم سے دلِ سوزاں میں اک جان آگئی روح پرور اختلاطِ برق و خرمن ہے یہاں
شعلۂ ہائے غم سے ہے نشو و نمائے باغِ دل دامن ابر کرم ہر برق خرمن ہے یہاں

محبت ہمیشہ سے ہر ملک کے شاعروں کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ مگر کسی شخص نے اب تک یہ کوشش نہیں کی۔ کہ محبت کے وہ تمام پہلو بھی دکھائے جائیں۔ جن میں گو ابتذال تو ہے۔ مگر جن پر حقیقت میں محبت کا جذبہ اساسی طور پر مبنی ہے۔ ہر ایک شاعر نے محبت کو روحانی فرض کرتے ہوئے اس کو سراہا ہے۔ اس کی رنگینیاں اس کی خواہشات کی فراوانی۔ پاکیزگی اور تقدس کی غرض سے لیکر تعریف کی ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے۔ کہ اس پرسوز جذبے سے کسی بنی نوع انسانی کا دل خالی نہیں۔ اس کی کیفیات اس قدر لطیف ہیں کہ پانی کے بلبلوں کی طرح ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ مگر نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے محبت کے جذبے کی تحلیل شاعروں کی تمام تعریفوں سے مختلف ہے۔

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے حکما کے دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ قانون فطرت نے کسی شخص کو واحد نہیں پیدا کیا۔ بلکہ ہر ایک شخص کا ..... ایک روحانی عکس یا ثنیٰ بھی پیدا کیا ہے جس کے ساتھ اس کو بیحد مجالست اور دلبستگی ہوتی ہے" لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ دونوں ایک جگہ نہیں پائے جاتے۔ اگر کوئی انگلستان ہے تو دوسرا امریکہ۔ اس لئے عام طور پر معاشقے کی نشوونما مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسرے گروہ کا ادعا ہے کہ ہر ایک مرد و عورت میں بشرطیکہ ان کی صحت میں کسی قسم کا فتور یا نقص نہ ہو معاشقے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور جہاں بھی کوئی باصحت جوان اور خوبصورت عورت باہم مل کر رہیں گے محبت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ جب تک اجتماع کی بندشیں انہیں قیود رسمی سے مجبور رکھتی ہیں۔ بے شک یہ چنگاری سلگتی رہتی ہے۔ مگر جہاں انہیں کوئی ایسا موقع ملا کہ اجتماع نے ان دونوں کو ذرا سی بھی آزادی بخشی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اسکے بعد ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی طاقت ان دونوں کو ملنے سے باز رکھ سکے۔ یہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے اور تو راث عمرانی میں شامل۔ ان باتوں سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ جوان مرد اور عورت کے لئے اپنی آرزوؤں کو کسی خاص مرکز تک محدود رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیالات خود اختیاری طور سے معاشقے کی طرف راغب ہوں گے۔ ہاں یہی رغبت جب کسی خاص محبوب سے مختص ہو جاتی ہے۔ اور مجالست و دلبستگی ایک گہرے رشتہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو اس کیفیت کو عشق کہتے ہیں۔ اس کیفیت کے بعد اگر محبوب نہ ملے تو سخت اضطراب اور کاہش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب تک محبوب سے ملاقات حاصل نہ ہو چین نہیں آتا۔ مگر یہ تمام کیفیتیں صرف عشق پر ہی منحصر ہیں۔ کسی جوان آدمی یا عورت کو ایک عرصے تک اپنی جنس مقابل سے ناآشنا رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے نفس میں بھی وہی اضطراب اور کاہش پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ محبت کی تعریفیں تو بہت سی ہو چکی ہیں جن میں سے شیفتہ کا یہ شعر مقبول خاص و عام ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

مگر ایسی کوئی تعریف نہ کی گئی تھی۔ جس سے محبت کا اساسی جذبہ بھی ظاہر ہو۔ اکبر کی ایک تعریف سُننے کے قابل ہے۔ کہتا ہے ؎

کیا بلائے جاں جوانی میں طبیعت ہو گئی
جس حسیں سے مل گئی آنکھیں محبت ہو گئی

محبت کی یہ تمام کیفیات بیان کرتے وقت غالباً ہوس کے مظاہر کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ مظاہر محبت کے لوازمات ہیں اور اس کے بغیر محبت میں وہ شدت اور حدت نہیں پیدا ہوتی۔ جو محبت کی جان ہے۔ پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ محبت کے ساتھ ہی ہوس کے مظاہر کیوں لذیذ اور دل آویز معلوم ہوتے ہیں۔

اس کا جواب دینے کے لئے غالباً نفسیات کا ایک نکتہ کافی ہو۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز نہایت محبوب ہو اس کے ذرائع حصول بھی لذیذ اور دل آویز ہو جاتے ہیں۔ اور انسان ان کو بھی اسی طرح محبوب سمجھنے لگ جاتا ہے جس طرح شئے موصوف کو۔ اسکی ایک ادنی سی مثال دولت کی ہر دلعزیزی ہوگی۔ بہت کم اشخاص ایسے ہونگے جن کے ذہن میں دولت کی عشرت کا تصور ان محبوب اشیاء کی وجہ سے پیدا ہو۔ جو دولت کے بدلے خریدی جاسکتی ہے۔ دراصل دولت کی محبوبیت کی وجہ یہی تھی۔ کہ اس کے بدلے زندگی کی تمام عشرتیں خریدی جاسکتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہی حصول عشرت کا ذریعہ خود بھی ایک احساس عشرت ایک کیفیت انبساط کا باعث ہونے لگا۔ مگر اب تک اس کی یہی وجہ تھی کہ دولت کے حصول کیساتھ ہی عشرت کے حصول کا خیال آتا تھا مگر بعد میں دولت بذات خود عزیز ہوگئی۔ اور اب ہم اپنے ذہن میں دولت کو بھی معبود و مقصود سمجھ کر اس کے ذرائع حصول کو محبوب تصور کرنے لگے ہیں۔ اور دولت ایک انفرادی خوشی قرار پاگئی۔

اسی طرح شروع میں تو ہوس کے مناظر و مظاہر محض اسلئے عزیز تصور کئے جاتے ہوں گے۔ کہ وہ محبت کے لوازمات ہیں۔ مگر بعد ازیں رفتہ رفتہ انہوں نے بھی ایک مستقل انفرادی حیثیت اختیار کر لی۔ اور وہ بھی عشرت کا ایک امتیازی قرار دیئے جانے لگے۔ اگر یہاں تک بات ختم ہو جاتی تو خیریت تھی مگر بعض شاعروں نے ہوس کے مناظر و مظاہر کو محبت کی پاکیزگی اور تقدس سے نا آشنا کر لیا۔ اور صرف انہیں کے مختلف پہلوؤں کو لے کر اپنے شعروں میں ادا کرنے لگے۔ ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ نفس انسانی پر اگر اپنے اختیار سے بھی کسی جذبے کے مظاہر جسمانی طاری کر لئے جائیں تو رفتہ وہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کئی شاعروں نے محض ہوس کے مناظر و مظاہر سے محبت کے مشکل الحصول جذبے کو تتبع کرنا چاہا لیکن وہ بہت دور نکل گئے۔ انہیں میں کا ایک کا مشہور شعر ہے۔

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اڑا رہی ہے صبا
جو وہ چھپاتے ہیں سینہ کمر نہیں چھپتی

اکبر نے بھی انہیں مناظر کو بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی قوت احساس۔ مدارج ارتقا کے زیر اثر تمدن جدیدہ کے
ابل ہو گئی۔ اسی لئے اس کے جذبات ہوس میں بھی شستگی ہے۔ اور کہیں ذرہ برابر بھی سوقیانہ رنگ نظر نہیں آتا۔
ں البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اخلاقیات کو ان مناظر سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ بھی ایک منضبط اصول ہے۔ جسقدر
ال انسانی حیات میں براہ راست ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ان کو سوسائٹی نگاہ اکراہ سے دیکھتی ہے۔ کیونکہ محبت
ا جس کا انتہائی معراج اتحاد جسمی ہے۔ توارث عمرانی کا ایک جزو ہے اور صیانت حیات کا ایک اہم عنصر۔ اسلئے
ں کے تمام مناظر میں بھی بلند آہنگی کا پایا جانا سوسائٹی کے نزدیک برا ہے۔

لیکن اکبر ان خطرناک شاہراہوں سے بچکر چلتا ہے۔ وہ بہت کھلتا ہے تو ان شعروں میں۔ کہ ؎

امید بوسہ و ابرو و زلف و چشم کسے
مرے نصیب کہاں اور یہ بلائیں کہاں

ہوائے دے بھی ہے عنبر افشاں۔ عروج بھی ہے مہ جبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت۔ محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

کچھ انتظار ہیں موقع کے طول ہجر ہوا
کچھ ابتدائے محبت میں ہاں نہیں بھی ہوئی

یہ عمر یہ حسن یہ ناز و ادا اس پر یہ سنگار اللہ اللہ
مستی نگہ آف اف کی جگہ" سینے کا ابھار اللہ اللہ
گالوں میں ترے کندن کی دمک بالوں میں ترے عنبر کی مہک
سینے پہ جواہر کی یہ چمک اور اس پہ یہ ہار اللہ اللہ
بکھری ہوئی زلفیں دام بلا یہ جنبش مژگاں تیر قضا
تقویٰ کی عدو ہے لغزش پا یہ رنگ خمار اللہ اللہ
خود خالق قدرت نازاں ہے۔ ہر چشم تماشا حیراں ہے

اس صفحۂ عنصر خاکی پہ یہ نقش و نگار اللہ اللہ

ہمیں ہنستے تھے زیادہ گناہ اکبر پر
ہمیں کو اب یہ ہے حسرت ہمیں نے کیوں نہ کیا

آخری شعر ہوس کی ایک عجیب کیفیت کا حامل ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی خاص وجہ سے گناہ کا اقدام نہیں کرسکتا وہ اپنے دل کی تسلی کے لئے تاویلیں گھڑ لیتا ہے۔ اور بادی النظر میں گنہگار کی لغزشوں پر ہنستا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسکی طبیعت بار ریا پارسائی سے اکتا کر کوئی تنوع چاہتی ہے مگر اس وقت وہ حدت و حرارت جو محبت کی جان باقی نہیں رہتی۔ یا اس کی کمزور فطرت ہر ایک گناہ کے اقدام سے ڈرتی ہے۔ اسی کیفیت کو شبلی نے بھی ایسے ہی مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل گشتم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

احساس ندامت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے غالباً ظرافت سے بہتر کوئی حربہ نہیں۔ اور اکبر کی افتاد طبیعت ستم ظریفانہ ہے۔ وہ دوسروں کی بیوقوفی پر ہنستا ہے گو ضروری ہے کہ اکبر کی ہنسی کو سمجھنے کے لئے اس بات کی کوشش کی جائے کہ خود ہنسی کا راز کیا شئے ہے۔ معمول ہے کہ ہر ایک قسم کی بدہیئتی کو دیکھ کر ہمیں خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے کوئی شخص خلاف معمول لمبا ہو یا موٹا ہو تو اس کی دیکھ کر دل میں خواہ مخواہ ایک گدگدی سی ہوتی ہے چنانچہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے۔ کہ یہ اس زمانۂ جہالت کی یادگار ہے۔ جب انسان بالکل وحشی تھا۔ اور جنگلوں اور غاروں میں رہا کرتا تھا۔ اندنوں وہ جنگجو اور ظالم تھا اور اپنے دشمنوں کو کسی خطرناک حربے سے قتل کرکے ان کی بدصورتی اور بدہیئتی پر ہنستا اس کا دستور قانون التزام عواید مفیدہ کے زیر اثر انسان کی ہر ایک حرکت جو اس سے ظہور میں آیا کرتی تھی۔ جو کسی تکلیف کو رفع کرنے میں معاون تھی۔ نظام عصبی میں اس طرح جاگزیں ہوگئی۔ کہ اب ایتلاف افکار سے فوراً ہمارا نفس اپنے اوپر وہ مظاہر طاری کرلیتا ہے۔ جو زمانہ گذشتہ میں کیا کرتا تھا۔

یہ تو ہوئی ہنسی کی حقیقت اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر انسانی افعال و اعمال کی حماقتوں پر کسی حیثیت سے نظر ڈال کر

ہنساتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی بدعادتیں چھڑوانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مضحکہ کیا جائے تاکہ وہ بار بار خیال کرتا رہے کہ مجمع اس بدعادت سے ندامت حاصل ہوئی ہے۔ اکبر نے اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ظرافت کا نمایاں پہلو اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کی ظرافت بالکل سطحی ہے۔ اس معانی بین السطور میں ہمدردی کا وہی جذبہ متحرک ہے جو ہر ایک بالغ نظر انسان کے دل میں ہونا چاہیے۔

جدید تہذیب کے تمام اثرات کو اپنی قوم کے لئے مضر سمجھ کر اس نے شروع سے ہی ان تمام رسوم کی مخالفت شروع کی تھی۔ جو شرقی تمدن کے پرانے اصولوں سے متضاد تھے۔ اس کی قدامت پرستی کبھی اس بات کی روادار نہ ہو سکتی تھی کہ وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے دوسری شعلہ بہ پیراہن اقوام بدنام ہیں۔ ہندوستانیوں میں رائج ہو جائیں۔ اس کا صدق دل سے یہی خیال تھا کہ مغربی تمدن سے وہیں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک وہ مشرق کی تہذیب کو فنا نہ کر دے۔ جدید رنگ تعلیم سے جو نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں اکبر ان کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ مغربی تعلیم کی اندھا دھند تقلید۔ قوم کے نونہالوں کو فلسفہ اور الحاد کے خطرناک مسائل سے آشنا تو کر دے گی۔ لیکن وہ نتائج جو اس تعلیم و تربیت سے پیدا ہو جانے ضروری ہیں ان کا علاج مغربی تعلیم کے بہترین ماہروں کے ہاں بھی نہیں۔ کیونکہ جن جذبات کی نشو و نما مشرقی فضا میں ہو رہی تھی ان کے لئے عمل کا میدان کوئی بھی نہ تھا مغرب میں تو مغربی جذبات پھل پھول بھی سکتے ہیں مگر مشرق ابھی ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مغرب کی آزادیٔ خیال اور بے نیازی طریق۔ مشرق کی پابند اور اسیر کیفیت میں حاصل نہیں ہو سکتی علیگڈھ کالج کی نسبت انہیں شبہات کو بیان کرتے ہوئے اپنی معمولی ظرافت سے کام لیکر کہتا ہے ؎

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیرزادے شریف زادے
لطیف و خوش وضع چست و چالاک صاف و پاکیزہ شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں انکے ہیں نیک ارادے
کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے
ہر اک ہے انہیں کا بیشک ایسا کہ آپ ایسی چاہتے ہیں جیسا
دکھائے محفل میں قدر عنا جو آپ آئیں تو سر جھکا دے

فقیر مانگے تو صاف کہہ دیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا
قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے
بتوں سے انکو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھوکے ہیں دل کے ساد ے
نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی ہے
الکٹرک لائٹ اسکو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و دردمندی
یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے ہمیں جو تم دو تمہیں خدا دے
انہیں اسی بات پر یقیں ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان کالج کے سب مکیں ہیں ابھی انہیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضع ملت نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

مغربی تعلیم نے پردے کی نسبت بھی لوگوں کے دلوں کو متاثر کرنا چاہا تھا۔ مگر اکبر نے اس کی بہت شد و مد سے
لعنت کی۔ اور اگرچہ ہر طرف سے اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑیں ہوئیں مگر وہ اپنی دھن کا پکا ہی کہتا رہا کہ ابھی
ت نہیں آیا۔ کہ عورتوں کو پردے کی نسبت اتنی آزادی دی جائے۔ تعلیم نسواں کی نسبت وہ خوشگوار خیالات کہتا
ا مگر اس کے ساتھ جو پردے کے اٹھنے کی ضد تھی۔ وہ اس کو خطرناک محسوس ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی

ظرافت کے بے پناہ تیر دلوں کو چھیدڈالتے تھے۔ کیونکہ خود اسکے کئی شعر شاہد ہیں کہ لوگ اس کے اس طرز عمل سے نادم ہو کر اس سے بہت بُرا سلوک کرتے تھے ایک شعر ہے کہ ؎

حمایت پردے کی بینے تو کی تھی خوش مزاجی سے
مجھے کہلوا رہے گالیاں وہ اپنی باجی سے

لیکن یہاں بھی اس کی طبعی ظرافت اس کو کبھی نہیں چھوڑتی۔ وہ اجتماع کو متاثر بھی کرنا چاہتا ہے تو اسی طرح ان کے اعمال و افعال پر ہنس ہنس کر ؎

جو مُنہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپینگی حضرت حوّا کی بیٹیاں کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں
سکنڈ و فسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کبتک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئیں گی چلمن کی تیلیاں کبتک
یہ مانا حضرتِ اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور اُن کی رباعیاں کبتک

مغربی تمدن نے جس طرح عوام کو متاثر کیا ہے اور جس طرح ان کے تمام جذبات کو محکوم کر لیا ہے۔ اس کے نتائج یہ ہوئے۔ کہ وہ روایات جن سے مشرقی تمدن کا دم خم تھا۔ سب مٹ گئیں مشرقی تمدن کا نام بنا دسفا کی جس سے ایک کا نقصان تو ہزار کا نفع ہوتا تھا۔ خود قوم کے دلوں میں بری گِنی جانے لگی۔ اور انگریزی خواں لوگوں کے دل جو محض مغربی خیالات کے پروردہ تھے۔ حقیقت میں یہ خیال کرنے لگے۔ اسلام بزور شمشیر ہی پھیلا تھا۔ اس تمام اضطراب کی وجہ اور اس کے نتائج کو نمایاں کرنے کے لئے اکبر نے برقِ کلیسا لکھی طوالت کے خوف سے ہم ان کے کئی شعر حذف کر کے چند ایک شعر نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ نظم مقبول عام ہو چکی ہے۔

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ،

دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
جوہرِ تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار
اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولے کہ تو پھر مجھکو بھی راضی سمجھو

محبت کے تمام لوازمات میں سے رشک و رقابت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی مخلوط حیثیتوں نے شاعروں کو ہمیشہ ایک گورکھ دھندے میں مبتلا رکھا ہے۔ ماہرین نفسیات اس کی تحلیل یوں کرتے ہیں کہ رشک ہمیشہ دو انفرادی جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ رنج اور خوف۔ جب کسی محبوب ملکیت کی نسبت یہ خوف پیدا ہونے لگتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے قبضے میں چلی جائیگی تو جس وقت خوف کوئی مستقل اور معروف شکل اختیار کرلے رشک کے جذبے کی تخلیق ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی نسبت ذرا سا رقابت کا شبہ بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ محبت جس قدر مضطرب اور دیوانہ وار ہوتی چلی جائیگی۔ اسی مقدار سے رشک کے مدارج احساس بھی بڑھتے چلے جائیں گے۔ جہاں محبت زیادہ ہوگی وہیں شکایت اور اسی قسم کے فرعی جذبات بھی ہمرکاب ہونگے۔ صرف یہی حیات کی نزاکت و لطافت

اس حقیقت ثابتہ کی مظہر ہوتی ہے کہ رشک کرنے والے شخص کے دل میں محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ پھر رشک کچھ انہیں چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ جو محبوب کی جدائی پر اختیار رکھتی ہوں۔ بلکہ محض محبوب کی جدائی کے خیال کے ساتھ اگر کسی اور شخص کا بھی خیال آجائے جس کی نسبت یہ شبہ ہو کہ شاید وہ فرقت کا باعث ہوگا تو خواہ مخواہ رشک کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ گو عام طور پر یہ حالت سوسائٹی کے اسفل ترین گروہ کی ہو جاتی ہے ورنہ مہذب افراد ہیں جن میں شاعر اپنی کیفیات کی لطافت و نفاست کی وجہ سے ممتاز ترین شخصیت ہے۔ اس قسم کے رشک سے گریز کرتے ہیں جس میں ابتذال کا شائبہ ہو۔ کیونکہ محبوب کی ہر ایک بات پر شبہ کرنا اور بے سبب اس شبے کی سست بنیاد پر رشک و رقابت کی ایک سر بہ فلک دیوار کھڑی کر دینا مذاق سلیم سے دور۔ اور ابتذال فطرت کی نشانی ہے۔ لیکن یہ کلیہ شاعروں پر صادق نہیں آتا۔ انہیں دنیا کی ہر ایک چیز سے عداوت ہے۔ ہوا محبوب کی زلفوں کو بکھرا کر ان سے اٹھکیلیاں کرتی ہے سورج کی شعاعیں تار نقاب بن کر روئے صبیح کے بوسے لیتی ہیں معنبر و معطر لباس ہمیشہ جسم نازنین کو چھوتا رہتا ہے۔ خاک راہ ہر وقت قدمبوسی کرتی رہتی ہے۔ گلہائے چمن کو محبوب کے سیمین قدموں سے پامال ہونے کا فخر حاصل ہے مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ ان تمام باتوں سے رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ جذبہ رشک کا اہم تر عنصر یعنی انکے محبوب کی جدائی کا باعث ان میں کوئی بھی نہیں اور اس عنصر کے بغیر یہ جذبہ حقیقت میں تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ شاعروں کا مبالغہ آفرینی اور قوت احساس کی رواداری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی کہنا پڑتا ہے کہ سوائے چند شاعروں کے جن کی مثال النادر کالمعدوم کی سی ہے۔ ہر ایک نغز گو نے اسی طرح کی بے حقیقت چیزوں کی وجہ سے رشک کے صدمے اٹھائے ہیں۔ اسی کے معاصرین کا تو کیا ذکر۔ کہ وہ اس کی شان کے آگے کچھ وقعت ہی نہیں رکھتے۔ خود غالب نے فضائے جذبات پر اتنی قدرت رکھتا۔ جگہ جگہ اس قسم کے جذبات ظاہر کئے ہیں مثلاً

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

آتا ہے مرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اسکے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کی ایک تار

ڈرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو،

اس جذبے کی تحلیل کی بہترین مثالیں آپ کو میر کے یہاں ملیں گی اور پھر یہ بات بھی ہے کہ کونسا ایسا جذبہ ہے جس کو میر نے بہترین طریق سے ادا نہ کردیا ہو۔ لیکن اکبر نے بھی جس حسن بیان و اسلوب سے اس جذبے کی تشریح کی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں انہیں ہر جگہ اس بات کا خیال رہے کہ رشک کے لئے کافی سے زیادہ وجوہات موجود ہوں۔ تاکہ سامع کے ذہن پر وہی نقوش تاثر ثبت ہوجائیں جن کی وہ ترجمانی کرنا چاہتا ہے چند ایک شعر سُنئے۔

وہی میں ہوں کہ غیروں کو وہاں آنے نہ دیتا تھا
وہی میں ہوں کہ پھروں منتیں کرتا ہوں دربان کی

رشک آتا ہے جو تکئے پہ وہ سر رکھتے ہیں
صاحب حسن نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا
مجھ سے کبیدہ ہو کے کہا پان، لیجئے

وہ جانتے ہیں غیر مرے گھر میں ہے مہمان
آئیں گے تو مجھ پر کوئی احسان نہ کریں گے

میں کیا ہوں خوش اگر ان کو رہی نہ الفت غیر
ملیں گے اس سے محبت اگر نہیں بھی ہی

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ ہیسہ کھلائے۔ پیام لائی نہ ہو کہیں کا

اب میں اس مضمون کو اکبر کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ جن سے ان کے اخلاقیات کے نقطۂ نگاہ کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا۔

جو اپنی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں،
نفس کی موج کو موجِ لب دریا سمجھتے ہیں!
گواہی دیں گے روزِ حشر یہ سارے گناہوں کی
سمجھتا میں نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں
شریک حال دنیا میں نظر آتا نہیں کوئی
فقط اک بے کسی ہے جسکو ہم اپنا سمجھتے ہیں
جو ہیں اہل بصیرت اس تماشا گاہ ہستی میں
طلسم زندگی کو کھیل لڑکوں کا سمجھتے ہیں،

عابد

ادبیات

چلمن کی جھلک

(از جناب ابوالجمال قاضی امانت علی صاحب تسکین ٹانوی)

چلمن کی ایک خفیف جھلک، اللہ جانے، کسی آنکھوں والے کے لئے تڑپ کا کیونکر ایک عظیم الشان حادثہ پیدا کردیتی ہے....؟ مابعدُ باد، کچھ بھی نہیں رہتا۔ ہاں یاد کا ایک مکمل نقشہ قیامت تک ہاں باقی رہجاتا ہے ایک زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اُسی گذشتہ واقعہ کے دوبارہ دیکھنے کو آنکھیں پھر کچھ ثانیہ بھر کے لئے وہاں کُھب جاتی ہیں۔ یہ ایک حس ہوا کرتی ہے مگر دیکھنے والا تو ہوتا ہے اکثر معصوم..........!

وہ سمجھتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ عالمِ متانت کے عہد شباب کی ایک ایک منزل میں قیامت تک کے نقشے پنہاں ہوتے ہیں جو ظاہر و باطن دونوں صورتوں میں ایک خوشگوار لذت سے ہرگز کم نہیں۔ یوں تو کہنے کو تو ایک دیکھنا ہوتا ہے مگر اللہ.......! یہ دیکھنا!! کسی آنکھوں والے کو نصیب ہو کہ سینہ میں ایک دل ہوتا ہے اور ہوتا رہتا ہو قیامت تک ذبح........!

دل میں کسی آن دیکھی صورت کا میٹھا میٹھا درد اور اُس درد میں میٹھی میٹھی لذتیں اُس کی زندگی بھر کو دنیادی تعلقات سے یکسو کرنے کے لئے اسباب بن جاتی ہیں۔ یہ ایک مرض ہوتا ہے مگر مریض کا رتبہ حاصل کرنے کے بعد وہ جب یہ معلوم کرتا ہے کہ اُس کا مرض کبھی بھی تشخیص نہیں ہوسکتا تو وہ ایک غائبانہ درد ڈھونڈتا ہے۔ وہ درد ایک حقیقی درد بنجاتا ہے اور اس کی کہنہ مگر اب تلخ لذتیں ہزاروں مشکلات کی منازل طے کرنے کے بعد اب اُسے وہاں پہنچادیتی ہیں جہاں خود اُسے اپنی ایک ایک حرکت میں ہزار گویا لاکھ چلمن کی جھلک کا لطف حاصل ہوتا ہے جس پر وہ پیار سے فنا ہونے کے بعد ابدی زندگی حاصل کر بیٹھتا ہے۔ اس دنیا کے بسنے والے اب کسے خدا بولتے ہیں۔

بلبل و قمری

عالم میں ایک باغ تھا بے مثل لاجواب — کرتا تھا حُسن باغ جہاں جس سے اکتساب
گل جس کے عطر بیز تھے گل جس کی مشک بو

اک گوشہ میں تھے بلبل و قمری کے آشیاں — ہوتی تھیں شاخ گل پہ یہ جب دونوں نغمہ خواں
بادِ نسیم رقص دکھاتی تھی چار سو

قمری نے عندلیب سے اک دن کیا خطاب — دلدادہ سرو کی ہوں میں تو عاشق گلاب
طالب تو شاخ گل کی میں جویائے آب جو

پھولوں سے اُنس تجھکو نہ زنہار چاہیئے — گردن میں تیری رشتہ زنار چاہیئے
گر مجھ سے رسم و راہ کی ہے تجھ کو جستجو

سُنکر کلام قمری کا بلبل ہوئی ملول — کہنے لگی یہ شرط میں کیونکر کروں قبول
فطرت کو تیری کیسے بناؤں میں اپنی خو

قمری نے عندلیب کو پھر یہ دیا جواب — ہوگا نہ اتحاد ہمارا یہ کامیاب
سنتی ہوں تیری نسل ہے دنیا میں جنگجو

پھر دونوں صحن باغ میں جنگ آزما ہوئیں — وقف جفا ہوئیں، ہدف ابتلا ہوئیں
پھولوں کی آنکھ سے بھی ٹپکنے لگا لہو

دوش صبا پہ اُڑنے لگے تار آشیاں — فریاد کر رہا تھا ہر اک مرغ گلستاں
کیا خاک میں ملی ہے گلستاں کی آبرو

صیاد تھا کشادہ گلستاں میں جسکا دام — جو کر رہا تھا ان کی اسیری کے اہتمام
بر آئی اس کے دیدۂ حسرت کی آرزو

مرغانِ نغمہ سنج قفس میں ہوئے اسیر — ویراں ہوا وہ گلشن بے مثل و بے نظیر
بادِ خزاں اُڑانے لگی خاک چار سو

محمود (اسرائیلی)

جلوۂ وحدت

حجابِ چشمِ عالم ہے اگر تم کو عیاں ہو کر
سما جاؤ مرے دل میں مرا رازِ نہاں ہو کر

تلاشِ یار میں برسوں پھرے وہم و گماں ہو کر
نشاں اُس بے نشاں کا ہم نے پایا بے نشاں ہو کر

جدہر دیکھو تمہارے ہی تمہارے سارے جلوے ہیں
چھپو گے کس طرف آرائشِ بزمِ جہاں ہو کر

حجابِ روئے روشن پردہ دارِ دردِ الفت ہے
کہ یادِ حسن بھی دل میں رہی رازِ نہاں ہو کر

تمہیں جلوہ فروزِ دل۔ تمہیں آئینۂ گیتی،
تمہیں تم ہو نظر میں زینتِ کون و مکاں ہو کر

دو عالم میں وہی ہے اک تجلی حسنِ پنہاں کی
بہت دیکھا بہت گذرے یہاں ہو کر وہاں ہو کر

تمہارے ہی کرشمے ہیں یہ ہست و بود کے جلوے
ازل سے تا ابد ہو تم۔ حیاتِ جاوداں ہو کر

کوئی تو ترجمانِ دردِ دل ہو اپنا فرقت میں
مزا ہو رازِ الفت بول اٹھے خود زباں ہو کر

ہمارا انکارِ رازِ حسن و الفت چھپ نہیں سکتا
یہ افسانہ زمانے میں رہیگا چیستاں ہو کر

ہمیں ہم ہوں تمہیں تم ہو دوئی سب دور ہو جائے
رہے گر پردۂ چشمِ تمنا درمیاں ہو کر

دبا جاتا ہوں احسانوں میں فرطِ شرمساری سے
پسِ مردن بھی یاروں پر رہا بارِ گراں ہو کر

پھنسا رکھا ہے دل نے موجِ گردابِ محبت میں
ڈبو دے گی یہ کشتی بحرِ الفت میں رواں ہو کر

ہوئیں جب بند آنکھیں بیخودی شوق میں رونق
اُتر آئے نظر میں ذات کے جلوے عیاں ہو کر

رونق (دہلوی)

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل

روز و شب، ارض و سما، شام و سحر کچھ بھی نہیں
زور و زر، لعل و گہر، مال و منر کچھ بھی نہیں
جلوۂ حسن و پری، حسن بشر کچھ بھی نہیں
یوں تو کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

خافونی ولا تخافوا ھم

تیغ و پیکان و سنان، تیر و تبر کچھ بھی نہیں
دست انساں میں یہاں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں
یہ ہے قالین کا شیر اس سے خطر کچھ بھی نہیں
دیکھنے ہی کا یہ عالم ہے اثر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

من یضلل اللہ فلا ھادی لہ

جب نہ ہو بخت موافق تو ہنر کچھ بھی نہیں
گر نہ ہو جلوۂ خورشید سحر کچھ بھی نہیں
جب بصیرت ہی نہ ہو، نور بصر کچھ بھی نہیں
جب خدا ہی نہ ہو ہادی تو خضر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

ان القوۃ للہ جمیعا

اک سمندر سے ہوئے سینکڑوں چشمے جاری
ایک ہی نور کے انوار ہیں، نوری ناری
ایک ہی جلوہ ہے سب کون و مکاں میں ساری
ہے اسی ایک خدا کے لئے قوت ساری
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

واللہ خلقکم وما تعملون

بو کسی زلف کی ہے نافۂ تاتاری میں
کس کا انداز ہے یہ گل کی طرحداری میں
ہے تجلی کوئی اس روح کی بیداری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

امجد (حیدرآباد)۔

ترجمہ قرآن مجید چینی زبان میں

قرآن کریم صحیفہ آسمانی ہونے کے لحاظ سے ہمارا دین وایمان اور ہمارے پاک و برگزیدہ مذہب اسلام کی اصل الاصول ہے۔ کتاب مقدس کی اس اہمیت کے مقابلہ میں اس کی نشر و اشاعت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ مقابلتہً بائبل کو دیکھیے کہ مشرق و مغرب کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ مسلمانوں کیطرف سے قرآن مجید کا کوئی صحیح، معتبر اور متفق علیہ ترجمہ انگریزی میں ابتک نہیں ہو سکا! دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے جو تراجم پائے جاتے ہیں انہیں "اپنوں" کی بہ نسبت "غیروں" کا حصہ زیادہ ہے اگر یہ ایک طرف "کتاب مبین" کی حقانیت کا ثبوت ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کی کم توجہی اور بے حسی کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ کہ جس کام کو ہمیں کرنا تھا اسکو غیروں نے انجام دیا۔

ایسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے قرآن مجید کے تراجم کی اشد ضرورت ہے چین میں مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ بتلائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے مذہبی حالات جہانتک ہمیں معلوم ہو سکے ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خواص بھی اپنے مذہب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ تا بعوام چہ رسد۔ اس لحاظ سے وہاں مذہبی لٹریچر کی اشاعت ایک شدید اور فوری ضرورت ہے۔ خصوصاً ایک معتبر و مستند ترجمہ قرآن کی۔

حال ہی میں مسٹر وی۔ ایل۔ اے محی الدین نے جو وہاں کے ایک مشہور مسلمان ہیں قرآن مجید کا چینی زبان میں ترجمہ کرانیکی زبردست ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ مولوی محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ پر سے کیا جائیگا۔ اور اس لئے ترجمہ در ترجمہ ہو کر اصل کے مطابق اس کی صحت میں بہت کچھ احتمال رہیگا۔ تاہم اسمیں شک نہیں ہے کہ اگر اس قسم کی کوششیں جاری رہیں تو آیندہ چین کے مسلمانوں میں تحقیق کا مذاق پیدا ہو جائیگا۔ اور وہ عربی زبان کے مطالعہ کیطرف متوجہ ہو کر قرآن مجید کو اصل عربی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بڑی مسرت ہوتی اگر صاحب موصوف نے اصل عربی سے اسکا ترجمہ کرایا ہوتا۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ چینی زبان میں قرآن مجید کی ایک تفسیر عربی متن کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جیساکہ کتاب "پیام امین" میں محمد عبداللہ صاحب مہاس نے بحوالہ "ریویو دی مونڈ سے مسلمان" (ج ۴ صفحہ ۲۰۵) بیان کیا ہے اور اس تفسیر کا نمونہ بھی دیا ہے اگر مترجم اس تفسیر سے افادہ کریں گے۔ تو قرآن مجید کے اصل متن کو سمجھنے میں بہت کچھ آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

غیر صحیح اور مخرب اخلاق کتابیں نذر آتش،

مغرب کے مدعیان علم و دانش اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ مطعون کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ علم اور اہل علم کی سخت مخالفت کی ہے، اور ان کی تصانیف کو نیست و نابود کرنے کے لئے طرح طرح کے جور و ستم روا رکھے ہیں۔ اور کہ علم اور اسلام اضداد کی حیثیت رکھتے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ ان غلط اعتراضات اور نام نہاد الزامات کا جواب عقلی و نقلی حیثیت سے بارہا دیا جا چکا ہے۔ نیز کئی مرتبہ الزامی جواب بھی پیش کر دیا گیا ہے یعنی کہ کلیسائے عیسوی کے ان شدید اور خوفناک مظالم کی کہیں نظیر نہیں ملتی جو اس نے اور اس کے پیرؤں نے علم و حکمت کی مخالفت میں روا رکھے ہیں تاریخیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ "تاریخ اپنے تئیں دہراتی ہے" تو اس شائستگی اور تہذیب کے زمانہ میں بھی اس قسم کی مثالیں زیادہ حیرت اور استعجاب نہیں پیدا کر سکتیں۔ جن میں کی ایک تازہ مثال حال ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

حال ہی میں شکاگو ٹربیون کے نام ایک لاسلکی پیغام وہ عجیب غریب منظر بیان کرتا ہے جبکہ ہرلن (امریکہ) کے فنڈامنٹلسٹ عیسائیوں نے نامور سائنس دان مسٹر ایچ۔ جی ویلس کی کتاب [illegible] اور دیگر کتابوں کو جلا دیا گیا۔ اس بنا پر کہ ہرلن ٹیبرنیکل چرچ کے پاسٹر ریونڈ جے۔ آر بلیک نے ان کے جلانے کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ اور اس مجرمانہ لٹریچر کو جناب ممدوح نے بہ نفس نفیس اپنی مقدس چمٹی سے گھسیٹ کر سلگتی ہوئی آگ میں شعلہ زن ہونے کے لئے جھونک دیا! کیوں؟ محض اسلئے کہ ریونڈ موصوف اپنے پیرؤں کو (جنمیں سے ایک شخص نے بھی کتاب مذکور کو دیکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی تھی) یہ سمجھایا کہ کتاب مذکور سے کتاب پیدائش کے متن کی صریحی تکذیب ہوتی ہے! جس پر اس جماعت کے ہر رکن نے یہ عہد کیا ہے کہ اب سے اگر کتاب مذکور کا کوئی نسخہ ان کے شہر میں آئیگا تو وہ اسکے پڑھنے سے محترز رہیں گے!

نہ صرف کتاب مذکور ہی اس آگ کی نذر کر دی گئی، جو کلیسا کے احاطہ میں روشن کی گئی تھی، بلکہ زین گرے کی کتاب "آخری انسان سے"، "تاش کی ایک گڈی"، اور ایک ہفتہ وار اخبار بھی اس کے شریک حال تھے کیونکہ

ریورنڈ موصوف کی رائے میں زین گرے کی یہ کتاب عام متلاشیانِ حق کے لئے بہت زیادہ "مصالحہ دار" تھی۔ اور تاش نیک آدمیوں کے تنزل و انحطاط کا کارخانہ تھا۔ جس کا مقابل صرف مینوشی اور رندانہ زندگی ہو سکتی ہے۔ اور کہ ہفتہ وار اخبار سے سوائے تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں تھا جو بجائے اس کے خداے عزوجل کی عبادت میں صحیح طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔

دیکھیں ہم مسٹر ویلس اس واقعہ سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں اور ہم یہ سننا چاہتے ہیں کہ وہ یورپ اور امریکہ کی اس نام نہاد "مسیحیت" کی نسبت کیا ارشاد فرماتے ہیں!

لنڈن میں مذہب عیسوی پر مادیت و خود غرضی کا غلبہ

کسی اخبار کے نمائندہ سے بشپ آف لنڈن کی ملاقات کا حال لنڈن میگزین میں شائع ہوا ہے۔ دوران گفتگو میں بشپ موصوف نے فرمایا کہ:۔

"آج کل لنڈن ۱۹۰۱ء کے لنڈن سے بالکل جداگانہ نظر آتا ہے۔ اسوقت جو خیالات لوگوں کے دلوں پر حکمراں تھے اب ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بہ نسبت پیشتر کے مادیت اور مذہب سے بیزاری لوگوں میں بکثرت سائر و دائر ہے مرد یا عورت کل زندگی کا غیر ذمہ دار نصب العین عہد حاضر کا ایک اہم جزو ہے۔ بار بار مزدوروں اور اہل حرفت کے جھگڑے اسبات کو ثابت کر رہے ہیں کہ خود غرضی کا عمل اب تک قائم ہے۔ اور شبینہ عشرت کدوں اور اسی قسم کے زمانہ حال کے خطرات سے اسبات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شر و فساد کی کون کونسی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں اگرچہ عوام الناس بادی النظر میں مذہب کی طرف نسبتاً بہت کم مائل نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ پچیس سال پیشتر تھے تاہم ان سب کے عمق قلب میں ایک وسیع اور خلوص آمیز مذہبی روح پائی جاتی ہے"

"مرکز تمدن" کے اس مذہبی پیشوا کو ان کی تشخیص پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم صرف اس قدر عرض کرنیکی جرات کرتے ہیں کہ:۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!

قدیم علم جغرافیہ کے محافظ

علم جغرافیہ میں مسلمانوں کے کارناموں کا محققین یورپ کو اعتراف ہے، چنانچہ رسالہ جاگرفیکل جرنل بابت مئی ۱۹۲۶ء میں گاڈفری کیلنڈ نے ایک امریکن مصنف کی کتاب ازمنہ وسطیٰ کا جغرافیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قدیم علم جغرافیہ کی حفاظت کر کے مسلمانوں نے دنیا پر کیا کیا احسانات کئے ہیں۔

ذاتوں کا امتیاز اور مساوات اسلامی

ہمارے ملک ہندوستان میں ذاتوں کا امتیاز ایک لعنت کبریٰ ہے جس کو دیکھکر اور سن کر بیرونی ممالک کے لوگ سخت تعجب اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ مصر کی ایک ماہر فن تعلیم خاتون مس ذکیہ عبدالحمید سلیمان جو ہندوستان کی سیاحت کو آئی ہوئی تھیں اور گذشتہ ماہ میں مصر واپس گئیں۔ انہوں نے پریس کے ایک نمایندہ کے سامنے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ہندوستان میں ذات پات کا امتیاز بہت ملحوظ رکھا جاتا ہے جس کا ان کے ملک (مصر) میں نام و نشان تک نہیں ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ:۔

ہمارے ملک کے لوگ اکثر مسلمان ہیں جہاں ہر گوشہ میں اسلامی جمہوریت کی شان نظر آتی ہے۔ بادشاہ اور فقیر ایک ہی جانماز پر مصر کی مسجد میں نماز پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرض کہ ہم ایک دوسرے کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھتے جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر نظر آتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا جدید اڈیشن

یورپ کی علمی ترقی کی رفتار کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گذشتہ پچیس سال کے اندر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی کثیر المجلدات کتاب کے تین جدید اڈیشن یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس کا تیرھواں اڈیشن کچھ دنوں میں شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہونچیگا۔ اس طبع جدید کا مقصد یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سال کی تمام انسانی معلومات اور علمی کارناموں کا ایک تازہ تبصرہ اس میں شامل کیا جائے۔ اس طبع جدید کی بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس کے مضمون "ایفون" سے ہو سکتا ہے۔ مضمون "کیپیٹا لزم" (سرمایہ داری) خود اس کتاب کے مدیر اعلیٰ مسٹر جے۔ ایل گاروِن کے قلم سے نکلا ہے۔ "سوشیالزم" (اشتراکیت) پر مشہور اشتراکی اور ادیب برنارڈ شا نے ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ "فتنہ بالشوزم" ایک روسی اہل قلم ٹروٹسکی نے لکھا ہے۔ "دنیا کی واپسی" پر مسٹر کیلوگس نے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے اور گرین ہاؤس نے پیرس کی موتمر السلام (پیس کانفرنس) کا احوال قلمبند کیا ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں مسٹر ہیریٹ، ڈاکٹر مسٹر تیسین، پریسیڈنٹ مساریک، ہنگریا کا وزیر اعظم کاؤنٹ بتھلین اور پریسیڈنٹ کولیج کے کابینہ (مجلس وزراء) کے ۵ ممبر جیسے مشاہیر اہل قلم شامل ہیں۔

تبصرہ

کتاب الحج والزیارۃ

(مؤلفہ جناب مولوی منور الدین صاحب دہلوی بی۔ اے)

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑہی)

اسلام کے ابتدائی زمانوں میں اور بعد کو بھی پیروان اسلام بغیر مذہب کے ایک قدم نہیں چلے تھے۔ مذہب ہی
نکا اوڑھنا بچھونا اور مذہب ہی ان کا تکیہ تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غافل ہونا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ اس
ت کو خوب سمجھتے ہوئے تھے کہ جس مذہب کے ہم پیرو ہیں اس کے سچے نام لیوا اس وقت تک نہیں کہے جا سکتے
بتک کہ ہم اس کی ایک ایک بات کو سمجھکر لوگوں کے ذہن نشین نہ کرا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی لٹریچر
بن کثرت کے ساتھ موجود ہے میرا خیال ہے کہ دُنیا کا کوئی مذہب اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ سب سے پہلے
سلمانوں کو اپنے نبی برحق کے تمام احکام (قولی و فعلی) کو جمع کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین
صدیوں میں فن حدیث ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدوّن ہونے لگا اور زمانۂ دراز تک بزرگان سلف اسکی تکمیل پر
ربستہ رہے۔ اسی کی دوش بدوش قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے فن تفسیر کی بنیاد پڑی اور اس فن میں اس
کثرت سے کتابیں لکھی گئیں کہ ان میں سے بعض بعض کی ضخامت سو سے لیکر چار سو مجلدات تک پہنچ گئی۔ اگرچہ
احکام قرآنی اور احادیث کے معتد بہ ذخیرہ پر سے دوسری صدی ہجری ہی ہیں۔ شرعی احکام کی فقہی تدوین شروع
ہو گئی تھی۔ لیکن چند صدیوں میں وہ عظیم الشان اور مستقل "فن فقہ" مرتب ہو گیا جس نے تمام احکام شرعیہ اور انکی
ممکن جزئیات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر لوگوں کو بہت سی دقتوں سے نجات دیدی۔ اس فن کی ترتیب و تدوین
بزرگان سلف کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچگئی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا فقہی کتابوں کی شروح، حواشی اور تعلیقات کا
ایک وافر ذخیرۂ کتب جمع ہو گیا۔ مگر یہ تمام ذخیرہ عربی زبان میں ہے جس کا کچھ حصہ فارسی اور اردو میں منتقل ہو چکا ہے
اور جو عرصۂ دراز سے عربی زبان سے ہماری بے توجہی کی بدولت صرف اُن "ملاؤں" کے لئے مخصوص ہو گیا ہے جو
عربی مدارس کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور یہی محدود طبقۂ علما رہے جن سے بعض موقعوں پر مذہبی احکام کی نسبت
استفتا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب ابتدا ر اسلام میں علوم شرعیہ نے اسقدر ترقی نہیں کی تھی تو مسلمان

بہت پابند مذہب اور دینی احکام کی جزئیات تک سے واقف اور ان پر عمل پیرا تھے۔ مگر جوں جوں مذہبی لٹریچر وسیع ہوتا گیا انھیں احکام سے غفلت اور بے پروائی پیدا ہوتی گئی۔

اس دور مادیت و الحاد میں جبکہ مذہب سے بیگانہ وشی اور اس کے احکام سے بے پروائی عام طور پر بڑھتی جاتی ہے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اپنا وقت تمامتر مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے ہوں۔ ان میں بھی بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خاص کر مذہب کے تشریعی احکام کو بالاستیعاب اور غور و خوض کے ساتھ پڑھتے ہوں۔ وہ زمانہ گیا جبکہ ہر شخص فقیہ اور عالم ہوتا تھا۔ اور اپنے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا تھا اگر کوئی مسئلہ اسے غلط معلوم ہوتا تو اس کی تحقیق کرتا تھا اور اس کی یہ تحقیق دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی تھی۔ مگر آج ایک "ادنی گنوار" سے لیکر ایک "اعلی تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" مسلمان تک اپنے ضروری احکام دینی سے ناواقف اور دوسرے کا محتاج نظر آتا ہے۔ ہم نے اکثر "اعلی تعلیم یافتہ" حضرات کو دیکھا ہے کہ اگر وہ "دینیات" کی تحصیل اپنے لئے باعث ننگ و عار نہیں تو "ملاؤں" کے لئے مخصوص ضرور سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ فن انہیں لوگوں کے لئے وضع ہوا ہے جو "خشک ملا" اور عالم بننا چاہتے ہوں۔ احکام مذہبی اور مسائل دینی سے یہ روگردانی مسلمانوں کے لئے بیحد شرمناک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس طبقہ نے جو اپنے تئیں دینیات کا محافظ اور "انبیا کا وارث" سمجھتا ہے، بہت کم اسطرف توجہ کی ہے کہ دینیات کے ذخیرہ کو عوام کی دسترس کے قابل بنایا جاوے۔ اس سمت میں ابتک جتنی کوششیں ہو چکی ہیں وہ کچھ تو روش زمانہ کے مطابق عام مذاق کے خلاف تھیں۔ اور کچھ تو لفظی ترجموں نے ان کو بے لطف کر دیا تھا آج اگر کوئی سمجھدار آدمی چاہے تو ان سے بخوبی استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اہل علم کے طبقہ کا کوئی باکمال فرد اُٹھے اور بہ طریق جدید احکام فقہیہ کا استقصا سادہ اور سلیس زبان میں کرے جس سے عوام تک کو مستفید ہونے کا موقع ملے۔ اور ہر پڑھا لکھا مسلمان، جب کبھی ضرورت پیش آئے، اپنے مذہب کے مسائل سے واقف ہو سکے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ یہ اہم مذہبی ضرورت ہمارے زمانہ کے ایک روشن خیال صاحب علم نے بوجہ احسن پوری کر دی ہے ہماری مراد اپنے فاضل اور باکمال دوست جناب مولوی منور الدین صاحب بی۔ اے (دہلوی) سے ہے، جنہوں نے اس ضروری موضوع یعنی فقہ اسلامی پر "فتاوائے عثمانی" کے نام سے کامل چھ جلدیں غایت استقصا اور ترتیب جدید کے ساتھ لکھ کر تمام مسلمانان ہند کو گرانبار احسان بنایا ہے

فجزاہ اللہ خیر الجزاء وشکر اللہ سعیہ۔
ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ علمی اور دینی خدمت "تعلیم یافتہ" گروہ کے ایک "قدیم الخیال" فرد نے انجام دی ہے جس کی توقع دیوبند یا ندوہ کے "دستار فضیلت" باندھنے والے مولویوں سے ہو سکتی تھی۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

یہ سلسلۂ "فتاویٰ عثمانی" ہز اگزالٹڈ ہائینس حضور نظام کے نام پر معنون کیا گیا ہے جس کی پہلی کڑی کتاب الحج والزیارۃ کے نام سے اُردو میں شائع ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا تاہم اس کا اکثر حصہ ہم نے سرسری نظر سے دیکھا ہے جس کی بنا پر ہم یہ رائے دینے کے قابل ہوئے ہیں کہ جہاں تک علم فقہ کا تعلق ہے اس جلد میں حج خانہ کعبہ، اس کے تمام احکام اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا پورا استقصا کر لیا گیا ہے۔ مؤلف نے جدید اسلوب پر اس کو حج کے متعلق حوالہ کی ایک جامع کتاب بنا دی ہے۔ جغرافیائی نقشوں اور ڈایاگراموں کے ذریعہ مقامات زیارت، مقابر و آثار کی پوری تفصیل نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ ان تمام باتوں کے لئے کتب معتبرہ کا حوالہ دیدیا ہے، اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور ہر ممکن طریقہ سے ایک ایک مسئلہ کو آسان اور عام فہم عبارت میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ غرضکہ مؤلف موصوف اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ کتاب جہاں خواص اہل علم کے لئے بہترین حوالہ کا کام دے سکتی ہے وہاں عام اُردو دانوں کے لئے بھی بہت کار آمد ہے۔ اور ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے مسلمانوں کو ان کے معلمین سے بے نیاز کردے گی جو اس پیشہ کی بدولت لاکھوں بندگانِ خدا کو ناجائز فضول خرچیوں میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب اس قدر جدت آمیز ہے کہ عربی فارسی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرانا چاہئے تاکہ تمام دنیا کے مسلمان اس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔ بحالت موجودہ اگر یہی سلسلہ مکمل چھپ جائے تو بسا غنیمت ہے۔ حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے دست کرم سے توقع ہے کہ سلسلہ کی بقیہ کتابیں بھی بہت جلد حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں گی ہم تمام مسلمانوں خواص و عوام سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اس پورے سلسلہ کے

خریدار بنجائیں اور اپنے مذہبی احکام و مسائل سے واقف ہو کر دین و دنیا دونوں میں سرخروئی حاصل کریں موجودہ کتاب کی قیمت جو بڑی تقطیع پر خاصی ضخیم ہے تین روپیہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مولوی منور الدین صاحب۔ بی۔ اے
رہبٹ منزل۔ دہلی

نذر رمضان

یہ ایک ۱۶ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے جسکو "حافظ سید مظہر احمد ادھمی پسر مولوی حکیم حاجی سید ظفر احمد صاحب مرحوم و مغفور" نے بہ "تحریک مولوی ظفر علیخاں واختی نجم الدین ومیاں سید عبداللہ اشتیاق علی وغیرہ وغیرہ" تالیف فرمایا ہے۔
اس رسالہ میں مولف نے "لیلتہ القدر" کے فضائل سے متعلق چند روایات صحیحہ کو یکجا جمع کر دیا ہے، اور سورۃ القدر کی مختصر و متعارف تفسیر لکھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا دوسرا نام "تفسیر للیلۃ القدر" بھی ہے۔ روایات کے شروع میں کتب احادیث کے لئے م۔ خ۔ ق وغیرہ علامات استعمال کرنے کی بجائے ہر روایت کے آخر میں کتاب کا پورا نام لکھدیا جاتا تو بہتر تھا۔
آخر میں مولف نے فارسی زبان میں ہندوستان کے اُن تین خاندانوں کا نسب نامہ منسلک کر دیا ہے۔ جو حضرت ابراہیم ادہم رح کی اولاد سے ہیں۔ اس رسالہ میں یہ ضمیمہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔
کاغذ لکھائی چھپائی معمولی، قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ
حافظ سید مظہر احمد آدہمی، فتحگڑھ بھوپال

مقیاس المحبت

حال ہی میں لندن کے ایک ڈاکٹر نے کلائی کی گھڑی سے مشابہ "اومیٹر" نام کا ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے انسانی محبت کی مقدار کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اکثر مرد اور عورتیں اس "طبیب عشق" کے پاس اپنے عشق و محبت کا امتحان کرانے جاتے ہیں، اور وہ ان کے بائیں ہاتھ کی کلائی پر اس آلہ کو رکھ کر بتا دیتا ہے کہ اُنہیں اپنے محبوب کے ساتھ سچی محبت ہے یا نہیں۔

خدانخواستہ اگر یہ آلہ کہیں ہندوستان میں آگیا تو ہمارے "مدعیان عشق و محبت" یعنی ہمارے شعرا کی قلعی کھل جائے گی۔

تفسیر بقاعی کی اشاعت

مصر کی مجلس دار الکتب نے طے کر لیا ہے کہ وہ کتاب نظم الدّرر فی تناسب الآیات والسّور کو شائع کرے گی۔ اس کے مصنف علامہ ابو اسحاق ابراہیم بن عمر البقاعی (۸۰۹ھ - ۸۸۵ھ) ہیں۔ یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے اور غالباً چھپنے کے بعد ایک ایک جلد ہزار ہزار صفحات کی ہوگی۔

شرق اردن کے آثار قدیمہ

برٹش میوزیم کی طرف سے ماہرین علم الآثار کی ایک جماعت شرق اردن میں اثری تحقیقات کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اس جماعت کو پرانے زرین کپڑے ہاتھ لگے ہیں جن میں قیمتی جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک قیمتی خزانہ میں سے برآمد ہوئے ہیں جو توت عنخ آموں کے خزائن سے بھی زیادہ اہم ہے۔

لاش کی حفاظت

جس طرح مصر قدیم میں ایک مخصوص مسالہ کے ذریعہ ہزارہا سال تک لاش کو محفوظ رکھ سکتے تھے ایسا ہی مسالہ حال میں ایک اٹالین کیمیاگر نے ایجاد کیا ہے جس سے انسان کی لاش برسوں تک محفوظ رکھی جاسکیگی۔ اگر یہ مردہ رسم پھر زندہ ہوگئی تو متمول اشخاص کے مردے بجائے قبرستان میں آسودہ خاک ہونے کے ڈرائنگ روم کی کاغذی تصویروں اور مرمرین جسموں کی جگہ حاصل کرلیں گے۔

ایک دو سر والے حلق کی ۴۵ ہزار میں خرید

حال میں برٹش محکمہ طبابت نے ایک شخص کا گلا جس میں سے دو قسم کی آوازیں ایک ساتھ نکلتی ہیں اس لئے خرید کیا ہے کہ شخص مذکور کے مرجانے کے بعد اسکو چیر کر تجربہ کیا جائے کہ اس میں وہ کونسی غیرمعمولی چیز تھی جس میں تمام انسانی حلقوم کے خلاف دو سُر نکلتے تھے۔

سب سے چھوٹا برقی لیمپ

حال میں ماہرین برقیات نے ایک ایسا برقی لیمپ بنایا ہے جو خاتم میں نگین کی طرح بہ آسانی رہ سکتا ہے اس لیمپ کی روشنی سے تاریکی میں ایک شخص نہایت آسانی سے لکھ پڑھ سکتا ہے ۔

غزل

(ناظم الاخلاق حضرت ذہینؔ حیدرآبادی)

دہر میں حسن کا طوفاں نظر آتا ہے مجھے
اک جہاں ہے کہ پریشاں نظر آتا ہے مجھے

بام پر جلوۂ جاناں نظر آتا ہے مجھے
طور پر شعلۂ تاباں نظر آتا ہے مجھے

جی کے بہلانے کا ساماں نظر آتا ہے مجھے
دلِ پُر داغ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

جلوۂ حسنِ ازل کب ہے نظر سے پنہاں
تیری صورت میں نمایاں نظر آتا ہے مجھے

دیکھ لیتا ہوں اس آئینہ میں جلوہ اُسکا
دل میں اپنا مہ تاباں نظر آتا ہے مجھے

نظر آتا ہے مجھے بحر بدامانِ قطرہ
ذرہ ریگ بیاباں نظر آتا ہے مجھے

لئے پھرتا ہے مجھے دشت نوردی کا خیال
قیس جنگل میں پریشاں نظر آتا ہے مجھے

ہے مسرت کے تصور سے مسرت حاصل
اب بیاباں بھی گلستاں نظر آتا ہے مجھے

کون تکلیف کا ساتھی ہو کہ جب آ ہو کے وقت
اپنا سایہ بھی گریزاں نظر آتا ہے مجھے

بےخودی چشم بصیرت ہے حقیقت میں ذہینؔ
ہر طرف جلوۂ جاناں نظر آتا ہے مجھے

اعتذار

اب تک زبان آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ لیکن چونکہ وہاں سے پرچہ چھپکر بروقت نہیں آتا تھا اور خریداروں کو تاخیر اشاعت کی سخت شکایت رہا کرتی تھی ہمنے یہ نمبر کانگریس الکٹرک پریس دہلی میں چھپوایا لیکن دہلی کے چیف کمشنر صاحب کے ڈیکلیریشن کے نہ منظور کرنے سے مارچ و اپریل کا موجودہ نمبر معرض التوا میں پڑا رہا ناچار ہمیں دہلی جانا پڑا اور بہ ہزار دقت تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد ڈیکلیریشن پاس کرا کر پرچہ شایع کرانے کی اجازت حاصل کی اُمید ہے کہ ناظرین کرام ہماری مجبوریوں کو مد نظر رکھکر اس تین ماہ کی غیر حاضری اور غیر معمولی رکاوٹ کو نظر انداز فرمائینگے اور زبان سے بدفرو نہ ہو جائیں گے۔

مئی و جون کا مشترکہ نمبر عنقریب حاضر ہوگا اور جولائی کا سالانہ نمبر بھی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام خاص نمبروں سے ارفع و اعلیٰ ہے بڑی آب و تاب سے چھپکر وسط ستمبر تک حاضر خدمت ہوگا۔

اُمید ہے کہ ہمارے اس واجبی اعتذار سے ناظرین زبان مطمئن ہو جائیں گے

دہلی ۔ یکم ستمبر ۱۹۲۷ء　　　　ایڈیٹر "زبان"

(مولانا اے۔ آر۔ خشتر سنگر دہلی پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے کانگریس پریس دہلی سے چھپکر شائع ہوا)

شبیہہ مبارک ۔ اس نمبر میں جو تصویر زبان کی زینت کو دوبالا کر رہی ہے وہ اعلیحضرت قدر
ررت ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر المتخلص بہ ناز والی ریاست خیرپور (سندھ) دام اقبالہٗ و
شمتہٗ کی ہے جو ہمیں اپنے کرمفرما جناب رضاالحق صاحب عباسی نے ازراہ کرم عنایت فرمائی ہے جس کو
ہایت فخر کیساتھ درج زبان کرتے ہوئے موصوف کے شکر گذار ہیں۔
عباسی صاحب موصوف کچھ عرصہ سے ریاست منگرول سے علیحدہ ہو کر خیرپور تشریف لیگئے ہیں۔
ہاں وہ اعلیحضرت میر صاحب بالقابہ کے پرائیویٹ سکرٹری کے ممتاز عہدہ پر سرافراز ہیں۔ حال میں آپ منگرول
شریف لے آئے تھے انکی زبانی اعلیحضرت میر صاحب بالقابہ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی بجید
ریف سنی۔ آپ کے ان اوصاف کو انشاءاللہ ہم آئندہ نمبر میں بوضاحت بیان کرینگے۔ اس موقعہ پر صرف
ی قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ موصوف نے نہایت ہمدرد دل پایا ہے۔ اور ملک و قوم کی بہبودی میں
ہر وقت آپ مصروف رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں آپ کو امور حکمرانی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے
ں ہاں علمی قابلیت میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ علمی مذاق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اچھے اچھے قابل فضلاء
لاء سے ہر وقت آپ کا دربار بھرا رہتا ہے۔ جن کی حد سے زیادہ قدر دانی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے
اردو فارسی میں آپ بے لاگ شعر فرماتے ہیں جو صد درجہ موثر و پُر درد ہوتے ہیں۔ آپ صاحب دیوان
ی ہیں مطبوعہ دیوان سے آپ کی وہ غزل جو آپ کو نہ صرف پسند ہی ہے بلکہ اس کو اپنا نصب العین
ماتے ہوئے ہیں اور سختی سے اس پر کاربند ہیں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۲)
ہم دیگر رؤسا ہند کی خدمت میں باادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بھی اس غزل کو اپنا نصب العین بلکہ
صول حکمرانی قرار دیکر اس پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔

خوشتر (منگرولی)

زبان

جلد۲ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ مارچ و اپریل ۱۹۴۷ء | نمبر۳

زبان خلق

حرم (پیلی بھیت) بابت فروری ۱۹۲۷ء

زبان منگرول :- یہ رسالہ مخدومی و مکرمی جناب عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی کی زیرادارت منگرول واقع کاٹھیاواڑ سے جاری ہوا ہے۔ اب تک اس کے پانچ نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ سرزمین کاٹھیاواڑ کا یہ پہلا علمی وادبی رسالہ ہے۔ اس وقت اکتوبر و نومبر کے پرچے پیش نظر ہیں کسی گذشتہ نمبر میں حضرت خالد بنگالی کی ایک نظم "اے گل زمین ڈھاکہ" کے زیر عنوان شایع ہوئی تھی یہ نظم ادب العالیہ کا ایک بہترین نمونہ ہے نومبر کے پرچہ میں جناب امجد حیدرآبادی کی ایک نظم باللعجب بھی خوب ہے ایسی نظموں کے مطالعہ سے دل و دماغ منور ہوتے ہیں۔ اس نظم کا کچھ حصہ ناظرات حرم کے مطالعہ کے لئے درج کیا جاتا ہے

اکتوبر کے پرچہ میں ضیاء الملک ملا رموزی صاحب نے خوب خوب نکات بیان فرمائے ہیں پڑھنے اور سوچنے کی چیز ہیں جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کا مضمون "زوجیت عامہ اور قرآن مجید" نہایت قیمتی ہے اردو زبان میں ایسے مضامین کی بہت زیادہ ضرورت ہے "ایران زیر حکومت رضا خان" "ہندوستان اور اس کی زبان" "حقیقت مجاز" "ملک نائب خسرو خاں گجراتی" "جواب استفسار احباب آزاد" یہ تمام گراں بہا اور پُر از معلومات ہیں پبلک کا فرض ہے کہ وہ مخدومی و مکرمی جناب خوشتر صاحب کی حوصلہ افزائی کرے پرچہ نہایت قابلیت کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے سالانہ چندہ چار روپے ہے اور ششماہی عہ؎ نمونہ ۶ آنہ

آئینہ (کان پور) بابت مارچ ۱۹۲۷ء

منگرول (کاٹھیاواڑ) کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے کاٹھیاواڑ جیسے حصہ ہند سے اردو زبان کا رسالہ شایع ہونا بظاہر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہندوستان کی ملکی و قومی مشترکہ زبان اردو کی ہمہ گیری کا ایک بین ثبوت ہے۔ زبان خصوصیت کے ساتھ علمی مضامین شایع کرتا ہے اور اس لئے اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، دوسرے رسائل کی طرح زبان بھی اہل علم کی بے اعتنائی کا گلہ گذار ہے اس کا شکوہ ہی کیا کہ یہ ایک عام شکایت ہے۔ یقیناً مولانا خوشتر ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم آن کی خدمت میں اپنے ایک مکرم دوست کی رائے (جو انہوں نے آئینہ کا

پہلا نمبر دیکھ کر ظاہر فرمائی تھی) پیش کرنے کی جرأت کریں یعنی" فی زمانہ ایسے خوش مذاق لوگ بہت کم ہیں جو صرف علمی مضامین کی بنا پر کسی رسالہ کی حوصلہ افزائی فرمانا اپنا فرض منصبی سمجھیں ضرورت ہے کہ علمی مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ عوام کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا جائے" ہمارے نزدیک زبان کی خدمت کرنا ہر اہل علم اور علم دوست کا فرض ہے۔

کراؤن سائز حجم تین جزو قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے۔

نظر (لکھنؤ) بابت مارچ ۱۹۲۶ء

زبان۔ اس نام کا ایک علمی و ادبی رسالہ جو سرزمین کاٹھیاواڑ کا پہلا ادبی جریدہ ہے میرے پیش نظر ہے۔ حضرت خوشتر منگرولی کی زیر ادارت ماہوار شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ قیمت چار روپے مناسب ہے۔ میں نہایت مسرور ہوں اور دل سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ملک کے اس حصہ سے یہ رسالہ اردو زبان میں اجراء ہو رہا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یا ایک شور زمین کہنا بجا ہوگا یقیناً تحسین و آفرین کے مستحق حضرت خوشتر ہیں۔ لکھائی چھپائی ترتیب مضامین کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک غیر مرکزی حصہ کی حیثیت سے اُس کا معیار ادب کسی طرح کم نہیں ہے۔

نیرنگ خیال (لاہور) بابت فروری ۱۹۲۶ء

"**زبان**" جناب عبدالرحمن صاحب خوشتر منگرولی نے کاٹھیاواڑ (کے مرکز منگرول سے شائع کیا ہے رسالہ ۲۰×۳۰/۸ سائز پر شائع ہوا ہے لکھائی چھپائی کاغذ بہتر ہے۔ جناب عبدالرحمن صاحب رسالہ کو نہایت قابلیت سے مرتب کرتے ہیں اور ہمیں اُن کی محنت اور کوشش سے توقع ہے کہ رسالہ بہت جلد ترقی کریگا۔ رسالہ میں عام پسند مضامین کے علاوہ علمی اور محققانہ مضامین بھی شائع ہوتے ہیں اُمید ہے رؤسائے منگرول رسالہ کی سرپرستی اختیار کئے رکھیں گے تاکہ کاٹھیاواڑ سے اُردو کا یہ رسالہ ہمیشہ شائع ہوتا رہے۔ رسالہ کا چندہ صرف چار روپے ہے جو خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ہے شائقین ضرور سرپرستی اختیار کریں۔

جناب محمود الحسن صاحب **محمود** اسرائیلی

خطۂ (گجرات) کاٹھیاواڑ اردو زبان کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ "زبان" نے ایام طفولیت ہی سے جس شوخی اور ہونہاری کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر اُردو کے ممتاز انشاء پرداز اور خوش فکر شاعروں کی نگرانی اور سرپرستی میں یہ رسالہ پروان چڑھا تو انشاء اللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں "زبان" کو ادبی صحافت میں وہی خاص درجہ حاصل ہو جائیگا جو اس کی سرزمین کو اردو زبان میں ہے۔

صفحہ ادارت

اتے دن ہندوستان کے ہر گوشے سے اخبارات و جرائد جس کثرت سے نکل رہے ہیں اور روز بروز اردو کے خزانے
بااضافہ ہو رہا ہے اُس کو دیکھ کر ہم بلند آہنگی سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کا موجودہ دور ترقی کا دور ہے۔
شبہ اردو کا یہ عہد جہانگیری آئندہ ایک صدی کے بعد "عہد زریں" سے یاد کیا جائے گا۔ اگرچہ اردو خزانہ میں
لمی سرمایہ کا عشر عشیر بھی فراہم نہیں ہوا ہے لیکن چونکہ اردو کو علمی زبان بنانے میں انتہائی کوششیں کی جا رہی ہیں
لک کی چند مایہ ناز انجمنیں اس کو بروئے کار لانے میں نہ صرف شدت کے ساتھ سرگرم کار ہیں بلکہ عملی ثبوت بھی دے رہی
س سے امید بندھتی ہے کہ اگر اس کی ترقی کا یہی عالم رہا تو آئندہ بہت تھوڑے عرصہ میں اردو بھی دیگر زبردست علمی سرمایہ رکھنے
بانوں کے دوش بدوش نظر آئے گی۔

ترِ معاصر "سہیل" (علیگڈھ) نے اپنی اپریل ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں موقت الشیوع رسایل و اخبارات کی جو فہرست پیش
گرچہ وہ نامکمل ہے اور اب ایک سال کے بعد اس میں معتدبہ اضافہ بھی ہو گیا ہے تاہم اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
دستان کے مختلف گوشوں سے اردو کے پندرہ روزہ، ماہوار، اور سہ ماہی تقریباً اسّی رسالے شایع ہو رہے ہیں ان
بعض رسائل نے تو ایسے ایسے مقامات سے اردو کا علم بلند کیا ہے جہاں اس سے قبل کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان رسایل میں کتنے ایسے رسالے ہیں جو خالص اور واقعی علم ادب کی خدمات بجا لاتے ہیں؟ ہمارے
میں پانچ سات ہی ایسے رسالے نکلیں گے جو بجا طور پر اردو کی خدمات انجام دیتے ہیں! مگر اس سے یہ خیال نہ کیا جائے
سی طرح دیگر رسایل بھی بیکار اور غیر ضروری ہیں!! نہیں بلکہ وہ ایک ایسی خدمت انجام دے رہے ہیں جو اعلیٰ اور
علمی رسالے نہیں انجام دے سکتے، ان رسایل میں اکثر رسالے اپنے عام پسند مضامین اور دلچسپ فسانوں سے ایسے
دان طبقے میں جو پُر مغز، فلسفیانہ، مورخانہ اور محققانہ علمی مضامین سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اردو پڑھنے ترغیب
وق پیدا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں ٹھوس مضامین کے پڑھنے کی طرف بھی مایل کرتے ہیں اس لئے یہ بھی ایک قسم
دو کی خدمت ہے۔

۵ اس میں شک نہیں کہ بعض وہ رسایل جو تجارتی مفاد کو مد نظر رکھ کر جاری کئے گئے ہیں اپنے عریاں اور اخلاق سوز مضامین سے
کے دامن کو آلودہ کر رہے ہیں اور عوام میں بدمذاقی کو وسعت دے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں یوں بھی رسایل ایک زبردست علمی خدمت ادا کر رہے ہیں جس کا احساس شاید ہی کسی کو ہوگا اور وہ یہ ہے کہ بعض وہ مصنفین جو بے مایہ ہونے کے سبب نیز ناقدری ابنائے ملک کے باعث اپنی تصانیف کو مستقل طور پر نہیں چھپوا سکتے اور ان کو کتابی جامہ نہیں پہنا سکتے رسالوں میں بالاقساط شایع کروا دیتے ہیں جن میں بعض تصنیفات اور تخیل ہونے کی وجہ سے نہایت قابل قدر ہوتی ہیں کچھ عرصے کے بعد رسالہ کی زندگی مستعار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے اور اس طرح ان کی دماغی کاوشوں اور علمی کارنامے صفحۂ ہستی سے فنا اور برباد ہو جاتے ہیں جو ہماری بدنصیبی اور اردو کے زوال کی علامت ہے۔

جہاں ہم اردو کی ترقی پر شادیانے بجاتے ہیں وہاں ہمیں اس کا ماتم بھی کرنا چاہئے کہ بیہودہ ناولوں اور مخرب الاخلاق فسانوں نے ایک طوفان بے تمیزی مچا رکھا ہے اور جن کا زہریلا اثر اردو کے شجر ارتقا کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ ان کی اشاعت کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں اس کام کے لئے ایک "دارالانتقاد" کے انعقاد کی ضرورت ہے جہاں سے ہر مصنف کو حسب ضخامت تصنیف معقول فیس وصول کر کے بلا رو رعایت ایک منصفانہ "تنقیدی سند" دی جس کو مصنف اپنی تصنیف کے شروع میں بطور سرٹیفکیٹ کے لگا دے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بیہودہ اور فضول لٹریچر کی اشاعت خود بخود رک جائیگی اور وہ ہر شخص جو یہ امتیاز نہیں کر سکتا کہ کون سی کتاب صحیح اور محققانہ ہے اور کون سی غلط اور غیر محققانہ ہے اور کس کا مطالعہ مفید مطلب اور کس کا پڑھنا مضر اخلاق ہے بآسانی امتیاز کرنے لگے گا اور اپنے مذاق کی کتب کا بلا خوف مطالعہ کر سکے گا، دارالانتقاد کی جانب سے ختم سال پر جن تصانیف کو اسناد دی گئی ہوں ان کو بطور رپورٹ کے شایع کر دے کہ اس سے ہر شخص استفادہ حاصل کر سکے۔

اگرچہ کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس میں ایک زبردست مالی سرمایہ کی قربانی ضرورت ہے جس کا فراہم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے لیکن جب ہم قوم کی پست خیالی اور فقدان مذاق کو دیکھتے ہیں تو ہمارے حوصلے پست اور ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور کسی جدید مفید مطلب علمی تحریک کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو مجبور اور بے دست و پا پاتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) اور دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے علمی کارناموں کو دیکھتے ہوئے ہمیں کسی جدید انجمن یا دائرہ کے انعقاد کی ضرورت نہیں ہے اس کے علاوہ چند اور انجمنیں بھی ہیں جو اس کام میں ہماری اعانت کر سکتی ہیں چنانچہ دائرۃ المعارف (حیدرآباد) اور انجمن اردوئے معلیٰ (علیگڑھ) وغیرہ جن کے متفقہ مشورے سے اس اہم کام کی تکمیل ہو سکتی ہے یعنی یہ انجمنیں مذکورہ بالا تمام امور پر غور کر کے مختلف شعبہ ہائے علوم کی آپس میں تقسیم کر لیں اور ہر انجمن اپنے متعلقہ شعبہ کی کتب اپنی ماتحت نہایت تحقیق و تصحیح کے ساتھ شایع کرواتے جو مصنف اپنی تصنیف خود اپنے زیر اہتمام چھپوائے اس کو متعلقہ شعبہ کی انجمن

کی جانب سے بالاستیعاب اور ناقدانہ نظر سے دیکھنے کے بعد سندی جائے کہ وہ مستند سمجھی جائے۔

اگر مذکورۃ الصدر انجمنیں متفقہ طور پر تصفیہ کر کے باہم متحد ہو جائیں تو ایک مہتم بالشان علمی خدمت انجام پا جائے اور قلمروئے اردو کو یہ "اتحاد اربعہ" بہت کچھ فائدہ پہنچا سکے۔ وما توفیق الخ

ہمیں امید ہے کہ مذکورہ بالا تجویز کو معزز معاصرین اپنے رسالوں میں اپنی رائے صائب کے ساتھ درج فرما کر مشکور فرمائیں گے نیز مذکورہ انجمنیں بھی اس پر توجہ مبذول فرما کر ہمیں ممنون بنائیں گی۔

شرر مرحوم کی یادگار میں مکرمی ایڈیٹر صاحب النّاظر لکھنؤ نے ایک "انعامی مقابلہ" قرار دیا ہے جس کے شرائط کی تفصیل کسی دوسری جگہ درج کرتے ہیں اس کے متعلق ہم اپنے مقالہ نگار خصوصی حضرت زور (صاحب روح تنقید) کو اس طرف ضرور توجہ دلائیں گے کہ وہ شرر مرحوم کی تصانیف پر مبصرانہ نظر ڈال کر ایک تنقیدی مضمون سپرد قلم فرمائیں اور ملک کو اپنے نکتہ رس خیالات سے ممنون فرمائیں۔

تعویق اشاعت کے باعث آخر ہم مجبور ہو کر دوسرے مطبع سے طباعت کا انتظام کرتے ہیں خدا کرے کہیں یہ بھی "ستم ظریف" نہ نکلے اگرچہ ہم نے ہر طرح کی پیش بندی کر لی ہے۔

چونکہ ہم نے قارئین زبان کی خدمت میں فروری کا زبان وسط مئی میں حاضر کیا تھا اس لئے بہت پیچھے رہ جانے کے باعث مارچ و اپریل کا یہ مشترکہ نمبر نکال رہے ہیں۔ جو غالباً وسط جون تک قدردانان زبان کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور انشاء اللہ اخیر جون تک مئی و جون کا مشترکہ نمبر بھی شایع ہو جائے گا جس سے توقع ہے کہ بہت جلد تاخیر اشاعت کی شکایت رفع ہو جائیگی

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ باوجود دو تین ماہ کا عرصہ گذر جانے کے اب تک ہمارے کاٹھیاواڑی بھائیوں نے انجمن اخوان الصفا (مانا ودر) کے عطیہ سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بھائی ایسے مستغنی ہیں کہ انہیں کسی کی امداد و اعانت کی ضرورت ہی نہیں ہے یا پھر کسی کی امداد و اعانت کو اپنی توہین و کسر شان کے مترادف خیال کرتے ہیں بہر حال اس سے ہماری غفلت و خود فراموشی ظاہر ہے۔

کیا کاٹھیاواڑ کو بھی کبھی وہ دن میسر آئیگا کہ اس کا ہر فرد اردو خواں وار دو داں نظر آئے گا؟ اور کیا اس بنجر اور پر شور زمین سے ایسے نونہال بھی پیدا ہوں گے جو اپنے علمی کارناموں سے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دیں گے۔

صورت حالات اور موجودہ "شان بے نیازی" دیکھتے ہوئے تو ہمیں ایک صدی تک اس کی توقع نہ رکھنی چاہئے کیونکہ ع

بے نیازی کی شان کس غنی کی ہے * بندگی کی ادا غنی کی ہے

عالیجناب معلے القاب نواب غلام محی الدین خانصاحب بہادر
والیو چیف آف مانا ودر

کلام الملوک ملک الکلام

(طبع زاد ہز ہائی نس میر علی نواز خاں بہادر نازؔ فرماں روائے ریاست خیرپور (سندھ) خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ)

ہوا خورشید کا ہمسر ستارہ میری قسمت کا — تماشا دیکھتا ہوں یا الٰہی تیری قدرت کا
مجھے پابند کر احسان کا، انصاف کی خُو دے — کھلے یا رب میرے ہاتھوں سے دروازہ عدالت کا
نہ کیوں ہو فرض مجھ پر ملک کی اپنے نگہبانی — جسے سب میرؔ کہتے ہیں وہ راعی ہے رعیت کا
میری دریا دلی سے چشمہائے فیض جاری ہوں — غریبوں کی خبرگیری میں صرف ہو میری دولت کا
خُدا کے روبرو جھکتا رہے سر میرا سجدے میں — رہے دل میں مرے ہر دم تصور اس کی عظمت کا
رہے نوشیرواں کے عدل کا سر پر مرے سایہ — سیاست میں میری ہو رنگ اکبر کی حکومت کا
عطا ہو مجھکو ہمت خادم اسلام ہونے کی — بڑھے رتبہ میری کوشش سے قوم و دین و ملت کا
میری بیکس نوازی کا بجے ڈنکا زمانے میں — رہے سکّہ میرے دینار و درہم پر شرافت کا
کسی کا دل تو کیا، ٹوٹے نہ مجھسے مے کا شیشہ بھی — نہ پائے استقامت لڑکھڑائے میری نیت کا
جواں ہو میرے سایہ میں میرا نورِ نظر یعنی[1] — یہ وارث ہے میرا، میرے وطن کا، میری عزّت کا

نہ ہو کیوں نازؔ مجھکو اپنے نشہ کی ترنگوں پر
پیے بیٹھا ہوں ساغر ساقیٔ کوثر کی اُلفت کا

---

[1] صاحبزادہ میر فیض محمد خانصاحب ولیعہد بہادر ریاست خیرپور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مارچ واپریل زبان ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک اگر پاک ہو دل صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی
(امجد)

مقالات

اسلام کی بدنصیبی

(اللھم ارحم امت محمد صلعم)

(علامہ میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

"ہم اپنے محترم و فخر کاٹھیاواڑ علامہ میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی کے اس دوسرے مضمون کو "زبان" میں شائع کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون آج بہت قبل چھپ جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ علامہ محترم کے خامہ حقیقت نگار سے نکلا ہے اور پھر اس میں ترکوں کا جذبہ مغرب پرستی سے متاثر ہو کر مذہب اسلام پر تصرف کرنا اور حسب خواہش اس کی ملحدانہ اصلاح کر کے ایک جذبہ مذہب کی بنیاد ڈالنا، اسلاف کے کارناموں کو بے وقعت کر کے اسکی جگہ مغرب کے اخلاق سوز تمدن کو رواج دینا وغیرہ وغیرہ پر نہایت مؤثر اور مدلل بحث کی ہے اس لئے ہم نہایت خوشی کے ساتھ صبح زبان کرتے ہیں۔" ایڈیٹر

اسلام کی بدنصیبی

اللہم ارحم امۃ محمد صلعم[1]

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

ہمارے جادو بیان مقرر اور سحر نگار محرر ہمیشہ ہمیں اسلامیوں کے عہد ماضی کے کارنامے سُنا سُنا کر غفلت کی گہری نیند میں سُلا رہے ہیں جس سے ہم اپنے طور پر یہ طے کر چکے ہیں کہ اُن کا ان اعمال حسنہ سے متصف ہونا ہمارے لئے کافی وافی ہے اور اُنہوں نے ہمیں اکتساب فضایل کے بارگراں سے سبکدوش کر دیا ہے ۔ گویا یہ بھی کوئی فرض کفایہ ہوا یا مسیحیوں کا کفارہ ۔

دل کی آنکھ جب کور ہو جاتی ہے تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی جس میں دماغی غلامی کا مریض مُبتلا ہو جاتا ہے وہ غیر علت کو علت گردانتا ہے یہ جملہ گو مختصر سا ہے مگر اپنی معنوی ہمہ گیری کے باعث ادبار زدہ قوم کی پوری زندگی پر طابق النعل بالنعل منطبق ہوتا ہے ۔

اسلام کی بدنصیبی کی گھٹائیں کچھ اس قدر تو بتو اُمڈتی آرہی ہیں کہ چشم بینا بالکل بیکار ہوئی جا رہی ہے کوئی حد دکھائی نہیں پڑتی جہاں یہ سلسلہ ختم ہو اور آیندہ کے لئے اُمید کی راہ کھول سکے ۔

بڑا ظلم ہے کہ سدا ناواقف مخاطبین کو مدحیہ افسانے سُنا سُنا کر خوش وقت کیا جائے اور اُن کے اسلاف کی منقبتیں سُنا کر اُن کی آنکھوں پر جہالت کی پٹی باندھ دی جائے ۔ یعنی کہ اُنہیں امروز و فردا میں مقابلہ کر کے محاسبۂ نفس سے محروم رکھا جائے ۔ اور اس طرح قوم و ملت کے مجموعی اغراض کو کسی اخبار یا رسالہ کے مقامی اغراض کی بھینٹ پر بری طرح ذبح کر دیا جائے ۔ سچا خیر اندیش وہی شخص ہو سکتا ہے جو قوم کو قبل از وقوع حادثہ خبردار کر دے ۔ خواہ تھوڑی سی دیر کے لئے اُس کو تجہیل و تحمیق ہی کا انعام کیوں نہ دیا جائے ۔ مگر وہ ژرف نگاہ اور غواص ناصح کسی طرح ان ادنیٰ امشوشات میں اُلجھ کر راہ و رسم سے کسی طرح رو گرداں نہ ہو ۔ بقول عرفی

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوق نغمہ کم یابی ٭ حُدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عالم اسلامی میں اس وقت ایک قیامت خیز طوفان افکار و آرا برپا ہے ۔ اسلامی ڈاک ہیں

---

[1] ہفتہ وار الفتح زیر امتیاز مکرمی الشیخ محب الدین الخطیب کے محرم ۱۳۵۵ھ کے اجزا ۔

بتاتی ہے کہ ہمارے دشمن ہمارے لئے جو گڑھے کھود رہے ہیں اُن سے کہیں زیادہ گہرے کنوئیں ہم نے خود اپنے لئے اپنے ہاتھوں کھود لئے ہیں اور برعکس مفوائے آیۃ کریمہ وکفی اللہ المومنین القتال خاکم بدہن کفی اللہ الکافرین القتال کا منظر در پیش ہے جو حکیم الامۃ سید جمال الدین افغانی کی پیشین گوئی کو حرف بحرف صحیح ٹھہراتا ہے " مسلمانوں کو اللہ فنا کر دے کہ اُن کی کسی رگ میں حیات کی صلاحیت نہیں اور ان کے بعد کسی ایسی قوم کو لائے جو ہنوز سادہ ہو اور پھر اُس سے اعلائے کلمۃ اللہ کا کام لے" او کما قال

وہی مصطفےٰ کمال جو کل انگورہ میں بزمانہ جنگ یونان بلاناغہ مسجد میں حاضری دیتا اور بارگاہ ایزدی میں مسلمانوں کی فتح کے لئے بتضرع و نیاز دست بدعا رہا کرتا تھا اور جو شیخ شریف احمد سنوسی سے بار بار بخاری کا ختم کرانے کی التجائیں کیا کرتا تھا۔ وہی آج بر غرور غلط ہو کر حسب فرمان الٰہی ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ شروع اسلام کی رفیع الشان عمارت کو ڈھانے میں مسمی بشیرین کا علم الملکوت بن رہا ہے اور کوس لمن الملک بجا رہا ہے۔

وائے گر در پس امروز بود فردائے

(۱) وہ مسلم کے لئے ارتداد کو جائز قرار دیتا ہے۔

(۲) تعدد ازدواج کو ولو ضرورۃً از روئے قانون بند کر دیتا ہے۔

(۳) مسلم خاتون کو غیر مسلم کے ساتھ بسلسلۂ عقد جوڑ دیتا ہے۔

(۴) سوئزرلینڈ کے قانون مدن کو جس میں بھانجی سے عقد کرنا روا رکھا گیا ہے اپنے ممالک میں بزور رواج دے رہا ہے۔

(۵) نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں یعنی بعولتن اور بتیگے کو کالج کی بینچوں پر بجبر آ ساتھ بٹھاتا ہے۔

(۶) پورے قلمرو سے فقۂ اسلامی کا نام و نشان میٹ دیتا ہے۔

(۷) تمام محاکم شرعیہ کو الغا کر کے ہر شرعی شے حتیٰ کہ لفظ شریعت کے اطلاق کو جرم قرار دیتا ہے۔

(۸) محکمۂ مشیخت اسلامیہ کو اڑا کر اُس کی بجائے ایک حقیر دائرۂ دیانت کو قائم کرتا ہے۔

(۹) تمام باشندوں کو ہیٹ کے استعمال پر مجبور کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کیوں؟ محض تفریح کے لئے! اور جو کوئی استہزاءً ہیٹ کو ٹھکرا دیتا ہے اُس کی گردن ماردی جاتی ہے۔ چنانچہ سینکڑوں مشائخ دین کا اسی جرم کی پاداش میں صفایا کر دیا گیا۔

(۱۰) عربی حروف کی بجائے لاطینی حروف کی منظور شدہ تجویز کو آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن

لہ دیکھو حاضر العالم الاسلامی کے حاشیہ میں ترجمہ سید جمال الدین۔

حکیم اس طرح لکھا گیا تو اُس کا تلفظ ناممکن ہو جائے گا مگر نہیں اونہوں نے تو پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے کہ حروف لاطینی کے مکمل رواج پانے تک قلمرو ترکی میں سرے سے کوئی قرآن خواں ہی نہ رہے گا۔ اس لئے انہیں کسی تشویش سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔ لاقدر اللہ

(۱۱) تمام مدارس شرعیہ کو مقفل کر کے صرف ایک مدرسہ لاہوت کو باقی رکھا ہے جو یورپی طریق پر آلہیات کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱۲) شرعی اوقاف کو ضبط کر کے وقف کرنے والوں کی شرطوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔

(۱۳) تمام اخبارات ورسایل کے نام یہ سرلیغ قضا تبلیغ نافذ ہوا ہے کہ وہ بیک وقت اسلام پر دعا و ابول دیں۔ اور عالم اسلامی کو "گھِنونے" کے ناپاک نام سے پکاریں۔

(۱۴) حج کو غیر معینہ مدت کے لئے روک دیا گیا ہے۔

(۱۵) اعلان کر دیا گیا ہے کہ ترکی کو بمقابلہ غیر مسلم ممالک کے اسلامی ممالک اور ان کے باشندوں سے کوئی خاص علاقہ یا ہمدردی نہیں (۱۶.......) وغیرہ وغیرہ

کیا ہنوز یہ حکومت اسلامی ہے؟ یا کیا ان تمام باتوں کو بعض سہل انگار لوگوں کی طرح گپ گزٹ سے تعبیر کیا جائے گا۔ یا بعض متعمق مگر جامد شخصیتوں کی طرح اس کو یورپی طاقتوں کی رضا جوئی اور دلدہی پر محمول کیا جائے گا۔

میرا ان بزرگوں سے سوال ہے کہ حبشہ (ایتھوپیا) کے لوگ تو باقاعدہ اور پرانے مسیحی ہیں پھر کیوں اُن کے ممالک کے حصہ بخرے کرنے کو یورپ کے مسیحی گرگے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا ترکوں کو لاطینی حروف اور ہیٹ کے استعمال نے میسولینی اطالوی فرعون کی اس دھمکی سے باز رکھا کہ وہ اس بنا پر کہ اناطولیہ اصل میں رومانوی ملک ہے جب چاہے اُس کو غصب کر سکتا ہے۔ کیا وہ اطالوی قانونِ عقوبت اختیار کر کے اطالیہ کے ملک الشعراء جبریل دانونضیو کو اس ناہنجار حرکت سے باز رکھ سکے کہ اُس نے اپنی ایک زبردست نظم میں اپنی قوم کو استرداد اناطولیہ پر اُکسایا ہے جو کبھی اطالویوں کے اسلاف رومانیوں کے ممالک محروسہ میں تھا۔ کیا ہیٹ نے قضیۂ موصل میں ترکوں کی نامرادی میں کچھ مدد کی۔

ہاں مگر اب پے بہ پے ٹھوکریں کھا کھا کر بعض ترک کچھ سنبھلنے لگے ہیں۔ اور اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ یورپ کے مسیحی برخلاف آیۂ کریمہ ولن ترضی عنک الیہود ولا النصاری حتّٰی تتبع ملتہم وہ کبھی اُن کے ترک مذہب سے بھی راضی نہ ہوں گے مگر "بعد از خرابی بصرہ" عام ترک علی الخصوص انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر تو پہلے ہی سے اس حقیقت کو خوب جانتے تھے مگر وہ بیچارے مغلوب و مقہور تھے نیز یونان پر فتح پا کر مصطفٰے کمال پوری ترکی کے مال و منال اور دین و ناموس کا بلاشرکت غیرے

مالک بن بیٹھا ہے اور لوگ اُس کے اس احسان کو دیکھ کر اُس کی ہر بیجا حرکت پر باوجود ناپسندیدگی خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر اُسے لائڈ جارج کی جنگ یورپ میں کامیابی اور پھر بزبان امن سخت گیری کے قصہ سے سبق لینا چاہئے۔

فالملک یبقی مع الکفر المبین ولا * یبقی مع الظلم فی بدوٍ ولا حضر

کہتے ہیں کہ بالشویکیوں نے ترکوں کو اس مغرب پرستی پر بہت کچھ سخت دست کہا ہے کہ وہ اس طرح نہ مشرقی رہیں گے اور نہ مغربی اور بمقتضائے لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء وہ دونوں امتوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ بارے وہ اب کچھ سنبھلنے لگے ہیں جس کا پتہ اُن کے موتمر مکہ میں وفد بھیجنے سے لگ سکتا ہے۔

مصطفےٰ کمال نے بہانہ پا کر موجودہ سازش قتل کے سلسلہ میں تمام رطب و یابس اور مجرم و غیر مجرم ہستیوں کو جن میں دس بارہ نہایت جلیل القدر شخصیتیں بھی ملوث ہیں اپنے آہنی قدم سے روند دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حالانکہ ترکی قوم اُن نیک نہاد اور کار گذار نفوس کے بعد پھر جسم بے جان رہ جاتی ہے اور یوں بھی ترکوں میں اعلیٰ قابلیتوں کے لوگ کون سی زائد تعداد میں تھے جو اُن کو کم کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ کیا اُن غیر معمولی نفوس کو جو براہ راست اس جرم میں شریک نہ تھے معاف کر کے ایک نیک مثال نہیں قایم کی جا سکتی تھی۔

ذرا آیئے۔ ہم اس واقعہ کی نظیر سیرت نبوی میں ڈھونڈیں مغازی[۵۱] ابو الاسود میں ہے کہ جب رسول کریم صلعم جنگ تبوک سے واپس لوٹ رہے تھے تو راستہ میں ایک گھاٹی اور ایک وادی سے دوچار ہوئے۔ چند منافقوں نے باہم گریہ سمجھوتہ کر لیا کہ جوں ہی آپ گھاٹی پہ پہنچیں آپ کو نیچے دھکیل دیں تاکہ اس طرح آپ کا نعوذ باللہ خاتمہ ہو جائے۔ جب آپ نے اس سازش پر اطلاع پائی تو حکم دیا کہ سب لوگ وادی کا راستہ لیں اور آپ مع چند مخصوص اصحاب کے گھاٹی پر سے گذریں گے۔ مگر چونکہ ان بد باطنوں کی نیت ناپاک تھی یہ آپ کی سانڈنی کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ سو آپ نے حضرت حذیفہ رضؓ کو بھیجا کہ ان کو یہاں سے ہٹا کر وادی کے راستہ پر لگا دو۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر کہ شاید آپ اُن کی سازش سے مطلع ہو گئے ہیں وادی کی راہ کی طرف ہو لئے۔ ادھر آپ نے حذیفہ رضؓ سے فرمایا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے؟ یہ لوگ میری جان لینے کے ارادہ سے پیچھے ہو لئے تھے۔ حضرت حذیفہ رضؓ بولے اگر ارشاد ہو تو اُن کی گردنیں مار دوں آپ نے فرمایا نہیں! نہیں!! لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ہی آدمیوں کو مار ڈالتا ہے۔

سبحان اللہ فداہ ابی و امی آپ کی تو یہ سیرت تھی کہ وانک لعلی خلق عظیم اور بالمؤمنین رؤف رحیم تھے مگر ہاں مصطفےٰ کمال کے پیش نظر تو اطالوی قانون عقوبت ہے جس میں وان تعفوا اقرب للتقوی کی آیۃ ہی نہیں ہے

---

[۵۱] الہدیٰ النبوی آغاز جلد دوم

ان حالات اور آئندہ کوائف کو دیکھتے ہوئے ابن سعود اور اخوان نجد نہ تھی کہ قابل برداشت ہوجاتی ہے بلکہ ذرا اور گہرے اترنے سے قابل تحسین و آفرین ماس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو موجودہ عالم اسلامی کی پست کنندہ حالتوں اور کیفیتوں سے باخبر ہیں۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے۔

اب چلئے ذرا آپ کو وادی نیل کی طرف لے چلیں جس کو عربی میں قبت الاسلام اور سفینۃ الاسلام کے گراں قدر القاب دیئے جاتے ہیں۔ ابھی حلقہ بگوشان توحید کے دلوں پر مصر کے قاضی علی عبدالرزاق ازہری کی کتاب الاسلام واصول الحکم کا زخم تازہ ہی ہوگا جس میں آنحضرت نے اسلام کے نصف حصہ کو جو دنیوی فلاح و بہبود سے متعلق تھا بالکل لغو اور بے معنی قرار دیا تھا اور جس کے رد میں تونس و مصر کے علماء کی طرف سے تین کتابیں ابھی ابھی نکلی ہیں جن میں ان کے پادر ہوا اور سفیہانہ استدلالات کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں کہ یکایک وہاں سے اور بھی تیز و تند طوفان در طوفان اٹھنے شروع ہوئے جنہوں نے راقم الحروف کی مہر سکوت کو توڑا اور اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ اپنے برادران دین کو حقیقی احوال سے آگاہ کرے۔

ایک صاحب جو دینی اور ایمانی غیرت سے متصف ہیں جرائد مصریہ کے جن میں السیاست آگے آگے نظر آتا ہے اس الحاد و زندقہ اور کفر و تعطیل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج سے پہلے تو اللواء المؤید اور الشعب وغیرہ اخبارات اگر بالفرض کہیں سے کسی داعی الحاد کی آواز اٹھتی تو علماء کو اس کے رد کی دعوت دیا کرتے یا خود ہی اس کا دنداں شکن جواب دے دیا کرتے تھے۔ مگر اب تو حالت دگر گوں ہوچلی ہے جو کوئی اپنے اخبار کو چلا کر جیب بھر لینا چاہتا ہے وہ ناجائز طور پر آزادی مطابع سے فائدہ اٹھا کر ملحدانہ مضامین شایع کرتا ہے۔ گویا وہ اپنے کو ایک اسلامی حکومت کے ممالک محروسہ میں نہیں دیکھتا بلکہ یوروپ کے کسی دہری ملک میں فالی اللہ المشتکی۔

اس تمسخر اور تفریح سے تنگ آکر اور حفاظت دین و ایمان کے فرض کا احساس کرکے چند مخلص علمائے ازہر اٹھے اور ایک ہفتہ وار اخبار انہیں بدلگاموں کی زبان دوزی اور دہان بندی کے لئے جاری کیا جس کا نام الفتح ہے جس کے چیف ایڈیٹر عالم ازہر جناب عبدالباقی سرور نعیم اور پروپرائٹر یا آنریری ایڈیٹر اور صاحب سیاست ہمارے محب صادق اور مخلص جاں نثار الشیخ محب الدین الخطیب ہیں اللہ ان کے ارادوں کو پورا کرے۔

ابھی چند روز ہوئے کہ مصر کے چند احمقوں نے برنطہ (ہیٹ) کی مدح سرائی اور طربوش (ترکی ٹوپی) کی مذمت میں متصل بیسیوں مضمونوں کا انبار لگا دیا تھا کہ جمعیت طبیہ نے ان کی حوصلہ افزائی کے طور پر تمدن و صحت کا مختصر ترین رسالہ ڈھونڈ نکالا اور اعلان کیا کہ ترکی ٹوپی نے لوگوں کی صحت جسمانی کو برباد کر رکھا ہے ان کے جسم لاغر کردئے ہیں ان کی تعداد اموات بڑھا دی ہے اور پیدائش کے اعداد و شمار کم کردئے ہیں جس سے ان کی تعلیمی حالت پست اور ان کے دماغی قواہ برباد ہوگئے ہیں۔

بس پھر کیا تھا سارے استعماری دیوتا ایک زبان ہو کر بول اٹھے کہ جی ہاں بالکل بجا ہے۔ ہاں صاحب وہ مدنیت علم اور طبیعت وفطرت کے بھی خلاف ہے نیز وہ اہل عرب سے مخالفت کے لئے بالکل غیر موزوں ہے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (نعوذ باللہ) ادہر ایک گروہ جو ذرا دینی اور ملی طبیعت کو خاموش کردینا بھی ضروری سمجھتا تھا لفظ طربوش کو یونانی الاصل قرار دیکر طربوش کو غیر اسلامی چیز بتا کر لوگوں کو ردوگرداں کرنے لگا مگر خدا میرے محترم علامہ احمد تیمور پاشا کا بھلا کرے کہ ادہوں نے طربوش کو سرپوش فارسی کا معرب دکھا کر اس کی اسلامی تاریخ پر ایک بے نظیر مضمون لکھا جس سے اس وہم کا تو قلع قمع ہو گیا۔ بعض طلباء حضرت سعد پاشا زاغلول سے استفسار کرنے لگے آپ نے فرمایا کہ طربوش کا مسئلہ بلحاظ ایک قومی پوشاک ہونے کے محض قومی بنگیا ہے سو اگر ہم نے اپنی پوشاک بدل دی تو دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا ہم نے اپنی قومیت ہی بدل ڈالی اور جس قوم میں قومیت نہ ہو وہ مردہ کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے ادہوں نے یہاں سے بھی منہ کی کھائی۔ ادھر جمعیۃ طبیہ کے شاندار جلسہ کی کیفیت سنئے جس کے بانی مبانی علی بک ابراہیم تھے کہ باوجود شدت اہتمام کسی نے اپنے سر اس مدنی ہم کے لئے پیش نہ کیا بجز ایک سر کے جو عنقریب اپنے دماغ میں سے سودائے تفرنج کو دور کردے گا۔ جب اس کو کوئی اپنا ہمنوا نہ ملے گا۔

ابھی یہ سلسلہ مصر کی فضا میں پھیل ہی رہا تھا کہ ایک سخت ترین ملحد نے اٹھ کر قرآن ودین پر سفیہانہ حملے شروع کردئے۔ ہماری مراد ڈاکٹر طہ حسین سے ہے جو من کان فی ھذہ اعمی فھو فی الآخرۃ اعمی کا مصداق ہے۔

یہ نوخیز اندھا ازہر میں تعلیم پاتا رہا اور پھر کوشش کی کہ وہاں سے عالمیت کی ڈگری حاصل کرے۔ امتحان میں بیٹھا اور فیل ہوا۔ بس پھر کیا تھا ازہر اور ازہری علماء کی تنقیص کو اپنا وتیرہ بنالیا اور ادھر جامعۂ مصریہ میں (جو اجنبی مداریوں کے اشارہ پر ازہر کی شان گھٹانے کے لئے بنائی گئی تھی اور جس کا مقصد مصر کے پیر نابالغوں کو رقص کرانا تھا وبس) اسی ڈگری کے لئے کوشش کی اور ذکری ابی العلاء لکھکر یہ ڈگری حاصل کی۔ اس کتاب میں حضرت نے یوروپ کے طریقۂ تصنیف کو جس میں ہر واقعہ کی تحلیل کی جاتی ہے اور ہر شے کے اسباب وعلل کی تلاش کی جاتی ہے بہت سراہا ہے اور قدیم طریقہ کو بہت کچھ برا بتا کر لکھا ہے کہ اس سلسلہ کی تمام گذشتہ تالیفیں ابوالعلاء کی تاریخ نہیں بن سکتیں بلکہ آیندہ تاریخ لکھنے والے کے لئے مواد کا کام دے سکتی ہیں فقط۔ یعنی گویا مارگو لیوتھ سلمون وغیرہ مستشرقین بھی مغرب کی تقلید میں آپ سے پیچھے ہیں۔ میں نے اپنی تالیف ابوالعلاء وما الیہ میں جو عنقریب مصر سے چھپکر نکلنے والی ہے ان کی چشم بصیرت وا کردی ہے اور ان کے لاتعداد جاہلانہ اقوال کی پوری طرح تردید کردی ہے

ہم نے اپنے سابق مضمون "ابوالعلاء اور مستشرق یورپ کے اغلاط" مطبوعۂ معارف میں وکالۂ یورپ کے مبلغ علم پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔

القصہ جامعہ کی منتظمین نے آپ کو تاریخ قدیم کا پروفیسر بنا دیا اور اب آداب عربیہ کے پروفیسر ہیں۔ اسی اثنا میں یہ یورپ گئے اور دل باختہ ہو کر آئے ایک میم سے شادی کر لی جس سے کچھ لڑکیاں بھی ہیں۔ اب ہر بات میں وہ مغرب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ان کے نزدیک علم اخلاق آداب غرض ہر شے اہل یورپ ہی کی ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

جامعہ کی کرسی اور حج مغرب نے ان کو کچھ اس درجہ برخود غلط بنا دیا کہ ان ہی دنوں ایک کتاب بنام الشعر الجاہلی[۱] لکھی جس میں اسلام پر نہایت ناپاک اور خام حملے کئے جن کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"موجودہ علوم کی روشنی میں دین بھی بظاہر اور احوال اجتماعیہ کی طرح ہے نہ وہ آسمان سے اترا ہے نہ وحی الٰہی سے اس کو کچھ سروکار ہے بلکہ وہ تو اسی خاک کا زائیدہ ہے جس طرح نفس جماعت بھی یہیں کی پیداوار ہے سو یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس علم کے جو دین کو ایسا کچھ سمجھتا ہے اور دین کے مابین کسی طرح اتفاق نہیں ہو سکتا"

"قرآن حکیم منزل من عند اللہ نہیں بلکہ وہ پادر ہوا افسانوں پر مشتمل ہے جو سیاسی اغراض کی بنا پر گھڑے گئے ہیں۔"

خاص مسلمانوں کی طرف سے ان بیہمانہ اعتراضوں کی بوچھاڑ نے غیرت ایمانی رکھنے والوں کو مجبور کیا کہ ادھر تو باقاعدہ ان کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں اور ترکی بہ ترکی جواب دیں اور ادھر وزارت مصری کا دروازہ کھٹکھٹائیں کہ شاہی مذہب پر ان بے جا حملات کے باوجود حکومت کیوں خاموش ہے۔

منصورہ سے بذریعہ تلغراف یہ فریاد اٹھی کہ ڈاکٹر طہ حسین کی دست درازیوں پر خاموش رہنے سے جس نے قرآن کی تکذیب اور سرکاری دین کی توہین کی ہے اس کی دلیری کو اور بڑھا دیا ہے جس سے اس نے جریدۃ سیاست نمبر ۱۹ میں لکھا ہے کہ "اللہ کا وجود اور انبیاء کی نبوت علم کے نزدیک خرافات ہے" اور کہ علم قرآن کی تکذیب کرتا ہے جس طرح اس نے پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ "تمام معاہد دینیہ بند کر دئے جائیں" بعد ۴۲ علماء داعیان کے دستخط ہیں۔

اس فریاد سے پہلے کے واقعات یہ ہیں کہ صاحب الفضیلۃ شیخ مصطفےٰ قادیانی نے جو مجلس نواب کے ممبر ہیں ذریعہ معارف سے اس سوال کا جواب مانگا ہے۔

آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہو گی کہ ڈاکٹر طہ حسین نے جامعہ کے طلبہ کے روبرو صاف صاف قرآن کی تکذیب کی ہے کہ وہ ابراہیم و اسمٰعیل کے کعبہ بنانے کا واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں کہ اس قصہ میں گونہ چالبازی کو دخل دیں جس کا

---

[۱] زبان اس کے متعلق صفحات آئندہ پر مولانا اختر صاحب کا مفصل مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

مقصد یہود و عرب اور تورات و قرآن میں باہمی لگاؤ پیدا کرنا ہے" صلا از کتاب الشعر الجاہلی۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں "سو اب اس قصہ کی حقیقت عیاں ہوگئی کہ یہ اسلام سے کچھ ہی پہلے گھڑ لیا گیا تھا۔ اور اسلام نے اس کو دینی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر قبول کر لیا۔ لہٰذا ادبی اور لغوی تاریخ کو چاہیئے کہ جب وہ فصیح عربی کی اصل کی کھوج نکالنے لگے تو اس قصہ کی طرف مطلق التفات نہ کرے" ص۲۹۔ پھر کتاب کے پہلے صفحہ میں لکھتے ہیں کہ "میں اس بحث کو پھیلانا چاہتا ہوں یعنی کہ تحریر کرنا گو جامعہ کے طلبا کے سامنے جو دو سو سے کسی طرح کم نہ ہوں گے اس کا اعلان کر دینا بھی شہرت میں کسی طرح کم نہیں" اور پھر آگے چند مطالبات ہیں جو آئندہ آئیں گے۔

علماء کے اس نیا دلیلا پر معدن الحاد یعنی جریدہ سیاست اپنے نمبر ۲ جولائی میں لکھتا ہے کہ طٰہٰ حسین کی کتاب پر علماء نے بہت چیخ پکار کی ہے حالانکہ جب پچھلی وزارت میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا تو تمام ارباب حل و عقد نے صاف کہدیا تھا کہ کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں جس کا نوٹس لیا جائے نیز جامعہ کی کونسل نے فیصلہ کر دیا ہے کہ کسی سرکاری مجلس کو حق نہیں کہ وہ جامعہ کے امور میں ہاتھ ڈالے۔ بایں ہمہ ڈاکٹر موصوف نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر جامعہ نے کتاب کی تمام کاپیاں خرید کر فتنہ کا سدباب بھی کر دیا تھا۔ شیخ الازہر نے اس حل کو منظور کر کے قضیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ سو بحالات موجودہ علماء کا اس مسئلہ کو دوبارہ چھیڑنا اُن کی نیک نیتی پر محمول نہیں کیا جاسکتا وغیرہ"۔

یہ سارے بیانات یا خلاف واقع ہیں یا دیدہ و دانستہ اغماض کرتے ہیں جس طرح الفتح میں اُن کے حرف حرف کی پوری تکذیب کی گئی ہے۔

مصر کے مشہور انشا پرداز فاضل شیخ مصطفےٰ صادق رافعی نے اس اعجوبہ پر کوکب الشرق میں ایک مضمون بعنوان "دکھانے کا مسلمان نہ حقیقی" سپرد قلم کیا ہے جس میں ایک تناقض پر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ قرآن بلکہ جمیع ادیان کی تکذیب کرنے کے باوجود جس طرح اُس کا دعویٰ ہے پکا مومن بھی ہے۔ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔

علماء کی اس شدید مقاومت سے تنگ آ کر ڈاکٹر مذکور نے سیاست میں دو مضمون لکھے۔ جن میں وہ یوں اپنی ہٹ پر اصرار کرتا ہے کہ

"دین ایک طرف ہے اور علم دوسری طرف۔ دونوں کا اتحاد ناممکن ہے جو دونوں کو ملانا چاہے وہ یا دھوکہ باز ہے یا خود فریب خوردہ"۔

پھر فرماتے ہیں کہ

"علم جس طرح میرے دوست عزمی کا قول ہے ہمیشہ اپنے نئے نئے مدارج میں ترقی پذیر ہے سو اگر آج ہم

کسی تورات یا قرآن کی آیۃ کی ایک تاویل کرتے ہو تو مجبوراً تمہیں کل ایک اور تاویل کرنی ہوگی۔ الخ"

ہاں یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر مذکور الحاد کے اقانیم ثلثہ میں سے ایک ہیں اور باقی دو استاذ محمود عربی اور ڈاکٹر ہیکل ہیں۔

اور دوسرے مضمون کا جو ۶ محرم کے سیاست میں علمائے ازہر پر دیا ہوا لوٹا ہے مختصر اقتباس حسب ذیل ہے۔

میں ارکان پارلیمنٹ سے جن کے ہاتھ میں آج کل مصر کی زمام اختیار ہے صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ شیوخ کے جمود نے مصر میں ایک شر عظیم پیدا کر دیا ہے۔ میں پھر علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اُن کے تئی فرائض اُن سے دو باتوں کا انصرام چاہتے ہیں (۱) موقت ہے مگر ضروری کہ قانونی اور سیاسی وسایل سے کام لے کر شیوخ کو اس امر سے باز رکھا جائے کہ وہ قوم کی عقلی سیاسی اور علمی زندگی پر قابض ہو جائیں۔ (۲) اس جمود کا انسداد کیا جائے اور موجودہ اور آیندہ نسلوں کو اس کے شر سے بچا لیا جائے۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب تک ازہر موجود ہے اور جب تک اُس کے ملحقہ مدارس اضلاع میں منتشر ہیں۔ برابر فساد چند در چند ہوتا رہیگا۔ بھلا مدارس حکومت کی مدنی تعلیم اور ازہر کی دینی بغیر ٹکرائے کیونکر ساتھ ساتھ چل سکیں گی۔

علمائے وزارت کو سخت تہدید کی ہے اور زوردار وسائل سے کام لینے کی دھمکی دی ہے اور چند امور کا مطالبہ کیا ہے کہ ایسے آدمی کو برطرف کر دیا جائے اُس کو قرار واقعی سزا دی جائے، کتاب کو معدوم کر دیا جائے، آیندہ کے لئے جرائد کو ایسے مضامین شایع کرنے سے روکا جائے، اور مذہبی آزادی کی واقعی تشریح اور حد بندی کر دی جائے تاکہ پھر کسی کو سرکاری مذہب پر طعن کرنے کی جرأت نہ ہو۔

جہاں تک معلوم ہے وزارت نے بعض امور کا واقعی سدباب کر دیا ہے اور بعض کے متعلق ہنوز اُس کے جواب کا سخت انتظار کیا جا رہا ہے۔

ہم نے بخوف طوالت اِن بے معنی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی کہ یہ اعتراضات ان حضرت کے زادۂ طبع نہیں بلکہ وہ تو محض مبشرین مسیحیت کی آنریری طور پر خدمت بجا لا رہے ہیں اور اپنی جہالت کے باعث استعمار کی بیڑیوں کو اپنے پاؤں میں اور بھی مضبوط کر رہے ہیں اور مغرب کی دماغی بندگی کر کے بقول عرب لا فی العیر ولا فی النفیر کہیں کے نہیں رہے۔ نیز اس فرض کو القمح نے پورے طور پر ادا کر دیا ہے۔

آخر میں ہم اُسی فقرے کو دہراتے ہیں اللّٰہم اھد امۃ محمد صلعم

اے لبِ را پردۂ یثرب بخواب * خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

شعر جاہلیت کا انکار

اور

"جامعہ مصریہ" کا ایک ملحد

(از مولانا قاضی احمد میاں صاحب اختر (جوناگڈھی)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین جامعہ مصریہ کا سند یافتہ اور وہاں عربی ادبیات کا پروفیسر ہے۔ جامعہ مذکورہ میں اس نے چند لکچر دیتے ان لکچروں کو اس نے کتابی صورت میں جمع کرکے الشعر الجاہلی کے نام سے شایع کیا ہے اس کتاب نے مصر کے مذہبی طبقہ کو بہت برانگیختہ کردیا ہے! اور وہاں کے علماء اور ادباء نے اس کی تردید کی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں اسلام پر بعض در پردہ حملے کئے گئے ہیں اس بناء پر جامع آزہر کے شیخ نے جو مذہبی درسگاہوں کے صدر اور امور مذہبی کے رئیس ہیں علماء آزہر کی ایک کمیٹی مقرر کرکے اس کو اس کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالنے اور قابل گرفت امور بابت رپورٹ کرنے کا کام سپرد کیا تھا۔ چنانچہ کمیٹی مذکورہ نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنا رپورٹ مرتب کرکے شیخ موصوف کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔ یہ رپورٹ اخبار المقطم میں شایع ہوا ہے۔ ترجمہ حسب ذیل ہے۔

اختر

مخدوم و محترم حضرت مولانا استاد اکبر شیخ جامعۃ ازہر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آنجناب کے حسب الحکم قرآن کریم کی تکذیب سے متعلق۔ جو طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب الشعر الجاہلی میں کی ہے تفتیش کرنے کے لئے ہماری کمیٹی کا اجتماع ہوا تھا اور چنانچہ کافی مطالعہ تفحص اور استقراء کے بعد اس کا رپورٹ مرتب کیا گیا ہے جو ارسال خدمت ہے۔

"یہ کتاب ۱۸۳ صفحات پر ہے اور اس کا موضوع شعر جاہلیت کا انکار ہے کیونکہ اس کے مصنف کے خیال میں یہ کلام بعد از اسلام کا وضع کیا ہوا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ اس نے اپنی اس بحث کی بنیاد دیکارٹے فرانسیسی فلسفی کے تتبع میں اپنے مذہب اور قوم سے علیحدہ ہو کر رکھی ہے۔ کتاب مذکور تمام تر الحاد اور زندقہ سے مملو ہے اور اس میں متعدد ارشادات پائے جاتے ہیں جو مذہب اسلام کے خلاف ہیں۔ ان کو ایسے طلباء کے سامنے بیان کرنا جو دینی معلومات سے بے بہرہ ہیں، بیحد خطرناک اور ان کے عقاید فاسد بنانے والے، قوم میں فتنۂ عظیم برپا کرنے والے اور حکومت اور ملکی مذہب کے سراسر خلاف ہے۔

اس کمیٹی کی رائے ہے کہ ملک کی تعلیم سے جب تک اس روح الحاد کا استیصال، اس شجر عظیم کی بیخکنی نہ کی جائے۔ اور حلقۂ تعلیم کو اس لامذہبیت سے پاک نہ کر دیا جائے (جس کی بعض افراد "آزادی رائے" کے پردے میں کر رہے ہیں) تو نظام تعلیم کے بگڑنے، فوضویت پھیلنے اور امن عامہ میں خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ ہے کیونکہ مذہب ہی بنیاد امن و اطمینان کی ہے۔

اگرچہ بادی النظر میں اس کتاب کا موضوع شعر جاہلیت کا انکار ہے مگر درحقیقت بادنیٰ تامل معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کفر و الحاد کے ستونوں میں سے ایک بڑا ستون ہے جو مذاہب کی عمارت کو منہدم کر دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مذہبی خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کر کے اس کے ضمن میں عربی اصول لغت کی بڑی اصل یعنی جاہلیت کے کلام نظم و نثر کا انکار کیا ہے۔ جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ فی الجملہ یہ مقصد ہے اس کتاب کا۔ اب ہم اس کے بعض صریح کفریات اور ملحدانہ مقامات کو پیش کرتے ہیں۔

مؤلف صفحہ ۲۶ میں لکھتا ہے:-

"توراۃ اور قرآن مجید کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ابراہیم اور اسمٰعیل کا ذکر کر دے لیکن ان میں ان دو ناموں کا ایراد ان کے وجود کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اس قصہ کے اثبات کے علاوہ جو اسمٰعیل بن ابراہیم کی ہجرت مکہ سے تعلق رکھتا ہے۔"

مولف نے اس طرح سیدنا حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) کی ہجرت کا انکار کرتے ہوئے قرآن مجید میں ان کے ناموں کے ورود کو تاریخی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی صریح تکذیب ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذ قالَ ابراهیم رَبِّ اجعل هٰذا البلد امنا واجنبنی وبنیّ ان نعبد الاصنام، رب انهن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانه منی ومن عصانی فانک غفور رحیم۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم، ربنا لیقیموا الصلوة فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون۔	اور جب کہا ابراہیم نے اے رب اس شہر کو پُرامن بنادے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ (کیونکہ) اے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہیں جس نے میری پیروی کی وہ مجھ میں سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے رب بے شک میں نے اپنی ایک اولاد میدان میں جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے نزدیک تاکہ اے رب وہ نماز کو قائم کریں پس لوگوں کے دلوں کو ایسا بنادے کہ ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ اور ان کو میووں سے رزق عطا کر شاید وہ شکر ادا کریں۔ (ابراہیم)

پھر اسی صفحہ میں رقمطراز ہے:۔

"ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ہم اس قصّہ (قصّہ ہجرت) کو ایک قسم کا "حیلہ" سمجھیں جو ایک طرف یہودیوں اور عربوں میں اور دوسری طرف قرآن اور توراۃ کے مابین اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے"۔

اپنے اس قول میں وہ صریح کرتا ہے کہ قرآن مجید نے یہ "حیلہ" اس لئے وضع کیا ہے کہ وہ جھوٹ موٹ سیاسی یا مذہبی اسباب کی بناء پر اہل عرب کو ایک بزرگ خاندان اور سلسلۂ نسب سے منسوب کرکے یہود کے ساتھ اتحاد پیدا کرائے۔

یہ انتہائی فحش و فجور اور طعن علی القرآن ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی "ابوت عرب" پر جس کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ — اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی گئی جو تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب ہے۔

صفحہ ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ساتویں صدی عیسوی میں اہل عرب کی طبیعتیں اس قسم کی اساطیر (واقعہ ہجرت) کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھیں"

آگے چل کر ۲۸ میں تو یہاں تک لکھتا ہے:۔

"پس کوئی وجہ ایسی نہیں تھی جو قریش کو اس بات کے قبول کرنے سے باز رکھتی کہ کعبہ حضرت اسمٰعیل و ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے جیسا کہ رومیوں نے اس سے قبل اور اسی طرح کے مشترک اسباب کی بناء پر ایک اور اسطورہ سے (legend) (جس کو اہل یونان نے وضع کیا تھا) کہ روما اینیاس بن بریام صاحب طرِوادہ سے منسوب ہے تسلیم کرلیا تھا۔ یہی حالت اس قصہ کی ہے۔ پس یہ قبل از اسلام کا بنایا ہوا اور حدیث العہد ہے۔ اسلام نے دینی اغراض کے اس میں غلو کیا اور اہل مکہ نے سیاسی اغراض کے لئے اس کو تسلیم کرلیا۔ اس لئے تاریخ ادبی و لغوی کا فرض ہے کہ وہ عربی زبان کی اصل کا سراغ لگاتے وقت اس قصہ کی طرف توجہ نہ کرے۔

مندرجہ ذیل آیات قرآنی کی صریحی تکذیب ہے کہ:۔

(۱) واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل الخ (سورۂ بقرہ)	اور جب ابراہیم اور اسماعیل اس خانۂ (خدا) کی بنیادوں کو اونچا کریں گے۔
(۲) واذ بوأنا لابراھیم مکان البیت الا تشرک	اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ (کعبہ) کی جگہ مقرر کردی تاکہ

بی شیئاً وطہر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلیٰ کل ضامر یاتین من کل فج عمیق

میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھے اور حج کے لئے لوگوں میں ندا کر کہ وہ پیادہ پا اور لاغر اونٹ پر راہ دور و دراز سے سوار ہو کر تیرے پاس آئیں۔

(۳) واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی وعہدنا الیٰ ابراھیم واسماعیل ان طہرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود

(۳) پکڑو جہاں ابراہیم کھڑا ہوا نماز کی جگہ اور عہد لیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے کہ پاک رکھیں میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے۔

اس کے علاوہ اور وہ آیات جو اس موضوع پر قرآن مجید میں موجود ہیں۔

مصنف تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس میں مذہبی اور سیاسی اغراض کے لئے حیلہ اور تدلیس سے کام لیا گیا ہے اور ان ہی اغراض کی ماتحت یہ جھوٹے قصے وضع کئے گئے ہیں۔ گویا مؤلف اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مجید اپنے تاریخی قصص میں معتبر اور قابل اعتبار نہیں۔

یہ کفر فاحش طلبا کی ذہنیت پر کیسا کچھ اثر نہ ڈالے گا اور ان کے مذہبی عقاید کو ملیا میٹ نہ کر دے گا۔ پھر اس تکذیب کے بعد صحت اور اعتبار کے لحاظ سے ان کے دلوں میں قرآن مجید کی کون سی وقعت باقی رہے گی

صفحہ ۳۳ میں لکھتا ہے :-

"قرآن مجید کے متعلق ایک روایت چلی آتی ہے (اور اگر ہمارے یا کسی اور شخص کے پاس اس کا استقصا کرنے اور اس پر تفصیل سے بحث کرنے کے لئے کافی وقت ہوتا تو اس کو بیان کر سکتے) وہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی زبان اور ایک ہی لہجہ میں تلاوت کیا جاتا ہے اور کہ وہ قریش کی زبان میں اور ان ہی کے لہجہ میں ہے حالانکہ عرب کے مختلف قبایل کے پڑھنے والوں کی وجہ سے اس کی قرأتین مختلف اور اس کے لہجے متعدد ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے اس میں بہت بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔"

آگے چل کر لکھتا ہے :-

ہماری مراد یہاں اختلاف قرأت سے ہے جس کو عقل قبول کرتی ہے، نقل اس کی اجازت دیتی اور ضرورت اس کی مقتضی ہے، وہ قبایل عرب کے مابین لہجوں کا اختلاف ہے جو اس بات پر قادر نہ تھے کہ اپنے گلوں۔ زبانوں اور ہونٹوں کو بدل دیتے۔ تاکہ وہ بھی ایسا ہی قرآن مجید پڑھ سکتے جیسا کہ پیغمبر اسلام اور اُن کے اہل قبیلہ کیا کرتے تھے۔ پس ان کی قرأت ان کے طرز تکلم کے مطابق ہوا کرتی تھی۔"

یہاں مؤلف اس بات کا انکار کرتا ہے کہ قرأتیں آنحضرت صلعم سے منقول نہیں ہیں بلکہ وہ قبایل کے اختلاف لہجات کی وجہ سے ہے یعنی اس کے نزدیک قرات سبعہ آنحضرت سے منقول نہیں ہے۔ حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ قرات سبعہ متواتر اور بذریعہ وحی اتاری گئی ہیں اور کہ اُن کا منکر کافر ہے۔

مقدمات مندرجہ کے علاوہ کئی صفحات اس کی کتاب کے ایسے ملال انگیز اشارات سے بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ صلا میں لکھتا ہے :۔

"ظہور اسلام کے وقت اور بعد میں اہل عرب میں یہ خیال رائج ہوگیا کہ اسلام دین ابراہیمی کی تجدید کرنیکو آیا۔"

اس سے پہلے کے ایک صفحہ میں لکھتا ہے :۔

"لیکن مسلمانوں نے یہ چاہا کہ وہ مذہب اسلام کی اولیت کو بلاد عرب میں ثابت کردیں کہ وہ آنحضرت سے قبل بھی موجود تھا اور کہ مذہب اسلام خلاصہ اور نتیجہ ہے ان مذاہب حقہ کا جن کو خدائے تعالیٰ نے اگلے پیغمبروں پر اس سے قبل نازل کیا تھا۔"

یہ آیات ذیل کی صریح تکذیب ہے :۔

ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین (نحل)	پھر ہم نے تیری طرف وحی نازل کی کہ ابراہیم موحد کے مذہب کی پیروی کر اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔
ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین اٰمنوا	ابراہیم سے زیادہ مناسبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے۔

یہ بعینہ وہی باتیں ہیں جو نزول قرآن کے وقت مشرکین طعنا کہا کرتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔

وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ واعانہ علیہ قوم اٰخرون فقد جاؤا ظلما وزورا وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا (فرقان)	اور کافروں نے کہا یہ کچھ نہیں مگر جھوٹ جو باندھ لایا ہے اور اس میں اس کو مدد دی دوسری قوم نے پس تحقیق وہ آئے ناانصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے یہ کہانیاں ہیں جو لکھی ہیں سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح اور شام۔

لہٰذا یہ کمیٹی آنجناب کی خدمت اقدس میں مؤلف کے صریح کفریات سے صرف وہی باتیں پیش کرتی ہے جو بہت کم وقت میں اس نے معلوم کی ہیں۔ علاوہ ازیں جو کچھ اس نے اپنی کتاب کے ضمن میں الحاد و زندقہ کا اظہار کیا ہے اُس کو نظرانداز کردی ہے۔

ہم آنجناب اور حکومت مصر کی خدمت میں مطالبہ کرتے ہیں کہ اس ملحد اور باغی مذہب شخص پر حد شرعی جاری کی جاوے۔ خصوصاً اس جرم کے لئے کہ اس نے تعلیم کی آڑ میں یہ باتیں مذہب کی عمارت کو منہدم کرنے کے لیے ضمناً داخل کی ہیں۔ جن کی وجہ سے آئے دن ہم ایک حادثہ سے فارغ نہیں ہوتے کہ دوسرا حادثہ رُونما ہوتا ہے جو عام مسلمانوں کو اپنے مذہب پر مطمئن نہیں رہنے دیتا۔

بنابریں ہم آنجناب اور حکومت سے یہ استدعا کرتے ہیں کہ ابناء ملک کی حفاظت کی خاطر اس مرض کا سد باب کردیا جائے جو بری طرح پھیل رہا ہے کہ یہ لوگ آگے چل کر ملک و قوم کے مہمات امور میں ارباب حل و عقد ہونے والے ہیں۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مسلمانوں کا روپیہ اور ان کے اوقاف ایسی تعلیم پر کیوں ضائع کردئے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ اس الحاد کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور جس کی اشاعت پر یہ داعی الحاد تلا ہوا ہے حالانکہ اس کو اسی روپیہ سے بہت بڑی تنخواہ دی جاتی ہے۔

کیا وزارت معارف اسی طریقہ سے قوم اور آئندہ نسلوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے؟ اور کیا اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے؟

اُمید ہے کہ آنجناب ہماری اس تحریر سے اتفاق فرمائیں گے۔

۲۶ شوال ۱۳۴۴ھ

دستخط کنندگان

محمود الدیناری۔ عبد المعطی الشرشمی۔ محمد عبد السلام القبانی۔ عبد ربہ مفتاح۔ عبد الحکیم عطا

محمد ہلال الابیاری۔ عبد الرحمٰن المحلاوی۔ محمد علی سلامہ

---

۱ یہ اشارہ ہے قاضی علی عبد الرازق کی کتاب الحکم والاسلام کی طرف جس پر علماء ازہر کی جانب سے مواخذہ ہو چکا ہے۔

شہزادہ مراد بخش کی نظر بندی

(از جناب مولوی مظہر احمد ادھمی "مُلا"، "منشی"، فاضل)

تمام مؤرخ اس بات میں ہمزبان ہیں کہ شہزادہ مراد بخش کی طبیعت کی اُفتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ ذراسی بات پر مزاج میں برافروختگی پیدا ہو جاتی تھی اور سادہ لوح ایسا کہ جہاں مصاحبوں نے الٹی سیدھی خوشامدیں کیں کہ وہ اُن کے کہنے میں آگیا۔

مراد بخش کی نظر بندی کی کُل ذمہ داری خود اُس کی ذات پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ جو جال اُس نے محی الدین احمد عالمگیر اورنگ زیب کے لئے نصر شاہ عباس کے مشورہ سے پھیلایا تھا وہ خود معہ اپنے غلط کار مشیر کے اُس کا شکار ہوا۔ عرب کا مقولہ ہے۔ "البادی اظلم"۔ چنانچہ آج مہذب دُنیا بھی اسی پر عامل ہے۔ اور جنگ کی تمام ذمہ داریاں اسی قوم یا حکومت پر عاید کی جاتی ہیں جس کی طرف سے ابتدا ہو۔ چنانچہ جنگ عظیم کا تمام الزام اسی بناء پر جرمنی پر عاید کئے گئے اور اُسکا خمیازہ بھی اسی کو بھگتنا پڑا۔

سموگڈھ کی فتح تک کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اورنگ زیب نے شہزادہ مراد کیساتھ بدسلوکی کا ارادہ کر لیا تھا۔ بلکہ اس وقت تک سختی کے ساتھ اُس معاہدہ کا پابند تھا جو دونوں میں ہوا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ شاہی اعزاز سے پیش آتا تھا اور شاہ کے لقب سے تخاطب کرتا۔ بدنیتی کی ابتدا، مراد کی جانب سے ہوئی۔ اُس زمانہ میں سلطنت کے واسطے اپنے بھائی، چچا اور قریب سے قریب رشتہ دار کو انتہائی سرد مہری کے ساتھ نیست و نابود کر دینا اعلیٰ طبقہ میں ایسا ہی جائز خیال کیا جاتا تھا جس طرح آج کل مہذب اقوام میں کمزور اور مغلوب اقوام کو پامال کرنا اور ہر ممکن طریقہ سے مٹا دینا عین مصلحت اور پالیسی پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔

اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مراد اس بدنیتی کا مرتکب ہوا اُس نے ایک روز اورنگ زیب کو دعوت کے حیلہ سے بُلا کر گرفتار اور قتل کرنا چاہا اور جب اورنگ زیب دعوت میں شریک ہوا تو قرائن سے معاملہ کی اہمیت کو سمجھ گیا اور حکمت عملی سے اپنے آپ کو موت کے مُنہ سے چھڑا لیا اور بعد میں حفاظت خود اختیاری کے اصول پر شہزادہ مراد بخش کو گرفتار کر کے نہایت احترام کے ساتھ گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ ہم کرنل ڈاؤ[1] کی تاریخ سے اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا

[1] Col: Daws' Work upon Hindustan Vol: III P.234

ہے کہ سموگڈھ کی فتح کے بعد مراد بخش کے مصاحبوں نے اس کو کچھ ایسے سبق پڑھائے کہ وہ دل ہی دل میں اورنگ زیب سے حسد کرنے لگا اور یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُس کو قتل کر دے تاکہ کسی قسم کا اندیشہ باقی ہی نہ رہے۔ اور وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کا بادشاہ بن جائے اگرچہ اورنگ زیب اسی کو بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اس خیال کو لئے ہوئے مراد نے ایک فوج مرتب کی اور بھائی کے ساتھ آگے بڑھنے میں روپیہ نہ ہونے کا عذر پیش کیا۔ چونکہ اورنگ زیب کو کسی قسم کی بدگمانی نہ تھی اس لئے نہایت فراخدلی کے ساتھ بیس لاکھ روپیہ بھیج دیا۔

مراد بخش ابھی متھرا کے کیمپ پر پہنچا ہی تھا کہ اورنگ زیب کو ایک شاہی ضیافت میں مدعو کیا۔ چونکہ اس کو بھائی کے ظاہری برتاؤ کی بنا پر پورا اطمینان اور بھروسہ تھا اس لئے وہ نہایت خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ اس ضیافت میں شریک ہوا۔ یہ دونو بھائی دسترخوان پر بیٹھے ہی تھے کہ نظر شاہ عباس آیا۔ یہ شہزادہ مراد کے باورچیخانہ کا افسر اور راز دار تھا۔ اس نے مراد کو اشارہ سے بلا کر کہا "اورنگ زیب کے شاندار لباس کے خاتمہ کا زرین موقعہ یہ ہی ہے۔

اورنگ زیب جس کو صورت دیکھکر دلی جذبات کے پتہ لگانے میں خاص کمال تھا فوراً تاڑ گیا جس پر مراد کی حرکات و سکنات نے شہادت کی مہر لگادی۔ مگر وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس خونی منظر کو دیکھتا رہا۔ مگر اپنے چہرہ یا حرکات سے کسی قسم کے خوف و خیال کا اندیشہ تک ظاہر نہ ہونے دیا تا آنکہ مراد نے نظر شاہ عباس کو یہ کہکر رخصت کر دیا کہ "اشارہ کے منتظر رہو"۔

اب تو اورنگ زیب کو پورا یقین ہو گیا کہ آج میرا قصہ تمام ہے مگر اس دور اندیش نے زبان سے ایک حرف بھی نہ کہا اور چند لمحوں کے بعد مچھلی کی طرح فرش پر تڑپنے لگا کہ درد گردہ کی وجہ سے بے چین ہے اس کی بے چینی اور کراہنے کی آواز سُن کر اس کے باڈی گارڈ کے سردار آموجود ہوتے اور مریض کو فوراً اپنے کیمپ میں لے آئے۔ تین روز تک اورنگ زیب نے کسی پر معاملہ کا انکشاف نہ ہونے دیا اور برابر علاج ہوتا رہا۔

مراد کی سادہ لوحی نے بھائی کو سچ مچ کا بیمار خیال کر لیا۔ اور اپنے کرتوتوں پر ذرا بھی نظر نہ ڈالی اور ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہ کیا کہ میرے ارادے کو اورنگ زیب بھانپ گیا اور اس حکمت عملی سے اپنی جان بچا کر چلا گیا۔ تین روز کے متواتر علاج کے بعد اورنگ زیب کو مصنوعی درد گردہ سے صحت ہوئی۔ اب اپنے غسل صحت کا ایک جشن منایا اور اس میں مراد کو بھی مدعو کیا اور لکھا کہ ایک طائفہ اس کے یہاں آیا ہے جو اپنے آپ کو علم موسیقی کا ماہر ظاہر کرتا ہے اس کے حسن ظاہری اور باطنی کی تعریف کچھ اس خوبی کے ساتھ کی کہ مراد جو عیش و عشرت کا بندہ تھا فوراً آمادہ ہو گیا اور باوجود اپنے چند مشیروں کی ممانعت کے بھائی کے کیمپ میں چلا گیا۔

مراد کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ جوں ہی وہ اندرونی خیموں میں داخل ہوا تو چند نوجوان عورتوں نے ایسا پرتپاک استقبال کیا۔

کہ وہ حیران رہ گیا۔ پھر کچھ اس ناز و انداز سے گایا بجایا کہ مراد جو خود بھی راگ رنگینیوں سے باخبر تھا مست ہو گیا۔ اور فوراً شراب کا حکم دیا۔ "شراب" کا لفظ نکلنا تھا کہ فوراً تعمیل کی گئی۔ دور پر دور چلنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نشہ میں چور ہو گیا۔ نیند کا غلبہ پا کر پلنگ پر جا لیٹا اور ایک عورت کے زانو پر سر رکھ کر دین و دنیا سے بے خبر ہو گیا۔ دوسرے خیمہ میں اس کے سردار اور باڈی گارڈ لطف اٹھا رہے تھے۔ اور اپنے آقا کی طرح وہ بھی نشے میں ایسے چور اور مدہوش ہوئے کہ اپنے آقا کی نگرانی اور حفاظت جان تک کا خیال نہ رہا۔

اورنگ زیب پہلے تو اس منظر کو بغور دیکھتا رہا اس کے بعد ظفر جنگ اور تین دیگر سرداروں کو حکم دیا کہ وہ خیمہ میں جا کر مراد کو مقید کر لیں۔ جب یہ لوگ پلنگ کے پاس آئے تو دیکھا کہ اورنگ زیب نے مراد کی تلوار پیش قبض کو پہلے ہی سے علیحدہ کر دیا ہے۔ جیسے ہی مراد کو گرفتار کرنا چاہا وہ بیدار ہو گیا۔ چاروں طرف دیکھا اور اس قدر زور سے چلایا کہ گرفتار کرنے والے سردار خوف زدہ ہو کر لرزنے لگے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر اورنگ زیب جو پس پردہ کھڑا تھا سامنے آیا اور تہدید کے لہجہ میں کہا "آپ نے میری جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا اگر میں بھی آپ کی طرح بے خبر ہوتا تو آج مجھے قید خانہ میں پہنچے تیسرا دن ہوتا۔ لہذا آپ کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ یا تو خود کو حوالہ کر دیجئے یا موت کو ترجیح دیجئے۔" اس کے بعد اپنے سرداروں کو حکم دیا اگر یہ ذرا بھی سرتابی کریں تو ان کو باندھ لو۔ مراد نے بھائی کی یہ ملامت سن کر اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو ظفر جنگ کے حوالہ کر دیا۔

نظر شاہ عباس جو مراد کا خاص مشیر تھا دوسرے خیمہ میں میر بخش کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس کے خیمہ کی رسیاں کاٹ دی گئیں اور خیمہ نظر شاہ عباس پر آ گرا وہ دب کر زخمی ہوا اور گرفتار ہو گیا۔ مراد کا باڈی گارڈ اور دوسرے سردار فوراً اورنگ زیب کے روبرو پیش کئے گئے۔ جنہوں نے وفاداری اور اطاعت شعاری کی قسم کھائی۔

آدھی رات بھی نہ گذری تھی کہ یہ سب قصہ ختم ہو گیا اور صبح صادق سے پہلے پہلے مراد مع اپنے ساتھیوں کے ہاتھی پر سوار کر کے آگرہ بھیج دیا گیا جہاں سے وہ بروقت گوالیار منتقل کر دیا گیا۔ جہاں مراد کے لئے ہر قسم کا عیش و آرام مہیا کیا گیا تھا۔ لیکن صرف آئندہ خانہ جنگی کے خیال سے اس کی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔

علی نقی خاں کے لڑکوں نے جب مراد پر قتل کا دعویٰ دائر کیا تو اورنگ زیب کو سخت صدمہ ہوا اور خون بہا دیکر معاملہ کو ختم کرنا چاہا اور بہت سی تدابیر کیں لیکن مستغیث قتل ہی پر مصر تھا۔ اس لئے مقدمہ محکمۂ قضا کے سپرد کر دیا۔

مراد کے قتل کی نسبت اکثر مؤرخوں نے سخت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان سے بڑھا ہوا تبرا ان حضرات کا ہے جو اس واقعہ قتل کو نہایت شد و مد کے ساتھ بیان کرتے اور بلا دلیل اورنگ زیب پر الزام لگایا کرتے ہیں۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا کہ اس موقعہ

پر قتل مراد کے اصل واقعات خافی خاں کی تاریخ اور عالمگیر نامہ سے ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔

خافی خاں کا باپ شہزادہ مراد کا خاص معتمد اور ملازم تھا۔ اور جو کوششیں مراد کو قلعۂ گوالیار سے بھگا لے جانے کی کی گئیں ان میں وہ خود بھی شریک تھا اور دل سے مراد کا طرفدار اور بہی خواہ تھا۔ خود اس کا بیان ہے کہ " مراد بخش نے علی نقی خاں کو بے گناہ مار ڈالا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے جنھوں نے قتل کا دعویٰ مراد پر دائر کیا۔ بڑا بیٹا اورنگ زیب کے سمجھانے بجھانے پر دعوے سے دست بردار ہوگیا۔ مگر چھوٹا بیٹا کسی طرح بھی راضی نہ ہوا "

قتل کا ثبوت[52] مکمل تھا۔ ملزم کو اقرار بھی تھا۔ قاضی نے اندرونی طور سے جب وہ گوالیار کے قلعہ میں مراد کے شاہانہ اعزاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان قلمبند کر رہا تھا چاہا کہ وہ اقرار نہ کرے سگر ملزم نے صاف اقرار کیا تو پھر قاضی نے سزائے قصاص تجویز کی۔ مگر اورنگ زیب محض اس دعوے کی بنا پر مدعی سے عمر بھر ناراض رہا چنانچہ خافی خاں جیسے مخالف کے قلم سے جو الفاظ اس معاملہ میں نکلے وہ ملاحظہ ہوں۔

" چوں پسر کلاں از دعویٰ خون پدر ابا نمود۔ بادشاہ قدردان (یعنی) اورنگ زیب از فرسول خدمات حضور و دیگر عنایات نسبت حال او شدند "

جب کہ بڑے بیٹے نے باپ کے دعویٰ خون سے دست برداری پیش کردی تو بادشاہ قدر دان یعنی اورنگ زیب نے دربار کی خدمات اُس کو بخشیں اور قسم قسم کی عنایات اُس کے حال پر کرتا رہا۔

قدیم تعلقات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ خافی خاں مراد کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا اور اورنگ زیب سے سخت متنفر۔ اس وجہ سے اس مورخ نے حتی الامکان حقیقت پر پردہ ڈالنے کی سخت کوشش کی مگر سچ ہر حال میں ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے مندرجہ بالا الفاظ خود بتلاتے ہیں کہ اُس کا یہ بیان کہ " قیاس ہوتا ہے کہ مراد کے قتل کا دعویٰ اورنگ زیب کی ایما سے دائر ہوا ہو " قطعی غلط ناقابل تسلیم اور اس مصنف کی سادہ لوحی اور من گھڑت کا بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح بعض دوستوں کی تاریخ دانی جو زبان فارسی اور تاریخ سے بے خبر ہونے کے باوجود اورنگ زیب پر الزام عاید کیا کرتے ہیں اور بھی مضحکہ خیز ہے۔

---

۵۱ عثمانیہ یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ تاریخ جلد سوم ۲۷۶ ۵۲ عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۶۔ ۵۳ منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۱۵۶۔

"رسم الخط"

(تمکین کاظمی)

"یہ مضمون صرف میری ہی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مسٹر عباس شروانی"
"کے مضمون (الف، ب ت) مطبوعہ مخزن جلد (۱۱) نمبر (۴) بابت ۱۹۰۶ء اور مولوی سید یوسف الدین صاحب"
"مرحوم صوبہ دار گلبرگہ کی تصنیف (الخط الاسلامی) سے بھی مدد لی گئی ہے۔"

"تمکین"

الف، ب، ت کی ایجاد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ زبانوں کے حروف کی ایجاد کا سہرا "چین" والوں کے سر ہے اور اکثر لوگوں کو اس کا یقین ہے کہ حرف کے موجد اہل "فینشیا" ہیں، مگر دراصل ایسا نہیں ہے اس کے موجد اہل مصر ہیں اور کاٹ چھانٹ کر سیدھے راستے پر لانے والے اہل فینشیا۔

سب سے پہلے حروف کی ضرورت کو مصریوں نے محسوس کیا چونکہ وہ جانوروں کی پرستش کرتے تھے، اس لئے اظہار خیال کا ذریعہ حیوانات ہی کی تصاویر قرار دی گئیں، بعض جگہ جہاں پر کہ جانوروں سے کام نہ چلا، وہاں ایسی چیزوں کی تصاویر اختیار کی گئیں جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں، اس طرح اونہوں نے ایک مکمل الف، ب، ت، بنائی اور اُن کا نام "مقدس حروف" رکھا، انہیں حروف کو یونانی زبان میں "ہیراگلفک" کہتے ہیں، چونکہ "ہیراگلفک" میں تصاویر ہی تصاویر تھیں اور ان کا جلد اور سہولیت کے ساتھ لکھا جانا ممکن نہ تھا، اس لئے ان کی دو قسمیں کر لی گئیں، ایک "ہراٹک" جو صرف مذہبی کاموں کے لئے مخصوص تھی، دوسری "ڈماٹک" جو عام کاموں کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جیسا کہ آج کل "موڑی" اور "بالبودہ" (مراہٹی) مذہبی اور دنیوی کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

"ہراٹک" اور "ڈماٹک" حروف معنی کے لحاظ سے دو طرح کے تھے، "آئیڈیوگرافک" (Ideographic) (کاشف الخیالات) اور "فونک" (phonic) (کاشف الصوت، ان میں بھی ایک ایک کو دو دو حصوں پر منقسم کیا گیا، یعنی "آئیڈیوگرافک" میں ایک حصہ وہ کیا گیا جو اس قسم کی تصویروں پر مشتمل تھا جن سے بعینہٖ وہی اشیاء معلوم ہوں مثلاً ✳ سے ستارہ وغیرہ اور دوسرا حصہ اس قسم کے نشانات کا کیا گیا جن سے صرف اظہار مشابہت مقصود ہو جیسے [figure] سے رات وغیرہ یعنی آسمان اور اس کے نیچے ستارہ کیونکہ

ستارہ آسمان پر رات ہی کو نظر آتا ہے۔

" فونک " میں سے ایک تو وہ حصہ علیحدہ کر دیا گیا جس سے صرف آواز معلوم ہو مثلاً " آ ' او ' ایں ' وغیرہ اور دوسرا وہ حصہ جس سے ایک مرکب آواز کے مختلف حصے معلوم ہو سکیں مثلاً ہاتے ' ہا ' من ' وغیرہ اس طرح پندرہ حروف تیار ہو گئے مگر مشکل یہ آ پڑی کہ آوازیں اکیس تھیں، اس لئے انہیں پندرہ اشکال سے اکیس حروف بنائے گئے اور ان میں بعض آوازیں ایسی بھی تھیں جن کے لئے ایک سے زاید حروف بھی تھے ملاحظہ ہو نقشہ

اصلی حروف	K K P kh f u ئ
وطنی یا زاید حروف	کیا خ یا گ ، ک ، بی ، بی ، یف ، ـو ، آئی
اصلی حروف	a ..a a s h n m t
زائد حروف	س ، ن ، م ، { ز ـ ج }
اصلی حروف	t t h. x S
زائد حروف	ت ، ڈ ٹ ، ہ ، ح ، خ ، س

یہی وہ حروف ہیں جنہیں مصریوں نے پہلے پہل ایجاد کیا۔ جس قدر کہ تمدن و تہذیب میں زیادتی ہوتی گئی لکھنے پڑھنے کی ضرورت بڑھنے لگی، اور ان حروف کی نوشت و خواند میں تکلیف ہونے لگی، جدت پسند طبائع نے ان حروف کی صورت شکل کو ضائع کر کے ایک اور ہی وضع قطع پیدا کر لی۔ " زا فینِ مصر " نے ان حروف میں اور دس حرفوں کا ازدیاد کر دیا!

سب سے پہلے جنہوں نے مصری حروف کو سیکھا اور اُن میں تبدیلی کی وہ اہلِ "فنیشیا"[51] تھے، چونکہ یہ قوم "مصر" سے تجارتی تعلقات رکھتی تھی اس لئے ایک دوسرے کے تمدن و تہذیب سے واقف تھے۔ اہلِ "فنیشیا" نے حیوان پرست مصریوں کے پاس ایک کام کی چیز دیکھ کر خود ہتیالی اور اس کو کتر بیوت کر کے دُنیا کے آگے پیش کر دیا، مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم اس کے موجد ہیں بلکہ بعض کوتاہ بیں مصنفوں نے ایجادِ حروف کا سہرا اہلِ "فنیشیا" کے سر باندھ دیا، در اصل وہ موجد نہیں بلکہ مصری موجد ہیں، حروف پر اہلِ "فنیشیا" کا وہی احسان ہے جیسا کہ "اردو شاعری" پر دہلی والوں کا، اور حروف سے مصر کو وہی تعلق ہے جو "اردو شاعری" سے "دکن" کو ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ "فنیشیا" مصری حروف کے علاوہ خود ایک نئی طرز کے حروف کے موجد ہیں۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ البتہ اہلِ "فنیشیا" نے مصریوں سے حروف لینے کے بعد شکلیں تو پہلے پہل وہی قائم رکھیں۔ مگر نام بدل دئے۔ بعض فونیشین کتبے[52] جو دستیاب ہوئے ہیں خود اس امر کے گواہ ہیں کہ ان کے حروف کی شکل بالکل "مصری ہیراگلف" سے ملتی ہے،

ان اشکال کے لکھنے اور پتھروں پر کھودنے میں بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، اس لئے اس میں کچھ جدت تو فونشین لوگوں نے دکھائی اور جو باتیں ان سے رہ گئی تھیں انہیں "عبرانیوں" نے پورا کر دیا۔

خط "حمیر" جس کو اہلِ "مدینہ" نے "بشیر بن عبدالملک" سے سیکھا تھا خط کوفی کہلانے لگا[53] جب کہ "کوفہ" کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا، اہلِ مدینہ میں سے "جذم بن حمرہ" نے "خط حمیر" یا "خط کوفی" کو نیا لباس پہنا دیا اور یہ "خط جذم" بن گیا، گویا مدینہ میں اب "حمیر" کا خط باقی نہ تھا بلکہ "خط جذم" رائج تھا سنہ ۲ ہجری نبوی تک خط جذم بالکل بیکار رہا کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی ہجرت نبوی کے بعد سے اس کی ضرورت پڑنے لگی اور "خط جذم" موجودہ (ع۔ ب) خط بن گیا، سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے یہی خط جذم کو دیکھ ایک خط ایجاد کیا مگر وہ شہرت نہ پا سکا،

---

۵۳ مطابق تقریر صفحہ ۹

۵۲ سنہ [illegible]ء میں جو کتبے ([illegible]) قوم کے برآمد ہوئے ہیں وہ بالکل ہیراگلفک ہیں۔ مگر فونشین حروف میں (ہٹیٹ بھی اولاد سام سے ہے) ۱۲

۵۱ "فنیشین" سام کی اولاد سے ہیں۔ بعضوں نے انہیں کنعانیوں سے بھی منسوب کیا ہے، یہ ملک مصر کے محاذ میں بحر احمر کے کنارے ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ میں آباد تھے ۱۲

حضرت مسیح سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل "یونانیوں" (سیریا) یا اہل ارم، نے فونشین حروف کو سامنے رکھ کر ایک اور وضع کے حروف بنائے، ان حروف کو اہل "ارم" سے عبرانیوں نے لیا اور "مربع عبرانی" نام رکھا، اب یہ حروف فونشین سے بالکل ہی مختلف ہو گئے تھے کیونکہ قدیم فونشین میں پہلے تو خود انہوں نے ہی تبدیلیاں کیں اور پھر عبرانیوں نے جدت طرازی کی اور اہل ارم نے تو بالکل ہی نئی وضع بنا دی۔

اب ہم ایک ایسا نقشہ پیش کریں گے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ "قدیم عبرانی" "کتابتی عبرانی" "قدیم فونشین" "مربع عبرانی" یہ مصری ہرانگک سے کس قدر ملتی ہیں اور ہمارا خیال کس حد تک صحیح ہے۔

	عبرانی نام	مصری ہرانگک	قدیم فونشین		قدیم عبرانی	قدیم کتابتی عبرانی	مربع عبرانی
۱	الف،						
۲	ب، Beth.						
۳	ج، Gimel						
۴	د، ڈ، Daleth						
۵	ہ، ح، He						
۶	و، Vav						
۷	ز، ذ، ڑ، Zayin						
۸	ح، Cheth.						
۹	ت، ٹ، Teth						
۱۰	ی، Yodh						
۱۱	ک، Kaph						
۱۲	ل، Lamed.						
۱۳	م، Mem						
۱۴	ن، Nun						

۱۵	س،	Samekh'						
۱۶	ع،	Ayin.						
۱۷	پ، ف،	Pe.						
۱۸	ص،	Tsadhe						
۱۹	ق،	Kaph						
۲۰	ر،	Resh						
۲۱	ش،	Shin						
۲۲	ط،	Tav						

اس نقشہ کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوجائیگا کہ مصریوں نے پہل پہلے جو حروف بنائے وہ آگے چل کر خود انہیں کی جدت طرازی سے کس قدر بدل گئے اور پھر ان متغیر حروف میں فینیشا والوں نے کیا دست درازی کی۔ اور ان کے بعد عبرانیوں نے کیا کیا موشگافیاں کیں اور پھر "کتباتی حروف" کس طرح علیحدہ کئے گئے، "مربع عبرانی" کس قدر سہل اور صاف حروف بن گئے اگر ہم اس کو پہلا دور کہیں تو کچھ نازیبا نہ ہوگا کیونکہ مصریوں کے حروف ہی کئی ایک جنم بدل کر "مربع عبرانی" بن گئے۔

غالباً حروف کو مصریوں کی ایجاد ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ ہوگی۔

"مربع عبرانی" نے آگے چل کر دو شاخیں اختیار کیں ایک تو وہ جو مشرق کو گئی اور دوسری مغرب کو، ان دونوں شاخوں نے مغربی اور مشرقی آب و ہوا کے اثر سے ایسی صورت بدلی کہ ایک کو دوسرے سے سروکار ہی نہ رہا۔

چونکہ ہم کو مشرقی شاخ کی نسبت بہت کچھ لکھنا ہے اس لئے ہم پہلی شاخ (مغربی) کو علیحدہ کرکے اس کی سوانح ختم کر لیتے ہیں۔

مغربی شاخ (فونشین یا مربع عبرانی) ایشیائے کوچک کے شمالی حصہ سے سیدھے یونان جا پہونچی، یہاں پر اس نے بالکل ہی نرالی وضع اختیار کرلی، جس کی یادگار اب تک یوروپین حروف باقی ہیں۔

یونانی قدیم

α. β. γ. δ. ε. (ϵι, η.) F
a b c d e e e f
g h(h) i. j. k l m
g h i j k l m
n o (o, ω.) p q r s
n a a p q r s
t u o.T v x y
t u o.T v x y

قدیم یونانی حروف کو لے کر یورپ نے نئے قالب میں ڈھالا جواب تک موجود ہیں اور جن سے ہمیں دن رات کام پڑتا ہے۔ اسی ایک شاخ کو یورپ کے علاوہ لاطینی لوگوں نے بھی لیا اور معمولی کتر بیونت کے بعد بالکل گھڑ ڈال لیا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حروف انہیں راس بھی آ گئے۔

قدیم لاطینی حروف

A, A, A — a
B. B. — b
C, C. — c
Δ. Δ, D — d
II, E, E. — e
IIA, F — f
H. — h
I, I — j
K. — k
L, L L — l
M, W, M. — m
N, N, N. — n
O, O — o
P, P, P. — p
Φ, Q — q
R, R. — r
S, S, S. — s
T, T, T — t
V. — u
X. — x
Z. — z

اب گویا مغربی شاخ کی سوانح ختم ہوئی، ان حروف نے جن کا نقشہ دیا گیا ہے۔ آگے چل کر کس قدر ترقی کی اور کتنی تبدیلی ہوئی ہر ایک شخص جانتا ہے۔

اب ہم مشرقی شاخ کی حالت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس شاخ میں سے بھی دو شاخیں پیدا ہو گئیں ایک تو وہ جو عرب جاپہنچی اور دوسری وہ جو ایران جا دھمکی۔

مؤرخین اسلام نے اس میں بہت اختلاف کیا ہے کہ سب سے پہلے عربی خط میں کس نے کتابت کی مگر بعض لوگوں کا خیال[۱] ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے خط لیا گیا اور بعضوں نے سیدنا اسمعیل[۲] علیہ السلام کے خط سے خط عربی کا وضع ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض اولاد اسمعیل[۳] سے نزار بن عدنان کے خط سے اس خط کا لیا جانا ثابت کرتے ہیں۔ مگر ہماری دانست میں یہ صرف خوش فہمی یا مذہبی تخیل ہے کیونکہ ہم نے آج تک ایک حروف بھی سیدنا آدم یا سیدنا اسمعیل یا نزار بن عدنان کے خط کا نہیں دیکھا اور نہ کسی نے اپنی تحقیق کے دوران میں اس دعوے کو ثابت کر دکھایا۔

ابن خلدون نے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل "حمیر[۴]" نے سب سے پہلے عربی میں خط و کتابت کی مگر وہ یہ نہیں بتا سکتے ہیں کہ حمیر نے کس سے سیکھا۔

خیال یہ ہوتا ہے کہ "مربع عبرانی" یا "فونشین" سے "حمیر" نے اپنا خط مرتب کیا کیونکہ اس کے پیشتر کسی خط کا موجود ہونا ہی غیر ثابت ہے اور اس کے علاوہ خط "حمیر" کی ہئیت خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ایک شاخ ہے "عبرانی" یا "فونشین" کی مگر "حمیر" نے اس قدر احسان ضرور کیا کہ اس بدصورت خط کو کسی قدر صورت دار بنالیا۔

حمیر کا قدیم خط

ا ب ت ث ج ح خ د ذ

ر ز س ش ص ض ط ظ ع

غ ف ق ک ل م ن ہ و

ی لا

۱؎ دیکھو سیوطی کتاب اوائل اور مزہر کی نوع ۴۱ ص ۳۴۰ ۲؎ دیکھو مطالع بدریہ ص ۵ و الوفائی ۳؎ دیکھو سیرۃ حلبی ۴؎ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۲

اس خط کو "خط حمیر" یا حمیر کا "طریقہ کتابت" کہتے تھے۔ شاہان[۹۱] حمیر نے چونکہ بڑی ہی دیدہ ریزی اور دقت کے بعد اس خط میں ایک طرح کی صلاحیت پیدا کی تھی اس لئے کوئی شخص بغیر ان کی اجازت کے خط حمیر نہ سیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس خط کو سیکھنا چاہتا تو اس کو چند خاص شرائط کی پابندی بھی کرنی پڑتی تھی۔

"حمیر" سے "تبابعہ[۹۲]" نے ان حروف کو سیکھا اور "تبابعہ" سے "حیرہ" نے اور اہل "حیرہ" سے "اکیدر بن عبدالملک[۹۳]" (رئیس دومۃ الجندل) کے بھائی بشیر بن عبدالملک نے سیکھ کر اہل مکہ کو سکھایا۔

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو جائیگا کہ خط حمیر کو کس طرح بدلا گیا اور حضرت سیدنا علی رض کا خط کیسا تھا،

خط حمیر	خط جزم	سیدنا علی رض کا خط	خط نسخ (موجودہ)	خط حمیر	خط جزم	سیدنا علی رض کا خط	خط نسخ (موجودہ)
	L	L	ا				ط
	ب	ب	ب				ظ
	ت	ت	ت		ع	ع	ع
	ث	ث	ث		غ	غ	غ
	ج	ج	ج		ف	ف	ف
	ح	ح	ح		ق	ق	ق
	خ	خ	خ		ک	ک	ک
	د	د	د				ل
	ذ	ذ	ذ				م
	ر	ر	ر				ن
	ز	ز	ز				ه
	س	س	س		و	و	و
	ش	ش	ش				لا
	ص	ص	ص			ی	ی
	ض	ض	ض	×	×	×	×

۹۱ و ۹۲ و ۹۳ صفحہ ۱۳۶ پر ملاحظہ ہو ۱۲

زمانۂ خلافت میں مصاحف عثمانی اور احادیث "جزم" (کوفی) میں لکھے جاتے تھے زمانۂ نبوت کے بعد حکومت عرب نے فتوحات بڑھائے اور "بصرہ" اور "کوفہ" کو مرکز اسلام قرار دیا، اور ایک طرح کا تمدن بھی پیدا ہونے لگا، ادھر حکومت اسلام عرب "افریقہ" اور اندلس پر محیط تھی اور دوسری طرف بنی عباس نے بغداد کی بنا ڈالی اور وہ بغداد ہی حکومت عرب کا صدر مقام بن گیا۔ اور اہل بغداد نے خط کوفی کو بدل کر اور تیرہ (۱۳) خط وضع کئے جن کی تفصیل یہ ہے:۔[۱۵]

"(۱) خط طومار (۲) خط سجلات (۳) خط عہود (۴) خط مومرات (۵) خط امانات (۶) خط دیباج (۷) خط مدبج (۸) خط مرصع (۹) خط ریاش (۱۰) خط غبار (۱۱) خط خرش (۱۲) خط بیاض (۱۳) خط حواشی"

یہ خطوط خط کوفی سے بالکل مغایرت رکھتے تھے ہر خط کے استعمال کا موقع خاص تھا اور ہر ایک کے لئے قلم بھی جداگانہ تھے مثلاً

(۱) خط طومار[۱] سے بقلم جلی کتبے لکھے جاتے تھے، جن کے آثار عمارات عرب پر ابھی باقی ہیں۔

(۲) خط عہود[۲]، خط مومرات[۳]، خط امانات[۴]، کا قلم متوسط تھا جس سے احکام اور قبالے اور دستاویزات وغیرہ لکھی جاتی تھیں

(۴) خط دیباج[۵]، خط مدبج[۶]، خط مرصع[۷]، خط ریاش[۸]، یہ محض خوشنویسی کے لئے تھے جن کی کشش ایک دانگ سے (۶) دانگ تک تھی۔

(۵) خط غبار[۹]، خط خرش[۱۰]، خط بیاض[۱۱]، خط حواشی[۱۲]، وہ خطوط تھے جن سے قرآن مجید اور دیگر کتب لکھے جاتے تھے، یہ خطوط تیسری صدی ہجری تک چلے۔ مگر جب ابن مقلہ[۱۶] نے نئے چھ خط ایجاد کئے تو یہ سب خطوط بھلا دئیے گئے، جن کا ایک حرف بھی آج نظر نہیں آتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) ۵۴ "حمیر" ملوک یمن سے تھے ابرہہ بن صالح جو آغاز اسلام کے زمانہ میں یمن کا بادشاہ تھا وہ قبیلہ حمیر ہی سے تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۱۳۱) ۵۱ مقدمہ ابن خلدون صہ ۵۲ تبابعہ (جمع تبع) یہ قبیلہ بھی حمیر ملوک یمن ہی سے تعلق رکھتا تھا ۵۳ مطابع نصریہ مصر ۱۲ ۵۳

حاشیہ صفحہ ہذا ۵۱ نامۂ دانشوراں ۵۲ محمد بن علی بن حسین بن مقلہ ۲۷۲ھ میں یکم شوال کو پیدا ہوا، علم فقہ، تفسیر، قرارت، ادب، وغیرہ میں مستند مانا جاتا تھا، اور نہایت ہی خوشنویس تھا ۳۱۶ھ میں اپنی خداداد لیاقت سے ترقی کر کے خلیفہ المقتدر عباسی کا وزیر اعظم ہو گیا مگر تین بار قید ہو کر ایک بار شہر بدر کیا گیا اور پھر وزارت پر واپس آیا آخر ۳۲۲ھ میں خلیفہ راضی باللہ نے سیدھا ہاتھ کٹوا کر قید کر دیا اور ۳۲۸ھ میں جیل میں قتل کرا دیا۔ ابن مقلہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام ابو عبداللہ تھا اور وہ بھی خوشنویس تھا ابو عبداللہ سلخ رمضان ۲۷۸ھ کو پیدا ہوا اور ربیع الثانی ۳۳۸ھ میں بغداد

ابن مقلہ نے اصول خط املی مقرر کیے اور ان کا مدار سطح اور دَور پر رکھا اور (۱) خط محقق (۲) خط ریحان، (۳) خط ثلث ریحانی (۴) خط نسخ، (۵) خط توقیع (۶) خط رقاع وضع کیا۔ ابن مقلہ کے یہ خطوط تقریباً (۵۰) برس تک جاری رہے مگر ابن بواب[۱] نے ان کو بھی مٹا دیا اور اپنے نئے خطوط کو رواج دیا سنہ ھ عماد الدولہ دیلمی (عضد الدولہ) کے عہد میں حسن بن حسین بن علی فارسی نے خط کاتب، خط نسخ، خط رقاع، خط ثلث کو سامنے رکھ کر "خط تعلیق" وضع کیا جس کا نام خط ترسیل بھی مشہور تھا، اسی زمانہ میں خواجہ میر علی رحمۃ تبریزی نے خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام "نسخ تعلیق" رکھا گیا (جو رفتہ رفتہ "نستعلیق" کے نام سے مشہور ہو گیا، خواجہ میر علی رحمۃ کے بیٹے میر عبداللہ اور میر عماد نے اس خط میں تصرفات کر کے ایک عمدہ معیار پر قائم کر دیا۔

خط نستعلیق سے بھی دو خط نکالے گئے۔ چونکہ نستعلیق دیر میں لکھا جاتا تھا اس لئے سنہ ۱۱ھ میں مرتضیٰ قلی شاملو حاکم ہرات نے خط شکستہ وضع کیا جو روزانہ معمولی خط و کتابت کے لئے تھا۔ اسی زمانہ میں مرتضیٰ قلی خاں کے منشی "شفیعا" نے خط شکستہ میں کچھ گھٹا بڑھا کر ایک اور ہی ڈھانچہ تیار کر دیا جس کا نام "خط شفیعا" مشہور ہو گیا، اس خط میں بعض بعض باتیں خط تعلیق کی بڑھا دی گئی تھیں جیسے را کے پیچیدہ (حـ ر صـ) ی، ن پیچیدہ (ـــــے، کنعم) خط نستعلیق کے ساتھ ہی ساتھ خط شکستہ اور شفیعا کا رواج بھی ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔

ہندوستان اور عرب و عجم میں خط نسخ، نستعلیق، شکستہ، شفیعا، رائج ہے اور اسی خط میں کاروبار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان مروجہ خطوط کی ابتداء اور ارتقاء ظاہر کر دی گئی ہے انشاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر "سنسکرت" و فارسی قدیم (ژند، اوستا) وغیرہ کے متعلق بھی اپنی تحقیقات پیش کی جائے گی۔

آخر میں مسٹر عباس شیروانی اور مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب مرحوم کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کیونکہ مسٹر شیروانی کے مضمون اور مولوی صاحب مرحوم کی تالیف سے مجھے بہت مدد ملی۔

---

[۱] ابوالحسن بن علی بن ہلال (بواب)، چوتھی صدی عیسوی میں بغداد میں پیدا ہوا ابن بواب خوش نویسی کے علاوہ علوم ادبیہ و قرأت وغیرہ میں بھی کمال رکھتا تھا مگر خوش نویس ہی مشہور رہا، چونکہ اس کا باپ علی بن ہلال بارگاہ خلافت میں بوابی کی خدمت پر مامور تھا یہ ابن بواب مشہور ہو گیا۔ ابن بواب ۲۔ جمادی الاول روز پنجشنبہ ۴۲۳ھ کو بغداد میں انتقال کیا اور امام حنبل کے بازو مدفون ہوا۔ ۱۲۔ (ابن خلکان)

کاشتکاروں کی حکومت

(جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر مدیر ظل السلطان بھوپال)

گزشتہ بیس سال سے ڈنمارک ایک ایسی دلچسپ جگہ ہوگیا ہے۔ جہاں تمدنی مسایل کو مطالعہ کرنے کی غرض سے۔ ترقی
یافتہ ملکوں کے ہوشیار اور قابل لوگ آتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ملک ڈنمارک پولٹیکل مصالح کا ایک دلچسپ مرکز ہے اور دنیا کے ان چند خطوں میں سے ہے جو اپنے ملکی
ذرایع کو نہایت ہوشیاری اور ہوش مندی سے اقتصادی ترقی اور رعایا کی فلاح و بہبودی پر صرف کرتا ہے۔ خواہم انگلستان کو
جائیں یا فرانس اور جرمنی اور امریکہ کو۔ ہمکو ہر پولٹیکل اسٹیٹ شاہنشاہی تمدن پر ملیگی۔ جہاں مختلف پارٹیاں اور خاص
طبقے کے لوگ جو نہ تو عام رعایا کے قائم مقام ہیں اور نہ قایم مقام ہونا ظاہر کرتے ہیں اور نہ عام رعایا کے کسی کام آسکتے ہیں برخلاف
اس کے ڈنمارک کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کی دولت کو لوگوں میں برابر تقسیم کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ملک
کی پیداوار کو بڑھا سکتا ہے۔

اور دوسری قسم کی مونوپولی کو بالکل جائز نہیں رکھتا۔ یہ افلاس کو دور کرسکتا ہے اور اپنی رعایا کو راحت و آرام سے
رکھ سکتا ہے۔ ڈنمارک نے اس قدر علم کو ترقی دی ہے کہ بے علمی اس ملک سے دور ہوگئی ہے اور ایسے طرز کی سوسائٹیاں
بنائی ہیں جن سے ہر شخص کو مساوات کی آسانیاں حاصل ہوسکتی ہیں۔

ڈنمارک نے ایک ایسی چھوٹی سی قوم جس کی وقعت ہوسکتی ہے اس کو بتا کر بتا دیا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے بڑی خوبی
کے ساتھ شاہنشاہی اقتدار اور مملکت کے حاصل کرنے یا زبردست بری اور بحری فوج رکھ کر کچھ اور حاصل کرنے کی تمنا سے
اپنے آپ کو بری کر رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں کے لوگ ان باتوں کے پیچھے نہیں پڑتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے
مقبوضہ جزیرہ آئس لینڈ کو بھی آزاد کر رکھا ہے اور سمندر پار جا کر کسی حصول کی تمنا نہیں کرتے۔ اس کو دوسروں کے ملک
اور زمین سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ صرف اپنے ملک کی ترقی اور اپنی تیس للکھ رعایا کے فلاح و بہبودی میں مصروف
رہتا ہے۔

ڈنمارک کو جو اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے وہ صرف کوآپریٹو آرگنائزیشن کا باعث ہے۔ کاشتکاروں میں کوآپریشن
کا طریقہ تو عام طور سے رائج ہو ہی گیا ہے۔ لیکن اب خاص شہروں میں ڈنمارک کے بھی یہی طریقہ مطبوعہ عام ہو رہا ہے۔

غرضنکہ اس تحریک نے ایسے تجارتی جمہوریت پیدا کر دی ہے کہ بلا اتفاق یا بلا مانگ خریداروں کے مال بنا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ کاشتکاروں نے اپنی ذاتی ڈائریاں۔ بیکن کی فیکٹری۔ انڈے جمع کرنے والی سوسائیٹیاں۔ بنک اور دیگر اقسام کے کارخانے مثل نسل کشی مویشیان وغیرہ قایم کر رکھی ہیں۔ ہر کاشتکار عموماً تین سے لے کر دس انجمنوں تک کا ممبر ہے۔ اور اس کی فیملی میں اگر دوسرا شخص ہو تو اس کا تعلق کسی نہ کسی کوا پریٹو انجمن سے ہوتا ہے۔ اُن کی زندگی کوا پریٹو کے کام لگی ہوئی ہوتی ہے اور وہ کیمیکل۔ میکانکل اور صنعت کے طریقے سیکھتا ہے۔ اور اس کو ایک علمی طریقہ اس طرح پر کام کرنے کا حاصل ہو جاتا ہے۔ کوا پریٹو ایک ایسی ایجنسی ہے جو کاشتکاروں کو بربادی اور لوگوں کی غارت گری سے بچاتی ہے۔ چنانچہ ہزاروں کوا پریٹو سوسائٹیاں ہیں جن پر وہاں کے لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہی لوگ سلطنت میں حکومت حاصل کئے ہوئے ہیں جو لوگ کوا پریٹو کے طریقوں میں تعلیم پا چکے ہیں۔ اس تحریک نے دورنگی کو بالکل دور کر دیا ہے۔ جو دیگر ممالک میں پائی جاتی ہے یعنی اس نے سیاست داں اور پولٹیکل سلطنتوں کو دبا دیا ہے اور کاشتکاروں کی ایک ایسی سلطنت ہو گئی ہے۔ جہاں پولٹیکل آئینہ سے کاشتکاروں کی ضروریات کو دیکھا جاتا ہے۔

دیگر ملکوں میں جس طرح روپیہ والے لوگ ایجنسیاں قایم کر کے کاروبار کرتے ہیں یہاں وہ کاروبار کاشتکار خود کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی فصل آپ پیدا کرتے ہیں۔ خود چیزیں بناتے ہیں۔ اور اپنی پیداوار کا بیوپار خود کرتے ہیں۔ وہ اپنے مویشی کے واسطے دور دور کے مارکٹ سے اجناس۔ اپنی ذاتی ضروریات کا سامان۔ نیز آلات کشاورزی منگواتے ہیں۔ وہ اپنے گھر، فصل اور مویشی کی حفاظت خود کرتے ہیں وہ اپنے بنک کا کام آپ کرتے ہیں۔ اپنا سرمایہ رکھتے ہیں۔ نسل کشی مویشیاں اور ترقی مویشی کی سوسائٹی کا کام خود کرتے ہیں۔ اور وہ خود تھوک فروشی کے نرخ سے خرید کر آپس میں خوردہ فروشی کے نرخ پر تقسیم کر لیتے ہیں۔

اس کوآپریشن نے نہ صرف اُن کے فضول مصارف کو کم کر دیا ہے بلکہ اُس ملک کے سوشیل حالت کو بھی بدل دیا ہے اس نے سرمایہ داروں کا زور گھٹا دیا ہے اور سود کا نرخ بھی کم کر دیا ہے۔ اس کا یہ سبب ہوا کہ تعلیم عام طور پر مقبول ہو گئی۔ اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ انتظامی قوت کے ساتھ پولٹیکل قوت بھی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے زمینداروں کو خصوصاً سرمایہ داروں کو جو اپنے سرمایہ کے ذریعہ سے غریب لوگوں کو لوٹتے تھے۔ گرا دیا ہے۔

زمینداروں نے بھی اپنی کاشت کو چھوٹا کر دیا۔ اس لئے بجائے گیہوں بونے کے اونھوں نے نسل کشی مویشیان۔ مکھن سازی اور بیکن بنانے کا کام شروع کر دیا اور گائے کی نسل میں ایسی خوبی کے ساتھ ترقی دی کہ اُن کا دودھ اور مکھن زیادہ نکلنے لگا۔ اس نے ڈین کے مزارعین کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ غرضکہ چالیس سال کے عرصہ میں یہاں کے لوگ ایسے

فارغ البال ہوگئے جو شاید دُنیا کے پردے پر ہوں۔ لوگوں کی فلاح کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا میں ڈنمارک کا شمار بڑے دولتمند ملکوں کے ساتھ ہوگیا ہے۔ اگرچہ اُس کی زمین ایسی زرخیز نہیں ہے۔

زیادہ تر کاشتکار چھوٹی چھوٹی آراضی کے ہیں کل کاشتکار ڈہائی لاکھ ہیں۔ منجملہ اُن کے پونے دو لاکھ کاشتکار ایسے ہیں جن کے پاس ۳۷-۲۷ ایکڑ آراضی ہے۔ باقی کاشتکاروں میں کچھ ۴۲-۳۲ ایکڑ کے ہیں اور جو ۷-۸ اور ۸-۸ ایکڑ والے ہیں۔ اگرچہ وہ چھوٹے کاشتکار ہیں تاہم اس قدر رقبہ اُن کے پیٹ بھرنے اور آسایش کے ساتھ رہنے کے واسطے کافی ہوتا ہے اور اُن کو کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ہو کی یہ رائے ہے کہ اگر اگریکلچر کو اقتصادی زندگی کا ذریعہ بنایا جائے تو بغیر زمینداری یا کاشتکاری کے ناممکن ہے۔ اس لئے زمینداری۔ باہمی اتفاق اور تعلیم گویا اقتصادی زندگی کی بنیاد ہے۔ جس طریقہ پر اُس ملک میں لوگوں کو زمینیں دی گئی ہیں وہ اُس ملک کی خاص تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ اور ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود اس طرز زمینداری کے کسی قسم کی پولٹیکل تحریک کا اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ انگلستان اور پروشیا میں بھی زمینداری ہے لیکن وہاں پولٹیکل تحریک کا اثر ضرور لیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حالت قدیم روس کی بھی تھی۔ یہی مسئلہ اجارہ زمین کا آئرلینڈ میں بھی محرک رہا اور لوگوں کے افلاس کا باعث ہوا۔ غرض جہاں کے لوگ اپنے گھروں کے مالک اور اپنی زمینوں کی کاشت کرتے ہوئے پائے گئے وہاں جُداگانہ اسپرٹ اور جُداگانہ پولٹیکل طریقہ دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ جن ملکوں میں زمینداروں کو حق ملکیت حاصل ہے وہ ڈیماکریسی اور ریپبلکن گورنمنٹ کے خواہاں ہیں۔ اور اُن کی ایسی ہی اُمیدیں۔ حوصلے اور آزادی کے خیالات ہیں جیسے ممالک ہالینڈ۔ فرانس۔ سوئزرلینڈ۔ اور اسکنڈے نیویا کے لوگوں کے ہیں۔

جدید نقشہ سے ظاہر ہے کہ ڈنمارک میں ۱۰-۱ بٹہ دار کاشتکار ہیں اور بقیہ ۹۸ر۹ زمیندار ہیں۔ جن کاشتکاروں کے پاس ۱۲-ایکڑ سے لے کر ۱۴۷-ایکڑ تک آراضی ہے وہ مزدوروں کے ذریعہ سے اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہترین تعلیمیافتہ ہیں اور سیاسیات نیز کوآپریشن سوسائٹیوں کے کاموں میں جن میں وہ شریک ہیں۔ اپنا بہت سا وقت صرف کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنٹلمین کہلاتے ہیں اور اپنے ضلع کے سیاسی کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ تیس سال سے پارلیمنٹ میں انہیں کا فروغ دیکھا جاتا ہے۔

زمانہ موجودہ کے طریقہ کاشت میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نرخوں سے باخبر رہتے ہیں۔ علم میکانک میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور بسا اوقات کیسٹ کی خدمت بھی اچھی طرح انجام دیتے ہیں۔ اگریکلچر کو سائنٹفک اصول سے کرنے کا علم اُن کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کو نہ زیادہ زمین حاصل کرنے کی آرزو ہے اور نہ دولتمند ہونے کی

تمنا ہے۔ اگر ان کی کوئی آرزو ہے تو یہ ہے کہ وہ اچھے کاشتکار بنیں۔ یہی لوگ قوم کی پولٹیکل جماعت میں ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت ہے۔

حوصلہ مندی۔ بلند نظری اور مثالاً کام کرنے کی اولوالعزمی۔ پٹہ دار کاشتکاروں میں ہونا ناممکن ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ زراعت کو برباد کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے کاشتکار کھیت کو اس وجہ سے ترقی نہیں دیتے کہ وہ ملکیت زمیندار کی ہوتی ہے اور مالک اس وجہ سے ترقی نہیں کرتا کہ اس سے اس کی ذات کو منافع کی اُمید نہیں ہوتی۔ مزید براں ایسے کاشتکار کی یہ خواہش ہمیشہ ہوتی ہے کہ ایک کھیت سے حتی الامکان منفعت حاصل کر کے دوسرے کھیت میں منتقل ہو جائے۔

ڈنمارک کا کاشتکار اس اصول کی تعلیم حاصل کرتا ہے کہ کس طرح گائے کی پرورش کی جاتی ہے کس طرح اس کو دانہ پانی دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ بہت زیادہ عمدہ قسم کا مکھن تیار کر سکے۔ اور اس مکھن کو عمدہ سے ٹین کے ڈبوں میں بھرے تاکہ خریدار خوشی خوشی خرید لیں۔ وہ بازار کے حالات کو معلوم کرتا رہتا ہے اور زمین کی مٹی کی جانچ کراتا ہے اور نو ایجاد آلات کشاورزی اور آلات ڈائری فارم جن کو انجمن نے یا اس موضوع کے آدمیوں نے متفق ہو کر منگایا ہوا استعمال کرتا ہے۔

ڈنمارک کو صورت حال پر یہی لوگ لائے ہیں۔ کاشتکاروں نے سیاسی حکومت قائمی نرخ بازار۔ خرید و فروخت اور کل ملک کے لین دین کا معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اونھوں نے اپنے طریقہ کو اس طرح ترقی دی ہے کہ پٹہ داری کو بالکل متروک کر دیا ہے۔ اور بر بنائے ترقی مالکانہ زمینداری قایم کر دی ہے۔ بادشاہ ایک "کانسٹی ٹیوشنل ملک" ہے جو اپنی رعایا کی مرضی کا خواہاں ہے یعنی وہ اپنی رعایا کو قانوناً حکم نہیں دیتا بلکہ مشورہ دیتا ہے۔

ڈنمارک دنیا کے اُن چند ملکوں میں سے ہے جہاں پولٹیکل حق پائے ہوئے لوگوں کو پولٹیکل حکومت سے بذریعہ Ballot کے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اور پولٹیکل ڈیماکریسی کو ایسی ترقی دی ہے کہ شاذ ہی کسی ملک میں ہو۔ پہلے ان لوگوں نے یہ کیا کہ بادشاہ کے اختیارات کو کم کر دیا۔ پھر بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ چنانچہ ایک پشت تک ان لوگوں نے پارلیمنٹ کے lower house کو اپنی حکومت میں رکھا۔ اس کے بعد مزدوروں کو شریک کر کے مجلس پارلیمنٹ اور وزارت اور کل محکمہ جات دادرسی پر حکومت شروع کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت جس کو کہتے ہیں وہ ڈنمارک ہی میں پائی جاتی ہے۔

کل زرخیز آراضی کا لگان یکساں ہے۔ اندنوں پھر آراضی کی قیمت جانچ کر دوبارہ قایم کی گئی ہے تاکہ اس کے بموجب تشخیص لگان کا ایک معیار قایم ہو جائے چنانچہ آراضی اور عمارت کی تخمینی قیمت پر بحساب فی ہزار ا را لگان لگایا گیا ہے

ڈنمارک کا کاشتکار زمیندار بھی ہے۔ مہاجن بھی ہے۔ سوداگر بھی ہے اور کارکن بھی ہے۔ وہ کوآپریٹو یونین اور ایجنسی کے ذریعہ سے کام کرنا زیادہ پسند کرتا ہے بمقابلہ "Semi-socialistic" یا سلطنت کے تحت ایجنسیوں کے ذریعہ سے۔ جیسا کہ جرمنی اور سوئزرلینڈ میں رائج ہے۔ یہاں کے لوگ مسئلہ انڈیوڈوالزم "Individualism" اور سوشیالزم "Socialism" میں اپنے کو بے مثال سمجھتے ہیں۔

اُن قوانین کی رو سے جو ۱۸۹۹ء سنہ ۱۹۰۴ء اور سنہ ۱۹۰۹ء میں جاری ہوئے تھے۔ گورنمنٹ نے ایک رقم پچاس لاکھ کرونز Kroners کی نکالی جس کے ذریعہ سے جو جدید چھوٹے چھوٹے کاشتکار بنائے گئے۔ اُن کو چار فیصدی سالانہ کے سود پر رقم مذکور میں سے پیشگی دی گئی۔ اور اوسطاً ۸-۱۰ ایکڑ آراضی کے وہ کاشتکار ہوئے۔ چنانچہ اُن سے زرقرض کی وصولی کی یہ صورت رکھی گئی کہ پہلے پانچ سال تک صرف اصل پر سود لیا جاوے۔ اُس کے بعد اُس رقم قرض کے دو ٹکڑے کردئے جاتے یعنی ایک ٹکڑا ⅖ کا اور دوسرا ⅗ کا۔ یہ حصہ جو ⅖ کا ہو اُس کو پبلک سٹاک بنا دیا جائے اور اس کو بذمہ داری گورنمنٹ بازار میں فروخت کر دیا جائے اور یہ فروخت کی کارروائی ڈنمارک کا "مارگیج Martgage" بنک کرے۔ لیکن ⅗ والا حصہ جو فروخت نہیں ہوگا۔ اس پر قرضخواہ پانچ فی صدی سالانہ سود دیتا رہے۔ جس میں سے ایک فیصدی بسلسلہ ادائگی اصل رقم کے مفروضہ سمجھا جائے۔ پس جب کہ یہ ⅖ والا حصہ ۴۶ سال میں ادا ہو جائے۔ تو اُس دوسرے حصہ کو جو ⅗ والا ہے۔ پبلک اسٹاک سے منتقل کرکے اسی صورت سے ادائگی کرائی جائے۔ تاکہ ۹۸ سال میں کل قرضہ ادا ہو جائے

سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد ایک نیا قانون پاس ہوا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سلطنت سے آراضی حاصل کرکے ملکیت کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جس شخص کو کسی پارلیمنٹ کے ممبر کے واسطے ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور وہ متقی اور پرہیزگار اور محنتی ہونے کا سارٹیفکیٹ کونسل سے پیش کرسکتا ہے۔ اُس کو حق ملکیت مل سکتا ہے۔ اُس کو خریداری آراضی کے لئے روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کو قیمت آراضی پر صرف سود دینا پڑتا ہے جو قانوناً ساڑھے چار فیصدی سالانہ رکھا گیا ہے۔

ایسے چھوٹے چھوٹے نئے زمیندار سلطنت سے کھیت لگان پر لے لیتے ہیں۔ لگان آراضی کی قیمت پر لگایا جاتا ہے جس کی وقتاً فوقتاً تشخیص ہوتی رہتی ہے۔ کاشتکار کو بغرض ترقی مدد دینے کے لئے سلطنت نے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ اُس کی عمارت جس قیمت کی ہوتی ہے۔ اُس قیمت کا ۹/۱۰ حصہ بطور قرض دے دیتی ہے۔ اور اگر عمارت سنہ ۱۹۱۴ء کی بنی ہوئی ہے تو اس سے بھی زیادہ رقم دے دیتی ہے۔ جس پر ابتدائی دس سال تک قرضخواہ کو زرسود نہیں دینا پڑتا۔ وہ اپنے کھیتوں کو اپنے بچوں کے نام منتقل کرسکتا ہے۔ اور اگر وہ فروخت کرنا چاہے تو سب سے پہلے سلطنت کو خرید

کردہ قیمت پر لے لینے کا حق ہوتا ہے۔ اور مالک کو ترقی کرنے کا پورا معاوضہ دیدیا جاتا ہے۔

مزدوروں کے کام کرنے کے اوقات، لڑکوں کی عمر۔ یعنی جس عمر کے لڑکے کارخانوں میں کام کر سکتے ہیں۔ عالم ضعیفی کے لئے پنشن۔ اُن بیوگان کا وظیفہ جن کے بچے چودہ سال کی کم عمر کے ہیں۔ بیماروں اور بے روزگاروں کے واسطے بیمہ وغیرہ کا قانون بنا دیا گیا ہے۔ جس کو "سوشیل لاء" کہتے ہیں۔

کرایہ ریل کو مقرر کرنے کا اصول پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعہ سے مقرر کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ شرح کرایہ ایسی ہو۔ جس سے ڈنمارک کی اقتصادی حالت میں ترقی ہو۔

۲۔ جس قدر مسافت زیادہ ہوتی جائے۔ شرح کرایہ میں کمی ہوتی جائے۔

بغرض تشخیص کرایہ ایک کمیشن مقرر ہوا۔ جس نے تحقیقات کیا کہ ریل کی آمدنی میں اضافہ ہونا چاہئے اور یہ سفارش کی کہ شرح کرایہ نہایت احتیاط کے ساتھ بڑھائی جاوے۔ اور اوسط ہو تاکہ آمد و رفت میں کمی نہ ہو جاوے۔ اس لئے بمقابلہ اضافہ کرایہ کے بہترین انتظام کا کیا جانا مناسب خیال کیا گیا۔ جس سے اصلی آمدنی میں اضافہ ہو جائے اور اس کی تکمیل کے واسطے دو تجویزیں سوچی گئیں۔ اول یہ کہ جو صیغہ محدود اور پیچیدہ ہو اور جس میں مصارف زیادہ ہوں۔ اس کی اصلاح کی جاوے۔ دوسری یہ کہ منافع کو تقسیم کرنے کا قاعدہ مقرر کر دیا جاوے تاکہ کل ملازمان ریلوے منفعت حاصل کرنے کی غرض سے حتی الامکان ترقی آمدنی میں کوشش کریں اور قاعدہ یہ رکھا گیا کہ اگر کل مصارف پر دو فیصدی سے زیادہ منافع ہو۔ تو اُس زیادہ رقم منافع کو ڈائرکٹروں اور دیگر ملازمان مستقل ہیں علاوہ تنخواہ کے حسب شرح ذیل تقسیم کر دیا جاوے۔

اگر ۵۰ فیصدی منافع ہو تو دو سے ۲½ فیصدی تک اصل سرمایہ میں شامل ہوگا بقیہ تقسیم کر دیا جائیگا۔

" ۳۰ " " ۲½ " ۳ " " " " "

" ۱۰ " " ۳ " ۴ " " " " "

" ۵ " " ۴ " ۶ " " " " "

لیکن منافع چونکہ ۶ فیصدی سے زیادہ نہوا۔ اس لئے اسٹاف کے حق میں جو رقم بغرض تقسیم بچی وہ بہت ہی خفیف تھی۔ کیونکہ یہ مناسب نہیں خیال کیا گیا کہ آمدنی کو بہت زیادہ بڑھانے کے واسطے ملازمان کو ترغیب دی جاوے۔ اس سے سلطنت کے بہت سے کاموں کے نقصان کا اندیشہ تھا۔

ہر ملک کے مرتبہ بجٹ سے اُس طبقہ کے لوگوں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اُس ملک کی حکومت ہوتی ہے۔ جہاں جمہوریت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہاں آمدنی۔ وراثت اور دولت پر ٹیکس لگایا جاتا ہے لیکن جہاں

حکومت زراعتی عمائد یا تجار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہاں ٹیکس اشیاء کے کھپت پر لگایا جاتا ہے۔ بہرحال بجٹ ایک آئینہ ہے جس سے اُس ملک کی حکومت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نیز اُس طبقہ کے لوگوں کا حال ظاہر ہوتا ہے جو اُس ملک پر حکومت کرتا ہے۔

ڈنمارک ایک ایسا ملک ہے جہاں تجارت آزاد ہے اور اس کی انڈسٹری کسی حفاظت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اس کی پیداوار کا کوئی حریف ہے۔ جو مقابلہ کرے وہی شے اس ملک میں جاتی ہے جو وہاں پیدا نہیں ہوتی۔ اُس ملک میں معمولی کارآمد چیزیں جس طریقے سے بلا محصول آتی ہیں۔ وہ اس سے ظاہر ہے۔ البتہ مسکرات پر محصول سخت ہے۔ شکر، تمباکو، سگریٹ، موٹرکار اور اشیاء تفریحی بھی خارج محصول نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے صیغوں پر مثلاً جائداد اور وراثت وغیرہ پر بھی ٹیکس لگتا ہے۔ چنانچہ سلطنت کو بڑی آمدنی انکم ٹیکس سے ہوتی ہے۔ عمارات اور آراضیات پر بلحاظ اُن کی تخمینی قیمت کے فی ہزار ا رانکس لیا جاتا ہے۔

رعایا کو اپنی آمدنی پر ایک حد معین تک بشرح ۵ و ۴ر ۱ فیصدی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ یعنی جس کی پہلی آمدنی بارہ سو روپیہ کی ہوتی ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتا ہے اور جن لڑکوں کی عمر ۱۴ سال سے کم ہے اُن کے لئے الاؤنس مقرر ہے۔ لمیٹڈ کمپنیوں کے منافع پر اس طریقہ سے ٹکس لگایا گیا ہے کہ ۴ فیصدی کی شرح سے سرکار کا حق نکال کر رقم بقایا منافع پر تین فی صدی شرح سے ٹکس لیا جاتا ہے۔ تبنیت پر بھی ٹیکس بشرح ایک تا تین فیصدی بلحاظ مقدار جائداد لگا ہوا ہے اس شرط کے ساتھ کہ اگر وارث مورث کا فرزند خاص ہے اور اگر وارث مورث کا رشتہ دار دور کا ہے تو دس یا بارہ فیصدی ٹکس دینا پڑتا ہے۔ غرضکہ ان سب کے علاوہ ملک کو دیگر ذرائع آمدنی کے بھی حاصل ہیں۔ مثلاً ریل۔ ڈاک خانہ۔ فیس بندرگاہ اور قومی بنک وغیرہ۔

۲۱-۱۹۲۰ء میں جو کل آمدنی ۵.۴۰ ملین (یعنی چالیس کروڑ پچاس لاکھ) کرونز کی ہوئی تھی اُس میں سے دو کروڑ پچاس لاکھ کرونز کی آمدنی صرف ٹکس کی تھی۔ بجٹ کی سرسری تقسیم حسب ذیل ہے:-

بابت امداد صنعت و تجارت	۱۰ فیصدی
بابت اخلاقی ترقی و فلاح	۳۰ فیصدی
بابت افواج بری و بحری	۳۰ فیصدی
بابت انتظامات ملک مثلاً سول، پولیس، پنشن وغیرہ	۲۰ فیصدی
بابت سود متعلق قومی قرضہ	۱۰ فیصدی

اخلاقی ترقی اور فلاح کے لئے جو ۳۰ فیصدی رکھا گیا ہے۔ اُس کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

بابت پنشن ضعیفی	۵ فیصدی
بابت ہسپتال اور پناہ گاہ معذورین	۶ء۷ فیصدی
بابت ہائی اسکول	۵ فیصدی
بابت تعلیم سائنس	۵ فیصدی

قومی قرضہ اس قدر ہے جس کا حساب فی باشندہ ۳۲ پاؤنڈ پڑتا ہے اور رقم اس قرضہ کی ریل اور چھوٹی چھوٹی آرامنیات میں لگی ہوئی ہے۔

میونسپلٹی کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ ٹرامسے اور ہر طرح کے بیوپار پر ٹیکس سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میونسپلٹی نے ٹیکس ہر فرد بشر اور ہر جائداد پر لگا رکھا ہے۔ البتہ وہ شخص جس کی آمدنی ایک ہزار کی ہے یا وہ شرح ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد ہے تو علاوہ ایک ہزار کے ہر بچہ کے لئے ایک سو روپیہ بھی ٹیکس سے بری ہے۔ لیکن حدود سے تجاوز کرنے پر بلحاظ مقدار آمدنی ٹکس لیا جاتا ہے جس کی شرح ایک فیصدی سے چھ فیصدی تک ہے۔

ڈاکٹر ہوتے اپنے دلچسپ مضمون میں باشندگان امریکہ کو خاص طور سے توجہ دلاتی ہے کہ وہ ڈنمارک کے طریقہ باہمی اتحاد واتفاق، سکول سڈائریاں اور مارکٹ ایجنسیوں وغیرہ وغیرہ کے حالات کو پڑھ کر سبق حاصل کریں۔ نیز کاشتکار اور زراعت پیشہ لوگوں کو زمیندارانہ حیثیت پر لے آنا ایک ایسی بڑی کامیابی ہے جو نہایت قابل غور و مطالعہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہو نے امریکہ کے کاشتکاروں کو اپنے مضمون میں یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ بھی اپنے ڈینش بھائی کی طرح سیاسیات میں دلچسپی اور عملی حصہ لیں۔ اس لئے کہ حسب بیان مضمون نگار۔ امریکہ کے کاشتکاروں کا بھی ویسا ہی تاریک حال ہے جیسا کہ ہند کے کاشتکاروں کا ہے۔ جو دلالوں اور درمیانی لوگوں کے ہاتھ سے لٹے ہوئے ہیں۔ اور اُن کی حالت تقریباً غلامی کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔

پہلا ستم یہ ہے کہ امریکہ کا کاشتکار یہ نہیں جانتا کہ اُس کے تیار کردہ اجناس کی قیمت کیا ہوگی۔ اور وہ اجناس کہاں جا کر فروخت ہوں گے۔ وہ فصل پر تخم ریزی کرتا ہے۔ مزدور لگاتا ہے۔ قرض سے زیربار ہوتا ہے۔ اور بالکل بے خبر رہتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اُس کی پیداوار کی کیا قیمت آئے گی۔ اور اُس سے اُس کی مزدوری اور مصارف بھی اٹھیں گے یا نہیں۔ اول تو اُس کی شے کی قیمت اُس کے ملک کے کل پیداوار یا کل دُنیا کی پیداوار پر ٹھہرا دی جاتی ہے۔ بعد ازاں کمیشن والے لوگ۔ دلال اور خریدار اُس کی اشیا کی قیمت ٹھہرا دیتے ہیں۔ اور مالک سے کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا۔

خریداران آپس میں مقابلتاً قیمت نہیں ٹھہراتے۔ بلکہ جب کاشتکار اپنی شے بیچنا چاہتا ہے۔ اُسی وقت قیمت ٹھہرا دی جاتی ہے۔ قیمت کو پبلک نہیں مقرر کرتی۔ بلکہ وہ دلالی ایجنسیاں ٹھہراتی ہیں۔ جن کے ہاتھ میں بازار ہے اور جو کم سے کم قیمت پر خریدتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مزید براں کاشتکار اس اُمید پر کہ بازار کا نرخ چڑھنے پر اپنی پیداوار کو فروخت کرے گا۔ اپنے غلہ کو جمع نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ اُس کے پاس ذرائع آسانی کے نہیں ہیں۔ بنک ان کو قرض دینے کے واسطے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کاشتکار کو فصل کے ختم ہونے پر اپنی پیداوار کو فروخت کردینا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اُس قرضہ کو ادا کردے۔ جو اُس نے بغرض کاشت لیا ہے۔

یہ واقعات ہندوستانی کاشتکاروں کے حالات سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ڈنمارک کے کاشتکار کی حالت بدرجہا بہتر ہے فقط

منازل حیات

(جناب سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے عالیؔ لکھنوی)

موجودہ زمانے کی کش مکش انسان کو اس بات کا بہت کم موقعہ دیتی ہے کہ وہ فطرت کی تمام دلچسپ چیزوں پر غور کرے۔ ہماری زندگی میں غور و فکر کرنے کے لئے بہت تھوڑا وقفہ ہوتا ہے۔ ہر وقت ایک نہ ایک کام کے لئے اور ہر کام کسی نہ کسی وقت کے لئے مخصوص ہے اور دست فطرت کی بنائی ہوئی دل فریبیوں سے لطف اندوز ہونا، ایک اتنا غیر ضروری فعل معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف کبھی کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ قدرت کی اور دل فریبیوں کو جانے دیجئے۔ خود انسان کی مختصر حیات میں جو دور فطرت نے قایم کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ طفلی کی معصومانہ شرارتیں، شباب کی شوخ اُمنگیں ضعیفی کی متانت و بردباری اور ان سب کی جُدا جُدا خصوصیات کی تشریح ایک ایسا موضوع ہے جس کو بڑے سے بڑا فلسفی بھی اپنے نظریات کا مرکز قرار دے سکتا ہے۔

طفلی طفلی کا دلچسپ و خوشگوار زمانہ جس میں ہم کو اپنی ضروریات پوری کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ نہ ہم پر فرایض عاید ہوتے ہیں اور نہ ہم کو فرایض کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتا ہے اور ہم کو اس کا خیال تک نہیں ہوتا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ جس میں احساس ہونا بھی نہ چاہئے۔

طفلی میں صرف ایک بات کی فکر رہتی ہے اور وہ یہ کہ ہم جیسے بھی ہو سکے مسرت و شادمانی حاصل کریں۔ رنج و غم۔ غور و فکر ہمارے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ اور ہم مسرت و شادمانی کے خیالی دُنیا میں بسر کرتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے عالم بالا کا ننھا مسافر، دُنیائے فانی کی منازل طے کرتا ہے، اُس پر فرائض کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اس عالم سرور کو جس میں وہ اب تک رہا ہے بھولتا جاتا ہے اور اس کے لئے نئے نئے ابواب تفکرات کے کھلتے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان سے نیا نیا سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے انسان پر ایک حیرت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ طفلی کی دلفریبیوں کو اس طرح بھول جاتا ہے گویا ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ بچپن میں انسان کا دماغ نئے نئے خیالات اور مادی اشیاء کا عکس بہت جلد قبول کر لیتا ہے اور چونکہ قوت ارادی بالکل ابتدائی درجہ میں ہوتی ہے۔ اس لئے نہ انسان اس کی کوشش کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ وہ تمام خیالات و نقوش جو دماغ پر مرتسم ہو سکے ہیں قایم رہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

دھندلے دھندلے نقش اور معمولی معمولی خیالات ذہن سے اتر جاتے ہیں اور ان کی جگہ دماغ میں زیادہ وزنی خیالات اور گہرے نقش جگہ پاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان دلچسپیوں کا پورے طور پر احساس کر ہی نہیں سکتے جو عہد طفلی میں میسر تھیں۔ بچوں کو جو خوشی ایک دوسرے سے مل کر اپنے کھلونے پاکر ہوتی ہے اس کا اندازہ کوئی معمر شخص کر ہی نہیں سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حالت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔ وہ بچوں کو نہایت شغف سے ان باتوں میں مصروف دیکھتا ہے جو اس کی نظر میں بالکل حقیر ہیں تو اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ چیزیں اور وہ اشغال بھی جنہیں میں دلچسپ خیال کرتا ہوں اسی طرح بے کیف اور بے نتیجہ ہیں، جس طرح بچوں کی مشغولیت میری نظر میں ہے لیکن قدرت کا یہ انتظام حد درجہ قابل تعریف ہے کہ ہم کو طفلی کی دلفریبیوں کی بے حقیقتی، ایام طفلی میں، شباب کی دلچسپیوں کی بے حقیقتی شباب میں، اور پیری کے تفکرات کے بے اصل ہونے کا پیری میں احساس نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اس وقت کے گذر جانے کے بعد ہوتا ہے اور اس طرح انسان دنیاوی تفکرات اور مصائب کے درمیان کبھی کبھی ان نظر فریب دلفریبیوں سے دل بہلا لیتا ہے۔

لیکن ہاں زمانہ طفلی میں ایک چیز ضرور کبھی کبھی طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے اور وہ یہ احساس کہ ہم کیوں دوسروں کی طرح معزز نہیں خیال کئے جاتے۔ ہم ابھی دوسروں سے کمزور ناتواں ہیں۔ اور دوسروں کی دلبستگی کا سامان ہیں۔ اس موقع پر کبھی کبھی ہم تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہم بھی جلد سرحد شباب میں قدم رکھیں۔ اور ہم کو دوسرے لوگ ممتاز خیال کریں۔

شباب وہ زمانہ جس کی تمنا طفلی میں اور جس کی حسرت ضعیفی میں انسان کے دل میں رہتی ہے۔ جب آتا ہے تو اس کا احساس نہیں ہوتا کتنی مست شباب ہستیاں ایسی ہیں۔ جن کو اس حالت میں کبھی اس کا خیال بھی آتا ہے کہ ہم اب جوان ہیں اور گو یہ خیال نہ آئے مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ معصومانہ ادائیں اور خواہشات رخصت ہو چکتی ہیں۔ پر زور اور بعض حالتوں میں ناقابل تسخیر جذبات انسان پر قابو پا لیتے ہیں۔ اور انسان اپنے میں کچھ تغیر ضرور پاتا ہے اب تک اس کا مقصد زندگی، محض حصول مسرت تھا۔ دنیا اس کے لئے محض ایک سرسبز و شاداب چمن کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اب فرائض کا بار بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ دماغ میں خیالات اتنی سرعت سے جگہ نہیں پاتے وہ نقوش مرتسم ہوتے ہیں جیسے پیشتر ہوتے تھے۔ بلکہ انسان اب یہ تمیز کرنے لگتا ہے کہ کون چیز قابل غور و فکر ہے۔ اور کون چیز ناقابل اعتنا اور جب انسان غور و فکر کرتا ہے تو جو نقوش اس کے ذہن میں بنتے ہیں وہ کافی گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں اور جو خیالات وہ قایم کرتا ہے وہ ذہن میں عرصہ دراز تک محفوظ بھی رہتے ہیں۔

اس حالت میں پہنچکر انسان کی دائرہ عمل بھی بدل جاتا ہے۔ جن باتوں میں پیشتر اس کو انہماک رہتا تھا۔ اب وہ غیر دلچسپ نظر آتی ہیں۔ نئے نئے مشغلوں میں اس کو دلچسپی ہوتی ہے۔ نئے نئے خیالات نئی نئی باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس نقالی سے جو عام طور پر انسان بچپن میں دوسروں کی کرتا ہے۔ نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہماری رائے کی وہی وقعت ہے جو دوسروں کی رائے کی ہوتی ہے۔ طبیعت کو پیشتر صرف اُن چیزوں سے رغبت ہوتی تھی جن سے دلچسپی حاصل ہوتی تھی۔ اب دلچسپی کے ساتھ ساتھ فائدہ بھی مدنظر رہتا ہے۔ اور انسان وہ کام بھی کرتا ہے جن سے اگر دلچسپی نہ بھی ہو تاہم فائدہ ہو یعنی بخیال خوشی اس کی نظر میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے فائدے اور نقصان کو سمجھنے لگتا ہے۔ پیشتر تمام کاموں کا مقصد حصول مسرت ہوتا تھا لیکن اب مقصد صرف حصول مسرت نہیں بلکہ حصول زر، حصول عزت، یا شہرت وغیرہ ہوتا ہے۔ اور انسان میں وہ بات پیدا ہوتی ہے۔ جس کو کسی حد تک دور بینی پیش بینی، مآل اندیشی وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تفکرات اور ایسی تفکرات جو اکثر برسوں انسان کو محنت و مشقت میں مبتلا رکھتی ہیں سامنے رہتی ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے حصول مسرت کا شوق اکثر فائدے اور منفعت کے خیال پر غالب آجاتا ہے۔ اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ انسان ابھی حدود شباب سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اسی عہد حیات کے چند خصوصیات یہ بھی ہیں کہ انسان کسی معاملے پر بے انتہا غور و خوض کر کے اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اکثر بے سوچے سمجھے وہ وہ کام کر ڈالتا ہے جس کا نتیجہ اکثر خدا سی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ مادہ موجود ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتیجوں پر غور کرلے جو پیش آنے والے ہیں۔

ضعیفی حیات انسان کی آخری منزل جس کو لوگ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں ضعیفی ہے۔ لیکن جس طرح بہار کے بعد خزاں کا آنا ضروری ہے اسی طرح طفلی و شباب کے بعد پیری بھی آنا لازمی ہے۔ اور بظاہر کوئی ایسا سبب معلوم نہیں ہوتا کہ لوگ اسے ناپسند کریں۔ طفلی میں جو مسرت انسان حاصل کرتا ہے خود اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسے ان نعمات کی قدر نہیں ہوسکتی۔ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس حالت کے مقابل مصائب و تکالیف بھی ہیں۔ شباب میں جن جن باتوں سے اُسے سابقہ پڑتا ہے وہ سب پیری میں اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اس طرح حیات انسانی کی ابتدا و انتہا سے وہ پورے طور پر واقف ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر مآل اندیشی، دور بینی کی صفات اس میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قوائے جسمانی کمزور ہوجاتے ہیں۔ جسم میں چستی و چالاکی کا پتہ نہیں رہتا۔ لیکن اس کے

مقابلہ میں تمام عمر کا تجربہ اس کو حاصل رہتا ہے اور یہ بات اگر قابل ترجیح نہیں ہے تو کم از کم ان حالات سے کسی طرح خراب نہیں ہے جو انسان کو ابتدائی دو دوروں میں پیش آتے ہیں۔

شباب میں انسان کے دل میں اُمنگ، طبیعت میں جوش اور سر میں ترقی کا سودا ہوتا ہے اور یہ چیز اس کو ہمیشہ آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن ضعیفی میں چونکہ جسمانی طاقت کم ہو جاتی ہے اور انسان کو برابر اس کا احساس ہوتا رہتا ہے اس لئے وہ غیر مفید اور فضول اُمیدوں، خواہشوں اور توقعات کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اور اس طرح زندگی میں ایک خاص قسم کی طمانیت اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک خاص فرق جو اس زمانے میں ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان مسرت و شادمانی حاصل کرنے سے ایک بڑی حد تک گریز کرتا ہے۔ اب اس کو منافع کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ حالانکہ وہ مدت جس میں کہ وہ ان منافع سے بہرہ ور ہوگا۔ دن بدن کم ہوتا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ وہ ایک مدت تک دنیا میں رہتا ہے۔ اس کی ہر چیز سے لطف اُٹھاتا ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر ہر شے اُسے دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ موت سے بہ نسبت جوانوں کے زیادہ خائف رہتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شباب میں انسان ہر چیز حتیٰ کہ زندگی کی طرف سے بھی بے پروا رہتا ہے۔ اور اگر حیات کا آخری منظر اُسے دیکھنا پڑتا ہے تو اُسے زیادہ بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے مقابل ضعیفوں کے لئے دُنیا اور دُنیا کی چیزوں سے کنارہ کشی کرنا بہت زیادہ شاق ہوتا ہے۔

حیات انسانی کے مختلف ادوار کا مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے اور ان میں سے ہر ایک دور بجائے خود اتنا دلچسپ ہے کہ اس پر مستقل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

انداز

(اسٹائل)

(از جناب سید عابد علی صاحب عآبد بی۔اے ایل ایل۔بی)

کسی زبان کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کا ثبوت بہم پہنچا سکتا ہے کہ جب ہم انداز کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُن تمام قومی روایات اور ملی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں جو قومی زبان میں رچ گئی ہیں۔

اگر دو آدمی اس طرح کے تصور کئے جائیں جن کی فطرت معاشری، ذہنی، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل یکساں ہو اور جو تاریخ عالم کے کسی ایک دور کے کسی ایک لمحہ میں پیدا ہوں اور اس طرح پیدا ہوں کہ ان کے ماحول متحد الوضع ہوں اور مختلف زبانیں سیکھیں تو ناممکن ہوگا کہ وہ ادب کے ذریعہ ایک ہی پیغام کو ایک ہی طرح کے الفاظ میں ادا کر سکیں ان کی مادری زبان کی خصوصیات امتیازی ادائے مطالب کی قدرت کو معینہ حلقوں میں محدود کر دیں گی۔ قطع نظر اس سے کہ جن مطالب کا ادا کرنا مقصود تھا وہ بالکل ایک ہی موضوع پر حاوی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسے دو اشخاص کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو ایک ہی طرح کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی ساخت کے ساتھ پیدا ہوں۔ اور جن کے الفاظ من حیث اللذ بالکل ایک ہی طرح کے ہوں۔

یاد رکھو کہ انداز صرف ان ہی قومی خصوصیات کا نشان نہیں ہے جو موجودہ زبانوں میں جاری و ساری ہیں اور جو کسی قوم کے ذہنی ارتقاء کو ثابت کرنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ان ذاتی خصوصیتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔ جو کسی ایک فرد واحد سے مختص ہوتی ہیں۔

جو کچھ کوئی فرد واحد اپنے دل و دماغ سے کام لے کر کہیگا اُس کی سیرت کا آئینہ دار ہوگا جس قدر کوئی شخص عوام الناس سے مختلف ہوتا چلا جائے گا۔ اُسی قدر اُس کی تحریر و تقریر میں ادائے مطالب کے بین امتیازی نشان پائے جائیں گے۔ شکسپیر۔ فردوسی۔ غالب سے لے کر حالی، داغ تک چلے آؤ اور پھر حالی، داغ معمولی منشیوں تک پہنچ جاؤ جوں جوں تم بلند درجوں سے نیچے چلے آؤ گے۔ امتیاز و تفریق کے خطوط مدھم ہوتے چلے جائیں گے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا کسی شخص کی تحریر و تقریر کا انداز اس کی سیرت کا مکمل آئینہ دار ہو سکتا یا بالفاظ دیگر کیا کوئی اس قسم کا فن موجود ہے جس کے مدلل و مرتب اصولوں سے کام لے کر ہم کسی فرد واحد کی سیرت کی ذہنی تشکیل قائم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ دیکھو جب ہم کسی کے ساتھ سالہا سال رہتے ہیں اس کی تحریر و تقریر سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہتے ہیں تب بھی اُس کی سیرت کا صحیح اندازہ قائم نہیں کر سکتے۔ انداز وہ آئینہ ہے جس میں کسی فرد واحد کی سیرت کے

کچھ حصے ناتمام نظر آتے ہیں اور مسخ شدہ سیرت کی مکمل ماہیت پوشیدہ رہتی ہے کوئی غیر شخص کسی اور غیر شخص کے متعلق سب کچھ نہیں جان سکتا کیونکہ خود کوئی سب کچھ اپنے متعلق نہیں جانتا جب کوئی مصنف ایک مخصوص لہجہ ایک مخصوص ذہنیت ایک مخصوص زاویہ نگاہ ایک مخصوص انداز اختیار کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ مواد تحریر میں اخفا انتخاب غلط بیانی سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ظاہر و باطن تحریر میں یکساں نظر آئیں۔ کوئی نقاد یہ نہیں کہہ سکتا اور کہے تو جھوٹا ہے کہ وہ کسی مصنف کی تصانیف کو بہ نظر غائر مطالعہ کرکے مصنف کی روحانی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کی ہمت اپنے آپ میں ضرور پاتا ہوں کہ انداز کی خصوصیات کو مصنف کی ذاتی خصوصیات اور اس کے ذہنی تعینات سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی خاص انداز کے اختیار کرنے میں یا وضع کرنے میں یا استعمال کرنے میں کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ان ذہنی اور قصبی طاقتوں سے بلند ہو جائے جو تخیلی ادراک وجدان اور تعین گفتگو سے متعلق ہیں عین اسی طرح جس طرح کوئی پہلوان یہ نہیں کر سکتا کہ اپنی طاقت کے استعمال میں ان قوتوں سے بالاتر ہو کر رہے جو اس کی جسمانی ساخت چالاکی اور بہادری سے متعلق ہے۔ ہر ایک صنعت کا شاہ کار لازمی طور پر صناع کی ذہنی کیفیات اور دعملوں کی پیچیدہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔

ادبی تصانیف میں احساسی طور پر اخلاقی اور جذباتی ذہنیتوں کے فروق باہمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مبالغہ خود ستائی آپ بیتی کسی خاص پہلو کو زیادہ شوخ کرنا ان مصنفوں کا شیوہ ہے جن کی ذہنیت وسعتیں چاہتی ہے۔ سنجیدگی حفظ انتخاب مختلف رنگوں کا ادغام ہونا ان مصنفوں کا شیوہ ہے جن کی ذہنیت خود نمائی میں محتاط ہے۔ رتن ناتھ مصنفین کے پہلے گروہ سے تعلق رکھتا ہے محمد علی دوسرے گروہ سے۔ ڈراموں میں خاص کر مصنف کو ایسے افراد تخلیق کرتے پڑتے ہیں جن کے جذبات و حسیات ضرورتاً اس سے بالکل مختلف ہیں اور انہوں نے اپنی معاشری حالتوں کے ماتحت اپنے اصلی رنگوں میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ ڈرامہ نویس اس کام کو وجدان وادراک کی سرعت اور تاثر و ہمدردی شدت سے انجام دیتا ہے۔ اس کے تخلیق شدہ افراد کے خیال و اقوال میں فرداً فرداً موضوع اور ماحول کی مطابقت میں سنجیدگی۔ مسرت غم تشکک عشرت پسندی یا نشاط کی ایک سطح جاری و ساری رہتی ہے لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے مندرجہ بالا معیار پر سوائے ان جذبات کے بیان کرنے میں جو خود ڈرامہ نویس اوپر طاری ہو چکے ہوں کوئی پورا نہیں اترتا سوائے ان حضرات جن کو فطرت کی طرف سے ایک خاص ملاحیت ہوا ہے۔

آغا حشر کی فطرت گیر طبیعت اس بات کو سمجھتی ہے لیکن وہ موجودہ اردو اسٹیج کی روایات کو برقرار رکھنے میں اس قدر کوشاں ہیں کہ ان کی آزاد ذہنیت چند ایک رسوم و قواعد میں گھر جاتی ہے۔

پھر بھی وہ اس اعتبار سے اپنے فن میں یکتا ہے۔

حکیم احمد شجاع بی۔اے علیگ قابل تحسین ہیں کہ ان کا ڈرامہ باپ کا گناہ ان تمام قیود سے آزاد ہے جو اردو اسٹیج سے متعلق ہیں اور حقیقت میں ایک مکمل ڈرامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ سیرت کا انداز پر اثر دیکھنا۔ دوم درجہ کے ڈرامہ نویس ٹریجیڈی لکھیں یا کامیڈی ان کے تخلیق شدہ افراد کے پیچھے ہمیشہ ان کی اپنی نقاب پوشی صورت جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بہت بڑے مصنفین کی تحریروں میں سیرت کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا لیکن فطرت کے مظاہر کو پیش کرتے ہوئے ان کی ذاتی خصوصیات ایک مدہم سے پردے کے پیچھے جھکتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے۔ غور سے دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ غالب ڈنٹیے۔ فردوسی۔ ہومر۔ اقبال کا نقطہ نگاہ زندگی کی جزئیات سے بالکل مختلف ہے۔

ذہنی تاثرات کا اثر انداز پر مترتب ہوتا ہے اس کی مثالیں دیکھو کہ فلسفی استدلال میں۔ ذہنی مقتدا اپنی تبلیغ میں۔ منطقی اپنی کلیات میں۔ شاعر اپنی نظم میں۔ سائنس داں اپنے ثبوت میں ایک ہی موضوع کے لئے مختلف تراکیب کا استعمال کریگا۔ ایک اشکال کی صورت میں سوچتا ہے۔ دوسرا اسی استقلال کے ذریعہ۔ تیسرا بحث کے ذریعہ ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔ چوتھا بلند بانگ ادعا کو فصاحت کا لباس پہناتا ہے۔

اسی طرح جمال پرستی اور دیگر جمالی خصوصیات انداز پر اپنا پرتو ڈالتی ہیں۔ اگر مصنف نے ذہن پر رنگوں آوازوں۔ روشنیوں اور شکلوں میں سے کسی ایک چیز کا اثر گہرا مترتب ہو چکا ہو تو ان چیزوں کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے زیادہ تر زور قلم اسی شے پر مرکوز ہو گا۔ جو ان کے ذہن پر محیط ہے۔

قصبی تو قیس انداز کے ذریعہ اسی طرح ظاہر ہوتی ہے جس طرح ذہنی تعلیم۔ سائنس کی ہو یا قانون کی ادب کی ہو یا انشا کی۔ تاثرات توصیف کی کتاب کے متعلق ہوں یا شہر کے متعلق معاشری ماحول۔ نجیب الطرفین پیدائش۔ زندگی کے مختلف مظاہر یہ تمام چیزیں فرداً فرداً حسب تاثر مصنف کے قلم میں رنگ بھریں گی۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ انتخاب الفاظ میں بھی مصنف کی ذہنیت کا عکس موجود ہوتا ہے کسی شخص کا ذخیرۂ الفاظ۔ انتخاب ترکیب فقروں کا دروبست۔ رنگینیٔ انشا۔ اختصار و ایجاز اس کے اخلاقی اور روحانی نقطۂ نگاہ کو واضح کرتا ہے۔ دقیقے کی علامتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ مصنف کے ذہن میں وقت کی کیا قیمت ہے۔ اور وہ سکون و اطمینان کو کس قدر عزیز رکھتا ہے۔ ادبی انداز۔ جذبات۔ احساسات۔ شدت سرعت و تاثر اور نقطۂ نگاہ پر مبنی ہوتا ہے۔

سائنس کا استدلال نفسی کیفیات سے معرا ہے اور جس شدت سے ناولوں۔ افسانوں اور نظموں میں مصنف کی سیرت جس قدر جلوہ زن ہوتی ہے۔ سائنس کی کتابوں میں نہیں ہو سکتی۔

سائنس میں قدرت ادائے مطالب یہ صفت تعریج و تشریح کافی ہے۔ لیکن نظموں اور افسانوں میں جو اثر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے یہ سلسلہ جذباتی خیالی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نفاست کی کمی دلبشتی ہی ایسی شے ہے جو صاحب انداز و طرز ہونے میں بے انتہا مدد دیتی ہے۔ غالب اسلئے غالب ہے کہ اس کی نزاکت طبع اشعار میں جاری و ساری ہے۔ شکسپیر یوں شکسپیر ہے کہ اس کی نفاست خیال فطرت کی گہرائیوں کو پالیتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ موضوع تشنہ رہ گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کو شاداب کرنے کے لئے نہ صرف ادب کا ایک وسیع مطالعہ ضروری ہے بلکہ نفسیات اجتماع کے ساتھ ساتھ جذبات کا نقطہ داں ہونا بھی ضروری ہے اور ان تینوں چیزوں کا ایک فرد واحد میں جمع ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے

تصانیف شرر پر تنقید و تبصرہ کے لئے

انعامی مقابلہ

مولانا شرر مرحوم نے اردو زبان کی جو خدمات انجام دیں، اُن کی اہمیت و عظمت کا اعتراف مختلف صورتوں میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی کہ مولانا کی تصانیف پر مفصل تنقید و تبصرہ لکھ کر اُن کی خصوصیات کو نمایاں کیا جائے اور بتایا جائے کہ ادب کے جن مختلف شعبوں کی اونہوں نے خدمت کی اُن میں سے ہر ایک میں اُن کی کیا منزلت تھی، اور کن کن امور میں شعبہ کے دوسرے مشاہیر اہل قلم سے وہ ممتاز تھے، اور واضح کیا جائے کہ خالص انشاء پرداز کی حیثیت سے ان کو کس طبقہ میں جگہ ملنا چاہئے۔

الناظر میں انعامی مقابلوں کا سلسلہ شروع کرنے کا بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگوں میں ادبی تنقید کا ذوق پیدا ہو اور جو کچھ سرمایہ ہماری زبان میں فراہم ہو چکا ہے اُسکی مختلف حیثیتوں سے جانچ پڑتال ہوتی رہے۔ اس لئے ملک کے جملہ اہل قلم حضرات کو صلائے عام دی جاتی ہے کہ شرائط مندرجہ ذیل کو پیش نظر رکھ کر اس ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع پر طبع آزمائی فرمائیں۔

شرائط مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم از کم ۵۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۲) ۳۱۔ جولائی ۱۹۲۷ء تک بذریعہ رجسٹری کے ذریعہ دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۶)

بنائے احمد آباد کی کیفیت

جناب مولوی رضی الحق صاحب عباسی احمد آبادی مرحوم

گجرات میں متعدد مقامات پر مراۃ احمدی (جو فارسی میں گجرات کا قدیم اور مکمل تاریخ ہے) کے قلمی نسخے محفوظ ہیں مگر اب تک نہ اس کے اصل چھپنے کی نوبت آئی ہے اور نہ اس کا مکمل ترجمہ ہی طبع ہوا ہے اگرچہ مولوی رضی الحق صاحب عباسی احمد آبادی اس کا مکمل ترجمہ کر چکے ہیں مگر اس میں سے (جو چار ضخیم جلدوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے) صرف پہلی جلد ۱۳۱۶ھ ہجری میں چھپنے پائی تھی کہ مترجم کا انتقال ہو گیا اور یہ نایاب ذخیرہ اب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا

ہم اپنے کرم دوست جناب فصیح الحق صاحب عباسی کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ہماری خواہش پر اس میں سے "بنائے احمد آباد کی کیفیت" رسالہ کے لئے مرحمت فرمائی اور اپنے عم بزرگوار کی اس یادگار کو چھپوانے کے لئے صاف کر رہے ہیں۔

ہم انشاء اللہ اس میں سے وقتاً فوقتاً اہم تاریخی واقعات نذر ناظرین کیا کریں گے۔

"اڈیٹر"

مظفر شاہ کے پوتے سلطان احمد نے احمد آباد کے آباد کرنے کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی مودود بن فیروز خاں سے لڑ بھڑ کر گجرات فتح کر چکا تھا۔

مودود کا استیصال کر کے ۸۱۳ھ ہجری میں قصبۂ اساول میں وارد ہوا۔ سب سے پہلے رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔ آسا بھیل جس کا یہ قصبہ تھا بڑے نامی گرامی سرکشوں میں شمار کیا جاتا تھا اُس کا بھی سلطان احمد کے جاہ و جلال نے استیصال کر دیا۔ بادشاہ چند روز تک بے فکر ہو کر دریائے سابرمتی کے کنارے سیر و شکار میں مصروف رہا۔ دریا کی آب و ہوا نے چھینٹے دے دے کر اپنا گرویدہ بنا لیا اور گرویدہ بھی ایسا بنایا کہ انجام کار یہیں کا ہو رہا۔ ایک روز سیر دریا میں طبیعت ایسی بہلی کہ رفیقوں اور مصاحبوں سے اس کے کنارے ایک شہر آباد کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ بادشاہ کی طبیعت کا رجحان ابتداء سے بزرگانِ دین و اہل اللہ کی طرف تھا اور اُن کا صد درجہ معتقد رہا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں حضرت سراج المحققین شیخ احمد کھٹو المعروف گنج بخش قدس سرہ موضع سرکھیج میں تشریف فرما تھے بادشاہ کو خیال گذرا کہ اگر حضرت موصوف میرے ارادے میں معین و مددگار

ہوں تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں۔ بادشاہ بصدق ارادت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بنائے احمد آباد کی کیفیت بیان کر کے اجازت چاہی۔ آپ کی زبانِ مبارک سے بَارَکَ اللّٰہُ فِی اِرَادَتِکَ ارشاد ہوا۔ یہ سنکر بادشاہ بہت محظوظ ہوا اور دریائے سابرمتی کے شرقی رویہ قصبۂ آساول میں ایک میدان سطحہ مگر نہایت پُر فضا پسند فرما کر منجموں کو زائچہ تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ حکم شاہی سے منجمان ذی علم نے بنائے احمد آباد کا زائچہ طیار کر کے تاریخ متعین کی۔ قمری مہینہ ذی قعدہ کی تیسری تاریخ بروز پنجشنبہ مطابق بیساکھ خدی پنجمی سمبت ۱۴۶۹ بکرماجیتی مرادف ۱۳۱۲ شاکی سالواسن کے روز پندرہ گھڑی اور پینتیس ۳۵ پل دن چڑھے بعد پوس کشتر کا عمل شروع ہوا تھا۔ زائچہ حسب ذیل ہے۔

شان ایزدی دیکھئے کہ حسن اتفاق سے ایسا زائچہ واقع ہوا کہ ساتوں ستارے اور دوگرہ بارہ برجوں میں مقیم تھے۔
علاوہ بریں بنائے احمد آباد کے متعلق یہ بات بھی مشہور خلایق ہے کہ اس کی بنیاد چار احمد نامی بزرگوں کے دست مبارک سے ڈالی گئی تھی جن کے اسمار گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت شیخ بزرگ قدوۃ المحققین سراج الملت والدین شیخ احمد کھٹو المعروف بہ گنج بخش قدس سرہ
۲۔ سلطان احمد خود والی ملک۔
۳۔ ملک احمد جو دروازہ کالوپور (احمد آباد) کے قریب گوشہ لحد میں لیٹے ہوئے اپنی آباد کی ہوئی بستی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔
۴۔ قاضی احمد صاحب جیند۔ آپ حضرت گنج احمد صاحب کے خلیفہ تھے اور پیران پٹن میں آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ اہل اسلام ہے۔ آپ کے لوح مزار پر بھی یہ عبارت کندہ ہے کہ "جن چار احمد نامی بزرگوں نے بنیاد احمد قایم کی تھی ان میں سے ایک آپ بھی تھے"۔

"حصار"

حصار احمد آباد ۸۱۳ھ ہجری میں شروع ہو کر تین سال کے عرصہ میں پورا تعمیر ہوگیا۔ تمام حصار کی عمارت پکی اینٹ اور چونے کی نہایت مستحکم بنی ہوئی ہے۔ مگر جس قدر حصہ دریائے سابر کے دامن سے وابستہ ہے اتنا حصہ کمر تک سنگ خارا کا بنا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے کل بارہ دروازے اور ایکسو انتالیس بروج اور دو گوشے ہیں۔ تمام قلعہ کی عمارت میں اس سرے سے اس سرے تک فصیل قلعہ پر چھ ہزار سات سو تریسٹھ کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ قلعہ کی مسافت دو کوس اور ایک جریب ہے۔ قلعہ ارک جس کو بھدر بھی کہتے ہیں انہیں ایام میں معہ ایک پتھر کی مسجد کے تیار ہوا تھا۔ قلعہ کی دیوار کی بلندی سات آٹھ گز سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر شاہجہاں کے زمانہ میں قلعہ ارک (بھدر) میں کھڑکی سے ملحقہ دیوار سیف خاں نے از سر نو تعمیر کروائی تھی جو تخمیناً پندرہ گز اونچی ہوگئی۔ چونکہ اس دیوار کے برابر سے دریائے سابر بہتا ہے۔ حفظ ما تقدم کے خیال سے یہ دیوار اس قدر بلند بنائی گئی ہے۔

شہر کا طول رائیڈ دروازہ سے لے کر جس کو دہلی دروازہ بھی کہتے ہیں جمال پور تک فی مابین شمال و جنوب تین ہزار ایک سو پچیس گز اور عرض قلعہ ارک کے جھروکے سے لے کر سارنگ پور دروازے تک فی مابین مشرق و مغرب دو ہزار پانسو گز ہے۔ قلعہ کی اندرونی زمین جس میں آبادی ہے دو ہزار دو سو انتیس بیگہ اور تیرہ بسوہ ہیں۔ شاعر گرامی طوائے شیرازی نے احمد آباد کی تاریخ میں چند اشعار نظم کئے ہیں جو ذیل میں درج ہیں:۔

چنیں گفت حلوائے شیریں سخن — که افشاند صد درج دُر در سخن
که چوں چند گه شاه گردوں مرام — شدش بر لب رود سابر مقام
زمینے بغایت ز خاشاک دید — دگر صحن خاکِ او پاک دید
ہوائے که جگر و دل را ہوس — نسیمش چو مشک ختا خوش نفس
مکانے نزه دید و جائے لطیف — محل خوش آب و ہوائے لطیف
بالہام غیبی و لطف اله — چنیں آمد اندر دل پادشاه
در آں سرزمین مروح ہوا — کند تازه شہرے معظم بنا
ہماں لحظه بانی طلب کرد شاه — بفرمود تا ہمدر آں جائے گاه
بسازد یکی شہر عالی اساس — که گویند سکان خاکش سپاس
سر خاک یر اوج خضرا برد — فرای را بر اوج ثریا برد
بنائے بر آرد بقصر فلک — که در دے شود خیره چشم ملک
پے دفع یاجوج کیں آوری — کشد بر زمیں سدِ اسکندری
کند سر زمیں آسمانے بنا — که خشتش بود جام گیتی نما
یکے مصر جامع کند آشکار — که خاکش برد آب چین و تتار
نشاپور را از حسد جاں کند — که گجرات رشک خراساں کند
طلب کرد اصحاب علم نجوم — که بودند گنجور گنج علوم
دقایق شناسان دورِ فلک — که واقف بودند از سما تا سمک
مطالع کشایان سطح سپہر — طوالع نمایان ناہید و مہر
بدیدند ہر کوکبی را شرف — نظر بر کشادند از ہر طرف
بفرمان شاہنشه بختیار — بکردند ساعات سعد اختیار
چو بانی بنا بر کشید از زمین — برد خواند ہر دم فلک آفریں
چو یکبار خشتی بخشش نہاد — ملک گفت مسعود و فرخنده باد
نو آباد شہرے شده بر زمیں — سوادش چو خالی بروئے زمیں

جو ترتیب آں شہر عالی مقام شد از ناصر الدین احمد تمام
ورا نام ہم احمد آباد شد درآں ملت احمد آباد شد
شدہ تازہ شہرے عمارت پذیر کہ گردوں ندیدش بدوراں نظیر
الٰہی تو ایں شہر عالی بنا
مدہ تا بحشرش زوال و فنا

شہر کے دروازے

شرقی۔ کالو پور۔ سارنگ پور۔ استوڑیہ
غربی۔ خان پور۔ رائے کھڑ۔ خان جہاں۔
شمالی۔ دریا پور۔ ایڈریا یا دہلی دروازہ۔ شاہ پور
جنوبی۔ جمال پور۔ بند دروازہ۔ رائے پور۔

ان بارہ دروازوں کے علاوہ دو اور کھڑکیاں بھی ہیں جن کے نام دیچہ باغ بھدر اور کھڑکی حلیم ہیں۔ بند دروازہ اور حلیم کی کھڑکی کے متعلق بہت سے اقوال زبانِ خاص و عام ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کی صداقت مشکوک ہے لہٰذا اُن کو یہاں قلمبند نہیں کیا جاتا۔

قلعہ ارک یا بھدر کی اندرونی زمین کا عرض و طول

طول۔ دریائے سابرمتی کے کنارے سے اُس قدیم بڑے دروازے تک جس کے دونوں طرف دو بڑے بڑے بُرج ایک ہزار چار سو ساسی گز۔ (۴۸۰ گز)

عرض۔ بھدر کی اندرونی مسجد سے جس کو خود بادشاہ سلطان احمد نے تعمیر کروائی تھی۔ باغ کے دروازے تک جو شمال میں واقع ہے چار سو گز (۴۰۰ گز)

قلعہ ارک یا بھدر کے اول تیرہ بُرج تھے۔ نجم الدولہ جالہ نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک بُرج نیا تعمیر کر دیا تھا۔ جب سے چودہ بُرج قایم ہیں۔ بادشاہی نقار خانے کا دروازہ اور باغ کا دروازہ قدیم عمارت میں شامل ہیں۔ کچہری والا دروازہ ناظموں کے زمانہ حکومت میں نیا تعمیر ہوا۔ سلاطین گجرات و ناظمان صوبہ جو بعد کو دارالسلطنت دہلی سے نامزد ہو کر آ!

کرتے تھے اسی قلعۂ ارک میں رہتے تھے۔ اس قلعۂ ارک کی وجہ تسمیہ کے متعلق بھی بہت سی لغو باتیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن ان میں سے بجز ایک کے اور سب باتیں قابل اعتبار نہیں اور وہ یہ ہے کہ چونکہ پٹن میں ایک پرانے زمانہ کا قلعہ اسی قسم کا ہے اور اس میں ہندوؤں کی بھدر کالی ماتا کا مندر واقع ہے۔ لہذا اس بنا پر قلعۂ ارک، قلعۂ بھدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ، اور احمد نگر کے قلعہ ارک بھی اسی طرح بھدر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جب یہ شہر آباد ہو گیا تو سلاطین گجرات نے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ ہر بادشاہ کے زمانہ میں آبادی نے ترقی کی سلطان محمود بیگڑہ کے زمانہ میں اس قدر آبادی بڑھ گئی کہ دنیا کے اعلیٰ شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔ قلعۂ ارک میں خود بادشاہ نے بھی کئی عمارتیں تعمیر کروائیں جو ایک مدت تک اصلی حالت میں آباد تھیں لیکن زمانہ کی دست برد سے رفتہ رفتہ گر کر کالعدم ہو گئیں۔ اب چند کھنڈر باقی رہ گئے ہیں جو اگلی شان و شوکت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہے ہیں۔

شہر میں صدہا مسجدیں نہایت عمدہ اور پتھر کی بنی ہوئی اب تک زمانہ سلف کی یادگار ہیں۔ راستے اور بازار ایسے وسیع اور کشادہ ترتیب دیئے گئے تھے کہ لوگوں کو اور خریداروں کو کسی قسم کی دقت پیش نہ آتی تھی۔ شہر کے ارد گرد تین سو ساٹھ اور ایک بیان کے مطابق تین سو اسی محلے آباد تھے۔ گویا پورے محیط ہو کر تمام شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان محمود ثانی نے اپنے زمانہ سلف میں محمود آباد کو دارالسلطنت قرار دیا۔ وہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی مطبوع طبع ہوئی کہ ہمیشہ وہیں رہا کرتا تھا۔

احمد آباد اور محمود آباد میں بارہ کوس کا فاصلہ ہے۔ لوگوں کو آباد کر کے دو رویہ بازار ترتیب دیا اور اس بازار کے اطراف و جوانب میں متوسلانِ سلطنت کے لئے مکانات تعمیر کروائے جس سے احمد آباد سے لے کر محمود آباد تک گویا ایک ہی شہر دکھائی دیتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۰)

(۳) اصحاب ذیل مضامین کی جانچ کریں گے :۔

۱۔ مولوی عبدالحق بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو

۲۔ مولوی سید محفوظ علی بی اے بدایوں

۳۔ مسٹر سید سجاد حیدر (یلدرم) بی اے علیگڈھ

۴۔ منشی امیر احمد علوی بی۔ اے نیچ چھاؤنی

۵۔ مولوی عبدالماجد بی۔ اے دریاباد ضلع بارہ بنکی

(بقیہ صفحہ ۱۶۶)

ادبیات

الوداعی ملاقات

(جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی متعلم بی۔ اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

ذیل کا افسانہ مشہور فسانہ نویس اسٹیونسن کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ نہ صرف انوکھا ہے بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ ہم جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی بی۔ اے کے ممنون ہیں کہ آپ نے اردو زبان نوازی مذکور فسانہ نویس کے شاہکار فسانہ Will of the Mill کا ترجمہ بھی مرحمت فرمایا ہے جو طویل اور بیحد دلچسپ و اثر انگیز ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

ایڈیٹر

میں اس فن کا ماہر نہیں ہوں اور حقیقت پوچھیے تو اس میں کمال حاصل کرنا تو مجھے دنیا میں مشکل ترین معلوم ہوتا ہے اور شاید آپ کا بھی یہی خیال ہو۔ دو چار میل جانے والے کو وداع کرنا نہایت آسان ہے مگر ہم کبھی بھی ایسے معمولی سفر پر وداع کرنے کے لئے نہیں بلائے جاتے، ہم صرف ایسے ہی موقعہ پر اسٹیشن پہنچتے ہیں جب کہ ہمارا دوست ایک دراز تر سفر پر ایک طویل مدت کے لئے جا رہا ہے، جتنا زیادہ دوست عزیز، سفر لانبا اور جدائی طویل ہوگی۔ اتنا ہی جلد ہم اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کریں گے اور ناکام ہوں گے اس طرح گویا ہماری ناکامی، موقع کی نزاکت اور ہمارے جذبات کی گہرائی کی نسبت سے ہوگی۔ کمرہ میں بلکہ دہلیز پر بھی ہم نہایت گرمجوشی کے ساتھ ؎

بسفر رفتنت مبارکباد　　بسلامت روی و باز آئی

کہہ سکتے اور اپنے پُرخلوص جذبات رنج و غم کو بشرہ سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ نہ الفاظ ہمارے جذبات کے اظہار میں ناکام رہتے ہیں اور نہ جانبین میں سے کوئی کسی قسم کی رکاوٹ اور جھجک محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے تعلقات کا رشتہ ابھی استوار ہوتا ہے۔ یہ آخری اجازت طلبی رسمی ہوتی ہے۔ پھر کیوں نہ اس تکلف کا قلع و قمع کر دیا جائے، جدا ہونے والے دوست ہمیشہ ازراہ اخلاق و انکساری اصرار کرتے ہیں کہ کرائے کے بھاڑے میں اسٹیشن تک تکلیف گوارا فرما کر محجوب نہ کیجئیگا۔ اور ہمیشہ ہی ہم ان درخواستوں کو خلوص کے منافی سمجھکر سُنا اَن سُنا کر دیتے ہیں۔ اور اگر کبھی بھولے پن سے ہم ان کی درخواست کو منظور کر لیتے ہیں تو وہ اس کا بُرا مانتے ہیں۔

کیونکہ وہ فی الحقیقت ہم سے الوداعی ملاقات کے متمنی اور دلی خواہشمند معلوم ہوتے ہیں اور اس خواہش کو دل سے بھی پورا کیا جاتا ہے مگر افسوس کہ اس وقت ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے اور ہم بے فائدہ اپنے بازو اس کی طرف عبور کرنے کے لئے پھیلاتے ہیں، ہمارے لئے آخری موقعہ باقی رہتا ہے لیکن ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہم اس طرح خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں جس طرح حیوان انسان کو دیکھا کرتے ہیں، ہمارے دل میں خیالات اور کہنے سننے کا طوفان برپا رہتا ہے۔ مگر ہم خاموش منہ تکتے رہ جاتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ وہی دوست ہیں جن سے کل شب مل چکے ہیں اور وہ بھی اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم بدلے نہیں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کائنات کی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس قلیل عرصہ میں اختلاف کی خلیج اس قدر وسیع ہو جاتی ہے کہ ہم یہ چاہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح گارڈ سیٹی دے کر اس تکلیف دہ اور مضحکہ انگیز صورت حال کا خاتمہ کر دے۔

گذشتہ ہفتہ ایک سرد اور کہر آلود صبح مجھے ایک دیرینہ دوست کو جو امریکہ جا رہا تھا۔ وداع کرنے کے لئے اسٹیشن جانا پڑا۔ رات ہم اس کو ایک رخصتی ڈنر یہ ——— جس میں رنج کے ساتھ خوشی کا عنصر بھی ملا ہوا تھا دعو کر چکے تھے۔ سالہا سال کے بعد غالباً وہ واپس ہوگا، ہم میں سے بہت سارے اس کو دوبارہ دیکھ بھی نہیں سکیں گے، ہم جب ماضی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ و مستقبل حالات پر اپنے پردں کا جو سایہ ڈال رہا تھا اس سے ناواقف نہیں تھے۔ ہم اپنے مہمان کی دوستی پر جس طرح شکر گذار تھے اس کی جدائی پر ملول و رنجیدہ بھی تھے۔ یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ مصروف عمل تھے بلاشبہ وہ ایک کامیاب "الوداع" تھی۔

اب ہم پلیٹ فارم پر خاموش اور از خود رفتہ کھڑے ہوئے تھے اور ریل گاڑی کی کھڑکی میں ہمارے دوست کا چہرہ نظر آ رہا تھا لیکن وہ تو ایک اجنبی کا چہرہ تھا ——— خوش کرنے کا متمنی، فریادی اور خود فراموش اجنبی کا چہرہ تھا، ہم میں سے ایک نے کہا کیا ہر چیز موجود ہے؟ اس طرح طلسم سکوت ٹوٹا۔ ہمارے دوست نے ایک دل فریب اشارہ کے ساتھ جواب دیا جی ہاں ہر چیز موجود ہے۔ ایک خالی اور حیران دماغ آدمی کی طرح زور دے کر اس نے پھر دہرایا "جی ہاں ہر چیز موجود ہے" میں نے کہا آپ ٹرین میں لنچ کھانے کے قابل ہو سکیں گے حالانکہ یہی پیشین گوئی ایک سے زیادہ مرتبہ کی جا چکی تھی۔ اس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "جی ہاں" اور گاڑی سیدھا لورپول گئی ہے یہ بات ہم کو عجیب معلوم ہوئی کہ، ہم ایک دوسرے کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور آخر کار ہم میں سے ایک نے پوچھا کہ کیا گاڑی کریو (———) پر نہیں ٹھہرتی۔ ہمارے دوست نے مختصر جواب دیا کہ "نہیں" وہ بالکل بے چین معلوم ہوتا تھا۔ مگر بڑی دیر تک انتظار کی تکلیف برداشت کرنی پڑی، ہم میں سے ایک نے بناوٹی ہنسی اور سر کو جنبش دے کر کہا "ٹھیک ہے" جنبش سر، ہنسی اور بے معنی ٹھیک ہے" غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر ادا کئے گئے تھے۔

دوسرا سکوت ہم میں سے ایک کی کھانسی سے ٹوٹتا اور کھانسی کا یہ دورہ ہر شخص جانتا ہے کہ ارادی تھا لیکن اس سے وقت گذاری تو بہرحال ہو گئی، پلیٹ فارم پر شور کم نہیں ہوا تھا ٹرین کے چھوٹنے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہمارے اور ہمارے دوست کی اس آفت سے رہائی کی نیک ساعت ــــــ ہنوز دلی دور است۔

میری متجسس نگاہوں نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو جو ہمارے ڈبے سے دوسری کھڑکی میں کھڑی ہوئی لیڈی سے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا گفتگو کر رہا تھا تاڑا۔ اس کا خوبصورت چہرہ دیکھا ہوا تھا، نوجوان لیڈی صاف طور پر امریکن معلوم ہوتی تھی اور وہ انگریز تھا ورنہ میں اس کے حکمانہ اور مؤثر انداز سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا کہ وہ اس کا باپ ہے میں اس کی گفتگو سننا چاہتا تھا، مجھے یقین ہے کہ وہ بہترین مشورے دے رہا تھا۔ اور اس کی نگاہوں میں محبت و ہمدردی کے زبردست جذبے ــــــ نظارہ بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی شخصیت پُراسرار اور مقناطیسی نظر آ رہی تھی جب اس نے آخری ہدایات اور مشوروں کا دفتر کھول کر رکھ دیا تو میں یہاں کھڑا ہوا اس کی اس مقناطیسی قوت کے اثرات کو محسوس کر رہا تھا، پُراسرار شخصیت اور اُس کی مقناطیسیت سے اس کے چہرہ کی طرح میں خوب واقف تھا مگر مجھے اس کا تجربہ کہاں ہوا تھا۔

آناً فاناً مجھے یاد آ گیا کہ یہ شخص ہیوبرٹ لی راس (H. Le Ros) تھا مگر اب اس میں کتنا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سات یا آٹھ سال پہلے شہر کی ایک سڑک کا واقعہ ہے اس وقت وہ ہمیشہ کی طرح بیکار تھا۔ اس لئے مجھ سے دو کراؤن قرض لئے تھے۔ اس کو قرض دینا اپنی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا، اس کا وجود ہمیشہ مقناطیسی رہا ہے، اس کی اس مقناطیسی شخصیت نے اس کو لندن کے اسٹیج پر کیوں کامیاب نہیں بنایا۔ میرے لئے ہمیشہ یہ معمہ رہا ہے وہ نہایت کامیاب اور اعلیٰ درجہ کا ایکٹر اور مضبوط اخلاق کا آدمی تھا مگر بہت سے اپنے ہم پیشہ افراد کی طرح ہیوبرٹ لی راس (میں یہاں اس کا اصلی نام جس سے وہ مشہور ہے نہیں بتا سکتا) بتدریج قعر گمنامی میں گرتا ــــــ باہر چلا گیا اور اس طرح میں اُس کو دوسروں کی طرح بُھلا بیٹھا۔

اس کو اتنے سالوں کے بعد یہاں پلیٹ فارم پر اس طرح کامیاب اور خوش حال دیکھنا تعجب خیز تھا نہ صرف اس کی نادری کی وجہ سے بلکہ اس کے بیش قیمت لباس کے سبب اس کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے نقلی اونی کوٹ اس کے حجامت بڑھے ہوئے بیوتوں چہرہ کی طرح اس کا غیر منفک جزو معلوم ہوتا تھا مگر اب اس کا لباس قیمتی اور اصولی تھا جو لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف بلا تامل مائل کرتا تھا۔ وہ مالک نیک معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کے وداع کرنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا "برائے مہربانی ہٹ کر کھڑے ہو جائیے" گاڑی چلنے والی تھی میں نے اپنے دوست کو الوداعی دستی ہلائی۔ لی راس وہیں کھڑا رہا وہ نوجوان امریکن لیڈی کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا "جناب برائے مہربانی ہٹ جائیے" اس نے حکم کی تعمیل کی مگر فوراً ہی پھر کچھ کہنے

کے لئے آگے بڑھا، میرا خیال ہے کہ آنسو اس کی آنکھوں میں لہرا رہے تھے بالآخر وہ ٹرین کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد میری طرف پھرا۔ وہ مجھ سے مل کر خوش معلوم ہوتا تھا اس نے مجھ سے دریافت کیا "اتنے سالوں تک آپ کہاں غائب تھے" اور اس کے ساتھ ہی مجھے دو کراؤن واپس کر دئے گویا کہ وہ قرض کل لیا گیا تھا وہ میرے بازو میں اپنا بازو ڈالے اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے بیان کرنے لگا۔ میرے ڈرامائی تنقیدوں کو وہ ہر ہفتہ کس مسرت اور خوشی کے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔

میں نے جواب میں پوچھا کہ اسٹیج سے وہ کس طرح غائب ہوگیا اس نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے مگر آج کل میں اسٹیج پر ایکٹ نہیں کرتا ہوں اس نے یہ جملہ اسٹیج پیز در دیکر کہا تھا اس لئے میں نے دریافت کیا کہ پھر وہ کہاں ایکٹ کیا کرتا ہے پلیٹ فارم پر اس نے جواب دیا میں نے کہا کہ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ محفل رقص و سرود (Concert) پر ایکٹ کرتے ہیں وہ مسکرایا اور اپنی چھڑی کو زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگا کہ پلیٹ فارم سے میری مراد یہ جگہ ہے کیا اس کی پر اسرار کامیابی اور خوش حالی نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا مگر نہیں وہ تو بالکل صحیح الدماغ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے ذرا زیادہ صاف صاف الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی درخواست کی۔

اس نے اپنا عطا کردہ سگریٹ سلگانے کے لئے روشنی پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کسی دوست کو رخصت کرنے آئے تھے۔ میں نے تائید کی تو اس نے پوچھا کہ خود آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ میں یہاں کیا خیال کر رہا ہوں میں نے کہا کہ اس کو بھی یہی کام کرتے ہوئے میں نے دیکھا ہے اس نے متانت سے جواب دیا کہ "نہیں" وہ لیڈی میری دوست نہیں تھی۔ میں اس سے پہلی مرتبہ آج صبح یہاں آدھ گھنٹہ سے بھی کم پہلے ملا ہوں۔ یہاں دوبارہ اس نے اپنی چھڑی سے پلیٹ فارم پر ٹھونسا دیا۔ میں نے اپنی حیرانی کا اقرار کیا وہ مسکرایا اور کہنے لگا شاید آپنے انگریزی امریکی معاشرتی انجمن کی خبر سنی ہوگی میں اس سے لاعلم تھا اس نے سمجھایا کہ ہزاروں باشندگان امریکہ میں سے جو ہر سال انگلستان سے گذرتے ہیں سینکڑوں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی انگریز دوست نہیں ہوتا قدیم زمانے میں یہ لوگ تعارفی خطوط لایا کرتے تھے مگر انگریز ایسے طوطا چشم اور جوہر مہمان نوازی سے عاری ہیں کہ ان خطوط کی انکے نزدیک خطوں کے کاغذ سے بھی کم قدر و قیمت ہوتی ہے پی راس نے کہا کہ یہ انجمن ایک قدیم ضرورت کو پورا کرتی ہے امریکن بڑے ملنسار ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثروں کے ہاں خرچ کرنیکو خوب رقم ہوتی ہے یہ انجمن ان کو انگریز دوست مہیا کرتی ہے۔ ۵۰ فیصدی فیس انجمن رکھ لیتی ہے اور پچاس فیصدی دوستوں کو دیتی ہے افسوس ہے کہ میں اس انجمن کا ناظم نہیں ہوں بصرف ایک ملازم اور رخصت کرنے والوں میں سے ہوں تاہم اپنی جگہ پر خوش اور اچھا ہوں اور اگر ناظم ہوتا تو نہایت مالدار ہوتا۔ میں نے مزید توضیح و تشریح کی خواہش کی اس نے کہا کہ اکثر و بیشتر امریکن انگلینڈ میں دوست پیدا کرنا نہیں چاہتے مگر وہ سب کے سب ج سفر رفتہ مبارکباد کے سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ فیس تنہا مسافر کے لیے ۵ پونڈ (۲۵) ڈالر اور دو یا دو سے زیادہ کی جماعت کے لئے ۸ پونڈ (۴۰ ڈالر)

ہے۔ وہ اپنی روانگی کی تاریخ اور حلیہ سے۔ جس کے ذریعہ رخصت کرنے والا انہیں پہچان سکے اطلاع دیتے ہوئے فیس انجمن میں بھجوا دیتے ہیں تب ــــ ہاں تب ان کو نہایت تپاک سے وداع کیا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اس کا حاصل کیا؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کو اس سے اپنی غربت اور دوستوں سے محرومی کا خیال نہیں ہوتا، اس سے ان کی عزت گارڈ کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کے ساتھی۔ جو لوگ جہاز پر ان کے ہم سفر ہونے والے ہیں ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنے پاتے اور ان کو پورے سفر میں ایک حیثیت حاصل ہو جاتی ہے قطع نظر اس کے خود اس میں ایک بڑی مسرت ہے، آپ نے مجھے اس لیڈی کو رخصت کرتے ہوئے دیکھا ہے کیا آپ کے خیال میں میں نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ ادا نہیں کیا نہایت خوبصورتی سے میں نے آزار کیا، مجھے تم پر رشک آتا تھا میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ ــــ ٹھیک ہے میں اس کا تصور کر سکتا ہوں اور آپ وہاں سر سے پاؤں تک لرزتے، خاموشی کے ساتھ ثبت کی تصویر بنے اپنے دوست کو گھورتے ہوئے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں جانتا ہوں کہ اس فن کا مطالعہ کرنے اور اس پیشہ کو اختیار کرنے سے پہلے میں بھی اسی طرح کیا کرتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب میں نے کمال حاصل کر لیا ہے۔ ابھی تک میں پلیٹ فارم کا طفل مکتب ہوں جیسا کہ خود آپ کو تجربہ ہوا ہے ریلوے اسٹیشن تمام مضافات سے زیادہ ایکٹ کرنے کے لئے مشکل مقام ہے مگر میں نے ناراضگی سے کہا کہ جناب معاف کیجئے میں ایکٹ نہیں کر رہا تھا بلکہ میں فی الحقیقت محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے کہا کہ صاحبزادے علی ہذا القیاس میرا بھی یہی حال تھا۔ آپ بغیر محسوس کئے ایکٹ نہیں کر سکتے جب گاڑی روانہ ہوئی ہے تو کیا تم نے میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطروں کو چھلکتے ہوئے نہیں دیکھا؟ میں نے ان کو نکل پڑنے پر مجبور نہیں کیا میں تم سے کہوں کہ میں فی الحقیقت متاثر ہو گیا تھا میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی متاثر ہو گئے تھے مگر باوجود اس کے تم اس کے ثبوت میں ایک آنسو بھی نہیں بہا سکے۔ تم اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں ہو گویا دوسرے الفاظ میں تم ریلوے اسٹیشن پر ایکٹ نہیں کر سکتے میں چیخ اٹھا کہ مجھے سکھاؤ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور آخر کار اس نے کہا اچھا مگر وداع کرنے کا موسم اب عملاً ختم ہو چکا ہے البتہ میں تم کو ایک درس دوں گا۔ میرے درس میں کئی طلبا شریک ہوتے ہیں اس نے ایک مطالعہ نمبر بوٹ نوٹ بک کو دیکھتے ہوئے کہا ہاں میں تم کو صرف منگل اور جمعہ کے دن ایک گھنٹہ دے سکوں گا۔

مجھے اقرار ہے کہ اس کی شرائط کڑی تھیں مگر میں ان پر چیں بجبیں نہیں ہوں مجھے منظور ہے۔

احمد عبد اللہ المسدوسی متعلم بی۔ اے عثمانیہ کالج

"خاکِ بسر"

(از عشرت رحمانی الجبوبی رامپوری)

(۱)

"نوشتۂ تقدیر کا مطالعہ انسانی نگاہ کے اختیار میں نہیں"

"کیا" ہوگا۔ اور کس طرح ہوگا۔ کچھ کسی کو نہیں معلوم ہوتا۔ مگر انسان جدوجہد کو کام میں لاتے ہوئے 'عمل' کے میدان میں قدم بڑھاتا ہے تو کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

مرزا عابد میرٹھ میں سب انسپکٹر تھے۔ تقدیر نے 'رشوت ستانی' کے مقدمہ میں پھنسا کر بریت محال کر دی۔ اور داروغہ جی بشکل جیل خانہ کے منہ سے نکل کر صرف 'موقوفی' کی ناقابل برداشت سزا پا گئے۔ کچھ دنوں گذر اوقات جس طرح بن پڑی کرتے رہے۔ مگر جلد ہی قسمت کا دوسرا فیصلہ صادر ہوا کہ صرف اسی قدر اکتفا نہیں۔

کل اثاثہ ختم ہوگیا اور مرزا صاحب بیچارے کس مپرسی کے عالم میں نظر آنے لگے۔ غریب کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ایک بیوی اور ایک خود۔ کل سات ذی روح افراد کی تن پروری کا انتظام۔ ناقابل بیان مصیبت تھا۔

پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے اہل شہر کی نظروں میں جو وقعت تھی مقدمہ میں ماخوذ ہونے اور برخاستگی کے باعث کچھ بھی نہ رہی۔ اکثر دشمن انتقام کے لئے آمادہ ہوگئے اس بدنصیبی اور غربت کا شریک دنیا میں ملنا تو امکان سے بعید۔ ع

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

(۲)

غریب مصیبت کے مارے۔ تن بہ تقدیر میرٹھ سے روانہ ہوگئے۔ کیونکہ عزت و شرافت کا تقاضہ یہی تھا کہ 'داروغہ جی' پر اہل شہر کی نظریں اب بیباکانہ، بے وقعتی سے نہ پڑیں۔

نہ معلوم کس مصیبت سے اور کہاں سے کچھ سامان فروخت کرکے اور کیا کیا کرکے بیوی بچوں کو ہمراہ لیا اور سیدھے بمبئی سدھارے۔

بمبئی سا شہر اور بے روزگار مرزا جی۔ معاً ایک مفتر مجوئی کے کس طرح مصیبت کٹ سکتی۔

اور پھر تقدیر و تدبیر دست و گریباں۔ "تقدیر" تدبیر سے اعترافِ شکست کے لئے مصر۔
فاقوں کی نوبت پہنچی۔ نہ تن پر کپڑا درست ہے۔ نہ پاؤں میں جوتہ۔ کس سے امداد کے طالب ہوں۔ کیا کریں۔ کہاں جائیں۔ عرصہ کے بعد منت۔ سماجت سے ایک کارخانہ میں مزدوری شروع کردی، ایک لڑکا جو (عمر میں پندرہ برس کا اور سب سے بڑا تھا) اور خود صبح سے شام تک وہاں کام کرتے تو ڈیڑھ روپے مل جاتے۔ جس سے کچھ جان میں جان آئی۔ حالت سنبھالی، سنبھلنے بھی نہ پائے کہ "قسمت" نے پھر ایک طمانچہ رسید کیا جس سے بے دم ہو گئے۔ یعنی جس کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ وہاں مینیجر سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہو گیا۔ شریف آدمی تھے سخت وسست کی برداشت نہ کر سکے۔ "لوہے کی سلاخ" جوشِ انتقام میں ان کے ہاتھوں سے گذر کر اس کے سر تک پہنچی اور مینیجر کے لئے پیغام قضا بن گئی،
یہ ایک نئی مصیبت سر پر پڑی۔ گرفتار ہوئے۔ قتل کے جرم میں مع لڑکے کے چالان ہوا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ سشن سپرد ہوا۔ اب ان کو ملازمت کی "فرعونیت" یاد آئی۔ کیا کیا کارنامے ــــــــــ!!
"ایک سب انسپکٹر پولیس" ــــــــــ "اور ایک ادنیٰ مزدور بہ حیثیت قاتل"۔ دونوں حالتوں کا موازنہ ــــــــــ دلخراش اور روح فرسا، احساس ــــــــــ! اُدھر بیوی اور بچے بے سہارے۔ فاقوں کے مارے۔ زندہ در گور، کبھی خواب میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ مرزا عابد سب انسپکٹر ــــــــــ ان مصائب کی کشمکش کے بعد جیلخانہ میں ایک قاتل کی حیثیت سے "موت و زندگی" کی کشاکش، کا نظارہ دیکھ سکیں گے۔ اور خاندان بھیک بھی نہ پا سکیگا۔
مگر کاتبِ تقدیر کے زبردست قلم نے تو یہ سب کچھ پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا۔ جو "اٹل" ثابت ہوا!
اب مرزا صاحب نے اپنے تمام گناہوں پر اشکِ ندامت بہائے۔ اور بصد الحاح وزاری عفو کی درخواست درگاہِ صمدیت میں پیش کی۔ کہ رحمتِ حق ان کو بخش دے۔ اُس بارگاہ میں کسی کی "التجا" بیکار نہیں جاتی۔
دریائے رحمت جوش زن ہوا۔ خطائیں معاف ہوئیں۔ مگر "منتقم حقیقی" کا فیصلہ انصاف کے خلاف ہرگز نہیں۔

(۳)

قسمت نے بھی کچھ یاوری کی۔ کارخانہ کا مالک۔ مرزا صاحب کی بے کسی اور مفلسی پر رحم کھا کر ہمدردی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اُس کی نظر میں "مینیجر متوفی" کا قصور ثابت ہوتا تھا۔ بصد محنت و کوشش کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کرنے لگا، اور ثابت کرا دیا کہ مینیجر نے پستول سے حملہ کیا تھا۔ جان بچانے کے لئے مرزا "عابد" نے لوہے کی سلاخ "استعمال" کی۔ جو ناگہاں موت کا باعث ہوئی۔ عمداً قتل کا ارتکاب عمل میں نہیں آیا۔

اور لڑکا بالکل بے قصور ہے۔ موقعۂ واردات پر اُس کی موجودگی بھی ثابت نہیں "۔
عدالت سے حکم ہوا کہ لڑکے کو بالکل بری کیا جائے۔ چونکہ واقعات سے ثابت ہے کہ مینجر کا ارادہ مرزا عابد کو پستول سے ہلاک کرنے کا قطعی تھا۔ اس لئے مرزا نے حفاظت جان کی غرض سے یہ عمل کیا جو اتفاقاً موت کا باعث ہوا "
"استحقاق حفاظت خود اختیاری" ثابت ہے۔ لیکن تاہم ایک سال کی 'قید سخت' کی سزا دی جاتی ہے "۔
مرزا جی کے نزدیک یہ بھی بری ہونا تھا۔ "جان بچی لاکھوں پائے"۔ کہتے جیلخانہ پہنچے۔
مگر خاندان کی مصیبت افلاس کے ہاتھوں ناگفتہ بہ " خدا کے رحم و کرم کا شکر ادا نہیں کرسکتے کہ جان بچ ہی گئی
لڑکا محنت مزدوری کرتا اور جس طرح بھی ہوسکتا۔ خور و نوش کا انتظام ہو جاتا۔
خدا خدا کرکے مصیبت کے دن گذارے۔ ایک سال کے بعد مرزا جی میعاد ختم کرکے رہا ہوئے۔
کارخانہ میں پہنچے۔ مالک نے تسلی و اطمینان کرکے کسی کام پر تقرر کر دیا۔ اب دونوں باپ بیٹے مل کر چالیس پچاس روپیہ ماہوار کما لیتے اور خدا کا شکر ادا کرکے معمولی طور پر گذر اوقات کرتے۔ اسی طرح دو سال کا عرصہ ہوگیا۔ اس درمیان میں چالیس پچاس روپیہ پس انداز کرکے جمع بھی ہوگئے۔ مالک کارخانہ کے مشورے سے انہوں نے ارادہ کیا کہ کچھ معمولی تجارت کا سلسلہ شروع کریں۔ کسی 'کپڑے کے کارخانہ' میں مالک ان کو لے گیا اور کچھ کپڑا جو مشین میں کٹ کر خراب ہوگیا تھا۔
پچاس روپے میں خرید لیا۔ اور بازار میں مختلف طریقے سے اسے فروخت کر دیا، اسی طرح کچھ عرصہ تک سلسلہ جاری رہا۔
ایک روز مرزا صاحب نے سُنا کہ 'بانات' کے کچھ تھان ایک کارخانہ میں نیلام ہو رہے ہیں۔ یہ فوراً پہنچے اور قیمت طے ہوکر ڈیڑھ سو روپے میں کل تھان خرید لئے
ان کی بیوی سینا پرونا بخوبی جانتی تھیں۔ رائے ہوئی کہ اس 'بانات' سے مختلف کپڑے تیار کئے جائیں۔ چنانچہ ایک 'مرزئی' پہلے تیار ہوئی اور ایک لڑکا اُسے بازار لے گیا۔ امداد ربانی شامل حال تھی۔ اتفاقاً کوئی والیٔ ریاست بغرض سیر و تفریح آئے ہوئے تھے۔ بازار سے گذر رہے تھے کہ اُن کی نظر اس 'مرزئی' پر پڑی۔ نہایت سلیقہ سے بیل بوٹہ کا کام کیا گیا تھا خوبصورت اور جدید طریقہ کی معلوم ہوئی۔ لڑکے کو قریب بُلا کر 'مرزئی' قبضہ میں کی۔ اور بغیر دریافت پانچسو روپیہ عنایت ہوئے۔ لڑکا حیران و ششدر تھا کسی طرح یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس قدر رقم، اس کی قیمت۔
شاید نواب صاحب مضحکہ اڑاتے ہیں۔! لیکن جب اُن کی سواری نظروں سے غائب ہوگئی۔ تو یقین ہوا کہ۔ واقعی قیمت ادا کی گئی ہے۔

بدحواس دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ ماں باپ اس بے اندازہ رقم کو دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ پھر خیال کر لیا کہ رئیس کی پسند ہے۔ شاہانہ عطیہ ہے۔ کوئی حیرت افزا واقعہ نہیں۔

تقدیر نے کروٹ بدلی۔ دن پھرے۔ مرزا خوش خوش مالک کے پاس پہنچا واقعہ بیان کیا۔ اس نے بھی مبارکباد دی اور اس نے کہا کہ ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ "کالبا دیوی روڈ" پر ایک ہوٹل کو رات 'آگ' نے خاکستر کر دیا۔ اس کی خاک۔ نیلام ہو رہی ہے۔ فوراً جاؤ اور وہ "خاک" خرید لو۔ قسمت آزمائی کرو۔ دیکھو "قدرت کو کیا منظور ہے"

مرزا بہت حیران و پریشان ہوئے۔ مالک کا کیا مطلب ہے۔ اس 'رقم' سے ناراض تو نہیں ہو گیا۔ 'خاک' کی خریداری کسی ذی ہوش۔ کا کام نہیں۔ ہوٹل جل کر خاک سیاہ ہو چکا۔ اس کی 'خاک' کیا 'اکسیر' ہو گئی۔ کیا معاملہ ہے۔ خاک کا میں کیا کروں ــ"

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مالک نے ہنس کر کہا "مرزا جی! میں سمجھتا ہوں تم اس تقریر سے حیران ہو گے۔ مگر تم کو اس معاملہ میں تجربہ نہیں۔ تمہاری سراسیمگی بیجا نہیں۔ کچھ خوف نہ کرو۔ فوراً جاؤ اور 'خاک' کی خریداری کرو۔ کیا تعجب ہے۔ تمہاری تقدیر۔ اور تائید غیبی۔ اُسے 'اکسیر' بنا دے۔ اپنی پھوٹی تقدیر خاک میں ڈھونڈو۔ بس جلد جاؤ۔ ہم اس قسم کی تجارت کا راز سمجھتے ہیں۔

(۵)

ناچار مرزا غریب چل دئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں۔ خاک کے تودے آسمان سے ٹکرا رہے ہیں۔ پہاڑ کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ششدر کھڑے ہوئے۔ مگر غور کیا تو اکثر تجار موجود تھے۔ اور خریدنے کے لئے آمادہ۔ مالک کی ہدایت کا بھی خیال کیا۔ جرأت کر کے کچھ رد و بدل کے بعد چھ سو روپے میں 'خاک' کے پہاڑ خریدے اور مالک کے پاس پہنچے۔ اس نے کہا "مزدور لیجاؤ" اور تقدیر کی جستجو کراؤ" اس پر یہ بہت رنجیدہ اور پریشان ہوئے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ آخر مالک نے ان کو سمجھا کر اصرار سے مزدور روانہ کئے اور خود ان کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مزدور نے خاک کے ڈھیر میں سے ایک 'ڈبیہ' نکالی۔ سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی چھوٹی ڈبیہ تھی۔ مالک نے خود اُسے کھولا۔ مرزا جی نے بھی اسے دیکھا۔ اب تو حیرت و خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہنسی سے بیتاب ہو گئے۔ "ہیرے" کی چمک "نے آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دی۔ مالک نے مزدوروں سے کہہ دیا کہ اب جو کچھ اس میں سے ملے وہ سب تم لوگوں کی ملکیت ہے اور مرزا کو ہمراہ لے کر چلا آیا۔ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال * کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

(۶)

اب وہی مرزا عابد، ہیں جو ایک ادنیٰ مزدور کی حیثیت سے کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ کہ ان کے ذاتی کارخانوں میں ہزاروں مزدور نظر آتے ہیں۔ "بیک گردشِ چرخ نیلوفری " کیا کیا ہو چکا ——— قدرت کی کار فرمائیاں انسانی عقل کی رسائی سے مستغنیٰ ہیں "

پولیس کا سب انسپکٹر ——— میرٹھ کے ایک علاقہ کا بادشاہ " ——— "محتاج۔ بیکس، فاقہ زدہ "۔ بمبئی میں مزدور، ——— (قتل کے جرم میں ماخوذ، ——— (مالک کارخانہ امداد ربانی سے ہمدردی پر آمادہ) ——— جیلخانہ میں قیدی کی حیثیت سے ——— (نازپروردہ ——— اولاد۔ اور شریف بیوی، ٹکڑوں اور چیتھڑوں کو محتاج۔ بیکسی کے عالم میں قابلِ رحم) ——— پھر وہی مزدور ——— ایک ادنیٰ تاجر، پارچہ فروش ——— اور ایک گردش میں وہی ——— خاک بسر ——— "خاک کے ڈھیر، سے لکھ پتی ——— بمبئی کا رئیس التجار ——— "سیٹھ عابد" ——— جس کی کوٹھی میں سینکڑوں عمائدین شہر اور افسران پولیس " حلقۂ احباب " میں شامل۔ نظر آتے ہیں ——— "

" خدائی اُس کی ہے، جس پر نظر پڑی تیری "

(مصوّرِ فطرت) عشرت رحمانی المجوبی

(بقیہ صفحہ ۱۵۶)

(۴) بہترین مضمون نگار کو حسب ذیل انعامات دیے جائیں گے۔

۱۔ تمغۂ شہر (سونے کا)

۲۔ ایک سو ایک (۱۰۱) روپے کی تھیلی

۳۔ مضمون کے پچاس مطبوعہ نسخے

(۵) جس مضمون پر انعام دیا جائے گا، نیز جملہ مضامین کے مجموعہ کے حقوق طبع و اشاعت بحق الناظر محفوظ رہیں گے۔ اور مجموعہ شایع ہونے سے قبل کوئی مضمون الناظر کے سوا کہیں اور شایع نہ ہو سکے گا۔

ظفر الملک ایڈیٹر الناظر

شہید تغافل

"بالم"

(بہ سلسلہ ماہ جنوری)

(۵)

کون! سلیمہ !! منظور کے منہ سے انتہائی حیرت و استعجاب کی حالت میں سلیمہ کو الٰہی بخش کے مکان پر دیکھ کر بے ساختہ نکل گیا۔ سلیمہ جو منظور کو دیکھکر زینے ہی پر ٹھٹک کر ٹھہر گئی تھی جذبہ محبت و دفورِ اضطراب سے آنکھوں سے نہ رکنے والا سیل سرشک بہانے لگی۔ اگرچہ دونوں کے درمیان شرم و حیا کی ایک بسیط خلیج حایل تھی لیکن ان کے دل معاملہ کی نوعیت کے سمجھنے سمجھانے میں مصروف تھے، یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کون کہاں تک کامیاب رہا مگر اس میں شک نہیں کہ حسن، عشق میں اور عشق، حسن میں مدغم ہوگیا تھا جس سے ان سرشاران بادہ حسن و عشق سے کوئی کیفیت مخفی نہ تھی خدا جانے یہ دلچسپ منظر اور کب تک قایم رہتا اگر ماما برآمدے سے نکلکر ان متوالوں کو موقع کی نزاکت کا احساس نہ کراتی۔ سلیمہ چونک کر ماما کے ساتھ نیچے چلی گئی اور منظور اس خواب پریشان سے بیدار تو ہوا لیکن اس کی تعبیر سے گھبرا رہا تھا یعنی ماما پر اصل راز کے منکشف ہو جانے پر نہایت سراسیمہ و پریشان تھا۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا بالآخر ملاقاتی کمرے میں گیا۔ جہاں خوش قسمتی سے اس وقت کوئی نہ تھا جو اس کے بشرے سے اندرونی جذبات کا پتہ لگا سکتا۔ اس لئے اپنی حالت درست کرنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ موجودہ واقعات پر ایک تنقیدی نظر دوڑائی کوئی پندرہ بیس منٹ کی فکر و غور کے بعد شاید وہ کسی مستقل نتیجہ پر پہنچا اور کمرے سے نکلکر نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ باختہ حواس مجتمع کر کے زنانکی طرف چلا۔

الٰہی بخش کی کوٹھی ایک پرفضا مقام پر واقع ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک وسیع احاطہ تھا اسی میں ملازمین کی کوٹھی سے ملحقہ مکانات اور ایک طرف اصطبل و موٹر خانہ بنا ہوا تھا کوٹھی کے زیریں حصہ میں چند کمرے اور ایک شاندار ڈرائنگ روم تھا جو کسی بڑے آدمی کی ملاقات ہی کے وقت کھولا جاتا تھا یا جب کبھی میاں رحیم بخش علیگڈھ سے چھٹیوں پر آتے تو دوستوں کی آمد و رفت کی وجہ سے کھلا رہتا ورنہ عموماً بالائی دیوان خانہ میں ہی ملاقات لی جاتی تھی۔ اوپر کے بیٹھکے میں جانے کے لئے علاوہ پشت کے زینے کے ایک علیحدہ محاذ پر بھی زینہ تھا۔ پشت کی جانب کا زینہ ملازمین و مستورات

کے لئے منحوس تھا۔ منظور اکثر اسی زینے سے آتا جاتا تھا حسب دستور آج جب وہ اس زینے سے اوپر جا رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر سلیمہ سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔

زنانہ میں اجازت لیکر منظور داخل ہوا ایک صوفے پر الٰہی بخش دراز تھے اور قریب ہی ایک کرسی پر ان کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں منظور کو دیکھکر الٰہی بخش نے کہا۔ منظور! کیا وجہ ہے کہ میں تم کو کئی روز سے نہایت پریشان و متفکر دیکھ رہا ہوں؛ خدانخواستہ کہیں اندرونی مرض تو نہیں لاحق ہو گیا؟

مرض تو نہیں ہے کچھ یوں ہی سی طبیعت نڈھال اور دل پر ایک قسم کی مُردنی سی چھائی ہوئی رہتی ہے۔

اگر کام کی کثرت اور کلرکوں کی کمی ہو تو چند اور محرر عارضی طور پر رکھ لیجئے جس سے کام کا بار بھی ہلکا ہو اور کام میں سہولت بھی ہو۔ تم صرف گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضروری کام دیکھ لیا کرو اور باقی تمام کام کے متعلق ماتحتوں کو ضروری ہدایات کر دیا کرو۔ دیکھو انشاء اللہ آیندہ ماہ مئی میں میاں رحیم بخش بھی علیگڈھ سے ایم۔ اے پاس ہو کر آجائیں گے۔ تمہارا بہت سا کام وہ بھی انجام دیا کریں گے۔

اول تو کام کی ایسی کثرت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو طبیعت اس سے اکتانی نہیں ہے بلکہ فرصت اور تنہائی میں جی پریشان ہونے لگتا ہے تاہم اگر میاں آجائیں گے تو علاوہ کاروباری دنیا سے واقف ہونے کے بہت کچھ تجارتی معاملات میں بھی تجربہ حاصل کریں گے جو ان کے لئے بے انتہا ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں تو اب انہیں بہت جلد اپنے کام کو ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

ابھی تو وہ ناتجربہ کار ہیں۔ تمہارے ماتحت ایک عرصہ تک کام کریں گے۔ جب کہیں وہ تجارتی معاملات کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

اس قسم کی گفتگو کے بعد کچھ کارخانے کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ دوران گفتگو میں منظور نے ممدا حامد کے مر جانے پر بھی اظہار تاسف کیا جس پر الٰہی بخش فوراً بول اٹھے ہاں وہ چونکہ اپنا پرانا اور دیانت دار آدمی تھا میں نے پرسوں سے اس کی بیوی بچوں کو بھی اپنے ہاں ہی بلا لیا ہے تاکہ وہ حامد کے مرنے اور اپنے افلاس کے تفکرات سے پریشان نہ ہوں، یہاں انہیں گھر کے آدمیوں کی طرح رکھتے ہیں اور ان سے کوئی خدمت نہیں لیتے کوٹھی کے زیریں حصہ میں ایک کمرہ بھی دے رکھا ہے۔

منظور اصل حقیقت کے ظاہر ہو جانے سے قدرے مطمئن ہو گیا مگر پھر بھی ایک خیال شدت کے ساتھ اس کو بیچین کئے ہوئے تھا جس کا تدارک بظاہر اس کے حیطہ امکان سے باہر تھا تاہم بشاش چہرہ بنا کر اپنے آقا کی اس ہمدردی کی

اس ہمدردی کی بہت تعریف کی اس کے بعد وہ رخصت لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

منظور کو اب یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں ماما اس کے راز کو طشت ازبام نہ کردے اور اس نے عرصہ دراز سے جن دلوں پر اپنے شریفانہ کیرکٹر کا سکہ جمایا ہے کہیں بے وقعت نہ کردے وہ اسی فکر میں آہستہ آہستہ زینہ سے اُتر رہا تھا کہ اُس کے ذہن میں کسی فوری خیال کے آتے ہی بعجلت زینہ طے کر کے سیدھا ماما کے کمرے میں گیا جہاں سلیمہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اور ماما اس کو تسلیاں اور دلاسے دے رہی تھی، منظور کی آمد پر خاموش ہو گئی ماما نے تواضع کرتے ہوئے کھٹیا پر بیٹھنے کو کہا مگر منظور نے بغیر شکریہ ادا کئے ماما سے کچھ ایسی صورت بنا کر اور ایسے لہجہ میں جس میں انفعال وانکسار کی نمایاں جھلک تھی کہا۔" دیکھو آج سے تم ہماری رازدار ہو ہماری لاج تمہارے ہاتھ ہے اگر تم نے رازداری سے کام لیا تو گویا دو جاں بلب ہستیوں کو موت کے پنجے سے رہائی دلوائی۔ اور ہم اس رازداری کے صلہ میں علاوہ زر کثیر تادم زندگی تمہارے احسان مند رہیں گے۔"

ماما جو یوں بھی بہت بھلی اور با مروت تھی " زر کثیر" کا لفظ سنکر بشاش ہو گئی اور کہنے لگی بیٹا تم بے فکر رہو۔ ایسے ایسے ہزاروں رازہائے سربستہ میرے سینے میں محفوظ ہیں کیا مجال ہے کہ کسی کو اس کی ہوا بھی لگنے پاتے۔ میں کب سے صاحبزادی کو بھی یہی سمجھا رہی ہوں مگر ان کو تو شاید آج ہی جی بھر کر رونا ہے جو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں ہر چند اطمینان دلاتی ہوں مگر یہ ہیں کہ روئے جاتے ہی چلی جاتی ہیں اور کسی صورت سے رونا نہیں چھوڑتیں۔

منظور نے سلیمہ سے کسی قدر قریب آکر کہا کہ اب ہمیں کوئی خوف و ہراس نہیں ہے بلکہ ہمیں جیسی ایک مشفقہ راز دار کی ضرورت تھی خدا نے ویسی ہی ملا دی ہے۔ انشاء اللہ اب بہت جلد ہم ان قیود و سلاسل سے یک لخت آزاد ہو جائیں گے۔

اس کے بعد ماما کے ہاتھ میں چند نوٹ دے کر گھر کی طرف چل دیا۔

(۶)

منظور رات بھر اسی کشمکش و پیچ میں رہا کہ کیونکر سلیمہ کو اپنے آقا کے گھر سے علیحدہ کرے جب کہ اس نے محض از روئے ہمدردی و غمخواری ان کو ورطۂ آفت سے نکال کر اپنے زیر سایہ آرام و راحت سے لا رکھا ہے، اس صورت میں سلیمہ یا اُس کی اماں اصغری کی الٰہی بخش کے ہاں سے علیحدگی نہ صرف احسان فراموشی ہے بلکہ خوان نعمت ہے، اور خود الٰہی بخش کو بھی ان کی یہ حرکت ناگوار گذرے گی پھر کون سی ایسی تدبیر کی جائے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔

منظور کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے سلیمہ سے مل کر اس کے مافی الضمیر سے واقف ہونا ضروری خیال کرتا تھا چنانچہ دوسرے

روز شام کو پھر ماما کے کمرے میں گیا ماما بیٹھی کچھ سی رہی تھی منظور کو دیکھکر سینا چھوڑ دیا اور کہنے لگی آپ بڑی دیر میں آئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ منظور نے بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے کہا اگر سلیمہ یہاں آ سکتی ہو تو میں اس سے کچھ دیر کے لئے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں کیا تم انہیں یہاں بھیج سکتی ہو؟ ہاں بھیج تو سکتی ہوں۔ ماما نے کہا مگر مشکل یہ ہے کہ اس وقت وہ اور اُن کی اماں بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں دیکھئے میں اوپر جاتی ہوں۔ موقعہ ملا تو بھیجدوں گی مگر آپ ذرا احتیاط سے کام لیں۔

ماما یہ کہہ کر اوپر چلی گئی اور منظور پوشیدہ طور پر کمرے میں بیٹھا ہوا انتظار کرنے لگا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی منظور کا بیقرار دل خوشی سے سینے میں بلیوں اچھلنے لگا۔ سلیمہ نہایت سہمی ہوئی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ منظور اس کو دیکھ کر کچھ ایسا مرعوب ہو گیا کہ چند لمحوں تک اس پر سکر کی ایسی کیفیت طاری رہی پھر لجاجت سے آبدیدہ ہو کر کہنے لگا:۔

پیاری سلیمہ! میں اس وقت اظہار محبت کرنے نہیں آیا اور نہ اب اس کی چنداں ضرورت ہے اس لئے میں بلا کسی تمہید کے صاف صاف مطلب عرض کرتا ہوں کہ کیا آپ مجھے اپنی غلامی کا شرف بخشنے کو تیار ہیں؟ تاکہ میں کسی نتیجہ پر پہنچکر کوئی مناسب انتظام کر سکوں اور اپنے مستقبل کو خوشگوار بنا سکوں۔

سلیمہ ایسی ناسمجھ نہ تھی جو اس کھلے ہوئے پیغام مسرت کو نہ سمجھ سکتی لیکن جواب دینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ نسوانی شرم اس پر غالب تھی۔ اس لئے بدستور نیچی گردن کئے خاموش ہی کھڑی رہی، منظور نے بیتاب ہو کر پھر کہا:۔

دیکھئے وقت بہت کم ہے "خموشی کی نیم رضا" سے میں نیم جان رہنا نہیں پسند کرتا۔ میں آج اپنی زندگی کا فیصلہ صاف الفاظ میں آپ کے لب نازک سے سننا چاہتا ہوں۔ میری حیات و موت کا انحصار آپ کی جنبش لب پر موقوف ہے لہذا میں صاف صاف سننا چاہتا ہوں کہ کیا مجھے آپ کی غلامی کا شرف حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں!!

یہ کہکر منظور نے بچشم نم اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیا، سلیمہ جلدی سے اپنے گرم اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسکو اٹھا کر بولی "مجھے شرمندہ نہ کرو میں ہمیشہ سے آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی"۔

یہ فرحت روح پرور سُن کر منظور کی آنکھوں سے اشک مسرت کا دریا امنڈ آیا اور سلیمہ نے بھی اشک بار و بیقرار ہو کر اپنے تئیں اس کی آغوش کے سپرد کر دیا۔

کچھ دیر کے لئے یہ دونوں سرشار بادۂ الفت دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے اس وقت عشق کا پر لذت درد محبت چکاں دلوں کو ایسا مزا دے رہا تھا کہ گویا آج ہی یہ دو جانیں ایک قالب ہو کر حیات ابدی حاصل کر لینگی۔
لیکن ماما کے پاؤں کی چاپ نے نہیں اس کے کھنکھارنے کی آواز نے ان خود فراموشانِ محبت کو ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کیا جس طرح شاخ سے گل اور گل سے بلبل جدا ہوتے ہیں۔
ماما کی آمد پر یہ دونوں اپنی اضطراری کیفیت سے اس قدر منفعل و محجوب تھے کہ زمین پر گڑی ہوئی نظریں اوپر کو نہیں اٹھا سکتے تھے آخر ماما نے سلیمہ سے کہا تمہاری اماں کسی کام سے نیچے آرہی ہیں تم لپک کر اپنے کمرے میں چلی جاؤ ورنہ بدمزگی ہوگی"
سلیمہ سنبھلی آنکھوں سے آنسو خشک کئے اور لباس درست کر کے جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ منظور نے جو اپنی جگہ پر خفیف ہو رہا تھا ماما سے دریافت کیا میرے یہاں ہونے کا تو کسی کو علم نہیں ہوا ؟
کسی کو کیسے علم ہو سکتا ہے ماما نے کہا جب کہ میں نے کسی سے کہا نہیں ہے بلکہ اصغری نے کئی مرتبہ اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن میں ہر بار ایک نہ ایک ایسی بات یا سوال کر بیٹھتی تھی کہ وہ جواب دینے کے لئے مجبور ہو جاتی تھی (بات کا پہلو بدل کر اور ذرا خندہ رو ہو کر) کہئے آج تو خوب مرادیں بر آئیں ؟
یہ سب تمہاری عنایت ہے منظور نے کہا ورنہ ایسا موقع شاید قیامت تک ہاتھ نہ آتا (جیب میں ہاتھ ڈال کر) یہ لو اپنی خدمت کا صلہ، میں ذرا اوپر ہو آؤں تم مجھے پھر یہیں ملنا۔
اس کی کیا ضرورت ہے ماما نے کسی قدر لجاجت سے کہتے ہوئے بیس روپے کے نوٹ لے لئے۔
الٰہی بخش اور چند مہاجن ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی لین دین کے معاملہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ منظور آگیا جس کو دیکھ کر الٰہی بخش نے کہا لو یہ آ گئے اب ان سے گفتگو کیجئے۔ اس معاملہ میں انہیں کو کلی اختیار ہے، یہ کہکر الٰہی بخش تو زنانہ میں چلے گئے اور منظور ان سے بات چیت میں مصروف ہو مگر بہت جلد اس معاملہ کو رفع دفع کر کے الٰہی بخش سے زنانہ میں آکر معاملہ معلومہ کے متعلق اختصار میں سمجھایا پھر کارخانہ اور دفتر کی مختصر سی کیفیت بیان کر کے منظور پھر ماما کے کمرے میں آیا۔
سلیمہ اپنی والدہ کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی بن سنور کر آ گئی تھی ماما اوپر کام کاج میں مصروف تھی۔ اس لئے سلیمہ خوش ہو رہی تھی کہ اب جی بھر کر پیار و محبت کی باتیں ہوں گی تنہائی پا کر منظور بھی مصروف ہوا کہ۔ اظہار خیالات کا یہ موقعہ غنیمت ہے۔
اس وقت سلیمہ کے حسن پر بلا کا نکھار تھا۔ دل کش اداؤں کے ساتھ نہا دھو سنگھار نے اس کی رعنائیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔

منظور کو دیکھکر اول تو زیر لب متبسم ہوئی پھر فوراً ہی نیچی گردن کرکے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ منظور کو اس ادا نے مار ہی تو ڈالا اگر اس وقت منظور کی بجائے اور کوئی ہوتا تو وہ بے اختیار ہو کر سلیمہ سے چمٹ جاتا مگر منظور کے جسم میں شرافت کا خون تھا اس لئے یہ حرکت تو نہ کی مگر اتنا تو کہہ ہی دیا کہ :۔

مجھے ہلاک کرنے کے لئے کیا سادگی کم تھی جو اس پر یہ آرائش کرکے مجھے کھو دینے کا سامان کیا گیا ہے۔

پیاری سلیمہ! اب میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد تم کو اپنے گھر کی ملکہ بنا کر اپنے کلبہ احزاں کی رونق بڑھاؤں، کیا واقعی تم اپنے اس غلام کو اس قابل سمجھتی ہو؟!

میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی یہی کہتی ہوں کہ سلیمہ ہمیشہ سے آپ کی ہے اور ہمیشہ آپ کی رہے گی"

اگر یہی ہے تو اب بہت جلد تمہیں اس مکان کو چھوڑ دینا چاہئے میں یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔

یہاں آنے کے بارے میں اماں جان تو سخت خلاف تھیں لیکن میں نے محض اس خیال سے کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی آپ کی صورت زیبا کے دیکھنے کا موقع تو مل جائیگا اپنی والدہ کو بیگم صاحبہ کے بلانے پر یہاں آنے کے لئے رضامند کر لیا۔ ورنہ ہم اپنی محنت مزدوری کو عیش و راحت پر ترجیح دیتے ہیں اور دال روٹی کو من سلوا سمجھتے ہیں اور اس زندگی سے اس کو بہتر خیال کرتے ہیں۔

جب تو اب بھی تم اپنی والدہ کو یہاں سے گھر چلنے پر رضامند کر سکتی ہو؟

ہاں میں ضرور ایسا کر سکتی ہوں مگر پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تم اطمینان رکھو میں نے سب سوچ لیا ہے کل میں خود بھی تمہاری والدہ سے آکر ملوں گا۔

قند پارسی

(جناب بنے خاں صاحب سرخوش شادانی رامپوری ہیڈ مولوی گورنمنٹ سکول مظفرنگر)

شوق چوگاں چو بمیداں بہ برد جاناں را ۔۔۔ عاشقاں گوئے بسازند سر خود شاں را
نیک سہل است کہ سیلاب برد بنیاں را ۔۔۔ عشق رسوائے محبت بکند انساں را
ترس از گریہ خونین من اے سنگیں دل ۔۔۔ پرورد قطرۂ اشکم بہ بغل طوفاں را
وائے آں قوم کہ بیگانہ رود از رہ عشق ۔۔۔ خبر از عالم انساں نبود حیراں را
ساقیا خیز کہ آمد ز حرم شور اذاں ۔۔۔ مژدۂ عیش بدہ مطرب خوش الحاں را

ہر کرا قطرہ ز ابر کرمش حاصل شد
ہمچو سرخوش بہ پشیزے نخرد عماں را

دیگر

(جناب نواب حسین نواز جنگ بہادر خسرو اول تعلقدار (کلکٹر) ضلع گلبرگہ)

دم ز نسیم چوں زنم بوئے نگار کے رسد ۔۔۔ در دل بے قرار من صبر و قرار کے رسد
من بخیال روئے تو از ہمہ چیز فارغم ۔۔۔ چہرۂ ماہ بر فلک گرد و غبار کے رسد
درد ترا ست آرزو زاں گل و لالہ می دمد ۔۔۔ در دل غم رسیدہ را تازہ بہار کے رسد
زلف و رخ تو در دلم کیفیتے کہ می دہد ۔۔۔ سنبل و گل چہ سر زند لیل و نہار کے رسد
گردش چشم تو مرا ساغر نو کند عطا ۔۔۔ مست سرور عیش را رنج و خمار کے رسد
عارض شمس را اگر خیرہ شود از دستر ۔۔۔ جلوۂ نازنین من در شب تار کے رسد

جذب وفا چہ کردہ بر من دل کہ گفتہ است
خسرو جاں نثار من سینہ فگار کے رسد

ہلال عید

اے ہلالِ عید، کشتیِ فلک، ابروئے حور — اے کلیدِ شادمانی، جامِ صہبائے سرور
موجِ دریائے کرم، محرابِ ایوانِ سخا — تارِ گیسوئے زر افشاں ناخنِ حسرت کُشا
لذّتِ نظارہ حاصل تجھ سے چشمِ شوق کو — اور اک کیف سکوں میرے دلِ پُر ذوق کو
ہر برس جب روئے زیبا اپنا دکھلاتا ہے تو — اک بشارت اہلِ دُنیا کے لئے لاتا ہے تو
اب کے تیرے آئینہ خانہ میں جو تنویر ہے — اس میں ہندوستاں کے مستقبل کی اک تصویر ہے
دے رہے ہیں جس کے خط و خال پیغامِ حیات — سوئے مشرق ہو رہی ہے گردشِ جامِ حیات

ہو چکے سب سیر گو تیری شعاعِ نور سے
ایک شاعر ہے کہ بیٹھا تک رہا ہے دور سے

محمود (اسرائیلی)

کشف کاشف

(۱) سوزِ دل میں کیفیت آنکھوں کے پیمانے میں ہے
شمع کی تنویر، دو صورت سے پروانے میں ہے

(۲) مجتمع جس سے رہا شیرازۂ رنگ و ضو
منتشر اب وہ بہارِ داغ ویرانے میں ہے

(۳) وہ کڑی، تھا ربط جس کا قیس کی زنجیر سے
سلسلہ در سلسلہ، اب میرے افسانے میں ہے

(۴) سنگ ریزے ہیں حنائی سرخ ہیں لب ہائے خار
نکہتِ تقسیمِ بہارِ زخم ویرانے میں ہے

(۵) میں تو داعظ خونِ دل پیتا ہوں اک انداز سے
تو سمجھ افشردۂ انگور پیمانے میں ہے

کاشف (اکبر آبادی)

نوائے سروش

نام ہی نام ہو جس کام میں وہ کام نہ کر
کام کر، کام سے پہلے ہوسِ نام نہ کر

تیرے انجام میں پنہاں ہیں ہزاروں آغاز
اپنے آغاز کو وابستۂ انجام نہ کر

دل کو وسواس و خیالات کا مرکز نہ بنا
اپنے اس گھر کو کبھی رہ گذر عام نہ کر

ایک دن منزلِ مقصد تجھے مل جائیگی
جادۂ پیمائی میں فکر سحر و شام نہ کر

کامیابی کی تمنا ہے اگر دل میں تیرے
طلب عیش نہ کر خواہش آرام نہ کر

ثروت و عزتِ دنیا کو نہ دے دلمیں جگہ
حرم قدس کو بازی گہِ اصنام نہ کر

کامرانی کی نمودار ہوئی جس سے سحر
اپنے اس دل کو تو خورشید لب بام نہ کر

انتظار مے و ساغر بھی خمار آگیں ہے
بزم ساقی میں کبھی تذکرۂ جام نہ کر

قیصر (از بھوپال)

حسیات فکری

تڑپتی ہے شہادت کے لئے میری رگِ جاں تک
مگر بھی کھچا رہتا ہے مجھ سے اُن کا پیکاں تک

یہ کس مظلوم کی لاش آئی ہے گورِ غریباں میں
ہیں جس کے خون سے رنگین ذرات پریشاں تک

مٹا ڈالیں وہ میرے نقش ہستی کو مٹا ڈالیں
اُلٹ دیتی ہیں جو نظریں بساطِ بزم امکاں تک

میں وحشت میں بھی رسم عام کا پیرو نہیں ہوتا
ہے ورنہ فاصلہ ہی کیا میرے گھر سے بیاباں تک

یہی وہ دل ہے جس میں بھیڑ رہتی تھی اُمنگوں کی
وفورِ یاس سے اب لا پتہ ہیں شوق و ارماں تک

مجھے ہمدم سکونِ قلب حاصل ہو تو کیوں کر ہو
ہٹائے سے نہیں ہٹتے خیالاتِ پریشاں تک

وہاں میرا قفس صیاد نے کچھ سوچ کر رکھا
جہاں سے جا نہیں سکتے ہیں نالے بھی گلستاں تک

کسی کو کیا خبر فکری مرے حالِ پریشاں کی
میرے نالے تو ہیں محدود دیوارِ زنداں تک

فکری (از بھوپال)

حجابات

نالہ مضرابِ محبت کے لئے اک ساز ہے
سر سے پا تک درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے

دل سراپا درد ہے اور وہ سراپا ناز ہے
حسن کی فطرت میں سنتے ہیں کوئی اعجاز ہے

دید کے قابل ہیں حسن و عشق کی نیرنگیاں
ایک پابندِ خلش ہے ایک محوِ ناز ہے

آستانِ دوست سے اُٹھنے کی طاقت ہی نہیں
میری قسمت کو میری واماندگی پر ناز ہے

شوقِ موسیٰ بے خطا ہے جوشِ حیرت بے قصور
گرمیٔ ہنگامہ اُس کا شعلۂ آواز ہے

لوگ کیوں سمجھے ہوئے ہیں درد کا انجام موت
اب ہمارے داستانِ زیست کا آغاز ہے

کیوں کھچا جاتا ہے دل کیوں روح میں ہے اضطراب
کون دیتا ہے صدائیں کس کی یہ آواز ہے

اُس طرف پردے میں بیتاب اشاعت حسنِ دوست
اس طرف آنکھوں کے آگے اک حجابِ ناز ہے

کیا جواب اے ضبطِ غم بے اختیاری کا مری
جب شکستِ رنگ ہی آئینہ دارِ راز ہے

ذوق پیدا کر کے ڈال ان سب پہ اک گہری نگاہ
عالمِ امکاں کا ہر ذرہ سراپا راز ہے

اضطرابِ روح اب دیکھا نہیں جاتا امیںؔ
نغمے سب خاموش ہیں وقتِ شکستِ ساز ہے

امین سلونوی

کیفیات

(رُباعیات)

سب راز فنا اور بقا کا معلوم
یہ بود و نبود کا تماشہ معلوم
اے کیفؔ سراب ہے یہ سیلاب جہاں
رنگینی ہنگامۂ دُنیا معلوم

ڈوبی ہوئی کیفیت میں ہستی مری
بکھری ہوئی نگینوں میں مستی میری
اللہ رے تاثیر جنوں زائی کیف
ہمدوش فلک ہے آج بستی میری

کیوں کہتے ہو چہرہ سے نقاب اٹھتا ہے
کہدو کہ نگاہوں سے حجاب اٹھتا ہے
کچھ بھی نہیں اے کیفؔ اگر سچ پوچھو
اک پردۂ نیرنگ سراب اٹھتا ہے

روداد چمن تھی گلفشانی میری
قصہ تھا دو عالم کا کہانی میری
جب پردہ اٹھا تو یہ سمجھ میں آیا
اک "عالمِ کیف" تھی جوانی میری

کیفؔ (مرادآبادی)

کارفرمائی عشق

جہاں میں عشق کی چاروں طرف اک کیسی حکومت ہے
ہر اک دل کو یہاں اک دوسرے کے دل سے نسبت ہے
مریض درد دل کے واسطے جاں بخش صحت ہے
یہ روح قالب بے جاں ہے جانِ آدمیت ہے
ازل سے تا ابد ہے کارفرما سارے عالم میں
خدا تم جس کو کہتے ہو وہ خود بھی اک محبت ہے

اخترؔ (جوناگڈھی)

آلودہ معصیت

اے خالق بے ہمتا ۔ رحمٰن و غنی یکتا
حنان و غنی یکتا
سُبحان و غنی یکتا
منان و غنی یکتا
برہان و غنی یکتا
دیان و غنی یکتا
سلطان و غنی یکتا

کی تو نے مدد یارب ۔ رنج و غم و حرماں میں
جب نوح کی طوفاں میں
ایوب کی حرماں میں
یعقوب کی احزاں میں
محبوس کی زنداں میں
پھر میں غم درماں میں
کب تک رہوں ارماں میں

کر نظر کرم شاہا ۔ ہوں بے کس و بیچارہ
آلودہ معصیت

ہاں رحم میرے اللہ ۔ مجبور رہوں ناکارہ
آلودہ معصیت

گم کردہ و بے کس ہوں ۔ حیران و پریشاں ہوں
آلودہ عصیاں ہوں
وقف غم و حرماں ہوں
مجبور ہوں گریاں ہوں
بگڑا ہوا ایماں ہوں
اُجڑا سا گلستاں ہوں
اب سر بہ گریباں ہوں

اللہ کرم فرما ۔ دل ریش ہوں گریاں ہوں
نادم ہوں پشیماں ہوں
رحمت پہ میں نازاں ہوں
جو کچھ ہوں مسلماں ہوں
ہاں صاحب ایماں ہوں
میں اور پریشاں ہوں
کس واسطے حیراں ہوں

آخر ترا بندہ ہوں ۔ بندہ بھی تھکا ہارا
آلودہ معصیت

ہاں نگہ کرم شاہا ۔ ہر بندۂ آوارہ
آلودہ معصیت

جلوؤں سے ترے یارب ۔ معمور بیاباں ہے
پُر نور گلستاں ہے
کیفیت بُستاں ہے

رحمت کے تصدق میں ۔ توفیق عطا کر دے
سرشار وفا کر دے
دل قبلہ نما کر دے

آئینۂ امکاں ہے
خورشید درخشاں ہے
گویا مہ تاباں ہے
شاہد میرا ایماں ہے
محروم رہے یارب - کیوں طالب نظارہ
آلودۂ معصیت

رحمت کی گھٹا کر دے
توحید بپا کر دے
نالہ کو رسا کر دے
مقبول دعا کر دے
پھر کفر مٹا ڈالے - اک خستۂ ناکارہ
آلودۂ معصیت

اسلام کی اُلفت دے - اور اپنی محبت دے
مسلم کو اقامت دے
کچھ نفس پہ قدرت دے
ایمان کی دولت دے
احساس ندامت دے
خود دار صداقت دے
اسلام کو رفعت دے
مقبول دعائیں کر - ہوں بیکس و بیچارہ
آلودۂ معصیت

احمدؐ کے تصدق میں سبے لوث صداقت دے
کفار کو ذلت دے
اسلام کو عزت دے
گلہائے مسرت دے
مسلم کو وہ طاقت دے
ہر عزم میں وسعت دے
ہر شان میں شوکت دے
ہاں کفر مٹا ڈالے - اک خستۂ ناکارہ
آلودۂ معصیت

عشرت رحمانی المجوبی (رامپوری)

شباب رفتہ کی یاد میں

وہ ساعتیں مزہ کی وہ خوشگوار گھڑیاں — حسرت مجھے کسی کی میں کسی کو ارماں
عہدِ شباب تک تھا لطفِ شباب اپنا — اب میں ہوں اور دل میں رنج و الم کی دُنیا
تو اے شبابِ رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

یادِ شباب دل میں رہ رہ کے آ رہی ہے — اور آٹھ آٹھ آنسو مجھکو رُلا رہی ہے
اس طرح بھی کسی کی بن کر بگڑ نہ جائے — دشمن کو بھی نہ ایسا صدمہ خدا دکھائے

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

تو کیا گیا کہ مجھکو برباد کر گیا ہے — جب تو نہیں تو ایسے جینے کا لطف کیا ہے
مر مر کے زندگانی کرنے سے فائدہ کیا — میں اس طرح جیا بھی تو زیست کا مزا کیا

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

میں مست و بیخبر تھا نشہ میں تیرے ایسا — دنیا کی فکر تھی کچھ مجھکو نہ خوفِ عقبیٰ
اب فرطِ غم سے میرا سینہ میں دم رُکا ہے — اک رنگ آ رہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

مجھ سے جدا ہوا ہے جب سے شباب میرا — دل غم سے ہو گیا ہے جل کر کباب میرا
بارِ دگر جو اس کی مجھ تک نہ ہو رسائی — تو بھیجدے الٰہی مجھکو کسی کی آئی

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

بس اے اثرؔ نہ رو تو اس بیوفا کا رونا — ہو کر کبھی کسی کا ہرگز نہیں یہ رہتا
اس پر ہی منحصر کیا اس کا ہی کیا گلا ہے — دائم کوئی کسی کا ہو کر نہیں رہا ہے

تو اے شباب رفتہ ارمان زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

اثر رامپوری

قرض

قرض ہرگز نہ لو کہ آفت ہے — اس کا انجام اک مصیبت ہے
سمجھو اس کو نہ تھوڑی سی زحمت — زحمتوں میں ہے یہ بڑی زحمت
مفلسی ہے بلا خدا کی پناہ — کرہی دیتی ہے آدمی کو تباہ
خیر کیا مفلسی میں کوئی کرے — ہے ملک گر بشر نہ بچے شر سے
خرچ آمد سے کم کرو بھائی — تا نہ افلاس سے ہو رسوائی
ہے کفایت شعاری اچھی شے — مطمئن اس سے قلب ہوتا ہے
آپ کو جب نہ تم سنبھالو گے — کام غیروں کے کیا نکالو گے

پہلے ہو جاؤ اپنے آپ معین
پھر کرو غیر کی مدد بھی ذہین

ذہین (حیدرآباد)

عمر کی گھڑی

زندگی وہ ہے جو صلح و آشتی میں کٹ گئی — ہے غنیمت وہ گھڑی جو بندگی میں کٹ گئی
غور کر کیا فائدہ ہے ظلم و نخوت سے ذرا — سوچ غافل عمر سب تیری اسی میں کٹ گئی
اے بشر تو دل کو ہر دم نیکیوں سے شاد کر — یہ سمجھ پھر عمر سب عیش و خوشی میں کٹ گئی
دن وہی ہے جس میں خالق کی عبادت ہو گئی — رات وہ ہے رات جو یاد نبی میں کٹ گئی

کیا عبادت وقت پیری ہو سکے تم سے عزیز
حیف ہے ساری جوانی دل لگی میں کٹ گئی

عزیز (از حیدرآباد)

غزلیات

(جناب سید محمد شمس الحق صاحب خیال۔ وکیل عدالت رام پور)

سر میں جو سمایا مرے سودائے محبت
بیساختہ دل بول اٹھا ہائے محبت

مجنوں ہوں۔ بجا ہے مجھے دعوائے محبت
حصہ میں مرے آئی ہے لیلائے محبت

دشمن کو بھی دیکھا تو نظر دوست ہی آیا
اللہ ری یک رنگیٔ دنیائے محبت

کیا جانے کوئی اہلِ محبت کے شرف کو
خورشید ہے ہر ذرۂ صحرائے محبت

آزاد کیا فکر سے کونین کی مجھ کو
قربان ترے نشۂ صہبائے محبت

سر کی نہ خبر رہتی ہے انسانکو نہ تن کی
جب جوش پر آتا ہے یہ سودائے محبت

جب دل بھی عزیز آپ کو ہے جان بھی پیاری
باطل ہے خیال آپ کا دعوائے محبت

از ابوالافتخار سید عبدالغفار فخرؔ حیدرآبادی (ہند)

دفع لب تشنگی قتل مقدر میں نہیں
قطرۂ آب جو قاتل ترے خنجر میں نہیں

حسرتِ لذتِ آزاد دل زار پہ حیف
تابِ مشق ستم آرائی ستمگر میں نہیں

غم ساقی کی تواضع مرے دل میں کیا ہو
مَے کی اک بوند بھی صد حیف کہ ساغر میں نہیں

بحر زخار ہے گر دل تو اُمنگیں ہو میں
اک طوفان ہے شوریدگی اس سر میں نہیں

عرضِ ارمانِ دلی۔ شرح تمنائے وصال
اور کچھ اس کے سوا شوق کے دفتر میں نہیں

ان سے کچھ کہہ کے میں اکبار جو ہوں مہر بلب
جانتا ہوں کہ مزہ عرض مکرر میں نہیں

تیری اک حشر خرامی سے ہیں سو حشر بپا
فتنہ پردازیاں یہ فتنہ محشر میں نہیں

کیوں نہ ہو دشتِ نوردی کا جنوں سر پہ سوار
کوئی دلچسپی کا ساماں ہی جب گھر میں نہیں

ضبط بے تابیٔ ارماں کی ہے کوشش بیسود
تاب اے فخرؔ اب اتنی دل مضطر میں نہیں

"غزل"

از "تبسم نظامی" (ع)

طور ہی کیا کیف حسن دید سے بیہوش ہے
میری آنکھوں پر بھی طاری حیرت خاموش ہے

حسن پنہاں کارساز جذبۂ مدہوش ہے
پیش محمل "قیس" مثل آہوئے خاموش ہے

انتہائے یاس نے ناکامِ الفت کر دیا
ذرہ ذرہ میری دنیا کا وبالِ دوش ہے

آسماں کی گردشوں کے ساتھ ہے دورِ نشاط
ساغرِ دل میں ازل سے بادۂ سرجوش ہے

کیوں نہیں آتا حقیقی، نغمۂ دل تا بہ گوش
کیا نفس کا زیر و بم صوتِ حقیقت پوش ہے

درد کی وہ کیفیت جاتی رہی اب کیا کروں
آج دُنیائے تمنا محشرِ خاموش ہے

منکشف یوں گلفشانیٔ "تبسم" ہو گئی
حسن" اکثر برگ گل کی اوٹ میں روپوش ہے

جناب شیخ محمد میاں صاحب صؔفا اسے صدیقی منگرولی ہیڈ ماسٹر مدرسۂ زینت الاسلام (راولپنڈیہ)

تمنا ہے کہ دل جبھی سے جانِ پُر الم نکلے
چلے مُڑ مُڑ کے خنجر حلق پر تھم تھم کے دم نکلے

جو ہم بُت خانہ سے تفریح کو اُس سمت جا پہنچے
حرم سے بہر استقبال اربابِ حرم نکلے

یہ ہے ارمان دُونا لطف حاصل ہو شہادت کا
ہمارے قتل کو نکلے تو شمشیرِ دو دم نکلے

نہ پورے اُترے آخر آپ اقرارِ محبت میں
غلط سرکار کے سب وعدۂ و قول و قسم نکلے

نظر آتے تھے کتنے بھولے بھالے عہدِ طفلی میں
مگر ہو کر جواں تم تو غضب نکلے ستم نکلے

فدا ہونے کو پھر مر مر کے زندہ ہوتے جاتے ہیں
قتیلِ تیغِ حسرت تیرے کتنے تازہ دم نکلے

یقین ہے خاتمہ میرا بخیر الایمان ہو جائے
محمد لب سے گر نامِ محمد مرتے دم نکلے

(خاکسار خوشتر منگرولی اڈیٹر رسالہ ہذا)

یا درکفِ بُت خودکام ہوتی جاتی ہے
کارگر تیرگیِ شام ہوئی جاتی ہے

جلوہ گر ہو کے دکھاتے نہیں کیوں اپنا جمال
بھیڑ سی بھیڑ تہِ بام ہوئی جاتی ہے

ہائے کس طرح کٹیگی شبِ تاریکِ وصال
گل مری شمع سرِ شام ہوئی جاتی ہے

دور ہے منزلِ مقصود ابھی کالے کوسوں
راستہ ہی میں مجھے شام ہوئی جاتی ہے

غیر پر بھی نگہِ مہر لگی ہے ہونے
جو نظر خاص تھی وہ عام ہوئی جاتی ہے

زاہدِ خشک کا بھی ہاتھ بڑھا جاتا ہے
دُخترِ رز بزم میں بدنام ہوئی جاتی ہے

مہرباں ہیں جو ولیعہد بہادر خوشتر
رخصت اب گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تنقید و تبصرہ

اُردو کے رسالے

رسایل پر ریویو کرنے کے متعلق مؤقر ہمعصر "خیابان" (لکھنؤ) کی اس رائے سے اگرچہ ہم متفق ہیں کہ:۔ "صرف قدیم رسایل جدید رسایل پر تنقید کریں جدید رسایل کا قدیم پر تنقید کرنا کچھ لا حاصل ہی سا ہے" ہمعصر مذکور تو اس "شناگستری" ریویو کی رسم شکنی کر کے خارج از جماعت اور ملحد ہو گیا۔ لیکن اگر ہم بھی موجودہ دور صحافت کی اس "تقلیدی سنت" سے انحراف کریں تو خوف ہے کہ کہیں مذہب صحافت کے 'مفتیانِ ادب' کے نزدیک 'غیر مقلد' نہ قرار پائیں۔ لہٰذا مجبوراً اس 'کورانہ تقلید' پر کاربند ہوتے ہیں۔

ہرچند رسایل پر ریویو کرنے کے مروجہ اور مخصوص طریقے سے ہمیں سخت اختلاف ہے۔ اس طریقۂ تنقید میں خواہ معاصرانہ ہمدردی مضمر ہو خواہ حوصلہ افزائی، یا "تو من ترا حاجی بگویم" کا راز پوشیدہ ہو یا اپنے عیوب کی پردہ پوشی بہر حال کچھ ہی ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریقہ ہے نہایت ہی ناپسندیدہ اور اصول تبصرہ نگاری کے سراسر خلاف، ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بلند آہنگی سے کہہ سکتے ہیں کہ آج تک "زبان" پر معزز معاصرین نے جو حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اصول تبصرہ نگاری کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ سب نے ایک ہی راگ الاپا ہے اور سب نے ایک زبان ہو کر اس کی مدح سرائی کی ہے، مگر کسی نے بھی اس کے عیوب کی طرف ہماری توجہ منعطف نہیں کرائی حالانکہ ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

بہت سے رسالے ایسے ہیں جن کا نہ کوئی نصب العین ہے اور نہ کوئی مقصد، ہاں "علمی و ادبی" کے دعویدار ضرور ہیں مگر جب اس دعوی کی تصدیق کے لئے رسالہ اٹھا کر دیکھا جاتا ہے تو دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر مدیران رسالہ بلا امتیاز نوعیت مضامین مختلف مضامین سے رسالہ کو پُر کر کے اپنے فرائض ادارت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، اور جو ایک طرف جدید انشا پردازوں کی حوصلہ افزائی کو مد نظر رکھتے ہیں اور ملک میں ادبی مذاق کو وسعت دینے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں تو دوسری طرف بے نتیجہ اور غیر مفید بلکہ اخلاق سوز لٹریچر کا ادب اردو میں اضافہ کرتے ہیں مگر بعض رسایل اس عام کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ان میں سے علاوہ دیگر کار آمد و مفید رسایل کے "شمع" آگرہ بھی ہے جس پر کار آمد و مفید ہونے کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ محمد حبیب صاحب اور حسن عابد

صاحب جعفری ایسے دو قابل ہستیوں، اور بار ایٹ لا رکے ہاتھوں ہر راہ بزم وعلم وادب کو اپنی ضوفشانیوں سے منور کرتا ہو۔

"شمع" کا زیر تبصرہ فروری نمبر مرزا محمد اسمٰعیل خاں صاحب دیوان ریاست میسور اور آصف جاہ نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی تصاویر سے مزین کیا گیا ہے اور جن کے متعلق مدیران رسالہ کی جانب سے مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔

مضامین میں محکومیت نسواں، قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے براہ خشکی بار برداری اور آمد و رفت کے ذرائع "شمع مزار" اور شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا پایہ اردو ادبیات میں، اچھے مضمون ہیں۔

پہلا مضمون جارج اسٹوارٹ مل کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے اگرچہ اس مضمون کی ہم نے اگلی دو قسطیں نہیں دیکھیں تاہم اس آخری قسط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یورپی نقطہ نگاہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "عورتیں مردوں کی طرح ہر جائز پیشہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں، سرکاری اور کاروباری کاموں میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے سکتی ہیں۔ سیاسیات کے پیچیدہ عقدہ حل کر سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہندوستانی ان کو اس قابل نہ سمجھ کر بلکہ ناقص العقل خیال کر کے ان کاموں سے باز رکھتے ہیں اور انہیں مساوی حقوق نہیں دیتے۔ اور اس جنس بے کس کو گھریلو زندگی کے تاریک ایام بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شاید یہ مضمون اُن مغرب پرستوں کے لئے جو یورپ کی اندھا دھند تقلید کی لعنت میں گرفتار ہیں کار آمد ہو مگر ہم "ہندوستانی مسلمانوں" کے لئے بیکار اور غیر ضروری ہے۔ ہم تو چلمن کی آڑ میں نسوانیت کی جھلک دیکھنے والے ہیں اور عورت کو "عورت" کے معنوں میں دیکھنے کے متمنی ہیں، دوسرا مضمون جعفری صاحب (مدیر شمع) نے بڑی تحقیق وتلاش سے لکھا ہے۔ یہ مضمون بھی گذشتہ سے پیوستہ ہے۔ تیسرا مضمون "شمع مزار" نہایت دقت خیز اور عبرت آمیز ہے اس کا پہلا نمبر ستمبر ۱۹۲۶ء کے شمع میں شایع ہوا تھا یہ "تیسرا آنسو" (کمپنی بہادر کے سایہ عاطفت میں) ماشلی دہلی اس اشاعت میں شایع ہوا ہے جس میں عہد مغلیہ کے زوال کے حالات، نہایت دردناک اور مؤثر پیرایہ میں تحریر فرمائے ہیں خصوصاً شاہ ظفر کے حالات بہت الم انگیز ہیں ان کی شاعری پر بھی ایک مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور موقع بموقع اشعار بھی دئے گئے ہیں غرض یہ مضمون اس قابل ہے کہ مکمل ہونے پر کتابی صورت میں شایع کرا دیا جائے، چوتھا مضمون جو حالی پر لکھا گیا ہے وہ ناتمام ہے۔

مارچ کے شمع میں منشی ذکاء اللہ دہلوی، خواتین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام، علماء کی صحبت، کامیابی کا راز، اور

اپنی اصلاح' اچھے مضامین ہیں پہلا مضمون مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز کے انگریزی مضمون کا ترجمہ جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے قابل مترجم صاحب انگریزی اخبارات ورسایل کے تنقید نگار ہیں، مضمون زیر بحث میں جیسا کہ اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے مولانا مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کے حالات زندگی ہیں۔ اس لئے قابل قدر ہے مگر اس کی وقعت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ منشی صاحب مرحوم کے ایک انگریز دوست کے بے لوث اور پرخلوص قلب و قلم سے نکلا ہوا ہے' یہ مضمون جیسا کہ مترجم صاحب کے نوٹ سے ظاہر ہے غیر مطبوعہ ہے اور اس کو مولانا ذکاء اللہ صاحب کے حالات زندگی کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائے گا۔

دوسرے مضمون میں ٹرکی کے موجودہ سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور مذہبی انقلاب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اسی قبیل کا ایک مضمون زبان کے موجودہ نمبر میں علامہ عبدالعزیز صاحب راجکوٹی کا درج ہے اس لئے اس کے متعلق زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ تیسرا مضمون جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے ناظم محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد (دکن) کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقع پر (نومبر ۱۹۲۶ء) فرمائی تھی اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اساتذہ (علماء) کے اعلیٰ کیرکٹر کا طلباء پر کیسا اثر پڑتا ہے اور ان کی صحبت سے کتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے قابل مقرر نے اپنی کیمبرج کے پروفیسروں سے ملاقات اور ان کے علمی انہماک کا ذکر بھی کیا ہے جو ہمارے ہندوستانی پروفیسروں کے لئے کارآمد ہے۔ چوتھا مضمون خود جعفری صاحب مدیر شمع کا ہے جن کا ایک نہ ایک مفید مضمون ہر نمبر میں ہوتا ہے یہ مضمون بھی بہت مفید اور سودمند ہے ملک کو ایسے اصلاحی مضامین کی سخت ضرورت ہے یہ ایسا مضمون ہے کہ کئی کتب کے مطالعہ کے بعد بھی ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم خوش ہیں کہ مدیران شمع نے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

اپریل نمبر میں "مملکت عوز" جناب نور بخش صاحب نے بڑی تحقیق و تلاش سے لکھا ہے "بہو بیگم" کے متعلق بھی مولانا علم الدین صاحب بی۔ اے نے محنت سے مواد فراہم کیا ہے۔ "آفتاب کا راز" جعفری صاحب کا سائنٹفک مضمون ہے جو پُر از معلومات ہے۔

علاوہ اُن علمی و ادبی مضامین کے ہر نمبر میں کوئی نہ کوئی فسانہ اور عمدہ نظم بھی ہوا کرتی ہے۔ اور ہر ماہ ثاقب۔ قزلباش۔ شاد۔ صفی۔ محشر۔ وحشت وغیرہ اساتذہ کا تازہ کلام ناظرین شمع کی ضیافت طبع کے لئے بہم پہنچایا جاتا ہے اور مطبوعات جدیدہ پر ریویو بھی نہایت قابلیت سے کئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ یہ رسالہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔ لکھائی۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ سائز ۲۰×۲۶ حجم ۶ جزو سالانہ چھ روپے ملنے کا پتہ:۔ جن منزل شاہ گنج آگرہ

"علیگڈھ میگزین" بھی موقت الشیوع رسایل میں ممتاز حیثیت رکھتاہے جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے بلا
پابندی " باقاعدہ " جناب مولوی عبدالباسط صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی کی ادارت میں شایع ہوتاہے۔زیر
تبصرہ نمبر مارچ۔اپریل ومئی ۱۹۲۶ء جلد ۴ نمبر اول ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی شبیہہ سے آراستہ ہے "اورنگ
بھوپال پر نونہال علیگڈھ" کے زیر عنوان ایڈیٹر صاحب کا تہنیت نامہ ہے پھر "بھوپال دارالشرف والاقبال" کے تحت
جناب قاضی جلال صاحب نے تاریخ بھوپال پر ایک بسیط مگر ناتمام مضمون لکھاہے جو میگزین کے صفحات سے الگ
از ابجد تاکلمن ہے، اس کے بعد عالیجناب فخری پاشا سفیر جمہوریت ترکی (در کابل) کی تصویر اور ان کے خط کا عکس
دیا گیاہے۔جو انہوں نے کابل سے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے نام پنجاہ سالہ جوبلی کے موقعہ پر عدم شرکت کی
معذرت اور کالج کے ساتھ اپنی ہمدردی کے اظہار کے متعلق لکھا ہے صفحہ ۱۴ پر ہمارے "یلدرم" صاحب نے کہیں شملہ کا
کالکا ریلوے پر کسی "آہو" کو دیکھ لیا ہوگا اُس کا دل فریب نقشہ نہایت دلکش الفاظ میں نظم فرمایا ہے کیا "یلدرم"
صاحب اب بھی " دیکھتے ہیں" ؟ " تذکرہ منصور کے چند اوراق ' مولوی محمد امین صاحب پروفیسر عربی چٹگام کا قابل
قدر علمی مضمون ہے جو ان کی اسی موضوع پر غیر مطبوعہ تصنیف کا کچھ حصہ ہے۔اس میں اعتقادات پر نفسیات سے
بحث کی ہے اور جابجا بھگوت گیتا کے شلوک سے استدلال کیا ہے " صبحیات " کے زیر عنوان پروفیسر وحید الدین
صاحب سلیم کے چند مختلف اشعار ہیں جن میں صبح کا نظر فریب سماں دکھایا گیا ہے۔" فلسفہ مسرت " محمد لیاقت اللہ خاں
صاحب تقفیر بریلوی نے اچھا مضمون لکھا ہے " روشنی کی رفتار" مولوی حامد حسن صاحب قادری ایڈیٹر سعید کا مضمون
بھی خوب ہے اسی طرح " پان اسلامزم کی حقیقت " (ناتمام) والا مضمون بھی پراز معلومات ہے، " اگر موت بن خواب
کی نیند ہوتی " جناب عظمت صاحب دہلوی کی لی رک نظم (انگریزی تخیل کا ترجمہ) سادگی وسلاست کے لحاظ سے
بہت اچھی ہے ' مکتوب ہندی ' ہمارے کرمفرما ، حضرت دلگیر صاحب کے نام ہے جس کو ہم نے زمان میں بھی نقل کیا تھا
" شہر صفی آباد کا خاکہ " " عظمت نپولین " اور انداز خودنمائی ' معمولی مضمون ہیں ' تتلی ' پر دور موجودہ کے قریب
قریب تمام شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں تاہم درد صاحب کی " تتلی " ' رقاصہ فطرت ' ہے ' پیام شوق ' آغا حیدر
صاحب کے رنگ میں ایک خط ہے جو علاوہ دلی کی بیگمات کی لوچدار زبان کے دلچسپ بھی ہے ' پراسرار جوگن '
ہمارے کرمی ومحبی جناب محمود الحسن صاحب کا دلچسپ فسانہ ہے " ترانہ بے صدا " کے عنوان سے نواب مرزا جعفر علی خاں
صاحب اثر نے داس آنجہانی کے تتبع میں خوب نظم لکھی ہے اسی طرح " اسلام کی علمی اور اخلاقی " فتوحات کے تحت
ایک طویل نظم جناب انیس رضوی امروہوی کی ہے جو اچھی ہے " حسن کلام " تعلیم نسواں پر رابعہ اور نجمہ کا نتیجہ خیز

مکالمہ ہے "بیوہ اور ہلال عید" والی نظم بھی دردانگیز ہے غزلیات میں ثاقب۔ قزلباش لکھنوی اور یاس عظیم آبادی کی غزلیں بہت اچھی ہیں "قندپارسی" اور "سحر سہیل" کے عنوان سے ہادی مچھلی شہری اور مولانا اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی فارسی غزلیں بھی خوب ہیں آخر کے چار صفحوں پر "تنقید و تبصرہ" ہے اس نمبر کی ضخامت ۱۱۲ صفحے ہے۔

اکتوبر و نومبر ۱۹۳۶ء کے میگزین میں پہلا مضمون 'امرا القیس اور شاعری' مولوی عبدالباقی صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی کا ہے جو نا تمام ہے دوسرا مضمون 'حصن حصین' موت کے مقابلے کے لئے رابرٹ موئی اسٹیونسن کے ایک مضمون کا ترجمہ جناب حامد حسن صاحب قادری نے کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھا ہے جناب سید محمد بدرالدین صاحب علوی نے 'سامی زبانوں کی اصل عربی ہے' کے ثبوت میں چند عربی الفاظ پیش کر کے سامی زبانوں کے ہم شکل اور ہم معنی الفاظ سے مقابلہ و استدلال کیا ہے۔ 'ولا تمناہی' ہئیتی مضمون ہے "نئی نسل کا رجحان آزادی" مکرمی جناب محمود الحسن صاحب نے لکھا ہے رسالہ بھر میں یہی ایک کام کا مضمون ہے۔ تاریخ قنوج کا ایک خونی ورق پرتھی راج اور سنجوگتا کا تاریخی فسانہ مشیر احمد صاحب علوی نے کامیاب اور مؤثر لکھا ہے اسی طرح ایک 'ادھ جلا سگریٹ' نے جناب عبدالعلی صاحب کے قلم سے اپنی "آپ بیتی" یا حب الوطنی کا فسانہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے رنگ میں بہت دلسوز لکھوایا ہے۔

نظموں میں جناب اختر شیرانی کی دعا اور محمد شبیہ الحسن صاحب کی نظم 'ایک ہندی مسلمان کا پیغام' (غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے نام) اچھی اور پرجوش ہے غزلیات میں بھی پروفیسر سلیم صاحب اور جناب ہادی مچھلی شہری کی غزلیں خوب ہیں یہ نمبر ۵۶ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔

میگزین کی جلد ۴ کا نمبر ۳ نہیں موصول ہوا چوتھا نمبر بابت دسمبر جنوری فروری ۱۹۳۷ء زیر تبصرہ ہے، شذرات میں قابل ایڈیٹر صاحب نے اپنا الوداعی نوٹ تحریر فرمایا ہے یعنی جس طرح گورنمنٹ برطانیہ کی یہ پالیسی کہ کوئی بڑے سے بڑا عہدیدار بھی اپنے مفوضہ عہدے پر مخصوص زمانہ اور مقررہ وقت سے ایک ماہ بھی زاید نہیں رہ سکتا۔ غالباً اسی حکومت کی پالیسی کو مدنظر رکھ کر میگزین کے مدیر بھی ایک "عہد معینہ" وقت کے بعد بدل دئے جاتے ہیں۔ 'حکومت' کا دائرہ عمل تو ایک قانون کے ماتحت ہے لیکن 'صحافت' کا غیر قانونی میدان عمل بہت وسیع ہے۔ جہاں پر مدیر 'ہر کہ آمد عمارت نو ساخت' کے مطابق جولانی طبع دکھاتا ہے۔ اور لوگوں کو اپنے مذاق اور طرز عمل کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور چل دیتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ آیندہ میگزین کی ادارت کی ذمہ داری ہمارے محبی جناب محمود الحسن صاحب کو تفویض ہوئی ہے۔ جن کے علمی انہماک اور ادبی شفقت سے ہمیں اُمید ہے کہ محب موصوف اپنے زمانۂ ادارت میں میگزین کی امتیازی شان کو قایم رکھیں گے بلکہ دوچند کرنے کی سعی کریں گے۔ ہم اپنے دوست کی خدمت میں اس علمی عہدے پر سرفراز ہونے کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۹ پر "کالکا شملہ ریل کا منظر" چودہری خوشی محمد صاحب ناظر کی وہ مقبول و مشہور نظم ہے جو آج سے بہت پہلے ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے مگر افسوس ہے کہ مطبوعہ نظم بلا حوالہ نقل کی گئی ہے، اس کے بعد "نظریہ تمدن" خود ایڈیٹر صاحب کا مضمون ہے جو نہایت محققانہ اور مُفید ہے۔ ایسے مضامین کی اردو لٹریچر میں سخت کمی ہے مگر شکر ہے کہ میگزین اس خدمت کو ایک حد تک انجام دے رہا ہے "ترقی معکوس" ملا شاہدی کے نگارش خامہ کا نتیجہ ہے اس میں دلچسپ پیرایہ میں دو ہمسفر تہذیبی و تمدنی کا مکالمہ قایم کرکے بڑے بڑے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی مسایل اس خوبی سے حل کئے گئے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں "بعد رابع" ریاضی کا مضمون ہے جس کے تین بعد گذشتہ نمبر میں نکل چکے ہیں یہ مضمون شاید ریاضی دانوں کے لئے مُفید ہو مگر اس خشک مضمون میں عوام کی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اللغۃ العصریہ عربی نظم جو الزہرا سے نقل کی گئی ہے۔ بلا ترجمہ غیر عربی دانوں کے لئے غیر مفید ہے، اسی طرح جناب سید محمد ہادی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کا فارسی مضمون "تدقیقات اردو" اُردو تدقیقات میں کہاں تک مُفید ہو سکتا ہے؟ کم از کم ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہے! ہاں اگر اس سے اپنی لیاقت کا اظہار مقصود ہو تو اور بات ہے۔ "فطرت کی ستم ظریفی" تماشائی کا طویل اور نتیجہ خیز فسانہ ہے "ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ" جناب مولوی سید حسن صاحب برنی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی نے نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا ہے "ایک ہواباز کی کہانی" میں ہوائی جہاز سے چھتری کے ذریعے نیچے اُترنے کا تجربہ اس کی اپنی زبانی لکھا گیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ "فریب نظر" ادبی مضمون خوب ہے "فارسی شاعری اور صوفیا کی امرد پرستی پر ایک نظر" جناب محمد علی خاں صاحب اثر ایچ۔ پی (رامپوری) نے صوفیوں پر امرد پرستی کے الزام کو رد کرنے اور اُن کے پاک نفس کا ذکر نہایت صفائی سے کیا ہے۔ "فلومِلا" میتھیا آرنلڈ کی ایک دلگداز نظم کا نثر میں ترجمہ محمد ابراہیم صاحب متعلم ایم۔ ایس۔ سی نے کیا ہے۔ "امرء القیس اور شاعری" والا مسلسل مضمون اس نمبر کے ساتھ ختم ہوتا ہے "حیات" میں سر رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کے اس حصہ کا ترجمہ ہے جس میں شاہ سلیمان کے جواہرات کی کان کی تلاش کے متعلق ذکر آیا ہے۔ "مصر کا ہنگامۂ عظیم" میں ملکہ ہشیفرلیس کے مقبرہ کی ۱۹۲۵ء میں دریافت کے متعلق کار آمد معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں "اظہار محبت" شمیم

بلہوری صاحب کا ترجمہ فسانہ ہے۔صفحہ ۷۵ سے آخر صفحہ ۷۶ تک کتب و رسایل پر "تنقید و تبصرہ" کیا گیا ہے۔

نظموں میں "سالک کی ادا" "خطاب بہ علیگڈھ" اور ہلال عید" اچھی ہیں۔ اسی طرح غزلیات میں "محسوسات فانی" "آہنگ تپش" اور کیفیات کے زیر تحت اچھی غزلیں ہیں۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے یہ رسالہ اچھا ہے اور بہترین لکھائی چھپائی کے لحاظ سے بھی مسلم یونیورسٹی پریس مشہور ہے۔

"مرقع" (لکھنؤ) بھی اعلیٰ رسایل میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اس کا زیر تبصرہ جنوری ۱۹۲۷ء نمبر "خاص نمبر" ہے جو بہ اعتبار مضامین و ضخامت قابل ذکر ہے۔ مرقع بجائے تصاویر کے ہر ماہ اساتذۂ متقدمین و حال کے خطوط کے عکس تحریر کرتا ہے اس نمبر میں سات عکوس تحریر ہیں جس میں بحر شاگرد رشید ناسخ لکھنوی منیر شکوہ آبادی داغ دہلوی اور امیر مینائی کے خطوط خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہیں۔

مضامین میں "سیرۃ اصحاب کا ایک ورق" "سیدنا آدم علیہ السلام" "حرز جاں" اور "شیشہ سازی" بہترین مضامین کہے جاسکتے ہیں فسانوں میں "جان عالم اور ملکہ مہر نگار" جادو نگار نیاز صاحب کا بہت اچھا فسانہ ہے نظمیں اور غزلیں بھی مستند شعرائے حال فراہم کیگئی ہیں خصوصاً "خمریات ریاض" کا ہر ہر شعر سرور بخش و کیف انگیز ہے غرض چھوٹے بڑے نظم و نثر کے ۲۷ مضامین دو کالم کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہیں۔

ہم اس نمبر کے لئے جناب وصل صاحب بلگرامی کی مساعی جمیلہ کی داد دیتے ہیں اور فراہمی مضامین و طیاری رسالہ پر مبارکباد دیتے ہیں۔

مرقع کے اکثر مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ہر نمبر میں ایک دو مضمون ایسے اہل قلم کے فراہم کئے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کو ہمیشہ ناز رہیگا۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اگر بہترین نہیں ہے تو برا بھی نہیں ہے سالانہ للعہ ر۔

ملنے کا پتہ:۔ مینجر مرقع نظیر آباد لکھنؤ

لاہور کے تمام جرائد میں اپنی شان کا انوکھا جریدہ بلاشبہ "نیرنگ خیال" کہا جاسکتا ہے۔ جنوری نمبر میں گیارہ تصاویر ہیں۔ جن میں سے علامہ سر اقبال، نورجہاں، مقبرہ نورجہاں، مقبرہ انارکلی، مقبرہ شہنشاہ جہانگیر اور چغتائی کی رنگین تصویر "اسرار حیات" وغیرہ اچھی ہیں۔ تاریخ لاہور کے متعلق تین بسیط مضمون اچھے ہیں۔ سید امتیاز علی صاحب تاج کا ڈرامہ "انارکلی" بہترین ڈرامہ ہے اسی طرح فلک سیر سرمدی کا فسانہ" غالب کا ایک شعر" بہت دلچسپ ہے "ڈاکٹر سر اقبال کی شاعری پر" اڈیٹر صاحب کا مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے نظمیں اور غزلیات بھی اچھی ہیں۔

فروری کے نیرنگ خیال میں آٹھ تصویریں ہیں جن میں فانی بدایونی کی تصویر کے علاوہ تمام غیر ضروری ہیں اسی طرح

مضامین میں بھی "ترقی نسواں اور ہندوستان" "صنف نازک" "مطالعہ" اور "احباب صادق" چھوٹے چھوٹے اور معمولی مضامین ہیں "ایک بوسہ کا راز" دلچسپ افسانہ ہے اور کوثر لکھنوی کی نظم "وجہ خاموشی" اور جناب سید عابد علی صاحب عابد کی غزل اچھی ہے۔

متعدد تصاویر کے ساتھ ہر نمبر پانچ جزو کا ہوتا ہے اس پر سالانہ صرف ۳ روپے علاوہ ازیں سال میں دو تین خاص نمبر بھی بڑے اہتمام سے نکالے جاتے ہیں۔

ملنے کا پتہ :۔ مینجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

انقلاب یہ بھی لاہور کا "ادبی و سیاسی دلچسپیوں کا ماہانہ مجموعہ" ہے جو فتح چند نسیم اور کنھیا لال ثاقب بی۔ اے کی مشترکہ کوشش سے شایع ہوتا ہے۔ لیکن یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء کا "خواتین نمبر" جے دیوی صاحب ایک ہندو لیڈی کی زیر ادارت شائع ہوا ہے جس میں آٹھ نو تصاویر ہیں اور سب کی سب خواتین ہی کی ہیں اسی طرح مضامین بھی تمام تر خواتین ہی کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں جن میں "تعلیم نسواں" پر موہن رانی جی شرغہ کا اور محترمہ بیگم محمد علی صاحبہ کا مضمون "استانیوں کی ضرورت" دونوں اچھے ہیں اسی طرح "بہترین اصول صحت" "باب نسواں" اور ایڈیٹرس صاحبہ کا مضمون "رفیق زندگی" بہت اچھے اور کارآمد مضمون ہیں افسانے بھی تمامتر خواتین کے لئے مفید ہیں اگرچہ صحت زبان کا لحاظ نہیں رکھا گیا تاہم یہ نمبر ہر پڑھی لکھی خاتون کو دیکھنا چاہئے ہم حیا صاحبہ کو ان کی اس سعی بلیغ داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (حجم ۹۶ صفحے)

جنوری کا انقلاب (سالگرہ نمبر) بھی متعدد تصاویر و افسانوں سے پر ہے۔ اور اس میں بھی "عالم نسواں" مرتبہ جے دیوی حیا ایک رسالہ کی صورت میں بطور ضمیمہ شامل ہے اس میں ایڈیٹرس صاحبہ کا مضمون "کیا تعلیم سے عورت خشک اور فلسفی بن جاتی ہے" فیصلہ کن ہے اسی طرح "میرا بائی" والا مضمون بھی اچھا ہے اور افسانے بھی تمام دلچسپ ہیں اس نمبر کی ضخامت ۱۲۰ صفحے ہے۔ اس پر سالانہ چندہ صرف ۳ روپے۔

لکھائی چھپائی معمولی ملنے کا پتہ :۔ مینجر انقلاب ریلوے روڈ لاہور

"اڈیٹر"

صفحۂ ادارت

گذشتہ نمبر میں ہم نے اعلیحضرت ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر دام اقبالہٗ و حشمتہٗ والی ریاست خیر پور (سندھ) کی تصویر کے متعلق اپنے نوٹ میں موصوف الصدر کے مزید حالات حالات قارئین زبان کی خدمت میں پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس جگہ درج کرتے ہیں۔

حال میں زبان کے ڈکلریشن کے متعلق ہمیں دہلی جانے کا اتفاق ہوا تھا اس دوران میں خیر پور (سندھ) جانے کا اتفاق ہوا تھا اس دوران میں خیر پور جانے کا بھی موقع مل گیا چنانچہ کرمی و محترمی جناب رضاء الحق صاحب عباسی پرائیوٹ سکریٹری میر صاحب بہادر بالقابہ کے توسل سے ہمیں حضور میر صاحب بہادر کی خدمت میں باریابی کا بھی شرف حاصل ہوا اور ہمنے عباسی صاحب سے محترم موصوف کے جو جو اوصاف حمیدہ اور اخلاق کریمانہ سنے تھے اس سے کہیں بڑھکر اعلیٰ اوصاف سے انکو متصف پایا ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

ہمیں آپ سے شرف نیاز حاصل کرکے ان بے بنیاد اور بے پا در ہوا اطلاعات کو مشتہر کرنے والے اخبارات کی حالت پر جنکا مقصد واحد محض رؤسا کی بری بھلی باتیں شائع کرکے روپیہ کمانا ہے سخت افسوس ہوا کہ وہ اپنی اغراض کی تکمیل کی خاطر کیسی کیسی دور از حقیقت خبریں شائع کرکے فن صحافت کو بدنام کر رہے ہیں

اس قحط الرجال کے زمانے میں مسلمان رؤسا ہند میں ایک بھی ایسا رئیس نہیں ہے جو آپکے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔ رعایائے خیر پور کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہئے کہ انکو ایک ایسا رعایا پرور و ہمدرد اور مشفق تاجدار میسر آیا ہے جو ہر وقت انکی فلاح و بہبودی میں مصروف رہتا ہے۔ افسوس آپکی فیاضی و دریا دلی جو غریب رعایا کی اعانت ہمدردی یا اہل فضل و کمال کی قدردانی پر مبنی ہوتی ہے خارجی اور سیاسی دنیا اسکو "فضول خرچی" سے تعبیر کرتی ہے یہ انکی نادانی و ناواقفیت کا ادنیٰ ثبوت ہے۔

اگر ہم یہاں آپکی اولوالعزمی، فیاضی، کریم النفسی، حلیم الطبعی، منکسر المزاجی اور رعایا پروری کے اوصاف کو اختصار میں بھی حیطۂ تحریر میں لائیں تو ایک دفتر ہو جائے تاہم ہم ان سے متاثر ہو کر آپکے زیر ریاست کے جستہ جستہ حالات جو حقیقت پر مبنی ہیں لکھدینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ریاست خیر پور مغربی ہندوستان میں اول درجہ کی واحد اسلامی دیسی ریاست ہے آپ اپنے نامور والد بزرگوار

ہز ہائنس میر سر امام بخش بہادر جی-سی-آئی-ای سابق والیٔ خیرپور کی رحلت کے بعد ۱۹۲۱ء میں سریرآرائے ریاست ہوئے، آپکی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ہے اور آپ انگریزی، عربی، فارسی، اردو، سندھی، اور پنجابی زبانوں سے کم وبیش واقف ہیں۔

آپکے عہد معدلت مہد میں ریاست میں اسکولوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچی ہے جس میں ہزارہا طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اسی طرح بہت سے عمدہ شفاخانے بھی ہیں جہاں سے بیش قیمت ادویہ اور طبی مشورہ مفت دیا جاتا ہے آپنے اپنی ہندو رعایا کے لئے ایک مندر بھی تعمیر کرایا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ کو ہر مذہب سے دلچسپی ہے اور انکا خاص مقصد اپنی ہندو مسلم رعایا میں یگانگت اور رواداری کے جذبات کا پیدا کرنا ہے آپنے اس مندر کا جہاں ہندو مسلمان اپنے قومی مراسم اور طریقہ عبادت پر عامل ہوکر ایک ساتھ بھائیوں کی طرح مل سکتے ہیں وہ مہا بیر آشرم، نام تجویز فرمایا ہے آپ رعایا کی معروضات کو بذات خود نہایت غور وخوض سے سنتے ہیں اور انکے ساتھ شاہانہ مراعات کو روا رکھتے ہیں۔

ریاست نے ایک لاکھ پانچ ہزار کی گراں قدر رقم کنگ اڈورڈ میموریل فنڈ میں ایک لاکھ مسلم یونیورسٹی فنڈ میں بیس ہزار اعانۂ بمبئی کے چندہ اسکاوٹ ماسٹروں کی ٹریننگ کیلئے اور پندرہ ہزار کی رقم تعلیمی کانفرنس بمبئی منعقدہ پونا کو دی ہے۔

آپنے اپنی زیر نگرانی رعایا و ریاست کی بہبودی و ترقی کی خاطر اپنے اختیار سے ایک کونسل کا تقرر فرمایا ہے جو آئے دن ذرائع آمدنی و ترقی اور رعایا کے مفاد کی تدابیر عمل میں لا رہی ہے، طبقہ ادنیٰ کے افراد بہ نسبت سابق زائد اجرت پر کام کرتے ہیں، پیداوار کی مدات میں ترقی دی گئی ہے، آبادی، تعلیمی محکمہ جات اور خیراتی شفاخانہ ریاست میں یوماً فیوماً بڑھتے جاتے ہیں اور رعایا بھی آپکے زیر ظل عاطفت شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور انکو ہر قسم کی سہولتیں ریاست کی بہم پہنچائی جاتی ہیں جس سے قوی امید ہے کہ موجودہ فرمانروا اپنے وسیع مشرقی و مغربی تجربات سے رعایا و ریاست کو ایسی ترقی دینگے جسکی نظیر ریاست کے گذشتہ صفحات تاریخ میں ڈھونڈھے سے نہ ملیگی

آپ جہاں صاحب ملک ومال ہیں وہاں صاحب تصنیف و دیوان بھی ہیں یعنی آپکا ایک مختصر سا دیوان پاکٹ سائز نہایت نفیس و دیدہ زیب چھپ گیا ہے جسمیں سے ایک غزل اس نمبر میں بھی ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔ اخیر میں ہم بقول شخصے دست بدعا ہیں کہ ؎

پاؤں پھیلائے رعایا چین سے سوتی رہے   علم و دولت کی ترقی ملک میں ہوتی رہے

خدا کا لاکھ شکر ہے کہ باوجود بے بضاعتی و کم مائگی کے آج رسالہ زبان ہزاروں مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی عمر کا پہلا سال ختم کرتا ہے۔ ہم اس موقع پر اپنے ان تمام معاونین اور قدردانوں کا بہ صدق دل شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے گاہ گاہ دامے درمے اور قلمے ہماری معاونت فرماکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ بھی ہمارے قلمی معاونین اسی طرح اپنے شہ کار اور اعلیٰ علمی مضامین سے زبان نوازی فرمایا کرینگے اور زبان کو ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں شمار کئے جانے کے قابل بنا دینگے۔

زبان نے اپنی ایک سالہ مدت قلیل میں ملک و قوم کی جو کچھ بھی بری خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں اور زبان نے جس بلند معیار علمی کو اپنے لئے مختص کیا ہے اُسکو از اول تا ایندم جس خوبی و عمدگی سے نباہا اور نباہ رہا ہے یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ملک و قوم نے بھی زبان کی علمی خدمات کی ویسی ہی داد دی جسکا کہ وہ واقعی مستحق و سزاوار ہے؟ تو افسوس کہ نفی کے سوا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔

اگرچہ ہم اس بنا پر اپنے تئیں مغرور ہیں کہ زبان نے باوجود ملک کی بے اعتنائی و کم توجہی کے اس بنجر و پُرشور زمین پر اپنے وجود کو ابتک قائم رکھا لیکن افسوس کہ اب ان اسباب و وجوہ کے ساتھ یہ نونہال ادب سرسبز و بار یاب ہوتے اور پھولتے پھلتے نہیں نظر آتا اور ہم آج سخت مایوسی کے ساتھ بادل ناخواستہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ "اگر ملک و قوم کی ناقدردانی کا یہی عالم رہا تو یہ کاٹھیاواڑ کا واحد علمی رسالہ آیندہ سے بند کردیا جائیگا"

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس طرح بعض اہل رسالہ اپنے رسالہ کی ہزاروں کی تعداد اشاعت کا اعلان کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور "فن اشتہار" کو کس تکذیب سے درجہ تکمیل کو پہونچاتے ہیں؛ ہمیں تو صرف اپنے "احوال واقعی" کی "گذارش منظور ہے"، رسالہ زبان ہر ماہ پانسو کی تعداد میں چھپتا ہے اور رسالہ چھپکر منگرول تک پہنچنے میں ہمیں ایک سو روپیہ کی لاگت آتی ہے، اسکے مقابلہ میں خریداروں کی تعداد صرف ۱۳۲ ہے اب ناظرین خود ہی اندازہ فرمائیں کہ ابتک رسالہ کو جاری رکھنے میں ہم کسقدر زیر بار ہوئے ہونگے۔

کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی آبادی از روئے مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء ۱،۰۶۱،۱۰۲ ہے ان میں سے زبان کے خریدار صرف ۶۰ ہیں جن میں سے ۴۵ خریدار تو منگرول ہی کے ہیں اور اگر ان کو کاٹھیاواڑی خریداروں کی تعداد میں سے وضع

کردیں تو پورے کاٹھیاواڑ میں سے صرف ۲۳ خریدار زبان کو میسر آئے ہیں۔ کیا یہ امر اہل کاٹھیاواڑ کیلئے باعث "شرمندگی" نہیں؟ لیکن انکے جمود و خود فراموشی کو دیکھکر ہم یہی کہیں گے کہ "کاٹھیاواڑ" ع ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا۔

جہاں یہ مالی وجوہات ہماری راہ ترقی میں حائل ہیں وہاں چند اور اسباب بھی زبان کی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ناظرین کرام کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ زبان ابتک "نان رجسٹرڈ" ہے جس سے ہمیں بجائے ایک پیسہ کا ٹکٹ چسپاں کرنے کے ایک آنے کا ٹکٹ لگانا پڑتا ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت نقصان ہے۔

ریاست جوناگڈھ اور منگرول کے سیاسی معاملات خواہ کیسے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ رسالہ زبان کو (جسکو سیاسیات سے کوئی دور تعلق بھی نہیں ہے) کیوں ایک "سیاسی آرگن" سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست جوناگڈھ کے فیاض حکمراں اور انکے روشن خیال دیوان صاحب اس مسئلہ پر نظر ثانی فرمائینگے بلکہ اس علمی صحیفہ کی سرپرستی فرماکر اپنی فیاضی و علم دوستی کا ثبوت دینگے۔

یہی وہ موانعات ہیں جن سے تنگ آکر ہم رسالہ بند کردینے پر آمادہ ہوئے ہیں کیا اس کی ذمہ داری ملک و قوم پر نہیں عائد ہوتی؟ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا اگر ملک کے چند ذی حوصلہ افراد رسالہ کی قدردانی اور حوصلہ افزائی پر کمربستہ ہو جائیں۔

ہمنے آجتک خریداران و معاونین سے رسالہ زبان کی توسیع اشاعت کے متعلق کوئی درخواست نہیں کی لیکن اگر ہم سخت مجبوری و مایوسی کی حالت میں اسکی استدعا کریں تو غالباً بیجا نہ ہوگا لہذا ہم اپنے ناظرین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ اگر آپ زبان زندہ اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اگر آپ کے خیال میں اسکی خدمات واقعی ملک و قوم کے لئے سودمند ثابت ہوسکتی ہے تو اسکی امداد کے لئے طیار ہو جائیں اپنے احباب سے سفارش کریں اور انکو زبان کی خریداری پر مائل فرمائیں۔

اگر ہر خریدار تین تین چار چار خریدار بہم پہنچائے تو امید ہے کہ زبان کی تمام موجودہ مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ اور وہ آیندہ آپکی خدمت بجالانیکے قابل ہو جائیگا اور پھر تعویق اشاعت کی شکایت بھی جو بسبب اقلیت خریداران کے رہا کرتی ہے دور ہو جائیگی۔

ہمنے کسی گذشتہ اشاعت میں انہی صفحات میں سلطان محمود بیگڑہ کی جوناگڈھ پر حملہ آوری کرنے کے اصل اسباب کا

ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسکے متعلق ایک اہم تاریخی دستاویز کا عکس معہ مفصل حالات کے درج زبان کریں گے شکر ہے کہ آج ہم اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ ناظرین مضمون وہ ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف ملاحظہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں جناب سید واصل میاں صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ آپ نے اپنے خرچ سے دستاویزات کے عکوس خاص زبان کیلئے طیار کرواکر مرحمت فرمائے ہیں نیز ہم مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کے بھی مشکور رہیں کہ آپنے ہماری استدعا پر ان دستاویزات کے متعلق نہایت عرقریزی و جانفشانی سے ایک مفصل اور قابل قدر تاریخی مضمون قلمبند فرماکر عطا فرمایا ہے۔

موجودہ دور صحافت کی تقلید میں ہمنے بھی عزم کیا ہے کہ زبان کا آیندہ نمبر وہ خاص نمبر" ہو چنانچہ ہمنے اس کی طیاری میں ملک کے مشہور اور مستند اہل قلم حضرات کے معرکۃ الآرا مضامین خاص طور پر حاصل کئے ہیں۔ جن میں سے مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اڈیٹر الہلال مولانا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی۔ پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے۔ال ٹی (بڑودہ کالج) اور جناب سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔اے (صاحب روح تنقید) وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اسی طرح "ادبیات" میں ملک کے مایہ ناز اور نغزگو شعرائے حال کا کلام بلاغت نظام اور دلچسپ فسانے بھی بہم پہنچائے گئے ہیں۔

یہ نمبر اعلیٰ پیمانہ پر نفیس طباعت وکتابت کے ساتھ عمدہ کاغذ اور دوچند ضخامت پر متعدد تصاویر کے ساتھ شائع ہوگا تصاویر میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی کی تصویر اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل دید ہوگی ہم اسکے متعلق اسوقت صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ناظرین خاص نمبر کے منتظر رہیں

"اڈیٹر"

زبان آیندہ خاص نمبر خریداران کے نام ذریعہ ویلو پیبل للعہ کا روانہ کیا جائیگا جن حضرات کو سال آیندہ کی خریداری منظور نہ ہو وہ براہ کرم ایک پوسٹ کارڈ لکھکر ہمیں مطلع فرمائیں کہ دفتر اسکی واپسی کے نقصان سے بچے۔ ویلو اس نمبر کے موصول ہونے کے دس روز بعد روانہ کیا جائیگا۔

مینجر رسالہ "زبان"

کلام الملوک ملوک الکلام

عطیہ ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر متخلص بہ ناز والی ریاست خیرپور (سندھ) دام اقبالہ واجلالہٗ

میں بھی رنگ اپنی ہی ضد ہوں — آپ محسود آپ حاسد ہوں
آپ مختار آپ ہوں مجبور — آپ مسجود آپ ساجد ہوں
آپ موسیٰ ہوں آپ جلوہ طور — آپ مشہود آپ شاہد ہوں
آپ ہوں عبد آپ ہوں مولیٰ — آپ معبود آپ عابد ہوں

خود پرست و خدا پرست ہوں میں — آپ مومن ہوں آپ ملحد ہوں
مشتبہ ہے میری حقیقت حال — گاہ میکش ہوں گاہ زاہد ہوں
مرداے ساکنانِ ملک عدم — اک مسافر ہوں تازہ وارد ہوں
کون قیمت لگائے گا میری — میں زمانہ میں جنس کاسد ہوں
کیوں نہ من جاؤں روٹھکر سو بار — دل کی ہٹ ہوں نہ آپکی ضد ہوں
کیا حساب و کتاب کا کھٹکا — حرف باطل ہوں مد زائد ہوں

جی رہا ہوں کسی پہ مر کر نازؔ
اک نئی زندگی کا موجد ہوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مئی و جون — **زبان** — سنہ ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی | کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہو دل | صادق ہے زباں تو اسم اعظم ہے یہی

(امجد)

مقالات

ایک قدیم دستاویز

اور

اہم تاریخی انکشاف

(از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر مہاودیالے (احمد آباد)

اس وقت دو مقدس ہستیوں کے خطوط کا عکس شائع کیا جاتا ہے جو تاریخی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے، یہ دونوں بزرگ اپنے وقت میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان میں سے پہلا خط سید رکن الدین عرف سید راجو بن سید آدم بن سید سکندر[1] کا ہے آپکا سلسلہ نسب حضرت موسیٰؑ کاظم تک پہنچتا ہے آپ تو خالص منگر دلی (کاٹھیاواڑی) ہیں مگر آپکے جد امجد کا اصلی وطن ترمذ (ترکستان) تھا جنکا اسم گرامی سید سکندر بن مسعود حسینی ہے، آپ اوائل عمر میں اچھ (سندھ) حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کی خدمت میں حاضر ہوکر عام مریدوں کی طرح فیضیاب ہوتے رہے

[1] تذکرۃ الانساب میں آپکا سلسلہ نسب اس طرح لکھا ہے:-
مخدوم سید سکندر بن مسعود بن عمر بن قاسم بن شاہی بن علی بن موسیٰ بن علی بن حسن بن علی بن ابراہیم بن موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مخدوم کو معلوم ہوا کہ آپ صحیح النسب سادات میں سے ہیں پس آپ نے ادب سادات کے لحاظ سے سیّد سکندر سے خدمت لینی موقوف کر دی، اور جب یہ سوال کیا گیا کہ تم نے اپنی سیادت کو کیوں مخفی رکھا تو سید سکندر نے جواب دیا کہ تعلیم اور رشد و ہدایت حاصل کرنے میں سیادت کا اظہار کچھ موزوں نہ معلوم ہوا۔ اس سے حضرت مخدوم نے انکی ذہانت اور فطانت کو محسوس کر کے انکی طرف توجہ زیادہ مبذول کی اور کچھ عرصہ کے بعد آپ نے اپنی خلافت سے ممتاز فرمایا اور حکم دیا کہ سورٹھ کے علاقے میں جا کر مخلوق کو ہدایت کرو۔

محمد شاہ تغلق کے عہد میں جب "طغی" غلام نے گجرات میں بغاوت کی اور شاہی فوج سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی تو ٹھٹھہ (سندھ) میں آکر جام کے یہاں پناہ لی۔ سلطان محمد نے ایک بڑی فوج سے محاصرہ شروع کیا لیکن عین موقع پر وہ اس جہان فانی سے چل بسا اور فیروز شاہ تغلق اس کا جانشیں ہوا۔ اس نے اسوقت تو مصلحت وقت سے محاصرہ اٹھا لیا اور دہلی کو مراجعت کی مگر کچھ عرصہ کے بعد ۷۶۳ھ میں ٹھٹھہ کا محاصرہ کر لیا[۱] لیکن سامان رسد کی قلت اور وبائی امراض پھیل جانے کے سبب فوج کا کثیر حصہ ضائع ہو گیا۔ اس لئے فوجی طیاری کی غرض سے گجرات چلا آیا اور دوسرے سال ۷۶۴ھ میں ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ٹھٹھہ کا پھر محاصرہ کیا طرفین کے کثیر آدمی مارے گئے اور محاصرہ نے طول کھینچا خود فیروز شاہ کی فوج تنگ آگئی تھی اور سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث ٹھٹھہ کے لوگ بھی بیحد خوفزدہ ہو گئے تھے اسلئے ٹھٹھہ والوں نے حضرت مخدوم کے پاس پیغام بھیجا کہ بشرط اماں ہم لوگ اطاعت کے لئے بخوشی راضی ہیں، آپ واسطہ بنکر ہماری صلح کرا دیجئے۔ چنانچہ آپ نے صلح کرا دی۔ حضرت مخدوم کی یہ پہلی ملاقات سلطان سے ہے۔ یہ واقعہ ۷۶۴ھ کا ہے۔

---

[۱] افسوس ہے کہ کسی تاریخ میں محاصرہ ٹھٹھہ کا سنہ نہیں ملتا عفیف سراج اس عہد کا ہمعصر مورخ ہے اسنے اپنی تاریخ فیروزشاہی میں بڑی تفصیل سے فیروزشاہ کے حالات تحریر کئے ہیں اس چند سو صفحہ کی کتاب میں اس مرد صالح نے ایک واقعہ کا بھی بھولے سے سنہ نہیں لکھا۔ بہر حال اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ فیروزشاہ ۷۶۲ھ میں بنگالہ سے دہلی واپس آیا اور نگرکوٹ کا محاصرہ کیا طبقات اکبری نے اس سنہ کے ساتھ ماہ رجب بھی لکھا ہے۔ تو اغلب ہے کہ اس سنہ میں اسنے نگرکوٹ کا محاصرہ کر کے فتح کر لیا ہو اس صورت میں نگرکوٹ کی فتح بھی ۷۶۲ھ میں شامل ہوگی اسکے بعد وہ سندھ ٹھٹھہ کے محاصرہ کیلئے گیا پس یا تو اس سنہ میں سندھ پہنچ گیا اور یا ۷۶۳ھ میں پہنچا میں نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس زمانہ کے وسائل آمد و رفت کو مد نظر رکھتے ہوئے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ اس بڑی فوج کے ساتھ چھ ماہ میں وہ دہلی سے نگرکوٹ کا محاصرہ کرے اور پھر بعد فتح سندھ بھی پہنچ جائے اسلئے مجھے یقین ہے کہ وہ ۷۶۳ھ کا ہوگا۔ پھر بادشاہ گجرات چلا گیا اور ایک سال کی تیاری کے بعد پھر ٹھٹھہ آیا اور کامیاب رہا اس لحاظ فتح ٹھٹھہ ۷۶۴ھ میں ہوئی۔

سیدنا سکندر بن مسعود کی ولادت باسعادت سنہ ھ میں ہوئی[1] اور خورد سالی میں آپ اچھ حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور غالباً اسی باعث آپکو اپنی والدہ بی بی مریم کی خدمت سپرد کی اور اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ سلطان سے حضرت مخدوم کی پہلی ملاقات جب سنہ ھ میں ہوئی تو آپ موقع پر موجود ہونگے اور آپکی عمر شریف اسوقت ۱۲-۱۴ سال تک کی ہوگی۔ جب آپکی عمر تقریباً ۱۹-۲۰ سال کی ہوئی تو خرقہ خلافت عطا فرماکر قصبہ منگلور ملک سورٹھ میں ہدایت خلق کے لئے قیام کرنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اور فیروز شاہ تغلق کو جو آپکا عقیدتمند مرید تھا آپکے لئے سفارش کی۔ چنانچہ آپ اچھ (سندھ) سے پہلے دہلی تشریف لائے اور فیروز شاہ تغلق سے ملاقات کی جس نے آپ کی بڑی عزت کی اور ہر طرح مدارات سے پیش آیا انہیں دنوں میں یعنی سنہ ھ میں[2] ایک فوج منگلور کو راجہ کنور پال کی تنبیہ کیلئے جارہی تھی[3] آپ بھی بطور ایک مجاہد کے شریک ہوگئے آپکے ساتھ آپکے مریدوں اور عقیدتمندوں کا بھی ایک مجمع تھا وہ بھی اسمیں شامل ہوگیا اس فوج کا افسر ملک عزالدین بن آرام شاہ تھا یہ مختصر فوج دہلی سے چلکر منگرول پہنچ گئی اور راجہ نے صلح کے مقابل جنگ کو زیادہ پسند کیا۔ دونوں میں سخت مقابلہ ہوا راجہ مارا گیا اور مسلمانوں کی کامل فتح ہوئی اور فتح کی یادگار

[1] ریاض الاولیا۔ حالات سید سکندر بن مسعود۔ [2] تاریخ الاولیا صفحہ ۳۴۰۔ [3] میں نے لفظ "تنبیہ" اسلئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا کسی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ بظاہر سبب اشتعال کا نظر آتا ہے جس سے فوج کشی کیجائے۔ پس قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے محمد تغلق جوناگڈھ فتح کرچکا تھا اور اسکے مضافات مع سواحل اسکے تابع فرمان تھے انھیں میں منگلور کا راجہ بھی تھا منگلور بندرگاہ ہونے کے باعث ہمیشہ مختلف المذاہب تاجروں کا مسکن رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان تاجروں اور راجہ کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے اور مسلمانوں کی حفاظت جان و مال کیلئے ایک مختصر فوج بھیجنی پڑی گو اس مختصر مہم کا تاریخ میں ذکر نہیں ہے مگر اس کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو فتح منگلور کی یادگار میں جامع مسجد کے ایک بازو پر لگایا گیا تھا جو فی الحال بوہرہ واڑ کی مسجد میں لگا ہوا ہے۔ اسیطرح عزالدین ایک غیر معروف افسر ہے البتہ ضیا برنی نے جہاں فیروز شاہ کے امرا کی فہرست لکھی ہے وہاں ایک امیر کا نام ملک عزالدین بھی ہے اور بدایونی جلد اول صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ کلکتہ میں تحریر ہے کہ "البتہ بعہد محمد تغلق ملک عزالدین یحیٰ نامی ایک امیر ہے جسکو اعظم الملک کا خطاب ملا تھا" شاید دہی ہو لیکن جامع مسجد کے کتبہ سے اس کے باپ کا نام آرام شاہ معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ کچھ اس شخص کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ دیوان رنچھوڑ جی اپنی تاریخ سورٹھ (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ فوج کے دو حصے ہوئے ایک کا افسر عزالدین تھا جو منگلور میں جاکر جنگ آزما ہوا اور دوسرے کا شمش خاں جسنے جوناگڈھ کا محاصرہ کیا اصل عبارت یہ ہے کہ "شمش خاں بہ فرمان فیروز شاہ در جوناگڈھ باندک جنگ و جدل فتح ساختہ راجہ کھینگار بہ پناہ کوہ گرنار جاں بہ سلامت بردو شہر تاراج رفت" اسی طرح منگرول کی نسبت بھی لکھا ہے (صفحہ ۹۴ قلمی بخط مصنف) اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ

بقیہ صفحہ

یں جامع مسجد کی بنیاد رکھی گئی جو ۸۰۵ھ میں طیار ہوئی جیسا کہ جامع مسجد کے کتبہ سے ظاہر ہے[۵۱]۔

سیدنا سکندر بن مسعود اس جگہ (منگرول) مقیم ہوگئے اور آپکی خانقاہ کے لئے ایک گاؤں سلطان کی طرف سے عطا ہوا جسکا نام پہلے دیول پور تھا جسکو بدل کر مخدوم پور رکھا گیا۔ آپ ۷۰ برس زندہ رہکر ۸۲۵ھ میں راہی ملک بقا ہوئے آپکے دو فرزند تھے سید آدم۔ اور سید راجو ان میں سید آدم آپکے خلیفہ ہوئے جیسا کہ اس عکس تحریر کے مضمون سے ظاہر ہے آپکے وصال کے بعد آپکے لڑکے رکن الدین عرف سید راجو کو خلافت ملی۔ اور یہی سید رکن الدین ہیں جنکی تحریر کا عکس اسوقت شائع کیا جاتا ہے۔

دوسری تحریر حضرت شاہ عالم کی ہے جو سید رکن الدین کے جواب میں ہے حضرت شاہ عالم کے والد بزرگوار معروف بہ قطب عالم ہیں اور وہ فرزند ہیں سید ناصر الدین کے جو لڑکے ہیں سیدنا جلال الدین حسین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے حضرت قطب عالم سلطان مظفر اول کے عہد میں پٹن تشریف لائے آپکا اصلی وطن اچھ (سندھ) ہے کنیت آپکی ابو محمد اور اسم گرامی عبداللہ اور لقب برہان الدین اور مشہور بہ قطب عالم

جب اچھ سے آپ پٹن تشریف لائے تو سلطان احمد اول نے بڑی عقیدتمندی کے ساتھ زانوئے ارادت آپکے سامنے تہ کیا اور احمد آباد کا شہر جب تیار ہوگیا تو احمد آباد سے تین کوس پر ایک مقام ہے جو آجکل بٹوہ کے نام سے مشہور ہے اور شاہی وقتوں میں اسکو رسول آباد کہتے تھے آپ فروکش ہوئے۔ اور عقیدتمندوں نے ایک قلیل عرصہ میں اس جنگل کو آباد کرکے قابل زیارت جگہ بنادی۔ آپکی وفات ۸۵۷ھ ہے[۵۲]۔ آپکے بعد آپ کے منجھلے لڑکے شاہ عالم خلیفہ ہوئے آپکی کنیت ابوالبرکات اسم گرامی محمد اور لقب سراج الدین ہے مگر مشہور بین العوام والخواص شاہ عالم کے نام سے ہیں[۵۳] آپکا سلسلہ نسب

بقیہ صفحہ کے راجوں نے محمد تغلق کے مرنے پر جس نے انکو فتح کرلیا تھا خودمختار ہو بیٹھے تھے اور خراج دینا بند کردیا تھا اس لئے ان دونوں پر چڑھائی ضروری سمجھی گئی۔ [۵۱] اس تحریر سے معلوم ہوا کہ سیدنا سکندر دہلی ہوکر خشکی کے راستہ منگلور پہنچے۔ اچھ سے براہ سمندر منگلور نہیں آئے جیسا کہ منگلور کے عوام میں مشہور ہے اسی طرح یہ بات بھی پایہ صداقت سے گری ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت بہ بہانہ بارات شادی مع مسلح سپاہیوں کے ڈولہ میں بیٹھکر قلعہ میں پہنچ گئے بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہوتی ہے اصل یہ ہے کہ غیر محتاط لوگوں نے دوسروں کا واقعہ آپکی طرف منسوب کردیا حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ مرہٹوں کے عہد حکومت میں جبکہ منگلور پر وہ قابض تھے۔ سادات منگلور پُرفریب طریقہ سے مرہٹوں کو نکالکر خود قابض ہوگئے تھے جیسا کہ دیوان رنچھوڑجی کی تاریخ سورٹھ میں یہ بیان مفصل موجود ہے۔

[۵۲] اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۷ مجتبائی اور بعض کتب مثلاً معارج الولایت میں سنہ وفات ۸۶۵ھ ہے۔

[۵۳] تاریخ الاولیا جلد ۲ صفحہ ۲۴۷

سیدنا امام علی نقی تک پہنچتا ہے[1] آپکی ولادت باسعادت سنہ ۸۱۷ھ ہے سلسلہ کے لحاظ سے طریقہ سہروردیہ کے پابند تھے لیکن سیدنا شیخ احمد کھٹو سے بھی قادریہ مغربیہ طریقہ پر فیضیاب ہوئے گو آپ کو لوگ شاہ عالم کے نام سے جانتے ہیں مگر اپنے زمانہ میں زیادہ تر "میاں منجھلا" کے نام سے مشہور تھے جیسا کہ سیدنا رکن الدین راجو کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار میں آپکا نام "شاہ منجھن" لکھا ہے حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ نے متوفی سنہ ۱۱۶۳ھ اپنی کتاب "شجرہ عرجیہ" منظومہ میں بھی یہی نام لکھا ہے[2] چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بقول حق انا الحق کشف عالم به "منجھن شہ محمد شاہ عالم"

مولف برکات الاولیا نے لکھا ہے کہ "شاہ منجھن بخاری بھی آپکو کہتے ہیں" یہی مصنف تاریخ اولیا میں لکھتا ہے کہ "آپ ملقب بہ منجھن پیر ہیں" اور پھر آگے چلکر اسکی تشریح کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "آپ تین بھائیوں میں اوسط ہیں اسلئے آپ کو منجھلے پیر کہتے ہیں" ایک گجراتی تاریخ قلمی نظر سے گذری اس میں "منجھلا میاں" لکھا تھا صاحب مرآۃ سکندری نے ایک جگہ منجھن اور دوسری جگہ منجھلا تحریر کیا ہے۔

ان بیانات سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکا صحیح نام "میاں منجھلا" ہی ہے جیسا کہ سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ نے جو انکے ہمعصر ہیں بہت واضح طریقہ سے لکھا ہے اور بعد میں کاتبوں کی غفلت سے تصحیف ہو کر "ل" ساقط ہو گیا حضرت پیر محمد شاہ کے شعر میں بھی اگر "ل" ساقط نہ ہو تو مصرع موزوں رہتا ہے۔

آپکی وفات سنہ ۸۸۰ھ میں ہوئی ہے۔ آپ سلطان محمود بیگڑھ کے ہمعصر ہیں سلطان آپکا بڑا ادب کرتا تھا اور آپکے احکاموں کی تعمیل اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آپکے خلفا گجرات میں بکثرت ہیں اور آپکے کرامات عام طور پر بہت معروف ہیں آپ شاہانہ ٹھاٹھ سے رہا کرتے تھے۔ اور اسی لئے غالباً شیخ محدث دہلوی نے باوجود اعتراف کمالات و مقامات عالیہ کے آپ کی نسبت تحریر کیا ہے کہ "بعض اوقات لباس حریری پوشیدہ و بر مشرب ملامتیہ می رفت"۔

میرے خیال میں آپ خلوت در انجمن کے مسلک پر عامل تھے اور اسی سبب سے دنیاوی وجاہت نے روحانیت پر قابو نہ پایا۔

اس تقریب کے بعد اب ہم سیدنا رکن الدین کے خط کا اور حضرت شاہ عالم کے جواب کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں

وھوھذا

---

[1] تذکرۃ الانساب صفحہ ۱۳۲ مرآۃ احمدی میں ہے کہ نسب آپکا سید جعفر ثانی برادر حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔

[2] یہ کتاب ابھی تک قلمی ہے اور کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ میں محفوظ ہے۔

(۱) خلاصہ خط سید نا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

"یہ بندہ عرصہ دراز سے اس بات کی آرزو دل میں رکھتا تھا کہ آپ جیسے روشن ضمیر مرشد کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر شرف قدمبوسی حاصل کرے لیکن بدقسمتی سے اس وقت تک علائق دنیاوی و بلا اعلائی میں اس طرح منہمک رہا کہ حضور انور کی زیارت سے مشرف نہ ہوسکا جسکا دل کو بیحد قلق ہے اگر حضور اقدس اس طرف توجہ فرمائیں اور اجازت دیں تو حاضر ہو کر سربلندی اور افتخار حاصل کروں، دوسری گذارش یہ ہے کہ میرے دادا سید سکندر بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کو آپکے پردادا حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت رحمۃ اللہ علیہ نے سورٹھ میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ حسب الحکم خدمت مخلوق میں اپنی عمر بسر کی اُنکے بعد میرے والد مرحوم بھی قدم بہ قدم چلکر اس خدمت کو ادا کرتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد یہ خاکسار اُنکی پیروی کیلئے تیار ہوا لیکن مشکلات اسقدر پیش ہیں کہ آگے قدم بڑھنا مشکل ہوگیا ہے خصوصاً قلعہ گرنار کا راجہ اور حکامان وقت اس قدر مسلمانوں کے برخلاف ہیں کہ اب اس جگہ قیام کرنا دشوار ہو گیا ہے اس لئے یہ وقت مدد کا ہے اس لئے آپ دعا فرمائیں کہ خدا ہماری مشکلات کو دفع کرے اور مدد کرکے ہمکو اس ظلم سے نجات دیں"

(۲) خلاصۂ جواب حضرت شاہ عالم

"آنجناب کا خط ملا۔ آپکی صحت کا حال معلوم کرکے خوشی ہوئی آپنے ہم سے ملاقات کا جو ارادہ کیا ہے یہ مبارک ارادہ ہے آپ ضرور آئیے، آپکے آنے سے معاملات جلد طے ہو جائینگے حل مشکلات کے لئے بہتر یہ ہے کہ آپ خدا کی طرف اپنی مشغولیت کو بڑھا دیجئے اور ہر وقت امید و بیم کی حالت میں رہیئے جو شیوۂ فقراء صالحین ہے اور ہر نماز کے بعد اَللّٰهُمَّ نَسْتَعِيْنُ بِكَ عَلٰى طَاعَتِكَ دس دفعہ پڑھا کیجئے مجھکو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپکے خاندان کے لئے کوئی وظیفہ مقرر نہیں ہے میں آج ہی دیوان سلطانی سے ملکر عرض کر دونگا ملاقات کے وقت تک اسکا ظہور ہو جائیگا حاکم قلعہ گرنار کی جو شکایت آپنے لکھی ہے اسکے متعلق آپ بیفکر رہیں حاکم مذکور عنقریب اپنی سزا کو پہنچے گا۔ اُسوقت دوست خوش اور دشمن ذلیل ہونگے۔ غیب کو حاضر سمجھ کر اس بات کا یقین رکھیں۔ آپ اپنے بچوں اور حاضرین مجلس کو میری دعائیں مخصوص جانیں اور خط و کتابت جاری رکھیں کیونکہ خط و کتابت بھی نصف ملاقات کے برابر ہے وصلی اللّٰہ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین۔

میں اس مضمون کے ضمن میں قلعہ گرنار یعنی جونا گڈھ اور اسکے راجہ کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس مضمون سے متعلق ہے۔

جوناگڈھ

جوناگڈھ، گرنار جیسے بلند و بالا پہاڑ کے سبب ہمیشہ مستحکم مقاموں میں سمجھا گیا ہے اور اسی سبب سے بہت کم لوگوں نے اسکے فتح کی ہمت کی سب سے پہلے مسلمان بادشاہوں میں محمد تغلق نے اسکی طرف توجہ کی راجہ گرنار نے ایک شاہی مجرم کو پناہ دی تھی جسکے باعث محمد تغلق نے اسکو فتح کرکے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا[1] لیکن بعد وفات محمد شاہ راجہ پھر قابض ہو کر باغی ہو گیا اسلئے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس پر فوج کشی کی گئی جب خاندان تغلق معرض زوال میں آیا اور ہر صوبہ کے ناظم خود مختار ہو بیٹھے تو گجرات کے ناظم کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر راجہ پھر آزاد ہو گیا، مظفر شاہ اول کے بعد جب احمد شاہ اول نے تخت گجرات پر قدم رکھا تو بعد کوشش کے بعد تمام سرکشوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن راجہ گرنار اپنے قدرتی مستحکم قلعہ کے بھروسے پر مطیع نہ ہوا اسلئے مجبوراً ۸۱۷ھ میں احمد شاہ کو باقاعدہ فوج کشی کرنی پڑی چنانچہ دیوان رنچھوڑجی اپنی تاریخ سورٹھ میں لکھتے ہیں :۔

چوں بادشاہ احمد شاہ گجراتی بہ جمیعت دین محمدی لشکر باستیصال جوناگڈھ کشید راجہ کھینگار بن جے سنگھ و دیوانش میر تنک (میر سنگھ) ناگر تاب اقامت نیاوردہ بہ پناہ قلعہ سمت ۱۴۷۰ بکرمی سلامت ماندند۔ اما از تطاول بہادران اجل طبعی نہ ماند۔ شہر غارت شد۔ چہ در شہر و چہ در پرگنہ جات جابجا سید قاسم و ابوالخیر کہ برائے تحصیل از سلامی تھانہ گذاشتہ بود۔ مسلماناں را جاگیر دادہ آباداں ساخت۔

(صفحہ ۱۴۲ قلمی بخط مصنف)

جب بادشاہ احمد گجراتی نے دین محمدی کی جمیعت میں جوناگڈھ کی بیخ کنی کیلئے فوج کشی کی تو راجہ کھینگار بن جے سنگھ اور اوسکا وزیر میر تنک (میر سنگھ) ناگر (شہر میں) ٹھہر نہ سکے اور ۱۴۷۰ بکرمی میں قلعۂ (گرنار) کی پناہ میں (جاکر) سلامت رہے لیکن بہادروں کی زبردستی سے طبعی موت تک جی نہ سکے شہر لٹ گیا۔ کیا شہر میں اور کیا علاقوں میں جابجا سید قاسم اور ابوالخیر نے جنکو سلامی کا روپیہ وصول کرنیکے لئے تھانہ (دار) بناکر قائم کئے تھے۔ مسلمانوں کو جاگیریں دیکر آباد کئے۔ صفحہ ۱۴۲ قلمی بدست مولف۔

مرآۃ احمدی میں بھی اسطرح لکھا ہوا ہے۔

اما قلعہ جوناگڈھ کہ قریب دامن کوہ گرنار واقع است بدست سلطان افتاد۔ زمینداران سورٹھ مطیع و منقاد گشتہ پیش کش قبول نمودند صفحہ ۱۵

لیکن قلعۂ جوناگڈھ جو کوہ گرنار کے دامن کے قریب واقع ہے سلطان کے ہاتھ آگیا (ضلعۂ) سورٹھ کے زمینداروں نے تابع فرمان ہو کر پیش کشی دینا قبول کیا۔ صفحہ ۱۵

[1] ضیاء برنی واقعہ محمد تغلق [2] تاریخ سورٹھ صفحہ ۱۴۲ قلمی بخط مصنف

سلطان احمد کے بعد گجرات کمزور ہاتھوں میں ہونے کے سبب غیر منظم - اور خانہ جنگی سے بدعملی پھیل گئی راجہ گرنار اس بدنظمی سے پھر فائدہ اٹھا کر خود مختار ہوگیا اور لوازمات شاہی کا استعمال کرنے لگا محمود بیگڑھ نے جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو راجہ گرنار اُسی طرح خود مختار تھا جس طرح محمد تغلق سے پہلے۔ اسوقت قلعہ پر قبضہ راجہ منڈلک (راماَنڈلک) کا تھا راجہ منڈلک کا چوڑاسمہ خاندان تقریباً دو ہزار برس سے اس پر قابض چلا آرہا تھا[1] راجہ مانڈلک اس خاندان کا آخری راجہ تھا اور دنیا میں آخری تاجداروں کا جو حال ہوتا ہے وہی راجہ منڈلک کا تھا مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہوں کی طرح یہ بھی مغرور اور عیش پرست تھا چنانچہ عام کتب تاریخ میں یہ مشہور روایت درج ہے کہ اسکے عہد میں بیسل نامی ایک بقال تھا جو "من موہن" نامی ایک خوبصورت عورت رکھتا تھا جب اسکی خبر راجہ کو ہوئی تو اس عورت کو اسنے اپنے محل میں طلب کرکے شب باش ہوا اسی طرح موضع موبنہ ضلع جوناگڈھ ایک حسین عورت "ناگی چارن" رہتی تھی جسکا شہرہ سنکر یہ بہانہ شکار روانہ ہوا، جب اسکے گھر پہنچا تو وہ عورت اسکو مہمان سمجھکر اسکی عزت افزائی کو اٹھی مگر راجہ اسکو دیکھکر ایسا بدمست ہوا کہ بے اختیار اپنا دست ہوس اسکے قبہ ہائے نوری کی طرف دراز کیا۔ جس کا انجام کچھ اچھا نہ نکلا (تاریخ سورٹھ قلمی)

راجہ بیحد مغرور ہوگیا تھا، اور کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا تھا۔ اپنے باپ دادوں کی طرح وہ بزرگوں کا ادب ولحاظ نہ کرتا تھا چنانچہ "نرسی مہا رش" کی اسنے سخت توہین کی جسکا اثر عوام پر اچھا نہ پڑا، راجہ کی طرف سے عام طور پر نفرت پھیل گئی لوگوں کا خیال ہے کہ اس عابد کی بددعا سے سلطنت چلی گئی، دیوان رنچھوڑجی کے الفاظ یہ ہیں۔

وبشامت گناہے کہ باچنیں مرد عارف بے ادبی کرد سلطنت ازخاندان رائے زادگان چوڑاسمہ رفت	اور اس گناہ کی شامت سے کہ ایسے عارف شخص کی بے ادبی کی چوڑاسمہ خاندان کے رائے زادوں سے سلطنت نکل گئی

غرض یہی عیش پرستی اور امور سلطنت سے بے پرواہی تھی جسکے سبب حکامان سلطنت اپنے فرائض سے غافل ہوکر دراز دستی پر اتر آئے۔ اور اس سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ مرآۃ سکندری میں ہے کہ

القصہ قرمچیان ولایت سورٹھ دائما تاخت وباخت اطراف بلاد گجرات می نمودند۔ ودزدانش درپیشہ دزدی مُصر بودند۔	قصہ مختصر ملک سورٹھ کے دہاقین ہمیشہ بلاد گجرات تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور اوسکے قزاق ڈاکہ زنی میں اصرار کرتے تھے۔

---

[1] مرآۃ سکندری۔

اس بدامنی کے سبب قافلے عام طور پر لٹنے لگ گئے تھے۔ مسافر اور تاجران غیر ملکی بیحد خوفزدہ اور غیر مطمئن تھے۔ ایک قلمی گجراتی تاریخ میں ہے کہ ایک عرب خاندان کو جو سورٹھ میں سفر کر رہا تھا سورٹھ والوں نے لوٹ لیا، اور حاکمان سورٹھ نے اسکی فریاد پر کوئی توجہ نہ کی مجبوراً اس نے احمد آباد محمود شاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ حاکمان سورٹھ نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ مذہبی معاملات میں بھی جبر و اکراہ شروع کیا۔ جس سے غیر ہندو رعایا میں سخت بیدلی پھیل گئی اور راجہ کی حکومت سے بیزار ہو گئے۔ دیوان رنچھوڑجی اپنی تاریخ سورٹھ میں تحریر کرتے ہیں:۔

"بعد حملہ احمد شاہ اپنے مذہب کی کشش سے ہر قسم کے مسلمان سندھی۔ بلوچ۔ جٹ۔ کھوکھر۔ ملک ملتانی۔ قریشی۔ افغانی اور غوری اس ملک میں آباد ہو گئے۔ راجہ نے ہر شخص سے پختہ عہد لینا شروع کیا کہ ریش تراشینگے۔ گائے ذبح نہ کرینگے اور مسجد کی طاق میں شیولنگ کا نقشہ بنا کر اس کو سجدہ کیا کرینگے (صفحہ ۴۹ قلمی ا)"

غالباً اسی قسم کے مظالم تھے جس سے سیدنا رکن الدین علیہ السلام جیسے گوشہ نشین عابد و زاہد مرنج و مرنجاں طبیعت رکھنے والے شخص بھی گھبرا اٹھے، سیدنا رکن الدین رحمہ اللہ نے اپنے خط میں شاہ عالم سے انھیں مظالم کی شکایت کر کے خدا سے دفع مظالم کی استدعا کی ہے و باللہ التوفیق

اخیر میں عکس ہائے تحریر کی اصل عبارت مع ترجمہ پیش کر کے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

عرضداشت سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

"بندہ خاندان حضرت نبوی رکن الدین آدم بن سید سکندر حسینی پروردہ و نہال گردانیدہ منسلک به سلک بندگی ..... منبع .. ... الاتقیا، سراج الاصفیا، شمس الفقرا، مرشد الطالبین۔ برہان المحققین ختم المجتہدین سید السادات منبع الکرم والکرامات شیخ جلال الحق والشرع والدین قدس اللہ سرہ العزیز است ومن المهد الی اللحد ابا عن جد طوق عبدیت و عبودیت من الخالق والمخلوق برگردن جان دادہ الالهم زد ولا تنقص۔ کمترین خدام بلکہ تراب اقدام در مقام عبودیت شرط العهد بجا می آرد۔ و بازمی نماید مرتے مدید است متوالی اللیالی والایام متواتر الشهور والاعوام آرزو، انتظار و آرزو در روئے طاعت شاہ و شاہزادہ کونین کہف شهور الثقلین قطب المشائخ زبدة الاخیار برگزیده حضرت مالک الملک پیش او آیۃ الذین لاخوف علیهم سید السادات منبع العلم والعبادات مفخر اہل السیادت حجت اہل شرعیت

والطریقة الشیخ الاعظم والمعظم والقدوة الاکرم شیخ محمد عرف میان معظم وکرم وعمیان منجھلہ" خلد اللہ رایات جلالتہ منصوبتہ ملاقبتہ السماک وآیات کمالہ علی جبہة الافلاک - بندہ امیدوار دوالہ دیدار برائے مشاہدۂ مامون وطلعت ہمایون نمداذری شدہ - لالہ آسا داغ رانجون دل ترمی کند ونیلوفرمثال در آب دیدہ غوطہ می خورد - ودائم الاوقات بہ تضرع وابتہال از حضرت ذوالجلال ومسبب الاسباب مسالت می نماید یارب العالمین نعمت ملاقات شاہ عدیم المثال کریم الخصال علی احسن حال عنایت فرما بہ منہ وکمال کرمہ اشتیاق پابوس از حد غائت را اگر حرفے نویسم زاشتیاقت قلم در شرح آں عاجز بماند - بعزة اللہ وجلالہ، عمرخویش بہ منہایروم وی برم بنوعے شرف پابوس وآستانہ بوسی مشرف شوم وخاک آستانہ در دیدہ جہاں بیں سرمہ کنم وشرائط بندگی بجا آرم - ہمدریں آرزو عمرے رود بر حیات عالم غدار چہ اعتماد ترسم کہ فرصت وفا نہ کند وبہ تمنائے مذکور ترسم بجہت ایں معنی بندہ در تفکر می بوشد ودر خود می خرد شد وبہ عزیمت می کوشد ولبسا اہتمام دارد بصد ہزار نیازمندی در دائرہ خدمت گاراں باریابد بواسطہ قید الماراشد من قید الحدید میسر نمی شود - العبد یدبر والله یقدر -

ہر وقت کہ عنایت ابدی وسعادت سرمدی خواہد بود وبخت یاوری خواہد کرد شاہزادہ ثقلین بجانب خدمت اذن خواہد فرمود طالب بہ مطلوب خواہد آورد - النصیب یصیب ؎

خواہم کہ بہ پرم سوے وصلت
لیکن چہ کنم کہ پر نہ دارم

چندکرت بندہ خواست بہ موازنہ خود بحضرت شاہزادہ کونین عریضہ نیازمندی وشکستگی باز نماید فکر... مزاحم وقت من شد ند وعقل بہ عجز معترف می کند چوں اولیائی تحت قبائی لایعرفہم غیری فرمان شدہ است بندہ بکدام زبان تقریر را در گمان انداز ود چہ نویسد خاما استظہارے در باطن راہ یافت بحضرت پیران دین مریدان یقین حال خود باز نمودہ اند - با ایں دانستہ شوخی کردہ ام ووقاحت را در کار بستم وعریضہ باز نمودہ ام وخود را باآنکہ ہیچ محلے ندارم بہ نظر مبارک ظاہر نہ گشتہ ام بستم در زمرہ ثنا سرایاں درگاہ شاہزادہ بندہ نواز درآوردہ ام چہ کنم درماندہ ام ودر دریائے درماندگی فرو رفتہ ہستم چنانچہ ہستم اگر کیفیت واقعہ حال کما حقہٗ بازعیدہ آید طویل افتد شکایت حق سبحانہ وتعالیٰ باشد بندہ کالہائم فی البوادی ایام منصرف میکند وسکونت قصبہ منگلور بر حکم (حوالت بندگی) قطب اقطاب عالم قدس سرہ العزیز سید السادات سید سکندر مرحوم اختیار کردہ اند وقصبہ مذکور خاصہ اسلام نصب کردہ حضرت قطب الاقطاب علم بندگی مخدوم جہانیاں قدس اللہ روحہٗ بعد الاستخارہ والاشارہ سید سکندر مسعود حسینی را در شہر سودھرہ نامزد کردہ اند وسکونت قصبہ مذکور فرمودہ اند دراں وقت (دراں وقت) در شہر مذکور ہمہ جا کفر بود وسید السادات

چنانچہ فرمان بود سرانجام رسانیدہ اند۔ چوں بہ مغرب فنا فرہ شدند والد مرحوم نیز تشبہ طریق وسع امکان باتمام رسانید۔ بعد وفات والد مرحوم بندہ خاکروب آستانہ بصورت لنگاں و کوراں و ضعیفاں برحسب طاقت بشری بامید حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم وان لم یعمل بعملہم دراں راہ می شتابد۔ امادروقت سید عوارضات دنیاوی فراغ ندارد معلوم فرمودہ باشند۔ مقادم قلعہ گرنار (زیراکوشی) در اسلام می کند بہ سمع شاہ ولایت خصوصاً عرضہ داشتہ شدہ وقت اعانت است از سکونت در قصبہ مذکور دشوار دارد الا بہ عنایت باری تعالیٰ و عنائت اعانت شاہزادہ معظم و کرم ہمہ کارہا امر بحسب مطلوب خواہد رسید و مدعیان مقہور خواہند شد،

التماس ایں حال آشفتہ ... ... وضلالۃ .. ... رحمت کنا از ظلمات (انگیں) ... ... بہ سائل .... از جانب خدمت .. ... بندہ حلقہ .. ... کمربستہ بخدمت ... ... اتمام گشت قصہ حال بحضور وارد ..... واثق بواسطہ نعمت ہائے دارین ملاحظہ میاں معظم ..... مرحمت .... مرقد اقدس .... عالم قدس ... حضر .... بواسطہ نعمہا دارین .. حضرت قطب عالم بود بندہ کرم .... آرزو دیدار است کالمریض الی .... العافیۃ و نیازمند حضور شد ... عصر خلطش بود می باید .... ہم تصور حل اماں بعید افتادہ .. قریب حضرت در خدمت اشارہ فرمایند و ہر .. نالمنتہا .. جواب .... از میاں السنت ایں بندہ ..... و سرفراز فرمائند امید بفضل باری تعالیٰ .... وجائے مستحکم را بر محل صلح بنظر مبارک خواہد گذشت نعمت دولت دارین،،

جواب حضرت شاہ عالم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد تعریض دعا مزید حیات و کفایت مہمات .. .. .. و ترقی درجات و تعلی مقامات (خدمت) بنابر مجمع سید السادات منبع .. .. تعالیٰ .. آل طٰہٰ و یٰسین بن سید المرسلین سید رکن الدولۃ والدین المعروف سید راجو لازال فی عون اللہ الرحمٰن باز نمود مکتوب مرغوب خدمت اخوی دام سعادتہ، مبنی از کمال اعتقاد و معلم از وفور اتحاد در باب غالب شدن سلام اشتیاق بر معایت باایں مخلص وصول یافت دریافت اخبار صحت ذات فرحت فراواں و بہجت بے پایاں بحصول پیوست۔ مقرر خمیر نمود باد۔ اینجانب غیبت خدمت اخوی را بر حکم المرء مع من احب خصوصاً تصور میکند۔ و نیت صادق موجب ثواب عمل است خدا تبارک تعالیٰ بمراد و منتہی دل رساند،،

دعوة الغائب اسرع الاجابة .. بذکر حق مشغول باشید۔ کما قال اللہ تعالیٰ فاذکرونی اذکرکم و برائے فتحیابی توفیق بر طافیاں بعد ہر فریضہ ایں کلمات دہ بار گویند اللّٰھم انا نستعین بک علی طاعتک و اوقات را بذکر و تدبیر و تفکر صمدی معمور دارند و در رجا و خوف باشند۔ تا بہ مقصود دینی و دنیاوی برسند و از حضرت عزت خواستہ شدہ است نواختہ سمع حضرت قطبیہ مرشدیہ ہمت تاباں باشد بمنہ و احسان کرمہ۔ دیگر چنانچہ حضرت قطب اقطاب عالم قدس اللہ روحہ واوصل الغایۃ (فتوحۃ) .. .. سید السادات سعد الملۃ والدین سکندر مسعود حسینی مفوض گردانیدہ .. .. و ہماجا باشد .. .. .. باد شیخ مرشد با تو است و نیز ما با تو ایم درحق دوستاں و مخالفاں حکم بیش ازاں .. .. فرمودہ اند۔ و بقلم کریم مثالہا عطا کردہ اند معمول اند دیگر بیش از مکتوب معلوم .. .. اقوی باخیلیانہ استقامت و وظیفہ تعین ندارد۔ دریں وقت محبان خاندان بسیار اند خود با اصحاب دیوان حماہ اللہ تعالیٰ ملاقات خواہد کرد۔ برحسب مشاہدہ معائنہ خواہد شد از جہت ملاقات اہتمام کلی بہ نشستہ بودند۔ مبارک باشد غنیمت است زود بیائید (آمدنت) ہمہ کارہا برسد بہ مطلوب خواہد رسید۔ و آنکہ از جہت فسدہ مقدم قلعہ گرنار مع .. .. .. از قصبہ منگلور مسطور بود مقدم مذکور مقہور است عن قریب الایام بہ سزا خود خواہد پیوست۔ مقر ضمیر الوزباد۔ (بہ ترک درویشانہ .. .. .. ارسال نداشت) بر کار بند و موقوف ندارد و اولیا رفعت مسرور و اعدا و دولت مقہور۔ و ہیچ تفکر را بخود راہ نہ دہند کہ راہ سوئے دوست ہر آئینہ ابد الست باید کہ غیبت را حضور دانند مراسلات شریف جاری دارند المکتوب نصف المشاہدہ" فرزندان ہر یک و حضار مجلس ہمہ بدعا مخصوص اند۔ و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین ط

ترجمہ عرض داشت سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

بندہ خاندان نبوی رکن الدین آدم بن سید سکندر حسینی جو پروردہ اور تعلیم یافتہ بندگی کی لڑی (ہار) میں پرو دیا ہوا سر چشمہ پرہیزگاران برگزیدہ لوگوں کے چراغ فقیروں کے آفتاب طالبان حق کے مرشد محققوں کی دلیل آخری مجتہد شرا و ل کے۔ سردار سخاوت اور بزرگیوں کے سرچشمہ شیخ جلال الحق والدین (جلال الدین جہانیاں جہانگشت) کا ہے اور ابتدا عمر سے اسوقت تک باپ دادوں سے خالق و مخلوق کی طرف سے غلامی اور عقیدت کا طوق اپنی گردن میں رکھتا ہے۔ اے خدا اس کو زیادہ کر اور کم نہ ہونے دے غلاموں میں سب سے کم درجہ کا آدمی بلکہ قدموں کی خاک بندگی کی جگہ میں وعدہ کی شرط کو پورا کرتا ہوا عرض کرتا ہے کہ ایک عرصہ ہوا پے در پے رات اور دن آئے سال اور مہینے گذرے کہ ملاقات کا خیال اور دونوں کے

شاہ اور شاہزادہ کے روشن چہرہ کے دیدار کا آرزومند ہوں ۔ جو دونوں جہان کے حسینوں میں مثل بدر کے ہے ۔ مشائخ کا قطب نیکوں میں بہتر ۔ خدا کے منتخب ۔ آیۃ الذین لاخوف علیہم انکے پیش نظر سیدوں کے سردار علم عبادت کے سرچشمہ ساداتوں کے مفخر صاحبان شریعت و طریقت کی دلیل بڑے اور بزرگ شیخ پیشوا باعزت شیخ محمد مشہور بہ "میاں منجھلا" اللہ انکی بزرگیوں کے جھنڈے کو آسمان کے قبہ پر ہمیشہ قائم رکھے اور انکے کمالات کے نشانیوں کو آسمان کی طرف ہمیشہ ظاہر رکھے بندہ عاشق دیدار آقا کے مبارک چہرہ کے مشاہدہ کا امیدوار ہوا ہے لالہ کی طرح رخ کو خون دل سے ترکرتا ہے اور نیلوفر کی طرح آنکھوں کے پانی میں غوطہ مارتا ہے اور ہمیشہ اور ہر وقت عاجزی کے ساتھ خدائے برتر سے یہ بندہ سوال کرتا رہتا ہے کہ اے جہان کے پروردگار! اپنے کمال مہربانی اور احسان سے بہتر طریقہ پر کریم الاخلاق بادشاہ کے ملاقات کی نعمت عطا فرما۔

قدمبوسی کے بے انتہا اشتیاق کی بابت اگر میں ایک حرف بھی لکھوں تو بوجہ غلبہ شوق قلم اسکے بیان سے عاجز رہ جائے قسم ہے اللہ کی عزت اور اسکے جلال کی کہ اپنی عمر گنا ہوں میں بسر کی اور کر رہا ہوں چاہتا ہوں کہ کسی طرح قدمبوسی اور آستانہ بوسی سے عزت حاصل کروں اور دنیا کو دیکھنے والی آنکھ میں آستانہ کی خاک کا سرمہ لگاؤں اور غلامی کی شرائط ادا کروں ۔ انھیں آرزوؤں میں میری عمر گذر رہی ہے ۔ اس بے وفا دنیا کی زندگی پر کیا بھروسہ؟ مجھے خوف ہے کہ شاید مہلت نہ مل سکے اور تمنائے مذکور میں بندہ بارہا اس سبب سے پیچ تاب کھاتا رہتا ہے اور دل سے ارادہ کرتا ہے اور بہت اہتمام رکھتا ہے کہ لاکھوں آرزوؤں کے ساتھ غلاموں کے حلقہ میں باریاب پائے لیکن مطابق اس مثل کے "کہ پانی کی قید لوہے کی قید سے زیادہ سخت ہے" یہ آرزو بر نہیں آتی بندہ کچھ تدبیر کرتا ہے اور خدا کچھ اور انتظام کرتا ہے جس وقت خدا کی عنایت اور ہمیشگی کی سعادت ہوگی اور میرا نصیب مدد کریگا تو دونوں جہان کے شاہزادہ اپنے پاس آنکی اجازت دینگے ۔ طالب مطلوب کے پاس پہونچے گا اور جو نصیب میں ہوگا ملیگا ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپکے پاس اڑکر جاؤں مگر کیا کروں کہ پر نہیں ہے ۔ بارہا دل میں آیا کہ حضرت شاہزادہ کے پاس اپنی حاجتمندی اور بے نوائی کا عریضہ (خط) لکھوں لیکن خیالات وقت پر مزاحم ہوئے اور عقل عاجزی کا اقرار کرنے لگی چونکہ "اولیاء تحت قبائی لایعرفہم غیری" (میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں انکو میرے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا) کا حکم ہو چکا ہے تو پھر بندہ کس زبان سے تقریر کو گمان میں لاوے اور کیا لکھے ۔ لیکن مدد چاہنے کا خیال باطن میں آیا ۔ پیران دین کے آگے یقین رکھنے والے مریدوں نے اپنا حال کھولا ہے ۔ باوجود ان باتوں کے علم کے میں نے شوخی کی ہے اور بے ادبی سے کام لیکر عریضہ (خط) پیش کیا ہے اور باوجودیکہ میں اپنے آپ کو کسی لائق نہیں سمجھتا اور نہ نظر مبارک مجھ پر کبھی پڑی پھر بھی میں نے اپنے آپ کو تعریف کرنے والوں کی جماعت میں شامل کر لیا ۔

اور شاہزادہ غریب پرور کے دربار میں حاضر ہوگیا کیا کروں کہ مصیبت کا مارا ہوں اور مصیبت کے دریا میں غوطہ کھا رہا ہوں جیسا کہ ظاہر ہے اگر حقیقت حال کا اظہار کروں تو بات طویل ہو جائیگی اور خدا کی شکایت سمجھی جائیگی بندہ جنگلوں میں بھٹکنے والے کی طرح دن گذار رہا ہے۔ قصبہ منگلور کا قیام سید سکندر مرحوم نے قطب اقطاب عالم (جلال الدین جہانیاں جہانگشت) کے حکم پر اختیار کیا ہے اور اگرچہ حضرت قطب اقطاب عالم بندگی مخدوم جہانیاں (پاک کرے اللہ انکی روح کو) نے قصبہ مذکور میں استخارہ اور اشارہ کے بعد علم اسلام خود نصب کیا ہے لیکن سید سکندر مسعود حسینی کو شہر سوڈھ میں نامزد کرکے قصبہ منگلور میں قیام کا حکم فرمایا اسوقت شہر مذکور میں ہر جگہ کفر تھا اور سید السادات مذکور نے حکم کے مطابق سرانجام دیا جب وہ وفات پاگئے تو والد مرحوم بھی حتی الامکان انکے نقش قدم پر چلتے رہے بعد وفات والد مرحوم کے یہ بندہ آستانہ کی خاک چھاننے والا لنگڑے اندھے اور کمزوروں کی طرح اپنی طاقت کے مطابق اس حدیث کی امید پر راہ طے کر رہا ہے کہ "جسنے کسی قوم کی مشابہت اختیار کرلی تو وہ انھیں میں سے شمار کیا جائیگا اگرچہ انکے جیسے اعمال اسکے نہوں" لیکن سید موصوف کے وقت میں دنیاوی مصیبتوں نے اسقدر وسعت اختیار نہ کی تھی آنجناب کے ذہن نشین رہے قلعہ گرنار کا حاکم اسلام کو کمزور کرنے میں کوشش کرتا ہے خصوصیت سے حضور کے کانوں تک یہ بات پہنچائی ہے۔ مدد کا وقت ہے قصبہ مذکور میں اب قیام مشکل ہوگیا ہے لیکن خدا کی مہربانی اور شاہزادہ معظم کی عنایت سے تمام کام آسانی سے حاصل ہو جائیگا اور دشمن ذلیل ہونگے۔

ترجمہ خط حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد پیش کرنے دعائے زیادتی عمر اور حل مشکلات اور ترقی درجات اور بلندی مقامات پوتے حضرت مجمع سید السادات کے جوسر چشمہ . . . تعالی طٰہٰ و یٰسین کی اولاد سید المرسلین کے بیٹے سید رکن الدولہ والدین (رکن الدین مشہور بہ راجو ہیں مہربان خدا کی مدد ہمیشہ آپکے ساتھ رہے (یہ بندہ) ظاہر کرتا ہے کہ پسندیدہ خط میرے بھائی کا (خدا انکی نیک بختی کو ہمیشہ قائم رکھے) اس خلوص رکھنے والے تک پایا جو کمال اعتقاد پر مبنی اور زیادتی اتحاد کا ظاہر کرنے والا اور غلبہ سلام و اشتیاق کو بتانے والا تھا آپکی ذات کی صحت کی خبر سے بیحد خوشی اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ روشن دل کو معلوم ہو . . . بندہ اپنے بھائی کی غیر حاضری کو خصوصیت سے "المرء مع من احب" (آدمی جسکو پسند کرتا ہے اسی کے ساتھ ہے) کے موافق خیال کرتا ہے۔ اور سچی نیت عمل کے ثواب کا باعث ہے۔ خدا یہ

اپنے مقصد دلی تک پہونچائے (غائب کی دعا جلد قبول ہوتی ہے) آپ خدا کی یاد میں مشغول رہیں جیسا کہ خدا خود فرماتا ہے کہ مجھکو یاد کرو میں بھی تم کو یاد کرونگا۔ اور سرکشوں پر فتح کی توفیق پانے کے لئے بعد ہر فریضہ نماز کے اس کلمہ کو دس بار پڑھیں اللّٰھم الخ (اے میرے خدا میں تجھ سے تیری فرماں برداری کے ذریعہ مدد طلب کرتا ہوں) اور اپنے اوقات کو ذکر۔ فکر اور خدا کے دھیان میں مصروف رکھیں اور امید وبیم کی حالت میں رہیں تاکہ دینی و دنیاوی مقصود تک آپ پہونچ جائیں اور خدا سے یہ بات چاہی گئی ہے۔ حضرت قطبیہ مرشدیہ (حضرت مرشد قطب اقطاب کے کانوں تک پہونچی ہوئی ہے۔ اسکے احسان اور کرم کے سر پر ہمت بلند رکھو۔

امر دوم یہ کہ حضرت قطب اقطاب عالم نے (پاک کرے اللہ انکی روح کو اور ہم تک اُن کی خوشی کو پہونچائے) سید السادات سعد الملۃ والدین سکندر حسینی کو سپرد کیا تھا ۔ .. .. شیخ مرشد تمہارے ساتھ ہے اور ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ دوست اور دشمن کے بارے میں حکم انھیں سے ہے جیسا کہ فرمایا ہے اور سخی قلم سے بارہا عطا کرنے کی مثال اپنا معمول بنایا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خط سے پہلے معلوم ہوا کہ میرا بھائی مع خاندان کے مستقل وظیفہ معین نہیں رکھتا بندہ خود دیوان والوں سے (اللہ ان کو محفوظ رکھے) ملاقات کریگا۔ ملاقات کے موقعہ پر ظاہر ہوگا۔ ملاقات کے لئے پورے بندوبست کے متعلق آپ نے لکھا ہے۔ آنا مبارک ہو۔ غنیمت ہے جلد آیئے آپکے آنے سے تمام کام حسب خواہش انجام پا جائینگے اور جو کچھ مقدم قلعہ گرنار کے فساد کے متعلق .. .. .. قصبہ منگلور سے لکھا تھا۔ تو مقدم مذکور پر غضب نازل ہوچکا ہے جلد اپنی سزا کو پہونچے گا آپکے روشن دل کو معلوم ہو .. .. .. بلند پایہ احباب خوش ہونگے۔ اور سلطنت کے دشمنوں پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔ آپ کسی قسم کا تردد نہ کریں کہ دوست کی طرف کا راستہ بے شک بدل کا ہے۔ چاہیئے کہ غیر حاضر کو حاضر جانیں۔ اور خط و کتابت جاری رکھیں کیونکہ خط بھی آدھی ملاقات ہے آپکے ہر ایک لڑکے اور حاضرین مجلس میں سے ہر شخص دعا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اللہ کی رحمت سب سے بہتر مخلوق حضرت محمد اور انکی تمام اولاد پر ہوجیو۔

اس مضمون کے بعض حصہ پر مولنا مولوی سید محمد حسن صاحب کے اعتراضات ہیں۔ رسالہ زبان بابت جوزجوردی خاص نمبر صفحہ ۱۵ ملاحظہ فرمائیں

عربوں کے علوم

(از جناب حافظ سید مظہر احمد صاحب ادیبی بھوپالی)

زمانۂ جاہلیت | زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے جملہ علوم کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ جو سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ مگر عام طور سے اُن کو حوالۂ قلم کرنیکے معتاد نہ تھے۔ جزیرۃ العرب میں اتنے قدیم زمانہ سے حروف کا استعمال چلا آرہا ہے (جسکی مجمل تاریخ انشاء اللہ آئندہ پیش کرینگے) کہ اوسکی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا ایک اہم ترین کام ہے۔ عرب اپنے علوم ذاتیہ کو نہ کتابی شکل میں جمع کرتے تھے اور نہ اسکو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن مقابر کے کتبہ اس کو یقین کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ وہ حروف کا استعمال دیر یا یادگاروں میں کرتے تھے۔ لیکن اِن نوشتوں کے علاوہ جو کچھ بھی تھا نوک زباں تھا کہ بچے اپنے باپوں سے سیکھتے اور متقدمین اپنی متاخرین کو تکرار روایت تابع سمع اور دلوں کی جانچ اور پرکھ سے سکھلایا کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عربوں کے وہ علوم جن میں اُنکو خاص دلچسپی تھی (۱) شعر (۲) خطابت (۳) انساب اور (۴) قیافہ تھے۔

علم قیافہ میں انکو وہ ید طولا تھا کہ آدمی کی ہیئت شکل رنگ اور بات چیت سے اوسکے اخلاق عادات اور صفات کا فوری پتہ لگا لیتے اور جس نتیجہ پر وہ پہنچتے شاید ہی خطا کرتا ہو۔ جس سے اُنکے ذہن کی رسائی اور تیزیٔ فکر کا پتہ چلتا ہے۔

(۵) تاریخ عربوں کا خاص فن تھا جس سے انکی طبیعت کو گہرا لگاؤ تھا جو نئی حوادث انکے ملک میں رونما ہوتے تو وہ اُن کو کبھی بطور اخبار متفرقہ بیان کرتے اور کبھی اُن کو یاد کرتے اور یاد کراتے۔ اسیطرح جن دوسری اقوام سے اُن کو ملنے کا اتفاق ہوتا اُن کے ممالک کے واقعات قدیمہ وجدیدہ کو سنتے اور یاد کر لیتے۔ کیونکہ اُنکا خیال تھا کہ واقعات عالم مثل ایک رہٹ کے ہیں کہ وہی ڈولچیاں اپنے چکر میں اوپر سے نیچے جاتی اور پانی کو باہر پھینکتی ہیں۔ جب ایک ہی نوعیت کے اسباب پیدا ہوں گے تو اُن سے وہی واقعات رونما ہو جائینگے جو ایک بار ہو چکے ہیں۔ اِس لئے خود کو اور ملک کو آئندہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے تاریخ کا جاننا نہایت اہم ترین شے ہے۔

یہی عربوں کا وہ نظریہ ہے جو آگے چلکر فلسفہ تاریخ بنجاتا ہے جسکی بنیاد ابن خلدون نے ڈالی اور رفتہ رفتہ بمصداق "ہر کہ آمد برآں مزید کرد" یورپ میں فلسفۂ تاریخ ایک جداگانہ ہی علم ہو گیا ہے۔

جواب

عکس تحریر۔ حضرت شاہ عالم صاحب

قدس اللہ سرہ العزیز

عکس تحریر۔ حضرت سید رکن الدین صاحب

عرف سید راجو ۔ رح۔

(۶) علم ہیئت - چونکہ عربوں کو ریگستان میں جہاں راستہ کا پتہ لگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ طول طویل سفر کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ ابتدا ہی میں اس پر مجبور تھے - کہ ستاروں کی مدد سے اپنے راستوں کا پتہ لگائیں انکے سہارے دور دراز سفروں کو طے کریں۔ اسلئے بروج اور منازل شمس میں وہ مرتبہ اور دست قدرت ہوگئی کہ ایک قوم بھی اُنکے لگے کی نہ تھی۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ عرب کو علوم ہیئت اور اجرام فلکی سے کیا نسبت - لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے کیونکہ جب ایک عرب کو تاروں بھری رات میں سفر کرنیکا اتفاق ہوا اور اوس نے بعض ستاروں کو خاص خاص مقام پر طلوع و غروب ہوتے دیکھا۔ تو اونکی مدد سے اس نے راستہ آسانی اور صحت کے ساتھ دریافت کرلیا۔ چونکہ انکا دن رات سفر ہی میں گذرتا تھا۔ اسلئے بلا علم گردش اجرام فلکی ایک لمحہ بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ اور عرب کے لق و دق میدانوں میں سے گذرجانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسلئے ضرورت نے اس پر مجبور کیا کہ وہ فلکی منازل شمس و قمر اور مواقع نجوم کو اپنی پڑوسی کلدانیوں سے جنہوں نے دنیا میں سب سے پہلے رصدگاہ قایم کرکے بروج کے علامات اور نشانات قائم کئے تھے اور موجودہ تقسیم اوقات بھی ان ہی کی یادگار ہے۔

(۷) طب بالتجربہ۔ اس علم میں عربوں کو کافی حصہ ملا تھا۔ یہ مختلف جڑی بوٹیوں اور بسیط اجزا کا بار بار تجربہ کرتے اور جب اپنے تجربات کو صحیح پاتے تو انہی کی مدد سے علاج کرتے۔ بیماریوں میں پچھنے لگاتے اور بعض ناقابل علاج امراض میں آخری دوا داغ کو خیال کرتے اور کام میں بھی لاتے تھے۔

ان تمام علوم کو ایک عرب اپنے صفحات دل پر یادداشت اور رسائی فکر کی قلم دوات سے اسطرح لکھتا کہ مٹائے نہ مٹتا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ عرب نے اپنے ہاتھ میں کس وقت قلم کو سنبھالا۔ ان کے تمام علوم۔ ادب زبان اور دفتر کا مخزن اشعار ہیں کیونکہ جب کوئی عرب کھڑے ہوکر ندوۃ الحی میں اشعار پڑھتا تو اوسکی قوت گویائی اُسکے علوم مخفیہ کا پردہ اُلٹ دیتی۔ اسکے دلی راز اُسکے افکار میں جھلک دکھلاجاتے۔ نطق انکے ودائع دلی کو ظاہر کردیتا با اینہمہ عرب لوازم مدنیت و حضارت سے بہت دور تھا۔ لیکن جب اُن کا کوئی فرد علوم متمدنہ سے باخبر ہوجاتا تھا تو وہ اپنی ذکا طبع کی بدولت بڑی بڑی اقوام کے سربرآوردہ ہستیوں سے گوئے سبقت لیجاتا تھا۔

زمانہ ابتدائے اسلام | بازار عکاظ کی بدولت مختلف قبائل عرب کی زبانیں ایک ہی معیار پر آگئیں جس نے زبان کے شیرازہ کو منتشر نہونے دیا۔ اس ادبی بازار نے ان کو ایک ہی اسلوب اور لغۃ مسلمہ کے استعمال پر مجبور کرکے مختلف قبائل کی زبانوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کردیا۔

اسوقت لغتہ قریش اور زبان حمیری مسلمہ زبانیں تھیں۔ لیکن جب آفتاب ہدایت واسلام عرب کے افق پر چمکا اور قرآن لغتہ قریش میں نازل ہوا تو اوسکو زبان حمیر پر تفوق حاصل ہوگیا اور دوسرے قبائل کی زبانوں کا ذکر ہی فضول ہے۔ تمام خطباء، شعراء اور متکلمین نے لغتہ قریش کے سامنے گردن تسلیم وطاعت خم کر دی اور اس وقت سے آج تک یہی زبان تمام عربی مکاتبات نثر و نظم میں رائج ہے۔

ابتدا اسلام میں قریش ہی بلاغت کے مالک تھے۔ اور یہ ہی اسالیب کلام میں تصرف کرتے تھے لیکن جب قوم کے سامنے قرآن مجید آیا اور اس نے بلاغت قرآنی اور اسکے بدیع اسالیب کو کہیں بڑھ چڑھ کر پایا تو اُس کی ساری بلاغت اور قوت لسانی ماند ہو گئی۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ قرآن کریم کی وجہ سے زبان میں وسعت اور زیب و زینت پیدا ہو گئی۔ کیونکہ قرآنی تراکیب نہایت محکم تھیں اور بیان نہایت واضح۔ اور باعتبار ترتیب و بلاغت کے انتہائی درجۂ کمال پر تھا۔ ان تراکیب اور ان اسالیب سے زبان اور بھی چمک اٹھی۔

عربی کی سب سے پہلی کتاب وہ کتاب جس سے عرب سب سے پہلے روشناس ہوئے قرآن حکیم ہے۔ یہ منشیوں اور شعراء کے لئے راہبر ہے اور جب انکو کسی قسم کی ادبی مشکل پیش آتی تو وہ قرآن کی طرف رجوع کرتے اور قرآن کی عبارت کو مثال میں لاتے کیونکہ قرآن کی ترتیب و نظم الفاظ عربوں کے مالوف ترتیب سے زیادہ بین اور بالاتر ہے۔ یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ قرآن آداب کا مصدر اور حکمت و دانش کا سرچشمہ ہے اور اخلاق کریمہ کا معدن۔ انسانی طبائع کی کجی کو سیدھا کرنیوالا تہذیب و تمدن کی روح پھونکنے والا ہے۔ لیکن ہمارے بعض دوستوں کا یہ جبری فیصلہ کہ قرآن تمدنی اور معاشرتی ترقیات میں مانع ہے۔ آفتاب پر دھول ڈالنا اور ایک وہمی و فرضی بات ہے اور اسلام پر صریح غلط الزام۔ کیونکہ قرآن حکیم میں ایسی ہزارہا آیات موجود ہیں جو علوم دنیوی کی تعلیم کی ترغیب دیتی اور انکے دریافت کرنے پر آمادہ کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں ارکان تمدن اور اسباب حضریت زیادہ قوی نہ تھے اور اسوقت قوم وملت کو انکی چنداں ضرورت بھی نہ تھی اس وجہ سے لوگ اسطرف متوجہ نہیں ہوئے۔ لیکن جب مصالح ملکی سے فرصت ہوئی اور تمدنی ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی تو مسلمان نہایت زور وشور کے ساتھ اس میں مصروف ہوئے اور جس سرعت کے ساتھ انھوں نے ترقی کی ہے اوس سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں۔

میں یہ بلاخوف تردید عرض کرونگا کہ اگر قرآن نہ ہوتو عربی زبان میں وہ فصاحت وبلاغت ہرگز نہ پیدا ہوتی جسپر آج اس زبان کو ناز ہے وہ ہرگز ایک ہی اسلوب پر قایم نہ رہتی بلکہ جس طرح قبل از اسلام بدلتی رہی تھی اسیطرح پھر بدلتی یہانتک کہ آج قدیم اسالیب و زبان کا اثر بھی باقی نہ رہتا جبکہ اور زبانوں کے تغیرات شاہد ہیں۔

ابتدائے اسلام کی تدوین اور کتابت | یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب پر امیت اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ ظہور اسلام کے ساتھ ساتھ کتابت کی اشاعت ہوئی اور وحی کی تدوین کی وجہ سے اور اُن خطوط کے سبب سے جنکو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہوں اور امراء کے پاس تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا کرتے تھے عرب میں منشیوں اور کاتبوں کی بہتات ہوئی۔ اس وقت تک عرب علوم کو کتب میں تدوین کرنے کو معیوب خیال کرتے اور کتابی شکل میں مضامین علمیہ کو لانے سے اعراض کرتے تھے۔ وہ صرف اپنی قوتِ حافظہ اور اپنی یادداشت کے صحائف پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے۔

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے خاص علوم قرآن۔ تفسیر اور روایت حدیث رصلی اللہ علیہ وسلم تک محدود تھے تمام قوم ان علوم کو صحابہ اور تابعین سے بوجہ قربت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم زبانی سیکھتے اور یاد کر لیتے تھے۔ کیونکہ انکا خیال تھا کہ اگر وہ سیکھیں گے تو نوشتہ پر اعتماد رہیگا اور کوئی بھی حفظ کرنے کی طرف مائل نہ ہوگا۔ اور اُنکا اُسکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ نوشتوں میں تحریف کی جا سکتی ہے۔ اور جب سینوں میں محفوظ رہینگے تو مخالف اقوام کی دست برد سے بچ سکیں گے۔ اور احکام کچھ سے کچھ ہو جائینگے۔

رسول اکرم نے جنگ بدر کے قیدیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جو اپنا فدیہ نہ دیسکے وہ مسلمان بچوں کو کتابت کی تعلیم دے یہی وہ تاوانِ جنگ ہے جو ادس پر عائد کیا جاتا ہے گویا قومی عام تعلیم کا سنگِ بنیاد دنیا میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ نے رکھا۔

حضرت عمر بن الخطاب کے عہد خلافت سے قبل خراج کے رجسٹر عربی زبان میں نہ تھے بلکہ دوسری زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔ آپ نے عربی زبان کو دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا کہ جملہ حساب وکتاب عربی ہی میں لکھے جایا کریں۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اِس عصرِ منیر میں تمام ملک و ملت میں کتابت کی اشاعت ہوئی۔ اور علم کے سرچشمے بہہ نکلے۔

میر انیس

اور

عون و محمد کا کردار

(از جناب محمد عبد القادر صاحب سروری)

عون اور محمد حضرت زینب بنت علی کے بیٹے اور امام حسین علیہ السلام کے بھانجے ہیں۔ جسوقت امام گھر سے کوفے کو چلے ہیں، یہ دونوں کمسن تھے میدان کربلا میں انھوں نے اپنی شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اور ستم کی فوج کے ہاتھ جام شہادت نوش کیا۔

"حضرت زینب[۵] کے یہ دونوں لڑکے درحقیقت افسانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکے متعلق تواریخ میں کچھ پتہ نہیں چلتا اور ان کی پیدائش مرثیہ میں میر انیس کی قوت تخلیق کی ممنون منت ہے۔ انیس نے جہاں کربلا کے ایک واقعہ کو پھیلا کر ایک پورا قصہ بنانے کی کوشش کی ہے وہیں بہت سے موقعوں کو کامیاب بنانے کے لئے اونھوں نے نئے اشخاص قصہ میں بھی پیدا کئے ہیں جنمیں سب سے زیادہ نمایاں اور مہتم بالشان عون اور محمد ہیں جنکے حالات مختلف مقامات میں مختلف مرثیوں میں ملتے ہیں اکثر اونکا ذکر ضمنی آیا ہے۔ لیکن میر انیس نے انکے متعلق مستقل مرثیے بھی تحریر کئے ہیں جنمیں انکے اپنی مادر مہربان سے رخصت ہونے، امام سے اجازت لیکر جنگ میں جانے، اور دشمنوں کی فوج سے لڑکر جوہر شجاعت دکھاتے ہوئے یزیدیوں کے ہاتھوں سے شہید ہونیکا ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ امر قابل یاد داشت ہے کہ انیس کے مرثیوں کی تکمیل ایک قصہ کی شکل میں کبھی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اپنے مطمح نظر یعنی امام کے یزید کی فوج سے دشت کربلا میں جنگ کرنے اور جام شہادت نوش فرمانے کے واقعہ کو دلچسپ ڈراما بنانے کی غرض سے اس واقعہ سے پہلے اور بعد کے بہت سے حالات بیان کئے ہیں تاکہ سامعین پر اثر کا تسلسل ہو اور یہ اونکو اس منتہا تک رہبری کرے جہاں پہونچکر اونکے قصہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن قصہ نگار کا یہ فرض بھی

---

[۵] موازنۂ انیس و دبیر ص۶۲

ہے کہ وہ منتہا تک پہونچا کر قصہ کو ختم نہ کر دے بلکہ اسکو آخر تک لیجا کر اسکے نتائج بھی نمایاں کرے تاکہ سامعین مجلس سے ایک اختتامی احساس کے ساتھ اٹھیں۔

مندرجہ بالا اسباب ایسے تھے کہ شاعر کو انفرادی حیثیت سے اشخاص قصہ کی طرف توجہ کرنیکا بہت کم موقعہ مل سکتا تھا، بجز اسکے کہ وہ کسی خاص شخص قصہ کی تصویر مرکزی واقعات سے متعلق پیش کر رہا ہو۔ جب شاعر کو انفرادی اشخاص قصہ پر توجہ کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا تو اسکو اس امر کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کردار نگاری کے ان تمام اصولوں کی پابندی کرتا جو ایک شخص قصہ کی کردار کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ مرثیہ میں انیس کو مرکزی اشخاص قصہ کی طرف سے توجہ ہٹانے کی مہلت ہی نہیں تھی تاہم ضمنی طور پر انھوں نے مخصوص اشخاص قصہ کی سیرت کے متعلق جو نقوش کہیں کہیں چھوڑے ہیں وہ بیحد قابل قدر ہیں۔ اور ان سے اشخاص قصہ کی سیرت پر ایک بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ لیکن انکے کردار میں تدریجی ارتقا کی توقع رکھنا محض فضول ہے۔ کیونکہ تدریجی ارتقا کا دکھانا، موضوع کی نوعیت کی لحاظ سے، شاعر کے لئے ناممکن تھا۔ یہاں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ میر انیس مرثیہ لکھ رہے تھے نہ کہ قصہ، اور وضروری وقت انکے قابو میں تھا وہ امام کے گھر سے نکلنے سے لیکر، دشت کربلا میں کوفیوں کے خنجر بیداد سے شہادت کبریٰ حاصل کرنے تک تھا۔ جو زیادہ سے زیادہ چند ماہ ہو سکتا ہے اس عرصہ میں کوئی کیونکر کسی کردار کو، مکمل پیش کر سکتا ہے اگر میر انیس ایسا کرتے بھی تو یہ ایک غلطی ہوتی اسمیں شک نہیں کہ میر انیس نے آنحضرت اور حضرت فاطمہ زہرا کے وقت سے لیکر، اہل بیت نبی کے یزید کے دربار، بلکہ مدینہ واپس ہونے تک کے بھی واقعات بیان کئے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے یہ محض تمہید (Exposition) اور خاتمہ (Downfall) تھا جسکی بذات خود کوئی اہمیت نہیں۔

مذکورہ بالا طویل بحث کا مقصد صرف اسقدر تھا کہ یہ بتلایا جائے کہ عون اور محمد دونوں کے کردار میں تدریجی ارتقا کا ڈھونڈھنا فضول ہے۔ انکے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس سے انکی کرداری خصوصیات، طرز روش، اور رجحانات کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

عون اور محمد کا تعلق ایک ایسے برگزیدہ خاندان سے تھا جن میں ایک طرف مذہبی تقدس کے سرچشمے اور دوسری طرف شجاعت اور بہادری کے خزانے ابل رہے تھے جعفر طیار انکے والد، علی حیدر کرار، خیبر شکن، انکے دادا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے مورث اعلیٰ تھے۔ لہذا ان میں بھی ایک طرف تو تقدس کی وجہ سے، ایک شان انقیاد، اور رضا و تسلیم پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف شجاعت اور دلیری رگوں اور پٹھوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پھر انکے عادات و

اطوار کے متعلق صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ انھوں نے حضرت زینب سی دلیر اور ضابطا اور خود دار والدہ محترمہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائی تھی۔

عون اور محمد اپنے بیمار باپ کو چھوڑ کر امام کے ساتھ کوفہ چلنے کو طیار ہو گئے حضرت عباس قاسم وغیرہ اپنے اپنے ہمجولیوں سے جدا ہوتے ہیں تو عون اور محمد بھی اپنے ہم سنوں کو وداع کر رہے ہیں اور ع

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہمسن	کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن	گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن

تم حضرت شبیر کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے ساتھیوں میں بڑے ہر دلعزیز اور محبوب تھے جنکے چھوڑنے پر وہ اظہار تاسف کرتے ہیں۔ عون و محمد کی وفاداری ملاحظہ ہو ع

ہم جولیوں سے کہتے ہیں وہ دونو برادر	ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر	ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر

وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

وہ شہ کی مشہور شیدا" (زینب) کے بیٹوں سے اسی قسم کی توقع تھی۔ کمسنوں میں اس قسم کا پاس نمک کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ مگر کیوں نہ ہو مادر مشفق کی تعلیم تھی۔

غرض عون اور محمد کوفے پہونچتے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

جب حضرت عباس اہل بیت اطہار کے لئے خیمے نصب کر رہے تھے۔ اُدھر سے یزید کی فوج اُمنڈنی شروع ہوتی ہے امام کے ساتھی بھی تیار ہو جاتے ہیں حضرت عباس کو علَم دئے جانے کی گن سن پا کر عون و محمد آپس میں مشورہ کرنے لگتے ہیں کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے۔ اسلئے علَم لینے کیلئے ہم ماموں سے کہیں۔ بڑے بھائی جو زیادہ ہوشیار ہیں روکتے ہیں کہ یہ موقع نہیں۔ خاموش رہو۔ ہمارا کام تو محض ماموں پر فدا ہونا ہے علاوہ اسکے اماں جان بھی سنینگی تو خفا ہونگی حالانکہ ماں اس تمام گن سن کو پس پردہ کھڑی سُن رہی تھیں۔ دونوں کو ڈانٹا اور حکم دیا کہ اگر عباس علم حاصل کریں تو فوراً انھیں تم تہنیت دو ورنہ ع

کہنے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال — کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال[۱]

پھر سمجھاتی ہیں کہ ؎

صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو — میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

۱؎ ہم نے جھگڑے کو میر وحید نے جس عمدگی سے نظم فرمایا ہے جی نہیں چاہتا کہ ہم اس موقع پر ناظرین زبان کو اس سے محروم رکھیں، اگرچہ پورا مرثیہ ع "پانے کیا حضرت زینب نے نایاب پسر" دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں "کردار نگاری" کا اعلیٰ نمونہ وحید صاحب نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ بہ لحاظ سلاست و روزمرہ وحید صاحب نے جس "بات چیت" کو نظم فرمایا ہے اور اس میں جو کامیابی انکو حاصل ہوئی ہے غالباً آجتک کسی مرثیہ گو کو یہ بات میسر نہیں آئی۔ یہاں ہم چند بند نمونۃً درج کرتے ہیں جس سے قارئین کو خود اندازہ ہوجائیگا کہ وحید کس پایہ کا شاعر تھا، اور اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو وہ آگے چلکر کیا سے کیا ہوجاتا۔" ایڈیٹر

۲۱؎ پاچکے جب علم فوج جناب عباس — آبدیدہ یہ گئے زینب ناشاد کے پاس

ماں نے گھبرا کے کہا خیر تو ہے کیوں ہو اداس — جوڑ کر ہاتھ یہ کی عرض کہ اے عرش اساس

چھوٹے ماموں کو علم شہ نے دیا خوب کیا

ہم کو تقدیر نے بخشوں میں محجوب کیا

۲۲؎ یوں تو ہر امر کے مالک ہیں امام آفاق — پر یہ صدمہ ہے کہ ہم پر نہیں اب وہ اشفاق

منہ دکھانا ہمیں کسطرح نہ دنیا میں ہو شاق — حیف کی جا ہے کہ تھا کچھ نہ ہمیں استحقاق

اپنے جد جعفر ذی رتبہ و ذیجاہ نہ تھے

آپ فرمائیں کہ نانا اسد اللہ نہ تھے

۲۳؎ غور سے دیکھ کے منھ حضرت زینب نے کہا — خوب یہ دل میں سمائی ہوئی ہے نام خدا

اس گھڑی بات وہ کی تم نے جو تھی نازیبا — مصلحت میں شہ والا کے تمھیں دخل ہے کیا

فوج چڑھ آئی ہے موقع نہیں دم لینے کا

وقت سر دینے کا یہ ہے کہ علم لینے کا

۲۴؎ نیک و بد جانتے ہو نام خدا ہوشیار — چاہیئے ہے کہ ہوں جراروں کے پوتے جرار

عہدہ پانے پہ قرابت کا نہیں دارومدار — پوتے جعفر کے ہو تو جنگ پہ رہیو تیار

جیتونیں دیکھ کے تھرائیں جواں لشکر کے

صفدری کے ہوں جولانے ہو اگر حیدر کے

۲۵؎ اوچھی باتوں پہ مہذب نہیں کرتے ہیں خیال — جانشیں وہ جو دکھائے اب و جد کے افعال

فخر کیا مل گیا ترکے میں اگر منصب و مال — یہ وراثت ہے کہ ہاتھ آئے بزرگوں کا کمال

وہی کردار وہی عزم وہی کام کرے

خلق میں اپنے بزرگوں کی طرح نام کرے

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قاسم و اکبر سے پہلے اگر رن میں جاؤ تو میں ماں اور تم بیٹے ورنہ دودھ نہ بخشوں گی۔ یہ سنکر دونوں سعادتمند خاموش ہو جاتے ہیں۔

سو، اتفاق سے جب جنگ شروع ہو جاتی ہے تو باوجود عون اور محمد کے بار بار اجازت طلب کرنے کے امام ان کو رن میں جانے نہیں دیتے یہانتک کہ تمام رفقائے امام شہید ہو جاتے ہیں۔ حضرت زینب نہایت بے چینی سے اصرار کر رہی ہیں کہ آخر یہ کب لڑنے کیلئے نکلینگے اور اپنا حق نمک۔ اور حق غلامی ادا کرینگے۔ آخر جب اجازت لیکر ماں سے رخصت ہونے آتے ہیں۔ تو ماں ان سے منھ پھیر لیتی ہیں۔ اور شکایت کرتی ہیں کہ میرے حکم کی متابعت کیوں نہیں ہوتی۔ سعادتمند لڑکے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کو اجازت نہیں ملی تھی۔ اسپر حضرت زینب نے وہ بہترین طعن آمیز شکایت کی جو ادب میں عدیم المثال ہے ؎

انصاف تو کیجئے مجھے کیونکر نہ گلا ہو ۔۔۔ وہ پہلے نہ بیدم ہوں، لہو جن میں ملا ہو

کھلتا نہیں کچھ، اور شجاعت انھیں کیا ہے ۔۔۔ حضرت تو سلامت ہیں، یہ عجلت انھیں کیا ہے

جب کوئی نہ ہووے گا تو یہ جنگ کریں گے ۔۔۔ کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

ماں کا غصہ دیکھکر لڑکے کانپ جاتے ہیں اور عذر کرتے ہیں کہ حضرت عباس مزاحم ہوئے تب اس زبردست سیرت کی مالک خاتون نے ایک جہاں دیدہ سپہ سالار کیطرح جو اپنے سپاہیوں کو نصیحت کرتا ہے۔ وہ تقریر کی جو اپنی آپ مثال ہے ؎

ہاں چاہئے منھ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو ۔۔۔ دو شیر ہو، مل کر عمر و شمر کو گھیرو

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے ۔۔۔ دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے

توقیر تمھاری ہو امیری ناموری ہو ۔۔۔ سر دونوں کا لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

ایسے تو نہیں جو مجھے محبوب کروگے میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

دونوں سرفروش بہادروں کے دل پر ماں کی طعن آمیز تقریر، سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کرتی ہے۔ ماموں جان پر فدا ہونیکے لئے تیار ہو کر خیمہ گاہ اہل بیتِ نبوی سے نکلتے ہیں۔ اور یزید کی فوج کا مقابلہ اس جانبازانہ دلیری کے ساتھ کرتے ہیں کہ مادرِ مشفق کے آخری جملے، ان کے کانوں میں صدا بنکر گونجتے رہتے ہیں۔ اسی حال میں زمین پر گرتے ہیں۔ اور ان کی پاک روحیں جسم سے علٰحدہ ہو کر "ناناجان کے پاس" چلی جاتی ہیں۔ مگر اپنے پیچھے ایک سرمدی نغمہ خود فروشی کا چھوڑ جاتے ہیں۔

یہاں وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جسکے لئے انیس نے انکی تخلیق کی تھی۔

انگلستان اور ہندوستان میں تعلیم کے طریقے

(از سید محمد یوسف قیصر مدیر رسالہ ظل السلطان بھوپال)

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کا طریقہ جو اس وقت رائج ہے وہ اُن تعلیمی خیالات پر مبنی ہے جو انگلستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں ایک نقص یہ ہے کہ انگلستان میں تو یہ طریقہ تعلیم اُس ملک کے موافق ہے لیکن ہندوستان میں یہ طریقہ غیر ملک سے آیا ہے اور اسلئے بالکل ایک اجنبی طریقہ ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو باتیں انگلستان میں تعلیمی طریقہ کی معمولی کوتاہیوں کے زمرہ میں شامل ہوتی ہیں وہ ہندوستان میں برائیوں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔

کئی سال ہوئے کہ نیویارک کے رسالہ ہیرپرس میگزین کے صفحات میں لارڈ ہیلڈین نے انگلستان کے تعلیمی طریقے کے نقائص اور اُس میں جن باتوں کی ضرورت ہے اُن کے متعلق لکھا تھا۔

ایک ہندوستانی شخص جو امریکہ میں رہتا ہے اُس نے ماڈرن ریویو میں ایک چھوٹا سا مضمون لارڈ موصوف کے خیالات کی بنا پر تعلیم کو متعلق لکھا ہے اُس مضمون میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ اشخاص مخاطب کئے گئے ہیں۔

لارڈ ہیلڈین صاحب کے خیالات کے بموجب انگلستان کے طریقہ تعلیم میں چار بڑے نقص ہیں اور مضمون نویس نے اُن چاروں نقص کے متعلق یہ امر ظاہر کیا ہے کہ اُن کا ہمارے طریقہ تعلیم پر کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے اول اور نہایت ہی بڑا نقص انگلستان کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ وہ غیر جمہوری ہے جیسا کہ لارڈ ہیلڈین کہتے ہیں کہ "انگلستان میں امراء اور غربا کے لڑکوں کے درمیان تعلیمی امور میں مساوات کا برتاؤ نہیں کیا جاتا علاوہ ازیں انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں یہ شک ابھی تک پھیلا ہوا ہے کہ تعلیم ایک خطرناک چیز ہے اور یہ کہ وہ آدمیوں میں پریشانی پھیلاتی ہے اور اُن میں خود مختاری یا تمرد کا مادہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔

دوسرا مہلک نقص یہ ہے کہ انگلستان میں امور سائنس کی کامل تحقیقات کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے اور تعلیم میں قوم کے کاروبار کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اس کے متعلق لارڈ ہیلڈین کہتے ہیں کہ۔

"دستکاری اور تجارتی امور کی قدر و منزلت کرنے اور اس کیلئے سامان بہم پہنچانے اور سائنس کی تعلیم اور

تحقیقات کرنے میں انگلستان جرمنی اور امریکہ سے ایک زمانہ نہیں بلکہ تین زمانے پیچھے ہے "

یہی نقائص اُس برائی کے باعث ہیں جس پر آج سنتے ہیں کہ اس قدر افسوس کیا جارہا ہے یعنی ضروری دستکاریاں انگلستان سے اُن کے رقیب اس واسطے چھین لیجاتے ہیں کہ وہ سائنس کے طریقوں کو کام میں لاتے ہیں۔

تیسرا نقص برطانیہ کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ وہاں کی رعایا کے لئے حقیقی قومی حیثیت کا کوئی تعلیمی طریقہ نہیں ہے لیکن اس ملک میں ہر ایک فرقہ کی علیحدہ علیحدہ بہت کثرت سے درسگاہیں ہیں۔ تعلیم میں جو فرقہ بندی کا خیال رکھنے سے نقص پیدا ہوتا ہے اُسکے متعلق لارڈ موصوف کہتے ہیں۔

" دنیا میں کوئی ایسا عجیب وغریب نظارہ نہیں ہے جیسا کہ پارلیمنٹ میں تعلیمی قانون کے مشورہ کی بحث کے وقت پیش نظر ہوتا ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جب کبھی تعلیمی قانون کا مسودہ پیش ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ تقریباً ایک لڑائی کا اکھاڑا بنجاتا ہے اور یہ لڑائی تعلیم کے ماہرین میں نہیں ہوتی ہے بلکہ مختلف مذہبی علما کے درمیان ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُسکے خاص فرقہ کا لحاظ رکھا جائے اور ہر ایک اس سوال کے ساتھ قومی لحاظ کا اسی طریقہ سے برتاؤ کرتا ہے یعنی اپنے فرقہ کو ہی کل قوم کے مانند خیال کرتا ہے "

چوتھا بڑا نقص انگلستان کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ تعلیم کے نتیجہ پر خیال نہیں کیا جاتا اسکے متعلق لارڈ موصوف کہتے ہیں " جب میں دار آفس (دفتر جنگ) میں تھا تو مجھکو یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ رنگروٹ جو بھرتی کئے جاتے ہیں اُن میں تیرہ فیصدی ایسے ہوتے ہیں کہ جو بالکل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اس کا کیا سبب ہے؟ اُن کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم ابتدائی مدارس میں ضرور دی گئی تھی لیکن جسوقت انھوں نے مدرسہ چھوڑا تو جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا اُس سب کو بھلا دیا کیونکہ اُن کو اس میں مزید دلچسپی باقی نہ رہی۔ مزید دلچسپی باقی نہ رہنے کا باعث یہ ہے کہ اُن کی آیندہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے ایسے مدارس نہیں ہیں جن میں وہ تعلیم پاسکیں اور نہ اُنکی آیندہ زندگی بسر کرنے کے لئے ایسا انتظام ہے کہ جس سے اُن میں یہ ترغیب پیدا ہو کہ وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھیں ہم کو انھیں پھر تعلیم دینی پڑتی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس قدر حماقت کا کام ہے کہ ابتدائی۔ اوسط درجہ، صنعتی یا یونیورسٹی کی تعلیم میں سے ہر ایک تعلیم کو علیحدہ علیحدہ خیال کر رکھا ہے اور ان کے متعلق علیحدہ علیحدہ ہی خیال کیا جاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ ایک کا خیال دوسرے کے ساتھ میں رکھا جائے۔

تعلیم کی یہ حالت ایسی خطرناک ہے کہ اس قدر خطرہ کسی بڑی یا بحری فوج کا نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ خطرہ جہالت

دماغی قوت کی کمزوری، خیال کرنے اور عمل کرنے کے ناکمل طریقوں کا ہے۔ جس سے ذہانت میں ترقی نہیں ہوسکتی اور اپنی رقیب طاقتوں کے مقابلہ میں ہر ایک کام کو سائنس کے طریقوں اور تحقیقاتوں سے کرتے ہیں۔ ہمارے طریقے بہت ہی لوئی درجہ کے ہیں۔

جرمنی کے کیمیادان پروفیسر حکام سائنس کے تجربوں کے کارخانوں اور جماعتوں کے کمروں میں اور دفتروں میں پوشیدہ طور سے کام کرتے رہتے ہیں جس سے وہ ہمارے مرتبہ کو دنیا کی قوموں میں شاید براہ راست کم لیکن ڈریڈناٹون کی بہ نسبت بہت زیادہ خوفناک طریقہ سے نقصان پہونچاتے ہیں۔ ہم کو جواب کام کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم کو اُن کا مقابلہ اُن کے کاموں کو اُنکے ملک میں ہی سیکھ کر کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو جفاکش اور مثل اُنکے قابل بنانا چاہیئے ایسا کرنے میں بلاشک بڑا روپیہ صرف ہوگا۔ لیکن ہر ایک پیسہ جو اس خرچ میں لگے گا وہ بجا طور پر صرف ہوگا اور کسی طور سے قابل اعتراض نہیں ہوسکتا

جو نازک وقت ہمارے سامنے ہے اور ہم اُس کو نازک وقت ہی سے تعبیر کرتے ہیں اُس کا انسداد اُسی صورت میں ہوسکے گا جب کہ ہم بھی اُنہی طریقوں کو کام میں لائیں جو جرمنی نے اپنی شکستہ حالت کی اصلاح کے لئے اختیار کیے تھے جبکہ ایک صدی پیشتر اوس کو نپولین نے نیچا دکھایا تھا پھر جرمنی کو کس نے بچایا؟ اُسکے بچانے والے ایسے اشخاص تھے جیسے رفش اور روان ہمبولڈٹ جنھوں نے جرمنی قوم سے استدعا کی کہ وہ تعلیم حاصل کریں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ نسبت دیگر چیزوں کے اونھوں نے تعلیم سے وہ برتری حاصل کی ہے جو اس وقت اُنکو ہے۔ اسی قسم کی استدعا اب ہم سے بھی کیجائے۔ ہم کو ابھی اس امر کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ تعلیم پر ہی ہماری آیندہ بہبودی کا انحصار ہے۔

لارڈ ہیلڈین کے مضمون مذکورہ بالا کا خلاصہ دیکر مضمون نویس لکھتا ہے کہ جو چار بڑے نقص انگلستان کے طریقہ تعلیم میں بتلائے گئے ہیں وہ ہی نقص ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔

(۱) غربا کے بچوں کو تعلیم پانے کا کوئی موقع نہیں ہے حتیٰ کہ ابتدائی تعلیم کا بھی۔

(۲) ہندوستان کی یونیورسٹیاں محض کلرک پیدا کر رہی ہیں اور عملی طور پر ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں تحقیقات کے کام کی کوئی سہولتیں نہیں رکھی گئی ہیں۔

(۳) فرقہ بندی بھی ہمارے طریقہ تعلیم میں ایک بڑا خطرہ پیدا ہوگئی ہے۔

جاپان نے بدھ مذہب والوں اور شنٹو مذہب والوں کے لئے علیحدہ علیحدہ یونیورسٹیاں قائم نہیں کیں اور نہ چین نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن معلوم نہیں کہ پھر ہم کیوں اس ناقص طریقہ کو اختیار کریں۔

(۴) اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں پر بھی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے مدارس نہیں ہیں اور نہ ہمارا موجودہ تعلیمی طریقہ ہماری قومی قابلیتوں کو ترقی دینے دیتا ہے۔

مضمون نویس اس کے علاج کے متعلق تحریر کرتا ہے کہ جو کچھ بڑے نازک وقت کے لئے علاج گریٹ برٹن کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ ہی طریقہ بالکل ہندوستان کے لوگوں کیلئے بھی کارآمد ہے۔

اگر انگلستان کے ایک سب سے بڑے مدبر کا یہ خیال ہے کہ انگلستان کو جرمنی اور امریکہ کے طریقہ تعلیم کی تقلید کرنی چاہیئے تو گیا پھر ہمارے لئے بھی یہ امر مناسب نہیں ہے کہ ہم بھی امریکہ جاکر وہاں کی تعلیم سے فیضیاب ہوں۔ جس سے ہماری قوت بطور ایک قوم کے مستحکم ہو۔ جرمنی جانے کا خیال تو ابھی کچھ زمانہ کے لئے دل سے نکالدینا چاہیئے۔

غزل

(جناب عرشی نعمانی رامپوری)

وہ بادۂ شبینہ میں لذت نہیں رہی
پہلی سی مجھکو خواہش شہرت نہیں رہی

اب انتظار وعدۂ شام و سحر کہاں
ہاں! ہاں! مجھے وہ پہلی سی الفت نہیں رہی

اظہار آرزو تو بڑی بات ہے یہاں
خود نفس آرزو کی بھی جرأت نہیں رہی

شاہ مجاز تیری حقیقت کے سامنے
واللہ میری کوئی حقیقت نہیں رہی

اک خستہ جاں پہ اتنے ستم ہائے روزگار
اُف! آمد نفس کی بھی مہلت نہیں رہی

میرا نہیں تو میری محبت کا پاس کر
ظالم تجھے کسی کی محبت نہیں رہی

(از حضرت خالد (بنگالی))

ملتے ہی نگاہوں کے حیا آگئی تمکو
لو آج محبت کی نظر پا گئی تمکو

پھر جلوہ طلب ہے رُخ روشن سے تمہارے
وہ طور کے پہلو سے صدا آگئی تمکو

یوں عرش کو چھو لینے کے قائل نہیں عشاق
جب جانیں اگر آہ رسا پا گئی تمکو

پھر حسن میں پہلی سی وہ تمکیں نہیں رہتی
کیا بات شب وصل بھی سمجھا گئی تمکو

وہ سبزہ پامال نہ خاکستر برباد
خالد سے کہو کس کی نظر کھا گئی تمکو

خاموشی

(جناب محمد حسن خاں صاحب متین حیدرآبادی)

تعریف:۔ خاموشی سے مراد وہ پسندیدہ خصلت ہے جو قوت ناطقہ کو بیہودہ باتوں سے باز رکھتی اور اُن عیوب کی پردہ پوش ہوتی ہے جو شرافت انسانی کے لئے ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس سے بسیار گوئی کی عادت بد زائل، اور کم گوئی کا ملکہ راسخ ہو جاتا ہے۔

ضرورت:۔ اگر کوئی شے علی التسلسل حرکت کرتی رہے اور اسکو سکون حاصل نہو تو ممکن ہے وہ شے بہت جلد ناکارہ ہو جائے۔ یہی حال گویائی و خموشی کا ہے، جب تک گویائی بحدّ اعتدال رہتی ہے تو وہ خموشی کہلاتی ہے۔ اور اگر اس میں افراط اور تفریط ہو تو دو حالتوں سے خالی نہیں: وہ یا تو بسیار گوئی ہے یا لب بستگی و بے زبانی۔

بسیار گوئی سے انسان کا دماغ نہ صرف مختل ہی ہوتا ہے بلکہ مالیخولیا اور ہذیان کی کیفیت طاری ہوتی ہے بزرجمہر کا حکیمانہ قول اس خیال کی تائید کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جو شخص بسیار گوئی پر زیادہ مائل ہوتا ہے یقین جانو کہ اس کو جنون ہو گیا ہے۔ کیونکہ "اَلْمِکْثَارُ مِهْذَارٌ" بسیار گوئی بیہودہ گوئی ہے اور بیہودہ گو فاتر العقل ہوتا ہے۔

لب بستگی سے انسان جوہر گویائی کھو بیٹھتا ہے۔ اس میں اور گونگوں میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا جسطرح گویائی انسان کے لئے ہنر ہے اسی طرح گونگا پن عیب ہے۔ گونگے کی عامۃ الناس کے نزدیک کوئی عزت نہیں۔ خاموشی اختیار کرنے والا انسان عاقل و متین اور معزز و مؤقر سمجھا جاتا ہے۔

فضیلت:۔ خاموشی موجب درازی حیات ہے اور اس کا اختیار کرنا باعث نجات۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "مَنْ سَكَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ فَقَدْ نَجَىٰ" یعنی جس شخص نے خاموشی اختیار کی وہ سلامت رہا۔ اور جو سلامت رہا اس نے نجات پائی۔ بخلاف اس کے بسیار گوئی سبب آفت ہے، اور اس کا التزام وجہ ذلت۔
مرزا صائب نے کیا خوب کہا ہے ؎

زباں زہر زدہ درائی بجاں رساند مرا   لب خموش بدار الاماں رساند مرا

اس میں شک نہیں کلام میں خوش بیانی کی حلاوت ضرور ہے۔ لیکن خموشی میں ایک ایسی لذت موجود ہے جو سالکان طریقت کے دل میں معرفت الہیہ کا چسکا پیدا کر دیتی ہے ؎ صائب۔

بخاموشی محیط معرفت کن جانِ گویا را　　بجان بے نفس چوں ماہیاں کن سیر دریا را

عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں نے عرض کی کہ آپ ہم کو ایسی نصیحت فرمائیے۔ جس سے ہم جنت میں داخل ہوں فرمایا کہ کہ مطلق بات نہ کرو۔ کہا یہ ہم سے ممکن نہیں۔ فرمایا "جس وقت کوئی کلمہ زبان سے نکالو، وہ کلمۃ الخیر ہو۔ بسیار گوئی دل کو تاریک کر دیتی ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ جنت کے طلبگار ہیں وہ ہرزہ درائی ترک کر دیں اور خاموشی اختیار کریں کیونکہ خاموشی دل کی تاریکی دور کر کے نورانیت بخشتی ہے۔ صائب کہتا ہے ؎

جنت دربستہ باشد مہر خاموشی ترا　　چہرہ زریں میکند چوں بہ نمد پوشی ترا

فوائد:۔ خموشی کے فوائد بیشمار ہیں۔ جن کا بیان حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اخلاق محسنی میں ملا حسین واعظ طاب ثراہ نے خموشی کے بیان میں ایک دلچسپ حکایت قلمبند کی ہے کہ" نوشیرواں کے دربار میں ایک دفعہ قیصر روم، خاقان چین، رائے ہند موجود تھے۔ نوشیرواں نے فرمایا کہ مدتوں کے بعد ایسے شاندار مجمع کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس موقع پر چاہئے کہ ہم میں سے ہر ایک کچھ تقریر کرے کیونکہ کلام الملوک ملوک الکلام (شاہوں کی باتیں سخن کا بادشاہ ہوتی ہیں) جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اس وقت افسوس کرنا پڑیگا۔ اور ہمارے اس اجتماع کی یادگار صفحہ روزگار پر باقی رہیگی ؎

دریں سرائے کہن خوئے کن بخوش سخنی　　کہ بہتر از سخن خوب یادگارے نیست

نوشیرواں نے جب یہ بات کہی، تو سب نے باظہارِ انکسار کہا کہ کلام کی ابتدا آپ ہی کی جانب سے ہو۔ نوشیرواں اس طرح دُرفشاں ہوا کہ مجھے آج تک ان باتوں سے جو میری زبان سے نہیں نکلیں۔ کبھی پشیمان نہ ہونا پڑا۔ البتہ جو باتیں زبان سے کہی گئیں۔ ان سے مجھے بیحد ندامت حاصل ہوئی! اسکے بعد قیصر روم نے اپنے زریں خیالات اس طرح ظاہر کئے کہ جن باتوں کو میں نے ابتک نہیں کہا ہے اُن کے کہنے پر قادر ہوں اور جن باتوں کو کہدیا ہے وہ میرے حد امکان سے باہر ہیں۔ یعنی وہ تیر سخن جو شست بیان سے ابھی نہیں نکلا۔ مجھے اس پر قدرت حاصل ہے۔ جس وقت چاہوں نشانہ پر لگا سکتا ہوں۔ لیکن جب وہ کمان تقریر سے نکل چکے تو اس کا لوٹانا ناممکن ہے"

خاقان چین نے اپنے مشک سخن سے مشام مجلس کو اس طرح معطر کیا کہ جو بات میں زبان سے نہ کہوں، وہ میری (بات) مغلوب ہے اور میں اس پر غالب ہوں، جو بات میں نے کہدی ہے میں اس (بات) کا مغلوب ہوں، وہ مجھ پر غالب ہے۔ اور زبردست پر غلبہ ناممکن۔ یعنی جب تک عروس سخن پردۂ فکر میں ہے۔ اسوقت تک مشاطۂ مشیت کو اختیار حاصل ہے۔ چاہے منصۂ نطق پر بٹھائے چاہے نقاب عدم اس کے چہرے پر ڈالدے۔ لیکن جب پردے

سے باہر نکل آئے۔ تو ممکن نہیں کہ وہ خلوت خانۂ مستوری میں دوبارہ جاسکے۔

رائے ہند نے اپنے گلہائے فصاحت سے اہل دربار کے دماغ اس طرح تازہ کئے کہ "ہر وہ کلمہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ یا تو درست ہوگا یا نادرست۔ اگر (کلمہ) درست ہے، تو قائل اس کا اس وقت تک ذمہ دار ہے۔ جب تک وہ اس سے بری الذمہ نہو۔ یا اگر وہ نادرست ہے تو کچھ فائدہ نہ دیگا۔ اسلئے ہر دو حال میں خاموشی اولیٰ ہے۔ قطعہ

بہ پیرے رسیدم ورا قصائے یونان بدو گفتم اے آنکہ باعقل و ہوشی

زمر دم چہ بہتر بہر حال گفتا خموشی! خموشی!! خموشی!!! خموشی!!!!

غلط فہمی کا ازالہ:- مذکورہ بالا دلائل سے یہ نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ انسان کو ان کہی بات پر قدرت حاصل ہے۔ اور کہی ہوئی بات اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کہنے سے نہ کہنا بہتر۔

خموشی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بالکل بات نہ کریں زبان تک نہ ہلائیں، گونگے بنے بیٹھے رہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں، کہ بے ضرورت نہ بولیں، کم گوئی کی عادت ڈالیں بات کریں مگر سوچ سمجھکر۔

ہر کام کے لئے حدود مقرر ہیں اور ہر عمل کیلئے اصول۔ جو کام توازن پر قائم ہیں۔ وہی عقلمندوں کے نزدیک مقبول ترین ہے۔ خَیْرُالْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا جہاں تک ہوسکے ہم خموشی اختیار کریں نہ اس حد تک کہ حصول مقاصد میں مانع ہو اور نہ اس درجہ کہ بسیار گو کہلائیں سے سعدی رحمۃ اللہ علیہ

دو چیز طیرہ عقل است دم فرد بستن بوقت گفتن وگفتن بوقت خاموشی

جو لوگ خاموشی کے معنی بے زبانی کے سمجھے ہوئے ہیں۔ اور بے زبانی کو اپنا شعار ٹھیرایا ہے۔ اُن کا حال اُس شہزادے کی مانند ہے جو علم ظاہری و باطنی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد اُسکے اُستاد نے تکمیل فضائل کیلئے اس کو خاموشی کی تلقین فرمائی۔ شہزادے نے اس وقت سے شیوۂ خاموشی کو اپنا پیرایہ روزگار بنایا، اور اس درجہ خاموش اور بے زبان ہوگیا۔ جیسا کہ ایک مادرزاد گونگا ہوتا ہے

بادشاہ اور اس کے مصاحبین یہ خیال کرنے لگے کہ شہزادے کے دماغ میں کچھ خلل پیدا ہوگیا ہے اس لئے حکماء و اطباء سے تشخیص بھی کرائی گئی۔ مگر کسی نے اس کے مرض کو نہ پہچانا۔ آخر میں ایک حکیم نے یہ تجویز کی کہ علی الصباح شہزادے کو جنگل میں ہوا خوری کے لئے لیجایا کریں، تو وہ تندرست ہو کر بات کرنے لگیگا۔

دوسرے دن شہزادے کو مع حشم و خدم روانہ کیا گیا۔ جب جنگل میں پہونچے تو ایک کبک دری دریدہ دہن ہو کر پکار اُٹھا، شہزادے کے رفقاء میں سے ایک نے جونہی اسکی آواز سنی، بندوق کا نشانہ بنایا، شہزادے کی زبان سے

بیساختہ یہ بات نکل پڑی "ارے بیوقوف اگر تو نہ بولتا تو کیوں مارا جاتا"
جب یہ جنگل سے واپس ہوئے تو اس کی خبر بادشاہ کو پہنچائی گئی بادشاہ سنکر خوش ہوا۔ مگر سوائے اتنی بات کے شہزادہ پھر کبھی نہ بولا۔ اور حسب عادت معہودہ خاموش رہا۔ عرصہ دراز کے بعد پھر اسی حکیم سے استمزاج کیا گیا تو اس نے کہا کہ شہزادے کو کوڑے رسید کریں۔
شہزادے کو جب کوڑے لگائے جارہے تھے تو کہا" وہاں بولنے پر چکور بندوق سے مارا گیا۔ یہاں میں نے خاموشی اختیار کی تو کوڑے کھانے پڑے ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔
پس خردمند کو چاہیئے گفتگو اور خاموشی کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دے **قطعہ**

نظر کردم بچشم عقل و دانش — نہ دیدم بہ زخاموشی خصالے
نگویم لب بہ بند د دیدہ بر دوز — ولیکن ہر مقامے را مقالے

حفظ لسان:۔ اگرچہ بسیار گوئی ولب بستگی کا پایہ فضیلت سے گرا ہوا ہے۔ لیکن لب بستگی کو بسیار گوئی پر اسلئے تقدم بالشرف حاصل ہے کہ زبان بسیار گوئی کی صورت میں ذمائم ورذائل سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتی۔ البتہ لب بستگی کی صورت میں حفظ لسان ممکن ہے۔ جس طرح تلوار کی حفاظت نیام سے ہوسکتی ہے۔ اسی طرح زبان کی حفاظت لب سے۔
زبان تیغ تیز کی طرح واقع ہوئی ہے۔ جسکی تیزی کے آگے تیغ آبدار بھی پانی بھرتی ہے۔ جس کسی کو اس سے زخم پہنچا وہ کبھی مندمل نہ ہوا۔ اسلئے اس تیغ کا نیام میں ہی رہنا انسب ہے؎

چھری کا تیر کا تلوار کا تو گھاؤ بھرا — لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

جہانتک ہوسکے دروغ گوئی چاپلوسی اور غمازی سے زبان کی حفاظت وصیانت کریں کیونکہ اس قسم کی لغزشیں بیہودہ گوئی میں داخل ہیں۔ جو لوگ زبان دراز بسیار گو اور ہرزہ درا ہوتے ہیں، ان کیلئے خسر الدنیا والآخرۃ ہے چنانچہ ہمارے نبی کریم علی التحیۃ والتسلیم فرماتے ہیں " ھل یکب الناس فی النار علی مناخرھم الا حصائد السنتھم" (لوگ زبان درازی کے سبب منہ کے بل آگ میں جھونکے جائینگے) جو لوگ اپنی زبان کو بدگوئی۔ دروغ ونمامی سے نہیں رُکتے۔ اُن کیلئے یہ بدعادتیں ایک دن وبال جان ثابت ہونگی؎ ناسخ

ہوئی اس بزم میں بیطور زباں جس کی دراز — شمع کی طرح سے سر کٹنے میں تاخیر نہیں

تحصیل علوم وفنون کیلئے احکامات اسلامیہ

(جناب سید آل حسن صاحب اختر کنلیری)

کسی قوم کیلئے یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ جہالت کے تاریک غار وں میں رہکر اپنی عمر بسر کرے۔عربوں میں قبل اسلام جہالت، خانہ جنگی، بت پرستی، عیاشی اور دیگر رسومات قبیحہ کا اسقدر زور تھا کہ اُن کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ عادات خبیثہ تباہ کن اور قابل ترک ہیں۔ اُن کا افلاس روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا۔اور اُنکی دماغی قوت لغو شاعری، ہجو و مدح۔ خاندانی مشیخت۔اور جنگجویانہ خصائل کی داد میں صرف ہوتی تھی۔جب اسلام کا نور پھیلا تو شراب کے ظروف توڑے گئے۔ زانیوں کیلئے درّے بنائے گئے۔اور لغو شاعری۔بیہودہ انشاپردازی کو مخرب اخلاق اور قوم کی پستی کا سبب قرار دیا گیا۔

ابتدا میں ارشاداتِ قرآنیہ کے بموجب مسلمانوں کو علوم وفنون حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔انھوں نے قدیم فلسفہ یونان کی عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔اور انواع واقسام کی جدت کی۔یورپ کے محققین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔کہ فلسفۂ یونانیہ کو عرب نے زندہ کیا۔چھ صدیوں تک خلفائے امیہ اور عباسیہ کے عہد میں علوم طب، ہندسہ، اقلیدس، طبعی، نجوم، ہیئت، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ادب، قواعد وغیرہ رونق پر رہے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ مشاہداتِ عالم پر غور وفکر کرکے اپنی فلاح وبہبود کے راستے تلاش کرو۔اپنا دماغ فضولیات اور خرافات میں صرف نہ کرو۔ابتدا سے انتہا تک کل قرآن مجید ایسے احکامات سے پُر ہے کہ انسان کیا ہے۔اسکی اصل فلاح کس بات میں ہے۔ظالم لوگ کیسے تباہ ہوجاتے ہیں۔نیک لوگ کیسے سرسبز ہوتے ہیں، ہوائیں کیسے چلتی ہیں بادل کیسے بنتے ہیں۔بجلی کیا ہے۔چاند، سورج، ستاروں، پہاڑوں، زمین، آسمان، دریاؤں، حیوانات ونباتات و جمادات پر غور کرو۔اپنے وجود، اپنے نفس، اور اپنے اعضا پر غور کرو۔جہاز کیسے چلتے ہیں، دودھ کیسے بنتا ہے، بارش کسطرح ہوتی ہے۔پرند کسطرح ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔

آجکل یورپ، امریکہ، جاپان وجرمنی نے انھیں ارشادات حقہ پر کلیۃً عمل کرکے دنیا کو حیرت انگیز ترقی کرکے دکھلادی ہے۔قرآن مجید عقل سکھاتا ہے۔غیر اقوام سیکھتی ہیں۔غور کرتی ہیں۔نتیجہ نکالتی ہیں۔نئی نئی راہیں نکالتی ہیں۔مگر انکے معلم اول سستی وتاریکی میں ہیں۔

ذیل میں قرآن مجید کے چیدہ چیدہ مقامات درج کئے جاتے ہیں۔انکو پڑھ کر ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کے مذہب میں حکمت

دانش، غور و فکر، عقل و تمیز کو کس کس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا وما یذکر الا اولوا الالباب

جسکو چاہتا ہے اللہ حکمت عطا فرماتا ہے اور جسکو حکمت ملی اسکو خیر کثیر ملی۔

(گفت حکمت را خدا خیرے کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر)

یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت واللہ بما تعملون خبیر ۝

تم میں سے جو مومن ہیں اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے بلند کریگا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ۝

مگر اللہ سے اُسکے وہی بندہ ڈرتے ہیں جو جان کار ہیں۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ط

تو پوچھ کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں۔

انما یتذکر اولوا الالباب ۝

نصیحت تو بس اہل دانش ہی پکڑتے ہیں۔

اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین

میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

ان فی السموات والارض لایات للمومنین ۝ وفی خلقکم وما یبث من دابۃ ایات لقوم یوقنون ۝ واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیی بہ الارض بعد موتہا وتصریف الریاح ایت لقوم یعقلون ۝

بیشک آسمانوں اور زمین میں مومنوں کیواسطے نشانیاں ہیں اور تمھاری پیدائش میں اور نیز جانوروں میں جنکو وہ پھیلاتا ہے یقین کرنیوالے لوگوں کے واسطے نشانیاں ہیں اور رات اور دن کے تغیر و تبدل میں اور اس رزق میں جو اللہ نے آسمانوں سے اتارا اور اس زمین کو اسکے مرنیکے بعد زندہ کر دیتا ہے اور ہواؤں کے چلنے میں عقل والے لوگوں کے واسطے نشانات ہیں۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۝ والی السماء کیف رفعت ۝ والی الجبال کیف نصبت ۝ والی الارض کیف سطحت ۝

کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے۔ کہ کیسا پیدا کیا گیا۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے قائم کئے گئے اور زمین کی طرف کہ کیسے پھیلائی گئی۔

اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ۝ وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ ط ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون ۝

اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو تمھارے لئے پابند احکام بنا دیا۔ کہ اسمیں اسکے حکم سے کشتی چل سکے تاکہ اسکے فضل سے کمائی کر سکو اور اسکی قدر کرو اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسکو پابند احکام بنا دیا ہے۔ بیشک اسمیں فکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

والشمس وضحٰها ۝ والقمر اذا تلٰها ۝ والنہار اذا جلّٰها ۝ واللیل اذا یغشٰها ۝ والسماءِ وما بنٰها ۝ والارض وما طحٰها ۝ ونفس وّما سوّٰها ۝ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۝

قسم ہے سورج کی اور اسکی دھوپ کی اور چاند کی جو اس کے پیچھے روشنی ہووے اور دن کی جب وہ اسے ظاہر کرے اور رات کی جب وہ اسے ڈھانپ لے اور آسمان کی جسے اس نے بنایا اور زمین کی جسنے اُسے درست کیا۔ پس اسکے اندر بدی اور نیکی کا علم الہام کر دیا۔

ان احکامات پر مسلمانوں نے عمل کیا تو اور قوموں سے علوم و فنون میں بڑے رہے اور اُن کا اقبال زبردست رہا احادیث صحیحہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم و فنون کے حصول کیلئے کسقدر زور دیا گیا ہے علم کو ہر مسلمان مرد عورت پر یکساں طور پر فرض قرار دیا گیا ہے العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ ۔ تلاش علم میں جو پریشانیاں حائل ہوں ان کو برداشت کرو اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ علم کی شمع چین میں روشن ہو تو پروانہ وار چین کا سفر اختیار کرو۔ ایک گھڑی علم حاصل کرنا اور دوسروں کو سکھانا تمام رات کی شب بیداری اور عبادت سے بہتر ہے۔ ایک عالم کی فضیلت عابد جاہل پر اسقدر ہے جسقدر کہ میری فضیلت ایک ادنیٰ امتی پر اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ عالم لوگ نبیوں کے جانشیں ہوتے ہیں۔

انکے علاوہ ہزاروں احکام و اقوال کسب علوم و فنون کے متعلق نقل کئے جاسکتے ہیں۔ مگر افسوس مسلمانوں کی حالت پر ہے کہ وہ اپنے احکام پر اغیار کو عمل کرتا ہوا دیکھکر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

آخر میں مسلمانوں کو عبرت دلانیکے لیے اقوام یورپ کی رائے مذہب اسلام کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ ہم پیشتر بیان کرچکے ہیں کہ اگلے زمانوں میں مسلمان دیگر اقوام کے استاد رہ چکے ہیں۔ آجکل وہ اغیار کے مقابلہ میں پست و شکست خوردہ ہیں۔

یہ قومیں مسلمانوں کی نسبت یہ کہتی ہیں کہ اسلام فطرت اللہ کے مخالف ہے۔ اسلام محض لفظ پرستی ظاہر پرستی رسم پرستی اور انسان پرستی سکھاتا ہے۔ مسلمان نیچر کو دین کا دشمن خیال کرتے ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے دماغوں کو آہنی قالب میں بند کر دیا ہے۔ نماز بے سمجھے لفظوں کا دُہرانا کافی سمجھا گیا ہے۔ آمین پکار کر یا آہستہ کہنے پر جھگڑے ہوتے اور قرأت فاتحہ خلف امام پر تکفیر بازی ہوتی ہے مگر بامعنی پڑھنے یا سمجھنے پر کوئی بحث نہیں۔

آجکل کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح فوٹو مندرجہ بالا سطور میں آگیا ہے۔ قرآن و حدیث کی اعلیٰ درجہ کی

اشاعت یورپ وامریکہ میں ہو اور ان کو پڑھ پڑھ کر اغیار عمل کریں مگر مسلمان دست و پا شکستہ حالت میں گوشہ نشیں مفلس و قلاش۔ مقروض و تنگدست بنکر اسلام کو بدنام کریں۔ یہ باتیں اسلام سے محبت رکھنے والے شخص کو اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حیات انیس

ناظرین یورپ کی زندہ قومیں اپنی قوم کے معمولی لوگوں کی سوانح عمریاں شائع کرتی ہیں جو ہاتھوں ہاتھ بیچاتی ہیں لیکن ہم اپنے اعلیٰ ہیرو ز پر بھی نگاہ نہیں کرتے۔ لکھنؤ کے بے مثل سخنور اور اردو کے لاثانی زبان آور میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے حالات زندگی اور اُن کی تصنیف کے متعلق ایک مستقل کتاب کا نہونا تعجب سے خالی نہ تھا۔ الحمدللہ کہ مولانا اشہری صاحب نے اس فرض کو ادا کیا اور حیات انیس کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کتاب میں میر انیس کے خاندان اور اُنکی تعلیم و تربیت وضع و قطع کے تمام ضروری حالات درج کئے گئے ہیں اور میر انیس کو فردوسی اُردو ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا گیا عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ انگریزی زبانوں سے اُن کا مقابلہ کر کے اُنکو لاثانی شاعر مانا گیا ہے اور اُن کو کسی باب میں فردوسی اور شکسپیر سے کم درجہ پر نہیں رکھا گیا جسکے وہ مستحق ہیں میر صاحب کے کلام معجز نظام کا نہایت قابل قدر اقتباس کیا گیا ہے جس سے بہتر اردو میں نہیں مل سکتا۔ اٹھارہ جز کی کتاب ہے اور نہایت اعلیٰ درجہ کے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں لائی گئی جو مخصوص شیعہ سے متعلق ہو۔ بلکہ ہندو۔ مسلمان۔ سُنّی۔ شیعہ۔ اولڈ فیشن۔ نیو فیشن سب کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے اور وہی اشعار انتخاب کئے گئے ہیں جو عام دلچسپی سے متعلق ہو سکتے ہیں اور میر انیس کی تصویر نہایت اعلیٰ درجہ کی انگریزی کارخانہ سے بنوا کر منگائی گئی ہے ہمکو امید ہے کہ میر انیس کے شیفتہ اور حسن معانی کے فریفتہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ خرید فرمائیں گے۔ قیمت فی جلد عـہ/

مصائب الشہدا۔ یہ کتاب ۱۹ نوحہ غم افزا شہدائے کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام سے پر ماتم ہے صفحہ (۸۱۲) مجلد ۶/ نورجہاں بادشاہ بیگم کی سوانح عمری قیمت ۸/ رقومی نظم قیمت ۴/ ایشیائی قیمت عـہ مکالمہ عورت مرد ۳/ مرقع تاجپوشی ہر دو حصہ قیمت عـہ اُردو کی ڈالی ۲/ اُردو کا گلدستہ ۴/ سیر طلسمات ۲/ جملہ تصنیفات مولٰنا اشہری اور فہرست کلاں درخواست کر پر ارسال ہوگی۔

المشتہر

خواجہ صدیق حسین مالک مطبع آگرہ اخبار۔ آگرہ

اطمینان قلب

(از جناب سید عبداللہ صاحب المعروف بہ سلطان میاں منگرولی)

ذیل میں ہم اپنے دوست جناب سلطان میاں صاحب منگرولی کا مضمون درج کرتے ہوئے زبان کے ذریعہ ایک جدید کاٹھیاواڑی انشاپرداز کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

موصوف کو عربی فارسی اور گجراتی میں کافی مہارت حاصل ہے اور اگر اردو میں بھی چندے یونہی مشق جاری رہی تو انشاءاللہ کاٹھیاواڑمیں ایک جدید انشاپرداز کا اضافہ ہو جائیگا۔ امید ہے کہ ہمارے دوست اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے" اڈیٹر"

اطمینانِ قلب انسان کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم دنیا میں جس کسی کو دیکھتے ہیں وہ شب و روز اسی کوشش اور جد و جہد میں نظر آتا ہے کہ کسی صورت بھی مجھے چین کی زندگی میسر ہو اور بغیر چین کی زندگی کے اطمینان قلب میسر نہیں ہوتا بلکہ اطمینان قلب ہی کا نام چین کی زندگی ہے اور اطمینان قلب جملہ نعمتہائے دنیوی کے حاصل ہونے سے تعبیر ہے اور یہ کسی شخص واحد میں بیک وقت جمع ہو جانا اگر محال نہیں تو نایاب ضرور ہے۔ ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُسکے پاس رہنے کیلئے اعلیٰ مکانات، پہننے کے لئے عمدہ لباس، اور عیش و عشرت کے جملہ اسباب مہیا ہیں۔ دولتمند بھی ہے اولاد کی جانب سے بھی خوش نصیب ہے، اور خویش و اقارب میں بھی صلح و اتفاق ہے مگر ایک تندرستی نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے یا سب نعمتیں ہیں مگر دولت نہیں یا سب کچھ ہے مگر خویش و اقارب میں نااتفاقی ہے یا اولاد نہیں۔ یا اولاد ہے تو فرمان بردار نہیں غرضیکہ کسی ایک نعمت کی بھی عدم موجودگی اطمینان قلب کیلئے عارج ہو گی ہم اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کسی کو بھی چین اور اطمینان حاصل نہیں ہے مگر ہمارا یہ خیال بھی غلط ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنکی زندگی چین سے گذرتی ہے مگر وہ وہی اہل اللہ ہیں جنھوں نے لذات دنیوی پر راحت اخروی کو ترجیح دے رکھی ہے اور اس دنیائے فانی کی ہر لذت کو عارضی سمجھتے ہیں، آپکو تعجب ہوگا کہ کیا ان میں کوئی بیمار نہیں ہوتا؟ ان میں کوئی مفلس اور لاولد نہیں ہوتا؟ ہوتا کیوں نہیں وہ تمام حادثات و رنج و غم جو انسانی زندگی میں لاحق ہو سکتے ہیں اُس سے اُن کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے مگر باوجود اسکے اُنکا قلب مطمئن رہتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے قلب میں صرف خدا تعالیٰ کی محبت ہی کو جگہ دے رکھی ہے۔

ایسے لوگ جب کوئی روزگار کرتے ہیں، اولاد کو پیار کرتے ہیں یا لوگوں سے ملتے جلتے ہیں تو محض حصول اکل حلال

ادائگی حقوق، اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کے خیال سے جو ایک انسان ہونیکی حیثیت سے ہر انسان پر فرض ہے
نہ یہ کہ دنیادار انسان کی طرح حصول مال تکمیل عیش اور دنیاوی جاہ و منصب کے خیال سے ع
آب در کشتی ہلاک کشتی است

ایک دنیادار کو باوجود پیہم سعی و کوشش کے بھی ان سے اطمینان نہیں حاصل ہوتا اور ان کو (اہل اللہ) انہی میں اطمینان کلی حاصل ہوتا ہے اسکی کیا وجہ؟ بات یہ ہے ان عارضی اور بظاہر محبوب اشیا کی انکی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اسی لئے جب ان اشیا کا فقدان ہو جاتا ہے یا ان سے چھین لیجاتی ہیں تو چونکہ پہلے ہی ان کو دل میں جگہ نہیں دی تھی کوئی تشویش اور بیچینی نہیں ہوتی وہ اپنی جملہ محبوب اشیاء کو محبوب حقیقی کی ملک جانتے ہیں بلکہ اسکی رضا و خوشنودی کیلئے اپنی جان عزیز تک اُس پر قربان کر دیتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں سہ

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اہل اللہ کو خدا تعالیٰ سے خالص اور حقیقی محبت ہوتی ہے اور محبت کا اقتضا ہے کہ یادِ محبوب سے کاشانہ دل کو آباد رکھے مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ او کما قال۔ اسلئے وہ کبھی بیچین نہیں ہوتے نتیجہ یہ کہ چین کی زندگی خدا کی یاد میں مضمر ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اطمینان قلب کا طریقہ خود خدا بتاتا ہے کہ خدا کی یاد سے دلوں کو چین نصیب ہوتا ہے۔

غزل

(جناب محمد احمد یار خاں صاحب عبرت تلمیذ عشرت رامپوری)

شوق سے اے سنگدل کر ظلم بھی بیداد بھی　　　کر دیا وقفِ ستم ہمنے دلِ ناشاد بھی
تلخ کامی سے گنوائی جانِ شیریں حیف ہے　　　منزلِ اُلفت میں تھک کر رہگیا فرہاد بھی
اس دلِ بیتاب کو دم بھر نہ دم لینے دیا　　　ہوگئی اُنسے زیادہ سخت اُن کی یاد بھی
قابلِ افسوس ہے بیمارِ غم کی بیکسی　　　ضعف اتنا ہے کہ ہو سکتی نہیں فریاد بھی
جب خیال آیا تو دل قابو سے باہر ہوگیا　　　ہے ستم غربت میں یارانِ وطن کی یاد بھی

ان بتوں کے عشق میں دیوانگی سے فائدہ
کچھ تو ہونی چاہئے عبرت خدا کی یاد بھی

اُردو پر مغربی زبان کا اثر

(جناب حامد رضا خاں صاحب تبسم نظامی از علیگڈھ)

جسقدر زبانیں ہندوستان وغیر ممالک میں مروج ہیں "جتنی قدیم ہوتی جاتی ہیں" اسی قدر ہر زبان میں ایک نیا سرمایہ جمع ہوتا جاتا ہے،، قدیم کتابوں کے مطالعہ سے تحقیق ہوا کہ موجودہ اردو قدیم محاورات وخیالات سے معرا ہے" یعنی اردو ایک زمانہ میں تلفظ کی زینتوں سے محروم تھی۔ اب اُردو زبان کا مستقبل شاندار نظر آرہا ہے" اُردو کے اجرا کو دو سو برس کا زمانہ گذر گیا،، اسلئے کہ اب اردو میں کوئی نسخہ ۱۱۴۵ھ سے پہلے کا نہیں پایا جاتا" ان دو صدیوں میں اُردو نے بہت کچھ ارتقائی منزلیں طے کرلیں اور ہر دور میں کسی دوسری زبان کے عناصر شامل ہوتے رہے؛

تاہم" اردو جب عالم وجود میں آئی،، اسوقت غالباً دوسری زبانوں کا اشتراک اس درجہ نہ تھا جسقدر اب اُردو میں انگریزی الفاظ مستعمل ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی حکومت کا ہندوستان پر پورے طور پر تسلط ہوگیا،، آراکین سلطنت ضرورت کے موافق اپنی زبان کی اشاعت کرتے رہے۔ گو انگریزی زبان میں بھی اسوقت دوسری بانوں کا عنصر شامل تھا مگر انگریزی زبان والوں نے اس اشتراک کو باعث تنزل نہ سمجھا۔

یہی اک راز تھا جس نے انگریزی زبان کو ایک زندہ زبان بنادیا۔ اکثر میری نظر سے اُردو کے مختلف مضامین گذرے مگر کوئی مضمون ایسا نہیں پایا جو مغربی رنگ سے بچا ہوا ہو" یہی حال روزمرہ بول چال کا ہے" آجکل ایک دہقانی بھی پوسٹ کارڈ، ڈاکٹر، ریل، انجن، ڈرائیور، گارڈ، اسٹیشن وغیرہ انگریزی الفاظ سمجھتا اور کہتا ہے انگریزی داں طبقہ کو قطع نظر کرتے ہوئے اردو ہندی کے ہر معمولی طالب علم کو ڈرل، اسکول، کلاس بولتے سُنا گیا ہے۔

اردو اخبارات کا کوئی کالم انگریزی الفاظ سے معرا نہیں دکھائی دیتا۔ یہی باعث ہے کہ ہندوستان میں اخبارات سے رغبت نہیں جسقدر لوگ اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اُلجھن ہوتی ہے۔

ہرچند یوپی کے دیوانی و فوجداری مقدمات و معاملات بھی اردو کے رہین منت ہیں مگر انگریزیت سے محروم نہیں،، تجارتی دنیا میں خرید فروخت کرنے والے" فرنیچر، سوڈا، کاسٹک، موٹر، پیپرمنٹ، وسلن، وغیرہ انگریزی الفاظ بلاتکلف بولتے ہیں۔

یہ مجھے تسلیم ہے *

مگر گذارش یہ ہے کہ جب ہم اپنا مطلب اُردو زبان میں بخوبی ادا کرسکتے ہیں تو دوسری زبان کے اشتراک کی چنداں کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔۔ البتہ جن انگریزی الفاظ کا (اردو) میں ترجمہ نہیں ہوسکتا۔۔ اُنکے لئے مجبوری ہے)۔ گویہ باتیں قطعی ماننے کی باتیں ہیں۔ مگر مجھے صرف اُن اصحاب سے (جو موجودہ اردو زبان کے اشتراک سے انحراف کرتے ہیں) یہ معلوم کرنا ہے کیا انگریزی زبان کی شرکت سے اُردو ایک باقاعدہ مستند زبان بن سکتی ہے)

کیا اردو کا خزانہ فارسی و عربی تراکیب سے نہیں بھر سکتا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اُردو کی تکمیل و ترصیع کیلئے موجودہ رنگ اشتراک غنیمت ہے۔ میں زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ عرض کرونگا۔ کہ اگر فلسفہ اور ادبیات کے تراجم کی پذیرائی نہ کی گئی۔ اور ہمیشہ صدائے انحراف گونجا کی تو جس قدر نقصان اُردو کو انگریزی الفاظ کے اشتراک سے پہنچا ہے اس سے زائد نقصان کا اندیشہ ہے۔

حیدرآباد دکن میں اُردو بہت کچھ ترقی کرچکی ہے اور روزافزوں اصلاح پذیر ہے۔ اردو زبان سے انگریزی الفاظ قطع کئے جارہے ہیں۔

ہر انگریزی لفظ کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے مثلاً موٹر کو ہوا گاڑی کہتے ہیں، اور ہر قسم کی گاڑیوں پر اعداد شمار بھی اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

کٹنگ سلون" کا ترجمہ اردو میں اصلاح خانہ کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں جن صوبوں میں اُردو کی پامالی تھی" اب وہاں بھی اردو کو نوازا جارہا ہے۔ مثلاً مدراس سے اردو اخبارات کا اجرا قابلِ ستائش ہے۔

ایک مثال (کاٹھیاوار) منگرول کی پیشِ نظر ہے، منگرول سے صحیفہ زبان کا اجرا، خوشتر صاحب کی ادب نوازی اور علم دوستی کا ثبوت ہے، اُردو زبان کی اصلاح و اشاعت کیلئے (کاٹھیاواڑ) سے ایک ادبی و علمی رسالہ کا اجرا، ضروری تھا۔ میں اس کمی کو اکثر محسوس کرتا تھا۔

شکر ہے کہ یہ کمی پوری ہوگئی، مگر کمی[۱] کے ساتھ، تاہم رسالہ زبان کا معیار غنیمت ہے، یہ خوشتر صاحب کی کوششوں

* انگریزی "الفاظ" اردو میں اسطرح مروج ہوگئے ہیں، کہ انگریزی نہ جاننے والا زبان سے ادا کرنے وقت کوئی امتیاز لفظی نہیں کرسکتا

[۱] زبان، کاش! اس کمی کو "سیمابی فرقہ" کا کوئی فرد پورا کرسکتا!!

کا خوشگوار نتیجہ ہے، میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں۔
خدا خشتر صاحب کو ہمت دے، اور کاٹھیاواڑ کے باشندگان کو توفیق، تاکہ زبان کے مقاصد پورے ہوتے رہیں۔"

مضمون کے غیر مربوط ہو جانے کا خیال دامنگیر ہے" اسلئے نفس مضمون کو بالا کرتے ہوئے اس موقعہ پر مناسب ہوگا اگر یہ بتا دیا جائے کہ اُردو نے یو-پی میں پرورش پائی اور اقتدار بھی یہیں حاصل ہوا۔ اسلئے تنزل بھی یو-پی ہی میں ہونا تھا۔ اور ہو کر رہا۔ اسکا ثبوت ہمیں مل رہا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان (علاوہ اُنکے جو موجودہ ادب لطیف کے حامی اور مددگار ہیں) قطعی خاموش نظر آتے ہیں۔
آج صوبۂ پنجاب ادبی دنیا میں ترقی کر رہا ہے۔ اور اُردو کی خدمت لاہور والے پنجاب کو اُردو کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ غیر ممکن ہے[۵۱]۔
المختصر جس طرح دوسرے صوبے اردو کو ترقی دے رہے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ اردو سے نکال رہے ہیں۔ کاش۔ یوپی والے بھی اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔
برخلاف اسکے تقاضا کیا جاتا ہے "کہ اُردو کو فارسی اور عربی میں جذب کرنا۔ اُردو کے ساتھ ظلم ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اُردو میں انگریزی عناصر کس درجہ شامل ہو رہے ہیں:
ہندی رسائل جو اپنے ارادوں میں ایک حد تک کامیاب ہیں" اُنکا مقصد اولیں یہی ہے کہ بھاشا سنسکرت میں جذب کر دی جائے " لہذا جب تمام قوموں کو یہ حق حاصل ہے،" کہ اپنے طرز عمل کے مطابق کام کریں۔
تو او بائے اُردو کو فارسی و عربی کے عمل اشتراک سے کیوں باز رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے (؟ زبان)

---

[۵۱] زبان:- آپ غیر ممکن کی رٹ لگاتے رہیں "پنجاب" اپنا کام کر رہا ہے۔

دورِ حاضرہ کے شاعر

(جناب عشرت رحمانی المجبوبی رامپوری)

آجکل ہماری ادبیات کا معیار ناقابل اظہار ہے۔ عام رائے ہے کہ "دنیائے شاعری میں ترقی رونما ہے۔ ہر شہر اور قصبہ میں شاعروں کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہے ہر فرد ادب کی خدمت میں منہمک ہے۔"

لیکن بغور دیکھا جائے تو یہی 'ترقی' 'تباہی' کے مترادف ہو سکتی ہے۔ 'ادبیات' پر جو ظلم آجکل کے نوخیز 'ادیب' (بزعم خود) روا رکھتے ہیں۔ ناگفتہ بہ ہے۔

ہر فرد و بشر جو معمولی اُردو پڑھ لکھ سکتا ہے، دو چار بے تکی غزلیں کہکر مسلم الثبوت "شاعر" بننے کو تیار غزلوں کی اشاعت کیلئے ہمارے بعض بعض .. رسائل کافی سے زیادہ ہیں۔ جنکے اجراء کی غرض صرف "تجارت" وہ ... "مدیر" بمصداق "بدنام کنندۂ نکونامے چند" ادارت کی خوب گت بنا رہے ہیں۔

اصل بیجوڑ تکبندی کا نام شاعری ہے۔ رسائل کی کوئی نہیں۔ مضمون کی فراہمی ہو تو کیونکر اور کہاں سے۔ بس یہی شاعر اُن رسائل کے معاون ٹھہرے۔ "لکھیں عیسیٰ پڑھیں موسیٰ" تمام موزوں ناموزوں غزلیں۔ اولاً "زنبیل ارادت کیونکر پُر ہو" دوم خود مدیر صاحب کچھ قابلیت رکھتے ہوں۔ اُن کو تو چندہ کی وصولیابی سے فرصت ہو تو مضامین کی تدوین کی جانب توجہ ہو سکے۔

اس قسم کے رسائل کا تو فرض یہی ہے کہ صرف وہی مہملات شائع کریں جنکا تعلق براہ راست اعلیٰ معاون یا سرپرست سے ہو خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ معاون کیلئے "زمیندار" یا کسی حالت میں مالدار ہونا لازم ہے۔ اور بس۔ شاعری پر جو ظلم ہمارے موجودہ 'فاضل' شعراء نے روا رکھا ہے قابل افسوس ہے۔ اور پھر "دعویٰ استادی ناگفتنی۔"

نثر ہو یا نظم آجکل کے مضمون نگار حضرات کی یہی حالت ہے۔ لیکن نثر پر کسیقدر توجہ کم فرمائی جاتی ہے۔ 'نظم' خصوصیت سے 'تختۂ مشق' ہے۔ اور ہر طرح یہ ثابت کرنیکی کوشش کیجا رہی ہے کہ 'شاعری' جو بیشتر ایک ادبی اخلاقی اور شریف فن مانا جاتا تھا۔ محض تفریحی مشغلہ ہے۔ 'پتنگ بازی' یا اور ہزاروں 'بازیاں' جسطرح رائج ہیں۔ اسیطرح 'شاعری' بھی 'بیکاری' کا شغل ہے۔ اس سے زیادہ اسکی اہمیت ہمارے 'نوخیز' شعراء کی نگاہ میں نہیں اور

ہرگز نہیں۔ یہ خیال کرکے ہو جو گلفشانیاں ہو رہی ہیں۔ معاذ اللہ

لیکن اس سے قابل افسوس و حیرت ایک امر ہے۔ ہمارے بعض وہ حضرات جنکو شاہیر کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے جو علم اوستادی بلند کئے ہوئے۔ دنیائے ادب میں ہر بونگ مچانے ہوئے ہیں۔ اور دو چار لمبے چوڑے لایعنی خطابات کو (بزعم باطل) شرف قبولیت عنایت کئے ہوئے ہیں۔ وہی۔ آجکل سب سے زیادہ مہملات کی گرم بازاری میں مشغول نظر آتے ہیں۔ جنکی ذات سے ادبی ترقی کی امید کیجاتی ہے۔ وہ اسکی بیخ کنی کیلئے (نشۂ اوستادی میں سرشار) تیار ہیں۔

ذیل میں دورِ حاضرہ کے قابل اور نامور شعراء کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ میرا مقصد ہرگز ہرگز تعریض نہیں۔ تنقید ضرور ہے۔ عام طور پر تنقید کے معنی تعریض ہیں۔ یہ بھی ہماری ایک کمزوری ہے۔ تنقید ترقی کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن ذاتیات سے کوئی تعلق نہو۔ صاف اور بے لوث تنقید فرض ہر اس نقود کا جسکا تعلق ادبی خدمات سے ہے۔ جہاں جہاں میری عقل کا قصور متصور رہو۔ کرم فرماکر وضاحت فرمادیجئے تاکہ استفادہ ہوسکے۔

"رسالہ خورشید میرٹھ"

مئی ۱۹۲۷ء

امیرالکلام۔ حسان الہند حضرت غریب سہارنپوری

ط۔ بہت اچھا اگر میری کہانی تم نہیں سنتے
کسی سے کشتگان کربلا کی داستاں سنلو

کیا خوب ارشاد ہے۔ آپکی داستان "کشتگان کربلا کی داستان" سے ضرور مشابہ ہے۔ معاذ اللہ۔ کیا بلند پروازی ہے۔

س۔ غریب انساں نہیں ہے درحقیقت اک فرشتہ ہے
تحیر میں رہو برسوں جو اس کی داستاں سنلو

معقول۔ شاعری اسی کا نام ہے۔ آپکے فرشتہ ہونے میں کسکو کلام ہوسکتا ہے۔ غالباً ہر وہ ہستی جس کی حیرت فزا ہو "فرشتہ" کہلائے جانیکی مستحق ہوسکتی ہے۔ نرالی جدت ہے۔

خورشید جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

۵۳ جو اُترا غسل کرنے کے لئے وہ بحرِ محبوبی
تو پھیلے ہاتھ دریا کے کھلا آغوش دریا کا

نہیں معلوم 'دریا کے ہاتھ کسطرح پھیلے' اور 'آغوش' کیونکر 'کھلا'۔ 'پھیلے اور کھلا دونوں فعل ماضی ہیں۔ جو ظاہر کرتے ہیں کہ محبوب کے دریا میں اُترنے سے پہلے ہاتھ اور آغوش بند تھے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ شاعر کی مراد ہاتھ اور آغوش دریا سے کیا ہے اور اسمیں کیا جدت پیدا کی ہے۔ (واہے کسی کے واسطے آغوشِ نقش پا) غالباً اس مصرعہ کے 'واہے' صیغہ حال سے دھوکہ کھا کر "پھیلے ہاتھ اور کھلا آغوش دریا کا" فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے۔ جو غلط ہے۔

رسالہ جلوۂ یار میرٹھ

جون و جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

۵۴ یہ بھی فانی ہے فنا ہو جائے گا مٹ جائیگا
چار دن کو رونقِ بازارِ دنیا اور ہے

جناب حسان الہند کی ایجاد یہ بھی کس قدر نرالی ہے۔ 'رونق' کو 'مذکر' فرماتے ہیں۔ آجتک تو 'رونق' 'مونث' سنا ہے۔ شعر کی شرح کیجئے۔ غالباً بازار کی مناسبت نے "فنا ہو جائیگا" "مٹ جائیگا" لکھنے پر مجبور کیا۔ قادر الکلامی اسی کے معنی ہیں۔

فصیح البیان جناب افسر صدیقی امروہوی

۵۵ قبرِ عاشق سے نظر پھیر کے جانے والے
تو نے اس ڈھیر کی ٹھوکر بھی کبھی کھائی ہے

ماشاء اللہ فصاحت تو آپکے بیان سے "ٹپکتی" ہے۔ ڈھیر کی ٹھوکر کھانیکا استفسار انوکھی ترکیب ہے۔

۵۶ میں بھی وحدت کے مزے لوٹ رہا ہوں ظالم
تیری یکتائی کا جوڑا میری تنہائی ہے

یکتائی کا جوڑا، کیا اچھی زبان ہے۔ آپ فصیح البیان ہیں۔

۵۳ چشمِ ساقی سے جوانی میں جو چھلکی تھی شراب
بنکے گردش مرے حصہ میں وہی آئی ہے

کیسا وجد انگیز شعر فرمایا ہے۔ افسوس کہ اس ادق مسئلہ کو حل کرنیکی لیاقت نہیں۔ تشریح فرما دیجئے تو بعید از علم دوستی نہو گا۔ حضرت فصیح البیان زحمت فرمائیں۔

جناب منشی جان محمد صاحب انور تلمیذ حضرت مضطر خیرآبادی

۵ کس غضب کی یہ آئی شبِ تنہائی ہے
شرط بد کر تو قیامت سے نہیں آئی ہے

"شرط بدنا" خوب فصاحت ہے۔ جدید محاورہ ہے۔ "شرط کرنا" تو سُنا۔ لیکن اسکی سند درکار ہے۔

جناب منشی شیاما چرن صاحب ترم مختار بریلوی تلمیذ جناب حلم بریلوی

۵ باڑھ تلوار کی جلا دنے بنوائی ہے
آج کیا جانیے کس کس کی قضا آئی ہے

تلوار کی باڑھ بنوانا، جدید محاورہ ہے۔ جو جناب ترم نے تراشا اور جناب حلم نے حلیم الطبعی سے تسلیم کر کے اسکے اجرا کی اجازت دی۔ فصیح وصحیح محاورہ "باڑھ رکھنا" یا "باڑھ رکھوانا" ہے۔ سند درکار ہے

جناب زخمی ازسیونی

۵ قتل کے بعد مرے آپ بھی پچھتائیں گے
عاشقوں میں یہی اک آپ کا شیدائی ہے

قتل کسکا۔ اور شیدائی کون ہے"۔ اندازِ بیان نرالا ہے۔ نثر کیجئے۔ عجیب وغریب اُردو ہے۔ فرماتے ہیں۔ "میرے قتل کے بعد آپ بھی پچھتائینگے۔" (کیونکہ) عاشقوں میں یہی اک آپکا شیدائی ہے۔ مہمل ہے۔ "میں ہی اک آپکا شیدائی ہوں،، ہونا چاہیئے۔

جناب منشی سالگ رام صاحب سالکؔ گرداری

ص
کیا بتاؤں کہ محبت میں ہیں جھگڑے کیا کیا
کبھی خفت کبھی ذلت کبھی رسوائی ہے

ماشاء اللہ۔ منشی صاحب۔ واقعی محبت میں بھی جھگڑے ہیں۔ حسن و عشق کا مرقع ہے آپکا شعر۔ خفت بھی کیا خوب ہے۔ اللہ اللہ کیسے کیسے جھگڑے ہیں۔ اور پھر آپکی ادائگی۔ اے سبحان اللہ۔ کبھی یہ بھی غور کیا۔ شعر گفتن چہ ضرور۔ شاید کسی مرض کی دوا ہے۔

جناب حافظ قادر بخش صاحب شبابؔ تلمیذ جناب مشتاق

ص
دل ہے مضطر شب غم آنکھ تمنائی ہے
کاش ایسے میں وہ آجائیں تو تنہائی ہے

کیا مہمل ادائگی ہے۔ مصرع ثانی کی بے ربطی قابلِ داد ہے۔ "ایسے میں وہ آجائیں تو تنہائی" بھی خوب ہے۔

کچھ اس انداز سے ہے شاخِ گلِ تر کا تناؤ
کہ نظر میں کسی معشوق کی رعنائی ہے

"شاخِ گلِ تر کا تناؤ"۔ کیا فصاحت ہے۔ معاذ اللہ۔ تناؤ اور رعنائی کا تناسب۔ کیا خوب۔

ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوحؔ ناروی جانشیں نواب فصیح الملک بہادر مرحوم

صلہ
آپ سے اور مجھ سے لطف و کرم کی امید
کبھی یہ بات ہوئی ہے کبھی ہو آئی ہے

فصیح العصر کی فصاحت ملاحظہ ہو۔ "ہو آئی ہے" عجیب و غریب محاورہ ہے۔ جس سے آجتک کان آشنا نہ تھے۔ "ہو آنا" نہ معلوم کہاں کی زبان ہے۔ غالباً خاص "نارہ" میں استعمال ہوتی ہے۔ "ہوتی آئی ہے" تو سنا ہے۔ لیکن یہ انوکھی ترکیب ہے۔

سند - (ناخدا کی ناخدائی دیکھ لی)-

۵۲ بیٹھکر وہ مرے پہلو میں یہ فرماتے ہیں
کیوں جی اب بھی تمھیں دعوائے شکیبائی ہے

کیسا فصیح و بلیغ شعر فرمایا ہے۔ مگر کج فہمی کو کیا کہئے۔ مطلب و معنی سمجھنے سے قاصر۔ "دعوائے شکیبائی" تشریح طلب ہے۔ شعر ضرور لطیف ہوگا۔

اب کہاں تک اس لغویات کا اظہار کیا جائے۔ بطور مثال چند نمونے پیش کئے گئے۔ جو امید ہے کہ میری گذارش واقعی کی تصدیق کیلئے کسیقدر کافی ہونگے۔ یہ ہیں ہمارے اوستادانِ وقت کے کمالات۔ خدا ہدایت فرمائے۔ آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ تعریض منظور نہیں۔ بلکہ حقیقت کا اظہار جو ایک ادبی خادم کا فرض ہے ؎

آزاد رہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

عشرت رحمانی المحبوبی

غزل

(جناب منشی عبد اللطیف صاحب شاد شاگرد حضرت امیر مینائی)

کبھی ہم ضعف میں آہیں کبھی فریاد کرتے ہیں
یہ پردے ساز خاموشی کے ہیں چڑھتے اترتے ہیں

کچھ ایسے حد سے باہر ہجر کے صدمے گذرتے ہیں
کہ دل سے درد دل کو ہم الگ محسوس کرتے ہیں

نہ لگ جائے نظر تیغ نظر کے زخم پنہاں کو
شہیدانِ نگہ حوروں کی چشم بد سے ڈرتے ہیں

نہیں محسوس ہوتی آہٹ انکے پائے نازک کی
وہ میری عمر بنکر کوئے دشمن سے گذرتے ہیں

مہ نو کی طرح رکھتے ہیں اک خود آفریں ہستی
فنا ہونے سے ہم اپنے کو آپ ایجاد کرتے ہیں

نظر سے کرتے ہیں پیدا تن کاہیدہ میں لرزش
وہ حس کہربائی نبض خس میں جذب کرتے ہیں

یہ کمزوری ہے کہدینا کلام شاد مغلق ہے
نکالے سقم کچھ ہم تہدیہ دشمن کو کرتے ہیں

دورِ قدیم و جدید کی شاعری پر ایک نظر

(جناب ولایت حسین خانصاحب آثر رامپوری)

اساتذہ متقدمین و متاخرین نے اصنافِ سخن میں سے جس جس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اُس کو بلحاظ وقت و مذاق اسی نظر سے دیکھنا ہر صاحبِ ذوق و اہلِ نظر کا فرض ہے۔ ہمکو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے ہر قسم کا کافی سے زیادہ سرمایہ چھوڑ گئے ہیں اگر ہم اب بھی اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اس سے زیادہ ہماری کم نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے دیکھا جاتا ہے کہ برخلاف دورِ قدیم کے دورِ جدید کی شاعری میں زیادہ تر لفاظی کیجا رہی ہے جو عام زبان کی وسعت کو محدود کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ روزمرہ اور عام بول چال کو وسعت دیجائے۔ پروفیسر آزاد نے آبحیات میں خواجہ آتش مرحوم لکھنوی کے حال میں ان کے طرزِ کلام پر تحریر کیا ہے "کہ جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازیٔ ہند کا اعلیٰ نمونہ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اُسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں انکے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی" واقعی کلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس سے اُس عہد کی بول چال کا انداز ہوسکے۔ افسوس ہے کہ دورِ حاضرہ کے نوجوان تعلیم یافتہ نئی روشنی کے دلدادہ طرزِ کہن کے ناپسند کرنے والے اس طرف کچھ توجہ نہیں کرتے۔ روزمرہ اور عام بول چال کو وہ جس سے کلام میں روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے" غلط فہمی سے عدم قابلیت کا سبب ٹھہراتے ہیں سبب یہ ہے کہ اول تو بزعم قابلیت کسی اُستاد سے رجوع کرنا گوارا نہیں کرتے اور اگر ایسا کرتے بھی ہیں تو اصول و قواعد کی پابندی نہیں کرتے۔ خدا ان کے یارانِ طریقت کو خوش رکھے جو ہمیشہ واہ وا سبحان اللہ سے انکے کلام کو چار چاند لگاتے رہتے ہیں اور انھیں مشقِ سخن کی زحمت سے بچا کر بزعم خود اُستاد ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ پھر تو یہ بھی اظہار قابلیت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور دل کھول کر ہر صنف میں ایسی لفاظی کرتے ہیں کہ نفس مطلب فوت ہو جانے تک کا لحاظ نہیں کرتے۔ ایسا تو اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ پرشکوہ الفاظ کی بھرمار سے کلام کو ایسا مغلق کر لیتے ہیں کہ جو مطلب ہوتا ہے وہ الفاظ اشعار سے ادا نہیں ہوتا۔ لگتے لگانے پڑتے ہیں اور یہ اسی کو معیار قابلیت سمجھے ہوئے ہیں خدا انھیں اساتذہ کے کلام سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور یہ اپنے میں اظہارِ خیالات کی روزمرہ اور عام بول چال میں قوت پیدا کریں البتہ جو خیالات و مضامین عام زبان میں ادا نہوں اور علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے تو مجبوری ہے۔

مترجمات

مطبوعات قدیمہ کی قدر و قیمت

عنوان بالاسے الزہرا، کے تازہ پرچہ میں ایک پراز معلومات مضمون شائع ہوا ہے جسمیں مضمون نگار نے بعض اُن یوروپی مطبوعات مصر کا تذکرہ کیا ہے جو مختلف اوقات میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتی رہی ہیں۔

نام کتاب	کس سنہ میں فروخت ہوئی	قیمت	کیفیت
تورات	سنہ ۱۸۲۲ء	۱۲۸ لیرہ	یہ کتاب غوجن برگ میں ٹائپ میں بزبان لاطینی پندرھویں صدی کے نصف میں شائع ہوئی تھی۔
"	سنہ ۱۸۴۱ء	۱۹۰ لیرہ	
"	سنہ ۱۸۸۳ء	۲۹۰۰ لیرہ	
"	سنہ ۱۸۹۷ء	۴۰۰۰ لیرہ	
کتاب المزامیر			خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو چمڑے پر ٹائپ میں سنہ ۱۴۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسکا پہلا نسخہ لوئی ہشتدہم نے بارہ ہزار فرانک میں خریدا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اسکا صرف ایک نسخہ باقی ہے۔
کتاب المزامیر مطبوعہ سنہ ۱۴۵۹ء	سنہ ۱۸۸۱ء	۱۲۲،۰۰۰ فرانک	سنہ ۱۸۸۱ء میں اسکے صرف بارہ نسخہ موجود تھے جن میں سے ایک مذکورہ قیمت پر فروخت ہوا تھا۔
الاقتدار بالمسیح مطبوعہ سنہ ۱۴۷۱ء	سنہ ۱۹۰۵ء	۳،۰۰۰ فرانک	یہ کتاب موٹے خط میں صرف ۷۰ صفحات پر مشتمل تھی۔

کتب خانہ جامعہ پرنسٹن (امریکہ) میں روم کے مشہور شاعر ورجل کا ایک دیوان ہے جو روم میں پہلی بار سنہ ۱۴۶۹ء میں

مرتب ہوا تھا خیال ہے کہ اسکی قیمت بیحد و شمار ہوگی اس جامعہ کو بھی اپنی اس ملکیت پر بہت فخر و ناز ہے۔ یہ سنکر حیرت ہوتی ہے کہ شیکسپیر کی مطبوعہ تصنیفات کی قیمت کا اندازہ اسکی اپنی زندگی میں صرف ۰۰، پونڈ کیا گیا تھا۔ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی کو (جسکا تذکرہ اسی رسالہ میں اختر صاحب کر چکے ہیں) پچاس برس میں مرتب کیا تھا جسکا ایک نسخہ کہتے ہیں کہ سیف الدولہ بن حمدان حاکم حلب کی خدمت میں خود مصنف نے تحفۃً بھیجا تھا جس کے صلہ میں حاکم مذکور نے ایک ہزار دینار مصنف کو دئے تھے (افسوس) صاحب بن عباد کہتے ہیں "حاکم نے ابوالفرج کی کوئی قدر نہ کی اور انتہائی بخل سے کام لیا مصنف اس سے کئی چند انعام و اکرام کا مستحق تھا۔

مغلوں کا محکمہ احتساب

ہندوستان کے مشہور مورخ پروفیسر جدو ناتھ سرکار نے اپنی محققانہ تالیف "نظام حکومت مغلیہ" Mughal Administration میں "عہد مغلیہ میں محتسب کے فرائض" پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی لیکن چونکہ "زبان" کا یہ عنوان خاص، محض تراجم کے لئے وقف ہے اسلئے ہم بھی ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں اس موقع پر یہ بتلا دینا نامناسب نہیں معلوم ہوتا کہ پروفیسر صاحب نے اس عنوان کے تحت میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعض دستاویزات از قسم فرامین و دستور العمل کے مطالعہ کا نتیجہ ہے جیسا کہ آپ نے اس کتاب میں آگے چلکر تشریح کردی ہے اگر انھوں نے اس موضوع پر خالص اسلامی نقطۂ نظر کا مطالعہ کیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اس مضمون میں ایک امتیازی شان پیدا ہوجاتی بہرحال مغل شاہی محکمۂ احتساب پر انھوں نے جو کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ انکا ملخص یہ ہے وہ قانون اسلام کی رُو سے بادشاہ وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک محتسب کو مقرر کرے جو عوام کو قرآنی احکام کی پیروی میں مستعد رکھے۔ محتسب کے فرائض میں احکام و اوامر (خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر لوگوں کو آمادہ کرنا اور نواہی سے باز رکھنے کی سعی کرنا داخل ہے مثلاً بادہ خواری۔ بھنگ نوشی و دیگر سیال اور نشہ آور اشیاء کے استعمال سے روکنا اور قمار بازی و دیگر خلاف شرع امور سے لوگوں کو باز رکھنا وغیرہ۔

خشک نشیلی چیزوں کی ممانعت نہ تھی افیون اور گانجہ کا استعمال جائز قرار دیا گیا تھا۔ ملحدانہ خیالات انکار رسالت اور روزہ نماز سے غفلت شعاری پر کسی مسلمان کو سزا کا مستوجب ٹھہرانا بھی محتسب کے فرائض میں داخل تھا۔ محتسب کا یہ معمول ہوتا تھا کہ وہ سپاہیوں کی ایک جماعت لیکر شاہراہوں اور گلی کوچوں میں گشت کرتا اور ان دوکانوں اور گھروں کو

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مسمار کرادیتا تھا جہاں خلاف شرع امور کا ارتکاب کیا جاتا تھا یعنی جہاں شراب یا اور کوئی دوسری سیال نشہ والی چیزیں فروخت ہوتی تھیں یا جہاں جوا کھیلا جاتا تھا - اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی آبادی کو احکام اسلام کی پیروی کی تنبیہ و تلقین کیجاتی تھی بعض اوقات اس جماعت کو ان اجڈ "خراباتیوں" کے خلاف جو آمادۂ فساد اور مقابلہ پر مستعد ہو جاتے تھے مسلح کارروائی کرنی پڑتی تھی -

اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں نو تعمیر منادر کا انہدام بھی محتسب کے فرائض میں داخل تھا دیکھو تاریخ اورنگ زیب تیسرا حصہ "مصنفہ جدوناتھ سرکار" صفحات ۹۳، ۹۴، ۳۲۳) (افسوس ہے کہ مصنف نے اپنی ہی ایک دوسری تصنیف کا حوالہ دینا مناسب سمجھا اگر اصل ماخذ کا حوالہ دیا جاتا تو اس جملہ کی صداقت و حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی) "محتسب کو اسکی تقرری کے وقت حسب ذیل ہدایات دیجاتی تھیں - ان مسلمانوں کو جو مذہب حقہ کی عبادات و مراسم سے نابلد ہیں آگاہ کرو اگر وہ سہل انکاری اور غفلت سے کام لیں تو زجر و توبیخ کرو یا تنبیہ سزا دو بازاروں اور گلیوں میں دیکھو کہ کسی نے خلاف قانون و دستور سڑک کے کسی حصہ کو روکا یا راستہ کو بند تو نہیں کر دیا ہے یا بازار کے اس حصہ پر قبضہ کر کے دوکان تو نہیں لگائی ہے جو عام گذرگاہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور یہ خلاف ورزیاں ہوتی ہوں تو ان کا سد باب کرو اور قانون کی اطاعت پر مجبور کرو شہر میں نشیلی اشیاء کے استعمال یا بازاری عورتوں کے قیام کی ہرگز اجازت نہ دو کیونکہ نواہی شرع میں انکا شمار ہے ان لوگوں کو جو قرآنی احکام کی نافرمانی کرتے ہیں نیکی کی طرف ہدایت کرو لیکن ایک سختی کا برتاؤ نہ کرو ورنہ وہ تمہارے درپے آزار ہو جائینگے تمھیں چاہیئے کہ پہلے سرگروہ اشرار کو متنبہ کرو اگر وہ پھر بھی تمھاری باتوں کو خاطر میں نہ لائیں تو عامل کے سامنے ان کو پیش کرنے کی کوشش کرو"

فلسطین کی جدید اثری تحقیقات

ارض الانجیل "Bible Lands" میں یو یروشلم اور مشرق قریبہ کی مشنری جماعت کا سہ ماہی آرگن ہے ایک اہم مضمون فلسطین کی موجودہ تحقیقات اثری پر شائع ہوا ہے ہم اس مضمون کے بعض ضروری حصے پیشکش ناظرین کرتے ہیں۔ "عالمگیر جنگ کے بعد فلسطین میں سول نظام حکومت کے قیام پر برطانوی مدرسہ علم الآثار کے ڈائرکٹر کی ماتحتی میں آثار قدیمہ کے ایک محکمہ کا خاکہ تیار کیا گیا تھا جسکا عملی افتتاح ۱۹۲۰ء میں ہوا لیکن ۱۹۱۶ء میں ہی یہ قائم ہو چکا تھا یہاں کی قدیم اور مشہور سوسائٹی "Ecole Biblique de S. Etienne" ہے اور امریکن جماعت محققین مشرق ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش "فلسطینی تحقیقاتی فنڈ" (۱۸۶۵ء) کا قیام تھی جو کامیاب ہو کر ان اداروں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ان یورپی جماعتوں کے علاوہ خالص یہودی ادارات اور تحقیقاتی جماعتیں ہیں۔ غیر ذمہ دارانہ تحقیقاتی سلسلہ کو بند کرنا تحقیق و تدقیق مسائل میں سائینٹفک اصول پر کام کرنے میں مدد دینا ایسے طلبا کی ایک جماعت تیار کرنا جو فن تحقیقات میں ماہر ہوں اور نتائج تحقیقات جو خواہ علمی ہوں یا مادی کی حفاظت کرنا یہ ان ادارات کے فرائض اغراض اور مقاصد ہیں۔

ان اطراف میں کھودائی اور تحقیقات کرنے سے جو اہم نتائج نکلے ہیں انکا تذکرہ ارض الانجیل کے پچھلے نمبروں میں مفصل کیا جا چکا ہے۔ یروشلم کی قدامت پر اب کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) سے بہت پہلے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور اس لئے معبد سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے بھی یہاں ایک معبد ضرور رہا ہوگا۔

گلیلین سر کی نسبت جسکو فلسطین کے نتائج تحقیقات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آج سے بیس ہزار یا اس سے بھی پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے فلسطین کی قدامت بھی پایۂ ثبوت کو پہونچتی جا رہی ہے اور یقیناً یہ حقیقت ظاہر ہو کے رہیگی۔

جبیل (جبل - پہاڑ) جو یونانی لفظ "Byblos" سے مشتق خیال کیا جاتا ہے اب جو بیروت کے شمال کی جانب واقع ہے فرانسیسیوں نے بعض عمدہ قبریں دریافت کی ہیں جو بارھویں خاندان (۲۱۰۰ قبل مسیح علیہ السلام) کی ہمعصر خیال کیجاتی ہیں! کچھ اور صدیاں پہلے کی ہی قیاس کی جاتی ہیں بائبل اور مصر کے باہمی تعلقات بہت قدیم

اور گھیرے تھے اور اسوقت سے تھے جبکہ شام کو مصری صوبہ جات میں نہ شمار کیا جاتا تھا۔ مصری معبد کی تحقیقات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدیم اور متوسط شاہوں کی ملکیت میں تھا۔ اہرام، شاہ بائبل کے کتبہ کو ایک خاص اہمیت دیجاتی ہے کیونکہ فنیشین ایپی گرافی کا یہ قدیم ترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے اسکا سن کتابت بارھویں صدی قبل ولادت مسیح ہے۔

تل مشرف (شام) میں ایک وسیع و عظیم قلعہ کے آثار موجود ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ اسکی فصیل ۲۵ فٹ اونچی رہی ہوگی۔

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جماعتوں کے علاوہ جنکا تذکرہ آغاز میں کیا گیا ہے امریکہ اور یوروپ کے مشہور دار العلوموں کی جماعتیں بھی ان اطراف میں مشغول تحقیقات رہتی ہیں۔

یہ مضمون آخر میں اس اطلاع پر ختم ہوا ہے کہ اس موضوع پر اے۔ ایس مکیسٹر کی کتاب "a century of excavation in Palestine" بہترین خیال کیجاتی ہے یوں تو شام کے آثار قدیمہ پر صدہا کتابیں لکھی گئیں ہیں۔

یادگار قدیم

جے پور ایک مشہور ریاست راجپوتانہ میں ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ضیاء الحق والدین مولنا سید شاہ ضیاء الدین علیہ الرحمۃ آسودۂ خواب ہیں جو حضرت قطب الاقطاب خواجہ محمد فخر الدین چشتی دہلوی قدس سرہٗ کے خلیفہ اعظم اور خاندان چشت کا روشن چراغ ہیں۔ آپ ہی کے دست مبارک سے مدرسہ ضیاء الاسلام قائم ہوا تھا جسکو آپ نے ایک اعلیٰ پیمانہ پر پہنچا دیا تھا لیکن اب زمانہ کے جزر و مد سے اسکی حالت قابل غور ہے۔ جے پور میں اولاً اسلامی آبادی نسبتاً کم اور ہے تو غربا کی۔ زیادہ ضرورت ہے کہ یہاں تعلیم اسلامی جاری رکھی جاوے تو یہاں کے مسلمان علم دین سے واقفیت حاصل کریں لیں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس قدیم کو قائم رکھیں تو اسکی ہر طرح امداد کیجئے۔ ما علینا الا البلاغ

ترسیل زر بنام مولوی محمد افتخار علی صاحب ناظم مدرسہ ضیاء الاسلام محلہ چھوٹا کھرہ جے پور سٹی ہونا چاہئے۔

المشتہر

سکریٹری مدرسہ

ادبیات

فلسفی وِل

(جناب احمد عبد اللہ المسدوسی متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

گرنی جہاں وِل، اپنے متبنی لئے ہوئے والدین کے ساتھ رہتا تھا وادی کے زیریں حصہ میں سر بفلک پہاڑوں اور صنوبر کے درختوں کے درمیان واقع تھی، اوپر کے حصہ میں ایک پہاڑ پر دوسرا پہاڑ واقع تھا جو گنجان اور اونچے ساگوان کے درختوں کی گہرائیوں سے نکل کر آسمان کا اپنی عریانی سے مقابلہ کرتا تھا کچھ اوپر کی طرف لمبا حصہ کھُر کے مانند جو جھاڑی دار پہاڑی پر چھایا ہوا ہو واقع تھا۔ وِل کے کانوں میں گرجا کے گھنٹوں کی دھیمی اور نقرئی آواز ہوا موافق ہوتی تو آیا کرتی تھی نیچے وادی زیادہ ڈھلوان مگر ساتھ ہی ساتھ دونوں جانب کشادہ ہوتی گئی تھی۔ گرنی کے قریب بلندی سے اسکی پوری لمبائی صاف طور پر دکھائی دیتی تھی اور اس وادی سے دور آگے ایک وسیع میدان میں دریا چمکتا راستہ بدلتا ہوا اور اپنے منزلِ مقصود سمندر کی طرف ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بہتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس وادی کے اوپر ایک درہ تھا جو ہمسایہ سلطنت میں نکلتا تھا، پس خاموش اور دیہی مقام ہونیکی وجہ سے سڑک پر جو اس پار دریا کے کنارے کنارے گئی تھی دو عظیم الشان اور طاقتور جماعتوں کے درمیان مسافروں کی کثرت رہتی تھی۔ گرما کے پورے موسم میں ادھر جانیوالے مسافرین کی گاڑیوں یا گرنی سے پرے نیچے کی طرف آنیوالوں کی آواز سنائی دیتی تھی اور چونکہ دوسری جانب سے چڑھنا نسبتاً آسان تھا اس لئے مسافرین کا اس راستہ پر زیادہ ہجوم نہوتا، پانچواں حصہ نیچے کی طرف آتا تو ایک حصہ اوپر کی جانب جاتا ان تمام گاڑیوں میں جنکو سفر کرتے ہوئے وِل نے دیکھا تھا یہ تناسب تھا۔ پیدل مسافرین کا تناسب تو اس سے بھی زیادہ تھا۔ تمام سبک رفتار پیدل مسافرین اور تمام چکر فروش دیہاتی تاجر اپنے عجیب وغریب سامان تجارت سے لدے ہوئے نیچے کی طرف دریا کی مانند جوان کا ہمسفر تھا جاتے تھے۔ یہی نہیں جب وِل ابھی بچہ تھا تو دنیا کے ایک بڑے حصہ میں خوفناک لڑائی چھڑ گئی، اخبارات کے کالم فتح و شکست کی خبروں سے معمور ہوتے تھے، زمین گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز سے گونج اٹھتی تھی اور اکثر اوقات کئی مسلسل دن تک اور میلوں تک چاروں جانب نیک اور

غریب لوگوں کو میدانوں میں محنت کرنے سے لڑائی کے ہنگامہ اور شور و شغب کی آوازیں گھبرا دیتی تھیں۔ وادی میں ایک زمانہ تک ان سب کے متعلق کچھ نہیں سنا گیا لیکن آخر کار ایک سپہ سالار فوج کو درے کی دوسری جانب لیگیا اور تین دن تک سوار اور پیدل، توپ و قرنا کی آوازوں میں گرنی سے نیچے کی طرف جوق در جوق جاتے رہے۔ تمام دن یہ لڑکا (ول) کھڑا ہوا انکو دیکھتا رہا۔ باقاعدہ مارچ زرد چہرے، حجامت بڑھی ہوئی، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، اڑے ہوئے رنگ کے نشان اور پارہ پارہ علم ان سب نے اسکو ایک قسم کی تکان، رحم اور تعجب کے احساسات سے بھر دیا اور رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد وہ توپوں کی گرج اور گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز اور جنگ کی آواز بازگشت کو گرنی کے اوپر اور نیچے سنتا رہا۔ وادی میں کسی نے اس لڑائی کے حشر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں سنا کیونکہ ان لوگوں نے اس مصیبت کے زمانے میں گپ شپ اڑانا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اسکے باوجود ول کو ایک امر صاف طور پر نظر آتا تھا کہ ایک آدمی بھی اس مہم سے لوٹ کر نہیں آیا یہ سب کہاں گئے؟ تمام پیدل مسافر اور سبک رفتار جلد فروش اپنے عجیب و غریب سامان تجارت کے ساتھ کہاں گئے؟ تیز قدم گاڑیاں کہاں گئیں؟ دریا کا پانی ہمیشہ نیچے کی طرف بہتا ہوا اور ہمیشہ اوپر سے تازہ دم ہو کر کہاں جاتا ہے؟ یہانتک کہ ہوا بھی اکثر وادی کے نشیب میں بہتی اور اپنے ساتھ گرے ہوئے پتوں کو نیچے کی طرف پھینکدیتی ہے۔ اسکو جاندار اور غیر جاندار اشیا کی یہ ایک بہت بڑی سازش معلوم ہوتی تھی کہ وہ سب کے سب تیزی اور خوشی کے ساتھ نیچے کی طرف جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف پیچھے رہگیا ہے اس لکڑی کے مانند جو راستہ پر پڑی ہوئی ہو۔ بعض اوقات اس امر کا نظارہ اسکو خوش کر دیا کرتا تھا کہ کس طرح مچھلیاں دریا کی اوپر کی جانب چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ تمام دنیا نیچے ایک نامعلوم دنیا کی طرف جارہی ہے کم از کم مچھلیاں تو اسکے ساتھ شرط وفاداری نباہ رہی ہیں۔

ایک صبح اس نے گرنی کے مالک سے پوچھا کہ دریا کہاں جاتا ہے؟

وہ وادی کے زیریں حصہ میں کئی گرنیوں کو ــــ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے اسٹرڈک تک ۲۰ گرنیوں کو ــــ چلاتا اور پھر بھی تھکتا نہیں ہے۔ پھر وہاں سے نیچے کے ممالک میں جاتا، بہت بڑے اناج کے ملک کو سیراب کرتا اور چند خوبصورت شہروں میں سے جہاں لوگوں کا بیان ہے کہ بادشاہ یکہ و تنہا رفیع الشان محلوں میں جنکے دروازوں کے سامنے سنتری ٹہلتا رہتا ہے رہتے ہیں گزرتا ہے پھر وہ پلوں کے نیچے سے جنکے اوپر پتھر کے مجسمے جو پانی کو دیکھتے اور مسکراتے ہیں کیونکہ وہ پانی کے دیکھنے کے بڑے مشتاق ہیں نصب کئے جاتے ہیں گزرتا ہے پھر وہ ریت اور کیچڑ کے درمیان سے ہو کر آگے ہی آگے جاتا۔ تا آنکہ اس دریا میں جا گرتا ہے جہاں جزائر "غرب الہند" سے تمباکو اور طوطے لانے والے جہاز ہیں۔ ہمارے اس مقام سے گاتا ہوا جب یہ دریا گذرتا ہے تو اسکو بڑا فاصلہ طے کرنا باقی رہتا ہے

وِل نے پوچھا کہ بھلا سمندر کیا بلا ہے؟

گرنی کا مالک چیخ اٹھا۔ خدا تم سب کی مدد کرے سمندر خدا کی مخلوقات میں عظیم ترین چیز ہے۔ سمندر وہ ہے جہاں دنیا کا تمام پانی بھاری پانی کی ایک بڑی جھیل میں جا گرتا ہے سمندر میرے ہاتھ کی طرح مسطح اور بچے کی طرح بےگناہ ہے لیکن لوگ وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ جب ہوا چلتی ہے تو اس میں پانی کے ایسے پہاڑ پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے زبردست ترین پہاڑوں سے بڑے ہوتے، ہماری اس گرنی سے بدرجہا بڑے جہازوں کو نگل جاتے اور ایسا شور کرتے ہیں کہ تم میلوں تک زمین پر انکی آواز سن سکتے ہو انہیں بھینسے سے پانچ گنا بڑی مچھلی ہے اور ایسا پرانا سانپ ہے جو ہمارے اس دریا کے اتنا لمبا اور اس دنیا کے اتنا قدیم ہے آدمی کیطرح اسکے چہرہ پر مونچھیں ہیں اور سر پر چاندی کا تاج ہے۔

وِل دل میں خیال کرنے لگا کہ اس نے ایسی چیز کبھی نہیں سنی۔ اس نے دنیا اور اسکے تمام خطرات اور عجائبات کے متعلق جو دو دریا کے نیچے واقع ہے سوالات کا طومار باندھ دیا یہاں تک کہ بوڑھا مالک مجبور و متاثر ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر لیگیا جہاں سے وادی اور میدان صاف طور پر نظر آتے تھے۔ آفتاب غروب ہونیکو تھا اور صاف و شفاف آسمان پر آفتاب نیچے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ شام کی زرد دھوپ میں ہر چیز صاف اور خوبصورت نظر آتی تھی۔ وِل نے اپنی زندگی میں ملک کی اتنی وسعت کو نہیں دیکھا تھا وہ مبہوت کھڑا ہوا تھا ایک متسلط اور فاتحانہ جذبہ نے اسکے جسم اور روح پر قبضہ پا لیا۔ اس کا دل سینہ میں اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ سانس نہ لے سکا منظر ـــــ شہر، جنگل، میدان، دریا کا درخشاں پل اور زمین کا گوشہ جو چمکدار آسمان کے گوشہ کو مس کرتا تھا ـــــ اسکی آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ آفتاب چکر لگاتا ہوا اور جب رخ بدلا تو ان عجیب شکلوں کو دور پھینکتا ہوا جو خیال کے سریاں کے ساتھ غائب ہو جاتے اور اپنی جگہ دوسرے خیالات کو دیدیتے ہیں معلوم ہوا۔ وِل نے اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور زار زار رونے لگا۔ غریب مالک گرنی نے پریشانی اور تذبذب میں یہی مناسب خیال کیا کہ اسکو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر خاموشی کے ساتھ گھر واپس لیجائے۔

اس دن سے وِل کا دل نئی نئی آوازوں اور امیدوں کا کاشانہ تھا، ایک نامعلوم شے اسکے دل سے رسہ کشی کرتی تھی بہتا ہوا پانی جب وہ اس کے بہاؤ پر خیال آرائی کرتا تو اپنے ساتھ اسکی آرزوں کو بہالیجاتا تھا، ہوا جب بے شمار درختوں کی چوٹیوں کو ایک ادا سے چھیڑتی ہوئی گزرتی تو اسکو جرأت انگیز الفاظ میں مبارکباد کے ترانے سنایا کرتی تھی۔ شاخیں نیچے کی طرف اشارہ کرتی تھیں، صاف اور کھلی سڑک جو زاویہ بناتی ہوئی بل کھاتی ہوئی پستی کی جانب تیز تیز جاتی اپنی درخواستوں سے اس کا دل ٹکڑے کرتی تھی۔ اس نے بلندی پر بیٹھکر اپنی زندگی کے بہترین اوقات نیچے دریا کی روانی اور چاروں طرف ہوا اور خطہ ہائے زمین کے دیکھنے میں صرف کئے، وہ ان لکہ ہائے ابر کو غور سے دیکھتا رہتا جو آہستہ خرام

ہواؤں کے کاندھوں پر سفر کرتے اور اپنے ارغوانی سایہ کو میدانوں کے بیچ سے کھینچ لیجاتے تھے یا پھر وہ کبھی راستہ کے کنارے کھڑا ہو جاتا اور گاڑیوں کا جو دریا کے کنارے کنارے نیچے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی جاتی تھیں اپنی نگاہوں سے تعاقب کرتا تھا۔ ہر وہ چیز جو اس راستہ سے جاتی چاہے ابر ہو یا گاڑی چڑیا ہو یا چشمہ کا بلوریں پانی اس جیون خواہش کے اندر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکا دل بھی اسکے ساتھ اڑا چلا جا رہا ہے۔

سائنسدان اور اہلِ علم ہم سے بیان کرتے ہیں کہ ملاحوں کے تمام حوادثات اور اقوام و قبائل کے وہ تمام ایکدوسرے کے خلاف اقدامات اور جارحانہ کارروائیاں جنکی اقواموں اور باقیات الصالحات سے پرانی تاریخ بھرپور ہے۔ نتیجہ ہے "طلب اور رسد" کے مشکل قواعد اور ایک قسم کی فطری جبلت کا کہ سستی خوراک حاصل کیجائے۔ غور و خوض کرنیوالے کے لئے یہ ایک کمزور، بودی اور قابلِ رحم تشریح نظر آتی ہے۔ قبائل جو شمال و مشرق سے امنڈ آئے اگر فی الواقع وہ آگے کو دوسروں کے پیچھے سے ڈھکیلنے سے بڑھے تھے تو اسکے ساتھ ہی ساتھ ہم کو اقرار کرنا پڑیگا کہ جنوب و مغرب کے مقناطیسی اثر سے کھینچ آئے تھے۔ دوسرے ممالک کی شہرت ان تک پہنچی، لازوال[۵۱] شہر کا نام انکے کانوں میں گونجا۔ وہ نوآباد نہیں بلکہ زائرین تھے۔ وہ شراب سونا اور دھوپ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے مگر انکے دلوں میں اس سے زیادہ شریفانہ اور اعلیٰ و ارفع مقصد پنہاں تھا۔ وہ وہی اضطراب اور نوعِ انسان کی بیش ترین تکلیف جو عظیم الشان کامیابیوں کے درواز کھولتی اور المناک ناکامیوں کا منحوس چہرہ دکھلاتی ہے وہ جس نے اکارس[۵۲] کے ساتھ اپنے بازو ملائے تھے، جس نے کولمبس کو غیر آباد اور مواج بحرِ ظلمت میں بھجوایا تھا اسی نے ان وحشی اور بربری قبائل کو آمادہ کیا ہمت دلائی اور اس خطرناک سفر پر تیار کیا۔ ایک مشہور قصہ ہے جو نہایت عمدگی کے ساتھ انکی اصلی حالت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان جہاں گردوں کی ایک سفر کرنیوالی جماعت نے ایک لوہے کا جوتہ پہنے ہوئے بوڑھے کو پایا بوڑھے نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو، متفقہ آوازمیں انہوں نے جواب دیا کہ "لازوال شہر" کو اس نے انکو مایوس نگاہوں سے دیکھا اور کہا کہ میں نے اسکو دنیا کے بہت بڑے حصہ میں ڈھونڈھ ڈالا۔ جوتہ جو میں پہنا ہوا ہوں ایسے تین جوڑے میں نے اس زیارت کے شوق میں پھاڑ ڈالے ہیں اور چوتھا اب میرے

---

۵۱ لازوال شہر سے مراد روم ہے جسکا نام کسی زمانے میں اٹلی کے وحشی اور بربری اقوام کے حملوں کے لئے محرک کا کام دیتا تھا۔

۵۲ اکارس، ڈیڈالس کا بیٹا اور یونانی دیومالا کا ہوشیار کاریگر جس نے پرواز کے لئے پر اور بازو بنائے تھے۔ اکارس آفتاب کے قریب تک جس نے اسکے بازو پگھلا دئیے تھے اڑا اور بازوؤں کے پگھلنے کی وجہ سے سمندر میں گر پڑا وہ "اکارین سمندر" اسی کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۲

پاؤں کے نیچے گھس رہا ہے تاہم ابتک جیلے اس شہر کا پتہ نہیں پایا بوڑھا مڑا اور انکو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے راستہ پر ہولیا۔

تاہم یہ واقعہ میدان کے متعلق دِل کے ارادہ کی گہرائی کا بہت کم مقابلہ کرسکتا ہے۔ اگر وہ صرف میدانوں میں دوڑ تک جاسکتا تو وہ محسوس کرسکتا تھا کہ اسکی نگاہیں صاف اور روشن ہوجائینگی اور اسکی سماعت زیادہ خوشگوار ہوجائیگی اور اسکا سانس زیادہ آرام کے ساتھ چلنے لگیگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موجودہ جگہ میں دوسری جگہ سے اکھاڑ کر لگایا گیا تھا اسلئے سوکھ رہا تھا وہ پردیس میں تھا اور وطن کے لئے بیچین۔ رفتہ رفتہ نیچے کی دنیا کے متعلق اسکے پراگندہ خیالات میں ایک سکون پیدا ہوگیا۔ دریا جو ہمیشہ رواں اور ترقی پذیر تھا یہانتک کہ عظیم الشان سمندر میں جا ملتا تھا، خوبصورت آدمیوں سے مملو گنجان شہر، گانیوالوں کی جماعتیں، مرمریں محل جو رات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مصنوعی طلائی ستارو ں (قندیلوں) سے بقعۂ نور بنی رہتی ہیں، عالیشان گرجا، قابل وفاضل (جامعات (یونیورسٹیاں) بہادر افواج اور ناقابلِ شمار دولت جو نہ قانون میں جمع کیگئی ہے، امیرانہ رعب دار آواز جو آفتاب کی روشنی میں بلند ہوتی ہے اور دبے پاؤں آدھی رات کے قتل کی تیزی ان سب کو اس نے اب اپنے خیالات میں مجتمع کرلیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ وطن کے لئے بیمار تھا۔ اس کا پیکر ٹھہرتا ہے وہ اس شخص کا سا تھا جو دھندلکے میں سویا ہوا ہو اور اپنے ہاتھوں کو قسم قسم کے رنگ اور طرح طرح کی آواز والی زندگی کی طرف محبت سے بڑھاتا ہو۔ یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ وہ بیمار اور رنجیدہ تھا۔ وہ جانیگا اور مچھلیوں سے کہیگا کہ وہ اپنی زندگی کی خاطر پیدا کئے گئے تھے، انکو کیڑوں، بہنے والے پانی اور دریا کے کنارے ایک سوراخ سے زیادہ کی ہوس نہیں ہے لیکن اسکا خمیر اور طرح تیار ہوا تھا خواہشات اور آرزوؤں سے مملو۔ رنگا رنگ جلوؤں سے معمور دنیا بھی اسکی امیدوں کے دریا کا قطرہ تھی سچی زندگی اور روشن دھوپ دور میدان میں پائی جاتی ہے آہ کہ مرنے سے پہلے اس آفتاب کی روشنی کو دیکھنا، زریں خطہ دنیا میں خوش خوش سیر کرنا، تعلیم یافتہ گویوں کی جان نواز موسیقی اور گھنٹوں کی گرجا کے شیریں آواز کا سننا، خوشی کے میدان میں مسرت کے عالم میں پھرنا اور تعطیلات میں باغوں کی سیر کرنا کیا ہی دلنواز ہوگا! وہ چیخ اٹھا کہ "مچھلیو اگر تم صرف اپنی ناک کو نشیب کی طرف موڑ لو تو تم ان فسانوی پانیوں میں نہایت آسانی سے تیروگی، تمھارے سروں پر سے بادل کے مانند بڑے بڑے جہازوں کو گزرتے ہوئے اور بڑے بڑے "پانی پہاڑوں" کو تمام دن مترنم اور موسیقی آوازیں گاتے ہوئے سنوگی مگر افسوس کہ مچھلیاں صبر وتحمل کے ساتھ اپنے قدیم رخ کو ہی دیکھتی رہیں تا آنکہ دِل بمشکل سمجھ سکتا کہ اسکو اس پر ہنسنا چاہیئے یا رونا۔

اس اثنا میں مال دِل کے بازو سرک سے کسی ایسی چیز کے مانند جو تصویر میں نظر آتی ہو گزر گیا۔ شاید اس نے کسی مسافر سے سلام وپیام کا تبادلہ کیا یا ایک بوڑھے شریف آدمی کو سفری ٹوپی پہنے گاڑی کے دریچہ میں بیٹھا ہوا دیکھا ہو

لیکن یہ فی الحقیقت اس کا واہمہ تھا کہ اسنے اپنے خیالات میں ایسا تصور کیا آخر کار اسکے خیالات کے بدلنے کا وقت آگیا مالک گرنی نے جو ایک حد تک حریص آدمی تھا اور جائز منافع کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا گرنی کو ایک چھوٹی سی سرائے میں بدل لیا اور خوش قسمتی کہ فائدہ کے مواقع حاصل ہونیکے سبب کئی اصطبل بھی بنا لئے اور اس طرح سڑک پر ہوٹل اور سرائے کے مالک کی حیثیت اختیار کر لیا۔ اب ول کا فرض تھا کہ مسافرین کی خاطر و تواضع کرے۔ جب وہ ناشتہ کرنیکے لئے گرنی کے باغ کے سرے پر چھوٹے سے سائبان کے نیچے بیٹھتے تھے تو آپ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ انکی گفتگو سننے کے لئے اسنے اپنے کانوں کو کھلا رکھا ہوگا جب وہ شراب اور امولٹ (omelette) لایا کرتا تھا تو باہر کی دنیا کے متعلق بہت ساری نئی باتیں اسنے معلوم کی ہونگی۔ اکثر اوقات وہ تنہا مہمانوں کے ساتھ گفتگو اور بحث کا سلسلہ چھیڑ دیا کرتا تھا اور دانشمندانہ سوالات اور متانت آمیز توجہ کے ساتھ نہ صرف اپنی خواہش کو پورا کرتا بلکہ مسافرین کے دلوں کو موہ لیتا اور انکی اچھی رایوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ بہت سے مسافرین نے بوڑھے بوڑھے سے خدمتگار لڑکے کی سفارش کی اور ایک پروفیسر صاحب تو اسکو اپنے ساتھ لیجانے کے بڑے خواہشمند تھے تاکہ شہر میں اسکو عمدہ اور بہتر تعلیم دلا سکیں۔ گرنی کا مالک اور اسکی بیوی اس سے بڑے متعجب ہوئے اور اس سے زیادہ خوش بھی سرائے کھولنے کے خیال کو وہ بہت اچھا خیال کرتے تھے۔ بڈھا اکثر رائے زنی کرتا تھا کہ تم دیکھتی ہو کہ اس میں سرائے کا مالک بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے وہ سوائے اسکے اور کچھ نہ کرسکیگا۔ اس طرح زندگی نہایت اطمینان کے ساتھ سوائے ول کے سب کے لئے گذرتی گئی۔ ہر ایک گاڑی جو سرائے کو چھوڑ کر چلی جاتی اپنے ساتھ ول کا ایک حصہ لیجاتے ہوئے معلوم ہوتی اور جب لوگ مذاق کے طور پر اسکے لئے جگہ پیش کرتے تو بمشکل وہ اپنے جذبہ پر قابو پا سکتا تھا۔ راتیں گذرتی گئیں اور ان میں وہ برابر خواب دیکھتا گیا کہ وہ مستعجل نوکروں کے ذریعہ نیند سے اٹھایا گیا ہے کہ ایک خوشنما اور شاندار گاڑی دروازہ پر اسکو نیچے میدان میں لیجانے کے خیال سے انتظار کر رہی ہے۔ راتیں اسی حالت میں گذرتی گئیں یہانتک کہ یہ خواب جو اولاً اسکو تمامتر مسرت معلوم ہوتے تھے اب رنج اور مایوسی کی صورت اختیار کرنے لگے۔ رات کی آواز اور گاڑی کے انتظار نے اسکے دل میں مستقل جگہ اختیار کر لی ایسی کہ بیک وقت اسکی آرزو بھی کہلائے اور اس سے خوف بھی۔

ایک دن جب ول سولہویں سال میں تھا ایک موٹا مگر نوجوان آدمی غروب آفتاب کے وقت رات گذارنے آیا وہ "صابر نظر آنے والا" خوش آدمی تھا جو ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ جب ڈنر تیار ہو رہا تھا تو وہ سائبان میں ایک کتاب دیکھنے کے لئے بیٹھ گیا لیکن جونہی اسنے ول کو غور سے دیکھا کتاب ایک طرف رکھدیا وہ صاف طور پر ان لوگوں میں

سے ایک معلوم ہوتا تھا جو زندہ آدمیوں کو کاغذ اور سیاہی کے آدمیوں پر ترجیح دیتے ہیں خود وِل نے اگرچیکہ پہلی نگاہ میں
نوواردکی ذات میں کوئی خاص کشش نہیں دیکھی لیکن بہت جلد اسکی معقول اور سنجیدہ باتوں میں مسرت محسوس کرنے لگا
اور آخرکار اسکے اخلاق اور عقلمندی کا گرویدہ ہوگیا - دونوں بہت بڑی رات تک بیٹھے رہے اور تقریباً دو بجے رات کو
وِل نے اپنا دل نوجوان کے سامنے کھولکر رکھدیا اور بیان کیا کہ کس طرح وہ وادی کو چھوڑنے کی آرزو کرتا رہا ہے اور
میدان کے شہروں سے اسکی کیسی درخشاں امیدیں وابستہ ہیں نوجوان نے سیٹی بجائی ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میرے
نوجوان دوست فی الحقیقت اس چھوٹی سی عمر میں تم بڑے خیالی آدمی ہو اور بہت سی ایسی چیزوں کے آرزومند ہو جن کو تم
نہیں پاسکتے - تم یہ سنکر شرمندہ ہوگے کہ تمہارے ان فسانوی شہروں میں بھی بہت سے لوگ تمہاری جیسی حماقت میں
گرفتار اور یہاں پہاڑوں میں آنیکے لئے بیتاب ہیں - مجھے یہ بیان کرنے دو کہ وہ لوگ جو نیچے میدانوں میں جاتے ہیں
بہت جلد پھر وہاں سے واپس آنیکی دلی آرزو کرتے ہیں - ہوا نہ وہاں اس قدر صاف و سبک ہے نہ سورج یہاں سے
زیادہ تاباں اور روشن ہے - رہے خوبصورت مرد و عورت تو تم ان میں سے اکثروں کو چیتھڑے لگائے اور انکے چہروں
کو خطرناک بیماریوں سے بدنما پاؤگے غریبوں اور حساس لوگوں کے لئے شہر ایسی بری جگہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے ہاتھوں
خودکشی کرنیکو ترجیح دیتے ہیں -

وِل نے جواب دیا کہ آپ مجھے نہایت سیدھا سادھا اور بیوقوف خیال کرتے ہیں - میں وادی سے باہر نہیں گیا
لیکن یقین کیجئے کہ اسکے باوجود اپنی آنکھوں کو کام میں لایا ہے - مجھے معلوم ہے کہ ایک چیز کی زندگی دوسرے پر کیسے منحصر
ہوتی ہے مثلاً میں جانتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو پکڑنے اور ان سے ملنے کی غرض سے کس طرح مچھلی بھنور میں چکر لگاتی ہے
اور گڈریہ جو بھیڑوں کو مکان واپس لیجاتے ہوئے ایسا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے صرف ڈنر کی غرض اسمیں پوشیدہ ہوتی
ہے میں نے تمہارے شہروں میں تمام چیزوں کو اچھا اور قابل تعریف پانے کا کبھی خیال ظاہر نہیں کیا یہ وہ شئی نہیں ہے
جس سے میرے دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے - اگرچیکہ کسی زمانے میں یہ بھی ایک وجہ تھی اگرچیکہ میں ہمیشہ یہیں رہا ہوں،
لیکن سالہائے گذشتہ کے اندر سوالات کے ذریعہ بہت ساری باتیں معلوم کی ہیں جو یقیناً میرے پرانے خیالات کا مدار
ہیں لیکن کیا تم مجھے وہ تمام چیزیں دیکھے بغیر جو دیکھنے کے قابل ہیں اور وہ تمام کئے بغیر جو آدمی کرسکتا ہے چاہے اچھا ہو یا برا
کتے کی طرح مرنے دوگے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کے تمام ایام اس سڑک اور دریا کے درمیان گزار دوں اور
بغیر اپنی زندگی کو اعلیٰ زینہ پر پہونچانے کی کوشش کئے اپنی زندگی کے انفاس پورے کردوں، وِل چیخ اٹھا کہ ایسی زندگی
پر میں اچانک موت کو ترجیح دیتا ہوں -

نوجوان نے کہا کہ ہزاروں آدمی تمھاری سی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی بھی رنجیدہ نہیں ہے۔

وِل نے آرزومندانہ لہجہ میں کہا کہ اگر ہزاروں آدمی ایسا چاہتے ہیں تو کوئی ان میں میری جگہ کیوں نہیں سنبھالتا؟ کامل اندھیرا چھایا ہوا تھا سائبان میں لیمپ لٹک رہا اور میز اور گفتگو کرنے والوں کے چہرہ کو روشن کر رہا تھا، رات کے اندھیرے کے خلاف کمان کی جالیوں پر کی بیل نظر آتی تھی، فریہ نوجوان اٹھا۔ وِل کا ہاتھ پکڑ کر کھلے آسمان کے نیچے لیگیا اور اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا تم کبھی ستاروں کو بھی دیکھا ہے؟ ہزاروں مرتبہ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کیا ہیں؟ انکے متعلق مختلف اوقات میں کئی خیالات میرے ذہن میں آتے رہے ہیں نوجوان نے کہا ان میں ہمارے ایسے عالم ہیں بعض ان میں سے چھوٹے اور اکثر ان میں سے لاکھوں درجہ بڑے ہیں بعض ان میں سے جن کو تم ٹمٹماتے دیکھتے ہو نہ صرف مستقل عالم ہیں بلکہ مجموعہ ہائے عالم ہیں ان میں سے ہر ایک میں کیا ہے؛ ہم نہیں جانتے ممکن ہے کہ ہماری تمام مشکلات کا جواب یا ہمارے تمام مصائب کا علاج ہو بریں ہم ان تک ہم نہیں پہونچ سکتے ہمارے ان قریب ترین ہمسایوں تک پہونچنے کے لئے ہوشیار سے ہوشیار کاریگر بھی کوئی جہاز تیار کرسکتا ہے اور نہ ہم میں سے معمر ترین انسان کی زندگی ہی ایسے طویل سفر کے لئے کافی ہوسکتی ہے جب ایک بڑی لڑائی میں شکست ہوتی ہے یا کوئی عزیز دوست داغ مفارقت دیجاتا ہے یا جب ہمارے خیالات میں جوار بھاٹا ہوتا ہے تب بھی یہ ستارے بغیر کسی تکان کے چمکتے رہتے ہیں ہم انسانوں کی پوری فوج یہاں نیچے مجتمع کھڑی ہوکر اپنی پوری آواز سے چیخے تب بھی ہماری آواز ان تک معمولی سرگوشی کی صورت میں بھی نہیں پہونچ سکتی اگر ہم بلند ترین پہاڑ پر بھی چڑھجاویں تو ان سے قریب نہیں ہوسکتے جو کچھ ہم کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں باغ میں انکے پیچھے کھڑے ہوجائیں اپنی ٹوپیاں سروں سے اتارلیں تاکہ تاروں کی روشنی ہمارے سروں پر چمکتی رہے میرا سر ذرا کنجا ہے اسلئے میرا دعویٰ ہے کہ تم اسکو تاریکی میں چمکتا ہوا دیکھو گے کہو اب کیا خیال ہے؟

وِل نے کہا کہ "میں دیکھتا ہوں کہ ہم پنجرے میں بند ہیں"

کچھ اسی طرح" کیا تمنے کبھی کسی گلہری کو پنجرے میں بند اور دوسری گلہری کو فلسفیانہ انداز میں اپنے گھونسلے میں بیٹھے ہوئے غور کرتے دیکھا ہے؛ مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بیوقوف ہے"۔

(۲)

پادری کی بیٹی

چند سال کے بعد ایک ہی سرما میں بوڑھوں کا انتقال ہوگیا جنکی اونکے متبنی بیٹے نے خوب تیمارداری کی اور مرنیکے بعد جی بھر کے خاموشی کے ساتھ ماتم کیا لوگوں نے جو اسکے عجیب وغریب خیالات سے واقف ہوگئے تھے خیال کیا کہ وہ جلد جائداد فروخت کرکے قسمت آزمائی کی دھن میں دریا کے نیچے چلا جائیگا مگر دل کی طرف سے اس قسم کے ارادہ کا کوئی نشان ظاہر نہوا برخلاف اسکے اس نے سرائے کے کاروبار کو عمدہ پیمانہ پر چلانا شروع کردیا اور چند ملازم بھی اس غرض کے لئے نوکر رکھ لئے اس طرح وہ ایک مہربان، منطقی اور بدگھو لنے" یا نتایوں میں ۲ فٹ ۳ انچ، مضبوط جسم اور دوستانہ آواز کی صفات سے متصف ہوکر رہنے لگا۔ بہت جلد اس نے ضلع اور گرد و نواح میں عجیب قسم کے آدمی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی پہلے پہل یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ابتدا ہی سے عجیب قسم کا آدمی تھا اور گفتگو میں ہمیشہ پامال اور پیش پا افتادہ اسناد سے استدلال واستشہاد کرکے ذوق صحیح وعقل سلیم کا ثبوت دیچکا تھا لیکن جس چیز نے اسکے نام کا ڈنکا بجادیا اور شہرت کے پروں پر اس کے نام کو اڑایا وہ پادری کی لڑکی مارجزی کے ساتھ کورٹ شپ کا واقعہ تھا۔

پادری کی مارجزی ۱۹ سے کچھ کم تھی اور دِل بیس سال کے قریب تھا وہ خوبصورت اور اس خطہ ملک میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی یہ خاندانی اثر کا ثمرہ تھا وہ بڑی خوددار اور مغرور تھی اور نہایت خودداری کے ساتھ اس نے شادی کے کئی پیشکش اور پیامات کو ٹھکرادیا تھا جسکی وجہ سے اطراف وجوانب میں لوگ اسکو برا بھلا کہتے تھے لیکن فی الحقیقت وہ نیک اور اچھی لڑکی تھی اور ایسی اچھی تھی کہ کسی آدمی کو بھی اپنے سے راضی رکھ سکتی تھی۔

دل کو اگرچہ اسکے مکان سے پادری کدہ اور چرچ صرف دو میل تھے اسکو دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا وہ صرف اتوار کو وہاں جایا کرتا تھا اتفاق کہ پادری کدہ کی مرمت اور درستی کی ضرورت پیش آئی اور پادری اور اسکی لڑکی نے تقریباً ایک مہینہ تک گھٹے ہوئے شرائط پر سرائے میں بسر کیا، سرلئے اور گرنی کی آمدنی اور مالک گرنی کی کفایت شعاری کیوجہ سے ہمارا دوست مالدار ہوگیا تھا اسکے علاوہ وہ طبیعت کی عمدگی اور عقلمندی کے لئے جن کا شادی کے معاملہ میں خاص درجہ ہے لوگوں میں مشہور تھا اس وجہ سے انکے بدخواہوں میں یہ افواہ گرم تھی کہ پادری اور اسکی لڑکی نے آنکھ بند کرکے بغیر کسی غرض کے وہاں رہائش اختیار نہیں کی ہے۔ وِل دنیا میں آخری آدمی تھا جسکو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دیکر شادی کرنے پر راضی کیا جا سکتا اگر آپ صرف اسکی ان خاموش آنکھوں کو دیکھیں گے جو صاف ہونیکے باوجود شادابی میں پانی کے چشمے معلوم ہوتی ہیں اور جن میں ایک قسم کی ایسی شفاف روشنی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی حصہ سے آرہی ہے تو آپ فوراً سمجھ جائینگے کہ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے دل کا جائزہ دار ہے اور اس پر ہمیشہ مستقل اور جما ہوا رہیگا۔ یہ سوال البتہ کیا

جاسکتا ہے کہ مارجری دل کی صاف گوئی اور استقلال میں مدمقابل ثابت ہوگی کہ نہیں، یا ان میں سے کون شادی کے بعد حکمرانی کریگا، لیکن مارجری نے شادی کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور اپنے باپ کے ساتھ نہایت خاموشی اور بے تعلقی کے ساتھ رہنے لگی۔

چونکہ موسم کا آغاز تھا اسلئے وِل کے ہاں مسافرین کم اور دیر سے آتے تھے مگر یاسمن کھلنے لگی تھی موسم ایسا معتدل تھا کہ جماعت جابلی کے اندر ڈر رکھایا کرتی تھی دریا کی روانی کی خوشگوار آواز اور جنگل کے طیور کے ترانوں کی گونج انکے کانوں میں آتی تھی۔ وِل بہت جلد ان کھانوں میں ایک خاص قسم کی فرحت محسوس کرنے لگا۔ پادری ایک حد تک سست ساتھی اور میز پر او نگھنے کا عادی تھا لیکن کبھی اسکی زبان سے بیرحمانہ اور سخت کلمہ نہیں نکلا، پادری کی لڑکی اپنے ظروف کی انتہائی خوبصورتی کے ساتھ جس کا تصور ممکن ہے تعریف کیا کرتی تھی جو کچھ وہ کہتی ایسا اچھا اور خوبصورت معلوم ہوتا کہ وِل کے دل میں اسکی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا جب وہ آگے کو اُگنے والے سرو کے درخت کی طرف پشت کئے جھکتی تو وہ اسکے چہرہ کو دیکھ سکتا اسوقت اسکی آنکھیں نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ برق پاشی کرتی نظر آتی تھیں روشنی اسکے بالوں کے اطراف دستی کی طرح حلقہ کئے معلوم ہوتی تھی، اسکے زرد گال کو ایک قسم کی شے جو بشکل تبسم کہی جا سکتی ہے تھر تھرا دیا کرتی تھی تو وِل ایک خوشگوار یاس کے عالم میں اس کا نظارہ کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکتا تھا اسکی تنہائی کے لمحات تک میں وہ اس قدر مکمل، نیچے پاؤں کی انگلیوں سے لیکر اسکے لباس کے دامن تک جاندار نظر آتی تھی کہ بقیہ مخلوقات اسکے مقابلہ میں بمنزلۂ صفر نظر آتی تھیں۔ اگر وِل اسکو چھوڑ کر اطراف کے منظر کو دیکھتا تو درخت بے حس اور بے معنی نظر آتے تھے، بادل فضائے آسمان میں مردہ چیزوں کی طرح معلق نظر آتے تھے یہانتک کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی بے نور اور خوبصورتی و جمال سے معرا نظر آتی تھیں۔ اس لڑکی کی رعنائی و خوبصورتی کے مقابلہ میں تمام وادی کا حسن و جمال پھیکا پڑ جاتا تھا۔

اپنی سوسائٹی میں وِل ہمیشہ اپنے بنی نوع کا مشاہدہ کرتا تھا لیکن مارجری کے معاملہ میں اسکا مشاہدہ تکلیف دہ حد تک حریص ہوگیا تھا جو کچھ وہ کہتی سنتا اور ساتھ ہی ساتھ اسکی آنکھوں سے دل کے ان مطالب و مضامین کے نقوش کو جو بیان نہیں کئے جاسکتے پڑھا کرتا تھا بہت سی نیک، ہمدردانہ اور پرخلوص تقریروں کی گونج اسکے گوش دل میں سنائی دیتی تھی وہ ایک ایسی روح سے واقف ہوگیا تھا جو نہایت خوبصورتی کیساتھ اسپر چھا رہی تھی۔ بغیر کسی شک و شبہ اور بغیر کسی آرزو کے کامل اطمینان میں لپٹی اور بسی ہوئی۔ اسکے چہرہ کو اسکے خیالات سے علیحدہ کرنا ناممکن تھا، اسکی آواز کی تبدیلی، اسکی آواز کی سریلی موسیقیت، اسکی آنکھوں کی روشنی اور اسکے چہرہ کے مختلف رنگ اور حرکات و سکنات جو تلخ اور شیریں الفاظ سے اس اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے مانند جو گوستے کی آواز کو ہموار کرتے اور مترنم بناتے ہیں ہم آہنگ ان سب کا نقشہ

یا مارجری کی یاد کے ساتھ ول کے دل و دماغ پر کھنچ جاتا کرتا تھا اس کا اثر قصہ مختصر ایک ایسی شے تھا جسکی نہ تقسیم کی جاسکتی ہے اور نہ جسکو بحث و گفتگو کا آماجگاہ بنایا جاسکتا ہے بلکہ جسکو صرف اتصال و ابتہاج کے عالم میں محسوس کیا جاسکتا ہے ول کے لئے اسکا وجود بچپن کی یاد تازہ کرتا تھا اور اس کا خیال طلوع صبح، رواں پانی اور سب سے پہلے کھلنے والے گل بنفشہ اور یاسمن کے پیچھے پناہ گیر ہوتا تھا یہ بہار کے ان پھولوں کے مانند جو ہم میں اس لطیف اور نازک احساس اور پراسرار اجنبیت کے اثر کو از سر نو زندہ کرتے ہیں جو درصورت ثانی سالوں کی آمد کے ساتھ ساتھ زندگی کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں پہلی مرتبہ یا ایک طویل وقفہ کے بعد دوبارہ دیکھی ہوئی اشیا کی حقیقت ہے۔ محبوب کے چہرہ کا ایک ادنیٰ نظارہ انسان کے اخلاق و عادات کو از سر نو ابدی سرچشمہ سے سیراب کرتا اور تازگی بخشتا ہے۔

ایک دن ڈنر کے بعد ول صنوبر کے درختوں کے درمیان گشت کرنے لگا ایک یاس آگیں مسرت نے اسکو سر سے پیر تک ڈھانپ لیا اور جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اپنے آپ پر اور منظر پر ہنستا گیا۔ دریا آگے کو بڑھی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتا، ساز بجاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہوا میں ایک چڑیا زور سے گانے لگی پہاڑ کی چوٹیاں انتہادرجہ اونچی ہوتی دکھائی دینے لگیں اور وقتاً فوقتاً جب وہ انکو دیکھتا تو معلوم یوں ہوتا کہ ایک مربیانہ مگر محزون تشویش کے ساتھ اسکی نقل و حرکت کی نگرانی کررہی ہیں اسکو راستہ ایک ایسی اونچائی پر لیگیا جہاں سے میدان صاف نظر آتا تھا وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور ایک گہرے اور خوش آیند خیال میں مستغرق ہوگیا۔ میدان سامنے چاروں طرف اپنے شہروں اور طلائی دریا کے ساتھ نظر آتا تھا دنیا کی ہر شے سوائے پرندوں کے ایک بڑے حلقے کے جو نیچے اترتا، اوپر جاتا اور نیلی فضا میں چاروں طرف چکر لگاتا تھا خواب نوشین کے مزے لے رہی تھی۔ اسنے مارجری کا نام باآواز بلند دہرایا اور اسکی یہ آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوئی۔ اسنے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور مارجری کی صورت نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ خیالات و اوصاف کے جلو میں نمودار ہوگئی دریا ہمیشہ بہیگا پرندے زیادہ سے زیادہ اوپر اڑینگے تا آنکہ آسمان کو چھولیں گے اگرچہ اسکو بہتر دھوپ مل رہی تھی مگر اسنے خیال کیا کہ یہاں اپنی ہی وادی میں صبر کے ساتھ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بیٹھے رہنا فضول اور جنون نوازی ہے۔ دوسرے دن میز پر ول نے جبکہ پادری اپنا پائپ بھر رہا تھا ایک قسم کی سلسلہ جنبانی اور چھیڑ کا اس طرح آغاز کیا "مس مارجری میں نہیں جانتا کہ کبھی میں نے کسی سے تم سے زیادہ محبت کی ہو میں بہت بڑی دور تک سرد اور غیر مہربانی کا برتاؤ کرنے والا آدمی ہوں یہ میں دل سے نہیں چاہتا بلکہ یہ میرے عجیب و غریب طریقے غور و خوض کرنیکا نتیجہ ہے کہ لوگ مجھ سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں گویا کہ میرے اطراف ایک حلقہ کھنچا ہوا ہے آپ کے سوا جس کے سب باہر ہیں میں دوسروں کو گفتگو کرتے اور ہنستے دیکھتا ہوں مگر آپ تو قریب آگئی ہیں۔

اس نے دریافت کیا کہ مس مارجری اسکو ناپسند تو نہیں کرتی ہیں؟ مارجری نے کوئی جواب نہیں دیا پادری نے کہا کہ اسے لڑکی جواب دے۔ دِل نے کہا کہ پادری صاحب میں انکو مجبور کرنا نہیں چاہتا میری زبان خود اسوقت بند ہے میں اسکو استعمال نہیں کرسکتا اور وہ تو عورت ہے لیکن ابھی لڑکپن باقی ہے لیکن میں اپنی حد تک جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں چاہے لوگ اسکے معنی کچھ ہی لیں خیال کرتا ہوں کہ میں محبت میں گرفتار ہوں میں اپنے منھ میاں مٹھو بننا پسند نہیں کرتا ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے اگر مس مارجری اپنے نزدیک کچھ اور خیال کرتی ہیں تو کیا براہ مہربانی وہ اپنا سر ہلا دینگی؟

مارجری خاموش تھی اور اس نے ایسی کوئی علامت ظاہر ہونے نہ دی جس سے معلوم ہوتا کہ اس نے گفتگو سنی ہے دل نے پوچھا کیوں پادری صاحب یہ کیا بات ہے؟ پادری نے کہا کہ لڑکی کو بات کرنی چاہئے ہمارا یہ پڑوسی ای مارجری کہتا ہے کہ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے کیا تو اس سے محبت کرتی ہے ہاں یا نہیں؟ کہدے۔

مارجری نے لجاتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا کہ میں خیال کرتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے دِل خوشی سے پکار اٹھا کہ کافی ہے یہی میری خواہش تھی اور اسکے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں نہایت اطمنان کے ساتھ میز کے درمیان سے لیکر ایک منٹ تک رکھا۔

اپنی چلم کو دوبارہ منھ میں رکھتے ہوئے پادری نے کہا کہ "تمہاری شادی ہو جانی چاہئے" دِل نے کہا آپ غور کیجئے کیا یہ ٹھیک اور مناسب بات ہے؟ پادری نے جواب دیا یہ تو لازمی اور لابدی ہے۔ عاشق نے کہا "تب تو ٹھیک ہے"

دو یا تین دن دِل کیلئے بڑی مسرت کے عالم میں گذر گئے اگرچہ کہ باز دکھڑے ہونیوالا مشکل اس مسرت کو محسوس کرسکتا۔ وہ مارجری کے بالمقابل کھانے اس سے گفتگو کرنے اور اسکے باپ کی موجودگی میں اشتیاق بھری نظروں سے دیکھنے لگا لیکن اس نے اسکو تنہا دیکھنے کی کوشش کی اور نہ کسی اور طرح اپنے ابتدائی طرز عمل کو بدلا۔ اس سے شاید ایک حد تک لڑکی مایوس تھی اور یہ مایوسی نا واجب بھی نہ تھی لیکن اگر کسی کے تصور و خیال میں رات دن رہنا اور اسکی زندگی کی کایا پلٹ دینا کافی ہے تو پھر دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کامل طور پر مطمئن تھی کیونکہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی دِل کے دل سے دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ ندی کے کنارے بیٹھا ہوا گرداب اور بھنور کو، اپنے توازن کو برقرار رکھنے والی مچھلی کو اور جھکی ہوئی گھانس کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ تنہا باہر ارغوانی آسمان کے نیچے گھوما کرتا اور تمام کالی چڑیاں درختوں کی شاخوں سے اسکو جھانکا کرتی تھیں۔ وہ علی الصباح اٹھتا اور آسمان کو پہلے سے طلائی ہوتے دیکھتا اور روشنی کو پھاڑ کر آتی ہوئی

پر رقص وجست کرتے دیکھتا تھا۔ ان تمام اوقات میں وہ اکثر سوچا کرتا کہ اس نے ایسی چیزیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ کیا معمہ ہے کہ یہ سب چیزیں اب اسقدر مختلف نظر آتی ہیں؟ اسکی گرنی کے پھیوں کی آواز یا جھاڑوں کے درمیان ہوا کی سنسناہٹ اسکو حیران و مسحور کر دیتی تھی۔ انتہا درجہ مسحور کن اور طلسمی خیالات بن بلائے اسکے دل میں آیا کرتے تھے وہ اسقدر خوش تھا کہ راتوں کو سو نہ سکتا اور اسقدر بیچین تھا کہ مارجری سے علیحدہ ہو کر بمشکل اطمینان سے بیٹھ سکتا تھا۔ باوجود اسکے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ حاصل نہیں ہوئی بلکہ کھو گئی ہے۔ ایکدن جبکہ وہ تفریح سے واپس ہو رہی تھی دل نے مارجری کو باغ میں پھول چنتے ہوئے پایا۔ اسکے قریب پہونچا تو بازو یا زو دا ہستہ آہستہ چلنے لگا اور دریافت کیا کہ "کیا تم پھولوں کو پسند کرتی ہو؟ بلاشبہ میں انکو انتہا درجہ پسند کرتی ہوں کیا تم بھی پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ کیوں نہیں؟ مگر اتنا زیادہ نہیں جب کام تمام ختم ہو جائیں تو یہ ایک چھوٹا سا تفریحی مشغلہ ہے میں نے لوگوں کو اس سے حد درجہ محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتے جیسا تم کر رہی ہو۔ ٹھہرتے اور اوپر اسکی طرف دیکھتے ہوئے مارجری نے دریافت کیا کہ کس طرح؟ اس نے جواب دیا کہ انکو توڑتے ہوئے وہ جہاں ہیں وہیں بہت اچھے اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر تم دور جاؤ۔ مارجری نے کہا کہ میں خاص انکو اپنے لئے حاصل کرنا چاہتی ہوں تاکہ میں انکو اپنے دل کے پاس اور اپنے کمرہ میں رکھ سکوں۔ جب وہ یہاں اُگتے ہیں تو وہ مجھے خواہش دلاتے اور زبان حال سے کہتے ہیں کہ "یہاں آ اور کھینچ کر" لیکن جونہی ایک دفعہ میں انکو توڑ لیتی ہوں اور اپنے بازو پر رکھ دیتی ہوں تو خوبصورتی بڑی ہوتی ہے اور میں ان کو نہایت آرام اور ہلکے دل کے ساتھ دیکھتی ہوں۔ دل نے جواب دیا کہ تم انکے متعلق پھر نہ خیال کرینگے خیال سے انکو حاصل کرنا چاہتی ہو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جب میں لڑکا تھا کیا کرتا تھا کیونکہ دور میدان کو دیکھنے کی مرے دل میں آرزو تھی اور میں وہاں جہاں جا کر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا جانیکی خواہش کرتا تھا کیا یہ معقول استدلال نہیں ہے؟ پیاری! پیاری! اگر لوگ خیال کریں تو تمام دنیا میری ہی طرح کریگی اور تم اپنے پھولوں کو تنہا اپنے مقام پر ہی رہنے دوگی جسطرح کہ میں یہاں پہاڑوں پر مقیم ہوں۔ یکایک وہ کہہ اٹھا "خدا کی پناہ" اور جب مارجری نے دریافت کیا کہ کیا غلطی ہوئی تو اس نے سوال کو بدل دیا اور مکان میں چہرہ پر ایک حد تک مضحک تاثرات لئے ہوئے چلدیا۔

وہ میز پر خاموش رہا۔ جب رات ہو گئی اور ستارے سروں پر چمکنے لگے تو وہ گھنٹوں تیز تیز باغ اور صحن کے درمیان ٹہلتا رہا۔ مارجری کے کمرہ میں ابتک روشنی باقی تھی جو سیاہ اور نیلے پہاڑوں اور سفید ستاروں کی روشنی میں ایک چھوٹی سی نارنجی رنگ کی لمبی لکیر معلوم ہوتی تھی۔ دل کے خیالات بار بار دریچہ کی طرف منتقل ہوتے تھے مگر اسکے خیالات کچھ زیادہ عاشقوں کے سے نہ تھے۔ وہ خیال آرائی کرنے لگا کہ وہ وہاں اپنے کمرہ میں اور ستارے یہاں سر کے اوپر آسمان پر ہیں۔

—— دونوں پر رحم اور خدا کا فضل —— دونوں کا اسکی زندگی پر گہرا اثر تھا دنیا سے کامل قناعت اور بیزاری میں دونوں نے اسکی زندگی کو پرسکون بنایا تھا اور ان سے اس سے زیادہ اور کس چیز کی خواہش تھی، فربہ نوجوان اور اسکے نصائح اسکے دماغ میں اسقدر تازہ تھے کہ اسنے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکا دیا، اپنے دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ لیا اور بالآخر بڑبڑاتا ہوا بستر پر جا لیٹا۔

دوسری دفعہ صبح منھ اندھیرے اس نے دوبارہ مارجری کو باغ میں دیکھا اور اس سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ کر بیہودہ طریقہ سے یوں مخاطب ہوا کہ میں شادی کے معاملہ میں غور کرتا رہا ہوں اور کامل غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔

مارجری ایک منٹ کے لئے اسکی طرف مڑی مگر اسکا سرخ لیکن رحم بھرا چہرہ (ان حالات کے تحت فرشتہ کو غیرت اور شرم آتی) چمک اٹھا اور وہ دوبارہ زمین کو خموشی کے عالم میں دیکھنے لگی۔ وہ اسکو کانپتا ہوا دیکھ سکتا تھا وہ کچھ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا کہ میں امید کرتا ہوں کہ تم اسکا خیال نہ کروگی اور تم کو کرنا بھی نہ چاہیئے میں اس پر خوب غور کر چکا ہوں میری جان کی قسم اسمیں کوئی ایسی بات نہیں ہے ہم جتنے قریب ہیں اس سے ایک انچ بھی زیادہ قریب نہیں ہو سکتے اگر میں عقلمند ہوں تو اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔

مارجری نے کہا میرے ساتھ سیر بیکار ہے مجھے خوب یاد ہے کہ تم نے اپنے کھلونے بنائے جانیکو پسند نہیں کیا تھا اب میں دیکھتی ہوں کہ ہم غلطی پر تھے حقیقت پوچھو تو تم نے کبھی میرا خیال ہی نہیں کیا مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ میں ابتک غلط فہمی میں مبتلا رہی۔

دل نے بڑے زور سے کہا کہ معاف کرنا تم میرا مطلب نہ سمجھ سکیں میں تم سے کبھی محبت کرتا تھا یا نہیں اسکو میں لوگوں پر چھوڑتا ہوں لیکن ایک چیز کے متعلق تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرا احساس نہیں بدلا اور دوسرے تم اس پر فخر کر سکتی ہو کہ تم نے میری زندگی اور کیریکٹر کو بالکل بدل دیا ہے۔ میرے الفاظ میرا ٹھیک مطلب ہوتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کرنا کچھ زیادہ اہم ہے تم اپنے والد کے ساتھ رہا کرو میں تم کو ہفتہ میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ جسطرح کہ لوگ گرجا کو جاتے ہیں دیکھنے کے لئے آیا کرونگا اور اس طرح ہم دونوں اس اثنا میں بہت زیادہ خوش رہا کرینگے یہ میرا خیال ہے اگر تمہارا خیال یہ نہو تو میں شادی پر راضی ہوں۔

مارجری نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ تم میری ہتک کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا مارجری میں تو نہیں اگر ایک صاف ضمیر میں کوئی چیز ہو تو شاید وہ کر رہی ہو میں نہیں میں تو اپنے دل کی سچی محبت تیرے حسن کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں

تو اسکو قبول کر یا ٹھکرا دے اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ جو کچھ واقع ہو چکا ہے اسکو بدلنا اور میرے خیالات کی بندھن کی گرہ کو کھولنا تیری اور میری قوت سے باہر ہے۔ اگر تو پسند کرے تو میں تجھ سے شادی کرلوں لیکن میں بار بار یہی کہونگا کہ وہ کوئی اہم چیز نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں اگرچہ میں ایک خاموش آدمی ہوں تاہم میں نے بہت سی چیزیں دیکھی ہیں۔ مجھ پر اعتماد کر اور میری تجویز کو قبول کرلے یا اگر تو اسکو ناپسند کرتی ہے تو ظاہر کر میں فوراً تجھ سے شادی کرلوں گا۔

ایک عرصہ تک سکوت طاری رہا اور وہ جو تکلیف محسوس کرنے لگا تھا نتیجہ کے متعلق غضب ناک ہونے لگا اس نے کہا اپنے دل کی حالت بیان کرنے میں تم بہت مغرور معلوم ہوتی ہو۔ مجھے یقین کرو کہ یہ برا ہے۔ صاف صاف اظہار و اقرار زندگی کو آرام دہ بناتے ہیں، مجھ سے زیادہ کیا کوئی شخص عورت کا احترام کرسکتا ہے؛ میں اپنی رائے ظاہر کرچکا اور تجھکو موقع دیتا ہوں کیا میں تجھ سے شادی کرلوں، یا تو میری دوستی پر جسکو میں زیادہ مناسب سمجھتا ہوں اکتفا کریگی؛ یا تو بھلائی بھلائی کے لئے مجھ سے سیر ہو چکی ہے؛ خدا کے لئے کچھ تو زبان سے کہہ؛ تو جانتی ہے کہ تیرے باپ نے کہا تھا کہ ایسے معاملات میں لڑکیوں کو اپنے عندیات بیان کردینے چاہئیں۔ اس پر مارجری کو ہوش آیا وہ بغیر ایک لفظ کہے پلٹی، تیزی سے باغ میں سے ہو کر مکان میں دل کو نتیجہ کے متعلق پس و پیش کی حالت میں چھوڑ کر چلدی۔ وہ آہستہ سے سیٹی بجاتا ہوا باغ میں ٹہلتا رہا۔ بعض اوقات وہ ٹھہرتا آسمان اور پہاڑ کی چوٹیوں پر غور کرتا بعض اوقات ندی کے سرے پر جا بیٹھتا اور دیوانگی سے پانی کو دیکھا کرتا یہ تمام تشویش و اضطراب اسکی فطرت اور زندگی کے لئے، اس زندگی کے لئے جسکو اس نے عزم صمیم کے ساتھ اختیار کرلیا تھا ایسا عجیب اور نیا تھا کہ وہ مارجری کی آمد پر افسوس کرنے لگا وہ خیال کرتا کہ میں ایسا ہی خوش تھا جیسا کہ ایک آدمی ہوسکتا ہے اگر کبھی میں چاہتا تو یہاں نیچے آجاتا اور تمام دن مچھلیوں کو دیکھا کرتا گویا کہ میں اپنی پرانی گرنی کی طرح مقیم و مطمئن تھا۔

مارجری ڈنر کے لئے نیچے آئی تو بہت خاموش اور حسین معلوم ہوتی تھی جوں ہی تینوں میز پر بیٹھ گئے اُس نے اپنے باپ سے گفتگو شروع کردی اسکی آنکھیں رکابی پر جمی ہوئی تھیں لیکن اسکی مایوسی اور تشویش کی کوئی دوسری علامت نہیں پائی جاتی تھی اسنے کہا "ابا جان میں اور مسٹر ول معاملات کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں ہم سمجھتے ہیں ہم دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور مسٹر ول میری درخواست پر شادی کا خیال ترک کردینے پر راضی ہوگئے ہیں مگر وہ پھر بھی ماضی کی طرح میرے سچے دوست رہینگے آپ دیکھتے ہیں کہ کسی قسم کے جھگڑے کا یہاں شائبہ بھی نہیں ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں ہم انکو سعد مرتبہ دیکھیں گے کیونکہ ہمیشہ

انکی آمد کا ہمارے گھر میں خیر مقدم کیا جائیگا۔ یقیناً اباجان آپ خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن ہمارے لئے موجودہ حالت میں سسٹر ول کے مکان کو چھوڑنا بہتر ہوگا جو کچھ واقع ہو چکا ہے۔ اسکے بعد مجھے اندیشہ ہے کہ ہم بمشکل پسندیدہ مقیم ثابت ہوسکیں گے۔ ول جو ابتداء سے بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھ سکا تھا اس پر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا اور حقیقی ہراس کے عالم میں گویا کہ وہ مداخلت اور اختلاف کرنا چاہتا ہے اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا ـــــ مارجری نے کہا کہ غالباً آپ ازراہ مہربانی معاملات کو خود مجھے بیان کرنے دینگے۔

ول اسکے چہرہ کے اثرات اور اسکی آواز کی گونج سے زرد اور خاموش ہوگیا وہ اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ اس لڑکی میں ایسی باتیں ہیں جو اسکی سمجھ سے باہر ہیں اور اس رائے میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔ غریب پادری بالکل مایوس اور رنجیدہ ہوگیا اسنے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ یہ سب ایک سچے عاشق کے معمولی سے جھگڑے سے زیادہ کچھ نہیں ہے جو شام ہونے سے پہلے ختم ہو جائیگا لیکن جب اسکی پوری طرح تردید کی گئی تو پھر اس امر پر زور دینے لگا کہ جب لڑائی کا کوئی واقعہ نہیں ہے تو جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بوڑھا آدمی اپنے میزبان اور اسکی مہمانداری دونوں کو چاہتا ہے۔ یہ عجیب ہے کہ لڑکی نے دونوں کا کیسا فیصلہ کیا اور کس طرح نسوانی قابلیت اور رہنمائی سے دونوں کو ہم رائے کر لیا۔ یہ اس کا کام بمشکل معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعات ہی ایسے ہوگئے ہیں۔ وہ اور اس کا باپ اسی سہ پہر کو زراعت کی گاڑی میں بیٹھکر نیچے وادی میں ایک دوسرے جھونپڑے کے اندر انکا خاص مکان تیار ہونے تک چلے گئے۔ ول اسکو بہت غور سے دیکھتا رہا تھا اسلئے مارجری کی مایوسی ناکامی اور عزم سے واقف تھا۔ جب اسکو تنہائی ملی تو بہت سارے اہم معاملات کا اسکو فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ بہت غمگین اور اداس تھا۔ اسکی زندگی سے تمام فائدہ جا چکا تھا، جب تک اچھا معلوم ہوتا آسمان پر وہ اختر شماری کرتا تھا وہ ایک حد تک پناہ اور طمانیت قلب کے پانے میں ناکام ہو چکا تھا اور مارجری کے متعلق وہ روحانی کشمکش میں مبتلا تھا وہ اسکے برتاو پر حیران اور مشتعل تھا تاہم اسکی محبت سے باز نہ رہ سکتا تھا وہ خیال کرتا کہ اس خاموش روح میں جسکا اس نے ابتک خیال نہیں کیا تھا اس نے ایک مقدس مگر مغرور فرشتہ کو پالیا ہے۔ اگرچیکہ وہ اس امر کو سمجھ چکا تھا کہ اسکی مصنوعی اطمینان کی زندگی کو اس کا اثر صحتیاب نہیں بلکہ مریض بنادیگا تاہم اسکو حاصل کرنیکی دلی آرزو سے وہ کنارہ کش نہیں ہو سکتا تھا اس شخص کے مانند جو ابتک سایہ اور چھاؤں کے درمیان رہا ہو اور پہلی مرتبہ دھوپ میں آیا ہو وہ خوش بھی تھا اور رنجیدہ بھی۔

جوں جوں دن گذرتے گئے اسکے خیالات میں ترقی ہوتی گئی کبھی اپنے ارادہ کی مضبوطی کی ڈینگ لمتا تھا

اور کبھی اپنی لاطائل اور بیہودہ احتیاط پر لعنت و ملامت کرتا تھا۔ اول الذکر جذبات کے صحیح خیالات کا غالباً صحیح آئینہ دار تھا اور انسان کے جذبات و میلانات کے رنج کی بہترین طریقہ سے ترجمانی کرتا تھا۔ لیکن ثانی الذکر خیال وقتاً فوقتاً ناقابل ضبط قوت کے ساتھ آیا کرتا تھا اسوقت وہ تمام خیالات اور دلائل کو بھول جاتا اپنے مکان اور باغ کے درمیان ٹہلا کرتا تھا یا صنوبر کے درختوں کے درمیان اس شخص کے مانند جو رنج و افسوس میں آپے سے باہر ہو رہا ہو گھوما کرتا خاموش اور تنہا دل ول کے لئے معاملات کی یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اسلئے اس نے ارادہ کیا کسی طرح اسکا خاتمہ کرونگا پس گرما کی ایک گرم سہ پہر میں اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا، ایک کانٹوں دار چھڑی ہاتھ میں لی اور ندی کے کنارے کنارے وادی کے نیچے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ارادہ کے ساتھ ہی اسکا فطری اور عادتی اطمینان قلب واپس آگیا اس نے صاف اور خوشگوار موسم، اور منظر کی بوقلمونی سے بغیر کسی قسم کے خوف اور ناگوار حرص کی آمیزش کے لطف اٹھایا۔ معاملات کا انقلاب بھی تقریباً اسکے لئے ایسا ہی تھا۔ مارجری قبول کرے تو اس دفعہ وہ اس سے شادی کریگا جو ہر طرح ٹھیک اور مناسب ہے۔ اگر وہ انکار کر دے تو ممکنہ کوشش کو ناکام میں لانے کے باعث وہ ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیگا لیکن اسے یقین تھا کہ مارجری انکار کر دیگی اور جونہی دوبارہ اسنے ندی کے ایک زاویہ سے درختوں میں سے جھانکتے ہوئے مارجری پر سایہ کئے ہوئے ارغوانی چھت کو دیکھا تو راستہ سے لوٹ جانیکا نصف ارادہ کیا اور نصف سے زیادہ اپنے تلون اور عدم استقلال پر شرمندہ تھا۔

مارجری اسکو دیکھکر خوش معلوم ہوتی تھی، بغیر کسی اظہار محبت اور تعریف کے اس نے اپنا ہاتھ دیا دل نے کہا میں شادی کے معاملہ پر غور کرتا رہا ہوں اس نے جواب دیا علیٰ ہذا القیاس میں بھی غور کرتی رہی ہوں میں آپ کی نہایت عقلمند آدمی کی سی عزت کرتی ہوں۔ آپ نے مجھے مجھ سے بھی زیادہ عمدگی کے ساتھ سمجھا اور اب میں کامل یقین رکھتی ہوں کہ معاملات علی حالہ بہت اچھے ہیں ول نے کہا ساتھ ہی۔۔ قطع کلام کرکے مارجری نے کہا آپ تھک گئے ہونگے، کرسی پر بیٹھئے اور مجھے شراب کا ایک گلاس پیش کرنے دیجئے، سہ پہر بہت گرم ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ اس ملاقات سے ناخوش نہوں آپ کبھی کبھی آیا کیجئے، ہفتہ میں ایک مرتبہ بشرطیکہ آپ وقت کا خون کرسکیں۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو دیکھکر خوش ہوتی ہوں۔

ول نے دل میں خیال کیا کہ بس ٹھیک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر نہیں تھا۔ اس روز وہ بہت اچھی طرح ملا، اچھی حالت میں مکان کو واپس آیا اور اس معاملہ پر پھر کچھ زیادہ غور نہیں کیا۔ تین سال تک ول اور مارجری دونوں میں سے کسی کی جانب سے بغیر کسی محبت کے لفظ کے اظہار کے ہفتہ میں ایک دو مرتبہ ملتے رہے۔ اس تمام عرصہ میں

مجھے یقین ہے کہ وِل ایسا ہی خوش رہا جیسا کہ کوئی آدمی رہ سکتا ہے مارجری کو دیکھنے سے وہ اپنے آپکو ایک حد تک روکتا اکثر اوقات پادری کدھو کے راستہ پر آدھی دور تک جاتا اور یہ خیال کر کے کہ زُرْ غِبًّا وَ تَزْدَدْ حُبًّا[له] اشتیاق بڑھانے کے خیال سے لوٹ آتا وہاں سڑک کے کنارے ایک کونا تھا جہاں سے وہ وادی میں صنوبر کے درختوں کے درمیان کھڑا ہو کر گرجا کے احاطہ کو دیکھ سکتا۔ وہ وہاں اکثر بیٹھ جاتا اور واپس ہونے سے پہلے بیٹھ کر اکثر خیالات کے گھوڑے دوڑایا کرتا تھا وہاں اسکو دھندلکے میں بیٹھے ہوئے پانے کے کسان ایسے عادی ہوگئے تھے کہ انہوں نے اسکو گرنی والا ول کے گوشہ سے موسوم کر دیا تھا

تیسرے سال کے اختتام پر کسی اور سے شادی کر کے مارجری نے اسکے ساتھ برا مذاق اور سلوک کیا۔ وِل نے اپنے چہرہ کو مردانگی سے بدلنے نہ دیا۔ صرف اتنا ریمارک کیا کہ جتنا کم وہ عورت کی سرشت کے متعلق سمجھ سکا ہے اس بنا پر تین سال سے پہلے اس سے شادی نہ کرنے میں اس نے بڑی عقلمندی کا ثبوت پیش کیا ہے مارجری بھی ایسی عادات کے خلاف ایسی ہی بیوفا تھی جیسی اسکی صنف کی اور افراد کا حال ہے اس بچاؤ پر وہ اپنے آپ کو مبارکباد دیتا اور نتیجہ پر اپنی فراست کے متعلق اعلیٰ رائے قائم کرتا تھا لیکن دل میں وہ ناخوش تھا مہینہ دو مہینہ تک اندر ہی اندر گھلتا رہا اور دبلا ہوگیا۔

اس شادی کے ایک سال بعد وِل ایک رات سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے ہوشیار ہوا۔ سرائے کا دروازہ جلد جلد کھٹکھٹایا جا رہا تھا اس نے اپنا دریچہ کھولا اور ایک کھیت کے ملازم کو گھوڑے پر سوار ایک کوتل گھوڑے کی لگام تھاما ہوا دیکھا جس نے بیان کیا کہ حتی الامکان عجلت میں اسکو اسکے ساتھ چلنا چاہیئے کیونکہ مارجری قریب المرگ اور اسکو فوراً اپنے بستر مرگ پر لانے کے لئے بھجوایا تھا۔ وِل کوئی اچھا سوار نہیں تھا ایسا آہستہ آہستہ چلا کہ غریب مارجری جب وہ پہونچا تو موت کے بہت قریب تھی انہوں نے کچھ دیر تک تخلیہ میں باتیں کیں جب آخری مرتبہ اس جہان فانی میں مارجری نے سانس لیا تو وہ وہاں موجود تھا اور زار زار گریاں ہوا۔

(۳)

موت

[له] زُرْ غِبًّا وَ تَزْدَدْ حُبًّا حدیث ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ فاصلہ سے ملا کرو محبت بڑھیگی۔

میدان کے شہروں میں سال بہ سال زبردست حوادث اور مصائب کے ساتھ گذر گئے۔ خونی انقلابات خون کی ندیوں میں ڈوب گئے، یہاں وہاں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دھن کے پکے ہیئت داں رصدگاہوں میں نئے نئے ستاروں کی دریافت میں مصروف رہے۔ بقعۂ نور تھیٹروں میں کھیل ہوتے رہے۔ پلنگوں پر مریض شفاخانوں میں لیجائے جاتے رہے۔ اور اس طرح انسانوں کی تمام دوڑ دھوپ اور ہنگامے آباد مرکزوں میں جاری رہے۔ اوپر دل کی وادی میں ہوا اور موسم کا دور دورہ تھا۔ تیز دریا میں مچھلیاں تیرتی، طیور سروں پر چکر لگاتے، تاروں کے نیچے سرو کے درخت گانیں کہتے، ان سب پر مستزاد سر بفلک کوہ آسمان سے باتیں کرتے کھڑے تھے۔ دل سرائے سے یہاں تک آتا جاتا رہا۔ یہاں تک سفیدی اسکے بالوں میں نمودار ہوگئی لیکن اسکا دل ابھی نوجوان اور جری تھا، اسکی نبض معتدل تھی اور ہاتھ میں لنگ تیزی سے حرکت کرتی تھی اسکے دونوں گالوں پر سیب کے مانند سرخی تھی۔ وہ کسی قدر جھک گیا تھا مگر اسکے قدم اب بھی مضبوط تھے، اسکے مضبوط ہاتھ تمام آدمیوں سے دوستانہ دباؤ کے ساتھ ملتے تھے۔ اسکے چہرہ پر وہ جھریاں جو کاہلی ہو کا نتیجہ ہوتی ہیں نمودار ہوگئی تھیں اور جنکی سدا دھوپ میں جلنے کے اثرات سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ جھریاں کاہل آدمی کی کاہلی کو بڑھا دیتی ہیں لیکن دل جیسے صاف آنکھوں اور ہنس مکھ چہرہ کے آدمی کے لئے اسکی سادہ اور آسان زندگی میں دوسری دلکشی پیدا کر دیتی ہیں۔ اسکی گفتگو عقلمندانہ مقولوں اور کہاوتوں سے پر ہوتی تھی، وہ دوسروں کو چاہتا اور دوسرے اسکو چاہتے تھے۔ جب موسم میں وادی مسافرین سے معمور ہوتی تو دل کے سائبان میں پر لطف راتیں بسر ہوتی تھیں۔ اسکے خیالات جو پڑوسیوں کو "مجذوب کی بڑ" معلوم ہوتے تھے شہروں اور کالجوں کے لوگ اکثر انکو بے انتہا پسند کرتے تھے۔ وہ بوڑھا اور قابل تھا اور دن بدن اسکی شہرت کو پر لگ رہے تھے اسکی شہرت میدانوں کے شہروں تک جا پہنچی تھی۔

نوجوان اور تعلیم یافتہ جو گرما میں سفر کے اندر چائے خانوں میں بیٹھے ہوتے گرنی والے دل اور اسکی خام اور ناہموار ہمہ اوست فلسفہ پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے۔ یقین ہے کہ بہت ساری دعوتیں آئیں مگر اسکو اوپر کی وادی سے نیچے کر شہروں میں آنے پر آمادہ نہ کر سکیں وہ سر ہلاتا اور ایک پر معنی انداز میں تمباکو کی چلم پر ہنستے ہوئے جواب دیتا تھا "تم بہت دیر سے آئے میں اب مردہ ہوں۔ میں جی بھی چکا اور مر بھی۔ دو سال پہلے تم میرے خیالات اور ارادوں سے واقف ہو سکتے تھے لیکن اب تو تم مجھے ترغیب بھی نہیں دے سکتے یہ زیادہ دنوں تک زندگی کا نتیجہ ہے کہ انسان زندگی کی پرواہ کرنا چھوڑ دیتا ہے ایک اچھے ڈنر اور طویل زندگی میں صرف یہ فرق ہے کہ ڈنر میں میٹھی چیزیں آخر میں آتی ہیں کبھی جب دنیا میں لڑکا تھا تو اس پر حیران تھا کہ دیکھنے کے قابل اور عجیب چیز آیا میں ہوں یا دنیا؛ مگر اب میں جانتا ہوں کہ

دیکھنے کے قابل میں ہوں اور اسی پر مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہوں اس نے دنارت اور زبون ہمتی کی کوئی علامات ظاہر نہیں
ہونے دی بلکہ مضبوط اور عالی ہمت رہا لیکن آخر میں لوگ بیان کرتے ہیں کہ وہ خاموش ہو گیا تھا اور گھنٹوں تک دوسروں کو
باتیں کرتے ہوئے ہمدردانہ اور مسرور سکوت میں سنا کرتا تھا مگر جب گفتگو کرتا تو اصل مبحث سے باہر نہیں ہوتا اور یہ گفتگو
پرانے تجربوں سے مملو ہوتی تھی سورج کے پہاڑ کی چوٹی سے شام میں گھلے ملتے وقت یا بہت رات گئے سائبان میں ستاروں
کے نیچے کسی ناقابل حصول اور مقناطیسی کشش کا نظارہ اس کی خوشی میں اضافہ کرتا تھا۔

ایک رات اپنی عمر کے ۷۲ سال میں وہ جسم اور روح کی تکلیف میں بستر پر جاگنے سے اُکتا کر اٹھا، کپڑے پہنا اور
خیال آرائی کرنے کے لئے سائبان میں جا بیٹھا کامل اندھیرا چھایا ہوا تھا، آسمان پر ایک ستارہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ دریا
خاموش اور سویا ہوا تھا اور گیلے درخت اور میدان کو معطر کر رہے تھے۔ دن میں گرجتا رہا تھا اور دوسرے دن اس سے
زیادہ کڑک چمک کے آثار ہویدا تھے۔ تاریک اور ڈراونی رات ۷۲ سال کی عمر والے کے لئے، نہ معلوم موسم، بیداری یا
اسکے بوڑھے اعضا میں بخار کی خفیف سی حرارت کے سبب ولِ کا دل اضطراب انگیز اور حزن آگیں یاد سے بھر گیا۔
اسکا بچپن، بغربہ نوجوان کے ساتھ کی رات اسکے متبنّیٰ لئے ہوئے والدین کی موت مارجری کے ساتھ بہار کے ایام اور
بہت سے وہ معمولی واقعات جو دوسروں کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے لیکن باوجود اسکے کسی شخص کی زندگی کا جز لاینفک
ہوتے ہیں، دیدہ اشیاء، شنیدہ الفاظ، غلط تعبیر شدہ نظریں اپنے بھولے ہوئے کناروں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسکی
توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ مرحومین اسکے ساتھ تھے، یادوں کے اس نازک کھیل میں جو اسکے دماغ کے سامنے صف بستہ
ہو رہا تھا انہوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ اسکے جسمانی حواس کو بھی جیسا کہ وہ گہرے خوابوں میں کرتے ہیں متاثر کر رہے
تھے۔ فربہ نوجوان مقابل کے میز پر بازوؤں کے بل جھکا ہوا گھور رہا تھا۔ مارجری باغ اور سائبان کے درمیان پھولوں سے
دامن بھری ہوئی آئی اور گئی۔ وہ بوڑھے پادری کے زور سے جھٹکنے یا ناک سے سانس چھوڑنے کی آواز سنتا تھا۔ اس کی
ہوشیاری کی موج چکر لگائی اور چلی گئی۔ بعض اوقات اپنے ماضی کی یاد میں وہ اونگھتا اور ڈوب جاتا اور بعض اوقات
اپنے آپ پر حیرت کا اظہار کرتا ہوا جاگ اٹھتا۔ لیکن آدھی رات کے وقت مرحوم مالک گرنی کی آواز سے جو مکان کے باہر
سے آ رہی تھی وہ چونک پڑا، بوڑھا خریداروں کی آمد پر ایسا کرنے کا عادی تھا، وہم ایسا کامل تھا کہ دل اپنی جگہ پر سے اچھل
پڑا اور آواز کے دہرائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سننے لگا تو ندی کی گنگناہٹ اور اپنے تپ زدہ کانوں کی گونج
کے علاوہ ایک دوسری آواز سنائی دینے لگی یہ گھوڑوں کے ہلنے اور ہنہنانے اور ہارنس کی چرچر کی آواز معلوم ہوتی تھی
گویا ایک گاڑی سڑک پر بے صبر آدمیوں نے صحن کے دروازہ کے سامنے لا کھڑا کی ہے۔ ایسے وقت میں اس ناہموار

اور خطرناک راستہ پر عجیب اور ڈراونے خیالات وِل کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ وِل نے انکو دماغ سے دور کر دیا اپنی کرسی پر سائبان میں بیٹھ گیا اور نیند بہتے ہوئے پانی کیطرح اسپر چلی آئی۔ مرحوم مالک گرنی کی آواز سے وہ دوبارہ جاگ اٹھا جو پہلے کی بہ نسبت زیادہ باریک اور مدھم تھی اور دوبارہ اسکو گاڑی کی آواز سنائی دی یہانتک کہ آخر کار وہ اپنے آپ پر اس ڈرپوک بچے کی مانند جس سے مذاق کیا جائے ہنستا ہوا اور اپنے شک وشبہ کو دور کرنے کے لئے پھاٹک کی طرف بڑھا۔

سائبان سے پھاٹک تک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں تھا تاہم وہاں جانیکے لئے وِل کو کافی عرصہ لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مردے صحن میں اس پر مجتمع ہوگئے اور ہر قدم پر اسکے راستہ میں حائل ہو رہے ہیں وہ سورج مکھی پھولوں کی سوح پر قبضہ کرنیوالی نفاست خوشبو سے متحیر ہوگیا، معلوم ہوتا تھا کہ اسکے باغ میں ایک سرے سے دوسرے تک یہی پھول لگے ہوئے ہیں۔ مرطوب رات نے ایک سانس میں تمام خوشبو کو بکھیر دیا تھا سورج مکھی غریب مارجری کے محبوب پھول تھے اور اوسکی وفات کے بعد سے وِل کی زمین میں ایک بھی نیا درخت لگایا نہیں گیا تھا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ وہ غریب مارجری اور اسکے سورج مکھی پھولوں کا تصوّر مجھے دیوانہ بنا دیگا۔ اسکے ساتھ ہی اسنے دریچہ کی طرف اپنی نگاہ اٹھائی جو کسی زمانہ میں مارجری کی قیام گاہ تھا اگر اس سے پہلے وہ متعجب اور حیران ہو رہا تھا تو اب خوفزدہ تھا کیونکہ کمرہ میں روشنی تھی کمرہ کے دریچہ میں پہلے کی طرح ایک نارنجی رنگ کی لکیر معلوم ہوتی تھی اس رات کی طرح جبکہ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہوکر ستاروں کو پکار اٹھا تھا پردہ کا کنارا اٹھایا اور گرایا گیا۔ تمثیل ایک منٹ کے لئے بھی معلوم ہوئی لیکن اس نے ایک حد تک وِل کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا، مکان کے خاکہ اور تاریک رات کو اسکے پیچھے دیکھنے لگا۔ جب وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر تک وہ وہاں خاموش کھڑا رہا۔ تو سڑک کی آوازیں از سر نو کان میں آنے لگیں اور کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک مسافر سے ملنے کی خاطر لپٹا جو صحن میں اس سے ملنے کی غرض سے آرہا تھا۔ سڑک پر ایک بڑی گاڑی سی نووارد کے پیچھے نظر آتی تھی اور اسکے پیچھے چند سرو کے سیاہ جھاڑ بہت سی کلغیوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

مختصر فوجی انداز میں نووارد نے پوچھا وہ جناب وِل" وِل نے جواب دیا وہ جناب کیا میں آپکی کچھ خدمت کر سکتا ہوں دوسرے نے کہا میں نے آپ کا بڑا شہرہ سنا ہے اگرچیکہ کاموں سے مجھے بالکل فرصت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی میں تمہارے سائبان میں شراب کی ایک بوتل پینا چاہتا ہوں۔ میں جانے سے پہلے انشاء اللہ اپنا تعارف کروا دونگا۔

جاتی تک وِل نے رہنمائی کی لیمپ روشن کیا اور بوتل کا ڈھکنا کھول کر پیش کیا۔ وہ اس قسم کی تکلفانہ ملاقاتوں کا عادی تھا اور بہت سی مایوسیوں کے انجام کے طور پر ان ملاقاتوں سے کسی چیز کی بہت کم امید رکھتا تھا۔ ایک

قسم کا پردہ اسکے حواس پر چھا گیا اور وقت کی نزاکت اور انوکھے پن پر غور کرنے سے روک دیا اس نے خوابیدہ آدمی کی طرح حرکت کی، معلوم ہوتا تھا کہ خیال کی سی سرعت اور تیزی کے ساتھ لیمپ روشن ہوگیا اور بوتل کھل گئی تاہم اپنے ملاقاتی کی آمد کے متعلق ایک قسم کی تشویش ضرور اسکے دل میں تھی۔ اس نے بیفائدہ چہرہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی یا تو اس نے لیمپ مضبوط نہیں پکڑا یا اسکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ اسکو میز پر اپنے حاتھ ایک سایہ سا دکھائی دیا شیشے اور گلاس کو صاف کرتے ہوئے وہ اس سایہ کو گھورتا رہا اور ایک قسم کا خوف محسوس کرنے لگا۔ اس پر سکوت چھا گیا کیونکہ وہ کچھ نہیں سن سکا۔ ندی کی روانی تک نہیں۔ صرف اسکے سانس کے چلنے کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی

درشتی سے نو وارد نے کہا کیا کر رہے ہو، شراب ڈالتے ہوئے ول نے کہا میں جناب اپنے فریضہ کو انجام دے رہا ہوں نو وارد نے کہا میں جانتا ہوں کہ تم جری اور دُھن کے پکے آدمی، وِل نے کسی قدر اطمینان کی ہنسی اور سر کی حرکت سے اثبات میں جواب دیا نو وارد نے کہا میں بھی ایسا ہی ہوں، میری دلی آرزو ہے کہ لوگوں کی پکار پر تو میں حاضر رہا کروں، میں نے اپنے سوا کسی کو مستقل نہیں پایا میں اپنے وقت بادشاہوں، سپہ سالار ہوں اور زبردست صناعوں کے خیالات کو آزما چکا ہوں اگر میں کہوں گا کہ یہاں میں تمہاری مستقل مزاجی کا امتحان کرنے کے لئے آیا ہوں تو تم کیا کہو گے؟ وِل سخت جواب دینے کے لئے زبان کھولنے والا ہی تھا کہ ایک تجربہ کار اور بوڑھے مالک سرائے کے اخلاق اس پر غالب آگئے اور اسکے غصہ پر قابو پالیا ہاتھ کے شفیق اشارہ سے جواب دیا مسافر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی جگہ پر برقرار رہنے یعنی اپنی سرائے سے لپٹے رہنے پر مقرر ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میری گاڑی میں تم میرے ساتھ ایک گشت کے لئے چلو۔ اس بوتل کے خالی ہونے سے پہلے تمکو چلنا پڑیگا۔ وِل نے ہنستے ہوئے جواب دیا یقین مانئے کہ یہ عجیب بات ہے کیوں جناب میں یہاں پرانے سرو کے درخت کی طرح اگا ہوں شیطان بھی بمشکل مجھکو یہاں سے اکھاڑ سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک دلچسپ بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم کو دوسری بوتل دونگا تا کہ تم میرے ساتھ جھگڑنے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔ اس تمام عرصہ میں وِل کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی اور بے رونقی بڑھتی رہی تھی مگر وہ ایک حد تک تیز اور سرد لانے والی نگاہ سے واقف ہوتا رہا وہ اسکو مشتعل مگر ساتھ ہی ساتھ اس پر قبضہ کر رہی تھی۔ گھبرانیوالی آواز میں جس سے وہ خود سہم گیا کہہ اٹھا کہ تم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں یہاں مکان پر اسلئے مقیم ہوں کہ خدا کی مشیت سے ڈرتا ہوں خدا جانتا ہے کہ میں اس زندگی سے بیزار ہوں اور جب ایک لمبے طویل سفر کا وقت آئیگا تو میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بالکل تیار پاؤنگا۔

نووارد نے گلاس خالی کیا اور اپنے پاس سے اسکو دور پھینکدیا وہ کچھ دیر تک نیچے دیکھتا رہا پھر میز پر جھک کر انگلی سے
وِل کے بازو کو تین مرتبہ مارا اور اطمینان سے کہا کہ "وقت آچکا ہے" جہاں اسنے چھوا تھا وہاں ایک خوفناک لہر دوڑ گئی
اسکی آواز کا لہجہ بھدا اور پریشان کن تھا جو عجیب طریقہ سے وِل کے کانوں میں گونجا ایک حد تک ہراسانی سے وِل نے پوچھا
معاف کیجئے آپ کا کیا مطلب ہے، میری طرف دیکھو تمھاری نظر ڈوب رہی ہے اپنا ہاتھ اُٹھاؤ وہ بے حسی سے شل ہوچکا ہے،
ماسٹر وِل! یہ آخری تمھاری شراب کی بوتل ہے اور زمین پر آخری رات ہے وِل نے پوچھا آپ ڈاکٹر ہیں دوسرے نے جواب
دیا بہترین جو کبھی پردۂ دنیا میں تھا کیونکہ میں ایک ہی نسخہ سے جسم اور روح دونوں کا علاج کرتا ہوں میں تمام تکالیف کو دور کرتا
اور تمام گناہوں کو بخشتا ہوں میرے مریض زندگی میں جو غلطیاں کرتے ہیں میں انکی اصلاح کرتا اور انکو دوبارہ اپنے قدموں
پر آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔

وِل نے کہا مجھے آپکی ضرورت نہیں ڈاکٹر نے کہا ماسٹر وِل تمام آدمیوں کے لئے ایک ایسا وقت آتا ہے جبکہ حیات
کا تاج انکے ہاتھوں سے لیلیا جاتا ہے چونکہ تم عقلمند، صابر و خاموش تھے اور بہت دنوں سے اسکے استقبال کی تیاریوں
میں مصروف تھے اسلئے وہ وقت تمھارے لئے دیر سے آیا۔ تمھاری گرنی میں جو کچھ دیکھنے کے قابل تھا، تم دیکھ چکے لیکن اب
تمھاری زندگی قریب الختم ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا کہ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ اپنے مہمان
کو غور سے دیکھتے ہوئے وِل نے کہا تم عجیب طبیعت کے آدمی ہو۔ نووارد نے کہا میں قانونِ فطرت ہوں اور لوگ مجھے
موت کہتے ہیں۔

وِل پکار اُٹھا پہلے ہی آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا میں گذشتہ کئی سال سے آپکا منتظر ہوں، اپنا ہاتھ لاؤ خوش آمدید
نووارد نے کہا میرے بازو پر جھک جاؤ کیونکہ تمھاری طاقت جواب دے رہی ہے، مجھ پر جتنی ضرورت ہو جھک جاؤ،
میں اگرچہ بوڑھا ہوں، تاہم مضبوط بھی ہوں میری گاڑی تک صرف تین قدم ہیں اور وہاں پہونچتے ہی تمھاری تمام تکالیف
ختم ہو جائینگی۔ نووارد نے کہا کیوں وِل میں تم سے ایسی محبت کرتا ہوں گویا کہ تم میرے بیٹے ہو ان تمام آدمیوں کی بہ نسبت
جنکے پاس میں اپنی اس طویل زندگی میں گیا ہوں تمھارے نزدیک میں بڑی خوشی سے آیا ہوں میں کسی قدر سخت گیر ہوں
اور بعض اوقات پہلی ہی نگاہ میں لوگوں کو ناراض کر دیتا ہوں لیکن تم جیسے آدمیوں کا میں دلی دوست ہوں۔ وِل نے
جواب دیا جب سے مارجری لیلی گئی ہے میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ تم ہی ایک ایسے دوست ہو جس کا میں منتظر ہوں
اس طرح جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ملائے صحن کو عبور کر گیا۔

ایک نوکر اسوقت جاگ اٹھا اور دوبارہ سونے سے پہلے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی اس رات نیچے تمام وادی

میں میدان کی طرف بہنے والی صاف اور رواں ہوا کے مانند آواز آتی رہی۔ دوسری صبح جب دنیا سو کر اٹھی تو یقیناً گرنے والا دل اپنے آخری سفر پر جا چکا تھا۔

(اسٹیونسن)

تصحیح

گذشتہ مارچ واپریل کے مشترکہ نمبر میں علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی کتابت کی غلطیوں کے چند فاحش غلطیاں رہ گئیں ناظرین کرام اس طرح درست فرمالیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۷	۵	نکات وادارت	صفحہ ادارت
۹۷	۵	ملا رموزی	ایڈیٹر
۱۰۰	۱۷	پڑھنے ترغیب	پڑھنے کی ترغیب
۱۰۱	۴	ساتھ ہمیشہ	ساتھ وہ بھی ہمیشہ
۱۰۱	۴	ہو جاتی ہے	ہو جاتی ہیں
۱۰۱	۵	کاوشوں	کاوشیں
۱۰۱	۱۰	تنقیدی سند دی	تنقیدی سند دی جائے
۱۰۱	۱۶	قربانی ضرورت	قربانی کی ضرورت
۱۰۴	۱۲	ایک جذبہ مذہب	ایک جدید مذہب
۱۱۴	۱۰	پیش کر دیا	پیش کر دی
۱۱۴	۱۱	شائع ہوا	شائع ہوئی
۱۷۰	۱۶	خموشی کی نیم رضا	"خموشی نیم رضا"
۱۷۴	۱۴	شیرازہ رنگ وضو	شیرازہ رنگ نمو
۱۸۴	۱۲	شب تاریک وصال	شب تاریک فراق

الٹن لاک کے آخری الفاظ

(ماخوذ از نظم کنگسلی)

حسرت، حسرت، حسرت، حسرت

ہر جاہل پر، ہر کاہل پر
خاک اڑاتی باد صبا ہے
ہر ویرانہ وقف بُکا ہے
گلشن سے اٹھتی یہ صدا ہے

شور بپا ہے ہر ساحل پر
بیکاری سے مرنا بہتر
نفرت، نفرت، نفرت، نفرت

اس پر جو بیکار نہیں ہے
جو خو کردہ ظلم و جفا ہے
جو بزدل محتاج و گدا ہے
جس کو ہر خیرات روا ہے
زیست کا وہ حقدار نہیں ہے

قول خدا بیکار نہیں ہے
جاگو، جاگو، جاگو، جاگو

جو کرنا ہے کرتے جاؤ

رات گئی اور سورج نکلا
پھول کھلا اور غنچہ چٹکا
کھلی عدالت حاکم آیا
کیا کہتے ہو سامنے آؤ
کام کرو یا قبر میں جاؤ

(محمود اسرائیلی)

نوائے راز

بنگئے اسرارِ حسن و عشق افسانہ طراز
ہو رہا ہے ضبط کے آثار سے افشائے راز

جی میں آتا ہے کہ ان ہی جا کے پوچھا چاہیئے
التفات ناز کے قابل ہے کیا میرا نیاز؟

مرنے والا مر گیا اور اس کا دم آخر ہوا
بس لئے بیٹھے رہیں وہ اپنی شان حسن و ناز

مر گئے پھر بھی نہ کچھ سمجھے کہ یہ کیا چیز ہے
موت جسکو زندگی کا جانتے تھے ایک راز

بیخودی میں ہو گئے اسرار خودداری عیاں
مشکلات زندگی نے کر دیا ہے بے نیاز

رنج و غم نے مجھکو مرنیکی بھی کچھ فرصت نہ دی
میرا سوز غم ہے میری زندگی کا ایک ساز

اضطراب جاوداں نے کیں بہت آسانیاں
ہے مگر طولِ شب فرقت بھی اک آہِ دراز

چارہ گر بالیں پہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں فکر میں
اس مریض غم کا اب تو بس خدا ہے چارہ ساز

اسکو سن لیجئے اب افسانہ غم ختم ہے
چند سانسیں ہیں مگر شرح گلہ ہائے دراز

قیصر (از بھوپال)

انشا پردازی

آئینۂ جہاں ہوں، جام جہاں نما ہوں
میں شرحِ حالِ رازِ اشرار و اتقیا ہوں

بحرِ سخن ہے میرا اک موجۂ ترنم
چرخ ادب کی مجھ سے قائم ہے بزم انجم

انوار سے ہے میرے مہر سخن درخشاں
منشیِ چرخ بھی ہے مجھ پر فدا بصد جاں

گنجینۂ بیاں ہوں، سرمایۂ زباں ہوں
شانِ سخنوراں ہوں جانِ سخنوراں ہوں

مجھ سے گلِ مضامیں کا رنگ و بُو ہے تازہ
میں چہرۂ عروسِ تخئیل کا ہوں غازہ

پھولا پھلا ہے مجھ سے گلزارِ رمز و معنیٰ
جاری ہے دم قدم سے میرے بیاں کا دریا

ہر صنف میں ہے میری کچھ اور ہی لطافت
جادو ہے گر بیاں میں تو شعر میں ہے حکمت

ہادیِ گمرہاں ہوں، خضرِ رہِ صفا ہوں
گم گشتہ کارواں کا بیدار کن درا ہوں

میرے وجود سے ہے لطفِ سخن جہاں میں
اعجاز موسوی ہے میرے لب و دہاں میں

اہل مجاز پر ہے روشن مری حقیقت
سن لو متینؔ! "میں ہوں تفسیر رنج و راحت"

متینؔ حیدرآبادی

تصوّر

اک پیاری پیاری صورت
یوں سامنے کھڑی ہے
چہرہ ہے یوں درخشاں
پیشانی ہے سراپا
آنکھوں میں مستیاں ہیں
معصوم ہیں نگاہیں
گیسو ہیں کالے کالے
دو ہاتھ گورے گورے
سادا سا پیرہن ہے
ایک ہلکا سا دوپٹہ

اک موہنی سی مورت
جیسے کوئی پری ہے
جیسے کہ ماہ تاباں
اک چاند کا سا ٹکڑا
ہونٹوں پہ بجلیاں ہیں
خوابیدہ ہیں ادائیں
کاندھوں پہ اپنے ڈالے
دونوں طرف ہیں لٹکے
رنگینی چمن ہے
سینے کے پاس رکھا

اک نور ہے سراپا
اک حور ہے مجسم

ہر شان اک ادا ہے
آنکھوں میں بے نیازی
مخمور ہیں نگاہیں
زلفیں بکھر رہی ہیں
گالوں پہ ایسی لالی
پلکیں جھپک رہی ہیں
اک حشر اٹھا رہی ہیں
گوری ہتیلیاں ہیں
سرخی جھلک رہی ہے
ہونٹوں پہ ہے تبسم

ہر آن دلربا ہے
نظروں میں دلنوازی
مینوش ہیں فضائیں
بیچین کر رہی ہیں
جیسے شفق کی سرخی
آنکھیں چمک رہی ہیں
فتنے جگا رہی ہیں
بیکس کی داستاں ہیں
مہندی لگی ہوئی ہے
ہر سانس میں ترنم

یہ سکر زا نظارا
اف یہ غضب کا عالم

میں مست ہو رہا ہوں   چپ چاپ وہ کھڑی ہے
میں حال کہہ رہا ہوں   وہ مسکرا رہی ہے
بیتا سنا رہا ہوں   خاموش سن رہی ہے

میں اسکو دیکھتا ہوں
وہ مجھکو دیکھتی ہے

کیف (مرادآبادی)

دردِ عشق

(قطعہ)

(عطیہ لسان الملک ندرت بیان صاحبزادہ)

کسی بیدرد نے اک دردمندِ عشق سے پوچھا — کسے کہتے ہیں یہ سودا عشق اور کیا چیز الفت ہے

کہا اس دردمندِ عشق نے رو کر کبھی ہنس کر — جسے کہتے ہیں الفت بیخودی کی ایک حالت ہے

یہ دردِ عشق وہ شے ہے فنا ہو کر نہیں مٹتا — دلِ زندہ میں گویا غیر فانی ایک لذت ہے

وہ لذت ایسی لذت ہے بیاں جسکا نہیں ممکن — وہ ایک ناگفتہ بہ حالت ہے اک رازِ حقیقت ہے

وہی رازِ حقیقت جو کہ رازِ کن فکاں ٹھہرا — وہی روزِ ازل سے دل میں انساں کے ودیعت ہے

وہی جوہر جو ذاتِ خاص نے مرغوب فرمایا — ہوا ہے جلوہ گر دل میں وہی دردِ محبت ہے

مزے دردِ محبت کے کوئی عشاق سے پوچھے — اگرچہ درد ہے ظاہر میں لیکن عین راحت ہے

وہ راحت ہے مگر جس میں ہیں لاکھوں آفتیں پنہاں — ہر اک آفت مگر اسکی نویدِ عیش و عشرت ہے

وہ عیش روح پرور ہے سرورِ جانفزا واثق

تخیل بھی بظاہر جس کا دل پر اک مصیبت ہے

کیفیات

دورِ خزاں کے ہاتھ میں دامنِ لالہ زار ہے — ہستیٔ بے ثبات کا اب بھی تو اعتبار ہے

لب پہ نہ آ سکا جسے دل میں خیالِ یار ہے — دل بطفیلِ رازِ عشق یار کا رازدار ہے

نقش برآب ہے حیات دیکھ اسیرِ کائنات — وسعتِ ہر حباب میں نازشِ اختصار ہے

عیش و نشاطِ آرزو خونِ حیاتِ آرزو — وہ بھی مآلِ شباب تھا یہ بھی مری بہار ہے

پردۂ گل سے آ نکل حسنِ ازل کہ دل مرا — سجدہ گہِ مجاز میں مٹنے کو بیقرار ہے

اشکِ ستم ظریف ہو۔ دردِ دلِ نحیف ہو — ضبط مرا حریف ہو۔ ہجر کوئی غمگسار ہے

ناز میں بے نیاز ہے عمرِ وفا دراز ہو — عشق کا دم مرا تھا حسن کا یہ خمار ہے

حیف یہ دلنوازیاں آہ یہ کیف زائیاں — چشمِ سیاہ مست میں کشمکشِ خمار ہے

الحذر تو سہی یہ انفعال بارِ گناہ کو سنبھال — لطف و کرم کے جوش میں رحمتِ کردگار ہے

عشقِ ستم سے اور بھی ذوقِ ستم فزوں ہوا — شدتِ جور میں نہاں راحتِ جانِ زار ہے

آبِ کرم سے اے کریم دور ہو داغِ معصیت

عشرتِ زار دلفگار آج تو شرمسار ہے

عشرت رحمانی المحبوبی رامپوری

چڑیا کے انڈے

سنہری دھوپ میں دن بھر مزے سے
پھدکتے اڑتے پھرتے ہیں پرندے
درختوں کے ہیں پتے ان کے خیمے
یہیں آپس میں ہیں وہ بحث کرتے

وہ دیکھو شاخ پر اک گھونسلا ہے
ہے چھوٹا سا مگر کیا خوشنما ہے
ہیں اس میں چار ننھے ننھے انڈے
انھیں سیتی ہے چڑیا کس خوشی سے
یہ نیلے انڈے جب دیتی ہے چڑیا
تو اُن کو رات دن سیتی ہے چڑیا

ابھی میں دیکھ آیا چڑھ کے اوپر
کہ بچے ہیں ابھی انڈوں کے اندر
جب انڈے کھٹکیں گے ماں باپ انکے
نکل آئینگے چوں چوں کر کے بچے
بڑے ہو کر یہی بچے ابھی سے
چمن میں چہچہائیں گے خوشی سے
اٹھا لیں گے یہ سر پر سارا جنگل
منائیں گے یہ سب جنگل میں منگل

ذرا بچو یہ سوچو دل میں اپنے
پرندوں کے ہیں بچے تم سے چھوٹے
ابھی کمسن بھی ہیں کمزور بھی ہیں
مگر کچھ خوبیاں ان میں بڑی ہیں
وہ تھوڑے عرصہ میں اڑتے پھرینگے
سنائیں گے وہ سب کو اپنے نغمے

تو ی ہو کر حقارت کی نظر سے
کبھی ان کو نہیں ہم دیکھ سکتے
یہ جس دم میٹھے میٹھے گائینگے گیت
تو ہم کو اُن کے بس تڑپائیں گے گیت
یہ برگد اور پیپل کے شجر پر
کریں گے نغمہ سنجی شاد ہو کر
اگرچہ ہم ہیں عاقل اور دانا
بڑے ہم فلسفی ہیں یہ بھی مانا
مگر اوپر کب اڑنے پاتے ہیں ہم
زمیں پر جوتیاں چٹخاتے ہیں ہم

ذہین حیدرآبادی

غمزدہ کوئل

کوبکو صحرا بصحرا پھر رہی ہے کیوں اداس — خیر تو ہے کیوں سراسیمہ ہے کیوں ہے بدحواس

غمزدہ کوئل یہ کیسی دکھ بھری آواز ہے — ترے ہر نالے میں تری زندگی کا راز ہے

خانماں برباد نکلا عشق افسونگر تیرا — محشر انگیز تمنا ہے دل مضطر تیرا

تیرے دردانگیز نالوں میں نہیں کچھ بھی اثر — کیوں تجھے تڑپا رہی ہے شدتِ دردِ جگر

رکھتا ہے بیتاب کیا شوقِ گوناگوں تجھے — مخلصی دیتا نہیں ہے عشق کا افسوں تجھے

رنگ ماتم کا ہے تجھ پر کس لئے چھایا ہوا — نالہ کرتی ہے تو اڑ جاتا ہے ہوش آیا ہوا

آسماں سنتا نہیں ہے کچھ تری فریاد کو — صبر بھی دیتا نہیں ترے دلِ ناشاد کو

تری ہستی کا ابھی مجھ پر نہیں عقدہ کھلا — کس سے پوچھوں میں تری سرگشتگی کا ماجرا

تو ہے میرا گم شدہ دل یہ تو میں کیونکر کہوں — ہاں کسی بیتاب کا تجھ کو دل مضطر کہوں

قابل عبرت ہے ترا حال دنیا کے لئے — زندگی ہے تلخ تجھ سے ناشکیبا کے لئے

تجھ سے سنا چاہتا ہوں داستانِ دردوغم — پھر سنانا چاہتا ہوں کچھ بیان دردوغم

ہے بھرا ترے رگ و ریشے میں دردِ عاشقی — ہے وبالِ دوش تجھ کو اب یہ تری زندگی

مشغلہ یوں نالہ و فریاد کا اچھا نہیں
کچھ تو کر سامانِ تسکینِ دلِ اندوہگیں

اقدس (حیدرآبادی)

کوئل کی صدا

پیاری کوئل جو مجھے تیری صدا آتی ہے — بخدا تن سے مری جان نکل جاتی ہے
تیری آواز بہت دل کو مرے بھاتی ہے — کیوں تو بےچین ہے کس کے لئے چلاتی ہے

دلربایانہ ہیں انداز تو دلکش ہے صدا
دل تڑپتا ہے مرا سنکے تری آہ و بکا

کس کی فرقت میں ہوا حال ہے ابتر تیرا — کس پہ آیا ہے بتا سچ دل مضطر تیرا
سنگدل ہے وہ بڑا کون ہے دلبر تیرا — نالہ سنتا ہوں جو ہر وقت میں اکثر تیرا

ماتمی کس لئے پہنا ہے بتا تونے لباس
کس کے غم میں تو رہا کرتی ہے ہر وقت اداس

لب پہ فریاد ہے کیوں کس کے لئے چشم ہے تر — کیوں ترے چاہنے والے کو نہیں تیری خبر
کیوں تجھے چین نہیں مجھکو بتا آٹھ پہر — یاد میں کس کی رہا کرتی ہے تو شام و سحر

تیری آواز ہے پیاری تو تو ہے متوالی
ہجر میں کس کے تری شکل ہوئی ہے کالی

بیوفا ہے وہ بڑا جس نے تجھے رنج دیا — بیکسی پر تری افسوس نہ کچھ رحم کیا
یاد معشوق میں پھرتی ہے یہاں کیوں تنہا — بات کر مجھ سے ذرا میں بھی ہوں ہمراز ترا

سچ ہے دنیا میں کسی کا بھی کوئی یار نہیں
ہیں تو مکار بہت کوئی وفادار نہیں

رحم آیا نہیں مجھ پر بھی مرے قاتل کو — وار پورا نہ کیا چھوڑ گیا بسمل کو
یاد آئی نہ مری بھول کے اس غافل کو — پاس آ رو کے نکالیں گے غبار دل کو

نہ تو ہمدرد ہے میرا نہ کوئی تیرا عزیز
اک خدا کو ہے بقا اور ہے فانی ہر چیز

عزیز حیدر آبادی

(خاکسار خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا)

مزا پوچھے کوئی زخم خدنگ ناز کا ہم سے
تڑپ کر کہہ رہا ہے طائر قبلہ نما ہم سے

تلا ہے ظلم پر گردوں مقدر ہے خفا ہم سے
پھریں تری نگاہیں کیا زمانہ پھر گیا ہم سے

نہ ہو بدظن نہ رہ برہم غنیمت ہے ہمارا دم
ملینگے چاہنے والے نہ پھر اے بیوفا ہم سے

سنا کر مجھکو کہتے ہیں مخاطب کرکے غیروں کو
نہ رکھے عاشقوں میں کوئی امید وفا ہم سے

ہوا ہے ہم میں انمیں اسطرح سے عہد الفت کا
پھریں اللہ سے گر ہم پھریں اقرار باہم سے

چھپایا لاکھ تم نے دل میں راز الفت دشمن
تمہاری نیچی نظروں نے مگر سب کہدیا ہم سے

تمھیں سچے ہمیں جھوٹے سہی تکرار جانے دو
نہ نکلے گا نتیجہ کوئی بھی اس بحث باہم سے

بنی ہے جان پر ایسی کہ کچھ بھی بن نہیں پڑتی
جو وہ بگڑے ہوئے ہیں تو قضا بھی ہے خفا ہم سے

ہم اپنے خون دل سے سینچتے رہتے ہیں اے قاتل
نہ کیوں مانوس ہو گلزار مقتل کی فضا ہم سے

بتائے کون کس سے ہم کریں دریافت اے خوشتر
رہا کرتا ہے بدظن کیوں بت کافر ادا ہم سے

بجلد ۳ ‖ فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ جولائی و اگست ۱۹۲۷ء سنہ عیسوی ‖ نمبر ۱

تصاویر { (۱) عالیجناب شیخ عبد الخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست منگرول
(۲) امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی (۳) جناب سید غلام محی الدین صاحب زور قادری ۔ ایم ۔ اے

نکات

از "ملا رموزی"

جنون، خبط، مالیخولیا، اور، دیوانگی کا مجموعہ اگر دیکھنا ہو تو کسی مضمون نگار یا شاعر کو اُس وقت چھپ کر دیکھو جب وہ مضمون لکھ رہا ہو یا غزل کہہ رہا ہو، یہ جس قدر نامور مضمون نگار دنیا میں آج کل نظر آرہے ہیں اگر اُن کا نمونہ دیکھنا ہو تو بس ہمیں دیکھ لو اور سمجھ لو کہ اسی طرح مضمون لکھتے ہیں مثلاً اگر خدا نہ خواستہ آپ ہمیں مضمون لکھتے دیکھ لیں تو آپ کو مضمون نگاری کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا، چنانچہ ہم جس طرح مضمون لکھتے ہیں وہ یوں ہے کہ :-

....

چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے، جاگتے اور سوتے، مضمون کا عنوان سوچتے رہتے ہیں، جب سوچ لیا تو پھر نہایت غرور کے ساتھ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر **وہ** جو سادہ کاغذ میز پر رکھ جاتی ہیں ادھیں قلم کی نوک سے سیدھا کرتے ہیں، اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں، کہ یکایک دماغ معطل ہو جاتا ہے تو ہم آسمان دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں! پھر قلم کو منھ میں داب لیتے ہیں! پھر قلم کو سر پر مارتے ہیں مگر اس سلیقہ سے کہ کوئی یہ سمجھے سر کھجا رہے ہیں۔ پھر یہ مصرعہ گنگناتے ہیں کہ ؎

"وہ جو گھر میں نہیں تو کچھ بھی نہیں"

پھر اس مصرعہ میں سُر پیدا کرتے ہیں، پھر قلم اور میز سے طبلہ کا کام لیتے ہیں اور اس سے اپنی نغمہ سرائی کو باقاعدہ بناتے ہیں پھر الاپتے ہیں، پھر تان لگاتے ہیں کہ مضمون یاد آجاتا ہے اور پھر مضمون نگاری شروع ہو جاتی ہے، کہ یکایک پھر دماغ .... اب قلم ہاتھ سے پٹک دیتے ہیں اور دونوں پاؤں میز پر دراز کر کے کرسی کو جھولا دیتے ہیں اور وہی مصرعہ پھر پڑھتے ہیں کہ ؎

"وہ جو گھر میں نہیں تو کچھ بھی نہیں"

اب بھی اگر مضمون نہ سوجھا تو چارپائی پر مع قلم و کاغذ لیٹ جاتے ہیں اور مضمون لکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں دماغ پھر .... پھر لیٹے لیٹے ؏

"جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں"

مگر تھکے جاتے ہیں کہ اتنے میں زور شور سے چھینک آتی ہیں مگر ہم تھکے جاتے ہیں، اب لیٹے لیٹے تھکنے سے بدن میں وہی عیش پسند سستی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی حکمران مسلمانوں کی امداد کے لئے لنڈن سے بچارے انگریزوں کو ہندوستان آنا پڑا اور اب بھی غریب ہندوستانی حکمرانی کے ذمہ دار ہیں۔

پھر اس سستی سے ہم اس طرف سے لیٹ جاتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں پھر اس طرف سے لیٹ جاتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں، پھر ایک ہاتھ پھیلاتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں پھر دونوں پاؤں دراز کرتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں، پھر تکیہ لگا کر اوندھے لیٹ جاتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں، پھر ایک دو جمائیاں لیتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں، ہارے اب یہاں سے غنودگی کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے مگر تھکے جاتے ہیں، اب غنودگی کا اثر لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتا ہے مگر تھکے جاتے ہیں اب مضمون کی سطریں ٹیڑھی ہونا شروع ہوتی ہیں مگر تھکے جاتے ہیں، اب نظروں سے حروف غائب ہونا شروع ہوتے ہیں مگر تھکے جاتے ہیں کہ اتنے میں آواز آتی ہے۔

"آگ لگے، کب لکڑیاں پھاڑی جائیں گی"

"اور کب روٹی پکیگی"

یہ آواز **او ن** کی ہوتی ہے اور ہم جھنجھلا کر مضمون پھینک کر کلہاڑی سنبھال لیتے ہیں، مضمون لکھنے کے بعد اُن کے ڈر سے لکڑی پھاڑنا پانی بھرنا، سودا سلف لانا کیجئے دماغ کے لئے کس قدر مفید ہے ؟؟؟

اب ایسے "مضامین بامشقت" کو مفت طلب کرنا ایڈیٹروں کا ہے نہ "انگریزی مارشل لا" !

---

۲۷ رجون کو لنڈن میں "مادری زبانوں میں تعلیم" کے متعلق ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستانی مسٹر اکبر حیدر آبادی نے ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم دینے پر زور دیا اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موصوف کی بات لنڈن کانفرنس میں سُنی بھی گئی یا نہیں ؟ لیکن سوال یہ ہے کیا ہندوستانیوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایم۔ اے تک کی تعلیم اُردو زبان میں حاصل کریں ؟

ہمارے خیال میں تو جب تک ہندوستانی ذیل کے امور میں "حق مادری" کو تسلیم نہ کریں گے کچھ بھی نہ ہوگا مثلاً وہ تمام ہندوستانیوں کو اپنا پاجامہ بھی "مادری" استعمال کرنا چاہئے اسی طرح علی گڑھ والوں سے کہدیا جائے کہ وہ کالج کی زندگی سے نکل کر اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں سے "مادری زبان" ہی میں گفتگو فرمایا کریں، پھر تمام انگریز بھائیوں سے کہدیا جائے کہ وہ ہر ہندوستانی سے "اردو زبان" میں گفتگو کریں کیونکہ گو ہندوستانی سوراج کے قابل نہیں مگر اردو زبان خوب جانتے ہیں،

صوبجات متحدہ جو کسی وقت اردو زبان کے لئے مصدر و مرکز کا کام دے چکے ہیں آج مسلمانوں کی "انگریزی پرستی" کے صدقہ اردو زبان سے تہی دامن نظر آتے ہیں، مثلاً یہاں ۱۹۱۳ء میں ہندی زبان کے اخباروں کی تعداد (۵۶) تھی اور اردو زبان کے اخباروں کی تعداد (۷۹) تھی، لیکن تیرہ سال بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں ہندی زبان کے اخباروں کی تعداد (۲۴۶) اور اردو زبان کے اخباروں کی تعداد (۱۹۶) ہے گویا اس عرصہ میں ہندی اخباروں کی تعداد اردو اخبارات سے بقدر (۵۰) زیادہ ہوگئی، بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ مسلمانوں کو اپنی زبان سے جسے وہ ملک کی مشترکہ زبان کا درجہ دینا چاہتے ہیں کہاں تک محبت ہے؟ مگر ہم یہی کہیں گے کہ یہ سب نتیجہ ہے پتلون پہننے اور اخبار۔ پانیر۔ خریدنے کا

اخباروں میں جس طرح ایک طبقہ۔ اخبار بیں ہوتا ہے اسی طرح رسالوں میں ایک طبقہ رسالہ بیں ہوا کرتا ہے، مگر اب ایک طبقہ "رسالہ خوار" پیدا ہوا ہے، ادہر رسالوں میں جب سے خاص نمبروں کی گھوڑ دوڑ شروع ہوئی ہے اس "رسالہ خوار" طبقہ کا زور بہت بڑھ گیا ہے، آئے دن رسالے کے ایڈیٹر رویا کرتے ہیں کہ ہمارے رسالے چوری جاتے رہے، اتفاق سے اس مرتبہ ہم نے ایک ڈاکخانہ میں دیکھا کہ ایک رسالہ کا خاص نمبر بیٹھے پڑھ رہے تھے، بعد ملاحظہ اسے گوند سے اسی طرح بند کر کے رکھدیا اور دوسرا رسالہ کھولا یہ ڈاکخانے کے "ڈیلیوری کلرک" تھے جو اخباروں اور رسالوں کی چٹیں پھاڑ کر ملاحظہ فرماتے تھے اور پھر بند کر کے ڈاکیہ کو تقسیم کئے دیتے تھے

ہم نے محسوس کیا کہ آخر ڈاکخانہ والے رسالے کے خاص نمبروں پر اس قدر کیوں فریفتہ ہیں تو معلوم

ہوا کہ رسالے خاص نمبروں کے صفحۂ اول کو اس قدر رنگین بناتے ہیں کہ وہ نقش ونگار کا خاصا ڈرائنگ ماسٹر ہو جاتا ہے اس لئے ہم تمام رسالوں کے ایڈیٹروں کو چوری سے محفوظ رہنے کی یہ تدبیر بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے خاص نمبروں کے صفحۂ اول کو رنگین بنانے کی جگہ سیاہ رکھا کریں اور اس پر بجائے رسالہ کے نام لکھنے کے لکھدیا کریں۔ "دعا گنج العرش فارسی" انشاء اللہ مسلمان ڈاک خانے والے اس پر سوائے بوسہ دینے کے نظر تک نہ ڈالیں گے اور ڈاکیہ بھی اُسے سینہ سے لگائے ہوئے سیدھا خریدار کے گھر پہونچا دیا کرے گا، اب رہے ڈاک خانوں کے ہندو ملازم سو وہ بھی لفظ "فارسی" کی وجہ سے اس رسالہ کو ہاتھ نہ لگائیں گے، خدا کرے رسالہ "زبان" کا خاص نمبر اسی ترکیب سے شائع ہو۔

اطلاع

زبان کی چند مکمل جلدیں دفتر میں موجود ہیں جن صاحب کو ضرورت ہو فوراً ۱۲ بھیجکر ایک سال کی دو مکمل جلدیں طلب فرمائیں۔ موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد یہ علمی جواہر پارے پھر کہیں دستیاب نہ ہوں گے۔

مینیجر "زبان"
منگرول (کاٹھیاواڑ)

قصیدہ[1] در تہنیت تشریف آوری از سیاحت مصر و یورپ حضور لامع النور شیخ عبد الخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست مانگرول دام اقبالہٗ و جلالہٗ

از نتیجۂ فکر احقر خوشتر منگرولی (مدیر رسالہ ہٰذا)

طرب انگیز ہے کیا یہ شور بحر بے پایاں
مچا تا ہے خوشی میں کونسی یہ اسقدر طوفاں

مسرت ساکنان بحر کو کیوں کر نہ ہو حاصل
تلاطم میں تموج میں تفرج خیز ہے طغیاں

مسرت کی ہیں سطح بحر پہ لہریں رواں ہر سو
مناتی ہیں اچھل کر مچھلیاں کیوں جوش میں خوشیاں

نہیں پھولے سماتے کیوں حباب بحر جامہ میں
خوشی کے عالم قلزم میں کیوں ہر سمت ہیں سامان

سمندر کیا لئے جاتا ہے اور لاتا ہے خوشخبری
یہ کیا آج جزر و مد میں یارب راز ہے پنہاں

یہ موجیں کس کے آمد کی خبر لائی ہیں ساحل پر
صدف کس کے نچھاور کو ہے لائی گوہر غلطاں

ہے آیا کون بحری راہ سے بحر کرم ایسا
کہ جس پر بحر احمر او ہے بحر عرب نازاں

نوید جانفزا لائی ہے باد شرطہ ساحل پر
وہ آتے ہیں جو ہیں پیدا دلی میں حاتم دوراں

وہی بحر سخا در یتیم نہ گوہر یکتا
ولیعہد بہادر شیخ عبد الخالق ذیشاں

معہ الخیر آج آئے مصر و یورپ کی سیاحت سے
معہ فرزند و بیگم کیا بہ لطف خالق یزداں

انہیں کے آج استقبال کی تقریب شش کن ہیں
بنا ہے گلشن منگرول رشک گلشن رضواں

مضامیں کے بہادہ جودت طبع رواں دریا
کہ سن کر پانی پانی شرم سے ہوں عرفی و سحباں

خطابیہ پڑھوں وہ مطلع توصیف اے خوشتر
کہ جس کو سن کے ارباب سخن ہوں شُشدر و حیراں

[1] یہ قصیدہ ممدوح گرامی کے سفر یورپ کی تشریف بری کی تقریب میں [illegible]

مطلع

تو اے سیاح یورپ شیخ عبدالخالق ذیشاں
وحید عصر، فیاض زماں ہے حاتم دوراں

جہانگیر زماں ہے تو جو عہد اکبری ہے یہ
ولیعہدی تجھے زیبا ہے شاہی ہے تجھی شایاں

امور مملکت مشکل سے مشکل سہل کر دے تو
ترے آگے سیاسی عقدہ دشوار ہے آساں

نہنگ و شیر بھی تیرے مطیع حکم رہتے ہیں
ترا اقلیم بحر و بر پہ ہے حکم و عمل یکساں

تو چاہے تو رواں ہو فلس ماہی پر ترا سکہ
خراج بحر چاہے تو صدف دے گوہر غلطاں

سہیم آفاق میں ہمسر کوئی تیرا نہیں ملتا
ہے اپنا آپ ہی ثانی تو زیر گنبد گرداں

رعایا پروری و عدل کوشی دین ہے تیرا
مساوات و رواداری برتنا ہے ترا ایماں

سخا سے رحم سے انصاف سے اخلاق سے اپنے
ہر اک کو کر لیا ہے تو نے اپنا بندۂ احساں

نہیں ہندو مسلماں میں کوئی تخصیص اعلیٰ کی
نگاہ عدل میں ہیں ہے رعایا سب تجھے یکساں

ہے طرز حکمرانی در رعایا پروری ایسی
ہر اک کو فخر ہے ہونے کا تیرا طابع فرماں

خلیق و با مروت ہے شفیق و با محبت ہے
حلیم و معدلت گستر ہے تو ہی اے شہ ذیشاں

درافشاں ہو اگر تو بزم میں اے رونق محفل
فصیحان جہاں بھی ہوں فصاحت پر تری حیراں

اگر تیور بدل کر رزم میں شمشیر زن ہو تو
شجاعان جہاں کے تری آگے ہوش ہوں پراں

شجاعت اور ہمت کا تری وہ مان لیں لوہا
اگر ہوں آج گیو و گودرز و سام و رستم و دستاں

دکھا کر تو نے بحر فکر میں غواصیاں خوشتر
کئے حاصل ہیں مدح و وصف کے کیا کیا در غلطاں
بس اب کر دے دعا پر مختصر تو اس قصیدے کو
ہو اوصف شہ عالی گوہر میں خوب درافشاں

رہے بیخوف تری کشتی عمر رواں جاری (د) روانی بحر میں جب تک رہے اور موج میں طغیاں

نہ ڈر باد مخالف کا رہے اس کو نہ طوفاں کا
نہ بیم و خوف گرداب بلائے بحر بے پایاں

ترے دشمن جو ہوں غرقاب ہوں بحر ذلت میں
ترے احباب ہوں تاباں مثال گوہر تاباں

تری جو آرزوئیں ہوں خدا پوری کرے ساری
ترے بر لائے سارے خالق اکبر دلی ارماں

رہے پھولا پھلا دائم چمن تیری مرادوں کا
رہے اس گلشن عالم میں تو مثل گل خنداں

دعا تیرے ہی خواہوں کی ہے دل سے یہی ہر دم
رہے تا حشر تو با خیر و خوبی خرم و شاداں

جذبات آثر

(جناب ولایت حسین خاں صاحب آثر رامپوری)

پھر وہی خواب پریشاں نظر آتا ہے مجھے
پھر وہی حشر کا ساماں نظر آتا ہے مجھے

سن رہا ہوں وہ عیادت کیلئے آئیں گے
دردِ دل قابلِ درماں نظر آتا ہے مجھے

ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اب وحشت میں
ہاتھ سے دور گریباں نظر آتا ہے مجھے

خیر ہے اے دلِ ناشاد نصیبِ اعدا
کچھ ترا حال پریشاں نظر آتا ہے مجھے

کہدیا کس سے یہ احوالِ پریشاں اپنا
کون ہمسر بگریباں نظر آتا ہے مجھے

چشم امید رکھوں اور جہاں میں کس سے
دل ہی جب جاں کا خواہاں نظر آتا ہے مجھے

پھرنے والے ہیں خدا چاہے تو پھر دن اپنے
پھر وہی عیش کا ساماں نظر آتا ہے مجھے

سوزِ الفت کی بدولت یہ ہوا ہے عالم
دل کا ہر داغ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

سختیاں راہِ محبت میں اٹھائیں ایسی
کارِ دشوار بھی آساں نظر آتا ہے مجھے

چشم و دل میں جو سمایا ہے اثر جلوۂ یار
کبھی پیدا کبھی پنہاں نظر آتا ہے مجھے

مولانا ابوالکلام صاحب آذاد دہلوی ایڈیٹر الہلال

صفحۂ ادارت

خدا خدا کرکے زبان نے اپنی عمر کا ایک سال ختم کر دیا۔ آج دوسرے سال میں ہزاروں امیدوں کو لے کر داخل ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ گذشتہ سال کی طرح سال رواں بھی اس کے لئے ویسا ہی منحوس و مہلک اور بھاری ثابت نہ ہو۔ ہمارا ہی جی جانتا ہے کہ کس طرح اس نے سال گذشتہ کو مر مر کے اور لمبی لمبی سانسیں لیکر اور کن کن مصائب کا سامنا کرکے ختم کیا ہے باوجود اس تجربہ اور معقول مالی نقصانات کے ہم اس کو پھر قائم رکھنے سعی اور زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہمیں اس بات کا پہلے ہی سے کھٹکا تھا کہ "کہیں ہماری یہ سعی سعی لاحاصل ثابت نہ ہو" آخر وہی ہوا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک نے ہماری اس درخواست پر کوئی توجہ نہیں کی ہماری سعی کی کوئی داد نہیں دی اور ہماری جان کاہیوں کا کوئی صلہ نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ آج اس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور جینے کی کوئی امید نظر نہیں آئی اور ظاہرا اس کی حیات سے مایوسی ہو چلی ہے مگر دنیا بہ امید قائم کے پرانے مقولے پر عمل پیرا ہو کر ہم اس کے قیام و ثبات کے لئے ایک آخری جدوجہد کر رہے ہیں اگر ہم اس میں بھی ناکام رہے تو ملک و قوم کے جمود و بدمذاقی کا ماتم کرکے **زبان** کو ہمیشہ کے لئے **بند** کر دیں گے۔

ہم بارہا اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہم نے زبان کا اجرا کسی خاص سرمایہ سے نہیں کیا محض اپنے ملک کی قدردانی کے بھروسے پر اس کو جاری کیا تھا اور یہ بھی علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اس میں جلب منفعت کا کوئی شائبہ ہے نہ ذاتی منافع مقصود ہے لیکن افسوس کہ ہماری توقعات کے خلاف ملک نے انتہائی غفلت شعاری اور خود فراموشی سے کام لیا ؏

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اب اگر ہم زبان کے بند ہونے کے اصلی سبب میں اپنوں کا شکوہ کرتے ہوئے یہ کہیں تو غالباً کسی طرح بیجا نہ ہوگا ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

ہم حسب وعدہ قارئین زبان کی خدمت میں یہ خاص نمبر جو بیش بہا علمی جواہر پاروں سے مالا مال ہے اور جس کی تیاری میں ہم کو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ صرفہ آیا ہے اس امید پر پیش کرتے ہیں کہ شاید ہمارے گذشتہ نقصانات کی تلافی ہو جائے ورنہ گزشتہ نقصانات کے ساتھ یہ مزید نقصان تو ہے ہی ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں اور ناظرین کو ان کے فرض "توسیع اشاعت" کی جس کا ہم گذشتہ نمبر میں اعلان کر چکے ہیں یاد دہانی کرتے ہیں۔ دیکھیں اب بھی ہماری اس حقیر کوشش کی داد دی جاتی ہے یا نہیں ہ

دل دے کے ان سے داد وفا مانگتا ہوں میں
ہے دیکھنے کی چیز "یہ حسن طلب" میرا

اگر حسب درخواست ہر خریدار نے تین تین چار چار خریدار ہم پہنچا دیے تو تو انشاء اللہ زبان پھر اپنی شیریں کلامی سے نہایت پابندی کے ساتھ ہر ماہ اپنے قدر دانوں کی خدمت بجالانے کے قابل ہو جائیگا ورنہ درصورت عدم توجہ وہی ہوگا جو ہم کہہ چکے ہیں یعنی رسالہ بند کر دیا جائے گا اور **وی۔پی** وصول کرنے والوں سے اس نمبر کی قیمت وصول کر کے ان کی بقیہ رقم واپس کر دی جائے گی ہ

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

آہ! دنیا، پر انقلاب دنیا!! اور دو رنگی دنیا کی یہ کیسی نیرنگی ہے کہ ہم گذشتہ اسی ماہ میں **زبان** کے اجرا کا بڑی دھوم سے اور بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ نہایت شاندار الفاظ میں **افتتاحیہ** لکھ رہے تھے اور آج پورے ایک سال کے بعد اسی ماہ میں ہم نہایت حسرت و مایوسی سے اس کا اختتامیہ لکھ رہے ہیں، الوداع لکھ رہے ہیں وہ اگر اس کی تولید کا خوش آیند نغمہ تھا تو یہ اس کی جوانا مرگی کا پر درد مرثیہ ہے آہ! ہ

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

اس خوف سے کہ مبادا قدر دانانِ زبان نے ہماری درخواست پر بدستور بے پروائی برتی اور

شان بے نیازی قائم رکھی تو ہم آئندہ نمبر نہ شائع کرسکیں گے اس لئے یہاں ہم اپنے ان تمام قلمی معاونین جنھوں نے ہماری اسـتدعا پر اپنے اپنے افادات سے زبان نوازی فرمائی ہے، اس اجنبی راہ میں خضر راہ بن کر رہنمائی کی ہے، ہمارا ساتھ دیا ہے اور گاہ گاہ ہمارا ہاتھ بٹایا ہے دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے اس تقصیر کی معافی چاہتے ہیں اور خواستگار عفو ہیں امید ہے کہ وہ ہمیں ضرور معاف فرمائیں گے۔

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

تصاویر۔ اس خاص نمبر کو جن خاص تصاویر سے مزین کیا گیا ہے ان میں سے پہلی تصویر ہمارے مربی و محسن کرم گستر و معارف قدردان علم و ہنر حضور **شیخ عبدالخالق** صاحب صدیقی ولیعہد بہادر ریاست منگرول کی ہے، ہمارے اس جواں بخت و جواں سال ولیعہد کو مبدء فیاض نے نہ صرف ملکی حکمرانی عطا فرمائی ہے بلکہ ایسی غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا مالک بھی بنایا ہے جس سے وہ ہمارے دلوں پر حکومت اور ہمارے خیالات پر حکمرانی کرتا ہے جہاں یہ اہم ملکی امور کے سلجھانے اور بڑے بڑے سیاسی عقدوں کو آسانی سے حل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے وہاں قوم کی بہبودی و فلاح اور ملک کی اصلاحی تدابیر بھی اسی سہولت سے عمل میں لانے کی قابلیت رکھتا ہے جس کو دیکھ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آدمی ایک ہی دفعہ کی ملاقات میں اس کے علوی خیال اور حسن اخلاق کا معترف ہو جاتا ہے۔

غرض کہ آپ کو قدرت کے فیاض ہاتھوں نے ایسا ہی دل و دماغ عطا فرمایا ہے جیسا ایک منصف رئیس کا ہونا چاہئے۔ پہلو میں ہمدرد دل اور دل میں رحم و کرم اور ملک و ابنائے جنس کی ہمدردی اور مذہبی جوش اسی قدر موجود ہے جس قدر ایک سچے مسلمان کے دل میں ہوتا ہے ان خوبیوں کے ساتھ آپ حسن سیرت و اخلاق کا بہترین نمونہ اور انکسار و تواضع کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔

باوجود ریاست کے کاراہمہ کے آپ کا علمی ذوق بھی قابل داد ہے۔ اردو ادبیات سے خاصہ شغف ہے خصوصاً مراثی کے ادبیات سے بڑی دلچسپی ہے۔ مرثیہ اس ڈھنگ سے پڑھتے ہیں کہ رزم و بزم کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور سامعین پر ایک وجدانی نقشہ طاری فرما دیتے ہیں۔ غرض آپ کی ذات کاٹھیاواڑ کے لئے مایۂ نازش ہے۔

دوسری تصویر امام الہند مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کی ہے جو ہمیں اپنے کرم فرما اور موصوف الصدر کے دوست جناب رضا الحق صاحب عباسی پرائیویٹ سیکرٹیری میر آف خیرپور (سندھ) سے موصول ہوئی ہے جس کے لئے ہم عباسی صاحب کے ممنون ہیں۔

اس بات کا بہت کم اصحاب کو علم ہوگا کہ ہم جس علامہ محترم کے عالم شباب کی یہ تصویر زیب نزبان کرتے ہیں اور جو آج ہمیں صحیح مسلک پر چلنے کی تعلیم، ہمارے اسلاف کے اصول پر چلنے کی ہدایت، ہمارے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی، اور ہم میں مذہبی۔قومی۔اور سیاسی روح پھونکنے کی قابل قدر جدوجہد کر رہا ہے اور جس کے دل میں مذہبی جوش اور قومی ہمدردی بدرجہ اتم موجود ہے اور جو الہلال ایسے مؤقر اور شاندار اخبار کو آج نہایت قابلیت سے ایڈٹ کر رہا ہے وہی آج سے ۲۵ سال قبل عین عالم شباب میں بھی یہی دل و دماغ رکھتا تھا دل میں یہی درد اور خیال میں یہی وسعت رکھتا اور "لسان الصدق" جیسے خالص علمی رسالہ کو ایڈٹ کرتا تھا جن میں قوم کی بیداری کی بھی تجاویز پیش کرتا تھا جن کو آج ہم اس کی ہر تقریر اور ہر تحریر میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس وقت بھی جاننے والے اُسی عمق نظر سے دیکھتے تھے ۔ اسی لئے تصویر کی مناسبت سے ہم نے مضمون "مسلمانوں کا ذخیرہ علوم فنون" بھی موصوف کے عالم شباب ہی کے زمانہ کا بہم پہنچایا ہے یقین ہے کہ ناظرین قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

تیسری تصویر زمانہ حاضرہ کے نوجوان اور ہونہار ادیب (عازم انگلستان) ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور قادری ایم۔ اے کی ہے جس کو ہم نہایت فخر کے ساتھ پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں آپ حال ہی میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں جس کی ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

موصوف کا نام اگرچہ "روح تنقید" کے ذریعہ علمی دنیا میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا لیکن دنیائے علم و ادب کو آپ سے اس سے کہیں بہتر و افضل تصانیف کی توقع ہے جو امید ہے کہ بہت جلد اردو کے علمی خزانہ میں زبردست اضافہ ثابت ہونگی۔

دعا ہے کہ موصوف جس غرض سے ولایت کا سفر کرتے ہیں اس میں کامیابی کے ساتھ فتحمند ہوں۔

مضامین - اس نمبر میں جتنے مضامین شائع کئے جاتے ہیں ان سب میں زبان کا اصل معیار قائم ہے ہم چاہتے ہیں کہ زبان کا ہر نمبر ایسے ہی مضامین سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کی معلومات کا باعث ہوا کرے اور یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے اگر زبان کے مقالہ نگار اس طرف توجہ فرمائیں۔

سیرت رسول اللہ کی تمہید یہ مضمون ہمارے مکرم پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے کی اسی نام کی زیر تالیف کتاب کی تمہید کا کچھ حصہ ہے جو موصوف نے خاص زبان کے لئے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم موصوف کے بحد شکر گزار ہیں۔

کوئی ۱۹-۲۰ برس کا عرصہ ہوا موصوف نے "تذکرۃ المصطفیٰ" نام ایک مختصر سی کتاب اسی موضوع پر لکھی تھی لیکن "سیرت رسول اللہ" (مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کی ان غلط تحریرات نے جو ہمارے رسول اللہ صلعم کے خلاف لکھی گئی تھیں جس کا ذکر ہم گذشتہ اگست ۲۶ء کے زبان میں کر چکے ہیں موصوف کو اس اہم خدمت کے انجام دینے کے لئے مجبور کیا ہے) جیسا کہ اس کی تمہید ہی سے معلوم ہوتا ہے مشرق و مغرب کے قدیم و جدید ماخذوں سے جدید طرز پر مرتب کی جا رہی ہے جو بلاشبہ اپنی طرز میں انوکھی اور اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ موصوف یہ بھی خوشخبری دیتے ہیں کہ اب تک دو سو صفحات سے زاید لکھے جا چکے ہیں۔

"مسلمانوں کا ذخیرہ علوم و فنون" اس مضمون کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہے کہ یہ علامہ ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کے خامہ معجز رقم سے نکلا ہوا ہے اور اس پر علامہ شبلی مرحوم کا نوٹ بطور مہر ثبت ہے "علمائے ماہرین السنہ" یہ مضمون ملک کے مشہور و مایۂ ناز مضمون نگار و مصنف مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو ہمیں اپنے مکرم جناب سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہا ودیالے احمد آباد کی معرفت موصول ہوا ہے جسکو شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ اسی طرح مولانا سے محترم زبان نوازی سے ہمیں سرفراز فرمایا کریں گے۔

"دیودیوی" یہ تاریخی مضمون ہمارے خاص کرمفرما اور زبان کے زبردست قلمی معاون مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہا ودیالے (احمد آباد) کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے جو ہمیں زبان کے خاص نمبر کے لئے عطا فرمایا ہے، اگرچہ ان کے نتائج افکار کا سب سے زیادہ مستحق "معارف" (اعظم گڈھ) ہے پھر بھی وہ ہمیں ہر نمبر کے لئے کچھ نہ کچھ مرحمت فرمایا ہی کرتے ہیں جس کے لئے ہم

موصوف کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ حق تو یہ ہے کہ چونکہ "دیول دیوی" کو گجرات سے ایک خاص تعلق ہے اس بنا پر اس مضمون کے سب سے زیادہ ہمیں حق دار ہیں امید ہے کہ موصوف اس قبیل کے مضامین سے زبان کے حقوق کی حق تلفی نہ فرمایا کریں گے۔

"اردو کے پیغام گو شاعر" ہمارے خاص کرم مولانا ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔اے (جامعہ عثمانیہ) کا یہ دوسرا معرکتہ الآرا مضمون ہے جس کو ہم زبان میں شائع کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں موصوف نے اس مضمون میں اردو کے اُن شعرا کا حال جنھوں نے قوم کو بیداری کا پیغام دیا ہے نہایت قابلیت سے ناقدانہ رنگ میں لکھا ہے موصوف کو اس رنگ میں جو ید طولیٰ حاصل ہے "روح تنقید" اس پر دال ہے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں ہے۔

"نفسیات اسباب آرائش" اس نئے موضوع پر جناب سید عابد علی صاحب عابد بی۔اے ال۔ال۔بی نے قلم اٹھایا ہے اگرچہ مختصر ہے تاہم ایک حد تک کامیابی کے ساتھ اس پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔

گجرات کی ایک قدیم عربی تاریخ اور جالینوس والے مضامین مکرم حضرت زور صاحب کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں جنھیں شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے ہم معزز مقالہ نگاروں سے توقع رکھتے ہیں کہ آیندہ بھی وہ اپنے افادات سے زبان کو مستفید فرمایا کریں گے۔

"شوہر کے نام" جو خط شائع کیا جاتا ہے وہ ہمیں محترمہ جناب ہمشیرہ صاحبہ مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی نے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم محترمہ موصوفہ کے مشکور ہیں۔ اس مضمون میں پردے کی پامال بحث کو نہایت قابلیت سے لکھ کر اس میں جان ڈال دی ہے موصوفہ نے بے پردگی کی خرابیوں کو ایسے مدلل طریق پر بیان فرمایا ہے کہ ممکن نہیں پردے کے مخالف ان حقایق صادقہ سے انکار کرنے کی ہمت کر سکیں ہاں ہٹ دھرمی کی اور بات ہے۔

"اقوال زرین" ہمارے مکرم دوست جناب حافظ امام الدین صاحب امام اکبرآبادی نے اپنے خاص رنگ میں خوب لکھا ہے بھلا "زلال دردوایہ" والا مضمون بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت رکھتا ہے ہاں "مصور فطرت" کے ہم قائل ہیں جس میں ادب عالیہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

"لازوال شاعر" شوکت صاحب تھانوی کے ہم مشکور ہیں کہ آپ نے از رہ زبان نوازی اپنا

ایک ادبی فسانہ زبان کو بھی عطا فرمایا امید ہے کہ آئندہ بھی ہمیں شکریہ کا موقع دیا جائے گا۔

حصّہ نظم میں بھی اس مرتبہ سب کی سب نظمیں قابل داد ہیں کس کس کی تعریف کی جائے ہر نظم کا ہر ہر شعر تیر ونشتر کا حکم رکھتا ہے حضرت محوی لکھنوی خالد بنگالی برق دہلوی اور قیصر صاحب کے ہم بہت ممنون ہیں کہ اونھوں نے ہماری استدعا پر اس خاص نمبر کے لئے اپنا اپنا کلام مرحمت فرمایا اسی طرح غزلیات عنایت فرمانے والے تمام شعرا کے بھی خاص طور پر شکر گزار ہیں۔

اس مرتبہ "نکات" میں ہمارے دوست ملا رموزی صاحب نے بہت "پھیکا پکوان" پیش کیا ہے اس کا سبب شاید "اونچی دوکان" ہو جانے کا ہے۔

افسوس ہے کہ ہم اس نمبر میں کتب موصولہ پر ریویو نہیں کر سکے اور بعض مضامین بھی شائع ہونے سے رہ گئے ہیں بہ شرط زندگی انشاء اللہ آئندہ نمبر میں اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

خوشتر (منگروی)

مدیر

گذشتہ مئی و جون کے مشترکہ نمبر میں "ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے خلاف ہمارے پاس ایک مضمون آیا ہے جسکو ہم بجائے تمام وکمال درج کر دینے کے یہاں صرف اُسی حصّہ کو نقل کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں جس میں مضمون مذکورہ بالا کی چند موٹی اور فاحش غلطیاں بتلائی گئی ہیں امید ہے کہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر بہاؤدیالے (احمد آباد) ان وقیع اعتراضات کا معقول جواب عنایت فرمائیں گے اور اپنی زیر تالیف تاریخ گجرات میں ان واقعات کو پوری تحقیق و تدقیق سے لکھیں گے تاکہ آئندہ کسی اعتراض کی گنجایش نہ رہنے پائے۔

گذشتہ مضمون میں حسب ذیل امور تنقیح طلب اور قابل اعتراض ہیں جن کو نمبر وار درج کر کے بالترتیب جوابات دئیے گئے ہیں۔ وھو ہٰذا

"ایڈیٹر"

(الف) محاصرہ و فتح نگرکوٹ کے بعد چھ ماہ میں سندھ پہنچنا۔
(ب) انہی دنوں یعنی ۷۷۰ھ میں ایک فوج منگلور کو راجہ کنور پال کی تنبیہہ کے لئے جا رہی تھی۔
(ج) اس تحریر سے معلوم ہوا کہ سید سکندر رح دہلی ہو کر خشکی کے راستہ سے ...... تا ختم
نوٹ اس میں امور ذیل تنقیح طلب ہیں۔
(۱) "فوج منگلور کو کنور پال کی تنبیہہ کے لئے جا رہی تھی"
(۲) "آپ بھی بطور والنٹیر کے شریک ہو گئے"۔
(۳) "مریدوں کا مجمع بھی تقلیداً شریک ہو گیا"۔
(۴) "اُس جنگ کا کسی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں"
(۵) "مگر جامع مسجد کے کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے"۔
(۶) "منگلور کے عوام" سے کیا مراد ہے"۔
(۷) "آپ بہ بہانہ بارات شادی مع مسلح سپاہیوں کے ڈولہ میں بیٹھ کر قلعہ میں نہیں پہنچ گئے"
(۸) "بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہوتی ہے"۔
(۹) "صحیح یہ ہے کہ مرہٹوں کے عہد حکومت میں سادات منگلور پر فریب طریقہ سے مرہٹوں کو نکال کر خود قابض ہو گئے تھے"۔
(۱۰) "جیسا کہ دیوان رنچھوڑجی کی تاریخ سورٹھ میں مفصلاً موجود ہے"۔

جوابات

(الف) یہ امر مستبعد نہیں اس لئے کہ نگرکوٹ خود ملک سندھ میں واقع ہے دیکھو کتب جغرافیہ قدیم۔
(ب)، (ج) نمبر (۱) حقیقت یہ ہے کہ فوج کنور پال کی تنبیہہ کے لئے اتفاقیہ نہیں جا رہی تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں ذکر ہوتا۔ بلکہ حضرت جہانگشت رح کی فرمایش سے سلطان فیروز شاہ نے یہ فوج خاص طور پر آپ کی مدد کے لئے تیار کی تھی۔
(۲) آپ بطور ایک مجاہد کے شریک نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ آپ ہی عسکر یا امیر الجیش تھے اور ماتحت افسر عزیز الدین کی باقاعدہ فوج آپکی زیر فرمان جس طرح بادشاہ حقیقتاً بادشاہ ہے اور سپہ سالار اس کا نوکر۔

(۳) مریدوں کا مجمع بھی تقلیداً شامل نہیں ہوا تھا بلکہ اصالتاً لشکر مجاہدین ہی تھا اور "عزالدین کا باقاعدہ دستہ آپ کی کمک۔

واقعہ یہ ہے کہ حضور نبوی کے حسب ارشاد حضرت جہانگشت نے اپنے مریدین کے ایک جم غفیر کو آپکی خدمت میں دیا اور فیروزکی باقاعدہ فوج کا ایک حصہ بطور کمک براہ خشکی روانہ ہوا۔ آپ کے ہمراہ وہ تبرکات بھی تھے جو حضرت مخدوم کو جہاں گردی میں ملے تھے اور صرف آپ کو حسب الامر اعطا ہوئے تھے۔ آپ معہ لشکر مجاہدین براہ سمندر ساحل پر اترے علی الصباح محافہ وار بیل گاڑیوں میں سوار ہوکر **دیل واو** کے رستے شہر کے غربی دروازہ سے برات کے بہانہ شہر میں داخل ہوئے۔ دروازے کے پہرے دار کو شک گذرا اس نے ایک گاڑی میں برچھی گھونپ دی وہ حضرت ضیاء الدین کے سینے سے پار ہوگئی آپ نے وہیں جام شہادت نوش کیا اور اسی جگہ مدفون ہیں۔ معاً مجاہدین تکبیریں پڑھتے ہوئے تلواریں سونت کر گاڑیوں میں سے کود پڑے اور لڑتے بڑھتے راجہ کے محل تک پہنچے۔ راجہ مارا گیا۔ مستورات حسب دستور راجپوتان قلعہ کے شمال مغربی برج مسمی بہ سنجن شاہ کا کوٹھا میں بند ہوکر ستی ہوگئیں۔ شہر پہ مجاہدین کا قبضہ ہوگیا مگر راجہ کا بقیۃ السیف لشکر مع امرا شہر کے بڑے مندر میں (جو اب جامع مسجد ہے) پناہ گزین ہوگیا اور کمک کا انتظار کرنے لگا فتح کے تیسرے روز عزالدین کا لشکر بھی آگیا اور مندر پر متحدہ حملہ ہوا سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی راجہ کا لشکر بالکل تباہ ہوگیا مسلمان بھی بڑی تعداد میں شہید ہوئے جو وہیں مندر کے شرقی دروازے کے سامنے والی باولی میں (جو عرصہ سے پاٹ دی گئی ہے) دفن کئے گئے۔ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام "گنج شہیداں" اب تک چلا آتا ہے۔

حسب الامر حضرت مخدوم مع بقیہ مجاہدین منگلور ہی میں اقامت گزیں ہوئے شہر کی حکومت شاہی افسر کے حوالہ کی اور آپ حسب دستور اُچھ خانقاہ قائم کرکے ریاضات وارشاد میں مصروف ہوئے فقراء متوکلین کے لنگر کے لئے ایک گاؤں مسمی بہ دیول پور حال مخدوم پور منظور فرمایا۔ یہ روایت حضرت مخدوم کی اباً عن جدٍ مسلسل ومستند ہے۔ جو بالکل اسی طرح محفوظ چلی آتی ہے جس طرح تبرکات ورسوم اور دیگر متعلقہ روایات اور اس مسلسل روایت کے بعض بعض اہم فقرات کی تصدیق سنگی کتبات اور رقعجات وپروانجات شاہی وکتب تاریخ وطریقت سے بھی ہوتی ہے مثلاً مرقعہ مصورہ مولہ رسالہ ہذا میں دکھو فقرہ "وسکونت قصبہ منگلور بر حکم حوالت بندگی قطب اقطاب عالم قدس اللہ سرہ العزیز سید السادات سید سکندر

مرحوم اختیار کردہ اند وقصبہ مذکور خاصہ اسلام نصب کردہ حضرت قطب اقطاب عالم بندگی مخدوم جہانیان قدس اللہ روحہ بعد الاستخارہ والاشارہ سید السادات سید سکندر مسعود حسینی در شہر سورٹھ نام زد کردہ اند وسکونت قصبہ مذکور فرمودہ اند و درآں وقت در شہر مذکور ہمہ جا کفر بود وسید السادات چنانچہ فرمان بود سر انجام رسانیدہ اند"

ہمارے ہر سہ دعاوی مذکورہ اس فقرہ سے اور خصوصاً خط کشیدہ جملوں سے بالکل واضح طور پر ثابت ہیں جن میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ وفی الاشارۃ و اشارۃ الی بشارۃ یعرفہا اہلہا۔

(۴) کیا دنیا بھر کی موجودہ تاریخیں دیکھ لی گئی ہیں؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بہت تاریخوں میں اس کا ذکر ہو اور وہ تاریخیں حوادث کی نذر ہو گئی ہوں جس طرح لاکھوں کتابیں ملکی انقلابات میں تلف ہو گئیں اور ہو رہی ہیں۔ کسی تاریخ میں ذکر نہ ہونے سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ گذرا ہی نہیں کیا ساری دنیا کے تمام چھوٹے بڑے واقعات بالاستیعاب تاریخوں میں منضبط ہیں۔ ایسے چھوٹے واقعات جن میں طرفین کے ڈیڑھ دو ہزار سپاہی، مصروف پیکار ہوئے ہوں تاریخوں میں کہاں آیا کرتے ہیں الاماشاء اللہ اور یہ اگر صحیح بھی ہو تو کیا حرج ہے جبکہ

(۵) "جامع مسجد کے سنگی کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے" کیا یہ تصدیق کسی تاریخی کتاب سے زیادہ معتبر نہیں؟ نیز اس کی مزید تصدیق رقعہ مسطورہ کی اس عبارت "وسید السادات چنانچہ فرمان بود سر انجام رسیدہ اند" سے ہوتی ہے لفظ خط کشیدہ پر غور فرمائیے نیز اور بھی بہ کثرت اس کی تصادیق ہیں جو۔ رداً للاختصار بالفعل محذوف۔

(۶) "منگرول کے عوام" کی تعریض بالکل غیر ضروری تھی جبکہ اس دعوہ پر جو تاریخ اولیا کی محولہ عبارت سے پیش کیا گیا ہے جس سے صرف فیروز سے ملاقات اور آپ کی تکریم ثابت ہوتی ہے آپ کے دعوے کا ایک لفظ بھی اس میں منقول نہیں۔ جب کہ اس دعوی پر کوئی امر اہم بلکہ خاص الخاص سادات منگرول سے ہے کیونکہ انہی کی یہ روایت ہے اور یہی حاملان روایت ہیں توارثاً اباً عن جدٍ۔ اگرچہ ان عوام کے موجودہ ریکارڈ میں خاص اس دعوی (ورود براہ سمندر) کا کوئی خاص تحریری ثبوت نہیں ہے مگر پوری اور مسلسل روایت کے بعض بعض اہم فقرات کے جستہ جستہ ثبوت اور مضبوط ثبوت موجود ہیں مثلاً رقعہ محولہ بالا۔ تو اس پر قیاس کرکے عام روایت کی صحت کا حکم لگانا بعید از عقل نہیں۔ اور پھر روایت بھی اس قدر مستحکم

کہ سمندر سے شہر تک ایک میل کے راستہ کی تعین کہ "دیل واڑے کے راستہ سے شہر میں آئے"۔

(۷) "آپ بہ بہانہ بارات شادی مع مسلح سپاہیوں کے ڈولہ (نہیں بیل گاڑی محافہ دار) میں بیٹھ کر قلعہ میں نہیں پہنچ گئے"، اسلئے کہ

(۸) بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہے۔

بزرگوں کے متعلق ایک مسلمان کو ایسے ہی حسن ظن سے کام لینا چاہئے مگر اس میں کسی قدر افراط ہو گئی ہے۔ قدیم سے قدیم تاریخ جو دنیا کو معلوم ہے آج تک پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ دنیا کا ہمیشہ اسپر عمل درآمد رہا ہے۔ فردوسی و نظامی سے ہزاروں برس پیشتر ہومر کی نظموں اور مہابھارت کی رزم آرائیوں تک اور اہل اسپارٹا (محاصرۂ ٹرائے) اور قدیم فنیقیہ کی مہات تک سیکسن و بولونیا۔ روما اور کارتھیج۔ ایران۔ توران بابل و مصر۔ حمیر و فارس غرض کوئی ملک اور کوئی قوم تاریخی دنیا میں ان مکروہ اسباب دنیاوی سے نہیں بچی۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے بھی اسپر عمل کیا۔ عیسائیوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عرب کی فائق فنون سپہگری کا جزاعظم یہی تھا اور اب بھی ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا یہ مکروہ اسباب دنیاوی میں سے ہے یا نہیں۔ جواب بالکل واضح ہے کہ "نہیں" یعنی حدود جنگ تک اور ان کے باہر یقیناً "ہاں"، "الحرب خدعۃ" کیا اٹل قانون ہے اور کان ؐ اذا اراد غزوۃ ورّیٰ بغیرھا (صحیح بخاری) اب تو غالباً اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۹-۱۰) واقعہ یہ ہے کہ حضرت سید سکندری کی فتح کے بعد الحرب سجالؐ کے اصول پر کئی بار منگلور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کا قبضہ ہوا مگر سید سکندر کے سوا کبھی علی الانفراد سیدوں کا قبضہ نہیں ہوا کبھی قصباتی مالک ہوئے کبھی ٹکک اور کبھی شیخ۔ ان جنگوں میں یہ تو غیر ممکن تھا کہ سید شریک نہ ہوں جبکہ شہر بھر کے مسلمان شامل ہوں شامل تو ضرور ہوئے مگر صرف مجاہد یا سپاہی کی حیثیت سے ہیروورشپ کبھی نہ لی یا شاید چھوٹے چھوٹے افسروں کے طور پر کچھ کام کیا ہو مگر کبھی حاکم علی الاستقلال نہ بنے۔ بچ کے رقعہ جات وغیرہا سے پتہ لگ سکتا ہے۔ نیز تمام روایات و تواریخ وغیرہ میں کہیں بھی منفردانہ قبضہ سادات کا ذکر نہیں بجز دیوان رگھوبر جی "اور اس کے ناقلین کے۔ اور خاص اخراج مرہٹہ کا واقعہ تو سب سے اخیر یعنی زمانہ حال کا ہے اور جب سے آج تک مسلمانوں کا مسلسل قبضہ چلا آتا ہے۔

جنگ مرہٹہ کو قاضی مرتضیٰ نے اسی زمانہ کی کاٹھیاواڑی اردو میں نظم کیا ہے یہ مثنوی یہاں منگرول

بن ریاست کی جانب سے شائع ہو چکی ہے اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

مار مونڈا مروڑ مرہٹہ کا
گردن
سال-کاڑا تمام سورٹھ کا
کانٹا- نکالا

اس مثنوی میں بڑے بڑے افسروں کے نام ہیں مگر شعر سیدوں کا نشان بھی نہیں - اس سے بڑھ کر
ور ثبوت کیا ہوگا - دیوان رنچھوڑجی نے تقریباً سو برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے اس طرح پر فریب طریق کا ایک
حرف بھی قافی مرتضی کی پوری مثنوی میں نہیں ملتا وہ تو بالکل اسی قسم کی جنگوں کی ایک جھنکاری تھی جیسی نورالدین
زنگی یا اس کے غلام صلاح الدین ایوبی یا بایزید ملدرم یا طارق بن سنان یا قتیبہ بن مسلم یا یزید بن مہلب وغیرہ
مشاہیر اسلام کے وقتوں میں ہوتی رہی ہیں -

دیوان رنچھوڑجی بن امرجی ریاست جوناگڈھ کی تاریخ سورٹھ کو تاریخ کہنا تاریخ کا منہ چڑانا ہے
ایک دفتر مہملات، ایک خریطہ فضولیات، ایک طومار ڈلیات کو میں نہیں جانتا کہ اور کیا کہوں ع

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

اس مجموعہ خرافات کا کچھ نمونہ دیکھنا ہو تو اس کے صفحہ ۳ اسے صفحہ ۹ ایک - (قصہ راجہ بھان
جیٹھوا یا قصہ چل تن دکا سر غیب) نظر ڈال جائیے اس قدر گنجائش کہاں کہ یہ ۶ - ۷ صفحے یہاں نقل کئے
جائیں "

قطعہ

ہی بے گناہوں پہ ظلم و ستم تماشہ ہی — یہ فرد عدل میں کیا نیا اضافہ ہی
گناہگاروں کو ملتی ہی قید میں خوراک — مگر مکان میں جو بچے ہیں اُنکو فاقہ ہی

محمود اسرائیلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جولائی زبان سنہ ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی | کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہی عرش خدائے پاک، اگر پاک ہو دل | صادق ہو زباں تو اسم اعظم ہے یہی

مقالات

سیرت رسول اللہ کی تمہید

از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے (بڑودہ کالج)

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگرچہ ادیان سابقہ کے تمام پیغمبروں اور ہادیوں کو منجانب اللہ مامور یقین کرکے اپنی امت کو صاف الفاظ میں ہدایت کردی کہ ان سب بزرگوں کی ہم عظمت کریں اور ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی نہ کریں اتنا ہی نہیں بلکہ کتب سابقہ میں ان پاک نفسوں کی سیرت کے متعلق جو بیہودہ

اور شرمناک روایات مندرج ہیں اُن کو غلطی اور کوتاہ بینی پر محمول کرکے ان قدسی نفوس کی پاکیزہ روی اور خدا پرستی کی شہادت دیں لیکن نبی اُمّیؐ کی اس حق پسندی حقیقت شناسی اور وسیع الخیالی کا صلہ یہ ملتا ہے کہ اس دور تہذیب میں بھی جبکہ تحقیق اور ہمہ دانی کا دعویٰ نہایت بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے آپ کے واقعات زندگی پر ٹھنڈے دل سے انصاف نظر ڈالنا کیا معنی تدلیس کے آبدوزوں اور افترا کے تیاروں سے سیرت پاک کے سفینہ نجات کو غرق کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی طبیعت عجب متلون واقع ہوئی ہے قریش مکہ نے جسے اس کی امانت اور صداقت کے صلہ میں الامین کا لقب دیا تھا اسی کو جب وہ ان کے تزکیہ نفوس کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور توحید کامل کی تعلیم دیتا ہے ساحر اور مجنون کہہ کر پکارتے ہیں۔ زمانہ حال کے مستشرقین جسے پیغمبر مکہ تسلیم کرتے ہیں اسی کو جب وہ مدینہ میں اصلاح بین الناس کے لئے اسوۂ حسنہ کی عملی مثال پیش کرتا ہے عیش پرست اور دنیا ساز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ قریش کی وہ جہالت تھی جس نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور جو اُس وقت اُٹھ گیا جب فتح مکہ کے دن وہی جس کو انہوں نے ناحق طرح طرح کے ظلم وستم کے بعد گھر سے نکالا تھا اور اس کے خون کے پیاسے تھے ان سے جبکہ وہ قیدی بنے ہوئے موت وحیات کی کشمکش میں تھے یوں خطاب کرتا ہے۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ آج تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

لیکن مستشرقین اور ان کے مقلد ہمارے ابنائے وطن کا یہ علم ہے جو حجاب اکبر ہو رہا ہے۔ اس ظلمت میں انہیں پیغمبر مکہ شاہ مدینہ نظر آتا ہے یعنی شاہی کا مفہوم استبداد اور تعیش جو ان کے ذہن میں ہے اور اس کے ساتھ زمانہ موجودہ کی سیاسی چالوں کا جو نقش ان کے سامنے کھنچا ہے وہ ان انوار نبوت کو جو مدینہ میں آپ کے قول اور فعل سے صاف جھلکتے ہیں پوشیدہ کردیتا ہے لیکن ایک حد تک وہ معذور بھی ہیں جس کو تشریح کی ضرورت ہے۔

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں یورپ نے علوم وفنون میں حیرت انگیز ترقی کے ساتھ مذاہب عالم کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ اور نایاب کتب کو تلاش کرکے اور ان کے متنوں اور تراجم شائع کرکے جمع کردیا جس سے تحقیق اور تدقیق کا راستہ آسان ہوگیا۔ ہم یورپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ اس کے مایہ ناز فرزندوں نے ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے جو دست بردِ زمانہ سے فراموش ہوچکے تھے ہمارے سامنے پیش کردیئے۔ کتب مغازی وسیر کے اصل ماخذ جو ہمارے قلمی کتب خانوں کی بربادی

اور ہمارے ذوق علمی کے فقدان سے قریب قریب مفقود ہو چلے تھے مستشرقین یورپ کی مساعی جمیلہ کی بدولت پھر ہم کو ملے۔ سب سے قدیم ماخذ محمد ابن اسحٰق (وفات ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء) کی کتاب المغازی ہے۔ اصل کتاب تو ایک مدت سے مفقود ہو چکی ہے جب کہ مارگولیوتھ نے اپنی کتاب (Mohammedanism and the rise of Islam) کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ لیکن اس کتاب کو جس شکل میں ابن ہشام نے وفات ۲۱۳ھ مطابق ۸۲۹ء) جو ایک محدث اور مورخ تھے ابن اسحٰق کے ایک شاگرد زیاد بن عبد اللہ البکائی (۱۸۳ھ) کی روایت سے حذف و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا اور جس کا نام سیرت الرسول رکھا اس کو وستنفلڈ نے ۱۸۶۰ء میں غوتنغن سے شائع کیا۔ ۱۸۶۴ء میں گستاؤ ویل نے اُسی کا جرمن ترجمہ آستگرت سے شائع کیا۔

دوسرا قدیم ماخذ طبقات ابن سعد ہے۔ محمد ابن سعد (۲۳۰ھ ۔ ۸۴۴ء) اگرچہ مشہور قصہ گو واقدی (۲۰۷ھ مطابق ۸۲۳ء) کے شاگرد اور کاتب ہیں۔ لیکن محدثین کے نزدیک استاد کی طرح بے اعتبار نہیں ہیں۔ رسول کریم اور اصحابہ کے حالات میں ایک ضخیم کتاب ۱۲ جلدوں میں لکھی تھی جو قریباً ناپید ہو چکی تھی، قیصر ولیم نے پروفیسر شاخو کو ایک رقم کثیر عطا کر کے قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ سے اس کتاب کے اجزا فراہم کرا کے کامل نسخہ تیار کر کے چھپوانا شروع کیا۔ آنحضرتؐ کے حالات دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جو حالات درج ہیں اس کا بڑا حصہ واقدی سے مروی ہے۔ ابن سعد نے ۲۳۵ھ مطابق ۸۴۵ء میں انتقال کیا۔ اسی سلسلہ میں واقدی کی کتاب المغازی کو بھی یاد رکھنا چاہیے جس کو ۱۸۵۵ء میں کریمر نے کلکتہ سے شائع کیا۔ یہ نسخہ ناقص ہے جیسا کہ مارگولیوتھ کا بیان ہے ۱۸۸۲ء میں ولہاسن نے واقدی کے ایک دوسرے نسخہ کا مختصر ترجمہ (Mohammed in Medina) برلن سے شائع کیا۔

تیسرا قدیم ماخذ محمد ابن جریر الطبری (وفات ۳۱۰ھ مطابق ۹۲۳ء) کی تاریخ الامم والملوک ہے جس کی جزو ثانی و ثالث میں آنحضرت صلعم کے حالات مذکور ہیں۔ یہ حالات زیادہ تر ابن اسحٰق کی کتاب کا معتد بہ حصہ طبری میں موجود ہے۔ اس مبسوط اور مستند تاریخ کو نولڈکی اور دے بارتھ نے چودہ برس کی محنت میں ۱۸۸۵ء میں جرمنی کے مشہور شہر لیدن سے شائع کیا۔ اس سلسلہ میں تاریخ یعقوبی ابن واضح (وفات ۲۹۲ھ مطابق ۹۰۵ء) بھی قابل ذکر ہے۔ جس کو ہوتسما نے اسی

شہر لیدن سے دو برس پیشتر شائع کیا تھا اس کتاب کے دو جزو ہیں۔ اول میں تاریخ دول عالم اور دوسرے میں آنحضرت صلعم کے عہد مبارک سے ۲۷۹ھ یعنی المعتمد علی اللہ العباسی کے دور تک علم رجال میں ابن حجر کی مشہور کتاب اصابہ کو اسپرنگر نے کلکتہ سے ۱۸۵۶ء میں شائع کیا۔

ان ماخذوں کے اشاعت سے مستشرقین یورپ کے معلومات وسیع ہوگئے اور اب انھوں نے عالمانہ رنگ میں سیرت نبوی اور اسلام پر قلم اٹھایا لیکن صدیوں کی قومی منافرت اور سیاسی تفوق کا احساس سنگ راہ رہا۔ سوء اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اسلام کی سیاسی قوت پامال ہورہی تھی۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ ایران میں قاچاریہ آفتاب لب بام تھا اور "یورپ کا مرد بیمار" (ترک) ۱۸۵۴ء کی جنگ میں خرس روس سے بری طرح زخمی ہوکر تڑپ رہا تھا۔ مصر شیر برطانیہ کے پنجہ میں تھا اور مراکش کی پگڑی رند فرانسہ نے اچھال دی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں سر ولیم میور نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر لندن سے شائع کی اور اسی سال اسپرنگر نے برلن سے سیرت پر اپنی تصنیف شائع کی۔ ان کتابوں کے متعلق مارگولیوث کا تبصرہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں۔

میور نے جو سیرت لکھی ہے وہ کھلی ہوئی مسیحیت کی جنبہ داری ہے اور اسپرنگر نے چند ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا علم الاسلاف غیر معتبر ہے" (دیباچہ محمدؐ اینڈ رائز آف اسلام صفحہ ۴) میور اور اسپرنگر اگر اسوقت زندہ ہوتے تو ضرور یہ کہتے۔

من ازچہ عاشقم ورند دست ونامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بیگنہ اند

بہر حال میور اور اسپرنگر نے جس طرز کی ابتدا کی اسمیں روز افزوں ترقی ہوتی گئی مشہور مستشرق گولڈزہر نولڈکے اور کراہل کے تصانیف اس فن میں ان کے وسعت معلومات۔ دقت نظر اور ذوق علمی کے شاہد ہیں۔ مثلاً گولڈزہر کی (Mohammedan Studies) "محمڈن اسٹڈیز" ۱۸۹۰ء میں نولڈکی کی "دس لبن محمدز" ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اور ڈاکٹر کراہل کی کتاب "محمد" ۱۸۸۴ء میں لیپزگ سے نکلی جو سیرت میں ایک مسیحی کے قلم سے نکلی ہوئی بڑی حد تک منصفانہ تصنیف ہے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ جس طرح کتب عہد عتیق میں جو آسمانی مانی جاتی ہیں حضرات موسیٰؑ داؤدؑ اور سلیمان علیہما السلام کے متعلق بہت سی لغو اور شرمناک روایات منقول ہیں اسی طرح آنحضرت کی سیرت

جناب سید محی الدین صاحب زور قادری - ایم اے - (مصنف روح

کے متعلق ان قدیم ماخذوں میں بھی ویسی ہی روایات مندرج تھیں۔ ان اکاذیب باطلہ کو جنھیں مورخین مابعد نے آنکھ بند کرکے نقل کر دیا مستشرقین یورپ نے تنقیص رسول اور تفضیح اسلام کے لئے ایک سہل حصول ذریعہ سمجھ کر بے چون وچرا تسلیم کر لیا۔ اور پھر اپنے زور قلم سے رائی کا پہاڑ بنا دیا جس کا کاٹنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے ہم پہلے ان قدیم ماخذوں اور ان کے مصنفین پر نظر ڈالتے ہیں۔

سیرت رسول کریم اس وقت سے خط و تحریر کے ذریعہ سے محفوظ ہونا شروع ہوئی جب سے غار حرا میں ایک دُرِ یتیم کے نورانی قلب پر اقرا باسم ربك الذی خلق کے الفاظ نقش ہو کر زبان پاک پر جاری ہوئے۔ یہ سلسلہ ۲۳ سال تک جاری رہا اور ۱۱۴ سورتیں جمع ہو گئیں جن میں آپ کے ابتدائی حالات خانگی زندگی غزوات اور تعلیمات غرض کہ خلق عظیم اور اسوہ حسنہ کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ کو وفات رسول کے ایک سال بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک کامل نسخہ میں لکھوا دیا جس کی چھ نقلیں حضرت عثمانؓ نے بلاد اسلامیہ میں بھیجدیں۔ اس نسخہ کو ہم قرآن مجید کہتے ہیں اور اغیار اگر اس کو کلام اللہ نہ مانیں تو کم از کم سیرت محمدؐ تو تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ تاریخ اور واقعیت کی آنکھوں میں خاک جھونکیں غرض کہ پچاس سال تک یہی قرآن تھا جس میں سیرت رسول کا مطالعہ ہوتا تھا لیکن جب بنی امیہ دنیائے اسلام کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے اور عہد جاہلیت کے امراض پھر عود کر آئے تو سیرت رسول کے واقعات اہل کتاب کے قصص و روایات اور عجم کے افسانوں کے رنگ میں بیان ہونے لگے اس پر طرہ یہ کہ سیاسی اثر نے جو بنی امیہ کے جور و ستم سے محیط ہو گیا تھا اکثر واقعات کی صورت کو مسخ کر دیا۔ ۶۵ھ میں جب عبدالملک ابن مروان کو تخت نشینی کا مژدہ سنایا گیا تو اس وقت وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھا اس نے کتاب اللہ کو بند کیا اور کہنے لگا ھذا فراق بینی وبینك ممکن ہے یہ الفاظ اس کی ابتدائی مرتاضانہ زندگی کے رخصت ہونے پر تحسر کے لہجہ میں نکلے ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکومت ملتے ہی قرآن رخصت ہو گیا۔ عبداللہؓ بن زبیرؓ کو کعبہ میں قتل کرکے وہ ان کے بھائی عروہ کو لکھتا ہے کہ ابوسفیان کے حالات متعلق جنگ بدر لکھ بھیجو عروہ نے جو تحریر بھیجی وہ تاریخ طبری میں درج ہے جس پر ہم غزوہ بدر کے ضمن میں تبصرہ کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ یہ تحریر سورہ انفال کی کھلی ہوئی شہادت کے مقابلہ میں گویا روئی کا ایک تار تھا جس سے فائدہ اٹھا کر بعد کے وقائع نگاروں نے آنحضرتؐ پر قافلہ لوٹنے کا الزام لگایا ہے۔ عبدالملک ایک بیدار مغز اور مدبر فرمانروا تھا۔

اس نے بہت سے مفید اصلاحات کئے اور اسلام کی دینادی سلطنت کا پایہ مستحکم کر دیا لیکن اپنے بزرگ مقتولان بدر کی یاد اور اپنے دادا حکم کا اخراج بھول نہیں سکتا تھا وہ اس معاملہ میں دموی پہلے تھا پھر حلقہ بگوش اسلام۔ اس کے عہد میں روایات قلمبند کئے گئے اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں مستقل تصانیف کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ طبقات ابن سعد میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھولاء الامراء — ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے یہانتک کہ ان امرا نے ہم کو مجبور کیا۔

(۳۶ مصری)

زہری جن کا نام محمد بن مسلم ہے ۵۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے تحصیل علم کا شوق تھا اوائل عمر میں وہ ہولناک واقعہ حرہ دیکھا تھا جب حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہی فوج یزید مدینہ کو تاراج کر رہی تھی مہاجرین والضار بیدریغ قتل ہو رہے تھے اور مسجد نبوی کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ زہری کے والد مسلم مصعب بن زبیرؓ کے جنہیں عبدالملک نے ایک خونخوار جنگ کے بعد قتل کیا تھا شریک تھے مگر انھوں نے جنگ وجدال سے پرہیز کیا اور نشر حدیث و روایات میں مشغول رہے۔ تیس برس کے سن میں عبدالملک کے دربار میں گئے اور مقربین خاص میں داخل ہوئے ہشام ابن عبدالملک نے اپنی عہد حکومت میں ان کو اپنے بچوں کی تعلیم پر مقرر کیا غرض کہ ۱۲۴ھ تک جو ان کا سن وفات ہے مقرب دربار اور عہدہ قضا پر فائز رہے۔ مغازی اور سیر کا بڑا حصہ انہیں کی مرویات ہیں۔ اکثر روایات پر ماحول کا اثر بھی صاف نظر آتا ہے (تفصیل آگے آئیگی) ان کے شاگردوں میں دو شخص بہت مشہور ہوئے ایک موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ) جنھوں نے ایک مختصر کتاب مغازی پر لکھی تھی مگر وہ مدت سے مفقود ہو گئی اگرچہ کتب سیر میں اکثر اس کے حوالے آتے ہیں۔ دوسرے محمد بن اسحاق جنکی کتاب المغازی کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔

محمد بن اسحق ۱۲ھ میں عراق کے ایک گرجا میں عین التمر سے ایک شخص یسار گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور قبیلہ عبداللہ بن قیس مطلبی کے موالیوں میں داخل ہو کر وہیں رہنے لگا۔ محمد بن اسحق اس کے پوتے ہیں جن کی نشو و نما عہد بنی امیہ میں ہوئی۔ ولادت کی تاریخ ضبط نہیں کی گئی ہاں سن وفات ۱۵۱ھ طبری میں درج ہے۔ ابن اسحق کو ابتدا سے قصص و روایات کا شوق تھا اور احادیث

نبوی کا بھی ذوق تھا اکثر صحابہ سے فیض حاصل کیا تھا مگر اس کے ساتھ اہل کتاب سے بھی بے سر و پا روایات
نقل کرتے تھے۔ یہ روایات تو خیر لیکن جب احادیث نبوی میں بھی ادنھوں نے امام مالک ایسے محدث و فقیہ
کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کیا۔

اعرضوا علی علم مالك فانی بیطارہ — میرے سامنے مالک کا علم پیش کرو کہ میں
میزان الاعتدال (ص۲۱) جلد ثالث — اس کا بیطار (ڈاکٹر) ہوں

تو امام موصوف نے اس خیال سے کہ اس شخص کی جھوٹی روایات سے فتنے پیدا ہوں گے فرمایا

انظروا الی دجال من الدجاجلہ — دجالوں میں سے ایک دجال کو دیکھو۔

میزان الاعتدال (ص۲۱)

اہل مدینہ چونکہ امام موصوف کے فضل و کمال اور تقدس و تفقہ کے معتقد تھے اس لئے ابن اسحٰق کو مدینہ چھوڑ کر
ایک عرصہ تک مصر پھر عراق میں رہنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنی امیہ کی حکومت کا دفتر الٹ چکا تھا اور
ان کے دل دہلانے والے مظالم کا بدلہ ایسی سفاکی سے لیا جا رہا تھا جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی
تھی۔ رسول کریم نے فتح کے بعد کشتگان بدر کو بلا لحاظ مسلم و کافر دفن کیا لیکن آپ کے ابن عم السفاح
نے حکومت حاصل کر کے نہ صرف ہزاروں بنی امیہ کو تہ تیغ کر دیا بلکہ مردوں کی لاشیں بھی قبروں سے نکال کر پھکوا دیں
سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا۔ منصور عباسیوں کا عبدالملک ہے اُس نے بنی عباس کی حکومت
کی عمارت ایسی مستحکم کر دی کہ چھ سو برس تک قائم رہی وہ ربر مقنن اور علم دوست تھا۔ اُس نے ابن اسحٰق کو
بغداد میں بلایا جہاں انہوں نے اطمینان سے اپنی وسیع معلومات اور مجموعہ روایات کو قلمبند کرنا شروع
کیا اگرچہ ان کے استاد المعلم زہری نے مغازی پر ایک مستقل تصنیف کی تھی اور حضرت عروہؓ ابن زبیر کے
متعلق ایسی ہی روایت کشف الظنون میں موجود ہے لیکن سیرت نبوی میں اس وقت تک کوئی مستقل اور
مفصل کتاب نہ تھی یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کی فتوحات چین سے اندلس تک اور نومسلموں کے تعداد
لاکھوں تک پہونچ چکے تھے جن میں یہود نصاریٰ مجوس بت پرست بھی تھے۔ حضرت موسیٰ کے مغازی وسیر
کتب عہد عتیق میں موجود تھے زردشت اور بزرگان عجم کی داستانیں دساتیر اور پہلوی کتابوں میں متداول تھیں
جن میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا ہشام بن عبدالملک کے میر منشی جبلہ بن سالم نے ۱۱۳ھ
میں تاریخ عجم ایک مفصل اور مبسوط تاریخ کا ترجمہ کیا تھا جن میں سلاطین کی تصاویر بھی انکی خاص

وضع وقطع اور لباس وزیور کے ساتھ شامل تھیں۔ اسی طرح عبداللہ بن مقفع نے جو پہلوی کا عالم اور عربی کا قادر الکلام استاد تھا منصور کے عہد میں ایران کے ایک دوسرے مفصل اور مقبول کتاب السیر خدائی نامہ کا ترجمہ کیا جس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا۔ غرض کہ گردوپیش کے یہ حالات تھے جب ابن اسحٰق نے منصور کو قدردان اور مہربان پاکر سیرت نبوی دو حصوں میں لکھی (۱) کتاب المبتدا جسکا دوسرا نام بقول مصنف سیرت الحلبیہ کتاب المبدا وقصص الانبیا ہے (۲) کتاب المغازی اس کتاب میں چونکہ دلچسپ قصے پرلطف داستانیں مسلسل واقعات اور جابجا اشعار اور قصیدے درج تھے عام طور پر اس قدر مقبول ہوئی کہ ابن اسحٰق کو "امام المغازی" کا لقب دیا گیا لیکن اسی کے ساتھ فن حدیث کے بہت سے ثقہ علما کی نظروں سے گر گئے اگرچہ بعضوں نے توثیق بھی کی۔ محدث دارقطنی (م ۳۸۵ھ) نے خوب فیصلہ کیا ہے۔

هو صالح الحديث ما لا عندی	اس کا قول درست ہے میرے نزدیک
ذنب الا انه حشا فی السيرة من	اس میں برائی نہیں سوائے اس کے
الاشياء المنكرة المنقطعة والاشعار	کہ وہ سیرت میں منکر ہتیں۔ منقطع روائتیں
المكذوبة۔	اور جھوٹی اشعار بھر دیئے ہیں۔

(مرائی الاعتدال ص۲۱ جلد سوم)

ابن اسحٰق اگرچہ جدت تحریر اور طرز ادا کے باعث امام المغازی کہلائے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ بہت سی منقطع روایات جن کی نسبت وہ لکھتے ہیں "مجھ سے بعض اہل علم نے کہا" اہل کتاب کے بہت سے باطل اقوال اور سیکڑوں اشعار جو انہوں نے شعرائے وقت سے کہلا کر کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے جس کی نسبت چاہا منسوب کر دیا غلط اور لغو ہیں ان میں سے چند اکاذیب باطلہ کو زمانہ حال میں مخالفین اسلام سنداً پیش کرتے ہیں لیکن ان کی قلعی اسی زمانہ میں کھل چکی تھی (تفصیل آگے آئیگی) بہرحال ابن اسحٰق کی کتاب چشمۂ شیریں بھی ہے اور سراب بھی ایک وادی ہے جس میں تختہ گلاب بھی ہیں اور پھولوں کے جھنڈ بھی۔ اسی وجہ سے حافظ ابن حجر کو جو بہت زیادہ روایت پرست ہیں ابن اسحٰق کے متعلق تقریب التہذیب میں لکھنا پڑا۔ امام المغازی صدوق یدلس۔

محمد بن عمر الواقدی | یہ بھی بنی ہاشم کے موالیوں میں ہیں ۱۳۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے

ابتدائی تحصیل کے بعد بغداد میں جو اس وقت عباسیوں کا پایہ تخت تھا سکونت اختیار کی۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ موافق اور مخالف سبھی قائل تھے مجاہد ابن موسیٰ کا قول ہے کہ مینے واقدی سے زیادہ حفظ یاد رکھنے والا نہیں دیکھا۔

بنی امیہ کے خالص عربی مذاق کے مقابلہ میں عباسیوں کا رنگ عجمی تھا جن کے دربار میں داستان سرائی کا شوق تھا واقدی کی بڑی قدر ہوئی اور ایسے شخص کی جو وسعت معلومات میں زندہ انسائیکلوپیڈیا یا (دائرہ المعارف) تھا برامکہ جو عجمی النسل اور علم و ہنر کے شیدا تھے کیوں نہ قدر کرتے چنانچہ بہت جلد شرقی بغداد کے عہدہ قضا پر فائز ہو کر عیش و آرام سے رہنے لگے اور سیرت میں کتاب المغازی جس کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں تصنیف کی۔ ان کا طرز بیان دلچسپ تھا۔ واقعات اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ کیا ممکن کہیں سے سلسلہ ٹوٹ جائے۔ روایات منقطع ہوں یا ضعیف موضوع ہوں یا صحیح ان کو اس سے بحث نہ تھی۔ یہ خشک بحثیں اور اسناد کے لمبے چوڑے زنجیریں انہوں نے محدثین کے لئے چھوڑ دیں ان کو گرمی سخن اور لطف کلام کے نشہ میں کچھ اور نظر نہیں آتا تھا صرف رسماً ابتدا میں اسناد گنوا دیئے پھر جس طور سے چاہا داستان شروع کر دی۔ رسول کریم صلعم جب رومیوں کے اجتماع کی خبر سنکر سنہ ۹ھ میں تبوک واقع شام کی جانب گرمیوں کے موسم اور عسرت کی حالت میں بعزم جہاد فی سبیل اللہ روانہ ہوتے ہیں تو جناب واقدی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا

تسارعوا معی الی الشام لعلکم ان تصیبوا بنات الاصفر۔	میرے ساتھ شام کی جانب بڑھو شاید بنی اصفر کی بیٹیاں (حسینان روم) تمہارے ہاتھ لگیں۔
(کتاب المغازی ص ۴۲۴ مطبوعہ کلکتہ)	

جہاد کی یہ تحریص کیا عہد واقدی کی عیش پرستی کی تصویر ہے یا اس رسول برحق کے تعلیم کی جو حضرت ابو موسیٰ الاشعری سے بخاری اور مسلم دونوں میں یوں مروی ہے۔

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔	جو اس واسطے لڑے کہ خدا کا بول بالا ہو وہ راہ خدا کا غازی ہے۔

واقدی کی اس ہرزہ سرائی اور دروغبانی کا مقابلہ ابن اسحق کی روایت سے کرو جسے طبری نے نقل کیا ہے غزوہ تبوک کے لئے جب آنحضرتؐ سامان کر رہے تھے آپ نے جد بن قیس سے جو منافق تھا) فرمایا

ھل لک العام فی جلاد بنی الاصفر — کیا یہ سال تیرا بنی اصغر (رومیوں) کے مقابلہ کے لئے ہے۔

اس نے جواب دیا مجھے نہ لیجائیے کیونکہ مجھے فتنہ کا خوف ہے میری قوم کو خوب معلوم ہے کہ میں عورتوں کا کس قدر شیفتہ ہوں وہاں بنی اصغر کی عورتوں کو دیکھ کر صبر نہ کر سکوں گا" (طبری جلد سوم صـ۱۴۲)

اللہ اکبر واقدی نے اپنے رسولِ برحق کے اس قول پر کہ "جس نے میری طرف وہ بات لگادی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کرلے" کچھ غور نہ کیا۔ ان کو رخسار آتش کی کشش ایسی جگہ کھینچتی ہے جس کی صفت یہ ہے نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ۔

واقدی کی انہیں اکاذیب باطلہ کے جھوٹے موتیوں کو مستشرقین نے ایک بیش بہا تاج" بنا کر اپنی تحقیق وتدقیق کے سر پر رکھ دیا ہے لیکن وہ یاد رکھیں کہ واقدی کی آبرو گیارہ سو برس ہوئے خاک میں مل چکی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "مدینہ میں سات آدمی تھے جو جعلی اسناد بنایا کرتے تھے ان میں ایک واقدی ہے" (تہذیب ابن حجر) اسی کتاب میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول درج ہے "الواقدی کذاب"

میزان الاعتدال ذہبی میں لکھا ہے۔

استقر الاجماع علی وھن الواقدی — واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع ہو چکا ہے۔

ائمہ حدیث اور ثقات کا یہ فیصلہ جس بنا پر ہے اس کے تفصیلی روایات واقدی کے ضمن میں ہم آگے بیان کریں گے یہاں اس قدر اشارہ کافی ہے کہ گردوپیش کے حالات اور درباریوں نے واقدی کو تباہ کیا وہ امام ابوحنیفہ نہ تھے جنہوں نے قید میں جانا گوارا کیا مگر عہدہ قضا قبول نہ کیا۔ وہ دربار کے نبض شناس تھے جاہ وعزت کے ہوس میں انھوں نے اپنی وسعت معلومات سے جا وبیجا فائدہ اٹھایا۔ جس طرح یورپ کے فلسفہ جدید کا امام بیکن نے امارت کے نشہ میں شرمناک اخلاقی کمزوری دکھائی اسی طرح قاضی بغداد واقدی نے حب جاہ میں اپنے دامن علم کو کذب سے آلودہ کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون

اور

یورپ کی سرپرستی

(مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال)

مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابلِ شرم ہے کہ جس میدان میں انہیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی کا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کجکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آ رہی ہیں، صرف یہی نہیں، کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے ان کو ہمارے علما کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان، لغت، صرف، نحو، عروض، اور قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئیں ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبانوں میں آ جائے تو بیش بہا معلومات سے مالا مال ہو جائے۔

ڈاکٹر لائیز ہماری اس افسوس ناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں، "کہ مسلمان ہیں تو بہت

گروہ جانتے کیا ہیں، اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان درکار ہو تو یورپ سے مانگنا پڑے گا ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں، تابط شرا، امراء القیس، بحتری اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا؟ یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں"

ڈاکٹر لائٹیز کو تو صرف اس کا افسوس ہے کہ "اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے"، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں اور انہیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعہ علماء اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں جن کی بدولت آج انہیں اس امر کا موقعہ حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یہ دکھلایا ہے۔ کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی۔ اور صرف و نحو لغت و ادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے جو یورپ کی کوشش سے چھپکر شائع ہوئیں"

(شبلی)

یورپ کو عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی؟ اور کیونکر ہوئی؟ یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے جس کے بیان کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، صرف اس قدر بتلانا سلسلۂ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا۔ اور کیونکر عربی علوم و فنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہوگئے۔

دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹکل خونریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کیگئی ہے گیارھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجہ تک بلند ہوچکے تھے یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقعہ دیا کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ

پیدا ہوگئے تو یورپ کی آنکھیں کھلیں اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی عملی ترقیات کے دنیا میں اکیلے مخزن ہیں، اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ ہوگئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی گئی کیونکہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گذر ہوا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے، اس لئے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑا اُٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے، کہ چونکہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور ارکین سلطنت کے لئے مخصوص تھی اس لئے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اول قدم اُٹھا وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشان خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی حالانکہ ابتداء میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم و فنون پر یورپ کو توجہ ہوئی، اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوگئیں ابتداء میں متعدد محکمہ قائم کئے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کیجائیں، پھر پوپ اکلرمنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لئے یورپ کے نوجوان طلبا اندلس روانہ کئے گئے اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفہ میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لئے یورپ کے طلبا ان کی اعانت سے فائدہ اُٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کرلیتے اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے۔

جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخی صفحات پر موجود ہیں ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تعلق سے خود کو ہمیشہ کے لئے آزاد کرلیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کردی کچھ طالب علم ایسے ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصہ کی تلاش و تحقیق کے بعد سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو

تو اسلامی علوم و فنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ ہارڈمین کریمون اس زمانہ کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کرلی تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹر زمارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا جس کو جغرافیہ کا شوق دامنگیر ہوا اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا افریقہ کی خاک چھانی اور مدت تک آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔

ڈنیل مارلی اور پیٹر زماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کرکے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی، آخرالذکر نے قرآن شریف کا عربی سے ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ترجمہ اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کردیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کرلی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لئے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کرسکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کی کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولھویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی، ۱۶۲۲ء میں پندرھویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا، کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہوگئی اس کے بعد ہی ۱۶۲۷ء میں خاص پوپ اربالنس کے حکم سے اس انجمن سے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا، تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پاکر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی اور سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلواکر مقرر کئے گئے تھے، عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں تعلیم کے لئے ضرورت ہوئی کہ صرف و نحو اور ادب کی کتابیں بہ کثرت مہیا ہوں اس لئے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے اور کچھ کتابیں قدیم زمانے کی لکھی ہوئی دستیاب کیں اور انہیں نہایت اہتمام سے طبع کراکر شائع کیا۔

صرف و نحو عربی کی جو کتابیں یورپ میں لکھی گئیں | اس انجمن نے عربی کے لئے

جو کچھ کیا وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی اور پھر صرف و نحو اور ادب و لغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا ان لوگوں میں پہلا شخص آر پی نیو نامی ایک عالم ہے جو ہالینڈ کا باشندہ تھا مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد زبانوں کو حاصل کر کے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے ہو چکی تھی اس لئے پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہو گیا اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہو گئی اور صرف و نحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا، آر پی نیو کے بعد لافن دارنر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی یہ عالم ۱۶۱۹ء میں پیدا ہوا، اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی ۱۶۴۰ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں اور لیڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کر دیں۔

سترھویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا وہ بنیادی دور شروع ہوا جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنا رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سل وسٹر تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف و نحو ہے جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے کہ جن جن صرفی و نحوی مسائل کو لکھا ہے ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دیئے ہیں اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہو گئی منجملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے مسلمانان ہند کا یہ زمانہ اگرچہ زمانۂ انحطاط تھا مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علماء آج زیادہ مشہور ہیں وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں اس لئے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی اور اس توجہ سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے ان میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے، کہ انگریز

بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دور میں برابر کے شریک رہے مشہور انگریز عالم لمسڈن نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف و نحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شائع کی اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے جن میں سے ایک رسالے میں عربی کی چھوٹی بڑی حکائیتیں جمع کی تھیں اور دوسرے رسالے میں الف لیلہ کے تیسرے حصّہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا، اس دور میں صرف و نحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

(۱) علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف و نحو عربی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک چھپ کر لیپزنگ سے شائع ہوئی۔

(۲) علامہ کاسپری کی صرف و نحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزنگ سے شائع ہوئی پھر علامہ اگسٹس نے ترمیم و تہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

(۳) پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رائٹ نے کاسپری کی صرف و نحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یورپ کے علماء نے جب عربی زبان پر توجہ کی تو ان کو صرف و نحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی جو ان کے لئے مفید ہوں جب ایسی کتابیں نہیں ملیں تو خود انہوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں اور آنے والے زمانہ کے لئے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا وہ جحیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے جو اٹلی کا رہنے والا تھا

یورپ نے عربی کے جو لغت ترتیب دئیے

پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی اور ۱۸۵۳ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے اس لئے علامہ مانینسکی نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی فارسی ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمنی دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت

کا نام کنز اللغات الشرقیہ ہے ۱۸۰۶ء میں دانا دار السلطنت اٹلی سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیٹنگ نے چار جلدوں میں، اور کازی مرسکی نے فرنچ میں اور باڈجر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کئے جو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شائع ہوئے ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کئے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس (   ) ہے یعنی اضافہ لغت عربی

شمس العلما، مولانا شبلی نعمانی کے کتب خانہ میں یہ لغت میری نظر سے گذرا دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کئے ہیں جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے، کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت تیار ہوا، تاریخ وادب اور علوم و فنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں اور جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ ملے جمع کر لئے، پھر سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق و تنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا اسے لفظ بلفظ درج کیا پہلی جلد کی ابتدا میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش و تحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سی نایاب کتابیں جمع کیں، اور کس طرح ان سے مبہم مشکوک الفاظ کا پتہ لگایا!

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملکی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیئے یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں مگر اختلاف لب ولہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔

پروفیسر دوزی نے جد ت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کئے ہیں، اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیونکر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی؟

افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے یورپ نے عربی علم ادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیئے ہیں اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیئے ہیں بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کئے ہیں اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لنڈن برلن اور پاریس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف و نحو

آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں یورپ نے دارجہ کے بھی صرف نحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کالکن نامی مستشرق نے ۱۸۰۰ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی اور اسپین میں چھپکر شائع ہوئی پھر دمیبے نے لکھ کر وانا سے شائع کی اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی،

لغت دارجہ کے مجموعہ امثال

صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی (جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں) یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعہ الگ الگ ترتیب دیئے ہیں مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں باوجر نے صرف مکہ معظمہ کا امثال ترتیب دیئے ہیں ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع مجموعہ امثال ترتیب دیا ہے جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کئے ہیں،

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں اور جن سے ان کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو

بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) سوسین کا مجموعہ حکایات جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا،

(۲) سبی ٹابیک کا مجموعہ جو ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے چھپ کر شائع ہوا،

(۳) لینڈبرگ کا مجموعہ جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا،

(الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

اقوال زرین

(از امام اکبر آبادی)

(۱) دنیا میں ہر مرد اپنے فعل کا مختار ہوتا ہے، لیکن ایک عورت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔

(۲) ایک سنجیدہ و عقلمند، ایک عالم و فلاسفر، اور ایک بہادر سورما، اگرچہ اپنے اپنے میدان کے مرد ہوتے ہیں، لیکن ایک عورت کے مقابلہ میں ذلیل و خوار بنجایا کرتے ہیں۔

(۳) جب عورت اپنے محوسات کو سمجھ لیتی ہے تو دشوار کو آسان، نادستیاب کو دستیاب، اور ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔

(۴) عورت کا تلون سمندر کی موج ہے، اسکی پیشانی کے بل سمندر کی لہریں ہیں، اور اس کا عزم ایک مستقل پہاڑ ہے۔

(۵) جو راز عورت کے دل میں ہوتا ہے، وہ اس کی زبان پر نہیں آتا، اگر زبان پر آتا ہے تو منھ سے باہر نہیں نکلتا، اور جب باہر نکلتا ہے تو عملی جامہ پہن لیتا ہے (۶) عورت ایک معمہ ہے، جسکا حل نہیں۔ ایک راز ہے، جسکا انکشاف نہیں۔ ایک بگولا ہے جسکا مسکن نہیں، اور ایک بھید ہے، جسکا حل اس کائنات میں نہیں (۷) پرستش کے قابل نہ تو پتھر کی مورت ہے اور نہ دولت کی دیوی۔ بلکہ صرف عورت ہے، بشرطیکہ وہ عورت ہو (۸) وہ قومیں جو ترقی کے بام پر سیر کر رہی ہیں، صدقہ ہے عورت کے اس مسرت آگین لمحہ کا، جبکہ مرد دنیا کے کاموں سے گھبرا کر اسکی صحبت اختیار کر کے اپنے دماغ کو تازہ کرتا ہے (۹) اس عورت سے جو ایک سے بات کرتی ہو، دوسرے کی طرف نگاہ ہو اور

علمائے ماہرین السنہ

(از مولانا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی)

اگرچہ ملکی، سیاسی، مذہبی اور علمی، غرض ہر حیثیت سے اسلام کی تاریخ کا اقتضا یہ تھا، کہ مسلمانوں میں بہ کثرت علما مختلف زبانوں کے پیدا ہوتے۔ لیکن اسلام نے اپنے ملکی مذہبی، اور علمی اقتدار کی بنا پر دوسری قوموں کا ہم زبان بننا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے جن ممالک پر فاتحانہ حکومتیں کیں وہاں کی قوموں کو خود اپنا ہم زبان بنا لیا۔ یا کم از کم ان کو اپنے پیغمبر کی عربی زبان کے سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے زیر سایہ، یہودی، رومی، عیسائی، پارسی اور حبشی وغیرہ قومیں موجود تھیں۔ جس سے اس کو مختلف قسم کے تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ اسلئے قدرتی طور پر وہ ان زبانوں سے متاثر ہوتا تھا۔ خود قرآن و حدیث میں مختلف زبانوں کے بہ کثرت الفاظ موجود ہیں۔ اور رسول اللہ صلعم اور صحابہ کی زبان سے بھی عربی کے علاوہ غیر زبانوں کے الفاظ نکلے ہیں۔ بعض صحابہ کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ اہل کتاب کے صحائف آسمانی سے واقفیت رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رض کے تذکرے میں علاوہ ذہبی نے لکھا ہے کہ:۔

"انھوں نے اہل کتاب کی تمام کتابیں حاصل کی تھیں۔ اور مستمرا اونکا مطالعہ کیا تھا اور اسمیں عجائبات دیکھے تھے"

اسد الغابہ میں ہے "وہ فاضل اور عالم تھے، قرآن کو اور اگلی کتابوں کو پڑھا تھا"

مسند دارمی میں ہے "کہ حضرت عمر بن الخطاب رض تورات کا ایک نسخہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں لائے، اور کھول کر پڑھنے لگے"[۵۱]

اور اسد الغابہ میں ہے کہ تورات کا یہ نسخہ ان کے ایک یہودی دوست نے جو بنی قریظہ کا تھا، اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا[۵۲] جس سے علانیہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام بزرگ عربی زبان کے علاوہ عبرانی اور سریانی

---

۵۱ مسند دارمی صفحہ ۶۲ ۔ ۵۲ اسد الغابہ تذکرہ حضرت عبداللہ بن ثابت انصاری رض

زبان سے بھی واقف تھے۔ اور نہ صرف سرسری طور پر واقف تھے بلکہ اس زبان کی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کرسکتے تھے۔

مذہبی، اور علمی حیثیت کے علاوہ بعض صحابہ نے سیاسی ضرورتوں سے بھی عبرانی زبان سیکھی تھی چنانچہ رسول اللہ صلعم کو چونکہ یہودیوں کے ساتھ خط وکتابت کرنی پڑتی تھی اس لئے زید بن ثابت رض نے آپ کے حکم سے عبرانی زبان سیکھی۔ اور پندرہ ہی روز کے بعد اس میں خط وکتابت کے قابل ہو گئے[۵]۔

اس کے بعد بنوامیہ کے زمانہ میں غیر زبانوں کے علوم وفنون کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ دولت عباسیہ میں تکمیل کے درجہ تک پہونچی اور اکبر کے زمانہ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں میں بہ کثرت علما نے دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کی لیکن اس موقع پر یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ جو کچھ تھا محض سلطنت کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔ اور مسلمانوں نے جن غیر زبانوں میں کمال پیدا کیا۔ اُن کی حالت آج بالکل انگریزی زبان کی تھی۔ جس کو ہر شخص کسب معاش کے لئے سیکھ رہا ہے۔ لیکن اولاً تو خود حکمائے اسلام کے حالات کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اوّل اوّل یہ زبانیں محض علمی ذوق کی تکمیل کے لئے سیکھی تھیں۔ کیونکہ تمام قدیم علوم وفنون یونانی، لاطینی، اور سریانی زبانوں میں تھے۔ اور جب ان زبانوں سے واقفیت نہ حاصل ہو جاتی۔ ان علوم میں کمال پیدا کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے حکمائے اسلام نے اسی علمی ذوق کے پورا کرنے کے لئے یہ زبانیں سیکھیں۔ جو بعد کو کسب معاش کا ذریعہ بھی بن گئیں۔ دوسرے یہ کہ محکمہ تراجم کے بند ہو جانے کے بعد بھی ہمکو متعدد علما کے نام ملتے ہیں۔ جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے۔ چنانچہ اس موقع پر ہم اس قسم کے چند بزرگوں کے حالات درج کرتے ہیں۔

زین الدین ابوحسن آمدی

نہایت معزز اور مُوقر تھے۔ علم تعبیر رویا میں کمال حاصل تھا۔ متعدد زبانوں، مثلاً منولی (مغل)، ترکی، فارسی، رومی اور عزلی وغیرہ کے ماہر تھے۔ چنانچہ جب سلطان غازان خاں ۶۹۵ھ میں بغداد آیا۔ تو لوگوں نے اُس سے علامہ موصوف کا تذکرہ کیا۔ وہ اُن کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ اور کہا کہ کل جب میں مدرسہ مستنصریہ میں آؤں گا۔ تو اُن سے ملوں گا۔ چنانچہ وہ جب اس مدرسہ میں آیا۔ تو لوگوں نے ایک عام جلسہ کیا۔ اور بغداد کے

---

[۵] بخاری باب الاحکام باب ترجمہ الحکام۔

تمام اعیان واکابر جن میں شیخ زین الدین آمدی بھی شامل تھے، مدرسے میں جمع ہوئے۔ غازان خاں آیا تو اس نے اپنے اکابر امرار کو حکم دیا کہ وہ لوگ یکے بادیگرے اس سے پہلے مدرسے میں داخل ہو کر شیخ زین الدین کو سلام کریں۔ اور ان میں ہر ایک ان کے امتحان کے لئے اپنے آپ کو خود بادشاہ ظاہر کرے۔ چنانچہ اس ترتیب کے موافق جب کوئی امیر آتا تھا، تو لوگ عزت اور مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کو شیخ زین الدین کی خدمت میں سلام کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ شیخ سکون و وقار کے ساتھ ہر ایک کے سلام کا جواب دے دیتے تھے۔ لیکن کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ آخر میں غازان خاں پہلے امرا سے کم شان و شوکت کے ساتھ آیا اور سلام کر کے شیخ سے مصافحہ کیا۔ چنانچہ جب اس نے شیخ سے ہاتھ ملایا۔ تو وہ اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ہاتھ چومے، اس کی ملاقات کو اہمیت دی۔ اس کے ساتھ غیر معمولی طور پر پیش آئے۔ اور پہلے مغولی زبان میں، پھر ترکی، پھر فارسی پھر رومی پھر عربی میں اس کو دعائیں دیں۔ چونکہ وہ بے بصر تھے۔ اس لئے سلطان غازان خاں کو ان کی ذہانت اور فطانت پر تعجب ہوا۔ اور اسی وقت ان کو خلعت و مال سے سرفراز کیا۔ اور ماہانہ تین سو درہم بطور وظیفہ کے مقرر کر دے اور بادشاہ کے علاوہ امرا، وزرا، اور خواتین نے بھی ان کی قدر و منزلت کی۔

زباندانی کے علاوہ اس بے بصری کے حالت میں ان میں بعض عجیب و غریب خصوصیات نہایت حیرت انگیز تھیں۔ مثلاً وہ کتابوں کی تجارت کرتے تھے، اور اپنے پاس کتابوں کا وافر ذخیرہ رکھتے تھے۔ لیکن جب ان میں سے کسی کتاب کی فرمایش کی جاتی تو اپنے کتب خانے میں جاتے۔ اور تمام کتابوں میں سے مطلوبہ کتاب کو اس سرعت کے ساتھ نکال لاتے کہ گویا اس کو انھوں نے ابھی رکھا ہے۔ اگر وہ کتاب کئی جلدوں میں ہوتی اور ان میں سے مثلاً پہلی یا دوسری یا تیسری جلد طلب کی جاتی تو بعینہٖ وہی جلد اٹھا لاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پہلے کتابوں کو ہاتھ سے چھوتے تھے۔ پھر کہتے تھے "کہ اس کتاب میں اتنے اجزا یا صفحے ہیں" اور جو کچھ وہ کہتے تھے وہ صحیح نکلتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کتاب کے صفحے پر ہاتھ پھیر کر یہ بتا دیتے تھے کہ اس صفحے میں اتنی سطریں ہیں۔ فلاں جگہ جلی خط سے لکھا ہوا ہے۔ اور فلاں جگہ سرخ روشنائی کی کتابت ہے۔ اگر وہ کتاب مختلف الخط یعنے دو یا تین کاتبوں کی لکھی ہوئی ہوتی تو یہ بتا دیتے تھے کہ فلاں مقام سے فلاں مقام تک خط مختلف ہو گیا ہے۔ وہ جن کتابوں کو بہ غرض تجارت جمع کرتے تھے۔ ان سب کی قیمت ان کو صحیح طور پر معلوم رہتی تھی۔ جس کی وجہ یہ

تھی کہ جب وہ کتابوں کو خریدتے تھے ۔ تو ایک باریک کاغذ کا ٹکڑا لے کر ایک یا اس سے زیادہ حروف تہجی کی صورت میں اس کی تیلی سی بتی بنا لیتے تھے، اور چونکہ جمل کے حساب سے ہر حرف ایک عدد معین پر دلالت کرتا ہے ۔ اور اسی طریقہ سے شعرا تاریخ نکال لیتے ہیں اس لئے کتاب کی قیمت کی جو تعداد ہوتی تھی اسی تعداد کے حروف کے مطابق یہ بتی بناتے تھے ۔ اور اس کتاب کی جلد کے اندر چپکا دیتے تھے ۔ اور جلد کے اوپر بھی اتنے ہی بڑا کاغذ چسپاں کر دیتے تھے ۔ اس لئے جب کسی کتاب کی قیمت بھول جاتے تھے ۔ تو انھی ابھرے ہوئے کاغذی حروف کو ٹٹول کر اس کو معلوم کر لیتے تھے[۵۱]

علامہ وجیہ الدین ابن الدھان الواسطی

زبان داں علما میں یہ دوسرے بزرگ ہیں ۵۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۱۲ھ میں وفات پائی ۔ واسطہ میں علامہ ابو سعید نصر بن محمد بن مسلم مؤدب وغیرہ سے، اور بغداد میں ابن خشاب سے تعلیم حاصل کی ۔ مدتوں کمال ابن الانباری کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا ۔ اور ان کے سب سے زیادہ محبوب شیخ وہی ہیں ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد "نظامیہ" میں جو اسلام کا سب سے بڑا دار العلوم تھا کئی سال تک نحو کی تعلیم دی ۔ اور ان کے حلقۂ درس سے ایک جماعت فارغ التحصیل ہو کر نکلی ۔ وہ عربی زبان کے ساتھ ترکی، فارسی، رومی، حبشی اور زنگی زبانیں بھی جانتے تھے ۔ اور ایک عجمی طالب العلم جب عربی میں معنی نہیں سمجھتا تھا تو اسکو عجمی زبان میں مطلب سمجھا دیتے تھے[۵۲]

ایک اور بزرگ علامہ فخر الدین فارسی اور ترکی زبان کے ماہر تھے ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اور لوگوں نے یہ دونوں زبانیں سیکھی تھیں ۔ چنانچہ شیخ اثیر الدین ابو حیان فرماتے ہیں ۔

"اور ہم نے انھی فخر الدین سے ترکی اور فارسی زبانیں لکھیں ۔ اور وہ ان دونوں زبانوں کے عالم تھے ۔ افراداً اور ترکیباً ان کو جانتے تھے ۔ عربی دانی نے ان کو اس میں مدد دی تھی ۔ انھوں نے بہت سے قصائد لکھے ہیں جن میں ایک قصیدہ ترکی زبان کے قواعد میں ہے[۵۳]" الخ

کیا ہمارے علما بھی عربی زبان کی اعانت سے اس قسم کا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں ؟

---

[۵۱] نکت الھمیان فی نکت العمیان للصفدی صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸

[۵۲] نکت الھمیان صفحہ ۲۳۳ - صفحہ ۲۳۴

[۵۳] کتاب مذکور صفحہ ۲۷۴

دیول دیوی

(از مولانا مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر بھاؤنیا لے احمد آباد)

"راجہ کرن" باگھیلہ راجپوت کا آخری راجہ تھا جو گجرات کے شہر پٹن یعنی انہل واڑا میں حکومت کرتا تھا۔ ۶۹۶ھ میں دہلی کے شہنشاہ علاء الدین خلجی سے راجہ کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ چنانچہ سنہ مذکور کے ابتدائی مہینوں میں الماس بیگ الغ خاں جو سلطان کا بھائی تھا اور نصرت خاں جالیسری جو سلطان کا وزیر تھا، مہم گجرات کے لئے مامور ہوئے۔ اور "مادھو" جو راجہ کرن کا وزیر تھا اور اس سے ناراض ہوکر دہلی چلا آیا تھا رہبری کے لئے ہمراہ کر دیا گیا۔ یہ دونوں ایک جرار لشکر لے کر راجہ کرن والے گجرات پر حملہ آور ہوئے۔ راجہ شاہی لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے صدر مقام انہل واڑہ[۱] کو چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ فرار ہوگیا۔ اور باگلانہ (جو آج کل ضلع ناسک ملک خاندیس میں شمار کیا جاتا ہے) میں جاکر قیام کیا الغ خاں کو اس جنگ میں مال غنیمت کے ساتھ راجہ کرن کی ایک رانی "کنولا دیوی" اور دوسری عورتیں بھی ہاتھ لگیں۔ جو اسیر ہوکر دہلی میں آئیں۔ کنولا دیوی باقاعدہ سلطان علاء الدین کے حرم میں داخل کی گئی۔ اور اس نے بوجہ اپنی خوبصورتی، خوش سیرتی اور سلیقہ مندی کے سلطان کے دل میں بہت قدر و منزلت پیدا کرلی ۷۰۶ھ میں ملک کافور جب فتح دکن کے لئے جا رہا تھا۔ تو کنولا دیوی نے ایک دن موقعہ پاکر اور سلطان کو خوش دیکھ کر یہ درخواست کی کہ میری دو لڑکیاں جو وہاں چھوٹ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو خدام شاہی پر تصدق

---

[۱] بعض گجراتی اور سنسکرت کتابوں میں درج ہے کہ یہ جنگ "اساول" کے پاس ہوئی۔ اور راجہ کرن باگھیلہ اسی جگہ سے شکست کھاکر باگلانہ بھاگا۔ اور غالباً اسی سبب سے کنولا دیوی کو ساتھ نہ لے سکا جو معلوم ہوتا ہے کہ پٹن میں تھی۔

(۱) راجہ کرن کے بزرگوں کو اس زمانہ کے راجہ نے "باگھیل یا واگھیل" نامی ایک گاؤں جاگیر میں دیا تھا آہستہ آہستہ یہ طاقتور ہوکر راج دبا بیٹھے اور پھر مہاراجہ گجرات بن بیٹھے۔ اسی گاؤں کی مناسبت سے لوگ انہیں باگھیلہ کہتے ہیں۔

ہو چکی ہے۔ مگر دوسری زندہ ہے۔ خون کے تعلق سے دل بے اختیار تڑپ رہا ہے اگر حضور کی توجہ ہو جائے تو میرا مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ بیٹی کو ماں کے ساتھ ملانے میں حضور سے قیامت کے دن کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔ امیر خسرو نے عشقیہ میں اس کو اسطرح شروع کیا،

شبے خوش دید داراے زمن را	ایک رات بادشاہ کو خوش دیکھ کر اپنے
بعرض آورد۔ راز خویشتن را	دل کا بھید یوں عرض کیا۔

"پھر آگے چل لڑکیوں کا تذکرہ کرتی"

کہ از شاخ جوانی بر درختم	کہ میرے درخت پر جوانی کی شاخ سے
دو غنچہ ناشگفتہ داشت بختم	میرا نصیب[1] دو بن کھلی کلی رکھتا تھا۔

اس کے بعد اپنی خوش قسمتی کو اپنی نسبت اس طرح ادا کرتی ہے۔

شدم من خوش ز بخت روشن خویش	میں اپنی خوش نصیبی سے مسرور ہوں
دلی ماند آں دو گل در گلشن خویش	لیکن وہ دونوں پھول اپنے باغ میں رہ گئے۔

"اب وہ اصل مطلب ادا کرتی ہے"

دوم ماندہ ست وچون پیوند خون ست	دوسری زندہ ہے اور چونکہ وہ میری
دل من ہمراں خون بے سکون است	لخت جگر ہے بدین سبب میرا دل اُس کے
دمے گر مہر شہ بر بندہ تابد	لئے بے چین۔ اگر بادشاہ کی مہربانی میرے
بگرمی خوں بخوں پیوند ماند	اوپر ہو خون کے ساتھ خون ملکر سکون حاصل کرے۔

چونکہ سلطان علاء الدین اپنے بیٹے خضر خاں کے لئے پہلے ہی سے کسی عمدہ موقع کا متلاشی تھا اسلئے رانی کنولادیوی کی یہ تجویز اُس کو پسند آئی[1]۔ رائے کرن کو رشتہ کا پیغام بھیجا گیا۔ اور اس نے

(مقدمہ دول رانی مطبوعہ علی گڑھ)

[1] غالباً کنولادیوی نے یہ دیکھا ہوگا کہ شاہزادہ خضر خاں کی ماں "ملکہ جہان" کا اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

نہایت خوشی سے اس پیغام کو منظور کیا۔ اور چاہتا تھا کہ شاہانہ جہیز کے ساتھ دیول دیوی کو دہلی روانہ کردے چنانچہ رائے کرن کی خوشی اور مسرت کو امیر خسرو رحمہ اس طرح ادا کرتے ہیں۔

سریر آرای ملکِ ہندواں کرن
ہندوؤں کے ملک کا راجہ کرن جو اس

کہ بد صاحبقران رائے دراں قرن
زمانہ میں اپنے وقت کا صاحبقران تھا

ازیں شادی کہ آمد ناگہانش
اس مسرت سے جو اس کو اچانک حاصل

نگنجید اندرونِ پوست جانش
ہوئی جامہ میں پھولا نہ سماتا تھا

لیکن پھر سلطان کی رائے بدل گئی، اور گجرات کو ممالک محروسہ میں شامل کرلینے کا فیصلہ کرلیا[۵]۔ غرض ملک کافور فتح دکن کے لئے مالوہ ہوتا ہوا گجرات پہونچا اور وہاں سے دکن چلا گیا۔ بموجب حکم سلطانی حاکم مالوہ اور گجرات اس کے مدد و معاون قرار پائے۔ حاکم گجرات نے بگلانہ کا محاصرہ کیا۔ الپ خاں اور "پنج مین" کے علاوہ دوسرے سردار بھی اس میں جد و جہد اور سعی بے حد کررہے تھے۔ الپ خاں نے راجہ کرن کو پیغام بھیجا کہ دیول دیوی حوالہ کردو۔ تاکہ اس کی ماں تک پہونچا دی جائے راجہ کرن نے اسے نامنظور کیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴) سلطان کا جو رجحان میری طرف بڑھ رہا ہے اس کے باعث مجھے کچھ نقصان پہونچائے۔ یا بعد سلطان مجھے کوئی تکلیف اٹھانا پڑے۔ بدیں خیال اس نے یہ تدبیر سوچی دیول دیوی کی شادی خضر خاں کے ساتھ کردی اس صورت میں وہ بعد علاء الدین بھی آرام سے رہ سکتی ہے۔ کیونکہ خضر خاں ولی عہد اور وارث تخت تھا۔

[۵] رانی کنولا دیوی کی یہ تجویز اور راجہ کرن کی رضامندی کسی معتبر تاریخ میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ معاملات نج کے طور پر طے ہوئے تھے۔ اور غالباً یہ معاہدہ ہوا ہوگا کہ گجرات کا راج کرن کو واپس دیا جائے اور وہ دیول دیوی سے خضر خاں کی شادی کردے۔ غالباً اسی سبب سے وہ راضی ہوگیا تھا۔ اس نے دلمیں خیال کیا ہوگا کہ ایسا سمجھوں گا کہ ترک میری ایک لڑکی کو اٹھا لے گئے۔ جیسا کہ فیروز شاہ تغلق کی ماں نے اپنے خاندان کو یہ فقرہ کہکر تسکین دی تھی لیکن پھر سلطان کی رائے کیوں بدلی؟ میرے خیال میں ملکہ جہاں نے اس جوڑ کا توڑ کیا۔ یعنی اپنے بھائی الپ خاں کی لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اس نے ان تمام تدبیروں کو درہم برہم کرڈالا۔ اور جب سلطان کا ارادہ بدل گیا اور الپ خاں کی لڑکی سے نسبت پختہ ہوگئی تو گجرات ممالک محروسہ میں داخل کرلیا گیا۔ تاہم کنولا دیوی کی خاطر دیول دیوی کو دہلی لے آنے کا حکم صادر کردیا

اس سے قبل کا واقعہ یہ ہے کہ راجہ کرن جب شکست پاکر خاندیس کی سرحد پر پہونچا تو اس نے دیوگڈھ (دولت آباد) کے راجہ رام دیو سے مدد کی درخواست کی۔ مگر اس نے مدد دینے کا کوئی وعدہ نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کرنا علاء الدین خلجی سے جنگ مول لینا ہے۔ لیکن اس کے لڑکے شنکر دیو نے راجہ کرن کو اس کی لڑکی سے شادی کا پیغام بھیجا۔ مگر چونکہ شنکر دیو[۵۱] مرہٹہ تھا۔ اور راجہ گجرات راجپوت، اور راجپوت اپنے کو مرہٹوں سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کرن باگھیلہ نے انکار کر دیا۔ اب جو دیول دیوی کی مانگ علاء الدین کی طرف سے ہوئی تو راجہ سمجھ گیا۔ کہ میرے پاس لڑکی رہی تو ایک نہ ایک دن ضرور چھن جائے گی۔ ادہر الپ خاں ناظم گجرات نے ایک بڑی فوج کے ساتھ پے در پے حملوں سے راجہ کرن کو پریشان کر ڈالا۔ دو ماہ تک جس طرح سے ہوا۔ راجہ مدافعت میں سرگرم رہا۔ اسی درمیان شنکر دیو نے اپنے باپ کی بلا اجازت اپنے بھائی بھیم دیو کو بڑے بیش قیمت تحائف کے ساتھ راجہ کرن کے پاس بھیجا۔ کہ آریہ راجپوت اگرچہ ترکستان ہی سے آئے ہیں اور اس لئے ترکوں کے ہم قوم ہیں۔ پھر بھی مذہبی مخالفت کے سبب ایک دوسرے سے ملنا بہت دشوار ہے۔ اور ہم تمہارے ہم مذہب ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم لڑکی کو میرے عقد میں دیکر روانہ کر دو۔ تاکہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ اور ترک کوچ کر جائیں"

راجہ کرن نے دیوگڈھ سے فوجی امداد کی امید پر دیول دیوی کو تمام شرائط طے کر کے بھیم دیو کے سپرد کر دیا۔ اور وہ لے کر غیر معروف راستہ سے دیوگڈھ روانہ ہو گیا[۵۲]۔ ادہر ناظم گجرات کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو بہت مضطرب ہوا۔ کہ اس پری کو دیو اڑا لے گیا، تو پھر میں بادشاہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہونگا۔ یہ خیال کر کے کرن باگھیلہ پر اس سختی سے حملے شروع[۵۳] کئے، کہ بے چارہ تمام سامان چھوڑ کر حیران پریشان بھاگ نکلا

---

۵۱ مورخوں نے اس کے نام مختلف لکھے ہیں۔ کسی نے سنگل دیو، اور کسی نے سنکھن دیو، اسی طرح اس کے بھائی کا بھیلم دیو، حالانکہ صحیح گجراتی نام "شنکر دیو، اور بھیم دیو ہے (دیکھو کتاب "کرن باگھیلہ") گجراتی مصنفہ رجسٹرار آف ودیاپیٹھ احمد آباد۔

۵۲ یہ تمام حالات فرشتہ سے لئے گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں دوسری تاریخوں سے بھی کافی مدد لی ہے۔

۵۳ جناب مولوی رشید احمد صاحب انصاری جنہوں نے ایک مفید مقدمہ "دول رانی خضر خاں" معروف بہ مثنوی عشقیہ پر لکھا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گجرات پر دو دفعہ حملہ کیا گیا۔ اول دفعہ جبکہ کنولا دی ہاتھ آئی اور بار دوم

(باقی صفحہ آئندہ)

اور دیوگڈھ کی راہ لی۔ ناظم گجرات بھی تعاقب کرتا ہوا، دیوگڑھ سے ایک دن کی راہ پر آگیا۔ مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ حیران تھا کہ کیا کرے، تقریبًا مایوس ہو چکا تھا۔ دریا کے کنارے دیوگڑھ کے قریب خیمہ زن تھا۔ کہ ہراول کے چار سو سپاہی جو سردار "پنچ من" کے ماتحت تھے، اجازت لے کر غار ایلورا دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے اتفاقًا وہاں ہندوؤں کی فوج پر نظر پڑی اور غلطی سے ایسا سمجھا کہ راجہ رام دیو کی فوج نے ہم پر چھاپہ مارنے کا قصد کیا ہے۔ حالانکہ یہ فوج بھیم دیو کی تھی۔ جو دیول دیوی کے ساتھ غیر معروف پہاڑی راستہ سے دیوگڑھ کے قریب پہونچ چکی تھی۔ ترک فورًا جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور تیر اندازی شروع کر دی۔ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۷) جبکہ دیول دیوی پر قبضہ ہوا۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ گجرات پر حملہ صرف ایک ہی دفعہ ہوا اور دوسری جنگ باگلانہ میں ہوئی جو ناسک ضلع میں واقع ہے اور آجکل جس کو "ستانہ" کہتے ہیں۔ اور اس آخری جنگ میں ناظم گجرات خود شریک تھا۔ فرشتہ میں صاف لکھا ہے "کہ رایان دکن کی سرکوبی کے لئے جب فوج ملک کافور لے کر چلا تو کنولا دیوی نے دیول دیوی کے متعلق بات کہی۔ سلطان نے ناظم مالوہ و ناظم گجرات کو ملک کافور کی اطاعت اور مدد کے لئے اور دیول دیوی کو حاصل کرنے کے لئے تاکید کی۔ پھر لکھتا ہے "الغ خاں ناظم گجرات" نے گجرات سے فوج لے کر بگلانہ (باکلانہ) کا قصد کیا۔ اور رائے کرن نے جنگ کر کے دو ماہ تک اپنا مقام بچایا" تاریخ بدایونی میں ہے "

"نہروالا (انہل واڑ) رابعد از ہزیمت رائے کرن نہب و غارت کردہ تعاقب آنمود۔ و رائے کرن در پناہ رائے بیرم دیو (رام دیو) کہ والی دیوگیر (دیوگڑھ) بود از ولایت دکن پیوست" پس جب دکن چلا گیا اور پھر گجرات آنا یا قبضہ کرنا اس کا ثابت نہیں ہوتا تو دوبارہ حملہ گجرات کیا معنی؟ ضیاء برنی، لکھتا ہے کہ درسال سوم جلوس علائی (۶۹۷ھ) الغ خاں و نصرت خاں با امرا و سرلشکران و حشم بسیار جانب گجرات لشکر کشیدند، نہروالا و تمام گجرات را نہب و تاراج کردند و کرن رائے گجرات از نہروالا بگریخت و برام دیو در دیوگیر (دیوگڑھ) رفت" گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ میں ہے" فلما کانا بالقرب من نہروالا خرج الیہما (یعنی الغ خاں و نصرت خاں) صاحبہا الرائے کرن، وکانت بینہم شدۃ۔ انجلت بہزیمۃ الرائے الی دیوگیر واستاسرا اہلہ۔ ان تاریخی شہادتوں سے معلوم ہو گیا کہ راجہ کرن پھر دوبارہ حدود گجرات میں داخل نہیں ہوا جس سے جنگ دوم گجرات میں ہوتی البتہ گجراتی تاریخوں سے اسقدر واضح ہوتا ہے کہ الغ خاں کے چلے جانے کے بعد گجرات میں بلوہ ہو گیا۔ جسکو جلد رفع کر دیا گیا اور الپ خاں کے مستقل گورنر بنانے پر تمام گجرات میں امن ہو گیا۔

باوجود کثرت فوج کے بھی ترکوں کے تیروں سے عاجز آکر بھاگنے لگی۔ اور تھوڑی دیر میں فوج اِدھر اُدھر منتشر ہوگئی۔ اسی ہنگامہ میں ایک ایک تیر دیول دیوی کے گھوڑے کو لگا جس سے وہ زخمی ہوگیا۔ سپاہیوں نے اس پر ہجوم کیا۔ اور اس کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک لونڈی نے کہا کہ دیکھنا! یہ راج کماری دیول دیوی ہے، اس کا ادب رکھو۔ یہ سنتے ہی تمام سپاہیوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، سردار "پنچ من" کو اپنی اس کامیابی پر بڑا فخر حاصل ہوا۔ اس نے فوراً محافہ میں سوار کرایا اور ناظم گجرات کے پاس لے گیا۔ ناظم گجرات کو بھی بے انتہا مسرت ہوئی۔ فوراً وہاں سے گجرات روانہ ہوگیا، اور پٹن پہونچ کر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہزادیوں کے مانند روانہ کیا اور اسی سال کے آخر میں اپنی ماں کنولا دیوی شاہ بیگم کے پاس پہونچ گئی۔ جس کے دیکھنے سے بیگم کو بے انتہا مسرت ہوئی۔ دیول دیوی محل سرا میں داخل ہوکر خاص قصر شاہی میں رہنے لگی۔ شاہزادہ خضر خاں چونکہ بچہ تھا۔ اور دیول دیوی بھی چھوٹی تھی اس لئے اکثر اوقات دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے [۵]

ایک دن سلطان نے خلوت میں خضر خاں کو طلب کیا اور ملکہ جہاں [۲] (ماہک بیگم) کو اشارہ کیا کہ جو تجویز ہوئی ہے اس کو ظاہر کردینا چاہئے۔ ملکہ جہاں نے کہا کہ حضور کا منشا ر مبارک ہے کہ تمہاری شادی دیول دیوی سے کردی جائے۔ خضر خاں مارے شرم کے کچھ نہ کہہ سکا، اور چپ چاپ باہر چلا آیا۔ لیکن دیول دیوی کی محبت اس کے تمام رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

---

[۵] دیول دیوی کے متعلق مصنف مرآۃ احمدی نے لکھا ہے "کہ جب دیول دیوی گرفتار ہوئی تو ہنوز خردسال تھی، الغ خاں نے اپنی فرزندی میں قبول کرکے پرورش کی اور پھر بہ حکم سلطانی خضر خاں سے شادی کردی" میرے خیال میں یہ بیان کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اول تو اس کی ماں موجود تھی۔ غیر کے ہاں پرورش پانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ پھر اسقدر اصرار کے ساتھ تو کنولا رانی نے اسکو منگوایا تھا۔ اس نے کیسے گوارا کیا کہ وہ اسکی آنکھوں سے دور الغ خاں کے سپرد کردیجائے۔ دوسرے الغ خاں فتح گجرات کے چھ سات ماہ بعد تو مرگیا وہ کیونکر بحکم سلطانی شادی کرسکتا تھا۔ اگر مان لیا جائے کہ الغ خاں سے مطلب الپ خاں ہے تو اول تو وہ گجرات میں رہتا تھا۔ اور بہ تحقیق معلوم ہے کہ دیول دیوی دہلی سے پھر کبھی گجرات نہ آئی۔ سوم خود الپ خاں کی بیٹی سے خضر خاں کی شادی ہوئی۔ تو کیا جانکر اپنی بیٹی کے ساتھ سوکن بھی داماد کو دیتا (۲) یہ نام ابن بطوطہ نے لکھا ہے جو ۷۲۹ھ میں بہ مقام مکہ اس بیگم سے ملا تھا۔ لیکن ظفر الوالہ میں برخلاف ابن بطوطہ کے اس کا

اس وقت دیول دیوی کی عمر آٹھ سال کی تھی[۵] - اور خضر خاں دس سال کا دیول دیوی کو اس رشتہ کی کچھ خبر نہ تھی۔ مگر وہ اپنے بھائی کی شباہت کے سبب جو خضر خاں میں پائی جاتی تھی - خضر خاں سے محبت کرتی تھی۔ لیکن خضر خاں واقف تھا۔ کہ وہ کسی روز اس کی دولہن بننے والی ہے دونوں اکثر اوقات ساتھ رہتے تھے اور نہایت شوق سے کھیلا کرتے۔

جب دیول دیوی نے نویں برس میں قدم رکھا۔ اور خضر خاں بھی سن بلوغ کو پہونچتا ہوا معلوم ہوا۔ تو ایک روز سلطان نے ملکہ جہاں (ماہک بیگم) کو بلا کر کہا کہ ماشاء اللہ اب خضر خاں جوان ہو گیا ہے۔ اس کی شادی کی فکر ہونی چاہیئے۔ آخر باہمی مشورہ سے یہ قرار پایا کہ خضر خاں کے ماموں الپ خاں کی لڑکی سے رشتہ پیغام بھیجا جائے، جو ملکہ جہاں کی بھتیجی تھی۔ الپ خاں نے نہایت فخر اور خوشی سے اس رشتہ کو منظور کیا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو نے اس کو اس طرح لکھا ہے۔

الپ خاں کاں بلندی یافت از بخت	الپ خاں جس نے اپنے نصیب کو بلند
پذیرفت آں مبارک مژدہ از تخت	مرتبہ پر پایا تخت شاہی کی طرف سے اس مبارک خوش خبری کو قبول کیا۔

قصر شاہی کی مستورات پر جب یہ راز ظاہر ہوا۔ تو خیر اندیشی اور نیک خواہی کی راہ سے ان کی ایک جماعت ملکہ جہاں کی حضور میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔ کہ الپ خاں کی لڑکی بھی کوئی غیر نہیں ہے - وہ بھی آپ ہی کی لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا نہ خواستہ اس کو کوئی تکلیف یا رنج پہونچے - یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اس سے لاپروائی یا غفلت برتی جائے، خضر خاں کا رشتہ جب سے اعلیٰ حضرت (سلطان علاء الدین خلجی) نے دیول دیوی کے ساتھ کر دیا ہے اسی کے تام پروالہ و شیدا ہے - دوسری لڑکیوں کی طرف مطلق اس کو توجہ نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ دونوں کے لئے جدا جدا مکان مقرر کر دیا گیا۔ ہفتہ عشرہ میں گاہ گاہ ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن جب خضر خاں اور دیول دیوی کے عشق و

---

[۵] دیول دیوی کی نسبت امیر خسرو نے آٹھ سال لکھا ہے - لیکن عام مورخین اس بارے میں جو لکھتے ہیں آگے چل کر اس کے متعلق کافی بحث کروں گا۔ اور کتب تاریخی کے تتبع سے جو میری رائے قائم ہوئی ہے اسکا بھی اظہار کروں گا۔

محبت کا چرچا شاہی محل میں زیادہ ہونے لگا۔ اور ملکہ جہاں کو اس کے متعلق متواتر خبریں ملنے لگیں اور یہ واقعہ پایہ ثبوت کو پہونچ گیا۔ تو اس نے حکم دیا کہ دیول دیوی لال محل میں بھیجدی جائے چنانچہ ملکہ جہاں کے حکم کے بموجب دیول دیوی کو سنگھاسن (تخت رواں) میں بٹھا کر مع سہیلیوں اور کنیزوں کے لال محل کی طرف روانہ کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر فوراً خضر خاں کو پہونچی، خضر خاں اس وقت اُستاد کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت یہ سن کر جو حالت ہوئی ہے وہ بہت دردناک ہے۔ غرض یہ وحشت ناک خبر سنکر شاہزادہ مکتب سے بے تحاشا بھاگا، اور رانی دیول دیوی کے سکھ پال (تخت رواں) کو جا پکڑا۔ دونوں مل کر خوب روئے اور طرفین سے محبت کی نشانیوں کا تبادلہ ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ خضر خاں کا رشتہ دیول دیوی سے اگرچہ سلطان کر چکا تھا۔ مگر بمشورہ والدہ خضر خاں (ملکہ جہاں) یہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور الپ خاں کی لڑکی سے شادی قرار پاگئی۔ اور اس کا سامان ہونے لگا تین سال تک متواتر اس کی تیاری ہوتی رہی۔ جب وقت آیا تو اس جشن شادی میں تمام شہر اور کوچہ بازار کی آرائش کی گئی۔ جابجا ڈیرے، خیمے، استادہ کئے گئے۔ اور زریں پردے اور شامیانے برپا کئے گئے تمام در و دیوار پر عجیب و غریب نقوش و تصاویر آویزاں و نمایاں کئے گئے۔ اور تمام گلی کوچوں میں ریشمی فرش بچھائے گئے۔ غرضیکہ نوبت اور شادیانے، تلوار اور خنجر کے کرتب دکھانے والوں کے اکھاڑے، نٹوں اور شعبدہ بازوں کے تماشے، گیند کا آسمان میں اچھالنا، تلوار کو پانی کی طرح نگل جانا، ناک کے راستہ چاقو چڑھا لینا، بہروپیوں کے سانگ، ولائتیوں[۵۱] اور ہندوستانیوں کے راگ و باجے، ہندوستانی گانیوالیوں کے ناچ اور راگ کی محفلیں، جابجا منجنیقوں کا نصب کیا جانا، اور ان سے روپیوں اور اشرفیوں کی بارش کا ہونا، یہ تمام باتیں ہیں جن سے اس جشن کو ترتیب دی گئی[۵۲]۔ منجموں کی ساعت سعید مقرر ہونے پر شمس الحق خضر خاں گھوڑے پر سوار ہوا۔ تمام امرا ارکان دولت پا پیادہ ساتھ ہوئے۔ ہاتھیوں پر زرین عماریاں کسی تھیں، اور چاروں طرف برہنہ تلواروں اور خنجروں سے نظر بد کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ راستے میں موتیوں اور جواہرات کی بکھیر ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جلوس الپ خاں کے مکان پر پہونچا، شاہزادے

---

۵۱ ولائتی سے مراد ترکی اور افغانی ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں فرنگیوں (یورپین) کا نام و نشان بھی ہند میں نہ تھا۔ ۱۲

۵۲ جشن کی تفصیل فقط اس لئے لکھدی ہے کہ اس سے اس زمانہ کی تہذیب اور جشن کا حال معلوم ہو۔ ۱۲

نے مسند پر جلوس فرمایا اور تمام ارکین دولت اپنے اپنے درجوں کے مطابق دائیں اور بائیں بیٹھے، ۲۳ر رمضان المبارک ۷۱۱ھ کو صدر جہاں نے منجموں کی بتائی ہوئی ساعت سعید میں خطبہ نکاح پڑھا، اور ایک گراں قدر مہر پر عقد ہوگیا۔ تمام حاضرین پر موتیوں اور جواہرات کی کھیر ہوئی، لوگوں کو قیمتی انعامات سے مالا مال کردیا گیا اور بعد فراغت نکاح یہ جلوس اسی ترتیب سے واپس آیا۔ غرۂ ذی الحجہ شب دوشنبہ ۷۱۱ھ حسب مقرر منجمین ایک پہر رات گذرنے کے بعد شاہزادہ محل میں داخل ہوا زرنگار فرش پر ایک پُر تکلف کرسی بچھائی گئی، اور اس پر شاہزادہ بٹھایا گیا۔ موتی اور جواہرات نچھاور کیے گئے۔ موتیوں کے نورانی سیارے فضا میں سرگرم سیر تھے کہ اچانک سامنے سے ابر دور ہوگیا (یعنی دولہن کی رونمائی ہوئی) یہ تمام باتیں ہوئیں۔ لیکن خود خضر خاں کے دل کا کیا حال تھا اسکو حضرت امیر خسرو کی زبانی سنئے؟

ہمہ شاداں ز خضر خاں غم اندیش	غم گیں خضر خاں سے سب کوئی خوش تھا
خضر خاں ہم۔ ولیکن باغم خویش	خود خضر خاں بھی۔ لیکن اپنے غم کے سبب
نہ از خویش و نہ از خویشا خبر داشت	اپنے آپ اور قرابتداروں کی خبر نہ رکھتا تھا
کہ تن آں جا، و دل جائے دگر داشت	کیونکہ اسکا جسم اس جگہ مگر دل دوسری جگہ (دیول دیوی) تھا

گو خضر خاں کی شادی ہوگئی۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ وہ شرم کے سبب اپنے ماں باپ کے منشا کے خلاف لب کشائی نہ کرسکا اور یہ ایسی بات تھی جو ملکہ جہاں اور قصر شاہی کی مستورات کو اچھی طرح معلوم تھی۔ مگر غالباً وہ سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد دیول دیوی کو فراموش کردیگا۔ لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا۔ خضر خاں کا عشق اور اس کی شیفتگی دن بدن بڑھتی گئی۔ جب معاملہ حد سے گذر گیا اور خضر خاں نے دیکھا کہ والدین کی غفلت بدستور ہے تو مجبوراً اس نے اپنے ایک محرم راز کو اپنی والدہ ملکہ جہاں کے پاس بھیجا۔

اس نے خضر خاں کی حالت زار اس طرح ظاہر کی کہ ملکہ اس سے بے حد متاثر ہوئی۔ پھر اس نے کہا کہ بھتیجی کی خاطر اپنے لڑکے کو ہلاک کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ یہ سن کر ملکہ جہاں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ آخر کار ملکہ جہاں نے سلطان علاء الدین خلجی سے اجازت طلب کرکے گھر کے چند خاص آدمیوں کی موجودگی میں خضر خاں اور دیول دیوی کا نکاح ہوگیا۔

چنانچہ مثنوی عشقیہ میں ہے۔

نهفته با درونی خاصه چند	چند مخصوص آدمیوں کے روبرو
نشست و عقد کابین کرد پیوند	خفیہ طور پر عقد ہو گیا۔

خضر خاں جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اس کی حالت میں ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ اس نے تمام مہیات سے توبہ کر لی۔ اور حضرت نظام الدین بدایونی سے بیعت کر کے ان کے مریدوں کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اور عبادت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ عرصہ تک یہی حال رہا، آخر جب علاء الدین خلجی بیمار ہوا[۵۱]۔ تو خضر خاں نے نذر مانی کہ اگر سلطان کی صحت ہوئی تو پا پیادہ ہتنا پور (شاید دہلی کے پاس کسی بزرگ کا مزار تھا) کی زیارت کو جاؤنگا۔ اور سلطان کو جب قدرے صحت ہوئی تو اپنی منت پوری کرنے کو روانہ ہوا ملک کافور نے (جو اس وقت نائب ملک تھا) بادشاہ کو خضر خاں سے ناراض کرا دیا، جو صرف عیادت کے لئے سلطان کے پاس آیا تھا۔ اور اسی طرح اس کے خسر الپ خاں کو قتل کرا دیا، جس کو سلطان نے گجرات سے محض مشورہ کے لئے بلایا تھا۔ چنانچہ خضر خاں کو حکم دیا گیا کہ فوراً امروہہ چلا جائے، اور بلا طلب ہرگز دہلی نہ آئے۔ جب میرٹھ پہونچا تو اس سے ولی عہدی کے علامات، چتر، دورباش وغیرہ بھی واپس کرنے کا حکم ملا۔ چنانچہ ملک حسام الدین کے سپرد کر کے وہ امروہہ چلا گیا۔ جہاں پہونچکر وہ سخت رنج والم میں مبتلا رہا۔ جب کچھ سکون ہوا۔ تو اس نے غور کیا اور سمجھا کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ وہ عتاب شاہی کی تلخی سے ناواقف تھا۔ اس نے خیال کیا کہ بے خطا ہونے کے سبب سلطان کی ناخوشی کا ایسی حالت میں اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ سوچ کر بلا طلب فوراً دہلی پہونچکر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان اس وقت اس کے آنے سے بہت خوش ہوا۔ اور پدرانہ شفقت سے گلے لگایا۔ اور معذرت کی۔ لیکن چند روز کے بعد جب خضر خاں غافل ہو گیا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو کر دربار کی پابندی ترک کر دی تو نائب ملک، کافور کو موقع مل گیا۔ اس نے کہا کہ خضر خاں اور شادی خاں بعض امرا کی سازش سے آپ کی جان لینے کے خواہاں ہیں۔ اور چند غلاموں اور خواجہ سرا اول سے اس کی تائید کرا دی۔ سلطان نے حکم دیا کہ خضر خاں اور شادی خاں قلعہ گوالیار میں قید کئے جائیں۔ اور ملکہ جہاں کو بھی محل سرا سے نکال کر پرانی دہلی میں بھیجدیا گیا، ان واقعات سے، اور نیز ملک کافور کی بدعنوانیوں سے ملکی بغاوتوں کی جو خبریں متواتر آنے لگیں تو علاء الدین کی علالت بڑھتی گئی، حالت روز بروز ردی ہوتی

---

۵۱ ضیاء برنی مرض استسقاء لکھتا ہے۔ اور بدایونی سل و دق تجویز کرتا ہے۔

جاتی تھی اور کسی طبیب کی دوا کارگر نہ ہوتی تھی، آخر اسی حالت میں مورخہ ۶ شوال ۷۱۵ھ میں علاء الدین نے وفات پائی۔[51] دوسرے دن ملک کافور خضر خاں کے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو جس کی عمر سات سال کی تھی، تخت شاہی پر بٹھا کر خود حکومت کرنے لگا، اور ملک سنبل کو باربکی کا عہدہ دے کر فوراً گوالیار روانہ کیا کہ خضر خاں اور شادی خاں کی آنکھیں بے نور کر دے، چنانچہ گوالیار پہونچ کر اس کے سپاہی آنکھوں کو بے نور کر دیتے ہیں۔ ملک کافور یہ چاہتا ہے کہ خضر خاں کے تیسرے بھائی مبارک خاں کا بھی کام تمام کر دے، لیکن تقدیر نے تدبیر پلٹ دی اور جن لوگوں کو قتل کے لئے مقرر کیا تھا، ان لوگوں نے رات کے وقت جب سب لوگ اپنے اپنے گھر کو واپس چلے گئے، ملک کافور کے خیمہ میں گھس کر اس کو قتل کر ڈالا، خضر خاں کو جب اس کی خبر ملی تو خدا کا شکر کیا۔ مگر کچھ خوش نہ ہوا۔ مبارک خاں اس واقعہ سے دو ماہ تک اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین عمر خاں کی نیابت میں اور پھر روز یکشنبہ ۲۴ محرم ۷۱۶ھ کو تخت پر رونق افروز ہو کر کاروبار سلطنت انجام دینے لگا۔[52] اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خطاب اختیار کیا۔ اور شہاب الدین کو اندھا کر کے گوالیار خضر خاں کے پاس روانہ کر دیا۔[53] اور پھر اپنے جلوس کے دوسرے سال ۷۱۸ھ میں فوج کشی دکن کے واپسی کے وقت جب بہ مقام جھائن پہونچا تو ملک شادی سر سلاحدار کو گوالیار روانہ کیا، تاکہ جملہ شاہزادوں کو قتل کر کے ان کے اہل و عیال کو دہلی لے آئے۔ اس قتل کا اصلی سبب تو وہ سیاسی مصلحت تھی جو ملک اسد الدین (سلطان علاء الدین کا بھتیجا) نے سازش قتل مبارک شاہ کر کے پیدا کر دی تھی، لیکن خضر خاں پر اس وقت تک کوئی سیاسی جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مبارک شاہ نے ایک نیا حیلہ تراشا یعنی دیول دیوی کو طلب کیا۔ جس کے جواب میں خضر خاں نے شاہی حکم ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس جواب کو امیر خسرو کی زبان سے بھی سن لیجئے۔

کہ شہ را الملک رانی چوں وفا کرد	کہ بادشاہ کے ساتھ جب "سلطنت" نے وفاداری کی
دول رانی بہ من بائد رہا کرد	تو دول رانی (دیول دیوی) "کو مجھے بخشدینا چاہئے۔

5[1] عام مورخین ۷۱۶ھ لکھتے ہیں (یہ سن مثنوی عشقیہ کی ہے)

5[2] مقدمہ دول رانی میں یہ سن ہے ورنہ عام مورخین ۷۱۷ھ لکھتے ہیں۔ ۱۲

5[3] اس حساب سے ۷۱۸ھ ہونا چاہئے۔ ۱۲

چو با من ہمسرست ایں یار جانی	جبکہ میرا دلی دوست میرے ساتھ ہے، تو پہلے
سر من دور کن، زاں پس تو دانی	میرا سر قلم کرلو، پیچھے تم جانو!

بادشاہ اس جواب سے طیش میں آکر۔ ملک شادی کو حکم دیا کہ فوراً گوالیار جاکر شاہزادوں کو قتل کردے چنانچہ ملک شادی ایک رات دن میں مسافت طے کرکے گوالیار پہونچا۔ اور شاہی حکم سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ مستورات میں شور قیامت برپا ہوا۔ شاہزادے سامنے لائے گئے قتل کا حکم دیا جاتا ہے مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی ہے۔ آخرکار ایک پنچ ذات کا ہندو اپنے افسر سے تیغ آبدار لے کر خضر خاں کو قتل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد دوسرے شاہزادوں کی باری آتی ہے اور قتل کئے جاتے ہیں اور انکی لاشیں بصد حسرت و یاس قلعہ گوالیار کے ایک برج میں جس کا نام نبجے مبارک ہے دفن کی گئیں" (مترجم)

اسلامی مورخوں کے تحریر کے بہ موجب دیول دیوی ۶۹۳ھ میں پیدا ہوئی۔ وہ چار سال کی تھی کہ آغوش مادر سے محروم کردی گئی۔ اپنی زندگی کے تیرھویں دور کو ختم کررہی تھی کہ دہلی پہونچی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں خضر خاں سے اس کا نکاح ہوا۔ تقریباً چوبیس زینے عمر کے طے کرچکی تھی کہ اپنے عزیز از جان شوہر کے ساتھ قید خانہ پہونچی اور اسی سال اپنے محبوب کے ظاہر میں آنکھوں کو بے نور ہوتے ہوئے اپنی روشن آنکھوں سے دیکھا۔ چھبیس[۲۶] برس کے بن میں بیوہ ہوگئی۔ خضر خاں جب تک زندہ رہا رانی دیول دیوی نے بڑی وفاداری سے اس کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ گوالیار کے جیل خانہ میں بھی ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ قطب الدین کی طلب پر بڑی آسانی سے ملک شادی کے ساتھ دہلی پہونچ کر شاہ بیگم بن سکتی تھی مگر اس نے تخت پر محبت کو ترجیح دی۔ اور وفاداری کے ساتھ زندگی کے آخری لمحہ تک خضر خاں کا اس نے ساتھ دیا۔ دیول دیوی رانی کے عمر کے متعلق مختلف تاریخوں کے تتبع سے جو سنین معلوم ہوئے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

واقعات	سنہ	عمر	کیفیت
ولادت	سنہ ۶۹۳ھ	۱	
حملہ گجرات	سنہ ۶۹۷ھ	۴	امیر خسرو رح کے نزدیک حملہ گجرات کے وقت اسکی عمر
نسبت خضر خاں بہ دیول دیوی	سنہ ۷۰۴ھ	۱۲	کل چھ ماہ کی تھی۔ اس حساب سے آخر تک ۴ سال کا فرق

واقعات	سنہ	عمر	کیفیت
حملہ باگلانہ	۷۰۶ھ	۱۴	رہتا ہے یعنی خسرو خاں کے وقت وہ ۲۴ سال کی تھی۔
شادی خضر خاں با دختر الپ خاں	۷۱۱ھ	۱۹	نکاح ماہ رمضان میں اور رخصتی ماہ ذی الحجہ میں ہوئی۔
نکاح دیول دیوی با خضر خاں	۷۱۳ھ	۲۱	یہ سنہ عشقیہ دولرانی میں ہے۔ بدایونی ۷۱۱ھ لکھتا ہے جو میرے
قید گوالیار	۷۱۵ھ	۲۳	نزدیک صحیح نہیں۔
کور چشمی خضر خاں	۷۱۶ھ	۲۴	
جلوس قطب الدین	۷۱۷ھ	۲۵	
قتل خضر خاں	۷۱۸ھ	۲۶	
قتل قطب الدین	۷۲۰ھ	۲۸	
قتل خسرو خاں گجراتی	۷۲۰ھ	۲۸	

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں ایک روایت لکھی ہے کہ دیول دیوی خضر خاں کے بچانے میں خود بھی ماری گئی۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ خضر خاں کے قتل کے بعد ملک شادی تمام خاندان خلجی کے تعلقمندوں کو جن میں دیول دیوی بھی شامل تھی، دہلی لے آیا۔

گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ میں ہے کہ دیول دیوی مع اپنی والدہ کے دہلی پہونچا دی گئی۔ جہاں اسکی مرضی کے خلاف قطب الدین نے نکاح کرلیا۔ بعض تاریخوں میں تحریر ہے کہ قطب الدین کے قتل کے بعد وہ خسرو خاں کے تصرف میں آئی۔ بہرحال خسرو خاں کے وقت تک اس کی عمر ۲۸ برس کی تھی۔ اور یہ آخری بات ہر جو تاریخوں میں دیول دیوی رانی کے متعلق ملتی ہے۔ اس کے بعد کسی واقعات سے تاریخ خاموش ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب تک زندہ رہی۔ اور کب اس نے وفات پائی۔ ممکن ہے کہ خسرو خاں کے قتل کے وقت جو ہنگامہ برپا ہوا، اس میں کسی نے ہم وطن اور طرفدار سمجھ کر قتل کردیا ہو۔ اور یہ بھی پردہ خفا میں ہے کہ آیا وہ صاحب اولاد تھی۔ یا اس سے محروم۔

اسی عہد میں (۷۱۵ھ) مشہور شاعر حضرت امیر خسرو ؒ نے اس واقعہ کو نظم کرکے ایک کتاب لکھی

ہے جس کو عام طور پر لوگ مثنوی عشقیہ کہتے ہیں۔ لیکن خود امیر خسرو نے اس کا نام "دَوَل رانی خضر خاں رکھا ہے۔ اور اس تبدیلی کی وجہ یہ لکھی کہ اس پری پیکر کے نام کا اول حصہ لفظ "دیو" سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے اسکو بدل کر ہم نے دَوَل کردیا۔ جو دولت کی جمع ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

دَول رانی کہ ہست اندر زمانہ   ز طاؤسانِ ہندوستاں یگانہ
برسم ہندوی از نام نالبش   در اوّل بود دیولدے خطابش
بنامِ آں پری چو دیورہ داشت   فسوں بندہ زآں دیوش نگہداشت
چناں رسمے بدل کردم مراعات   کہ از ہندی عَلَم بر زد بہند ات
یکے علت در و بفگندم از کار   کہ دیول را دو کردم بہ ہنجار
دول جمع دولتہاست در شمع   دریں نامہ است دولتہا بسے جمع
چو رانی بود صاحب دولت و کام   دَوَل رانی مرکب کردمش نام

ہند میں اس کے مختلف نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن اس کتاب کا بہترین نسخہ ظاہر جس کے لحاظ سے وہ ہے جو خدا بخش خاں کی لائبریری (بانکی پور پٹنہ) میں ہے۔ جس کو نواب شہاب الدین احمد خاں ناظم گجرات نے بمقام احمد آباد ۹۹۵ھ میں تیار کرایا۔ اور میر محمد شریف وقوعی نیشاپوری نے اسکی تصحیح کی۔
اسی مثنوی کو بڑی صحت کے ساتھ مع ایک بہترین مقدمہ کے مولوی رشید احمد صاحب سالم انصاری نے حسب منشا نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم سابق سکریٹری علی گڈھ کالج ۱۹۱۷ء میں شائع کرائی ہے جو بڑی تحقیق اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

اردو کے پیغام گو شاعر

(از ابوالحسنات جناب غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ، ایم اے)

(۱)

ہر زبان کا ادب کسی نہ کسی طرح سے اس کے بولنے والوں کی ذہنیتوں کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ قوموں کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات ان کی زبانوں اور ادبیات پر بھی اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء وہ سال ہے جس نے یہاں کے باشندوں کو ایک زبردست انقلاب سے روشناس کرا دیا۔

عالیشان تمدن اور پرشکوہ سلطنت کے آخری ایام جن رنگ رلیوں اور بے ہودگیوں میں آلودہ رہتے ہیں وہ سب ۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان میں رائج تھیں۔ اردو کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کو ایک ایسی قوم اور ایک ایسے ملک میں جنم لینے کا موقع ملا جس کی ذہنیتیں تمدنی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اپنی بساط کے موافق عروج کمال کو پہونچ چکی تھیں لیکن یہ بھی فطرت کا ایک عجیب معمہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی چیز کسی ایک پہلو کے لحاظ سے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مصروف رہتی ہے اس کے ساتھ ہی کسی دوسری صنف میں اسکو تنزل کی سیڑھیوں پر سے اترنا پڑتا ہے۔

سلطنتوں اور قوموں کو عروج کے زمانہ میں سخت کشمکش اور جد و جہد کرنی پڑتی ہے اس لئے ان کے افراد تازہ دم، سرگرم، ہوشیار اور مستعد رہتے ہیں لیکن جہاں ان کی کوششیں انھیں کامگاریوں کی صورتیں دکھانی شروع کر دیتی ہیں اور جہاں معاشرتی ذرائع آسان ہونے کے باعث تنازع البقا کے لئے کسی دوڑ دھوپ کی ضرورت باقی نہیں رہتی ان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں میں نقص پیدا ہونے لگتا ہے اور عیش و عشرت کے ایسے تخم پڑ جاتے ہیں جو بہت جلد سرسبز و شاداب درختوں کی شکل میں نمودار ہونے لگتے ہیں۔

ایسی صورت میں ادب و انشا کا متاثر ہونا بھی ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ ہماری زبان اردو بھی اپنے بولنے والوں کی ذہنیتوں سے کافی طور پر متاثر ہوگئی اور اس میں وہ تمام تکلف، تصنع اور لایعنی عناصر شامل ہوگئے جو اس زمانہ کی تہذیب اور آداب معاشرت کے اجزائے لاینفک تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کی شاعری کے متعلق حالی نے اپنے "مسدس" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس حقیقت کے زبردست ترجمان ہیں

جس نے اردو کے شاعروں کو ایک طرف تو فارسی کی تقلید اور اس کے اثر کے باعث اور دوسری طرف ان کے معاشرتی اور سیاسی کاموں کی بنا پر اس قسم کی شعری تخلیق پر مجبور کر دیا تھا۔ حالی کہتے ہیں ؎

وہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر　　ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے　　عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے　　مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

سخن جو ہے یاں آج حصہ ہمارا　　نہیں قوم کو ظاہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بہتاں ہو جسمیں گوارا　　مجسم ہو اس کا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اس سے اور اک ہمالا
ہمالا سے ہو جس کی چوٹی دو بالا

زمانہ میں جتنے قلی اور نفر ہیں　　کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویئے امیروں کے نور نظر ہیں　　ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سُنتے نہ ہوں، جی سے جائیں گذر سب　　ہو میلا جہاں، گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ، اگر شہر چھوڑیں نفر سب　　جو تھڑ جائیں مہتر، تو گندے ہوں گھر سب
یہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

طوایف کو از بر ہیں دیوان ان کے ۔۔۔ گویوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان ان کے ۔۔۔ ثنا خواں ہیں ابلیس شیطان ان کے

کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انھوں نے

لیکن جب اس تمدن و معاشرت کا جہاز ایک غیر قوم کی حکومت و غلبہ کے تیز و تند طوفان میں غوطے کھانے لگا تو اس کی شاعری اور انشا پردازی کا گہرا اور شوخ رنگ بھی ڈھل ڈھلا کر دھندلا اور مدھم پڑنا شروع ہوا۔ یہی وہ عمل ہے جس نے بعض حساس ہستیوں کو اس خاص رنگ میں رنگ دیا جس پر ہم اپنے اس مضمون میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور جس کی بنا پر ان خاص ہستیوں نے اپنے ملک و قوم کے آگے خاص خاص پیغام پیش کئے تھے۔

(۲)

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز واقعہ کے بعد جہاں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی حالت نہایت دردناک ہو گئی تو جس طرح اُن کے بعض روشن خیال افراد قنوطیت کے بحر منجمد میں غرق ہونے لگے، چند بلند ہمتوں نے مستعد ہو کر قوم کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کی بھی کوشش کی اس کا واحد ذریعہ ان کی نظروں میں سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ ——— دع ما کدر و خذ ما صفا ——— یا بقول حالی۔ ——— پھرو اس طرف کو جدھر کی ہوا ہو ——— پر عمل کریں۔

ان باہمت افراد میں جنھوں نے سب سے پہلے ان قدیم طرز معاشرت اور ادبیات کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا سرسید، آزاد اور حالی سب سے زیادہ اہم ہیں۔ سرسید کے وسیع جولانگہ عمل کے متعلق بحث کرنا فی الحال ہمیں مقصود نہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آزاد اور حالی کی اس قسم کی کوششوں اور ان کی نوعیت کے متعلق اپنے خیالات کا کچھ اظہار کریں۔

محمد حسین آزاد پہلے اردو ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی خیالات سے متاثر ہو کر اردو کو بھی انگریزی نہج پر چلانے کا خیال پیدا کیا اور اس باب میں اُنھوں نے اس قدر خوش مذاقی اور بلند حوصلگی سے کام لیا کہ ان کی محنتوں کی بے اختیار داد نکل پڑتی ہے۔ اُنھوں نے نثر اور نظم دونوں کا اسلوب اگرچہ قدیم ہی رکھا لیکن ان کے مطالب بالکل بدل دیئے۔

اردو دانوں کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی یہ پہلی ادبی کوشش تھی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ آزاد اپنی اس کوشش میں ایک حد تک ضرور کامیاب رہے۔ انھوں نے "نیرنگ خیال" میں نثر کے جو مضامین پیش کئے ہیں وہ بھی انگریزی خیالات کے جزواً وکلاً حامل ہیں اور ان مضامین کی طرح ان کی تمام نظمیں بھی اسی مقصد کی وفادار کارگذار ہیں۔

آزاد کی طرح حالی نے بھی اس کام کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کرنل ہالرائیڈ کی مرہون منت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو بھی حقیقی شاعر ہوتا وہ ایسے زمانہ میں یقیناً وہی کام کرتا جو حالی نے کیا۔ حالی اپنے زمانہ اور قوم کی صحیح پیداوار تھے۔ اس زمانہ اور قوم کا اقتضا ہی یہ تھا کہ ایک حالی ضرور پیدا ہو جاتا۔ اگرچہ آزاد نے اس کام میں تقدیم کی لیکن پہلے تو انہیں اس میں کمال حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور دوسرے یہ کہ نثر کی طرف (اور وہ بھی خاص قسم کی نثر کی طرف) متوجہ ہونے باعث ان کی شاعرانہ قوتیں حالی کی شاعرانہ قوتوں کے مقابلہ میں زیادہ سرسبز نہ ہو سکیں۔

آزاد دنیا میں شاعری کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے جو کچھ شعری تخلیق کی ہے وہ معمولی درجہ کی بھی نہیں ہے لیکن صرف اسی پر آزاد کی تمام شہرت کا دارومدار نہیں کیا جا سکتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آزاد کی نثری خدمات ان کی ادبی پیداوار سے علیحدہ کر لیا جائے تو پھر ان کی شخصیت کی وہ عظمت باقی نہیں رہتی جس کی خاطر آج ہم انہیں اردو کا ایک زبردست محسن اور اس کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد) میں شمار کرتے ہیں ان کی نظمیں انہیں دنیائے اردو میں ایک عظیم الشان حیات جاودانی نہیں بخش سکتیں۔ اس کے برخلاف اگر حالی سے ان کے نثری کارنامے علیحدہ بھی کر لئے جائیں تو ہماری نظروں میں ان کی وہی عظمت باقی رہتی ہے۔ اگر حالی نثر میں ایک سطر بھی نہ لکھتے تو بھی ان کا نام دنیائے اردو میں ہمیشہ روشن رہتا۔

(۳)

حالی نے جس ماحول میں نشو و نما حاصل کی اور اپنی زندگی میں انہیں جن جن خیالات سے سابقہ پڑا وہ ضرور اس قابل تھے کہ ان کی حساس طبیعت کو متاثر کر کے ان کی شاعرانہ قوتوں کو بڑھا دیتے۔ وہ شخص جس نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسا زمانہ دیکھا ہو جبکہ اس کے ہم وطن آزادی اور اغیار کی اطاعت سے قطعاً نا آشنا تھے اور وہ شخص جس نے ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کی ہو جس میں اس کے ہم قوم حاکموں کی شان سے سر اونچا کئے پھرتے تھے

اور وہ شخص جو شہر دہلی میں شام کے وقت چاندنی چوک میں ہر طرف امیروں اور شریف زادوں کو اپنی اپنی قدیم آن بان اور تزک و احتشام کے ساتھ متفرق سواریوں پر نکلتے ہوئے دیکھتا تھا، جب انہی ہم وطنوں کو دوسروں کے قبضۂ اقتدار میں بیکس پاتا ہوگا اور انہی ہم قوموں کو اغیار کی غلامی میں خراب وخستہ حال دیکھتا ہوگا تو اس کے دل پہ کیا گذرتی ہوگی؟

غدر کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کی تباہی جس درجہ تک پہونچ گئی تھی اس کا اظہار کرنا تو کجا صرف خیال ہی سے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی مسلمان نظر آتا تھا انگریز حکام اس کو مجرم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ہندوستان میں پہلے مسلمانوں کی سلطنت تھی اسلئے صرف انہیں نے ہمارے خلاف بغاوت کی۔ اسلئے وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی جاگیریں، زمینات اور مکانات دیئے گئے۔ غرض اس طرح مسلمان تباہ و برباد کردیے گئے بڑے بڑے شریف اور امیر خاندان منتشر ہوگئے۔ ان کی اولاد غریبوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس میں وہ تمام برائیاں پیدا ہوگئیں جو ایک ایسی محکوم اور غلام قوم میں خود بخود پیدا ہونے لگتی ہیں جو اپنی آزادی کے زمانہ میں بھی کاہل الوجود اور پست خیال ہونے کے علاوہ سیکڑوں طرح کی بے ہودگیوں میں مبتلا ہوگئی۔

مولوی حالی نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کا جو دردناک مرقعہ پیش کیا ہے اس سے ہمیں غدر کے بعد ہی مسلمانوں کی جو حالت ہوگئی تھی اس کا ایک صحیح مرقعہ نظر آجاتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے — کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے — ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت — نہ اپنوں سے الفت، نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت — خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع، غرض کی مدارا

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم — نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم

نہ جلسوں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم　　نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصّہ ہمارا ہے سوداگری میں
تنزل نے کی ہے بری گت ہماری　　بہت دور پہنچی ہے نکبت ہماری
گئی گذری دنیا سے عزت ہماری　　نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کے جیتے ہیں سارے

مسلمانوں کی حالت پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد حالی نے اپنے ہم وطن ہندوؤں کی ارتقائی منازل کا بھی تذکرہ کیا ہے اس کے بعد ایک دو بند ملاحظہ ہوں :۔

دکاں ان کی ہے اور بازار ان کا　　رہنج ان کا ہے اور بیوپار ان کا
زمانہ میں پھیلا ہے بیوپار ان کا　　ہے پیر و جواں برسرکار ان کا
مدار اہل کاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس، انہیں کے ہیں دفتر
جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ،　　پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچہ میں جا کے ڈھل جاتے ہیں　　جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضا جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

کیا ان اشعار سے اس امر پر کافی روشنی نہیں پڑتی کہ ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونے کے ساتھ ہی انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف اسی شوق اور سرعت کے ساتھ توجہ کی جس شوق اور سرعت سے انہوں نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی کی طرف رغبت کی تھی اس کے برخلاف مسلمانوں نے ایک زمانہ تک انگریزی تعلیم کو باعث کفر قرار دیا، اور اگر سرسید جیسا باہمت شخص اٹھ کھڑا نہ ہوتا تو نہ معلوم کتنے زمانہ کے بعد مسلمان انگریزی کی طرف متوجہ ہوتے؟

اسی سلسلہ میں حالی جہاں اپنے ہم قوموں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ انگریزوں کی طرف

بڑھیں اور نہ صرف ان کی زبان بلکہ خیالات کی بھی تحصیل کی کوشش کریں، اس کے ضمن میں وہ اہل یورپ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یہ چیز بھی نہایت موافق فطرت ہے وہ کہتے ہیں ؎

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ ۔۔۔ کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ

بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ ۔۔۔ کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں وہ

نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ

بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

کیا اس وقت کے مسلمان ایک ایسی قوم کے دوش بدوش رہ سکتے تھے جن کو صفات متذکرہ بالا ہوں؟ اس کے مقابلہ کے لئے اگر ہم "ضمیمہ" مسدس حالی کے وہ اشعار پیش کردیں تو نامناسب نہ ہوگا جن میں حالی نے مسلمانوں کی بے سروسامانی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اہل یورپ کی تذکرہ بالا حالت کے مطالعہ کے بعد جب اسلامیوں کی حسب ذیل حالت کا اندازہ کرنے پر کوئی شاعر مجبور ہوجائے تو کیونکر اس کے جذبات کو ٹھیس نہ لگتی ہوگی اور پھر کیوں وہ دردناک صدائیں بلند کرنے پر مجبور نہ ہو جاتا ہوگا؟ کہتے ہیں ؎

نہ پاس ان کے چادر، نہ بستر ہے گھر کا ۔۔۔ نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا

نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا ۔۔۔ صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا

کنول مجلسوں میں، قلم دفتروں میں

اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

(۴)

ان حالتوں کے مدنظر کہاں تک کوئی شخص زندہ دل رہ سکتا ہے! چنانچہ حالی بھی قنوطیت میں غرق ہوگئے۔ اور اس امر کے اظہار پر مجبور ہوگئے کہ ؎

تباہی کے خواب آرہے ہیں نظر سب ۔۔۔ مصیبت کی ہے ہونے والی سحر اب

ساتھ ہی حالی کے انداز میں سوزوگداز پیدا ہوگیا۔ انہوں نے جب مسلمانوں اور اسلام کے متعلق مسدس لکھا تو اسکو پہلی دفعہ یاس پر ختم کردیا چنانچہ ازمنہ ماضیہ کے زبردست تمدنوں کے خاتموں کو پیش نظر کرکے انہوں نے اس امر کا اعلان کردیا کہ اب مسلمانوں کی قوم دوبارہ ترقی نہیں کرسکتی۔ کس قدر دلخراش صدائیں ہیں!!

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے ۔۔۔ سرانجام ہر قوم وملت یہی ہے

صدا اسے زمانہ کی عادت یہی ہے   طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر

بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

کہاں ہیں وہ اہرامِ مصری کے بانی   کہاں ہیں وہ گردانِ زابلستانی

گئے پیشدادی کدھر اور کیانی   مٹا کر رہی سب کو دُنیائے فانی

لگاؤ کہیں کھوج مکداینوں کا،

بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا

وُہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے   جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے

سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے   نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب

غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

حالی کے تمام کلام اور بالخصوص مسدس میں رنگینی اور تکلف دونوں نام کو بھی نہیں پائے جاتے ان کے کلام کی بڑی خصوصیت سادگی اور جوش ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اس قسم کے طوفان میں زندگی بسر کرنے کے بعد حالی کی شاعری میں وہ رنگینی اور بانکپن نہیں پایا جاسکتا تھا جو غدر کے پہلے کے اکثر شاعروں کو نصیب تھا۔ یہ تو طبیعت کا اثر تھا اس کے علاوہ انہیں جن موضوعوں پر قلم اٹھانا پڑتا تھا وہ بھی ایسے نہیں تھے کہ وہ اس میں رنگینی اور تکلف سے کام لے سکتے۔

حالی تکلف اور تصنع کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے یوں بھی دنیا کا کوئی شاعر اپنی طبیعت پر زور دیکر اعلیٰ درجے کے شعر نہیں پیش کرسکتا اکثر بہترین شاعرانہ شاہکار سے جوش و جذبہ ہی کے عالم میں نکل پڑتے ہیں چنانچہ حالی نے بھی اپنے مسدس کو اپنی طبیعت کے مطابق یاس انگیز صداؤں پر ختم کردیا۔ یہ امر سرسید کو برا معلوم ہوا وہ ایک ایسے انسان تھے جو ناامیدی اور قنوطیت کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اگرچہ اس وقت ہندوستان کے تمام مسلمان اپنی فلاح و بہبود سے قطعاً ناامید ہوگئے تھے لیکن سرسید ایک ایسی شخصیت تھی جس نے امید کے دامن کو نہیں چھوڑا اور آفریں ہے ان کی ہمت پر کہ وہ اپنے مقاصد میں زیادہ حد تک کامیاب رہے۔

سرسید نے مولوی حالی کو مجبور کیا کہ وہ اس مسدس کو دلخراش نالوں پر ختم نہ کردیں بلکہ اس کے بعد ایک ضمیمہ لکھ کر امید افزا حالات کا ذکر کریں اور اپنی قوم کو ڈھارس دلائیں۔ چنانچہ حالی نے مسدس کا ایک "ضمیمہ" بھی لکھا اور اس میں امید سے خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل ابتدائی بند کے ساتھ کائنات کے ان واقعات کا ذکر کیا جن میں تباہی اور بربادی کے بادل اُمڈ اُمڈ کر آئے لیکن پھر بہت جلد نکل گئے ؎

بس اے ناامیدی! نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے امید! اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں،

وہی حالی جنہوں نے اپنے زمانہ اور ماحول سے مجبور ہو کر "مسدس" کے لکھتے وقت آواز بلند کی تھی کہ ؎

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب — علن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب — بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے،
ستون مرکز ثقل سے ہٹ گیا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ ہے اس کا — کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اونچے سے جس کو گرایا — وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

سرسید کے کاموں سے متاثر ہونے اور ان کی فرمائش پر جب اس مسدس کا ضمیمہ لکھتے ہیں تو حسب ذیل امید افزا خیالات کا اظہار کرتے ہیں ؎

گر ہے ابھی یہ دیا ٹمٹماتا — بجھا جو کہ ہے یاں نظر سب کو آتا

. . . .

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط الناس — نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خذف کے ہی انبار گریاں — جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں اس میں پنہاں

چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ

لیکن چونکہ مسدس کا ضمیمہ ایک حد تک فرمائشی چیز تھی اس لئے اس میں وہ اصلیت اور جوش نہیں پایا جاتا جو مسدس میں دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ضمیمہ مسدس کی طرح مقبول نہ ہو سکا۔

(۵)

اگرچہ حالی کے کلام میں بالعموم یاس کی جھلکیں نمودار ہیں لیکن سرسید کے اثر کی وجہ سے بعد میں وہ بھی مسلمانوں کی ترقی کی امید رکھنے لگے تھے۔ سرسید کی طرح ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ میل جول کرکے ترقی کرنی چاہئے۔ اسلام کی قدیم روایات یورپ کی موجودہ تہذیب سے میل کھاتی ہیں۔ ہند کا رواجی اسلام ٹھیٹ اسلام نہیں۔ اور ٹھیٹ اسلام یورپ کی موجودہ تہذیب کے منافی نہیں لہٰذا مسلمانوں کو یورپ کی تہذیب اختیار کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

جب مسلمان دولت، حکومت اور سیاست سے محروم ہوگئے تو انہیں چاہئے کہ کسی نہ کسی طرح سے اس کی تلافی کریں اور بحالت موجودہ اس کی صورت یہی ہے کہ وہ یورپ کی طرزِ معاشرت اختیار کرلیں کیونکہ وہ اسلام کی ضد نہیں ہے۔ نیز یہ کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ جدھر زمانہ پھرے اس طرف کو نہ پھر جائے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

رہوگے یونہی فارغ البال کب تک
نہ بدلوگے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک
نہ چھوڑوگے تم بھیڑیا چال کب تک
سب اگلے فسانے فراموش کردو
تعصب کے شعلہ کو خاموش کردو

یہ ہے حالی کی شاعری کا پیغام۔

لیکن اس پیغام کو ماننے کے لئے ان کے ہم قوم اول اول ہرگز راضی نہ تھے۔ کیونکہ انہیں انگریزوں کی ہر چیز سے نفرت تھی یہ مجبوری زمانہ تھا۔ اس میں لوگوں کی مخالفت اور طعن و تشنیع کا طوفان اٹھا ایک

فطری امر تھا چنانچہ ان کے مخالفوں اور پرانی طرزِ معاشرت کے علم برداروں نے نثر اور نظم دونوں کے ذریعہ سے ان کی مخالفتیں کیں۔ لیکن چونکہ نثر دیرپا نہیں ہوتی اس لئے مرگئی اور وہ نظمیں جن میں کچھ جان تھی اور جو حقیقی معنوں میں نظمیں تھیں زندہ رہگئیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی کی ہیں۔

(۶)

اکبر بھی حالی کی طرح اپنے زمانہ اور ماحول کی حقیقی پیداوار اور وفادار نمایندے تھے۔ جس طرح حالی اپنے دیرینہ تجربوں اور غور وفکر کے باعث اپنا خاص پیغام سنانے پر مجبور تھے، اکبر بھی عبوری دور کی خصوصیات کے زیر اثر حالی کے پیغام کا ردِعمل کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے کلام اور خیالات کی اٹھان بھی یقیناً فطری ہے۔ اس عبوری زمانہ کا اقتضا ہی یہ تھا کہ ایک اکبر ضرور پیدا ہوجاتا۔

اکبر حالی کی طرح دل سے قوم کے بہی خواہ تھے۔ اس کے علاوہ قدرت نے انہیں ایک ایسا کمال عنایت کیا تھا کہ وہ جن لوگوں پر طنز کرتے تھے وہ بھی انہی کی طرح ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ خاص ملکہ صرف اکبر ہی کا حصہ تھا اور اس کے ذریعہ انھوں نے حالی کے برخلاف تہذیبِ حاضرہ کے معائب بیان کرنے میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ حالی کی طرح اکبر کے کلام میں بھی غزلیات کا فقدان نہیں لیکن حالی ہی کی طرح وہ بھی ایک خاص غزل گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔ اکبر اپنے آخری زمانے میں غزلیں بہت کم لکھتے تھے۔ عموماً سیاسی، اخلاقی، عارفانہ اور ظریفانہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت جو کچھ غزلیں انھوں نے لکھی ہیں ——— اور جن کی تعداد کم بھی نہیں ——— ان میں بھی غزلیت کا عام عنصر بہت کم ہے۔ مثلاً اس زمانہ کی غزلوں کے بعض شعر ملاحظہ ہوں :-

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے ۔۔۔ اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا ۔۔۔ سائنس سے سنتے تھے کہیں موت نہیں ہے
نیچر ہی کا مطیع ہے بہت معتبر اکبر ۔۔۔ تم دیکھتے ہو چھل میں کہیں چھوت نہیں ہے

دورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب ۔۔۔ ہم بھی اب چاک گریبان کو سئے لیتے ہیں

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اکبر کی شاعری اس وقت معراج کمال کو پہونچتی ہوئی نظر آتی ہے جب وہ نئی روشنی کے متعلق طنز آمیز نظمیں لکھنی شروع کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی اور اکبر دونوں قوم کی خستہ حالی سے تحت متاثر تھے لیکن اس کے علاج کے طریقے دونوں نے بالکل مختلف اختیار کئے۔ اکبر کا پیغام حالی کے برخلاف یہ تھا کہ ——— خالص مذہب کی طرف جاؤ، نئی تہذیب کی طرف نہ بڑھو اور قدیم روایات کو نہ چھوڑو ——— انکا خیال ہے کہ سرسید اور حالی کے پیغامات پر عمل کرنے سے :-

ہم کو نئی روشنی کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کروٹوں میں ٹوٹیں — بخیے جو فطرتی تھے وہ اب ادھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل بگڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کسکی کریں گے زینت — لفظوں کے یہ نگینے کیوں آپ جڑ رہے ہیں

اکبر نے اپنے ماحول کی ——— جو ایک عبوری دور کا بہترین مظہر تھا ——— جسقدر نفیس ترجمانی کی ہے اس کے متعلق بعض شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو — دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت کے کام دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے؟
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج یا ترد د — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے؟

ترقی کی تنیں ہم پر چڑھائیں گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھائیں
نہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن وہ گو اسکول میں برسوں پڑھائیں

غرض اکبر نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ذاتی مشاہدہ کے بعد اور بعض دفعہ پیش بینی سے لکھا ہے۔ اگرچہ حالی کی طرح ان کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن جس طرح انھوں نے اپنا پیغام حالی سے بالکل مختلف قرار دیا اس کے ظاہر کرنے کا طریقہ بھی حالی کے طریقۂ اظہار سے بالکل علیحدہ نوعیت کا اختیار کیا۔ اکبر جو کچھ کہتے ہیں ظرافت کے ساتھ کہتے ہیں اور حالی جو کچھ بیان کرتے ہیں سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(۷)

اکبر اور حالی دونوں کے پیغام سے ابھی مسلمانوں کے کان آشنا ہونے ہی پاتے ہیں کہ ان دونوں سے متاثر ہو کر ایک تیسرا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کے خیالات کی نوعیت اور انداز بیان کو دیکھتا ہے کبھی حالی کی نقل اتارتا ہے اور کبھی اکبر کی ریس کرتا ہے چنانچہ اول اول اس کے لئے کوئی خاص راستہ نہیں پیدا ہوتا۔

وہ حالی سے مسلمانوں کے موجودہ مصائب کو بیان کرنا سیکھتا ہے اور اکبر سے قدیم روایات اسلامی کو نہ چھوڑنے اور نئی تہذیب کو مضر سمجھنے کے خیالات اخذ کرتا ہے۔ اکبر تہذیب نو کے مخالف تھے حالی اسکے مخالف نہیں۔ اقبال نے ایک بات حالی سے لی اور ایک اکبر سے۔ وہ بھی تہذیب نو کے مخالف ہیں وہ دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ وطنیت کا خیال جو یورپ میں جڑ پکڑ گیا ہے کائنات کے لئے سخت مضر ہے اس کے برخلاف حب انسان دراصل اعلیٰ معراج ترقی ہے۔ اگرچہ یورپ والوں نے بھی اس کو اپنا معیار ترقی اور اصول زندگی قرار دیا ہے لیکن وہ اس پر صحیح طور پر عمل پیرا نہیں ہے اور نہ بحالت موجودہ ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف اسلام میں حب انسانی کا جو تخیل پیش کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ مکمل اور پختہ ہونے کے علاوہ اس قابل ہے کہ اس پر آسانی سے عمل کیا جا سکے۔

اقبال نے یہ خیال کس لئے قائم کیا اور اس قسم کا پیغام کیوں پہونچایا اس پر ایک نظر ڈالنا اردو کے پیغام گو شاعروں کے پیغاموں کے مقابل مطالعہ کا ایک لازمی عنصر ہے۔

(۸)

اگر ہم اقبال کی شاعری کا ان کی زندگی کی روشنی میں مطالعہ کریں تو ہماری یہ منزل بہت جلد طے ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگی کے لحاظ سے ان کی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

پہلا دور ولایت جانے سے قبل کا ہے۔ اس وقت وہ داغ کی شاگردی میں حسن و عشق کے مضامین باندھتے تھے اور حالی کی تقلید میں مسلمانوں کے باہمی مناقشات اور دیگر خرابیوں کا ذکر کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ہندوؤں کے اثر سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر اس کا نغمہ گایا۔ اس وقت وہ اس بات کے خواہشمند تھے کہ مناظر قدرت سے ہم کلام ہوں لیکن مو خر الذکر ان کی طرف مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ وہ اسرار فطرت سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن غزل گوئی کے میدان میں گامزن ہونے اور عشق مجازی کی بھول بھلیوں میں پھنسے رہنے کے باعث انہیں ناکامی ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب کہ وہ ولایت میں تھے وہاں وہ اپنے ماحول کی سیاسی اور معاشرتی حالتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سوسائٹی کے اجزا پر غور کرنے کے بعد انہیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یورپ کے تمدن کا انجام ٹھیک نہیں۔ وہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے جھگڑے سے زبردست سبق حاصل کرتے ہیں انہیں ان جھگڑوں اور جمہوریت وغیرہ کے خیال کی تہ میں استبدادہی استبداد نظر آتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں وطن پرستی کا جذبہ شدت سے موجزن ہے۔ ایک قوم دوسری سے بڑھنا اور اس کو اپنے سے حقیر کرنا چاہتی ہے۔ ان تمام امور کے مدنظر وہ یورپ کے تمدن سے بیزار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی بنیاد متزلزل ہے اور آخر کار وہ خود ہی اپنی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اس لئے وہ حب انسانی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں۔ اقبال کے اس خیال یا پیشین گوئی کے مطابق یورپ میں بہت جلد جنگ چھڑ جاتی ہے۔

اگرچہ یورپ میں حب انسانی کا میلان پیدا ہو چکا تھا۔ فرانس کے انقلاب نے اخوت، مساوات اور آزادی تینوں چیزوں کی طرف رغبت پیدا کرائی تھی مگر عمل پیشہ اس کے برخلاف ہوتا رہا۔ یہ دیکھ کر اقبال کا خیال اسلام کے اتحاد و اخوت و مساوات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انہیں اسلام میں یہ چیزیں مکمل حالت میں نظر آتی ہیں اس لئے اب وہ تہیہ کر لیتے ہیں کہ انہی تین چیزوں کو دنیا کے آگے مکمل حالت میں پیش کریں۔

اقبال کی شاعری کے اس دور میں وطنیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کو وہ انسان کے لئے مضر

سمجھنے لگتے ہیں ان کے تخیل میں چونکہ انسانوں کی باہمی محبت کے خیال موجزن ہونے لگتے ہیں اس لئے اب انہیں کائنات کی ہر چیز بات کرتی نظر آتی ہے اور محبت کا سبق سکھاتی ہے۔

دور اول میں تلاش پائی جاتی ہے اور دوسرے دور میں آیندہ کے لئے کوئی جولانگہ عمل اور مطمع نظر تیار کرنے کی کوشش۔

تیسرے دور میں ایک خاص کارزار عمل کا خاکہ تیار کر کے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس دور میں اقبال کا خیال قران شریف کی اس آیت کی طرف جاتا ہے کہ

انا عرضنا الامانت علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جھولا۔

اور وہ اس کی تشریح و توضیح کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جو پیغام دیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے اور دنیا کے امام۔ نیز یہ کہ خدا نے مسلمانوں کو تمام دنیا کی قوموں میں سے منتخب کیا اور بلند مرتبہ بنایا۔

ان خیالات تک پہونچنے کے بعد اقبال اس امر پر غور کرنا شروع کرتے ہیں کہ دنیا کا امام بنانے کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو کن کن چیزوں کی طرف متوجہ کیا؟ اور اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے چند چیزوں کو مطمع نظر قرار دیں مثلاً

اتحاد ملی:۔ اقبال یہ سبق دیتے ہیں کہ قوم انفرادی حالت میں نہ رہے بلکہ ہر شخص قوم کی خاطر اپنی زندگی کا بڑا حصہ قربان کر دے۔ کیونکہ ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ قطرہ دریا میں ہے اور بیرون دریا کچھ نہیں

راز زندگی:۔ مسلمانوں کو زندہ رہنا چاہئے یہ اقبال کی شاعری کا ایک موضوعی عنصر بن گیا ہے "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" ان دونوں نظموں میں انھوں نے اس امر کے متعلق بہتر سے بہتر شہ پارے پیش کئے ہیں۔ بعض نمونے یہ ہیں: ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ۔۔۔ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ۔۔۔ سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ ۔۔۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں،
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں،
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم، — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را؟ طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

---

(۹)

اقبال نے جس موضوع کو اپنی شاعری کا پیغام قرار دیا ہے وہ نہایت خشک تھا، اس کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لیئے اقبال نے مستقبل کی تابناک جھلکیں دکھانی شروع کیں اور نہایت یقین کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ مجھے آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے وہ پھر اپنی پرانی عظمت حاصل کرنے والے ہیں اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح ہمت دلائی کہ

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کی بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت کی نوا کوئی

یہ رجائی پہلو ہے۔ اسلام کا حقیقی پہلو بھی دراصل رجائی ہے۔ اس کا کوئی عنصر قنوطیت آمیز نہیں۔ لا تقنطو من رحمت اللہ۔ قرآن شریف میں جہاں جہاں خدا کے غضب سے ڈرایا گیا ہے رجائیت بھی ہر جگہ جھلکتی نظر آتی ہے۔ اقبال کی آخری نظمیں اسی رجائیت سے معمور ہیں وہ مستقبل کی امیدوں کی وجنو شکن صدائیں بلند کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد ۔۔۔ بہار آمد نگار آمد نگار آمد بہار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا ۔۔۔ صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد
سرت گردم توہم قانون پیشیں سازدہ ساقی ۔۔۔ کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش ۔۔۔ پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور ۔۔۔ تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
اگر شاخ خلیل از خون ما نمناک میگردد ۔۔۔ ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم ۔۔۔ کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

حالی نے جس قسم کا پیغام پیش کیا اور اکبر نے اس کا جس بنا پر رد عمل کیا اور اسکے مخالف ایک نیا پیغام سنایا یہ تمام چیزیں اقبال کے کلام میں ایک مکمل حیثیت کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہیں۔ حالی اور اکبر دونوں انتہائی تھے اقبال نے اگرچہ اعتدالی ہونے کا ثبوت بھی نہیں دیا لیکن ایک ایسا پیغام سنایا جس سے ان کی قوم ان کے پیش روؤں کے پیغاموں سے زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کی وجہ اس پیغام کی صرف نوعیت ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پیش کرنے کا طریقہ بھی تھا۔

حالی کے طریقہ بیان میں قنوطیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر بار خاطر ہو جایا کرتا تھا۔ اکبر اپنی خوش مذاقی سے اس قدر ہنسا دیا کرتے تھے کہ ان کے سننے والے ان کے کلام کے سنجیدہ پہلو پر غور کرنا بھول جاتے تھے۔ اس کے برخلاف اقبال اسقدر رجائیت آمیز صدائیں بلند کرتے ہیں کہ ان کے سننے کے لئے

جوق در جوق اہلِ ذوق جمع ہونے لگتے ہیں اور ان کے کلام کو مقدس جان کر اس کا سننا، پڑھنا اور دُہرانا ضروری سمجھتے ہیں یہ وہ زبردست کامیابی ہے جو اب تک اُردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی!!

(۱۰)

اقبالؔ کے پیغام نے مسلمانوں کو جگانے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اس کے متعلق گفتگو کرنا ہمارے موجودہ موضوع میں داخل نہیں یہاں اسی امر کا اظہار ضروری ہے کہ ان کی شاعری نے اُردو کے اسلوب شاعری کو بہت متاثر کیا۔ آجکل کے نوجوان شاعر اپنی شعر گوئی کی ابتدا اقبالؔ کی شاعری کی تقلید سے کرتے ہیں اور اگرچہ اس وقت تک متعدد شاعر مزاج اس طرز میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں لیکن شاید ہی کوئی ہو جو اس سعی میں کامیاب کہلایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ شاعروں کے مدنظر کوئی بھی بحالت موجودہ پیغام گو شاعر نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض شاعر اپنی طبیعت کی فطری افتاد کے مطابق خاص خاص رنگوں میں اور خاص خاص موضوعوں پر اپنی سخنوری کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ چیز تو غدر سے پہلے بھی اردو شاعری میں موجود تھی۔ ہم نے "غالب کی ذہنیت" کے مضمون کے پہلے حصّہ میں اس امر پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اُس مضمون کو اسی کے مدنظر لکھا ہے۔ موجودہ مضمون میں ہم اردو کی پیغامی شاعری سے بحث کر رہے ہیں اور جس طرح ہمیں غدر سے پہلے پیغامی شاعری مفقود نظر آتی ہے، اقبالؔ کے بعد بھی اس کی موجودگی کے کوئی بڑے آثار دکھائی نہیں دیتے تاہم اس مضمون کے ختم کرنے سے قبل ہم اُردو کے ان دو قسم کے شاعروں کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہیں جن کے متعلق بعض ارباب ذوق کا خیال ہے کہ وہ آیندہ پیغام گو شاعر بن جائیں گے۔ اور دوسرے وہ جو اپنے اشعار کے ذریعہ اس امر کے مدعی ہیں کہ ان کا کہنے والا ایک پیغام گو ہستی ہے۔

اول الذکر طبقہ میں جوشؔ ملیح آبادی اور عظمت اللہ خاں دہلوی کے نام قابل ذکر ہیں اور موخر الذکر میں سلیم پانی پتی اور ہاشمی فرید آبادی کی ہستیاں۔

جوشؔ کی سحر پرستی ان کے کلام میں اکثر نمودار رہتی ہے۔ نمودِ صبح کی دل آویزیاں ان کے سمندِ جذبات پر تازیانہ کا کام کر جاتی ہے اس وقت تک انکا کلام کسی خاص پیغام کا حامل نہیں ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ زمانہ انہیں کسی پیغام گوئی کی طرف متوجہ کر دے۔ کم از کم ان کے بعض احباب کو تو اس پر یقین ہے کہ وہ ایک پیغام گو شاعر ثابت ہو رہیں گے۔

عظمت اللہ خاں اگرچہ خود کو شاعر بھی نہیں سمجھتے لیکن ان کی شاعری یقیناً ایک انقلاب کُن شاعری نظر آتی ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری کی عام طرز روش ـــــ یعنی فارسی شاعری کی تقلید ـــــ کا ردعمل کیا اور ہندی شاعری کی طرف توجہ کی۔ ایک حقیقی ہندوستانی کے صحیح جذبات و خیالات کے ادا کرنے کا بہترین اور موزوں پیرایہ وہی ہے جو ہندی شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ فارسی شاعری ایک غیر ملک کی چیز ہے اور اُردو میں اس کی بغیر تقلید کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے تاہم یہ مضحکہ خیز بات اُردو کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے عظمت نے اپنی شاعری کو اُردو کے ایک فطری سرچشمے سے سیراب کرنا چاہا۔ انہوں نے نہ صرف ہندی الفاظ اور ہندی بحریں اختیار کیں بلکہ ہندی شاعری کے بعض موضوعی عناصر بھی اپنی شاعری کے ذریعہ اُردو میں منتقل کر دیئے۔ چونکہ ہندی شاعری کی رو سے جذبات کی ترجمانی کرنے والی ہستی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی ہوتی ہے اس لئے اُنہوں نے بھی اپنی شاعری میں عورت ہی کی زبان سے بڑی دلچسپ اور دل خراش صدائیں سُنائی ہیں۔ اگر عظمت ایک حقیقی شاعر نہ بھی ہوں (جیسا کہ خود ان کا خیال ہے) تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی شاعری سے اردو ادب بے حد متاثر ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ وہ ایک عہد آفریں شاعر ثابت ہو جائے۔

پروفیسر سلیم نے شاعر کی حیثیت سے کبھی شہرت نہیں پائی لیکن وہ اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کی مشق کرتے چلے آ رہے ہیں اُن کی شاعری جوش و جذبہ اور الفاظ کی رنگ آمیزیوں سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ انہیں اُردو دنیا میں اب تک ایک پیغام گو شاعر کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی لیکن اُمید ہے کہ انکی شاعری کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دے جائے گی۔

مولانا سلیم کے مخاطب زیادہ تر نوجوان رہتے ہیں۔ اور اگرچہ مولانا اُردو کے دور ماضی کو ایک آخری یادگار ہیں لیکن ان کی طبیعت اس قدر نوجوان ہے کہ ان کا کلام ایک ایسے نوجوان کا کلام معلوم ہوتا ہے جسکے دل میں ترقی کی اُمنگیں طوفان بپا کر رہی ہوں اور جس کا دماغ ولولہ انگیز خیالات سے نمونہ محشر بنا ہوا ہو۔

مولوی ہاشمی فریدآبادی مولانا سلیم کی طرح نہ تو ایک پرگو شاعر ہیں اور نہ کسی خاص طبقہ سے مخاطب رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر اور بہت دیر میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی مولانا سلیم کی طرح چمنستان نثر میں تفریح کرتے کرتے کچھ ہی عرصہ قبل سے گلگشت نظم کے لئے قدم بڑھانے شروع کئے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جوش و جذبہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے قیام علی گڑھ کے

زمانہ میں اپنی شاعری کے ذریعہ اسی طرح شورش بپا کر دی تھی جس طرح محمود اسرائیلی کی نظموں نے خلافت کی کشمکش کے زمانہ میں مبئی میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا —— یہ چیز اُن عناصر میں سے ہے جو کسی شخص کو پیغام گو شاعروں کے سلسلہ میں شریک کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ہاشمی کی شاعری پر اول اول فارسیت کا —— اور خصوصاً غالب کی طرز کی مارسیت کا —— رنگ زیادہ غالب تھا اب انکی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کی جدید نظمیں ہندیت سے زیادہ متاثر ہیں۔ یہ نہایت مبارک تبدیلی ہے!

ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت سوز و گداز ہے جو پروفیسر سلیم کے کلام میں جوش و جذبہ کے اندر دب جاتی ہے۔ اس کے باعث ہاشمی کے بعض اشعار انہیں ایک اعلیٰ شاعر ثابت کرتے ہیں۔ اگر انکی نظموں کے وہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے جن کے تصوف اور فلسفہ کو عام سخن فہم نہیں سمجھ سکتے اور جن کے سمجھنے کے لئے بقول مولوی عبدالحق "ایک خاص ذوق کی ضرورت ہے" تو ہمیں ان کے ان اشعار کی خوبیوں سے درگذر نہیں کرنا چاہئے جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں اور جن کو سمجھ لینے کے بعد ہم اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۱۱)

اردو کے پیغام گو شاعروں کے سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی غیر ضروری نہیں کہ اورنگ آباد میں جہاں مولوی عبدالحق کے باعث کبھی کبھی اُردو کی "گرمئ بزم" پیدا ہو جایا کرتی ہے چند اور شاعر انہی کی زیر تربیت پیغام گوئی کے لئے تیار ہوتے نظر آتے ہیں جن میں سے ایک غلام طیب صاحب ہیں اور دوسرے ہمارے دوست دہاج الدین صاحب۔

غلام طیب صاحب نے اقبال کی طرز میں بڑے بڑے پیغام سنانے شروع کر دیئے ہیں لیکن ان کے دل میں ابھی وطنیت ہی کے جذبات موجزن ہیں جو اقبال کی شاعری کے پہلے دور کی ایک ضمنی خصوصیت ہے۔

طیب کی شاعری پر عظمت کی عہد آفرینی کا بھی اثر پڑا ہے۔ وہ اپنے موضوعوں کے لحاظ سے اقبال کے اور اسلوب کے لحاظ سے عظمت کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ان دونوں چیزوں سے مرکب ہو کر ان کی ادبی پیداوار اردو کی پیغامی شاعری میں اضافہ کا باعث بن سکے۔

مولوی دہاج الدین خاص طور پر اقبال کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان کی شعری کوششیں

اُن نوجوانوں کی کوششوں سے بہتر ہیں جو اقبال کی پیروی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

ان چند شعرا کے علاوہ جب ہم اردو کے دوسرے شاعروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بعض شاعروں مثلاً امین حزیں، حفیظ جالندہری، محمود اسرائیلی، تلوک چند محروم، مرزا ہادی رسوا، شوکت علی خاں فانی، اقبال علی سہیل، اصغر گونڈوی، ریاض، عزیز، صفی اور اثر لکھنوی، حسرت موہانی، افسر میرٹھی، آزاد انصاری، کیفی چریا کوٹی، ضامن کنتوری، نظم طباطبائی، امجد اور ذہین حیدر آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ موضوع کے لحاظ سے ان میں سے ایک بھی فی الحال ایسا نہیں نظر آتا جس پر تفصیل سے بحث کی جائے اگرچہ سب کسی نہ کسی طرح سے ادبیات اردو کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اپنی اپنی خصوصیات شاعری کے باعث اس قابل ہیں کہ ان پر نہایت طویل مقالے لکھے جائیں۔

بہت ممکن ہے کہ انہی میں سے بعض کا ذکر آئندہ کسی وقت اس موضوع کے تحت بھی کیا جا سکے جس پر اس وقت ہم نے ناظرین کی معیت میں ایک سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

انجامِ ہستی

(طبعزاد استاد نامی مولانا تجمل چشتی قادری)

ہر مرغِ روح صیدِ دامِ ہستی — گرفتارِ غم و آلامِ ہستی
ازل میں جب ملا پیغامِ ہستی — نہ سمجھے آہ ہم انجامِ ہستی
رہا تا عمر اسیرِ حسرت و یاس — کجا میں اور کجا آرامِ ہستی
نہ صبحِ آرزو ہو صبحِ محشر — نظر آئے سوادِ شامِ ہستی
سراپا موردِ الزام ٹھہرے — ملا آخر یہی انعامِ ہستی
نظر ہوتی جو اپنی نیستی پر — نہ لاتا کوئی لب پر نامِ ہستی
ہوا اعضا شکن ثابت بالآخر — خمارِ بادۂ گلفامِ ہستی

تغافل کیشی و رندی کہاں تک — نہ رہ ناداں مستِ جامِ ہستی
تپاں ہیں بر سرِ خاکِ مذلت — قتیلِ تیغِ صمصامِ ہستی
صدائے عبرت افزائی جہاں ہے — فغانِ مردمِ ناکامِ ہستی
شریکِ پختہ مغزانِ ازل ہو — نہ رہ محوِ خیالِ خامِ ہستی
سنبھل اے مرغِ دل اُگڑی ہوئی ہے — فضائے باغِ صبح و شامِ ہستی
ہوئے رسوا نہ بدنامِ خلائق — بہت اچھے رہے گمنامِ ہستی
دلیل پستیِ ہمت ہے غافل — تمنائے عروجِ بامِ ہستی

تجمل بعد مدت ہم یہ سمجھے — تھی اپنی نیستی انجامِ ہستی

نفسیات اسباب آرایش

(ازجناب سید عابد علی صاحب عابدؔ بی - اے ال - ال - بی)

امارت کی ساخت اور طرز تعمیر میں نہیں - تو گھر کی اندرونی آرائش میں انگریزوں کو اولیت کا رتبہ حاصل ہے۔
لوی نژاد لوگوں کا مذاق تناسب الوان ورنگ کے علاوہ نہایت خام کار ہے - فرانس کے لوگ اسباب
یش سے متعلق ایک شاداب اور نفیس زاویہ نگاہ رکھتے ہیں - یا کم از کم ان کے مذاق میں سلیم عناصر نمایاں
تے ہیں لیکن ان کی فطری خوش مزاجی جس کے باعث انہیں اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ باہر صرف
ا پڑتا ہے - اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اندرونی آرایش کی طرف توجہ کریں مشرقی اقوام کا
ل آرایش ذوق سلیم سے مملو ہوتا ہے - لیکن آوارہ -

اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے آرایش کا اہتمام نہیں کرسکے اور ڈچ شاید یہ تو سمجھتے نہیں - کہ
ے دریاں نہیں ہوتے اور دریوں وبستروں میں کچھ فرق ہے امریکوی ذوق آرایش ناقابل برداشت
ے اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں نسلی اعتبار سے کوئی امارت نہیں ہوتی - اسلئے نتیجۃً انہوں نے
پنے لئے ناگزیر طور پر ایک دو امارت زرتیار کرلی ہے جہاں شخصی حکومت ہے وہاں امارت کے
ظاہر خدام کے شان وشکوہ کی صورت اختیار کرتے ہیں امریکہ والوں کے ہاں دولت کی نمائش امارت
ے عظیم ترین مظہروں میں سے ہے اسی تغیر اصول کے ماتحت لازمی طور پر امریکہ والے اپنے ذوق سلیم
دولت کی نمایش میں مدغم کردیتے ہیں -

مثال کے طور پر انگلستان میں قیمتی اشیا رکی نمائش اس تاثر کو تخلیق کرنے کے لئے ناکافی ہوگی
ہ وہ جمیل ہیں اس نمایش سے یہ بھی لازمی طور پر نہ ثابت ہوسکے گا کہ نمایش کا بانی صاحب ذوق ہے
س کا باعث یہ ہے کہ انگلستان میں دولت امارت نسلی کا ثبوت نہیں دوسرے یہ کہ وہاں کے نشینی
مزاجوں کا خون آخر ش ابتذال سے پاک ہے اپنے آپ کو ذوق سلیم کے محدود دائرہ میں مقید رکھتے
ہیں اور بے معنی نمایش زر سے احتراز کرتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ عوام میں بھی صاحب ذوق پیدا ہوگئے
ہیں - ازبسکہ امریکہ میں دولت ریاست کا معیار اولین ہے اس لئے اس کی نمایش امارت نسلی کا واحد

متمیز عنصر سمجھی جاتی ہے اور عوام الناس امرا کے تتبع میں ذوقِ سلیم سے عاری ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید جمال اور شوکت ہم معنی الفاظ ہیں حقیقت یہ ہے کہ امریکوی اعتبارات سے کسی شے کی صلاحیت آرائش، کا اندازہ اس کی قیمت کی کمی اور بیشی سے لگایا جاتا ہے۔

اسی معیار کے تقرر کے بعد لغزشوں کی تخلیق ضروری تھی لیکن ان تمام لغزشوں کا معدن وہ سرچشمہ ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک صناع کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ایک ایسا امریکوی مکان ہے جو امریکوی زاویہ نگاہ سے سجایا گیا ہو فقدانِ تناسب اس کا سب سے نمایاں عیب ہوتا ہے فقدانِ تناسب سے وہی شے مراد ہے جو کسی تصویر میں فقدانِ تناسب کہلاتی ہے۔ کیونکہ تصویر اور مکان دونوں چیزوں کے لئے ایسے مسلم الثبوت قوانین منضبط کر دیے گئے ہیں جو صنعت کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔

جس معیار سے ہم کسی تصویر کے محاسنِ اعلیٰ کو جانچتے ہیں اسی معیار فرنیچر کی ترتیب کو جانچنا چاہئے۔

فقدانِ تناسب بعض اوقات اسباب آرائش کے انواع کے متعلق ہوتا ہے لیکن اکثر اسکا ثبوت الوان و اشکال کے ذریعہ بہم پہنچتا ہے آنکھیں اسباب آرائش کی غیر شاعرانہ ترتیب سے دکنے لگتی ہیں متوازی اور سیدھے خطوط کی کثرت تنوع کا فقدان موجود ہوتا ہے یا اگر کہیں کوئی تنوع ہوتا ہے تو متوازی خطوط زاویہ قائم پر کاٹ دیئے جاتے ہیں اور اگر خم دار خطوط موجود بھی ہوتے ہیں تو ان کا تسلسل ایک ہی نوع کا ہوتا ہے۔ دوسرے اسباب آرائش کے اعتبار سے بعض اوقات پردوں کا انتخاب بہت لغو ہوتا ہے رسمی اسباب آرائش کے ساتھ پردے بالکل غیر ضروری ہیں اور پردوں کی کثرت ہمیشہ ذوقِ سلیم کی منافی ہوتی ہے۔ پردوں کے انتخاب کا معیار وہ مجموعی تاثر ہے جو دیکھنے والے کے ذہن میں پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

تیچھلے دنوں سے دریوں کا انتخاب کچھ صحیح ہونے لگا ہے لیکن ابھی دریوں کے نقوش اور رنگ غلط انتخاب کئے جاتے ہیں یہی حال غالیچوں کا ہے۔ غالیچہ کمرے کی روح ہے۔ غالیچے کے رنگوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باقی اسباب آرائش تشکیلیں کیا ہونی چاہئیں اور انہیں کس ترتیب سے سجانا چاہئے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کمرے کا فرش بڑا ہو تو غالیچے کے نقوش کے دائرے بڑے ہونے چاہئیں اور اگر چھوٹا ہو تو چھوٹے۔ غالیچے کی بنائی نہایت حسین ہونی چاہئے امریکہ میں اکثر صرف اس طرح کی اشکال پسند کی جاتی ہیں جن کے پھول

معمولی پھولوں میں سے ہلوں اور جن کے الوان بالکل بے معنی ہوں۔ معمولی اشیاء کی تصاویر غالیچوں پر لغویت مذاق کا سب سے زیادہ ثبوت ہے۔

بھڑک امریکوی فلسفۂ آرائش میں بدترین عنصر ہے یہ اس غیر فطری مذاق کا نتیجہ ہے جو دوست کی نمائش نے پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ کے لوگ گیس کی روشنی کو بہت پسند کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ گھر کے اندر گیس کی روشنی کا داخلہ قانوناً منع ہونا چاہیے اس کی کرخت اور غیر متناسب روشنی احساس سلیم کو مجروح کرتی ہے جو شخص دماغ بھی رکھتا ہے اور آنکھیں بھی وہ اسے کبھی نہیں برتے گا لطیف روشنی جسے صناع ٹھنڈے نور سے تعبیر کرتے ہیں اپنے گداز سایوں کی معیت میں کمرے کی زینت کو چار چاند لگا دے گی۔ معمولی لمپ بلور کے ملفوف کے ساتھ اسقدر حسین معلوم ہوتا ہے جس کا جواب نہیں "نصف ملفوف" فیشن کی تخلیق ہے اور جو لوگ اسے اندھا دھند برتتے ہیں وہ یا تو ذوق سلیم کے اصولی احساسات سے بے خبر ہیں یا فیشن کی اندھا دھند تقلید کے عادی بلوری ملفوف میں سے روشنی چاندنی کی طرح چھن چھن کر برستی ہے "نصف ملفوف" کی روشنی غیر متناسب اور ناگوار ہوتی ہے اسباب آرائش کی اقتصادی زینت اسی روشنی سے تباہ ہو جاتی ہے۔

بلور کے معاملے میں امریکوی ذوق کا ابتذال بالکل نمایاں ہو جاتا ہے یہ لوگ چمک پر مرتے ہیں اور صرف اسے ایک نقطۂ ابتذال کے ایسے وسیع معانی مضمر ہیں جن کی تفسیر تحصیل حاصل ہے۔ ٹمٹماتی ہوئی متحرک شعاعیں کبھی کبھی خوش گوار معلوم ہوتی ہیں۔ مجانین و حمقاء ان سے ہمیشہ حظ اٹھاتے ہیں لیکن کمرے کے اسباب آرائش میں انہیں ہرگز کوئی دخل نہ ہونا چاہیے۔ چمک کے شوق نے امریکہ والوں کو اس بات پر بھی مجبور کیا ہے کہ وہ شیشوں کی جا و بے جا نمائش کریں۔ یہ لوگ دیواروں کو باوقار بلند شیشوں سے پر کر دیتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہفت خواں رستم کا میدان مار لیا جو اشخاص ارتقا یافتہ آنکھیں رکھتے ہیں وہ بیک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیشوں کی کثرت اسقدر بری معلوم ہوتی ہے۔ عکس سے قطع نظر شیشہ آنکھوں کے سامنے ایک بے رنگ صاف مسلسل غیر متنوع سطح پیش کرتا ہے۔ عکس کے اعتبار سے شیشہ ایک مہیب اور نفرت انگیز تسلسل کا خالق ہے حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کمرے میں چار یا پانچ شیشے لگا دیے جاتے ہیں اور انکے تناسب و تدوین کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تو بہ اعتبار صنعت اس کمرے کی کوئی شکل نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ جب ان شیشوں کی چمک کا خیال کیا جائے جسے تابش اندر تابش کہنا بجا ہوگا تو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ بہ ہیئت مجموعی ذہن پر ایک مہیب اور غیر منظم اثر مرتب ہوتا ہے۔

ہر شخص واحد ایسے کمرے میں داخل کے بعد فوراً ہی احساس کرے گا کہ اسباب آرائش میں کوئی بولتا ہوا نقص رہ گیا ہے ہر چند وہ یہ نہ بتا سکے گا کہ نقص کیا ہے۔

کبھی کبھی امریکہ میں اسباب آرائش وجدانی طریقہ سے سجایا جاتا ہے۔ لیکن دولتمند حضرات کے ہاں ذوق سلیم کا شائبہ تک بھی نہیں۔

ہندوستان نفاست ذوق اور قدامت تمدن کے اعتبار سے زبان زد خلایق ہے لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نئی تہذیب کے عناصر کی آمیزش سے ہمارے اسباب آرائش کی سجاوٹ اس طریق سے کیجاتی ہے کہ وہ تمام سکون ریز کیفیت مٹ جاتی ہے جو ہندوستانی تخیل آرائش سے وابستہ تھی۔ اُجلی اُجلی چاندنیاں گاؤ تکئے اور مختلف اشیائے زینت کی ایک شاعرانہ سی بے ترتیبی ذہن پر سکون کا ایک ناقابل بیان اثر مرتب کرتی تھی۔ موجودہ مخلوط طریق آرائش آرام دہ ضرور ہے لیکن اس مشرقی نفاست سے عاری ہے جو ہماری رگوں میں رچی ہوئی تھی۔ اور جس کا امتیازی عنصر سکون و اطمینان تھا تکلفات کی ماہیت پر غور کرو اگر یہ مشرقی ذہنیت کے سکون و اطمینان ضامن نہیں تو اور کیا ہیں۔

گجرات کی ایک قدیم عربی تاریخ

(از جناب سید محمد صاحب قادری - بی - اے متعلم ایم - اے)

انگلستان کے مشہور مستشرق سر اڈورڈ ڈینی سن راس کی ساعی جمیلہ سے گجرات کی ایک نایاب اور قدیم عربی تاریخ کا اصل مسودہ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ سے برآمد ہوا اور انہی کی اَن تھک کوشش سے حواشی اور دیگر ضروری اشاروں کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا ہے۔ مستشرق موصوف نے اپنی ایک تقریر کے سلسلہ میں اس کے متعلق نہایت مفید و کارآمد معلومات کا اظہار فرمایا تھا۔ ذیل کا مضمون زیادہ تر انہی کی پیش کردہ معلومات کا حامل ہے۔

اس کتاب کی دریافت کا حال بھی عجیب دلچسپ ہے۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں جس کو ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا تھا، اس کتاب کا اصل مسودہ نہایت ردی اور لاعلمی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس مدرسہ کی صدارت پر یوں تو بہت سے یوروپین فائز رہے لیکن ان میں سے دو شخص خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر اسپرنگر جس نے سیرۃ النبی صلعم جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھا کر بہت شہرت حاصل کی اور دوسرا بلاک من جس نے اپنی تحقیقات سے تاریخ ہند کے اسلامی دور کے متعلق بہت سی قدیم کتابوں کی تصحیح کر کے اُن کو مرتب و شائع کیا ہے۔ یہ دونوں اپنے وقت کے مشہور مستشرق تھے اور خصوصاً ڈاکٹر اسپرنگر نے تو بہت سی قدیم کتابیں دریافت کی ہیں اور بڑی محنت و تلاش سے ان کے مصنفین وغیرہ کے حالات و واقعات بہم پہنچائے ہیں۔ تقریباً یہی حال بلاک من کا بھی تھا۔ آئین اکبری وغیرہ وغیرہ جیسی مستند و معتبر تاریخی کتابیں اس کی ساعی سے دست برد زمانہ سے بچ گئیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ کتاب ان کی نظروں سے نہیں گزری ہوگی کیونکہ مدرسہ مذکور کے تمام نسخے ان دونوں نے ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے مگر تعجب ہے کہ اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی اور یہ اُسی طرح لاعلمی و گمنامی میں پڑی رہی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں سر اڈورڈ ڈینی سن راس ہندوستان آئے اور مدرسہ عالیہ کے کتب خانہ کا معائنہ کیا۔ پہلے ہی ان کی نظر اس نسخہ پر پڑی۔ سرسری طور پر دیکھ کر آپ نے اس کی اشاعت ضروری پائی اور فی الفور لارڈ کرزن سے جو اس وقت ہندوستان کا ویسرائے تھا، حکومت کے مصارف سے اس کے

شائع کرانکی درخواست کی - لارڈ کرزن نے بھی جو خود تاریخ ہند و آثار قدیمہ کا دلدادہ تھا، حکومت کی طرف سے اس کی اشاعت منظور کرلی۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں میں سلسلہ دستاویزات (Indian Records Series) کے نام سے ایک سلسلہ اشاعت قائم ہوا تھا۔ اس کتاب کو بھی اس سلسلہ میں شامل کردیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس کی پہلی جلد طبع ہوئی اور دوسری جلد بھی ۱۹۲۱ء میں شائع ہوگئی۔ غالباً اس سال اس کی تیسری جلد بھی زیور طبع سے آراستہ ہوجائے گی۔

اس کتاب کا بھی ایک نسخہ اب تک پایا گیا ہے اور باوجود سعی بلیغ کے کوئی اور نسخہ جزواً یا کلاً نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مصنف کا مسودہ تھا جو رفتار زمانہ سے گجرات سے نکل کر کلکتہ پہنچ گیا۔ اس کتاب کا نام "ظفرالوالہ" ہے۔ اور ساری کتاب میں صرف دو مرتبہ اس کا اعادہ ہوا ہے۔ اس کے دو حصے یا دفتر ہیں۔ پہلے دفتر میں جو تقریباً پوری کتاب کے تین چوتھائی حصہ پر مشتمل ہے، گجرات کے مسلمان بادشاہوں کی جو ۱۳۹۶ء سے ۱۵۷۲ء تک حکمران رہے۔ مفصل و مستند تاریخ ہے۔ دوران کتاب میں اتفاقیہ طور پر مختلف موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے اور جنوبی عرب، جون پور، دکن اور منڈو کی ریاستوں کا حال بھی مندرج ہے۔ اور بعض مشاہیر کے طویل حالات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کے چند ابتدائی اوراق جن میں پہلے دو بادشاہ مظفر اور احمد کا حال تھا، لاپتہ ہیں۔ یہ امر اس وجہ سے اور زیادہ قابل افسوس ہے کہ خصوصاً ان دو بادشاہوں کے متعلق دوسرے مورخین کے بیانات متضاد اور مجمل ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ دوسرے دفتر میں ہندوستان کے مختلف اقطاع کی اسلامی ریاستوں کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ حصہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ دفتر اول کے بیانات کی طرح اس کے اقوال چشم دید اور زیادہ مستند نہیں ہوسکتے۔ تاہم اس میں بعض ایسے اضافی واقعات اور قدیم ترین کتابوں کے اقتباسات ہیں جو اس وقت بالکل لاپتہ ہیں اور جن سے موجودہ تاریخیں ساکت ہیں۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں اس سے بہتر ہندوستان کے اسلامی دور کی کوئی مختصر تاریخ موجود نہیں۔

صوبہ گجرات جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں سندھ اور راجپوتانہ ہے، مشرق میں دکن اور مغرب و جنوب میں بحیرہ عرب پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے مشہور شہر احمدآباد بڑوچ، بڑودہ، سورت اور ڈیو ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کے قبل تک اس سرزمین پر مختلف ہندو راجہ حکمران رہے جن سے اس وقت ہم کو کوئی سروکار نہیں۔ سب سے پہلے سلطان شہاب الدین غوری نے اپنی فتوحات

ہند کے سلسلہ میں گجرات کے ہندو راجہ سے بھی جنگ کی تھی اور اس کو خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر یہ فتح کچھ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئی۔ سلطان شہاب الدین کے ہٹتے ہی راجہ پھر خود مختار اور آزاد ہو گیا۔ ۱۲۹۶ء ۱۲۹۷ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے پہلی مرتبہ اس صوبہ کو فتح کیا۔ اس وقت سے لے کر ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں کے قابض ہونے تک یہ صوبہ اسلامی حکومت کے تحت رہا۔ اس طرح یہاں مسلمانوں کی حکومت کوئی ساڑھے چار سو سال تک قائم رہی۔ اس مدت کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تیرھویں صدی عیسوی۔ قدیم شاہان دہلی کی حکومت۔

۲۔ چودھویں صدی سے سولھویں صدی کے اختتام تک کوئی پونے دو سو سال۔ احمد آباد کے مقامی بادشاہوں کی حکومت۔

۳۔ دو سو سال تک۔ سلاطین مغلیہ کا اقتدار۔

سلطان علاء الدین خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی ۱۲۹۷ء میں اپنے وزیر ملک نصرت اور ایک جرنیل الغ خاں نامی کو فتح گجرات کے لئے روانہ کیا۔ الغ خاں نے نہایت آسانی سے فتح حاصل کر لی اور اپنی طرف سے ایک شخص کو عامل مقرر کیا اور خود آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے سارے گجرات کا صدر صوبہ دار ہو گیا۔ چند سال بعد اس کی جگہ عین الملک نامی ایک امیر کے سپرد کی گئی اور اس کو دہلی واپس بلا لیا گیا۔ عین الملک کا جانشین قطب الدین مبارک شاہ ہوا۔ یہ بادشاہ وقت کا خسر بھی تھا۔ صوبہ داری پر فائز ہوتے ہی اسکو ظفر خاں کا خطاب دیا گیا اور اسی نے (جو غالباً سنہ ۱۳۹۱ء میں صوبہ دار ہوا تھا) گجرات کی خود مختار اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ظفر خاں نے کس وقت علی الاعلان اپنی خود مختاری کا اظہار کیا۔ غالباً اس نے سنہ ۱۳۹۶ء میں شاہان دہلی کی اطاعت سے انحراف کیا ہے۔

ظفر خاں ایک راجپوت نو مسلم تھا اور اس کا دور حکومت ہر وقت معرض خطر میں رہا۔ نہ تو اس وقت گجرات کی سرحدیں محفوظ تھیں اور نہ خود گجرات کے اندر امراء اور مقتدر باشندوں میں اس کی اطاعت کا خیال پوری طرح جاگزین تھا۔ چند سال بیم و امید میں خود مختارانہ حکومت کر کے آخر کار ظفر خاں ۱۴۱۱ء میں فوت ہوا اور اس کا پوتا احمد اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ احمد ہی دراصل بانی حکومت کا مستحق ہے۔ اس نے اپنے حسن تدبیر اور زبردست سیاسی قوت کے ذریعہ تمام خطروں کا اندفاع کیا اور ہر طرح سلطنت کو محفوظ و مصئون کر کے اپنے جانشینوں کے حوالہ کیا۔ اسی نے شہر احمد آباد کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کو ہر طرح سے آراستہ کر کے اپنا پایہ تخت قرار دیا تھا۔

اس خاندان کے جملہ چودہ بادشاہ گزرے ہیں۔ ان میں سے صرف دو خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا محمود شاہ بیگڑا جس نے ۱۴۵۸ء سے ۱۵۱۱ء تک حکومت کی اور جوناگڑھ اور چمپانیر کے مضبوط قلعے حاصل کئے اور ساحل کی حفاظت کے لئے بحری فوج بنائی۔ دوسرا بادشاہ بہادر شاہ ہے۔ اس نے مالوہ فتح کر کے اسکو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور ڈیو نامی بستی پرتگالیوں کے حوالے کی جو اب تک انہی کے قبضہ میں ہے۔ بہادر شاہ انہی کے ہاتھوں ۱۵۳۶ء میں مارا گیا۔ بہادر شاہ کے بعد تین اور بادشاہ ہوئے لیکن یہ طاقتور امرا کے ہاتھوں میں بالکل کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ جو امیر اپنے اقران و امثال میں زیادہ طاقتور ہوتا وہ بادشاہ پر مسلط ہو جاتا اور جس طرح چاہتا اس کے نام سے راج دہائی کرتا۔ آخری بادشاہ مظفر شاہ ثالث ہے جس نے ۱۵۶۱ء میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ اسکے دور حکومت میں اکبر نے ۱۵۷۳ء میں گجرات پر حملہ کیا اور سارا علاقہ ختم کرلیا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس خاندان کا پہلا بادشاہ راجپوت نسل سے تھا اور یہاں کے اکثر امرا بھی نو مسلم تھے جنکو اپنے نئے مذہب سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ وہ برائے نام مسلمان تھے اور ہندوؤں کی صحبت میں ہندو رسم و رواج کے پابند تھے۔ مگر ان کے علاوہ بہت سے امرا اور سرداران لشکر خالص اسلامی ممالک کے باشندے تھے اور فوج کا اکثر و بیشتر حصہ بھی ولایتی سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ ایک معاصر مورخ کا بیان ہے کہ ۱۵۱۱ء میں محمود بیگڑا کی وفات کے وقت شاہان گجرات کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی مگر ۱۵۷۲ء میں اکبر کے حملہ کے وقت گھٹ گھٹا کر صرف بارہ ہزار رکھی تھی اور یہ بھی تمامتر بیرونی ممالک کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ (۷۰۰) حبشی (۳۰۰) ترک، (۴۰۰) بلخی، (۶۰۰) غوری، (۵۰۰) مغل (۵۰۰) بخاری سادات (۴۰۰۰) افغانی اور متفرق (۵۰۰۰) سپاہی تھے۔ اس اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ گجرات میں ولایتی سپاہیوں نے گھر کرلیا تھا اور انہی مختلف اقوام کے سرداروں میں سے جو شخص زیادہ طاقتور ہو وہ بادشاہ پر حاوی ہو جاتا تھا۔ اسی اسلامی خانوادہ کی مفصل اور صحیح تاریخ پیش نظر کتاب میں بیان ہوئی ہے۔

اس تاریخ کا مصنف حاجی دبیر کے نام سے مشہور ہیں۔ خود اس نے اپنے حالات شرح و بسط کے ساتھ مگر بالکل بے ترتیب اسی کتاب میں بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام عبداللہ محمد ابن سراج الدین عمر الہندادلی تھا۔ وہ ۱۵۴۰ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۵۵۵ء تک وہیں رہ کر تعلیم و تربیت پائی۔ اسکا باپ سولہویں صدی کے اوائل میں بمقام پٹن پیدا ہوا تھا اور اس کا تعلق کسی ایرانی الاصل خاندان سے ہے۔ اس کے آبا و اجداد ایران کے باشندے تھے اور مغلوں کے حملہ ایران کے وقت جو نادر گردی شروع

ہوئی اس سے پریشان خاطر ہوکران لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور سندھ کے شہر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔ مغلوں نے ایران کو لوٹ کر بس نہ کیا بلکہ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی میں قتل وغارت کا بازار گرم کردیا۔ اس آشوب و پریشانی میں مصنف کا جد اعلیٰ جو اس وقت ملتان میں مقیم تھا معہ اپنے اہل وعیال کے گجرات کی طرف بھاگا اور قصبہ پٹن میں جاکر دم لیا۔ اسوقت گجرات کے تخت حکومت پر ظفر خاں بانی خاندان جلوہ افروز تھا۔

سلطان مظفر شاہ ثانی کے عہد حکومت میں ایک نووارد امیر نے معہ اپنے اہل وعیال کے پٹن میں آکر سکونت اختیار کی۔ اس امیر کے لڑکے سے جو آگے چل کر آصف خاں کے خطاب سے مفتخر اور تاریخ گجرات میں ممتاز ہوا، حاجی دبیر کے والد سراج الدین کی دوستی ہوگئی جو مدت العمر دونوں نے نباہ دی۔ ۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ والی گجرات اور ہمایوں کے تعلقات بالکل کشیدہ ہوگئے اور دونوں میں جنگ چھڑ جانے کے آثار نظر آنے لگے بہادر شاہ نے اس خیال سے کہ فتح و شکست تو نصیبوں سے ہوتی ہے، مصلحت اس میں دیکھی کہ فی الفور اپنے حرم اور خزانہ کو آصف خاں کے ہمراہ مکہ معظمہ بھیجدے۔ آصف خاں نے چلتے ہوئے اپنے خاندان کے ساتھ اپنے دوست سراج الدین اور اس کے اہل وعیال کو بھی لے لیا اور سب مل کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں خیر وخوبی سے پہنچکر بہادر شاہ کی زندگی تک امن چین سے رہے۔ بہادر شاہ کی وفات کے دوسرے سال ہی خسرو پاشا والی مصر و حجاز و یمن کے حکم سے اس کا حرم وخزانہ ضبط کرلیا گیا۔

۱۵۴۲ء میں بادشاہ وقت نے آصف خاں کو گجرات بلالیا اور آصف خاں نے چلتے ہوئے باقی خزانہ اور حرم کی نگرانی سراج الدین کے حوالے کی جس نے کچی کچی دولت کا بہت بڑا حصہ دے دلا کر بہادر شاہ کے حرم کے لئے اطمینان حاصل کیا۔ بہادر شاہ کے جانشین سب کے سب کمزور اور برائے نام بادشاہ تھے۔ کسی مطلب آشنا اور سنگدل امیر نے موقع پاکر ۱۵۵۳ء میں بادشاہ، اس کی بیوی اور اس کے خیر خواہ مشیر آصف خاں تینوں کو تہ تیغ کرڈالا۔ اس حادثہ کے ۱۰ سال بعد سراج الدین اپنے لڑکے عبداللہ محمدؐ (مصنف تاریخ ہذا) کو لے کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اسوقت عبداللہ محمدؐ کی عمر (۱۶) سال تھی۔ ہندوستان میں دوبارہ آکر سراج الدین نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔

عبداللہ محمدؐ نے ابتدا ً ۱۵۵۸ء میں ایک امیر محمد الغ خاں کی ملازمت کی اور اپنے آقا کے نام پر اپنا لقب الغ خاں رکھا۔ خود اس نے اپنے ملازم ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز سرشام وہ

الغ خاں کے دربار میں حاضر تھا۔ اور خان کے آگے ایک کتاب، سادہ کاغذ اور قلمدان رکھا ہوا تھا۔ وزیر خیرات خاں نے اس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ کیا تم لکھ پڑھ سکتے ہو۔ اس نے سمجھا کہ شاید کتاب سے کچھ نقل کروانا چاہتا ہے صورت نویسی کردونگا اس لئے کہدیا ہاں۔ یہ سنکر وزیر نے چنگیز خاں نامی ایک امیر کے نام خط تحریر کرنے کا حکم دیا۔ وہ فارسی خط وکتابت سے عاری تھا اس لئے اس مشکل سے نجات پانے کی فکر کرنے لگا۔ مغرب کا وقت قریب تھا قلم بنانا شروع کیا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی اور خان اور اس کا وزیر نماز کے لئے اٹھ کر چلے گئے۔ یہ موقع غنیمت جان کر وہ بھی وہاں سے چلتا بنا۔ تھوڑی دور جا کر خیال کیا اگر گھر چلا جاتا ہوں تو مغرب کا وقت گزر جاتا ہے۔ نماز پڑھ لینی چاہئے۔ یہ سوچ کر وہیں قریب میں نماز پڑھنے لگا۔ خان نماز سے فارغ ہو کر آیا تو اس کو غائب پایا۔ حکم دیا کہ حاجی دبیر کو پکڑ لاؤ۔ ملازموں نے کشاں کشاں لاکر عبداللہ محمدؐ کو خان کے آگے حاضر کیا۔ اب مجبوراً اس کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ خط لکھدینا پڑا۔ اسکے بعد چند روز تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ خان نے پھر یاد کیا اور اس کے حکم سے دوبارہ اسکو دبیری کی خدمت انجام دینی پڑی۔ اس عرصہ میں وہ دو تین امیروں کی ملازمت کرتا رہا۔ آخر کار اپنے قدیم آقا کی عنایات کا گرویدہ ہوکر پھر اس کی ملازمت اختیار کرلی۔

۱۵۷۲ء میں اکبر احمد آباد میں داخل ہوا اور الغ خاں نے اکبر کی اطاعت قبول کرلی۔ اور حاجی دبیر کو بھی اکبر کے روبرو پیش کردیا۔ اکبر نے اس کو اپنے اماکن مکہ معظمہ کا نگرانکار بنا کر مکہ معظمہ روانہ کیا۔ اسطرح اس نے سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے ۱۵۷۲ء میں دوبارہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ ۱۵۷۶ء تک الغ خاں متوسل رہا اس کے بعد بیس سال ایک اور امیر سیف الملک کی ملازمت کی۔ آخر کار ۱۵۹۵ء میں تیسرے امیر فولاد خاں کی نوکری اختیار کی اور اس کے انتقال (۱۶۰۵ء) تک اسی کا متوسل رہا۔ یہانتک اس کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ انکے بعد اس کے کیا مشاغل رہے اور اس نے کیسی زندگی بسر کی کچھ معلوم نہیں۔ تاریخ ہذا میں اس نے اپنی ایک اور تالیف کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ یہ اس کے آقا الغ خاں کی سوانحعمری ہے اور اسکا نام "فواتح الاقبال وفواد الانتقال" بتایا ہے۔ اس کا ہنوز کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اغلب ہے کہ اس میں اس نے اپنے حالات زیادہ تفصیل سے لکھے ہوں گے۔

اس نے اپنے فرصت کے اوقات میں یہ تاریخ لکھنا شروع کی تھی۔ اگرچہ اس میں کوئی واقعہ ۱۶۰۵ء کے بعد کا قلمبند نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶۱۱ء تک اس کتاب کی نظر ثانی اور اضافے کرتا رہا کیونکہ جابجا اس نے

جالینوس

(از جناب احمد عارف صاحب حیدر آباد)

یہ عجیب بات ہے جالینوس[1] کو یونانی حکما میں شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ یونانی نہیں کیونکہ تمام مورخین خواہ وہ انگریز ہوں یا عرب، اس امر پر متفق ہیں کہ اس کی جائے پیدائش ایشیائے کوچک ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کے آبا و اجداد اصلاً یونانی تھے، لیکن اہل یونانی کے علمی، سیاسی، اور تمدنی انحطاط کے زمانہ میں جبکہ رومیوں کی ترقی کا عہد شباب تھا، وہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر پرگاش[2] میں آ کر آباد ہو گئے تھے، اسی سرزمین کو اس یگانۂ روزگار حکیم کے وطن ہونے کی عزت حاصل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ، اسی خاندانی انتساب پر وہ یونانی مشہور ہوا ہوگا ورنہ حقیقت میں ایسا سمجھنا ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کرنا ہے۔ بہرحال ۱۳۰ء میں جب یہ پیدا ہوا تو اس کا باپ نیکن فضل و کمال میں شہرۂ آفاق رکھتا تھا۔ یعنی ہندسہ و ریاضی اور مساحت میں متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق، ہیئت میں کافی دستگاہ حاصل تھی ایسے باپ کا بیٹا جسکی ذات میں قدرت نے ابتدا ہی سے غیر معمولی قابلیتیں ودیعت کر دی تھیں بہترین تعلیم و تربیت سے کیوں محروم رہتا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی نیکن نے اس کو علوم ریاضیہ کی تعلیم دینی شروع کی جس کا وہ خود امام وقت تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جالینوس بہت ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کو اپنا روزانہ سبق ایک ہی مرتبہ کے پڑھ لینے سے حفظ ہو جاتا تھا۔ اس کے وہ ہم سبق طلبہ جن میں کچھ سنورنے کے لچھن اور ہونہاری کی نشانیاں پائی جاتی تھیں، اپنی ان تھک محنت سے اس کو زک دینے کی کوششیں کیا کرتے۔ لیکن ناکامی ہمیشہ ان کی قسمت میں لکھی تھی۔ اسی زائد از ضرورت ذہانت نے نیکن کو اسکی تعلیم و تربیت کی طرف بہت زیادہ متوجہ کر دیا۔ وہ خود تعلیم دینے کے علاوہ شہر کے علما، اور ماہر اساتذہ کی خدمت میں اس کو بھیجا کرتا، غرض باپ کی تعلیم و تربیت، فضلائے عصر کا فیض صحبت اور خود اس کی خدا داد ذہانت نے اسکی عمر کے پندرہویں برس

---

[1] انگریزی میں اسے گیلن Galen یا گیلی نس Galenus لکھتے ہیں ۱۲

[2] اس کا جدید نام سمرنا ہے اور اہل عرب کے ہاں اس کا قدیم معرب نام فرغاموس ہے۔ ۱۲

ہی میں اُسے تمام علوم ریاضیہ کا استاد بنا دیا۔

اس کے بعد نیکن نے اپنے لایق بیٹے کو فلسفہ کی تعلیم دلانی شروع کی۔ فلسفہ کی تحصیل میں دو ہی برس گذرے تھے کہ یکایک نیکن نے اسے علم طب کی تحصیل کے لئے مجبور کر دیا[۵]۔ گو ابتدا میں اسے اس فن سے کچھ دلچسپی نہ ہوئی۔ لیکن جوں جوں اس میں بصیرت پیدا ہوتی گئی، ویسے ہی اس کے خیالات میں بھی ایک نمایاں انقلاب ہوتا گیا۔ ریعان شباب ہی میں دنیوی لذتوں اور حرص و ہوس کو انسان کا قاتل جان کر اُن کو چھوڑنے کے علاوہ سب سے بڑا تغیر جو اس کے خیالات میں ہوا وہ ساری کائنات میں انسان کا ذلیل اور بے حقیقت ہونا ہے۔ سنہ ۱۴۹ء میں جبکہ اس کی عمر اکیس سال کی تھی، جالینوس اپنے نوجوان احباب کی ایک پر تکلف دعوت میوہ خوری میں شریک ہوا تو اصول صحت کے برخلاف مجبوراً خوب میوے کھا گیا۔ اس کا اثر اس پہ پڑا کہ کچھ عرصہ کے بعد سخت بیمار ہو گیا۔ اور ابھی پوری طرح تندرست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک اور صدمہ روح فرسا سے سابقہ پڑا یعنی اس کے باپ کا سایہ عاطفت اس کے سر سے اٹھ گیا۔ ذہنی انقلاب نے پہلے ہی سے جب اس کو نفس کش کے اور مرتاض بنا یا تو اس کی جان ناتوان بہ مشکل اس بوجھ کی حامل تھی۔ اب اس مصیبت نے اور بھی قیامت ڈھا دی۔ تحصیل علم سے الگ فکر معیشت بھی دامنگیر ہوئی اور اسی سبب سے اسکی صحت دن بدن خراب ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال کے عرصہ تک مختلف بیماریوں کا شکار ہوتا رہا۔ لیکن یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ تحصیل علم کی راہ میں گو مصائب کا ایک بڑا پہاڑ حائل تھا مگر اس کی ہمت بلند نے کبھی پستی کا منہ نہ دیکھا۔ اور برابر اسی دوران پریشانی میں اپنے مقصد کے پیچھے دوڑتا رہا۔ بارے خدا خدا کر کے اٹھائیس برس کی عمر میں جب علم طب سے فراغت پائی تو اس کی مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

جالینوس دو برس تک برابر اپنے وطن ہی میں پیشہ طبابت کو فروغ دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سنہ ۱۶۰ء میں روم کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں روم ترقی تہذیب اور فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا، اطراف عالم سے اہل علم و کمال کھنچے کھنچے اس شہر میں چلے آتے تھے۔ زوال پذیر خطۂ یونان کے تمام کاملان فن ایک ایک کر کے اسی علم آباد کی زینت ہو چکے تھے۔ اگر جالینوس جیسا فرد فرید اس سرزمین کو اپنے کمالات کا جولانگاہ

---

[۵] دفعتاً انقلاب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نیکن نے خواب میں اپنے بیٹے کو بحیثیت طبیب کے مراتب جلیلہ حاصل کرتے دیکھا تھا۔

نہ سمجھتا تو کیا کرتا۔ غرض جب یہ رومتہ الکبریٰ میں وارد ہوا ہے تو اورسے لیوس انطونی نوس سریر آرائے حکومت تھا۔ چونکہ پہلے ہی سے اسی نوجوان حکیم کا آوازہ کمال بلند ہو چکا تھا اس لئے اہل روم نے تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد جالینوس نے مسلسل کئی دن تک عام جلسوں میں علم تشریح پر تقریریں کیں اس کی غیر معمولی قوت تقریر، فصاحت و بلاغت اور علم تشریح، کے انوکھے انداز تشریح نے عام طور پر وہ قبولیت حاصل کی کہ تمام رومیوں نے بالاتفاق اس کو "معجز بیاں[۵۱]" کا خطاب دیا۔

ایک مرتبہ اکابر روم اور حاذق اطبائے یونان اس کی تقریر سننے کے لئے کسی جلسہ میں فروکش تھے تقریر کرتے کرتے اس نے کچھ پرندوں کو طلب کیا اور کسی کی مختلف رگیں کاٹ دیں اور کسی کا پیٹ چاک کر کے اندرونی آلائش کو تتر بتر کر دیا۔ پھر اطبائے حاضر سے خطاب کر کے ایک ادعائی رنگ میں کہنے لگا "وہ کون ایسا طبیب ہے جو ان کٹی ہوئی رگوں اور اس بے ترتیب آلائش کو اپنی اصلی حالت میں مرتب کر سکتا ہے؟" جب کسی نے بھی اس صلا پر لبیک نہ کہا تو خود اسی نے ان پرندوں کو کچھ اس طرح ٹھیک کر دیا جیسے وہ پہلے ہی سے صحیح و سالم تھے۔ اسی واقعہ کا لوگوں پر اور خاص کر عہدہ داروں پر بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ ایک عہدہ دار نے کسی فوجی دواخانہ کی مہتممی پیش کی۔ جالینوس نے اسے بہ طیب خاطر قبول کیا اور اس خوش اسلوبی سے مفوضہ خدمت کو انجام دینے لگا کہ سینکڑوں مایوس مریض شفا پانے لگے۔ اس حسن کارگزاری نے چند ہی دنوں میں اسے صدر فوجی دواخانہ کا مہتمم بنا دیا۔ علیٰ ہذا القیاس یہاں بھی اس نے اپنی کارروائی کا اسقدر سکہ بٹھایا کہ روم سے شام تک اسی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ حسن قبول اور شہرت عام خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، تعجب تھا اگر یہ اُسے شہنشاہ وقت کے دربار میں نہ پہنچا دیتی۔ چنانچہ اس اعزاز سے مفتخر ہونے کے بعد، آپ دیکھیں گے کہ وہ شہزادگان والاتبار کا معالج خاص مقرر ہوا ہے اور یہ وہ خدمت ہے جس کی آرزو میں نامور اور حاذق اطبا اپنی عمریں صرف کرتے تھے۔

شاہی قرب، گو جاہ پسندوں کے نزدیک کتنا ہی بام منزلت پر پہنچانے والا کیوں نہ ہو۔ لیکن ایک اس حکیم کے لئے جس نے دنیا کی ایسی دل بھانے والی چیزوں پر ایک عرصہ تک غور کر کے انہیں بے حقیقت

---

[۵۱] رومی زبان کا اصلی لفظ " Paradoxologus " ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ "Wonder-Monger" ہے۔

سمجھا ہو، کیا حیثیت رکھتا تھا؛ طوعاً و کرہاً وہ کچھ دنوں تک تو اس خدمت کو انجام دیتا رہا، اور خود اسی کے الفاظ میں یہ مدت گویا اس کی آزاد طبیعت کے لئے قید سخت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد بڑی دشواریوں کے ساتھ واپس وطن کی اجازت چاہ کر یہاں سے چل کھڑا ہوا۔ وطن مالوف کی خدمت کا شوق اور طلب علم کا ذوق عرصہ سے دل میں کھول رہا تھا، اب ان کو پورا کرنے کا سامان ہاتھ آیا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دو مشہور باکمال روم میں قیام پذیر تھے۔ ایک پیلاپ نامی شخص تھا جو فن طب میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے البنیس، جو علم فلسفہ کا عالم مانا جاتا تھا۔ دراصل انہی کا ملان فن سے مستفید ہونے کی خاطر جالینوس نے روم کا سفر اختیار کیا تھا۔ لیکن اس کی ہردلعزیزی اور اعزاز شاہی نے اسے اس امر کا موقع ہی نہ دیا۔ اب جو ان علایق سے فرصت ملی تو کچھ عرصہ کے لئے ان بزرگوں کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا[۵۱]۔ اسی طرح رتیھز، اسکندریہ اور مصر میں باکمالوں کی خبر پاکر ان سے خوشہ چینی کی اور کچھ عرصہ کے بعد وطن چلا گیا۔

جالینوس نے اب ارادہ کرلیا کہ مدت العمر اہل ملک کی خدمت اور حصول کمال میں بسر کردونگا۔ انسان کے ارادے تو بہت کچھ ہوا کرتے ہیں لیکن ہر وقت ان کی تکمیل قدرت کے نزدیک کچھ بھی ضروری نہیں اور انسان کی زندگی میں انہیں فسخ عزائم کی وجہ سے جو زبردست تغیرات ہو جاتے ہیں ان کی ذمہ دار صرف یہی قدرت نیرنگ نواز ہے۔ بیچارہ وطن میں آکر ستانے بھی نہ پایا تھا کہ دفعتاً قیصر روم کا فرمان قضا شیم اس کی طلبی میں آپہنچا۔ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن، اب حاضر دربار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دربار میں حاضر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ملک میں ۱۶۷ء میں وبا شروع ہوگئی جالینوس کو اس خصوص میں بہت کچھ سرگرمیاں دکھانی پڑیں۔ اس کے بعد جب قیصر روم کشورکشائی کے نشہ میں جھومتا ہوا شہر روم سے نکلا تو حکم ہوا کہ جالینوس میدان جنگ میں صدر طبیب کی خدمت انجام دے۔ لیکن جالینوس نے اپنی کسی منت کا بہانہ کرکے جو روم کے مندر میں خاص انہیں دنوں میں پوری کی جانی تھی اجازت چاہی۔ قیصر روم نے اپنے واپس آنے تک شہزادہ کاموڈس[۵۲] کے معالج رہنے کی شرط پر اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ قیصر روم کی واپسی پر وہ پھر اپنے وطن روانہ ہوا۔ طلب علم و کمال کے

---

۵۱ بعض مورخین کا قول یہ بھی ہے کہ جالینوس نے شہر روم میں وارد ہوتے ہی پیلاپ (Pelaps) اور البینس (Albinus) سے استفادہ کیا ہے۔

۵۲ (Commodus)

شوق نے اس کو وطن میں بھی نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ یہاں سے اسکی تقریباً عمر سیر و سفر ہی میں بسر ہوگئی۔ اس مدت میں اس نے بیسوں مشہور اہل کمال سے اکتساب فن کیا۔ بالآخر حالت سیاحت ہی میں یہ مشہور علم و کمال جبکہ وہ جزیرہ سائپرس میں مقیم تھا، ۲۰۰ء یا ستر برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

بڑے لوگوں کی موت حقیقت میں موت نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑائی کیا ہے؟ انسان کا کمالات اور پاکیزہ صفات سے متصف ہونا ہی چیز ہے جو اسکو عزت و شہرت کے پر لگا کر اڑاتی اور بقائے دوام کے دربار میں لا بٹھاتی ہے۔ ایسے ہی باکمال بزرگوں کے نقوش قدم ہوتے ہیں جو شمع ہدایت بنکر ہوئے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ آج دنیا اٹھارہ سو برس آگے نکل آئی ہے۔ لیکن جالینوس کی بزرگی اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ آج بھی عوام اس سے اسیطرح مستفید ہو رہے ہیں جسطرح پہلے اس کے ضیائے کمال سے روشن دماغ بن گئے تھے۔

اگر جالینوس کو یونانی حکما میں شریک کیا جائے (جیسا کہ ہوتا آیا ہے) تو اس کا نمبران مشہور و معروف حکما میں بحیثیت زمانہ گو سب سے آخر ہے لیکن بہ اعتبار صاحب کمال ہونے کے وہ اُن سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ بلکہ علم و فضل اور اپنے فن میں مجتہدانہ نظر رکھنے کی بنا پر وہ ان میں سے اکثروں سے بڑھا چڑھا خیال کیا جاتا ہے۔ زمانہ حال میں طب جدید کی روز افزوں ترقی نے یونانی طب کا بازار ایک عرصہ سے سرد کر رکھا ہے۔ اور ان دونوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہی ہے کہ یونانی طب میں زیادہ ظن و قیاس ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے طب جدید بغیر تجربہ کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا لیکن جالینوس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ فن طب میں تمام عمر اس کا مسلک جزئیات تک میں تجربات پر مبنی رہا۔ اس کا قول تھا کہ طب میں میری ہر ایک رائے گویا ایک تجربہ ہے۔ علم تشریح (اناٹمی) میں جو معلومات اسکو حاصل تھے اور غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اس نے جس طرح اس علم کو مدون کیا ہے وہ تمام حکمائے یونان میں اسی کا اور صرف اسی کا حصہ ہے۔

جالینوس کو جو شہرت اور مقبولیت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرا اور سلاطین کی اسکو مجبوراً درباداریاں کرنی پڑتی تھیں لیکن ایسی پابندیاں اسکو آزاد طبیعت پر بڑی شاق گزرتی تھیں۔ وہ ہر وقت ان کی صحبت سے پہلو بچانے کی نفرت کو ساتھ کوششیں کیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے بہت کچھ تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بادشاہوں نے بزور حکومت اس کو اپنا پابند بنانا چاہا اور اس نے فرار ہو کر مدت مدید تک شہر شہر کی خاک چھانی ہے۔ اس کا طرز زندگی حکیمانہ اصول پر مبنی تھا۔ کثرت سے مطالعہ کتب کیا کرتا تھا۔ سوتا اور کھاتا تو بہت کم لیکن بولتا بہت زیادہ تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور پاکی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا دو چیزیں دل سے مرغوب تھیں، خوشبو اور موسیقی۔ موسیقی میں خود کو بھی کچھ دخل تھا اس لئے عموماً الاپتا رہتا تھا۔ سیر و تفریح کا بہت شائق تھا۔ اور مناظر قدرت کی

دل فریبیوں سے بیحد حظ حاصل کرتا تھا۔ خوش مزاجی، خندہ پیشانی اور خلق و مروت کی مجسم تصویر تھا۔

جالینوس ایک ہمہ گیر لیاقت کا انشاپرداز تسلیم کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصانیف خواہ وہ کسی فن میں ہوں قطعاً عالمانہ اور مجتہدانہ ہیں۔ اپنے وقت میں علم منطق کا وہ ایک منفرد عالم مانا جاتا تھا اور اس علم میں اس نے جو کچھ اضافے کئے ہیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور قدیم علم منطق کی تاریخ میں اس کا یہ کارنامہ وقیع ترین حیثیت رکھتا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے شاہی کتب خانہ میں اس کی بے شمار تصانیف محفوظ کرلی گئی تھیں لیکن افسوس کہ اس لاجواب کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور تمام علمی ذخیرہ خاک میں مل گیا۔ اس پر بھی اس نے اپنی تصانیف سینکڑوں کی تعداد میں یادگار چھوڑیں[51]۔ لیکن آج بہت ہی کم کتابوں کا وجود دنیا میں ہے۔ زیادہ تر اس کے تصانیف کا موضوع قواعد اخلاقیات اور منطق رہا ہے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو غلط طور پر اس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ بہرحال تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ صرف تراسی رسالے شائع شدہ کتابوں میں ایسے ہیں جنہیں یقین کے ساتھ جالینوس کی تصانیف کہا سکتا ہے۔

غزل

(از: شوکت تھانوی)

اگر دل میں خیالِ شکوۂ بیداد آتا ہے — تو اس کے ساتھ پیمانِ وفا بھی یاد آتا ہے

جہاں سے نہرِ شیریں آ رہی ہے باغِ خسرو میں — وہیں سے خون میں ڈوبا ہوا فرہاد آتا ہے

جہاں آغازِ فصلِ گل میں غنچے مسکراتے ہیں — وہیں اپنا دلِ مرحوم مجھکو یاد آتا ہے

وہیں کھینچے لئے جاتی ہے مجھکو آرزو میری — جہاں سے اک زمانہ با دلِ ناشاد آتا ہے

ہم اپنی تلخ انجامی کو یکسر بھول جاتے ہیں — جب آغازِ محبت کا زمانہ یاد آتا ہے

یہ نغمے خوب ہیں اے خوش نوایانِ چمن لیکن — اسی کے شوق میں سوئے چمن صیاد آتا ہے

بہت ہمدرد ہیں دنیا کے ساتھی بھی مگر شوکت — مصیبت کے زمانہ میں خدا ہی یاد آتا ہے

---

۵۱ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے کہ جالینوس کی کل تصانیف کی تعداد ۵۰۰ ہے۔ ۱۲

"دنیائے افسانہ" پر ایک سرسری نظر

(جناب محمد محسن خانصاحب متین حیدر آبادی)

"دنیائے افسانہ" ہمارے کرمفرما مولوی عبدالقادر سروری ایم۔اے کی مصنفہ ہے۔ جس کو موصوف نے ایم۔اے کی تعلیم کے زمانہ میں لکھا ہے۔ یہ کتاب اصول و مبادیات فسانہ نگاری پر اردو زبان میں سب سے پہلی ہے۔ اس کے شیوع سے عوام کے لئے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ وہ افسانوں کے محاسن و معائب سے آگاہ ہو جائیں گے۔ اور افسانوں کی غلط رفتار کے لئے ان کی آگاہی روک کا کام دیگی۔ اور رفتہ رفتہ افسانوں کا عام معیار بلند ہوتا جائیگا۔ نیز یہ امر ظاہر ہے کہ کسی افسانہ تراش کی تصنیف علمی طبقہ میں اس وقت تک قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جائے گی جب تک کہ اس نے افسانوں کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر قصہ نہ لکھا ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب کہ افسانے کے فن پر کوئی جامع کتاب موجود ہو۔ اگرچہ مغربی فاضلوں نے اولاً اس فن کی تدوین پر قلم اٹھایا اور ایک حد تک انکو اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ اردو میں اس کی بہت کمی تھی جو کچھ اس کے اجزا موجود تھے وہ "اجزائے پریشان" کی سی حالت میں تھے۔ اُن کو ایک جامع کتاب کی شکل میں پیش کرنا سروری جیسے ذی ہمت فاضل طیلسانی ہی کا کام ہے۔

اس وقت فاضل موصوف کی عمر ۲۴-۲۵ سال کے درمیان ہے۔ لیکن اُن کے زور قلم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق، انشا پرداز ہیں۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ موصوف نے جامعہ عثمانیہ سے "ماسٹر آف آرٹس" کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب اُن کے زمانہ تعلیم کی یادگار ہے۔ لیکن یہ ایک تخلیقی چیز ہونے کی حیثیت سے توقع کیجاتی ہے کہ دنیائے ادب میں ایک زبردست شاہکار کا رتبہ عظیم حاصل کرے گی۔ کتاب زیر تنقید (۲۰) ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں "حقیقت اور افسانہ" "افسانہ کا ارتقا" "اردو زبان اور افسانے" "ابتدائی دور کے افسانے" "فورٹ ولیم کالج کی کوشش" "اردو ناول" کے عنوانوں کے تحت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ اور فلسفیانہ بحث کی گئی ہے چنانچہ ہم ذیل میں ناظرین کی تفریح کے لئے کتاب ہذا سے چند سطریں نقل کرتے ہیں:-

"اپنے موضوع کو کامیاب بنانے کے لئے ایک فن کار کو بیشک عالم مثالی میں زندگی بسر کرنی

" چاہیے۔ تخیلہ ایک طلسمات ہے جس میں قدم رکھتے ہی ساری کائنات شگفتہ نظر آنے لگتی ہے"
" لیکن کبھی کبھی عالمِ حقیقی میں بھی اترآنا اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب تک فنکار کے پیراہن"
" تخیل میں حقائق دنیا دی سوزنِ عیسیٰ کی طرح اسے نہ رہیں بہت ممکن ہے کہ وہ عرشِ معلیٰ سے"
" بھی پرے اڑنے لگے حقایق پر نظر جمائے رکھنے سے ناول محض خیالی واقعات کا مجموعہ بنکر"
" نہیں رہجاتا بلکہ اس میں حقیقت شعری پیدا ہو جاتی ہے جن کا زبردست وکیل ارسطو ہے"

فاضل مصنف نے اس کتاب میں فنی ضرورت کے لحاظ سے جو نادر الفاظ کی تراش خراش اور اصطلاحات کی وضع وقطع میں جابجا اپنی اعلیٰ انشاء پردازی کا ثبوت پیش کیاہے وہ قابل تحسین ہے۔ چنانچہ کتاب ہذا سے ناظرین کی دلچسپی و معلومات کی غرض سے ذیل میں چند اصطلاحیں اور نادر ترکیبیں پیش کیجاتی ہیں

استہزا خیز۔ فنکار۔ تماشکار۔ فوق نطری افسانے۔ موعظانہ قصے۔ تخم کاری۔ وجود پذیر۔
رزمیہ نگاری۔ طربیہ ناول۔ حزنیہ ناول۔ تماشہ گھر۔ انقلاب کن رستخیز۔ غفلت ورزی۔
ساقط از اعتبار۔ بلا توسط غیرے۔ کثیف خاکہ۔ گندہ احساسات۔ حقایق ملہمانہ۔ انفرادانہ تشخص۔ موازنہ کن واقعات۔ کردار نگاری حقیقت شعاری۔ رجائیت۔ کردار کشی۔ خارجیت۔
ادب علمی ادب الہامی۔ نطری افسانے۔

اس کتاب میں خیالی افسانوں کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ چار عنوانات کے تحت ہے (۱) قصہ (۲) تمثیل (۳) حکایت (۴) رومانس۔ قارئین کرام کو تمثیل پر شتباہ ہوتا ہوگا۔ اس لئے کہ اہل ایران نے ڈراما کا ترجمہ تمثیل کیاہے لیکن یہاں تمثیل سے مراد ڈراما نہیں ہے۔ بلکہ افسانہ کی ایک قسم ہے۔ لایق مصنف نے اس کی توضیح بذریعہ امثلہ نہیں کی ہے۔ شاید اردو پبلک کوئی قصہ انکی نظر سے نہ گذرا ہوگا" عشق و محبت، حادثات اور مہمات کے رزمیہ قصے رومانس کہلاتے ہیں"" رومانس" کے لئے اردو میں داستان کا لفظ موجود تھا۔ لفظ "خرد لانیفک" متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ ہندی اور عربی الفاظ میں فارسی ترکیب مثلاً نقل وسوانگ۔ فارسی الفاظ میں عربی ترکیب مثلاً بالراست۔ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف صاحب اس کتاب کے آیندہ ایڈیشن کو۔ ع " نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول" کا مصداق بنائیں گے۔

ادبیات

تصوّرات

جب آدمی راحت کو بزم جہاں خاموش ہوتی ہے
حیات عالم ایجاد جب بیہوش ہوتی ہے

دل مہجور دُہراتا ہے افسانہ محبت کا
فلک پر بزم انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

میں جب دنیاؤ مافیہا سے غافل ہو کے سوتا ہوں
اور احساسات کی ہر قید سے آزاد ہوتا ہوں

جہاں خواب میں پھرتی ہے تصویر محبت کی
کلیجہ تھام کر اُٹھ بیٹھتا ہوں خوب روتا ہوں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

سحر کے جھٹپٹے میں عابد و معبود ملتے ہیں
بہت بے پردہ ہو کر ساجد و مسجود ملتے ہیں

مرا ذوق پرستش خواب سے بیدار ہوتا ہی
نیاز و ناز سے جب حامد و محمود ملتے ہیں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

مرے دلمیں سماجاتا ہی جب ذوق عبودیت
مری تن میں اُتر آتی ہے جب روح الوہیت

میں جب سجدہ گذار آستانِ عشق ہوتا ہوں
مجھے جب قید ہستی سی چھڑالیتی ہی محویت

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

گل و ریحاں کے پردوں سے کوئی ہوتا ہی جب ظاہر
عبودیت سے جب حمد و ثنا کرتا ہی ہر طائر

لب اظہار جو دل سے کیا کرتا ہے جب باتیں
فنا ہوتا ہے جب جذبات حسن و عشق میں شاعر

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

نظر آتا ہے سورج آسماں پر اہل عالم کو
شعاعیں جذب کر لیتی ہیں جب قطرات شبنم کو

مری فطرت میں ہو جاتی ہی جب اک تشنگی پیدا
مرا دامن چھپالیتا ہی میری چشم پر نم کو

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

دہن غنچہ کا جب میں دیکھ لیتا ہوں گلستاں میں اُتر آتی ہیں جب نرگس کی آنکھیں چشمِ حیراں میں،
مرے دلمیں تپش اُٹھتی ہے جب سوزِ محبت کی کھٹکتا ہے کوئی کانٹا سا جب میری رگِ جاں میں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

پپیہا "پی کہاں ہے" "پی کہاں ہے" کہہ کے روتا ہے کوئی کافر ادا بھونرا کلی کے دل میں سوتا ہے
تصور میں نظر آتی ہے اک دُنیا محبت کی گل و بلبل میں جب راز و نیازِ عشق ہوتا ہے

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بہم ہوتے ہیں جب حسن و محبت ایک محفل میں حقیقت کروٹیں لیتی ہے جب دُنیائے باطل میں
تہی آغوشیاں میری مجھے بیچین کرتی ہیں نئے ارمان ہو جاتے ہیں جب پیدا مری دل میں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

کیا کرتے ہیں قطرے جستجو میں جب سمندر کی فضا سے کشمکش ہوتی ہے جب ذرات خودسر کی
رگ و پے میں مری جب دم کی گردش سماتی ہے میں جب تسکین کرنا چاہتا ہوں قلبِ مضطر کی

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بساطِ آب و گل پر ہوتے ہیں جب رنگ و بو پیدا ہوا کرتی ہے جب گلہائے تر میں اک نمو پیدا
مری نظریں جب اُن سے اکتسابِ کیف کرتی ہیں مرے دلمیں ہوا کرتی ہے جب اک آرزو پیدا

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

قمر خورشید سے جب اکتسابِ نور کرتا ہے اور اس دُنیا کو اپنے نور سے معمور کرتا ہے
شعاعِ پر ضیا جب مجھکو مجھ سے چھین لیتی ہے مجھے جب خود فراموشی پہ دل مجبور کرتا ہے

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

اکبر حیدری

پہاڑی لڑکی

(از جناب محمد شفیع صاحب کاشف اکبرآبادی)

خدایانِ حسن و عشق میں اپنے خونی روزنامچہ کی گم شدگی سے سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے کہ یہ کون موشگاف ہے جو اہلِ لعن پر ہمارے پوشیدہ حالات کا انکشاف کر رہا ہے؟—

کیا ہم بتادیں کہ آج صحراے "ایک فیلڈ کی ایک "حورِ صحرا" مرقعی کی تصویر دوشیزگی اپنے خامہ رنگین طراز سے ادب و معانی کے دلاویز رنگ میں قرطاس زبان پر کھینچکر .... کی شگفتگی کو طشت از بام کرنے والا وہی کاشف (صاحب شوالہ) ہے جس نے عرصہ ایک سال کا ہوا انہی صفحات پر ارض ناشقی کی "فاتح الکافات" یا قبیلۂ آفذ کے ذی روح اور متحرک بت زارہ کے حسن کی شرح کرتے ہوئے ہرتاق کے رازِ عشق کو فاش کیا تھا؟!

کیوپڈ اپنے بے پناہ تیر سے جو کام لے رہا ہے کیا ظالم کاشف اپنے خوں چکاں قلم سے وہی کام نہیں لیتا؟

نوٹ:- چونکہ آیندہ کیوپڈ کے خفیہ کارناموں کا انکشاف زبان ہی کے ذریعہ ہوا کرے گا لہٰذا پہلو میں زخمی دل رکھنے والوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ ان صفحات کا ضرور مطالعہ کریں ممکن ہے کہ جراحت دل کے اندمال کی اسی سے کوئی صورت نکل آئے!!!— حالانکہ ترجمان عشاق کا تو یہ قول ہے کہ

جن زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ‖ لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

"ایڈیٹر"

(۱)

سائکی اپنی عشرت گاہِ زمردین میں نسیم کے لطیف ترین جھونکوں سے کھیل رہی تھی۔ نیم خوابی کی نیم مست ادائیں اس کی زہرہ آفرین انگڑائیوں کو بوسہ پرستش دے رہی تھیں۔ سائکی، ترمکا اور طائرد اُس کی نازک پیکر

سیلیاں اُس کے کفِ پا کے آئینوں کو غبارِ نگاہ سے صاف کر رہی تھیں۔ یکایک سانگی ایک موجِ محسوس کی طرح اُٹھی۔ اور کیوپڈ کی طرف جو اپنے تیر و کمان کو تکیہ بالش بنائے ہوئے سو رہا تھا دیکھ کر بولی۔ کیوپڈ اُٹھو میں تمہیں ایک کارِ عظیم کے انجام دینے کے لئے زمین پر بھیجنا چاہتی ہوں۔

کیوپڈ تیر و کمان ہاتھ میں لئے ہوئے اُٹھا۔ معصومیت نے اوس کی انکھڑیوں کو بوسے دیئے۔ وہ نہایت ادب آمیز لہجہ میں بولا۔ سانگی وہ کام کیا ہے میں تیار ہوں۔ سانگی نے بلوریں گردن اُٹھائی اور اپنی مخمور آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی "جاؤ تلاش کرو دنیا میں غیرت، رحم، اور محبت کا کہیں نشان باقی ہے یا نہیں۔ اچھی طرح تحقیق کرو اور مجھے آکر جواب دو۔

کیوپڈ نے کمان میں تیر جوڑا۔ اور کمانداروں کے اندازِ خرام کے ساتھ ایک طرف روانہ ہوگیا۔

(۲)

کسان اپنے جھونپڑے میں آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کی بیوی اور دو لڑکیاں ایک ہی میز پر سادہ کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔ سادگی اور جمود و سکون اُس کے تسلی خانہ کے گوشہ گوشہ سے جھلک رہا تھا۔ محنت کے بعد انتہائی واماندگی کی خاموش کیفیتیں ہر چہرہ پر برس رہی تھیں۔ اور کیوپڈ اپنی تلاش کی منزلیں طے کرتا ہوا اس جھونپڑے کے باہر چلا جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا اور اُسے محسوس ہوا کہ سکون کے نقوش غیر متحرک اس مکانِ سادہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے اُس نے ایک تیر اس کے دروازہ پر بھی پھینک ہی دیا۔ اور غائب ہوگیا۔

مرفی کسان کی سب سے بڑی اور سب سے حسین لڑکی نے ایک تنی انگڑائی لی۔ اُس کی آنکھوں سے کھونٹے آنسو نکلے اُس کا گداز سینہ کچھ زیادہ اُبھر گیا۔ وہ ایک نامعلوم جذبے سے متاثر ہو کر گھبرائی ہوئی سی اُٹھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک ٹوکری اُٹھائی، اور جھونپڑے سے باہر چلدی۔ اُس کی رفتار میں برقیت جسم میں لچک، اور آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی گھر سے دور نکل گئی اور پھولوں کے اُس کنج میں جا پہنچی جو اُس کے کھیتوں کے قریب دریا کے ساحل پر مہک رہا تھا۔ اُس نے بہت سے پھول جلد جلد توڑ لئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی گویا کہ اُسے کسی کا انتظار تھا۔ اُس کے دل میں کوئی ارادہ نہ تھا مگر وہ ایک ارادہ سے لبریز نظر آتی تھی۔

فیتھول، اُس کے باپ کا ایک کاشتکار دُور سے مسکراتا ہوا آیا۔ مرفی کو نئی شان خود نمائی میں دیکھکر

اس کا تبسم معنی خیز ہو گیا۔ وہ خلاف عادت آگے بڑھا چلا گیا اور اب مرفی بالکل اس کے پاس تھی۔ ہوائے ساحل سے بھیگے ہوئے جھونکے دونوں کے سادہ لباسوں کو آپس میں ہمکنار کر رہے تھے۔ مرفی کچھ دیر خاموش رہی پھر ایک پھول میتھول کو نذر کیا اور اس کے گلے میں بے اختیار باہیں ڈال دیں۔ میتھول چاہتا تھا کہ مرفی کے جذبات کی پذیرائی کے لئے اپنے ہاتھوں کو بھی جنبش دے، مگر مرفی اس سے فوراً جدا ہو گئی۔ اور اسی خرام بدمست کے ساتھ اسکی طرف تبسم نگاہوں سے دیکھتی ہوئی دور چلی گئی۔ میتھول سراسیگی کی بے خودی میں وہیں کھڑا رہا اور وہ نظروں سے غائب تھی۔

مرفی خدا جانے کیا چاہتی تھی، اس کی مستانہ کیفیتیں خدا معلوم اسے کہاں لے جا رہی تھیں وہ بڑھی چلی گئی، اور ایک ایسے مقام پر پہونچ گئی جہاں چشمے کے کنارے کنارے دور تک پہاڑ تھے۔ اور جو یہاں آکر مثلث کی صورت میں تقسیم ہو گئے تھے۔ پہاڑ کا ایک بلند مگر مختصر ٹکڑا چشمے کے گھوم پر وقار آشکار تھا اور اس کے چاروں طرف بلند اور تناور درخت کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یہاں پہونچ کر ٹھٹکی اس نے دیکھا کہ ایک جوان مصور کسی شاہکار کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اتنا مصروف کہ اسے مرفی کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔ مرفی اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے آگئی۔ تصویر پر ایک متحرک سایہ محسوس کر کے مصور نے نظر اٹھائی۔ مرفی نے سبد گل سے ایک گہرا سرخ پھول نکالا۔ اور مصور کو نذر کر دیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو" مرفی نے نہایت سادگی سے پوچھا۔ اور مصور نے بغیر توقف جواب دیا میں "بازگشت" کی تصویر اپنی مو قلم سے کھینچنا چاہتا ہوں۔

مرفی۔ بازگشت؟

مصور۔ ہاں اسے حور صحرا وہ بازگشت جس کے امکانِ تخلیق و وجود پر ہماری آسمانی کتاب نے پیشین گوئی کی ہے۔

مرفی۔ لیکن غیر مرئی اور خیالی تصویر کس طرح اتار سکو گے۔

مصور۔ میں کوشش کر رہا ہوں، اور میرا تصور کبھی کبھی میرے خیال کا ہیولہ قائم کر کے میرے نظروں کے سامنے بھی لے آتا ہے۔

مرفی۔ کیا اسے میں دیکھ سکتی ہوں۔

مصور۔ صرف کاغذ پر۔

مرفی۔ کیا وہ تمہاری طرح اس فضا میں نظر نہیں آسکتی۔

مصور۔ نہیں، اس لئے کہ تم مصور نہیں ہو۔ اور ہنوز اس کی تخلیق کا بھی یقین نہیں ہے

مرفی۔ اچھا یہ ایک پھول اور قبول کرو۔ اگر تم ایک فیلڈ میں میرے مکان پر کبھی آئے تو میں بھی تم سے اپنی تصویر کھچواؤں گی۔ کیا تم کبھی آؤ گے۔

مصور۔ تمہارا نام کیا ہے۔

مرفی۔ مجھے اینل مرفی کہتے ہیں۔ اچھا سلام!

مصور قلم در دست دیکھتا رہا اور مرفی اسی طرح لچکتی ہوئی اس کی نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

(۳)

چودھویں رات کا چاند سمندر میں طلائی قمقمے جلا رہا تھا۔ سکون انگیز موجیں کرنوں کی گود میں کھیل رہی تھیں، بھیگی ہوئی رات کی زلفیں تا کمر پہنچ چکی تھیں کہ سمندر کی پریاں چاندنی کی سیر کے لئے نکلیں، اور اپنے نورانی جسموں سے شمعیں بناتی ہوئی ساحل پر آبیٹھیں۔ موجیں ان کے پاؤں چومتی تھیں، اور چاند کی سنہری کرنیں ان سے ہم آغوش ہوئی جاتی تھیں۔ ان کے لمبے اور کالے بال کمر سے بہت نیچے تک بکھرے ہوئے تھے چاند سے زیادہ شفاف عریاں جسم کالے بالوں میں کچھ عجیب طلسم بنا رہے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا چند جوان نئی راتیں اپنے اپنے چاند لے کر سمندر کے کنارے جمع ہو گئی ہیں۔ گورے گورے جسموں سے چاندنی نکلی ہی پڑتی تھی۔ سمندر ان اجالوں سے ہمہ نور اور یکسر ہی میں بنا ہوا تھا۔ یہ سمندر کی کنواریاں آپس میں چھیڑیں کرتی ہوئی کبھی موجوں کے ساتھ سمندر میں چلی جاتی ہیں اور کبھی پھر ساحل پر آ جاتی تھیں۔ چاند، آسمان اور سمندر کے سوا ان نوری پیکروں کا دیکھنے والا کوئی اور نہ تھا۔ ہوا کبھی کبھی ان کے اچھوتے جسموں کو چھو کر گدگدا جاتی تھی، اور یہ ہوا کے ایک لطیف ترین لمس سے بے قرار ہو کر اس قدر ہنستی تھیں کہ موجوں کا پرسکون شور خاموش ہو جاتا تھا۔ چاند کی کرنیں جب ان کے ہمہ نور جسموں کو ہم آغوش کرتی تھیں تو ہر چہرہ ایک حسین انفعال برسنے لگتا تھا یا ساحل کے نمناک خاک کا ذرہ ذرہ ان کے خرام لطیف سے کنول کے پھول کی طرح شگفتہ تھا اور جتنی جگہ پر یہ دوشیزگان بحر کھڑی ہوئی کھیل رہی تھیں اتنی جگہ چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔

سمندر کی پریاں پانی کی معصوم موجوں سے ابھی کھیل رہی تھیں کہ ایک آواز آئی اور یہ فوراً سمندر کی چادر میں غائب ہو گئیں۔ مرفی اپنے پیکر خاکی سے نوری شعاعیں چھینکتی ہوئی، پھولوں کی ٹوکری ہلاتی ہوئی اور بال بکھرائے ہوئے ساحل پر آ پہونچی۔ اس نے چاند کو اس قدر دست پہلی مرتبہ دیکھا تھا، یہ اس کے شباب کی پہلی منور رات تھی، جسے وہ سکون اور محویت کے عالم میں اپنی نظروں سے تو بہ شکن دیکھ رہی تھی۔ اس نے ٹوکری

رکھدی اور استغراق کی موجیں اُس کے نازک پاؤں کے بوسے لے کر کئی مرتبہ چلی گئیں مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ آخر میتھول نے اس کی محویت کو توڑا جو بڑی دیر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور کہا مرفی، رات ختم ہونے کو ہے اب گھر چلو۔ اینل تمہارے لئے پریشان ہوگا۔

مرفی۔ میتھول تم یہاں کہاں؟

میتھول۔ اپنے مالک کی کنواری لڑکی کو میں تنہا کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ تھا اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا۔

مرفی۔ آخر اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

میتھول۔ صرف تمہاری نگرانی۔ دنیا حوادث کی کروٹیں بدل رہی ہے۔ تم ابھی نوجوان ہو تمہیں کیا خبر کہ تمہاری ہر ٹھوکر سے کتنے فتنے بیدار ہو کر تمہیں گھیرنا چاہتے ہیں۔

مرفی۔ پھر تم اُن کا انتظام کیا کرو گے۔

میتھول۔ میں ہر ٹھوکر اپنے طاقتور جسم پر سنبھالونگا، اور ہر فتنے کو اپنے زبردست ہاتھوں سے پھر سلا دونگا۔

مرفی۔ مگر میں نے تمہیں اس تکلیف کے لئے مجبور تو نہیں کیا۔

میتھول۔ ہرگز نہیں، یہ ایک میرا فطری جذبہ ہے جو خدا نے تمہاری طرف سے میرے دل میں پیدا کر دیا ہے۔

مرفی۔ پھر اب تم کیا چاہتے ہو۔

میتھول۔ یہی کہ گھر چلو۔ اور اپنے ارادۂ سیر و تفریح کو صبح پر ملتوی کر دو۔

مرفی۔ میتھول، میں چاہتی ہوں کہ ان کرنوں میں جو سمندر میں غسل کر کے مجھ تک پہونچ رہی ہیں جذب ہو جاؤں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سمندر کی ان نغمہ آفریں موجوں کی گود میں سو جاؤں۔ تم مجھے اس فردوس نظارہ سے محروم کرنا کیوں چاہتے ہو۔

میتھول۔ صرف اس لئے کہ چاند کی کرنیں اور سمندر کی موجیں تم سے زیادہ تمہارے لئے بیتاب ہیں۔ اور میں اُن کی خواہش کی تکمیل نہیں چاہتا۔

مرفی۔ دیکھو، میتھول دیکھو، ادھر دیکھو، چاند کی کشتی خالی ہے۔ سمندر کی موجیں اُسے درہم و برہم کر رہی ہیں، بس مجھے جانے دو میں اس میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کروں گی اور .... اور ....

مرفی نے یہ کہا اور میتھول کے گلے میں باہیں ڈالدیں مگر میتھول ایک زبردست اور غیر متاثر کریکٹر

کا جوان تھا اس کے جذبات میں جنبش تک نہ ہوئی - اور وہ مرنی کو گلے سے لگائے ہوئے جس قدر جلد ممکن ہو سکا ریک فیلڈ واپس آ گیا -

(۴)

طلوع خورشید سے ایک گھنٹہ پہلے صبح صادق نے نور کی بانسری بجائی - وادیاں انگڑائیاں لے کر اٹھیں، چشموں نے آنکھیں ملیں، پہاڑوں کی گھاس نے جماہی لی - اور دامن کوہ سے جبالہ جو اپنی جماعت میں بنت الجبال کہلاتی تھی خواب گاہ سے اٹھکر پہاڑوں کو نوید صبح اور پیغام سحر دینے چلی ....

ہاں تو جبالہ وہ بنت الجبال پہاڑوں کو نوید صبح اور پیام سحر دینے چلی - وہ ابھی اپنی خواب گاہ سے تھوڑی ہی دور پہونچی تھی کہ اس کی ہم جلیس ضبی کنواریاں ہر طرف سے مسکراتی اور کھیلتی ہوئی نکل آئیں . سب نے اُسے سلام کیا اور ہنستی بولتی ایک طرف روانہ ہوگئیں . پہاڑ کے ایک سرے پر یہ حسین قافلہ ٹھیرا - آسمان تاروں سے صاف ہو چلا تھا - اور اب صرف اتنے تارے روشن باقی تھے جتنی یہ لڑکیاں تھیں - جبالہ کی جبین ناز سے صبح قریب طلوع تھی - اس کے پابوس بال چمکدار ہوتے جاتے تھے - اس کی رخسار کی سُرخیاں آفتاب کے لئے اُفق بنا رہی تھیں - اور وہ اپنی صحابیات کے ساتھ رسم صبح ادا کرنے پہاڑوں پر گھوم رہی تھی .

آخر اس نے اپنی نشیلی اور بدمست آنکھوں سے ایک بانسری بجائی، اس کی سہیلیاں رقص کرنے لگیں . اس کے ہونٹوں نے نغمے پیدا کئے - اور وہ بولی - عدنہ کیا یہ صحبتیں اسی طرح ہوتی رہیں گی، اور یوں آرزو پوری نہ ہو گی -

عدنہ - قسم ہے رب الجبال کی، اے جبالہ اگر تم حکم دو تو میں قوس کو اسی وقت اپنے ہمراہ لے آؤں، مگر خداوند جبال مرکاؤس کو اگر ذرا بھی اطلاع ہوگئی تو وہ ہماری جانوں کو عذاب میں گرفتار کر دے گا -

جبالہ - کیوں لعلین تمہاری کیا رائے ہے - اس نے اپنی ایک دوسری مصاحب سے پوچھا -

لعلین - خداوندہ پہاڑوں پر تمہاری حکومت ہے - قوس ایک ادنیٰ موکل معدنیات ہونے کی حیثیت سے تمہارا غلام ہے - مگر عدنہ کی طرح میں بھی خائف ہوں -

جبالہ - کیا تم میں سے کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا - جبالہ نے سب کی طرف نگاہ ڈالی - ان

لڑکیوں میں سے چھوٹی لڑکی شرارہ تھی۔ چمک کر بولی، جبالہ تم روزنوس کا ذکر کرکے ہمارے مراسم سحری اور عبادت
صبحگاہی میں بدمزگی پیدا کر دیتی ہو۔ میں آج ہی خداوند مرکاؤس کو اس کی اطلاع دیئے دیتی ہوں۔ اُس کا غضب
یا تو تمہاری اس حسرت کو مٹا دیگا، یا ہمیں تمہاری اس مصاحبت سے آزاد کر دیگا۔

جبالہ نے کوہ شکن غصہ کی بے پناہیوں کو روکتے ہوئے جھنجلا کر کہا۔ شرارہ، کیا تو چاہتی ہے کہ تیرا یہ سوز اور تیری
یہ چمک ہمیشہ کے لئے تجھ سے چھین لی جائے اور تجھے ایک ذرہ تابناک بنا کر پہاڑوں میں سر ٹپکنے کے لئے آزاد کر دیا جائے۔

شرارہ۔ خداوندہ، تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو، مگر۔۔۔۔۔۔۔۔

جبالہ۔ بس میرے سامنے سے ہٹ جا، آج سے تمہاری آزادی موقوف، سیر و سیاحت بند، پتھر کے زندان میں ہمیشہ کے
لئے قید ہو جاؤ، اور جب تک تم پر لوہے کی ضرب نہ پڑے پتھر سے باہر نہ آؤ۔

جبالہ نے اپنی پوری قوت و جبروت سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ شرارہ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ میں سما گئی۔ باقی لڑکیاں
ڈر کر خاموش ہو گئیں اور جب سورج نے انہیں جھانکنا چاہا تو یہ بھی سب سایہ کی طرح غائب تھیں۔۔۔۔۔ مگر کرنوں
کے اُجالے میں جب پہاڑوں نے اپنے دامن چمکائے تو مرتی متحیر کھڑی تھی۔ وہ پہاڑوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ
اُس کے جذبات کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ اسکی آنکھیں بہت زیادہ منور ہو جاتی تھیں۔ اور اس کا شباب اُس کے سینہ سے
اُبلا پڑتا تھا۔ وہ خدا جانے کب سے یہاں کھڑی تھی۔ دن نکلا، دھوپ پھیلی۔ تو چند شکاری بندوقیں لئے ہوئے پہاڑوں کے
دامن میں آموجود ہوئے۔ کوہی اور صحرائی جانور جو رات کی برودت کو رفع کرنے کے لئے دھوپ میں پڑ اور پاؤں کھولے
بیٹھے تھے اُن پر بندوقیں برسنے لگیں۔ کسی کا بچہ دودھ پی رہا تھا مر گیا، کسی کی مادہ کلیلیں کر رہی تھی، ماری گئی، کوئی
پانی پیتا ہوا کوئی نغمے گاتا ہوا، کوئی اُڑتا ہوا، کوئی سوتا ہوا، اور کوئی انگڑائیوں لیتا ہوا شکار ہو گیا۔ ابھی دو چار بندوقیں
چلی تھیں کہ ایک توانا اور تندرست شخص رنگِ آسمان کی طرح پہاڑ سے لڑھکتا ہوا آیا، اور شکاریوں کی بندوقیں چھین
کر بولا، حریص انسانو! تمہیں شرم نہیں آتی کہ یہ بے زبان جانور جو نہ تمہیں ستاتے ہیں نہ تم سے اپنا رزق مانگتے ہیں نہ کبھی
تمہارے سامنے آتے ہیں خدا کی زمین پر خدا کے حکم سے زندگی بسر کر رہے ہیں، تم صبح ہوتے ہی ان پر بجلی کی طرح
آپڑے اور شکار کرنا شروع کر دیا۔ اگر کوئی غیبی شکاری اسی طرح صبح ہوتے ہی تمہارے گھروں پر جا پڑے جبکہ تمہارے
بچے کھیل رہے ہوں، تمہاری عورتیں مسکرا رہی ہوں تمہارے عزیز و اقارب اور بھائی اپنے امید افروز ارادوں
کی تکمیل کے لئے تیار ہوں اور وہ غیبی شکاری تمہیں چھوڑ کر ان سب کا شکار کر لے تو تمہارا کیا حال ہو؟
خونی انسانو، تمہارے منہ سے خون لگا ہوا ہے۔ تم بکری، بھیڑ، بھینس، مرغ، کبوتر، مچھلی سب کچھ اپنی

خواہش کے مطابق گھر بیٹھے حاصل کر لیتے ہو۔ اور حاصل کر سکتے ہو، پھر کونسی بات تمہیں مجبور کرتی ہے کہ تم ان بے زبانوں کا خون کر کے اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرو۔ صحرائی مخلوق کی یہ بربادی اور بے کسی تمہاری شامتِ اعمال کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چلے جاؤ۔ اور خبردار اگران مقدس پہاڑوں کے دامنوں میں پھر کبھی قدم رکھا تو ایک ایک کی گردن پکڑ کر نیچے پھینک دونگا۔ شکاریوں پر اس علیبی شخص کی تقریر نے کافی اثر کیا، اور وہ سر جھکائے واپس چلے گئے ——————— یہ میتھول تھا۔

میتھول نے دیکھا کہ مرفی متحیر و حیران کھڑی ہوئی ہے گویا سنگتراش نے ایک مرمریں بت تراش کے پہاڑ کے دامن پر نصب کر دیا ہے۔ وہ سامنے آیا۔ پوچھا، مرفی، تم کیا سوچ رہی ہو۔

مرفی۔ آہ میتھول، تم نے میری دنیائے تصور کو درہم وبرہم کر دیا۔ میں اس پہاڑ کی عظمت و بلندی سے اپنی خواہشوں کے مطابق ایک بُت تراش رہی تھی، وہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ تمہاری آواز نے میری تخیلی ترتیب کو منتشر کر دیا۔ تمہیں میرے ساتھ رہنے کی ضد ہے تو رہو، لیکن خدا کے لئے میرے تصورات میں خارج ہونے کی کوشش نہ کرو۔

میتھول۔ تصورات! صرف خیال کی پستی و بلندی کا نام تصور ہے، خاموشی اسمیں رنگ بھرتی ہے اور تخیل حرکت دیتی ہے۔ تم تصور سے عمل کے میدان میں کیوں نہیں آجاتیں، کہ حیرت و تصور کی دشوار گذار وادیاں کنواری مرفی تمہارے پاؤں برداشت نہ کر سکیں گے۔

مرفی۔ نہیں میتھول، میں اپنے کنارِ شوق میں کسی کو کھینچنا چاہتی ہوں، مگر کھینچ نہیں سکتی۔ میری طبیعت خود بخود جذب و انجذاب کی کیفیتوں سے معمور ہوئی جاتی ہے۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں اور کسمیں جذب ہونا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری طبیعت کے اس نئے طلسم کی عقدہ کشائی کر سکتے ہو۔

میتھول۔ نہیں۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ انجذابِ پروانہ ایک شمع، اور جذبِ شمع ہزاروں پروانے اپنے گرد پیدا کر لیتا ہے۔ اور دونوں میں سے کسی کو تلاش اور جستجو کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مرفی۔ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ میں بھی انتظار کروں گی۔ لیکن کیا کروں طبیعت بہت بے چین ہے گھر میں جی نہیں لگتا۔ دل کوسوں اُڑا جاتا ہے۔

میتھول۔ اچھا مرفی، اب دھوپ زیادہ پھیل گئی ہے۔ ان وادیوں میں جہاں دھوپ کی سختی سر بفلک پہاڑوں کی تپش سے بہت زیادہ حسرتناک ہو جاتی ہے، زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔

مرفی۔ کیا ان کی تپش اندوزی مجھے جذب نہیں کر سکتی۔ لیکن ان پہاڑوں میں جذب کا مادہ نہیں ہے اچھے میتھول مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔

میتھول۔ مرفی، حرارت کو حرارت جذب نہیں کر سکتی تمہارا شباب اپنی گرمی اور حدت کے اعتبار سے ایک انجذاب شاداب کا تمنائی ہے، اور پہاڑوں کی خشک بلندیاں ان اثرات کو جذب نہیں کر سکتیں

مرفی۔ تو کیا میں سمندر اور دریاؤں سے پناہ مانگوں؟ کیا وہ میری پذیرائی کریں گے؟۔

میتھول۔ نہیں شباب کی تپش اندوزی شباب ہی کی نمی میں جذب ہو سکتی ہے۔

مرفی۔ مگر ایسا شباب! پیارے میتھول کیا تم جوان نہیں ہو؟

میتھول۔ مگر میں آنیل کا ایک وفادار خادم ہوں۔ تم اس کی امانت ہو، میرا فرض ہے کہ تمہاری نگرانی کروں اور جب تک تمہیں محبت کی منزل مقصود کا سیدھا راستہ نہ مل جائے تمہیں غلط راستوں سے بھٹکنے سے بچاؤں۔

مرفی۔ آہ، محبت، مقصود، اور غلطی۔ میتول چلو میں دیوانی نہ ہو جاؤں۔ مجھے اپنے اطاعت گذار جذبات میں پناہ دو۔

آخری دونوں لفظوں کے ساتھ مرفی کے نازک کلائیوں میں جنبش ہوئی اور وہ میتھول کی گردن میں حائل تھیں۔

(باقی آیندہ)

شہادت منصوری کا نظارہ

مجرم عشق کوئی دار پہ چڑھنے آیا
آسمان لرزہ براندام۔ زمیں ہلتی ہے
گردشیں دینے لگا کون اسے حشر انگیز
شور ظلمات میں ہے نور پہ دھاوا کردو
اک طرف پاس وفا دور زماں ایک طرف
آسماں والے اُدھر اور اِدھر اہل زمیں
صورتیں ایکطرف مادیات ایک طرف
عشق اور حسن کو ضد ہے کہ دوئی مٹجائے
متنازع ہوئے آپس میں غرض باطل و حق
حسن کہتا ہے! کرشمہ تو ذرا دکھلادے
تھا خیالات میں اک حشر طلاطم برپا
دار نے شکل الف اللہ کی جو ہی دکھلائی
حسن معشوق کا جلوہ نظر آیا سر دار
حوصلے عشق نے دو چند کئے اسکے فزوں
نقش کثرت کو دیا جذبہ وحدت نے مٹا
راز نے جلوہ کیا دور حجابات "ہوئے"
آسماں نے پھر صدا دی کہ زمیں کو تھامو
اہل عالم کی نگاہوں میں سیاہی چھائی
اسم ذات ایک رہا ہٹ گئے اسمائے صفات
مل کے معشوق سے اک جان دو قالب جو ہوا
مرکے منصورؒ نے یہ داد جو دی وحدت کی

حسن بیتاب ہے ہوتا ہے غضب یہ کیسا
قتل پر کس کے یہ دنیا نے کمر باندھی ہے
الاماں۔ ہوتا ہے "پیمانۂ ہستی" لبریز
پھر سے دنیا کے اُجالے میں اندھیرا کردو
حسن و عشق ایک طرف دونوں جہاں ایکطرف
اہل دل ایکطرف ایک طرف ظاہر ہیں
ذات بحت ایک طرف اور صفات ایکطرف
فکر اسما کو یہ کثرت میں نہ کچھ فرق آئے
کشمکش میں تھا ادھر عاشق حسن مطلق،
عشق کا قول کہ اب جام شہادت پی لے
ساتھ ہی سینہ میں جذبات کا طوفاں اٹھا
"نحن اقرب" کی صدا تار رسن سے آئی
کہہ کے لبیک بڑھا عاشق جانباز اک بار
چل گیا حسن کا چلتا ہوا اسپر افسوں
اُٹھ گیا صاف نگاہوں سے دوئی کا پردا
شوق طرفین بڑھا دور حجابات ہوئے
آئی آواز معاً اسکو کہ خود ہی سنبھلو
وصل کا وقت ہے غیروں کو نہ دی دکھلائی
جوہر نور نجوم آیا بروئے ذرات
چڑھ گیا دار پہ خود شور "انا الحق" کرتا
روح خالد نے صدا عالم ارواح سے دی

"ہر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود
بروائے واعظ خود بیں کہ ز چشم من و تو
رازِ ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود"

خالد (بنگالی)

زیب النسا کی قبر

زیب النسا کی قبر جو تھی خاک میں نہاں — صدیوں کے بعد اُس کا ملا گم شدہ نشاں

مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے — تھا گنج بے بہا اُسی میدان میں نہاں

مٹی میں مل رہا تھا دُرِ شاہوار حیف — اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں

شاید پسِ فنا یہ تخلص کا تھا اثر — مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں

اگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے — ممنون جستجو نہیں روداد بے کساں

تصویر دستبرد حوادث ہے سربسر — اُبھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقشِ رائگاں

گنبد ہے۔ مقبرہ ہے۔ نہ لوحِ مزار ہے — تعویذِ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں

نے شمع ہے نہ چادرِ گل ہے نہ قبر پوش — مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں

ویرانیٔ لحد ہے مُجاورِ سرِ مزار — زائر ہجومِ یاس۔ تباہی ہے پاسباں

ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا — سبزہ تو کیا کہ شکلِ نمو بھی نہیں عیاں

اُڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی — چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں

بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی — ہیں ذرہ ہائے ریگ بیاباں گہر فشاں

ہے اُس کی خوابگہ یہ شبستانِ خاک اب | زیبندہ جس کے دم سے تھے قصرِ فلک نشاں
جو دُختِ ماہوشِ شہِ ہندوستاں کی تھی | تھا مصدرِ سخا و کرم جس کا آستاں
روشن چراغِ بزمِ سخن جس کے دم سے تھا | مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں
ہیں جس کے حُسن و عشق کے قصّے زبان پہ | کافی ست ایں اشارۂ من بہرِ عاقلاں
اس کو پسِ فنا ہے یہ ٹُٹیا محل نصیب | امن کو جس کے گِرد سپر راد تھی گراں
سچ ہے نہیں زمانے کو ایک وضع پر قرار | نیرنگِ روزگار۔ چنیں ہے گہے چناں
برحق کہ بے ثبات ہیں اسبابِ ظاہری | سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں
ہے امتیازِ شاہ و گدا تا بہ زندگی | ہے زیرِ خاک پست بلندیٔ عز و شاں

وہ آج غرقِ خون ہیں جو کل محوِ ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

برق (دہلوی)
بی۔ اے

لازوال شاعر

(اثر :- شوکت تھانوی)

شافعی کے لیے وہ صبح کسقدر دلچسپ اور جاذب نظر تھی جبکہ کشمیر کی فردوس آفرین فضا رنے موسم بہار میں نکلتے ہوئے سورج کی درخشاں شعاؤں کو زعفران کے کھیت میں پریشان کر دیا تھا، اور چھوٹی چھوٹی خوشنما پہاڑیوں کو جوسبز تا پا لباس سبز سے آراستہ تھیں عالم سکوت میں مخمور رنگینی رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

شاعر کے لئے ایک ایسا عالم، ایک ایسا منظر، ایک ایسی فضا، سیکڑوں حشر سامانیاں مہیا کر دیتی ہے۔ شافعی ایسا شاعر جو عالم جوانی میں غارتگر شباب کی مکمل تصویر تھا، یہ مناظر اپنے لئے اور اپنے کو ان مناظر کے لئے وقف سمجھتا تھا عالم وجد میں گنگناتا ہوا اور ہر نقش زرین کو اپنی شراب بار آنکھوں میں جذب کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ شاعر نہ تھا بلکہ شعر تھا اور شعر بھی وہ شعر جو صرف ایکمرتبہ سماعت میں گونج کر، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دل میں جذب ہو جائے اس کے شعر بار آنکھیں مناظر لطیف کو فطرت کی ایک نظم سمجھ کر پڑھ رہی تھیں اور وہ مغلوب اثر ہو کر جھوم جھوم جاتا تھا۔ اسی عالم جذب و سکر میں اسکی نظریں چیڑ کے ایک درخت پر پڑیں اور اس نے صاف دیکھ لیا کہ کچھ حروف درخت کے تنے پر منقوش ہیں وہ قریب گیا قریب تر گیا اور اس نے صاف پڑھ لیا کہ کھدے ہوئے حروف کے مجموعہ سے ایک تباہ کن شعر بنتا ہے ؎

"سیکڑوں بہاریں آئیں اور خزاں بن گئیں۔ سیکڑوں حسین پیدا ہوئے مگر مٹجانے کے لئے لیکن لازوال"
"شئے جس نے ان سب کو اہمیت دی محبت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہر بہار اور ہر حسن اسی"
"ایک عنوان کے تحت میں ہیں ——————"

اس نے پڑھا اور اپنے دل میں رکھنے کی ایک چیز سمجھ کر نقش کر لیا۔ دیر تک عالم حیرانی میں ادھر ادھر دیکھتا رہا کچھ سمجھ میں نہ آیا آخر ایک فولادی ٹکڑے سے کندہ شعر کے نیچے دوسرا شعر لکھدیا۔

"محبت کے لازوال شعر کہنے والا ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے وہ بھی ہمیشہ سے زندہ ہے اور محبت کے وجود"
"تک زندہ رہیگا، اس فضا رخاموش میں محبت کا شعر سیکڑوں نغمے گا رہا ہے مگر ساز خاموش کے بجائے"
"بولتی ہوئی بانسری درکار ہے ——————"

شعر کہا اور اسی خیال میں مستغرق جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔

(۲)

ٹھیک اُس وقت جبکہ شام کی سرگیں سیاہی فضاء عالم پر مستولی تھی۔ پرندے بسیرے کی فکر میں خلا آسمانی میں پرواز کر رہے تھے اور سطح آب اُن کے عکس اپنے میں جذب کر رہی تھی تالابوں کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اپنی جنبش خفیف سے سیکڑوں بے معنی نقوش پانی پر بناتیں اور مٹا دیتی تھیں۔ تنویرہ کی حسین فطرت نے کل کی طرح آج بھی اُن مناظر سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی۔ وہ اُٹھی اور اپنے رخساروں کے سُرخ آئینے چمکاتی اپنے چمکدار گیسوؤں کو شاعرانہ انداز سے شانوں سے ہم آغوش کرتی بڑھی چلی اور سُرخ سڑک پر اپنی ٹھوکروں سے سیکڑوں شگفتگیں پیدا کردیں بہار کی ملکہ بنی ہوئی وہاں پہونچی جہاں شب گذشتہ ایک نقش محبت ثبت کرائی تھی۔
اس نے دیکھا اور حیرت سے دیکھا کہ اس گنجان جنت میں اس کے فردوس آفرین شعر نے اپنے جذب کامل سے ایک حسین شعر اپنا شریکِ سکوت بنا لیا ہے وہ اپنے ہلال فریب ہونٹوں سے مسکرائی اور ایک طوفانِ شباب برپا کردیا اس نے دیکھا اور غور سے دیکھا کہ شعر کی سادگی معصوم معانی پیدا کر رہی ہے اس نے محسوس کیا کہ گویا اس کا جگایا ہوا جادو اسی پر پلٹ گیا ہے اور وہ بیچین تھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ تباہ کن شعر کسی دماغ کا نتیجہ ہے وہ کون ساحر ہے جس کے جادو نے اس وقت ایک دم اس کی رنگینیوں کو فتح کر لیا ہے —————— وہ برابر انھی خیالات میں مستغرق رہی دفعتاً اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے کہا:-

"بولتی ہوئی بانسری درکار ہے —————— یہ کیا؟"
"یعنی میں خود اپنا شعر یہاں پڑھوں؟ مگر کون سُنے گا؟"
"کیا یہ مطلب ہے کہ خود انہیں کو پکڑ کر سناؤں؟ ہاں یہی ہے؟"
"مطلب —— مگر میں اُس شاعر کو کہاں سے پاؤں؟ نہیں"
"وہ ضرور آئیگا —— اچھا تو میں یہ کردوں ——"

یہ کہہ کر تنویرہ اُٹھی اور درخت کے تنے سے اپنا شعر مٹا دیا اور مٹا کر شعر کی جگہ ایک عبارت لکھدی:-

"شعر کے جذب نے شعر کو جذب کر لیا، لازوال شعر زندہ ہے مگر"
"زندہ رہنے والے شاعر کی بانسری میں پڑھ اپنا شعر اور اس ترنم،"
"رہے کہ فضاء خاموش ساز اُٹھالے میں سُن رہی ہوں سُنا"

" مجھ کو اے نہ فنا، ہونے والے شاعر سُنا ــــــ "

" ــــــ "تنویرہ" ــــــ "

عبارت لکھ کر تنویرہ ایک قریب تر گنجان جھاڑی میں روپوش ہو گئی جہاں اس کے تنفس کی گرمی خوشبو میں
[illegible]دش پانے لگی اور اس کی زلفوں کے ارتعاش میں سنہرا چاند اپنی آسودہ اور خواب آلود چاندنی پھیلانے لگا۔

(۴)

صبح کی سپیدی ابھی سورج کی سنہری شعاؤں سے بے نیاز تھی اور درختوں پر قسم قسم کے جانور نغموں کی
[illegible]اسے دل کش سے جنھیں بکھیر رہے تھے اور آنکھوں سے ایسی بارش ہو رہی تھی گویا فرشتے تقدیس ملکوتی کو غسل
[illegible]ے رہے ہیں تنویرہ بیدار ہو چکی تھی اور منتظر تھی کہ ایک نغمہ روح کش اس کو نوید صبح دے نغمہ وہی نغمہ جو
[illegible]س کے دل و دماغ میں گونج کر روح نوازی کر رہا تھا۔

شافعی نے کل کا دن اور رات جس طرح بھی کاٹی ہو بہر حال آج صبح سے وہ گھر چھوڑ کر طلوع ہونے والے
[illegible]ورج کی ایک کرن شعاع سے اپنے شعر کا جواب طلب کر رہا تھا وہ بیتابانہ چیر کے درخت کے پاس پہونچا اور صرف
[illegible]پا شعر باقی دیکھ کر متعجب ہوا دوسرے شعر کی جگہ عبارت پڑھ کر چاروں طرف اس طرح نظر دوڑائی گویا "تنویرہ"
[illegible]و ڈھونڈ رہا ہے، اس نے بہ آواز بلند کہا۔

"تنویرہ! تنویرہ!! اے شاعروں کی ملکہ تنویرہ!!!"

[illegible]آواز سب جنگل میں گونج کر وہی الفاظ اور وہی آواز پیدا کرتی اور بہجاتی تھی، تنویرہ نے سنا اور خاموشی کے
[illegible]ساتھ شافعی کی ایک ایک حرکت دیکھتی رہی ــــــ شافعی نے پھر کہا ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

نکل کر ایک زمانہ جبیں بہ سجدہ ہو
حجاب حسن کی توہین ہے حجاب نہ کر

تنویرہ! ــــــ اور سن میں شعر پڑھتا ہوں اور قسم کہتا ہوں کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ میری شعریت لرزاں سے متاثر"
ہو جائیگا ــــــ ! تو نہیں آتی؟ ــــــ اچھا سن میں تیری خیالی تصویر کو مخاطب کر کے"
شعر پڑھتا ہوں ــــــ "

اس نے شعر پڑھا اور کچھ ایسے انداز سے پڑھا کہ جنگل کی خاموش فضا کو مرقص کر دیا۔ "تنویرہ" بیتاب ہو گئی اور
[illegible]ضطراب کی کشمکش سے مغلوب ہو کر بجلی کی طرح شافعی کے سامنے چمک کر گری اور "لا زوال" شاعر کے ہم آغوش ہو گئی۔
[illegible]ب بہ لب سرمئی بادل کی طرح چھا گئی اور موسیقی بجلی کی طرح تڑپ تڑپ کر رہ گئی۔

روحِ بیداری

مبتلا ہے ظلمتِ امروز میں روحِ حیات
کیا شبِ دوشینہ کے پیشِ نظر ہوں واقعات

یاد ہے کچھ، جانتی تھی تجھ کو دنیا بت شکن
آج ذرّہ ذرہ تیرے دل کا ہے اک سومنات

ہو گئی خوابیدہ اب وہ بربطِ شیریں نوا
جس کے ہر اک تار کی لرزش سے تھی پیدا حیات

بجھ گئی وہ روشنی جو رہنما منزل کی تھی
"شاخِ آہو" پر تمناؤں کی ہے اب تو "برات"

سعیٔ لاحاصل نے ناکامِ تمنا کر دیا
ہو گئی مصروفِ باطل تیرے دل کی واردات

ہو رہی تھی ایک عالم پر مسلط خوابِ گِگ
تجھ سے چھینی جا رہی تھیں جبکہ تیری ہی حیات

منسلک اجزائے عالم ایک ہی رشتہ میں تھے
آج وہ شیرازہ ہے بشکستہ ذات و صفات

لیکن اب بھی مرتعش ہیں تار نغموں کے لئے
منتظر نورِ سحر کی اب بھی ہے ظلمت کی رات

دیدۂ ہستی ہے خواہاں اس فضا کا آج بھی
جس سے بیداری کی پیدا ہوں جہاں میں کیفیات

اب بھی دُنیا زندگی کے واسطے تیار ہے
ہو مگر اسکے لئے پیدا نگاہِ التفات

تو کہ اک خورشیدِ تاباں ہے زمانہ کے لئے
اُٹھ! اور اپنے نور سے معمور کر دے کائنات

قیصر (از بھوپال)

شوہر کے نام

(عطیہ جنابہ ہمشیرہ صاحبہ مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی)

کئی دن ہوئے آپ کا خط پہونچا۔ میں نے کئی بار پڑھا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب لکھوں۔ آپکا حکم ماننے سے دُنیا کی بُری بنتی ہوں اور دُنیا سے ڈرتی ہوں تو آپ کے خلاف مزاج ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں کئی دن گذر گئے۔ چند باتیں اس معاملے میں غور طلب ہیں پہلے اونکو گذارش کرتی ہوں۔

آپ کہتے ہیں کہ لڑکی کو پردے میں نہ بٹھایا جائے۔ پردے کے متعلق نئی روشنی کے لوگوں کو بہت سے اعتراض ہیں جن میں سے چند اعتراضات کا ذکر کرتی ہوں:-

۱۔ مسلمانوں نے اپنی عورتوں کو پردے میں رکھہ کر اُن پر ظلم کیا ہے۔

سچ پوچھو تو مسلمان مردوں نے اپنی عورتوں کو پردے میں رکھہ کر عورتوں سے زیادہ خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کیا وہ نہیں چاہتے کہ بجائے ایک بیوی کے وہ نوجوان حسین عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھکر ان سے محظوظ ہوں مگر وہ اپنی قوم میں نیک نفسی قائم رکھنے کے لئے اُن کو پردے میں رکھہ کر اپنے اوپر جبر کرتے ہیں۔ پاک نفسی قائم رکھنے کے لئے پردہ سد سکندری کا کام دیتا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نیک دل ہو مگر فطرت نے جو ایک جنس میں دوسرے کے لئے قوت جاذبہ پیدا کی ہے اس کو کون روک سکتا ہے؟

عیسائی قوم میں بازاروں۔ کلب گھروں۔ گرجاؤں اور تھیٹروں میں جہاں کہ مردوں اور عورتوں کا اجتماع ہوتا ہے وہاں کتنے ہی ایک دوسرے کو گھورتے نظر آتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کو اس میں بہت لطف آتا ہے اور وہ دل ہی دل میں ان لوگوں کو گنا کرتی ہیں جو ان کی طرف پر شوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ہندوستانی اس بات میں اپنی ذلت سمجھتے ہیں اور ہے بھی ذلّت۔ کوئی غیرتمند اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۲- ہندوستانی بغیر دیکھے بھالے شادی کرتے ہیں۔ اور جبکہ ان میں پیشتر سے محبت نہیں ہے تو بعد کو اچھی طرح نباہ نہیں ہو سکتا۔

سطحی نظر سے یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا عمیق نظر سے دیکھو کوئی مرد یا عورت جس کی شادی اسی طریقہ سے ہوئی ہو وہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شادی سے قبل دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے غائبانہ محبت موجود تھی جب وہ ملے اور ایک نے دوسرے کی صحبت اُٹھائی تو اس محبت کو اور بھی استحکام ہوا۔ یہ پردے ہی کی برکت ہے کہ یہاں ہر خوبصورت۔ بدصورت بے ہنر۔ باہُنر۔ بے شعور۔ اور باشعور سب کی شادی ہو جاتی ہے اور پہلی غائبانہ محبت کی ابتدا کی بنا پر کامیاب اور خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ناکامیابی کی جو مثالیں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں۔ بلکہ جہالت اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

اب دیکھو کہ بے پردگی کی وجہ سے یورپ وغیرہ ملکوں میں شادی ہونا کیسا دشوار ہے۔ اوّل اوّل نوجوان لڑکیاں بوجہ خود مختاری کے کسی کا پابند ہونا پسند نہیں کرتیں لیکن جب اپنی معاش پیدا کرنے کے لئے تمام دن محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے تو اس کو انکا دل نہیں چاہتا (جیسا کہ کسی کا دل نہیں چاہتا) محنت سے عاجز و پریشان ہو کر وہ چاہتی ہیں کہ کوئی ایسا ذریعہ معاش ہوتا کہ بلا مشقت روزی بہم پہونچتی اب وہ شادی کرنا چاہتی ہیں تو جس شخص کو وہ اپنے لئے انتخاب کرتی ہیں وہ شخص اس کو اپنے لایق نہیں سمجھتا۔ جو شخص اس عورت پر فریفتہ ہے اسکو یہ عورت حقیر سمجھتی ہے۔ صورت۔ صحت۔ دولت۔ عزت وغیرہ وغیرہ مانع ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جستجوئے شوہر اور تلاش زوجہ کی کشمکش میں اتنا زمانہ گذر جاتا ہے کہ شباب رخصت ہوتا ہے۔ کوئی غمخوار۔ اور رفیق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دل مغموم اور چہرے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ مشقت و تفکرات میں مبتلا رہتے رہتے آخر کار ضعیف ہو جاتے ہیں۔ آخر عمر میں کوئی اولاد نہیں ہوتی کہ اس بُرے وقت میں ان کے کام آوے۔ وہ بصد غم و الم اپنی جان دیتی ہیں۔ کتنی ہی ضعیف العمر لیڈیوں کو میں نے اپنے کانوں سے یہ کہتے سُنا ہے کہ "کاش ہماری بھی شادی ہو جاتی۔ کوئی ہماری بھی زندگی کی بہار دیکھنے والا ہوتا۔ ہم بھی کسی کی بیوی یا کسی کی ماں کہلاتے۔" اور اسی طرح مردوں کے قول کا آپ نے اعادہ کیا ہے۔ قدرت نے ہر انسان کے دل میں یہ آرزوئیں پیدا کی ہیں۔

۳- ہندوستانی اپنی عورتوں کی آواز کا بھی پردہ کرتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ آواز ایک دلکش چیز ہے۔ کتنے ہی بدشکل گانے والے مرد اور عورتیں ہیں جن کی آواز دلکش کے اشتیاق میں خلقت امنڈ آتی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک ضعیفہ نے آپ سے پردے کی آڑ سے کوئی بات چیت کی تھی تو بعد کو آپ نے مجھ سے کہا کہ ان کی آواز بڑی دلکش ہے۔"

کسی نابینا سے پوچھا گیا کہ "تم کو کبھی عشق ہوا ہے؟" اس نے کہا "میں بچپن سے اندھا ہوں" کبھی کسی کو دیکھا نہیں مگر ہاں ایک عورت کو بولتے سنا ہے جس کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس لئے بہت بے قرار ہو جاتا ہوں۔ کاش وہ عورت مجھے مل جاتی کہ وہی آواز مسلسل سنتا۔"

ایک واعظ نے ایک مجمع میں بیواؤں کے عقد ثانی کے متعلق وعظ کہا۔ ایک عورت ایسی از خود رفتہ ہوئی کہ واعظ کے انکار کرنے کے باوجود اس نے زبردستی اسی سے نکاح کیا۔

پس ضروری ہے کہ آواز کا پردہ کیا جائے تاکہ آواز کے لحن اور طرز گفتگو سے کوئی متاثر نہ ہوسکے۔ آواز کا پردہ کرنے سے بھی پاک طینتی کا قیام مدنظر ہے۔ اس میں بھی بہ نسبت عورتوں کے مردوں نے اپنے اوپر زیادہ ظلم کیا ہے۔

۴- ہندوستانی اپنی عورتوں کے ناموں کا بھی پردہ کرتے ہیں کہ کوئی ان کے نام نہ سنے بنت فلاں۔ ہمشیرہ فلاں۔ زوجہ فلاں۔ والدہ فلاں وغیرہ اشارات سے ذکر کرتے ہیں۔

ناموں کے پردہ کرنے کا یہ سبب ہے کہ ہندوستانی شرفا کی غیرت یہ نہیں گوارا کرتی کہ ہماری عورتوں کے نام مردوں کی زبان پر اسی طرح جاری ہوں جس طرح بازاری عورتوں کے نام باہر پکارے جاتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک احترام ہے جو مرد اپنی عورتوں کے لئے کرتے ہیں۔

انجمن آرا بیگم میری ایک سہیلی بہت آزاد پسند ہیں۔ اتفاق سے میں ایک مرتبہ ان کی مہمان تھی کہ ان کے نام ایک خط آیا۔ ہم لوگ بالاخانے کے ایک کمرے میں تھے۔ وہاں سے دیکھا کہ پوسٹمین ایک خط ہاتھ میں لئے لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ "انجمن آرا بیگم" کا مکان کون سا ہے؟ کسی نے کہا "ہم نہیں جانتے۔" کسی نے کہا کہ "شاید یہ محمد رضا صاحب کی صاحبزادی کا نام ہے۔" پوسٹ مین نے کہا کہ "یہ کوئی شریف زادی ہیں یا طوائف؟"

ناموں کے پردے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کوئی اچھا اور دلچسپ نام سُنکر کسی مرد کے دل میں اس کا اشتیاق نہ پیدا ہو۔ جس سے پاک باطنی میں خلل آئے۔ مثلاً کسی شخص کی بیوی کا نام "جمال آرا بیگم" ہے۔ اس سے سُننے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بیوی بہت حسین ہوگی۔

۵۔ کوئی شے جسقدر زیادہ پوشیدہ رکھی جاتی ہے اتنا ہی دوسروں کو اس کا اشتیاق زیادہ ہوتا ہے اور اس طرح پردے میں رہنے سے عورتوں اور مردوں کے درمیان بدنفسی پیدا ہونے کا زیادہ موقع ہے۔

غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اشتیاق قائم رہنے میں جو سرور ہے وہ اشتیاق ختم ہو جانے میں نہیں ہے۔ لیکن کوئی شے جب بالکل دیکھی سُنی نہ ہو تو اشتیاق کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور جو شے ممکن نہ ہو سکے اس کا اشتیاق نہ پیدا ہونا کتنا ضروری ہے۔ پردہ اس میں کسقدر مدد کرتا ہے۔

بے پردہ ممالک میں جہاں عورتیں اور مرد ہر جگہ برابر نظر آتے ہیں۔ اپنے روزانہ کام ملکر انجام دیتے ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتے۔ گاتے۔ بجاتے اور ناچتے ہیں وہاں اشتیاق کیسا! ہر شخص ضرورت سے زیادہ اور حد سے باہر آکر اپنے اشتیاق کی آگ بجھا سکتا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر گلے ملکر ناچے۔ جتنی دفعہ دل چاہا موقع نکال کر بوسہ بازی کی۔ عوام کا تو ذکر کیا۔ متبرک پادریوں اور ننوں کے درمیان۔ گرجاؤں۔ اور خانقاہوں میں جو جو واقعات گذر جاتے ہیں ان کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ پادریوں اور دیگر عورتوں کے درمیان ہر قسم کے تعلقات جائز ہیں۔ ننوں کے بچوں کو پادری گردن دبا کر مار ڈالیں تو کچھ گناہ نہیں۔ کسی ایسے کام سے ان کی پارسائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ کی نوجوان بیٹی۔ غیر لوگوں سے شیک ہینڈ کرے۔ تنہائی میں بیٹھکر مردوں کے ساتھ باتیں کرے۔ محفل میں پیانو بجا بجا کر گیت گائے اور ناچے۔ واہ واہ کی تالیاں بجیں۔ کتنے ہی آدمی اسکا منہ چومیں اور رخصت ہوں۔ آپس میں تذکرے ہوں کہ "اس کے بال بہت خوبصورت ہیں" "آنکھیں بڑے غضب کی ہیں" "آواز بڑی دلکش ہے" "ناچتے وقت تتلی معلوم ہوتی ہے"

بھلا ہندوستانی غیرتمند مردوں اور عورتوں میں ایسے مناظر دیکھنے کی تاب کہاں؟ ادنےٰ درجے کے جاہل اور کوڑھ مغز مسلمان میں بھی اتنی غیرت ضرور ہوتی ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہندوستانی مسلمان ایسی باتوں کو تہذیب اور شائستگی میں شامل کرلیں! میں نے کئی خاندانوں میں بے پردگی کا رواج ہوتے دیکھا ہے لیکن بعد چند دن کے کچھ ایسی باتیں نظر آئیں کہ پھر اُنہوں نے پردہ قائم کیا۔ اسوقت لوگوں کو بڑا مذاق ہاتھ آیا۔ مگر اصابت

شہید تغافل

(از "بالم")

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۷)

"غالباً یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ مرنے والے حامد کے نزع کی حالت میں آخری الفاظ کیا تھے اور اگر میں اس ذمہ داری کو جو میں نے اپنے سر لی ہے پورا نہ کروں تو حامد کی روح بے چین رہیگی حشر میں مجھ سے مواخذہ کرے گی اور مجھے شرمندہ کرے گی کہ میں نے اس کے پسماندوں کی خبر نہ لی وعدہ خلافی کی اور میں نے اس کے عنصر خاکی سے پرواز کرنے والی روح! آرام سے نکلنے والی روح!! اور مطمئن روح سے دغا کی دھوکا دیا لہٰذا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تم کو اس بات کا یقین دلادوں کہ میں تمہاری کفالت کا ذمہ دار ہوں اسلئے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ میں تمہاری ضروریات کو تازندگی پورا کرتا رہوں گا مگر یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ محض اپنے شوہر کے آقا کے ناخواندہ مہمان بن کر اس کے لطف وکرم کی امیدوار ہو کر ہمیشہ اسی کے ممنون احسان ہو کر بلکہ بار خاطر ہو کر اپنی زندگی بسر کرو! اس کے مقابلہ میں ایک فرزند کی بھی خدمات کسی طرح احسانات کی مد میں داخل نہیں ہو سکتیں، مجھے اپنا فرزند ہی تصور کرو!"

یہ تھی منظور کی آخری تقریر جو بہت کچھ رد و قدح کے بعد اس نے سلیمہ کی والدہ اصغری سے کی، کی اور ایسے موثر پیرایہ میں کی کہ سلیمہ کی مستقل مزاج ماں کا دل بھی متزلزل ہو گیا۔ ایک شریف نوجوان کے مواعید پر یقین، ایک سچے ہمدرد کے مخلصانہ مشورہ کی قدر، ایک مفلسی میں ساتھ دینے والے غمگسار کے ہمدردانہ الفاظ پر اعتماد نہ کرنا اصغری کے اختیارات سے باہر تھا رضامند ہو گئی اور آمادہ ہو گئی مگر پھر بھی سوچنے کے لئے ایک روز کی مہلت طلب کی۔

اصغری! جفاکش اور غریب اصغری نے بھلا یہ راحت آرام کاہے کو دیکھا تھا بلا محنت ومشقت وقت

پر عمدہ سے عمدہ کھانا اچھے سے اچھا کپڑا اور کام بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا یا ایک آدھ سوئی کا ٹانکا لگا دینا اور بس پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس نعمت کو اس راحت اور اس آرام کو ٹھکرا دے عذاب سے مبدل کر لے اور پھر خانہ داری کے جھگڑے کو مول لے، یہ اور اس قسم کے اور بہت سے موانعات تھے جن سے وہ الٰہی بخش کے سایۂ عاطفت سے علیحدہ ہو کر نوجوان منظور کی مرہون منت ہونا نہیں چاہتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اپنی نوجوان بیٹی کی موجودگی میں کسی نوجوان محسن کی ممنون احسان، ممنون احسان ہی نہیں، متہم متہم ہی نہیں مطعون خلائق ہونا نہیں پسند کرتی تھی۔

ماں بیٹی میں جو گفتگو ہوئی اس کا نتیجہ کچھ خوشگوار نہ نکلا دو متضاد طبائع کا شیر و شکر ہونا ایسا ہی تھا جیسا آب و آتش کا ایک ہونا، اگر ایک اس بات پر بہ ضد تھی کہ ہلاکت آفرین عسرت میں جس کے زیر بار احسان رہے ہیں تباہ کن مفلسی میں جس کی دولت سے متنفیض ہوئے ہیں اب بھی اسی کے مرہون منت رہیں تو دوسری اس بات پر مصر تھی کہ شفق مہربان اور اخلاص و محبت سے پیش آنے والے آقا کے عطایا سے بہرہ اندوز ہونا جس کے ہم مدت مدید سے ریزہ خوار رہے ہیں بمقابل ایک نوجوان ناتجربہ کار نوجوان کی فیاضی سے فائدہ اٹھانے کے کہیں بہتر کہیں انسب اور کہیں افضل ہے۔ مختصر یہ کہ برخورداری پر بزرگداری غالب آئی، غالب آئی اور دو حرماں نصیب دلوں کی آرزوؤں کا خون کر گئی، خون کر گئی اور ہمیشہ کے لئے انکی کامیابی کی راہ میں سد سکندری حائل کر گئی۔

منظور کو اپنی تدبیر کی ناکامی پر جس قدر بھی صدمہ ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے باوجود اس کے وہ خوش تھا تو صرف اس خیال سے کہ سلیمہ اس کو چاہتی تھی وہ زندہ تھا تو اس لئے کہ سلیمہ کی حیات بخش آنکھوں میں ابھی محبت کا اثر باقی تھا۔

سلیمہ نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری تھی یہ مصیبت اسی کی آوردہ، یہ آفت اسی کی پیدا کی ہوئی، یہ تفرقہ انگیز ستم اسی کا مشورہ کا توڑا ہوا اور یہ فساد کا بیج اسی کا بویا ہوا تھا جو اب جڑ پکڑ گیا تھا اور کرتے دھرتے کچھ بن نہیں پڑتا تھا مگر محض اس خوش کن امید پر کہ گاہے ماہے ماماہی کے ذریعہ سے چوری چھپے ہی سہی اپنے منظور نظر منظور سے ملنے کا مگر جلے پھپھولے پھوڑنے کا، جلے پھپھولے پھوڑ کر دل کی بھڑاس نکالنے کا، دل کی بھڑاس نکال کر جی ہلکا کرنیکا موقع مل جایا کرے گا۔

اس کے بعد سے یہ ذوگرفتاران محبت، یہ بلاگردان الفت اور یہ پاکبازان عشق اکثر تنہائی میں ملتے اور نہ ختم ہونے والے گلہ شکوہ نہ تھمنے والی آنسوؤں کی جھڑی اور نہ رکنے والے جذبات کے ساتھ

علیحدہ ہو جایا کرتے تھے باوجود سخت احتیاط کے کوٹھی کی ایک شوخ لڑکی اس نہ چھپنے والے راز سے سلیمہ کے حرکات اور منظور کے اضطراب سے آگاہ ہو گئی مگر چالاک سلیمہ نے شبو کو جھٹ اپنی ہمراز بنالی جس سے راز عشق پردہ راز ہی میں رہا۔

ایک روز اس نوجوان رازدار لڑکی نے جسے بیگم صاحبہ شبو کہہ کر پکارتی تھیں سلیمہ سے کہا جیسی محبت منظور کو تم سے اور تمہیں منظور سے ہے اگر ایسی ہی مجھے اور مجھ سے کسی کو ہوتی تو کب سے میں اس کی اور وہ میرا ہو جاتا اور کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہ ملتا مگر تم پر تعجب آتا ہے کہ باوجود اس شدت محبت کے اب تک ایک دوسرے کے نہیں ہوئے۔

——— ہوئے کیوں نہیں ہیں ہم آپس میں ایک جان اور دو قالب ہیں مگر کچھ ایسے ہی موانعات درپیش ہیں کہ ہم بظاہر ایک دوسرے سے غیر اور اجنبی ہیں۔

——— مگر اس طرح کب تک چوری چھپے سے آپس میں ملتے جلتے رہو گے اس دن کا بھی تو دھیان کرو کہ خدانخواستہ جب تمہاری اس چوری کی خبر کوٹھی میں عام ہو جائے گی۔ تمہاری والدہ، بیگم صاحبہ اور سرکار کو بھی ان خفیہ ملاقاتوں کا حال معلوم ہو جائے گا اس وقت تمہیں کیا کچھ نہ پچھتانا پڑے گا تم تو تم بیچارے منظور کا تو اس بدنامی سے برا حال ہو جائیگا بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ وہ اس ذلت سے جان نہ کھو بیٹھیں۔

——— تو اب تمہیں بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے میری تو سٹی گم ہو گئی ہے وہ تو شادی کرنے کو بھی تیار ہیں بہ شرطیکہ ہم یہاں سے علیحدہ ہو جائیں مگر اماں جان جب امیں بھی وہ تو یہاں کا آرام دیکھ کر گھر جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

——— اس صورت میں تم خود منظور کے عندیہ سے اپنی والدہ کو اگر وہ ناواقف ہے آگاہ کردو یا کسی اور ذریعہ سے ان کے کان تک یہ بات پہنچادو کہ تم بھی اس کو پسند کرتی ہو۔ ممکن نہیں کہ تمہاری اماں رضامند نہ ہو جائے وہ اپنے سر سے جوان لڑکی کا وبال اترتا دیکھ کر فوراً آمادہ ہو جائیں گی بھلا ایسا اچھا ٹھکانا اور پھر شریف گھرانے کا ایسا عزت دار اور نیک لڑکا کا ہے کو کسی کو مل سکتا ہے میرے نزدیک تو تم اپنے تئیں خوش قسمت بلکہ قابل رشک ہو لہٰذا اگر میری بات مانو تو ماما کو درمیان رکھ کر آج ہی اس ذکر کو چھیڑ دو۔

سلیمہ کو شبو کی یہ رائے پسند آئی اور اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ اول تو اور ذرائع سے اپنی اماں جان کو رضامند کرلے اور اگر اس پر بھی وہ رضامند ہوئیں تو پھر میں علی الاعلان اپنی رضامندی کا اظہار کروں گی چاہے لوگ مجھے بے شرم و بے حیا ہی کیوں نہ کہدیں۔
سلیمہ نے وہ سب کچھ کیا جس کا عزم کر چکی تھی مگر بڑھیا اصغری کے کان پر جوں تک نہ رینگی وہ کچھ اور ہی خواب دیکھ رہی تھی۔

(۸)

آج الٰہی بخش کی کوٹھی میں غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی ہے کوٹھی کا ہر چھوٹا بڑا فرد خوشی سے جامہ میں نہیں سماتا ہر طرف صفائی اور آرایش ہو رہی ہے زیرین حصہ کا گول کمرہ بھی سجایا جا رہا ہے ملازمین اصیلیں مامائیں اور خادمائیں رنگ برنگ کے لباس پہنے ہوئے ہیں گویا آج کا دن عید بن کر کوٹھی میں آیا ہے الٰہی بخش اور ان کی بیگم صاحبہ بھی آج اپنے لخت جگر رحیم بخش کے علیگڈھ کالج سے واپس آنے پر بے اندازہ مسرور و بشاش ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تمام ملازمین اپنے آقا کی مسرت میں حصہ لے رہے ہیں اور انعامات ملنے کی امید پر خوش ہیں۔
یوں تو کوٹھی کی تمام لڑکیاں زیورات و ملبوسات سے آراستہ تھیں ان میں شبو اگرچہ اپنی دل کش اداؤں اور شوخی کے سبب سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی مگر سلیمہ کے حسن پر غضب کا نکھار بلا کی دلفریبی اور قیامت کی دلربائی نظر آرہی تھی سبز ریشمین ساٹن کا چست پاجامہ پنڈلیوں میں نہایت زیب دیتا تھا اس پر شربتی ململ کا ہلکے پیازی رنگ کا گھٹنوں سے اونچا اونچا کرتہ اس کے نقرئی جسم کو ایسا ہی ظاہر کر رہا تھا جیسا سفید لکۂ ابر کے نیچے ماہتاب نظر آتا ہے اور ان سب پر غضب ڈھانے والا ہلکے گلابی رنگ کا دوپٹہ اس کو وہ کچھ بنائے ہوئے تھا جس پر ممکن نہیں کہ انسان کی نظر پڑے اور فریفتہ نہ ہو جائے فریفتہ ہی نہیں ہزار جان سے قربان نہ ہو جائے آخر رحیم بخش بھی انسان ہی تھا کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نظر جس پر پڑی وہ یہی ناظورۂ ناز آفرین سلیمہ ہی تھی آنکھیں چار ہوتے ہی دل میں جذبہ محبت، محبت میں خلش۔ خلش میں لذت، لذت میں ایک مبہم امید، بیتاب تمنا اور رنگین آرزو پیدا ہو گئی۔
ان لڑجانے والی آنکھوں کو چار ہونے والی نگاہوں کو سب نے دیکھا مگر منظور نے نگاہوں کے برقی تصادم کو دل میں پیوست ہو جانے والی نظروں کو محبت کے برقی پیغاموں کو اور ایک دوسرے کے

دل سے محبت کے نکلتے ہوئے مخفی شعلوں کو بھی دیکھا! دیکھا اور رشک کی آنکھوں رقابت کی نگاہوں اور حاسدانہ نظروں سے دیکھا اور؟ اور اس پر ایک برقِ ہاتف گری دل آتش رشک سے بھُن گیا دماغ آتش فشاں پہاڑ کی طرح شعلہ فگن ہو گیا اور اس نظارہ کا جانگداز نظارہ کا اثر دل پر لے کر کلیجہ تھامے ہوئے گھر آیا۔ پہلی مرتبہ بھی جبکہ سلیمہ کے تیر نظر سے زخمی ہو کر گھر آیا تھا اس کے اضطراب کا یہی حال تھا لیکن وہ اضطراب لذت اندوز تھا اور یہ اضطراب جاں سوز تھا۔

منظور کے قدم پہلے جس ذوق وشوق کے ساتھ آلہی بخش کی کوٹھی کی طرف بڑھتے تھے اور دل جس جلوہ گاہ میں اس کو ہر روز کشاں کشاں لے جاتا تھا اب وہ جلوہ گہ ناز آتشکدہ بنی ہوئی ہے اب وہ مقام جہاں سلیمہ سے گھنٹوں تخلیہ رہتا تھا اس کو اپنی آرزوؤں کا مرقد نظر آتا تھا اسلئے قدم کی تیزی سست دل کے ولولے مردہ اور وہ تمام ذوق شوق معدوم ہو گیا ہر روز کا جانا موقوف اور دیدار یار سے بھی محروم ہو گیا۔

منزل عشق میں سب سے کڑی راہ اگر ہجر وفراق ہے تو غالباً جذبہ رشک ورقابت اس کی انتہا ہے پختہ کاران جنون عشق اسی مقام پر پہنچکر عشق کامل کی سند حاصل کرتے ہیں اور بوالہوس اس خارزار میں آکر برباد ہو جاتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں۔

سلیمہ نے منظور سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور ایسی اجنبی ہو گئی کہ گویا کبھی آنکھیں چار ہی نہیں ہوئی تھیں کبھی کوئی شناسائی ہی نہ تھی ایک مرتبہ منظور نے اتفاقیہ موقع پا کر کچھ کہنا چاہا تو سلیمہ نے نہایت بے رُخی سے کہا کہ "دیکھئے ہمیں اپنی عزتوں کا خیال رکھنا چاہئے کوٹھی بھر میں ہماری محبت کا چرچا عام ہو گیا ہے بہتر ہے کہ ہم غیر ہو جائیں قطعی قطع تعلق کر لیں تاکہ لوگوں کو ہماری طرف سے جو شبہ ہو گیا ہے رفع ہو جائے" اس سے منظور کے دُکھے ہوئے دل پر زخمی دل پر ایک اور ضرب کاری لگی لیکن کیا کر سکتا تھا دل مسوس کر رہگیا۔ ماما سے التجا کی کہ تمہیں میری حالت زار پر کچھ رحم کرو میری پریشانیوں سے اس کو آگاہ کرو اور آمادہ کرو کہ وہ میری سچی محبت کی قدر کرے مگر ماما! گرگ باراں دیدہ ماما! ایک ہی علامہ تھی وہ چھوٹے سرکار کی نظروں کو محبت بھری نظروں کو دیکھ رہی تھی اس لئے اس نے بھی پہلوتہی کی اور سمجھایا کہ "بہتر یہی ہے کہ اب آپ اس کا خیال ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے دور کر دیں اب تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا ہے تیر کمان سے اور موقع ہاتھ سے نکل گیا ہے میری مانو تو اب وہ آپ ایسے بھلے مانس کے قابل

ہی نہیں رہی" اس تقریر سے بجائے اس کے کہ وہ تسلیمہ اب بے وفا تسلیمہ کے عشق سے باز آجاتا دست بردار ہوجاتا اور آتش رشک میں جلنے لگا گر اشکوں نے اشکوں کی جھڑیوں نے اس آگ کو قدرے سرد کر دیا اور بعد ازاں وہ مایوس اپنے کلبہ احزان میں آکر پڑ رہا۔

یہاں تو یہ حالت ہے اور وہاں میاں رحیم بخش تسلیمہ پر محبت کے ڈورے ڈال رہے ہیں تحفہ تحائف سے نواز رہے ہیں خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں اور تسلیمہ ہے کہ منظور کے عشق صادق پر رحیم بخش کے تمول اور نوخیز حسن کو ترجیح دے رہی ہے اور ان کی محبت بھری نظروں کو اپنی برق پاش مسکراہٹ سے پذیرائی کر رہی ہے بلکہ ان کی عریاں آرزوؤں کو دعوت دے رہی ہے۔

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ منظور کے دل میں جذبہ انتقام پیدا ہی نہ ہوا ہو! ہوا ضرور تھا مگر اس کی رگوں میں شرافت کا خون تھا اس لئے وہ اس کے قسم قسم کے بُرے منصوبے اور طرح طرح کے ارادے پورے نہ ہونے دیتا تھا یا پھر یہ وجہ ہو کہ اس کا کوئی رازدار نہ تھا اور نہ کوئی ایسا یار غار جو اس کو ایسے کاموں میں مدد دیتا بہر حال وہ رحیم بخش کا بال بھی بیکا نہ کر سکتا تھا ہاں اس کو حقارت کی نظر سے ضرور دیکھتا تھا اور اس سے اس کے دل میں نفرت کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی اگر چہ رحیم بخش بھی اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ مجھ سے منظور کی طبیعت میل نہیں کھاتی مگر وہ اس کی وجہ صرف یہی سمجھتا رہا کہ شاید منظور کو میری دفتر کی آمد و رفت ناگوار گذر رہی ہے یا وہ اپنے اس اقتدار و برتری کو جو برسوں سے اسے دفتر کے اسٹاف پر حاصل تھی اب میری آمد سے جاتی ہوئی دیکھ کر مجھ سے حسد کر رہا ہے اگر منظور پر الٰہی بخش کی اسقدر مہربانی نہ ہوتی تو وہ بے تامل منظور کے اس سلوک پر اس کو فرم سے علیحدہ کر دیتا مگر بحالت موجودہ ایسا کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا غرضیکہ دو حریف مقابل تھے۔ مگر ایک دوسرے کا کچھ نہ کر سکتے تھے۔

غزلیات

افتخار الشعرا برق دہلوی۔ بی۔ اے

فسانہ بن کے زمانہ میں جسکا نام رہا ‏ خدا کی شان کہ وہ جم رہا نہ جام رہا

عجیب گوشۂ جنت نشاں ہی منزل گور ‏ کہ رہروانِ عدم کا یہیں مقام رہا

مٹی نہ بعدِ فنا بھی فسردگی میری ‏ بجھا بجھا سا چراغِ لحد مدام رہا

سخی نہیں ہی وہ شہرت پرست بندہ ہی ‏ کہ جس کو وقت سخاوت خیالِ نام رہا

فروغ شمع ہوا وجہ گرمیٔ محفل ‏ تمام رات پتنگوں کا اژدحام رہا

ہلال عید ہی تصویر بے ثباتیٔ حسن ‏ کہ ایک رات فروغِ مہ تمام رہا

دیا پیامِ سفر نور صبح پیری نے ‏ مسافرانہ یہاں رات بھر قیام رہا

ادھر بھی دیکھ لو جلوہ ثواب مفت ہی برق
حرم کدہ سے یہ بت خانہ چار گام رہا

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

دنیا کے انقلاب نے رسوا کیا مجھے | یا دل کے اضطراب نے رسوا کیا مجھے
گاہ اُن کے التفات نے مغرور کر دیا | گہ شوخیٔ جواب نے رسوا کیا مجھے
آنے سوا سکے ہو گئیں وہ چند خواہشیں | برسات کے سحاب نے رسوا کیا مجھے
داغِ جگر چمک کے مقابل میں آ گیا | محشر کے آفتاب نے رسوا کیا مجھے
سنجیدگی کو زعم نے تضحیک مرض کی | اُنکے متیں خطاب نے رسوا کیا مجھے
وہموں نے گھیر گھیر کے دیوانہ کر دیا | یوں چہرہ کے نقاب نے رسوا کیا مجھے
وہ بدگمانیاں ہوئیں پیدا کہ الاماں | بے وجہ کے عتاب نے رسوا کیا مجھے
میں کہہ رہا ہوں حسن پہ کچھ قید عمر کیا | غصہ میں وہ شباب نے رسوا کیا مجھے
دل سیرگاہ عام نہیں کیوں کھلے مگر | داغوں کے التہاب نے رسوا کیا مجھے
عمان حسن میں نہیں دخل ہوائے شوق | کہدو کہ وہ حباب نے رسوا کیا مجھے

خالد حجاب ناز کی ہر کوئی انتہا
کہتے ہیں تیرے خواب نے رسوا کیا مجھے

(جناب سیّد عابد علی صاحب عابد بی۔ اے ال ال۔ بی)

یہاں میں مضطرب ہوں کاہشِ اندوہ فرقت سے
وہاں نغمے نکلتے ہیں کسی کی بزمِ عشرت سے

یہاں سوزِ دروں سے میرے دل کا خون ہوتا ہے
وہاں دستِ نگاریں سرخ ہیں مہندی کی رنگت سے

یہاں سینے میں میرے سانس بھی رک رک کے آتا ہے
وہاں آتا انہیں شکل ہوا فرطِ نزاکت سے

یہاں پھولوں کو میں اپنے کلیجے سے لگاتا ہوں
وہاں رنگیں ہے محفل گیسوئے مشکیں کی نکہت سے

یہاں مجھ کو خمارِ عشق نے برباد کر ڈالا
وہاں ظاہر ہے مستی نرگسِ میگوں کی حالت سے

یہاں اک شمع کو میرا سیہ خانہ ترستا ہے
وہاں مہتاب بھی اک داغ ہے جوشِ لطافت سے

جناب محمد عبدالباسط صاحب باسط (بھوپالی)

شروعِ قصۂ غم ہو تجلیاتِ جاناں سے
فسانہ چھیڑیے دل کا اسی دلچسپ عنواں سے

تخیل کا مقدر لڑ گیا خوابِ پریشاں سے
مرے افسانہ کو زینت ہے اک شوریدہ عنواں سے

ہوئی تکمیلِ وحشت سبزۂ صحنِ گلستاں سے
جنوں انگڑائیاں لیتا اٹھا خوابِ پریشاں سے

شرابِ دید کے شائق خمار آلودہ رہتے ہیں
ذرا کچھ کام لو اپنی نگاہِ کیف ساماں سے

نہ وہ بلبل کے نغمے ہیں نہ وہ پھولوں میں نکہت ہے
مری بربادیاں پوچھے کوئی اہلِ گلستاں سے

ٹھہر اے آفتاب داغ روک اپنی تجلی کو
ابھی کچھ کام لینا ہے مجھے چاکِ گریباں سے

شہیدانِ محبت پر خدارا فاتحہ پڑھ لو
یوں ہی ہو کر چلے جاؤ گے کیا گورِ غریباں سے

کسی کی ظاہری اقرار سے دلبستگی کیوں ہو
میں کوسوں دور ہوں باسط فریبِ بانِ امکاں سے

فطرت نگار محمد عباس اقدس حیدرآبادی

ٹپکتی جا رہی ہیں خون کی بوندیں جو مژگاں سے
گلستاں بن گیا دامن بہارِ زخمِ پنہاں سے

نکلنے کو بہت بیتاب نکلی قلبِ سوزاں سے
مری فریاد بھی ہمدوش تھی دودِ گریزاں سے

زباں خاموش، دل حیراں غبارِ بیکسی رخ پہ
تماشا بن کے میں اٹھا جو اٹھا بزمِ جاناں سے

تم اٹھے، شمع اٹھی اور گردِ بے کسی اٹھی
مگر حسرت لگی بیٹھی رہی گورِ غریباں سے

مرے اشکِ تمنا، آسمانِ غم کے تارے ہیں
بکھرتے ہیں جو دامن پر اٹھا لیتا ہوں مژگاں سے

یہ کیا تھا عشق کی بیتابیوں کا اک کرشمہ تھا
دلوں میں پڑ گئی ہلچل مذاقِ دردِ پنہاں سے

کسی کے حسنِ رنگیں کے تصور میں مری نظریں
لگیں سرگوشیاں کرنے سحر کے حسنِ عریاں سے

یہ کیا ہے قیدِ ہستی میں بھی میرا جی دھڑکتا ہے
مصیبت ہائے پیدا ہے مصیبت ہائے پنہاں سے

وہ رہ رہ کر بھڑک جانا کسی کی شمعِ تربت کا
وہ آنسو پونچھتے اٹھنا ترا گورِ غریباں سے

خدا جانے یہ کس شوریدہ سر کی یادگاریں ہیں
بہارِ گل نمایاں ہے در و دیوارِ زنداں سے

چلے گم کردہ منزل جس جگہ سے پھر وہیں آئے
ہمیں اے گردشِ قسمت نکلنے دے بیاباں سے

کہیں بیمارِ غم نے آخری کروٹ نہ بدلی ہو
دھواں اٹھ اٹھ کے رہ جاتا ہے کیوں شمعِ شبستاں سے

خدا جانے جبینِ شوق کو کیا ہو گیا اقدس
مچلتی ہے نہیں اٹھتی زمینِ کوئے جاناں سے

اطلاع :- چونکہ صفحہ ۱۵ پر غلطی سے محوی صاحب کا نام درج ہو گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوئی نظم اب تک مطبع میں موصول نہیں ہوئی۔

کاٹھیاواڑ کا علمی وادبی

ماہوار رسالہ

مرتبہ

خوشتر (منگرولی)

سالانہ للعہ/

ششماہی عہ۸/

نمونہ ۶/

مطبوعہ مطبع آگرہ اخبار آگرہ

زبان

جلد ۳ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۸ سنہ عیسوی | نمبر ۳

جناب والا۔ تسلیم۔ میں اردو کی ایک کتاب فارسی جدید کے طریقہ پر مرتب کر رہا ہوں جس کا منشا صحیح اردو کو ملک میں پیش اور رائج کرنا ہے۔ چونکہ قدیم اردو جدید اردو سے ملکر ایک نئی صورت اختیار کرتی جارہی ہے اسلئے ضرورت ہے کہ صحیح اردو سے ملک کو باخبر کیا جائے۔ اس کے لئے آپ جیسے ماہرین فن کی مدد کی ضرورت ہے۔

چونکہ یہ ایک ملکی اور قومی خدمت ہے اسلئے حسب ذیل امور کی طرف متوجہ کرکے جلد سے جلد (فرصت کے وقت) جواب کا منتظر ہوں اور آپکی امکانی مدد چاہتا ہوں۔

(۱) کم سے کم دو بہترین نظم جو جناب نے کسی موضوع پر کہی ہوں اگر غیر مطبوعہ ہوں تو سبحان اللہ (۲) کم سے کم دو بہترین نثر جو جناب نے مفید مباحث پر تحریر فرمائی ہوں (۳) اپنے مختصر مگر تفصیلی حالات جو جناب کے سکیں مع تاریخ ولادت وغیرہ (۴) اپنا فوٹو (جو بلاک لینے کے بعد واپس کر دیا جائیگا) (۵) ان بہترین حضرات کے اسماء جن سے آپ واقف ہوں اور مجھے ان سے مدد مل سکے مرحمت فرما کر شکر گزار کریں۔

اگر آپ کوئی مفید مشورہ دیسکتے ہوں تو اسکے لئے مزید شکریہ قبول ہو۔

{ سٹرک کلاں ایٹہ۔ یو۔ پی }

احقر العباد { سید مقبول حسین بھزاد }

زبانِ خلق

علی گڈھ میگزین (جلد ۵ نمبر ۵)

"زبان" کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ جناب خوشتر صاحب کی زیرِ ادارت منگرول سے نکلتا ہے جہاں اُردو کا بہت کم چرچا ہے اور اس لحاظ سے خوشتر صاحب نے اُردو کی ایک بڑی خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے مضامین مفید اور طبع زاد ہوتے ہیں۔ ترتیب بھی خوب ہے۔ غرضکہ ہر لحاظ سے رسالہ دیکھنے کے قابل ہے۔ جو لوگ اُردو زبان کی توسیع و ترقی چاہتے ہیں وہ اس رسالہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائیں۔

ظل السلطان (بھوپال جلد ۱۱ نمبر ۶)

"زبان" یہ کس کو خیال تھا کہ ایک دن کاٹھیاواڑ کی خشک اور بنجر زمین سے علم و ادب کا ایک تر و تازہ پودا ہمارے اُردو کی نظر نوازی کرے گا مگر خوشتر صاحب نے اردو زبان کے ساتھ اپنی حقیقی شیفتگی کو ثابت کر دکھایا۔ یہ رسالہ جناب خوشتر صاحب منگرولی کی ادارت میں منگرول (کاٹھیاواڑ) سے شائع ہو رہا ہے اور باوجودیکہ کتابت و طباعت کی مشکلات علمی مضامین کی فراہمی کی دشواریوں کے پہاڑ حائل ہیں مگر خوشتر صاحب کی کوہکنی اور تیشہ زنی نے ان موانعات پر کسی قدر قابو پالیا ہے۔ رسالہ زبان علمی اور ادبی مضامین اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا رسالہ ہے اور اگر جناب مدیر محترم کی یہی فرہاد منشی رہی تو ہم ایک دن اس رسالہ کو اردو زبان کے بہترین اور ممتاز رسالوں کی صف میں دیکھنے کی مسرت حاصل کریں گے۔

کیف (اجمیر شریف)

"زبان"، مانگرول۔ جس کے ایڈیٹر خوشتر صاحب ہیں اپنے مارچ و اپریل نمبر میں بعض ایسے علمی مضامین کا حامل ہے جنھیں صرف "معارف" "اردو" یا "نگار" میں ہونا چاہئے تھا، علامہ عبد العزیز صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی کا مضمون "اسلام کی بدنصیبی" جوان ترکی حکومت پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی دل کر سکتا ہے جسے سیاست اسلام سے نصیب وافر ملا ہو۔

"شعر جاہلیت کا انکار" "شہزادہ مرادبخش کی نظربندی" "رسم الخط" "کاشتکاروں کی حکومت" یہ ایسے گرانقدر مضامین ہیں جنہیں پڑھ کر ہر ذی علم ناظر اپنے خزینہ دماغ میں محفوظ کرے گا۔

سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے عالی لکھنوی کا مضمون "منازل حیات" بعید صاف بعید مفید اور بعید بلند ہے ایسے قیمتی مضمون کا اضافہ اردو لٹریچر میں صرف زبان ہی کا کام تھا۔ سید عابد علی صاحب عابدؔ کا مضمون "انداز (اشائل) اردو میں" بالکل جدید نوعیت کا مضمون ہے ایسے مضامین لکھنا عابدؔ صاحب کا مخصوص حصہ ہے اور اس مضمون کو پیش کرنا "زبان" کا "اخص حصہ"

"علمی حیثیت" سے رسالہ زبان ہر طرح مفید اور قابل مطالعہ ہے لیکن ہنوز خوشتر صاحب کو "عشاق"[۱۵] نہیں ملے ہیں جو اپنے نفسیاتی فسانوں سے زبان میں جان ڈال سکیں۔ قوی امید ہے کہ آیندہ حصہ ادب نثر اور نظم میں جو کمی ہے پوری ہو جائیگی ادبی حصہ جسقدر اب ہے بجائے خود خوب ہے ہمارا مقصد یہ ہے کہ رسالہ کا علمی پایہ بلند ہے اسی جوڑ توڑ سے ادبی حصہ کو ترتیب دیا جائے۔ اور خصوصاً نظمیات[۱۵] میں جو کمی ہے اس کو پورا کر دیا جائے تو رسالہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیگا۔ دبیز کاغذ۔ دیدہ زیب لکھائی چھپائی قیمت صرف چار روپیہ (للعہ) سالانہ۔ ہم اہل ذوق سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ زبان کا مطالعہ کریں اور اس لئے بھی کہ "زبان" منگرول سے نکلتا ہے جہاں اردو غیر مانوس ہے اس کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

---

۱۵ "زبان" یہ ایک بدیہی امر ہے کہ زبان کو ابتک نفسیاتی فسانے لکھنے والے میسر نہیں آئے بلکہ آج تک ایک فسانہ بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں نفسیاتی آمیزش ہو البتہ "ظلمتِ دل" اس صنف میں داخل ہو سکتا ہے مگر وہ انگریزی سے اس بُری طرح ترجمہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم نے خود دیکھا ہوتا تو ہرگز ہرگز درج زبان نہ کرتے مگر افسوس کہ ہم نے اپنی کم توجہی کے باعث اس فسانہ کو جس میں جا بجا زبان کی غلطیاں مترجم سے رنگینی میں درج کر کے ناظرین کے ذوق ادب کا خون کیا ہے جس کے لئے ہم خواستگار عفو ہیں۔

۱۵ نظموں میں بھی چند ایسی ہی نظمیں جو زبان کے معیار سے گری ہوئی ہیں درج زبان کر کے ہم نے اپنی "سخن فہمی" کا ثبوت دیا ہے جس کے لئے اب عذر کرنا بدترین معصیت ہے اور بعید از وقت ہے۔

نِکات

(از مُلّا رموزی)

"زبان" کا خاص نمبر شائع ہوگیا۔ ناظرین کا حوصلہ آزما انتظار ختم ہوگیا، عملۂ ادارت نے اس کی اشاعت سے فراغت پاکر فرصت کا سانس لے لیا، مضمون نگاروں کو "صفحۂ ادارت" کے عنوان سے اس طرح داد مِل گئی کہ کسی کے مضمون کے لئے لکھدیا گیا، انوکھا ہے، کسی کے لئے۔ فلسفیانہ نظر ہے، کسی کے لئے شکریہ لکھا گیا، کسی سے کہا گیا یہ آپ کی۔ زبان نوازی۔ ہے، اور شعراء تو سب سے زیادہ نفع میں رہے جن کے لئے یوں کہا گیا کہ۔ سب کے اشعار اچھے ہیں کس کس کو داد دی جائے صرف قبلہ استاذی علامہ محوی لکھنوی کو اپنی داد واپس نہ ملنے کا افسوس ہوا ہوگا، جو ایڈیٹر صاحب کے محض حُسن ظن کی بنا پر بغیر غزل ملے دیدی گئی تھی۔

غرض خاص نمبر ہر اعتبار سے۔ خاص۔ رہا جس کے لئے عملۂ ادارت خصوصًا مولینا خوشتر مستحق داد و ثنا ہیں لیکن وہ جو کہا ہے کہ ع

ایک مجھی سے ہیں خفا سب کی خطا معاف ہے

سو اس خاص نمبر میں ہماری "دماغ سوزی" کی داد ایڈیٹر صاحب نے یوں دی کہ سب سے آخر میں لکھدیا کہ "اس مرتبہ نکات میں ہمارے دوست مُلّا رموزی صاحب نے بہت پھیکا پکوان" پیش کیا ہے اور اسکا سبب (خود ہی تبلادیا کہ شاید اونچی دکان ہوجاتا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس حساب سے ہم مضمون نگار کا ہے کو رہے قوم کے "خاصے پنساری"[1] ہوگئے، اب اگر پنساری ہی ٹھیرے تو یہ تلاش کرنا باقی رہجاتا ہے کہ ہماری یہ اونچی دکان" آخر کس "چاندنی چوک" میں واقع ہوئی ہے؟ یقینًا ہمارے پنساری۔ ہونے کا علم تو ہر اُس خوش ذوق و خوش فہم انسان کو ہے جس نے ہمارے۔ بارہ مسالے کے چٹخارے دار "نکات" کا ایک دفعہ بھی مزا چکھا ہے، البتہ۔ اونچی دکان۔ کا محلِ وقوع ایسی جگہ ہے جسے ۱۹۲۶ء

---

[1] زبان۔ یہ کیوں اطلاع کی ہے کہ نہیں؟

میں خود ایڈیٹر صاحب۔ زبان۔ ملاحظہ فرما گئے ہیں اور یہاں کے خریداروں کی "چاٹ" کا بھی انہیں اندازہ ہوگیا ہے، اور اسی لئے خود ایڈیٹر صاحب۔ زبان بتائیں کہ ہماری اس دکان میں۔ اونچا پن۔ کس رُخ سے پیدا ہو سکتا ہے؟ آہ ہماری دکان کی جس "بے رونقی" کو دیکھ کر ۱۹۲۶ء میں خود ایڈیٹر۔ زبان۔ الاماں۔ پکار اُٹھے ہوں وہی آج اسے اونچا۔ کہیں تو ہر شکایت کے لئے کسے تلاش کریں؟

عزیز از جان خوشتر!

اگر تمہیں خیال ہے کہ تمہارے دوست مُلّا رموزی کیلئے بمبئی کے آسودہ حال تاجروں نے کوئی۔ نوبل پرائز۔ بخش دیا ہے تو تمہیں پہلے غور کر لینا چاہئے تھا کہ ہندوستان خصوصاً زبان اُردو کے سربلند ادیبوں کے لئے کوئی نوبل پرائز نہیں رکھ سکتا بلکہ یہ تو ملتا ہوگا کسی تھیٹر کے خوبرو اور خوش گلو ایکٹر کو یقین نہ ہو تو جا دیکھو بمبئی کے دولتمند مسلمانوں کی ایکٹر نوازی۔ اور۔ گھوڑا پروری، آپ کے اہل قلم تو اُس روایتی طویلے میں سبھے جاتے ہیں جہاں۔ فکر معاش، حوصلہ شکنی، اور، بے قدری، کی تمام بلائیں اُن کے سر پر ڈال دی جاتی ہیں، اور دور کیوں جاتے ہو خود اپنی۔ قدر افزائیوں کو دیکھ لو۔

اور جو تمہارا یہ خیال ہو کہ یہ جو دسمبر ۲۷ء میں افغانستان کے بادشاہ سلامت بمبئی سے گزرے تھے تو ویسرائے ہند نے بطریق۔ تحفہ۔ انہیں ضرور دو چار اچھے فلسفی۔ عمدہ۔ مورخ، اعلیٰ ایڈیٹر۔ اور اول درجہ کے مضمون نگار بھی پیش کئے تھے اور انہیں میں مُلّا رموزی صاف بھی شاہ افغانستان کے اسٹاف میں مقرر ہو کر چلے گئے ہوں گے اور اسی لئے اب وہ۔ پھیکے نکات لکھنے لگے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ایسا بھی نہ ہوا۔ اس کے مقابل اگر یہ خیال کرتے کہ ہو نہو مُلّا رموزی اپنی گل بار و گل ریز مضمون نگاری کے صلہ میں شہر لاہور کے۔ کوتوال صاحب۔ بنا دئے گئے ہوں گے تو یہ کسی قدر قرین قیاس بھی ہو سکتا تھا کیونکہ آجکل کے ارباب کمال کچھ ایسی ہی بے جوڑ اور بے تُک صورت سے بسر کر رہے ہیں اور قدر و منزلت اور اقتدار و عزت کی کرسیوں پر وہ مراد آبادی اُگالدان رکھے نظر آتے ہیں جن کے اندر سوائے بلغم کے کچھ بھی نہیں۔

اب رہ گیا کوئی اس سے بھی اونچا خیال وہ مرتبہ جہاں آپ بہ فیض خواجہ حسن نظامی مدظلہ ہمیں پہونچا ہوا پا رہے ہیں تو اس کے سمجھنے کے لئے ہم بھی اپنے قادیانی بھائیوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ازراہ القا و الہام ہمیں بتا دیں کہ ہم وہاں پہونچ کر۔ پھیکا پکوان۔ کیوں فروخت کر رہے ہیں؟ ہم تو ننھے میاں کی والدہ کے فیض سے جو کچھ سمجھے ہیں وہ لسانِ فطرت

عرفی شیرازی کے الفاظ میں یوں ہے کہ

"از پریشانیٔ دل سوختم و بہر علاج"
"ہم بدریوزۂ دل ہائے پریشاں، رفتم"
"منم آں میوۂ ارزندہ بہ بستانِ کمال"
"کہ بدست و دہنِ ذائقہ ارزاں رفتم"

ان حالات کے بعد بالکل ہی صاف سن لیجئے کہ سب کچھ ہیں مگر دفتر کے منشی جی۔ جیسے پہلے تھے آج اور اب بھی ہیں، اور وجہ خاص نمبر میں "ننھے میاں کی والدہ" اور "کمہاڑی" والا قصہ لکھا تھا وہ ہمارے اُن عقل سوز حالات کا سچا خاکہ تھا جن سے آپ کے اور ہمارے دوست یکساں واقف ہیں مگر ہماری امداد سے۔ بیچارے سب کے سب مجبور ہیں'

اب رہ گیا مضامین کا "پھیکا پن" سو اس کے لئے ہم نے۔ زبان۔ کی ابتدائی اشاعتوں میں صاف لکھدیا تھا کہ۔ نکات۔ کا عنوان صرف ہنسی مذاق ہی کے لئے خاص نہیں بلکہ اسمیں کام کی باتیں بھی ہوں گی اور اسی لئے اُن کا انداز بیان کبھی کبھی مولیانہ خشکی کا رنگ، بھی اختیار کریگا، مگر اس کو کیا کہئے کہ بعض لوگوں کا "معیار ظرافت" یہ ہے کہ اگر وہ خود ہنس پڑیں تو ظرافت ورنہ حماقت، مگر آپ بتلائیے کہ ایک ظریف مضمون نگار مضمون شائع ہونے سے پہلے تمام ناظرین سے یہ کس طرح معلوم کرلے کہ۔ یہ مضمون ظریف بھی ہے یا نہیں؟ آپ تو مضمون اپنے ناظرین کے لئے شائع کرتے ہیں لہٰذا اس کی پسندیدگی کا معاملہ بھی انہیں کے ذوق پر چھوڑ دیجئے اگر اُن میں لطافت ہے تو وہ کہیں ہنس پڑیں گے ورنہ ازلی تمام لوٹ بن کر آپ کا کرہی کیا لیں گے، ؟

یہ تو تھی ہماری اور حضرت خوشتر کی۔ باہمی۔ یا۔ خانگی۔ جس کے جواب[۵] میں ممدوح بھی کچھ تنک۔ یا۔ بے تنک۔ فرما ڈالیں گے اُن سے چپ رہنے کی امید ہمتو ہم، ہماری آیندہ نسلوں کو بھی نہیں، البتہ اب ایک عام بات کہتے ہیں اور وہ یہ کہ وہ جو ہم نے کسی پہلی اشاعت کے نکات میں لکھا تھا کہ حضرت خوشتر۔ نپولین کا ٹھیا واڑ۔ ہیں، سو آپ کے عزم و ثبات، حوصلے اور ہمت کا اندازہ اسی ایک امر سے کرلیجئے کہ۔ زبان۔ کی اشاعت میں، مالی مشکلات، نے آپ کو جس درجہ پریشان کیا، اور۔ رجسٹرڈ نمبر نہ ملنے پر ڈاک خانے کو جو سودیا ادبی لگان ادا کرنا پڑا۔ اُن پر یہ مضمونی مشکلات کہ ہر مضمون نگار سے مضمون کی وصولیابی تک

---

[۵] "زبان" آپ کی خفگی کا خیال ہے اگرچہ گنجائش بہت ہے۔

سلسلۂ دوستی قائم رکھنا خوشتر اور صرف خوشتر کا کام نہیں۔ تو کیا یہ خاص نمبر پولس کے اہتمام سے شائع ہو گیا؟ مگر آہ کہ صوبۂ کاٹھیاواڑ کے لوگوں میں خدا جانے کس۔ گھوڑ دوڑ، کا ذوق موجود ہے جو اب تک اپنے صوبے کے اس جلیل القدر ادبی علمی، تاریخی، اور، غزلی۔ رسالہ کی امداد پر متوجہ نہیں ہوتے پر نہیں ہوتے، یہ غزل سے غزلی رسالہ۔ بنایا ہے غلط ہو تو وہی کاتب کی غلطی سمجھ لو،

وہ جو دسمبر ۲۷ء میں۔ جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور میں شرکت کے لئے جاتے جاتے دہلی کے اسٹیشن پر صندوق چوری چلے جانے کی وجہ سے ہم نے اپنی رفتار یا سفر کا رخ علی گڑھ کی طرف پھیر دیا تھا سو یہاں اخباری رشتہ کے دو بھائی ملے تھے جن کے نام ابو الاثر حفیظ جالندھری ایڈیٹر۔ مخزن لاہور۔ اور بدر الحسن جلالی، بی۔ اے چیف ایڈیٹر اخبار۔ مدینہ بجنور۔ ہیں، ان سے مل کر اخبار اور رسالے کی اشاعت کا اضافہ یا خریداروں کی کثرت کا ایک تجربہ حاصل ہوا ہے جو ایڈیٹر صاحب رسالہ۔ زبان کے فائدے کے لئے درج کرتے ہیں۔

کچھ نوٹ۔ کہیں سے۔ اور کسی طرح لیکر کاٹھیاواڑ کا سفر کر ڈالئے اور رسالہ زبان کے کوئی پانچ اوپر سو پرچے اپنے ہمراہ رکاب رکھئے اور کسی بڑے آدمی کے گھر پر ٹھہر جائیے اگر اس کے ہاں موٹر ہو تو زیادہ بہتر ہے ورنہ سائیکل ہی سہی، صبح جو کچھ مل جائے ناشتہ میں کھا۔ پی لیجئے۔ اما بعد رسالہ کے خریداروں کی فکر میں چہل قدمی فرمائیے اور اگر مقامی پولیس یا کم از کم کچھ تھانیدار دوست ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ مقصد حاصل ہے، صرف تحصیلداروں سے احتیاط رکھئے کیونکہ یہ ہوتے ہیں پانیر پسند، اور ٹائمس خواں۔ اور جو یہ منظور نہ ہو تو سفر خرچ دے کر کسی سمت ہیں۔ جنرل مرچنٹ و کمیشن ایجنٹ بنا کر ارسال کر دیجئے، دیکھنا یہاں۔ جنرل مرچنٹ۔ کا لفظ صحیح ہے یا نہیں؟

صحافت اردو میں ابھی تک تو رسالوں کے خاص نمبروں کی گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی اب پنجاب کے اخبارات اردو نے سنڈے ایڈیشن کا مرض پھیلایا ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔ اتوار کے دن جو عیسائی بھائیوں کا مقدس دن ہے یہ تمام اسلامی اخبارات اپنے اخباروں کو دونی ضخامت اور رنگین صفحات کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور اسی کو سنڈے ایڈیشن کہتے ہیں اور یہ سنڈے ایڈیشن والے وہی پرجوش مسلمان ایڈیٹر ہیں جو آئے دن علی گڑھ والوں کو اسلئے برا کہتے ہیں کہ وہ "مسلم یونیورسٹی" میں بجائے جمعہ کے اسلامی تعطیل کے اتوار کی عیسوی تعطیل مناتے ہیں، کیوں صاحب یہ بجائے اتوار کے اگر تمام اسلامی اخبارات۔ فرائڈے ایڈیشن۔ شائع کریں تو کیا اسمیں انگریزی اخبارات کی تقلید نہ رہیگی؟ اور کیا سنڈے کیطرح فرائڈے انگریزی لفظ نہیں ہے؟ مگر وہ تو ان مسلمانوں کو لفظ سنڈے ہی میں نظر آتا ہے خدا ان سنڈوں مسٹنڈوں سے زبان اردو کو محفوظ رکھے جو آئے دن ایسے الفاظ کو اردو کا جز بناتے جا رہے ہیں،

صفحۂ ادارت

گذشتہ دو نمبروں میں ہمنے معزز خریداران زبان سے استدعا کی تھی کہ اگر ہر خریدار دو دو تین تین خریدار بہم پہونچائے گا تو ہم زبان کو جاری رکھہ سکیں گے ورنہ بند کر دیا جائیگا۔ لیکن افسوس بجائے اس کے کہ ہماری درخواست پر توجہ کیجاتی، ہماری صحیح حالت پر اندازہ کر کے زبان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا نہ تو کسی صاحب نے کوئی خریدار ہی عنایت کیا اور نہ ہمارے ساتھہ ہمدردی فرمائی بلکہ برعکس اس کے خود اپنی خریداری کے بارگراں سے سبکدوش ہو گئے۔ لہذا آج ہم بھی اپنی سعی ناشکور سے دل برداشتہ ہو کر بمجبوری اپنے فرائض سے دست بردار ہوتے ہیں ع تکلف برطرف تھا ایک اندازہ جنوں وہ بھی،

آہ! اس وقت کاش کوئی اتنا ہی کہدیتا ؎

جسکی کوشش کا کچھہ نہوا انجام رحم اس بے ہنر پہ آتا ہے

غالبًا صحافی دنیا میں "زبان" پہلا رسالہ جو ایک سال کی لگاتار کوشش کے بعد بھی صرف ۴۴ خریدار پیدا کر سکا شاید یہ مثال دنیا کی کسی زبان کی صحافت میں ڈھونڈھے سے نہ ملے گی تاہم ہمنے اس محدود اشاعت (بعض نادہند مقامی خریداروں کا چندہ تو ابتک وصول بھی نہیں ہوا) پر رسالہ کو جاری رکھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سال دوم کے آغاز پر بامید توسیع اشاعت ایک شاندار "خاص نمبر" بھی نکالا لیکن ہماری خدمات قابل پذیرائی نہ ہوئیں اور ملک نے زبان کا وجود غیر ضروری سمجھا کیونکہ جس وقت خاص نمبر کے وی۔ پی خریداران سابق پر کئے گئے تو صرف ۱۳ خریداروں نے وصول کئے باقی سب نے شکریہ کے ساتھہ واپس کر دیئے، نیز مقامی خریداران کی تعداد بھی نصف سے زائد کم ہو گئی ان حالات میں مزید نقصانات کے برداشت کی تاب نہ لا کر ہم "زبان" کو بند کر دینے پر مجبور ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات سے ملک و ابنائے ملک کی بےحسی و بدذوقی کو الزام دینا ہمارے نزدیک کفر ہے ہم ان تمام نامساعد واقعات کی جو آبیاری جو آئے دن پیش آتے رہے ہیں اپنے سر لیتے ہیں، ملک و ابنائے ملک کے احساس و ذوق کو ٹھیس لگانا ہمارا مقصد نہیں کیونکہ زبان میں جو لٹریچر پیش کیا جاتا تھا وہ کچھ عوام اور اہل کاٹھیاواڑ کے ہی ذوق کو مدنظر رکھکر پیش نہیں کیا جاتا تھا لہذا ہم اپنی نااہلیت کا اعتراف کرتے ہوئے ضرور کہیں گے کہ ہمنے یا زبان نے ملک کی صحیح معنوں میں کوئی خدمت انجام نہیں دی اور یہی سبب ہماری ناکامی کا ہے۔ البتہ اگر ہمنے عامیانہ زبان میں مبتذل خیالات کی نشر و اشاعت کی ہوتی تو غالبًا زبان کے مقبول ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ تھا لیکن اسکو کیا کیجئے کہ ایسا کرنا نہ صرف ہمارے ذوق صحیح کے منافی بلکہ ملک کی بہبودی کے بھی سراسر خلاف تھا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ عوام ابھی اس کے لئے تیار نہیں (خصوصًا اہل کاٹھیاواڑ تو ابتک اردو ہی سے بیگانہ محض ہیں) لیکن ہم سے بھی تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم محسوسات عوام کے تابع ہو کر زبان کو عامیانہ

خیالات کی جولان گاہ بنا دیتے لہٰذا ؎

میری بربادیوں کا سب الزام
میری ذوقِ نظر پہ آتا ہے

سالِ رواں میں جن حضرات نے وی۔پی وصول فرمائے ہیں اُن کی تعداد اس قدر کم ہے کہ ہمیں بتلاتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ وہی حضرات ہیں جو خالص علمی ذوق رکھنے والے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو باقتضائے تعلقات دوستانہ "مروت" کا شکار ہوا ہو۔ پھر کس طرح ہم زبان کو گویا کر سکتے تھے؟ کم از کم ہماری طاقت سے تو باہر تھا اس لئے ع

بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

اس مریض کی طرح جو بسترِ مرگ پہ پڑا ہوا ہو حالتِ نزع ہو ساری امیدیں منقطع ہو گئی ہوں تمام دولہ سرد ہو گئے ہوں، تمام بلائیں نازل ہو چکی ہوں مرگِ ناگہانی کا منتظر ہو ایک آخری سنبھالا لیتا ہے بعینہٖ زبان کی حالت ہے جو اپنا آخری سانس اپنائے ملک کی گود میں نہایت کرب و بے چینی سے توڑ رہا ہے ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی، کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے (میرؔ)

چمنستانِ زبان کی آبیاری کرنے والے غالبؔ مرحوم زبان کو صفحۂ ہستی سے یوں مٹتے ہوئے دیکھ کر اور ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی فرماتے ہوئے بے مہریِ زمانہ کی یوں شکایت کرتے ہیں ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تو خدائے سخن میرؔ علیہ الرحمۃ ہمارے صفحۂ ہستی سے اُٹھ جانے پر اس طرح نوحہ گسار ہیں ؎

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا دل بھی میرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

لیکن زبانِ اردو کے محسن مومنؔ مرحوم زبان کی جوانا مرگی کا ماتم کرتے ہوئے یوں ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں ؎

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط لیک اُٹھے بھی تو ایک نقش بٹھا کے اُٹھے

موجودہ نمبر میں "عربوں کے علوم" والا سلسلہ مکمل اور دو فسانے "شہید تغافل" اور "پہاڑی لڑکی" زبان کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے ہیں مگر افسوس کہ "علم اور اسلام" اسے مضمون کے جواب (علامہ سید جمال الدین افغانی مرحوم کے اصل مضمون کا ترجمہ کے لئے محبی قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کو "سیاست" کے دست استبداد

نے ”زبان“ کے لئے قلم اٹھانے نہ دیا ورنہ یہ کمی بھی اس کے ساتھ پوری ہو جاتی۔

زبان کو کامیاب بنانے کے لئے جتنے جو شاندار منصوبے باندھے وہ تمام خاک میں مل گئے اب اس جگہ اس کا ذکر بالکل فضول ہے۔ آہ

”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“

جن حضرات نے وی۔پی وصول فرما کر ہمیں مشکور فرمایا ہے اُن کی خدمت میں خاص نمبر اور موجودہ نمبر کی قیمت معہ منی آرڈر فیس وضع کرکے بقیہ نہایت شکریہ کے ساتھ واپس کرتے ہیں اور جدید خریداران کرام کی خدمت میں گذشتہ نو نمبر روانہ کرکے حساب بیباق کرتے ہیں امید کہ ہماری جسارت بہ نظر عفو دیکھی جائے گی۔

جن معاصرین نے زبان کا تبادلہ منظور فرما کر اپنے موقر رسائل و اخبارات سے ہمیں بہرہ یاب فرمایا ہے ان کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ آیندہ تبادلہ کی غرض سے کوئی رسالہ یا اخبار نہ بھیجا جاوے۔

آجکل جہاں نئی نئی ملکی تحریکیں عمل میں لائی جا رہی ہیں وہاں چند نہایت کارآمد اور اہم علمی تحریکیں بھی عملی جامہ اختیار کر رہی ہیں کہ جسکو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو زبان بھی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آئے گی۔ سب سے اہم تحریک ”ہندوستانی اکاڈمی“ کا وجود میں آنا اور لاہور میں شخص واحد کی کاوشوں سے اردو انسائیکلو پیڈیا کے تصور کا خاکہ تیار کرنا ہے۔ اسی طرح ہمارے لائق دوست جناب سید مقبول حسین صاحب بہزاد (ایٹہ۔یو۔پی) کا اردو کے مشہور انشا پرداز اور شعرائے نامور کا طرز جدید پر بالتصویر تذکرہ کی تدوین کا عزم نیز موقر معاصر ”ریاست“ دہلی کے قابل ایڈیٹر جناب دیوان سنگھ صاحب مفتون جنہوں نے اردو صحافت کو فروغ دیکر مغربی صحافت کی سی آب و تاب بخشی ہے اپنے زیر اہتمام ہندوستان کی اردو اخباری برادری کے اراکین کی زندگی کے حالات کتابی صورت میں بالتصویر شائع کرنیکا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان ہر دو صاحبوں کی تجاویز یقیناً اردو ادبیات میں ایک بیش بہا خزانہ فراہم کر دیں گی۔ ہم ان کی ہمت آفریں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز کے متعلق جو مطبوعہ گشتی رقعہ ہمارے پاس آئے ہیں ہم انکو ذیل میں بجنسہ نقل کرتے ہوئے مستند اہل قلم و اہل اخبار و رسائل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس پر توجہ فرما کر معزز مؤلفین کی مشکلات میں آسانی فرمائیں۔

خوشتر منگرولی

مضمون "ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف" (مندرجہ زبان بابت مئی وجون) کے بعض حصص (خصوصاً فتح ننگر دل کی بابت) پر سادات ننگرول کو سخت اختلاف ہے جن کا ایک معترضانہ مضمون گذشتہ خاص نمبر کے انہی صفحات پر درج کر چکے ہیں ہم نے اپنے نوٹ میں اس وقت لکھا تھا کہ ان وقیع اعتراضات کا جواب مولٰینا ابو ظفر صاحب ندوی مرحمت فرمائیں کہ معترضین کی تشفی ہو جائے چنانچہ ہماری اس استدعا پر مولٰینائے موصوف نے جواب عنایت فرمایا ہے جس کو ذیل میں درج کرتے ہیں اگرچہ معترضین کی تسکین خاطر اب بھی نہ ہوگی اور وہ اب بھی اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوں گے لیکن اب ہم اس معاملہ کو طول دینا نہیں چاہتے لہٰذا آیندہ اس کے متعلق کوئی تحریر درج رسالہ نہ کریں گے۔

"ایڈیٹر"

کرمی! جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون میں اپنے والد ماجد کے انتقال کے باعث وطن گیا ہوا تھا۔ واپسی پر "زبان" کا خاص نمبر مطالعہ کیا۔ جوابات حسب ذیل ہیں۔

(ا) نگر کوٹ اگر سندھ میں ہے تو برائے مہربانی کسی جغرافیہ کا حوالہ مع صفحہ و مطبع کے تحریر فرمائیں۔ علمی مباحث میں صرف اسقدر کہنا کافی نہیں ہوتا کہ "دیکھو جغرافیہ قدیم"

عفیف سراج نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ نے چھ ماہ تک نگر کوٹ کا محاصرہ کیا۔ اور اس عرصہ میں وہاں ایک دن قدرتی برف لوگ اس کے پاس لائے۔ جو اکثر وہاں گرتی رہتی ہے۔ مگر اس نے محمد تغلق کا ایک واقعہ یاد کرکے استعمال نہ کیا۔ برائے مہربانی مطلع فرمائیے کہ سندھ میں کونسا ایسا مقام ہے جہاں برف باری ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے محترم دوست کو "امرکوٹ" سے تشابہ ہوا ہے۔ امرکوٹ بلاشک سندھ میں ہے۔ لیکن نگر کوٹ ہرگز سندھ میں نہیں ہے۔ بلکہ دامن ہمالیہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع کانگرہ میں ہے۔ نگر کوٹ کا دوسرا نام "کوٹ کانگرہ" بھی ہے (دیکھو امپیریل گزٹ آف انڈیا جلد ۱۴ ص ۲۹۷)

(ب) فوج اگر کنورپال کی تنبیہ کے لئے نہیں گئی تھی۔ تو پھر آخر کسی دوسرے ملک پر بلا وجہ حملہ کیوں کیا گیا۔ کیا اشاعت اسلام بذریعہ تلوار کی گئی یعنی جبراً لوگوں کو مار مار کر مسلمان بنانا مقصود تھا۔ یا فقط ملک گیری اور جہاں گیری کا خیال تھا۔

(۲-۳) سر عسکر سید نارکن الدین رہ تھے اور عزیز الدین ماتحت اور دوسرے سپاہی آپ کے کمک کے لئے تھے "یہ واقعہ اگر کسی علمی دلائل یا تاریخی معلومات کا نتیجہ ہے۔ تو برائے مہربانی ان تمام سنگی کتابت، درقبجات، وپروانجات شاہی، وکتب تواریخ وکتب طریقت کا حوالہ بقید صفحہ ومطبع ضرور تحریر فرمائیں۔ میں جناب کا بیحد شکر گذار ہونگا تاکہ میری معلومات میں جدید اضافہ ہو۔ اور اپنے زیر تالیف کتاب "تاریخ گجرات" میں اس سے مستفید ہوں۔

اور اگر آباً عن جدٍ روایات ان کا ماخذ ہے۔ اور آپ کے معتقدات میں شامل ہے۔ تو اس کے تسلیم کر لینے میں مجھے کیا عذر ہے بغیر کسی کو آزار پہنچائے ہوئے۔ آزادی رائے ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ اور یقیناً دوسروں کی طرح اس سے آنجناب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محترمی! خط کشیدہ الفاظ سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ "سیدنا قطب الاقطاب" کے اشارہ سے سیدنا سکندر رح نے قصبہ منگلور میں سکونت اختیار کر کے اشاعت اسلام کی۔ کیونکہ اس وقت اسجگہ کفر ہی کفر تھا چنانچہ جیسا حکم ہوا۔ ویسا انجام دیا" (یعنی اشاعت اسلام میں مصروف رہے) یہ حکم ٹھیک اسی طرح تھا جس طرح سیدنا معین الدین چشتی رح کو اجمیر جا کر اقامت کا حکم ہوا تھا۔ جو اس وقت کفرستان تھا یا سیدنا محمود شاہ منگولی (عراقی) کو اس سے قبل اسی دیار میں رہنے کا حکم ہوا تھا۔ خط کشیدہ فقرات سے جنگی مناظر تو کہیں نظر نہیں آتے۔

(۴-۵) مکرمی! مجھے تو خود تسلیم ہے کہ اگرچہ تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مگر مسجد کا کتبہ اس کا شاہد عادل ہے جیسا کہ میری تحریر میں موجود ہے۔ پھر مابہ النزاع کیا رہا؟

(۶) "منگولی کے عوام" کی تعریض واقعی غیر ضروری ہے۔ مجھے لکھتے وقت یقیناً اس کا احساس نہ تھا کہ اس سے سادات منگلور کے جذبات میں تموج پیدا ہوگا۔ میں اس غیر محتاط روش کے لئے متاسف ہوں۔ یہ اخلاقی بات تھی۔ باقی رہا نفس مسئلہ تو وہ رقعہ مسطورہ سے کچھ متاثر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نمبر ۳ میں تحریر کر چکا ہوں۔

(۷) مجھے ڈولہی کی روائت پہنچی تھی اب میں اس کی تصحیح کر لونگا۔

(۸) بحث طلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں نے ایسا کیا یا نہیں۔ اور نہ شریعت کے مسائل جائز و ناجائز کا فتویٰ مدنظر ہے گفتگو اس میں ہے کہ ایسے بلند پایہ اکابرین دین کا عام طور پر طرز عمل کیا رہا ہے۔

طارق موسیٰ، ابن قاسم، قتیبہ، محمد فاتح، صلاح الدین، الپ ارسلان، عالمگیر، جیسے سلاطین اور جنرلوں کے لئے اسباب دنیا ہی سے مستفید ہونا، یقیناً ان کے لئے باعث فخر ہے۔ لیکن سیدنا بایزید بسطامی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن خرقانی، عبدالقادر جیلانی، جہانیاں جہاں گشت، معین الدین سجزی (اجمیری) نظام الدین اولیاء (رحمہم اللہ) کے لئے بھی باعث فخر ہوگا؟ یہ ایک غور طلب بات ہے!۔

میرے نزدیک سیدنا سکندر رح مؤخر الذکر لوگوں میں شامل ہیں۔ اگر آنجناب کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو تو مجھے بھی اصرار نہیں ہے۔ کہ آزادی رائے میں ہر شخص مختار ہے۔

(۹-۱) میں نے قاضی مرتضیٰ کی مثنوی دیکھکر یہ رائے قائم کی تھی کہ غالباً یہ سب سے آخری جنگ ہے جس کے بعد مرہٹے پھر کبھی

منگلور پر قابض نہ ہوئے۔ اور واقعہ مندرجہ تاریخ سورٹھ اس سے قبل کا ہے۔ اور "صاحب البیت ادری" کا خیال کرکے ایک سرسری رائے قائم کرلی تھی۔ اب جناب کے توجہ دلانے سے میں اسکے متعلق خاص تحقیقات کررہا ہوں۔

تاریخ سورٹھ کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے اتفاق نہیں۔ شائد ہندؤں کی تاریخ پر آنجناب نے نگاہ غائر نہیں ڈالی۔ اسی نے راجہ بھان اور چل تن کے قصہ کا تذکرہ فرماکر افسردہ خاطر نظر آتے ہیں۔

ہندؤں کو تاریخ کا مذاق نہ تھا۔ اور اسی سبب سے تاریخی کتب ان کے یہاں تقریباً معدوم ہیں۔ بھاٹوں کی داستانیں، رشی اور منی کے تذکرے، اور شعراء کی مثنویاں، تاریخی مواد کا بہترین سرمایہ ہے۔ اسلئے ایک تاریخ سورٹھ پر آپ کیا ماتم کررہے ہیں۔ ایں ہمہ خانہ آفتاب است۔ اس سبب سے مورخین مجبور ہیں۔ کہ اسی "خریطہ فضولیات" کو پیش نظر رکھیں۔ اور جہاں جہاں سے غلطیاں صریح طور پر کسی دلیل علمی یا انکشافی کے ذریعہ معلوم ہوتی جائیں۔ درست کرتے جائیں۔ ورنہ اسی کو مسلمات سمجھیں۔

سومنات کے متعلق چاند کا ایک باپ کی متعدد لڑکیوں سے شادی کرنا، اور چھوٹی لڑکی سے ازدیاد محبت کے سبب باقی لڑکیوں سے بے پروائی، باپ کی تنبیہہ پر بھی کان نہ دہرنا، اور آخرکار بددعا دینے سے چاند کا برص کی بیماری میں مبتلا ہوجانا۔ ایک ایسا واقعہ ہے کہ کوئی صاحب علم وعقل تمسخر آمیز تبسم کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ابوریحان بیرونی جو ابوعلی سینا کا ہم پایہ سمجھا جاتا ہے۔ باوجود محقق ہونے کے اپنی مشہور کتاب "کتاب الہند" میں اسی "طومار زٹلیات" کو درج کرنے پر مجبور ہے۔ صاحب مرءۃ احمدی اور سکندری نے متعدد غلطیاں کی ہیں۔ فرشتہ اور بدایونی نے مختلف جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سیر المتاخرین کے ابتدائی اوراق کو تاریخ کہنا، "بقول آپ کے" تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ مع ہٰذا۔ میری تو یہ جرأت نہیں ہوتی ہے کہ بعض واقعات غلط ہونے سے ان تمام تاریخوں کے متعلق کہدوں کہ "ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ"

(مولینا) سید ابوظفر ندوی
(پروفیسر مہاودیالے) احمد آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

بابت ماہ مارچ ۱۹۲۸ء

مقالات

وجود باری عزاسمہٗ

(از مولینا محمد افتخار علی صاحب مُلّا عالم و فاضل)

لہٗ کل ذرات الوجود شواھدٌ — علی انہ الباری الالٰہ المصوّرُ

آفتاب اور ماہتاب کا وجود اتنا بدیہی نہیں جتنا کہ خلاق عالم کا ثبوت روشن اور جلی ہے اسی وجہ سے انبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصلی نصب العین صرف توحید کی دعوت رہی اور جن کو سرے سے اپنے خالق ہی میں شک تھا ان سے نہایت تعجب سے یہ خطاب فرمایا۔

قالت رسلھم افی اللہ شک فاطر السمٰوات والارض	رسولوں نے کہا کہ کیا تم کو اللہ کے بارے میں بھی کسی قسم کا شبہ ہے جو کہ آسمان اور زمین کا بنانے والا ہے

غالباً کوئی بے حس اور کور چشم بھی ایسا نہ ہیگا کہ جو یہ جانتا ہو کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردہ عدم میں مستور تھے اور عنقریب پھر ایسا ہی ایک زمانہ آنے والا ہے کہ ہم اسی پردہ میں مستور ہو جائیں گے۔ ہمارا وجود دو عدموں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ جس طرح نور زمین شب گزشتہ اور شب آیندہ کی دو ظلمتوں میں محصور ہے، نور کی یہ آمد و رفت بہ آواز بلند کہہ رہی ہے کہ یہ نور، زمین کا خانہ زاد نہیں بلکہ مستعار اور عطاء غیر ہے۔ نور آفتاب اور حرارت آتش کی طرح اصلی نہیں۔ پس جس طرح نور زمین اور گرمی آب آفتاب اور آتش کا فیض ہے اسی طرح ہمارا مستعار وجود بھی ضرور کسی ایسی ذات کا فیض ہوگا کہ جس کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہو۔

کیونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر فرع کی انتہا کسی اصل پر اور ہر مستعار کا اختتام کسی معطی پر ہونا چاہیئے ورنہ اگر وہ اصل ہی معدوم ہو تو فرع کہاں سے وجود میں آئیگی اگر معطی ہی نہیں تو عطا کہاں سے آئی؟

اعداد کے سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ اول سے لیکر اسے غیر النہایۃ چلا گیا ہے مگر تمام سلسلہ کا انقطاع واحد پر ہو جاتا ہے کیونکہ اول اور ایک اصل ہے اور باقی اعداد اس کی فرع ہیں اعداد کا سلسلہ بدون اول کسی طرح چل ہی نہیں سکتا کیونکہ اعداد کے تمام مراتب اپنے وجود میں اول کے محتاج ہیں اور اول ان سب کے لئے اصل ہے۔

آفتاب کو دیکھئے کہ ہزاروں لاکھوں مکانات کو نور عطا کرتا ہے اس لئے عالم اسباب میں تمام روشنیوں کا سلسلہ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے پس اسی طرح ہمارے وجود مستعار کا بھی سلسلہ اسی ذات پر منتہی اور مختتم ہونا چاہیئے کہ جس کا وجود، اصلی، ذاتی اور خانہ زاد ہو اور وجود اسکی ذات کے لئے اسی طرح لازم ہو جیسے آفتاب کے لئے نور اور آتش کے لئے حرارت اور چار کے لئے زوجیت اور تین کے لئے فردیت۔ یہ ناممکن ہے کہ آفتاب ہو اور نور نہ ہو آتش ہو اور حرارت نہ ہو، چار ہوں اور زوجیت نہ ہو تین ہوں اور فردیت نہ ہو اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ ذات خداوندی ہو اور اس کے لئے وجود نہ ہو۔ اسی موجود اصلی کو اہل اسلام خدا اور واجب الوجود کہتے ہیں اور اس آیت میں اس دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم

تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے موجود نہ تھے، پس خدا نے تمکو حیات عطا کی اور پھر تم کو فنا کر دیا

عربوں کے علوم

(بسلسلہ ماہ مئی و جون ۱۹۲۷ء)

(از جناب مظہر احمد صاحب ادیبی ملا و منشی فاضل)

عربی خط کی تاریخ

حروف کا استعمال جزیرۃ العرب میں اتنے قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ ان کی ابتدائی صورت اور درمیانی تغیرات کا صحیح پتہ لگانا آسان کام نہیں۔ تاہم قدیم کتبوں اور حضرات سے برآمدہ اشیا کی مدد سے یہ عقیدہ بہت کچھ حل ہو جاتا ہے جہاں تک ہم معلوم کر سکے وہ یہ ہے کہ حکومت سومریوں میں کتابت کا اختراع ہوا۔ لیکن جب حورابیہ کا جو سامی الاصل تھے دور دورہ ہوا تو انھوں نے اسی طرز تحریر اور حروف کو اپنی مکاتبات میں رائج رکھا اور اسی میں اپنی زبان کی تدوین کی چونکہ زمانہ تو کبھی ایک حالت پر رہا اور نہ رہتا ہے۔ سو یہ کیونکر ممکن تھا کہ یہ حروف ایک ہی انجمادی حالت پر رہتے۔ حورابیوں نے اپنی ضرورت کے اعتبار سے چند ایسے حروف کا جو سومریوں کی کتابت میں نہ تھے اور اضافہ کیا۔ جس کی وجہ سے مطالب اور عبارات زیادہ صفائی سے ادا ہونے لگے۔ سومریوں کے حروف تہجی مصر کے خط تمثال (ہیروگلف) سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ چونکہ تحریر مسماری قدیم جو عہد سومریوں سے چلی آتی تھی اس سے کتابت اور اظہار خیال میں بے حد طوالت ہوتی تھی اور تھوڑے سے مطلب کی ادائیگی کے لئے بہت سی جگہ اور وقت صرف ہوتا تھا۔ اسلئے حورابیوں نے وقتی ضرورت کے لحاظ سے اس میں نمایاں تبدیلی کی اور گارے کے حروف بنا بنا کر تعلیمی کام لیتے تھے تاآنکہ سومریوں کے حروف ابجد یہ نے اپنی شکل و صورت تبدیل کر کے نیا جامہ پہنا جس کا رواج شاہان ہخامنشی کے عہد میں عام تھا اور اسی میں کل تحریریں لکھی جاتی تھیں ان کے آثار بے ستون۔ استخر۔ دست مرغاب وغیرہ کے کھنڈرات کے کتبوں میں مختلف صورتوں اور رنگوں میں موجود ہیں ان حروف کی تعداد موجودہ عہد میں ۳۰ ثابت ہوئی ہے۔

یہ سنت الٰہی ہے کہ انسانی مصنوعات میں ہمیشہ تغیر و تبدل اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے چنانچہ سامیین کا جب عراق پر تسلط ہوا تو ان کی سرکاری اور غیر سرکاری زبان لغتہ بابلیہ تھی۔ مگر کتابت میں حروف مساری جن کو انھوں نے سومریوں سے سیکھا تھا استعمال کرتے۔ یہی وہ حروف تہجی تھے جن کی تمام معلومہ دنیا پر حکومت تھی کیونکہ اہل عراق اور فارس وغیرہ اپنی تمام علوم انھی حروف میں مدون کرتے تھے۔ تقریباً ایک ہزار برس تک انھی کا دنیا تمدن پر تسلط رہا۔ اس پر عظمت خط کے آثار صفحہ عالم سے بالکل محو نہیں ہوئے ان کے اکثر حصے جو پتھروں پر کندہ ہیں آج بھی موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی صورتیں اور نگارش گوناگوں ہیں مگر ان سب کا طرز تحریر اور شان خط ایک ہی ہے۔ ہم ذیل میں بطور نمونہ چند سطریں کتبہ داریوش واقع استخر کتاب "تاریخ مصور خط" تالیف نادلیس چاپ ڈینے سے پیش کرتے ہیں۔

کتبہ داریوش بخط میخی

خط میخی کی ان چند سطروں کا ترجمہ ہے "آہورامزدا خدائے بزرگ ہے۔ اس نے اس زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس نے آسمان پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان اور خوشحالی کو پیدا کیا ہے۔ اس نے داریوش کو بادشاہ۔ اور بہت سے بادشاہوں میں یگانہ اور بہت سے حکمرانوں میں یگانہ حکمران کیا ہے"۔

اگرچہ حروف مسماری نے متمدن دنیا پر ایک ہزار برس تک بلاشرکت غیرے حکومت کی۔ لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ قانون تغیر ان پر اثر نہ کرتا۔ لہٰذا جب تک دنیا پر بابلیوں کا اقتدار قائم رہا یہ حروف بھی برابر حکمرانی کرتے رہے۔ لیکن حکومت بابلیہ کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ ان پر نظر پڑنے لگی۔ کیونکہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ کسی حاکم قوم کی زبان حروف تہجی اور دوسرے اثرات اسی وقت تک قایم و زندہ ہیں جب تک وہ قوم زندہ اور برسر اقتدار ہے۔ جہاں اس قوم کی حکومت اثر اور اقتدار کا خاتمہ ہوا کہ اس کے تمام سیاسی علمی اور ادبی اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں وہی ادبیات جن کو لوگ فخر کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اب وہ تنقیدی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ نقائص و کمزوریاں جنکو حکومت و دولت نے اپنے پردہ میں چھپا رکھا تھا بے نقاب ہو کر صاف نظر آتے ہیں چنانچہ اب خاسماری کی جو حکومت کتابت پر تھی وہ کمزور پڑ گئی۔ چونکہ مہذب دنیا کی سیاست و تجارت پورے طور سے آرامیہ قوم کے قبضہ میں منتقل ہو گئی تو یہ حروف تہجی بھی جو فینیقین کی یادگار تھے اب قابل اصلاح و ترمیم نظر آنے لگے۔ اور ایک نئی صورت جو صدیوں کی اصلاح و تبدیل سے پیدا ہوئی تھی اس کے قائم مقام ہو گئی۔ اور چونکہ انسان طبعاً آسانی پسند ہے اسلئے وہ ان باتوں کو جن میں آرام و آسانی ہو زیادہ پسند کرتا ہے۔ کیونکہ جدید طرز تحریر میں نسبتاً سہولت تھی پس بوجہ سہولت تحریر بھی تمام متمدن دنیا کے حروف تہجی بن گئے یہانتک کہ خود بابلیوں نے بھی اپنے حروف تہجی کو خیرباد کہہ کر اسی کا خیر مقدم کیا اور اپنی زبان کی خدمت انہی سے کرنا شروع کر دی۔

حروف آرامیہ

زمانہ جاہلیت کی کتابت عربوں کا جب متمدن دنیا سے میل جول ہوا اور انہوں نے دور دراز ملکوں میں تجارتی اور سیاسی ضروریات کے لحاظ سے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنے ہر ایک معاملہ کا حساب و کتاب اور نظم قائم رکھیں اس لئے انہوں نے آرامیہ کو سیکھا اور سہولت کے سبب سے اس طرز تحریر کو اختیار کیا۔ چونکہ طبایع انسانی کو قدرت نے نچلا بیٹھنے والا نہیں پیدا کیا ہے اور قانون تغیر کے ماتحت ہر وقت کام کرتی رہتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اہل عرب کی ذہین طبیعتیں بے کار پڑی رہتیں چنانچہ انکی طبائع بھی حروف کی درستگی کی طرف مائل رہیں اس لئے چند صدیاں گزرنے کے بعد آرامیہ خط کی بہت سی شاخیں ہو گئیں اور نام بھی جدا جدا ہو گئے مثلاً تدمیری نبطی وغیرہ وغیرہ لیکن حروف و شان خط ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے عرب اسنہ قبل مسیح تک لغت و تحریر آرامیہ ہی کا استعمال کرتے رہے چنانچہ عائذ بن کہیل کی قبر پر جو کتبہ لکھا ہوا ملا اس سے اس امر کی کافی شہادت ملتی ہے اس کتبہ کی پہلی اور دوسری سطر ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج ہیں۔

= دنہ قبرای دی عید عید دبر کھیلو بر

(فصیح عربی میں ترجمہ) = ہذا ہو القبر الذی بناہ عائذ بن کہیل بن

الکی لنفسہ دیلہ واوہ دلمن دی ینلق بیدہ

(فصیح عربی) التی لنفسہ ولاولادہ واعقابہ ولمن یکون بیدہ

لیکن اس کے بعد پھر قانون تغیر نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنا اثر کیا جس کا پتہ مختلف کتبوں سے چلتا ہے کہ ان حروف نے پھر روپ بدلا اور ایک نئی صورت اختیار کر لی چنانچہ کھنڈرات رواق اعظم واقع تدمر پر جو نقوش کندہ ہیں انکی شکل بہت کچھ بدلی ہوئی ہے جس کی ایک سطر ذیل میں درج ہے۔

(ترجمہ) علت سطیابت زبای برتا ودقنا = بتمثال سمیات بنت زبای جلیلہ ونقیہ

یہ امر مسلم ہے کہ ہر جدید حکومت اپنے ساتھ بھلے یا بُرے اثرات ضرور لاتی ہے۔ پس جب سومریوں کی فرماں روائی ختم ہوئی اور زمام حکومت حمورابیہ خاندان کے ہاتھ میں آئی تو وہ اپنے ساتھ نئی باتیں اور اثرات لائے جالایہ کیونکہ ممکن تھا کہ الف یا جس پر تمدن اور زندگی کا مدار تھا اپنے ساتھ نہ لاتی چنانچہ ان حروف کی شکل و طرز تحریر میں تدریجی تغیر ہوتا رہا۔ اب لطف یہ ہوا کہ فنیقیہ ابجد سہل تھی اور مطالب کو تیزی و سہولت کے ساتھ جمع کر لیتی تھی اس لئے عام رجحان اس کی طرف رہا۔ دریا کا بہاؤ اور عامہ مخلوق کے جذبات کسی کے اختیار میں نہیں یہی وجہ تھی کہ سب نے اسی کو اختیار کر لیا۔

جب عربوں نے بادیہ پیمائی سے نجات پائی اور یمن میں مقیم ہو کر متمدن زندگی بسر کرنا شروع کی تو انہوں نے بڑی بڑی عمارتوں یادگاروں کے ساتھ ساتھ خط کی عمارت بھی تیار کی مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ حروف جو حکومت بحکومت منتقل ہوتے آئے تھے اس دولت و حکومت کو نہ ملتے۔ چنانچہ یمن کے عربوں کے حصہ میں بھی جو قوم ہو دسے تھے یہی ابجد بحیثیت ورثہ سلطنت منتقل ہو کر آئی۔ لیکن اب اسکی وہ حالت نہ تھی جس نے جو شکل چاہی بنالی بلکہ حروف نے معینہ شکل اختیار کر لی تھی اور ہر ایک حرف کا مستقل نام رکھا جا چکا تھا جسمیں رد و بدل کرنے کا حق کسی کو نہ تھا۔ اگرچہ ایک ایک حرف کئی کئی صورت سے لکھا جاتا تھا۔ مگر ان دو چار معینہ شکلوں کے سوا اور کسی طور سے لکھ دیا جاتا تو گویا وہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس حرف تہجی کا نام انہوں نے مسند رکھا اور اپنی زبان حمیری کو اسی میں مدون کیا جو تقریباً سنہ قبل مسیح تک اپنا ڈنکا بجاتی رہی۔ ابجد مسند کے حرف الگ الگ لکھے جاتے تھے۔

اہل یمن خط کے معاملہ میں بڑے سخت تھے عام لوگوں کو اپنے حروف تہجی کی تعلیم دینے سے گریز کرتے تھے امراء میں سے بھی خواص کے بچوں کو بہت ہی غور و تامل کے بعد بتلاتے۔ عرب کے دوسرے قبائل کے ساتھ اس معاملہ میں زبردست رازداری سے کام لیتے تھے اور کسی طرح اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اہل یمن کے سوا کسی اور کو اس کی ہوا بھی لگ سکے۔ مگر دوسرے قبائل بھی اس کی تاک میں تھے آخر جو ینده و یا بنده قبیلہ بنی طے کے چند آدمیوں نے کسی طرح سے اس کو سیکھ لیا اور اس میں اپنی ضرورت کے مطابق تصرف کر کے اس کا نام خط جزم رکھا۔ پھر کسی ترکیب سے اہل انبار نے سیکھا۔ ان کے شاگرد اہل حیرہ بنے اور اس قبیلہ سے اہل حجاز نے حاصل کیا۔ ان کے ہاں جب کتابت پہنچی تو رازداری کا پردہ اُٹھ گیا اور تمام عرب میں اس خط کا رواج ہو گیا۔

پھر بھی وقتاً فوقتاً خط میں تغیر و تبدل برابر ہوتا رہا حتیٰ کہ عرب کے مختلف حصص میں حروف کی شکلیں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ امرالقیس بن عمرو متوفی ۳۲۸ء کی قبر پر جو حروف کندہ ہیں وہ مسند نہیں بلکہ نبطی ہیں اور زبان بھی حمیری نہیں بلکہ لغت العربیہ شمالیہ یا لغتہ عدنان ہے اور ۳۲۸ء تک شمالی عرب میں یہی زبان رائج تھی امرالقیس کی قبر کے کتبہ کی پہلی سطر یوں ہے

[illegible]

ہذا قبر امرالقیس بن عمرو ملک العرب کلہ ذو التاج = تی نفس مرالقیس برعمرو ملک العرب کلہم الذی تقلد تاج

کم وبیش یہی حروف کل جزیرۃ العرب میں مستعمل تھے۔ انہی حروف نے بتدریج ترقی کرکے خط کوفیہ کی شکل اختیار کی جو اسلام سے ایک صدی قبل سے مامون عہد تک رائج رہا۔ اور مصحف پاک کی کتابت بھی خط کوفی میں ہوتی رہی یہاں تک کہ اب پھر حروف اور تحریر کے بارہ میں اختلاف ہوا۔ کیونکہ اس عرصہ میں اس خط نے بیس سے زائد صورتیں اختیار کرلی تھیں یہاں تک کہ ابن مقلہ نے ۳۲۵ھ میں خط نسخ کا اختراع کیا جو آجتک مستعمل ہے۔

ابتداء اسلام کی نثر

قبل از اسلام چونکہ عربوں میں حضریت اور مدنیت بالکل نہ تھی اس لئے اپنے علوم کو مدون کرنے کی متعاد نہ تھے ان کی نثر کے نمونے ایک دو کتبوں کے سوا اور کوئی ڈھونڈھے نہیں ملتے کہ خیالات کا نظم میں ظاہر کرنا عربوں کی خصوصیات میں سے ہے اور قدرت نے یہ ملکہ ان میں کچھ اس طرح ودیعت کیا تھا کہ بچہ کے مُنہ سے بھی جو لفظ نکلتے تھے وہ موزوں ہی ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ دُنیا کی مختلف اقوام کی تواریخ علم ادب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں اولیت کا سہرا نظم ہی کے سر رہا ہے۔ اور اس کے کہیں بعد نثر وجود میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جاہلیت کے قصائد تو بکثرت ملتے ہیں جس سے انکی تمدنی معاشرتی اور اخلاقی حالت پر کافی طور پر روشنی پڑجاتی ہے۔ لیکن ان کے مقابلہ میں نثر کا کہیں پتہ نہیں ملتا میں بلاخوف تردید کہوں گا عربوں کی اولین نثر قرآن پاک ہے جس کی برکت سے عربوں کی نثر یک بیک بلاغت کے انتہائی معیار پر آگئی۔

(۱) قرآن مجید۔ قانون نشو و نما کا اثر جس طرح جملہ مخلوقات عالم پر پڑتا ہے اسی طرح انسان کی بات بات پر قانون ارتقار کا ہر وقت عمل ہوتا رہتا ہے۔ زبان اظہار خیالات اور زندگی کے جملہ کاروبار کا سب سے زبردست آلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کا زبان پر سب سے زیادہ اور جلد اثر ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات دلی جس صفائی کے ساتھ نثر میں ادا کئے جا سکتے ہیں وہ بات نظم میں پیدا نہیں ہوتی انہی وجوہ سے ابتدار اسلام ہی میں قرآن مجید کی برکت سے عربوں کی نثر کو کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ قاعدہ ہے کہ جسقدر قومی وملکی ضروریات بڑھتی ہیں اسی قدر زبان میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ عربی نثر کے وجود استعمال کا میدان پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع ہوگیا۔ جب ملک متمدن ہوجاتا ہے تو ضروریات اسی نسبت سے زیادہ ہوجاتی ہیں اور اب ان کے لئے الفاظ اور طرز ادا کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اسی احتیاج نے اسالیب زبان میں کیا بلحاظ عبارت اور کیا باعتبار الفاظ رونق وحسن پیدا کردیا جس کا سب سے محرک قرآن ہوا۔ جس کے بیان نے اُن کو نئی نئی اسالیب کی تعلیم دی۔

عربوں کے فتوحات کے ساتھ ساتھ ان کی مدنیت بھی ترقی کرتی گئی کیونکہ جب ایک غیر متمدن مگر فاتح قوم کسی دوسری متمدن قوم سے ملتی ہے تو اس کی بدویت زائل ہوکر علو ہمتی اور بلند خیالی پیدا ہوجاتی ہے۔ وسعت خیال کا لازمی طور سے زبان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان اثرات نے ان کے طبعی رجحان میں رقت طبائع میں نرمی پیدا کرکے انکی بدوی حالت کو تہذیب وشائستگی سے

بدل دیا اور اب وہ الفاظ کے معانی اور ان کی تراکیب پر زیادہ غور و فکر کرنے لگے۔ پس وہ اسالیب جو زمانہ جاہلیت سے چلے آ رہے تھے، کلام مجید کی نادر بلاغت کے سامنے نظر سے گر گئے۔ اور وہ اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اس طرح قرآن پاک کے نادر اسالیب نے ان کو تمدن اور شائستگی کے اخلاق کا نمونہ بنا دیا۔

کلام الٰہی کے زبردست حسن بیان نے اہل عرب کو زبان کے اسالیب کے استقرار، اور اس کو قواعد عامہ کے تحت میں لانے کی طرف مائل کر دیا۔ حیات عقلیہ کی ابتدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد امون سے ہوئی کیونکہ آپ نے قواعد علم نحو کو خود وضع کر کے اسود کو حکم دیا کہ علم نحو کی تکمیل کریں تاکہ اس علم کی وجہ سے ترکیب و اسلوب زبان ایک حالت پر قائم رہے اور زبان میں تغیر نہ آسکے اگر علم نحو نہ ہوتا تو یقیناً جملوں کی ترکیب زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جاتیں۔ اسی بنا پر ابتدار اسلام سے لے کر دولت امویہ کے آخر تک قوم نے اپنی پوری کوشش وسعی سے کام لیا کہ ہر شخص صحیح بولے اور تکلم میں فرق نہ آئے تاکہ کلام اللہ اور حدیث نبوی صلعم کی تفہیم پر کوئی خراب اثر نہ پڑے۔

صرف یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی بدولت بہت سے علوم متدون ہوئے تاکہ کلام الٰہی کو اچھی طرح سمجھا اور اس سے احکام کا استخراج کیا جاسکے۔ قرآن ہی کی برکت ہے کہ عرب سے امیت رخصت ہوئی اور ان کی حیات عقلیہ درست ہوگئی۔ ابتدار اسلام میں قرآن ہی نے عرب کو علوم ادبیہ اور مذہب میں مشغول و معروف کیا زبان عربی کے جملہ علوم و فنون اسی کی وجہ سے درجہ کمال پر پہنچے۔

(۲) احادیث۔ عربی نثر میں دوسرا درجہ احادیث نبوی کا ہے جو سنت نبویہ اور آیات قرآنیہ کے مجملات کی تفصیل کا مجموعہ ہیں۔ صحابائے کرام ان کو لفظاً بہ لفظاً حفظ کر لیا کرتے تھے اور انہی الفاظ کو جو رسول اکرم صلعم کی زبان معجز بیان سے ادا ہوتے تھے محفوظ رکھتے تھے۔ مگر وہ ان کو اس خوف سے لکھتے نہ تھے کہ کہیں قرآن پاک سے اختلاط نہ ہو جائے۔ لیکن جبکہ عمر بن عبد العزیز مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے احادیث کو کتابی شکل میں جمع ہونے کی ضرورت کو محسوس کر کے ان کے مدون کرنے کا حکم دیا۔ عربی زبانیں قرآن مجید کے بعد بلاغت و الشار آیات بینات ہیں اور کوئی نثر احادیث کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ چنانچہ خلیفہ ابن عبد العزیز کے حکم سے محمد شہاب الزہری نے ۱۰۰ھ کی ابتدار میں احادیث کو کتابی صورت میں لانا شروع کیا اور امام مالک نے سب سے اول احادیث کو اپنی کتاب موطا میں جمع کیا۔ موطا امام مالک کے علاوہ احادیث کی چھ کتابیں بہت مشہور ہیں۔

(۱) بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) (۲) مسلم (متوفی ۲۶۱ھ) (۳) ابو داؤد (متوفی ۲۷۵ھ) (۴) ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ)
(۵) نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) (۶) دارقطنی (۳۸۵ھ)

(۳) خلفائے کا مواعظ۔ نثر میں تیسرا درجہ خلفار راشدین کی تقاریر کا ہے۔ رسول اکرم صلعم کے بعد خلفار راشدین نے دعوت حق، فلاح مخلوق اور اصلاح زبان میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور مخلوق کو اپنے مواعظ سے راہ راست پر لا کر اُن کو

صحیح معنوں میں انسان بنایا۔ ان کے خطب کا نمبر احادیث کے بعد ہے چنانچہ ہم چند چند فقروں میں خلفاء راشدین کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابابکر صدیق رضؓ ہجرت نبوی صلعم سے ۵۰ سال قبل پیدا ہوئے۔ یہ قبل اور بعد نبوت آنحضرت صلعم کے ساتھ رہے مردلوگوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ حطام دنیوی سے سب سے زیادہ پرہیز کرنیوالے اور زاہد تھے یہ سنہ ۱۱ھ میں خلیفہ ہوئے اور سنہ ۱۳ھ میں وفات پائی آپ نہایت فصیح اللسان تھے آپ کا قول ہے۔ "صنائع المعروف تقی مصارع السوء"

(ب) حضرت عمرؓ بن الخطاب۔ ہجرت سے ۳۰ سال پہلے پیدا ہوئے حضرت ابابکر صدیق رضؓ کے بعد زہد اور اتقا میں دنیا بھر میں کوئی شخص آپ کا مقابل نہ تھا۔ اور یہی ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ سب سے پہلے عدالت کی ترتیب کی اور کاغذات میں سنہ ہجری لکھنا شروع کیا آخر ذی الحجہ سنہ ۲۳ھ میں ابولولؤہ نے شہید کیا۔ آپکے مواعظ در فصاحت اور جواہر بلاغت سے مزین ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے (۱) کتم سرہ کان الخیار فی یدہ (۲) ترک الحرکۃ غفلۃ۔

(ج) حضرت عثمانؓ بن عفان۔ آپکی پیدائش ہجرت سے ۴۵ سال پہلے واقع ہوئی اور سنہ ۲۳ھ میں مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ آپ کی ذات بابرکت تھی جس نے کلام مجید کو کتابی شکل میں جمع کر دیا۔ آپ نہایت متقی صالح اور خدا ترس تھے آپ کے بلیغ خطب اور مکاتبات بکثرت موجود ہیں جو فصاحت میں نہایت بلند پایہ خیال کئے جاتے ہیں بسنہ ۳۵ھ میں مصحف پاک کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کئے گئے۔

(د) امام الاولیا حضرت علی رضؓ ابن ابی طالب ہجرت سے آٹھ سال قبل آپ کی پیدائش ہے۔ نو عمروں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ ہی ہیں سنہ ۳۵ھ میں آپ کے دست مبارک پر بیعت لیگئی۔ علم و حکمت میں کامل دستگاہ تھی اور آپ فصیح ترین خطیب اور زبردست شاعر تھے۔ آپ کے کلام و خطب کے مجموعے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو آپکے علو مرتبہ اور فصاحت کی روشن دلائل ہیں۔ آپ کو عبدالرحمٰن بن ملجم نے غدراً شہید کیا آپ کا قول ہے "ادب المرء خیر من ذہبہ" اور "قیمۃ کل امری ما یحسنہ الناس اعداء ما جہلو"

(۴) ابتداء اسلام ہی سے ملک و ملت کے سامنے قرآن و احادیث اور ان کے بعد خلفاء کے بہترین اسالیب موجود تھے اس لئے قوم نے اپنے طرز بیان کو اسی انداز پر وسعت دی اور اپنے خطبوں میں جدت طرازی اور نئی نئی اختراع کئے وہ اپنے خطابت میں کلام پاک اور احادیث کی روش پر چلتے۔ اور عبارتوں کو جواہر آیات سے مرصع کرتے بعض بعض نے اپنے خطبوں کو اس ڈھنگ سے ترتیب کرنے کی کوشش کی کہ ان کے خطبے تمام و کمال آیات قرآنی کا ہی مجموعہ ہوں کیونکہ ارہاب و ترہیب اور وعدہ وعیدین آیات قرآنی ایک اعلےٰ درجہ پر ہیں اور نیز یہ کہ ان کا دل پر گہرا اثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے اسپیکر باعتبار اصول بلاغت اپنی نظیر آپ ہی تھے۔

اس عہد مامون میں حسن کلام۔ بندش الفاظ۔ صفائی اور اظہار مطالب کے اعتبار سے خطابت کا مرتبہ زمانہ جاہلیت سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ وہ برقی تاثر جو جاہلیت کے اشعار میں تھا وہ اس زمانہ میں تقریروں اور خطبوں کے حصہ میں آگیا کہ بزرگان ملت کو فتوحات

غزوات ۔ اور دیگر مواقع پر عامہ خلایق کی طبائع گرمانے جوش اور تالیف قلوب کے لئے بر وقت تقریر کی ضرورت پیش آتی تھی. اس لئے تقاریر کی اہمیت کو عام لوگ بھی محسوس کرتے تھے قوم کے رہبر اور کمان دان انواع خطبات سے جنگ میں وہ کام لیتے تھے جو تلوار اور زبردست فوجی قوت اور جوش سے نہ نکلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت اسلام میں خطیب کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو زمانہ جاہلیت میں شاعر کا تھا۔

اگرچہ زمانہ کی رفتار اور حالات بالکل بدل چکے تھے اور ملک اور قوم میں حضریت اور مدنیت کے آثار کافی طور سے پیدا ہو گئے تھے مگر اس زمانہ میں بھی مقرروں اور خطیبوں کے عادات و خصائل وہی تھے جو شعراء جاہلیت کے تھے مقرر جب تقریر کرتا تو کھڑا ہو جاتا اور ساری حرکات و انداز وہی اختیار کرتا جو ایام جاہلیت میں ایک شاعر عمدۃ الحی میں اپنا قصیدہ سناتے ہوئے کرتا تھا کہ الفاظ و معانی اور ان کے مواقع استعمال کا دلوں پر پورا اثر پیدا ہو۔

یہ مسلم امر ہے اس عہد کے بہترین اور افضل خطبا خلفاء راشدین ہیں جن کے خطبات کی آب و تاب آج تک وہی ہے اور جب تک عربی زبان موجود ہے باقی رہے گی۔

(۵) رسائل یعنی خطوط۔ رسول اکرم صلعم نے جنگ بدر کے بعد ہی آزادی تعلیم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا اس وجہ سے کاتبوں کی بہتات ہو گئی۔ جس نے عرب میں کتابت کا ذوق پیدا کر دیا قوم نے اس انہاک سے کام لیا کہ اس زمانہ کی تحریریں ایجاز کا درجہ رکھتی ہیں۔ گویا اس مبارک عہد کے انشا ء نے آیندہ کے لئے قلم خشک کر دیئے۔ کہ ان کے خطوط مختصر اور سجع و تزئین الفاظ سے پاک تھے چھوٹی چھوٹی عبارتوں اور سادہ سادہ جملوں میں بڑے بڑے معانی و مطالب ادا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ معنی لفظ سے مجرد ہیں۔

اس دور میں خط من فلاں الی فلاں سے شروع کرتے اور سب سے پہلے بسم اللہ لکھتے پھر سلام ہوتا تھا باوجود اس اختصار کے خیال، تہدید، وعید، استنہاض اور استعطاف کے مواقع پر عجیب عجیب قلم سے کام لیتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے مصر کے حاکم عمرو بن عاص کو جس وقت حجاز میں سخت قحط سالی تھی اس طور سے لکھا:۔

من عبد اللہ عمر امیر المؤمنین الی عمرو بن العاص اما بعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا ابت انت ومن معك ان اهلك انا ومن معی فیا غوثاه ۔ فیا غوثاه ۔	من جانب بندہ خدا عمر امیر المومنین ۔ بخدمت عمرو بن عاص بعد (حمد و صلوٰۃ کے) قسم ہے میری عمر کی اے عمرو جب تو اور تیرے ساتھی سوتے ہیں تو اسکی پرواہ نہیں کرتے کہ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہو جائیں وائے بر فریاد رس ۔ وائے بر فریاد رس ۔

نظم قبل ظہور اسلام شعر اپنے انتہائی کمال پر پہنچ گیا تھا۔ ملک میں چاروں طرف اس کا دور دورہ تھا قبائل کو آپس میں لڑانا، صلح کرانا، جوش دلانا یا نفرت پیدا کرنا یہ سب شعراء کے حصہ میں تھا۔ شاعر ہونا انعام الٰہی تھا چنانچہ عربوں کو فصاحت اور طلاقت لسانی پر ایسا فخر اور ناز تھا کہ ساری خدائی کو اپنے مقابلہ میں گونگا خیال کرتے اور ایک حد تک وہ اپنے دعوے میں حق بجانب بھی تھے۔ کیونکہ الفاظ کی بہتات نے ادائے مطالب کے زبردست ذرائع پیدا کر دیئے تھے۔ اور وہ اپنے طرز بیان کو لاثانی و بے نظیر مانتے تھے۔ لیکن قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت کے سامنے گردنیں خم ہو گئیں اور شعراء اپنی چوکڑی بھول گئے ملک پر ایسا سکوت طاری ہو گیا۔ یہ خاموشی ان کی آئندہ ترقی کے لئے برکت الٰہی ثابت ہوئی جس نے ان کی ترقی میں استحکام کے چار چاند لگا دئیے۔ اسالیب قرآنیہ کی تتبع نے ایسی بلاغت پیدا کر دی جو پہلے سے زیادہ دلوں کو جذب کرنے والی تھی۔

یہ اعتراض کہ قرآن نے دنیا میں آکر شعر و شاعری کا دروازہ مسدود کر دیا بالکل لغو و بے بنیاد ہے۔ اگر اس عہد مبارک کے واقعات کا مطالعہ تعصب اور فرنگی آپی کی عینک اتار کر غور سے کیا جائے تو اس قسم کے اعتراض پیدا نہ ہوں۔ مجھ سے میرے ایک تلون پسند دوست نے اسی نوعیت کا اعتراض کیا تھا۔ اس لئے یہ بیجا نہ ہوگا اگر میں نہایت مختصر تاریخی جواب پیش کروں۔

کعب بن زبیرؓ نے فتح مکہ سے پہلے رسول اکرم صلعم اور مسلمان مرد و عورتوں کی ہجو کی تھی اور اسلام کے خلاف منافرت و جوش پھیلانے کی غرض سے بہت سے قصائد کہہ ڈالے تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد باغیوں کی فہرست میں ان کا نام بھی تھا۔ ان کے بھائی جویر پہلے ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مراسلت ہوئی آخر کار کعبؓ نے طے کیا کہ میں خود دربار رسالت میں حاضر ہوتا ہوں۔ اگر رسول اکرم کو صحیح معنوں میں حلیم اور صاحب مروت پاؤں گا تو ایمان لاؤں گا ورنہ موت کو ترجیح دونگا۔

حسب قرار داد یہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلعم کا دست مبارک پکڑ کر کہا اگر کعب اپنی حرکات پر اظہار ندامت کر کے معافی چاہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ رسول اکرم نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "سب معاف" یہ سنتے ہی کعبؓ نے کہا کہ میں ہی کعب ہوں اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" فی البدیہہ سنانا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلعم اس کو نہایت اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے یہاں تک کہ جب کعبؓ نے یہ شعر

ان الرسول لسیف یستضاء بہ مھند من سیوف اللہ مسلول	بیشک رسولؐ ایک ایسی تلوار ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے ہندی لوہے کی (یعنی مضبوط) اللہ کی ننگی تلوار ہیں۔

پڑھا تو رسولؐ اللہ نے اپنی چادر مبارک انکے کاندھے پر ڈال دی جس کو ان کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیس ہزار درہم (.... روپیہ) میں خریدا۔ یہ وہی چادر ہے جو مسند نشینی کے وقت ہر خلیفہ کے شانہ کی عزت کو دوبالا کرتی رہی یہ دار نبوی تاتاری

حملے کے وقت ضائع ہوگئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ رسول اکرم صلعم اس شعر میں اصلاح بھی فرمائی حضرت کعبؓ نے رسول اللہ کو سیوف ہند سے تشبیہ دی تھی جس پر رسول اکرم نے فرمایا "سیوف کی بجائے نور اور سیوف الھند کے بجائے سیوف اللہ کہو" چنانچہ شعر میں وہی الفاظ جو آنحضرت نے فرمائے تھے موجود ہیں

اگر اسلام نے عام طور سے شاعری کو حرام تبلایا ہوتا تو رسول اللہ صلعم اول تو اتنا طویل قصیدہ سنتے ہی کیوں؟ نہ یہ کہ دار مبارک مرحمت فرماتے بلکہ شعر میں ترمیم و اصلاح بھی فرماتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے اسی قسم کی شاعری کو جو مخرب اخلاق اور گندی ہو ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ عرب کی یہ حالت تھی کہ نہایت ناپاک اشعار فخراً پڑھا کرتے تھے اور اپنی بدچلنی کو فخریہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امرالقیس جو ملک الشعراء ہے اپنی آوارگی کس فخر کے ساتھ تبلاتا ہے۔

(۱) کدابک من ام الحویرث قبلھا وجارتھا ام الرباب بماسل[۵]

(۲) فمثلک حبلی قد طرقت و مرضع فالھیتھا من ذی تمائم محول

(۳) اذا ما بکی من خلفھا انصرفت لہ بشق وتحتی شقھا لم تحول

قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں کہ یہ شعر کس قدر فحش اور ذلیل ہیں۔ کوئی مہذب آدمی ایسی شاعری کو بہ نظر استحسان نہ دیکھے گا اور یہی اعتراض ہے جو ایشیائی شاعری پر آج عام طور سے ہو رہا ہے اسلام نے ایسے ہی شعر و شاعری کو مذموم و ممنوع قرار دیا ہے ورنہ حسانؓ بن ثابت خود دربار رسالت کے شاعر تھے۔

عہد جاہلیت اور اسلام میں چونکہ کچھ فرق نہ تھا اس لئے شاعری اپنے موضوع اور بندش الفاظ کے اعتبار سے ایک ہی حالت پر تھی اور اس کے عام رنگ میں کوئی بین اور صاف فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ ملک و قوم کو شعر و شاعری کی طرف رغبت رہی تھی۔ یہ اصول کی بات ہے جب طبیعت کسی ایک کام میں منہمک ہوتی ہے تو دوسری طرف مائل نہیں ہوتی کیونکہ اس زمانہ میں قوم امور دینیہ وعظ و پند اور دعوت حق اور فتوحات میں مصروف تھی اس لئے شعر گوئی کا کسی کو دماغ اور وقت نہ تھا کہ یہ تو فرصت کے مشاغل ہیں۔ لیکن جب ملک و ملت کو ملک گیری اور دعوت حق سے ایک گونہ فرصت اور اطمینان ہوگیا تو انھوں نے وہی شعر و شاعری شروع کردی۔ مگر میں یہ ظاہر کئے بغیر نہ رہونگا کہ اس عصر منیر کی شاعری جاہلیت سے بلاغت معنی، متانت، وسعت خیال اور حسن بیان میں کہیں زیادہ ممتاز درجہ حاصل کرکے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ قوم میں حضارت اور تمدن پیدا ہو جانے کی وجہ

[۵] اپنے ایک ساتھی کی زبان سے کہلواتا ہے تیری تو ہمیشہ یہی گت رہی ہے۔ پہلے ام حویرث اور اس کی پڑوسنوں کے تعلقات پر رویا پیٹا کرتا ہے اور یہ بنا ڈالا ہے۔ اپنی معشوقہ کو خطاب کرتا ہے۔ ذرا ناز نہ کر۔ میں نے تو بہت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو جن کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اپنی طرف یوں مائل کرلیا کہ جب بچہ روتا تھا تو اوسکو اس طرح تھپکتی تھی کہ اسکا آدھا دھڑ میرے نیچے ہوتا تھا اور آدھے کو پھیر سکتی تھی۔ ۱۲

سے اب شاعر کا وہ مرتبہ نہ رہا جو عہد جاہلیت میں اس کو حاصل تھا۔ اور قوم کی باگ بھی اب شاعر کے ہاتھ میں نہ رہی۔

اس مبارک عصر کے شعراء دو قسم کے ہیں۔ ایک مخضر میں جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے دوسرے وہ جنہوں نے صرف اسلام ہی کے زمانے میں نشو ونما پایا اور جاہلیت کا زمانہ نہیں دیکھا اس عہد کے مشہور شعراء کے نام ذیل میں درج کر کے ایک ایک دو دو شعر نمونتاً پیش کرتے ہیں۔

(۱) حسان بن ثابت جن کا نام ابو ولید انصاری ہے۔ یہ عہد رسول اکرم صلعم میں دربار رسالت کے شاعر خاص تھے ان کے اشعار باوجود سادگی کے نہایت جامع و مانع ہیں۔ ۱۲۰ سال کی عمر پائی۔

(۱) ۲ یاک لن تلقی من الناس معشرا	لوگوں میں ہرگز کوئی ایسا گروہ نہ ملے گا جو کہ عزت اور
اعز من الانصار عزا و افضلا	فضل میں انصار سے برتر ہو۔
(ب) واصید سماض الی السیف صارم	بڑا گردن بلند کن تیز تلوار کی طرف دوڑ کر گھسنے والا
اذا ما دعا الی الموت ارقلا	جب کوئی موت کیطرف دعوت دے تو دوڑ کر جانے والا

(۲) حطیئہ۔ انکا نام ابو ملیکہ بن اوس ہے۔ ۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۱) من یفعل الخیر لم یعدم جوائزہ	جس نے نیکی کی اس کے بدلے معدوم نہیں ہوتے اور
لا یذہب العرف بین اللہ و الناس	بھلائی اللہ اور مخلوق کے درمیان سے ضائع نہیں ہوتی
(ب) دع المکارم لا ترحل لبغیتہا	مکارم کو ترک کر۔ اس کی خواہش کی طرف نہ چل
و اقعد فانک انت الطاعم الکاسی	بلکہ بیٹھ رہ کیونکہ بے شک تو کپڑوں کی خوراک ہے

(۳) کعب بن زہیر۔ انکا پورا نام زہیر سلمی مزنی ہے ۲۲ھ میں دنیا سے کوچ کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۱) لو کنت اعجب من شیء لا عجبنی	اگر میں کسی بات پر تعجب کرتا ہوں تو وہ یہ ہے
سعی الفتی و ھو مخبوء له القدر	جوان ایک کام میں سعی کرتا ہے حالانکہ مقدر ابھی پوشیدہ ہے
(ب) یسعی الفتی لامور لیس یدرکها	جوان ایک کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور وہ اسکو نہیں پا سکتا
فالنفس واحدة و الهم منتشر	جان ایک ہے اور فکریں کثرت سے ہیں۔

(۴) نابغہ جعدی متوفی ۵۰ھ ان کا نام ابو لیلے ہے زمانہ جاہلیت میں شعر کہا کرتے تھے۔ ۳۰ سال تک کوئی شعر نہیں کہا پھر شعر گوئی شروع کر دی ان کے شعر کا نمونہ یہ ہے۔

(۲) ولا خیر فی حلم اذا لم یکن لہ
بوادر تحمی صفوہ ان یکدرا
جبکہ حلم کیوجہ سے اپنی صفائی مکدر ہونیسے نہ بچ سکے تو ایسے حلم میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

(ب) ولا خیر فی جہل اذا لم یکن لہ
حلیم اذا ما اورد الامر اصدرا
جبکہ جہل سے ایسی بربادی ہو کہ کسی امر میں مبتلا ہو کر اس سے نہ بچ سکے تو ایسا جہل برا ہے۔

(۵) الخنسار۔ ان کا نام تماضر بنت عمرو بن الشر ہے۔ ماہرین فن کا اتفاق ہے کہ ان سے پہلے اور انکے بعد کوئی ایسی عورت نہیں ہوئی ہے جس نے ان سے بہتر شعر کہے ہوں۔ نابغہ ذبیانی نے جو بازار عکاظ میں سرفیچ ہوتا تھا اعشی کے سوا سب پر فضیلت دی ہے جریر کا مقولہ ہے کہ خنسار نہوتیں تو میں سب سے بہتر شاعر ہوتا۔ ۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

(۱) ان الزمان ولیفنی لہ عجب
ابقی لنا ذنبا واستوصل الرأس
زمانہ! تعجب ہے کہ زمانہ کو فنا نہیں گناہ تو باقی رہ جاتا ہے۔ سر (ظالم) فنا ہوجاتا ہے۔

(ب) ان الجدیدین طول اختلافہما
لا یفسدان ولکن یفسد الناس
دن اور رات اپنے طول اختلاف میں ہیں ان کو تو تغیر نہیں ہوتا۔ لیکن انسان فنا ہوجاتا ہے۔

(۶) عباس بن مرداس۔ نام ابوالہیثم ہے۔ یہ جنگ کے شدائد کا خوب خوب ذکر کرتے ہیں۔ ۱۶ھ میں دنیار فانی سے رخصت ہوئے۔

(۱) دع ما تقدم فی عہد الشباب فقد
ولی الشباب وشاب الشیب والنعم
زمانہ شباب میں جو کچھ مقدم ہوچکا اوسکو چھوڑ جوانی گئی۔ اور بڑھاپا جوان ہوگیا اور بال جھڑ گئے۔

خیابانِ خلیل

(از لسان الملک صاحبزادہ متین اللہ خاں صاحب واثق ٹونکی)

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسنِ یار
"چیزے فزوں کند" کہ تماشہ بمارسید

میرے محترم کرم فرما، امیرالانشا دبیرالملک مصاحب خاص دربار ٹونک مولوی سید علی اصغر صاحب نے "خیابانِ خلیل" (مؤلفہ خود) کی ایک جلد بذریعہ ڈاک ارسال فرمائی جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں،

خیابانِ خلیل میں جو ضرب الامثال مخمس، مربع، مثلث، غزل، اور قطعات کے پیرایہ میں ہیں نظر آتے ہیں، طرز کلام، اور مضامین کے عیوب سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اشعار جن کے مضامین نہایت معمولی اور غیر دلچسپ ہیں بندگان عالی سے منسوب کرنا نازیبا ہے۔

بقول مکرمی ناظم صاحب "حضور عالی راجپوتانہ کے احاطہ میں "ایک ذوالریاستین" فرمانروا ہیں، یعنی جس طرح محروسہ ریاست ٹونک حضور معلیٰ کے قلمرو میں داخل ہے، اسی طرح اقلیم سخن کی حکمرانی بھی حضور پرنور کے زیرنگین ہے، شعر و سخن کے لطیف فن سے اعلیحضرت کی طبع نفس کو بالکل فطرتی مناسبت ہے، مذاق سخن نہایت صحیح، متین، سنجیدہ، اور اعلیٰ ہے الخ"

ہمارا بھی ذاتی تجربہ ہے، اور حضور انور کا کلام اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کلام حضور انور دام اقبالہٗ کا ہے، ہم جانتے ہیں کہ کون سا "ملک الشعرا" اس پردہ میں اپنے بوتے اور بحر شاعری کی داد لے رہا ہے، اور استادانِ لغز گو ہمرتبہ داغ و حالی خواہ مخواہ و لامحالا "واہ واہ" کہتے ہیں حالانکہ اُن کے دل سے کوئی پوچھے تو کہیں گے کہ ہم کلام کی داد نہیں دیتے لیکن جس نسبت عالی سے یہ کلام منسوب ہے اُن کو داد دیتے ہیں، یہاں اک خیال پیدا ہوتا ہے کہ "کیا اعلیٰحضرت خود شعر نہیں کہتے کوئی اور ان کے تخلص سے شعر کہدیتا ہے؟ اسکا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک شاعر جب بسلسلۂ شعر و سخن ملازم رہتا ہے تو اُس کا فرض منصبی یہ ہے کہ دربار کے موقعہ پر قصائد پیش کرتا رہے لیکن اپنا رسوخ بڑھانے کو وہ چند غزلیں بھی سرکاری تخلص سے کہہ کے پیش کر دیتا ہے جو بہ نظر قدر افزائی و مروت شاہانہ مسترد نہیں کیجاتیں" اسی قسم کے سرکاری اشعار قابل تنقید نظر آتے ہیں اور یونہیں ہیں تنقید کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہے، ورنہ کلام الملوک ملوک الکلام،

تقریب جو لایق و ادیب مؤلف نے لکھی ہے بالذات ایک قابلانہ مضمون نگاری ہے جس سے خیابان خیال کی مندرجہ ضرب الامثال میں ظاہری روح پیدا ہوگئی ہے اگر اس تقریب اور اُن عنوانات کو جو ہر ضرب المثل کے اوپر قائم کئے گئے ہیں تالیف سے نکال لیا جائے، یا وہ

فازہ جو قابل ادیب نے چڑھایا ہے اُتار دیا جائے تو چند بے مغز بے معنی الفاظ کا ذخیرہ رہ جاتا ہے، جس میں نہ مضمون آفرینی کی کوئی شان ہے نہ ندرتِ بیان،

امیر الانشا رنے اس میں شک نہیں کامل زورِ تحریر دکھایا ہے اور چند خرافات تک بندیوں کو اپنے زورِ قلم سے اُس معیار تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جو فنِ ادب سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اصل شے کا بدل دینا رنگ ساز کا کام نہیں، قلعی گر تانبے کو چاندی کی صورت میں کر سکتا ہے لیکن ماہیت نہیں بدل سکتا، سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ جب شاعرانہ نقطۂ نظر سے کوئی ضرب المثل پیش کی جائے تو بہترین الفاظ اور نادر الخیالی کے ساتھ کہ سامعین کا دل تڑپ جائے، بے موقعہ یا لچر الفاظ اور لغویت کے ساتھ شعر میں لانا اور خواہ مخواہ رگڑ ڈالنا ہرگز اس نتیجہ تک نہیں پہنچاتا جو دبیر الملک نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ضرب المثل صحیح موضوع پر وہی کہلائی جا سکتی ہے جس میں ضرورت سے ذرہ برابر تغیر نہ واقع ہوا ہو، اگر ضرورتِ شعری نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تو وہ ضرب المثل کے پایہ سے گر جاتی ہے ایک مصرع ہو جاتا ہے جس سے ضرب المثل کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔

استاد ذوق فرماتے ہیں "ڈالی کمند بام پہ، پہونچا کہاں رقیب   "سچ ہے حرام زادہ کی رسّی دراز ہے"

مصرع ثانی مکمل ضرب المثل ہے اور اسقدر مناسب الفاظ اور دلچسپ معنی رکھنے والا دوسرا مصرع بہم پہنچایا ہے کہ خواہ مخواہ دل لطف لیتا ہے اور تڑپ جاتا ہے کمند کا ڈالنا، بام پہ پہونچنا، رسّی دراز پھر حرامزادہ کا لفظ منعنت پہ کہ کمند ڈال کے چڑھا چلا جا رہا ہے کیسا پُر لطف انداز ہے خصوصاً "کہاں" کے لفظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے۔

علاوہ ازیں، بقول مولف، ضرب المثل سے جس نظم کا تعلق ہو، سامعین و ناظرین کو ثابت ہو کہ وہ اسی کے لئے وضع کی گئی تھی، "متذکرہ بالا شعر میں جو ضرب المثل موجود ہے وہ اسی کا مصداق ہے بخلاف اُن ضرب الامثال کے جو خیابانِ خلیل میں نظر آتی ہیں متعلقہ اشعار سے بالکل مناسبت ہی نہیں رکھتیں،

"صفحہ ۹۔ ضرب المثل اول"

"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا"

اصل مروجہ ضرب المثل تو یہ ہے "جنگل میں مور ناچا کسنے دیکھا"، لیکن ضرورتِ شعری نے لفظ "بیکار" کا اضافہ کرایا، اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ضرب المثل ہے بلکہ یہ ایک شعر کا موزوں مصرع ہے جس سے ضرب المثل کا مفہوم اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے ؎

۵۱   بیٹھے تھے بن سنور کے، آئینہ سامنے تھا،   مجھ سے کہے ہوئے تھے، مجھسے تمام بیجا

یوں تکتے تھے صورت، جس طرح کوئی شیدا   مجھکو ہوئی خبر جب کہلا کے میں نے بھیجا،

جنگل میں مور ناچا "بیکار" کس نے دیکھا

شاعر نے جو الفاظ نظم کیے ہیں، اُن کی شرح کیجائے تو ضرب المثل ایک غیر مناسب اور بے محل طور سے ٹھونسی ہوئی نظر آتی ہے، شاعر کہتا ہے "مجھ سے اُن ہیں بیجا رنج تھا، بناؤ سنگار کئے "اپنے گھر میں" آئینہ کے سامنے بیٹھے تھے، اپنی صورت عاشقوں کی طرح پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتے تھے، جب مجھے خبر ہوئی تو میں نے کہلا کے بھیجا، جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا،

مناسبت الفاظی جو ضرب المثل کے لئے نہایت ضروری چیز ہے اسمیں کہیں نہیں پائی جاتی، اگر یہ نہ ہو تو محل استعمال ایسا ہونا چاہیئے جس سے دل تڑپ جائے وہ بھی نہیں نہایت رکیک مضامین کا مرقع ہے جو نوشق نیچے کہا کرتے ہیں،

اگر ہم ذرا نازک خیالی سے کام لیتے ہیں تو نہایت دلچسپ نکتہ چینی کرنیکا موقع پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دیکھنے والی ایک علیحدہ ہستی تھی، جو چیز دیکھی گئی یا دیکھنے کے قابل تھی وہ دوسری تھی، یعنی آرایش، اور وہ دونوں شاہد و مشہود موجود تھے خصوصاً جبکہ وہ خود اپنے پُراشتیاقیہ نظریں ڈال رہے ہوں، پھر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا کس طرح کہا جا سکتا ہے، ہاں اگر آئینہ بجائے سامنے کے پشت پر ہوتا یا وہ شاہدانہ شان نہ رکھتے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ دیکھنے والا کون ہے، ؟

یوں تو جن حضرات کے پاس خیابانِ خلیل ہے وہ دیکھ سکتے ہیں غور فرما سکتے ہیں کہ ضرب المثل اس خمسہ میں یا مقطع میں جہاں لائی گئی ہے نہایت پھیکے معمولی اور رذل مضامین کے ساتھ ٹھونسی گئی ہے لیکن اسی خمسہ کا چوتھا بند اور قابل ذکر ہے،

دل میں یہ کیا آئی کیا بات بیٹھے بیٹھے مجھ سے کہا کہ کل ہم دروازہ بند کرکے
گھر میں چلیں پھریں گے پورا بناؤ کرکے میں نے کہا کہ بہتر، لیکن فضول ٹھہرے
جنگل میں مور ناچا بیکار کس نے دیکھا

مجھے ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، معلوم ہوتا ہے معشوق دیوانہ تھا بیٹھے بیٹھے رگِ وحشت پھڑکی اور وہ ارمان ظاہر کیا جو آجتک کسی ہی عقل انسانی نے نہ کیا ہوگا یعنی "کل ہم دروازہ بند کرکے ناچیں گے" تو بھی جنون اور مخبوط الحواسی پہ یہ ارمان محمول ہوتا، پھر عاشق صاحب نے جواب میں جو چند جملے زبان سے ادا کئے ہیں وہ معشوق کے ارمان سے کسی طرح کم نہیں اُس کے جواب میں عاشق صاحب کہتے ہیں "بہتر لیکن فضول، سننے سے" غریب دبیر الملک ان مضامین کو تو پیٹنے سے رہے، ہاں یہ ممکن تھا کہ جہاں تقریب وغیرہ لکھنے کی تکلیف کی تھی وہاں ان ضرب الامثال کو مخمس مسدس غزل، قطعات وغیرہ کے پیرایہ میں خود ہی بیان بھی کر جاتے،

صفحہ ۱۱ ، ۲۰

"کیا چیز ہے یہ دنیا، میلا گھڑی پلک کا"

خیابانِ خلیل کے گیارہویں صفحہ پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ متذکرہ بالا ضرب المثل نہیں ہے، تاہم شاہی نفیروں کی صدا ہے، تعجب ہے کہ لایق مولف نے بھی یہاں فحش غلطی کی ہے "اسے ضرب المثل تسلیم کرتے ہوئے اس کے معنی پر تبصرہ

کیا ہے،

ناظرینِ کرام خود سمجھ سکتے ہیں کہ آیا یہ ضرب المثل ہے یا تانک شاہی فقرا کی بھیک مانگنے کی صدا، ! لہٰذا ہم اُن اشعار کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے جو زیادہ سے زیادہ ادبیانِ تانک شاہی کے کام آسکتے ہیں، اور جن کا فن ادب صنائع بدائع معنی اور مناسبت وغیرہ کی بےکار قیود میں محدود ہیں، اون کو اس سے بحث نہیں معنی دار ہوں یا بے معنی مُنہ سے صدائے بالخیر نکلنی چاہیے جس کے اخیر الفاظ یہ ہوں،

"کیا چیز ہے یہ دُنیا میلا گھڑی پلک کا"

صفحہ ۱۳-۳

"باڑہ کاٹے تلوار کا نام"

اصل الفاظ کو موزونیت کی ضرورت نے ایک مصرع بنانے پر مجبور کیا "سچ کہا ہے" باڑہ کاٹے نام "ہو" تلوار کا، دوسرا مصرع جو شاعر نے چپاں کیا ہے وہ ایسے غیر مناسب الفاظ کا ذخیرہ ہے، جسے دوسرے مصرع سے کچھ بھی مناسبت نہیں، ہر دو مصرعوں کی آپسیں مناسبت تو درکنار خود اُسی کی ترکیب میں اسقدر غیر مناسبت ہے کہ جس کا سر ہے نہ پیر ؎

کام سرمہ کا تھا شہرہ ہے ادائے یار کا ، سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

"سرمہ" سے اور "ادائے یار" سے واسطہ؟ دوسرے "فعل" فی بطنِ شاعر رہ گیا "کام سرمہ کا تھا" معلوم نہیں کیا کام؟ "ادائے یار" سے زیادہ مناسب لفظ "چشم یار" ہو سکتا تھا کہ "سرمہ" کے مناسب لفظ ہے وہ اس طرح "کام سرمہ نے کیا شہرہ ہے چشم یار کا" اب فعل کا اظہار بھی ہوگیا اور ایک مصرع میں مناسب الفاظ کا ذخیرہ بھی ہو گیا اگرچہ بحیثیت تشبیہ و مماثلت اب بھی اعلیٰ پایہ سے گرا ہوا ہے کیونکہ آج تک سرمہ کو باڑھ اور چشم کو تلوار سے کسی نے تشبیہ نہیں دی، لہٰذا ضرب المثل نہایت بھدّے پن سے استعمال کیگئی ہے۔

نمبر۲ ؎ خطِ ابرو نے لیا دل شہرت ابرو ہوئی، سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا

حیران ہوں کہ یہ جدت طرازی فن سخن کا میدان وسیع کرنے والی ہے، یا اہمال کو بھی فن میں شامل کرکے ملیامیٹ کردینے والی،

"خطِ ابرو" اور "ابرو" دو متضاد و متغائر اشیا شاعر نے تسلیم کی ہیں حالانکہ مجھے ان میں کچھ بھی فرق نہیں معلوم ہوتا جو "خطِ ابرو" ہے، وہی "ابرو" ہے جب دونوں ایک ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے "ابرو نے دل لیا ابرو ہی کا نام" بات کیا ہوئی؟ اس مضمون کو یوں لا سکتے تھے،

مجرم ہو خود قتل کا، اور تیغ ابرو کا قصور
سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

نمبر۳ ؎ کٹ گرائے تھے مبانے مست کچھ ہیں ہے کیوں؟ سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

لے سبحان اللہ بالکل اس کی مثال یہ ہے "مارون گھٹنہ پھوٹے خیرآباد" "سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا"،
معزز ناظرین خود بہ نظرِ انصاف دیکھیں کہ "صبا کا گل گرانا" اور "منت گلچیں کرنا" پھر استفہام "کیوں؟" ایک پہیلی ہے جس کے بعد لکھ دیا "سچ کہا ہے باڑہ الخ"

نمبر ۴ ص ۵ — ہو گئی حسنِ ادا سے شہرتِ تیغِ ادا — سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

حسنِ ادا اور تیغِ ادا دونوں مترادف الفاظ ہیں حسنِ ادا ہی تیغِ ادا ہے،

نمبر ۵ ص ۵ — اصل نوکِ تیر ہے مشہور ہے تیرا خلیل — سچ کہا ہے باڑ کاٹے نام ہو تلوار کا

مقطع میں بھی صریح غلطی موجود ہے، تیر عبارت ہے ناوک سے سوفار تک نوک سے پر تک، نوک اور تیر دو چیزیں نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ تیر کاٹتا نہیں بلکہ گھس جاتا ہے، ضرب المثل اس اعتبار سے بھی موزوں نہیں ہے،

صفحہ ۴×۱۴

"رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا"

تنقید کے ابتدائی مضمون میں، میں بیان کر چکا ہوں کہ ضرب المثل میں ضرورتِ شعری سے ذرا بھی تبدیلی واقع ہو جائے تو وہ ضرب المثل نہیں رہتی بلکہ شاعر کا ایک موزوں مصرع ہو جاتا ہے، مفہوم میں خواہ تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو،
اصل ضرب المثل صرف اتنی ہے "رسی جل گئی بل نہ گیا" "تمام" "پر" "نہ" کے عوض "نہیں" ضرورتِ شعر سے کئی پھندلے ہیں، مندرجہ ذیل ضرب المثل سے جن اشعار کا تعلق ہے وہ ہر یہ ناظرین کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے مضحکہ خیز مضامین کو ادبیت پہ محمول کرنا اور یہ کہنا کہ "زبانِ اردو پہ احسان کیا ہے" فنِ ادب کی سخت توہین کرنا ہے، اگر قانون اجازت دیتا تو ان الفاظ پر مؤلف پہ جو خاص میرے عنایت فرما ہیں توہینِ عزت کا مقدمہ چلایا جاتا

مصرع مندرجہ عنوان پہ جو مصرعے لگائے گئے ہیں، اگر "وہ کسی خاص معاملہ کا اظہار کرتے ہیں،" تو "صاحبِ معاملہ" ہی لطف لے سکتا ہے یا وہ شخص جو رازدار ہو لیکن جب دنیائے ادب کے روبرو انہیں پیش کیا جائے تو بجز اس کے کہ چند فرمائشی قہقہے لگائے جائیں باوقعت ثابت نہیں ہو سکتے جن میں یا تو بوڑھے معشوق کی انتہا سے زیادہ تضحیک کی ہے یا مکار دغوبی کہہ کے عامیانہ خیال کے ساتھ معشوق کی تذلیل ہے۔ ملاحظہ ہوں اشعار

زلفوں کا خم، جبیں کا ابھی سَل نہیں گیا — رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا،

"مضحکہ خیز" — غرّہ شباب کا ہے، نہیں گرچہ اب شباب — "

صورت ہے وہ نہ عمر، مگر اینٹھ ہے وہی — "

گیسو سفید ہو گئے لیکن گیا نہ خم — رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

ناگن کا پیچ و تاب ہے زلفِ سفید میں — "

"تذلیل" — پھٹا زرکے تہاکے بھی چھوڑے نہ مکر و چھل — "

غصہ ہے اب بھی وہی وہی بدمزاجیاں — "

بل جو سرشت میں ہو کہاں جائیں کہ خلیل — "

اس موزوں ضرب المثل کو یوں کہہ سکتے تھے، ؎

وہ میرے پیچ و تاب کہتے ہیں غیر سو — رستی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

صفحہ ۱۵×۵

"قہر درویش بجانِ درویش"

یہ مصرع اسقدر مقبولِ عام ہوا ہے کہ اسے بمنزلہ ضرب المثل کے کہا جانے لگا ہے، شاعر نے صرف مصرع ثانی کے الفاظ و معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے بعض مصرعے بہم پہنچائے ہیں، اور بعض بالکل پہیلی ہیں،

۵۱ — بے اثر آہ و فغانِ درویش — قہر درویش بجانِ درویش

۵۲ — کھائے غم ہے یہی شانِ درویش — "

۵۳ — "ضبطِ غصہ" (ترکیبِ لی ہے) نشانِ درویش — "

ان ہر سہ اشعار میں صرف مصرع ثانی کے معنی کا لحاظ ہے، محل استعمال سے غرض نہیں کی گئی۔

۵۴ — گوش درویش فغانِ درویش — قہر درویش بجانِ درویش

محض بے معنی اور ناتمام جملہ ہے جس کی نثر کی جائے تو بجز سامع کے تبسم ہونے کے اور کچھ معنی پیدا نہیں ہوتے نثر یہ ہوگی، "درویش کا کان درویش کا رونا" ان الفاظ کو کہہ کے خوش ہو جائیے تو ہر شخص منتظر رہیگا کہ اعلیٰ حضرت آگے کیا فرماتے ہیں دوسرے مصرع سے چاہو کہ سلسلہ قائم ہو کر ناتمام جملہ کی خبر نکل آئے تو یہ بھی نہیں "درویش کا رونا درویش کا کان درویش کا غصہ اُسکی جان پر

۵۵ — دل ہدفِ تیر فغانِ درویش — قہر الخ

اس کی نثر یہ ہوگی" درویش کی فغاں کے تیر کا دل نشانہ" ربط ہے مصرع ثانی سے نہ بذاتِ خود کچھ معنی،

۵۶ — ہر درویش بقلبِ عالم — قہر درویش الخ

اسمیں شک نہیں کہ نمبر ۶ شعر میں مصرع اول ہر حیثیت سے اعلیٰ ہے اور محل استعمال کا لحاظ مندرجہ ذیل شعر میں رکھا گیا ہے

ضبط کرنا ہی پڑیگا دلِ زار   تھر درویش الخ

صفحہ ۱۷×۶

"پہلے خویش پیچھے درویش"

شاعر نے اس ضرب المثل میں بھی لفظ "ہے" اور "اور" کا اضافہ کرکے موزوں کر لیا ہے، بصورت خمسہ یہ ضرب المثل پیش ہے، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ مناسب مضمون یا مناسب الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے ایک ایک بند پہ تنقیدی نظر ڈالنا تو ہمارا کام تھا جس کا لب لباب ہم نے لکھدیا لیکن اس تنقید کو ناظرین کے روبرو پیش کرنا محض تضیع اوقات ہے، جن حضرات کے پاس خیابان خلیل ہے وہ خود غور فرما سکتے ہیں۔

صفحہ ۱۸×۷

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ مصرع بھی کثرت استعمال سے خواہ مخواہ ضرب المثل تسلیم کر لیا جائے ورنہ دراصل ضرب المثل نہیں ہے، ضرب المثل "وہ الفاظ ہوتے ہیں جو بیوداوزان سے آزاد جو موقعہ اور محل، وقت، کا لحاظ رکھ کے متکلم کے منہ سے نکلے ہوں اور زبان زد خلائق ہوگئے ہوں" برمحل اگر اسی صورت سے شاعر کے منہ سے چند الفاظ نکلے تو وہ مصرع بن گئے خواہ اسی مصرع کی طرح مقبولیت عامہ کی وجہ سے ضرب المثل کا کام دینے لگا ہو" مثلاً "برات عاشقاں برشاخ آہو"

اب اس مصرع کو جو خیابان خلیل میں بصورت خمسہ پیش کیا گیا ہے وہ فن ادب یا زبان اردو پہ احسان نہیں ہے، نوآموز شوقین نیچے اکثر ایسے ہی مصرعوں پہ مصرعے بہم پہونچانے کی کوشش کیا کرتے ہیں چنانچہ ایک بچہ نے اسے خمسہ کیا ہے جو استاد مکرم کے عقیدت مندوں سے ہے وہ میرے خیال میں اس کہنہ مشق شاعر سے بہتر صورت میں کامیاب ہے، مقابلتاً ایک بند خیابان خلیل کا اور ایک اس کا پیش کرتا ہوں۔

خیابان خلیل،
گذشتہ کو کوئی بھی پاتا نہیں   زمانہ سے کچھ رشتہ ناتا نہیں
نہ جائے یہ جبتک تو جاتا نہیں   جو جائے تو صورت دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ایک بچہ،
معلم ہیں کچھ سکھاتا نہیں   کبھی وقت پر اپنے آتا نہیں
پڑھاتا نہیں کچھ لکھاتا نہیں   اسے کوئی ہمدم سمجھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

خیابان خلیل،
نہ پائی جو وہ صورت دل ربا   کہا آئینہ کچھ ہے بگڑا ہوا

خدا جانے پھر کیا خیال آگیا   بغیر اپنی صورت کو دیکھے کہا
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کیا ناظرین اس مخمس کے معنی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا ادب انہیں مضامین کا محتاج ہے،؟ اور کیا اسی کو "پیرایہ بیاں کی دل آویزی" کہتے ہیں؟ کیا یہی وہ اشعار ہیں جو لطیف جذبات کی دلچسپ کیفیت سے معمور ہیں؟ نثر ہی کر لیجئے،

"جب وہ دلربا صورت نہ پائی (کروہ شکل نظر آئی) تو کہا آئینہ بگڑا ہوا ہے (آئینہ گویا ایک مشین ہے جس کے کل پرزہ بگڑ گئے ہیں) پھر خدا جانے کیا خیال آیا کہ اپنی صورت بغیر دیکھے کہا "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

کوئی ربط ہی نہیں، کچھ خیال ہی نہیں، کچھ دلچسپی ہی نہیں، .... کچھ معنی اور مطلب ہی نہیں، انہیں اشعار پہ واہ واہ کے نعروں سے شہر گونج جاتا ہے اور ملک الشعرا پھول جاتے ہیں،

ایک بند۔ بہت دن میں موقعہ تجھے ہے ملا   ہے تنہائی بالکل نہیں دوسرا
خبردار اے دل نہ ڈرنا ذرا   یہی وقت ہے کہہ بیاں مدعا
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اس کی بھی نثر ملاحظہ ہو کہتا ہے "بہت روز میں تجھے یہ موقعہ ملا ہے کہ وہ تنہائی میں اکیلے ملے ہیں خبردار اس موقع پہ ڈرنا نہیں یہی وقت ہے عرض مدعا کا گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں چوکا اور چوکا، (فیصلہ کا انحصار ناظرین کرام پہ ہے)"

خیابان خلیل، جفاؤں سے کرتے نہیں اجتناب   نتیجہ ہے اس کا بہت ہی خراب
یہ عمر اور اس میں یہ غفلت کے خواب   نہیں ہے تمہیں قدر عہد شباب
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

"جفا سے پرہیز نہیں کرتے نتیجہ خراب ہوگا،" وہ اول مصرعوں کا یہ منشا ہے، شاعر کا ایک خیال نہیں یہیں ختم ہو چکا اگرچہ خرابی نتیجہ پہ روشنی نہ پڑسکی دوسرا خیال شروع ہوا "یہ عمر اور یہ خواب غفلت" ان الفاظ سے تو پتہ چلتا ہے کہ بڑھاپا آچکا کیونکہ زمانہ غفلت کا تو وہی شباب ہوتا ہے جسے وہ ہوشمندی کا کہہ رہا ہے، دوسرا مصرع نے خیال کو پلٹا معلوم ہوا شباب کا زمانہ ہے بڑھاپا نہیں ہے لیکن قدر شباب نہیں ہے اس کے بعد گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ٹیپ کا بند جڑ دیا،

ایک بند، مناسب نہیں غیر سے اجتناب   ہے بیفکر و مدہوش جوں محو خواب
یہی وقت بدلے کا ہے اے شباب   نہ ہوجائے ہشیار خانہ خراب
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ہم چاہتے تو ہمارے عقیدتمند نوعمر دوست کے الفاظ و ترکیب میں تغیر و تبدل کر دیتے لیکن بجنسہ اسی کے الفاظ پیش کرنے منظور ہیں تاکہ اس کے صحیح خیالات کی تصویر ناظرین کرام کے روبرو ہو اور ملک الشعراء سے تقابل میں داد ملے۔

خیابان خلیل، بہت حرص میں ہے گرفتار تو جھک اس کی طرف ہے جو ہشیار تو
کھڑا ہو گا کل پیش دادار تو نہ کھو ایک دم اپنا بیکار تو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(تعجب ہے کہ شباب کے طویل خمسہ میں ہمیں ہم قافیہ اشعار مل گئے)

ایک بچہ، نہ رہ اب قفس میں گرفتار تو ہے مانوس صیاد بے کار تو
کھلا رہ گیا در خبردار تو نہ تاخیر کر آج زنہار تو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ناظرین کے روبرو غالب یا حالی یا داغ و ذوق کا کلام پیش نہیں کیا جا رہا ہے جو معترض نگاہی سے دیکھا جا سکے یہ ایک نوآموز بچہ کا کلام ہے جسے چند ماہ شعر و سخن کی فکر میں گذرے ہیں،

خیابان خلیل، نہ حد سے بڑھے خود کبھی اے خلیل ہے غفلت کی عادت بری اے خلیل
گذارے تو یوں زندگی اے خلیل کرے قدر وقت آدمی اے خلیل
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

شاعر مصرع اول میں اپنا ایک مکمل خیال بیان کر کے سلسلۂ عبارت ختم کر دیتا ہے ایک اصول بیان کیا گیا ہے کہ "انسان اپنی حیثیت سے نہ بڑھے" دوسرے مصرع میں دوسرے خیال کی تکمیل کرتا ہے دوسرا اصول بیان کرتا ہے "غفلت کی عادت بری ہے" اس مصرع کا مضمون بھی ختم ہو گیا،

تیسرا اور چوتھا مربوط مصرعے ہیں جن سے مصرع اخیر کو بیشک تعلق ہے، خمسہ قطعہ مسدس وغیرہ میں تمام مصرع مربوط اور سلسلۂ عبارت کو قائم رکھنے والے ہونے چاہئیں اور یہ نہایت سخت عیب ہے اور ناسمجھی پہ دال کہ شاعر جس مصرع پہ مصرع پہونچا رہا ہے وہ غیر مربوط اور غیر مسلسل ہوں۔

ایک بچہ، ذرا غور کرنا کبھی اے شباب کہ کیا چیز ہے زندگی اے شباب
بھلی ہو وہ یا ہو بری اے شباب نہ ضائع کرے آدمی اے شباب
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

صفحہ ۲۳×۹

"ہر ہر کئے جا ہر گھڑی ہر کو بچے جو ہر کا ہوئے"

یہ ضرب المثل بقول مؤلف بہ تائید صاحب کلام اگر دنیا کے روبرو پیش کرکے دریافت کیا جائے کہ یہ کونسی ضرب المثل ہے کس موقع اور محل پر بولی جاتی ہے تو لوگ سائل کو مبتلائے مالیخولیا سمجھیں گے کہ یہ ہے کسی بھجن کا مصرع اور کہتا ہے ضرب المثل، ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا. بحیثیت "مصرع ہی" جو مصرع اس پر پہنچائے گئے ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ہم تنقید قائم کرنے میں اپنا بیش قیمت وقت ضائع کریں،

صفحہ ۲۶×۱۱

"سو سُنار کی اور ایک لوہار کی"

نمبر ۱

صورت بدلتی جاتی ہے اب غصۂ یار کی　　　　کچھ بات بن رہی ہے دل بیقرار کی
خفت اب ہو رہی ہے انہیں اپنی ہار کی　　　　شوخی سے ہو برابری کیا اضطرار کی

سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لوہار کی

سب سے پہلے تو میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ضرب المثل ایسی جگہ بولی جاتی ہے جہاں ایک شخص دوسرے پر متعدد زیادتیاں کر چکا ہو اور اس نے برداشت کرتے ہوئے جواب میں ایک ایسی زیادتی کی ہو جس نے تمام بدسلوکیوں یا زیادتیوں کی خاطر خواہ تلافی کر دی ہو، متذکرہ بالا مخمس میں غور کرنے سے صرف اول مصرع میں شاعر نے انقلاب غصۂ معشوق پر روشنی ڈالی ہے "دوسرے مصرع میں اظہار کیا ہے کہ "میرے دل کی قدر ہوتی جاتی ہے" تیسرے مصرع میں معشوق کی خفیف سی شرمندگی کا اظہار ہو رہا ہے "ہار" محض قافیہ پیمائی ہے ورنہ "لڑائی" جس کا نتیجہ ہار یا جیت ہے پہلے یا بعد کے مصرعوں سے قطعی مترشح نہیں ہوتی ایما تک نہیں، چوتھے مصرع میں صرف اضطرار اور شوخی کی برابری پر روشنی ڈالی ہے، جس کے بعد ہی ضرب المثل کا پیوند لگا دیا گیا ہے، کہنا پڑتا ہے کہ نہ ہر چہار مصرع غیر مناسب غیر مربوط اور بجائے خود ہیں محل ضرب المثل نہیں بن سکتے.

"وحشی ترا جو سوئے گلستاں کبھی گیا، اک آہ میں پپیہے کی پی کی گئی صدا　　　　فریاد کی تو سکتہ سا قمری کو ہو گیا، اک نالہ نغمہ ہائے عنادل کو لے اڑا"

"سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لوہار کی"

اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے گھر پر تھا، پپیہا، قمری، عنادل گلستاں میں، گلستاں سے شاعر کے گھر تک سلسلۂ ٹیلیفون قائم تھا جس سے وہ پپیہے کی پی پی کی صدا، اور عنادل کے نغموں کی دلخراش راگنی سن رہا تھا، شاعر کو ان دونوں صداؤں سے سخت اذیت پہنچ رہی تھی لہٰذا وہ بیتاب ہو کے اٹھا "سوئے گلستاں گیا" تاکہ ان اذیت دہ جانوروں سے بدلہ لے،

گلستاں پہونچ کے اک آہ کی "اس آہ نے معاملہ درہم برہم کر دیا، پی کی صدا گئی" قمری غریب بے قصور ماری گئی "سکتہ سا ہو گیا" "نغمہ ہائے عنادل کو بھی لے اڑی" وہی مثل ہوئی سو سُنار کی اور ایک لوہار کی،

معلوم نہیں ہوتا شاعر کو وہ انکا لیکہ نعرۂ عظیم تھا ان کی صداؤں سے کیا تکلیف پہنچ رہی تھی بلکہ ضرب المثل کا محل تو یہ کہتا ہو کہ پرندان خوش آواز جن سے عشاق کو خاص طور سے دلبستگی ہوتی ہے اسی عاشق کو (شاعر کو) قصداً تکلیف دے رہے تھے، حالانکہ پیرایہ کلام سے اس بات کا کوسوں پتہ نہیں چلتا، پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر نے گھر ہی سے اک آہ کیوں کی وہی ٹیلیفون کا رابطہ اس آہ کو ان پرندوں تک پہنچا دیتا، اس ضرب المثل کو اسطرح لکھتے ہیں "تحفہ"

دشمن نے کیں ہزاروں ہماری برائیاں، گھر گھر کے دل سے دروہ کرتا رہا بیاں، اک بات اپنی ہاتھ لگی انکی ناگہاں، جڑتے ہی ساری ہو گئیاں لن ترانیاں،

سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لوہار کی

شاعر کا تخیل بلند پروازی میں محدود نہیں ہے دوسرا بند ملاحظہ ہو، ؎

دلمیں تھے میری سیکڑوں ارمان لوٹے، بیچھے کر رکھا تھا انہیں میرے شوق نے، مجبور ہو کے دیکھا جو اس نگاہ سے جس کے کہ سارے ولولے کمبخت مٹ گئے،

سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لوہار کی،

خاطر میں تم نہ لاتے مجھکو کبھی نہ لاتے تھے ہر روز ایک حیلہ نیا تم اٹھاتے تھے تم جذب شوق کو میرے جھٹلاتے تھے یہ آج کیسے آگئے تم تو نہ آتے تھے،

سچ ہے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی،

کرتا تھا روز انکی جفاؤں کا میں گلا، اور آجتک جتایا نہ تھا دل کا مدعا، بدقسمتی کہ آج وہ منہ سے نکل گیا، سنتے ہی مسکرا کے دیا طعنۂ وفا

سچ ہے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی،

اسیطرح متفرق مضامین کے سرسری طور سے صد ہا شعر کہے جاسکتے ہیں جنمیں محل و موقعہ کا بلا حسن و جوہ خیال رکھا جا سکتا ہے، اپنی کمزوری البتہ ایسی فحش غلطی کہلا سکتی ہے، ؎

کرکے اسیر دام مصیبت میں خوب دھنسا، ٹھیرایا دل کو اپنے مگر کچھ نہ ہو سکا، آیا جو تیر آہ تو سنبھلا نہ پھر ذرا صیاد سن کے گر پڑا نخچیر کی صدا،

سچ ہے کہ سو سنار اور اک لوہار کی،

میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہو کہ متواتر حملوں یا زیادتیوں کے بعد جو فریق ثانی کیطرف سے جوابی حملہ فیصلہ کن دیا جائے وہ اس ضرب المثل کا موقعہ استعمال ہوتا ہے یہاں صرف صیاد کا ایک ہی اذیت دہ برتاؤ ہے "اسیر دام مصیبت کرنا"، جسکا جواب نخچیر کیطرف سے یہ ملا کہ "تیر آہ مار دیا جس سے صیاد گر پڑا" سو سنار کی تو نہوئی اک لوہار کی ضرور ہو گئی،

التماس

ناظرین کرام، یہ وہ ضرب الامثال تھیں جو مولف نے اپنی تقریب میں درج کی ہیں، صفحہ ۲۹ سے اصل میں خیابان خلیل کی ابتدا ہے، اگر ہم ہر اک ضرب المثل پہ تفصیلی روشنی ڈالیں تو محض تضیع اوقات ہے تاہم تنقید بھی ضروری ہے اسوجہ سے یہ التزام کیا ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کے اشعار یا ہر اک غزل و مخمس وغیرہ میں سے جو بہتر اشعار نظر آئے انہیں تنقید میں لے لیا ورنہ باقی نظر انداز کر دیے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبان کا دورِ ثانی

"زبان" جس رفعتِ خیال اور بلندیٔ ارادہ کو لیکر جاری کیا گیا تھا اگر اہلِ ذوق اس سے بیگانہ وار نگاہیں نہ پھیر لیتے تو آج وہ بھی دنیائے ادب کا بہترین خدمت کرنے والا ہوتا،

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گو "زبان" دیگر موجودہ رسائل کیطرح "نیرنگیوں کا گوناگوں مظاہرہ" نہ بن سکا لیکن اس نے اپنے گذشتہ دور میں جو کچھ علمی و ادبی خدمات ملک کے سامنے پیش کیں وہ کسی طرح ملک کے بہترین رسائل کی خدمات سے کم نہ تھیں۔

ملک کی بیدردانہ بے توجہی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اہلِ ذوق اصحاب کے تغافل بیجا کا نوحہ کرتے ہوئے "زبان" کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دنیائے ادب سے روپوش کر دوں جس کا اعلان میں نے گذشتہ اشاعت میں کر دیا تھا۔ جب باوجود میری کوشش اور جد و جہد کا اعتراف کرنے کے علمی و ادبی ذوق رکھنے والے میری مشکلات کیطرف سے اسقدر غفلت کرنے لگے تو میں نے بھی ضرورت نہ سمجھی کہ میں زبردستی ہر مہینہ ان کے سامنے "کاغذی جھولی" پھیلا کر "مالی و ادبی بھیک" مانگتا رہوں چنانچہ میں نے اپنی امیدوں کا خون کر کے "زبان" کے بند ہونے کا مجبوراً اعلان کر دیا۔ گو اس اعلان سے میرے دل کو سخت تکلیف ہوئی لیکن اس سے میرے حوصلوں اور ارادوں میں کوئی پستی نہیں آئی میری امنگیں اور تمنائیں اسی طرح مجھے بلندیوں کیطرف متوجہ کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ "مصائب اور مشکلات سے گھبرا کر اپنے مقاصد سے منہ موڑ لینا بزدلی ہے اور عظمتِ انسانی کی توہین" چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ ایک دفعہ اور میں حتی الامکان کوشش کر دیکھوں اور دنیائے ادب کو دکھا دوں کہ دوسرے رسائل جہاں بزعم خود کم سے کم قیمت میں بہترین رنگینیوں کو ملک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، وہاں میں ان مصائب و مشکلات کے باوجود بہترین علمی و ادبی خدمات پیش کر سکتا ہوں ؎

مرے ہاتھوں میں طاقت ہے تو اک دن کھینچ لاؤنگا ــ مری کشتی کو پھینکے جائیں موجیں دور ساحل سے

اہلِ ذوق میری جانب سے نگاہیں پھیرے جا رہے ہیں میں بھی اپنی جد و جہد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھونگا۔ آخر کب تک

ان کا یہ بیدردانہ طرز عمل قائم رہ سکتا ہے؟ میری یہ سعی بیکار نہیں گئی۔ میرے ارادوں کے استحکام نے اگرچہ تغافل کیشوں کو ہنوز مائل کرم نہیں کیا لیکن میرے مربیوں کو تو متوجہ کر ہی لیا اور مجھے پھر اپنی کامیابی کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی۔

حضور **ولیعہد صاحب** بہادر دام اقبالہٗ (منگرول) اور مخدومہ و محترمہ **عالیہ بیگم** صاحبہ ناددر دام ظلہا نے میری کوششوں کو دیکھتے ہوئے "زبان" کی سرپرستی منظور فرمائی ہے حضور والا و موصوفہ محترمہ کی یہ نوازش امراء کیلئے بہترین درس اور حضور کی ادب نوازی کا ایک بین ثبوت ہے۔

اسکے علاوہ مکرمی **سید واصل میاں** صاحب اور مجی **محمد خاں** صاحب نے "زبان" کے قیام کیلئے زبردست مالی امداد دینے کا وعدہ فرمالیا ہے "زبان" کی آیندہ قیمتی خدمات متذکرہ بالا سرپرستوں اور معاونوں کی کرم گستری کی ممنون احسان رہینگی۔

میں یہ خبر بھی انتہائی مسرت سے ناظرین "زبان" کو سُنانا چاہتا ہوں کہ زبان کے اس انقلاب نے عملہ ادارت میں بھی ایک قابل قدر اضافہ کردیا ہے۔

حضرت کیف مرادآبادی سے دنیائے ادب عرصہ سے متعارف ہے کیف صاحب ادب کی خدمت عرصے سے کررہے ہیں اور ملک کے ممتاز رسائل آپکی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے نوازتے رہتے ہیں۔

کیف صاحب "زبان" کو ہر طریقہ سے کامیاب بنانے کی کوشش کرینگے اور جو امیدیں اُنھوں نے مجھے دلائی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب زبان کی حالت بہتر سے بہترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ہوجائیگی۔

میں امید کرتا ہوں کہ زبان کی تبدیلیوں کو دیکھ کر ادب نواز حضرات اس کی مالی اور ادبی امداد فرماتے رہیں گے اور میری مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے ان کی کمی کے واسطے کوشاں ہوں گے اور مجھے اپنی کوششوں کیطرف سے مایوس نہ ہونے دیں گے۔

خوشتر (منگرولی)

زبان کے خریداروں کی خدمت میں چھ ماہ کی جبریہ تعطیل کے بعد موجودہ ماہ کا نمبر حاضر ہورہا ہے۔ حساب درست کرنے کے لئے وہ خریداران کا جولائی کے ماہ سے سال شروع ہوتا ہے خاص نمبر کو جنوری و فروری ۱۹۳۶ء کا تصور فرمالیں تاکہ ان کی میعاد خریداری دسمبر ۱۹۳۶ء میں ختم ہوجائے۔

(مینیجر)

ادبیات

پہاڑی لڑکی

(از کاشف اکبرآبادی)

(۵)

جبالہ کا کوہ وقار ارادہ قوس کو پہاڑ و نکی اس خاموش چاندنی میں چھپا کر لے آئی جو اسکی نورافشاں جسم سے چھلک رہی تھی۔ اُس کے مرمریں جسم کی ضیاپاشی نے خوف دہراس کی تاریکیوں کو برہم کردیا۔ اُسکی ملکوتی ضد نے خداوند مرکادس کے پُرانتقام غضب کی پروانہ کی۔ اُن دیوی کے جسکے دامن، دامنِ مریم کیطرح مقدس تھے، وہ اپنی تجلیوں کی قوت مجاذبہ سے ایک کلیم پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اُس کے طورِ جمال نے اپنے تماشائی کو ایک لمحہ کے آغوش میں چھپے میں ہم آغوش کرلیا۔ آدھی رات تھی، پہاڑ اپنے جبروت کے سایئے دادیوں پر چمکار رہے تھے، چاند اُن کے اثرِ جلال سے دور چمک رہا تھا اور قوس کی آغوش جبالہ کے مجسمۂ لطیف سے لعل تراش رہی تھی،

جبالہ نے ایک سیرکن خاموشی اور اطمینان کے بعد اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو جبینِ صندلیں سے آہستہ ہٹایا۔ دُکھتے ہوئے ہونٹوں کو تبسم کی لطافتوں سے تازہ کیا اور شگفتِ گل کیطرح نرم اور سُریلی آواز میں قوس کو مخاطب کرکے کہنے لگی، ان اطمینان کے چند لمحوں کا دیرپا انتقام، میرے قوس تمہارا نازک ترین دل کیونکر گوارا کرسکیگا۔

قوس۔ انتقام، کیسا انتقام، جبالہ کیا تیری خداوندی میں دوسرے منتقم کا بھی گذر ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مجھے پھر کہنے دے ہرگز نہیں پھر کیا تو انتقام لیگی؟۔

جبالہ۔ نہیں۔ بلکہ مرکادس کی غضب آلود نگرانی نہیں چاہتی کہ میری تنہائیوں میں میری ہمجنس لڑکیوں کے علاوہ کوئی پرشباب رعنائی اور بھی شریک ہوسکے۔ وہ مجازی آزادی کو حقیقی مسرتوں سے لبریز دیکھنا نہیں چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ میں اسی حسرت و اندوہ میں گھر کر مرجاؤں۔

قوس۔ مرکادس، پہاڑوں کا جلیل القدر بادشاہ گو تیرا باپ اور میرا خداوند ہے۔ لیکن جبالہ، قوس کی کمزور کمان تیری حفاظت کیلئے ہر وقت تیر بکنار ہے۔ اور میرے ترکش کا ہر زہریلا اور کوہ شکن تیر تیرے دشمنوں کی پیاس بجھانے کے لئے وقف ہے۔

جبالہ۔ شکریہ۔ لیکن قوس وہ پھر میرا باپ ہے۔ میری اور تمہاری دونوں قوتیں ملکر بھی اس کے جلال کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ مرکادس میرے جذبات کی ضد کا شکار ہو۔

قوس۔ تو پھر میں اُس کے انتقام کی ہر چنگاری آنکھیں بند کرکے اور سر جھکا کے اپنے دلمیں، جسم میں، اور اپنی ہستی میں جذب کر لینے کیلئے تیار ہوں۔

جبالہ۔ تسلیم۔ لیکن جان نثار قوس تمہیں مصیبت میں دیکھنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ چودہ سال کی ناقابل برداشت انتظار کے بعد میں نے تمہیں اپنی قوت سے صحرائے کہکشاں سے یہاں تک کھینچا ہے۔ اب کسطرح ممکن ہے کہ میں تمہیں مرکادس کی آتش کدہ غضب میں جلنے جھلسنے کے لئے چھوڑ دوں۔

قوس۔ لیکن کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ اُس کا غضب صرف میرے ہی لئے ہوگا اور تم پر اس کی آنچ نہ آئے گی۔ اگر ایسا ہو تو میرے لئے ہر آگ فردوس، اور ہر تکلیف راحتِ وصال سے زیادہ سکون آفرین ہے...... کیوں جبالہ کیا یہ ممکن ہے؟

جبالہ۔ کہکشاں کی تیرہ روش کنواریاں، اگر تمہارے یکایک غائب ہو جانے سے خفا نہیں ہیں تو یقیناً تمہاری حفاظت کے لئے تیار ہونگی اور تم ان کے جھرمٹ میں پناہ لوگے۔ اسلئے میرا خیال یہ ہے کہ اُس کا غضب صرف میرے لئے ہوگا۔

قوس۔ کہکشاں کی کنواریاں اگر مجھے بچا سکتیں، تو کیا جبالہ کا پیکر رنگیں اُن کی شب تاک خشم ناکیوں میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔

"نہیں ہو سکتا"، ایک جبال شکن آواز بغیر گونج رعد کی کڑک کی طرح سنائی دی اور ابھی یہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اُسکا سلسلہ ایک لمحہ کے بعد پھر ساعت پاش ہوا۔ "اور آسمانی درندے، کہکشانی ابلیس کیا صحرائے کوہ کی کوئی چکدار ہرنی تیرے دامِ حرص میں گرفتار ہونے کے قابل نہ تھی، کہ تو شہاب کیطرح زمین پر ٹوٹا۔ اور آسمانِ مقدس کے گندے تارے، کیا کہکشاں کی کنواریوں میں کوئی باقی نہ رہا کہ تو نے ارض الجبال کی اچھوتی کو اپنی ناپاک کرنوں کی گرفت میں لے لیا۔ میں کوئی اظہار اور کوئی آواز سُننا نہیں چاہتا اور اس سے پہلے کہ تو کہکشاں کی نوری فوجوں کو اپنی مدد کے لئے بُلائے فیصلہ کئے دیتا ہوں کہ تو ارض ارض الجبال کا اسیر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ کیلئے کوہ آتش فشاں بنا دیا جائے۔ اور تیرے مغرور سر سے ہمیشہ تیرے شباب کی آگ دھواں بنکر نکلتی رہے۔ میں پہچان میں ہوں مرکادُس ارض الجبال کا تنہا حکمراں۔ اور تیرا سب سے پہلا اور بڑا دشمن"

آواز ایکدم بند ہو گئی۔ قوس کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جبالہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ قوس کے سر سے دھواں نکلا اور وہ ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ ایک آتش فشاں پہاڑ بن کر جبالہ کے سامنے برپا ہو گیا۔

(۶)

"کیا تم اپنی مصورہ تصویر بنانے میں کامیاب ہوا چھے مصور تم ریک فیلڈ کیوں نہ آئے؟"

مرفی نے ایک مدھم طلب نگاہ سے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا، جبکہ چشمہ اپنی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا، اور مصوّر بدستور "بازگشت" کی تصویروں کے خاکے بنا بنا کر مٹا رہا تھا۔ ایک پر سکون خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندے اپنے پروں سے ہوا کو منتشر کرکے ایک جلد مٹ جانے والی برقِ صدا پیدا کر دیتے تھے۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا کہ مصور کی نگاہ قلم اور پردے سے ہٹ کر صحرا میں کسی طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ تین طرف پہاڑ تھے کہ اگر کوئی ہنگامہ برپا ہوتا تو بھی گونج پیدا نہ ہوتی، کیونکہ مرفی تمام ہنگاموں کو اپنے جو ہائے محبت دل میں جذب کر چکی تھی اور اس نے کوئی سکون شکن صدا اپنے ماحول میں ایسی نہ چھوڑی تھی جو اس کی خاموشی کو برہم کر سکے۔ مصور اس کی سُریلی آواز سے چونکا اور مصروف کار آنکھوں کو مل کر بولا۔ نہیں اینل مرفی میں اپنی کوششوں میں ہنوز ناکام ہوں۔ میں قابل معافی ہوں کہ اس مصروفیت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، لیکن اب کسی دن آسمان پر ابر ہوگا اور بارش کا یقین ہوجائیگا۔ میں ریک فیلڈ ضرور آؤں گا۔

مرفی۔ ایک لاحاصل کوشش میں تم اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو
مصور۔ اس لئے کہ ہر کوشش کا کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے۔
مرفی۔ ہر کوشش کا۔ مگر میری کوشش بھی تمہاری کوشش کی طرح ہنوز لاحاصل ہے۔
مصور۔ تم کیا چاہتی ہو۔
مرفی۔ یہ مجھے خود معلوم نہیں۔ مگر میں کسی چیز کی تلاش میں ہوں اور وہ مجھے کہیں نہیں ملتی۔
مصور۔ بغیر تعین کسی چیز کی تلاش کیا معنی رکھتی ہے۔
مرفی۔ یہ تم اپنی موجودہ کوشش سے پوچھو۔
مصور۔ میری کوشش ایک نقش خیالی کے اسیر کرنے میں مصروف ہے
مرفی۔ لیکن وہ نقش خیال میں بھی اسیر نہیں ہے۔ اسلئے تم اُسی خیالی بھی نہیں کہہ سکتے
مصور۔ پھر وہ کیا ہے۔
مرفی۔ ایک نقش موہوم جو میرے مطلوب کی طرح موہوم ہے۔
مصور۔ تو کیا ہم دونوں ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں۔
مرفی۔ اس کا جواب مستقبل دیگا۔
مصور۔ او عقل کی زندہ پتلی، میں حیران ہوں کہ اپنے نقش موہوم سے زیادہ تجھے بعید الفہم پاتا ہوں۔
مرفی۔ ہر وہ چیز جو اپنی حقیقت میں گم ہے بعید الفہم ہے۔ میں اپنی حقیقت میں کھوئی ہوئی ہوں اسلئے تم مجھے بازگشت کیطرح جلد دریافت نہیں کرسکتے۔ اچھا خدا حافظ۔ جب ریک فیلڈ آؤ گے تو یہ معمہ حل ہوجائے گا۔

مرفی بغیر انتظار جواب مصور کو ایک پھول دیکر وحشی ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتی ہوئی غائب ہوگئی۔ اور مصور نے قلم ہاتھ سے رکھدیا۔ اور ایک ایسے خیال میں کھینچنے لگا جو اُسکے لئے بالکل نیا اور وحشت ناک تھا۔

(۷)

مرکاؤس نے لرزا دینے والی آواز میں کہا۔
تیرا کوئی عذر میرے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکتا۔ تو نے بنت الجبال ہوکر ارض جبال کی دوشیزہ کنواریوں کو بدنام کیا ہے جبالہ قسم ہے اپنے جبروت کی اگر تمام پہاڑ تیری سفارش کے سجدوں میں سر جھکادیں۔ آسمان زمین پر جھک پڑے۔ اور زمین اپنے ہر ذرہ کو زبانِ سفارش بنادے تو بھی میں تیرا قصور معاف نہ کرونگا۔
جبالہ۔ خداوند پہاڑوں کی حکومت خدائی نہیں ہے۔ آپ کو اُس سے بھی ڈرنا چاہیئے جس نے آپ کو یہ جلال اور یہ جبروت عطا کیا ہے۔
مرکاؤس۔ اُس سے تو تجھے ڈرنا چاہیئے۔
جبالہ۔ کیوں۔
مرکاؤس۔ اسکا جواب اپنے دامنِ چاک چاک سے لے۔
جبالہ۔ میرا دامن پاک ہے۔ میرا دل پاک ہے۔ اور میں پاک ہوں۔ اب تک صرف میرے ہونٹھ گنہگار ہیں۔ آپ انہیں جو سزا چاہیں دیں۔ میں غیرت پدری پر نثار ہونے کو تیار ہوں۔
مرکاؤس۔ میں ایک گنہگار جزو کو کل کے ساتھ سزا دینا چاہتا ہوں۔ تو میری بیٹی نہیں ہے کسی شیطان کی بیٹی ہے۔ صحرائے کہکشاں کی کوئی ناپاک روح تیرے پردہ میں مجھے دھوکا دینے آئی

وسیے آئی تھی۔ میں اُسے واپس بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو بنت الجبال نہیں ہے ننگِ جبال ہے۔ بس میں زیادہ سننا نہیں چاہتا۔ تو قیامت تک قیدِ جسم کے ساتھ پہاڑوں میں پوشیدہ رہیگی۔ اور تیرے ہونٹوں کی سزا یہ ہے کہ جب دامنِ کوہ میں کوئی صدا پست یا بلند پیدا ہوگی تو تیرے ہونٹ بھی اس کا اعادہ کریں گے۔ تو اس مصیبت سے کبھی رہا نہ ہوگی کہ خالقِ جبال کی منشا میرے حکم میں پوشیدہ ہے۔ بس جا۔ خدا حافظ۔

جبالہ ایک شعلۂ نور کی طرح گھٹی اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔ یہ پہلا دن تھا کہ پہاڑوں میں گونج پیدا ہوئی اور جبالہ "بازگشت" بنکر ہمیشہ کے لئے فضائے کوہی میں جذب ہوگئی۔ جب سے ابتک کوئی پہاڑ ایسا پیدا نہوا جس میں جبالہ کے توس گیر ہونٹوں کی یادگار کا مزار نہ ہو اور جس میں اس کے ہونٹھ سرگرمِ تکلم نہ ہوئے ہوں۔ "بنت الجبال" اب بھی بنت الجبال ہے۔ وہ پہاڑوں کی وادیوں میں اپنے توس کیلئے گونج رہی ہے اور توس اُسکی یاد میں اپنے سر سے آگ اُچھال اُچھال کر گدازِ محبت کو روشن کر رہا ہے۔ پہاڑ ابتک جبالہ کی گونج سے آباد ہیں۔ اور دُنیا ابتک توس کی آتش بجانی سے لرز رہی ہے۔

(۸)

ٹھیک اُسوقت جبکہ "مرفی" اپنی منزلِ مقصود کی خاک بزی کے لئے ریک فیلڈ چھوڑنے والی تھی۔ مصور آ پہونچا۔ متول نے اُسے دیکھا۔ بغور دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔ کیونکہ جب وہ کسی دوسرے نوجوان کو مرفی کا مشتاقِ ملاقات دیکھتا اور اُسے اپنی رعنائیوں اور توڑ کا حریف نہ پاتا۔ تو اُسکے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ آجاتی۔ اُسنے مصور کو بھی انہیں نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ مرفی نے ایک مستانہ بےتکلفی سے پوچھا۔ صاحب، کیا آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے۔

مصور۔ ہاں کل پہلا دن تھا کہ مجھے کامیابی ہوئی۔ میں اپنی متواتر ناکامیوں سے مجنون بنا ہوا تھا۔ جب میرا دماغ بالکل تھک گیا تو میں نے اپنا قلم پھینک دیا۔ اور میں چلّایا "آخر میں کب تک یوں ہی اسیرِ فریب رہوں"

میں ذرا ٹھٹکا تو قریبی پہاڑ سے مجھے یہی آواز سُنائی دی۔ میں متحیر ادہر گیا۔ میں نے کہا "کون ہے" "یہ کون تھا" بجنسہ یہ آواز اور یہی الفاظ مجھے پھر سُنائی دیئے۔ میں گھبرا رہا تھا۔ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں عنقریب وحشی ہوجانے والا تھا کہ میں نے کچھ اور بلند آواز میں کہا "بس مذاق ہوچکا باہر آؤ، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں" مگر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب یہی الفاظ دُہرا کر میرے کانوں پر مار دیئے گئے۔ آخر میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں متفکر ہوکر بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھ پر ایک خواب طاری ہوگیا اور میں نے دیکھا کہ ایک حورجمال دوشیزہ عالمِ کرب و اضطراب میں بےچین اور بیتاب ہے۔ اُس کے نرم اور گداز ہاتھ پہاڑوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں بول سکتی۔ لیکن جب اُس کے سامنے کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ اُسی کو دُہرا دیتی ہے۔

میں اس طلسمِ خواب کو کچھ زیادہ حل نہ کرسکا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اور مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ "بازگشت" تھی۔ میرے دماغ میں اُسکی صورت مرتسم تھی۔ میرے خیال میں اُسکی حالت منقوش تھی۔ میں نے فوراً قلم اٹھایا اور جتنی جلد ممکن ہوسکا وہ تصویرِ خیال سے کاغذ پر

اُتارلی۔ مرفی، دیکھو کیسی مظلوم صورت ہے!

مرفی۔ ہوگی مینڈ بھی اپنی منزل مقصود ختم کرلی۔ کیا یہ سن کر تم خوش ہو؟

مصور۔ بیشک، لیکن وہ کہاں ہے جسکی تمہیں تلاش تھی۔

مرفی۔ وہ تم ہو۔ مرفی نے بڑے جوشِ محبت کے ساتھ یہ الفاظ کہے اور مصور کی گردن میں باہیں ڈالدیں۔

(۹)

سائکی، اپنے سمن خانۂ ناز میں گھبرائی پڑی تھی۔ چاند مغرب کے قریب پہونچ چکا تھا۔ تارے واماندۂ نظارہ ہوچکے تھے۔ کرنے زہرہ کو آواز دی۔ طائرہ نے ایک انجم افشاں انگڑائی لی اور آنکھیں کھولدیں۔ دیکھا تو سائکی پریشان ہے۔ اُس کے ہونٹوں کی ارغوانیت کچھ ہلکی ہوگئی ہے۔ اور اس کی آنکھوں کی شراب کچھ تلخ سی ہو چلی ہے۔ اُس کے صندل آفریں اور مہتاب پرور جبین جمیل پر عرقِ فکر کے کچھ قطرے ثریا کا جھومر بنے ہوئے ہیں۔ طائرہ اُس سے زیادہ گھبرائی، وہ بے تابانہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے فوراً اپنا بربط سرہانے سے اُٹھالیا۔ وہ چاہتی تھی کہ نغموں کی صبوحیاں پلاکر اُس کے خمارِ اضطراب کی اصلاح کردے۔ مگر سائکی نے ہونٹوں کے اشارہ سے منع کیا۔ اور کیوپڈ کی خالی جگہ کو بغور دیکھنے لگی۔ طائرہ سمجھ گئی کہ سائکی کیوپڈ کے انتظار میں بے قرار ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ارض کہکشاں سے قوس کو اُس کی تلاش کے لئے آواز دے۔ کہ ناگہاں کیوپڈ کمان بردوش فاتحانہ انداز سے نازل ہوا۔ اُس نے سائکی کو تبسم نگاہوں سے دیکھا۔ سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا۔ سائکی میں گواہ ہوں کہ ابھی دُنیا میں غیرت، رحم، اور محبت، تینوں چیزیں باقی ہیں۔

سائکی کے ہونٹھ گہرے ارغوانی ہوگئے۔ اُس کی آنکھیں کوثر فریب شراب برسانے لگیں۔ اُس کی مہتاب جمال جبینِ روشن چاند برسانے لگی۔ اُس نے ایک صبح نگار تبسم کیا۔ کیوپڈ کی کمان کو بوسہ دیا۔ اور اس کے ہمہ رنگ اور ہمہ گداز ہونٹوں نے فضائے ملکوتی میں یہ الفاظ برسائے کہ

جب تک سائکی کے حسن میں وقار اور کیوپڈ کے تیروں میں خلش کاری باقی ہے۔ انسانی دنیا میں غیرت، رحم، اور محبت، ہمیشہ باقی رہیں گے اور دنیا ان فردوسی جذبات سے کبھی خالی نہ ہوگی

قُم قُم یا حبیبی

بھرا ہے دل میں شوقِ ہم کلامی — مٹا دے میرے ساقی تشنہ کامی
پہن کر فخر سے تاجِ غلامی — کھڑے ہیں دیر سے در پر سلامی

قم قم یا حبیبی کم تنام

خدارا مرنے والوں کو جلا دے — ردائے پاک چہرہ سے ہٹا دے
تجلّی رخِ انور دکھا دے — حواس و ہوش پر بجلی گرا دے

قم قم یا حبیبی کم تنام

برائے خاطرِ احباب برخیز — بہ تسکینِ دلِ بیتاب برخیز
ز خواب اے نرگسِ سیراب برخیز — چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

قم قم یا حبیبی کم تنام

شبِ معراج محبوبِ خدا ہے — جہاں میں نغمۂ صلِ علیٰ ہے
نیاز و ناز کا وقت آگیا ہے — خدا خود پیار سے فرما رہا ہے

قم قم یا حبیبی کم تنام

کہاں ہم اور کہاں انکا نظارا — نہیں ہے اس قدر یارا ہمارا
جگانا اُن کو حصہ ہے تمہارا — بلالؓ اک بار تم کہہ دو خدارا

قم قم یا حبیبی کم تنام

آمجد (حیدرآباد)

دو آتشہ

(تمنائے موت)

جامِ غمِ اندوہ پیئے جاتا ہوں — بادیدۂ تر ضبط کئے جاتا ہوں
کچھ ٹھوکریں کھانی ہیں ابھی قسمت میں — مرنے کی تمنا میں جئے جاتا ہوں

محمود اسرائیلی

(جواب از مظہری)

جامِ غمِ مخلوق پیئے۔ اور پیو! — زخمِ دلِ اقوام سئے۔ اور سیو
گر تو ں گرے ہوؤں قریبی ہے مدد — جس طرح سے بن پڑا جئے۔ اور جیو!

(دیگر)

ہر اک کو فکر ہو گی اپنے گھر کی — شاعر کے نصیبوں میں ہے دنیا بھر کی
مرنے کی تمنا اور ابھی سے محمود — کیا ساری مہم جہاں بھر کی سَر کی

مظہری

(فروتنی)

تنکا ہوں قدم قدم پہ رہجاتا ہوں — گرداب میں گھومتا ہوں بہ جاتا ہوں
چلنے کی نہ قدرت ہے نہ رکنے کی مجال — افتاد جو پڑتی ہے وہ سہ جاتا ہوں

(جواب مظہری)

تنکا بھی عجب ابھار پر رہتا ہے — کس شان سے دریا پہ چڑھا بہتا ہے
گرداب کے ظلمات کی تہ تک جا کر — اٹھتا ہے خوشی سے ہر کڑی سہتا ہے

(دیگر)

ہاں طالب طول زندگانی می باش — آمادہ مرگ ناگہانی می باش
می داں بہ یقیں کہ وقت فرصت کم است — ہر لحظہ بہ کار و کامرانی می باش

مظہری

غزلیات

(از پروفیسر صاحب اکبر حیدری)

بے تکلف تجھے خدا کہنا — میری سادہ دلی کا کیا کہنا

جانتا ہوں ضرورتیں اپنی — مصلحت ہے تجھے خدا کہنا

رخصت اے خونِ دل خدا حافظ — چشم خونبار سے دعا کہنا

آہ ناکامیوں کی خود رائی — موت تک کو حیات زا کہنا

دور اندیشیاں محبت کی — بے وفاؤں کو باوفا کہنا

انتہائے الم پرستی ہے (غیر فانی) درد کو درد کی دوا کہنا

شعر کہنا تو اکبر محزوں

درد آمیز درد زا کہنا

(خاکسار عبدالرحمٰن خوشتر منگروالی ایڈیٹر رسالہ ہذا)

ملی ایسی قسمتِ منقلب کہ بساطِ عیش الٹ گئی — جو لگائی بازیٔ عشق تو کبھی چت گئی کبھی پٹ گئی

شبِ آخری کا چراغ ہوں نہ بہار دیکھی وہ باغ ہوں — میں وہ غم نصیب ایاغ ہوں جسے بادِ تند الٹ گئی

وہ کلی ہوں میں جو کھلی نہیں وہ ہوں غنچے جو کھوئے ملے نہیں — وہ شباب ہوں جو گزر گیا وہ ہوں عمرِ رفتہ جو کٹ گئی

جو نہ پھلنے پھولنے پائی تھی جو نہ برگ و بار لائی تھی — وہ ہی شاخِ نخلِ امید ہوں جو بہار آتے ہی کٹ گئی

وہ مرض ہوں جس کی دوا نہیں وہ ہوں ساز جس میں صدا نہیں — وہ گھر ہوں جس میں ضیا نہیں وہ میں نیند ہوں جو اچٹ گئی

غم و رنجِ رفتہ کا ذکر کیا جو تھا ہونے والا وہ ہو چکا — جو گزر گئی وہ گزر گئی جو نپٹ گئی وہ نپٹ گئی

ہوا کوئی پورا نہ حوصلہ ہے شباب پیری نما مرا — جو تھا جوشِ عشق فنا ہوا جو بڑھی امنگ تھی گھٹ گئی

وہ ہوں آہ جنسِ بد و زبوں جو کسی کے کام نہ آسکوں — وہ کسی کی عمرِ رواں ہوں میں بڑھی جتنی اتنی ہی گھٹ گئی

نہیں دوستو نہیں وہ یکدلی چلی خوشتر ایسی ہوا بری — نہ وہ انس ہے نہ وفا رہی نہ دلوں سے ان کے کپٹ گئی

جلد۳ نمبر۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبان

(منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہرماہ کے آخری ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ)

فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

زبان کی جوانا مرگی کا ماتم کرہی چکے تھے کہ عین اس موقع پر ہمارے چند معزز کرم فرماؤں نے اس کے ساتھ مسیحانفسی فرماکر نئی زندگی عطا فرمائی اور ادبی دنیا میں اپنے ناموں کو بھی بقائے دوام کا خلعت بخشا ہم ان معاونین کے دلی شکر گزار ہیں انہوں نے اپنی مستقل طور پر معاونت کا وعدہ فرماکر ہمیں زبان کی اقتصادی حالت کی جانب سے بہت کچھ سبکبار کردیا ہے اس لئے زبان بھی انشاءاللہ (اگر اتفاقیہ امور درپیش نہ آئے) اب پابندیٔ وقت کے ساتھ ہر ماہ اشاعت پذیر ہوا کرے گا۔

گزشتہ نمبر میں ہم تبدیلی معیار کا اعلان کرچکے ہیں چنانچہ حسب وعدہ موجودہ نمبر طرز جدید پر مرتب کیا گیا ہے جو علمی وادبی جواہر پاروں کا بے مثل ونادر مجموعہ ہے ہم جسکو قارئین زبان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ یہ رنگ خواص وعوام میں "رنگ قبول" کا درجہ حاصل کرے گا اور محنت ٹھکانے لگے گی ؎

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول جو میں نے چُنے ہیں اُنکے دامن کے لئے

زبان پر عام طور پر یہ اعتراضات وارد ہوا کرتے تھے کہ "یہ معارف کا ہمرنگ ہے، اس کا معیار مولویانہ ہے۔ اسمیں خشک اور ٹھوس مضامین ہوا کرتے ہیں" اور ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ "زبان کی پالیسی بدل دینی چاہئے، اس میں تنوع پیدا کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ رنگ غیر مقبول ہے، اور اس "معصیت" کے لئے معارف کا وجود کافی ہے وغیرہ وغیرہ، جس کے یہ معنی ہیں کہ معارف کی پیروی کرنا (اگرچہ ہمیں یہ فخر بھی حاصل نہ ہوسکا) اور اسی کا سا اعلیٰ معیار اختیار کرنا اس لئے "معصیت" ہے کہ یہ رنگ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے اور ایک خاص حلقہ تک محدود ہے۔ ہم معترف ہیں کہ زبان میں ایسے مضامین ہوا کرتے تھے جو عوام میں "غیر مقبول وغیر دلچسپ" کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ افسوس ابنائے ملک کا مذاق علمی اس قدر پست ہوگیا ہے کہ وہ کسی رسالہ کو بھی معارف کا ہمرنگ دیکھنا نہیں چاہتے۔ عامیانہ مذاق کو پسندیدگی

کی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں غیر مفید مضامین اور دلچسپ وحیا سوز افسانوں سے انس ہے اور ظاہری ٹیم ٹام زیادہ مرغوب ہے۔

اس سلسلہ میں کرمی حضرت راز چاندپوری ہمیں لکھتے ہیں کہ "فی زمانا ایسے اہل نظر بہت کم ہیں جو کسی جریدہ کی معنوی خوبیوں کی قدر کرسکیں۔ ظاہر پرستی کا دور دورہ ہے۔ کم قیمت اور طبع شدہ رسائل نے کارآمد اور ٹھوس کام کرنے والے رسالوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وقت آئیگا کہ زمانے کی آنکھیں کھلیں گی اور اچھے بُرے کی تمیز ہوگی" لیکن ع

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اگر ہمارا زاویہ نگاہ "مالی مفاد" ہوتا تو ہم "آپ ہی کا رنگ اب کرتے ہیں ہم بھی اختیار" کہہ کر ہم بھی زبان کو عامیانہ مذاق کا رسالہ بنا دیتے لیکن چونکہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے اسلئے ایسا کرنا ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ مگر۔ ہاں۔ باقتضائے ضرورت اس میں ایک شاندار تنوع پیدا کرکے ہم اس کو موجودہ رسائل میں ایک امتیازی شان بخشنا ضرور چاہتے ہیں جس کے ثبوت میں موجودہ نمبر پیش کرتے ہیں اگرچہ اس میں بھی ہماری خواہش کے مطابق مضامین نہیں۔

محبی کیف صاحب جن کا ذکر گذشتہ نمبر میں کرچکے ہیں افسوس کہ بوجوہ چند زبان کے عملہ ادارت میں شریک نہیں ہوسکتے لیکن زبان کے ساتھ ان کی ہمدردی وقلمی معاونت بدستور رہے گی چنانچہ اس نمبر میں بیشتر مضامین انہی کے فراہم کردہ ہیں اور حسن ترتیب میں بھی انکا ہاتھ ہے جس کے لئے ہم اپنے دوست کے مشکور ہیں۔

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ کیف صاحب اپنی ادارت میں ہوپال یا بجنور سے عنقریب ایک علمی وادبی رسالہ کا اجرا کرنے والے ہیں۔ ان کے ذوق ادبی سے امید ہے کہ قلمروئے اردو میں انکا "سفیر" بہت جلد اقتدار حاصل کرے گا۔

خوشتر منگرولی

مقالات معاشیات

معاشیات علم ایجابی ہے یا معیاری

Idealistic, *Realistic*

(جناب سید صمران علی بی۔ اے (عثمانیہ) متعلم ایم۔ اے۔ ال ال بی مُسلم یونیورسٹی)

اس زمانہ میں جبکہ انسانی ذہنیت نے علوم و فنون کے میدان میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور نئے نئے ایجادات اور عجیب غریب انکشافات نے دنیا کو حیران کر دیا ہے جہاں فنون میں ترقیاں ہوئیں علوم کی وسعت میں بھی بے انتہا اضافے ہوئے ہمارے سامنے موجودہ علمی دنیا ایسے مسائل پیش کر رہی ہے جو اب سے پہلے عقل انسانی کے لئے بالکل چیستان تھے۔

علم معاشیات نے بھی اس دور میں بہت وسعت اور ہمہ گیری اختیار کر لی ہے اور روز بروز اس میں تازہ معلومات اور نئے نئے خیالات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن میرا مقصد اس وقت صرف معاشیات کے ایک اصولی مسئلہ کا پیش کرنا ہے جس نے معاشین کے اختلاف آرا کی وجہ سے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ علم معاشیات کو ایجابی (Realistic) تصور کیا جائے یا معیاری (Idealistic)

اس کے متعلق بحث کرنے سے پہلے یہ امر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مصطلحین نے علوم کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) (Social sciences) علوم عمرانی (۲) (Natural Sciences) علوم طبعی

اوّل الذکر میں علم معاشیات، اخلاقیات، تاریخ و تمدن وغیرہ شامل ہیں اور ثانی الذکر میں علم طبیعیات۔ اور علم کیمیا سے بحث کی جاتی ہے میں اس وقت عمرانیات یا (Social sciences) پر کچھ کہنا چاہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ علوم عمرانی میں سے ہر علم انسان کو ایک بڑی جماعت کا رکن یا فرد خیال کر کے اس کی زندگی کے کسی ایک پہلو سے بحث کرتا ہے اور چونکہ انہیں علوم میں معاشیات بھی شامل ہے اسلئے یہ انسان کے اس ایک پہلو سے بحث کرتا ہے کہ انسانی احتیاجات کیا کیا ہیں انکے پورا کرنیکے ذرائع کون کون سے ہیں یہ علم انسان اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہے کہ زندگی کے کاروبار میں اسکی معروفیت کا کیا حال ہے انسان اپنے آرائش و آرام کے مادی ضروریات کے بہم پہنچانے میں جو کچھ کوشش کرتا ہے اسے معاشیات میں بحث کیجاتی ہے۔ اسمیں ایکطرف تو مسائل دولت پر غور کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انسان کی حالت پر اس رو سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشین ایجابی اور معیاری کے تصفیہ کے بحث پر مختلف الرائے ہیں ایک ایجابی (Realistic) کہتا ہے دوسرا اسے معیاری (Idealistic) بتاتا ہے۔

بہر صورت ایجابی پرست گروہ اپنے قول کی تائید میں یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ معاشیات کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی

موجودہ حالت پر نظر ڈالے۔ معاش دنیاوی چہل پہل اور روزمرہ کے کاروبار میں معاشی ترقی کا اندازہ کرے۔ اور معاشیات کیا ہے۔ اس سے بحث کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اس کا اندازہ لگاتا ہے کہ دُنیا میں کیا کیا واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں لوگ کس طرح سے اپنی اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اقوام عالم کا کیا حال ہے۔ پس اس طریقہ سے معاشی مسائل میں جان پڑیگی۔ اور اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکیگا کہ عوام کن کن مشاغل میں مصروف ہیں اور دولت کی تقسیم اور اُس کو دوسرے اثرات کی وجہ سے عام انسانی زندگی کے شعبہ میں کیا کیا اختلاف اور کیا کیا تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ دوسرا اسکول اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہی بناتا ہے۔ اور وہ معاشیات کو علم معیاری تسلیم کرتا ہے اور اپنے قول کی تائید اور ثبوت میں یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ جب انسان دُنیا میں رہ کر یہ نہ بتا سکے کہ فلاں چیز ادنیٰ ہے۔ فلاں اعلیٰ فلاں چیز ہماری سوسائٹی کے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ فلاں چیز ہمارے تمدن میں عمدہ ہے اور فلاں خراب۔ تب تک ہم نہ تو دُنیا میں ترقی کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے علم معاشیات میں علمی جھلک پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ جب تک ہم ([illegible]) "کیا ہونا چاہئے" کے ساتھ۔ جو ہمارا مسلک ہے۔ بحث نہ کریں گے۔ اُس وقت تک آیندہ زمانہ کے متعلق کچھ رائے قائم نہ کر سکیں گے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جو خرابیاں ہمارے تمدن میں پیدا ہو گئی ہوں ان کو دُور کریں۔ اپنی معاشی حالت کو درست کریں۔ اور موجودہ حالت سے باخبر رہ کر آیندہ واقعات اور حالات کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔

پس اس طرح معاشین کے دو گروہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لیکن تیسرا گروہ خیر الامور اوسطہا کا حامی ہے وہ کہتا ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے ([illegible]) کی بحث کو پوری طرح سے سمجھ لیا جائے موجودہ حالت کا کافی مطالعہ کر کے ایک رائے قائم کی جائے اور جب انسان موجودہ حالات پر کافی عبور حاصل کر لے تو پھر اُس کو اجازت ہے کہ وہ بطور اشتراکی ([illegible]) کے ([illegible]) کیا ہونا چاہئے کی بحث میں پڑے لیکن اگر ہم نے اس طریق سے کام نہ لیا۔ بلکہ ([illegible]) کیا ہے، کو سمجھے بغیر کیا کیا ہونا چاہئے ([illegible]) کی بحث میں گرفتار ہو گئے تو ہم کو معاشی مسائل کے سمجھنے اور سُلجھانے میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ہماری مثال بعینہ ایسی ہی ہو گی جیسی کہ اُس بیوقوف کی جس نے کہ پوری کی ہوس میں آدھی کو بھی کھو دیا۔

پس ان حالات کی بناء پر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ([illegible]) "کیا ہے" کی بحث کو خوب سمجھ لیں۔ بعد ازاں ([illegible]) "کیا ہونا چاہئے" کی بحث میں اپنے دماغ سے کام لیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا تو ہماری علم معاشیات پند و نصائح کی کتاب بن جائے گی۔ اور معاشیات سے جو فائدہ ہم کو

پہنچنا چاہئے تھا وہ ہرگز نہ پہونچے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس علم میں علمی جھلک اور خالص علمیت کی روح باقی نہ رہیگی ....
المختصر مندرجہ بالا واقعات اس بات کی توضیح کرتے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی میں معاشیات سے مدد ملتی ہے ۔ اور اصلاح تمدن میں اس سے بہت بڑی سہولت ہوتی ہے ۔ چنانچہ جب ہم معاشی مسائل پر غور و خوض کرنے کے بعد کسی بات کو اپنے تمدن کے لئے مُضر خیال کرتے ہیں تو ہم اُس کو تمدن میں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری سعی یہ ہوتی ہے کہ ہمارا تمدن بری باتوں اور بُری رسومات سے پاک ہو جائے ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہم اپنے لئے وہی کریں گے جو ہمارے تمدن کے لئے مفید اور سودمند ہوگا۔

پس ان حقایق کے تحت ہم ہندوستان کی معاشی حالت پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان ۔ غرض سب میں ہی تمدنی بُرائیاں موجود ہیں ۔ مثلاً ہندوستان کے ذات پات کے طریق کو لے لیجئے اس میں جہاں بہت سے فائدے ہیں وہیں بہت سے نقصانات بھی مُضمر ہیں ۔ معاشین کا عام اتفاق اس امر پر ہے کہ ذات پات کا طریق ہندوستان کے لئے نہایت مضر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ معاشی جمود اور سیاسی غلامی کا منظر نظر آتا ہے ذات پات کے طریق کو چھوڑ کر ہندوستان کے اشتراکی خاندان کی مثال کو لے لیجئے ۔ اس اشتراکی خاندان میں گو فائدے بھی موجود ہیں لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جب لوگوں کو بغیر کوشش کئے وجہ معاش مل جاتی ہے تو پھر اُن کے دلوں میں کام کرنے کا ولولہ اور شوق باقی نہیں رہتا ۔ چنانچہ ایسی صورت میں بہت سے لوگ کاہل بن کر دوسروں کے سہارے پر زندگی بسر کرتے ہیں قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی عادت ۔ جس کے بغیر معاشی ترقی ناممکن ہے اُن کے دلوں میں کمتر پیدا ہوتی ہے ۔ اور معاشی آزادی جسکی پیدائش دولت میں سخت ضرورت ہے ۔ بہت محدود ہو جاتی ہے ۔ خاندان کا بار ہونہار لوگوں پر اس قدر پڑ جاتا ہے کہ وہ کسی بڑے کام میں جس میں خطرہ ہو ۔ ہاتھ ڈالنے کی جُرات نہیں کرتے ۔ بہر حال یہ رواج بہت اچھا ہے کہ سب کمائیں اور سب مل کر کھائیں لیکن یہ اصول کہ تھوڑے کمائیں اور زیادہ اس سے فائدہ اُٹھائیں ترقی معیشت کے لئے نہایت درجہ ضرر رساں ہے اس کے علاوہ ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ بھی بہت زیادہ اہم ہے ۔ یہاں کے لوگ جب سے ہندوستان کی صنعتوں کو زوال آیا ۔ زیادہ تر زراعت پیشہ ہو گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی قصباتی آبادی شہری آبادی سے کہیں زیادہ ہے ۔ جس کا پیدائش دولت پر نہایت بُرا اثر پڑ رہا ہے ۔ آبادی کے سوال کو قطع نظر کرکے یہاں کے اصل کی حالت اور اُس کی درستی خود ایک اہم مسئلہ ہے اور اصل کے علاوہ ہندوستان کے عام رسم و رواج کی وجہ سے جو یہاں کی زینت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی ہے ۔ اُس کی خرابی کا دور کرنا بھی معاشین کے سامنے ہے ۔ ان تمام حالات اور واقعات سے اس امر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے کسی ملک کی موجودہ معاشی حالت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور جب اُس حالت کا پورا

پورا اندازہ ہوجاتا ہے تو اُس کے نقائص کو دور کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ نہ یہ کہ نقائص معلوم کرنے سے پہلے کوئی صاحب کسی ملک کی معاشی حالت کے سدہارنے کا تہیہ کرلیں۔ لہٰذا پہلا گروہ جو محض اس امر سے بحث کرتا ہے کہ کسی ملک کی موجودہ حالت کیا ہے۔ ایک لحاظ سے غلطی پر ہے کیونکہ اسکا منشا یہ ہے کہ کسی ملک کی موجودہ حالت معلوم کرکے اُسی حالت پر اکتفا کیا جائے اور اُس کی تمام خرابیوں کو دور نہ کیا جائے اس لحاظ سے یہ پہلے گروہ کی غلطی ہے۔ اسی طرح دوسرے گروہ کا خیال بھی صحیح نہیں کہ معاشیات محض اس سے بحث کرتا ہے (What ought to be) کہ کیا ہونا چاہیئے۔ فرض کیجئے کہ عام طور پر تجارت آزاد ہر ملک کے لئے بہت مفید ہے۔ لیکن مخصوص حالات میں ہر ملک کے اندر تجارت آزاد پر عمل پیرا ہونا ایک قسم کی سخت غلطی ہے۔ چنانچہ اگر معاشیات کے اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے اور دوسرے گروہ کی اندھی تقلید کی جائے تو ہر ملک اپنے آپ کو تباہی اور ہلاکت میں ڈال لیگا۔ جیسے کہ ہندوستان کی مثال سے ظاہر ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ موجودہ حالت کا اندازہ کرنا معاشین کا فرض ہے۔ اور جب اُس کا پورا پورا اندازہ ہوجائے تو پھر اُس کی خرابیوں کو رفع کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے اسی بحث کو صاف کرنے کے لئے مختلف مثالیں ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں۔ اور جب تک معاشین کا گروہ یہاں کے رسم ورواج۔ ذات پات کا طریق۔ اصل کا انتظام۔ محنت کی رسد۔ زمین کی خرابیوں پر کافی غور وخوض نہ کریگا۔ اُس وقت تک دوسرے ممالک کی اندھی تقلید بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان پہونچائے گی۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں معاشیات نہ محض ایجابی ([illegible]) علم ہے اور نہ محض معیاری ([illegible]) بلکہ یہ ایجابی اور معیاری دونوں کے بین بین ہے۔

رُباعیاتِ امجد

(۱)

ظاہر میں اگرچہ تو دۂ خاک ہوں میں | پر صدر نشین بزم افلاک ہوں میں
اک پاک وجود سے تعلق ہے مرا | کیونکر کہوں آپ کو کہ پاک ہوں میں

(۲)

ذرّے ذرّے کو مستقل پاتا ہوں، | ہر عضو میں کیفیت دل پاتا ہوں
واجب سے ملی ہوئی ہے ممکن کی کڑی | ہر جزو کو کل سے متصل پاتا ہوں

نگینہ اور شاعر

پاؤں تلے اک آیا ٹوٹا ہوا نگینہ — دیکھا کہ بال آکر شق ہو گیا ہے سینہ
میں نے یہ اُس سے پوچھا از راہ دردمندی — اے میرے دل کے ٹکڑے، یہ پستی و بلندی!
اِکدن تو جلوہ آرا تھا حسن کے فلک پر — کرتے تھے رشک انجم تیری چمک دمک پر
اقبال بن کے چمکا تھا تاج قیصری میں — بڑھکر تھا چشم خوباں سے تو فسونگری میں
تیرے ہر ایک پرتو میں جلوۂ قمر تھا، — مرغوب دل تھا اکدن تو زینت نظر تھا
اب خاک رہ میں تجھ کو آلودہ دیکھتا ہوں — اس حال میں بھی تجھ کو آسودہ دیکھتا ہوں

گفتار میری سُنکر کہنے لگا نگینہ — چلنے دے جیسے چلتا ہے عمر کا سفینہ
خالق کے دستِ قدرت میں ہے عنانِ ہستی — اقبال اپنے بس کا ذلت نہ اپنے بس کی
مجھ جیسا سنگریزہ کیا ہوتا قابلِ دید — معدن میں پڑ گئی تھی مجھ پر نگاہ خورشید
پرتو نے جس کے مجھ کو جوہر بنا دیا تھا — اس خاک کے فلک پر اختر بنا دیا تھا

اب آشنا میں اپنی ہستی سے ہو گیا ہوں
اور اوج کے منازل طے کر کے سو گیا ہوں

محمود اسرائیلی

(ادبی فسانہ) (ادب لطیف)

(از جناب حافظ امام الدین صاحب امام اکبر آبادی)

تاریک رات کے منہ پر قیر کا غازہ ہے ستارے ایک ایک کر کے پردۂ ظلمت میں چھپے ہوئے ہیں۔ ماہِ نو لاجوردی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ تاریکی نے تمام صحرا میں سیاہ فرش بچھا دیا ہے، دریاؤں اور سمندروں میں قیر کی موجیں ہیبت ناک سانپوں کی طرح منہ پھاڑ رہی ہیں، آسمان پر سکوت طاری ہے، زمین قیر گوں چادر اوڑھ کر سو رہی ہے اور کائنات کی تمام فضا پر سکون طاری ہے۔

اس خاموشی کے عالم میں، اور اس اندھیری رات میں، رودابہ ہمہ تن انتظار بنی بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے ایک فانوس ہے، جس کی ہلکی روشنی، ریشمی گلابی پردوں سے چھن چھن کر پائیں باغ کے لہلہاتے ہوئے سبزہ پر پڑ رہی ہے اس کے بائیں ہاتھ کی پشت انگشت پر اس کا رخسار ہے۔ اور اس کی منتظر نگاہیں ساکن و بے حرکت ہیں۔ رودابہ نے ایک آہ کی اور اسی کے ساتھ اپنے رخسار کو حرکت دی۔ انگلیوں کے نشانات اس کے حسین رخسار پر اس طرح نظر آنے لگے جس طرح کسی آئینہ پر زمرد و یاقوت کے ٹکڑے جڑ دیے جاتے ہیں۔

دفعتہً سکون میں حرکت خاموشی میں اضطراب، اور سکوت میں زلزلہ پیدا ہو گیا، اور اسی کے ساتھ رودابہ کے دونوں ہاتھ دراز ہو گئے، اس لئے کہ زال بہادر و دلیر زال دست بستہ پائیں باغ میں اس کے روبرو کھڑا ہے چاہتا ہے کہ بالا خانہ پر چڑھ جائے، لیکن بابِ حریم ناز کی بلندی سے یہ مجبور کھڑا ہے۔

رودابہ نے زال پر ایک مسرت آگین نظر ڈالی، اور ایک ہی گردشِ چشم میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو برسوں میں نہیں کہا جا سکتا تھا، اسی کے ساتھ رودابہ نے اپنی دراز چوٹی لٹکا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو پکڑ کر اوپر چڑھ آ کہ یہ تار آج ہی کے لئے میں نے پرورش کئے تھے تاکہ دوست کے کام آئیں۔

زال نے جوشِ محبت میں چوٹی کو اس زور سے چوما کہ چومنے کی آواز رودابہ کے کانوں نے سن لی، دفعتہً رودابہ کے ریعانِ شباب میں برق دوڑنے لگی، اور اسی کا نشوۂ چشم خونِ صد میخانہ بن گیا۔

بہر نوع چوٹی نے کمند کا کام کیا، لیکن زال نے بجائے اس کے کہ اس سے کمند کا کام لیتا، اپنے گلے سے لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح سنہری ناگن کوئی لپیٹ لے۔

ہاں بیشک یہی ہیں وہ بال، اور یہی ہیں وہ گیسو، جن کی تمنائے حصول نے میری روح میں جذباتِ زندگی پیدا کئے۔

جن کی طلب کے جوش نے بیرونی حملہ آوروں کو شکست دی۔ دُنیا جانتی ہے کہ روم و بربر، شام و حبش، اور عرب و ہندوستان سے ہمیشہ ان گیسوؤں نے خراج لیا ہے۔ توران جو انکا حریف مقابل تھا ہمیشہ ناکام رہا۔ افراسیاب کے چراغ ہوس کو انہیں کالوں نے بجھایا تھا (بالوں کو ہاتھ میں لیکر اور چوکر) اور ہاں ارجاسپ نے انہیں زلفوں کے حلقہ میں پھنسکر ایک کمزور نحیف پرندکی طرح دم توڑا تھا (رودابہ کی طرف دیکھ کر) اے میری روح کی مسرت! آج اور اس وقت ایک غریب، ایک بھکاری جس کا نام زال ہے اور جو مدت سے اس انتظار میں تھا کہ وہ کبھی تیرے در تک ہو چکر........

ابھی زال پورا جملہ نہ کہنے پایا تھا کہ دفعتۂ سیٹی کی آواز آئی، جس کا مطلب یہ تھا کہ پہرہ دار رودابہ کے محل کے گشت لگا رہے ہیں، اور رودابہ نے فوراً نیم خوف و نیم طیش کی حالت میں زال کو اوپر چڑھا لیا۔ خلوت کا تاریک گوشہ روشن ہو گیا، اور رودابہ کو محسوس ہونے لگا گویا اس کے خون کے ریشہ ریشہ میں بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ اس کی سانسوں میں سرعت، اس کے دل میں غیر معمولی حرکت، اور اس کے بدن میں ایک سنسناہٹ پیدا ہونے لگی،

کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟ زال نے کہا اور ایک لمحہ کے لئے کمرہ کی فضا پر سکوت طاری ہو گیا،

"اس سے قبل کہ تم مجھ سے کچھ کہو، تمہیں یقین کرنا چاہئے کہ جو جستجو مجھے ملاقات سے قبل تھی وہ اب نہیں شاید"

"اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت تم میرے پاس نہ تھیں اور اب میں تمہیں اور تمہاری ہر چیز کو اپنی ہی سمجھ رہا ہوں"

"اور اس لئے شاید اب وہ لذت باقی نہیں"

"مرد در حقیقت عورت کے جذبات سمجھنے سے کسقدر قاصر ہے۔ شاید تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے، اگر تمہیں"

"یہ معلوم ہو جاتا کہ دنیا کی تمام لذتیں، عالم کی تمام دلفریبیاں اور کائنات کی تمام دلکشیاں، اس مسرت آگین لمحہ"

"کے بالعوض کوئی مجھے دینا چاہے، تب بھی میں ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ میری یہ گھبراہٹ و"

"پریشانی اس لئے ہے کہ میں اس وقت اپنے تئیں ایک آتشین ماحول میں دیکھ رہی ہوں، نہ اس لئے کہ"

"کسی انسانی صورت سے خائف ہوں"

"کوئی شک نہیں کہ عورت کے محسوسات کا اندازہ کرنا نفوس بشری کی فہم سے مافوق ہے کیونکہ اس زمین"

"پر عورت ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کا بھید آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔ لیکن جس کو وہ چاہے راز آشنا"

"بنا سکتی ہے۔ البتہ جس سے وہ نظر پھیر لے، کوئی شک نہیں کہ فطرت بھی اس سے نگاہیں بدل لیتی ہے"

"کیونکہ عورت ایک محبت ہے اور محبت خدا۔ پس جس چیز پر اس کی نگاہ ہوتی ہے، اسی پر خدا کی نگاہ ہوتی"

"ہے لیکن اس وقت میں ایک ایسے دور سے گذر رہا ہوں، کہ میں الطاف و قہر کی نگاہ میں تمیز نہیں کر سکتا"

"اور ہر خواہش سے اپنے تئیں مستغنی رہا ہوں"

"رودابہ نے یہ محسوس کر کے کہ" باوجود اس کے کہ زال عورت کی تعریف و توصیف میں ہمہ تن معروف ہے، لیکن پھر بھی اسوقت اس کی تمنائیں سرکش ہیں، اس کی آرزوئیں خودسر ہیں، اور اس کی خواہشیں معزور ہیں، زال پر ایک برق پاش نگاہ ڈالی، جس سے زال کی روح میں ارتعاش تھی، اور اس کے خون کے دورہ میں ایک برق نامعلوم دوڑنے لگی۔ خریانی کیفیت طاری ہوگئی اسی کیساتھ اس کے دونوں ہاتھ حلقہ کی صورت بن گئے، اور اب یہ اپنے احتساب جذبات سے بھی بیخبر ہوگیا"

دفعتہً صبح کے سفید بانعوں پر سورج کی کانپتی ہوئی کرنیں زرنگاری کا کام کرنے لگیں۔ اور برگہائے رنگیں سے شبنم کے قطرے کافور ہونے لگے۔ لیکن زال کا نہ ختم ہونے والا خواب سنگین قیامت کا خواب تھا، جس کی شیریں لذت سے وہ جاں بر نہ ہو سکا۔

جذباتِ باسطؔ

جلوۂ محویتِ نگار تو دیکھ — نقشِ سجدات بیقرار تو دیکھ
آ مرا سینۂ فگار تو دیکھ — اپنی نظروں کا اختیار تو دیکھ
تیرے وعدہ پہ اور مجھ کو یقیں، — دیکھ یہ حسنِ اعتبار تو دیکھ
دیکھ لبہائے ترکی سے گوئی، — موج بادہ کا انتشار تو دیکھ
میرے جذبات دل نہ پوچھ مگر — تو مرا شوق انتظار تو دیکھ
عشق کا نام موت رکھتا ہے — اس فسانہ کا اختصار تو دیکھ

اہلِ دُنیا کا کیا گلہ باسطؔ
اپنے آئین ناگوار تو دیکھ

باسطؔ بسوانی

قفس

کیوں ہوئی نابود اہل بزم کی ساری ہوس — کسلئے لانے لگے مینوش لب حرف بس

کسلئے جاتا رہا اصنام کی آنکھوں سے رس — کیوں ہوئی مفقود اہل عشق سے حرص مگس

جان دیدینا حسینوں پر کہاں جاتا رہا — کسلئے پھولوں کی رنگت میں ہا اب کچھ نہ رس

قیدیان زلف کی کیوں بیڑیاں کٹنے لگیں — کسلئے خالی کئے جاتے ہیں اب کنج قفس

رہ روش راہ محبت کسلئے ہیں دم بخود — سامعہ کرتا نہیں کیوں منت بانگ جرس

ساز ہستی کسلئے مرہون خاموشی ہوئے — کیوں ترنم ریز اب ہوتے نہیں تار نفس

کسلئے افلاک پر تاریکیاں چھانے لگیں — روشنی اب کسلئے کرتی نہیں انجم سے مس

ایک سناٹا سا کیوں ہے دہر پر چھایا ہوا — کسلئے خاموش ہیں اہل جہاں چوں خار و خس

۹

بات یہ ہے عالم فانی سے قدسی چل بسا
اے زباں خاموش رہ اللہ بس باقی ہوس

شہزادہ قدسی

(از تازہ افکار شاعر نامی مولانا تجمل چشتی قادری مدظلہ العالی)

کیوں چشم و دل میں اور کوئی خوبرو رہے — دونوں ترے مکان ہیں دونوں میں تو رہے
رونق فروز خانۂ دل گر نہ تو رہے — بستی یہ کیوں نہ پھر صفتِ دشت ہو رہے
بس ہے اُسی کے واسطے جائز نمازِ عشق — خونِ جگر سے اپنے جو کرتا وضو رہے
ارمان ہے بسر ہو مری عمر اس طرح — دل میں خیال لب پہ تری گفتگو رہے
پردے میں رہکے بھی ہے تو ایجان خودنما — کیونکر بھلا نہ ذکر ترا چارسو رہے
ہمنے ہی نذرِ تیغِ ادا سر کو کر دیا — میدان قتلگہ میں ہمیں سرخرو رہے
آنے نہ پائے دل میں کسی دم خیالِ غیر — اے دوست تو رہے کہ تری آرزو رہے
پیرِ مغاں نے ہمکو حق آگاہ کر دیا — خوشحال کرکے بیعتِ دستِ سبو رہے
ہے سخت امتحان محبت کا معرکہ — رکھے خدا تو آج مری آبرو رہے
منظور ہے تو یہ کہ نظر آئے روئے دوست — مقصود ہے تو یہ کہ وہی روبرو رہے

سجدے کا لطف آئے ادا ہو نمازِ عشق
موجود سامنے جو تجمل کے تو رہے

اخلاقیات — اخلاقیات

(از جناب مظہر احمد صاحب ادھمی منشی مُلّا)

(۱)

جبکہ مشرق و مغرب کے مابین رابطہ تعلق برائے نام ہی تہا اور باہمی تعلقات میں شگفتگی کا پتہ بھی نہ تھا بلکہ رقابت اور ہمچشمی کا بازار گرم تھا۔ اس وقت یہ ایک طبعی امر تہا کہ مشرق مغرب کے نظام درس و تدریس کو باوجود اس حقارت و نفرت کے جو ایک دوسرے کے قلب میں موجزن تھی بخود دیکھے اور وہ وجدان جو ایسے موقع کے انتظار میں رہا کرتا ہے ایک دوسرے کو اپنی طرف غیر محسوس طور پر مائل کر رہا تھا۔ گو عمرانی ترقی میں ایک کے ذخیرہ علم سے دوسرا استفادہ کرتا رہا مگر ان میں سے ایک کے بھی دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لئے بھی مرہون منت ہونے کا خیال نہیں گذرتا تھا۔ البتہ قومی تعصب دن بدن پیدا ہوتا گیا۔ اور کوتاہ نظری ایک کو دوسرے کا خیر مقدم کرنے سے باز رکھتی رہی۔ اور دونوں قوموں کی برافروختگی بڑہتی ہی گئی۔ جس کی شہادت یورپ کے عہد وسطیٰ کی تاریخ سے کافی طور سے ملتی ہے۔

کورانہ تقلید، بغض و عداوت سے بجز غیر منصفانہ تشکیک کے کوئی مفید اور قومی تحریک پیدا نہیں ہوتی اور نہ وہ اس تدریجی استفادہ کو جو ایک قوم دوسری قوم سے کرتی ہے روک سکتی ہے بلکہ اس سے خود کو نشانہ الزام و نفرین بنکر ایک حد تک اپنے ہی ہاتھوں نقصان پہونچاتا ہے۔ یہ نقصان اس سے کہیں زیادہ مضر و مہلک ہوتا ہے جو کہ متخاصمین ایک دوسرے کو پہنچا سکیں۔ یہی وجہ تہی کہ یورپ ایک طویل عرصہ تک پاپائے تعصب کا شکار بنا رہا۔

مغرب کو مشرق اور خاص کر مسلمانوں پر ایک قسم کا تفوق ضرور ہے مگر وہ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک متبحر عالم پر اس کے اس اُستاد کو جس نے اس عالم کامل کو حروف تہجی سکھلائے تھے حاصل ہو۔ لیکن میں تو اس برتری کو بھی ایک حد تک مشکوک سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جہاں سکندر جواہرات کے صندوق لاد کر لے جاتا ہے وہاں ایرانی علم و فضل کے خزائن

بھی ساتھ لیجاتا ہے۔ پس مشرق نے مغرب کو جو قرض دیا تھا اُس کو مع سود وصول کرنے کا مستحق تھا۔ جس میں سے ذرا اصل بھی تو پورا نہیں ملا۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں علم اخلاق کے شیدائی جن کے زیر مطالعہ جلالی و ناصری رہا کرتی ہیں، میری اس صاف گوئی پر اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے یہ اعتراض نہ جڑ دیں کہ علم اخلاق مغربی متاع نہیں ہے بلکہ وہ مشرقی دولت ہے اور یہ کہ اس کے مٹے ہوئے نشانات یونان میں ملتے ہیں مگر میں جواباً یہ عرض کروں گا کہ اگر وہ تمام کتاب ٹھنڈے دل سے تحقیقی نظر کے ساتھ مطالعہ کریں تو اخیر میں اُن کو میرا ہمخیال بننا پڑے گا۔ گو اس سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جیسے مغرب کے اُن ہاتھوں سے لیا جن سے اصنام کی بو آتی تھی مگر بہ نظر انصاف کہے گا کہ اس میں سے بھی اصنام کی بو آتی ہے اور یونانیت کا کہیں پتہ بھی ہے اور موجودہ علم اخلاق کیا جزوی اور کیا کلی اعتبار سے یونانی ہو سکتا ہے غالباً اس کا جواب نفی میں دینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آئیگا۔ خاص کر جبکہ آنحضرت صلعم اپنے رسول بنائے جانے کی غرض و غایت صرف اخلاق نیک کی تکمیل ظاہر فرماتے ہوں ارشاد فرماتے ہیں بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخلاقِ۔

یورپ کا یہ نظریہ مسلمہ ہے کہ ہر خوبی کو اپنی طرف اور بُرائی کو مشرق کی طرف نسبت کریں اور اس کا علاج ہی کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی ہر صدا پر لبیک کہنے والے اس کو فوراً بلا دلیل یورپی تسلیم کرلیں لیکن ایک منصف نظر اس امر کا کافی طور سے اندازہ لگا سکتی ہے کہ اسلامی ضرورت نے اگر کچھ لیا بھی تو اس میں اور چار چاند لگا دیے مگر اس کا کیا کیا جاسکتا ہے کہ یورپ ہمیشہ مسلمانوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطی پر رہا ہے اور ہمیشہ مسلمانوں پر بے بنیاد الزام عائد کئے ہیں۔ حالانکہ اُس کا دامن بھی اس قسم کے الزامات سے پاک نہیں مگر اُس کو اپنی آنکھ کا تارا نہ تو کبھی نظر آیا ہے اور نہ اُس کی امید کی جاسکتی ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کرلیں کہ مسلمانوں کا علم اخلاق جوں کا توں یونانی اور مغربی ہے۔ تب بھی اس رائے کو تبدیل کئے بغیر چارہ کار نہیں۔ چونکہ دنیا ہمیشہ اپنی رفتار میں ترقی کرتی رہی ہے۔ اور جو چیز کسی عہد میں ایجاد ہوتی ہے وہ وقتی ضرورت کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے اور وہ علم اخلاق جس کا کہ جلالی درس دے رہا ہے وہ ایک ترقی یافتہ قوم کے ضروریات و عادات اور اطوار کے بالکل مطابق ہے اور وہ خیالات جس کی کہ وہ تعلیم دے رہا ہے بالکل اسلامی ہیں ایسی صورت میں مغربی تفوق کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔

مسلمانوں کا یورپ و نیز مشرق کے دیگر اقوام کے ساتھ اس قدر جنگ و جدل رہا ہے کہ یورپ مسلمانوں کی ہر خوبی کو معترضانہ نظر سے دیکھتا اور روشن پہلو کو بھی تاریک کرکے دکھلاتا ہے جبکہ اپنی ہر ایک غلطی پر پردہ ڈالتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے لیکر سولھویں صدی تک مسلمان یورپ کو انگلیوں پر نچاتے رہے ہیں، ٹرکی اور مصر کی سلطنتیں ان کے

نوجی مرکز تھے جس نے عیسائی دُنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس لئے یورپ مسلمانوں پر بربریت اور جہالت کا الزام عائد کرتا رہا ہے۔ مسلمان اُن کے اس حملہ کا جواب اپنی حکمت آمیز خاموشی کے ساتھ دیکر اُن کو غلط اور پھر ثابت کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جہاں جو کچھ ملا اُس کو چاروں طرف سے سکوت کے ساتھ فراہم کرتے رہے۔ کیونکہ اس عہد میں یورپ کا تدریس لٹریچر ذلیل اور ہیچ میرز تھا مسلمان نہایت خاموشی و متانت کے ساتھ دنیا کی مختلف اقوام کے علوم و فنون کو جمع کرتے اور معراج کمال پر پہونچا کر اپنی دماغی جسمانی اور اخلاقی ترقی کا آلہ بنانے میں منہمک رہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ مظاہر علوم سے مبرّا ہے لیکن اُن تغیرات پر ذرا نظر ڈالو جو انہوں نے آن کی آن میں کر ڈالے اور اُن نتائج پر بھی ایک سرسری نظر دوڑاؤ جو انہوں نے اس یورپ کی مستعار ذات سے نکالے۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں پر کسی قسم کا الزام عائد کرنا ایک اخلاقی جرم ہے کیونکہ وہ علم اخلاق جسکو مسلمانوں نے پیش کیا ہے وہ یورپ سے مانگا ہوا نہیں ہے بلکہ اُن جودت طبع اور بلند اقبالی کا نتیجہ اور کامل مرقع ہے جس کی نظر عالم کی دوسری اقوام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں علم اخلاق کا سنگ بنیاد قرآن نے رکھا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

یہاں پر پاک کرنے سے مراد اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا ہے اور نیز رسول اکرم کا ارشاد ہے اسلام اخلاق نیک ہے ایمان کامل تر اُن کا جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ کمال ایمان حسن خلق ہے عبادت سے حسن خلق افضل ہے۔ یہ وہ تحریک ہے جس نے مسلمانوں کو علم اخلاق کی ترتیب پر مائل کیا۔

(۲)

سلطنت عثمانیہ اپنی زندگی کے ابتدائی مراتب طے کر رہی تھی کہ اُس کے بہادرانہ حملوں نے یورپ کو ہلا دیا لیکن قبل اس کے کہ وہ یورپ کے بہترین اور خوشنما صوبوں کو اپنے زیر نگین کرلے ایشیا کے وسط میں ایسی طاقت پیدا ہوگئی جس نے اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک ہی نہیں لیا بلکہ اُس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ایشیا کی وسطی سلطنت میں امیر تیمور نے اپنی شجاعانہ کامیابیوں سے اُس شیرازہ کو جو سالہا سال سے منتشر ہو رہا تھا مجتمع کر دیا وہ یا اُس کے جانشین مثل مرزا بائسنغر[1] و مرزا ابو القاسم و مرزا شاہ محمود و سلطان سعید گورگان وغیرہ وغیرہ ایشیا میں علم فرمانروائی بلند کر رہے تھے جن کے ایک ہاتھ میں اگر تلوار تھی تو دوسرے ہاتھ میں علم و عمل کا دفتر چنانچہ

[1] آثار عجم صفحہ ۳۰۹۔

حسن بیگ ابن امیر علی جو کہ آق قونیلو ترکوں میں سے تھا اور آذربائجان - عراقین - فارس - اور کرمان کی حکومت کی سند پر پندرھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں جس کو کہ ایران کا زرین و ادبی دور کہنا چاہیے متمکن تھا جس کا عہد حکومت اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ صرف علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ وہ خود علم و فنون کی باکمال ہستیوں میں شمار کیے جاتے تھے مثلاً الغ بیگ شاہ کابل صرف فرماں روا ہی نہ تھا بلکہ ایک زبردست منجم بھی تھا اور اس طرح امیر حسن بیگ[51] جو کہ ۸۸۲ھ میں عاقلانہ حکومت کے بعد اس دنیا سے چلتا ہوا ایک اچھا خاصہ شاعر اور مضمون نویس تھا چنانچہ ذیل[52] کا شعر اسی کے کلام کا نمونہ ہے ؎

جانا جفا برائے وفا میکشیم ما
ترک وفا مکن کہ جفا میکشیم ما

یہی وجہ تھی کہ اس کے دربار نے علم و فضل کی انتہائی سرپرستی کر کے میر محمد ہاشم[53] خواجہ رضی الدین احمد جامی، مولانا قطب الدین احمد آدم - اور مولانا کمال الدین حسین الواعظ جیسے کم از کم پچاس زبردست عالم و فاضل اپنے دربار میں جمع کیے جو کہ پاکیزگی خیال اظہار مطالبہ اور فصاحت بلاغت میں اپنی نظیر آپ تھے اور وہ فیاضی جو علم ادب کی سرپرستی میں برتی گئی اس حد کو نہ پہونچتی تھی کہ جس کے نتائج آخر میں مضر اور مہلک ثابت ہوں جبکہ اس عہد کے اور گورگانی شہزادہ اپنا اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔
اور رعایا کو عاقلانہ علمی دلچسپیوں میں مصروف رکھنے کے بجائے ظاہری ٹیم ٹام میں منہمک کئے ہوئے تھے اسی وقت ایشیا کے جنوب و مغرب کی سرحد پر قدیم فلسفہ کے پیرو اپنا علم فلسفہ بلند کر رہے تھے جس نے خاص قابلیت اور اہمیت کے آدمی پیدا کئے انہی میں سے حسن بیگ بھی تھا جس کو کہ امیر تیمور نے بذات خاص صوبہ عراق کا حاکم مقرر کیا تھا جس نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے سنگین کوششیں نہ صرف نام ہی کے لئے کیں بلکہ بہت سے دوام پذیر اور علمی یادگاریں قائم کیں۔

تخت جو کہ قرب و جوار کے متخاصمین فرمانرواؤں کے اثر سے ڈگمگا رہا تھا اس کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں قائم و برقرار رکھنے کے لئے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ باوجودیکہ یہ سلطنت چھوٹی سی تھی مگر اس کی روشن دماغی نے اپنی برتری اور علو مرتبت کا خراج[54] ایشیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے وصول کیا۔ کیونکہ اس کی عادت تھی کہ ایک ہی گورنر کو ایک ہی صوبہ میں عرصہ دراز تک نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ چار پانچ آدمیوں کو شریک حکومت کر کے ایک مجلس کی شکل قائم رکھتا تھا کم سے کم ایک کام میں دو آدمیوں کو ضرور شریک کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عہد حکومت

[51] آثار عجم صفحہ ۲۷۹
[52] تذکرہ آتشکدہ مجرہ اول
[53] روضۃ الصفا جلد ششم
[54] روضۃ الصفا حالات عمال دوزنما، جلد ہفتم

میں ہاتھوں منڈا کو تبدیل کیا جس میں سب سے اوّل قطب الدین طاؤس سمنانی اور سب سے آخر خواجہ جلال الدین عطا اللہ تھا۔ اسکو اپنے دورِ حکومت کے ابتدا ہی میں تو مغل بادشاہوں سے جنگ کرنا پڑی جس میں سے ایک کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کے حملوں کا خوف ہر وقت لگا رہا لیکن اس کی عاقلانہ طرز حکومت نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اس میں شک نہیں کہ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو جلالی کے وہ الفاظ جو اس کی مدح میں لکھے ہیں واقعہ کے مطابق ثابت ہوئے بغیر نہ رہتے

اس بادشاہ کی علمی سرپرستی اور قیاس بالتشابہ کی بنا پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ علمی و ادبی حیثیت سے یہ زمانہ زرین تھا۔ کیونکہ سیاسی اعتبار سے جو واقعات و حالات اس زمانہ میں ساری و طاری تھے اس نے اخلاق جلالی جیسی مبارک کتاب کو پیدا کیا۔ یہ ایک ایسی زبردست تالیف ہے جو اپنے مضمون کی اہمیت۔ آتش بیانی اور زبان کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت میں نہایت بلند پایہ رکھتی ہے اور باوجود لٹریچری دلچسپیوں کے دربار میں ایک بھی تو ایسا نہ نکلا جو اس کی ہمسری کرتا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حیات ابدی و سرمدی ہمیشہ قلم کے ہی حصہ میں رہی ہے اور فنا تلوار کے حصہ میں چنانچہ حسن بیگ کو ہمیشگی کی زندگی کا جام اخلاق جلالی نے ہی پلایا ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسکی زبردست فتوحات قبر میں جا سوئیں۔ یہ سچ ہے ؎

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعلم

گو کہ اس عہد نے کاشفی اور سہیلی جیسے آدمی پیدا کئے مگر اخلاق جلالی جہاں ایک طرف پاکیزگی خیالات کی مخلوق کو تعلیم دیتی ہے تو دوسری طرف مدبرین سلطنت کو قانونِ حکمت سکھلاتی ہے اور مدارس کا اخلاقی بازار اسی سے گرم ہو رہا ہے مگر کاشفی اور سہیلی کی فصیح تالیف صرف کتبوں کی زیبائش رہ گئی ہے۔

(۳)

وہ اشخاص جو کہ انسان کی تدریجی و جانکش ترقی سے باخبر ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ایک منفرد ہستی زمانہ کی اس سے زیادہ مرہون منت ہے کہ زمانہ کسی منفرد ہستی کا وہ اس تصنیف کی طرف جو اصلی و ابتدائی ہونے کا فخر نہیں رکھتی کچھ کم راغب ہونگے کہ کسی مؤلف و مصنف یا کسی زمانہ کا علم جس کو کہ ذاتی ایجاد کہا جا سکے۔ ایک ایسا سوال ہے جس کا کسی اور موقع پر ذکر کیا جائیگا۔ فی الحال اس بات پر ہی غور کرنا کافی ہوگا کم از کم موجودہ یورپ نے انسانی بہبودی و خوشی کے مسئلہ کو حل کرنے میں اسقدر جد و جہد کی ہے کہ گذشتہ دنیا کی تاریخ نظیر نہیں لا سکتی۔

زندگی و احساس کے تغیرات متواترہ کے متقل ترقی و تہذیب نے زمانہ کے لئے بہت سے ایسے اصول پیدا کئے

ہیں جو انسانی زندگی کے لئے راہ ہدایت ہو گئے ہیں پس ایسی صورت میں عام طور سے وہ مضامین جن کی طرف ہم اپیل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اُن میں سے ایک اخلاق جلالی بھی ہے۔ گو یہ تصنیف ایجادی و اختراعی نہیں ہے تاہم وہ ناکل مضامین جن پر کہ اس میں بحث کی گئی ہے۔ اُن کے لئے یہ ایک بہترین و اہم ترین رسالہ ہے۔

علم اخلاق کا ترغیب و تعلیمات مذہبیہ سے نہایت ہی قریبی رشتہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا کے خیالات اپنی ترقی کے ابتدائی دور میں ہے اسی کی طرف مائل ہو گئے تھے کیونکہ مفید علوم و فنون کی طرف لوگوں کو ترغیب و تحریص دیجاتی اور اُن کا رواج دیا جاتا تھا بشرطیکہ وہ انسانی تہذیب و اخلاق میں معاون و مددگار ہو سکیں۔ اس وقت جبکہ ہر ایک ایسے اصول معاشرت کو جس کے لئے قرآن و احادیث سے استشہاد نہ کیا جا سکے۔ الحاد خیال کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی ذکاوت فلسفہ کے اس ملحدانہ معیار کو گھٹا دینے میں مصروف تھی۔ جو اس غرض و غایت سے بالکل ہی مختلف تھی جو اس سے سمجھے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ایک قسم کی باریک اصطلاحی تفریق نے پیدا ہو کر فلسفہ میں ایک تلاطم برپا کر کے ایک غیر محسوس طور سے اس کے عمل و فعل کو غیر مؤثر ہی نہیں کر دیا بلکہ اس سے بتدریج ایک اور سادہ و صحیح طریقہ وجود میں آ گیا جس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس طریقۂ عمل اور مفروضات کا تیقن کر دے جو انفرادی و اجتماعی صورتوں میں مفید مطلب اور دلچسپ ثابت ہو سکے۔ چنانچہ علم اخلاق و فلسفہ کے تدریجی ترقی کی شہادتوں سے اس امر کو تسلیم کرنے میں چون و چرا کا موقع ہی نہیں رہتا ہے کہ اس طرز نے فلسفہ میں شعار اسلامی کو آہستہ آہستہ داخل کیا اور اس طریق عمل کو دنیا کے ذہن نشین کر دیا۔ اور وہ اس میں کامیاب اس وجہ سے ثابت ہوئے کہ مسلمانوں نے زندگی کے لئے مذہب و اخلاق کو دو جداگانہ اصول قرار دیئے تاکہ ان دونوں میں تصادم واقع نہ ہو اور اس طور سے اپنے پیش رو بزرگان ([illegible]) یونانیوں کے خیالات اور علم و عمل کو اختیار کرنے میں اور معیار عمل بنانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی

بت پرست فلسفیوں کی تالیف اس قوم کی زندگی کا قانون عمل بن گیا جس نے کہ نصف عالم کو صرف اس غرض سے مسخر کیا کہ اصنام پرستی کو مفقود کر دے نہ صرف ابو نصر اور ابو علی سینا جیسے مسلم اُستادوں نے ہی نہیں بلکہ مختلف صوبجات کے چھوٹے چھوٹے کو اکب علم و فضل نے بھی یونانی اُستادوں کے طریقے پر ایسے رسائل کی کوشش کی جو کہ اُن کے معاشرت کی مخصوصیات و مذہبی خصوصیات سے پوری طور سے موافق ہوں۔

سب سے کامیاب کوشش جس نے مختلف افراد کی سعی کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہو وہ یہی تالیف ہو سکتی ہے جو ہمارے

سامنے موجود ہے اس کتاب کو ابو علی مسکویہ کی کتاب الطہارت سے جو کہ دسویں صدی میں لکھی گئی ہے خاص طور پر امداد پہنچی جس میں افلاطون و ارسطا طالیس کے فلسفہ کا مغز و نچوڑ کو عملی پہلو سے دکھلایا گیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس میں شک و شبہ نہیں رہتا ہے کہ مصنف یا وہ جس نے اس سے استفادہ کیا ہے وہ ادنیٰ ترین اصول سے لے کر اعلیٰ ترین تک سب سے پوری طرح واقف تھا۔ دو صدی کے بعد اخلاق ناصری کے نام سے اس کا ترجمہ فارسی میں نصیر الدین طوسی نے کیا جسمیں اس نے ایک نہایت ہی اہم اضافہ جو پولیٹکل اور خانگی حالت کے متعلق کیا ہے۔ جس کو کہ اس نے پہلے ابو علیٰ سینا سے پھر ابو نصر سے لیا۔ یہ دونوں یونانی فلسفۂ قدیم کے نہایت ہی ممتاز استاد تھے یہ اصلاح شدہ تالیف تین سو برس کے تجربات و دماغی سعی کے اضافے کے ساتھ بعد نظر ثانی کر کے ایک ایسے مصنف ( ) نے جس کے مزید خصوصیات آج نامعلوم ہیں اخلاق جلالی کے نام سے شائع کیا۔ پہلا نتائج محصلہ کے مقابلہ میں اصول سے زیادہ بحث کرتا ہی۔ کیونکہ یہی بات اس کی ذاتی اعتقاد کی قوت و طاقت صاف طور پر مجتمع نظر آتی ہے اور وہ ان یقینیات پر جو دوسروں سے حاصل ہوں بہت کم اعتماد کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ اطلاعات پر ایک باریک نظر رکھتا اور اپنی ذاتی مفاد کو قربان کرنے میں بہت باخبر ہے۔ دوسرا نتائج پر جو کہ اصول سے حاصل ہوں پہنچنے کی جلدی میں اساسی اصول سے سہل انکاری برتا ہوا قرا کے دل و دماغ کو ایسے پس و پیش میں ڈالدیتا ہے جس کا اس کے دماغ میں پتہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ان اسرار سے جہاں دوسرے کے دماغ کی رسائی بہ مشکل ہوتی ہے پورے طور سے باخبر نظر آتا ہے اور ان کو سرگرم فصاحت سے مزین کرتا ہوا آگے بڑھا چلا جاتا ہے۔ جہاں دوسرا آزادی کے ساتھ چکر میں آجاتا ہے۔

جلالی کا پر جوش اور آزاد طرز بیان اور مضمون کی بلند پروازی اور اس کو آسمان ترقی پر پہنچانا ایسی ایسی خصوصیات ہیں جو جلالی کے محنت کی داد نہ صرف اسکی قوم سے بلکہ دوسری اقوام سے بھی لئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اور جوں جوں زمانہ ترقی کریگا اسکی قدر و منزلت اور بھی زیادہ زیادہ ہوتی جائیگی۔ لیکن اس سے ذرا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو صداقت کی قدر و قیمت صرف اسکی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے سمجھتے ہیں وہ اس کی ہر حالت میں قدر کریں گے خواہ وہ کیسی ہی لباس میں کیوں نہ پیش کی جائے۔ انکی نظروں میں ناصری کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی اور وہ اس کو دلچسپ نظروں سے دیکھیں گے۔ لیکن بعض طبائع ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کے لئے محرک اور مصلح اشیاء درکار ہوتی ہیں۔ اور جلالی ہمارے دل و دماغ میں گرمجوشی اور احساس پیدا کر دیتی ہے اور وہ گہری عزت و مرتبت جس کے ساتھ علوم کا احاطہ کرتی ہے اور وہ مسرت و جوش بیان جس سے کہ وہ پردہ کو دور کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روم کا مشہور مقرر سیسرو چہک رہا ہے۔ اور جب یہ اپنی زبان کھولتا ہے تو صرف ہر بات کا یقین ہی نہیں کرا دیتا ہے بلکہ ایسی بات سناتا ہی جسکی "صدائے بازگشت سارے عالم میں پھیل چکی ہے۔"

(باقی)

تجھے گر جستجوئے مدعا ہے　　تری ہستی کا میں مقصد بتا دوں
اگر تو سعیِ حاصل چاہتا ہے　　تو میں وہ کوششیں بیحد بتا دوں

پڑا ہے آہ تو کن پستیوں میں　　حقیقت سے بہت ہی دور ہے تو
سمجھ لے خوب ان سرمستیوں میں　　اس آزادی پہ بھی مجبور ہے تو

فضاؤں کی جو یہ رنگینیاں ہیں　　تو سمجھا ہے کہ ان میں ارتقا ہے
یہ سب آنکھوں کی کوتہ بینیاں ہیں　　ترا مقصود ہی کچھ دوسرا ہے

تو کیوں ہوتا ہے مایوسی سے بیدل　　تری ناکامیاں ہیں کامیابی
نہیں تجھ کو تمیزِ نیک و باطل　　ترے احساس کی ہے سب خرابی

ہے تو بے چینیوں سے کیوں پریشاں　　فراوانیِ غم سے ہاؤ ہو، کیا،
یہ سب بن جائیں گی تسکیں کا ساماں　　سکونِ قلب کی ہے جستجو، کیا،

تجھے کیوں خوف ہے کم وسعتی کا　　ہے تری خاک کا ہر ذرہ امین
تجھے غم کیوں ہوا بے مائیگی کا　　تری ہستی کا ہر دانہ ہے خرمن

تو بس ہستی کے مقصد کو سمجھ لے
غم فردا و دے سے فائدا کیا
تو اپنی سعی بے حد کو سمجھ لے
رضائے یار میں چون و چرا کیا

تو دل سے پردۂ غفلت اُٹھا کر
فلک سے دور دیکھ اپنی بلندی
تو کر احساس پیدا اپنے اندر
تری فطرت میں ہے رفعت پسندی

تو کر لے تکملہ سوزِ دروں کا،
یہی ہے راز تیری ارتقا کا
فنا کے راز سے آگاہ ہو جا
یہی اک رمز ہے تیری بقا کا

تو جبتک پستیوں ہی میں پڑا ہے
قدم روکے گی ہر تصویر تیرا
ضیائے عسر مہ کیا دیکھتا ہے
ہے مقصد مرکز تنویر تیرا

نظر کو آشنائے راز کر لے
طلسم رنگ و بو کیا دیکھتا ہے
تو دل کو وقف سوز و ساز کر لے
یہی رازِ حصولِ مدعا ہے

جہاں کا راز ہے ہستی میں تیری
تن عالم کی گویا جان ہے تو،
ہے راز ارتقا پستی میں تیری
خبر بھی ہے تجھے "انسان" ہے تو

کیفؔ مراد آبادی

اخلاقیات

(جناب یسین محمد صاحب انجنیر اجینی)

دُنیا کی ترکیب اور انسان کی خلقت کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک و بد راستہ کا اختیار کرنا انسان کی مرضی اور انتخاب پر مُحوّل ہے۔ انسان دنیا میں اس طرح نہیں بھیجا گیا جیسے ایک سمندر میں کوئی تنکا پڑا ہوا ہو کہ پانی کی لہریں جہاں چاہیں اُسے بہالے جائیں بلکہ وہ دُنیا کے سمندر میں ایک ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہے اور اپنی سعی سے جس طرف چاہتا ہے جاتا ہے، پانی کی لہریں اُس کی مزاحمت کرتی ہیں لیکن یہ بھی اُن کا مقابلہ کرتا ہے اور جدھر دل میں آتا ہے اپنا رُخ پھیر دیتا ہے۔

مبدء فیاض نے عقل و شعور اور جو قوتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں اُن کو اگر صحیح طور پر کام میں لائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو دُنیا میں ایسی صدہا مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ پہلے جاہل، بدکار، اور بدسلیقہ تھے کسی سبب سے اپنی برائیوں سے مطلع ہوگئے اور تلافی مافات کی کوشش کی تو وہی عالم نیک کردار، اور ہنرمند بن گئے۔

انسان جب کسی فعل کا خوگر ہوتا ہے اور اس کے خلاف قانون جاری کر دیا جاتا ہے تو وہ اس سے پرہیز کرنے لگتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے، عادت اور خواہش اس پر قادر نہیں بلکہ اس کی محکوم ہیں بشرطیکہ وہ اُن کو قابو میں رکھنا چاہے، اگر کوئی شخص خود ہی اپنی باگ خصائل ذمیمہ کے ہاتھ میں دیدے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے بلکہ انسان جب کسی فعل بد کے ارتکاب کا عزم کرتا ہے تو اس کا کانشنس (ضمیر) اُسے ملامت کرتا، اس فعل بد سے روکتا، اور اس سے باز رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بچنا اور احتراز کرنا اختیار میں نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ طبیعت میں بھی افعال ذمیمہ سے بچنے کا فطری تقاضا ہوتا، طبیعت انسانی خود جانتی ہے کہ اس میں اجتناب و احتراز کی قوت ہے اگر انسان آنکھ بند کر کے کنوئیں میں گر پڑے تو اس کا ذمہ دار وہ آپ ہے۔

جن انسانوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے وہ اپنے اعمال و افعال کی جانچ کیا کرتے ہیں، نیک و بد میں تمیز کرتے ہیں اور اسی دُھن میں لگے رہتے ہیں کہ ہمیں کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیے اس سعی و کوشش میں لگے

ہوئے رہنے سے طبیعت کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ اکثر انسان اپنی تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو دیکھتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بین و خود پسند ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ دونوں رُخ دیکھیں تو علاوہ محاسن کے اپنے عیوب بھی اُن کو نظر آئیں اور اصل حقیقت آئینہ ہو جائے اس کے بعد انسان اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے افعال کو منظم اور باقاعدہ کر سکے گا ۔

وہ اہل بصیرت جو اپنے عیوب کی خودنگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں اپنے تئیں ایسے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں کہ دوسروں کو نکتہ چینی کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور اپنے اعمال و افعال کی خود اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح انسان کو اپنے حال پر غور و فکر کرنے کی عادت ہو جاتی ہے ۔

لیکن ابتدائی حالت میں یہ کیفیت ایسی کافی نہیں ہوتی کہ انسان اسی پر اکتفا کرے اور نہ اس سے اس قدر فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ پہنچنا چاہئے ابتداءً اپنے کسی فعل کی اصلاح کا خیال کرنے کے لئے بڑی اولوالعزمی اور بہت بڑی جرات کی ضرورت ہوتی ہے ، اور اس میں جسقدر انسان کو تکلیف ہوتی ہے اس کی بہ نسبت فائدہ بہت کم معلوم ہوتا ہے اگرچہ فائدہ ہوتا ضرور ہے مستقل مزاج آدمی جو قول کے سچے اور دُھن کے پکے ۔ ہوتے ہیں ان تکالیف سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے نہ وہ ایسی ادھوری اصلاح پر قناعت کرتے ہیں بلکہ محاسبۂ نفس کی عادت کو زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی بالکل اصلاح و درستی نہیں کر لیتے کوشش کرنے سے باز نہیں آتے ۔

فرض کیجئے کہ کسی ایسے شخص سے جو اپنے نفس کی اصلاح میں مصروف ہو کوئی لغزش ہو جائے اور ضمیر اس ناشائستہ حرکت پر اُسے ملامت کرے تو اُسے سخت صدمہ ہوگا اس موقع پر وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کرے گا کہ وہ پھر کبھی اس فعل کا مرتکب نہ ہوگا لیکن اپنے نفس کے امتحان کے لئے وہ ایسے موقع کا منتظر رہے گا کہ نفس شہوانی یا غضبی کی سرکشی کے باوجود اپنی طبیعت پر قابو رکھ سکے اور جب وہ اس قابل ہو جائیگا کہ قوائے شہوانی و غضبی کے حملوں کی پوری طرح مدافعت کر سکے اور طبیعت پر ان کا کوئی بُرا اثر نہ ہو سکے تب اس کی اصلاح کامل سمجھی جائے گی اس وقت انسان کی روحانی کیفیت کا درجہ نہایت ارفع و اعلیٰ ہو جاتا ہے اور پھر وہ نیک و بد میں امتیاز کر سکتا ہے اور تخیلات فاسدہ کا اس پر قابو نہیں چل سکتا ۔

جب انسان میں روحانی طاقت کی نشو و نما ہونے لگتی ہے اور وہ خصائل حمیدہ کی عادت ڈالتا ہے اُسوقت ملکات ردیہ کا مقابلہ اور ان کے دور کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور فضائل کی تکمیل کے ساتھ ساتھ رذائل کی بیخ کنی بھی ہوتی جاتی ہے ۔ بالآخر رذائل سے ایک نفرت سی ہونے لگتی ہے اور وہ متعجب ہوتا ہے کہ ابتک ایسے مذموم و بدترین خصائل کا اس پر کیونکر قابو رہا ۔

جس قوت کے ذریعہ انسان کے افعال میں اتنا بڑا تغیر پیدا ہوگیا وہ حکمت عملی یا عقل فعال ہے جو انسان کو یہ سمجھاتی ہے کہ جو جو وسائل اور اسباب اُسے دنیا میں حاصل ہیں ان سے کوئی کام بطریق احسن کیونکر لیا جاسکتا ہے یہ قوت انسان کی دیگر تمام قوتوں کو مناسب درجہ پر اور ان میں انتظام اور ترتیب قائم رکھتی ہے یہ قوت انسان کو بتاتی ہے کہ اس کا درجہ کیا ہے اور وہ دنیا میں کیا کیا کرسکتا ہے، حکمت عملی انسان کو اپنے فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے (جو اس وقت درپیش ہوں) اور اسکی مدد سے انسان خیالی اور موہوم خوش آئند حالات کا انتظار نہیں کرتا نہ تاسف وحسرت کے عالم میں اپنے زور وقوت کو ضائع کرتا ہے بلکہ حالت موجودہ کو خوشگوار اور دل پسند بنانے کی کوشش کرتا ہے عقل فعال کسی خاص قوت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کی مختلف قوتوں کے ملکر کام کرنے کا نام ہے اس کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ راست وغلط میں تمیز کرنا سکھاتی ہے اس صورت میں اس کو قوت تمیز بھی کہتے ہیں۔

راست وغلط دو ایسے لفظ ہیں جن کی صحیح حقیقت معلوم کرنے پر تمام اخلاق کی بنیاد قائم ہے اگر صحیح وغلط کی تمیز نہ ہوتی تو دیگر حیوانات کی طرح انسان خواہ کچھ ہی کرتا اس کے لئے جائز ہوتا اور دنیا میں حسن وقبح، بھلائی اور برائی نیک نامی وبدنامی، ایسے الفاظ ہوتے جن کے کوئی معنی نہ ہوتے لیکن قوت تمیز صحیح وغلط، جائز وناجائز میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے اور ایک کام کو اختیار کرنے اور دوسرے کو ترک کرنے کا حکم دیتی ہے، راست وغلط میں تمیز کرنا اور اخلاقی اصول پر کاربند ہونا خود انسان کا کام ہے۔

بعض اوقات طبیعت کا اقتضا مختلف رجحانات پیدا کردیتا ہے لیکن جن کے دل نور حکمت سے معمور ہیں وہ تمام جذبات عقل کے تابع رکھتے ہیں اور عادت وخواہش کے محکوم نہیں ہوتے بلکہ اُن پر حکمرانی کرتے ہیں۔

انسان کی زندگی ایک مدرسہ ہے جس میں وہ روزانہ نئے نئے سبق اور تجربے حاصل کرتا ہے اس مدرسہ کے معلم گوناگون افکار، بڑے بڑے امتحانات، نئی نئی دقتیں طرح طرح کی تکالیف اور قسم قسم کے مشکلات ہیں جو پرہیز گاری، عزیمت نامہ، ہمت، قناعت، اور خدا پرستی سکھاتے ہیں۔

انسان کو اپنی نسبت نہ صرف یہ جاننا چاہئے کہ وہ کیا کرسکتا ہے بلکہ یہ بھی جاننا چاہئے کہ وہ کیا نہیں کرسکتا لیکن اس سبق کے حاصل کرنے کے لئے انسان کو دنیا میں مختلف لوگوں سے ملنا اور مختلف قابلیتوں کے لوگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھانا لازم ہے بغیر سوسائٹی کے انسان کو اپنی قابلیت کا پورا پورا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی استعداد کی جانچ میں غلطی کرکے خود بین وخود رائے ہوجاتا ہے، اعلیٰ سوسائٹی اس کی عقل کو روشن، رائے کو مستحکم اور نظر کو وسیع بناتی ہے، تمیز نیک وبد جو عملاً کوئی اچھا کام کرنا سکھاتی ہے ایسے ہی تجربات سے حاصل ہوتی ہے۔ تجربہ کے علاوہ علم

راضی برضا

شکوہ نہ بیش و کم کا نہ غم کا نہ کچھ گلہ ہے — جس چیز کے تھے قابل ملتا جو تھا ملا ہے
شانِ کرم سے قائم ہستی کا سلسلہ ہے — شکرِ کریم دل کے آئینہ کی جلا ہے

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

جو نعمتیں ملی ہیں وہ کم ہیں یا ہیں وافر — ہر حال میں ہے لازم تقدیر پر ہوں شاکر
رنگِ ظہورِ قدرت ہر ذرے سے ہے ظاہر — اول بھی تو ہے برقؔ مالک ہے تو ہی آخر

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

فیضِ عمیم تیرا دنیا میں چار سو ہے — تاروں میں نور تیرا پھولوں میں تیری بو ہے
سر بہرِ شکرِ نعمت خم تیرے روبرو ہے — پتلے ہیں ہم خطا کے بندہ نواز تو ہے

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

جس حال میں رکھے تو وا تا ہمیں ہے رہنا — پھولوں میں یا ہو تلنا یا درد و رنج سہنا
ہمنے ہے سر سے پا تک ملبوس صبر پہنا — دل میں یہی تمنا منہ سے یہی ہے کہنا

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

حاصل ہو سربلندی یا ہو نصیب پستی — دورِ طرب ہو یا عہد فاقہ مستی
رنجوری و الم ہو یا عیش و تندرستی — تسلیم اپنا شیوہ مسلک ہے حق پرستی

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو"

سازِ حیات کیا ہے؟ سامان ہے یہ تیرا — جو اصل زندگی ہے عرفان ہے یہ تیرا
سرچشمۂ کرم تو فیضان ہے یہ تیرا — بخشی ہیں نعمتیں جو احسان ہے یہ تیرا

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو"

خوانِ کرم پہ تیرے مہمان ہے زمانہ — ملتا ہے رزق ہر کو قسمت کا دانہ دانہ
جود و سخا کا مخزن ہے تیرا آشیانہ — کیوں برقؔ کے ہو لب پر ہر دم نہ یہ ترانہ

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

برقؔ دہلوی

اٹھارویں صدی کے فسانہ نگار

قیسی

قصہ کہانی کا سلسلہ تو ابتدا سے ہی چلا آتا ہے۔ نہ اس وقت کوئی مصوّر فطرت جادو نگار رقمطراز تھا نہ کوئی طوطی شیریں بیان فسانہ گو فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا تھا۔ بلکہ لوگ غلط و صحیح قصص و حکایات دل بہلانے کو گڑھ لیا کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں ذوق فسانہ نگاری کو عروج ہوا۔ انگریز مصنفین نے طول حکایات و قصص کو ناول کے جامہ میں اہل دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ پہلی کتاب جو فسانوں کی ماں ہے (Robinson Crusoe) جو ۱۷۱۹ء میں شائع ہوئی۔ فسانہ نگاری کی بنیاد اسی سے قائم ہوئی ہے۔ اس کے مصنف کا نام ڈینیل ڈیفو تھا۔ جب اسکی عمر صرف ۱۱ سال کی تھی ایک اور شخص جیل کے اندر مختلف قسم کے فسانوں کا رنگ جما رہا تھا جس کی شہرت "روبن سن کروسو" کے مصنف سے بھی زیادہ ہوئی۔ اس شخص کا نام جان بنین تھا۔ اس سے قبل چند اور غیر معروف لوگ ہوئے ہیں مگر جان بنین سترہویں صدی کا پہلا مشہور فسانہ نگار ہوا ہے۔

اس شخص کا کس قسم کا دماغ تھا؟ اس کا پتہ اس کی تصنیف (Pilgrims Progress) دیکھ کر چل سکتا ہے۔ زبان کی خوبی۔ خیالات کی پاکیزگی سے پُر ہے۔ اس کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس کا مصنف صرف قلم پر ہی حاوی نہ تھا بلکہ ایک عالم بیدل۔ قانون فطرت کا پورا ماہر بھی تھا۔ اس کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبردست تصنیف کسی کمہار کے لڑکے کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ حقیقتاً وہ فطرتی جذبات پرست اور صحیح الدماغ واقع ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم تربیت بہت معمولی سی تھی۔ عالم شباب میں عام جوان لڑکوں کی طرح سہل انگار اوباش و آزاد طبع تھا مگر اس کی روح قطعی بے لوث تھی اس میں انسانی ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔

اس کا سن پیدائش ۱۶۲۸ء ہے۔ ۱۶ سال کی عمر کے بعد اپنے آبائی پیشہ کو ترک کرکے فوج میں ملازم ہو گیا۔ اس نے ایک معمولی سی حیثیت کی لڑکی سے شادی بھی کرلی تھی جو ۴ بچے چھوڑ کر راہی عدم ہو گئی۔ شادی کے قبل تک اس کی طبیعت میں اوباشی تھی مگر بیوی ایسی نیک ملی کہ اس نے اس کی فطرت کے پوشیدہ جوہر کو چمکا دیا۔ بیوی کے انتقال

کے بعد وہ متقی مذہب پرست بن گیا اور عرصہ تک تبلیغ و اشاعت میں سرگرمی سے مشغول رہا۔ مگر چارلس دوم کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی آخر ۱۶۶۰ء میں گرفتار کر کے اس کو قصبہ (Bedford) میں قید کر دیا گیا۔ ۱۲ سال تک قید رہا۔ وقت کی قدر کرنا اس عرصہ میں اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔ چنانچہ اس عرصہ میں اس نے بہت سی مذہبی کتب لکھ ڈالیں۔

۱۶۷۲ء میں رہائی پانے کے بعد وہ ایک مستند پادری کی حیثیت سے (Bedford) کا پیشوا اعظم تصور کیا جانے لگا۔ رہائی پانے کے بعد اس کی قلم و زبان دونوں آزاد تھی اسی زمانہ میں اس نے اپنی مشہور تصنیف (Pilgrims Progress) کی تکمیل کی ۱۶۷۸ء میں آخر مر گیا۔ اس کی اس معرکتہ الآرا تصنیف کے تراجم ۸۰ مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

ڈینیل ڈیفو مصنف (Robinson Crusoe) کی ہستی یہ ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے کہ گمنامی و عسرت کی زندگی بھی اہل عالم کی نظروں میں کارہائے نمایاں کے ذریعہ وقیع ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا باپ جیمس فو قوم سے قصاب تھا اس مشہور و معروف مصنف نے اپنے آبائی پیشہ کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علم و فضل میں کلام نہیں لاطینی۔ یونانی۔ فرانسیسی۔ اسپینی اور اطالوی السنہ میں اس نے استعداد کامل حاصل کی۔ اسکا قصد پہلے کسی گرجا میں داخل ہونے کا تھا مگر اپنے تمام عزائم کی عنان دوسری جانب پھیر کر موزہ سازی شروع کر دی۔ اس وقت اسکی عمر ۴۴ سال کی تھی ہنوز تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔

اس نے ہی ابتدا میں اپنے قلم کو سیاست و قانون کتب سے مطلق مخوف نہیں ہونے دیا۔ نہایت آزاد بیانی سے سیاست و انصرام مملکت کے پہلوؤں پر تنقید و محاکمہ جاری رکھا۔ ایک بار اس کو کاٹھ میں بھی دیدیا گیا مگر پبلک فوراً پہنچی اور سلطنت کو اس کی رہائی کے لئے مجبور کیا۔ لیکن رہائی نہ مل سکی قید کر دیا گیا۔ وہاں وہ کب خاموش بیٹھنے والا تھا اس کے مضامین سے وقتی جرائد پر ہوتے تھے۔ مخالفین فرقہ پروٹیسٹنٹ اور حکومت کی خوب خبر لیتا تھا۔ اس کی موت ۲۴ اپریل ۱۷۳۱ء میں ہوئی ہے۔ موت کے ۳۰ سال قبل تک اس کی قلم مطلق خاموش و بیکار نہ رہی۔

فنانوں کو ناول کا رنگ دینے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کی معروف تصنیف رابن سن کروسو ہمیشہ اس کے نام کو زندہ رکھے گی مرنے کے بعد اس کو بھی جان نبین کے قریب دفن کیا گیا جو ۴۰ سال پیشتر سے وہاں آسودہ خواب تھا۔ مطالعہ کتب و تصنیف کی مصروفیت نے کبھی اس کو حلقہ تعارف کی وسعت کی فرصت نہیں دی انگلینڈ کا بچہ بچہ اس کی تصنیف کی قدر کرتا ہے مگر بہت سے لوگوں کو معلوم بھی نہیں کہ روبن سن کروسو کا مصنف تھا کون؟

جوفاتھن سوِفٹ

سنہ ۱۶۶۷ء ۳۰ نومبر کو پیدا ہوا تھا۔ عالی خاندان تھا۔ مگر باپ اس کی پیدایش کے قبل ہی فوت ہوچکا تھا۔ غریب ماں رہگئی تھی وہی اس کی ایام طفلی کی کفیل تھی اس کی ذکاوت و وجودت طبع کا یہ عالم تھا کہ ۵ سال کی عمر میں انجیل کی ہر آیت کا مطلب نہایت آسانی سے کرسکتا تھا۔

اُس کی ماں کے متعلقین دولتمند تھے ۱۴ سال کی عمر میں اس کو ڈبلن یونیورسٹی میں بھیجدیا گیا اور اس کے بعد اکسفورڈ۔

۲۷ سال کی عمر میں وہ پادری بنگیا۔ ابتداسے کچھ بددماغ شخص واقع ہوا تھا مگر قطع نظر اس کے عیوب ونقائص کے اسکے محاسن کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ ۳۱ سال بعد اس کی عجیب وغریب تصنیف (Gullivers Travel) شائع ہوئی جنے سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کو بھی ہنادیا۔ اس سے بیشتر دو کتابیں The Tales of Tub اور The Battle of Books اور لکھہ چکا تھا۔

اپنی تصنیف کے زمانے میں بدقسمتی سے کوئی حورمحوش اس کی حیات کی افضل ترین کائنات (دل) پر قبضہ کر بیٹھی تھی بہت عرصہ تک سودائی بنا رہا۔ جذبات محبت نے طبیعت کو اور جلا بخشی، شعروسخن کے بھی خوب خوب دریا بہائے آخر سنہ ۱۷۴۵ء میں فوت ہوگیا۔

سموئیل رچرڈسن

یہ بھی ایک نہایت مفلس بڑہیٔ کا لڑکا تھا جو سنہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوا اس کے چھوٹے بڑے فسانہ کم وبیش سب مقبول ہوئے۔ گو اسکا نام لٹریچر کے خدمت گزاروں کی فہرست میں خاص طور پر قابل توجہ نہیں تاہم اس کے چھوٹے اور مختصر فسانوں کا طرز بیان بالکل اُس کی جدت کا نتیجہ ہے۔ اس نے دوسرے فسانہ نگاروں کا رنگ نہیں اختیار کیا۔ اس کے حال طویل فسانوں کو پڑہنا ہم تو تضیع اوقات سمجھتے ہیں مگر اُس زمانہ کے لوگوں کے وہ بالکل حسب مذاق تھے۔ اُس کے ہر ناول کا پبلک بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھی۔ اس کے ایک معروف فسانہ کی ہیروین (Belinma) کی شادی کا جہاں ذکر آیا ہے تو لوگوں نے اس قدر پسندیدگی ورغبت کا اظہار کیا کہ بعض مواقع پر اُس ہیروین کا نام زبان سے ادا کرنے پر گرجہ کے گھنٹوں سے اسکی مفروضہ آمد کا خیر مقدم کیا جانے لگتا تھا۔

اُس کا ایک فسانہ (Clarissa) ہے جس کے اختتام میں اُس کے اسّی سال صرف ہوئے دوسرا سر چارلس گرانڈیشن ہے۔ یہ کافی مقبول ہوچکے ہیں۔

اس کی تعلیم تربیت بھی بہت معمولی سی تھی۔ ۱۰ سال کی عمر میں ایک مطبع میں ملازم ہوگیا جہاں بمشکل کتب بینی

کا وقت نکال سکتا تھا۔ مالک مطبع سخت گیر شخص تھا اس کے سو جانے کے بعد اس غریب کو کہیں کتب بینی کا موقع نصیب ہوتا تھا۔ شب بھر مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا۔ محنتی و دیانت دار انسان پندرہ سال کے بعد جانکاہی و دماغ سوزی کا انعام مل گیا۔ مالک مطبع نے اس کے مستحسن اطوار سے خوش ہو کر اس سے اپنی لڑکی کو منسوب کر دیا اور کل مطبع کا مالک بنا دیا۔

لارنیس ۲۴ نومبر ۱۷۱۳ء میں آئرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین انگلش تھے۔ ابتدائی تعلیم خاص طور قابل ذکر نہیں ہے۔ ھالی فاکس کے اسکول اور کیمبرج کی یونیورسٹی میں تعلیم پا کر ۱۷۳۸ء میں مستند پادری بن گیا۔ عرصہ دراز تک اس کے مشاغل زندگی مختلف رہے۔ چالیس سال کی عمر میں اس کی دو مشہور تصانیف شائع ہوئیں۔

"ٹوبیس اسمالیٹ"۔ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ کچھ عرصہ تک ڈمبرٹن کے اسکول میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد گلاسگو کی یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہیں سرجن ہو گیا۔ مگر قسام ازل کی جانب سے ادبی دماغ لیکر پیدا ہوا تھا۔

۱۸ سال کی عمر میں اپنا ایک تیار کردہ ڈراما لیکر لندن گیا لیکن اس وقت کسی نے اس کو نہیں خریدا۔

اس نے ایک متمول عورت سے کچھ عرصہ کے بعد شادی کر لی۔ مالی مشکلات سے ایک گونہ نجات مل جانے سے دماغ نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے۔ بہترین فسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ اس شغف نے چند سال بعد اس کو ایک مشاق مضمون نگار بنا دیا۔ پھر تو وہ تخیل پرداز فسانہ گو کے قابل مدبر کے اعلیٰ مورخ اور کامیاب سیاح بن گیا۔ اس کے تین ناول بالکل فیلڈنگ کے طرز پر تھے۔ وہ تینوں ناول Roderick Random, Peregrine Pickle اور Humphery Clinker ہیں۔

گولڈ اسمتھ، ایک تعلیم یافتہ نوجوان فسانہ نگار تھا۔ خیال کی بلندی۔ مبالغہ پر حقیقت کا رنگ چڑھانے میں اسکو کمال تھا۔ بہت عرصہ تک وہ (Oliver) اولیور وغیرہ میں گھومتا رہا۔ ادھر ادھر کی آوارہ گردی میں بجز تضیع اوقات کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قماربازی کی لت اس کو کچھ ابتدا ہی سے تھی۔ مطالعہ قانون کے لئے بڑی جانکاہی سے کچھ اندوختہ رکھا تھا مگر وہ بھی اس کی اوباش طبیعت نے قماربازی کی بساط کے نذر کر دیا۔ جب ۲۴ سال کا تھا طب کے مطالعہ کے لئے اڈنبرگ گیا۔ مگر وہاں بھی کچھ تحصیل نہ کر سکا۔ ان دنوں میں نوجوانوں کو سیاحی سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کو بھی یہ شوق چرایا۔ اپنی بانسری سنبھالی اور خالی جیب وسیع یورپ کی سیاحی کے لئے چل کھڑا ہوا۔ عرصہ دراز تک مارا مارا پھرتا رہا۔

۱۷۵۶ء میں لندن میں عجیب ہیئت کذائی کے ساتھ پھر داخل ہوا۔ گریبان تار تار پیر میں جوتہ تک نہ اور جیب

میں صرف چار فارذنگ (چار پیسے) تھے۔ بسر اوقات کے لئے اجرت پر لوگوں کے نوٹس وغیرہ لکھنے شروع کئے مگر تنگدستی نے دامن نہ چھوڑا نصاب تعلیم پر اسے چند مضامین لکھے جس سے چند لوگوں نے اس کی گمنام شخصیت کی جستجو کی آخر ایک شخص نے اس کو اپنے اخبار کا ایڈیٹر بنا لیا۔

اب وہ ایک محنتی شخص کی مانند شب و روز اپنے ادائیگی قرض میں مصروف رہنے لگا۔ اگر سادہ لوحی کیساتھ ساتھ وہ ذرا عاقبت اندیش بھی ہوتا تو فلاکت میں گرفتار نہ رہا کرتا۔ اس کی کریہ ہیئت۔ پستہ قد۔ اور لکنت تقریر نفرت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ عوام کو اس سے انسیت تھی۔ مگر وہ خود اپنی بعض عادتوں سے بیزار رہتا۔

اس کی مشہور تصانیف The Stoops to Conquer ایک کامل و مکمل ڈراما ہے۔

The Deserted Village اور The Vicar of Wakefield بہترین ناولوں میں سے ہیں۔

ایک بار ایک قرض خواہ عورت نے اس پر ڈگری دائر کر دی۔ ادائیگی کے لئے اس کے پاس کیا رکھا تھا۔ اس کے کسی دوست نے اس عریانی فسانہ The Vicar of Wakefield کے مسودہ کو تین سو ڈالر (۰ ۵۷ روپیہ کے قریب) میں فروخت کر کے اس کا قرضہ ادا کیا۔ ۱۷۷۴ء میں جب وہ مرا تو دس ہزار ڈالر کا مقروض تھا۔

ایسے مصنف کی زندگی اگر خوشحالی سے بسر ہوتی تو وہ جدائی ذہانت کا اچھا ثبوت دے سکتا تھا لیکن قانون قدرت ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ہر مشہور و معروف شخص کی ابتدائی زندگی فلاکت و آلام میں بسر ہوتی ہے۔

(ترجمہ)

(از جناب ولایت حسین خانصاحب اثر رحمانی الاخلاقی رامپوری)

وقتِ وداعِ یار ہے رخصتِ جانِ زار ہے
خاتمۂ حیات ہے حالتِ اختصار ہے

بس ہی نہیں کسی پہ کچھ ہائے ہماری بے بسی
آپ پہ اختیار ہے دل پہ نہ اختیار ہے

عہدِ سرور و انبساط خواب و خیال ہو گیا
عشق میں اب تو غم مرا مونس و غمگسار ہے

دل میں جو اپنے آگ ہے سوزشِ داغِ ہجر سے
نالہ بھی ہے شرر فشاں آہ بھی شعلہ بار ہے

سنگِ ستم سے دل مرا سوچ سمجھ کے توڑیے
اس میں متاعِ آرزو آپ کی یادگار ہے

برق ہو یا شرار ہو نکہتِ گل ہو یا صبا
جس کو جہاں میں دیکھئے مضطر و بیقرار ہے

کثرتِ غم سے اے اثر حال یہ اب ہوا مرا
رنج و ملال باعثِ راحتِ جانِ زار ہے

قطعہ

وصل و ہجر
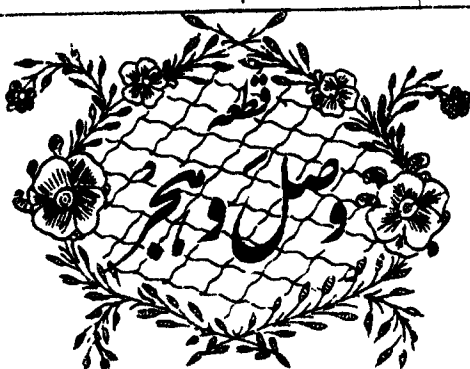
اک شخص نے دریافت کیا حضرتِ واثق
سچ کہنا کسی پر کبھی آئی ہے طبیعت ؟
بیچین رہے ہو کبھی فرقت میں کسی کی ؟
جھیلی ہے کبھی تم نے جفا کی بھی مصیبت ؟
گھائل بھی ہوا ہے کبھی دل "تیر نظر" سے
معشوق کے بھی وصل کی آئی کبھی نوبت ؟
چونکایا ہے غفلت سے کبھی "مرغِ سحر" نے
گذری ہے کبھی آپ پہ بھی "صبحِ قیامت" ؟
گذرے ہیں اگر آپ پہ یہ دونوں زمانے
تو وصل میں آرام ہے یا ہجر میں راحت ؟
بعضوں کا مقولہ ہے کہ ہے وصل مزیدار
اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہے ہجر میں لذت

عشاق میں مدت سے یہ اک جھگڑا رہا ہے
اب فیصلہ کی بات بتا دیجئے ، حضرت

اک آہ بھری میں نے کہا مخلصِ واثق
اللہ کسی کو بھی نہ دے صدمۂ الفت
حالانکہ بہت دن سے طبیعت نہیں آئی
ہمشکل ہی آ جائے نظر گر کوئی صورت
لیکن یہ بتاتا ہے مرا تجربہ مجھکو
کچھ وصل میں ہے لطف نہ کچھ ہجر میں راحت

قابو ہے اگر دل پہ تو دونوں میں مزا ہے
بے قابو طبیعت ہے تو دونوں میں مصیبت

واثق ٹونکی

معاشرتی افسانہ　　　　معاشرتی افسانہ

(جناب محمد صدیق صاحب مسلم مالیگانوی)

قدسیہ اپنے دو منزلہ مکان کے نشست کے کمرے میں بیٹھی ہوئی ڈوپٹے میں گوٹہ لگا رہی ہے۔ گردن جھکی ہوئی اور نگاہیں جمی ہوئی ہیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور خیال اب سے پانچ سال پہلے کی اس خوشگوار اور پُر اطمینان زندگی کو پیش نظر کئے ہوئے ہے۔ جبکہ اس کے والدین بقید حیات تھے۔ دُنیاوی تفکرات سے قطعاً آزادی حاصل تھی اور شب و روز کے چوبیس گھنٹے محبت کرنے والی ماں اور شفقت کرنے والے باپ کے زیر سایہ بسر ہوتے تھے اور میٹھی میٹھی باتیں سامعہ نواز رہتی تھیں............ ٹن ...... ٹن ...... ٹن ...... ٹن ...... دیوار گیر کلاک نے چار بجائے نگاہوں کے ساتھ گردن اوپر کو اُٹھی اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا" اے لو چار بج گئے۔ آج تو سنیچر کا روز ہے انہیں دو بجے ہی کچہری سے آجانا چاہئے تھا۔ لیکن ابھی تک کچھ ٹھکانا نہیں،، اس نے بقچہ تہ کرکے رکھدیا چلمن سرکا کر دیکھا۔ کھڑکیوں میں جھانکا۔ بے اطمینانی کے ساتھ اندر باہر دو چار چکر لگائے۔ آخر لکھنے پڑھنے کی میز کے قریب آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور دل بہلانے کے لئے ایک زنانہ رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ نظریں تو صفحے کی تحریر کو دماغ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر کان کسی آہٹ کو پاکر مطلوب کی آمد کا خاموش اعلان کرنے کے لئے بیتاب تھے اس کشمکش میں کوئی پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ سیڑھی پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ دل نے کہا "اے لو وہ آگئے،، قدم پیشوائی کو آگے بڑھے۔ قدسیہ دو چار قدم چلی ہو گی کہ مسٹر شمعون چلمن ہٹا کر اندر داخل ہوئے دونوں طرف لبوں پر ایک معنی خیز تبسم دوڑ گیا اور نگاہیں متصل ہو کر دم زدن میں خدا جانے کیا کیا کہہ گئیں۔

قدسیہ نے بیگ، میاں کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا" خیر تو ہے! آج کہاں دیر ہوئی"

شمعون نے کوٹ اور ٹوپی کھونٹی کی نذر کی اور آرام کرسی پر دراز ہو کر اپنے خوبصورت گھنگھر یالے انگریزی قطع کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا" کیا اتنی جلد فراموش کر گئیں اب تمہاری یادداشت کی بھی تعریف کرنی چاہئے۔

"ہاں تعریف کیوں نہ کروگے؟"

"موئے چنی لال ساہوکار نے جب سے مکان کا جھگڑا نکال کھڑا کیا ہے۔ مارے فکر کے میرے حواس بجا نہیں

سہتے حال کی باتیں تھوڑی دیر میں ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ اور گذشتہ غم پھر عود کر آتا ہے"!

"فکر تو ضرور ہونی چاہئے اور خصوصیت کے ساتھ تم سے زیادہ مجھے مگر...... شمعون نے سگرٹ کیس سے ایک سگرٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا...... اب فکر کیوں کرتی ہو۔ میں نے شب کو نہیں ذکر کیا تھا؟ کہ میرے دوست محمد اکرم نے امداد کرنے کا وعدہ کیا........

"خوب! دیکھو اب اچھی طرح یاد آیا اور یہ بھی تو آپ نے کہا تھا کہ میں کچہری سے وہیں جاؤں گا۔ تو کیا وہیں دیر ہوئی" قدسیہ نے ایک مستفسرانہ انداز میں کہا۔

"ہاں سیدھا وہیں سے آرہا ہوں"

"تو کہئے؟ انھوں نے اپنا وعدہ وفا کیا یا نہیں؟"

شمعون نے اپنی شریک زندگی کو ذرا کھیانا کرنے کی غرض سے کہا "مفصل طور سے سب کہے دیتا ہوں مگر اتنی عجلت کیوں ہے؟"

قدسیہ ذرا بگڑے ہوئے تیور سے بولی "یہی تو مجھے نہیں بھاتا۔ آپ کو ہمیشہ مذاق ہی کی سوجھتی ہے" اتنا کہہ کر قدسیہ غصے سے اندر جانے لگی۔

"اچھا! اچھا!! خانہ ہو میں کہتا ہوں بیگم صاحبہ آپ تو ذرا میں خفا ہو جاتی ہیں" مگر پہلے چائے تو پلوایئے!!!

قدسیہ زیر لب مسکرائی۔ اندر سے چائے کا سامان اور اسٹو (ولایتی چولھا) لے آئی۔ اُسے سلگا کر پانی چڑھا دیا اور قریب کے مونڈھے پر بیٹھ کر بولی؟ کہئے محمد اکرم نے کچھ دیا؟

"دیا اور بہت کچھ دیا۔ قدسیہ! اس دورِ قحط الرجال میں سچے دوست بہت کم ملتے ہیں۔ میرے اُس مخلص نے بے چون وچرا اور بغیر کسی شرط کے پندرہ سو کلدار گن دیئے۔ بیچارے کو فی الحال گنجائش نہ تھی مگر کوشش کرکے اُسنے اِدھر اُدھر سے یہ رقم فراہم کرلی۔ یہ پندرہ سو اور میرے نام کے جمع شدہ ایک ہزار روپیہ جو ابھی بنک سے لیتا آیا ہوں منجملہ ڈھائی ہزار کل لیجا کر اُس شیطان صفت ساہوکار کے حوالے کر آؤنگا اور باقاعدہ بھرپائے کرالوں گا۔ پھر تو یہ مکان بلا شرکت غیرے ہمارا ہے"

قدسیہ کی آنکھوں میں اشکِ مسرت بھر آئے۔ اور ایسا ہونا قانونِ فطرت کے موافق تھا کیونکہ مصیبت کے وقت تنکے کا سہارا بھی اپنی اوٹ میں بہجت وخوشی کا پہاڑ رکھتا ہے۔

چائے تیار ہو چکی تھی قدسیہ نے ایک پیالی میاں کے سامنے پیش کی مسٹر شمعون نے چائے پی اور معمول کے

مطابق لائبریری کی طرف چلے گئے، قدسیہ طعام شبینہ کے انتظام میں مصروف ہو گئی۔

(۲)

اطمینان سے زندگی بسر کرنے والا یہ پرمسرت جوڑا قصبہ ماہیم کے جس دو منزلہ مکان میں سکونت رکھتا تھا۔ اُسے قدسیہ کے والد سیٹھ عبدالرحیم نے تعمیر کرایا تھا سیٹھ صاحب ایک کامیاب تاجر تھے قدرت کا قانون ہے کہ اکثر دولت اور اولاد یکجا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کے ہی خدا کے فضل سے دولت تو بہت کچھ تھی مگر اولاد صرف ایک ہی ہوئی اور وہ یہی قدسیہ شمعون اُن کے ایک گہرے دوست کے لڑکے تھے۔ جنھیں عالم طفلی ہی میں والدین نے داغ جدائی دیا۔ والدین کے قضا کر جانے کے بعد چونکہ کسی رشتہ دار نے شمعون کی تربیت و پرورش کا بار اُٹھانا بہ خوشی قبول نہ کیا۔ اس لئے سیٹھ عبدالرحیم نے اپنی نیک سیرت بیوی سعیدہ کی صلاح سے اُسے اپنے گھر لاکر رکھا ایک حقیقی پسر کی طرح نازونعمت سے پالا اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ الغرض شمعون و قدسیہ نے اپنی طفلی کا خوشگوار زمانہ اسی مکان میں طے کیا اور عنفوان شباب میں سعیدہ کے اصرار سے ان دونوں کو شادی بیاہ کی روپہری زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اُس کے بعد سے ابتک مکان اُن کے لئے ایک پُرسکون و معمور مسرت سکونت کا کام دیتا رہا جس مکان کا چپہ چپہ عالم طفلی و شباب کے کیف زا و خوش آہنگ تغیرات و واقعات کا محرم راز ہو۔ اُس سے اگر انہیں قلبی محبت ہو جائے اور اُس کو وہ بہشت ارضی سے تعبیر کریں، تو مقام حیرت و استعجاب نہیں۔

مگر دنیا دارالانقلاب ہے جہاں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا ہونا لازمی ہے اس دارالمحن میں ہمیشہ یکساں نہیں کٹتی۔ سکھ کے بعد دُکھ اور دُکھ کے بعد سکھ کا کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ برابر جاری ہے ؎

خدا دیتا ہے جنکو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

چنانچہ سیٹھ عبدالرحیم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ اُن کے دورِ حیات کا آخری حصہ اُن کے تنزل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ پے در پے حوادثات پیش آنے شروع ہوے۔ اُن کی موت سے ڈیڑھ سال پہلے ہی سعیدہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ جس سے اُن کے محبت کرنے والے دل پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ اگرچہ وہ بظاہر اپنا چہرہ ہشاش بشاش بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر دل، اندر سے روتا رہتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار دُنیا دی سے توجہ ہٹ گیا تجارت میں ناقابل برداشت گھاٹا آگیا ہر طرف سے کارخانہ بگڑنے لگا۔ یہاں تک کہ تجارت کا سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ غرض ان مجموعی غم و آلام نے مل کر اُن کی زندگی اجیرن کر دی۔ آخر اونھوں نے بھی ایک رات داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنی شریک زندگی کے پہلو میں ابدی آرام حاصل کیا۔ ان واقعات کو آج پانچ سال کا زمانہ

گزر گیا۔

والدین کے اس طرح یکایک یکے بعد دیگرے اٹھ جانے سے قدسیہ اور شمون کو جس قدر غم ہونا چاہیے تھا اُس سے زیادہ ہوا۔ اگرچہ یہ امر مسلمہ ہے کہ پُر شباب دلوں پر غم و الم کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جیسے جیسے دن گذرتے گئے اُن کا غم ہلکا ہوتا گیا اور کار و بار دنیاوی میں طبیعت لگتی گئی۔

اگرچہ سیٹھ عبدالرحیم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا تھا۔ تاہم ان دونوں میاں بیوی کی محبت بدستور رہی۔ شمون بمبئی کے ایک سرکاری آفس میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر کلرک کی جگہ کام کرتے تھے اور اسی رقم میں دونوں میاں بیوی اپنی محبت کی زندگی بڑے آرام و اطمینان سے بسر کر رہے تھے۔

آج سے چھ ماہ قبل بمبئی کے مشہور ساہوکار چنی لال کی طرف سے شمون کے نام ایک نوٹس آیا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ "متوفی سیٹھ عبدالرحیم کے ذمہ ہمارے ڈیڑھ ہزار روپے نکلتے تھے۔ جس کے عوض اُنہوں نے اپنا دو منزلہ مکان" "رہن رکھا تھا۔ ادائیگی کی میعاد آج سے چھ ماہ میں پوری ہو جائے گی لہٰذا مع سود ڈھائی ہزار روپے ادا کر کے" "بھر پائی کرا لیجیے ورنہ رہن نامہ کے مطابق مذکورہ مکان فروخت کر کے ہم اپنی رقم وصول کر لیں گے۔"

ساہوکار کے اس نوٹس نے شمون اور قدسیہ کے خرمنِ سکون و اطمینان پر برق شرربار کا کام کیا۔ میاں بیوی ابھی تک اسی میں خوش تھے کہ ہمارے والدین نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا تاہم یہی مکان ہی دولت کونین ہے۔ جس سے ہماری گذشتہ زندگی کی دل خوش کن داستانیں وابستہ ہیں لیکن ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

انسان کارگاہِ زندگی میں سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہی۔ اوّل اوّل شمون کو مذکورہ نوٹس کا یقین نہ آیا۔ یا کم از کم انہوں نے یقین کرنا نہ چاہا۔ بنابریں وہ ایک روز ساہوکار کی کوٹھی پر گئے اور جملہ کاغذات و دستاویزات کو دیکھ کر حقیقت امر کا غمگین دل سے اعتراف کرنا پڑا۔ دورانِ ملاقات میں ساہوکار کی سخت گیری اور درندہ خو طبیعت کا پورا پورا تجربہ ہو گیا۔ نیز انداز بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس ظالم نے مذکورہ رقم میں ایک کوڑی کی بھی رعایت نہ کرنے اور میعاد مقررہ پر مکان پھونک دینے کا تہیّہ کر لیا ہے۔

ڈھائی ہزار کی رقم خطیر فراہم کرنا اور وہ بھی چھ ماہ کی قلیل مدت میں، یہ امر ایک معتدل حیثیت کے آدمی کیلئے ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔ اس بلائے ناگہانی سے میاں بیوی دریائے فکر و غم میں غوطے کھانے لگے۔ بالخصوص قدسیہ تو اس خیال سے اور بھی زیادہ ملول رہتی بلکہ بعض اوقات رو دیتی کہ اُس کے والدین کی ایک

واحد یادگار اُس کے ہاتھوں سے چھینی جا رہی ہے۔ لیکن مسٹر شمون آخر مرد تھے اور مرد بھی کیسے مستقل مزاج، صاحب ہمت، باتدبیر، اُنہوں نے سوچا کہ "اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے تو پیش آمدہ مصیبت ٹلنے کی نہیں۔ فی الحال چوسو کی رقم میرے نام بنک میں جمع ہے۔ اُسے اس وقفے میں کسی نہ کسی طرح ایک ہزار تک پہنچایا جائے باقی پندرہ سو کسی دوست سے بطور قرض حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔" غرض اس دستور العمل کے مطابق اُنہوں نے اپنی جد وجہد جاری کر دی ع "ہر طلبگار کو محنت کا صلہ ملتا ہے"
مسٹر شمون کی کوشش رائگاں نہ گئی۔ چھ ماہ کے اندر اندر اُنہوں نے اپنے دستور العمل کی تکمیل کر دی سخت جانکاہی وکفایت شعاری سے جمع کئے ہوئے ایک ہزار روپے اور مبئی کے اپنے ایک عزیز دوست محمد اکرم سے پندرہ سو روپے بطور قرض لے کر آج وہ گھر آئے تھے۔ میاں بیوی کے بہجت وانبساط کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چھ ماہ کے بعد آج انہوں نے اطمینان و خوشی کا منہ دیکھا تھا۔ اور وہ یقین کرنے لگے تھے کہ اب یہ مکان بلاشبہ ہمارا ہے۔

(باقی آئندہ)

زبان

(از نتیجہ افکار سید الشعرا سید حسین میاں صاحب سید منگروئی تلمیذ رشید حضرت شمشاد لکھنوی)

زباں دہن کو خدا نے جو دی بیان کے لئے
دہن کو بھی لب و دنداں ملے زباں کے لئے

اسی میں نعمتیں دونوں جہاں کی ہیں موجود
یہی زباں تجھے کافی ہے دو جہاں کے لئے

زبان والوں کو پاس زباں نہیں افسوس
جو بے زباں ہیں ترستے ہیں وہ زباں کے لئے

"زبان" کی قدر اگر ہم وطن نہیں کرتے
نکل ہی آئیں گے کچھ قدرداں زباں کے لئے

عزیز خاطر خوشتر جو تھی بہت دل کو
یہ چند شعر کہے پرچہ "زباں" کے لئے

ازل میں آہ سے میری شرر جو نکلے تھے
وہی ستارے بنے سید آسماں کے لئے

حیات حسرت

(سید الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی)

کیا کیا نہ ہجر میں ترے ناشاد کر چکے
"اب یہ سمجھ کے چپ ہیں کہ وہ یاد کر چکے"

رنگیں طرازیاں ہیں غضب اشک سرخ کی
جو دامنِ جنوں پہ ہم ایجاد کر چکے

پابند عیش ہو نہ سکے بندگانِ عشق
گو ختم قید غم کی وہ میعاد کر چکے

نادم ہیں اب کمال جب اُن سے بیان ہم
ساری غم فراق کی روداد کر چکے

کہتے ہیں اب وہ تیری گزارش ہے ناقبول
اکبار کر چکے جو ہم ارشاد کر چکے

نادم وہی تو آج ہیں کل بر بنائے ناز
خاک شہیدِ عشق جو برباد کر چکے

حسرت وہ اب ہوئے بھی تو کیا مائلِ کرم
جب ختم ساری سختیٔ بیداد کر چکے

(مرسلہ)
(مولینا مسعود الرحمٰن صاحب ندوی)
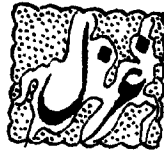
(از جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔اے۔ علیگ)

سوزِ غم اور سازِ دل کو پہلے باہم کیجئے
جس طرح پر چاہیے محفل کو برہم کیجئے

سوزِ دل سے پھونکدیجے ساز و سامانِ حیات
دردِ دل سے پھر نیا پیدا اک عالم کیجئے

آئیے اور منتشر کردیجے دل کی کائنات
نغمۂ الفت کو سوزِ جاں سے باہم کیجئے

ذوقِ الفت ہو نہ جائے بدگمانی سے فزوں
مجھ سے جتنا ہو سکے اب حسنِ ظن کم کیجئے

زخم۔ دلمیں ناوکِ مژگاں سے خود ہی ڈالئے
پھر نئے انداز سے خود فکرِ مرہم کیجئے

دل اگر چاہے الٹ دیجے بساطِ زندگی
اک نگاہِ ناز سے ہستی کو برہم کیجئے

جائیے اور شوق سے خونِ تمنا دیکھئے
اور پھر کچھ یاد کرکے چشمِ پُرنم کیجئے

بزمِ حسن و ناز میں ہو جائیے محوِ سرور
اور ستاروں کو رقیبِ سوزشِ غم کیجئے

بزمِ ہستی میں نہیں ملتا کوئی درد آشنا
کس سے گر کچھ کیجئے تو شکوۂ غم کیجئے

(تخیلات) (ادب لطیف)

(از جناب صادق الہ آبادی)

حریف نشاط کی دراز دستیوں نے گو، میری متاع حیات اور میرے سرمایۂ مسرت کو ضرور برباد کر دیا ہے، لیکن بڑی پُرلطف اور ولولہ انگیز ہے، وہ بیخودی، وہ کیفیت، اور وہ محویت، جس نے اس یاس و قنوط کے عالم میں میرے افسردہ و مضمحل دل کو گرما رکھا ہے۔ میرا فرقت نصیب دل اس بیاض حُسن کی پرستش پر مجبور ہے خدا جانے اس کی سحر آفرین آنکھوں میں کیا جاذبیت ہے کہ اس کی دزدیدہ اور پوشیدہ نگاہوں کی تیر باری سے میرا حسرت نصیب دل محشرستانِ تمنا اور خیالستان آرزو بنجاتا ہے اور میں امید و بیم کی حوصلہ شکن صبر آزمایوں کی آماجگاہ بنجاتا ہوں،

اس کا جلوۂ بصیرت نواز اور حسنِ طلسم ساز عشاق کی تسکین خاطر کیلئے ادویہ مفرح سے کسی طرح کم نہیں ہوتا، میں اس کے دل آویز تصور کو دل میں لئے ہوئے اپنے خلوت کدہ میں پہنچکر، اس کی جنون زا تصویر فرط اضطراب میں اپنے سینہ سے لگا لیتا ہوں، اور عالم گمشدگی میں کہتا جاتا ہوں اے چمنستان حُسن کے گل سر جو تجھے برا کہتے ہیں محبت کی بے قدری اور حسن کی توہین کرتے ہیں، جب میں یہ کہتا ہوں تو بادۂ محبت سے سرشار آنکھیں کھُل جاتی ہیں، اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ وہ شیرازۂ جمال ایک مرصع اسٹیج پر بیٹھی ہوئی اپنی ہم جلیس، اور ہم پیشہ نازنینوں کے ساتھ الھڑپن سے ادہر اُدہر جھانک رہی ہے، برقی روشنی کا تابناک منظر جذبات محبت میں حشر التفات پیدا کرنے کے لئے کافی تھا، اس نے بھی محسوس کیا اور اچھی طرح محسوس کیا پھر کیا تھا، محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگیں پپیہے کی، پی کہاں، نے اس کے دلی جذبات کو اور مشتعل کر دیا اسکے بیگانۂ محبت دلسے مہک سی اُٹھی اور وہ کیف محبت سے سرشار ہو کر یوں گویا ہوئی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں، اور خزاں رسیدہ باغوں کو مژدہ بہار سناتی ہیں کلیاں کھلتی ہیں۔ غنچے مسکراتے ہیں، مگر آہ میرے دل کی کلی ہنوز ناشگفتہ ہے، اس نے یہ جملہ ایک ایسی ادا کے ساتھ کہا، جس کے سننے سے میرے مضطرب دلمیں تسکین و طمانیت کی ایک جھلک پیدا ہو گئی، میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اسکو دیکھا، اور اس کے خوبصورت چمپئی چہرے کو ایک محویت سے دیکھ کر مست و بیخبر ہو گیا، جب مجھ کو ہوش آیا تو وہ میرے سامنے نہ تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، اضطراب قلب اور بیتابیٔ دل نے ایسا پریشان کر دیا کہ میں دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہو گیا اور عالم خیال میں اسے اپنی آغوش محبت سے لیکر اس کے نظر نواز رخساروں کے بوسے لینے لگا، مگر آہ! وہاں کیا تھا؟ صرف **"حسنِ ظن اور حسنِ خیال"** میں اُٹھا اور اس طرف کو جدہر وہ "جان آرزو" ایک محشر خرام کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی، یہ کہکر اپنے دل کی ٹھہرا

م ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔

نکالنے لگا،

اے برقِ طپاں! تجھے اپنی یادہ ریزاور حیا پرور آنکھوں کی قسم! دمِ رخصت ایک دزدیدہ اور غلط انداز نظر سے مجھے دیکھ کہ میری پرشوق اور حسرت آلود نگاہیں حدِ نظر تک تیرے دامنِ کرم سے وابستہ اور منت کش نظر آتی ہیں! مگر آہ! وہاں کچھ نہ تھا۔

(جناب حامد رضا خاں صاحب تبسّم نظامی)

زندگی اک چیز ہے لیکن یہ مستحکم نہیں
ورنہ "میری عمر" "عمرِ جاوداں سے کم نہیں

سوچتا ہوں، اب کہ وہ "میری تمنا کیا ہوئی
عالمِ امکاں میں جس کی وسعتیں کچھ کم نہیں

دو جہاں کی نامرادی آدمی کے ساتھ ہے
سینکڑوں غم ہیں میسّر پھر بھی کوئی غم نہیں

تجھ کو عریاں "دیکھنے والا" تا اب کیا کرے
"حسرتِ دیدار ہے آنکھوں میں" لیکن دم نہیں

حسن میری آرزو کو شوق سے رسوا کرے
اب مجھے رسوائیوں کا غم "بقدرِ غم نہیں"

صورت موہوم ہے "کیفیتِ آغازِ عشق"
پہلی باتیں یاد آتی ہیں "مگر پیہم نہیں"

پردۂ چشمِ تبسّم اور بھیگا دامانِ حسن
ایک مدت سے وہ رہیں گریۂ پیہم نہیں

جذباتِ کاشف

جناب محمد شفیع صاحب کاشف اکبر آبادی

رو دیئے آج تو وہ بھی مرے افسانے پر
خوش ہوں جذباتِ طبیعت کے بدلجانے پر

اعتماد، ایک ہوا تھی جو ہوئی چل کے خموش
اب یگانے پہ بھروسہ ہے نہ بیگانے پر

داغ سینے پہ کھلے صورتِ گلہائے چمن
چاک دامن سے بہار آگئی دیوانے پر

نہ کرو فکرِ سکوں، موت کی تکلیف نہ دو
کہ یہ ممکن ہے، مگر دل کے ٹھہر جانے پر

ہوئی تجدیدِ قوانینِ جنون کی تکمیل
نازشیں کرتی ہیں وحشت تری دیوانے پر

کشتۂ سوزِ تجلی کی ہو پروا کسکو
ایک آنسو نہ گرا طور کے جل جانے پر

سو گئی بزمِ جہاں جب مری نوبت آئی
شمع بھی رہ گئی بجھ کر مرے افسانے پر

سازِ پُر نغمہ شکستہ ہو تو غم ہو کاشف
رنج کیوں ہے دلِ خاموش کے مرجھانے پر

آطہر۔ جناب ناظم الملک مولوی سید معشوق حسین صاحب ہاپوڑی منصف جے پور اسٹیٹ

تمہارا حسن اچھا ہے ہماری عاشقی اچھی
خود آرائی تمہیں زیبا ہے ہم کو بے خودی اچھی

نہ ان سے چھیڑ چھاڑ اچھی نہ اُن سے دل لگی اچھی
حسینوں سے تو بس صاحب سلامت دور کی اچھی

اگر تھوڑی سی پی بھی لی تو اس سے کیا ہوا زاہد
ارے نادان نیت چاہئے انسان کی اچھی

مرے نزدیک دشمن اور تم دونوں برابر ہو
تمہاری دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی

یہی پینے پلانے کا زمانہ ہے یہی دن ہیں
بہار آتے ہی توبہ کی بھی اے زاہد کہی اچھی

فلک کہتا ہے میں بڑھ کر ہوں وہ کہتے ہیں میں بڑھ کر
مزہ ہے دو ستمگاروں میں باہم ہے چلی اچھی

مرے نزدیک شیخ و رند دونوں حد سے گزرے ہیں
نہ اتنا انکار اچھا نہ اتنی مے کشی اچھی

زباں پکڑی نہیں جاتی کسی کی کچھ کہے کوئی
سُنے جاؤ اگر واعظ کہے، رندو بُری اچھی

ہوئے اشکِ ندامت میرے باعث جوشِ رحمت کا
مآل اچھا ہوا ہے دل جس کا وہ شرمندگی اچھی

جو تم سے دور ہوں تو زندگی سے موت بہتر ہے
اگر تم پاس ہو تو موت سے ہے زندگی اچھی

بڑی چلتی رقم ہے وہ ستمگر حضرت، آطہر
ذرا دل کی خبر رکھنا نہیں یہ دل لگی اچھی

جناب سید شمس الحق صاحب خیال وکیل عدالت رامپور

جنونِ عشق میں کیونکر نہ ہوتی چاک دامانی
برنگِ بو مری تقدیر میں لکھی تھی عریانی

جمالِ یار کے نظارہ سے چھائی یہ حیرانی
حقیقت کیسی میں نے اپنی صورت تک نہ پہچانی

تواضع میں غمِ الفت کی خوں اپنا کیا پانی
جزاک اللہ اے دل خوب ادا کی شرطِ مہمانی

مری محرومیٔ تقدیر کا بھی کچھ ٹھکانا ہے — کہ جمعیت کے بدلے دل کو ملتی ہے پریشانی

ملے ہیں دونوں اپنی دہن کے پکے خوب گذرے گی — ہمیں ذوقِ جفاؤ جور انہیں شوقِ ستم رانی

کلیجہ شدتِ غم سے کہیں منہ کو نہ آجائے — گئی حد سے گزر اب دردِ الفت کی فراوانی

سناؤنگا کبھی فرصت جو دی مجکو زمانہ نے — کہ ہے افسانۂ دردِ دل بیتاب طولانی

جنوں کا کچھ قصور اسمیں نہ وحشت کی خطا اسمیں — مری تقدیر میں گل کی طرح تھی چاک دامانی

یہ دونوں کس طرح ہوں جمع اہل۔ کوئی نسبت بھی — کہاں دعوائے الفت اور کہاں ذوقِ تن آسانی

جبیں سائی درِ جاناں پہ کی ہے عمر بھر ہم نے — عجب کیا ہے جو مثلِ ماہ چمکے داغِ پیشانی

امنڈ آیا ہے جوشِ غم سے دل اشک آنکھ میں آئے — دکھا اے دامنِ مژگاں بہارِ موجِ طوفانی

ملے گا خانہ برانداز مجھ سا کون دنیا میں — کرے گی یاد میرے بعد مجھ کو خانہ ویرانی

غمِ پنہاں میں کیا اے چشمِ تر آنسو بہاتی ہے — کہیں تیری بدولت ہو نہ جائے آبرو پانی

فقط دل کی بدولت زندگی کے پڑ گئے لالے — جسے ہم دوست سمجھے تھے وہ نکلا دشمن جانی

خیال اک بھی نہیں پابندِ تخئیلِ قدیم اب تو
خدا رکھے ترے دم تک ہی یہ رنگِ غزل خوانی

افتخار الشعرا برق دہلوی

جم گئے جو قطرۂ خوں خنجرِ فولاد پر — بن گئے مہرِ شہادت محضرِ بیداد پر

کیا قیامت اور ڈھانی ہے دلِ ناشاد پر — کیوں نگاہِ لطف ہے مجھ خوگرِ بیداد پر

او ستمگر شوق سے بیداد کر بیداد پر — مہرِ ضبطِ غم لگا دی ہے لبِ فریاد پر

میں ہوں اک فطرت شناسِ آسمانِ کج نہاد — تھام لیتا ہوں جگر شورِ مبارکباد پر

میری ناکامی پہ ہنستی ہے امیدِ دلفریب — میں بہاتا ہوں جو آنسو کوششِ برباد پر

بر سرِ رحم آگئے آخر بتانِ سنگدل — پتھروں کے دل پسیجے ہیں مری فریاد پر

روز گردش ہے نئی میری مٹانے کیلئے — تل رہا ہے آسمان فتنہ گر بیداد پر

خاک و باد و آب و آتش کا ہے پیارا ظہور — ہے بنا ر دارِ فانی مجمعِ اضداد پر

بھر دیے ہیں خاک کے پتلے میں کیا جوہر لطیف — نازِ صناعِ حقیقی کو ہے آدم زاد پر

در حقیقت برقؔ یہ ہے خطۂ جنت نظیر — ششش جہت کو ناز ہے خاکِ جہان آباد پر

تنقید و تبصرہ

(ماہوار رسائل، اخبارات، روداد جلسہ۔ رپورٹ، انجمن اور ادبیات وغیرہ پر ریویو کیا جائیگا)

روح تنقید

یہ کتاب آج سے بہت پہلے ملک سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے اور اس پر موقر معاصرین کے عرصہ ہوا ریویو بھی نکل چکے ہیں لہٰذا اب اس پر اتنی دیر کے بعد ہمارا ریویو کرنا کچھ تحصیل حاصل ہی سا ہے تاہم اظہار خیال ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ مقیم لنڈن) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ زیر تنقید کتاب آپ ہی کی تالیف ہے جس میں یورپی نقادوں کے طریقہ تنقید اور اصول تنقید پر نہایت محنت و جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ حصہ اول مبادی تنقید سے متعلق ہے جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے خصوصاً ادب کی تعریف۔ تنقید کا مقصد۔ تنقید نگار کے فرائض۔ اصول تنقید۔ میر حسن اور اُن کی مثنوی سحر البیان وغیرہ مباحث نہایت مفید و کارآمد ہیں اور یہی کتاب کی اصل جان ہیں۔ دوسرا حصہ جو صفحہ ۱۷۵ کے بعد شروع ہوتا ہے اسمیں ارتقائے فن تنقید پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اس میں یونان و روما کے مشہور و قدیم نقادان فن کے حالات و ارتقائے تنقید کا ذکر، پھر فرانس اور انگلستان کے نقادوں کے اصول تنقید کا بیان کرتے ہوئے مروجہ تنقید اور چند تنقیدی کارناموں پر کتاب ختم کی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے نقادوں کو شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

کتاب میں جہاں جہاں مصنفین و تصنیفات کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی فہرست دیکھتے ہوئے حیرت ہی نہیں ہوتی بلکہ مؤلف کے وسیع مطالعہ و معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے نیز ان کی جگر کاوی و عرق ریزی کی داد دینی پڑتی ہے کہ مؤلف نے کئی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد یہ بیش بہا تحفہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے آپ کا اردو پر یہ احسان عظیم ناقابل فراموش ہے۔ پاکٹ سائز۔ لکھائی چھپائی معمولی۔

پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد (دکن)

دنیائے افسانہ

یہ کتاب بھی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کے ایک ہونہار متعلم کا پہلا ادبی کارنامہ ہے اور یہ کتاب بھی روح تنقید کے نہج پر لکھی گئی ہے اور یہ بھی اپنے موضوع پر پہلی تالیف ہے جس کے

لئے ملک کو خصوصاً اردو داں پبلک کو جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے کا بیحد مشکور ہونا چاہئے کہ آپنے اس تالیف سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔

آج کل اردو میں جس سرعت کے ساتھ بے اصول افسانہ نگاری کا مذاق عام ہو رہا ہے اس کے لئے ضرورت تھی کہ فن افسانہ نگاری کے وہ تمام اصول وضوابط جو یورپ میں مسلمہ طور پر رائج ہیں منضبط کر کے اردو دنیا میں پیش کر دیئے جائیں تاکہ اس سے ہر فسانہ فنی حیثیت سے دیکھا جاسکے اور افسانہ نگاران اصول کے ماتحت فسانے لکھ کر اہل مغرب کی طرح اس فن میں کمال حاصل کرسکیں اگرچہ افسانہ نگاری مشرقی فن ہے لیکن اس میں اب تک قدامت کی جھلک نظر آجایا کرتی ہے۔ رجال قصہ کی دور از کار باتیں اور محیر العقول واقعات یہ وہ عیوب ہیں جنکا غالب عنصر ہمارے فسانوں میں پایا جاتا ہے اور نفسیاتی تخیل سے تو قطعاً معرا ہوتے ہیں۔ نو مشق مضمون نگاروں نے فسانوں کا لکھنا سب سے سہل سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ ایک مستقل فن ہے اور سب سے مشکل۔ لہذا ہر افسانہ نگار کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

کتاب زیر تنقید کے شروع میں قابل مؤلف کا ایک دیباچہ ہے جس میں اس فن پر اردو میں کسی کتاب کے ہونے کے متعلق بحث کرتے ہوئے چند ان مضامین کا حوالہ دیا ہے جو اس بحث پر لکھے گئے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ صفحہ ۷ سے کتاب شروع ہوتی ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ افسانوں کی اہمیت فنون لطیفہ اور افسانہ۔ افسانوں کی پیدائش۔ حقیقت اور افسانہ۔ افسانوں کی قسمیں۔ اعلیٰ ناول کی خصوصیات۔ ناول نگاروں کے فرائض۔ مختصر قصے۔ مختصر قصوں کا فن۔ اردو زبان اور افسانے وغیرہ ابواب قابل مطالعہ ہیں۔ انہیں سے کئی ابواب اس تالیف سے پہلے رسالوں میں چھپ چکے ہیں ہمیں قابل مؤلف سے توقع ہے کہ وہ بہت جلد اس کا دوسرا حصہ بھی لکھ کر اردو پر احسان فرمائیں گے۔ پاکٹ سائز۔ حجم ..... کتابت وطباعت معمولی قیمت ۱۲؍

پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد (دکن)

پس پردہ یہ جناب آغا حیدر صاحب دہلوی کے ان مضامین کے مجموعہ کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً علیگڑھ میگزین اور دیگر رسائل میں نکلتے رہے ہیں۔ آغا صاحب کا نام دنیائے اردو میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ "نسوانی ادب" میں جو کچھ لکھتے ہیں بے لاگ لکھتے ہیں اور بیگمات دہلی کی زبان پر اسقدر قدرت حاصل ہے کہ اب کسی بیگم کو بھی ایسی قدرت بایدو شاید ہی حاصل ہو۔

آجکل جہاں اردو کو علمی زبان بنانے میں انتہائی کوشش کیجاتی ہے وہاں۔ ہماری زبان کی اصلی محافظ بیگمات کی زبان کی حفاظت بھی از بسکہ ضروری ہے۔ جو لوگ اردو کی موجودہ ترقی کو دیکھتے ہوئے اس کے سخت مخالف ہیں انہیں اس

بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جس زبان میں نسوانی ادب مفقود ہوگا وہ زبان کبھی مکمل نہیں کہی جاسکتی اگرچہ آج قلعہ معلےٰ کی اردو بہت کم بلکہ قطعی نہیں بولی جاتی کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا اس صورت میں یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو سرے سے نیست ونابود ہی کر دیا جائے اور اگر ایسا کیا گیا تو ایک وقت آئیگا کہ لغات اُردو سے انکی زبان کے الفاظ روزمرہ اور محاورات کو بھی خارج کر دینے پڑیں گے۔ کیونکہ لغات میں صرف انکے معنی ہی معنی رہجائیں گے اور کوئی انکا صحیح محل استعمال نہ جان سکے گا لہٰذا ملک کو اس نسوانی لٹریچر کی قدر کرنی چاہئے اور آغا صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ ادب اردو میں اس صنف کو مکمل فرما رہے ہیں ساتھ ہی ہمیں آغا صاحب موصوف سے یہ توقع بھی رکھنی چاہئے کہ جہاں وہ دکھنی زبان کی لغت مرتب فرما رہے ہیں وہاں وہ بیگمات دہلی کے روزمرہ اور محاورات کی بھی ایک جامع لغت تالیف فرماکر ادب اردو پر احسان فرمائیں گے۔

ملک کو مولوی عبد الباسط صاحب ایم۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے نہایت قابلیت سے اس مجموعہ مضامین کو ترتیب دیکر نہایت عمدہ کاغذ اور نفیس لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع فرمایا ہے امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف جناب آغا صاحب کے دیگر مضامین کو بھی یکجا کرکے جلد شائع فرمائیں گے۔

اس مجموعہ میں چھوٹے بڑے پندرہ مضامین ہیں جن میں "حامد دیوان اور مباحثہ" "محل سرا میں" اور "نائی کرامت" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ہم ناظرین زبان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ پس پردہ کا ایک ایک نسخہ ضرور منگا کر بیگمات دہلی کی چٹخارہ اور لوچدار زبان کا لطف اٹھائیں۔

پاکٹ سائز ۱۰۲ صفحے قیمت صرف ۸/ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ہلاک جستجو | یہ چھوٹا سا فسانہ جناب محمد شفیع صاحب شفیع وکاشف اکبرآبادی ایڈیٹر "مسلمانوں کا اخبار" کا ادبی فسانہ ہے آپکا نام دنیائے ادب میں نیا نہیں ہے زبان میں آپ کے دو معرکۃ الآرا فسانے "شوالہ" اور "پہاڑی لڑکی" نکل چکے ہیں جو بیحد مقبول ہوئے ہیں زیر تنقید افسانہ نثر شاعری کا بہترین نمونہ ہے قصہ کا پلاٹ اسقدر دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرکے پھر بغیر ختم کئے ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ناول اور ادب لطیف کے شائقین ضرور منگوا کر پڑھیں۔

مصنف کے نام کشمیری بازار آگرہ کے پتہ سے ۸/ میں مل سکتی ہے۔

عبرت کدہ | یہ چھوٹے چھوٹے آٹھ اخلاقی فسانوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف پروفیسر اکبر حیدری ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہیں جنکا نام ادبی حلقوں میں کافی سے زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے آپ ایک عرصہ تک رسالہ "اردوئے معلیٰ" دہلی کو ایڈٹ کرتے رہے ہیں۔ آپ کے دل میں قومی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر مضمون و نثر میں اس کا رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے ان افسانوں میں قوم کی پستی کا عبرتناک انجام پیش کیا گیا ہے اور ہر

افسانے کے اختتام پر "عبرت" کے تحت اس کا ماحصل نہایت عبرت آمیز اور سبق آموز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین قیمت ۱۲ار جو کسی قدر زائد ہے۔

مرقع عبرت یا ایک عیاش کی ڈائری | یہ افسانہ بھی پروفیسر صاحب موصوف ہی کا لکھا ہوا ہے شروع میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا مختصر سا مقدمہ ہے اسکے بعد مصنف نے تمہید و تعارف کے تحت میں مسلمانوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی جو کمی ہے اور اس سے آئے دن قوم جن لغویات میں مبتلا نظر آتی ہے اسکا نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فسانہ کے شکل ، عبرت کا جو فرضی کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ درحقیقت ہماری زوال پذیر قوم کا سچا فوٹو ہے اس کا ہر باب اگرچہ مختصر ہے مگر اسقدر جامع ہے اور نتیجہ خیز ہے کہ ہزار ضخیم داستانوں پر بھاری ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسکو پڑھے، سُنے۔ اور سُنائے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں عبرت حاصل کرے نیز ہمارے بیہودہ اور اخلاق سوز ناولس حضرات کو بھی اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے انہیں بھی ایسے ناول لکھ کر تباہی و گمراہی کے عمیق غار میں گرنے سے اپنے آپ کو اور قوم کو بھی بچائیں۔

آجکل ہماری قوم کو ایسے اخلاقی فسانوں کی اس شدت سے ضرورت ہو کہ ہمارے خیال میں مشہور فسانہ نگاروں سے اس قسم کے افسانے اس کثرت سے لکھوائے جائیں اور اسقدر ارزاں فروخت کئے جائیں کہ عریاں اور مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کا بازار بالکل سرد ہو جائے۔

پروفیسر موصوف ملک قوم کے بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ قوم کے انحطاط و زوال سے متاثر ہو کر بڑی سرگرمی کے ساتھ قوم کی فلاح و اصلاح میں حصہ لے رہے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا قیمت ۸ر

کیفستان | یہ ادب لطیف کے پرکیف مضامین کا مجموعہ بھی پروفیسر موصوف ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اسمیں چھوٹے چھوٹے چودہ ادبی جواہر پارے ہیں اگرچہ ادب لطیف میں لکھے گئے ہیں مگر اسمیں مصنف نے اپنے طبعی رنگ کو اس عمدگی سے نباہا ہے کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ ہم پروفیسر صاحب کو انکی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ اس طرز تحریر میں بھی اپنے خاص مقصد کو عمدگی کے ساتھ ادا کر سکے ہیں۔ یہ بات ہر کسی کو میسر نہیں ع۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ پاکٹ سائز نفیس کتابت و طباعت قیمت صرف ۴ر۔

ہر ۳ کتب مذکورہ کے ملنے کا پتہ :۔ دفتر اردوے معلیٰ۔ شاہجہانی پریس۔ دہلی

خوشتر منگردلی

زبان

مئی ۱۹۲۸ء

منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہر ماہ کے آخری ہفتہ میں شایع ہوتا ہے

فہرست مضامین

یہ نمبر بھی جدید مذاق کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے یعنی ہر مضمون کے بعد ایک نظم کا التزام کیا گیا ہے اور ہر مذاق کے مضامین فراہم کئے گئے ہیں چنانچہ تاریخی علمی اور ادبی مضامین سے آراستہ کر کے قارئین **زبان** کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا مضمون جناب مہربان علی صاحب بی۔ اے۔ کا ہے جس میں زوال اندلس کے اصل اسباب پر نہایت محققانہ روشنی ڈالی گئی۔ اس قبیل کے تاریخی مضامین بہت کم نظر سے گذرتے ہیں۔ اگلے نمبر میں بھی آپکا معاشیات پر ایک مضمون نکل چکا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے۔ اُمید کہ اپنی علمی کاوشوں کے نتائج سے قارئین **زبان** کو آئندہ بھی بہرہ اندوز فرمایا کریں گے۔

زبان کے خصوصی مقالہ نگاروں میں سے قارئین جناب مظہر احمد صاحب ادیبی کے علمی کارناموں سے اچھی طرح واقف ہوگئے ہیں۔ زبان میں آپکے جس قدر مضامین نکلے ہیں وہ پسندیدگی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں۔ آپکو ادق مسائل علمی کو آسانی اور سہل زبان میں ادا کر دینے پر جو قدرت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں "اسلامی علم اخلاق" اہل مغرب کے اعتراضات کے جوابات جس عمدگی سے تحریر فرماتے ہیں وہ آپکے تبحر علمی پر دال ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ صاحب مضمون کے نزدیک ہنوز تشنہ ہے تاہم اس قابل ہے کہ اسکا انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپین معترضین کی نظروں سے بھی گذار دیا جائے۔ آئندہ نمبر سے آپکے ایک طویل مضمون "مصر کا قدیم مذہب" کا سلسلہ شروع کیا جائیگا جو چار پانچ اشاعتوں پر ختم ہوگا۔ اگرچہ اس مختصر رسالہ میں طویل اور مسلسل مضامین کا سلسلہ کسی قدر گراں گذرتا ہے لیکن وہ ایسے علمی جواہر پاروں اور معلومات سے بھرا ہوا ہوتا ہے کہ ہم اسکو مسلسل شایع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر مضمون نگار حضرات زبان کے حجم کا خیال فرما کر مختصر مضامین ارسال فرمایا کریں۔

فسانوں میں اقبال احمد صاحب اقبال کا افسانہ "مہر موہوم" عوام کی دلچسپی کا بہت کم سامان رکھتا ہے مگر امین رشیدہ اور مظفر کا کرکٹر قابل تعریف ضرور ہے۔ عشرت رحمانی معاون مدیر رسالہ "نیرنگ" رامپور نے اپنے مزاحیہ فسانے میں "اخبار کے ایڈیٹر" کا کامیاب خاکہ کھینچا ہے جو نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ آئندہ نمبر آپکا بھی ایک طویل مضمون "حکیم

"مومن کی شاعری" پر مسلسل شایع ہوگا نیز واثق صاحب کا تنقیدی مضمون "خیابان خلیل" آئندہ نمبر سے بالاقساط درج ہوا کریگا

نظموں میں محمی کیف صاحب کی نظم "احساس پستی" پہاڑی کی تلہٹی میں موزوں ہوئی ہے جس کے رفعت خیال کی داد نہ دینا پست خیالی ہے۔ "بت خانہ" اور "رازعاشق" کے لئے ہم ابوالفاضل الانز چاندپوری کے ممنون ہیں۔

ابوالعانی بسمل بلگرامی مدیر آئینہ اپنے "بتخانہ" میں ایک جدید "بتکدہ" کی نبیاد ڈالکر اوسمیں ایک نئے مگر حسین "بت" کی تخلیق کرکے پھر اوسی سے ایک "بت حیلہ جو" کی پرستش کراکر ایک جدید مذہب کا سنگ نبیاد ڈالا ہے کیا صاحب بتخانہ "اصنام پرستوں" کے نزدیک "کافر" ہیں قرار پا سکتے؟

ہمیں اسکے باور کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے جبکہ ایک "آسمانی ہستی" "رازعاشق" بتلا رہی ہے

یعنی نیازمندی عاشق کی زندگی ہے

"کسواسطے روتا ہے تو" کے تسکین بخش کلمات اور اس کے پند و نصائح چاہے اوروں کو پسند نہ آئیں لیکن ہمیں تو یہ نصائح اِس ممبر موعظمت پر جلوہ افروز ہونے والے شرعت پناہ کے واعظ و نصیحت سے کچھ بھلے ہی معلوم ہوتے ہیں جو ریائی زہد و تقویٰ ایک عالم کو مبتلائے فریب کئے ہوئے ہیں۔

مشاہیر کی غزلیات میں بعض اشعار تیر و نشتر کا حکم رکھتے ہیں۔

مارچ نمبر کے صفحہ ادارت میں ہماری بے بسی و مایوسی نے جن حضرات کو متاثر کیا ہے انمیں مکرمی حکیم محمد یوسف حسن صاحب مدیر "نیرنگ خیال" لاہور نے ہمارے ساتھ سب سے زیادہ سچی ہمدردی اور سچے اخلاص کا ثبوت دیا ہے جس کیلئے ہم موصوف ہمعصر کے بیحد مشکور ہیں۔ ذیل میں ہم آپکے اِس مکرمت نامہ کی نقل بجنسہ درج کرتے ہیں۔

"مکرمی۔ السلام علیکم۔ آج کئی ماہ کے بعد زبان کا مارچ نمبر ملا صفحہ ادارت کے مطالعہ سے اس المناک حقیقت کا انکشاف ہوا جو دنیائے صحافت کے لئے ایک عبرت انگیز سبق ہے، کاٹھیاواڑ سے ایک اچھے رسالہ کا اس دیدہ زیبی سے شایع ہونا علمی و ادبی حلقوں میں غنیمت سمجھا جاتا ہے اس پر "دلدادگان اُردو" کی سرد مہریوں سے اگر وہ مٹ گیا ہے تو اس پر جسقدر بھی ماتم کریں کم ہے"

نیرنگ خیال کو ترقی دینے کے دوران میں مجھے سب ہی قسم کی تجارت کا موقعہ ملا، ان میں سب سے تلخ تجربہ وہ عظیم

مالی نقصان ہے جو بقدر ۸-۹ ہزار کے ہیں ۴ سال کے عرصہ میں اُٹھا چکا ہوں اور جس کی قربانی کے بعد نیرنگ خیال اپنی کثرت اشاعت کے بل پر آمد و خرچ کے پلڑے کو مساوی بنا رہا ہے مگر اس عظیم مالی نقصان کی تلافی کی مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی منگرول اور لاہور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لاہور میں نیرنگ خیال کے تین چار سو پرچوں کی کھپت ہے مگر منگرول میں یہ ممکن نہیں۔ آپ کو سنگلاخ زمین کا رونا ہے میں کہتا ہوں کہ علیگڑھ کی سرسبز و شاداب زمین سے "سہیل" کا اجرا بھی اتنی معاون پیدا نہ کر سکا کہ سب اعلان وہ آرٹ کی تصاویر سے رسالہ کو مزین کر سکے۔ ایک سال کے تجربہ کے بعد انہیں رجعت قہقری اختیار کرنی پڑی نیرنگ خیال ۱/۲-۴ اور پانچ مستقل اشاعت رکھنے پر بھی نالاں ہے کہ ہندی رسائل کی اشاعتوں کا مدمقابل نہو سکا اور ابھی اسکی مالی حالت اتنی مضبوط نہیں کہ میں اسے خطرہ سے باہر سمجھ سکوں۔ ہندوستان میں جبتک مانگ کر اخبار اور رسالہ پڑھنے کا دستور لکھے پڑھے آدمیوں میں باقی ہے اور جبتک وہ روزمرہ کی ضروریات میں اخبارات و رسائل کا خریدنا شامل نہیں کرینگے۔ نیز جبتک ہندوستان کا محکمہ ڈاک اتنا منتظم نہو جائے کہ رسائل و اخبارات راستہ میں چوری نہ ہوا کریں "اردو صحافت" کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

زبان کے لئے سب سے ضروری مسئلہ تین سال تک اخراجات کی بہم رسانی ہے اگر کسی والئ ملک سے سو دو سو روپے ماہوار کی مستقل اعانت ملجائے اور یہ اعانت کم از کم تین سال تک جاری رہے تو ہوسکتا ہے کہ منگرول سے زبان اتنے خریدار پیدا کرے کہ آمد و خرچ برابر ہو جائے۔ آپ ہمت نہ ہارئے آپنے جسقدر بھی کام کیا ہے قابل تعریف ہے۔ زبان کے دو دتائی کا جو مژدہ آپنے صفحہ ۲۹ پر درج کیا ہے اُسکے مطالعہ سے اُمید کی جھلک نظر آنے لگی ہے خدا کرے اسد نعہ آپ کامیاب ہوں مجھے آپ کی جد و جہد کا احساس ہے اور میں زبان کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہوں۔ نیرنگ خیال پر امداد کے لئے حاضر ہے۔ مجھے آپسے دلی ہمدردی ہے اور میں اسکا عملی ثبوت دینے کو تیار ہوں انشا اللہ جو کچھ بھی آپ امداد چاہیں گے میں اسکی بجا آوری میں مسرت محسوس کرونگا۔

منتظر

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور"

آپ کی اس دلی ہمدردی و حوصلہ افزائی کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ اس تہذیبیت و خود غرضی کے زمانہ میں کون ایسی ہمدردی کا اظہار کر سکتا ہے، آپنے اپنے حوصلہ افزا کلمات سے مری مردہ تمناؤں میں جان ڈالدی۔ کیا زبان بھی نیرنگ خیال کی کسی خدمت سے سرفراز ہو سکتا ہے؟

خوشتر منگرولی

(از جناب مہربان علی صاحب بی اے متعلم ایم اے ایل ایل بی مسلم یونیورسٹی)

بنو امیہ نے اندلس میں تقریباً چار سو برس حکومت کی اور اُسکو قعر ذلت سے نکالکر بام ترقی پر پہونچا دیا لیکن افسوس ہر کمالِ را زوال۔ یہ عظیم الشان حکومت صفحۂ ہستی سے صرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ کسی نے سچ کہا ہے، زندگی موت کیلئے ہے تاریکی روشنی کیلئے۔ ترقی تنزلی کیلئے۔ پستی بلندی کے لئے۔ افسوس

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

مختصر یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے۔ ہر ذی روح ہستی زوال پذیر ہے، یہی قانون قدرت ہے جو ہمیشہ ہوتا رہا اور تا قیامت ہوتا رہیگا۔

اب ہم اپنی موضوع بحث کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور سلطنت اسلامی کے زوال کے اسباب کو ناظرین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قبائلی جنگیں

یہ امر مسلمہ ہے کہ بنی اُمیہ نے اندلس میں جو سلطنت قایم کی تھی اوس کے زوال کے اسباب میں سب سے پہلا قبائلی جنگوں کو سمجھا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ چند افراد کی اُلو العزمی کیوجہ سے اندلس فتح ہوا تھا۔ جہان ایک عمدہ حکومت اور وسیع سلطنت قایم ہوگئی۔ لیکن افسوس ہے کہ جب اسلامی حکومت نے اندلس میں ترقی کرنا شروع کیا تو قبائلی جھگڑون نے اُسکو کمزور کر دینا چاہا۔ چنانچہ عبدالرحمن الداخل کی آمد سے قبل بجائے اسکے کہ مسلمان تمام اندلس پر چھا جاتے۔ وہ آپس کے قبائلی جھگڑون میں مشغول ہوگئے اور سفیری و حمیری آپس میں ہی گتھم گتھا ہونے لگے ان عام فسادون سے وہان کے عیسائیون نے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ لیکن عبدالرحمن الداخل کی یکایک آمد نے عیسائیون کے بلند حوصلون کو پست کر دیا۔ چنانچہ اس جلیل القدر اور دلیر بادشاہ نے اندلس کی سلطنت میں شیرانہ بندی کرکے اُسکی گری ہوئی حالت کو درست کیا اور ۱۳۸ھ سے ۱۷۲ھ تک عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ چنانچہ اس ۳۴ سال کے عرصہ میں اوس نے نہ تو مصریوں اور حمیریوں کو ایک دوسرے کے خلاف سر اُٹھانے کا موقع دیا اور نہ عیسائیون کو سنبھلنے دیا

بلکہ اُن کو شکست پر شکست دی اس اولوالعزم بادشاہ کے انتقال کے بعد ہشام۔ الحکم۔ عبدالرحمن ثانی اور عبداللہ کا زمانہ گذرا اس عرصہ مین عیسائیون سے جنگین ہوئین۔ لیکن عبداللہ کے زمانہ مین اُن قبائلی جنگون کا پھر آغاز ہوا جو عبدالرحمن الداخل کے زمانہ مین ختم ہو چکی تھین۔ پس سنہ ۲۰۶ھ تا ۲۷۶ھ ستر برس کے عرصہ مین اندلس کی حالت اور عام نظم و نسق کی کیفیت کچھ قابل اطمینان نہ رہی۔ عبدالرحمن ثانی کے زمانے مین عمر ابن حفصوں کی مشہور بغاوت کا آغاز ہوا جو ایک عرصہ دراز تک جاری رہی۔ عبداللہ کا عہد حکومت قبائلی جنگون کیوجہ سے نہایت خراب رہا۔ اور عام بدنظمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو اُمیہ کی ایک بڑی سلطنت گھٹ گھٹا کر صرف قرطبہ کی چہار دیواری تک محدود رہ گئی۔ سنہ ۲۷۹ھ مین عمر ابن حفصوں سے جو جنگ ہوئی اور جو جنگ پولی کے نام سے تاریخ اسلام مین مشہور ہے۔ اُس نے عبداللہ کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوار دیا۔ چنانچہ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر ابن حفصون کو کامل شکست نصیب ہوئی اور عبداللہ کی عظمت کا سکہ لوگون کے دلون پر بیٹھ گیا لیکن سلطنت کی حالت پھر بھی نہ سنبھل سکی۔ سنہ ۳۰۰ھ مین عبداللہ نے انتقال کیا تو عنان حکومت اوسکے بیٹے عبدالرحمن (جو بعد مین عبدالرحمان الناصر کے نام سے مشہور ہوا) کے ہاتھ مین آئی۔ اوس نے شروع ہی سے اندرون ملک کی حالت سنبھالی، باغی طبقون کو تنبیہ کی۔ باغی عرب امراء کو زیر کیا۔ اور تمام ملک کو اپنے جھنڈے کے تلے لے آیا۔ اِس عام انتظام کے بعد شمالی عیسائیون اور جنوبی فاطمیوں کی طرف رجوع ہوا۔ اِن دونوں طاقتوں کو وقتاً فوقتاً شکستین دیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو عبدالرحمن الناصر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے شمالی اور جنوبی طاقتون کے پنجہ سے اپنی سلطنت کو بچائے رکھا لیکن اوسکو بھی اسقدر لڑائیان لڑنی پڑین کہ اپنی سلطنت کو حقیقی معنون مین مضبوط اور مستحکم نہ بنا سکا۔ لہذا قبائلی جھگڑے جو عبدالرحمن الداخل کے زمانہ مین بند ہو کر عبداللہ کے زمانہ مین پھر شروع ہو گئے تھے اور جنھون نے سلطنت کے بہت سے حصوں مین طوفان بے تمیزی مچا رکھا تھا۔ عبدالرحمن الناصر کے زمانہ مین ختم ہوئے لیکن اس عرصہ دراز مین وہ سلطنت اسلامی کو وہ کچھ نقصان پہونچا گئے کہ آخر وقت تک سلطنت کا سنبھلنا دشوار ہو گیا۔ بہرحال گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کر کے عبدالرحمن الناصر نے یہ خیال کیا کہ جبتک عرب اُمراء کا زور نہین توڑا جائیگا۔ اور جبتک قبائلی جنگون کو بالکل فرو نہ کیا جائیگا اوسوقت تک کامل اطمینان حاصل نہین ہو سکتا۔ لہذا اُس نے سب سے پہلے قبائل جنگون کو نیست و نابود کیا۔ بعد ازان عرب اُمراء کا زور توڑنا چاہا اور اس لحاظ سے حاجب یا وزیر اعظم کا عہدہ جسپر عرب اُمراء مین سے کوئی بڑا امیر مقرر کر لیا جاتا تھا توڑ ڈالا۔ اسکے بعد اُن سے دوسرے بڑے عہدون پر عرب اُمراء کا تقرر نہ کیا۔ بلکہ بربری اور صقالیہ کو (جو اسوقت یورپ کے ممالک کے باشندے اپنی اپنی ملک سے بچون کو فروخت کرنیکے لئے اندلس بہت لاتے تھے اور جو مملوک کہلاتے تھے بازارون مین بہت سے خرید کر کے اور انکی حالت کو سنوارا اور انکو عروج دیا اور ان لوگون کی بڑی بڑی

تنخواہیں مقرر کیں اور ان کا بڑے بڑے عہدوں پر تقرر کیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بربر اور صقالبہ کو عروج حاصل ہوا اور دوسری طرف عرب قومیت کو زوال ہوا۔ جو حقیقت میں اسلامی سلطنت کے زوال کا ذمہ دار ہے۔ مختصر یہ ہے کہ عبدالرحمن الناصر نے خیال کیا تھا کہ نو پرورد اور زرخرید غلام جاہ و حشمت پاکر بادشاہ وقت کے خلاف کبھی سر نہ اٹھائیں گے اور اسکا یہ خیال بالکل درست تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ زرخرید غلام الناصر کے بعد بھی اُسکے اولاد کے خلاف سر نہ اٹھائیں گے چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ بس الناصر کے زمانہ میں جب یہ غلام ایسے مالدار ہو گئے کہ اپنے لئے خود غلام خریدنے لگے تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان غلام اُمراء کی طاقت کیا ہوگی۔ اس عام مرفہ الحالی کا یہ نتیجہ ہوا کہ الناصر کی وفات کے بعد یہ غلام بھی بادشاہ وقت کے خلاف باغی ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ الناصر نے تاریخ کی شہادتوں کی موجودگی کے باوجود ایک سیاسی غلطی کی تھی۔ حضرت عمر کے زمانے میں عرب قومیت کے عروج کی کس طرح کوشش کی گئی اور حضرت عمر کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ جبتک عرب قومیت عروج پر رہے گی اسوقت تک عربوں کا زوال مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب قومیت کی عام طور سے حفاظت کیجاتی تھی لیکن جب بنو عباس کے زمانہ میں عرب قومیت کو زوال پذیر بنایا گیا اور ایرانیوں کو عروج دیا گیا تو کچھ عرصہ بعد بنو عباس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس تاریخی مثال کو نظر انداز کر کے ہم ہندوستان کی مثال کو لیتے ہیں۔ یہ ایک سیاسی نظریہ ہے جو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر قوم اپنا عروج اور اعزاز و افتخار قایم رکھنے کے لئے اپنے ہم قوم کی عزت کرتی ہے اور حکومت وقت کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں کی جو جاہ و عزت ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بڑے بڑے انگریزوں کا تو کیا سوال ایک انگریز کانسٹبل کی جو قدر کے دلوں میں ہے وہ قدر شاید ایک بڑے سے بڑے ہندوستانی کی بھی اُنکے دلوں میں نہیں ہے حاصل کلام یہ ہے کہ وقت کو اپنی قوم کی عزت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس کو الناصر نے وقتی فائدہ کی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا اور آزمائی ہوئی بات کو دوبارہ آزمایا۔ آزمودہ را آزمودن جہل است" لہذا الناصر اور اسکے بعد المنصور کی حکمت عملی جس نے عرب قومیت کو زوال پذیر کیا۔ سلطنت اسلامی کے لئے گران بار ثابت ہوئی۔ اور آخر کار اوس نے اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب میں ایک اور اضافہ کیا۔ اسی کے ساتھ الناصر اور ابی عامر منصور نے اپنے اپنے عہد میں قبائلی نسلوں کو مٹا کے بعد ادنے طبقہ کے افراد کو ملا کر ایک قوم بنا دینا چاہا۔ لیکن حسن اتفاق سے انہی دو عہدوں میں عام امن کی وجہ سے تجارت نے ترقی کی۔ صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہوا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی جد و جہد شروع ہو گئی۔ اس عام معاشی ترقی میں متوسط طبقہ خوب مالدار ہو کر سرمایہ دار بن گیا۔ اب نیچے کا طبقہ مزدوروں کا رہا۔ اور دوسرا اوپر کا طبقہ غلام اُمراء کا۔ ان تین طبقوں کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ چنانچہ منصور (ابی عامر) کے زمانہ میں مزدوروں کا طبقہ اس بات کا شاکی تھا کہ اصلدار ہمکو مزدوریاں کم دیتے ہیں اور غلام اُمراء یہ چاہتے تھے کہ مزدور لوگ سرمایہ داروں سے جنگ کریں تاکہ سرمایہ داروں کا نقصان ہو۔ اس عام

کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب آپس مین جھگڑا چلا اُس زمانہ کی کیفیت وہی تھی جو آجکل یوروپ کی ہے اور جس نے یوروپ کے
بڑے بڑے معاشین کو خوفزدہ بنا رکھا ہے۔ اسوقت مزدور اس پر تلے ہوئے ہین کہ سرمایہ دارون کے طبقہ کے زور کو کم کیا
جائے لیکن اصلداراس بات پر متفق ہین کہ مزدورون کو حد سے زیادہ بڑھنے ندین گے۔ مختصر یہ ہے کہ ابی عامر کے زمانے مین
(جو ہشام ثانی کا وزیر اعظم تھا اور جس کے سامنے ہشام ثانی ایک طفل مکتب تھا) اِس قسم کی جنگ شروع ہوئی جسمین یہ گل کھلائے
کہ صقالیہ اور بربریون نے ایک طرف سرمایہ دارون کے خلاف اور دوسری طرف مزدورون نے بھی سرمایہ دارون کے خلاف
جنگ شروع کر دی۔ اس عام کشمکش کا نتیجہ ہشام ثالث کے زمانے مین یہ نکلا کہ عمائدین سلطنت نے شاہ وقت کو ایک تاریک
کوٹھری مین بند کر کے محتاج زندگی حاصل کرنیکے لئے اپنی کمترین خدام ادب سے عاجزانہ التجا کرنے پر مجبور کر دیا۔

اِس قسم کی عبرت خیز نظارے اب قرطبہ میں نئے اور انوکھے نہ تھے بلکہ اکثر و بیشتر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہر انقلاب اپنے
ساتھ تازہ آفتین لاتا۔ شورش پسند گروہ قرطبہ مین تعداد مین بڑھتا رہا۔ یہانتک کہ المنصور کے محل کو تاخت و تاراج کیا گیا اسمین آگ لگا دیگئی
چار دن تک مسلسل قتل عام کا بازار گرم رہا حتی کہ مدینۃ الزہرہ کی بھی باری آئی وہ مدینۃ الزہرہ جو خلیفہ اعظم کا مایۂ ناز محل تھا۔ دغا بازون نے اُسپر
قبضہ کر کے لوٹ لیا اور آگ لگا دی اُسوقت حالت یہ تھی کہ صقالیہ اور بربر نے ایک طوفان بے تمیزی مچا رکھا تھا اور انکے
ساتھ مزدور بھی تھے۔ اسوجہ سے خلیفہ پر خلیفہ تخت نشین کیا جاتا۔ کبھی بنو اُمیہ کا اور کبھی بنو حمود کا۔ اور جب ان بادشاہون سے
تسلی نہوتی تو حکومت کا بار شاورن کونسل (مجلس اُمراء قرطبہ) کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت کا یہ رنگ دیکھ کر صوبہ جات
کے گورنر خود مختار ہو بیٹھے۔ غرض ہر شہر ہر قصبہ اور ہر ضلع خود مختار ہو بیٹھا مگر خاص اسپین کے باشندے اِس طوائف الملوکی مین
شریک نہوئے، وہ اپنی بیکسی پر متاسف اور خاموش تھے۔ سرداران بربر نے جنوبی اضلاع پر کل قبضہ کیا۔ صقالیہ نے مشرقی صوبے
اپنے تحت مین لئے۔ باقی اضلاع پر گورنر اور بعض نو دولتیے خاندانوں نے اپنا قبضہ جمایا اور اسوقت قرطبہ اور سیوال نے
جمہوری حکومتین قایم کر دین۔ غرض گیارہوین صدی یا پانچوین ہجری کی شروع مین الناصر اور منصور کی حکمت عملیون نے خوب
خوب گل کھلائے اور عوام کو یہ اندازہ ہوگیا کہ عرب قومیت کا زوال اور عام لوگوں کو ملا کر ایک قوم بنانا اور بربر اور صقالیہ کو عروج
دینے کا کیا نتیجہ ہوا۔ پس اس عام بے چینی سے شمالی عیسائیون نے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ یہ وہ عیسائی تھے جو مسلمانوں کی فتح کے
وقت تعداد مین کم تر بیٹھے اور جو انکی تلوارون سے بچکر غاروں میں جا چھپے تھے۔ اور شہد چاٹ چاٹ کر زندگی بسر کر رہے
تھے لیکن مسلمانون نے اس طرف دھیان نہ دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی قلیل تعداد ایسی بڑھ گئی کہ جس نے شمال میں ابھر کر
لیون اور کیسٹائل کی سلطنتین قایم کر دین اور جنکا وجود مسلمانون کی سلطنت کے زوال کے اہم اسباب مین شمار کیا جاتا ہے
چنانچہ ان عیسائی سلطنتون نے مسلمانون کی عام ابتری مین اضافہ کرنا چاہا۔ چنانچہ اندلس کے خود مختار شہزادہ انکو مختلف

مقامات پر قابض تھے۔ ایک دوسرے سے لڑا دیا۔ اور آخر کار سب کو کمزور کر کے عیسائی سلطنت کیسٹائل نے (جو سب سے زیادہ طاقتور تھی) تمام مسلمان شہزادوں کو اپنا مطیع بنایا۔ پس اس گری ہوئی حالت میں جو کہ مسلمان نہایت خراب و خستہ اور عیسائیوں کے باجگذار بن گئے تھے، خدا نے مسلمانوں کی مدد کی۔ اور یوسف ابن تاشفین کو افریقہ سے بھیجا جس نے زولاقہ کے مقام پر کیسٹائل کے بادشاہ کو شکست دی اور اندلس کی اسلامی سلطنت کو کچھ عرصہ کے لئے خاتمہ سے بچا لیا۔ اسکے بعد جب حالت خراب ہوئی تو عبد المومن نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں اور خاندان المهدی کا بانی ہو کر حاکم سلطنت بنا۔ اسکے بعد بنو نصیر کے قبضہ میں سلطنت آئی جس نے صرف غرناطہ پر حکومت کی۔ اسکے بعد یہ شہر بھی عیسائیوں نے چھین لیا۔ پس ایک طرف تو تباہی جنگوں نے اور دوسری طرف بربر اور صقالیہ کے عروج نے اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب مہیا کئے، اسکے علاوہ الناصر اور منصور کی قومی حکمت عملی نے اسلامی سلطنت کو صدمہ پہونچایا۔ علاوہ اسکے الناصر کے بعد اسقدر کمزور بادشاہ ہوئے کہ وہ گرتی ہوئی حالت کو قطعاً نہ سنبھال سکے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ الناصر اور منصور کے زمانہ میں سلطنت اندلس کو افریقہ کی فاطمی سلطنت سے بھی بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے اسلامی حکومت کی طاقت کمزور ہوتی گئی۔ اور سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ شروع میں شمال کے عیسائی آبادی کیطرف کبھی توجہ نہ کی گئی۔ جس کی وجہ سے آخر کار عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو شکست اُٹھانی پڑی۔ پس یہی وہ اسباب ہیں جو اسلامی سلطنت کے زوال کے ذمہ دار ٹھیرائے جا سکتے ہیں افسوس

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

جناب ولایت حسین خان صاحب اثر رامپوری

تیری صورت کا ہے اپنی شکل پر دھوکا مجھے
یہ کمالِ عشق و اُلفت ہے کہ ہے سودا مجھے

مل گئے کیا آپ مجھکو مل گئی دنیا مجھے
اس سے بڑھکر اور دولت چاہیئے اب کیا مجھے

پڑ گیا ہے جب سے دردِ عشق کا چسکا مجھے
دیر ہی ہے لطف کیا کیا خواہشِ ایذا مجھے

عالمِ وحشت بھی میرا ہے عجب حیرت فزا
ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے اک صحرا مجھے

شکر کیوں کر ہو ادا بندہ نوازی کا تری
بحرِ اُلفت دل دیا ہے درد میں ڈوبا مجھے

میں سمجھتا ہوں جو اس آغاز کا انجام ہے
دیرہا ہے کس لئے اے عشق تو دھوکا مجھے

اے اثر دنیا کی ہر شے میں فنا پوشیدہ ہے
عالمِ ایجاد آتا ہے نظر دھوکا نہ مجھے

دل کو جلا رہا ہے سوزِ غمِ نہانی
گل ہو کے ہی رہیگی اب شمع زندگانی

جذبات دل کی آنکھین کرتی ہین ترجمانی
ملتی ہے مجھکو گویا یون داد بے زبانی

مانا ہر ایک شے ہے دنیا کی آنی جانی
لیکن یہ واقعہ ہے اک چیز ہے جوانی

مایوسیون نے صورت اُمید کی دکھائی
ناکامیون مین پنہان تھا راز کامرانی

ہان اک شعاع زرین اس تیرہ بخت دل پر
روشن ہی تجھ سے دنیا اے شمع لامکانی

اب یاد عہد ماضی دل کو ستا رہی ہے
آنکھون مین پھر رہی ہے تصویر کامرانی

اے محو عیش و عشرت، مصروف خواب راحت!
دیکھے ہین مین نے اکثر نیرنگ آسمانی

اُمید پر ہے قایم دنیا یہ ہے مُسلّم
اللہ اب کٹے گی کس طرح زندگانی

آئے حکیم کوئی پھر شوق دید لیکر
خاموش مدتون سے ہی ساز لنترانی

تو اور حُبّ دنیا، تو اور فکر عقبےٰ
معلوم ہو چکے بس اسرار لامکانی

اب شوق حق پرستی پیدا ہوا ہے دلمین
برباد ہو چکی ہے جب روح زندگانی

اے رازؔ اگر سلامت ہے ذوق شعر گوئی
ہو جائے گی مرتب روداد زندگانی

رازؔ چاندپوری

بسلسلہ ماسبق

(۴)

اسلامی علم اخلاق مین علامہ جلالی کی بلیغ کتاب فارسی علم ادب کے ذرایع و منبع کی تفصیلی توضیح ہی نہین کرتی بلکہ یہ بھی کہ مشرق کا اوس پر کیا اثر رہا ہے، چنانچہ چند دنون سے بعض یورپین مؤلفین اور مصنفین کا جو اس سے بالکل بے خبر ہین کہ ایشیائی اقوام کے تنزل کے اسباب کو مناسب اور نیک اندیش طرز پر کیونکر بیان کیا جائے یہ رویہ ہو گیا ہی کہ ایشیائی علوم کی اصولی غلطیون کو علت العلل قرار دین - یا دوسرے لفظون مین یون کہین کہ ادراک فہم کی کمی کو کرہ مسکونہ کی نصف آبادی کے تنزل کا سبب قرار دین - حالانکہ یہ ایک زبردست غلطی ہے اور معترضین خود اس کے اسباب سے بے خبر ہین - بلکہ اس قسم کے غلط نتایج تو کچھ ان کے آزادانہ پیش بینی ہی کے مناسب معلوم ہوتے ہین جنکی غرض غایت اسکے سوا اور کچھ نظر نہین آتی کہ وہ اس ڈھنگ سے ایشیاء کے علوم و فنون کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اُن کی جگہ یورپی علم کا پودا نصب کر دین -

---

علم اخلاق مین جلالی کی زبردست تالیف کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اس قضیۂ کاذبہ کو جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے نظرانداز کر دین تو یہ غلطی بالکل ہی ناقابل ہو گی بلکہ ترقی کر کے یہ کہہ دینا بے جا نہو گا کہ نقص فہم و ادراک کا الزام ایسے معترضین پر ہی عاید ہوتا ہے کہ ع آفتاب آمد دلیل آفتاب

آپ ٹھنڈے دل سے اِس امر کی طرف غور کیجئے کہ اسلامی علم اخلاق پر حضرت ملا جلال الدین دوانی کی کتاب مسمی بہ ”لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق“ پندرہوین صدی عیسوی کی تالیف ہے مگر مظاہر قدرت، علم اور اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہے - اور ان امور کو اس گرم جوشی کیساتھ بیان کرتی ہے کہ جبتک صفحہ عالم پر احساس فرض ترغیب و تحریص باقی ہین اسکی چہل پہل بھی باقی رہیگی - اِس کا فیصلہ آسانی کیساتھ یون ہو سکتا ہے کہ اوسی زمانہ کی یوروپ کی اس پایہ کی کتاب جو اسی کے برابر فصیح و بلیغ مانی جاتی اور ہاتھون ہاتھ لیجاتی ہو - پھر ان دونونکا مقابلہ و موازنہ کرو تب پتہ چل سکے گا کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہے اور یوروپ کی اس تالیف کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہی تب تم کو یوروپ کے بیجا اعتراض کا راز منکشف ہو جائیگا -

بات یہ ہے کہ نہ تو زمانہ کی رفتار ہمیشہ کسی قوم کیساتھ رہی ہے اور نہ رہیگی۔ جب زمانہ کسی قوم کے موافق نہین رہتا ہے تو معترضین اسی قسم کے الزام عائد کیا کرتے ہین کیونکہ جانتے ہین کہ سمت مخالف سے کوئی جواب دے ہی نہین سکتا پس جو چاہو اعتراض کرو۔ اور وہ قوم جس کے اسلاف پر اعتراض کی بوچھار ہوتی ہے وہ خود بھی اس قسم کے اعتراض و الزام کو صحیح تسلیم کرکے اپنے بزرگون کی سعی کو مشکوک نگاہون سے دیکھتے ہین۔ کیونکہ انہین حکومت و سلطنت باقی نہ رہنے کیوجہ سے اُن کے احساس مردہ ہو چکتے ہین اور ان مین بھلے اور برے کی امتیاز باقی نہین رہتی اصل یہ ہے کہ ایشیائی خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور آپس کے جنگ و جدل نے اِن کے بڑھتے ہوئے تمدن کو روک دیا اور یہ ایک طبعی امر تھا اسلئے کہ ہر ایک قوم سرداری اور برتری کی مدعی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہین کہ مسلمان مورد الزام قرار دئے جائین کیونکہ دنیا کی کل اقوام ماضیہ کی یہی حالت رہی ہے اور آج بھی باوجود دعوائے تہذیب و تمدن یورپی اقوام کو اپنی اپنی برتری کے لئے جنگ کرتی ہوئی دیکھ رہے ہین لیکن اس کشمکش کے باوجود مسلمانون کو جہان کہین موقع ملا ہے اور ذرا بھی چین سے بیٹھنا نصیب ہوا ہے وہان انکی روحانی اور مادی ترقی کے کافی آثار موجود ہین۔ مین یہ ضرور عرض کرونگا کہ یہ مقابلہ و موازنہ کی جنگ صرف چند تالیف تک ہی محدود نہین بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین عام ہے ہم اسکا فیصلہ اُن حضرات کی آراء پر جو مسلمانون کے اختراعات علمی سے اور تالیفات سے باخبر ہین چھوڑتے ہین کہ وہ خود ہی دیانت کے ساتھ فیصلہ کر دیکھین۔

یہ لطف تو دیکھئے کہ وہی پودا اگر اسلامی دنیا مین لگا ہو تو زہر ہلاہل ہے اور اگر یورپ مین ہو تو نوش۔ کیونکہ اس کتاب کا اُن زبردست تالیف سے موازنہ اور مقابلہ کرنے پر جنکی صفحہ گردانی کا مؤلف اقرار کرتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی فلسفہ کا بہت بڑا حصہ یونان سے آیا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مسلمانون نے پرانا اور بدبودار لباس اُتار کر ایک موزون اور ستھرا لباس قطع کرکے پہنا دیا اور وہ اسی شاندار لباس مین وہ قرطبہ وغیرہ کی یونیورسٹیون سے ہوتا ہوا یورپ مین جا پہنچا۔ لگا وہان جاکر آنکھین گھورنے کہ محسن کش ایسے ہی ہوتے ہین۔ اگر تھوڑی سی دیر کے لیے ہم یہ تسلیم بھی کرلین کہ یورپ نے فلسفہ براہ راست یونان سے لیا ہے تب بھی تو یہ دونون بچے یونان کے ہی تو ہوئے پھر یہ سمجھ مین نہین آتا کہ مسلمانون کے لئے باعث ہلاکت اور یورپ کی ترقی کا سبب کیون اور کس لئے ہے،

مین بلاخوف تردید عرض کرونگا کہ "لکل امۃ اجل" کے زبردست قانون سے نہ کوئی قوم بچی ہے اور نہ بچیگی ہے ہر ترقی کیساتھ تنزل لگا ہوا ہے، چنانچہ حسب قانون فطرت جب مخالف ہوائین چلنے لگین تو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ترقی رک گئی اور لازمی طور سے وہ اسی جگہ ٹھہرے رہ گئے جہان تھین چنانچہ گذشتہ دو سو برس سے یورپ برابر ترقی کے

قدم بڑھا رہا ہے۔ جبکہ ایشیا نسبتاً ساکت ہی نہین رہا ہے بلکہ ناقابل تلافی تنزل کر گیا ہے۔

یہ مسلّم امر ہے کہ متقدمین کے علوم متاخرین کیلئے چراغ ہدایت ہوا کرتے ہین اور ایک کے آثار سے دوسرا استفادہ کرتا ہے، چنانچہ مسلمانون مین فلسفہ یونان سے بذریعہ ترجمہ آیا ہوگا اور پھر وہاں سے یورپ گیا۔ کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ ہی کہ وہ بہتر کی طرف نظر دوڑایا کرتا ہے اور اگر ہم قیاس بالمشابہ سے کام نہلین تو یورپ کیخاطر بادل ناخواستہ یہ کہہ سکتے ہین کہ اسلامی اور یورپی فلسفہ مین اس قدر اشتراک ہے کہ یہ نہین کہا جا سکتا ہے کہ کس کے آثار اور مٹے ہوئے نشانات سے کس نے اِستفادہ کیا۔

مین نے عرض کیا تھا کہ صنم پرست قوم کا فلسفہ خدا پرست کے لئے ہادی ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانون نے صنم پرست کو خدا پرست بنا دیا۔ کیونکہ اصلی و طبعی ترقی وہی کہی جا سکتی ہے جو ارادی نہو بلکہ غیر اختیاری طور سے ظہور پذیر ہوا اور یہ بھی لازمی ہے کہ جہان دماغی تعلقات پیدا ہون اور اُن کے اثرات منتقل ہون وہان رابطہ ماسبق کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ آسانی سے رواج پا سکین۔ جب دو قومون کے خصائل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونگے تو ایک دماغی نتائج دوسرے پر بہت جلد اثر کرینگے، یہی باتین وہ ہین جنکا یونانیون اور عربون کی ابتدائی قومی خصوصیات مین پتہ چلتا ہے۔ مثلاً احساس کی آزادانہ اور فیاضانہ اُفتاد۔ حکومت کا آبائی اور دوستانہ شکل مین بے قیام ہونا قومی آزادی اور خود مختاری کو باوجود بڑی بڑی مخالف طاقتون کے قایم رکھنا تخیل کا موجود ہونا۔ صاحب روایات ہونا۔ قوائے مخفیہ کا اعتقاد۔ اجنہ کا اشرف المخلوقات مین داخل ہونے کو تسلیم کرنا۔ فرشتوں کا آسمان سے آکر خالق کو ہدایت کرنا اور تسلی دینا۔ بھانت بھانت کے پرندون وچرندون کے ذریعہ سے اخلاقی سبق سے زندگی کو پاک ستھرا بنانا وغیرہ،،

یہ ہین وہ باتین جو یونان و عرب کے اقوام مین مساوی طور سے پائی جاتی ہین۔ کسی قوم کی ابتدائی عادات وخصائل کے لئے صرف نام اور مثالون کی ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ وہ دوسری قوم کے خصائل کے مہتم بن سکے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب نے فلسفہ یونان کو اپنے اندر سرعت کے ساتھ جذب کر لیا۔

عرب کے نیم وحشیانہ اور غیر مہذب عادات وخصائل اور اُن مین اُصول و احساس کی جسقدر برائیان اور نقائص تھے اُن کو سیدنا محمد الرسول اللہ صلعم نے آکر صاف و مجلّا کر دیا۔ اور یہی اُصول جو بداخلاقی کے محرک اور موجب تھے آپ کی ذات کی وجہ سے برکت و رحمت ہوگئے اور تمام اسلامی دنیا کا فرض ہوگیا کہ وہ اسی قانون پر جس کی آنحضرت صلعم نے تعلیم دی ہے عمل پیرا ہو۔ یہ اسوہ حسنہ فرقان حمید ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ اُنھون نے چار دانگ عالم مین اپنا ڈنکا بجا کر چھوڑا۔ اب یونانی علوم کا سوال کچھ یون ہی سا رہجاتا ہے کیونکہ مسلمانون نے اُسے اُصول اور طریقہ عمل بنا لیا اور صرف

ابتدائی اُصول واجزاء ترکیبی کو کام مین لاکر معراج ترقی پر جا پہونچے اسی طرح اُن معاشرتی نظم و نسق کے نقطۂ خیال سے جن سے کہ تعلقات ماقبل و مابعد مین رشتہ پیدا ہوتا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ یونانیون کے اُوشین اسرار سے اسلامی صوفیت نے اُصول اور اجزاء ترکیبی حاصل کئے ہونگے کیونکہ اِن دونون مین قریبی رشتہ و تعلق پایا جاتا ہے اور ہو بہو اُوشین اسرار کی اُصول کی نقل نظر آتی ہے جس نے اِصطلاحات کی ایک ایسی زبردست پوشیدگی پیدا کردی ہے کہ یہ اسرار کی شین ہوگئی ہے۔ اور صوفیت کے کل پرزون کا مجموعہ اُوشین اسرار کی طرح ایک دلچسپ معمہ بن گیا ہے۔

لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئیے کہ اسکا ہر ایک جزو یونانی ہے بلکہ ان مین ایک قسم کا مشابہتی تعلق ضرور پایا جاتا ہے بلکہ یونانی اُصول کا اثر بذاتہ مفقود ہوچکا ہے ہاں صرف طریقہ غور و فکر کا رشتہ باقی رہجاتا ہے اور یہ کوشش کہ اسلامی فلسفہ کو یونان مین جا ملائین سعی لاحاصل ہوگی اور مسلمانون کو انکے دماغی نتائج سے محروم کرنا۔ یہ کہ یونان ہی کیون رہبر بنا۔ اسکی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ یورپ و ایشیا کے وسط مین مخالف عناصر سے بالکل غیر جانبدارانہ رشتہ رکہتا تہا۔ اِس لئے اسکے علوم عالم کے دماغی وفاق کا ذریعہ بن گئے اور آج بہی اسکی اخلاقی تعلیم دوسرے ممالک و اقوام مین زندہ نظر آتی ہے اسکے تمام علوم ایشیائی زبانون اور کتابون مین نقل ہوکر زندہ ہوئے اور وہین نشو و نما پایا۔ ایشیا مین اسی وجہ سے یونانی علوم کا پتہ چلتا ہے اور اسی نے یوروپ کو تبلایا۔ کہ یونان کے پاس کیا کیا ذخائر موجود ہین۔ خواہ آج یورپ کچھ بہی کیون نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی دنیا اسکی طرف ہاتھ نہ بڑہاتی تو آج کوئی نام بہی نہ لیتا۔

ابتداً موجودہ دنیا کے ہاتھ مین جو رسائل آئے وہ یہی علم اخلاق ہے اسکی بنیاد ایسی اتفاقی اور محدود اصول پر ہے کہ جسکی اہمیت پر بہت کچھ مباحثہ کیا جا سکتا ہے ہم تک انہی کے ذریعہ سے اُن مقاصد و آرام کی تلخیص کی رسائی ہوتی ہے جو نوع انسانی کے تیسرے عرصہ کی ترغیب و تحریص کے باعث تہے اور ان اجزاء تحلیلی کی صداقت کو ماننا ہی پڑتا ہے خاصکر اُن افراد کے لئے جو راستی کو قومی تراغیب کے مختلف شکلون اور پہلوؤن سے مقابلہ و موازنہ کرکے دریافت کیا چاہتے ہین اور وہ جو کہ مناظر شتی وازنہ مختلفہ کے انسانون کے اطوار و عادات کی ترقی کے آثار سے دلچسپی رکہتے ہین اور وہ لوگ جو کہ مشرقی سیاسیات کے نطری قانون کے پتہ لگانے یا ماضی کے درس عظیم کو مستقبل کے ساتھ تطبیق کرنیکے معتاد ہین۔ یہ۔ نہ۔ یز مسلمان کا اپنے اصول، انکشاف، شوق اور مطمع نظر ایسے معانے و مقاصد ہین

جس مین اساءہ تفہیم کی گنجائش ہی نہین کہ اس قسم کی تحریرات کا یہ خصوص امتیاز ہے کہ انکی سیاسی شہادت کی قدر وقیمت سے اُن کے تفکر وتعقل اور نشو ونما کی اہمیت بالکل ہی جداگانہ اور مستقل ہے گو آج یورپ مسلمانون کے طریقۂ تفکر واستدلال کو غلط تبلا رہا ہے۔ بالفرض اگر مسلمانون نے تفکر واستدلال مین غلطی کی بھی ہے تو وہ ناقابل التفات ہے اور اس غلطی کے اظہار سے بھی بہت سے گہرے مطالب حل ہو جاتے ہین کہ انسان کا صداقت کی طرف ترقی کرنا غلطی سے کھلا ہوا اور زبردست انکار ہے اس لئے کہ اسکی ہر ایک مسئلہ دلیل ومثال سے دوسرے کو امداد پہونچتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات یورپ خود بھی اوس موازنہ زبردست مشابہت سے جو ممالک غیر کے رسم ورواج اور آرا وغیرہ مین اُن کی ذات مین پائی جاتی ہے وہ دریائے حیرت مین غرق ہو جائین اور یہ مشاکلت ترقی وعلم کا ایک قیمتی وبہتر ذریعہ بنجاتی ہے جس سے اُن کے قومی امتیاز کو مزید تفوق حاصل ہو جاتا ہے اور اگرچہ وہ مفاد جو اس قسم کی تحقیق وتفتیش سے حاصل کئے جاسکتے ہین، دوسرے لوگون کے نظام تدریسی مین زیر بحث نظر آتے ہین جن کا بہت سا حصہ ایسی حقیقی واصلی خوبی سے مملو ہوتا ہے جس کی کہ ہم کو پہلے سے خبر ہی نہین ہوتی، ایسی صورت مین صاحب فہم کا فرض ہے کہ وہ ایسے اُمور کہ اگر وہ صحیح ہون توقبول کرنے مین کسی طرح کا نہ تو پس وپیش ہونا چاہئے اور نہ اسمین کوئی مشکوری کا موقع۔ اور یہ ایسا عام خراج ہے جسکو کہ سب ہی کو ادا کرنا چاہئے کہ یہ وہ اُصول ہے جس سے بادی طریقۂ عمل قایم وبرقرار رہتا ہے اسی کی وجہ سے اعلی ترین طبائع کو ادنے ترین کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے گو یہ مفاد مقرر کے افعال کے سامنے بہت کم مایہ ہوتے ہین مگر اس طور سے مادہ اور طریقۂ عمل دونون کے دونون جمع ہو جاتے ہین مناسب تو یہ ہے کہ اس قسم کی مباحث کو نظر انداز کر ہی دینا چاہئے کیونکہ اس سے یہ اُمید نہین کیجاتی کہ باہمی تعلقات مین مزید شگفتگی پیدا ہو جائے گی اور مناقشہ مرتفع ہو سکے گا۔

ہم علم اخلاق کو زیادہ سے زیادہ اُن مؤلفین ومصنفین کی گم شدہ کتب کی تشریح وضمیمہ تصور کر سکتے ہین جن کے ملحض ہونے کا اسمین اقرار کیا گیا ہے کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ یونانیون نے کسی مضمون کو بغیر ہاتھ لگائے ہوئے نہین چھوڑا ہے "ساری دنیا اُن کے سامنے تھی جسکو چاہتے انتخاب کرتے" اور قبل اسکے کہ وہ ایک مضمون مکمل کرتے دوسرا اُن کو اپنی طرف مائل کر لیتا تھا اسکے بعد تیسرا علی ہذا القیاس تا آنکہ یہ دائرہ مکمل ہو گیا۔ اِن مضامین کے باہمی تعلق نے ان کو کچھ ایسی طور سے منہمک کیا تھا کہ وہ کسی ایک کو بھی مہذب مرتب نہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ انکے زبردست اجزاء آج بھی دنیا سے خراج تحسین وصول کرتے ہین چنانچہ ہمارے پاس اسی جامع ونادر کتب جن سے یونانیونکے علم اخلاق کا کچھ بھی پتہ چل سکے، وہ مسلمانون کی کتب اخلاق ہین۔ اور یہ اُن ہی کے مواد سے اسطرح جمع کی گئی ہین

کہ جسکا انکار ممکن نہین۔ پس مستقل تالیف و تصنیف موجود نہونے کی صورت مین ان اخلاقی کتب کا ضمیر مقدم کیئے بغیر چارہ نہین کیونکہ اس سے عہد عتیق کے فہم و ادراک کا ایک دہندلا سا عکس پڑتا ہے کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ اس قسم کی مکمل و مختصر کتابین یونانی فلسفہ کے دور ثانی مین بحال و برقرار نہین۔ اور بعض کا گمان ہے کہ یہ اس کثرت سے موجود تہین کہ ازدیاد تعداد نے کسی ایک کی بہی شہرت کافی نہونے دی اور اس وجہ سے سب کے سب عدم توجہ و فنا کے نظر ہوگئین پس علم اخلاق پر جو اسلامی عہد کی تالیفات ہمارے سامنے ہین۔ وہ ایشیا و یورپ دونون کے لئے قابل قدر مجموعہ ہین جسمین یونانی علم اخلاق سے صرف ایک پر فریب تشابہ ہی نہین ہے بلکہ ایک ایک کی ہو بہو نقل نظر آتی ہے کیونکہ جب زمانہ کی دست تعدی نے یونانی علوم و فنون کو بحر فنا مین ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا ہے تو یقینی طور سے وہ ملک جہان پر وہ صحیح طور سے روشنی مین لائی جاسکتی تہین۔ بمقابلہ مصر و شام اور ایشیائے کوچک کے وہ کون سے دوسرے مقامات ہو سکتے تھے اور کیا یہ ممالک مساوی طور سے یونانیون اور مسلمانون کی جائے آمد و رفت نہ تھے۔ اسکی تائید مین اخلاق جلالی کا لامع ہشتم خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہے کیونکہ سیسرو[91] اور ہوریشس[92] سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی مضمون پر چند مسلمہ درسیات موجود نہین۔

مسلمانون کے علم اخلاق مین جسقدر حصہ قدیم عنصر کا ہے اُسکا دریافت کر لینا کوئی مشکل کام نہین کہ وہ ایک حد تک اپنی اصلی اور پاکیزہ حالت مین موجود ہے۔ مسلمانون مین یہ کچھ اصول ہوگیا تہا کہ فلسفیون کے ہر آنیوالی جماعت اپنے معتقدین کو اس درجہ عزت کی نظرون سے دیکھتے تھے اور قدماء کی عظمت و وقار کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ اُسکو غلامی سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ بظاہر یہ وجہ سمجھ مین آتی ہے کہ یونانی فلسفہ کی خوبیون نے اُن کے دل مین گھر کر لیا تہا اور اوس کے اوصاف اُن پر منکشف ہو چکے تھے۔ ایسی صورت مین وہ جو کچھ بھی یونانیون کی عزت کرتے کم ہے گو آج ہم اُسکو پسندیدہ نگاہون سے نہ دیکھین اسلئے وہ جو اختراع کرتے اور کبھی وہ اُنہی علوم و فنون کے ضمیمہ کے طور پر تہین جو پہلے سے چلی آرہی تھے

---

[91] سیسرو اسکا پورا نام میرکیس ٹیولیس سیسرو (Marcus Tullius Cicero) ہے یہ روم تہ الکبرٰی کا بہترین فصیح مقرر سمجھا جاتا ہے۔ یہ روم کا سربرآوردہ مدبر اور نہایت ہی روشن خیال مصنف ہے اور اس نے ایشیائے کوچک کا سفر کیا اور علم بلاغت کے سبق اور پروفیسرون کی صحبت سے استفادہ کیا۔ یہ ۱۰۶ قبل مسیح مین پیدا ہوا اور ۴۳ قبل مسیح مین اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ Chambers Encyclopedia Vol III p. 240

[92] ہوریشس اسکا پورا نام (Quintus Horatius Flaccus Horace) کوئنٹس ہوریشس فلکیس ہوریس ہے یہ لاطینی زبان کا شاعر ہے اسکا سلام سودا کی طرح ہجو سے داغدار ہے یہ جنوبی اٹلی مین وینیسا کے قریب ۸ دسمبر ۶۵ قبل مسیح مین پیدا ہوا یہ ایپیکورس کے مطیعین مین سے تہا اور یہ کہا کرتا تھا کہ ایپیکورس کے براہین و دلائل اسٹائکس کی سختی اور سار کے اخلاقی تعلیم کے مابین ہین۔ (Chamb: Enc: Vol V. p. 776)

مگر انکی صحت اور اصلاح کی طرف چندان توجہ نہ کی اور جو اختراعات انھون نے کئے وہ اصل کے اجزاء ہی معلوم ہوتے ہین اور مایہ لا کچہہ بھی نظر نہین آتا مگر یہ ضرور کہین گے کہ اس معتدل اور متوسط طریقہ عمل نے اسکی اہمیت مین کچہ

قدر کمی ہی نہین کی بلکہ اسکو ایک حد تک ادق کر دیا ہے۔ نیز تفہیم مضمون کے لئے جو امثلہ متقدمین سے چلی آ رہی تہین

بس اُنہی کا اُلٹ پھیر کرتے ہے جس نے امثلہ کے دائرہ کو بھی معین اور محدود کر دیا۔ اب خواہ اسکو ان کے فلسفہ کی خوبی

تصور کرین یا نقص مگر اس سے مسلمانون کے فلسفہ مین اور اصل مین زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ اس حدت سے

گو فلسفہ کی بناوٹ مین زیادہ ترقی تو نہو سکی لیکن مطالب تک دماغ انسانی کی رسائی کے راستے وسیع ہو گئے جسکو

مسلم فلسفہ کا خصوصی امتیاز کہنا بیجا نہوگا۔

تقریباً ۲۰۰ سال قبل مسیح کے بعد بھی سے یونانیون کے مذاہب فلسفہ عقل اور مادہ کی بنا پر مختلف اور متعدد تھے

لیکن دو کا نمبر سب سے بڑا چڑہا نظر آتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے ضد تھے گر یہ دونون افراط و تفریط سے خالی تھے

لیکن مسلمانون نے مادہ پر عقل کے تفوق کو کلیتہ ترک کئے بغیر اوس غلط تہذیب ترتیب کو جو عقل کے بارہ مین ہو سکتی

ہے یا ہونا چاہئے تھا اسکو اس خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا کہ ایک کا دوسرے پر کوئی برا اثر نہین پڑا۔ شیرلاک

(Sherlock) کا مقولہ ہے کہ "کسی وجود مرکبہ کے لئے خوشی و انبساط صرف ایک ہی عنصر سے حاصل نہین

ہو سکتی" اسمین شک نہین کہ دلائل ترک نہایت نفیس ہین لیکن یہ رائے نہین قایم کیجا سکتی کہ وہ بزرگ جنھون نے

سب سے پہلے قانون صداقت کو مشتہر کیا۔ وہ قصداً مرتکب سہو ہوئے کیونکہ ایسی صورت مین مخالف مواد فراہم نکرتے

گو علمی حالت اسکے اجتماع اور تجزیہ کی اجازت ہی کیون نہ دیتے لیکن وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے اہم و غامض جزو

وضعی مین منہمک تھے کہ دوسری طرف توجہ منعطف نہ کر سکے اور جس مواد کو اُنھون نے اپنے جانشینون کے لئے چھوڑا وہ

اس سے بتدریج ایسے نتائج پر پہونچے جو انسان کی صحیح دلچسپی کے خلاف تھے کیونکہ وہ قضایا جن پر اُسکا سنگ بنیاد

رکھا گیا تھا فطرت انسانی کے بالکل خلاف تھے۔

پس صفحۂ عالم پر جو ہستیان آباد ہین اگر اون کی زندگی کا مدار صرف مادہ پر تسلیم نہ بھی کرین تو اُن کے محسوسات

اور انفعال مادہ ہی کیوجہ سے عمل مین آتے ہین مگر اُن کو نہایت سنجیدگی سے بتلایا گیا تھا کہ دنیا اور اسکے متعلقات جسم

اور اوسکی ضروریات کوئی چیز ہی نہ تھی اور ضمناً یہ تعلیم بھی دی تھی کہ یہ اونکا فرض تھا کہ سوسائٹی کی مدد کرنیکے بجائے

اوس سے جنگ کرین۔ اس ناقابل عمل معیار کی غلطی کو ابتدائی زمانہ مین ہی ایک ایسے آدمی نے جو خود اسی اخرش

متاثر تھا بنات خود معلوم کر لیا اسی بنا پر ہیوم (Hume) اپنے رسالہ مین جسکا عنوان دوستی ہے اتفاقی طور

سے کہہ جاتا ہی کہ استاکس (Stoics) یا (عدیم المبالات بہ موثرات) جو زینو (Zeno) کے متبعین میں اور جنکو کہ انہوں نے یہ تعلیم دی تھی کہ انسان کو خواہشات نفسانی سے آزاد ہونیکی سخت کوشش کرنا اور رنج و راحت سے قطعی موثر نہین ہونا چاہیئے اور خود کو بلا چون و چرا اوسی زبردست ہستی کے سپرد کردینا چاہیئے جو تمام کائنات پر فرمان روا ہے اور اسی کو انسان کی اعلے ترین خوبی خیال کرتے ہوتے رنج و راحت موثر نہ ہونا چاہیئے۔ پس اگر یہ اپنے نظریہ کی باریک غلطی کا ادراک کرتے تو لکڑی کے کندے یا پتھر کی چٹان سے کچھ یوں ہی سے بہتر ثابت ہوتے بلکہ غور کرنے پر ہر ایک کی سمجھ مین آسکتا ہے، سوا استعمال نیکی خود نیکی کا استحقار ہے خواہ ایسی کورش کو (Epicurus) جس نے یہ تعلیم کی تھی حقیقی نیکی اور بدی خوشی اور رنج ہین کوئی صورت ہی کیون پیش نائی ہو اُسکے متبعین کم از کم ایک دوسرے افراط مین جا پھنسے اور اس سے نیچے رہنے کی غرض سے جب ایک غلطی کا انکشاف کرتے تو اوس سے زیادہ کا شکار ہو جاتے اس قسم کی غلطیون اور دہوکون سے اگر کوئی فلسفہ آزاد اور مستثنا نظر آتا ہے تو وہ ارسطو کا ہی مذہب ہے جسکے اصول کو اختیار کرکے آسمان تکمیل پر پہونچانے مین مسلمانون نے انسانی تخیل کے نہایت قیمتی حاصل کی اصطلاح کرنے اور جمع کرنے اور ترتیب دینے مین اپنی پوری کوشش سے کام لیا۔ اس کے سوا فلسفہ کے کل مذاہب کو قطعاً ترک کردیا۔ گو اسمین کچھ کم وقت پیش نائی ہوگی یا اس معرکتہ الآرا کام کی شہادت خود ایک ایسا واقع ہے جس نے دماغی تاریخ مین ایک دور جدید قایم کردیا اور یہ علوم سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتے رہے تو اسمین شبہ نہین کہ یورپ کے راہبوں کا تعصب و نفس پرست غرور اُن زبانوں کی کورانہ تعلیم مین جنکو کہ وہ مقدس خیال کرتے تھے ان علوم کو قطعی طور سے فنا کرکے چھوڑتے لیکن یہ قدرت کا فضل تھا کہ یہ علوم مسلمانون کے ہاتھوں مین پہونچے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت تفتیش (Inquisition) کے سفاک اور گمراہ کن ہاتھون سے بہت سی تالیفین بچگئین۔

ملہ (Stoics) استاکس زینو کے متبعین مین جو ۳۰۰ قبل مسیح مین ہوا ہے اُسکا یہ عقیدہ تھا کہ تمام عالم پر ایک بڑی زبردست قوت حکمران ہے جسکے سامنے ہماری تمام قوتین بیکار ہین اور یہ کہ باعتبار جسم انسان و حیوان دونون برابر ہین مگر انسا نمین قوت عقلیہ ہے جسکی وجہ سے وہ دیوتا تک بن سکتا ہے حیوانات مین بھی عقل ہے لیکن مدرک نہین (Encyclopaedia Brit.)

ملہ۲ (Epicurus) ایپی کورس ایتھنز کے قریب قصبہ گارگس کا باشندہ ہے یہ ۳۴۱ قبل مسیح مین پیدا ہوا اس نے یہ تعلیم کی تہی کہ سب سے بڑی خوبی سکون قلب ہے جو نیکی سے حاصل ہوتی ہے مگر اُسکے نزدیک نیکی عیش زندگی کا نام ہے اور بدی دنیاوی آلام و مصائب کا اسی وجہ سے اسکے متبعین کو عرب فلسفی و شہوانی کے نام سے مخاطب کرتے ہین۔

(Hughes Dict: of Islam - p. 379)

اور یورپ کی آزادی کا ذریعہ بن سکین۔ چنانچہ مسلم فلسفہ اخلاق ہی انھین کا ایک صحیح نمونہ ہے اور اس سوال کو کسی اور موقع پر حل کرین گے۔

بہت سے مسلم فلاسفر مخالف ہونیکی صورت مین بھی اسکے مفسر اور خادم ہونے پر ہی قانع رہے صرف اسی آخرالذکر شکل مین بہت کچھ باقی ہے جس پر بہت کچھ گفتگو کیجا سکتی ہے اگر قدیم تالیف کے عنوان کا مخزن ہی تو یہی مسلم علم اخلاق ہے۔ اِس ثبوت کے لئے بہت سی مفید مثالین اُن صفحات مین ملسکتے ہین جہان پر کہ (Herodotus) ہیروڈوٹس کے سادہ لفظی بیان کو کہین کہین معانی کے لباس پہنا دیے گئے ہیں جس سے (Xenophon) زینوفون کی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ سیسرو کی ذہانت رائج سکون مین تسلیم کی گئی ہے جسکے متعلق آج بھی یہ تسلیم کیا گیا ہی کہ لاطینی فلسفہ کی وہان تک رسائی نہین ہوئی۔ خیر ہم کو اسسے سروکار نہین ہان اِس نظریہ کو میرے خیال مین تسلیم کئے بغیر چارہ کار نظر نہ آئیگا کہ اس سے مادہ کی اصلیت و حقیقت کی تشریح نہین ہوتی بلکہ اسکے باقاعدہ اور مہذب استعمال کے دریافت کے لئے علم و ادب کے وسیع رسائل درکار ہونگے۔ اور یہ اوس کا موقع بھی نہین کہ بیزن ٹائن (Byzantine) سلطنت کے مورخین کا باہمی مقابلہ کر کے بتایا جائے، کسی عہد کی بہترین تفسیر اور شرح وہ ہی ہوسکتی ہین جو اسکے بعد ہی کے عہد اور جانشین سلطنت نے کی ہو۔ اسطرح معلوم سے نامعلوم کیطرف صعود کرتے ہین اور موجودہ زمانہ سے گذشتہ کیطرف جلد جلد قدم اُٹھاتے ہین اور زمانہ مین جس قدر بعد ہوتا جاتا ہے اِسی قدر اسی نوعیت کے خصوصیات کا اندازہ لگانا اہم ہوتا جاتا ہے اور اگر کبھی ایسا زمانہ آجائے کہ تناقض بیانات مشرق و مغرب کے مورخین کے ایک جگہ نہایت دیانت کے ساتھ جمع ہون اور سیاسی امور بھی ہمارے سامنے ہون تو ضرور معاشرتی حالات کا صحیح پتہ لگے اور یہ لوگون کی

---

۵۱) (Herodotus) ہیروڈوٹس ایشیاء کوچک کے شہر ہالے کورنس کا باشندہ ہے ۴۸۴ قبل مسیح مین پیدا ہوا تھا اپنے زمانہ کا بہترین مورخ مانا جاتا ہے ۴۶۴ قبل مسیح سے ۴۴۷ ق م تک اُس زمانہ کے سربرآوردہ ممالک مین سفر کرتا رہا۔

(Chamber Encyclopedia Vol: IX. p. 765)

۵۲) (Xenophon) زینوفون ۴۳۰ ق م مین پیدا ہوا۔ یہ یونانی مورخ اور فوج کا سپہ سالار تھا۔ یہ ابتداء عمر ہی سے سقراط کے اثر مین آگیا تھا اور اُسی کے مذاہب کا اس پر زیادہ اثر ہے، جب سائرس کو اُس کے بھائی نے شکست دیکر قتل کر دیا تو قوم نے فوجی کمان اسکے سپرد کی، یہ فوج لیکر ۳۴۶۵ میل ۲۱۵ دن مین پیدل چلا گیا۔

(Cham: Encyc: Vol. IX. p. 765).

عادات و خصائل اور تعلیم وغیرہ کے حالات جو اس طرح جمع ہوں گے وہ واقعات ماضیہ کی سچی تصویر ہو گی جس سے وہ حقیقت جو اسلامی علوم اخلاق میں مضمر ہے، دنیا کے سامنے آجائے گی اور وہ رسائل جس میں اُن کے علوم اخلاق کی تعلیم کی گئی ہے ضرور کبھی نہ کبھی اُن ماہرین فن کو جو اصل کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے اور اُس کی طرف رجوع کرنا پسند کرتے ہیں اُن کو اسلامی علم اخلاق اپنی طرف مائل کرے گا۔
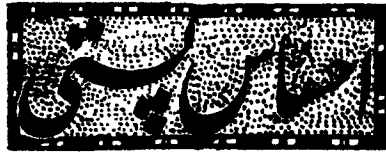
"صبح صادق کے جلوے عالم کو پیام بیداری دے رہے تھے، میں پہاڑی کے دامن میں بیٹھا ہوا اپنی زندگی پر تنقید کر رہا تھا۔ ذیل کے اشعار کو جذبات دلی کی تصاویر سمجھئے جو میں اسوقت صفحہ کاغذ پر کھینچ سکا۔" کیف،

میرے جذبات میں کل تک تھی عظمت اور فراوانی
کہاں لے آئی مجھکو آج ارمانوں کی طغیانی
میری فطرت کا یہ کمزور پہلو چھپ نہیں سکتا
میرے شیرازہ ہستی میں مضمر ہے پریشانی

ارادوں پر میری قدرت کو دیکھو اور پھر دیکھو
کہ محتاج عمل ہے آج میرا شوق پنہانی
نگاہوں کی میری قوت کو دیکھو اور پھر دیکھو
کہ مجھ سے بھاگتی ہے آج ہر جلوہ کی تابانی

کھنچا جاتا ہوں میں پستی کی جانب روک لے مجھکو
کہاں ہے آج وہ احساس عظمتہائے انسانی

کہاں ہے آج وہ سر میں مرے سودائے خودداری
جھکی جاتی ہے ہر نقش قدم پر میری پیشانی
کہاں ہیں آج وہ دلمیں مرے جذبات بیداری
کہ غفلت کر رہی ہے میری آنکھوں کی نگہبانی

معاذ اللہ اپنی قوتوں کا ضعف یہ دیکھوں
کہ حاصل دیکھکر اپنا مجھے خود ہے پشیمانی

نگاہ شوق اب سوئے بلندی کیوں نہیں اٹھتی
مری آنکھوں نے کس سے سیکھلی آخر یہ حیرانی

میرے جذبات کی رفعت پسندی کیا ہوئی آخر　　کہاں سے آگئی دل میں مرے یہ پست سامانی

میں اپنی کوششوں کا یہ نتیجہ کس طرح دیکھوں　　نہ دیکھی جائیگی مجھ سے بھرے گھر کی یہ ویرانی
میرا ہر ذرۂ دل وقفِ صد سیلاب بربادی　　میرے ہر دانۂ خرمن میں شعلوں کی فراوانی

میں اس دنیائے غفلت آفریں میں رہ نہیں سکتا　　کہ نادانی یہاں دانائی ہے دانائی نادانی

چھپا لے اے نمودِ صبح مجھکو اپنے پردوں میں　　مجھے مرغوب ہے دل سے ترا منظر یہ نورانی
ترے جلووں میں گم ہو کر میں پھر مقصد کو ڈھونڈونگا　　اُبھر آئینگے شاید اس طرح جذبات پنہانی
ترے پرتو سے شاید روح کچھ بیدار ہو جائے
دلِ مدہوش شاید اس طرح ہشیار ہو جائے

کیف مرادآبادی

عشرت رحمانی رامپوری

کوئی کرے تو پہلے دستِ سوال پیدا　　اہلِ کرم کو ہوگا آخر خیال پیدا
انسانیت کرے تو صدق مقال پیدا　　کرے گی حق پرستی اکلِ حلال پیدا
ہمدرد ہو کسی کا دردآشنائیوں میں　　یوں اپنے زخمِ دل کا کر اندمال پیدا
ہر عجز و انکساری ہے باعثِ بلندی　　مہتاب بھی ہوا تھا مثلِ ہلال پیدا
زمانِ بیکسی سے کب تک نجات آخر　　ناکامیوں میں یارب ہو اعتدال پیدا
انجام میں نگاہ ہو کچھ مد و جزر دیکھو　　اوجِ کمال سے ہے قعرِ زوال پیدا
ہے انتہائے الفت اظہارِ بدگمانی　　کرتا ہے رازِ پنہاں اکثر ملال پیدا
بیدار کر صداقت پیدا خلوص نیت　　قسمت کریگی اکدن جاہ و جلال پیدا
مرکز رہا ہے عشرتؔ در پردۂ تقدس
ہیں عہدِ حاضرہ میں کیا خوش خصال پیدا
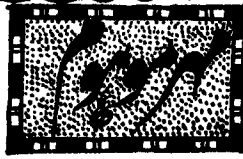
(اقبال احمد صاحب اقبال)

شاہدہ سے میری محبت کی نوعیت کچھ عجیب تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں شاہدہ کو پہلی مرتبہ دیکھ کر متاع دل کھو بیٹھا۔ ہم دونوں قریبی عزیز تھے۔ وہ میری ہم عمر تھی۔ بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے مجھے اس معصومانہ دور کی بعض باتیں یاد ہیں۔ کبھی کھیل میں شاہدہ مجھ سے بگڑ جاتی تو اس کو ہر طرح منانے کی کوشش کرتا وہ بڑی مشکلوں سے منتی لیکن جب اس کی خفگی دور ہو جاتی تو پھر وہی بے تکلفی اور محبت پیدا ہو جاتی تھی گھنٹوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ بچپن کے معصومانہ کھیلوں میں گذارتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یہ معصومانہ مؤانست رنگ لائے گی اور جیسے جیسے ہماری عمر کے سال گذرتے جائیں گے ہم محبت کی زنجیروں میں گرفتار ہوتے جائیں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہدہ ایک روز میری ہستی پر حکمراں ہوگی اور میری انس و محبت کا مرکز بن جائے گی دن گذرتے گئے اور ہم بچپن اور لڑکپن کی منزلوں سے گذر کر شباب کی پر کیف زندگی میں داخل ہوئے۔ یہ میری عمر کا اٹھارھواں اور شاہدہ کی عمر کا سولھواں سال تھا جب میں نے اپنی محبت کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ فطرتاً ہم دونوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ شاہدہ چند سال پہلے کی طرح سادہ دل اور خالی الذہن نہیں تھی، اس میں وہ خودداری پیدا ہوگئی تھی جو کم و بیش قدرت کی طرف سے عورت کو ودیعت کی جاتی ہے۔ شاہدہ کا حسن شباب کے زمانہ میں اور نمایاں ہوگیا تھا۔ اس کا قد درمیانی تھا۔ اعضا نہایت متناسب کھلتا ہوا رنگ۔ اس کے کتابی چہرہ کا بے عیب اور دلکش بناؤ۔ اس کی شرمیلی سیاہ آنکھیں جن سے ذکاوت اور ذہانت ہویدا تھی۔ اس کے باریک آپس میں ملے ہوئے لب جو اس کے پراز جذبات قلب کو ظاہر کرتے تھے یہ سب ایسی باتیں تھیں جن سے متاثر ہوئے بغیر مشکل سے رہا جا سکتا تھا۔ لیکن میری محبت کا باعث اس کا حسن و جمال اور شباب کی رنگینیاں نہ تھیں مجھے اس کی روح کے ساتھ مؤانست تھی اور اس وقت سے بھی جب شاہدہ حسن و جمال کی تمام نیرنگیوں سے بےخبر تھی اس لیے میرے خیال میں کبھی کسی

قسم کا تغیر نہ پیدا ہوا اور جو معصومانہ محبت مجھے اسکے ساتھ شروع سے پیدا ہوئی تھی وہ قائم رہی۔ اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ مین اسکے روز بروز قریب ہو رہا ہون اور ایک قسم کی جاذبیت شاہدہ مین پیدا ہوگئی ہے جو مجھے اپنی طرف زیادہ قوت اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ کھینچ رہی ہے ایک عرصہ کے بعد مین نے اسکو عالم شباب مین دیکھا اسوقت اس کی شوخی اور حیا کی متانت اور سنجیدگی سے تبدیل ہوگئی تھی وہ آپس کی بے تکلفیاں خواب و خیال تھین مین بھی اپنے تعلیمی مشغلون مین مصروف رہنے کی وجہ سے اپنی محبت کی سرگرمی اور جوش و خروش کا پورا احساس نہین کر سکتا تھا لیکن فرصت کے زمانہ مین جب مجھے کئی ماہ کے لئے وطن آنے اور رہنے کا اتفاق ہوا اور اسی اثناء مین شاہدہ سے ملنے کے زیادہ موقع ملے تو وہ سوتے ہوتے جذبات پھر بیدار ہو گئے اور اپنے سینہ مین پھر ایک تلاطم سا محسوس کرنے لگا جسوقت مین اس تلاطم کا احساس کرتا تو میرے دل مین یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مین زیادہ وقت شاہدہ کے پاس گذارون اور اُس سے ہنس بول کر کچھ اپنے دل کی آتش فشانی کو کم کرون۔ مجھے شاہدہ کی گفتگو بے حد پسند تھی اور میرا دل اتنا اوسکی گفتگو مین لگتا تھا کہ مین کئی کئی گھنٹے متواتر اس کے پاس بیٹھتا اور اوسکی باتین سنتا رہتا۔ یہ مشغلہ میرے لئے سب سے بڑی مسرت کا سبب تھا۔ اسی طرح مین شاہدہ سے متاثر ہوتا گیا اور میرا شوق رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا۔ مین نے ابھی تک اپنی محبت کا کوئی مقصد متعین نہین کیا تھا لیکن مین محسوس کر رہا تھا کہ باوجود اس بے لوثی اور بے غرضی کے میری محبت ایک خاص نوعیت رکھتی ہے، چاہے مین محسوس نہ کرتا ہون لیکن شاہدہ ضرور میری امیدون اور تمناؤن کا مرکز تھی ہماری باہمی گفتگو کا موضوع کوئی خاص نہ تھا۔ مین نے اپنی محبت کے جذبات کا اظہار اس پر نہین کیا۔ کبھی کبھی مین چاہتا تھا کہ جو کچھ دل مین ہے وہ سب اِس سے کہہ ڈالون۔ اپنی شوریدہ سری اور بے چینیون کا اس پر اظہار کرون لیکن شاہدہ کا طرز عمل اسقدر خوددارانہ ہوتا تھا کہ مین نے اظہار محبت کی جراءت نہ کی۔ باتین کرتے کرتے شاہدہ کبھی آنکھین اٹھا کر مجھے دیکھتی تو مین اوسکی آنکھوں مین خاص قسم کے تاثرات محسوس کرتا تھا جس مین حیا۔ پاکبازی اور خودداری پنہان تھی۔ مجھ پر جذبات کا ہجوم ہوتا گیا اور میرے اثرات ترقی کرتے گئے۔ لیکن اس نے اپنے کسی طرز عمل سے یہ خیال کرنے کا موقع نہین دیا کہ اُسے میرے جذبات کا کچھ علم ہے۔ وہ نہایت بے پروائی اور آزادی کے ساتھ مجھسے برتاؤ رکھتی تھی۔ مین تنہائی مین اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا میرے احساسات کا اثر اسکے دل پر بھی کچھ ہے اور اسکو بھی میرا خیال ہے، میرے خیال مین محبت کے اندر یہ تلاش کہ آیا محبوب بھی محبت کے جذبات سے متاثر ہے ایک قدرتی جذبہ ہے۔ بہرحال یہ یقینی تھا کہ شاہدہ میرے دل کی ہنگامہ خیزیون سے بالکل بیخبر تھی یا بے خبری کا اظہار کرتی تھی۔ کبھی مین کسی پیرایہ مین کوئی محبت کا افسانہ اسے سناتا تو مین دیکھتا تھا کہ وہ اُس مین ذرا بھی دلچسپی کا اظہار نہ کرتی تھی۔ وہ ان افسانون کو

اور محبت کے ایثار اور قربانیون کو سنکر انکا مضحکہ اُڑانے کے لئے یہ مصرع پڑھ دیا کرتی تھی۔ مصرع
کہتے ہین عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

اس سے میری تمام توقعات پر پانی پھر جاتا تھا اور مین مایوس ہوکر یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ میری محبت مین کوئی کشش نہین اور اسکا اس پر کچھ بھی اثر نہین ہے، کبھی مجھے اس خیال سے تشویش ہو جاتی تھی اور مین سوچتا کہ آخر اس محبت کا کیا انجام ہونیوالا ہے، محبت کے متعلق یہ خیال کہ اظہار اسکی لطافت کو ضایع کر دیتا ہے مجھے کبھی پسند نہین آیا۔ مین تو یہی چاہتا تھا کہ اگر موقع ملے تو شاہدہ کے قدمون پر سر رکھدون اور اسکو اپنا افسانۂ محبت سناؤن مین تو یہی چاہتا تھا کہ شاہدہ پر اپنے جذبات کا اظہار کرکے یہ معلوم کرلون کہ حقیقتاً وہ بھی ان جذبات سے متاثر ہے، اور اسکو بھی اس خلش کا احساس ہے جو رات دن مجھے بے چین رکھتی ہے، محبت کا معاوضہ محبت، مین سمجھتا ہون کہ یہ خواہش بالکل قرین فطرت ہے لیکن باوجود اس اُصول پر پورا یقین اور اعتماد رکھتے ہوئے بھی مجھ مین اتنی ہمت نہ تھی کہ مین اوس پیکر استغنا سے اپنا حال دل کہون۔

شاہدہ اب عمر کے اُس دور مین پہنچ گئی تھی جہان اوسکی شادی کا مسئلہ زیادہ دنون تک ملتوی نہین رہ سکتا تھا میری تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ہمارے گھر کی مالی حالت بھی اسکی متقاضی نہ تھی کہ اپنی معاش حاصل کرنیکے قابل ہونے سے پہلے میری شادی کا سوال پیدا ہوتا میرے والدین کو ابھی اس مسئلہ کا کوئی خیال بھی نہین تھا لیکن شاہدہ کے والدین اسکی شادی کے لئے بیتاب تھے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جہان لڑکی ذرا شعور کو پہنچی اور اسکا وجود مان باپ کے سر پر ایک بار گران ہوگیا۔ وہ بس اِس فکر مین رہنے لگے کہ جلد سے جلد اسکے بار سے سبکدوش ہون۔ اس عجلت مین وہ عموماً موقع کے اچھے اور برے ہونیکا بھی خیال نہین کرتے اور اندھا دھند لڑکی کو کسی کے حوالہ کر دیتے ہین۔ شاہدہ کیلئے بھی ایک اوسط درجہ کا معمولی تعلیم یافتہ انسان منتخب کر لیا گیا جسکو شاہدہ کے مذاق اور خیال سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی اشاہدہ کے والدین تو بھلا اس مناسبت کو کیا دیکھتے۔ ہندوستانی والدین عموماً اس کا کبھی خیال نہین کیا کرتے اور باتون کو وہ دیکھ لین گے لیکن لڑکے اور لڑکی کے مذاق تر تیب اور اُفتاد مزاج پر کبھی بھی توجہ نہ کرینگے، مجھے شاہدہ کی منگنی کی اطلاع ہوئی اور اچانک ہوئی۔ اس خبر سے مجھے سخت صدمہ پہنچا اس لئے نہین کہ شاہدہ میرے لئے ایک بیگانہ چیز ہونیوالی ہے اور مین اپنی محبت مین ناکامی کو دیکھ رہا ہون۔ محبت مین ناکامی کا کوئی سوال نہین۔ محبت حقیقتاً خود آپ اپنی غرض ہے مجھے شاہدہ سے جس قسم کی محبت تھی خواہ اسکی زندگی مین کتنی ہی تبدیلیان کیون نہ ہو جاتین وہ اسی طرح قایم رہ سکتی تھی لیکن خیالی طور پر وہ بالکل میرے قریب تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح عزیز رہے گی، مین محبت اور

ازدواج کو ایک دوسرے کے منافی نہین سمجھتا۔ ازدواج محبت کا مقصد نہین لیکن محبت ازدواج کے بعد بھی قایم
رہ سکتی ہے فنا نہین ہوجاتی ازدواج ایک اشتراکی زندگی کا نام ہے اور اسکا تعلق فطرت انسانی سے ہے لیکن محبت تمامتر
روح سے تعلق رکھتی ہے اور جس طرح روح اور جسم کو ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے اسی طرح محبت بھی ازدواجی
زندگی مین اسی طرح قایم رہ سکتی ہے، شاہدہ کی منگنی ہوجانیکے بعد مین نے سمجھ لیا کہ مشیت الٰہی کو ہمارا اتحاد زندگی
منظور نہین ہے اسلئے وہ فطری جذبات جو اس خبر کے سننے کے بعد میرے دل مین پیدا ہوئے مین نے انکو ضبط کیا اور اپنی
قسمت پر قناعت کرنا اور حالات کی تبدیلیون کے بعد بھی اپنی محبت کو قایم رکھنا اپنا اصول قرار دیا لیکن ان واقعات کا
اثر میری صحت پر نہایت برا پڑ رہا تھا جس کو میرے اعزاء اور اقارب بھی محسوس کر رہے تھے لیکن اسکا سبب اصلی صرف
مین جانتا تھا یا شاید اسکا تھوڑا بہت احساس کبھی شاہدہ کو بھی ہوا ہو۔ دنیا میری محبت سے قطعی بے خبر تھی۔ اپنی
صحت کی خرابی کے باعث مجھے اپنا سلسلہ تعلیم بھی منقطع کر دینا پڑا اور جب مین وطن آیا تو معلوم ہوا کہ اس اثناء مین شاہدہ
کے عقد کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی اور قریب ہی تقریب ہونیوالی ہے مین خود اس تقریب مین شریک رہا مین نے وہ تمام رسمین
دیکھین جو قدامت پسند گھرانون مین ہوا کرتی ہین شاہدہ کو مین نے دلہن بنتے دیکھا۔ اسوقت وہ مصنوعات مین گھری ہوئی
تھی۔ اسکو دیکھکر مجھے ایک گونہ افسوس ہوا مین تمام مصنوعی آرائشون کو شاہدہ کے لئے بالکل بے ضرورت سمجھتا تھا
سادگی اس کا سب سے اچھا زیور تھی اسی مین وہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ بہرکیف تمام رسوم ادا ہوجانے کے بعد شاہدہ اپنی سسرال
رخصت ہوگئی۔ اس تقریب کے اثناء مین مین نے اپنی کسی طرز عمل سے یہ ظاہر نہین کیا کہ یہ تقریب جو ایک شخص کی امیدون
کی تعمیر کر رہی ہے میری خاموش تمناؤن کو برباد بھی کر رہی ہے، کسی کو یہ خیال و گمان بھی نہوگا کہ مین گو بظاہر اس
تقریب مین ضرور شریک تھا لیکن میرے دل مین کس قسم کے تاثرات برپا تھے جسطرح انسان تکلیف اور مصیبتون کا عادی
ہوجاتا ہے اسی طرح مین بھی اپنی محرومی پر صابر و شاکر ہوگیا لیکن محبت اسی طرح قائم تھی۔ اسمین شمہ بھر بھی کمی نہین محسوس ہوتی
تھی اب وہ تعین مقاصد سے بالکل مبرا تھی۔ ایک پرکیف خاموشی، پرسکون خلش، ایک جان کو گھلانیوالی لیکن دل کو وجدانی
کیفیتون سے لبریز کر دینے والی تپش، یہی میری محبت کی نوعیت تھی۔

شاہدہ سسرال سے واپس آگئی۔ سسرال کے دور دراز ہونیکی وجہ سے اسکا میکے مین ایک عرصہ تک قیام
رہا اور اس اثناء مین مجھے اس سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا رہا۔ کچھ ملاقاتون کے بعد پھر یہ خیال میرے دل مین پیدا ہوا کہ مین
اسکا اندازہ کرون کہ شاہدہ آیا حقیقتاً کبھی بھی میرے جذبات سے متاثر ہوئی؟ اب اسمین کوئی امر مانع نہین تھا۔ میری
پاکبازی مین اسکو اشتباہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی میرے خلوص پر وہ مطمئن تھی اور اگر اس اطمینان کے بعد مین اس

پرا پنی محبت اور بے لوث محبت کا اظہار کردون تو یقیناً شاہدہ اس سے متوحش نہ ہوگی اور اظہار کے بعد اسکا جو جواب ہوگا وہ مجھے مطمئن کر دینے کے لئے کافی ہوگا۔ یقیناً مین نے اپنی محبت مین انتہائی ضبط و تحمل اور ایثار سے کام لیا۔ اگر شاہدہ مین اہلیت اور انسانیت ہے تو ضرور اسکا اعتراف کرے گی میری تسکین خاطر کے لئے اتنا بہت کافی تھا۔

شاہدہ کے سسرال سے آنیکے بعد ایک روز مین نے ایک ریشمی رومال اوسکو ہدیہ دیا اور کہا "شاہدہ مین تمہاری شادی کے موقع پر اپنی طرف سے کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اسوقت اسکا کوئی موقع نہ تھا اسلئے اسکو اب تم قبول کرو اور اس خصوصیت کی یادگار مین جو مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ رہی ہے اسکو اپنے پاس محفوظ رکھو" شاہدہ نے کسی قدر شرمگین نگاہون کے ساتھ اُسے لے لیا اور میرا شکریہ ادا کیا لیکن مین نے اسکے چہرہ کے رنگ مین ایک خفیف سی تبدیلی محسوس کی۔ اب شاہدہ مجھسے زیادہ آزادی اور بے تکلفی سے ملنے لگی تھی۔ لڑکیان شادی کے بعد عام طور پر اپنے قریبی عزیزون سے کسی قدر بے تکلف ہوجاتی ہین۔ شاہدہ بھی مجھسے بے تکلفی کے ساتھ ملنے لگی۔ اس بے تکلفی مین بھی مین نے اوس کی طرف سے کوئی بات ایسی نہین پائی جس سے مجھے اسکے تاثرات کا کچھ بھی علم ہوتا۔ یہ محض اپنے جذبۂ محبت کیوجہ سے مجھے خیال تھا ورنہ ظاہر تھا کہ شاہدہ اگر شادی سے پہلے کسی قدر متاثر بھی ہوگی تو شادی کے بعد اس اثر کو زائل ہوجانا چاہئے شاہدہ کو اب ایک دوسرے شخص سے محبت کرنا تھی اور پورے طور پر اسکو اپنی محبت کا یقین دلانا تھا۔ یہ مرحلہ اس عورت کے لئے جو کسی خفیف اثر سے متاثر ہو بہت ہی سخت ہوتا ہے، اس سے گذرنیکے بعد اسکے سابقہ تاثرات یقیناً مٹ جاتے ہین۔ عورت جب کسی کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے تو اس سے محبت بھی.... کرتی ہے، شاہدہ کو اپنے شوہر سے یقیناً محبت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی اور اسکا اندازہ کرنے مین مجھے کوئی دشواری نہین تھی۔ وہ اسکے حسن سلوک سے خوش تھی اور اس کا ذکر ہمیشہ مسرت اور بشاشی کے ساتھ کرتی تھی مین گو ضبط کا بہت کچھ عادی ہوچکا تھا لیکن پھر بھی مجھکو اپنی قلبی کیفیتون پر پورا اعتماد نہین تھا۔ شاہدہ کے سامنے اگر مین کبھی خود رفتہ سا ہوجاتا میری قوتِ ارادی مضمحل ہوجاتی اور مین اس خیال سے متفکر ہوجاتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ مین ایسی حالت مین اس سے کچھ اظہار محبت کر بیٹھتا اور اس سے اوسکو غلط فہمیان پیدا ہوکر کچھ بُرے نتائج پیدا ہوتے۔ مین نے چاہا تھا کہ مین اس سے ملنا چھوڑ دون لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا میری صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ یہان تک کہ خود شاہدہ کو بھی اس کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن میری بہن کی موجودگی مین اُسنے مجھسے پوچھا "آخر تمہاری کیا حالت ہوتی جاتی ہے۔ مین دیکھ رہی ہون کہ تمہاری صحت روز بروز بگڑتی جاتی ہے اور تم کچھ توجہ نہین کرتے۔ صحت زندگی مین سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ خدا کے لئے تم اپنی صحت کی طرف توجہ کرو" مین یہ سنکر خاموش ہوگیا میرے دل سے ایک دھوان سا اُٹھا میری آنکھین پرنم ہوگئین مین نے

کوئی جواب نہین دیا اور فوراً ہی وہان سے چلا آیا۔
دوسرے دن پھر شاہدہ نے وہی تذکرہ چھیڑا اور پوچھنے لگی "مین دیکھتی ہون کہ آپ کچھ کھوئے ہوئے سے رہتے ہین۔ اکثر مین نے محسوس کیا کہ بہت سی باتین کر گئین اور آپ خدا معلوم کہان تھے، کیا مین دریافت کر سکتی ہون کہ اس بے چینی حالی کا سبب کیا ہی شاہدہ کے اس سوال نے میرے دلمین ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ کیا شاہدہ میری محبت کا مضحکہ اُڑا رہی ہے یا وہ انتہائی ستم ظریف ہے یا وہ اس قدر خالی الذہن ہے کہ میری توجہات کو کسی اور طرف مائل سمجھکر میری رازدار بننا چاہتی ہے، میرے دلمین آیا کہ اب اپنی خاموشیون کو ختم کر دون لیکن پھر مینے ضبط کیا اور کہا شاہدہ ایسی بات کیون پوچھتی ہو جسکے جواب کے لئے تم تیار نہین ہو۔ میرا یہ فقرہ بہت مبہم تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت سے شاید کچھ سمجھا ہو مین نے اتنا اور کہا "اس قسم کا سوال خدا کیلئے مجھسے پھر نہ کرنا ورنہ خدا معلوم کس قسم کا جواب میرے منہ سے نکلے اور تم پر اوسکا کیا اثر پڑے" شاہدہ کا طرز عمل اس دوران مین کچھ عجیب طرح کا بیدردانہ اور تغافل سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے بے تکلفانہ ضرور ملتی تھی لیکن اسکے طرز عمل مین کسی قسم کا کوئی التفات نہین ظاہر ہوتا تھا اور مین اپنی محبت کے معاوضہ مین یقیناً غیر معمولی التفات کا متوقع تھا اور یہ توقع اپنی جگہ پر جائز اور درست تھی جبکہ یہی صرف میری محبت کا مقصد رہ گئی تھی۔ جب مین شاہدہ کی طرف سے بے اعتنائی اور بے التفاتی محسوس کرتا تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ میرے دل مین اسکی طرف سے بہت سے شکوے بھرے ہوئے تھے لیکن مین ان کو کبھی زبان پر نہین لایا تھا۔ شاہدہ سے اس گفتگو کے بعد مین اسکے جواب کا انتظار کئے بغیر چلا آیا اور گھنٹون اپنے کمرے مین پڑا ہوا یہ سوچتا رہا کہ آخر شاہدہ کے اس سوال کا کیا مطلب تھا۔ اور کیون وہ اپنے سوال کے جواب پر مصر تھی۔ کیا وہ مجھے موقع دے رہی ہے کہ مین دبے لفظون مین محبت کا اظہار کر دون۔ اتنے مین ایک لڑکا آیا اور اوس نے آکر کہا شاہدہ نے مجھے بلایا ہے۔ مین نے وہان پہنچکر دیکھا کہ شاہدہ نہایت خاموشی سے اپنے کمرہ مین ایک طرف بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے قریب پہنچنے پر اوس نے مجھے ایک خط دیا اور کہا "اسکو فرصت مین دیکھئے اور اسکا جواب دیجئے۔ مینے خط کو لے لیا اور اضطرابی حالت کو چھپاتے ہوئے واپس آگیا۔ انتہائی بے چینی کیساتھ مین نے اس خط کو کھولا تو یہ مضمون تھا

"آپ متعجب ہونگے کہ مین یہ خط آپ کو کیون لکھ رہی ہون مین عرصہ سے آپ کے طرز عمل کو دیکھ رہی ہون اور اسمین کچھ عجیب باتین محسوس کر رہی ہون۔ کئی بار مین نے چاہا کہ آپ کے اصلی خیالات کا کچھ اندازہ کرون لیکن مصلحتاً مین رک گئی۔ اب مین سمجھتی ہون کہ دریافت حال مین کچھ ہرج نہین ہے۔ آخر آپ اس قدر پریشان کیون رہتے ہین۔ اگر کوئی راز اس قابل ہے کہ مین اوسکی رازداری کر سکون تو مجھے اسمین شریک کیجئے۔ مین یقین دلاتی ہون کہ مین اپنی پوری کوشش آپ کی مقصد برآری مین صرف کر دونگی آپ مجھپر پورا اعتماد کیجئے۔

خط پڑھنے کے بعد مین گھنٹہ بھر تک ایک عجیب سناٹے مین رہا اور سوچتا رہا کہ مین شاہدہ کو اس خط کا کیا جواب دون میرا یہ جواب میری محبت کی تاریخ مین ایک انقلاب کرنیوالا واقعہ ہوگا کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ مین شاہدہ کو اپنی محبت کے متعلق کچھ لکھونگا لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال میرے دماغ مین آیا کہ آخر مین کیون اسپر اپنی محبت کا اظہار کرون اور اگر ایسا کرون بھی تو اسکا مقصد ظاہر ہے کہ شاہدہ اب آزاد نہین۔ اسکی جائز محبتون کا مستحق ایک شخص موجود ہے اور وہی اسکی تمام توجہات کا مرکز ہونا چاہیئے مین اس سے ضرور محبت کرتا ہون لیکن میری محبت کا یہ تقاضہ نہین ہونا چاہیئے کہ مین اسکے اظہار سے اسکی زندگی مین ذرا سا بھی انتشار پیدا کرون۔ بے غرض اور بے لوث محبت جب میرا اصول ہے تو پھر اسکی ضرورت ہی کیا ہے کہ شاہدہ بھی اس سے واقف ہو اور اسکے جواب مین اپنی محبت التفات کا اظہار کرے مین نہین چاہتا کہ شاہدہ میرے لئے اپنی فطرت سے جنگ کرے وہ اپنے شوہر کی محبت پر مطمئن ہے اور اسکو مطمئن رہنا چاہیئے اسلئے مین نے تہیہ کرلیا کہ مین اپنے خیال کی کمزوری سے مقابلہ کرونگا مین نے ایک پرچہ اسکے جواب مین لکھا۔

عزیزمن۔ میرے خیال کی پریشانیون کو پوچھکر کیا کروگی۔ مین جس حالت مین ہون اچھا ہون اسی حالت مین مجھے رہنے دو۔ کوئی ایسا معاملہ نہین جسمین تم امداد کرسکو۔ خود تمہارے طرز عمل سے مجھے کچھ غلط فہمی ہوئی تھی میرا خیال تھا تم نے میری مخلصانہ خصوصیت اور محبت کا صحیح اندازہ نہین کیا اور کسی غلط فہمی مین پڑگئین۔ اور غالباً اسیوجہ سے تمہارا برتاؤ شادی کے بعد وہ نہین رہا جسکا مین متوقع تھا۔ شاہدہ مجھے تمہارے ساتھ ابتدا سے ایک خصوصیت رہی ہے خواہ تم اسکا اعتراف کرو یا نہ کرو۔ لیکن تمہارا دل ضرور اسکو محسوس کرتا ہوگا۔ شاہدہ یقین کرو کہ حاضر وغائب وہی خصوصیت مجھکو تمہارے ساتھ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مین یہ نہین چاہتا کہ تم بھی اس کے جواب مین کسی خصوصیت کا اظہار کرو۔ بلکہ صرف یہ چاہتا ہون کہ جو طریق عمل تمہارا ابتک رہا ہے وہی قایم رکھو اور میرے مخلصانہ اُنس کو ایک منٹ کے لئے بھی دوسری نظر سے نہ دیکھو۔ تمہارے خیال مین جو یہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے اس پر مین تمہین کچھ الزام نہین دیتا۔ شادی ہونیکے بعد لڑکیون کے خیال مین بہت تبدیلیان پیدا ہوجاتی ہین اور وہ معمولی باتون کو بھی اہمیت دینے لگتی ہین شاید تم نے میرے برتاؤ کو بھی اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور اسی لئے تم نے یہ خط لکھا۔ مین اِس سے زیادہ کچھ اور لکھنا نہین چاہتا۔ تمہارا مخلص۔ ظفر۔

یہ خط مین نے شاہدہ کے پاس بھجوا دیا اور کئی روز تک مین شاہدہ کے یہان نہین گیا اور نہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس خط کا اس پر کیا اثر ہوا۔ ایک دن پھر اسکا ایک پرچہ ملا جسمین یہ عبارت تھی۔

واہ آپ مجھے تو چاہتے ہین کہ مین اپنے برتاؤ مین تبدیلی کرون اور خود اپنے برتاؤ مین تبدیلی کر رہے ہین

آخر آپنے آنا کیون چھوڑ دیا۔ کیا اس سے پہلے کوئی روز بھی ایسا گذرتا تھا جس مین آپ ہمارے یہان نہ آتے ہون، جب اخلاص ہے تو یہ فرق کیون۔ آپکے خلوص کا احساس کرتے ہوئے آپ کی منت پذیر۔ شاہدہ

اُسی روز شام کو مین شاہدہ سے ملنے گیا۔ وہ اپنے کمرے مین ایک طرف خاموش بیٹھی تھی۔ مین اُسکے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر مین اور وہ خاموش رہے۔ اسی اثنا مین مین بولنے کے لئے الفاظ کا متلاشی تھا۔ مین کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دلمین ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوتی تھی جو زبان بند کئے دیتی تھی۔ بالآخر شاہدہ نے خود ہی سکوت توڑا اور کہنے لگی "لوگون نے عورتون کو بالکل ہی بے حس سمجھ لیا" میرے دل کی حرکت اسی جملہ کو سنکر اور تیز ہوگئی اور مین انتظار کرنے لگا کہ دوسرا فقرہ شاہدہ کیا کہتی ہے مگر شاہدہ یہ کہکر خاموش ہی رہی۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی "ان کی بے حسی مین کیا شک ہے" مین نے کہا، "یہ صرف سمجھ کی غلطی ہے۔ عورتین کبھی بے حس نہین ہوتین صرف وہ اپنے احساس کے چھپانے پر قادر ہین اور مرد نہین۔ شاہدہ نے جواب دیا۔

"شاید ایسا ہو" مین نے کہا "لیکن انکا طرز عمل تو کچھ اور کہتا ہے" عورتون کے طرز عمل سے ان کے احساسات کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا نہ تجربہ کاری ہے۔ عورتون کا احساس اُن کے ظاہرا افعال سے کوئی تعلق نہین رکھتا" شاہدہ نے کہا۔

"لیکن یہ تو ایک فریب ہے" مین نے کہا۔

شاہدہ کا رنگ متغیر ہوگیا "مہربانی کرکے اس فریب دہی کی غرض بھی بتائی جائے" "محض خودداری کا اظہار اور دوسرون کے احساسات کو پامال کرنا"

مین خدا معلوم کس عالم مین یہ کہہ گیا لیکن یکایک مجھکو یہ خیال آیا کہ مجھکو شاہدہ سے اس قسم کی باتین کرنے کا کوئی حق نہین۔ مین اس اخلاقی حدود سے بھی تجاوز کر رہا ہون۔ یہ خیال کرکے مین نے فیصلہ کر لیا کہ اس ملاقات کو جلد ختم کر دون ورنہ گفتگو مین طول ہوگا۔ اور خدا معلوم مین بے اختیاری مین کیا کہہ جاؤنگا۔ میری آنکھون مین آنسو بھر آئے اور مین نے کہا "شاہدہ اس گفتگو کو ختم کرو۔ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے خیال نہ تھا کہ رفتہ رفتہ اتنا اہم پہلو اختیار کریگی۔ یہ مین ضرور کہونگا کہ جب تم کو میرے جذبات کا احساس تھا تو اسکا اظہار نہ کرنا چاہیئے تھا تم کو نہین معلوم کہ اس وقت کی مختصر گفتگو نے میری زندگی مین ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مین نہین بتا سکتی کہ میرا آئندہ طرز عمل تمہارے ساتھ کیا ہونا چاہیئے۔ میرے دماغ مین خیالات کا ایک تلاطم برپا ہے۔ شاہدہ تم ہی بتاؤ کہ آخر مین کیا کرون۔

"مین آپکا مطلب بالکل نہ سمجھی۔ آخر ہمارے طرز عمل مین فرق کیون آئے آپ پہلے ہی مجھے لکھ چکے ہین کہ ہمارے

خلوص مین فرق نہ آنا چاہیئے۔ "مین نے پہلے جو یہ لکھا تھا وہ اور جذبات خیالات کے ماتحت تھا۔ جب تک کہ مین اس نظریہ سے واقف نہ تھا کہ عورتون کے طرزِ عمل سے ان کے احساسات کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا ناتجربہ کاری ہے" اب مین اور ہی عالم مین پہنچ گیا اس لئے مین اپنی گذشتہ تحریر کو واپس لیتا ہون اور اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کرو گی اگر مین یہ کہون کہ اب ہمارا ملنا ہمیشہ کیلئے نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے سوائے بُرے نتایج کے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میرا قلب جذبات سے متاثر ہوتا جائیگا۔ اگر تم بھی اس سے متاثر ہوکر مجھپر التفات کرنے پر مجبور ہو جاؤ تو اس سے تمہارے شوہر کی بڑی حق تلفی ہوگی اور مین اسکو گوارا نہین کر سکتا۔ مجھے اجازت دو کہ مین تم سے اسوقت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤن۔ شاید تم یہ خیال کرو کہ مجھے تم سے کوئی شکایت رہیگی۔ نہین یہ تو مقدرات ہین میری قسمت مین یہی تھا کہ مین اسطرح تم سے علٰحدہ رہنے پر مجبور ہو جاؤن تم پر مین کسی طرح کا الزام نہین دیسکتا۔ مین تمہارا بدستور ہی خواہ ہونگا اور اگر کبھی تم کو ایک سچے اور ہمدرد دوست کی ضرورت پڑے تو مجھکو خط لکھنے مین تامل نکرنا۔ مین ہر ممکن طریقہ سے تمہاری امداد کو تیار رہونگا لیکن ملنا اب نہین ہو سکتا موجودہ صورت مین ہمارے لئے اِس سے بہتر اور کوئی راستہ نہین ہے کہ ہم ملنا قطعاً ترک کر دین۔

یہ کہکر مین اُن کو سلام کر کے وہان سے چلا آیا اور شاہدہ جسے یقیناً ملاقات کے اس انجام کی توقع نہ تھی خاموش کھڑی رہ گئی۔

اب مجھے شاہدہ سے ملے ہوئے کئی سال گذر گئے ہین۔ اُسکی ہستی میرے لئے خواب و خیال سے زیادہ اہمیت نہین رکھتی مین اب کبھی اسکے مکان کی طرف سے بھی نہین گذرتا کہ کہین جذبات سے مغلوب ہوکر اس سے ملنے پر مجبور نہ ہو جاؤن۔ اس عرصہ مین اس کا کوئی خط نہین آیا۔ اور نہ میرا یہ مطلب ہی تھا کہ ہم برابر خط و کتابت کرین۔

مجھے اور ذرایع سے اسکی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ اسکی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور اب اوسکی سسرال اور میکہ والے اس سے متفکر ہین۔ مین ان خبرون کو سنتا ہون اور اس کا مطلب سمجھتا ہون لیکن سوائے صبر کے اور کیا ہو سکتا ہے "

بت خانہ

شب جو ظلمت پوش ہے　　صبح در آغوش ہے　　شمع بھی خاموش ہے
کل جہاں پُر نور ہے　　حسن سے معمور ہے

اب ہے ہر شے دلکشا　　منظر راحت فزا　　شاہد فطرت نما
بزم گیتی دلچسپیان　　ہے نظر مین کل جہاں

دیکھتا ہون سر بسر　　اب منقش بام و در　　صنعت ذوق بشر
دید کے قابل مگر　　اور سب کو چھوڑ کر

بس ہے مسجد کی جگہہ　　سر زمین بت کدہ　　عاشقونکی سجدہ گہ
بزم رسم عاشقی　　رسم بزم عاشقی

شیخ سر گرم نیاز　　ہے بصد سوز و گداز　　پیش رب کارساز
لطف سے ہے ہمکنار　　دید کا ہے خواستگار

اس طرف بت خانہ مین　　کچھ طلائی مورتین　　عشق کا جو درس دین
این پرستش کے لئے　　دلفریب انداز سے

اس جگہہ اک نازنین　　دل رُبا ـ ناز آفرین　　ساری دنیا کی حسین
آئی پوجن کے لئے　　اوسکا سب سامان کئے

آنکھ ہے تفسیر حال　　رُخ پہ ہے گرد ملال　　غم کا چھپنا ہے محال
آرزو کا جوش ہے　　دل تمنا کوش ہے

لیکن اس سے بے خبر　　نازنین ہے سر بسر　　اوسمیں خود ہے جلوہ گر
پرتو نور خدا　　شاہد رنگین ادا

اور اُسکا بت کدہ　　آرزون سے بھرا　　خود ہے دل اُس دیوی کا
جس کی ہر اک آرزو　　ہے بت صد حیلہ جو

مست صہبائے طلب کر رہی ہے روز و شب وہ پرستش جس کی اب
جستجو دلین لئے آرزو دلین سئے

(ابو المعانی) بسمل بلگرامی

ناظم الملک جناب مولوی سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی منصف جیپوراسٹیٹ

مین صفحۂ جہاں پہ عبث آفریدہ ہون — کلک قضا سے نقطۂ از خود چکیدہ ہون

مین فرط اضطراب سے از خود رمیدہ ہون — برق طپیدہ و شرر بر جہیدہ ہون

ہر عیب سے بری ہون مجھے کوئی کچھ کہے — مین پاک مثل یوسف دامن دریدہ ہون

میری خوشی ہے رنج کا پہلو لئے ہوئے — مانند صبح عید گریبان دریدہ ہون

میرا وجود محض عدم ہے میرے لئے — مین ہون بھی کچھ تو اک رقم خط کشیدہ ہون

اس انجمن مین تاب نظارہ نہین مجھے — مین جلوہ گاہ طور مین ہوش پریدہ ہون

تھوڑی سی دیر کی ہے یہ میری شگفتگی — باغ جہاں مین مین گل شاخ بریدہ ہون

زاہد کو میکدہ مین کوئی پوچھتا نہین — پھر اُسپہ یہ غرور کہ مین برگزیدہ ہون

سب مجھسے بے خبر ہین میرا حال دیکھکر — گویا نوشتہ ورق آبدیدہ ہون

دشمن ہون دشمنوں کا تو ہون دوستوں کا دوست — تیغ کشیدہ اور کمان خمیدہ ہون

افتادگی نے عرش پہ پہونچا دیا مجھے — مین دیدۂ یتیم کا اشک چکیدہ ہون

دنیا مین مجھ سے کوئی نہین گوش آشنا — مضمون تازۂ سخن ناشنیدہ ہون

بحر جہان مین مجھکو ڈبوئینگے میرے اشک — مثل حباب مین ہمہ تن آبدیدہ ہون

اطہر وہ آب شباب کی رنگینیان کہان
پیری سے مین خضائی بناخن رسیدہ ہون

گذشتہ سے پیوستہ

(از جناب محمد صدیق صاحب سلم مالی گانوی)

(معاشرتی فسانہ)

(۳)

کوئی آدھی رات گذر چکی ہوگی۔ ساری کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تہا۔ خلق خدا گہری نیند مین پڑی سو رہی تھی۔ یکایک کسی آہٹ سے قدسیہ کی آنکھہ کھل گئی اُسے نیچے کے بڑے کمرے سے کسی چیز کے توڑنے کی آہستہ آہستہ آواز سنائی دیرہی تھی پہلے تو سمجھی کہ واہمہ ہے مگر جب رہ رہ کر وہی آواز آنے لگی تو اُسکے ہاتہون کے طوطے اُڑ گئے جسم مین کپکپی پڑ گئی اور خون خشک ہوکر رہ گیا۔ آہستہ سے میان کو بیدار کیا اور کانون تک منہ لیجا کر کہا۔

"جلد اُٹھئے! معلوم ہوتا ہے نیچے چور گُس آئے ہین۔ اللہ تیری امان! اب روپے نیچے کی آلماری ہی مین ہین۔" اتنا سننے کیساتھہ ہی شمّو اُٹھ بیٹھے اور دبے پاؤن زینے سے اُتر کر نیچے پہنچے لیکن چور کو شاید اونکی آہٹ لگ گئی وہ ایک دریچے کی طرف بھاگا اور شمّو کو ایک دھندلی سی تصویر دریچے سے نیچے جاتی ہوئی معلوم ہوئی "ارے حرامزادے ٹھہر!" کی خوفناک چیخ کے ساتھ وہ اُسکے پیچھے دوڑے مگر قسمت آج اون سے پوری طرح برگشتہ تھی۔ دوڑنے مین کسی چیز سے ٹھکرا کر بُری طرح گرے اور چور یہ جا وہ جا!!!

"ہائے اللہ! یہ کیا ہوگیا۔"

اوّل ترچھی روشنی کمرے مین پڑی اور پھر لالٹین ہاتھون مین لئے ہوئے قدسیہ نظر آئی اوس نے میاں کو گھٹنے پکڑے کراہتے ہوئے دیکھکر دور ہی سے مذکورہ جملہ تھرتھراتی ہوئی آواز مین ادا کیا۔

"بدمعاش کو پکڑ ہی لیا تہا مگر مین اس چھوٹے ٹیبل سے ٹھکرا کر گرا اور وہ نکل گیا۔ ہائے! ہائے اب کیا کرون گشت والے سپاہی کی آواز بھی تو سنائی نہین دیتی"

قدسیہ نے بڑھکر آلماری دیکھی تو وہ ٹوٹی ہوئی تہی اور روپے غائب تھے دماغ چکرا گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی اتنے مین

گشت والے پولس کی للکار سنائی دی۔ شمعون گرتے پڑتے دروازے تک پہنچے اور اُسے اندر بلایا۔ پولیس نے واقعات قلمبند کر لئے خوش قسمتی سے چوری گئے ہوئے روپے سو سو روپے کے نوٹ کی صورت میں تھے اور سب کے نمبر نوٹ بک میں شمعون نے درج کر لئے تھے۔ پولیس تو رخصت ہو گیا مگر قدسیہ کے حواس مجتمع نہیں ہوتے تھے۔ وہ اور ہی تھی اداس سی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ رہا تھا۔ شمعون نے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر تسکین دیتے ہوئے کہا "اب رونے دھونے سے کیا حاصل جو قسمت میں بدا تھا وہ ہو کے رہا۔ اگر قسمت پھر سیدھی ہوتی تو انشا اللہ کل چور پکڑا جائیگا!"

"اب وہ کل ہے کو ہاتھ آتا ہے، اے میرے اللہ میں کیا کروں۔ ہم تباہ ہو گئے۔ برباد ہو گئے!!!

(۴)

صبح ہوتے ہوتے تمام شہر بھر میں ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ شب میں چوروں نے اس چھوٹے سے قصبے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ ایک ہی رات میں دو جگہ نقب زنی کا حادثہ ہوا۔ شمعون کی طرح چنی لعل سیٹھ ساہوکار کی کوٹھی پر بھی اُنھوں نے دھاوا مارا۔ رات بھر تو سیٹھ صاحب خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح کو نیچے آنے تک اُنکے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی لیکن جب نیچے کے کمرے میں صبح کو آئے اور حقیقت حال پر روشنی پڑی تو چلا چلا کر زمین و آسمان ایک کر دیا ملکہ عوام میں یہ مشہور ہو گیا کہ سیٹھ صاحب غم کے مارے پاگل ہو گئے۔ کشاں کشاں یہ خبر ہمارے پریمی جوڑے کو بھی لگی"

انسان پر خواہ کتنا ہی رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر دنیا کا کاروبار بند نہیں ہوتا۔ ضروریاتِ زندگی ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں جو خواہ مخواہ انسان کو اپنے روزانہ مشاغل کی تکمیل کیطرف مائل کرتی رہتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی قدسیہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر چائے تیار کی اور جھاڑو لیکر مکان صاف کرنے لگی۔ ابھی دو چار ہی ہاتھ چلائے ہونگے کہ چھوٹی میز کے پاس اُسے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ وہ ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی۔ اُس نے حیرت و استعجاب سے انگوٹھی اُٹھالی اور میاں کو آواز دی۔ شمعون پژمردہ و ملول بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوی کی آواز پر دوڑتے آئے۔ بڑی حیرت سے انگوٹھی ہاتھ میں لی اور لگے ہیرا پھرا کر دیکھنے۔ انگوٹھی بہت خوبصورت تھی اور اسمیں بڑے بڑے پانچ روشن نگینے جڑے ہوئے تھے جنکی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ نگینوں کی درخشانی ہی اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ انگوٹھی گران قیمت ہے "کیا کچھ سمجھیں"، شمعون نے کہا "معلوم ہوتا ہے، چور پہلے گھسا سیٹھ صاحب کی حویلی میں۔ وہاں کی لوٹ میں یہ چیز اُسکے ہاتھ آئی۔ پھر ہمارے مکان میں گھسا۔ پکڑے جانیکے خوف سے جب وہ دریچے میں سے بھاگا ہے تو پریشانی میں یہ انگوٹھی اوس سے گر گئی"

قدسیہ ذرا سوچ میں پڑ گئی، اُسکے چہرے پر اُسکے دلی کیفیات ظاہر ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے

ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"میرے خیال میں ایک بات آتی ہے۔ موئے مارواڑی نے ہمارے ساتھ بڑی سختی و بے مروتی کا برتاؤ کیا اُس نے تمہاری بھی ہتک کی اور والد مرحوم کی شان میں بھی گستاخانہ الفاظ کہے۔ اُسکی یہ انگوٹھی دیکر خدا نے انتقام لینے کا اچھا موقع دیا ہے۔ اس لئے اس انگوٹھی کو فروخت کر کے اُسکا قرضہ چکا یا جائے"

شمعون قدسیہ کی طرف ایک طویل خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے، قدسیہ نے پھر کہا "اب آپ تاخیر کیوں کرتے ہیں نو کی گاڑی سے بمبئی جائیے اور محمد اکرم کی وساطت سے فروخت کرڈالئے۔ وقت بہت کم ہے جلدی کیجئے لیکن دوپہر کی گاڑی سے واپس آجانا۔ مجھے سخت انتظار رہیگا۔ پھر شام کو موئے مارواڑی کی کلھن کو روپیہ لیجا کر لگا دینا"

شمعون خموشی سے یہ سب سن رہے تھے اُن کے چہرے سے اُنکا دلی استحکام ٹپکا پڑتا تھا۔ آخر ان کی حالت متغیر ہونے لگی۔ اُنھوں نے دانتوں سے ہونٹ کو دبالیا۔ قدسیہ تو بول کر چپ ہوگئی اور میاں کا دلی منشا معلوم کرنیکے لئے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک گہری سانس لیکر شمعون نے کہا۔

"اچھا تو پھر ایسا ہی کرتا ہوں۔ اُسے بیچ ہی ڈالنا چاہیئے" اتنا کہکر شمعون نے کوٹ پہنا۔ ٹوپی اوڑھی اور انگوٹھی حفاظت سے جیب میں ڈالکر گھر سے نکل پڑے۔ جبتک شمعون نظروں سے اوجھل ہوئے۔ قدسیہ بڑی بے چینی سے ٹکٹکی لگائے دیکھا کی مگر جب وہ نظروں سے چھپ گئے تو پھر ہاتھ میں جھاڑو لی اور مکان صاف کرنا شروع کیا۔

(۵)

کہنے کو تو ع دل کے دو حرف ہیں اُدھر جدا ایک سے ایک۔ لیکن کیفیات و خصوصیات کی اوس میں ایک دنیا بستی ہے سب سے بڑا وصف اوس میں یہ ہے کہ جب کبھی انسان اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو اندر سے یہ لعنت و ملامت کرنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر انسان اپنے کئے پر دست تاسف ملتا اور افسوس کرتا ہے۔ یہی حالت قدسیہ کی بھی ہوئی۔ اُس نے جوش میں آکر اور دلی کمزوریوں سے مغلوب ہوکر شمعون کو صلاح تو دیدی مگر ابھی جھاڑو لیکر دو تین ہی ہاتھ چلائے ہونگے کہ اسکا دل اندر سے بیٹھنے لگا۔ کسی نامعلوم خطرے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ صدمے سے دماغ کی رگیں کھچنے لگیں۔ وہ اپنے اوپر ملامت کرنے لگی کہ "ہائے! ہائے! قدسیہ تجھے دنیاوی جاہ و حشمت پر اپنی سچائی کی بھینٹ چڑھادی۔ ہیرے کی چمک دمک نے تجھے کیسا اندھا کردیا کہ اپنے ساتھ اپنے عزیز شوہر کو بھی چاہ ضلالت میں گرانیکو تیار ہوگئی۔ تیری آنکھوں پر کیسے پردے پڑ گئے کہ تو حق و ناحق میں تمیز نہیں کرسکتی۔ تجھے غیروں کا مال فروخت کرنے کا کونسا حق حاصل ہے۔ افسوس صد افسوس تیری ہی تحریک نے شمعون کو انگوٹھی فروخت کرنے پر آمادہ کیا۔ تیری

ہی ملی کمزوریوں نے یہ روز بد دکھایا کہ شمعون چور اور اچکے کے نام سے بدنام ہو، چور اور اچکا، اِن الفاظ کا خیال آتے ہی قدسیہ پر ایک دیوانگی طاری ہوگئی اس نے جھپٹ کر کھونٹی سے چادر کھینچی۔ اسمیں خود کو لپیٹا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسٹیشن وہاں سے تقریباً ایک میل دور تھا اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہی ہو مگر شمعون کو بمبئی جانے سے روک لیا جائے ہائے!! ہائے قدسیہ ابھی اسٹیشن سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوگی کہ سیٹی ہوئی اور انجن دھائیں دھائیں کرتا ہوا پلیٹ فارم سے چل کھڑا ہوا۔

(۶)

کسی شاعر کا مقولہ ہے کہ ع تدبیر کے پر جلتے ہیں تقدیر کے آگے

اس مصرع کی حقیقت کو قدسیہ کل سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسٹیشن سے واپس پھری مگر اندوہ وحرمان کا بوجھ سینے پر لئے ہوئے۔ وہ چلی مگر ناکامی کی زنجیر پاؤں کو روک رہی تھی۔ وہ ایک گہری فکر میں تھی اور اُسے اس فکر میں اندیشہ۔ اندیشہ میں تشویش۔ تشویش میں افسوس۔ افسوس میں غم۔ غم میں بدنامی۔ اور بدنامی میں تباہی صاف طور سے نظر آ رہی تھی۔ اب اُس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں سچائی پر پوری طرح ثابت قدم رہونگی چاہے اسمیں میرا سارا مال و اسباب ہی کیوں نہ صرف ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ انگوٹھی فروخت کر ڈالی گئی ہوگی تو اُن کے واپس آتے ہی میں پھر اُلٹے پاؤں اُنہیں بمبئی روانہ کرونگی اور دام واپس کر کے انگوٹھی منگالونگی۔

کہنے کو تو ایک میل کی مسافت کچھ بہت زیادہ نہیں مگر اسکی اہمیت کا کچھ وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن پر کبھی ایسا حادثہ گذرا ہو۔ خدا خدا کر کے قدسیہ مکان کے قریب پہنچی۔ نظر دوڑائی تو دروازہ چوپٹ دکھائی دیا۔ دل اُچھل کر گلے میں آ لگا "ہا اللہ! قسمت کیوں میرے پیچھے اسطرح ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ چوروں نے کہیں پھر تو ہاتھ صاف نہیں کیا۔ میری کیسی کمبختی کہ گھبراہٹ میں دروازہ بند کرنا بھول گئی"۔

اندر قدم رکھا تو حیرت واستعجاب نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ میاں کو غور و فکر میں سر جھکائے کرسی پر پایا۔ بے تحاشہ دوڑ کر لپٹ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"بڑی خیریت گذری کہ آپ بمبئی نہ گئے ورنہ مجھ کمبخت نے آپکو برباد ہی کر دیا تھا۔ آپکے جانے کے تھوڑی دیر ہی بعد میں بھی جھپٹ کر اسٹیشن پہنچی مگر گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ میری ہی کیسی عقل ماری گئی تھی جو میں نے آپکو یہ صلاح دی۔"

بیوی کو تھپک کر شمعون نے تسکین آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ تم نے فوری جوش میں یہ صلاح دیدی مگر مجھے تمہاری طبیعت کے حقیقی رجحان کی خبر تھی اور میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا

کہ تم بعد میں ٹھنڈے دل سے غور کروگی تو ضرور اپنے کئے پہ پچھتاؤگی۔ لہذا میں اسٹیشن پر نہ جاتے ہوئے سیدھا چمنی لال کے مکان پر پہنچا"

"تو کیا انگوٹھی اوسی کی تھی" قدسیہ نے مستفسرانہ نگاہ ڈالکر کہا۔

شمعون نے ذرا ہنستے ہوئے جواب دیا" ہاں تھی تو اوسی کی مگر یہ ظالم ساہوکار بھی کیسے سنگدل ہوتے ہیں۔ انگوٹھی دیکھتے ہی ہاتھ بڑہاکر مجھ سے لے لی اور شکریہ وغیرہ تو درکنار مجھے لگا دیکھنے مشکوک نگاہوں سے۔ یہ ہے دنیا اور دنیا کا انصاف۔ نالایقوں کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے" یہ کہتے کہتے شمعون کا چہرہ غصّے سے قدرے تمتما اوٹھا اس پر قدسیہ کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ قدسیہ اوٹ میں ہوگئی اور شمعون نے باہر آکر جو دیکھا تو سیٹھ چمنی لال تھے۔ بڑی آؤ بھگت سے اندر لاکر ایک کرسی پر جگہ دی۔ دوسری کرسی پر خود بیٹھے اور کہنے لگے

"کہئے سیٹھ صاحب کیسے تکلیف فرمائی۔

"میں اپنے برتاؤ پر نادم ہوں اور تم دونوں سے معافی مانگنے آیا ہوں" سیٹھ صاحب نے ذرا خجالت آمیز لہجے میں کہا

"صاحب! آپ تو ناحق ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں"

"نہیں نہیں! تم دونوں کے مراتب حقوق سے آشنا ہوکر بھی میں نے آجتک سختی کا برتاؤ قایم رکھا۔ سیٹھ عبدالرحیم میرے دوست تھے اور دوست بھی کیسے محسن و مخلص۔ اِس لحاظ سے تم دونوں میرے بچوں کے برابر ہو لیکن میری آنکھوں پر غفلت کے ایسے پردے پڑ گئے کہ میں نے اُن قدیم تعلقات کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔ کیا کروں جب سے میری بیوی نے داغ مفارقت دیا ہے اُسوقت سے میری یہ حالت ہوگئی ہے ورنہ میں اتنا سنگدل نہ تھا" سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے:

"لیکن ہم آپکے اس برتاؤ سے . . . .

سیٹھ صاحب نے بات کاٹ کر کہا جسے یہ تیرا انکسار ہے خاکساری ہے۔ شرافت ہے۔ اِس انگوٹھی کی کیا قیمت ہے۔ اس کا اندازہ تو نہیں کر سکتا۔ ہیروں کی قیمت تو آٹھ دس ہزار سے زائد نہیں لیکن ایک خاص لحاظ سے وہ میرے لئے انمول ہے جسکی حقیقت کو اسوقت واضح کردینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

"میری بیوی خدا اُسے جنت نصیب کرے ہمیشہ تصویریں کھچوانیکے خلاف تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ فوٹوگرافر اپنا ساز و سامان لیکر آگیا ہے مگر وہ بیچاری اپنی ضد پر قایم۔ مجبوراً اُسے واپس جانا پڑا لیکن انتقال سے پہلے یکا یک اوسکی طبیعت میں کسطرح انقلاب پیدا ہوگیا۔ ایکروز اُس نے خود ہی یہ ذکر چھیڑا کہ اگرچہ میں تصویریں کھنچوانے کی مخالف رہی ہوں مگر اب میری

یہ خواہش ہے کہ آپ اور مین ایک ساتھ بیٹھکر تصویر کھنچوائین مجھے یہ سنکر بہت مسرت ہوئی چنانچہ دوسرے ہی روز ایک مشہور مصور سے ہم نے تصویر کھنچوائی۔ میری اہلیہ نے اُس تصویر کو ولایت بھجوا دیا تاکہ اوسکی نہایت ہی چھوٹی کاپی بناکر انگوٹھی مین بٹھا دی جائے اور اُس پر لینس جڑ دیا جائے۔ تھوڑے ہی دنوں مین یہ انگوٹھی حسب مرضی تیار ہوکے آگئی۔ میری اہلیہ نے تصویر کی جملہ کا بیان ضایع کر دیں اور انگوٹھی میرے ہاتھوں مین پہناتے ہوئے کہنے لگی کہ میری یہ مین خواہش ہے کہ میرے بعد میری ایک ہی تصویر ہو اور وہ ہمیشہ آپکے پیش نظر رہے "

اتنا کہکر سیٹھ جی نے انگوٹھی شمعون کی طرف بڑھا دی۔ شمعون نے دیکھا تو واقعی نگینون کے مقابل ایک بہت ہی باریک لینس جڑا ہوا تھا اور اوسمین سیٹھ صاحب اور اُن کی اہلیہ کی تصویر نمایان طور سے نظر آ رہی تھی۔

سیٹھ صاحب نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ یہ انگوٹھی ہمیشہ میری اُنگلیون مین رہتی تھی لیکن کل غلطی سے مین نے میز پر رکھدی اور بھول گیا پھر طرفہ یہ کہ کل ہی چورون کے ہاتھ لگ گئی۔ مین آپ دونون کا بڑا احسانمند ہون کہ آپکی وساطت سے میری یہ عزیز و گران بہا چیز واپس مل گئی لیکن مین بڑا ہی بیوقوف ہون کہ آپکا احسان ماننے کے بجائے مین سختی اور نفرت سے پیش آیا "

قدسیہ یہ گفتگو پردے کی آڑ مین کھڑی سن رہی تھی اُس نے کہا "سیٹھ صاحب آپ صرف انکا احسان مانئے مجھ کمبخت نے تو حرص و ہوا کے جال مین پھنس کر کچھ اور ہی ارادہ کر لیا تھا " اتنا کہکر اُس نے تمام واقعہ مختصراً کہہ سنایا۔

سیٹھ صاحب نے مسرت آمیز لہجے مین کہا۔ بچی! اسی سے تیرے شوہر کی اصلی شرافت ظاہر ہوتی ہے۔ تیرے شوہر نے بیان کیا تھا کہ تیری ہی وجہ سے وہ حرص و ہوا کا شکار ہوا۔

یہ سنکر قدسیہ کو اپنے شوہر کی اس انتہائی محبت کا احساس پیدا ہوا اور اوسکی آنکھون مین آنسو بھر آئے۔ سیٹھ صاحب نے پھر کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم میرے روپے ادا کرنیکی فکر مین ہو۔ اور اُسکا بھی مجھے احساس ہے کہ تم یہ روپے سخت مشکلات و مصائب کا مقابلہ کر کے فراہم کروگے کیونکہ تمہاری حیثیت و طاقت کا مجھے کافی علم ہے لہذا اب مین وہ روپے معاف کرتا ہون مسٹر شمعون! آپ میرے ہمراہ کوٹھی پر چلکر رہن نامہ بھی چاک کر لیجئے۔ اس مین ذرا بھی تاخیر نہو کیونکہ مین آخر بنیا ہون میری نیت کب بدل جائیگی اسکا یقین نہین۔

یہ سنکر قدسیہ اور شمعون کی آنکھون مین اشکِ مسرت بھر آئے۔ شمعون نے احسانمندانہ انداز مین کہا! سیٹھ صاحب ہم آپکے اس احسان . . . . جنی لال سیٹھ نے بات کاٹکر کہا "میرا احسان ماننے کی کوئی ضرورت نہین۔ احسان تو ایک اللہ کا مانئے جسکی ہدایت کیوجہ سے مین نے لالچ سے اور تم نے حرص سے نجات پائی۔ میری دعا ہے کہ ایشور تمہارے سنسار کو

کی نوکا کو اس جیوت مہا ساگر مین منزل مقصود پر پہنچائے۔
چنانچہ مسٹر شمعون سیٹھ صاحب کیا تھا اُن کی کوٹھی پہ گئے جنی لعل سیٹھ نے مہربانی کرکے رہن نامہ چاک کر دیا
تقدیر جب سیدہی ہوجاتی ہے تو تدبیر منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دوسرے ہی روز تھانہ دار کی طرف سے اطلاع
ملی کہ چور نوٹ بھناتے ہوئے گرفتار ہوا ہے۔ چنانچہ چوری گئے ہوئے ڈھائی ہزار روپے بھی بلا وقت واپس مل گئے

(ماخوذ)

جمالِ تجمل

از مولانا تجمل حسین صاحب چشتی قادری مدظلہ

عشق جانان سے فقط دل ہی نہین ممتاز ہے ۔۔۔ چشم مشتاق تجلی۔ گوش بآواز ہے
روز امل سے جو اپنے گوش زد آواز ہے ۔۔۔ وہ صدائے روح پرور نغمۂ دمساز ہے
کیا مرا خورشید رو سرگرم کبر و ناز ہے ۔۔۔ شعلہ افشان ہے ادا تو برق پاش انداز ہے
جلوہ وہ دیکھا ہے جس کو کر نہین سکتا بیان ۔۔۔ اک خموشی میری گویا کاشف صد راز ہے
جُرم تیرے ہین جو بیحد رحمت اوسکی بے شمار ۔۔۔ باز آعصیاں سے غافل باب رحمت باز ہے
جس کو ہے تجھسے تعلق مین ہون اُسکا ہم خیال ۔۔۔ جو ہے تیرا چاہنے والا مرا ہم راز ہے
شوق آزادی قفس مین کر رہا ہے بے قرار ۔۔۔ اُڑ نہین سکتا ہون لیکن حسرتِ پرواز ہے
لیلیٰ و مجنون کا افسانہ جو ہے مقبول دہر ۔۔۔ حسن کا یہ اک کرشمہ عشق کا اعجاز ہے
جان نثاری جسکی ہو تیری نگاہون مین وقیع ۔۔۔ واقعی وہ خوش مقدر عاشق جانباز ہے
ذکر ہجر و وصل ہے اک کارآمد فلسفہ ۔۔۔ اسمین مرگ و زیست کا عاشق کے مضمر راز ہے

بڑھ رہی ہے عمر میری آرزوئے قتل مین
اے تجمل ربط شمشیر و دم دمساز ہے

انصاف اندھا ہوسکتا ہے لیکن روپیہ گونگا نہیں ہے

(از جناب قاضی نصیح الدین احمد صاحب صدیقی۔ متعلم بی۔ اے۔ عثمانیہ)

تھامس گارڈن مانچسٹر کے بہت بڑے اور متمول سوداگر نے ایک مرتبہ نہایت خوفناک اور ظالمانہ قتل کیا۔

(مین نہین سمجھتا کہ کس قسم کا قتل عمدہ اور شریفانہ قتل خیال کیا جاتا ہے)

تھامس گارڈن اُسوقت گرفتار ہوا جبکہ اُسکے ہاتھ خون سے سرخ تھے۔ پولیس نے اُسکا بیان قبول نہ کیا (اگرچہ ایک ہزار پونڈ کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی) کہ اوس کے ہاتھون کی سُرخی سوائے گہرے سُرخ رنگ کے اور کچھ نہین تھی اور فوراً مقامی منصف کے اجلاس پر جو ایک دیرینہ تھا پیش کیا گیا۔ بغیر متاثر ہوئے منصف نے اسکا تمام قصہ سننے کے بعد اس کو قتل کا ملزم قرار دیکے مقدمہ عدالت العالیہ بھجوا دیا۔

اوسکا وکیل (جو اپنا محنتانہ پورا وصول کر چکا تھا) اس سے ملنے کے لئے حوالات کے تاریک کمرے مین گیا جہان یہ زیر حراست تھا۔ تھامس گارڈن نے اس سے دریافت کیا کہ اوسکے بچنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے وکیل نے ناامیدی سے سر ہلایا۔

"تمہارے بچنے کی ترکیب"، وکیل نے آہ بھر کر کہا "اسقدر کمزور ہے کہ اگر ایک ممبر کا پیر اس کے برابر رکھدیا جائے تو یہ پیر ایک بلند اور عظیم الشان پہاڑ نظر آئیگا"

یہ سنکر تھامس گارڈن نے ہر ایک کو جو اس مقدمہ سے تعلق رکھتا تھا بُرا بھلا کہنا شروع کیا حتیٰ کہ مقتول کو بھی اُس نے گالیاں دین کہ وہ کسقدر جنونی تھا کہ بغیر تکلیف دئے تلوار سے سر جدا کرنیکے بعد بھی مرگیا اور پولیس اور مقامی منصف کو کہ اُنہون نے اُسکی بے گناہی پر یقین کرنے سے انکار کیا اور اپنے وکیل کو کہ وہ کیون پہلی ہی سماعت مین جرم سے بری کرنے مین ناکام رہا۔

"کیا مین نے پہلے ہی تمہارا محنتانہ ادا نہین کیا؟" ملزم نے پوچھا "تم اسی وجہ سے بے فکر ہو۔ مین بیوقوف تھا جو تم کو پہلے ہی ادا کر دیا"

"لیکن مسٹر گارڈن"، وکیل نے جواب دیا "اگر مقدمہ اسقدر کمزور اور خوفناک نہوتا تو مین کبھی محنتانہ پہلے سے وصول نہ کرتا اگر تم کو سولی دیجائے تو مجھے کون محنتانہ ادا کریگا؟"

یہ سنکر تھامس گارڈن کا خون رگون مین منجمد ہوگیا اور پیشانی پر پسینہ کے سرد قطرے نمودار ہو گئے۔ عالم دیوانگی مین وہ اپنے وکیل کی طرف لپکا۔

"کیا مین نے تم کو اسی لئے محنتانہ دیا ہے کہ تم مجھکو میری موت کی خبر سناؤ؟" ملزم نے جوش سے پوچھا "نکل جا! دور ہو۔ کٹہرے مین خود اپنی وکالت آپ کرونگا"

افسردگی کیساتھ پھولون کی چادر بچھانے کا وعدہ کرتے ہوئے وکیل روانہ ہوگیا

✣ ✣ ✣

حوالات کا محافظ جو اس گفتگو کو سُن چکا تھا دوپہر کے وقت اس دولتمند ملزم کا کھانا لیکر داخل ہوا اور تھامس گارڈن سے مخاطب ہوکر کہا "سنو آج صبح بازار مین مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر وان ڈنکل کی تمہارے مقدمہ مین جوری کے صدر ہونیوالے ہین"

"اسلئے" تھامس گارڈن نے کہا "تم اُس آدمی کو کسی طرح میرے پاس لے آؤ مین تمکو ایک سَو پونڈ دونگا۔

"دوسو پونڈ ——— کیونکہ یہ بہت مشکل کام ہے"

تھامس گارڈن راضی ہوگیا۔ سہ پہر کے وقت حوالات کا محافظ مسٹر وان ڈنکل کو حوالات کے کمرے مین میلے کپڑون کے گٹھے کی صورت مین داخل کیا اور اوسکو ملزم سے بات کرنیکے لئے چھوڑ دیا"

تھامس گارڈن نے اپنے ملاقاتی کو کمرہ مین ایکطرف لیجاکر پوچھا "کیا تم کل جوری کے صدر ہونیوالے ہو؟"

وان ڈنکل نے سر کو جھکا کر اثبات مین جواب دیا "یہ عظیم الشان ذمہ داری میری کمزور گردن پر رکھی گئی ہے"

وان ڈنکل نے خاکسارانہ لہجہ مین کہا۔

"سنئے مسٹر وان ڈنکل" سوداگر نے کہا "اگر تم میری جگہ ہوتے اور مین تمہاری اور تم مجھ سے اپنی زندگی بچانیکی درخواست کرتے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ مین اُسکو سننے کیلئے اپنا بہرہ کان پیش کرتا؟"

"میرا بہرہ کان اب تمہاری طرف ہے" وان ڈنکل نے جوابدیا "لیکن یہہ کان بہت بڑی رقم کی آواز سُن سکتا ہے" "کیا پانچسو پونڈ کی؟"

"اتنی رقم بہت کم آواز کرتی ہے"

"کیا ایک ہزار پونڈ کی؟"

"شاید مین انکی آواز کو سن سکون" وان ڈنکل نے کہا "لیکن یاد رکھو ہم بارہ آدمی ہین باقی گیارہ بھی اسیطرح کم سنتے ہین" وہ بھی اتنی ہی آواز سنین گے" تھامس گارڈن نے جوابدیا "اب پھر سنئے تم اور تم مین سے ہر ایک کو

مین ایک ایک ہزار پونڈ دونگا اگر تم میرے خلاف قتل کے جرم کی جرم کی بجائے مردم کشی کے جرم کا فیصلہ کرو"
وان ونکل نے ناک پر ہاتھ پھیرا۔

"مسٹر گارڈن تم وعدہ کرتے ہو" اس نے کہا "لیکن ہم کو کسطرح یقین ہو کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے تم بُرا نہ مانو مین تم پر اعتبار کرتا ہوں اور بہت زیادہ لیکن دوسرے ـــــ وہ کتنے کسی پر اعتماد نہین کرتے وہ ضرور تمہارا تحریری معاہدہ لینگے"

"تب تو گارڈن نے کہا "وہ تحریری لے سکتے ہین" فوراً قلم اور دوات لیکر اس نے دستاویز لکھدی اور ایک آہ کے ساتھ مسٹر وان ونکل کے ہاتھ مین دیدیا۔

"یہ معاہدہ ہے" وان ونکل نے کہا "مین اپنا وعدہ پورا کرونگا اور تم بھی اپنا ضرور پورا کرنا"

✤ ✤ ✤

مقدمہ کی سماعت تمام دن ہوتی رہی اور روئداد تھامس گارڈن کے بالکل خلاف پائی گئی جو نہایت متفکرانہ اور پریشان نظروں سے جوری کے ارکان کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ کمرہ عدالت سے باہر فیصلہ پر غور کرنیکے لئے نکل رہے تھے۔

اس کا دل کانپ رہا تھا جب وہ واپس ہوئے۔ کیا وہ اپنے وعدہ پر قایم رہین گے ؟۔

صدر جوری مسٹر وان ونکل فیصلہ سنانے کھڑا ہوا "جوری نے" اس نے کہا "مجرم کو مردم کشی کا ملزم قرار دیا ہے۔ تھامس گارڈن خوشی سے اچھل پڑا اور اسکا دل بے انتہا خوش ہو گیا حتی کہ اس خوشی کو دس سال قید کی سزا کا حکم بھی دبا نہ سکا قید موت سے بدرجہا بہتر ہے .... دس سال بہت جلد ختم ہو جائینگے۔

وہ نہایت بشاش تھا جب وان ونکل اسکے پاس حوالات کے تاریک کمرے مین معاہدہ کی تکمیل کیلئے پہنچا اُسنے ہنستے ہوئے اپنے خزانچی کے نام حکم لکھا کہ ارکان جوری مین سے ہر ایک کو ایک ایک ہزار پونڈ کی رقم دیجائے وان ونکل کو کاغذ دیتے ہوئے گارڈن نے پوچھا

"مسٹر وان وان ونکل تم نے وعدہ پورا کرکے مجھپر بڑا احسان کیا کہئے ارکان جوری کو قتل کے فیصلہ کی بجائے مردم کشی کا فیصلہ کرنیکے لئے راضی کرنے مین تمکو کچھ زیادہ تکلیف و دقت اٹھانی پڑی"

"جی ہاں بہت زیادہ" وان ونکل نے جوابدیا "لیکن مینے انکو یاد دلایا کہ ہمکو معاہدہ کی پوری پابندی کرنی چاہئے"

تھامس گارڈن نے مسکرا کر کہا "تم نے بہت خوب کہا لیکن تمکو یہ دقت کیون محسوس ہوئی"

"اسلئے" وان ونکل نے کہا "کہ وہ تمام کے تمام چاہتے تھے کہ تمکو بالکل بری کردین اور کسی قسم کا الزام ہی نہ لگائین"

رازِ عاشقی

فطرت مین حسن کی ہے ——— اک شان نازپنہان
گلہائے نازسے ہے ——— یون حسن گل بداما ن
جیسے کہ شاخ گل کی
پھولون سے لدرہی ہو

بے نازحسن گویا ——— پژمردہ اک کلی ہے
کھلنے سے قبل جوکہ ——— افسردہ ہوچکی ہے
ہے رنگ اوس کے رخ پر
لیکن بہت ہی پھیکا

حرفِ نیاز ہونا ——— ہے شانِ عشق رسوا
لازم ہے اوس کو ہردم ——— ہرنازحسن اٹھانا
بے جاہو یابجاہو
جائز ہونا رواہو

بے نازحسن اٹھائے ——— یہ حال عشق کا ہے
جیسی ہوس پرستی ——— بے جا و ناروا ہے
شان نیازمندی
ہے روح عاشقی کی

جور وجفا کا شکوہ ——— ظلم وستم کا رونا
سوچو تواپنے دل مین ——— عاشق کو ہے یہ زیبا
کس منہ سے پھر شکایت
کرتے ہو تم کسی کی

سمجے جناب نیّر یہ راز عاشقی ہے
یعنی نیاز مندی عاشق کی زندگی ہے
اب سے کسی حسین کا
شکوہ کبھی نہ کرتا (مصطفےٰ حسین نیّر کانپوری)

قابلیت دماغی اور محنت جسمانی

جناب مرزا شکور بیگ صاحب متعلم عثمانیہ کالج

دنیا مین بعض کام ایسے ہین جو جسم کے پٹھون کی مدد سے انجام پاتے ہین- اور بعض ایسے ہین جنکو انجام دینے کے لئے ہمین دماغی قوتون سے کام لینا پڑتا ہے، یہ جاننے کے باوجود بھی ہم کام کی تفریق نہین کرسکتے اسلئے کہ دنیا کے کسی کام کو لیجئے خواہ ادنےٰ ہو یا اعلےٰ انجام دینے کیلئے ہمین پٹھون اور دماغ دونون سے کام لینا پڑتا ہے، ہان یہ بات ضرور ہے کہ بعض کامون مین ہمین دماغ سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور بعض مین جسم کے پٹھون کا یا جسمانی محنت کا نمایان حصہ رہتا ہے- ایک قلی کو دیکھئے جو اسٹیشن پر بوجھ اُٹھاتا رہتا ہے- بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے پیشے کیلئے صرف جسمانی محنت کی ضرورت ہے اور اسے دماغ سے کبھی کام لینا ہی نہین پڑتا لیکن اگر اسکا دماغ خراب ہوتا تو یہ کسطرح ممکن تھا کہ وہ سامان کھینچ کر اُسی جگہہ رکھتا جس جگہہ اُسکو رکھنے کا حکم دیا گیا تھا- دوسری طرف طبیب- وکیل جیسے لوگ ہین جو اپنا کام دماغ سے لیتے ہین مگر انھین بھی جسمانی پٹھون سے یقینی کام لینا ہوتا ہے البتہ نمایان حصہ دماغی محنت کا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جسمانی پٹھے اور دماغی قوتین دونون مل جلکر کسی کام کو پورا کرتے ہین عربی مین ایک ضرب المثل ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ عقل سلیم تندرست جسم مین پائی جاتی ہے- جہانتک ہمارے ناچیز خیالات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہین کہ اسکا منشا ہرگز یہ نہین کہ ہم دماغی قابلیت کی ترقی کو بالکل ہی نظرانداز کردین اور صرف جسمانی صحت کی طرف اپنی کوشش لگادین محض اس اُمید پر کہ جیسا جیسا ہمارا جسم تندرست وقوی ہوتا جائیگا ہماری عقل بڑھتی جائیگی- اگر واقعی ایسا ہوتا تو آج دنیا کے بڑے بڑے طاقتور پہلوان مشہور عقلاء بھی ملنے جاتے۔

صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص کو خدائے تعالےٰ نے کچھ نہ کچھ دماغی قابلیت عطا فرمائی ہے اگر اسمین انسان کوشش کرکے ترقی کرجائے تو کرسکتا ہے لیکن اگر اس جانب توجہ نہ کرے اور صرف جسمانی صحت کی طرف لگا رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

قدرت کی عطا کی ہوئی دماغی قابلیتیں بالکل مردہ ہوجاتی ہیں۔کیونکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ جس عضو کو قدرت نے جس کام کیلئے مقرر کیا ہے اگر اس سے وہ کام نہ لیا جائے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بالکل ناکارہ ہوجاتا ہے، چنانچہ اکثر ڈاکٹروں نے ایسے تجربے کئے۔مثلاً ایک ڈاکٹر نے ایک شخص کو آنکھوں پر پٹی باندہ کر ایک اندہیری کوٹھری میں بٹھا دیا۔تھوڑے دنوں بعد جب اُسے نکالا گیا تو اوسکی بینائی میں فرق آنے لگ گیا تھا۔ڈاکٹر موصوف نے اس تجربے سے یہ بات بیان کی کہ اور تھوڑے دنوں اگر اس شخص کو اسی طرح رکھا جاتا تو وہ بالکل ہی اندہا ہوجاتا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ جب ہم دماغی قابلیتوں سے بھی کام نہ لیں اور انہیں ترقی دینے کی کوشش نکریں تو وہ قدرت کی عطا کی ہوئی دماغی قابلیتیں ناکارہ اور مردہ ہوجاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ دماغی قابلیت کیلئے جسمانی صحت کی کس حد تک ضرورت ہے۔کسی کا کیا اچھا قول ہے کہ جسمانی صحت کو نظرانداز کرکے صرف دماغی قابلیت بڑہاتے جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں سونیکی اینٹوں کا بھرنا۔جب ان اینٹوں کا وزن کشتی کی قوت برداشت سے بڑہ جائیگا تو نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کشتی نہ صرف خود ڈوبے گی بلکہ اپنے ساتھ سونیکی اینٹوں کو بھی سمندر کی تہ میں لیجائیگی۔ہمارا جسم کشتی ہے دماغی قابلیتیں سونیکی اینٹیں ہیں جب سونیکی اینٹوں کا وزن جسم کی کشتی کی قوت برداشت سے بڑہ جائیگا تو یہ کشتی بھی اپنے ساتھ ان دماغی قابلیتوں کو فنا کے سمندر کی تہ میں لیتی جائیگی۔

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دماغی قابلیت کیلئے جسمانی صحت کی ضرورت ہے بلکہ اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس حد تک ضرورت ہے، اگر ہم کشتی کو مضبوط بنانا نہ چاہیں تو بہترین طریقہ یہی ہے کہ اینٹیں اتنی ہی بھری جائیں جتنی اوسکو ڈوبنے سے محفوظ رکھیں۔اگر اینٹوں میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو پہلے کشتی کی مضبوطی کی سخت ضرورت ہے بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ کشتی کی قوت برداشت اینٹوں کے وزن سے کچھ زیادہ ہی ہونی چاہئے

تاریخ کی ورق گردانی کیجائے تو ایسے لوگوں کی مثالیں بھی ملیں گی جنکی صحت جسمانی تو خراب تھی لیکن پھر بھی اپنی دماغی قابلیت سے ان لوگوں نے وہ کام کئے جنکی وجہ سے انکا نام ابتک صفحۂ ہستی سے نہ مٹ سکا۔مذکورہ بالا جملہ کی صداقت میں کوئی کلام نہیں۔اسوقت بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بالکل نحیف ولاغر ہیں لیکن دماغی قابلیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ اسکے متعلق ہم یہ عرض کریں گے کہ گھوڑے کی کمزوری کا اثر سوار پر بھی پڑتا ہے، مانا کہ آپ ایک اچھے شہسوار ہیں۔فن شہسواری کے ماہر ہیں لیکن اگر آپ کو ایک کمزور یا مریل گھوڑا

دیدیا جاتے توکیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے شہسواری کے کرتب بحسن وخوبی دکھا سکین اگر آپنے کچہ کرتب کھا بھی دئے تو یقینی وہ آپسے نفیس کرتب نہونگے جیسے کہ اس صورت مین ہوتے جیسا کہ آپکا گھوڑا بھی قوی اور جاندار ہوتا۔ پس جن لوگون نے باوجود اپنی جسمانی کمزوری کے ملک وقوم کی خدمت کی تو انکی مثال اوسی شہسوار کی سی ہوگی جسنے ایک کمزور گھوڑے پر شہسواری کے کرتب دکھائے، اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ دماغی قابلیت کے ساتھ اگر انکی جسمانی صحت بھی اچھی ہوے تو یقینی وہ اور زیادہ ملک وقوم کی خدمت کر سکتے اور موجودہ شہرت سے کہین زیادہ شہرت حاصل کرتے۔

اگر کوئی شخص گھوڑ دوڑ مین اول آنا چاہے تو نہ صرف اِس بات کی ضرورت ہے کہ وہ پکا سوار ہو بلکہ لازم ہے کہ اس کا گھوڑا بھی قوی اور جاندار ہو۔ بلکہ بعض دفعہ یہ دیکھا گیا ہے کہ سوار تو ویسا پکا نہین ہوتا مگر اوس کے گھوڑے جاندار ہونیکی وجہ سے کامیابی کا سہرا اوسی کے سر رہتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصلی چیز جسمانی صحت ہے مگر مشاہدہ بتلا رہا ہے کہ فی زمانہ جسمانی صحت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کے نتائج صاف ظاہر ہین جن کے اظہار کی چندان ضرورت نہین کیسی عجیب بات ہے کہ ہر شخص کی نظرین صرف علم کی عمارت کی بلندی اور وسعت پر لگی ہوئی ہین لیکن کوئی اس پر غور نہین کرتا کہ اتنی شاندار عمارت جو قایم کیجا رہی ہے آیا اوس کے پایہ یا بنیاد مین اپنی صلاحیت بھی ہے کہ اسے سنبھال سکے۔ ہم نے جو اپنی تمام توجہ جسمانی صحت کو نظر انداز کر کے دماغی قابلیت کے بڑہانے مین مبذول کر دی ہے تو سمجھ جائے کہ ہم علم کی عمارت بنیاد ریت پر جا رہے ہین۔ ظاہر ہے کہ ایسی عمارت ہرگز دیرپا نہین ہو سکتی آخر نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ عمارت بھی گرے گی اور اوس پر جو کچہ روپیہ لگایا گیا وہ بھی خاک مین ملجائیگا۔

از حضرت کیف مراد آبادی

میری روح اس جسد خاکی مین بے چین ہے، وہ عالم بالا سے آزادی کے ترانے گاتی ہوئی آئی تھی لیکن یہان جسم مین آکر مقید ہوگئی۔ اسکے یہان آنیکا سبب بھی اضطراب تھا اور اسکی موجودہ پریشانیون کا راز بھی اضطراب ہے، وہ مضطرب ہے اور بےطرح مضطرب وہ بے چین ہے اور بہت بے چین۔

میری روح اسلئے مضطرب رہتی ہے کہ اُسے سکون کی تلاش ہے اور سکون بھی وہ سکون جو حصول مقصد کے بعد پیدا ہوتا ہے، سکون کی تلاش مین مختلف عالمون مین۔ مختلف دنیاؤن مین۔ مختلف جہانون مین تبدیل ہیئت کرکے جاتی ہے اس عالم جسد جسد مین آنیکا سبب یہی تلاش تھی۔

لے اس عالم مین بھی مگر سکون میسر نہین ہوا اور اسلئے بےچین ہے، میرا جسم کبھی گلستانون مین جاتا ہے کبھی ویرانون مین کبھی پہاڑون کے دامنون مین اور کبھی دریاؤن کے کنارے پہ یعنی میری روح اس عالم کے گوشہ گوشہ مین سکون کی تلاش مین لے پہنچاتی ہے۔ مگر سکون نہین ملتا۔

میری روح اکدن یہ یقین کرکے کہ اس عالم مین بھی اس کا مقصد حاصل نہین ہوا میرے جسم خاکی سے تڑپکر نکلجائیگی۔ تڑپکر نکلجائیگی سکون کی تلاش مین۔ وہ اور زمین ڈھونڈیگی اور آسمان تلاش کریگی اور شکل بدلیگی ـــــ اپنے مقصد کو حاصل کرنیکے لئے،

میری روح کا مقصد کیا ہے۔ محبت کی تکمیل۔ وہ عالم بالا مین تھی تو اُسنے وہان کی فضا کے ذرہ ذرہ مین محبت کی روح پھونکدی۔ وہ اس عالم مین آئی تو اس نے یہان کی ہر شے مین محبت کے نغمے بھردئے۔ بلبل کی صدائین کوئل کی آواز پپیے کی پی کہان قمری کی کوکو۔ پہاڑون کی ہوائین۔ دریاؤن کے شور۔ چاند کی کشش۔ سمندر کا مدوجزر۔ پھولون کی شگفتگی۔ سبزہ کا لہلہانا۔ سب محبت کے شعلے ہین جو ہر شے مین میری روح نے دوڑا دئے ہین لیکن آہ وہ خود بےچین تھی اور اس نے سبکو بےچین کردیا۔ وہ جہان جاتی ہے، یہی تجلیان کونداتی چلی جاتی ہین۔

میری روح جب اس منزل مین اپنے مقصد کو نہ پاکر میرے جسم سے پرواز کرجائیگی تو یہ عالم محسوس کرے گا کہ اسکے اندر سے کوئی چیز کھوگئی ہے کیونکہ جن عالمونکو وہ چھوڑتی چلی آئی ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہین میری روح پھر عالم بالا کی طرف پرواز کرے گی۔ سکون کی تلاش مین اور پھر محبت کی چنگاریان ایک اور عالم کے درون

مین پیوست ہونگی۔۔۔

میری روح کیا چاہتی ہے۔ محبت کی تکمیل۔ محبت حسن حقیقی کی۔ محبت اوسکی جس کو میری روح نے ایکبار اچانک دیکھا تھا اور پھر وہ اوسکی نگاہون سے پوشیدہ ہوگیا۔

میری روح کو جس حقیقی کی تلاش ہے وہ تمام امکانی عالمون کے ذرہ ذرہ کو اوس کی تلاش مین سرگردان دیکھنا چاہتا ہے۔

حسن حقیقی میری روح کی بے چینیان دیکھہ رہا ہے، میری روح سے پوشیدہ رہکر وہ چاہتا ہے کہ میری روح اضطراب کی تکمیل کرے تاکہ اس مین حال مقصد ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

میری روح ایک دن اضطراب کی تکمیل کرے گی۔ پھر حسن حقیقی کی کشش تمام عالمون کو کھینچ کر ایک جگہہ جمع کردے گی۔ تمام دنیائین اپنے محور کو چھوڑ کر ایک جگہہ آجائین گی۔

میری روح بھی ایک نامعلوم کشش سے کھنچکر وہان آجائیگی۔ ہر چیز مضطر ہوگی اور ہر شے بیچین۔

میری روح آہستہ آہستہ بےخودی مین سن حقیقی سے قریب ہوتی چلی جائیگی۔ .... یکایک پردا آئے گا۔ بجلیان ہرطرف کوندنے لگین گی۔ اور ہر مادہ جلکر خاکستر ہو جائیگا۔ اُسوقت میری روح بالکل بیخبر ہو جائیگی حسن حقیقی اسے اپنے آغوش مین لے لیگا اور اسے ہمیشہ کیلئے سکون مل جائیگا۔

کسواسطے روتا ہے تو

یہ دن بہار زندگی کے ہین جوانی کا ہے سن
تجکو رلاتی ہے اگر ہمسائیگی و مفلسی
گل کی گرہ مین مال و زر کے نام کچہ بھی تو نہین
بلبل کے پلے مال ہی کوئی نہ دولت ہے نہ دھن
کسواسطے محزون ہے تو کسواسطے روتا ہے تو
ظاہر مین ہے مرو تین فہمیدہ ہے سنجیدہ ہے
کیا اسلئے محزون ہے کیا اسلئے روتا ہے تو
سرسبز اور شاداب اک جنگل مین تنکا گھانس کا

کسواسطے محزون ہی تو۔ روتا ہے کیون تم رات دن
یہ تاسپاسی چھوڑ تو دل مین کر اپنے منصفی
ہے شاد لیکن ہر گھڑی ہر وقت ہی خندہ جبین
فرط خوشی سے ہی مگر ہر دم چمن مین نغمہ زن
یون مفت اپنی جان کو ناداں کیون کھوتا ہے تو
پھر کس لئے غمگین ہے تو کسواسطے رنجیدہ ہے
مونس نہین تیرا کوئی ہمدم نہین تنہا ہے تو
بے غمگسار و یار ہے لیکن نہین پرما ذرا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۲ نمبر ۶

ایڈیٹر خوشتر منگرولی

زبان

(منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہر انگریزی مہینے کے آخری ہفتہ کو شائع ہوتا ہے سالانہ چار روپے)

فہرست مضامین جون ۱۹۲۸ء

صفحہ ادارت

اگرچہ ہم زبان کا یہ تیسرا نمبر بھی جدید طریقہ تہذیب و ترتیب کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں مگر ابتک ہمیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا ملک نے بھی اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا یا نہیں؛ لہذا قارئین زبان سے استدعا کرتے ہیں کہ زبان کے معیار سابقہ و موجودہ کے متعلق اپنی بیش قیمت آرا سے جلد سرفراز فرما کر مشکور فرمائیں کہ ہم کوئی قطعی اور فیصلہ کن لائحہ عمل اختیار کر سکیں۔
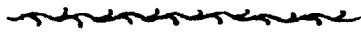
اس نمبر کے مضامین میں "اودھ کے بادشاہ گر" تاریخی مضمون ہے جس میں جناب امداد علی خانصاحب زبیری نے اودھ کے کنبوہ وزراء کے کارنامے اور اُنکے بے نظیر تدبر و حسن نظام کا ذکر بڑی محنت و جانفشانی سے یکجا کر کے قلمبند فرمایا ہے امید ہے کہ آیندہ بھی موصوف اس قسم کے مضامین سے زبان کو نوازتے رہیں گے۔

دوسرا ادبی مضمون ہندوستان کے مشہور ادیب اور اپنے انوکھے طرز انشا کے مالک حضرت ساغر نظامی مدیر "پیمانہ" کا ہے جنہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ سے "محبت" کے متعلق جن انوکھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اگرچہ اپنے خاص رنگ میں نہیں لکھے گئے تاہم اس قابل ضرور ہیں کہ وہ اردو ادبیات میں ممتاز درجہ حاصل کر سکیں۔ زبان میں آپ کا پہلا ہی مضمون "محبت" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جو آپکی زبان کے ساتھ قلبی و قلمی محبت کا ثبوت ہے، ہم ان "محبت پاروں" کو شائع کر کے موصوف سے متوقع ہیں کہ آیندہ بھی ایسی ہی "محبت" کا ثبوت دینگے اور یہ محبت بقول خود "فریب خیال" نہ ثابت ہوگی نیز ہمیں حصول مضمون یا امتحان محبت کے لئے "کوشش" کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ محبت خود ایک کوشش ہے"

طبیعیات کے ماہر نیوٹن کے ارتقائی کارناموں کو محمد عبدالنعیم صاحب صدیقی نے واضح طور پر سراہا ہے ہم اس مضمون کے لئے مکرمی عبدالقادر سروری ایم۔ اے مدیر "مکتبہ" کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ازراہ ہمدردی (اگرچہ خود کوئی مضمون نہیں دیسکے) زبان کے لئے مرحمت فرمایا۔

تنقیدی مضامین جو فاتیات سے مبرا ہوتے ہیں قابل قدر ہوتے ہیں مگر افسوس کہ ہندوستان میں اس کا فقدان ہے

ایسے تنقیدی مضامین بہت کم نظر سے گذرتے ہیں جو بلا رو و رعایت منصفانہ اور ناقدانہ نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہوں
بلکہ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ اس موضوع پر جب کبھی کسی اہل قلم نے قلم اٹھایا ہے کہیں نہ کہیں اپنے دلی بخارات کا
علانیہ یا خفیہ طور پر ضرور اظہار کر دیا ہے، چنانچہ خیابان خلیل کی دوسری قسط میں بھی بعض بعض مقامات پر اس کی
جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ اس مضمون کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ہم اس "جنگی پالیسی" کو پسند نہیں کرتے
امید کہ واثق صاحب آیندہ اقساط میں اس امر کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔

"حکیم مومن کی شاعری" پر ایک طویل مقالہ ہمارے دوست عشرت رحمانی معاون مدیر "نیرنگ" رامپور نے
خاص نگار کے "مومن نمبر" کیلئے تحریر فرمایا تھا مگر وقت پر نہ بھیج سکنے کے باعث ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ اس
مضمون میں بعض خصوصیات ہیں جو "مومن نمبر" کے مندرجہ مضامین سے ایک امتیازی اور جداگانہ حیثیت رکھتا
ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود "مومن نمبر" شائع ہو جانیکے اسکی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا اور اسی لئے ہم اسکو باوجود
طویل ہونیکے بالاقساط درج زبان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

عشرت صاحب کا نام جس طرح ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح قارئین زبان کے لئے
بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ آیندہ ہر نمبر میں آپ کا کوئی نہ کوئی مضمون ہوا کریگا۔

افسانوں میں قیسی صاحب نے اپنے فسانہ "گنگا کی وادی میں" دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہندوستان کی
آنیوالی نصف صدی سے پیشتر کا نقشہ پیش کیا ہے۔ درحقیقت جب ہماری تہذیب اس "سطح عریاں" پر پہنچ جائیگی تو
اس قسم کے واقعات کا رونما ہونا لابدی ہو جائیگا۔

دوسرا افسانہ "رقابت کی قیمت" جناب محشر عابدی کا ترجمہ ہے اس میں مصنف نے مغربی عورت کی محبت
اور وفاداری کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تخیل حقیقت میں مشرقی طرز معاشرت اور نسوانی وفا و
محبت سے لیا ہے اور اس میں اس امر کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ مغربی دنیا میں بھی ایسی شوہر پرست
عورتیں موجود ہیں۔ بہرحال فسانہ دلچسپ و سبق آموز ہے۔

اس مرتبہ نظموں کا معیار بہت بلند ہے اور سب کی سب اچھی ہیں۔ "جذبات عالیہ" علامہ سیماب اکبرآبادی کا
نتیجۂ افکار ہے جس کے لئے ہم حضرت ساغر صاحب کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری خواہش پر از معاصرانہ رہ
ہمدردی آپ کے کلام بلاغت نظام سے مشکور فرمایا۔ "شاعر کا نصب العین" خود حضرت ساغر صاحب کی

جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ یوں تو آپ کی ہر نظم اثر و جاذبیت سے لبریز ہوتی ہے مگر یہ نظم خاص طور پر کامیاب ہوئی ہے۔
"میخانۂ محبت" مکرمی حضرت رازؔ چاندپوری کا عطیہ ہے جنہوں نے باوجود عدیم الفرصتی کے ہمارے اصرار پر خاص زبان کے لیے فکر فرماکر روانہ فرمائی ہے۔ جس کے لئے ہم موصوف کے بیحد شکر گذار ہیں۔ آپ کے مضامین نظم و نثر اردو کے چوٹی کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔
"دوستی" پر حضرت ذہینؔ حیدرآبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال فرمایا ہے آپ نے اپنے کلام کے لئے اخلاقیات کا موضوع مختص کر لیا ہے اور اس میں بڑی حد تک آپ کامیاب ہوئے ہیں۔
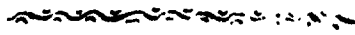
شکر ہے کہ روز بروز ہمدردانِ زبان میں موقر اہلِ قلم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مرتبہ جن حضرات نے زبان کے دورِ ثانی پر ہمیں مبارکباد دی، قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا اور ہماری حوصلہ افزائی فرماکر اپنے سچے خلوص اور پُر جوش ہمدردی کا ثبوت دیا ہے ہم ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولانا مسعود الرحمن خاں صاحب ندوی (جن کا ایک طویل مضمون "نیپولین کے خطوط معاشقہ" موصول ہوگیا ہے) حضرت رفیقؔ اجمیری (جنہوں نے ایک فسانہ خاص زبان کے لئے لکھا مگر...... کو دیدیا) حضرت ساغرؔ نظامی (جنہوں نے زبان کی قلمی خدمت کو اپنے فرائض میں داخل کر لیا ہے)۔ حضرت رازؔ چاندپوری (جن کے فسانہ کا منتظر ہوں) اور حضرت عشرتؔ رحمانی (جو زبان کی توسیع اشاعت قلمی امداد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں) خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

خوشتر (منگروی)
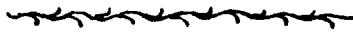
اودھ کے بادشاہ گر

(کنبوہ)

(از جناب امداد احمد خانصاحب نبیری)

شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد جب زمام حکومت محمد شاہ بادشاہ کے ہاتھ میں آئی تو رنگ رلیوں نے حکومت کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ ابھی بادشاہ نشہ بادہ نوشی میں چور ہی تھا کہ نادر شاہ کے فتنے نے سلطنت مغلیہ پر ایک ایسی ضرب کاری لگائی جس سے رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی۔ سلطنت کی زوال پذیر حالت کو دیکھکر امرا و دولت بھی جفائے روزگار و کجروئی فلک ناہنجار کی وجہ سے نبات النعش کی طرح متفرق ہو گئے۔ خوانین کنبوہ بھی جو شروع زمانہ سلطنت اسلامیہ سے حکومت کے کاروبار میں دخیل اور مہمات میں برابر کفیل رہنے کی وجہ سے دہلی کو اپنی جائے رہائش قرار دے چکے تھے۔ اس فتنۂ نادر گردی اور حکومت کی بد سے بدتر حالت کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور وہاں پر اپنی حالت کو محفوظ نہ خیال کر کے اقصائے مشرق میں پھیل گئے۔ چنانچہ کچھ امروہہ، مرادآباد، بریلی اور کچھ بنارس اور بنگالہ چلے گئے۔ ان میں سے غلام حسین[۱] خان۔ راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے مدار المہام ہو گئے تھے ان کے ہی اخلاف میں سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں تھے۔ اول اول یہ دونوں سرکار انگریزی میں تحصیلدار تھے۔ وہاں سے علیحدگی اختیار کر کے بزمانہ نواب سعادت علی خاں لکھنو چلے آئے اور انکی قدر دانی سے بہرہ اندوز ہوئے تھوڑی ہی مدت میں اپنے زور قلم، حسن تدبیر، اور کشورکاری کی وجہ سے وہ نام آوری حاصل کی کہ نواب غازی الدین حیدر بہادر کے امرا رکبار کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں اپنے وقت میں فارسی کے بڑے ادیب اور منشی مانے جاتے تھے۔

"صاحب[۲] تاریخ اودھ" رقمطراز ہیں کہ "سبحان علی خاں کنبوہ۔ علامۂ عصر ہمہ صفت موصوف نثار بے نظیر عالی فکر اور خوش تدبیر تھا معتمد الدولہ اُسکے بغیر مشورہ کوئی کام نہ کرتے تھے" اور "تاج الدین حسین خاں ذی عقل ارسطوئے عہد تھے۔ کنبوہوں کی قوم میں ایسا آدمی کم گزرا ہے" علاوہ ازیں[۳] نوابان اودھ کی جانشینی کے مسئلہ پر

---

[۱] "سلسلۂ عالیہ" مصنفہ حکیم عنایت حسین خان مارہروی صفحہ ۱۰۵۔ [۲] حصہ سوم ۹۰-۹۱ مصنفہ مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری

[۳] سوانحات سلاطین اودھ جلد اول صفحہ ۲۱۳ مصنفہ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی۔

ان دونوں کی راے کو بڑا دخل تھا اور اسی وجہ سے یہ لوگ "بادشاہ گر" کے لقب سے آجتک لکھنؤ میں یاد کئے جاتے ہیں۔"

جب ۱۸ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو نواب غازی الدین حیدر نے بادشاہ کا لقب اختیار کرکے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا تو اسوقت سبحان علی خان نے "سکہ شاہی" گزرانا جس کے صلہ میں پانچ ہزار روپیہ انعام پایا اور وزیراعظم کی "نیابت" کا خلعت حاصل کیا۔ سکہ یہ

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد حکومت میں قلمدان وزارت نواب معتمد الدولہ آغا میر کے ہاتھ میں رہا۔ ان کے دور وزارت میں سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں کو بڑا عروج رہا۔ ہر قسم کی مشکلات کو وہ اپنے ناخن تدبیر سے اس خوش اسلوبی سے کھولتے تھے کہ دوست اور دشمن محو حیرت ہو جاتے۔ جب چند در چند وجوہ سے نواب معتمد الدولہ نظر بند کئے گئے اور بادشاہ بیگم کا دل انکی طرف سے غبار آلود تھا۔ اور جس کے دور کرنیکے لئے تسہ و افسوں تک کا بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ اس وقت سبحان علی خان نے اپنے تدبر اور اثر سے بادشاہ بیگم سے صفائی کی صورت پیدا کرکے انکو پھر نیابت سے سرفراز کرایا۔

سبحان علی خان نہ صرف اپنے ممدوح کے خیر سگال تھے بلکہ حکومت کے بھی بڑے خیر خواہ تھے۔ جب معتمد الدولہ کے اسراف نے سلطنت کے خزانہ کو کھوکھلا کر دیا اور حالت بد سے بدتر ہونے لگی تو سبحان علی خاں چپ نہ رہ سکے۔ ایک دن معتمد الدولہ کو آیندہ نتائج سے آگاہ کیا۔ اور عاقبت اندیشی کی باتیں سمجھائیں اور خزانہ کی حالت کو بہتر بنانیکے لئے مشورہ دیا۔ مگر اس دور طوائف الملوکی میں انکا نیک مشورہ باد در ہوا ثابت ہوکر رہ گیا اور اسراف کی حالت بدستور قایم رہی۔

جب غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حکومت پر متمکن ہوئے تو معتمد الدولہ پر نوازشات شاہانہ کی بوچھار ہونے لگی۔ سبحان علی خاں کو بھی "تحریرات صدر" کا یک قلم اختیار اور "دارالانشاء" کی افسری حاصل ہوئی اور پچاس ہزار روپیہ نقد مرحمت ہوا لیکن معتمد الدولہ پر یہ نوازشات ظاہری تھیں۔ کیونکہ اندرونی سازشوں کی وجہ سے بادشاہ کا مزاج وزیر سے برہم تھا۔ سبحان علی خاں معتمد الدولہ سے کہا کرتے کہ "سبز باغ خزاں رسیدہ ہے۔" آخرکار سازشیں کامیاب ہوئیں وزیر معتوب ہوکر صاحب ریزیڈنٹ کے توسل سے جان بچاکر کانپور جا رہے۔ نواب

اعتماد الدولہ میر فضل علیخاں کو وزارت تفویض کی گئی اور معتمد الدولہ کے متعلقین اور متوسلین پر دست ظلم دراز کیا گیا۔
ان سب کے ساتھ سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں بھی نظر بند کئے گئے لیکن جب ان سے مواخذے کی نوبت پہنچی تو یہ بے جرم اور سرکار شاہی کے خیر طلب ثابت ہوئے۔ اگرچہ انکے اقبال کا ستارہ گردش میں آچکا تھا۔
لیکن اس پر بھی انکی خداداد قابلیت کی وجہ سے اعتماد الدولہ ان سے برابر مشورہ لیا کرتے تھے اور اُنکے دربار میں انکی ایک ممتاز جگہ تھی۔ تاج الدین حسین خاں نے بھی اپنا دامن محاسبہ سے پاک کر کے اطاعت اختیار کر لی۔
کچھ عرصہ کے بعد اعتماد الدولہ کے انتقال پر نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں وزارت پر فائز ہوئے۔ تاج الدین حسین خاں اُنکے ہمراز بنکر رزیڈنٹی کی سفارت پر معمور کئے گئے لیکن ابھی انکی وزارت کو پورے طور پر قایم ہوئے کچھ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا کہ سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں کی سفارش سے معزول کئے گئے۔ کرنل جان لو صاحب سے جو نئے رزیڈنٹ ہو کر لکھنؤ آئے تھے تاج الدین حسین خاں کے بہت گہرے مراسم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے حکیم مہدی علی خاں اور اُنکے اقربا کی گرما گرمی سرد پڑ گئی تھی۔
حکیم صاحب کے معزولی کے زمانہ میں خوانین کنبوہ کا عروج اپنے پورے نصف النہار پر تھا اُنکی صائب رائے پر کاروبار حکومت چل رہا تھا۔ اُنکے اشاروں پر وزرا کا عزل و نصب ہو جاتا تھا اور انکی تدبیروں کے آگے دوسرے امرا دولت بازیچۂ اطفال بنے ہوئے تھے۔ ان حالات میں سبحان علی خان کا بادشاہ کو یہ مشورہ دینا کہ "میری قوم میں سے کسی شخص کو وزارت کا عہدہ عطا کیا جائے" کچھ مناسب نہ تھا لیکن یہ عزت روشن الدولہ کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔ دوسروں کو کیونکر مل سکتی تھی۔ چنانچہ روشن الدولہ اس منصب سے سرفراز کئے گئے۔
سبحان علی خاں شریک مشورہ ہوئے۔ اور عہدہ سفارت رزیڈنٹی تاج الدین حسین خان کے ہی تعلق میں رہا "جب[۱] روشن الدولہ کو اختیارات ملے تو خوانین کنبوہ صغیر و کبیر محیط دائرہ وزارت ہوئے۔ اور حضرات کنبوہ کا گھر معین خاص و عام ہوا۔ اور ان سب کے اخراجات۔ خیر و خیرات۔ رفیق پروری۔ اور نیکی مشہور انام ہوئی"
تاج الدین حسین خان کی رسم و راہ قدسیہ بیگم سے بہت زیادہ تھی۔ روشن الدولہ کو یہ امر ناگوار گذرتا تھا۔ آخر کار اُن کا عتاب نازل ہوا۔ اور تاج الدین حسین خاں چار لاکھ روپیہ نقد لیکر کانپور چلے آئے اور اپنی املاک میں سکونت اختیار کی لیکن اُنکے تعلقات حکام رزیڈنسی اور خواتین محل سے اس قدر مستحکم رہے کہ حکومت کے رازہائے سربستہ کی اُن کو سب سے پہلے خبر ہو جایا کرتی تھی جو کچھ کونسل کلکتہ میں سلطنت اودھ کے متعلق احکامات صادر ہوتے یہ انکو غور و امل

---

[۱] تاریخ اودھ صفحہ ۳۲۴۔

کے ذریعہ بادشاہ کے گوش گذار کرا دیا کرتے۔ ان خبروں کی وجہ سے روشن الدولہ کو بڑی پریشانی لاحق رہا کرتی تھی۔

۲۰ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو بادشاہ نصیرالدین حیدر کا انتقال ہو گیا[۵۱] فریدوں بخت تخت پر جلوہ افروز ہوئے فخرالدولہ ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ دفعتہً احسان حسین خاں فرزند سبحان علی خاں کی آمد کی خبر سُن کر دوسرے لشکر سے میں چھپ گئے اور انکے خوف سے اُنکے آگے آنیکی جرأت نہیں کی احسان حسین خاں نے سلطان زماں محمد علی شاہ کو نذر اور سلطنت کی مبارکباد دی محمد علی شاہ نے الطاف و عنایت کا اظہار کیا۔"

تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ روشن الدولہ سے بگڑ گئے اور انکے لڑکے مرزا محمد احسن سے لیا طرزِ عمل اختیار کیا کہ روشن الدولہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگے جب سر سے اونچا پانی ہونے لگا تو احسان حسین خاں نے اپنی دانشمندی اور تدبیروں سے معاملہ کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھا دیا کہ روشن الدولہ انکے بڑے احسانمند ہو گئے جسکی وجہ سے وزیر کے رفقائے قدیم آتش رشک و حسد سے جلنے لگے لیکن احسان حسین خان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اس وقت سلطنت اودھ گہری سازشوں کا آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ امرائے دولت ایک دوسرے کے عروج کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہر ممکن کوشش روشن الدولہ اور بادشاہ میں بگاڑ کرانیکے لئے کی جاتی تھی۔ حاسدوں کے دو ایک وار تو خالی گئے۔ مگر آخر میں وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ بادشاہ اور وزیر میں سخت شکر رنجی ہو گئی۔ خوانین کنبوہ پر بھی عتاب نازل ہوا۔ کچھ لوگ قید ہوئے اور لاکھوں روپیوں کا حساب طلب کیا گیا۔ آخر کار خوانین کنبوہ سے سات لاکھ روپیہ لیکر داخل خزانہ کیا گیا۔ غرض حاسدوں کے حسد کشمیری کی چلتی۔ بادشاہ کا عتاب اور ریذیڈنٹ کی مصلحتوں نے ملکر سازشوں کا ایک طومار خوانین کنبوہ کے خلاف باندھ دیا اور انکو باول ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ کر بنارس چلا جانا پڑا۔ تاج الدین حسین پہلے ہی سے موجود تھے۔ روشن الدولہ بھی معزول ہوئے اور انکی جگہ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے دوبارہ وزارت کا خلعت حاصل کیا۔ کیونکہ یہ خوانین کنبوہ کے زخم خوردہ تھے اس لئے انہوں نے اب دل کھول کر ان سے بدلہ لیا۔

نواب روشن الدولہ سبحان علی خاں و خوانین کنبوہ کی جو ہر دانش نیک اندیشی تدبیر حسن کارگذاری اور صائب رائے پر ہمیشہ عمل پیرا رہے اور انکو سوائے انکی امداد کے اور کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ خوانین کنبوہ کی رائے اور قابلیت امور وزارت کے سرانجام دینے کے لئے مختص تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ انکو ایوانی وزارت کے ہر دور میں باوجود گوناگوں سازشوں اور مخالفتوں کے ممتاز جگہ ملا کی۔[۵۲] انہوں نے درستی عمل حسن سعی اور کاموں کی انجام دہی میں یگانۂ آفاق ہو کر اور انصرام امور سلطنت اور انجام خدمات میں دیانتداری۔ جان نثاری اور خیر سگالی کو راہ دیکر وہ عروج حاصل کیا تھا کہ[۵۳] احسان حسین خاں

---

[۵۱] سوانحات سلاطین اودھ۔ [۵۲] سوانحات سلاطین اودھ صفحہ ۳۶۔ [۵۳] تاریخ اودھ صفحہ ۹۹ - ۱۹۵۔

بن سبحان علی خاں اپنے جلسے میں علانیہ یہ بات کہا کرتے تھے کہ بڑے بڑے مشکل کام ہم باتوں میں حل کر دیتے ہیں۔ روشن الدولہ میں اتنی قابلیت کہاں تھی کہ وہ سلطنت کے کاموں کا بوجھ سنبھال سکتے۔ اس لئے کل بڑے بڑے کاموں میں سبحان علی خاں کا مشورہ کام کرتا تھا اور چھوٹے کاموں میں احسان حسین خاں کو داخلت تھی۔"

تاج الدین حسین خاں درستی معاملات۔ رسا کاری اور جوہر قابلیت میں ملیاذ روزگار تھے۔ حکام انگریزی سے بھی انکے تعلقات ایسے خوشگوار تھے کہ مشکل سے مشکل اور اہم سے اہم کاموں کو بحسن وخوبی۔ دولت کی بہبودی اور حکومت کی بہی خواہی کے مطابق اُن سے کرا لیا کرتے تھے۔ جب ۴ رنومبر ۱۸۳۰ء کو منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں ۔ میڈک صاحب۔ رزیڈنٹ کی خلاف مرضی خلعتِ وزارت سے سرفراز فرمائے گئے۔ تو رزیڈنٹ کے دل میں وزیر کی طرف سے کاوش پیدا ہوگئی۔ جب ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹینگ کانپور اور وہاں سے لکھنؤ آئے تو تاج الدین حسین خاں نے اپنے دوست یگ لاٹن کے ذریعہ وزیر کے معاملات کی پیروی کی۔ اور جو کدورت گورنر جنرل کے دل میں وزیر کی طرف سے رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں نے پیدا کر دی تھی وہ بالکل جاتی رہی جس کے صلہ میں تاج الدین حسین خاں عہدہ سفارت رزیڈنسی پر مقرر کئے گئے۔

انکی ہوشمندی۔ تدبر اور جز رسی اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ کونسل کلکتہ میں جو باتیں سلطنت اودھ کیلئے پیش ہوتیں انکی خبر سب سے پہلے انکو ملجایا کرتی تھی اور یہ ان خبروں کو بادشاہ کے گوش گذار کرا دیا کرتے تھے چنانچہ سلطنت کی ابتری اور طوائف الملوکی سے متاثر ہو کر لارڈ ولیم بنٹینگ نے جب بادشاہ کو تحریر کیا کہ "اگر حالت اپنی ٹھیک نہ کی تو پیشوا اور نواب کرناٹک کی طرح پنشن مقرر کر کے سلطنت کا انتظام گورنمنٹ خود لیلے گی۔" تو اس کو سب سے پیشتر تاج الدین حسین خاں نے ہی عورات محل کے ذریعہ بادشاہ کے حضور میں گذرانا تھا۔

تاج الدین حسین خاں ہمیشہ امیر اور صاحب شوکت و احتشام رہے اور مدت العمر عظمت واقتدار کے ساتھ بسر کی۔ علاقہ سلطان پور کی چکلہ داری کے زمانہ میں انکے اخراجات کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ عشرہ محرم میں انکا لاکھوں روپیہ کا خرچ تھا۔ لکھنؤ اور کانپور میں بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔

لکھنؤ سے علیحدگی کے بعد نواب محمد سعید خاں والیٔ رامپور کے یہاں بھی کچھ زمانہ تک عزت وعظمت کے ساتھ رہے۔ پھر علیحدگی اختیار کر کے اپنے داماد مظفر حسین خاں ابن سبحان علی خاں کے پاس الہ آباد چلے گئے۔

۱۲۶۱ھ میں ایک دفعہ پھر لکھنؤ آئے سلطان عالم واجد علی شاہ عزت وافتخار کے ساتھ پیش آئے۔ آغا باقر کے

۱؎ تاریخ اودھ صفحہ ۱۹۹

امام باڑہ میں جو مجلس انہوں نے منعقد کی تھی اُس میں بھی حضور عالم نے قدم رنجہ فرمایا اور شرف ملازمت کے ساتھ خلعت دوشالہ اور رومال بھی عطا کیا۔ لیکن سازشوں کے جال کو دیکھ کر یہ واپس الہ آباد چلے گئے۔

انکی واپسی الہ آباد کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اودھ پر سرکار انگریزی کا قبضہ ہوگیا۔ اور "حضور عالم[۵۸] نے تاج الدین حسین خاں اور انکے بھانجے احسان حسین خاں بن سبحان علی خاں کے لئے تجویز کی کہ یہ دونوں ایوان گورنری میں وکیل ہو کر کلکتہ جاویں" یہ معاملہ ابھی درپیش ہی تھا کہ سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے درمیان وکالت کی خدمت تاج الدین حسین کے بھانجے اور داماد مظفر حسین خاں ابن سبحان علی خاں کو سپرد ہوئی۔ انکے اور سیکرٹری کے درمیان بعض امور پر سخت اختلاف ہوگیا۔ انہوں نے جان نثاری اور خیر سگالی کی وجہ سے سختی کے ساتھ جوابات دینے میں ذرا باک نہیں کیا۔ اور جب کار برآری ہوتے نہ دیکھی تو اپنی خدمات سے علیحدہ ہوگئے اور "اس[۵۹] طرح اس خاندان کا سلاطین اودھ کے دور آخر کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رشتۂ ملازمت ختم ہوگیا"

کم و بیش نصف صدی تک سلطنتِ اودھ کے دورِ انحطاط میں سبحان علی خاں۔ تاج الدین حسین خاں اور انکے اعقاب نے جس پامردی۔ قابلیت۔ خوش سلیقگی۔ استقلال اور حُسن تدبیر سے خدمات انجام دی ہیں وہ زمانہ میں یادگار رہیں گی۔

محبت

(ساغر نظامی کے نقطۂ نگاہ سے)

محبت اُڑنے والے کو اُڑنے سے معذور اور معذور کو پر عنایت کر دیتی ہے۔

محبت سے دل وزنی ہوجاتا ہے۔ محبت دنیا کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔

محبت کے لئے کوشش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ محبت خود ایک کوشش ہے۔

محبت مقام کی محتاج نہیں۔

محبت قطعی ایک وہی شے ہے جو ہوتی ہے "کی" نہیں جاتی۔

محبت میں جب جرأت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ خطرناک ہوجاتی ہے۔

---

۵۸ - سلاطین اودھ۔ ۵۹ - سلاطین اودھ

محبت کی صحیح دوڑ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس کے پیٹ میں شراب وحشت کے دو تین پیپے پہنچ جاتے ہیں سچ ہے محبت خود ایک وحشت ہے ایسی وحشت جو بعض موقعوں پر تعمیر اور بعض اوقات تخریب کا باعث ہو جاتی ہے۔

محبت میں خودداری کیسی، محبت میں اصول کیسا، محبت خود اک اصول ہے۔ محبت درس نیاز دیتی ہے۔ محبت انسان کو کوٹ پیٹ کر دنیا کے تمام آلام اور غموں کے مقابلے کرنیکے لئے تیار کر دیتی ہے۔ محبت انسان کو انسان بنا دیتی ہے انسان ہی نہیں بلکہ فرشتہ۔ کیونکہ نیاز کامل اور دوامی مجسمہ سے جانا بس فرشتہ سے جاتا ہے۔

محبت رہ تسلیم و رضا کے مسافر کو صبر اور تسکین کے زاد سفر سے آزاد کر دیتی ہے اور محبت ہی تو ایک ایسی شئے عظیم ہے جو انسان کو خدا سے بہت قریب کر دیتی ہے۔

" اے محبت تو جس دل میں ہے اس دل میں
براہ راست خدا کی آمد و رفت ہے۔ "

محبت محض ایک جنون، جوش خون، اور فریب خیال سے زیادہ کوئی شئے نہیں ہے"۔ ہندوستان میں اکثرین کے نزدیک یہ بات بری اور شرمناک ہے کہ فلاں مرد فلاں عورت سے محبت کرتا ہے مگر حقیقتاً ہر شخص ایک عورت سے محبت کرتا ہے یا کم از کم وابستہ ہے۔ عجیب دلچسپ بات ہے کہ سوسائٹی اس کلیہ کی موجودگی میں محبت کرنے والے اور محبت کرنے والی کو گنہگار تصور کرتی ہے حالانکہ یہ ایک عطیہ فطرت ہے۔

محبت کی دنیا خوشبودار ہے محبت کے دنیا میں گیت ہی گیت ہیں، بوسے ہی بوسے ہیں ہنسی ہی ہنسی ہے، مستی ہی مستی ہے، اور محبت کی دنیا کا قطرہ قطرہ ایک سچی راحت اور مست خوشی کے سمندروں سے بھرا پڑا ہے۔

محبت ایک دوامی جھولا ہے جو ضمیر کے باغ میں غیر فانی جذبات کے تازہ پھولوں کی رسّی سے بنتا ہے اور ہمیشہ جنبش میں رہتا ہے۔ کچھ رونا کچھ ہنسنا اور کچھ دینا محبت کے فرائض میں داخل ہے۔

محبت جوانی کا میوہ ہے جو جوانی میں ضرور کھایا جاتا ہے۔

محبت ایک ٹھوکر ہے ایسی ٹھوکر جو ہر قدم پر ٹھوکریں کھلواتی ہے۔

محبت کسی سردی سے سرد نہیں ہوتی محبت کی گرمی کسی بارش سے ٹھنڈی نہیں ہوتی محبت ایک چراغ ہے جو ہوا کے جھونکوں بارش کے طوفانوں اور استارہ کی آندھیوں میں بھی برابر جلتا رہتا ہے۔ ایک مشعل ہے جو تاریکی میں راستہ دکھاتی ہے۔

عورت کو محبت میں ہمیشہ پہل کرتی ہے لیکن اظہار محبت میں کبھی تقدیم نہیں کرتی۔

عشرت اور لذت کامیاب محبت کے دو نام ہیں اور محبت دونوں چیزوں کا ایک نام

جس لڑکے اور جس لڑکی کو محبت سگلے ملاتی ہے وہ دنیا میں بہترین لڑکا اور بہترین لڑکی ہوتی ہے

محبت کرنا عبادت ہے
محبت پہاڑ پر ہی نہیں اکثر آسمانوں پر لے جاتی ہے
محبت خدا کی ایک قوت ہے بظاہر نہایت معمولی اور بہ باطن موجودہ سلطنتوں کی فضائی بحری اور بری قوتوں سے بھی زیادہ قوی۔
محبت واقعی صادق ہوتی ہے تو جذباتِ نفسانی کبھی نہیں بھڑکتے بلکہ انسان میں اُس قوت کی وجہ سے جو سچی محبت میں یقیناً پیدا ہو جاتی ہے ایک برودت آجاتی ہے اور برودت میں نفسانی جذبات شعلہ زن ہو ہی نہیں سکتے۔
محبت دنیا کی سب سے بڑی آوارگی ہے۔
جذبات سے مغلوب ہونا حیوانیت ہے۔ اور جذبات پر حکومت کرنے کا نام محبت

جذباتِ عالیہ

(از رئیس الکلام حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی)

گوہرِ اشک کو خونِ نابہ حرماں دیکھا
دلِ خوں گشتہ کو سیلابِ بداماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

اس نے کیا صبح کے آثار میں پنہاں دیکھا؟
اس نے کیا رنگ مریضِ شبِ ہجراں دیکھا؟
شمع کو پچھلے پہر طاقت میں لرزاں دیکھا

کی خلش تم نے فراموش مرے زخموں کی
نہ سنی شورشِ خاموش مرے زخموں کی
تم نے دیکھا بھی تو اپنا ہی نمکداں دیکھا!

رشتۂ انس سے مربوط تھی انسانیت
اس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دیدیا منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

انہیں دو چیزوں کو زیرِ بم زنِ محفل پایا
نغمۂ عشق کو ہنگامہ گرِ دل پایا؛
حسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

اس قصیدے کی قلم بند نہ تشبیب ہوئی
اک طرح قصۂ ہستی کی نہ ترتیب ہوئی
اسی افسانے کو ناقابلِ عنواں دیکھا

آج تو بیخودیٔ شوق کی بن آئی ہے؛
جو تماشا تھا وہ اب میرا تماشائی ہے
تو نے کچھ اور بھی اے دیدۂ حیراں دیکھا

رنگِ امید سے تھا جب دلِ مضطر خالی
شبِ غم جب نظر آتا تھا بھرا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

آپ کی مجلسِ پرجلوہ کے قابل بن جائے
دلِ ویراں کو یہ ہے خبط کہ محفل بن جائے
آپ نے حوصلۂ بے سر و ساماں دیکھا؟

نہ ستا شوق کی نظروں کو زمانے کی طرح
طور پر پھر نظر آ جا نظر آنے کی طرح

یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

آئینہ تھیں نظرِ گلکدہ رس کی راتیں ؎ ؎ کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں

آنکھ جب بند ہوئی خوابِ گلستاں دیکھا

شرط تھی پنجہ کشی دہر کی وسعت پہ مجھے ہوش آیا تو ہنسی آگئی وحشت پہ مجھے

اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

کوئی نازاں مجھے جانا کوئی مجبورِ حجاب کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودۂ خواب

سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا

اور کیا کرتے : خاموش اگر رہتے ہم کس سے سیماب پریشانیٔ دل کہتے ہم

ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

گنگا کی وادی میں

(از قیسی)

"دیکھو! دیکھو! کروٹ نہ لو ذرا اوپر اور چت لیٹے رہو" عبید کو کسی قدر ناگوار معلوم ہوا یہ پہلا تحکمانہ لہجہ تھا جو اس نے تمام عمر میں آج سنا۔ اسکی ضعیف قوت سامعہ نے اسکو فریب دیا۔ اگر وہ اصلی حالت میں ہوتا تو اس دلکش آواز کے تحکمانہ لہجہ سے جس میں ہمدردی کا جزو شامل تھا باوجود پراگندہ حواس ہونیکے متکلم کی جانب آنکھیں کھولکر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار کے قریب ہری ہری نرم گھاس پر ایک کسان لڑکی کسی اجنبی پڑے ہوئے شخص کے سرہانے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تر رومال سے اسکی پیشانی کو بار بار سرد کر رہی ہے۔ اسکی یہ کوشش ایلوپیتھک۔ ہومیوپیتھک کی زحمت وہ تدابیر سے بے نیاز ہے عشوہ طراز مسیحا کے اس علاج سے بیہوش شخص کی روح اس قدر مسرور تھی کہ اس نے اپنے مطیع حواس خمسہ کو بیدار ہونیکا تقاضہ ہی نہیں کیا۔ آخر عبید ہوشیار ہوا۔ فوراً اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر معالج کی تہدید نے اس کو جلد اپنی موجودہ حالت پر توجہ دلا دی۔

اس زمانہ کے فیشن کے دلدادہ اور اصولِ تندرستی سے بے بہرہ نوجوانوں کے مقابلہ میں وہ قوی الاعضا اور

کے ٹھلنے کا جوان نظر آتا ہے۔ بلند پیشانی پر ایک خراش میں سے خون بہ رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بیوفا گھوڑے نے اپنے راکب کے ساتھ اتنی ہی بدسلوکی نہیں کی کہ اسکو گرا کر فرار ہو گیا بلکہ سُم سے اُسکی پیشانی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ پُر فضا وادی کی تر و تازہ ہوا کی پلی ہوئی بھولی لڑکی نے پیشتر پُر تکلف لباس میں کسی جوان رعنا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیرت و خوف سے اُسکے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ عبید نے تکلیف کا احساس کر کے مُنہ بنایا۔ اپنے اُس پاس خاموشی و اطمینان دلانیوالا منظر دیکھکر اُس ہستی کا شکریہ ادا کیا جس کا دستِ قدرت ہر حادثہ میں انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ ابھی شکریہ کے الفاظ نے زبان سے نکلکر دل کی منت پذیری کے جوش کو کم نہ کیا تھا کہ خائف لڑکی پر اُسکی نظر پڑی جس کے ہاتھ میں اب تک اسکا بھیگا ہوا رومال تھا۔ اُس نے اول اسکو دیہاتی لڑکی سمجھکر توجہ نہیں کی۔ مگر اپنا رومال اسکے ہاتھ میں دیکھ کر دفعتہً جیب میں ہاتھ ڈالا غصہ سے اسکی جانب دیکھا۔ گھبرایا ہوا جھپٹا۔ قریب تھا کہ غریب لڑکی اسکے غضبناک تیور سے خائف ہو کر چیخ مار سکے کہ یکایک ٹھٹک گیا۔ غصہ کے آثار فوراً مٹ گئے۔ زود پشیمانی اسکی عادت میں داخل نہ تھی۔ مگر اس وقت وہ نادم تھا۔ معذرت کے لہجہ میں صرف اتنا کہہ سکا "میں نے بدگمان ہونے میں بہت عجلت کی معاف کرنا"

بیکس لڑکی نے اس معذرت پر یقین نہ کر کے پھر استفسارانہ اُسکی جانب دیکھا مگر عبید اب پھر وہی ۲۲ سالہ خوشخو شریف طینت جوان تھا۔ اُس کا متین و سنجیدہ بُشرہ اب خائف کرنیوالا نہ تھا۔ اُس میں وہی قدرتی جاذبیت پیدا ہو گئی اُس نے مکرر کہا "مجھے گمان ہوا کہ تم نے بیہوشی میں میری جیبوں کی تلاشی لی۔ مگر مفید مطلب شے نہ پا کر صرف رومال اُڑانے پر اکتفا کی۔ کیونکہ دیہاتی لڑکیوں کو بھی کپڑے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کیا تم مرا شکریہ قبول کر کے اپنی خوشنودی کا یقین نہیں دلاؤگی؟"

لڑکی "معاف کیجئے۔ اول تو آپ نے میرے متعلق رائے قایم کرنے ہی میں غلطی کی۔ میرے والد شہر کی لغویات سے سنگش ہو کر اس غیر آباد مگر پُر فضا دلکش خطہ میں آباد ہو جانے سے دیہاتی کسان کا لقب نہیں پا سکتے۔ آپ کے بیکار رومال میں نہ معلوم آپ کے نزدیک خوبیوں کا کس قدر گرانبار خزانہ ہے کہ اسکے منفعت رساں طریقۂ استعمال سے بھی آپ کو بدظن ہونے کی زحمت کرنی پڑی"

بے پرواہ دلچسپ عبید کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے غور سے اسکی جانب دیکھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ صورت ہی ایسی تھی کہ ہر نظر اسپر جگر بھر کسی اور دلفریب نظارہ کی تمنا سے خالی ہو جاتی تھی۔ بلکہ اُسکے غیر متمدنانہ جذبہ نے اس پر گہرا اثر ڈالا جو الزام دہی نے اُس لڑکی میں پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے قریب تر ہو کر ایک بار پھر لجاجت سے کہا "شکریہ ادنیٰ احسان کا ہو یا اعلیٰ کا ادا کرنا سخت ناسپاسی ہے۔ میری درخواست ہے کہ وہ احکامی تدبیر جلد بتاؤ جو میری

افضل ترین قربانی کے بعد تمہاری جانب سے خفیف سی معافی کا ہی مجھ کو یقین دلا دے۔" غضب و غصہ کے دیو کو زیر کرنیکے لئے عاجزی سے بہتر کوئی حربہ نہیں گر ہیاں غصہ تھا کس کو؟ اور فقط ایک خوشی دلانیوالی معمولی سی تحریک اسکے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے دریافت کیا آخر دہ شکریہ کس بات کا ہے؟"

عبیدہ "تم نے میرے معطل حواس کو تازہ کیا۔ نہیں سر نہ ہلاؤ۔ بھیگا ہوا رومال اور میرے سر کے تر بال جھوٹے نہیں بول رہے ہیں۔

۲
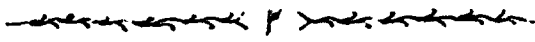
نعیمہ "آج رات کا پروگرام کیا ہے؟"

بھگوتی "زہرہ سے پوچھو"

زہرہ "بھئی ہم تو آج نہیں جا سکیں گے۔ بھیا کی خطنہ ہوئی ہے۔ آج مکان پر میلاد ہے۔ نعیمہ تم آؤگی؟"

نعیمہ "کون بے سری راگیوں سے اپنے کان گنگ کرے۔ آج کا ڈرامہ کہیں چھوڑ دینے کے قابل ہے؟"

بھگوتی "اس ڈرامے نے تو آج پتاجی سے جھڑپ کرا دی۔ وہ بکتے جھکتے رہے میں یہ جا وہ جا"

نعیمہ "شام کو تم باغ میں نہیں آئیں؟ قیراں اور میں آدہ گھنٹہ تک انتظار کرتے رہے"

بھگوتی "کہہ تو رہی ہوں آج دن بھر دردِ سری کرتے گذرا۔ یہ لوگ کچھ اس قدر اپنی احمقانہ غیرت کے پابند ہیں کہ ہماری سیر و تفریح ان کیلئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ بابو گنیش چند کے پاس ہارمونیم سیکھنے جاتی ہوں تو انکو کھٹکتا ہے۔ باغ میں جانا دو دیدوں نہیں بھاتا۔ فریدی کبھی میرے پاس آتا ہے تو ان لوگوں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ گر دہیٹ ہو تو مجھ سی ہو ایک نہیں سنتی"

زہرہ "میں تو مجبور ہوں۔ آج مکان پر ہی رہونگی"

نعیمہ "کل کوئی میلا بھی تو ہے۔ بولو چلوگی؟"

زہرہ "توبہ! تم تو آوارگی میں مردوں کے بھی کان کاٹنے لگیں۔ لو! اب میلہ کی سوجھی ہے"

نعیمہ "دھن کر ہ تمہاری کوڑھ مغزی پر رونا آتا ہے۔ برقع کی اوٹ میں تو تم عُرس وغیرہ کے اژدہام میں گشت کرلو پھر ذرا آزادی سے سیر کرنے میں کیا ہرج ہے۔ قیراں کے ساتھ ہر جگہ جانا میں پسند کرتی ہوں کیا تم نہیں جانتیں کہ اس مہلک رسمِ پردہ نے کس قدر تمہاری بہنوں کو دق وسل کا شکار بنا رکھا ہے۔ خوش نصیب ہیں خواتین ٹرکی و ایران کہ اپنے حقوقِ غاصب مردوں سے آخر لے کر رہیں۔ تم ہی ایمان سے کہو اگر ہم مطلق العنان ہو جائیں تو کیا

جنس قوی و جنس لطیف کی تفریق قائم رہ سکتی ہے۔ کیا پھر بھی مردوں کو ہم صنف نازک کے اطلاق کا حق رہ سکتا ہے ہم تمام کام انکے دوش بدوش کر سکتے ہیں۔ انکی Daily routine (روزانہ کی مصروفیت) کسی طرح ہماری مصروفیت سے زیادہ وسیع نہیں۔"

زہرہ:۔ "دیکھو صاحب اب تم صاف صاف کہنے پر مجبور کرتی ہو میں تمہارے خیالات کی زیادہ مخالف نہیں۔ مگر کہونگی خدا لگتی۔ صرف فیشن ایبل عیش پسند اور مغرب پرست بن کر تم اس مقصد کی ہرگز تکمیل نہیں کر سکتیں جو اقوام یورپ کی گھٹی میں پڑا ہے۔ طرز جدید کی تعلیم کی دلدادہ اس لئے نہ بنو کہ وہ تمہارے وجود میں مغربیت پیدا کرکے تمہارے حال میں انقلاب عظیم پیدا کر دیگی۔ تنعیس بال میں یا بالنگ کلب (ناچ گھر) میں ناچنے سے سوسائٹی کے نام نہاد اصول کی پیروی کرنے سے تم انڈین لیڈی تو ضرور کہلائی جا سکتی ہو۔ مگر حقیقی فلاحیت نہیں پا سکتیں۔ ٹرکی و ایرانی خواتین کی آزادی میں پولیٹیکل غرض پنہاں ہے۔ مگر تم اپنی کہو حکومت تمہارے ہاتھ میں نہیں تمہاری بیجا حقوق طلبی و آزادی کی غایت کیا ہے (میری اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت آزادی سے فطرتاً محروم ہے) اب تو تسلیم کرنیکے لئے تیار نہیں اگر تم اس کورانہ تقلید کو حصول سوراج کیلئے مفید آلہ کار ثابت کرنیکی کوشش کرو"۔

بھگوتی۔ (مسکرا کر) "یہ لیکچر تو آپ جا کر کسی چوراہے پر دیجئے۔ ہم کو تو جناب اپنی تمام مراسم موئے دماغ معلوم دیتی ہیں۔ ہندوستانی بیجا پابندیوں کا طلسم ہمارے ہاتھوں ٹوٹنا تھا۔ ایک مذہبی تفریق کا خوف ہے۔ چنانچہ دنیا کی ضرورتوں اور انجمنوں نے اسکی وقعت کچے دھاگے سے زیادہ نہیں رکھی۔ دھرم دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوا۔ ہم کافی پابستہ دلبیرہ چکی ہیں۔ آؤ مذہبی جامہ اتار کر آرائش یا کو بھی رشک یورپ بنا دیں"

یہ تھے تینوں اسکول کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے خیالات۔

——— ‹ ۳ › ———

والد:۔ "نعیمہ! تم نے اپنی شناسا لڑکیوں کی فہرست تیار کر لی؟ انکو بھی مدعو کر دینا"

نعیمہ:۔ "خیر وہ تیار ہو جاسے گی مگر یہ تو بتائیے آپ نے میرا ڈائننگ ڈریس (کھانیکے وقت کا لباس) تیار کیا یا نہیں؟"

والد:۔ "ڈائننگ ڈریس؟ اس کا کیا ہوگا؟"

نعیمہ:۔ "میں کیا عام لباس میں کھانے کی میز پر بیٹھونگی؟"

والد:۔ "تیرا وہ اطلس کا پاجامہ۔ کامدار دوپٹہ کیا ہوا؟"

نعیمہ:۔ "کہیں دعوت میں ایسا لباس پہنا جا سکتا ہے۔ مجھے مجبوراً کسی سے عاریتاً لینا پڑیگا"

والد: جہانتک ممکن ہو کھانا اپنی موجودگی میں تیار کراتا"

نعیمہ: آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کھانا پکواؤں گی یا مہمانوں کا استقبال کروں گی"

والد: اسکے لئے میں کافی ہوں"

نعیمہ: معاف کیجئے آپ کی ذات کا یقین نہیں کر سکتی۔ یہ میرا بھی اخلاقی فرض ہے"

والد۔ مگر بہت سے غیر مرد بھی تو آئیں گے"

نعیمہ۔ آنے دیجئے۔ میں ایک غیر مہذب لیڈی کی طرح سب کا استقبال کروں گی"

والد۔ میری غیرت تقاضہ نہیں کرتی ...."

نعیمہ۔ (جلکر) جہنم میں گئی آپ کی غیرت۔ اچھی غیرت ہے کمبخت۔ اگر آپ لوگوں نے ہمارے اخلاقی فرائض کی ادائیگی میں مزاحمت کی تو ہم کو باقاعدہ گورنمنٹ سے اپیل کرنی پڑیگی ہم اسکے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کریں گے"

بڑے میاں نے اپنی سعادتمند قرۃ العین کی تقریر کو ضبط سے سُنا اور خون کے گھونٹ پیکر رہ گئے۔

عبید نعیمہ کا بڑا بھائی تھا جس قدر وہ فیشن کی دلدادہ اور مغرب پرست تھی اسی قدر وہ شریف طینت اور نیکدل تھا نعیمہ کی ہنوز شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حسین تھی نوجوان تھی۔ اسکی پرستش میں صدہا نوجوان اپنی نجات سمجھتے تھے۔ سعید تو عرصہ سے اس پروندان آزتیز کئے بیٹھا تھا۔ گو شب نہ سہی مگر وہ اسکی صحبت و ملاقات کو اس سے کم بھی نہ سمجھتی تھی خودمختار خود آرا، مطلق العنان ہو کر کیا اس کو ایک پرستار کی تمنا نہیں ہو سکتی تھی؟"

عبید نہ تو کسی پر عاشق ہوا تھا نہ اس " ناکام نتیجہ" کوشش میں تھا۔ سُنا کرتا تھا کہ محبت میں انسان از خود رفتہ ہو کر نہ معلوم کیا بن جاتا ہے مگر اپنی ذات پر اس نے ابتک اسکا تجربہ نہیں کیا تھا۔ چند دعیان محبت سے اسکو دوچار ہونیکا اتفاق ہوا مگر انکی محبت سراسر اغراض سے ملوث تھی۔ بھگوتی کے دل لبھانے والے انداز وہ دیکھا کرتا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے تمام شناساؤں میں اسکی امتیازی شان تھی مگر اس امر کا یقین کر لینے میں کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اس کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ اسکی سادہ طبیعت جذبات نسوانی کا اندازہ لگانے کی اہل نہ تھی۔

زہرہ سے وہ اس وجہ سے نفرت نہیں کرتا تھا کہ وہ نعیمہ کی آوارگی اور آزادخیالی کی شریک تھی بلکہ اسکی ذہنیت نگاہ میں نسوانی فطرت اس کو بہت پست نظر آتی تھی۔

عبید: "نعیمہ تم میرے پڑھنے کے وقت تو اپنی جگر دوز آوازنہ نکالا کرو" قیاس اس موقع پر ہوتا تو عبید کو جری پر نوحہ فائش کرتا کہ نعیمہ کی آواز جگر دوز نہیں ہے بلکہ نظر میں ہے۔

"آخر کیا بات ہے؟"

نعیمہ۔ (ذرا دھیمی ہوکر) بھائی جان ایک ذرا سی بات ہے میں مہمانوں کا استقبال کرنا چاہتی ہوں اور یہ مجھے روکتے ہیں
عبید۔ "آپ اپنی ہنگامہ نصائح کو نعیمہ کے لئے ضائع نہ فرمائیے۔ اسکے لئے وہ تمام بیکار ثابت ہوئے۔" بڑے میاں غصہ ضبط کرتے ہوئے چلے گئے۔

عبید۔ نعیمہ! مجھے یہ ظاہر کرتے ہوئے دلی رنج ہے کہ تم نے شریفانہ غیرت پر اپنے دقیع نسوانی الطاف کا خاتمہ کرکے اسکو جا بجا تعلّی کی لینے کا موقع دیدیا۔ میں کیسے باور کروں کہ تم اپنی خاندانی خصوصیات بھی ضائع کرچکی ہو۔ کیا تم گوارا کروگی کہ وہ اپنی یکطرفہ خود غرضانہ محبت کو غلط بناکر عوام میں ظاہر کرتا پھرے۔"

نعیمہ۔ (بیباکی سے) "آپ کا خیال ایک حد تک درست ہے۔ مگر میں آپ کے رفع شک کے لئے کہنے کی جرأت کرونگی کہ اسکی محبت کے دونوں پہلو روشن ہیں۔" یہ جواب اس آزاد خیال خاتون کے لئے کوئی تعجب خیز نہ تھا۔

عبید۔ (روحانی اذیت محسوس کرکے) شاید میرے لئے دنیا میں اس سے زیادہ بد خبر کوئی نہیں ہو سکتی تم سے کسی معاملہ میں دردسری کرنا تم کو اور اپنے ارادوں پر مستحکم کرنا ہے۔ آخر میں اپنے دلی رنج کو ضبط کرکے تمہارے انتخاب کی مبارکباد دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ نعیمہ چند سکینڈ تک مبہوت کھڑی رہی۔ مسکرائی۔ دو قدم بڑھا سے اور زینہ کھٹ کھٹ اترکر غائب ہوگئی۔

۴
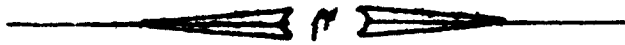
عبید گھوڑے کی سواری کا بہت شایق تھا۔ کئی بار سخت چوٹیں کھا چکا تھا مگر اپنے شوق کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ قبل طلوع آفتاب بیدار ہوا اپنی اور سبزہ عنابی گھوڑے پر سوار ہوا اور گنگا کے کنارے کنارے روانہ ہوا۔ آفتاب نکلنے والا تھا شفق کی سرخی کا عکس دھیمی دھیمی اٹھتی ہوئی لہروں پر پڑ رہا تھا۔ اس روز کے واقعہ کو وہ بالکل فراموش کرچکا تھا۔ مگر یہ جانتے ہی کہ مچھلیاں پکڑنے کی وہ بہترین جگہ ہے جہاں وہ گرا تھا اور کسی نامعلوم مسیحا کی توجہ سے ہوش میں آیا تھا ایک غائبانہ جذبہ سے متاثر ہوکر ذرا گھوڑا تیز کردیا۔ ۔۔ ۵ میل طے کرچکا تھا آفتاب کی پہلی نورانی شعاع اسکے سرد چہرے پر پڑی۔ ہرے بھرے کھیت کسی کے کشت آرزو کی طرح لہلہا رہے تھے۔ منزل مقصود آچکی تھی۔ مرکب سے اترکر حادثہ کی جگہ پر جا قصداً جا کھڑا ہوا۔ اسکے دل میں اس وقت اس حادثہ کی تکالیف کے خیالات جاگزیں نہ تھے بلکہ کسی دھندلے سے تصور کی خوش آیند لہر شریان سے گذر کر قلب اور پھر قلب سے شریان میں پہنچکر روح میں جذب ہو رہی تھی مگر یہ ذہنی کشمکش دیرپا نہ تھی۔ عنبی قصہ عنابی گھوڑے کو تیر سے باندھ دیا اور مچھلیاں پکڑنے میں مشغول ہوگیا۔ پندرہ بیس منٹ میں دو مچھلیاں ہاتھ لگیں مگر

اب آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد بھی ٹڈوں کو مطلق جنبش نہ ہوئی۔ دفعتاً بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز آئی۔ چونک ہوکر دیکھنے لگا۔ چشم زدن میں اسکا خود کا گھوڑا منہ میں ملائم ملائم گیہوں کی بالیں دبائے ہانپتا ہوا اس کے پاس آکھڑا ہوا اسی گھوڑے کی سراسیگی اور سانس کی بے ترتیبی پر غور کر رہا تھا کہ ایک اینٹ زور سے اسکے سر کو بچا کر ٹوپی پر پڑی۔ تعقب کرنیوالا برا بھلا کہتا ہوا اینٹوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ عبید کی نظر پڑ گئی۔ ذرا زور سے ہنس کر کہا "زخم سر بچا کر نکلنے کے بعد پھر زخمی کرنا آئین اخلاق سے بعید ہے۔"

"ہیں! یہ آپ ہیں، کہیں آپ کے دشمنوں کے چوٹ تو نہیں آئی؟" آنیوالے نے کہا۔

عبید۔ (مسکرا کر) "دشمنوں کے چوٹ آجاتی تو پرواہ نہ تھی مگر آپ نے میرے رفیق کی آنکھ زخمی کر دی یہ برا کیا۔" یہ وہی لڑکی تھی

لڑکی۔ (معذرت کے لہجہ میں) "اف مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آپ کا گھوڑا ہے؟ اور آپ بھی یہاں موجود ہیں۔ مجھے تو توقع نہ تھی کہ آپ پھر بھی کبھی یہاں آئیں گے۔ کیا آپ عفو تقصیر میں کشادہ دلی سے کام لیں گے؟

عبید۔ "ضرور۔ مگر بدون شرط نہیں۔"

لڑکی۔ "شرط؟ آخر کونسی شرط۔

عبید۔ "پہلی ملاقات پر تم نے میرے گستاخانہ کلمات کو معاف کرنے میں بخل سے کام لیا تھا۔ پہلے مجھے معاف کر دو۔"

لڑکی۔ (مسکرا کر) "آنکے لئے عفو کی درخواست کرنا مجھے اور شکایت کا موقع دینا ہے یعنی آپ مجھ کو اس قدر تنگدل سمجھتے ہیں کہ اتنی سی بات کا خیال میں نے ابتک اپنے دل سے نہیں نکالا۔"

عبید۔ "مجھے مسرت ہے تم نے معاف کر دیا۔ میرے گھوڑے نے آپکی زراعت کا تو ضرور نقصان کر دیا ہوگا۔ کیا اسکی تلافی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

لڑکی۔ "کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

عبید۔ "میری رائے میں یہ گھوڑا ہی اسکی تلافی کر سکتا ہے۔ یہ آپکے نذر ہے۔"

لڑکی۔ "آپ کی سواری کا گھوڑا چھین نا تو ظلم ہے۔

عبید۔ "اطمینان رکھئے میرے پاس اور گھوڑے موجود ہیں۔ دیکھئے خدارا منہ نہ بنایئے۔ اس نذرانہ کے مسترد ہونے کا مجھ کو بڑا قلق ہوگا۔"

لڑکی۔ "تو یہ آپ تو ——— گھر میں آبا میاں سے کیا کہونگی؟"

عبید۔ "مجھے آنکے پاس لیچلو میں انکو سمجھا دونگا۔" عبید لڑکی کے پیچھے پیچھے کھیت طے کر کے ایک خوش وضع

جھونپڑی میں پہنچا جہاں ضروریات کی تمام سادہ اشیاء موجود تھیں۔ اس لڑکی کا والد مغل خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے دیگر رفقا کی طرح گداگری کو بسر اوقات کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس زرخیز گنگا کی وادی میں کاشتکاری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ قریبی اعزا میں صرف یہ لڑکی باقی تھی۔ عبید نے اپنی مختصر سی حکایت بیان کرنیکے بعد بڑے میاں کو گھوڑا قبول کرنے پر آمادہ کر ہی دیا۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی کھیت کی مینڈ تک اسکے ساتھ آئی

”آپکی خوانِ نعمت سے مزے لینے والی زبان نانِ جویں کے ذائقہ سے کیا آشنا ہوگی آج ذرا چکھتے جایئے۔“

عبید:۔ ”مجھے بیحد افسوس ہے اب میں نہیں رک سکتا۔ دھوپ تیز ہوتی جاتی ہے۔ پھر انشاء اللہ آؤنگا۔“ اب سلسلۂ کلام ختم ہو چکا تھا خاموشی کا دونوں پر غلبہ تھا آخر عبید پھر بولا ”تمہیں اپنا نام بتانے میں تو کوئی عذر نہیں۔“

لڑکی:۔ (دھیمی آواز میں) ”نسیمہ۔“

عبید:۔ ”شکریہ۔ میرا نام عبید ہے اگر تم اسکو یاد رکھنا پسند کرو۔“

لڑکی:۔ ”میں ضرور اس نام کو یاد رکھونگی۔“ اس کا جواب عبید کے سرور سے لبریز دل نے صرف اتنا دیا کہ اسکے لبوں پر ایسے تبسم کے آثار پیدا کر دیئے جو آج تک نہیں دیکھے گئے۔

۵

عبید:۔ ”نعیمہ میں تم کو دو اور مہمانوں کے استقبال کی تکلیف دونگا۔“

نعیمہ:۔ ”بچشم۔“

عبید:۔ ”مگر تم کو انکے لئے علیحدہ انتظام کرنا پڑیگا۔“

نعیمہ:۔ ”آپ تو ہمارے شریکِ طعام ہونگے نہ؟“

عبید:۔ ”نہیں ہم تینوں علیحدہ کھائیں گے۔“

عبید کے ہاں آج مہتمم بالشان ضیافت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ صدر پھاٹک پر بیسیوں موٹر فٹن وغیرہ کھڑی ہیں۔ ڈائننگ ہال (کمرۂ ضیافت) کی آرائش سے کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی کہ شرقی رنگ پر مغربی وارنش چڑھا ہوا ہے۔ بلکہ مغربی رنگ کا حقیقی و بہترین نمونہ نعیمہ کا ترتیب دیا ہوا ڈائننگ ہال تھا۔

مہمانوں کے استقبال میں نعیمہ کا انہماک و عبید کی نگاہوں کا تجسس قابل دید تھا۔ نعیمہ خیر مقدم میں اپنے حقیقی جذبات سے کام لے رہی تھی جو تبسم کی شان میں اسکے لبوں سے نمایاں تھے۔ مگر عبید کسی کے نظر آجانے کی حسرت میں مصنوعی گرمجوشی سے نعیمہ کو اپنے فرض کی باحسن الوجوہ ادائیگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ دفعۃً حقیقی مسرت کے آثار

اسکی متلاشی نظروں سے ظاہر ہونے لگے۔ اس نے دو شخصوں کو آتا دیکھا۔ ایک سالخوردہ شریف مرد تھا۔ دوسری کوئی سرو قد عورت تھی جس کی تجلیاتِ حسن چھن چھن کر برقع کے نقاب سے نکل رہی تھیں۔ سلسلۂ آمد اب ختم ہو چکا تھا۔ عبید نیر سے اجازت لیکر مع اپنے مہمانوں کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں یہ دونوں مہمان کون تھے۔ نسیمہ اور اسکا والد۔ کھانے سے فارغ ہو کر عبید نے نسیمہ سے دریافت کیا "تم بزمِ طرب میں شریک ہونا پسند کرو گی؟"

نسیمہ:۔ "اس روحانی غذا سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر میں مجمع میں بیٹھنے کی عادی نہیں ہوں۔"

عبید:۔ "میں مجمع سے علیحدہ ہال کے پردہ کے پاس اگر آپ کو بٹھادوں پھر تو کوئی عذر نہیں؟"

نسیمہ:۔ "ہاں پھر میں تیار ہوں۔" عبید نے دونوں کو لیجا کر ایک کنجِ خلوت میں بٹھا دیا اور خود گانا سننے ایک الماری سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مغنیہ کی دلکش آواز نے بڑے میاں کی مردہ طبیعت میں جوانی کی گذشتہ باتوں کو تازہ کر دیا۔ اٹھے اور عبید کے قریب آکھڑے ہوئے۔ بلکہ چند منٹ بعد اس سامعہ نواز آواز سے مجمع میں سب سے زیادہ جو مسرور تھا وہ نسیمہ کا باپ تھا۔ فرید کی نظر اسی گوشہ میں تھی جہاں نسیمہ بیٹھی ہوئی تھی چپکے سے اٹھا اور اسکو غور سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ نسیمہ کے نازک و معصوم دل کو خود بخود اذیت سی محسوس ہوئی جبکہ اس نے بگولی کو عبید کا ہاتھ مسکراتے ہوئے تھام کر باہر لیجاتی ہوئے دیکھا۔ اسکی دوشیزگی کی حیا نے اول تو اجازت نہیں دی مگر پھر کسی جذبہ نے باہر نکلنے کے لئے آمادہ کیا۔ آہستہ سے اٹھی۔ دروازہ سے سر نکال کر جھانکا کوئی نظر نہ آیا۔ دس بج چکے تھے۔ دھندلی چاندنی میں اصطبل کے قریب بینچ پر کوئی سفید سی چیز نظر آئی۔ قیاس نے یقین دلایا کہ وہ عبید ہی ہے اور اسکے قریب ہی بگولی بھی بیٹھی ہوگی۔ مضطرب دل کے تقاضوں نے اس کو اتنا غور کرنے کا موقع بھی نہ دیا کہ اگر اس سے اس مداخلتِ بیجا کے متعلق سوال کیا جاتا تو کوئی وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔

ہاں وہ عبید ہی تھا۔ مگر تنہا۔ تنہا! حرماں نصیبی و بیکسی کی تصویر بنا ہوا۔

بینچ پر بیحس پڑا ہوا تھا۔ چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ نصف جلا ہوا سگار اس بے اتفاقی کے جوشِ انتقام میں زمین پر پڑی ہوئی ٹوپی کو جلانے کی فکر میں تھا۔ نسیمہ نے پہلے تو پی کو بچایا۔ چند لمحہ خاموش اس منظر کو دیکھتی رہی۔ کیسی تکلیف دہ خیال نے سینے کے محدود احاطہ میں گنجائش نہ پا کر تنفس کی تیز روانی کے ساتھ نکل کر عبید کو چونکا دیا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ وحشت نصف لمحہ کے اختتام کے قبل سرور سے بدل گئی۔ اطمینان کا سانس لیا۔ نسیمہ پہلے تو اسکے ان تغیرات سے کچھ خائف ہوئی مگر جرات کر کے بولی:۔ "یہاں کیوں آ لیٹے۔ کیا طبیعت ناساز ہے؟"

عبید نے اونچی نظر کر کے اس کو دیکھا اور صرف سر ہلا دیا۔

نسیمہ۔ (مسکرا کر) "آپ کی وہ ساتھی کہاں ہیں؟"

عبید۔ "صاف دلی سے" وہ فرید کے ساتھ چلی گئی۔"

—— < ۶ > ——

نسیمہ۔ "پھر آپ یہاں تنہا کیوں لیٹے ہیں؟"
عبید کے لئے اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا اس سے کہ دریافت کیا " میں آپکو استغراق میں مخل ہوئی"
عبید "نسیمہ ——" اسکے حلق میں سرد سے پھندا پڑ گیا نسیمہ سوسائٹی سے بے بہرہ تھی لیکن عبید کے جذبات سمجھنے کے لئے سادہ لوح نہ تھی۔ مگر اپنی فطرتی شان استغنا سے کام لیکر خاموش کھڑی رہی" نسیمہ! بیٹھ جاؤ میں سنجیدگی سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بیٹھ گئی۔
عبید" ہر شے یہاں میرے لئے دلچسپی نہیں ہے۔ اکثر اوقات جاذب نظر اشیاء مجھے اپنی جانب متوجہ کر لینا چاہتی ہیں مگر میرا مذاق طبع اس قدر قائل ہے کہ جس چیز کو میں اک بار کسی کی کے لحاظ سے کمتر سمجھ چکا ہوں اسکو کسی عارضی خوبی سے قابل توجہ سمجھنے کا عادی نہیں۔ نسائیت ——"
نسیمہ (ہنسکر اسکا قطع کلام کرتے ہوئے) "معاف کیجئے اگر آپ اس قدر خودستائی سے کام نہ لیں تب بھی آپ کے صحیح کیرکٹر کی وقعت جو میرے دل میں ہے وہ آپ کے حال پر نظر ثانی کرنے کی زحمت سے مجھ کو بچانیکو کافی ہے۔"
عبید" خودستائی کا لفظ تم نے میرے لئے استعمال کرنے میں بڑی بے بھی سے کام لیا۔ صحیح عادات و اخلاق کا اظہار خودستائی نہیں خیر —— کیا تم میرے جذبات کو کچھ چیز سمجھتی ہو؟ ایسی چیز جس کا تعلق تمہاری روح کی بسط و عرض سے ہو؟"
نسیمہ" مجھے مگر وہ ...... جذبات بھی تو معلوم ہوں"
عبید" تمہیں نہیں معلوم؟ کیوں بناتی ہو"
نسیمہ۔ (نیچی نظر سے) "تو! مجھے کیا خبر"
عبید" آہ تمہیں نہیں معلوم! اچھا میری طرف دیکھو"
نسیمہ" یہ لو!" مگر آنکھیں اوپر نہیں اٹھیں نیچی حجابانہ نظروں نے صاف اعتراف کر لیا کہ وہ عبید کے جذبات سے کما حقہٗ واقف ہیں۔
عبید۔ (ملتجی لہجہ میں) "نسیمہ یہ استغنا مجھے مار ڈالیگا۔ صرف ایک لفظ۔ قبول یا مسترد!"
نسیمہ" دونوں نہیں" شرارت آمیز تبسم اسکے لبوں پر رقص کر رہا تھا۔

عبید ۔" تمہیں میری قسم ۔"
نسیمہ ۔ خیر لفظاً وہی سہی ۔ مگر بلا والد کی رضامندی ہمارا اتصال اس دنیا میں نہیں ہوسکتا ۔ عبید میں تمہاری قدر کرتی ہوں
تمہاری تمناؤں کا خاتمہ ہونے سے قبل میں اپنا خاتمہ کرنے کو تیار ہوں ۔ مگر تم مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ والد کے احکام
کی خلاف ورزی کر کے بھی تم کو اپنی سرگرمی محبت کا ثبوت دے سکوں گی ۔"
عبید ۔ (رنج و حسرت کی درمیانی حالت میں) "مگر وہ کیوں انکار کریں گے ؟"
نسیمہ ۔" یہ میں بھی نہیں کہتی ۔ انتخاب میرا ہے رضامندی ان کی ہے ۔"

۷

قیراں ۔" نعیمہ آج بغرض تفریح کہیں نہیں چلو گی ؟"
نعیمہ ۔" اب تو بہت تاریکی ہو گئی ۔ مگر میں تمہاری خاطر شکنی نہیں کرنا چاہتی ۔ اچھا چلو ۔" جھٹپٹا وقت ہو چکا تھا دونوں شہر
سے دور دریا کے کنارے چلے گئے ۔ نعیمہ نے تھک کر کہا ۔ "لو اب لوٹ چلیں تم خدا جانے کہاں چلے جا رہے ہو ۔"
قیراں ۔" اچھا ذرا آؤ یہاں دم لے لیں پھر لوٹ چلیں گے ۔ دونوں ایک نشیب میں اتر گئے جہاں گنجان جھاڑیاں تھیں ایک
درخت کی ابھری ہوئی جڑ پر بیٹھ کر قیراں نے کہا" نعیمہ آخر کب تک انتظار کروں اب تو وعدہ وفا کرو ۔"
نعیمہ ۔ میں نے تو کل ہی والد سے اپنی شادی کے متعلق ذکر کیا تھا مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتے ہیں ۔ بھائی صاحب
تو کہنا ہی بیہودہ ہے وہ تو تم سے نفرت کرتے ہیں ۔"
قیراں ۔" ابھی زمانہ نفرت کرتا ہے تو کرنے دو ہمیں شادی بیاہ کے انتظار کی ضرورت ہی کیا ہے ۔" نعیمہ نے قدرے
چیں بجبیں ہو کر قیراں کی جانب دیکھا ۔
قیراں ۔ (مسکرا کر) "تم جیسی آزاد خیال خاتون پھر یہ بیجا پابندیاں ؟"
نعیمہ ۔ (ترشروئی سے) "قیراں ! میں تمہاری اس گفتار کی متحمل نہیں ہوسکتی ۔"
قیراں ۔ (اسی شرارت آمیز ہنسی سے) "اور میں ضبط کا متحمل نہیں ہوسکتا ع قوت ضبط ہے نہ تاب شکیبائی ہے ۔"
نعیمہ ۔" کیا میرے بھائی کا خیال درست ہے ۔ قیراں کیا تمہاری ہستی میری آیندہ زندگی کیلئے درس عبرت ہو گی ۔"
قیراں ۔" آیندہ زندگی کی تمنا کرنیکی اجازت اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ تم اپنی ضد سے باز آؤ ۔"
نعیمہ ۔" شیطان ! آہ میں اپنے غلط امتحان پر نادم ہوں ـــــــ ۔"
قیراں ۔" جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا ۔" ایک ہلکی سی حلق میں دب کر رہ جانیوالی چیخ کی آواز آئی ۔ کچھ سرسراہٹ ہوئی

ایک دھماکے نے اس سین کا خاتمہ کر دیا۔ مگر فوراً دوسرا سین نظر آتا ہے۔ تاریک جھاڑی کی شاخیں زور سے ہلیں۔ دھماکہ ہم کی آواز آئی۔ ایک زور کا کھٹکا ہوا اور دردناک آواز کے ساتھ کوئی دور دھم سے جا گرا۔

نعیمہ عبید کے قدموں پڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ قیراں کا جسم خاک و خون میں آلودہ پڑا ہوا تھا اسکی ناپاک روح پرواز کر چکی تھی۔ عبید کے پیچھے نسیمہ خوف و ہراس سے اس سین کو دیکھ رہی تھی۔

عبید "اٹھو نعیمہ! خدا کا شکر کرو کہ ملائک فریب نسیمہ کی ترغیب سے میں اس راستے مکان پر پہنچنے کیلئے روانہ ہوا ورنہ تمہارا نہ معلوم کیا حشر ہوتا۔ نعیمہ زار و قطار رو رہی تھی آخر نسیمہ نے تسکین دیکر اس کو اٹھایا۔

✣ ✣ ✣ ✣

زہرہ آخر ایسا بھی کیا پردہ تم نے اپنی حالت مریضوں کی سی بنالی۔

نعیمہ یہ پردہ قصور نہیں ہے اس واقعہ کا خیال ابتک میرے ذہن سے نہیں نکلا ہے۔ اپنی بھاوج نسیمہ کے برتاؤ سے امید ہے جلد حالت درست ہو جائیگی۔" **نقد قیمی**

آہنگِ اضطراب

ہم جو ناواقفِ کیفِ مئے عرفاں ہوتے
ایک ہی جام میں بیگانۂ ایماں ہوتے

آنکھ والوں کو بصیرت جو میسر ہوتی
ایک اک ذرہ سے سو حسن نمایاں ہوتے

جلوہ جب عام ہے پھر قیدِ تعین کیسی
ورنہ ہم بھی کبھی آسودۂ ارماں ہوتے

لیکے آئے تھے ازل ہی سے متاعِ ہستی
کس طرح دہر میں ہم بے سر و ساماں ہوتے

ہم سمجھتے تھے جب اک مرحلۂ عشق اسے
کس لئے بزمِ تماشا سے گریزاں ہوتے

لذتیں دید کی مفقود تھیں اٹھتا جو حجاب
آج ہم کثرتِ انوار سے حیراں ہوتے

جلوۂ حسن کی تھی روح بھی اک جزوِ لطیف
ورنہ بیگانے کبھی صاحبِ عرفاں ہوتے

بخششِ عام نے دھوکے مجھے کیا کیا نہ دیئے
کاش الطاف بہ اندازۂ ایماں ہوتے

غرق تھیں جلوۂ رنگیں میں نگاہیں بسمل
کیسے نظارۂ کیفِ حسنِ گلستاں ہوتے

(ابوالمعانی) بسمل بلگرامی

شاعر کا نصب العین

از ساغر نظامی

یہ وہ نظم ہے جو ۲۹؍ دسمبر ۱۹۲۶ء کو انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ کے یونین ہال میں انجمن خیابانِ اردو کے سالانہ مشاعرہ کی تقریب پر حضرت ساغر نظامی مدیر پیمانہ نے اپنے پرشوکت اور نغمہ آفریں لہجے میں پڑھ کر سنائی اور جو شفیقہ مو
پر انکے اُستادِ گرامی کی نظم کے بعد، اس موضوع پر بہترین نظم سمجھی گئی۔

(۱)

اے نقادِ بزمِ معنی ممنوں ہوں تیری پرسش کا
میں شاعر ہوں وہی شاعر الہام مرا میخانہ ہے
ساقیٔ قلم سرمستی سے پیمانہ بھر بھر دیتا ہے
صہبا کی ہر موجِ رنگیں اک شعرِ ناطق ہوتی ہے
میں خود ہی نوائے ملہم ہوں، محوِ شورِ دارین نہیں

تو قصہ پوچھنے آیا ہے شاعر کی ذہنی کوشش کا
ایک ہاتھ میں ہے ساقیٔ قلم اک ہاتھ میں پیمانہ ۔
پیمانہ جب بھر جاتا ہے صہبا جاری کر دیتا ۔
میں سحر جگایا کرتا ہوں جب ساری دنیا سوتی
وہ میرا شعر نہیں قطعاً جس میں رازِ کونین نہ
یہ میرا نصب العین نہی

شاعر کے نصب العین میں منشا قدرت کی تھراتی ہے
شاعر کے ذہنِ روشن پر کرنیں بن کر چھا جاتی ہے

(۲)

ہے عرش بداماں ذوقِ نظر میں کب محدودِ پستی ہوں
سب دہندے نقشِ قدامت کے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا
اب دل کی غم ناکی مجھ کو تسکینِ حسرت دیتی ہے
اب جھوٹی سچی باتوں سے دل میرا نفرت کرتا ہے
اب بے معنی فریاد نہیں اب مہمل شور و شین نہیں

گو خاک کا پیکر ہوں لیکن اک اک کی روشن ہستی
تھا جن پہ غلافِ تاریکی وہ سارے شیشے توڑ آ
اب حسن کی رعنائی مجھ کو پیغامِ حقیقت دیتی
اب اس پہ ہنسی آتی ہے مجھے جو لفظی آرائش
یوں لکھنا تجھ بن صبر نہیں، یوں کہنا تجھ بن چین
یہ میرا نصب العین نہی

بے صبر ہوں لیکن قلزم کے احساس میں اک قطرہ کی طرح
بے چین ہوں لیکن مرکز سے گھبرائے ہوئے شعلہ کی طرح

(۳)

وہ نصب العین شاعر ہے جو نصب العینِ فطرت ہے
خوابیدہ ہو جو قوم اُسے پیغامِ بیداری دینا
جذبات کی مردہ روحوں کو زندہ کرنا انسانوں میں
پھولوں کے ریشوں میں کھو کر پھولوں کی فطرت پڑھ لینا
عرفاں کے موتی چن لینا اسرار کی ہر گہرائی سے

جو مقصد مابین انسان اور فی مابینِ فطرت ہے
تاریک فسردہ ذروں کو احکامِ ضوباری دینا
تخئیل سے امرت رس لے کر قطرے ٹپکانا کانوں میں
کانٹوں میں ہو کر جذبِ خلش کی ہر نوعیت پڑھ لینا
انکار کے سورج چمکانا انوار کی ہر پہنائی سے
یہ نصب العین شاعر ہے

میں نبض شناسِ شاعر ہوں، اس کی فطرت کا ماہر ہوں
یہ نصب العینِ شاعر ہے میں واقف ہوں میں شاعر ہوں

(۴)

نغمات سحر کے سن لینا رنگین افق کے چنگوں سے
انسانوں میں پیدا کرنے وہ عنصر انسانیت کے
تاروں کی صحبت میں چھپ کر تعلیم محبت کی دینا
دنیا کو نفس پرستی کے غاروں سے اوپر لے آنا؛
مضرابِ عمل سے چھو لینا تحریک کے قائم تاروں کو

تاریکی شب کو پڑھ لینا خاموش شفق کے رنگوں سے
جو عظمت کے گہوارے ہوں آئینے روحانیت کے
بیداری کا مژدہ دینا غفلت کی آنکھیں سی دینا
ذروں کی دھندلی پستی کو تاروں کے اوپر لے آنا؛
عبرت سے پانی کر دینا بدمستی کے انگاروں کو
یہ نصب العین شاعر ہے

قدرت اصلاح خلقت کی تکمیل پہ تنہا قادر ہے؛
باقی جتنی تخریبیں ہیں ان سب کا مصلح شاعر ہے

(۵)

دنیا کی ذہنیت پڑھ کر بن جانا درس نصابوں میں
آئندہ نسلوں کے مستقبل کو رنگِ عظمت دینا

ذہنوں کو مرتب کر دینا بن کر الفاظ کتابوں میں
جو پیدا ہونے والی ہیں ان روحوں کو قوت دینا

ترکیب عزم و جزم سے کچھ ہمت والے دل بنوانا
دنیا میں آنے والے طوفانوں کے ساحل بنوانا
ایوان حکومت کو دینا ترتیب نئے آئینوں سے
اسرار اگلوا لینا گہرے سینوں کے گنجینوں سے
دنیا کے حسنِ کہنہ سے تازہ جلوے پیدا کرنا
نغموں کو لَے سے بھر دینا نَے سے نغمے پیدا کرنا
یہ نصب العینِ شاعر ہے

تجدید تعلق رکھتی ہے ہر نصب العینِ شاعر سے
پھر کس کا نصب العین ہو بڑھ کر نصب العینِ شاعر سے

(۶)

حریت کے میدانوں میں اپنے رایت چمکاتا ہے
قومیت کے ایوانوں میں تنظیم کے نغمے گاتا ہے
اصلاح کی قندیلیں لے کر جاتا ہے ظلمت گاہوں میں
تہذیب کی تمثیلیں بن کر پھرتا ہے جلوت گاہوں میں
جب قافلے اپنی غفلت سے چلتے ہیں راہِ باطل پر
وہ بانگِ جرس بن کر اکثر گونجا کرتا ہے منزل پر
گمراہوں کو منزل کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے
وہ رہ گیر و وا ماندہ کو اٹھنے کی قوت دیتا ہے
وہ تاروں کی آنکھیں بن کر رکتا ہے سیر اندھیروں کی
سورج کی کرنوں میں چھپ کر سنتا ہے گونج سویروں کی
یہ نصب العین شاعر ہے

یہ نصب العین فقط کامل شاعر کے دل میں ملتا ہے
تکمیل مگر جب ہوتی ہے جب ذہن کا تارہ کھلتا ہے

(۷)

وہ رمز شناسِ معنیٰ ہے فطرت کی طرف سے شاعر ہے
یہ ہے سطحی تنقید مری جذبات نگارِ خاطر ہے
وہ ملت کی ذہنیت پہ چھا جاتا ہے حالی بن کر
اقبال میں ظاہر ہوتا ہے اک فلسفہ عالی بن کر
اکبر کے لطائف میں چھپ کر اصلاح کی کوشش کرتا ہے
شبلی کے تبحر میں دورِ رفتہ کی نمائش کرتا ہے
خیام و حافظ کی لے میں گاتا ہے ترانے مستی کے
داغ و غالب بن کر افشا کرتا ہے مقصد ہستی کے
الجھے ہوئے رازِ ہستی کو لفظوں سے سلجھا دیتا ہے
فطرت کے معموں کو اکثر باتوں میں سمجھا دیتا ہے
یہ نصب العین شاعر ہے

شاعر ہے وہی جو پردے میں فطرت کے ترانے گاتا ہو
سازِ دل کے ہر پردے میں اپنی آواز سناتا ہے

(۸)

شاعر خود نصب العین ہے قدرت کے عزم صدرنگی کا
وہ خود اک مقصد ہے کامل، خود فطرت کا مقصود ہے وہ
ہے اس کا ہی نقشِ جادہ تقلید کے قابل عالم میں
فطرت کے "حکیم اعظم" سے ہر وقت مخاطب رہتا ہے

ہر رنگ اُسکے آہنگ میں ہے فطرت کی ہم آہنگی کا
ہر نصب العین میں پنہاں ہے ہر مقصد میں موجود ہے وہ
الفاظ سے اُسکے سجتی ہے الہام کی محفل عالم میں
"طوطی پس آئینہ ہے"، جو سُنتا ہے وہ کہتا ہے
یہ نصب العین شاعر ہے

جب نے کی نوا ذاتی ہی نہیں اُس کا نغمہ اور بین ہی کیا
جس پر فطرت خود قادر ہو پھر اس کا نصب العین ہی کیا

طبیعیات کے ارتقا میں نیوٹن کا کارنامہ

(جناب محمد عبد النعیم صاحب صدیقی)

تاریخ ماضی کے مطالعہ سے روشن ہوگا کہ "فلسفۂ قدرت"، یعنی علم الطبیعیات کی ابتدا ترقی کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا صرف تین سو سال کے قلیل عرصہ میں ہم طبیعیات کو موجودہ آسمانِ عروج پر پاتے ہیں۔ تمام عالم تیرہ و تار تھا، انسانی دل و دماغ تعیش او لہو و لعب کے نذر ہو چکے تھے۔ اعلیٰ خیالات اور علمی تحقیقات اور کد و کاوش مفقود ہو چکی تھی اور اس طرح انسانی جوہر بغیر کسی استعمال میں لانے اور بلا نگہداشت پڑے رہنے سے تخیل کی قابلیت میں بھی انحطاط کے آثار رونما ہونے لگے تھے۔ اعلیٰ علمی تحقیقات تو ایک طرف رہی ادنیٰ معلومات تک، جو اُس زمانہ کے حوائج ضروریہ کیلئے لازمی تھے، حاصل نہ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُنکے روزمرہ کی زندگی میں گوناگوں پیچیدگیاں پڑگئی تھیں اور معمولی معاشی مسائل عقدۂ لاینحل نظر آنے لگے تھے۔

اب اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی شخصیت ظہور پذیر ہو جو نہ صرف علمی تحقیقات عالیہ میں مصروف ہو بلکہ ساتھ ہی ساتھ انسانی دل و دماغ اور قوتِ تخیل کو تعیش اور عشق بازی کی لعنت سے بچائے اور لوگوں کو اسکے صحیح استعمال کی اہلیت آجائے۔ بالآخر ۱۶۴۲ء میں اولس تھروپ (Woolsthorpe) لنکن شائر سے آفتاب سائنس

طلوع ہوتا ہے اور تمام علمی دنیا کو اپنی علمی تحقیقات سے منور کر دیتا ہے اور یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ اگر قدرت کی عطا کردہ
قوت دماغی کی صحیح پرداخت کی جائے تو انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ مشاہدات فطرت پر علمی استدلال کر کے
اپنے اور اپنے ہم جنسوں کے لئے مفید اور کارآمد نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ نیز صحیفۂ قدرت کے مطالعہ کی قابلیت آ جاتی ہے
یہ زبردست ہستی جس نے انسان کے قلب میں برق کی سی تڑپ پیدا کر دی سوائے نیوٹن کے اور کون ہو سکتی تھی؛
سر آئزک نیوٹن ہی کی بدولت آج دنیا کی مہذب اور شائستہ قوم "فلسفۂ قدرت" کے اہم انکشاف و علمی ایجادات کی
راحت کی زندگی بسر کر رہی ہے اور نہایت ہی فخر و مباہات سے اپنے ہم جلیسوں میں اُس کا تذکرہ کر رہی ہے۔ اگرچہ
اس وقت نیوٹن کے ہم عصروں نے اُسکی سعی اور محنت کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن اُس کی ہی شب بیداریاں
آج روز روشن کا جلوہ دکھا رہی ہیں اور یہی مشقت علم الطبیعیات کے اس قصر رفیع الشان کی بنیاد ہوئیں جس میں
آج مہذب اور شائستہ قوم سکونت گزیں ہے۔ نیوٹن نے نہایت ہی صبر و استقلال سے ان تمام مشکلات کو جو اسکے
ہمعصروں کی نکتہ چینی اور خورده گیری کی وجہ سے پیش آئیں برداشت کر کے علمی میدان کو صاف کیا اور بالخصوص
طبیعیات کی داغ بیل ڈال دی اور فرہاد وار شیریں حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم ہم تک
پہنچائی۔ گو نیوٹن اس وقت موجود نہیں ہے لیکن علم و حکمت کا دریا بہہ رہا ہے اور بالخصوص طبیعیات کی
افتادہ زمین سر سبز و شاداب نظر آ رہی ہے۔

نیوٹن کی علمی تحقیقات کا آغاز نہایت دلچسپ طریقہ پر ہوا ہے۔ ۱۶۶۵ء میں وہ اپنے وطن Woolsthorpe
کے کسی باغ میں تفریح طبع کی خاطر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک ناشپاتی جو بالکل پک گئی تھی خود بخود
ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔ چونکہ فطرتاً فطین ذکی الطبع واقع ہوا تھا اس لئے معاً اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تحقیق
کیجئے کہ ناشپاتی نیچے کیوں گری؟ اور پر کیوں نہیں گئی؟ نہایت ہی تحقیق و تدقیق کے بعد اس نے یہ معلوم کیا کہ کوئی چیز
زمین میں ایسی ہے جو اجسام کو مرکز زمین کی طرف کشش کرتی ہے۔ اس کا نام اس نے جاذبۂ ارض رکھا پھر
ریاضی داں Kepler کے تیسرے کلیہ کی مدد سے معکوس مربعوں کا کلیہ اخذ کیا اور چاند کی حرکت سے اپنے کلیہ کی
تصدیق کرنا چاہا۔ لیکن ۱۶۸۵ء تک نیوٹن اپنے تجربہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب Picard کی دریافت کی
ہوئی مرمہ فلکی نصف قطر کی قیمت نیوٹن کو ملی تو اس نے ایک کرہ اور اسکے متصل ذرہ کی باہمی قوت کشش کا
حساب لگا کر اپنے کلیہ تجاذب کی صحت کو تسلیم کیا۔

اس کا کلیہ تجاذب یہ ہے "ہر مادی جسم دوسرے مادی جسم کو ایک خاص قوت سے کشش کرتا ہے جو متناسب

ہوتی ہے اجسام کی کمیوں کے حاصل ضرب کے اور تناسب معکوس رکھتی مربع فصل کے ساتھ۔"
جولائی ۱۶۸۷ء میں نیوٹن کی ان تحقیقات کے نتائج شائع کئے گئے۔ پہلی کتاب کلیہ تجاذب کے ڈائمی اثبات پر مشتمل تھی۔ دوسری کتاب میں سکون سیالات ہیڈروڈائنیکس اور نظریہ امواج پر بحث تھی تیسری کتاب میں نظام شمسی میں قوت کشش یعنی جذب کا وجود ثابت کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام اجرام فلکی اسی کے تابع ہیں۔ نیوٹن نے اپنی تحقیقات کو یہیں پر ختم نہیں کردیا بلکہ اور آگے بڑھایا اور اپنی تحقیقات کو جاری رکھ کر ان معرکۃ الآرا نتائج پر پہنچا جو کہ علم الطبیعیات کی بنا قرار دیئے گئے۔ ان میں سے پہلا کلیہ یہ ہے۔ "ہر جسم سکون میں رہتا ہے یا ہموار رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہتا ہے تاوقتیکہ کوئی قوت اسے اسکے برخلاف کرنے پر مجبور نہ کرے۔" روزمرہ کے مشاہدات اس کلیہ کی صداقت کے حامی ہیں۔ انکا دوسرا کلیہ یہ ہے "معیار حرکت کا تغیر قوت عاملہ کا متناسب ہوتا ہے اور اسی سمت میں ظاہر ہوتا ہے جو کہ قوت کی سمت عمل ہو" اس نے یہ بھی دریافت کیا "ہر مقام پر تمام مادی جسم اوپر سے نیچے کی طرف مساوی اسراع سے گرتے ہیں" ان دو کلیات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ کوئی قوت جو جسم پر لگائی جائے وہ اسکی کمیت اور اپنے پیدا کردہ اسراع کے حاصل ضرب پر موقوف ہے۔ انکا تیسرا کلیہ یہ ہے کہ عمل اور رد عمل ہمیشہ مساوی اور متضاد ہوتے ہیں۔

نیوٹن کے Optical Rehearch ۱۶۶۶ء سے شروع ہوئے ہیں۔ اس نے اسی سال سفید نور کو اپنے اجزاء ترکیبی میں تحلیل کیا دو سال بعد اس نے سب سے پہلی منعکس دوربین (Reflected Telescope) ایجاد کی اور اخبارات کے ذریعہ شاہی انجمن کے سامنے پیش کی۔ اسکی یہ تمام تحقیقات "Optics" کے نام سے ۱۷۰۴ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۶۹۴ء سے ۱۶۹۵ء تک نیوٹن نظریہ قمری "Lunar theory" کے مکمل کرنے میں لگا رہا جس کے لئے Flamstead کے مشاہدات کی سخت ضرورت تھی۔ نیوٹن اور Flamstead کے باہمی مناقشات کی وجہ سے اس اہم علمی تحقیق سے اس کو ہاتھ اٹھانا پڑا۔ ایک اہم مشاہدہ Newton's Ring کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مشاہدہ نیوٹن ہی نے کیا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ جب دو شیشوں کی سطحیں جنمیں سے ایک کسی قدر محدب اور دوسری مستوی ہو ایکدوسرے پر دبائیں تو نقطہ تماس کے اطراف کئی ہم مرکز رنگین دائرے نظر آتے ہیں۔ اگر ان شیشوں کو معمولی روشنی سے متاثر کیا جائے تو رنگین دائروں کی تعداد سات ہوتی ہے جن میں سے بیرونی دائرہ کا رنگ سرخ اور اندرونی دائرہ کا رنگ بنفشی ہوتا ہے۔ یہ شعاع نور کے علیحدہ علیحدہ مختلف فاصلے طے کرنے
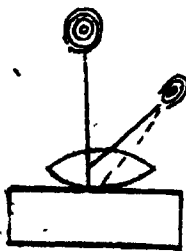
ینی اور سادہ سطح سے منعکس ہونے اور بہ یک وقت آنکھ تک پہنچنے سے دکھائی دیتا ہے
بالآخر ۱۷۲۷ء میں یہ علمی آفتاب غروب ہو گیا یعنی Keningston میں ایسی زبردست ہستی ہم سے ہمیشہ
کے لئے جدا ہو گئی۔ اور Westminister Alloy میں سپرد خاک ہوئی۔ باوجود ان تمام انکشافات کے
ابد علمی یعنی سائنس اور بالخصوص طبعیات کے رازوں کیلئے نیوٹن جیسے محقق کے مزید علمی شانہ کی ضرورت تھی۔ فقط

میخانۂ محبت

کچھ اہلِ دل، اہلِ وفا — بادہ گسارانِ ولا
پاکیزہ باطن، بے ریا — آئینہ دارانِ رضا
تصویرِ صدقِ آرزو
بیٹھے ہوئے ہیں چار سو —— ساقی کی بزمِ ناز میں

سینوں میں اُنکے ہے رواں — جوشِ محبت بیگماں
چہروں سے اُنکے ہے عیاں — کیفیتِ عشقِ نہاں
یعنی سراپا جوش ہیں
لیکن وہ یوں خاموش ہیں —— گویا نہیں منہ میں زباں

اک آرزو دل میں لئے — بے فکر اپنے حال سے
ہیں منتظر بیٹھے ہوئے — ساقی کی چشمِ لطف کے
کچھ بھی اُنہیں پروا نہیں
اندیشۂ فردا نہیں —— مستِ خمارِ دوش ہیں

اور ساقیٔ کمسن حسیں — نازک ادا و ناز آفریں
آئینہ رو، زہرہ جبیں — غیرتِ دہِ ماہِ مبیں
باشان و شوکت کر و فر

محفل میں یوں ہے جلوہ گر ——— جیسے پرستانیں پری
اُس کی نگاہِ سُرگیں مخمور، پیاری اور حسیں
دیوانہ سازِ حور عیں باصد ادائے دلنشیں
گردش میں مثلِ جام ہے
یعنی صلائے عام ہے ——— بادہ پرستوں کے لئے
لیکن وہ ہے اہلِ نظر اہلِ نظر بھی باہنر
سب کو پلاتا ہے، مگر پیمانۂ دل دیکھکر
تا کہ کسی کم ظرف کو
حد سے فزوں نشہ نہ ہو ——— رسوا نہ ہو اُنکی نظر
جتنے بھی بادہ خوار ہیں بیخود ہیں یا ہشیار ہیں
مفلس ہیں یا زردار ہیں مومن ہیں یا کفار ہیں
سب کی ہے چشمِ حق نگر
ساقی کے روئے پاک پر ——— یعنی موحد ہیں وہ سب
(ابوالفاضل) راز چاندپوری
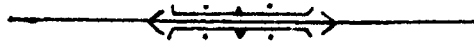
"جگر کے داغ"

ازل کے دن جو ہم لیکر اُٹھے تھے تیری محفل سے　　وہ شعلے آجتک لپٹے ہوئے ہیں دامنِ دل سے

اُٹھی کیا کوئی حسرت دلِ سوزاں کے قریب　　کچھ دھواں سا ابھی اُٹھا تھا گریباں کے قریب

ہو چکا تکملۂ صورت و معنائے بہار　　تو بھی اب سامنے آ اے چمن آرائے بہار

نمودِ عجز کی یہ گرمیٔ مزاج تو دیکھ　　ہزار قطرے فنا کر کے اک حباب اُٹھا

بقدرِ ظرف نئے بندگی کو جوش رہا　　کسی جبیں سے یہ ٹپکی کسی جبیں میں رہی
ہوس نے بھر دیئے اس درجہ خواہشات کے بت　　ذرا سی بھی نہ جگہ کعبۂ یقیں میں رہی
سرِ نیاز نہ جب تک کسی کے در پہ جھکا　　برابر ایک خلش سی مری جبیں میں رہی

ایک ذرہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے　　آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

میری حیرت کی قسم رخ سے اٹھاؤ تو نقاب　　میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

عشق جب مصروفِ اصلاحاتِ رنج و تمکیں تھا　　عرصۂ عالم مرے اک گوشۂ دامن میں تھا
ہم نے تکمیلِ جنوں بھی جلوہ زارِ غم میں کی　　دور کیوں جائے کہ صحرا بھی اسی گلشن میں تھا

قیس و فرہاد ہوں یا سرمد و منصور جگر　　ہم نے بے مایا نہ دیکھا کسی دیوانے کو

جگر مراد آبادی

خیابانِ خلیل

(از صاحبزادہ متین اللہ خانصاحب واثق ٹونکی)

(۲)

"چور کی ڈاڑھی میں تنکا"

(۱) نہ بولا، چور کی ڈاڑھی میں تنکا — کہے کیا، چور کی ڈاڑھی میں تنکا

اس مطلع میں کل کائنات چار الفاظ ہیں، "نہ" "بولا" "کہے" "کیا" ان چاروں لفظوں سے نہ کسی مضمون کا اظہار نہ کسی مفہوم کی طرف ایما، وہ مہمل مصرعے مطلع کی صورت میں رونما ہیں،

(۲)

"گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا"

یہ ضرب المثل اُس جگہ مستعمل ہوتی ہے جہاں غیروں سے کوئی اچھے سلوک کرے اور اپنوں سے معمولی، مغایرت اور یگانگت کا محلِ استعمال میں ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مندرجۂ ذیل خمسہ میں محل استعمال غلط ہے ؎

نالے کرے نہ کیونکر بلبل نہ کیوں ہو مضطر — کیا خار دے گیا ہے افسوس یہ ستمگر
چُن چُن کے لے گیا ہے دامن میں ہر گل تر — پژمردہ پھول چھوڑے گلچیں نے شاخ گل پر
"کیا خوب، گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا"

گلچیں نے تر و تازہ پھول تو "خود" چُن لئے اور "پژمردہ بلبل کے لئے چھوڑ دیئے" اول تو دیکھنے کی بات ہے کہ گلچیں نے ایک عمدہ چیز خود لی اور بری غیر کے لئے چھوڑی، یہ محل اس ضرب المثل کا نہیں ہو سکتا۔

دوسرے یہ کہ گلچیں اور بلبل میں مغایرانہ تعلق ہے نہ یگانگت کا، گل سے جس طرح خاص تعلق بلبل کو ہے اسی طرح گلچیں کو بھی ہے بلکہ بلبل سے زیادہ کہ لفظی مناسبت بھی رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا بلبل کے لئے صادق آتا ہے،

تیسرے یہ بات دریافت طلب ہے کہ شکوہ کے بطور یہ الفاظ مُنہ سے نکلتے ہیں اب یہاں کون مخاطب ہے؟

بھیجا تھا ہم نے تجھ کو کیا اس لئے بتا تو — آئی ہے گشت کرتی دل میں ذرا سمجھ تو

لائی بھی کبھی کیوں گیسو کی بو صبا تو ؎ ”جا“ سونگھتے نہیں ہم سمجھی نہ ہے ہم کو کیا تو
کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا

معلوم ہوتا ہے شاعر حضرت سلیمانؑ تھے، جن کے قبضہ میں ہوا تھی، انہوں نے بھیجا کہ بوئے گیسوئے معشوق لاؤ، گئی تو گشت کرتی ہوئی پلٹی، تمام خوشبو تقسیم کر آئی بچی کھچی لیکے گھر پہنچی اب عتاب ہوا خطاب ہوا، بھیجا تھا ہم نے تجکو کیا الٹی بتا تو نہ یہ مسلّم کہ ”صبا“ کو شعراء یا عشاق نے پیامبر باندھا ہے لیکن کوئی منت کرتا ہے، کوئی ارمان کرتا ہے کہ کاش تو میرا پیام پہنچا دے، کوئی شکر کرتا ہے کہ تو نے بوئے زلف مجھ تک پہنچائی، حکومت، دھمکی، یا گھر و تعلقات، رشتہ داری کا رابطہ کوئی نہیں جتاتا، جب بات یہ نہیں تو محل استعمال بھی غلط ہے، علاوہ محل استعمال غلط ہونیکے، بندش نہایت نامعقول ہے، حشو و زوائد سے ہر مصرع لبریز ہے،

اشعار کا مضمون اس قدر بے تکا ہے جس نے پایۂ اعتبار سے انہیں گرا دیا ہے، یہ شان عشق نہیں ہے کہ بوئے زلف معشوق کو خواہ وہ کسی قدر ہو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے سونگھنے سے انکار کر دے، عاشق کیلئے تو اسکی رمق ہی کافی ہے مشام دل و جان کو معطر کرنیوالی ہے،

پھر یہ الفاظ قابل غور ہیں ”جا نہیں سونگھتے“ وہ خوشبو جو ہوا کے ذریعہ ناک تک پہنچے اسکے سونگھنے پہ اختیار نہیں ہوتا، ”جا نہیں سونگھتے“ کی ایک ہی رہی،

اس بات سے مگر یہ کب ہے خیال اس کا ؎ خوشبو ملی ہے اسکی اس میں یہ ہم نے مانا
بٹنہ ملا ہوا کیوں یہ آج ہم کو بھیجا ؎ گر میل تھا نہ دل میں گر صاف تھا تو یہ کیا
کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا

سب سے پہلے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ ضرب المثل کا محل استعمال غلط ہے شاعر کا کہنا صرف اتنا ہے کہ ”ہمیں ملا ہوا بٹنا بھیجا“ حالانکہ محل استعمال یوں ہوتا کہ غیر کو اعلیٰ درجہ کا بے ملا ہوا بٹنہ بھیجا اور ہمیں ملا ہوا، گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا،

میں حیران ہوں یہ کس مذاق کا شاعر ہے، معشوق کے پہنے ہوئے ہار، معشوق کے جسم سے مس کی ہوئی چیزیں دنیا کے عاشقوں کو مرغوب ہوتی ہے حتیٰ کہ معشوق کے پسینہ کی بو تک محبوب تسلیم کی گئی ہے۔ باوجود اس اعتراف کے کہ اس بٹنہ میں انکی خوشبو ملی ہوئی ہے تاہم تیل کا ملیدہ ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے خمسہ متذکرہ بالا کی ترکیب اور ربط و تسلسل ہماری سمجھ سے باہر ہے، مصرع دوم و سوم کی بندش ترکیب معنی اور ربط پہ ناظرین کرام خود غور فرمالیں۔
مقطع میں بھیؔ باسی ہاروں کو، جو دس ہزار تازہ ہاروں سے ہمارے نزدیک بہتر ہے تیل کا ملیدا بتاتے ہیں۔

محل استعمال تو قریب قریب ہر جگہ نظر انداز ہے، بجز مطلع کے کہ نہایت مناسبت رکھنے والے الفاظ ہیں اور محل استعمال بھی ٹھیک ہے،

"ضامن نہ ہونا باپ کا ہے ضامنی گھر باپ کا"

متذکرۂ بالا الفاظ یا "مصرع" مجھے نہیں معلوم کہ دراصل ضرب المثل ہے یا بھاٹوں کی صدا، مطلع میں "باپ کا" ردیف ہے اور قافیہ علاوہ مصرع اول کے سب فارسی الفاظ ہیں جو نہایت ہی بدزیب معلوم ہوتے ہیں یعنی کھدر میں زربفت کے پیوند۔

صفحہ ۳۹ x ۱۱

"لاحول ولاقوت"

لاحول ولاقوت اسے کون ضرب المثل کہتا ہے، قرآن پاک کے چند الفاظ پاک ہیں جو زبان اردو کے محاورہ میں بھی بولے جانے لگے ہیں، ہم نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے جو تنقیدی اشعار ہیں ۵

یہ ضرب مثل حضرت با لاحول ولاقوت — یہ بھی ہے کوئی جدت لاحول ولاقوت
کیوں ٹانگ اڑاتے ہو جب کہنا نہیں آتا — اچھی نہیں یہ حرکت لاحول ولاقوت
ہر بات ہے بیڈھنگی "معشوق کی حضرت کے — کرتے ہو یہ کیوں ذلت لاحول ولاقوت
بے شرم بتاتے ہو معشوق کو یہ کہہ کر — "کچھ شرم نہ کچھ غیرت"، "لاحول ولاقوت"
جو چاہو کہو مر سے مانے گا کو ئی کیسے — کرتے ہو عبث حجت لاحول ولاقوت
بیزار ہوا ہوں میں اس سمع خراشی سے — لاحول ولاقوت، لاحول ولاقوت
جو جام سفالیں ہے جمشیدی بنے کیونکر — گو ایک سی ہو صورت، لاحول ولاقوت

سمجھائے انہیں واثق جو بات بری دیکھے
اتنی بھی نہیں جرأت لاحول ولاقوت،

کیا "لاحول ولاقوت" ردیف ہو جانے سے شاعر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ ایسے ہی مضامین پیدا کرے جن سے معشوق کی ذلت ہویدا ہو اور بس۔

---

۵۱ زبان :- بفتح اول وثانی وثالث از غیاث۔

۵۲ زبان :- یہ آپ تنقید کر رہے ہیں یا اعلان جنگ۔

۱۲ × ۳۹

"مدعی سست گواہ چست"

ذی علم ناظرین سے پوشیدہ نہیں کہ اس ضرب المثل کا محل استعمال اُس جگہ ہوتا ہے جہاں صاحب معاملہ کو فکر نہو اور غیر متعلق شخص تگ و دو کرے، شعر نمبر ۲ ملاحظہ ہو۔

دعوے دل کو دیکھکر، آہ و فغاں سے پوچھکر — اُس نے یہ فیصلہ کیا مدعی سست گواہ چست

شاعر کہتا ہے "معشوق کے روبرو دل نے محبت کا دعویٰ پیش کیا، آہ و فغاں شاہد تھے اُن سے دریافت ہوا" یہ صورت معاملہ مدعی سست گواہ چست کی نہیں ہو سکتی، ہاں جب مثل صادق آتی جب شاعر یوں کہتا "معشوق کے روبرو دل تو خموش ہے آہ و فغاں نے شور مچا رکھا ہے" اب یہ کہہ سکتے تھے مدعی سست گواہ چست،

اس خمسہ میں ضرب المثل بحیثیت ردیف کے واقع ہوئی ہے جو کہیں مناسب موقع پر نہیں نظر آتی، چند اشعار ناظرین کے غور کے لئے درج ہیں فرداً فرداً تنقید قایم کرنا فضول ہے۔

خط سے علاوہ حال کچھ کہہ دیا نامہ بر نے جب — سُن کے وہ شوخ بول اٹھا مدعی سست گواہ چست

خط نہ لکھا جاتا اور نامہ بر خود کوشاں ہوتا تو مثل صادق آتی۔

مانگ کے دل وہ چپ ہوئے سر ہے ادا کے در پہ بھی — کھلتا نہیں یہ ماجرا مدعی سست گواہ چست

دل نہ مانگتے اور ادا ہی ادا سر ہوتی تو مثل صادق آجاتی۔

۱۳ × ۴۰

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

یہ ایک مصرع ہے، جو موقع پر بولا جانے لگا ہے، تاہم ضرب المثل نہیں کہا جا سکتا، میں نے اسپہ یہ مصرع لگایا ہے ع "صورت و سیرت ہر اک کی ہے جدا" نہایت مناسب مصرع ہے جس سے محل استعمال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ "رنگ و بو" "صورت و سیرت" سے کیسی زبردست مناسبت رکھتے ہیں بخلاف اُن مصرعوں کے جو خیابان خلیل میں ہیں نظر آتے ہیں وہ نہایت بےمزہ اور پھیکے ہیں، علاوہ اس کے عیوب ظاہری سے بھی پاک نہیں ہیں۔

ع "ہے جدا نیش و خلش ہر خار میں" نیشِ عقرب تو سُنا ہے، لیکن نیشِ خار نہیں سُنا۔

"نغمہ سنجی بلبلِ دل کی یہ ہے" بلبلِ دل یہ ترکیب بھی نئی ہے۔

"شاخِ نخلِ دل کی شادابی نہ پوچھ" اول تو "نخلِ دل" کی ترکیب نئی، نخلِ آرزو البتہ سُنا ہے پھر اس پہ طرہ نخل کی شاخ"

سونے پہ سہاگہ۔

"قلبِ ہر بلبل جدا ہے اس لئے" سبحان اللہ قلب عربی کا لفظ ہے اور اضافت ہے اردو کے لفظ "ہر" کے ساتھ علمیت کی داد دیتا ہوں۔

صفحہ ۴۱ × ۱۴

"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست"

"یہ بھی ایک مصرع ہے" بار بار اس مسئلہ پہ بحث کرنا فضول ہے، ہم سر دست اور لغو اشعار کو نظر انداز کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار کی بابت صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جو شخص ہماری اس عبارت کے معنی سمجھا دیگا وہی ان اشعار کے معنی بھی بیان کر سکتا ہے، ہم بذاتِ خود دونوں کے معنی سمجھنے سے مجبور ہیں۔

اشعار، فلسفہ میں بچھا کے دام اصول — فرع میں رکھ کے دانہ ہائے عقول
مطمئن ہیں کئی ظلوم و جہول — معنئ حد ذات حق معقول
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

ہماری عبارت، تخیلات تیز بہا میں فطرتِ انسانی فی نفسہ منفرد عامہ ہے یا نہیں اگر ہے تو توجیہ کیجئے ورنہ تردید فرمائیے"

صفحہ ۴۲ × ۱۵

"کیا بھونس کا تاپنا کیا پردیسی کی پیت"

بند مخمس نمبر ۲ خصوصاً داد طلب ہے۔ خصوصاً فصیح اور دلچسپ الفاظ و بندش "پھلانہ میں جاتے ہو"

تمام خمسہ غیر دلچسپ، غیر مناسب، اور غیر مسلسل الفاظ کا مجموعہ ہے جس میں جبراً ضرب المثل کے الفاظ بھی ٹھونس دیئے گئے ہیں۔

صفحہ ۴۵ × ۱۷

عوض معاوضہ گلہ ندارد

اس ضرب المثل کا محل استعمال یہ ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے کو نقصان پہنچائے اور دوسرے کے ہاتھ بالا ارادہ شخص اول کو بھی نقصان پہنچ جائے۔ یہاں اکثر اشعار میں بدسلوکی کا معاوضہ رنج اور پشیمانی سے جو معشوق کو ہوئی ظاہر کرتے ہوئے اس ضرب المثل کا اطلاق کیا ہے جو ایک حد تک کمزور پہلو ہے۔

ع ۲۔ گجرے کے پھیر میں میرا دل، تو اپنا دل دے دیں۔ چہ خوش الخ

اس مصرع میں بھی دو نقل ہیں اور دو مقصد۔ علاوہ ازیں مضمون نہایت غلط ہے۔ اس شخص سے جو کسی کی لی ہوئی چیز واپس کرے یہ امید کہ وہ اپنی پسندیدہ شے دیدے۔ کہاں تک درست ہے جب وہ بگڑ کے مل واپس کرینگے تو اپنا دل کیوں دیں گے وغیرہ وغیرہ۔

"جیسا دیس ویسا بھیس"

اس ضرب المثل کا محل استعمال مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ جاہل سے جاہل بھی سمجھ سکتا ہے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" بولنا کہاں مناسب ہے اور کہاں نامناسب/ اب خمسہ ملاحظہ ہو جس کا سر ہے نہ پیر۔

۱؎ ہو خاموش بن آزاد جیسا دیس ویسا بھیس — کہے جا شکوۂ بیداد ....
کہے گا کیا ستم ایجاد .... — گلی میں اُسکی ہو فریاد ....
خبردار اے دلِ ناشاد ....

ضرب المثل کھادی میں زربفت کا پیوند معلوم ہوتی ہے۔ چاروں مصرع نہ مربوط ہیں، نہ حسن تخیل کے مظہر، نہ کوئی دلچسپ مفہوم پیدا کرنیوالے، ایک مخبوط الحواس کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ معلوم ہوتے ہیں جس کے دماغ میں کوئی خاص معنی خیز مضمون نہ پیدا ہوتا ہو، یا چند جاہلوں کی تک بندیاں ہیں جو کُل پر بیٹھ کے شاعروں کا مضحکہ اڑاتی ہیں۔

۲؎ یہاں یہ وصف ہے بے جوڑ، کرو صیاد کی تعریف — اب اپنا مُنہ ادھر سے موڑ، کرو صیاد کی تعریف
چمن کی رشتہ داری توڑ، .... — قفس میں یادِ گل کو چھوڑ، ....
سمجھ اے بلبل ناشاد جیسا دیس ویسا بھیس

نمبر۲ بھی اول سے کسی طرح کم نہیں ہے، ضرب المثل دیکھئے تو الگ۔ فی نفسہ اشعار پر غور کیجے تو لغو، خصوصاً مصرع اول جس کا مطلب کسی طرح بھی ظاہر نہیں ہوتا،

۳؎ بھبوت اب مُنہ پہ مل لے تو بن لے جو گیا کپڑے — فغاں فریاد نالہ آہ اُٹھتے بیٹھتے دل سے
یہ خشکی ہونٹ کی جائے نہ آنسو بند ہوں تیرے — پہنچا بن کے تو مظلوم اے قاصد جو وہ پوچھے
تو کہنا اے ستم ایجاد جیسا دیس ویسا بھیس

بار بار یہ کہنا کہ ضرب المثل ذرا بھی دلچسپ پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ سمع خراشی ہے کہیں بھی اس خمسہ میں محل اور ٹھیک موقع اور مناسب مضمون کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے لہذا اب ہم وہ نقائص ظاہر کرتے ہیں جو شعر کی حیثیت سے پیدا ہیں۔

مصرع اول میں کیسا زبردست نقص ہے وہ یہ کہ شاعر کے فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مظلوم کی حالت کا خاکہ کھینچ رہا ہے حالانکہ مصرع اول سے ایک جوگی کا لباس پہناتا ہے۔

مصرع ثانی میں جس قدر الفاظ جمع کئے ہیں وہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جو "فعل" کے محتاج ہیں اور فعل ہے نہیں "فغاں فریاد نالہ آہ اُٹھتے بیٹھتے دل سے" "کرنا" فی بطن شاعر رہ گیا جس سے مصرع مہمل ہوگیا۔

۴ ترا عاشق گیا جو دشت میں کل جوشِ وحشت سے
جو دیکھا اُس کے حلیہ کو ڈرے چیتے ہرن چمکے

اُدھر وہ تھے اُدھر یہ تھا پریشاں کیا کہے کس سے
کہا یوں خارِ صحرا نے اڑا کر ٹکڑے دامن کے

تنِ عریاں مبارکباد . . . .

ناظرین کرام، ان اشعار سے ہر شخص مجھ پہ یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ تجھے کیا خبط تھا جو ان پہ تنقید کرنے بیٹھ گیا جسکا نہ سر درست نہ پیر مبتدی سے مبتدی شاعر بھی یہ لغویت نہ برتیگا جو ملک الشعراء نے برتی ہے اور خواہ مخواہ انکو اعلیٰ حضرت سے منسوب کرکے دادلی ہے، بجز اسکے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خواہ وہ کسی قدر لغویت ہو لیکن ہے ایک بڑے دھوم کے ساتھ اور یارانِ طریقت میں ناز کیا جاتا ہے کہ "یہ وہ اشعار ہیں جنہیں امیر الانشا نے شائع کرنیکی زحمت گوارا کی ہے"

۴ میں تین مصرع مسلسل ہیں اگرچہ عیبوں سے بھرے ہوئے ہیں جنکی نثر یہ ہوسکتی ہے "جب تیرا عاشق جوش وحشت میں "کل جنگل گیا تو اُس کے (بھیانک) حلیہ سے چیتے ڈرے اور ہرن چمکے، اُدھر چیتے اور ہرن پریشان تھے (کہ یہ کون بھوت آگیا) اُدھر یہ پریشان تھا (کہ کہاں آپھنسا)" کیا کہے کسی سے" یہ الفاظ اگرچہ بے ضرورت ہیں تاہم ہیں منسلک۔

چوتھے مصرع کی نثر یہ ہوگی "دامن کے ٹکڑے اڑا کر خارِ صحرا نے یوں کہا "ننگے بدن مبارکباد"

سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہئے کہ مسٹر اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ "چیتے اور ہرن" دونوں ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہوتے، پہلے مصرع میں "خوبیٔ وحشت سے" غلط ہے بلکہ "جوش وحشت میں" ہونا چاہئے۔ پھر حلیہ سے ان جانورانِ صحرائی کا ڈرنا کیسا مضحکہ خیز خیال ہے۔ کیونکہ عاشق کا حلیہ اس قدر ڈراونا نہیں ہوجاتا کہ چیتے ڈریں اور ہرن چمکیں، ویسے چیتے کا ڈرنا اور ہرن کا چمکنا معمولی انسان سے بھی ہوتا ہے ہر معقول انسان بھی جنگل میں جائیگا تو چیتے ڈریں گے اور ہرن چمکیں گے، بھیانک حلیہ ہی پہ موقوف نہیں۔

پھر سب پہ طرہ کہ خارِ صحرا خواہ مخواہ اُلجھ پڑا دامن کے ٹکڑے کرکے بول اُٹھا تنِ عریاں مبارکباد۔ غالباً شاعر صاحب نے یہ خیال نہیں رکھا کہ صرف دامن کی اگر دھجیاں اڑا دیجائیں تو تن عریاں نہیں ہوجائیگا پھر تن عریاں مبارکباد

کیا معنی ہو آگے ضرب المثل کیسا مزہ دے رہی ہے "جیسا دیس ویسا بھیس"

عـ۵، نہ ہمدردی نہ دلسوزی نہ یہ پوچھا کہ ہو کیسے — نہ یہ پوچھا کہاں سے آئے بھیجا ہے تمہیں کس نے
پریشاں کیوں نہ ہوتا وہ نرالے طور جب دیکھے — جو اُنکے شہر میں قاصد گیا جس ہی نام اُسنے

جفا کی دی مبارکباد ....

مضمون کی لغویت کے علاوہ جفا کی ہر شخص کو مبارکباد دینا خصوصاً ایسی حالت میں کہ کسی کو نہ یہ علم تھا کہ یہ آنے والا کون ہے کیوں آتا ہے نہ کسی نے اس قسم کا سوال کیا نہایت سخت اہمال ہے، جفا کی مبارکباد قاصد کو دینا معنی کیا ہوئے شاعر صاحب ہی بیان فرما سکتے ہیں۔

عـ۶، سراپا باغ ہی بنجاؤ تم یہ ہی مناسب ہے — گلے میں بدھی، بیلا یا چنبیلی کی مناسب ہے
جوہی کر گجرے اور چمپا کلی کیسی مناسب ہے — دم سیر چمن پھولوں کا زیور ہی مناسب ہے

سمجھ اے غیرتِ شمشاد ....

اس میں شک نہیں "باغ" تو لگا دیا کیونکہ بیلا چنبیلی جوہی چمپا شمشاد، سب آگئے لیکن چاہئے کہ کچھ معنی پیدا ہوں اور دلچسپ مضمون نکلے خیر صلا ہے۔

۱ ، معشوق پھولوں کا زیور پہنے تو کیا وہ فی نفسہ باغ بن گیا کیسے مان لیا جائے۔

۲ ، اول مصرع میں "یہ ہی" غیر فصیح ہے۔ اصل فصیح لفظ "یہی" ہے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ "یہی" وزن میں آنہیں سکتا اور ایک اعلیٰ مضمون نکلا جاتا ہے تو بیشک "یہ ہی" لے آنا جائز ہے یہاں کونسا وہ اعلیٰ مضمون ہے جس نے "یہ ہی" لکھنے پہ مجبور کیا۔

۳ ، مصرع اول میں معشوق کو لفظ "تم" سے مخاطب کیا ہے اور آخیر مصرع میں "سمجھ" کا لفظ مستعمل ہے جو "تو" کا اظہار کرتا ہے اور یہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے عیب مانا گیا ہے۔

۴ ، ضرب المثل کا محل تو کوسوں غائب ہے۔

عـ۷، جلا کر اپنے دل کو، مرم سے اس سنگ کو بدلا — بنایا سرخ رو اس روسیہ کے ڈھنگ کو بدلا
کیا شفاف اسکو، اور اس کے رنگ کو بدلا — خلیل اس آتشِ سوزاں نے اسکے رنگ کو بدلا

کہ انگارہ بنا لولاو،

خمسہ کے معنی اور مطلب سخت تشریح طلب ہیں، اشتباہ ہے،

(باقی ——— باقی)

دوستی

شانِ محبوبی ہے شانِ دوستی — دل لبھا لیتی ہے آنِ دوستی
دوستی کو کہئے جانِ زندگی — زندگی کو کہئے جانِ دوستی
بے نیازی دوستی کی ہے بہار — خود پسندی ہے خزانِ دوستی
دلدہی ہے دوستوں کی جانفزا — ہے مروت ارمغانِ دوستی
یاں نہیں درزِ خصومت کا گذر — ہے شرافت پاسبانِ دوستی
دوستی سے دور ہے کوسوں نفاق — یہ نہیں شایانِ شانِ دوستی
ہونگے ہر اُمید میں وہ کامیاب — دے چکے جو امتحانِ دوستی
سینہ ہو جس شخص کا کینہ سے صاف — ہے اُسی کا دل مکانِ دوستی

شکر ہے واجب کہ تم ہو اے ذہین
جبہ سائے آستانِ دوستی

ذہین (حیدرآبادی)

غزل

(از مولانا تجمل حسین چشتی قادری)

دنیائے عشق کا یہ افسانہ مختصر ہے — نادیدنی تماشا، ناگفتنی خبر ہے
غفلت میں اک ذرا سی سو طرح کا ضرر ہے — ہشیار اے مسافر دنیا ٹھگوں کا گھر ہے
وہ دل ہے دل جو مضطر ہو عشق میں تمہارے — جو دیکھتا ہے تم کو اُسکی نظر نظر ہے
بھولے سے بھی لبوں پر آتا نہیں تبسم — قسمت میں اپنی شاید رونا ہی عمر بھر ہے
کیوں کر رہوں نہ محفوظ آفاتِ دہر سے میں — اے چشم مہربان تجھ پر مری نظر ہے
خود شوق سے ہوں قرباں تیغِ ادا پہ تیری — منظور مجھ کو مرنا مرنے سے پیشتر ہے
گھر میں نہیں تو باہر رہتا ہے کس جگہ تو — دل میں نہیں تو آخر تو جلوہ گر کدھر ہے

میں چمن کی یاد میں یوں بھولے ہوئے ہیں مجھ کو
مدت سے اسے تجمل نامہ نہ نامہ بر سے ہے

رقابت کی قیمت

از

(محشر عابدی)

— ۱ —

ولیم آسٹن ایک شریف خاندان کی نوجوان مایہ ناز ہستی تھی۔ اس میں انسانیت حسن اخلاق اور انکساری انتہائی مراتب کو پہنچ چکی تھی وہ ایک دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ گو اکثر واقعات انسان کی خواہش کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں اور زمانہ کا یہ رنگ ہے کہ وہ اپنی گردش متواتر سے ایک قریب آئی ہوئی شے کو دور کر دیتا ہے لیکن ولیم آسٹن کی حسین صورت اور خوش مزاجی نے اُسے بھی اپنا طرفدار بنا لیا تھا۔ وہ خوبصورت تھا خوبصورتی کی قدر کرتا تھا۔ خوبصورت بیوی کا خواہشمند تھا۔ اُسے خوبصورت بیوی بھی مل گئی تھی۔ وہ شیدہ میں کہتا تھا اُسے ایسی ہی بیوی کی تمنا تھی اور قسمت سے بیوی بھی ویسی ہی ملی تھی۔ وہ نہ مغرور نہ تمکنت پسند۔ نہ اسکی بیوی متکبر تھی۔ وہ دولتمند تھا تو بیوی بھی مالدار تھی۔ غرض دونوں ایک دوسرے کی مثال اور ایک دوسرے کی تصویر تھے اور اسلئے ان دونوں میں محبت ہونا لازمی امر تھا لیکن ایسا نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا جو زنانہ میں جہاں جملہ اوصاف عمدہ تھے وہاں اس میں جہالت کو بھی زیادہ دخل تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھی مگر معمولی درجہ کی کسی کالج کی گریجوایٹ نہ تھی۔ بلکہ ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شہر میں اسے رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے اکثر دقتیں پیش آتی تھیں۔ تاہم ولیم آسٹن اسکی جہالت اور ضد کو برداشت کرتا تھا۔ اور اُسے ہر بات نہایت نرمی سے سمجھاتا اور شہر کے ایٹی کیٹ (آداب صحبت) سے واقف کرتا رہتا تاکہ لوگوں کو اس پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کا موقع نہ ملے۔ انکی زندگی امن و آسائش کا گہوارہ تھی اور اطمینان و راحت کا مخزن۔ لیکن زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ ایسی پرسکون گھڑیاں زیادہ دیر تک نہیں قائم رہتیں چنانچہ انکی مسرور زندگی کو ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر ہنوز انکا نخل آرزو ثمر ور نہ ہوا تھا جس سے انکی آنکھیں روشن ہوتیں۔ اور دل زیادہ مسرور ہو جاتے۔

یہی وجہ تھی کہ آسٹن سخت مضطرب رہتا تھا وہ ایک لڑکے کا آرزومند تھا۔ اُسے تمنا تھی کہ میرے بعد میرے مال و متاع کا وارث پیدا ہو جائے لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی جب کوئی امید نہ نظر آئی۔ تو اسکے قلب حزیں میں دوسری شادی کی خواہش جاگزیں ہو گئی۔ آسٹن نے اس ارادہ کو کسی پر ظاہر نہ کیا۔ اور وقت کا منتظر رہا۔

اکثر ڈانس (ناچ) تھیٹر، سینما، سرکس وغیرہ میں اُسے خوبصورت اور خوش اخلاق خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور وہ انکے ساتھ انکے چھوٹے چھوٹے بچوں کو شاداں و فرحاں کھیلتا ہوا دیکھتا تو ایک آہ سرد بھر کر کہتا "کاش میرا بھی ایسا ہی ایک بچہ ہوتا۔"

یہ تماشوں اور اس قسم کی دوسری تفریحوں میں زیادہ حصہ لیتا تھا کہ اپنی پریشانی رفع کر سکے لیکن اس سے اسکی بےچینیوں میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ بہت سی ایسی لڑکیوں سے واقف تھا جن سے شادی نہایت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ ایک مشکل کام معلوم ہو رہا تھا اور جوز فائن کو بغیر طلاق دیئے دوسری شادی بھی ناممکن تھی۔ اور بظاہر کوئی ایسا سبب بھی نہ تھا کہ جس سے وہ اُسے طلاق دیکے اس لئے اب وہ بہانہ کی جستجو میں رہنے لگا۔

جوز فائن کی طرف سے اسکے دل میں نفرت سی ہو چلی تھی اور اب اسکے ساتھ وہ پہلے سے محبت آمیز برتاؤ نہ رہے تھے۔ جوز فائن نے بھی اس کو محسوس کیا لیکن مجبور تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی اس اضطراب کا سبب سمجھ رہی تھی اور اس لئے شوہر سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر یہ نفرت اسٹن کے دل کے اندر ہی اندر آگ کی طرح بھڑکتی جا رہی تھی۔

—·—·—‹ ۲ ›—·—·—

ایک رات جب وہ ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اسکے دماغ میں دو رکو یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ وہ جوز فائن کو اسی حال میں چھوڑ کر کہیں باہر چلا جائے۔ اور اسکی صورت نہ دیکھے لیکن فوراً ہی مال و جائداد کا خیال دامنگیر ہو جاتا اور دوسری تدبیر سوچنے لگتا۔ شراب کا گلاس میز پر رکھا ہوا تھا۔ سگرٹ پی رہا تھا اور کسی گہرے خیال میں مستغرق تھا

دوسری مرتبہ ڈانس (ناچ) ختم ہوا۔ لوگ ادھر اُدھر کرسیوں پر بیٹھنے لگے پھر بھی وہ اپنی محویت سے بیدار نہ ہوا۔ اس اثنا میں ایک کمسن خاتون جو کچھ حسین بھی تھی۔ آکر آسٹن کی قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی اور پوچھا۔

"میری وجہ سے آپکو تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

اسٹن نے چونکتے ہوئے مصنوعی تبسم سے جواب دیا نہیں آپ خوشی سے تشریف رکھئے۔

اورما۔ آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں ... آپنے ناچ میں حصہ نہیں لیا؟

آسٹن پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو چکا تھا اسکی آنکھیں اورما کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ گویا اس طرح اورما نے اُسے محبت کا پیغام دیا تھا۔

آسٹن: نہیں یا کچھ نہیں میں یونہی بیٹھا ہوں۔

اورما:۔ آپ شرمائے ہیں؟ بتائیے بھی تو کوئی حرج نہیں۔

آسٹن:۔ (استفسارانہ لہجہ میں) ہیں۔ لیکن آپ اپنا تعارف کرا سکتی ہیں؟

اورما۔ ہاں میں مسٹر ڈاسن کی بیٹی ہوں۔ جو پولیس انسپکٹر ہیں .... میری شادی چارلس کین۔ الیکٹرک انجنیر کے بیٹے مسٹر ریچرڈ کین سے ہوئی تھی ... لیکن میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔

آسٹن کو شادی کا حال سنکر کسی قدر افسوس ہوا۔ لیکن اورما کی باتوں نے اُسے اس قدر مسحور کر لیا کہ اسے دنیا کی خبر نہ رہی۔

آسٹن:۔ آپ تنہا تشریف لائی ہیں۔

اورما:۔ جی ہاں اس وقت تو میں تنہا ہی ہوں اور اس لئے میں آپ سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے رقص میں ابھی شرکت نہیں کی؟

اسٹن:۔ نہیں۔ اب ارادہ ہے۔

ہوٹل کے ملازم نے شراب کا دوسرا گلاس میز پر لاکر رکھ دیا۔

آسٹن ابتک اورما کے چہرہ کو گھور رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ایسا حسن کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اورما نے شراب پیتے ہوئے آسٹن سے پوچھا "کیا آپ اپنا اسم گرامی بتا سکتے ہیں؟

آسٹن :۔ مجھے ولیم آسٹن کہتے ہیں۔ میں مائننگ سکنز ملاکٹر دکان کھودنے کا ٹھیکہ دار ہوں۔

اورما :۔ مجھے آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ کیا آپ غیر ممالک میں بھی اس غرض سے تشریف لیجاتے ہیں۔

آسٹن :۔ ہاں۔ اب یورپ کے سفر کا ارادہ ہے۔

اورما :۔ یورپ میں کہاں؟

آسٹن :۔ جرمنی میں ایک ٹھیکہ میں نے لیا ہے۔

اورما :۔ کبتک روانگی کا قصد ہے؟

آسٹن :۔ دو ہفتہ کے اندر۔ کوئی خاص ضرورت ہے آپکو دال؟

اورما :۔ نہیں کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ میں بھی یورپ کی سیر کو جانیوالی ہوں۔ اسلئے شاید آپ کا ساتھ دے سکوں۔

آسٹن :۔ نہایت مسرت کی بات ہے۔

وہ اس امر سے بہت خوش ہوا۔ اسکے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ جس موقع کا وہ منتظر تھا وہ آگیا دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہوگئے ڈانس (رقص) پھر شروع ہوا۔ دونوں نے اس میں شرکت کی اس کے بعد مختلف قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر ٹھنڈے ٹھنڈے شاد و مسرور اپنے گھر کا راستہ لیا۔

۳۲

کچھ روز گذر گئے اور اب دونوں میں کافی راہ و رسم پیدا ہو چکی تھی ایک صبح آسٹن اور جوزفائن ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ آسٹن نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا "جوز۔ میں نے کوئلہ کی کان کھودنے کا جرمنی میں ایک بڑا بھاری ٹھیکہ لیا ہے اور اب میں یورپ جانیوالا ہوں۔

جوزفائن :۔ (مسرت آمیز لہجہ میں) بہت خوشی کی بات ہے لیکن کیا اکیلے جاؤ گے؟

آسٹن :۔ نہیں۔ اورما ٹامسن بھی یورپ جانیوالی ہیں اسلئے ان کا اور میرا ساتھ ہو جائیگا۔

جوزفائن :۔ (تعجب سے) اورما۔ رابرٹ ٹامسن انسپکٹر کی بیٹی!

آسٹن :۔ ہاں۔ تو کوئی حرج ہے؟

جوزفائن کو اورما کا حال معلوم تھا۔ کہ وہ ایک حسین عورت ہے۔ قابل اور تعلیم یافتہ ہے۔ اسکے علاوہ ایک بیوہ ہے۔ انہیں وجوہات سے اس نے اپنے شوہر سے کبھی اس سے ملاقات کا ذکر نہ کیا تھا کیونکہ وہ نام سے واقف تھی۔ اس نے ابتک اسے دیکھا نہ تھا۔ اور ذکر کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ خبر سنکر اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور وہ آزردہ ہوگئی۔

جوزفائن :۔ مجھے نہ لیچلوگے؟

آسٹن :۔ نہیں تمہارے جانیکی ابھی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

جوزفائن :۔ تو میں یہاں تنہا رہکر کیا کرونگی؟

آسٹن :۔ کیوں۔ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ اگر طبیعت گھبرائے تو اپنی والدہ کے یہاں چلی جانا۔ ابھی میں تمہارے

متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جوزفائن نے پھر کوئی سوال نہ کیا اور چپ ہو کر چائے پینے لگی۔

اس اثنا میں آورا بھی مکان میں داخل ہوئی۔ اور بلا کسی دقت کے اندر آگئی۔ آسٹن اور جوزفائن استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ جوزفائن آورا کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ گو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا اور آورا اسکی بیوی سے ناواقف تھی۔ آسٹن نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ اور پھر تینوں میز پر بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو میں جوزفائن نے پوچھا "آپ لیمپ کس غرض سے جانیوالی ہیں؟"

اورما:۔ صرف تفریح کے لئے۔

اس جواب سے اُسے اور زیادہ خلش پیدا ہوگئی۔ اب اسکو بھی یہ خواہش ہوئی کہ وہ بھی کسی طرح آسٹن کے ساتھ جائے۔

جوزفائن:۔ کبتک ارادہ ہے؟

اورما:۔ جب مسٹر آسٹن چلیں۔

جوزفائن:۔ مسٹر آسٹن تو تنہا جارہے ہیں۔

اورما:۔ آپ کو نہیں لیجاتے۔ کیوں؟

آسٹن:۔ آورا میں بالکل نئی جگہ جارہا ہوں۔ اس حالت میں ان کو ہمراہ لیجانا مناسب نہیں سمجھتا۔

اورما:۔ ہاں اگر تکلیف کا خیال ہے تو بہتر ہے۔

جوزفائن کو اس جملہ سے اور غصہ معلوم ہوا لیکن وہ خاموش رہی۔

آسٹن:۔ اورما پرسوں تک ہم کو روانہ ہوجانا چاہئے۔

اورما:۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا لیکن آپ جوز کو کیوں نہیں لیجاتے کیا پھر بلانے کا ارادہ ہے؟

آسٹن:۔ ہاں وہاں جانیکے بعد دیکھا جائیگا۔

اس اثنا میں جوزفائن کھڑی ہوچکی تھی۔ اس کا دل سخت مضطر تھا اور اب اسکی بیچینی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اُسے آسٹن سے ایسی دلی محبت تھی۔ جیسے ایک وفادار بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے وہ اُسے چاہتی تھی اور اس لئے وہ اپنی محبت میں غیر کو حصہ لیتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی۔ گو وہ جانتی تھی کہ آسٹن اب اس سے پہلے کی طرح محبت آمیز سلوک نہیں کرتا۔ تاہم اسے آسٹن کی اس بے پروائی کا خیال نہ تھا۔ اور وہ اس قسم کی ہر نفرت کو اپنی بدقسمتی سے تعبیر کرتی تھی۔ مگر شوہر کی جدائی کسی طرح نہ گوارا کر سکتی تھی۔ وہ صحن میں آکر ایک درخت کے پاس کھڑی ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

آورا نے اُسے روتا ہوا دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا تنہا جانا مصیبت کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح وہ جوزفائن کو رنجیدہ کر کے بلاوجہ اپنا دشمن بنالیگی۔ اس نے کچھ دیر سوچکر کہا

آسٹن: میں تنہا اب تمہارے ساتھ نہ جاؤنگی۔ میں ابھی اپنی سیر کا پروگرام ملتوی رکھتی ہوں۔ جب تم جوز کو بلاؤ گے اس وقت میں بھی چلی آؤنگی

اس جواب سے آسٹن کو تعجب ہوا۔ اتنے میں اورما جوزفائن کے پاس آئی اور کہنے لگی "جوز پیاری تم رو رہی ہو۔ اچھا میں بھی نہ جاؤنگی۔ تم اپنا دل مت کو ملاؤ۔"

جوزفائن:۔ نہیں تم جاؤ اورما۔ جاؤ میری وجہ سے کیوں اپنا عیش منغص کرتی ہو۔

یہ جملہ آورا کو بہت ناگوار گذرا لیکن وہ بہت عقلمند عورت تھی۔

آنیوالی مصیبت کو تاڑ گئی۔ اور آسٹن کے ہمراہ جانیسے انکار کر دیا۔ آسٹن کو جوزفائن کی اس حرکت سے غصہ معلوم ہوا۔ اور آدرما کی باتیں بھی نگوار گذریں۔ لیکن آدرما نے اسکے کان میں کچھ کہہ کر سمجھا دیا۔ وہ خاموش ہو گیا اور دوسرے ہی دن تنہا وہاں سے جرمنی روانہ ہو گیا۔

—•‹ ۴ ›•—

کچھ عرصہ کے بعد آسٹن کا تار آیا کہ تم دونوں چلی آؤ۔ ان دونوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور روانہ ہو گئیں۔ جرمنی پہنچکر اس گاؤں کا ٹکٹ لیا جس کا پتہ آسٹن نے لکھا تھا۔ اور ریل پر سوار ہو گئیں۔ راستہ میں جوزفائن کے دل میں طرح طرح کی تمناؤں اور آرزوں کے سمندر موجزن ہو رہے تھے۔ اور وہ اپنے شوہر سے ملنے کی خواہش میں بیحد مسرور اور بیقرار تھی۔ آخر مقام مقصود پر پہنچکر ایک ہوٹل میں وارد ہوئیں جس کا پتہ تار پر تحریر تھا۔ وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ آسٹن اب ایک ہوٹل میں نہیں رہتا بلکہ اس نے کان ہی پر مکان بنالیا ہے اور وہیں رہتا ہے۔ اس خبر سے جوزفائن کو بہت صدمہ ہوا اس نے حسب ذیل خط لکھکر آدرما کو دیا کہ وہ پڑھکر اسے ڈاک میں ڈال دے۔

پیارے اسٹن۔

جوز تمہاری یاد میں بہت بیچین تھی۔ اتنے دن سخت مصیبت سے کاٹے اور اب وہ تم کو دیکھنے کے لئے بیقرار ہے۔ میرے اسٹن تم اچھے ہو گے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ تم کو اچھا رکھے۔ امید ہے کہ تم اگر ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لیجاؤ گے۔ وہاں مکان کرایہ کا تو نہ ہوگا۔ تم نے خود ہی خریدا ہوگا۔ میں اچھی ہوں اور آدرما بھی۔ تمہارے جواب کا بیتابی سے انتظار ہے۔ تمہاری جوز

آدرما کی ظاہرا ہمدردی نے جوزفائن کو اپنا دوست بنالیا تھا۔ جوزفائن کو پہلا خیال جو آدرما کے متعلق تھا جاتا رہا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ آدرما صرف حیات کیلئے آئی ہے۔ اُسے اسکے شوہر سے کوئی خاص غرض نہیں لیکن اس کی ناتجربہ کاری اور دہقانیت نے اُسے آدرما کی چالاکیوں اور دغابازیوں سے غافل رکھا تھا۔ اس ہمدردی کے پردہ میں وہ جوزفائن کیساتھ نہایت ناجائز سلوک کرنا چاہتی تھی اور اپنی مکاری سے اسکی طرفدار بنی ہوئی تھی۔ تاکہ جوزفائن کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اب جوزفائن کو آدرما سے کوئی پردہ نہ تھا اسی لئے اسنے خط بھی اُسے پڑھنے کیلئے دیدیا۔ اب آدرما کو ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے خط پڑھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اور پھر یکایک قلم دوات اُٹھاکر خود دوسرا خط تحریر کرنے لگی۔ اور اس صفائی سے لکھا کہ جوزفائن اور اسکے خط میں کوئی امتیاز نہ باقی رہا۔ اور یہ مشکل سے کہا جا سکتا تھا کہ کونسی تحریر جوزفائن کی ہے اور آدرما کا خط حسب ذیل تھا:۔

میرے آسٹن۔

تم اچھے ہو گے۔ مجھے تمہاری عدم موجودگی میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی تم کو بھی شاید کوئی تکلیف نہ ہوئی ہو۔ اور آدرما کی وجہ سے میرا دل بہت بہل گیا اور اس وجہ سے تمہاری یاد زیادہ نہ ستاتی تھی مجھے نہیں معلوم یہ تمہارا خط کبتک پہنچیگی۔ مگر میرے لئے ایک گائے ضرور خرید رکھنا۔ اور اب تک تم نے کتنا روپیہ جمع کیا ہے۔ مکان تو دو تین ضرور خریدے ہونگے۔ اور میں اپنے لئے اچھا مکان چاہتی ہوں جس میں فرنیچر بھی قیمتی اور اچھا ہو۔ میری عادت سے تم واقف ہو۔ اس لئے یقین ہے کوئی شکایت کا موقع نہ دوگے۔ میں اچھی ہوں اور آدرما بھی۔ تم ہم لوگوں کو خود ہی آکر لے جاؤ تو بہت اچھا ہو۔ جواب کا انتظار ہے

جوز

(باقی آئندہ)

مصنف انڈکس (حصہ نثر)